تاریخ ہزارہ

مولفہ

ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی

(ایم بی بی ایس [illegible])

ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات

دار الشفاء۔ ایبٹ آباد

ضلع ہزارہ

تاریخ طبع بار اوّل .... اگست ۱۹۶۹ء

طباعت .... شائی برقی پریس۔ لاہور

کتابت .... محمد عبد الواحد اختر

تعداد .... پانچ سو

ناشر۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی۔ دار الشفاء ایبٹ آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ
تبویب	۳
ماخذ	۴
پیش لفظ	۹
تمہید	۱۳
وجہ تسمیہ	۱۵
راجہ رسالو	۱۹
ہزارہ۔ مختلف اقوام	۲۳
ترکوں کے حملے	۲۴
ہزارہ۔ عہدِ مغلیہ میں	۲۵
" " درانی	۲۶
سکھوں کا عہد	۲۹
سرگزشت گلاب سنگھ	۳۱
جموں و کشمیر	۳۶
کنور نونہال سنگھ کی موت	۳۹
شیر سنگھ کا عہدِ حکومت	۴۰
سردار ہری سنگھ۔ مانگل کی جنگ	۴۷
ہری سنگھ کا عہدِ حکومت	۵۰
مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آمد ہزارہ و جنگ سری کوٹ	۵۹

عنوان	صفحہ
محمد خان ترین، ملک صالح محمد مشوانی اور سربلند خان تنولی کی گرفتاری	۶۱
سردار جہان سنگھ کا دور	۶۴
راجہ شیر محمد خان تنولی کی گرفتاری	۶۶
نواب پائندہ خان اور جہان سنگھ کی آویزش	۶۷
حضرت سید احمد شہیدؒ آمد ہزارہ	۶۹
جنگ پائندہ خان و ہری سنگھ	۷۷
جہان سنگھ کی واپسی ہزارہ	۷۹
ہری سنگھ کی آمد ہزارہ	۸۰
شورش کرڑاواں	۸۳
اگرور پر حملہ	۸۴
ہری سنگھ کی آخری آمد ہزارہ	۸۵
جہان سنگھ۔ جانشین ہری سنگھ	۹۳
سردار تیجا سنگھ	۹۴
پیارا سنگھ	۹۶
دیوان مولراج دلوالیہ	۹۸
قتل مہاراجہ شیر سنگھ و کنور پرتاب سنگھ	۹۸

عنوان	صفحہ
سکھوں کی پہلی لڑائی۔	۱۰۰
قتل راجہ ہیرا سنگھ	۱۰۰
بعد کے واقعات	۱۰۱
ہزارہ میں گلاب سنگھ کی مخالفت	۱۰۵
میجر ایبٹ کی آمد اور چتر سنگھ کی بغاوت	۱۰۹
درانی فوج کی آمد ہزارہ	۱۱۲
ہزارہ پھر سے سکھ دربار کے حوالہ	۱۱۴
جیمس ایبٹ کے عہد کے حالات	۱۱۵
سردار چتر سنگھ و کرنل کناڈا	۱۱۷
گاغان کی مہم	۱۲۲
میجر ایبٹ کی ڈائری سے چند واقعات	۱۲۳
ہزارہ دوران بغاوت ۱۸۵۷-۵۸ء	۱۴۶
اہل ہزارہ کی معیشت	۱۴۸
پرانی تہذیبیں اور ان کے باقیات	۱۴۹
ایرانی سلطنت کا غلبہ	۱۵۲
یونانی دور	"
ٹیکسلا۔ تاریخی حالات	۱۵۳
مسلمانوں کے حملوں کا آغاز	۱۵۸
ہزارہ کے بندوبست	"
پاکستان بن جانے کے بعد کے حالات	۱۵۹
بندوبست ۱۸۷۲ء ۔ چند حقائق	"
پرانے شاہراہ	۱۶۱
قحط	۱۶۲
رواج نامہ۔ اقوام ہزارہ	۱۶۳

عنوان	صفحہ
سکھوں کے عہد کے مظالم	۱۶۴
عہد ماضی کے چند نامور اشخاص	۱۶۶
ماضی میں صوبہ و ضلع درباری	۱۶۷
حاکمان ہزارہ	۱۶۸
حکومت درانی۔ سکھ اور انگریز پر تنقید	۱۷۴
عہد انگریزی۔ اصلاحات	۱۷۶
عہد پاکستان۔ انتخابات	۱۷۹
بنیادی جمہوریت	۱۸۰
چند دیگر واقعات	۱۸۱
اعلیٰ حکام سرحد۔ عہد انگریزی	۱۸۲
" " پاکستان	۱۸۳
قوم پنی	۱۸۶
" " ہندوستان میں	"
پنیال قدیم تاریخ	۱۹۴
قوم غورغشت چھچھ ہزارہ میں	۱۹۷
مشہور افراد قوم پنی	۲۰۳
قوم پنی۔ مکان۔ لباس۔ ہتھیار	۲۲۷
رسومات شادی و غمی	۲۳۱
قوم پنی۔ بھیرہ	۲۳۶
" کالو پنڈ	۲۳۷
" پہاڑو	۲۳۸
" کانگڑہ	"
ڈھینڈہ و کنیا	۲۴۱
مشوانی	۲۴۲

عنوان	صفحہ
سید محمد گیسو دراز	۲۴۶
گوجر	۲۴۹
ترین	۲۶۴
دلازاک	۲۹۵
سادات	۳۱۳
بلغا دری	۳۳۱
سلمانی	"
بنبہ	۳۳۳
کڑال	۳۴۰
ڈھونڈ	۳۴۶
جدون	۳۵۱
تنولی	۳۶۳
گکھڑ	۳۹۱
ترک	۴۴۷
اتمان زئی	۴۵۷
طاہرخیلی	۴۶۲
کنازئی	۴۷۴
صواتی	۴۷۸
خان اگرور	۴۸۷
رئیس گڑھی حبیب اللہ	۴۹۹
آوان (اعوان)	۵۰۹
خویشگی	۵۱۷
ہزارہ کی سرحدی اقوام	۵۲۲
ہزارہ کی سرحدی جنگیں	۵۲۷
سید احمد شہیدؒ اور جماعت مجاہدین	۵۳۶

عنوان	صفحہ
جاگیرداران و کرسی نشینان	۶۰۲
علماء ہزارہ	۶۳۵
پیر بابا	۶۳۶
پیر روشن	۶۴۴
اخوند صاحب سوات	۶۴۸
مولانا محمد اسحاق مانسہروی	۶۵۰
مولوی محمد عرفان	۶۵۸
حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی	۶۵۹
مولانا غلام ربانی لودھی	۶۶۰
مولانا غلام رسول بفوی	۶۶۴
مولانا محمد رسول خان	۶۶۵
مفتی محمد حسن صاحبؒ	"
مولوی عبدالرحمن صاحب چھوہر شریف	۶۶۶
مولوی احمد مرحوم سکندرپوری	۶۶۷
سید محمود شاہؒ ڈھینڈوی	"
مولوی حمید الدین مرحوم مانسہروی	۶۶۸
دیگر علماء ہزارہ	۶۶۹
سکھ حکمرانوں کے فارسی آموز علماء	
سرائے صالح	"
قاری میر عبید اللہ سرائے صالح	۶۷۰
مولانا قمر علی صاحب	۶۷۱
مولانا فضل ربی	۶۷۲
مولانا غلام نبی صاحب	۶۷۳
میاں عبدالقیوم بفہ	"
مولانا محمد عبدالرحمن صاحب گنجوی	۶۷۴

مولوی منہاج الدین مرحوم	۶۷۶	پشتو زبان	۷۲۸
مانگل کے مجاہد علماء و مشائخ	〃	لفظ خان کی ابتداء	۷۲۹
اخوند صاحب مانگل	۶۷۹	پٹھان کی وجہ تسمیہ	۷۳۳
میاں محمد حنیف 〃	۶۸۲	افغان کی اصلیت۔ مزید تحقیق	۷۳۴
میاں ککگال صاحب 〃	۶۸۳	ہزارہ کے مقبرے اور درگاہیں	۷۴۱
حاجی عبداللہ 〃	۶۸۴	عہد ماضی کے سکے اور شاہان و خوانین	
قاضی محمود 〃	〃	کی مہریں	۷۵۶
محمد گل مرحوم 〃	۶۸۵	ہزارہ میں نظام صحت	۷۶۴
بابا احمد علی 〃	〃	ہزارہ۔ نظام عدالت	۷۷۲
مولوی عبدالکریم	۶۸۶	وکلاء ہزارہ	۷۷۷
پاتمال شریف	۶۸۷	ہزارہ میں نظام پولیس	۷۸۷
علاء خاندان عثمانی مسلہڈ	〃	ہزارہ کے اخبارات	۷۸۸
مولوی عزیز الرحمن۔ ایبٹ آباد	۶۸۹	ایبٹ آباد شہر۔ اس کے ادارے اور	
بفہ کا ایک اہل علم خاندان	〃	معروف ہستیاں	۷۹۳
پیران رجوعیہ	۶۹۱	ہزارہ میں زمانہ قدیم میں ذرائع	
مولانا عبدالکریم رجوعیہ	۶۹۳	آمد و رفت	۸۰۵
چند تاریخی خطوط	۶۹۴	ہری پور شہر۔ اس کے ادارے اور	
چند تاریخی فرامین	۷۰۴	مشہور اشخاص	〃
پٹھانوں کا حسب و نسب	۷۰۷	انجمن اسلامیہ۔ مانسہرہ	۸۱۰
افغان۔ نام	۷۲۲	عمر نامہ مؤلف	۸۱۱
پٹھان قوم کی سیرت	۷۲۵		
قندھار۔ وجہ تسمیہ	۷۲۶		
اقوام افغان کی اصلیت	۷۲۷		

تبویب

۱۔ تاریخ ہزارہ کے ماخذ

۲۔ پیش لفظ

۳۔ تمہید

۴۔ ہزارہ کی وجہ تسمیہ

۵۔ ہزارہ تاریخ کے مختلف ادوار میں

مفصل تاریخی کہانی
واقعات کی زبانی

۶۔ اقوام ہزارہ کی مفصل تاریخ ۔ بمعہ شجرہ نسب

پنی ۔ گوجر ۔ مشوانی ۔ ترین ۔ دلازاک ۔ تنولی ۔ جدون ۔ کرڑال ۔ ڈھونڈ ۔ سادات ۔ سواتی ۔ ببنبہ ۔ شلمانی (سلمانی)، بلغادری ۔ خویشگی ۔ اتمان زئی ۔ اعوان (آوان) ترک ۔

۷۔ پٹھان اور اُن کا حسب و نسب

۸۔ سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور اُن کی جماعت مجاہدین ۔

۹۔ ہزارہ کی سرحدی اقوام ۔

۱۰۔ ہزارہ کے علمائے کرام و صوفیائے عظام

۱۱۔ چند تاریخی خطوط جو تاریخ ہزارہ پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

۱۲۔ ضلع ہزارہ کے مقبرے ، درگاہیں اور زیارت گاہیں ۔

۱۳۔ شاہان سلف کے مواہیر اور سکے ۔ ۔

۱۴۔ جاگیر داران ہزارہ اور اُن کے کوائف ۔

۱۵۔ عمر نامہ مؤلف (ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی)

۱۶۔ ایبٹ آباد اور ہری پور شہر کے معروف ادارے اور شخصیتیں ۔

۱۷۔ اخبارات و مدیران ہزارہ

۱۸۔ ہزارہ میں نظام صحت و ہزارہ کے ڈاکٹرز ۔

۱۹۔ ہزارہ میں نظام عدالت اور حضرات وکلاء

۲۰۔ ہزارہ میں نظام تعلیم و نامور اصحاب علم

تاریخ ہزارہ کے مآخذ

میں نے طویل مدت تاریخ ہزارہ کے واقعات مختلف سرچشموں سے جمع کرنے میں صرف کی۔ اور اب جب کہ تقریباً یہ تالیف مکمل کر چکا ہوں۔ ہر وقت مزید حالات کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ ع

دامنے چیدیم ما روتے کہ خرمن داشتیم

میں نے مختلف اور بعض دفعہ نامعلوم گوشوں سے بھی حالات تلاش کر کے جمع کر دئے۔ لیکن خاص ماخذ جن سے میں نے استفادہ کیا وہ یہ ہیں:-

۱۔ اول اور بنیادی ماخذ جن سے میں نے بڑی محنت و مشقت سے سب اقوام ہزارہ کے خاندانی حالات، شجرہ نسب اور دیگر تاریخی واقعات نقل کئے وہ ۱۸۶۲ء کے کاغذات بندوبست ہزارہ ہیں مشہور دیہات ہزارہ کی صورت دیہی اس ضمن میں مفید معلومات کی حامل تھیں۔ ان سے مجھے بہت سی اقوام کی تاریخ آمد و جائے رہائش و حالات زندگی معلوم ہوئے۔ دو تین اقوام کے سلسلہ میں میری یہ تلاش ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ اگرچہ میں نے تلاش میں کمی نہیں کی لیکن افسوس ہے کہ اہل ہزارہ کے ارباب علم و فضیلت یا سربراہ اقوام و خوانین ہزارہ سے مجھے اس سلسلے میں توقع کے مطابق تعاون اور راہنمائی کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ حالانکہ میں نے ذاتی ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعہ استدعا کی۔ اور اخبارات کے ذریعہ کئی دفعہ توجہ دلائی۔ باوجود اس کے بھی اگر کوئی فروگذاشت اس تاریخی داستان میں یا حالات میں کمی بیشی نظر آئے تو میری معذوری کو مدنظر رکھتے ہوئے قارئین کرام معاف فرمائیں۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل اصحاب کا شکر گزار ہوں۔ کہ انہوں نے اپنے قیمتی مشوروں اور تاریخی حالات بہم پہنچانے میں میری مدد فرمائی۔

۱۔ مولانا غلام رسول مہر، مسلم ٹاؤن لاہور۔ ۲۔ مولانا غلام ربانی لودھی۔ سرائے صالح۔ ۳۔ میاں عبدالقیوم صاحب بفہ۔ ۴۔ خان شاد محمد خان ۵۔ خان علی اصغر خان صواتی۔ ساکن سفیدہ۔ حال ایڈووکیٹ مردان۔ ۶۔ میرے مہربان استاد الحاج مرزا غلام یوسف۔ ساکن موڑہ غربی ضلع جہلم۔ ۷۔ خان سردار بہادر خان ترین نے سارے مسودے کو غور سے پڑھا۔ پسند کیا۔ اور دو تین جگہ واقعات کی اصلاح کی۔ اور کہا کہ اس کو ضرور چھپ جانا چاہئے۔

۲۔ "تاریخ ہزارہ" مرتبہ ویسی (WACE) مہتمم بندوبست ہزارہ ۱۸۶۲ء اور ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء

سے بھی کافی مستند حالات معلوم ہوئے۔

۳۔ حیاتِ افغانی۔ مصنفہ محمد حیات خان صاحب ساکن واہ۔ یہ واہ خاندان کے مشہور مورث ہیں۔

۴۔ تواریخ خورشید جہاں۔ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء) مصنفہ شیر محمد خان صاحب گنڈاپور۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان۔

۵۔ پٹھان۔ از سر الف کیرو۔ یہ آغاز عہد پاکستان سے سرحد کے گورنر تھے۔

ان ہر سہ متذکرہ بالا کتابوں سے پٹھانوں کے شجرہ نسب اور قدیم تاریخ کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

۶۔ رؤسائے با اختیار و نامی خاندانِ پنجاب مرتبہ کرنل چارلس فرانسس میسی مطبوعہ ۱۸۹۱ء اس میں عہد انگریزی کے مشہور خاندان و خوانین کے حالات ہیں۔

۷۔ خوشحال خان خٹک۔ مصنفہ دوست محمد خان کامل ایڈووکیٹ پشاور۔ اس میں افغانان ماورائے دریائے اٹک کے ایک دو واقعات جنہوں نے اس ضلع کو موثر کیا۔ معلوم ہوئے۔

۸۔ "کے گوہر نامہ" مصنفہ رائے زادہ دونی چند پر مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کی تنقید۔ مطبوعہ "معارف" اعظم گڑھ۔ صوبجات متحدہ ہندوستان۔ اس میں گکھڑ قوم کے تاریخی حالات معلوم کرنے میں بہت مدد لی۔

۹۔ تاریخ فرشتہ۔

۱۰۔ بابر نامہ (سفرنامہ بابر بادشاہ)
۱۱۔ تاریخ رہتاس (بندوبست رہتاس)
} ان دونوں کتابوں میں گکھڑ قوم کے چند واقعات تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

۱۲۔ الفنسٹن۔ تاریخ سلطنت کابل و ملحقات۔ شائع شدہ لنڈن ۱۸۴۲ء

۱۳۔ تاریخ ضلع جہلم۔ اس میں گکھڑ قوم کے حالات ہیں۔

۱۴۔ منتخب التواریخ۔ مصنفہ ملا عبدالقادر بدایونی

۱۵۔ "تذکرۃ الواقعات۔ جوہر آفتابچی"

اردو ترجمہ از سید معین الحق جنرل سکرٹری و ڈائرکٹر آف ریسرچ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

یہ ہمایوں بادشاہ کا آفتابچی تھا۔ اور ہندوستان کے فرار کے بعد وہ ایران میں بادشاہ کے ساتھ رہا اور پھر واپس ہندوستان آیا۔ اس نے اس عرصہ کے حالات کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔

۱۶۔ میجر راورٹی (RAVETY) کی کتاب "افغانستان کی اقوام"

۱۷۔ ابٹسن کی فرہنگ اقوام و قبائل پنجاب و سرحد

۱۸۔ میرے مسودہ تاریخ کے مکمل ہونے پر مجھے میرے دوست مولانا غلام ربانی لودھی ساکن سرائے صالح کی نشان دہی پر ایک "قلمی فارسی تاریخ ہزارہ" قاضی عبدالمالک صاحب کلرک گورنمنٹ کالج ہری پور سے بذریعہ عزیز عبدالرحمٰن لیکچرار جغرافیہ ہری پور کالج ملی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے یہ کتاب میرے استفادہ کے لئے مجھے عنایت کی۔ جو تقریباً دو ماہ میرے پاس رہی۔ اس کتاب کا نام تاریخ ہزارہ عہد سرکار دولتمدار (سرکار انگریزی) و جنگ خورد برد سنگھاں و دُرّانیاں ہے۔ اس کے لکھنے والا مہتاب سنگھ ہے۔ اس نے یہ کتاب میجر جیمس ایبٹ اور ملھو خان اسسٹنٹ کمشنر کے ایما پر لکھی (غالباً جیمس ایبٹ ہزارہ کے بندوبست کا پہلا مہتمم تھا۔ لیکن ملھو خان کی شخصیت اور اس کے اس ضلع سے تعلق کا حال مجھے معلوم نہ ہو سکا) وہ لکھتا ہے کہ ہزارہ کا پہلے پہل جب بندوبست شروع (غالباً ۵۰-۱۸۴۹ء ہوگا) کرنے کے لئے افسران بالا تشریف لائے تو کچھ مدت کے بعد مصنف کو ہزارہ کی تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا۔ کیونکہ وہ عرصہ دراز سے اس ضلع میں موجود تھا۔ اور کوئی کتاب اس سے پہلے اس ضلع کے حالات پر موجود نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے۔

"میرا نام مہتاب سنگھ قوم کائستھ ساکن مری پور پرگنہ ہوگنی پور موسلی نگر متعلق ضلع کانپور۔ کا ہوں۔ تلاشِ روزگار میں لاہور آیا تو پہلے پہل مہاراج صاحب کنور کھڑک سنگھ کی سرکار میں نوکر ہو گیا۔ اور پانچ سال پرگنہ ساہیواں بلوخاں (جو مدت تک ضلع منٹگمری کے نام سے مشہور رہا۔ اور اب پھر پرانا نام ساہیوال ہو گیا ہے مش ن) میں بہ عملداری دیوان ٹوڈرمل رہا۔ اس کے بعد میرا آب و دانہ یہاں سے اُٹھ گیا۔ تو دس ماہ تک سردار فتح سنگھ جو ملک منکیرہ پر حاکم تھا (منکیرہ ریاست ۱۸۲۲ء کے آخر میں رنجیت سنگھ نے فتح کر لی تھی۔ مش ن) کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد سردار ہری سنگھ کا ملازم ہو گیا اور سمت ۱۸۸۱ بکرمی (۱۸۲۴ء) میں ملک ہزارہ کے دفتر میں مقرر کیا گیا" پھر آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔ "کہ اب تیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ کہ اس ملک میں اپنا وقت گزار رہا ہوں"

اُس کی عبارت فارسی زبان میں کافی ہے۔ اور عربی سے بھی کافی واقفیت رکھتا ہے کیونکہ جا بجا فارسی کے مستند اشعار اور عربی کے مقولے بھی بڑی خوبی کے ساتھ فارسی عبارت میں جا بجا تحریر کرتا ہے۔

یہ ہزارہ کی بڑی مفصل تاریخ ہے۔ سکھوں کے عہد کے حالات کو اس نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ تاریخ ہزارہ کے بہت سے پوشیدہ واقعات پر ایسی روشنی ڈالی ہے کہ باید و شاید۔ سردار ہری سنگھ کے عہد کے واقعات، اور اس کی تمام جنگوں اور خوانین ہزارہ سے کش مکش کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ خانانِ تناول۔ ہندوال و پلال۔ کی آویزش و دیگر حالات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر جو تفصیل اس نے سید احمد شہیدؒ کے آخری معرکہ۔ شہادت، بالاکوٹ۔ پر جس

تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اُس نے مولانا غلام رسول صاحب مہر۔ خاص مورخ سیرت شہیدؒ سے بھی دادِ تحسین حاصل کی اور سید شہید کی شہادت و دفن وغیرہ کے حالات پر پوری روشنی ڈالی ہے۔

۱۸۔ "نگارستانِ کشمیر" از قاضی ظہور الحسن صاحب۔ سیوہارہ۔ ضلع بجنور۔

۱۹۔ مخطوطاتِ قدیمہ۔ عجائب گھر پشاور سے۔ سب پرانے فائل۔ محکمہ امور خارجہ ہندوستان جو مجاہدین اور دیگر امور ضلع ہزارہ سے متعلق تھے۔ ان سے بھی کافی استفادہ کیا گیا۔

۲۰۔ بہت سے رسائل۔ انگریزی و اُردو و اخبارات سے بھی ہزارہ کی تاریخ کے متعلق مواد حاصل کیا گیا۔

۲۱۔ میجر ایبٹ۔ ضلع ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر۔ کی ڈائری۔

میں نے میجر ایبٹ کی چند ڈائریوں (۱۸۴۹ء و ۱۸۵۵ء) کی نقول ۱۹۵۵ء میں محکمہ مخطوطاتِ قدیمہ پشاور سے حاصل کر لی تھیں۔ اور اُن میں درج شدہ مفید معلومات کو اپنے مسودہ میں شامل کر لیا تھا۔

لیکن اوائل ۱۹۶۰ء میں جب کہ میں اپنا مسودہ مکمل کر چکا تھا پتہ چلا کہ میجر ایبٹ کی ڈائری مارچ ۱۸۴۷ء تا جون ۱۸۴۹ء مقبرہ انارکلی کے عجائب گھر واقع لاہور میں زیر تحویل ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت مغربی پاکستان موجود ہے کوشش کر کے اِن کی نقول مجھے اوائل دسمبر ۱۹۶۰ء میں ملیں۔

میجر ایبٹ (اُس وقت یہ کپتان تھا) روزانہ ڈائری کے ذریعے مقامی حالات۔ بلکہ ملحقہ پنجاب کے بھی۔ اور سیاسی واقعات ہزارہ کشمیر و ملحقہ علاقہ جات۔ ریذیڈنٹ لاہور کو بھیجتا رہتا تھا۔ مقامی سکھ افسران فوج و سول، مہاراجہ کشمیر گلاب سنگھ کی ریشہ دوانیوں اور اُن کے انسداد کی تدابیر سے ریذیڈنٹ کو مطلع کرتا رہتا تھا۔ اور اس ضلع کے سیاسی حالات کا جو اثر پنجاب پر ہوتا تھا۔ اُس سے لاہور کو باخبر رکھتا تھا۔ اس کے مشورے صائب، دلیرانہ اور پختہ سیاسی ذہن کے مشورے تھے۔ اہلِ ہزارہ کی سیاست کا ماہر اور نبض شناس تھا۔ اس کے مشوروں سے اور اس کے اپنے مؤثر طریق حکومت سے اہلِ ہزارہ کے دل اپنے قبضے میں کر رکھے تھے۔ گروہ خوانین ہزارہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اعتماد کر سکتا تھا۔ اگرچہ سکھ حکومت کا ملازم اور ناظم ہزارہ کا مشیر تھا، لیکن عملاً وہ ریذیڈنٹ کا نمائندہ برائے سلطنت انگریز تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ماحول میں ہزارہ کا ناظم (دگر رنس) سکھ، افواج حکومت ہزارہ سکھ، اس کی اپنی باڈی گارڈ سکھ سپاہی حتیٰ کہ اس کا منشی سکھ تھا۔ مگر وہ ان سب پر بطور حاکم حکومت کرتا تھا۔ اُس کی اصلی طاقت اقوام ہزارہ کی پشت پناہی اور وفاداری تھی۔ اور اُس نے یہ دعویٰ کیا (یعنی ریذیڈنٹ کو لکھا) اگر سب افواج سکھاں اس کے خلاف ہو جائیں تو وہ ان سب کو اقوام ہزارہ کی امداد سے شکست دے دے گا۔

اِس ڈائری سے اُس عہد کے حالات اور پس منظر پر صحیح روشنی پڑتی ہے۔

میں نے اِس ڈائری سے کافی استفادہ کیا۔

۲۲۔ تحقیق الافغان۔ تحقیقاتِ سمیع المعروف بہ تاریخ پکھلی۔ از سمیع اللہ جان خان۔ ساکن ڈھوڈیال۔ تحصیل مانسہرہ۔ اس میں مفصل شجرے اقوام ہزارہ کے اور خاص کر سواتی قوم کے دیئے گئے۔ ان سے میں نے استفادہ کیا؛

پیش لفظ

مجھے بچپن میں کہانیوں اور قصوں کے سننے کا بہت شوق تھا۔ اور خاص کر خاندانی کارناموں کا جو میرے خاندان کے لئے فخر و مباہات کا کام دیتے تھے۔ ماحول بھی اور زمانہ بھی قومی و خاندانی تعصب کا تھا۔ اور لوگ ایسی کہانیوں اور قصوں کو بڑی رغبت اور خواہش سے دُہراتے تھے اور سُنتے تھے۔ اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے۔ کہ تاریخ کی ابتداء ہمیشہ قصے، کہانیوں اور روایات ہی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کلیہ خاص کر اُن لوگوں کی تاریخ پر زیادہ صادق آتا ہے جو زمانۂ بعید میں گزرے ہوں۔ اور مورخ کے وطن سے دُور ہوں۔ عام لوگ ایسی روائتیں سُننے کے شائق ہوتے ہیں جن سے اُن کی خاندانی برتری و عزت و جاہ کی تشہیر ہو۔ اس لئے میں عمر رسیدہ لوگوں، بڑی بوڑھیوں (خاص کر والدہ مرحومہ) کے پاس گھنٹوں بیٹھ کر اُن سے پُرانی کہانیاں، خاندانی قصے اور شجرہ نسب کے سلسلے بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ سنتا تھا۔ اور کچھ کچھ قلمی یادداشتیں بھی رکھ لیتا تھا۔ اِس شوق میں زیادہ ترقی اُس وقت ہوئی جب میں ۱۹۱۳ء میں مڈل سکول ہری پور میں داخل ہوا۔ میرے ہم جماعت مختلف اقوام کے افراد تھے۔ لہٰذا خاندانی و قومی حالات کی کہانیوں اور قصوں کی طرف اور زیادہ توجہ ہوئی۔ آہستہ آہستہ اپنی قوم کے افراد کے حالات اُن کی کارکردگیاں، اُن کے عروج و زوال، آغاز و انجام کی تحریر کی طرف توجہ مبذول ہوئی اس کام کو بہت تفصیل سے کرنا شروع کیا۔ کام دیر طلب، طویل اور صبر آزما تھا۔ اپنے گاؤں اور خاندان کے حالات بہت مفصل دریافت کئے۔ اور زبانی شجرہ نسب جتنا معلوم ہو سکا۔ تحریر کیا گیا۔ اس کام میں اور توسیع ہوئی۔ اور دیگر دیہاتِ قوم پنّی کے متعلق بھی ان خطوط پر تحقیقات شروع کی۔ اس کام میں آہستہ آہستہ دلچسپی بڑھتی ہی گئی۔ اور قوم پنّی کے کل افراد کا مکمل شجرہ نسب تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر اس کام کی تکمیل کے لئے بزرگوں کی زبانی اور تحریری یادداشتیں نامکمل نظر آئیں۔ لہٰذا اس کام کی تکمیل کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑا۔

۱۹۳۱ء میں میرا تقرر ہری پور سول ہسپتال میں بطور اسسٹنٹ سرجن ہوا۔ اور دس ماہ ہری پور رہا۔ اور تحصیل کے دفاتر چھانے اور جو بھی مفید مطلب کاغذات نظر آئے اُن کو نقل کر لیا گیا۔ اور قوم پنّی کے تمام شجرہ نسب کو مکمل نقل کر لیا گیا۔ ان سب مسودات کے ترتیب دینے کا کام ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک جب میں بنوں میں سول سرجن تھا۔ مکمل کیا گیا۔ تمام دیہات قوم پنّی کے افراد کا شجرہ نسب

موجودہ زمانہ کے افراد کے نام تک مکمل کر کے صاف و خوشخط لکھ کر تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ شاید کبھی طبع ہو سکے۔

اپریل ۱۹۵۲ء میں میری تقرری بعہدۂ سول سرجن ضلع ہزارہ ہوئی۔ اور اپریل ۱۹۵۴ء تک یہاں رہا۔ اس اثنا میں مزید قومی حالات ضلع ہزارہ کے ریکارڈ دفتر سے حاصل کر کے اپنے مسودات کی کمی کو پورا کر دیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ قوم پنّی کی تاریخ مع مکمل شجرہ نسب تحریر کر کے شائع کر دی جائے اور یہ سب کام مکمل بھی ہو گیا۔ لیکن بعد میں جب زاویہ نگاہ، خاندان، قبیلہ اور قوم کے تنگ دائرہ سے بلند ہوا تو اس کام میں دلچسپی کم ہو گئی۔ اور شجرہ نسب خاندانی (جو کہ وقتی فخر و مباہات کا سامان ہے) کی تحریر کا کام چھوڑ دیا۔ کیونکہ سب انسان اولادِ آدم ہیں۔ اور آدم مٹی سے بنا تھا۔ اس لئے ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے انسان میں خاندان و قبیلہ کی تقسیم عزت و آبرو کے لئے کوئی مقصودی شے نہیں جس کسی نے ہمت کی۔ کوشش کی۔ وہ اپنی مراد کو پہنچا۔ جو کاہل رہا نامراد رہا۔ اور یہی بنیاد ہے حاکم و محکوم، معزز و نامراد ہونے کی۔ اور اب یہ محسوس ہوا کہ یہ ایک ایسی محنت نہیں جو تمام تر التفات کی مستحق ہو۔ اگر اس کی بجائے "ہزارہ کی کہانی، تاریخ کی زبانی" مرتب ہو سکے۔ تو ایک مفید علمی کام ہو گا۔ لہٰذا اس کام کے لئے مناسب مواد جمع کرنے کی جستجو ہوئی۔

قارئین کرام کو میرے ان الفاظ سے یہ اثر نہیں لینا چاہئے کہ خاندان و قبیلہ کی تقسیم بہ غرض تنظیم کا میں مخالف ہوں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ انفرادی صحت، ورزش اور ذاتی تموّل کی معتدل کوشش سے زیادہ اہمیت خاندان اور قبیلہ کی اصلاح کو دینی چاہئے۔ اسی طرح بڑھتے بڑھتے اس اصول کی طرف آنا چاہئے۔ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

بہر حال یہ کام ایک صاحبِ علم اور قابل مؤرخ کا تھا۔ اور میں نے تو اپنی زندگی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے اور پھر اس کام میں مشغول رہنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس پر مزید یہ کہ ڈاکٹر کی زندگی کا دائرہ خاص قسم کے علم و عمل ہی کو محیط ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ خواہش اس پس منظر کے ساتھ مطابقت تو نہیں رکھتی تھی۔ لیکن فطری ذوق و شوق اور سالہا کی محنت نے مجبور کیا کہ جس طرح سے ہو اور جب بھی ہو۔ اس کام کو ضرور پورا کیا جائے۔

بہر حال اس کام کا آغاز کر دیا گیا۔ اور دورانِ ملازمت صوبہ سرحد کے تمام اضلاع اور خصوصاً ضلع ہزارہ کے گزیٹر اور دیگر تحریرات مطالعہ کرنی شروع کر دی گئیں۔

آہستہ آہستہ یہ ذوق و شوق بڑھتا ہی گیا اور بہت سی کتابوں سے مفید مطلب معلومات کو نقل کرنا شروع کر دیا گیا۔ تمام میسر مطبوعہ کتابوں اور غیر مطبوعہ مسودات کا بغور مطالعہ کیا گیا۔ برطانوی عہد کی پرانی دستاویزات اور فائل جو کہ پشاور کے عجائب گھر میں زیرِ تحویل "ناظم مخطوطاتِ قدیمہ" (DIRECTOR of ARCHIVES) ہیں ان سب کا مطالعہ کیا گیا۔ اور اُن سے اقتباسات لئے گئے۔

آغازِ کار سے تا اختتامِ ملازمت (یکم نومبر ۱۹۵۶ء) اِن اوراقِ پریشان اور مسوداتِ تاریخی کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ خیال تھا کہ پنشن پر آنے کے بعد اور فراغت کے وقت اِن کو ترتیب دینے اور تاریخ ہزارہ لکھنے کا کام شروع کیا جائے گا۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان سطور (پیش لفظ) کے لکھنے کے وقت تک پورے گیارہ سال گزر چکے ہیں۔ لیکن تکمیلِ کار کے آثار اب بھی نظر نہیں آتے۔ اب بھی نہ فراغتِ قلب میسر اور نہ ہی ہمت۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جب کبھی (عموماً چند ماہ کے بعد) اس کام کا خیال آیا۔ تو اِس طومار کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ قلم اُٹھایا لیکن کام کی اہمیت و گراں باری سے ہار کر پھر کاغذات لپیٹ کر طاقِ نسیاں کے حوالے کر دئیے۔ یہ سلسلہ آج ۱۹۶۸ء تک یوں ہی چلتا رہا۔ تھوڑا تھوڑا یہ کام بھی ہوتا رہا۔ اور کاروباری زندگی یعنی ڈاکٹری کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اور ڈاکٹر کی زندگی معلوم ہے کہ فارغ الوقت اور بے فکر نہیں ہو سکتی ڈاکٹر کو اپنے وقت کی آقائی کبھی میسر نہیں ہو سکتی۔ اِن حالات میں اس سنجیدہ اور غور و فکر کے کام کو کرنا بڑی ہی مشکل بات تھی۔ لیکن یہ کام چلتا ہی رہا۔ اور بقول مولانا حسرت موہانی ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکّی کی مشقت بھی
اِک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

تاریخ تیار کرنے اور معالج کے فرائض ادا کرنے کے دونوں میدانوں میں لڑتا رہا۔ اب جب کہ میں اس تمام ذخیرہ پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ تاریخ ہزارہ میں ایک عجیب خصوصیت نظر آتی ہے۔ اگر مزید تلاش و محنت کی جائے تو وسطی ایشیا کے اقوام کی تاریخ کا عکس ہزارہ کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور تاریخ ہزارہ میں زمانہ قدیم کے ادوار کی تاریخ کی جھلک بھی دکھائی جا سکتی ہے۔

ہندوستان پر بیرونی حملوں کے آغاز سے پہلے جتنے حملے بھی اس ملک پر ہوئے۔ وہ وسط ایشیا سے اور ہندوستان کے شمال و مغربی درّوں کے راستہ سے ہوئے۔ اِن طوفانوں کا رخ گو ہمیشہ ہندوستان کی

مرکز کی طرف ہی رہا۔ لیکن ان کی لہریں ضلع ہزارہ کی ناقابلِ تسخیر چٹانوں سے ٹکراتی رہیں اور لبِ ساحل (یعنی دامنِ کوہ) پر اپنے اثرات اور بقیہ افرادِ قوم کو چھوڑتی جاتی رہیں۔ ان قوموں کے افراد کے موجودہ جائے وقوع سے اقوامِ گزشتہ کے سیلاب کی عصری تاریخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حملہ آوروں کے ہر سیلاب نے اول تو اصلی باشندوں کو اور پھر دوسری اقوام کو آگے دھکیلا اور خود اُن پیشروؤں کے مقامات پر قبضہ جمایا۔ اس سلسلہ کی مختلف کڑیاں ضلع کی شمال مشرقی سرحد کے پہاڑوں سے شروع ہو کر جنوب مغرب میں چھچھ کے میدان تک پھیلی ہوئی ہیں۔

اِن تاریخی واقعات پر مزید طور سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے۔ کہ انسانی تاریخ کے مختلف درجاتِ تہذیب کا عکس بھی ہزارہ کی ان دو انتہائی سرحدوں کے درمیان دیکھا جاسکتا ہے۔ چوپالی و گلہ بانی سے زراعت و تجارت کے درجات کا سلسلہ شمال مشرق کی بلندیوں سے جنوب مغرب کے میدانوں تک بتدریج اُترتا اور پھیلتا ہوا نظر آسکتا ہے۔ جو قومیں پُرانی تہذیب کی حامل تھیں اور اُن کا آبائی پیشہ گلہ بانی اور چوپانی تھا۔ وہ شمال مشرق کی طرف انتہائی سرحد کی جانب دھکیلی جاتی رہیں۔ اور بعد میں آنے والی اقوام جو نسبتاً ترقی یافتہ تھیں سلسلہ وار جنوب مغرب کے میدانوں میں ڈیرے ڈالتی رہیں۔ اس تاریخی حقیقت (یعنی بے شمار قوموں کی آمد) نے لوگوں میں یہ غلط خیال پیدا کر دیا کہ اس ضلع میں ہزاروں اقوام آباد ہیں۔ اور اسی وجہ سے ضلع کی وجہ تسمیہ ہی یہی سمجھی گئی۔

اس پس منظر میں اور اس نظریہ کی تائید میں مزید محنت و تلاش کی ضرورت معلوم ہوئی تو میں نے از سرِ نو زیادہ تحقیق شروع کی۔ اس مقصد کے لئے ضلع کے دفاتر میں بہت پرانے تاریخی مواد کی تلاش شروع کی۔ یہ تلاش اب بھی جاری ہے۔ اور ترتیب و اشاعت میں زیادہ التوا ہو رہا ہے اور دیکھئے کب یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہوتی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

تمہید

کسی صاحبِ علم کا انگریزی مقولہ ہے:-

"WHERE THERE IS NO KNOWLEDGE OF THE PAST

THERE CAN BE NO VISION OF THE FUTURE

ترجمہ:- جہاں ماضی کے واقعات کا علم نہیں وہاں مستقبل کی بلند نظری بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔

انسانی زندگی کے گزرے ہوئے واقعات بیان کرنے کو، اصطلاح میں تاریخ کہتے ہیں۔ علم تاریخ دنیا کی تمام قوموں میں رائج ہے اور سب طبقہ کے لوگ اس سے رغبت رکھتے ہیں اور اپنے خاندان کی سرگزشت کو کہانیوں۔ قصّوں اور حکایتوں کے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ قومی اور نسلی فخر کے قصّے بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اور ان کو سینہ بسینہ بطور مقدس امانت کے اولاد کے حوالے کرتے ہیں۔ اور اپنے نسب و حسب کے مکمل شجرے بڑے انتظام سے یاد رکھتے ہیں۔ اِن ہی حکایتوں اور قصوں سے زمانہ قدیم کی تاریخ سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی حالت وقتاً فوقتاً کیونکر بدلتی رہی۔ مختلف اقوامِ عالم کا آغاز و انجام کس طرح ہوا اور کن واقعات نے قوموں کے عروج و زوال پر اثر ڈالا یعنی تاریخ، مختلف قوموں کے ظہور، آثارِ ترقی، حالات، آداب و رسوم و عقائد اور مشہور لوگوں کے کارنامے بیان کرتی ہے۔ اور جو اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے اُن کے اسباب و نتائج بتاتی ہے۔ فرد سے قبیلہ، قبیلہ سے قوم اور اقوام کے مجموعہ سے عالمِ انسان بنتا ہے۔ اس لئے جس شخص کے سینے میں نوعِ انسان کی خدمت کی تڑپ ہے وہ قوم کی اخلاقی، مادی اور جسمانی و روحانی بہبود کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا اسی طرح اگر کوئی انسان خدمتِ نوعِ انسان کے لئے اپنی ذات کی اصلاح و ترقی اور جسمانی و ذہنی ترقی کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی نیت کی برکت سے محبِ انسانیت شمار ہو گا اور جو شخص ذاتی اقتدار کے لئے اور حیوانی خواہش کے لئے کوشش کرے گا وہ اپنی پست ذہنیت و ارادہ کے لحاظ سے پست ہو گا۔ ورنہ فرد کی اصلاح و ترقی بجائے خود مکروہ نہیں بلکہ پسندیدہ امر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے بعض افراد کو جو عبادت اور نماز کے لئے راتوں کو بہت جاگتے تھے۔ ان سے فرمایا:- خدا نہیں تھکے گا تم تھک جاؤ گے۔ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ (تیری جان کا حق ہے) یعنی یہ کہ صوم و صلوٰۃ اور ذکر و فکر و عبادت میں ایسا اعتدال اختیار کرو کہ بدنی صحت پر زوال نہ آئے، اِلّا ماشاءَ اللہ۔ ذات کی اصلاح، تعلیم، صحت، قوت کے لئے کوشش کرنے والا قبیلہ کا دوست ہے۔

کیونکہ مفید اور شریف افراد کے مجموعے سے بہادر اور شریف قبیلہ بنتا ہے۔ اسی طرح بہادر، شریف اور نیک نام اور خوش اعمال قبیلوں کے مجموعہ سے باوقار قوم بنتی ہے۔ اور اچھی اقوام کے مجموعہ سے وہ عالمِ انسانی بنتا ہے جنہیں خالقِ کائنات نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ اور قیامت اس وقت برپا ہوگی جب نیک آدمیوں سے زمین خالی ہوجائے گی۔ اور اللہ کا نام پکارنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے ماضی کے واقعات کا علم چاہئے کیونکہ ماضی کے حالات کے علم سے انسان مستقبل کے حالات سے آگاہ اور حوادث کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ ہوسکتا ہے۔

اس حقیقت کو نظام الملک طوسی نے اپنے بیٹے کو خطاب کرتے وقت، ان الفاظ میں بیان کیا۔

"تاریخ کو تدابیرِ ملکی میں بہت کچھ دخل ہے۔ کیونکہ عالمِ اسباب میں کبھی کسی نئے واقعہ کا ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی ہوتا ہے جو بارہا ہوچکا ہے۔ اور جس کے نظائر موجود ہیں۔ اور چونکہ پچھلے واقعات پڑھے ہوئے، سمجھے ہوئے، سُنے ہوئے ہوتے ہیں کہ فلاں کام کا خاتمہ یوں ہوا تھا۔ اور جب کوئی ایسا ہی معاملہ سامنے آجاتا ہے تو یقین رکھو کہ اس کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا"۔

عبرت کے لئے تاریخ آموزی ضروری ہے۔ یہ قوم کو آگاہ کرتی ہے۔ کہ کن حالات میں عروج و زوال لازم آتا ہے۔ قرآنِ کریم نے تاریخ اقوامِ عالم سے نصیحت پذیری کی طرف توجہ دلائی۔ اس حقیقت کو مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قلمِ اعجاز رقم سے اس انداز سے تحریر فرمایا:۔

اصل یہ ہے کہ انسان ماضی کو کسی مقدس دیوتا کی طرح پوجتا تو ضرور ہے۔ مگر اُس کے افسانوں کو یاد رکھنے کی بہت کم پرواہ کرتا ہے۔ اُس کی اصلی مشغولیت زمانہ حال میں ہوتی ہے۔ وہ صرف موجود اور حاصل ہی کا متلاشی رہتا ہے۔ البتہ مستقبل بھی اُس کے لئے دل کش ہے کیونکہ انسان کی دلفریب اُمیدیں اور سرمست آرزوئیں مستقبل کے ہاتھ میں ہیں اور اس مخلوقِ غفلت و فراموشی کے لئے اُمیدوں کا وجود اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ بسا اوقات زمانہ حال کی موجود و حاصل مشغولیتوں کو بھی بھُلا کر صرف مستقبل ہی کی حسرتوں میں اپنی پوری عمریں بسر کر دیتا ہے۔

لیکن انسان کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے۔ مستقبل پر اُسے اختیار نہیں اور حال بھی ماضی کا جانشین اور اُس کے ترکے کا وارث ہے۔ پس اس کے لئے جو کچھ سرمایہ فلاح و مراد ہے۔ وہ صرف ماضی ہی کی یاد اور اُس کے نتائج و عبرت کے درس و بصیرت میں رکھا گیا ہے۔ اسی لئے نوعِ انسانی کی سب سے بڑی کتاب ہدایت نے بار بار واقعاتِ گزشتہ، تاریخ حوادث اور سوانحِ ماضیہ کے یاد رکھنے، سوچنے، اور سمجھنے کی وصیت کی: (۱) قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۲) أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ"

البلاغ جلد چہارم

صحیح تاریخ سے عبرت ہوتی ہے۔ عام تواریخ چونکہ غلط قصوں سے لبریز اور حکمت سے خالی ہوتی ہیں۔ لہذا وہ تاریخ کا صحیح مقصد پورا کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ سب اقوام کی تاریخ قصوں اور روایات سے شروع ہوتی ہے۔ خاص کر اُن اقوام کی تاریخ میں یہ عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے جو لکھنے والوں سے زمانہ کے لحاظ سے یا جغرافی لحاظ سے بہت دُور ہوں۔

اس لئے میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہزارہ کی تاریخ کے قصوں اور روایات کی پوری چھان بین ہو۔ اور تاریخی واقعات نکھر کر سامنے آجائیں۔ جس سے تاریخ کا صحیح مطلب پورا ہو اور پڑھنے والوں کے لئے مفید بھی ہو۔ سامانِ عبرت بھی ہو اور سبق آموز بھی ہو۔

ہزارہ کی وجہ تسمیہ

سب سے پُرانا نام جو کتبِ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ اِس خطۂ زمین کو ابی سماریز (ABISARES) کے مُلک سے معنون کرتا ہے۔ ابی ساریز اس علاقہ کا حاکم تھا۔ اور سکندرِ اعظم کے حملے کے وقت (۳۲۶ ق م) میں یہاں حکمران تھا۔ یہ ابی ساریز (ابی سارا) پونچھ کا راجہ تھا۔ اور سکندرِ اعظم ہی نے ہزارہ بھی اُس کو دے دیا تھا۔

ڈاکٹر آرل سٹائن کے خیال میں ہزارہ اُرسا (URASA) ہے اور رش اسی سے مشتق ہے اور اب بھی ایبٹ آباد، مانسہرہ سڑک کے علاقہ کو میدان رُش کہتے ہیں۔ یہاں پر بے اختیار اسلام کی جہانگیری کا ایک تواریخی واقعہ تحریر کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا۔ جو مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب "ہزار سال پہلے" (ص ۴۶-۴۷) میں تحریر کیا ہے۔

"بزرگ بن شہریار نے ابو محمد الحسن بن عمر بن حمویہ کے حوالہ سے ایک طویل روایت درج کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک راجہ جو کشمیر (بالائی) اور کشمیر اسفل (یعنی شمالی ہزارہ - ش ب) کے درمیان کے علاقہ کا راجہ تھا۔ اُس نے ۲۷۰ھ میں منصورہ کے امیر عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز کے پاس خط لکھا کہ اُس کے پاس ایک ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو شریعتِ اسلام کے احکام ہندی زبان میں بیان کرسکے۔ منصورہ کے امیر نے ایک مسلمان کو بھیجا جس کے متعلق لکھا ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کو جانتا تھا۔ راجہ کے پاس یہ مسلمان چند سال رہا۔ اور راجہ کو اسلام سے پورے طور پر واقف بنا دیا۔ اسی سلسلہ میں اس کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ کہ راجہ نے اُس سے

سے خواہش ظاہر کی کہ ہندی زبان میں اُس کے لئے قرآن کی تفسیر لکھے۔ اسی کا بیان ہے کہ اس نے سورۂ یٰس تک "قرآن کی تفسیر ہندی زبان میں پوری کر دی تھی"۔

اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں خورشید اسلام کی کرنیں اس علاقہ پر پڑ رہی تھیں وہاں مسلمانوں کے علم اور ذوقِ تبلیغ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

وجہ تسمیہ

تاریخ ہزارہ مصنفہ ولیس صاحب میں تحریر ہے۔ کہ اس علاقہ میں قوم تُرک معروف بہ نام ہزارہ قارلغ جو خاص کر میدان ہری پور پر قابض تھے لہٰذا یہ میدان ہزارہ قارلغ مشہور ہے۔ اور بقیہ اِن ترکوں کا میدان پکھلی میں شاہنشاہ جہانگیر کے وقت میں موجود تھا۔ اور اب ان کی اولاد موضع گیرڈال (نزد بفہ) میں موجود ہے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ علاقہ اُن ترکوں کے نام سے مشہور ہے جن کو امیر تیمور نے خود یہاں چھوڑا جیسا کہ آئینِ اکبری ص ۴۸۷ جلد دوم کے اقتباس ذیل سے ظاہر ہے:۔

"سرکار پکلی۔ درازا سی و پنج کروہ و پہنا بست و پنج کروہ، خاور رویہ کشمیر شمالی کتور، جنوبی بُنگاہ اُلوس گکھر (گکھڑ) باختر سوا اٹک بنارس۔ صاحبقرانی چندے را بپاسبانی گذاشتہ بودند۔ امروز از نژاد آں ..... بہ کوہستان رو ہموارہ برف بارد و بدشت گاہ گاہ سرما زگرما افزون۔ و آویزش ابر ہند آسا۔ از سہ دریا فیض برگیرند۔ کشن گنگ، بہت (جہلم) سندھ۔ زبانِ ایں دیار نہ بکشمیر ماند و نہ بہ ہندوستان و نہ بزابلستان۔ نخود و جو بیشتر شود۔ و زردآلو، و شفتالو۔ و چہار مغز خود رہ باشد۔ و میوہ کشتن رسم نہ بود۔ جانور شکاری، اسپ، شُتر، و گاؤ میش میانہ۔ مرزبان اینجا بکشمیر نیائش گری کردے"۔

ترجمہ:۔ سرکار پکھلی۔ طُول پچاسی کوس۔ عرض پچیس کوس۔ مشرق کشمیر۔ شمال کتور (گلگت چترال) جنوب قوم گکھڑ کا وطن۔ مغرب اٹک بنارس صاحبقران (امیر تیمور) نے اس علاقہ کی حفاظت کے لئے کچھ آدمی یہاں چھوڑے تھے۔ اُن کی اولاد آج بھی موجود ہے۔ اس کے پہاڑوں پر ہمیشہ برف برستی ہے۔ اور صحرا (میدان) کبھی کبھی سردی کا موسم گرمی سے زیادہ۔ بارش ہندوستان کی مانند ہوتی ہے۔ اس علاقہ کو تین دریا سیراب کرتے ہیں۔ کشن گنگ۔ بہت (جہلم یعنی اس کا معاون کنہار) اور دریائے سندھ۔

اس وطن کی بولی نہ کشمیر سے ملتی ہے اور نہ ہندوستان سے اور نہ ہی زابلستان (علاقہ خوست۔ گردیز جنوبی افغانستان یعنی پشتو سے)

اس علاقہ میں چنا اور جو کثرت سے ہوتے ہیں۔ خُرمانی، آلُو، اور اخروٹ خود رو (یعنی جنگلی) ہوتے ہیں یہاں میوہ کاشت کرنے کی عادت نہیں۔ شکاری جانور، گھوڑا، اونٹ اور بھینس درمیانہ قسم کے ہوتے ہیں اس علاقہ میں مُرغ بہت ہیں۔

عموماً اس علاقہ کا حاکم کشمیر کا باجگزار رہا ہے"۔

بارھویں صدی عیسوی میں ترکوں کی آبادی وسط ایشیا میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ بے حد سادہ اور بہادر تھے۔ اس زمانہ میں فوجی افسروں کے عُہدے سپاہیوں کی تعداد سے ہوتے تھے مثلاً پنج ہزاری ہفت ہزاری وغیرہ۔ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ (یا ہزارہ) جس علاقہ سے لیا جاتا تھا۔ اُسے عموماً اُسی علاقہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اسی طریقہ سے وہ ہزار سپاہیوں کا دستہ جو قوم قارلغ سے تھا۔ اُس کو امیر تیمور نے اس علاقہ میں متوطن کر دیا جس کے نام پر یہ علاقہ ہزارہ قارلغ مشہور ہوا۔ اور مرورِ زمانہ سے صرف ہزارہ رہ گیا۔

امیر تیمور کی آمد آخر ۱۳۹۸ء میں ہوئی تھی اور یہ علاقہ اس سے بعد ہزارہ قارلغ مشہور ہوا۔

تُوزک بابری میں بھی ہزارہ کا نام ہزارہ قارلق درج ہے۔ بابر لکھتا ہے:۔ "نیلاب اور ہزارہ قارلق ہمایوں کو جاگیر میں دیئے"۔ اور جب وہ ہاتھی گکھڑ پر ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں فتح پا کر کابل کو جا رہا تھا۔ اس موقع پر لکھتا ہے کہ "ہمایوں کے ملازم قارلوق کے ملک مرزا ملوئے قارلوق تیس چالیس آدمیوں سمیت حاضر ہوا۔ اور دلہ زاک افغانوں کا لشکر بھی آیا"۔

سرجن میجر بیلیو (BELLEW) کتاب "افغانستان کی اقوام" میں لکھتا ہے:۔ "یہ کہا جاتا ہے کہ چنگیز خان نے افغانستان میں اپنی فوج کے دس ہزار کے دستہ سے نو دستے ہزارہ (کابل) میں چھوڑے اور ایک ہزار کا دستہ دریائے سندھ سے مشرق کے علاقہ پکھلی میں چھوڑا۔ جب کہ وہ خود موسم سرما سوات میں گزار رہا تھا۔ یعنی یہ ایک دستہ اس طرف کی حفاظت کے لئے تھا۔ جب کہ وہ تمغاج کو جانے سے پہلے ہندوستان کے راجہ سے اُس کے علاقہ سے گزرنے کی اجازت کے جواب کا انتظار کر رہا تھا"۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ منگولوں کا پہلا حملہ ۱۲۲۱ء میں التمش کے عہد میں ہوا۔ ہزارہ (پکھلی) میں ترکوں کی موجودگی اسی وقت سے تھی۔

دوسرا حملہ ۱۲۴۱ء میں بہرام شاہ کے عہد میں ہوا جس میں لاہور فتح ہو گیا۔

عہد بلبن میں تیسرا حملہ ۱۲۶۹ء اور چوتھا ۱۲۸۵ء میں ہوا۔ اِن حملوں سے منگول دریائے سندھ اور دریائے جہلم کے درمیانی علاقہ پر قابض ہو گئے۔ ۹۷-۱۲۹۶ء میں منگول جالندھر تک بڑھ آئے۔ لیکن پسپا ہو گئے۔

۱۲۹۹ء میں اُنہوں نے سیدھا دہلی کا رُخ کیا۔ کچھ عرصہ شہر کا محاصرہ رکھا۔ شہر کو فتح نہ کر سکے۔ لیکن ارد گرد کے علاقہ میں لوٹ مار کی۔

۱۳۰۶ء میں ملتان کے قریب دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن پسپا ہوئے منگولوں کے کل بارہ حملے ہوئے۔ سندھ پنجاب اور بلوچستان ان حملوں کی زد میں آئے۔

ان کے بعد تیموری حملے شروع ہوئے۔ تیمور نے میدان ہری پور میں (اغلباً) ہزارہ قارلق کی ایک منگ (ایک ہزار سپاہی) اپنے ہم قوم ترکوں کی جو پہلے سے یہاں موجود تھے کی حفاظت کے لئے چھوڑی تاکہ اُن کا دست و بازو بنے۔

تزک جہانگیری میں پکھلی کا ذکر ان الفاظ میں ہے:۔

عرض ۲۵ کروہ (کوس)، طول ۳۵ کروہ۔ حدِ مشرقی کوہستان کشمیر۔ حدِ شمالی لکھنور۔ حدِ جنوبی گکھڑ دخل زمینداری اس وقت سلطان حسین کا ہے۔

موضع دھمتوڑ کا زمیندار اکبر بادشاہ کے وقت شاہ رُخ تھا۔ اور اب اس کا پسر بہادر ہے۔ بہادر و سلطان حسین باہم خویشی رکھتے ہیں۔ اُن کی زبانی پایا جاتا ہے۔ کہ جب امیر تیمور گورگان فتح کر کے ہندوستان واپس ہوئے تو اُن کے بزرگ ان کے پار کاب تھے۔ اُن کو اس مقام پر چھوڑ کر یہ مقام عنایت فرمایا۔ اور ذات اپنی قارلغ بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ بزرگ اُن کا کون تھا۔ اور کیا نام رکھتا تھا۔ ..... سلطان حسین ستر برس کی عمر کا ہے ...."

مندرجہ بالا تاریخی حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے۔ کہ اس ضلع کا نام ہزارہ۔ ترک قوم کے قبیلہ ہزارہ قارلغ سے ہوا۔ چونکہ قارلغ ترک میدان ہزارہ (ہری پور) ہی میں پہلے آباد ہوئے تھے اس واسطے یہ میدان ہری پور ہی اصلاً ہزارہ ہے۔ عہدِ مغلیہ، دُرانی اور سکھوں کے عہد میں اس میدان کو ہی ملک ہزارہ لکھا جاتا رہا۔ باقی اطرافِ ضلع کو ملک پکھلی، ملک تنول وغیرہ لکھا جاتا رہا۔ اگرچہ عموماً یہ سب علاقے ہزارہ کے نام کے تابع ہی سمجھے جاتے رہے۔ اب بھی تحصیل مانسہرہ و ایبٹ آباد کے لوگ ہری پور میدان کو ہزارہ بولتے ہیں۔

ہزارہ

تاریخ کے مختلف ادوار میں

قدیم تاریخ ۔ اس ضلع کا پرانا نام یا اس کے ایک حصہ کا نام اُراشہ تھا اور جس کی یاد اب بھی

"ارشس کا میدان" کے نام سے موجود ہے۔ اغلباً یہ مہابھارت کا اُراگہ ہے۔

۲۲۶ - ۳۲۷ ق۔م بطلیموس اپنے جغرافیہ جلد ۷ حصہ اول اس ضلع کو دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان کا حصہ بتاتا ہے اور اس کا بادشاہ سکندرِ اعظم کے حملہ پنجاب کے وقت ارسیکز (ARSAKES) تھا۔ یہ ضلع سکندرِ اعظم کے ٹیکسلا جانے کے راستہ سے ہٹا ہوا تھا۔ اور ٹیکسلا کا عظیم شہر اس ضلع کی سرحد پر تھا۔ اس ضلع نے بھی سکندرِ اعظم کی اطاعت قبول کر لی تھی۔

سکندرِ اعظم کے بعد چندر گپت نے ٹیکسلا پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ہزارہ صوبہ ٹیکسلا کا ایک حصہ تھا۔ چندر گپت کا پوتا اشوکِ اعظم اس خطہ کا خود گورنر رہا۔ اور جب وہ ۲۷۲ ق م میں بادشاہ بنا تو اپنی یادگار چند کتبے جو پتھروں پر مانسہرہ کے نزدیک اب تک موجود ہیں۔ کندہ کرائے۔ یہ پتھر بریڑی پہاڑ کی چوٹی پر زیارت کو جانے والے راستہ پر تھے۔ ان پتھروں پر بدھ مت کی تعلیم کے اصول کندہ ہیں۔

راجہ رسالو

اس ضلع میں راجہ رسالو کے متعلق بہت مشہور روایات ہیں اس کے متعلق عوامی گیتوں کا بھی کافی حصہ اب تک موجود ہے۔ جن سے اس کے مختلف تاریخی کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔

راجہ رسالو راجہ سالباہن کا بیٹا تھا۔ راجہ سالباہن نے اب سے تقریباً دو ہزار سال پہلے شمالی ہند کے ساکا حملہ آوروں کو شکست دے کر سیالکوٹ میں اپنی سلطنت قائم کی۔ اُس کے باپ کی حکومت راولپنڈی کے علاقہ تک قائم تھی۔ اُس کا بیٹا رسالو قسمت آزمائی کے لئے شمالی سرحد کی طرف نکلا۔ راجہ سرکپ (ٹیکسلا) سے بھی نبرد آزما ہوا۔ وہاں پر کھنڈرات میں وہ مقام بھی دریافت ہوا جس جگہ راجہ رسالو نے راجہ سرکپ کے ساتھ چوپڑ کا کھیل کھیلا تھا اور ستر حسین و جمیل دوشیزاؤں کو اپنی بہادری سے مرعوب کیا تھا۔ ایک گیت ہے کہ راجہ سرکپ کی ایک رانی رسالو سے کہتی ہے ؎

نیلے گھوڑے والیا، نیویں نیزے آ
اگے راجہ سرکپ ہے، سر کپسی اوہ لاہ
بھلا چاہیں اپنا، تاں پچھے ای مُڑ جا

ترجمہ:۔ نیلے گھوڑے والے اپنا نیزہ جھکا کر آ۔ آگے راجہ سرکپ بیٹھا ہے جو تیری گردن کاٹ لے گا اگر اپنا بھلا چاہتا ہے تو پیچھے کی طرف مُڑ جا۔

تو جواب دیتا ہے :-

ڈوروں بیڑا چکیا ایتے فتح آئے

سرکپ وا سر کٹ کے، ٹوٹے کرساں چار

تینوں بناساں ووہٹڑی، میں بنساں مہاراج

ترجمہ:- میں دُور دراز سے آیا ہوں۔ میں نے جیت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ میں راجہ سرکپ کا سر کاٹ کر اس کے چار ٹکڑے کردوں گا۔ پھر تجھے دُلہن بناؤں گا۔

لڑکی کو رسالو سے پیار ہوگیا۔ وہ راجہ سرکپ کے پاس جاکر کہنے لگی۔ ؎

اک جو آیا راجپوت کردا مارو مار

تینوں راجہ مارکے، ساتوں کھڑسی نال

ترجمہ:- ایک راجپوت بڑے زور شور سے آرہا ہے۔ راجہ۔ وہ تمہیں ہلاک کردے گا اور مجھے ساتھ لے جائے گا۔

راجہ سرکپ کو اپنی طاقت پر ناز تھا۔ وہ بولا ؎

چھوٹی نگری دا واسکن، رانی وڈی کرے پکار

جد میں باہر نکلاں تاں

میری تاں نچاوے ڈھال

فجرے روٹی تاں کھاساں، سر لیساں اُتار

ترجمہ:- رانی! کیا باتیں کررہی ہو؟ ایک چھوٹی سی نگری کا باسی آیا ہے۔ اور تم اتنی چیخ پکار کررہی ہو میں ایک دفعہ باہر نکلا تو میری ڈھال ہی اسے نچائے گی۔ میں صبح سویرے اُس کی گردن کاٹوں گا اور پھر روٹی کھاؤں گا۔

راجہ سرکپ کا سر کاٹ کر رسالو نے اُس کی رانی کوکلاں کو ساتھ لیا۔ اور مورتی کے پہاڑوں کی طرف چلا گیا جو راولپنڈی کے جنوب مغرب میں واقع ہیں۔

راولپنڈی اور ٹیکسلا کے درمیان ایک مقام سنگ جانی آتا ہے۔ اس کا بھی ذکر عوامی گیتوں میں ہوتا ہے اور راجہ ہودی کا بھی۔ جس کا دارالحکومت ہودی نگر اٹک کے جنوب میں دریائے سندھ پر واقع تھا۔ اسی سے راجہ ہودی کے باپ راجہ انگی مل کا سُراغ ملتا ہے جس کی سلطنت اٹک سے جلال آباد (افغانستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔

ضلع ہزارہ میں راجہ رسالو کے متعلق بہت مشہور روایات ہیں۔ اور اس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی

کا بیان ہوتا ہے۔ علاقہ کنڈی کاہل میں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ روایت کے مطابق یہ پتھر اس کی فوج نے جمع کئے تھے۔ سربن پہاڑ (ایبٹ آباد) میں اُس کا غار جہاں وہ شکار کے دوران آرام کیا کرتا تھا اب تک موجود ہے۔ گندگر پہاڑ میں اُس نے راکشسوں (دیوؤں) سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ ایک دن جب وہ میدان رجوعیہ میں سو رہا تھا تو اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی جو گندگر کے پہاڑ میں تھی۔ ایک دیو سے محبت کے انداز میں راز و نیاز کررہی تھی۔ رانی نے ایک مینا اور ایک طوطا پال رکھے تھے۔ اُس رانی اور دیو کی یہ حرکات اُن کو پسند نہ آئیں۔ مینا نے رانی کو ملامت کی۔ اس پر رانی نے مینا کی گردن مروڑ دی۔ وہ وہاں مرگئی۔ طوطا یہ حال دیکھ کر اڑ گیا اور رجوعیہ میں آکر اپنے پَر دریائے دوڑ کے پانی میں ڈبو کر سوئے ہوئے راجہ رسالو کے چہرہ پر پانی چھڑکا۔ جس سے راجہ جاگ پڑا۔ طوطے نے اس کی بیوی کی بے وفائی کا قصہ اُس کو سنایا۔ یہ سنتے ہی راجہ رسالو اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر سیدھا گندگر پہنچا۔ اس کے گھوڑے کے سموں کے نشان اب بھی نارا سیدخانی (نزد موضع واڑی کھلابٹ) کے نالہ میں موجود ہیں۔ اس نے بیوی اور دیو کو محبت کرتے دیکھ لیا۔ بیوی کو وہیں قتل کردیا۔ لیکن دیو بھاگ کر ایک غار میں چلا گیا۔ راجہ دوڑ کر غار کے منہ پر پہنچا۔ لیکن دیو اندر جا چکا تھا۔ راجہ نے غار کا منہ ایک پتھر سے بند کر دیا۔ اور اندر کی طرف اپنے تیر سے پتھر پر اپنی تصویر جس میں اُس نے کمان پر تیر چڑھایا ہوا نقش کیا تھا بنا دی۔ جب کبھی وہ دیو باہر آنے کی کوشش کرتا۔ تو راجہ رسالو کی تصویر دیکھ کر شور کرتے ہوئے واپس غار کے اندر دوڑ جاتا تھا۔ لوگ عام روایت کرتے ہیں کہ بہت مدت تک گندگر پہاڑ سے ایک خوفناک آواز وقفہ سے سنائی دیتی رہتی تھی۔ میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق یہ انیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں تک یہ آواز لوگوں نے اُس سے بیان کی۔

اس واقعہ کی تصدیق تزک جہانگیری[1] سے بھی ہوتی ہے۔ جہانگیر کے دورہ ہزارہ و کشمیر کے متعلق درج ہے "جہانگیر بگلی (پکھلی) اور دھنتوڑ (دھمتوڑ) کے راستہ کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔ حسن ابدال میں دو دن قیام کیا۔ اس منزل گاہ میں ایک بہتا ہوا چشمہ، ایک آبشار اور ایک نہایت نفیس حوض موجود ہے۔

سلطان پور میں پڑاؤ ڈالا جو حسن ابدال سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس علاقہ کے لوگوں سے سننے میں آیا کہ برسات کے دنوں کے بعد جب آسمان پر بادلوں کا نام و نشان اور بجلیوں کے کوئی آثار

---

[1] تزک جہانگیری اردو ص ۵۹۵۔

نہیں ہوتے کبھی کبھی نزدیک کے پہاڑ (گندگر) سے بادلوں کی گرج جیسی آواز نکلتی رہتی ہے جس کی وجہ سے اس پہاڑ کا نام گرج رکھا گیا ہے۔ یہ آواز پہاڑ سے سال دو سال کے وقفہ کے بعد نکلتی ہے۔ میں نے یہ بات حضرتؒ کی زندگی میں اُن کی محفلوں میں بھی متعدد مرتبہ سنی تھی۔ چونکہ عجائبات سے خالی نہیں۔ اس لئے تحریر کر دی۔ صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔

نوٹ:۔ جہانگیر تخت نشینی کے چودھویں سال اول اول کشمیر آیا۔

ساتویں سے بارھویں صدی عیسوی تک

چینی سیاح ہیون سانگ جو اس ملک میں ساتویں صدی عیسوی میں آیا۔ اس نے ہزارہ کا نام بہ حیثیت ملک وُو۔ لا۔ شی کے کیا ہے۔ اور اس کو کشمیر کے ماتحت اور اس کے شمال مغرب میں بیان کیا ہے اس علاقہ کا دارالسلطنت مانگل تھا۔ جو مانگل ندی پر واقع تھا۔ اس وقت اور بعد میں بھی مانگل ایک بڑا شہر تھا۔ اگرچہ وہ شہر اب نابود ہوگیا ہے۔ پھر بھی اُس کی دیواروں کے نشانات اب بھی موجود ہیں ہیون سانگ سے صدیوں بعد اُراشہ کی سلطنت (یعنی ہزارہ موسوم بہ رش) کا تعلق کشمیر سے رہا۔ اس کی تصدیق کلہانا کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ کہ بادشاہ شنکرا ورمان جب ۹۰۲ء میں اس ملک سے گزر رہا تھا۔ تو باشندگانِ ہزارہ نے اُس پر حملہ کر دیا۔ اور ایک تیر جو پہاڑ کی چوٹی سے اس پر پھینکا گیا۔ وہ اس کی گردن میں لگا۔ یہ ضرب مہلک ثابت ہوئی۔ اور جب وہ اپنی فوج کے ساتھ واپس کشمیر جا رہا تھا۔ تو راستہ ہی میں مرگیا۔ لیکن اس کی موت کو فوج سے اُس وقت تک پوشیدہ رکھا گیا جب تک وہ وادی جہلم میں نہ پہنچی۔ اس کے بعد کلہانا لکھتا ہے کہ ۱۰۶۳-۱۰۸۹ء میں کلاشا بادشاہ کشمیر نے اس ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور بعد میں ہزارہ کا راجہ ابھیایا بمعہ دیگر ماتحت راجاؤں کے مہاراجہ کلاشا کے دربار میں حاضر ہوئے۔ راجہ ابھیایا کی بیٹی مہاراجہ ہرسا کے بیٹے بھوج سے بیاہی گئی۔

اس کے بعد ۱۱۱۲-۱۱۲۰ء مہاراجہ شسالا نے اور شہ پر حملہ کیا۔ اور خراج مقرر کیا۔ ۱۱۲۸-۱۱۴۹ء مہاراجہ ڈیوٹیانے وائی اور شہ کو شکست دی۔ اس کے ساتھ کلہانہ لکھتا ہے۔ اینو گرہ پورہ (بقول بطلیموس اور شہ اور بہ تحقیق ڈاکٹر سٹائن موجودہ اگرور) جو ایک مضبوط قلعہ تھا۔ مہاراجہ ڈیوٹیا نے فتح کر لیا۔ اس علاقہ میں پُرانے قلعوں کے جابجا آثار جن کے متعلق روایات ہیں کہ جنوں نے طاقتور رانیوں کے حکم سے بنائے مثلاً دریائے اترن کے کنارے موضع سوہا (بیڑ کے نزدیک) اور دریائے کنہار اور جہلم کے اتصال پر موضع پٹن والے قلعے۔ ان روایات سے مزید واضح ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر ہندوؤں کا راج رہا۔

تاریخ اقوام ہزارہ

پُرانے زمانہ میں دوآبہ دریائے سندھ و جہلم بمعہ پنجاب راجگانِ ہند کے ماتحت تھا۔ اور اس علاقہ میں موجودہ جگہوں کے سنسکرت نام اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً گندگر (علاقہ تارخیلی میں) مہابن (جدون علاقہ میں) مانسہرہ۔ مانک رائے۔ راجکوٹ (گندگر پہاڑ جس کو تارخیلی کافرکوٹ کہتے ہیں) راجدھان رانی واہ (علاقہ خانپور) اور اوگی اوگرہ (تحصیل مانسہرہ) علاقہ خانپور سے جب خاتمہ ہندو راجگان کا ۵۶ء میں ہوا تو اُس کے بعد سے دخل قوم گکھڑ کا پایا جاتا ہے۔ جلال الدین اکبر بادشاہ اور جہانگیر بادشاہ کے وقت علاقہ ڈھونڈ و کڑرال بھی گکھڑوں کے علاقہ میں شامل تھا۔ اور رجوعیہ کا علاقہ داخل کڑرال ہو کر گکھڑوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ اور علاقہ خانپور، دناہ، ناڑہ، بکوٹ بوئی متعلق فتح پور بابری (موجودہ راولپنڈی) گکھڑوں کے زیر حکومت تھا۔ اور صوبہ لاہور سے متعلق تھا۔ اور ہزارہ جس میں ظاہرا علاقہ جات ترین، ترک، دلازاک و شنگڑی، اُتمان زئی وغیرہ شامل تھے۔ اٹک بنارس سے متعلق کر رکھا تھا۔ گویا ہزارہ کے تین ٹکڑے تھے۔

پہلا ٹکڑہ۔ ضمیمہ صوبہ کشمیر۔ سرکار پکھلی بمعہ علاقہ دھمتوڑ (جدون) و تناول

دوسرا ٹکڑہ۔ متعلق صوبہ لاہور۔ پرگنہ فتح پور بابری یعنی راولپنڈی (علاقہ گکھڑ، خان پور دناہ۔ ناڑہ۔ بکوٹ بوئی)

تیسرا ٹکڑہ۔ متعلق دوآبہ سندھ ساگر علاقہ اٹک پرگنہ ہزارہ۔ علاقہ جات ترین، ترک، دلازاک شنگڑی۔ اُتمان زئی وغیرہ۔

۱۵۵۶ء سے ۱۷۳۳ء تک ایام سلطنت چغتائی میں تو یہ صورت رہی اور خراج ہائے مقررہ وقت پر سلطنت میں ادا کرتے رہے۔ پھر جب ۱۷۳۶ء میں نادر شاہ کا غلبہ ہو کر یہ ملک اُس کی حکومت کے متعلق ہوگیا۔ تو اس وقت بھی ایسا ہی حال رہا۔ حکومت نادر شاہ سے احمد شاہ دُرانی کو نصیب ہوئی۔ اور چونکہ وہ پٹھان تھا۔ لہذا اس ملک میں قوم افغان کا زیادہ غلبہ ہوگیا۔ پکھلی میں سواتی اور رجوعیہ، دھمتوڑ وغیرہ میں جدون، اور علاقہ جات تناول متعلقہ پکھلی میں تنولی آگئے۔ اور گکھڑ بھی کچھ کمزور ہوئے، ڈھونڈ اور کڑرال نے بھی ایک قسم کی آزادی اُن کی حکومت سے پیدا کر لی، رفتہ رفتہ صورت کے ملک کی تفصیل قوم وار حسب ذیل ہوگئی۔

۱۔ تارخیلی۔ گکھڑی و گندگر۔

۲۔ مشوانی۔ سری کوٹ
۳۔ اتمان زئی۔ تربیلہ و خالصہ
۴۔ تنولی۔ کولائی۔ بدہنک۔ کچھی۔ ببرہان۔ شیروان۔ گھڑیال۔ شنگڑی
۵۔ اقوام متفرق میدان ہزارہ
i۔ ترین۔ جاگل۔ کوٹ نجیب اللہ، کنڈی کابل۔ ہری پور
ii۔ دلازاک۔ سرائے صالح
iii۔ ترک۔ مانکرے
iv۔ قوم پنی پنیاں۔ بھیرہ وملحقات
۶۔ گکھڑ۔ خان پور
۷۔ جدون۔ بگڑہ۔ رجوعیہ۔ دھمتوڑ۔ مانگل

پندرھویں صدی کے وسط سے اٹھارھویں صدی تک

ترکوں کے حملے

ہزارہ کا ذکر تیمور کے حملوں کے دوران پھر تاریخ کے صفحات پر نمایاں ہوتا ہے جب وہ ہندوستان فتح کرکے ۱۳۹۹ء میں واپس آیا۔ تو اس ملک کو اس نے قارلغ ترکوں کے حوالہ کر دیا۔ جہاں پر ترک پہلے سے آباد تھے جن کی آمد و توطن چنگیز خان و ہلاکو کے زمانہ سے تھا۔ تیمور کے اس قارلغ قبیلہ کے ترکوں کو یہاں آباد کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ وہ اپنے ہم قوم قبائل کی امداد و اعانت کر سکیں۔

اس وقت ہندوؤں کی قوت ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ اس ملک میں ہوگیا تھا۔ اور ہزارہ کے نام کی اصلی وجہ انہی ترکوں (قارلغ ہزارہ) کی وجہ سے ہوئی۔ ترکوں کی افواج کی ٹکڑی ایک ایک ہزار کی تعداد میں ہوتی تھی۔ اور ایک ہزار کی ٹکڑی کو وہ منگ کہتے تھے۔ اور جو ٹکڑی اس ملک میں بس گئی تھی وہ قارلغ ترک کی تھی۔ اس واسطے اس ملک کا نام قارلغ منگ یعنی قارلغ ہزارہ۔ پڑ گیا اور اب مختصر ہو کر ہزارہ رہ گیا ہے۔

(جیسا کہ پچھلے صفحات میں تحریر ہو چکا ہے۔)

ہزارہ عہد مغل میں

آئین اکبری میں ابوالفضل اور توزک جہانگیری میں جہانگیر نے اس علاقہ کو پکھلی سرکار لکھا ہے۔ اور اس کا حدود اربعہ و حالات تحریر کئے ہیں۔ اس وقت اس میں موجودہ تناول اور علاقہ سوا تقیان اور رش کا میدان داخل تھے۔ علاقہ ناڑہ و خان پور گکھڑوں کے زیر حکومت تھا۔ مغل بادشاہوں کے وقت پکھلی سرکار پر ترکوں کی حکومت تھی۔ جہاں اب بھی چند مواضعات میں ان کی اولاد موجود ہے۔ اور شمال میں حکومت کشمیر کا قبضہ تھا۔ تاریخ فرشتہ میں اس علاقہ کا ذکر موجود ہے۔ مغلوں کے وقت ہزارہ کا میدان اور پکھلی سرکار حاکم اٹک سے متعلق تھے۔

توزک بابری میں بابر جہاں ہندوستان کے حالات لکھتا ہے۔ وہاں پر پہاڑوں کے حالات کے تحت لکھتا ہے "شمال کی طرف دریائے سندھ پار ہوتے ہی سارے پہاڑ میں آبادی ہے اور وہ علاقہ ملک کشمیر کے علاقہ میں گنا جاتا ہے جیسے پگلی (پکھلی) سہنک وغیرہ کے علاقے۔ ان علاقوں میں سے اس زمانہ میں بہت سے علاقے گو کشمیر کے تعلق سے نکل گئے ہیں لیکن پہلے داخل کشمیر ہی تھے۔ کشمیر سے بنگالہ تک اس پہاڑ میں بڑا وسیع ملک ہے......"

مغلیہ سلطنت کا زوال

اور ہزارہ

اس زمانہ میں مغلوں کا زوال اور مقامی خاندانوں کی کمزوری سے باہر کی اقوام کے حملے شروع ہو گئے۔ اور افغانوں اور ان سے متعلقہ اقوام نے داخل ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ سترھویں صدی میں سواتیوں کے پے در پے حملوں کے بعد میدان پکھلی پر قبضہ کرنے کا ہے۔ وہ اپنے وطن علاقہ سوات سے پٹھانوں کے دباؤ سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔ سوات سے نکلنے کے وقت وہاں کے سلطان کا نام سلطان پکھل تھا۔ اور جو جہانگیری سلاطین کے خاندان سے تھا۔ اس کے نام پر پکھلی کا نام رکھا گیا۔ سب سے آخری حملہ اٹھارھویں صدی میں زیر قیادت سید جلال بابا ہوا۔ جس کا مقبرہ وادی بھوگڑ منگ میں ہے۔ ترک بے دخل کر دئے گئے اور سواتیوں نے ضلع کے شمالی حصہ اور مغربی پہاڑی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اسی طرح تناولی قوم کو دریائے سندھ سے پار مہابن کے علاقہ سے یوسف زیوں نے نکال دیا۔ اور

یہ موجودہ علاقہ تناول میں آکر آباد ہو گئے۔

جدون بھی دریائے سندھ پار سے آکر علاقہ دھمتوڑ پر قابض ہو گئے اور ترکوں کو نکال دیا۔

قوم ڈھونڈ اور کرڑال نے گکھڑوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد شروع کر دی۔

ترین قوم نے میدانِ ہزارہ میں گوجروں سے بہت سے حقوق مختلف مواضعات میں حاصل کر لئے۔

اور تربیلہ کے گوجروں نے اتمان زیوں کو پار علاقہ سے اپنی امداد کے لئے بُلا لیا۔ اور اتمان زیوں نے بیع و رہن سے ان گوجروں سے زمینیں لے لیں۔ یہ سب واقعات سترھویں صدی کے آخر اور شروع اٹھارھویں صدی میں ہوئے۔ مستند تاریخی حالات کی عدم موجودگی میں ان اقوام کے متعلق صحیح تاریخی حالات معلوم نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے طاقتور اقوام کمزور اقوام کو اپنے گھروں اور جائداد سے بے دخل کرتے رہے اور جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس کے قانون پر عمل ہوتا رہا۔

اٹھارھویں صدی کا آخر نصف اور اُنیسویں صدی کی ابتداء

ہزارہ عہدِ دُرّانی میں

احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۷ء میں بادشاہ ہوا۔ اور ۱۷۵۲ء میں کشمیر اور پنجاب اُس کے قبضہ میں آگیا۔ ہزارہ پر درّانیوں نے اقوام ہزارہ کے خوانین کے ذریعہ سے حکومت کی۔ اور مستحکم نظام بنانے کی خواہش نہ کی۔ ان خوانین کو بڑی بڑی جاگیریں دے کر اور وقتاً فوقتاً اپنی فوج کے لئے سپاہی بھرتی کرنے اور کشمیر کا راستہ پُرامن رکھنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اُنہوں نے ضلع کے شمالی حصہ پر خوانین سواتی کے ذریعہ، تناول کرڑال اور علاقہ گکھڑ میں ان کے خوانین کے ذریعہ حکومت کی اور میدان گکھڑ میں اُن کے خوانین کے ذریعہ حکومت کی۔ اور میدانِ ہری پور پر اٹک کے حاکم یا ترینوں کے ذریعہ سے۔

اُنیسویں صدی کے شروع میں درّانی سلطنت کمزور ہوگئی اور ہزارہ کے لوگوں پر حکومت کرنی بھی مشکل ہوگئی۔ درّانی حاکم کشمیر اور کابل جاتے ہوئے راستہ میں اہلِ ہزارہ سے جو کچھ وصول ہوتا رہا اُسی کو غنیمت سمجھتے رہے۔ یہ دَور ایک قسم کی بدامنی کا تھا۔

عہدِ دُرّانی کے مشہور خوانین

اس عہد میں جب طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ اُس وقت کے ایک دو خان جنہوں نے اپنی

قوم کی سرداری کی اور اُن کو نظم میں رکھا۔ وہ یہ ہیں:-

۱۔ سعادت خان۔ جو سواتیوں کا خان تھا۔ اُس کا مسکن گڑھی سعادت خان (موجودہ گڑھی حبیب اللہ جو اس کے لڑکے کے نام سے موسوم ہے) دریائے کنہار کے کنارے پر تھا۔ اُس وقت اُس کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ خوانین جدون اور تناول بھی اپنے معاملات برائے تصفیہ اُس کے پاس لے جاتے تھے۔

۲۔ راجہ جعفر خان۔ گکھڑ۔ خان پور ۱۷۸۹ء سے ۱۸۰۱ء)

۳۔ گل شیر خان تناولی۔ اس سے انگریز سیاح فارسٹر (FORESTER) نے ۱۷۸۳ء میں ملاقات کی تھی

۴۔ نجیب اللہ خان ترین۔ جس نے میدان ہزارہ پر خوب دبدبہ سے حکومت کی۔ اس کی وفات ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ اُس کے بعد اُس کی بیوی نبی بیگم نے اپنے عامل مقدم مشرف کے ذریعہ سکھوں کے عہد کے آغاز تک حکومت کی۔

ان خوانین کے علاوہ باقی عام طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ قبائل ایک دوسرے پر لوٹ مار، قتل غارت کرتے رہتے تھے۔ بدامنی اتنی تھی کہ لوگ حکومت کے کارندوں پر بھی دست درازی کرتے تھے۔ ان ایام کا نقشہ ایک واقعہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۰۳ء میں حاکم اٹک نے ایک قاضی جو علاقہ چھچھ کا رہنے والا تھا۔ میدان ہری پور کا مالیہ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ وہ سکندر پور (نزد ہری پور) میں آکر ٹھہرا۔ اس وقت تک سکندر پور ہی حکام کی جائے رہائش تھی اور ہری پور آباد نہ ہوا تھا۔ لیکن ترینوں اور مقدم مشرف نے ظاہراً اس سے ادائیگی مالیہ کی بات چیت کی۔ لیکن رات کے وقت حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا اور اس کے جو ہمراہی بچ سکے وہ بھاگ کر اٹک چلے گئے۔

احمد شاہ ابدالی کی وفات (۱۷۷۲ء) یا ۱۷۷۳ء (بموجب کننگھم) کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ۱۷۹۵ء (۱۷۹۳ء۔ کننگھم) میں فوت ہوا۔ تیمور شاہ کی وفات سے پہلے بارکزئی خاندان کا اثر و رسوخ سلطنت افغانستان میں ہو گیا تھا۔

تیمور شاہ کی وفات کے بعد اس کا تیسرا بیٹا شاہ زمان بہ مشورہ امراء و امداد پائندہ خان بارکزئی تخت پر بیٹھا۔ اُس وقت بارکزئی قوم کا ہاتھ اقبال نے پکڑا اور سدوزئی (قبیلہ احمد شاہ) نے بھی پر و بال نکالے۔ اکثر درّانی بہ تہمتِ سازش شاہ محمود پسر دوم تیمور شاہ قتل کئے گئے۔

ہزارہ اس عرصہ میں درّانیوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اور ان کی آئے دن کی خانہ جنگیوں اور سازشوں سے یہ ضلع بھی متاثر ہوتا رہا۔

۱۸۰۳ء میں شاہ شجاع افغانستان سے پنجاب میں آگیا۔ اور سدوزئی خاندان کے تباہ ہونے پر

بارک زئی کا قبضہ کافی حصہ افغانستان پر بہ سرکردگی دوست محمد خان ہو گیا۔ ہزارہ درانیوں کے کشمیر جانے کے لئے آسان راستہ تھا۔ اور اس علاقہ سے کافی رنگروٹ بھی بھرتی کئے جا سکتے تھے۔ لہٰذا درانیوں نے اس علاقہ پر ان دو وجوہات کے لئے اپنی گرفت محفوظ رکھنے تک ہی رکھی۔ اور اندرونی امن و امان سے غرض نہ رکھی اور مالیہ کی وصولی کی بھی اتنی پرواہ نہ رکھی۔ انیسویں صدی میں درانی حکومت کمزور ہو گئی۔

درانی حکومت میں ضعف آنے کی وجہ سے ضلع ہزارہ کے لوگوں نے مالیہ دینا بند کر دیا۔ ان ایام میں ہزارہ ناظم اٹک کے متعلق تھا۔ نمو شاہ (علی مردان ثانی) فرزند احمد شاہ ناظم اٹک ہو کر آیا۔ ملک میں سرکشی عام ہوئی۔ مانگراٹے کے ترک جو قوم غور غشتی سے مغلوب ہو کر اپنے علاقہ سے نکل گئے تھے۔ پھر باعانت حکومت دخیل ہو گئے۔

چوہدری عیسیٰ و موسیٰ گوجر دوتتا والے (حال کوٹ نجیب اللہ) جو پٹہ گوجری کے وارث تھے۔ ہمت خان ترین کے ہاتھ قتل ہوئے (اس قتل کی مفصل تاریخ بعد کے صفحات میں دی جائے گی) ملک میں بد امنی تھی۔ اور انتظام پوری طرح سے نہ ہو سکا۔ آپس میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ تو ان ایام میں کابل سے سمندر خان درانی معہ کافی فوج آیا۔ اہالیانِ ہزارہ کے ساتھ بہ مقام سیری (نزد کالو بنڈ بھیرہ) اُس کی بہت سی فوج ماری گئی۔ مگر سیری اس نے لے لی۔ (موضع سیری کوہ گندگر کے دامن میں ہے۔ اور بد امنی کے زمانہ میں سب اہالیان میدان ہری پور کے لئے قلعہ کا کام دیتی تھی۔ اس مقام پر اور پھر اس سے بلند پہاڑی کی چوٹی سیری کوٹ پر اہل ہزارہ دشمن کی مقاومت کے لئے جمع ہو جایا کرتے تھے) سمندر خان موضع سیری فتح کرنے کے بعد اس کو اور اکثر دیہات ہزارہ کو جلا دیا۔ اور سخت بربادی بپا کی مگر پھر بھی انتظام نہ ہو سکا۔

۱۸۰۳ء میں حاجی وہاب قانون گو از علاقہ چھچھ حاکم ہزارہ ہو کر معہ فوج آیا۔ اور موضع سکندر پور میں (نزد ہری پور) جو اُس وقت اس علاقہ کے حاکم کا مرکز تھا، ٹھہرا۔ تمام خوانین ہزارہ کو بلا کر فہمائش اور نصیحت کی۔ ان ایام میں محمد خان ترین پسر نجیب اللہ خان ترین باعداد متقدم مشرف جو نہایت قوی دل شخص تھا ہزارہ پر غالب ہو چکا تھا۔ حاجی وہاب بطور حاکم وقت ہو کر آیا تھا دونوں کی رائے گفتگو میں مطابقت نہ ہوئی۔ محمد خان ترین بوجہ اختلاف گفتگو ناراض ہو کر اُٹھ گیا۔ اور اپنے اہل و عیال کو درویش سے نکال کر گلدھیری علاقہ کنڈی کو لے گیا۔ حاجی وہاب نے درویش کو جلا دیا۔ محمد خان نے تمام خوانین ہزارہ کو طلب کر کے مشورہ کیا اور دوسرے روز رات کے وقت حملہ کر کے حاجی وہاب کو قتل کر دیا اور اس کے دو سو سوار بھی قتل کر دئے۔ باقی مفرور ہو گئے۔

تاریخ ہزارہ فارسی قلمی از مہتاب سنگھ جو سردار ہری سنگھ کے وقت سے اس ضلع کا کاردار وغیرہ تیس سال تک رہا۔ اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۱۸۰۰ء میں جب محمود شاہ تخت کابل پر بیٹھا تو اس نے سمندر خان درانی کو بھیجا جس نے ملک ہزارہ میں بہت بربادی کی۔ اور اس کی بہت سی فوج بھی کام آئی۔ موضع سیری کو جلا دیا گیا اور باقی دیہات ہزارہ کو بھی سخت تکلیف پہنچائی گئی۔ شاہ محمود شاہ نے مہمات مملکت کو امراء کے حوالے کر دیا۔ اور ایک قلعہ دار قادر اٹک کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا۔ اور اقلیم چھچھ ہزارہ وغیرہ کا انتظام قلعہ دار اٹک کے حوالہ کر دیا۔ قلعہ دار نے قلعہ میں پہنچنے پر سب پرگنوں میں اہل کار مقرر کر دئے۔ چنانچہ ملک ہزارہ کی تحصیل مالیہ کے انتظام کے لئے حاجی وہاب خان جو ملک چھچھ کے قانون گویان میں سے تھا۔ ہزارہ بھیج دیا۔ حاجی وہاب خان تین سو سوار اور چند پیادوں کے ساتھ ہزارہ میں داخل ہوا۔ اور موضع قاضی پور حال سکندر پور کے ساتھ موضع ملکیار کے میدان میں پندرہ دن تک اپنا ڈیرہ رکھا۔ ہزارہ کے رئیس، ملک اور مال گزار فرداً فرداً آ کر سلام و مجرا کرتے رہے۔ اس کے بعد حاجی وہاب خان نے سب رئیسوں اور خوانین کو طلبی کے پروانہ جات لکھے۔ کہ وہ سب یک جا کر ملاقات کریں۔ ملاقات پر بعد از احوال پرسی و سلام کلام آپس سے خریف کا معاملہ طلب کیا۔ اس سوال پر جواب میں تلخی پیدا ہو گئی۔ محمد خان ترین نے سخت جوابات دئے۔ حاجی وہاب خان کو حکومت کا پندار تھا۔ ہر دو کے درمیان موافقت نہ ہو سکی۔ اور تعلقات خراب ہو گئے۔ محمد خان مجلس سے اٹھ کر سیدھا درویش گیا۔ اور اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر موضع گلدھیری (نزد نورومی) لے گیا۔ حاجی وہاب خان اس واقعہ سے خفا ہو کر درویش میں آیا۔ محمد خان کے گھروں کو برباد کیا۔ بعض کو آگ لگا دی اور بعض کو مسمار کر دیا۔ ان مکانات کی سب لکڑی جلانے میں استعمال کر دی۔ محمد خان کو اس بات سے سخت غصہ پیدا ہوا۔ ظاہراً زمانہ سازی سے تمام رئیسانِ ہزارہ کا جرگہ برائے ادائیگی مالیہ بلایا۔ تاکہ حاجی وہاب خان کے پاس جا کر مالیہ ادا کر دیا جائے۔ لیکن اندرون خانہ حملہ کی تیاری کی۔ مضبوط اور چست کمر بند آدمی ہر سہ پٹی ترک، دلزاک و ترین سے اور کچھ تنولی و افغان اور مشوانی سے ساتھ لئے۔ اور حاجی وہاب خان کے ڈیرہ کے چاروں طرف صبح سویرے آ کر فوراً بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ حاجی وہاب خان ابھی خیمہ خوابگاہ سے بیدار نہ ہوا تھا۔ لیکن جرأت اور ہمت سے اُٹھا۔ کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر باہر آیا۔ لیکن نیند سے بیدار ہونے والے اور بیدار کے حالات میں تفاوت ظاہر ہے۔ آخر کار اس جنگ میں حاجی وہاب خان معہ اپنے ایک دو آدمیوں کے مارا گیا۔ اُس کی باقی سوار فوج نے اٹک کی راہ لی۔ جو کوئی بھی ڈیرہ میں موجود تھا گھوڑے پر

سوار ہو کر سواروں کی معیت میں روانہ ہو گیا۔ اُنہوں نے اپنے بہت سے گھوڑے، اسلحہ جات اور سامان چھوڑ کر اپنی جان سلامت لے جانے ہی کو غنیمت جانا۔ جو بھی ذرا پیچھے رہا اس کو گرفتار کر کے گھوڑا، سامان اور اسلحہ لے لیا جاتا تھا۔

محمد خان ترین بمعہ مشرف ساکن کوٹ ان سواروں کا ہزارہ کی سرحد تک تعاقب کر کے بھگانے کے بعد واپس آ گئے۔ اور حاجی وہاب خان کا سب اسباب، خیمہ، بنات، گھوڑے، اسلحہ جات اور نقد و جنس لوٹ لیا گیا۔

سکھوں کا عہدِ حکومت

درّانی حکومت کی کمزوری سے ہزارہ نسبتاً حاکم سے باغی ہونے لگا۔ اور سکھوں کی حکومت بھی چند ابتدائی شکستوں کے بغیر مستحکم نہ ہو سکی۔ رنجیت سنگھ نے اس ضلع کو ۱۸۱۸ء میں باضابطہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن ۱۸۲۰ء میں اس کے سپہ سالاروں کو شکست ہوئی اور ۱۸۲۱ء میں سردار امر سنگھ مجیٹھیہ سمندر کٹھ (علاقہ کرڑال) میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر سردار ہری سنگھ حاکم کشمیر کو ہزارہ بھیجا گیا۔ اُس کو تین سال سے زیادہ عرصہ قبائل ہزارہ کو مطیع کرنے میں لگ گیا۔ خان پور کے گکھڑوں کو ۱۸۳۶ء تک ہی مطیع کیا جا سکا۔ بہر حال ہزارہ پر حکومت کرنا اتنا آسان کام نہ تھا۔

۱۸۴۵ء میں پنجاب میں سکھ حکومت کے کمزور ہونے پر ہزارہ میں پھر بغاوت شروع ہو گئی۔ ۱۸۴۶ء میں دیوان مُول راج حاکم ہزارہ کو حسن ابدال میں پناہ لینی پڑی۔ لوگ ہری پور میں جمع ہوئے اور اپنی حکومت کا انتظام کرنے لگے۔ اس اثناء میں سکھوں کی پہلی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مارچ ۱۸۴۶ء میں سکھ دربار اور حکومت برطانیہ کے معاہدہ کی رُو سے ہزارہ راجہ گلاب سنگھ راجہ جموں کے ماتحت آ گیا۔ لیکن ہزارہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر اوائل ۱۸۴۷ء میں گلاب سنگھ نے ہزارہ کو دوبارہ سکھ دربار کے حوالے کر کے اُس کے عوض میں جموں کے نزدیک کا علاقہ لے لیا۔ اور ۱۸۴۹ء میں سکھوں کی دوسری لڑائی کے نتیجہ کے طور پر ہزارہ برطانوی قبضہ میں آ کر پنجاب سے ملحق کر لیا گیا۔ ۱۸۴۷ء میں کپتان ایبٹ صاحب سکھ دربار کے حکم سے ضلع ہزارہ اور علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کی حد بندی کرنے کے لئے آیا۔ اور ہزارہ کا سرسری بندوبست کیا۔ اُس نے منصفانہ تشخیص مالیہ، خوانین کے ساتھ روادار سلوک، اور وقتِ ضرورت مضبوطی و جرأت سے کام لے کر ایک سال کے اندر اندر اہل ہزارہ کو مطیع

اور گرویدہ کر لیا۔

سکھوں کی دوسری لڑائی میں میجر ایبٹ نے اپنی ذاتی ہمت سے اپنی پوزیشن ہزارہ کے پہاڑوں میں جب کہ سکھ فوجوں نے اُس کے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا قائم رکھی۔ حالانکہ کوئی بیرونی امداد اُس کو نہ مل سکتی تھی۔

زمانہ غدر میں میجر بیچر (BECHER) کے زیرِ حکومت رہا۔ اور کوئی فساد نہیں ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کالا ڈھاکہ کی مہمیں جاری رہیں۔ اور ۱۸۶۸ء، ۱۸۸۸ء، ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۳ء کی چڑھائیوں نے ملک کو پُر امن بنا دیا۔

یہ عہد درّانی سے بعد کے وہ سرسری حالات ہیں، جو سکھوں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ سکھوں کے عہد کے مفصل حالات اگلے باب میں شرح و بسط کے ساتھ انشاء اللہ بیان کئے جائیں گے۔

سکھوں کا عہدِ حکومت[1]

پنجاب میں

ہزارہ میں سکھ حکومت کے عہد کے حالات بیان کرنے سے پہلے سکھوں کے ظہور، عروج اور زوال کی مختصر تاریخ بیان کی جاتی ہے تاکہ ہزارہ کے واقعات کے لئے پس منظر کا کام دے۔

تاریخی لحاظ سے سکھوں نے مقامی طور پر ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۷ء تک غلبہ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں جب کہ احمد شاہ ابدالی ہند پر حملہ آور ہوتا رہا۔ احمد شاہ کے آخری آمد ہندوستان ۱۷۶۷ء سے بعد تیس سال تک یعنی ۱۷۹۷ء تک سکھ حکومت لاہور پر قابض رہی۔ ۱۷۹۷ء میں شاہ زمان لاہور پر چڑھ آیا۔ لیکن تاوان جنگ لے کر واپس چلا گیا۔ دوسرے سال پھر وہ لاہور آیا۔ اور واپس جاتے وقت لاہور کی حکومت رنجیت سنگھ کے حوالے کر گیا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کی حکومت کو مضبوط اور مشہور کر دیا۔ انگریزی حکومت اور برٹش (ایسٹ انڈیا کمپنی) نے رنجیت سنگھ کی موت ۲۷ جون ۱۸۳۹ء بعمر ۵۹ سال سے بعد اپنے مقام حکومت (آگرہ - اودھ) سے للچائی ہوئی نظریں لاہور پر ڈالیں جس کی وجہ سے اُن کی سکھوں سے جنگیں شروع ہوئیں۔

---

[1] اقتباس پاکستان ٹائمز ۲۴-۶-۱۹۶۴ء ایم۔ زیڈ۔ اے خان

جواہر سنگھ رانی جنداں (رنجیت سنگھ کی مہارانی) کا بھائی اور لال سنگھ رانی جنداں کا منظورِ نظر حکومت پر عملاً قابض تھے۔ جواہر سنگھ وزیر بنایا گیا لیکن خالصہ فوج کی مخالفت کی وجہ سے وہ ۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء میں قتل کر دیا گیا۔ حکومت پر فوج کا قبضہ ہو گیا۔ لال سنگھ وزیر اور تیجا سنگھ کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو انگریزوں سے جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور سکھ فوج نے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۵ء کو دریائے ستلج پار کر لیا۔

جنگ مُدکی ۱۸ دسمبر، فیروزپور ۲۱ و ۲۲ دسمبر اور بدوال ۲۱ جنوری ۱۸۴۶ء، علی وال ۲۸ جنوری اور سبراؤن ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور لاہور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور ۱۸۴۶ء میں لاہور میں برٹش کونسل آف ایجنسی مقرر ہو گئی اور سب اختیار حکومت برٹش ریذیڈنٹ نے سنبھال لئے۔ اس کے بعد سکھ فوج اور آبادی نے بغاوت کر دی۔ اور پیش قدمی کرتے ہوئے ساٹھ میل تک پہنچ گئے۔ لارڈ گوو (GOUGH) نے فوج کی کمان سنبھالی اور مقام چلیانوالہ بتاریخ ۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء سخت جنگ لڑی گئی۔ سکھوں نے اپنی انتہائی کوشش دوبارہ حکومت لینے کے لئے کی لیکن وہ ناکام رہے۔

ان حالات کو پنجابی شاعر شاہ محمد نے اپنی کتاب نظم۔ جنگ نامہ میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اُس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بہادری اور عروج کی داستان تفصیل سے بیان کی ہے اس کی وفات کے بعد سکھوں کے درمیان نا اتفاقی کے حالات اور زوال کے حالات بھی بیان کئے ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق رنجیت سنگھ کی موت کے بعد انگریزوں نے اپنے ایک ہوشیار اور تجربہ کار افسر ہنری براڈ فٹ کو پنجاب کی سرحد پر بھیجا۔ تاکہ وہ انقلاب کے لئے ریشہ دوانی کرے۔ اُس کے پہنچنے کے تھوڑی مدت کے بعد انگریزی فوجوں نے ستلج سے پار کے علاقہ کپورتھلہ پر قبضہ کر لیا جو کہ سکھ حکومت کے زیرِ تحفظ تھا۔ سکھوں نے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوجیں بھیجیں۔ لیکن سکھوں کے سب افسر کمانڈر انچیف مصر تیجا سنگھ تک انگریزوں سے ملے ہوئے تھے۔ اور مہارانی جنداں بھی دشمن سے ملی ہوئی تھی۔ بایں ہمہ سکھ فوج نے بہت بہادری اور جانفشانی سے مقابلہ کیا۔ شاہ محمد کے بیان کے مطابق (شاہ محمد امرتسر کے نزدیک ایک گاؤں میں ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۸۶۲ء میں فوت ہوا۔ لہٰذا اُس کا بیان ایک عصری شہادت ہے) رانی جنداں نے انگریزوں کو خود دعوت دی تھی اور گلاب سنگھ اس تمام کارروائی کا سرغنہ تھا۔

اس کے جنگ نامہ سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

جھنڈے نکلے، کوچ دا حکم ہویا
چڑھے پُت سرداراں دے چھیل بانکے
چڑھے سب مجیٹھ دوآبیے جی
شاہ محمدا چڑھے زنبورخانے
مظہر علی تے ماکھے خاں کوچ کیتا
بیڑا چڑھیا سلطان محمود والا
اُنہاں رب دا واسطہ پایا ای
پروں ملک فرنگی نے مار لیا
گھروں گئے فرنگی دے مارنے نوں
خیر آفتاں نوں گل لائیو نی
خوشی وسدا شہر لاہور سارا
شاہ محمدا! آکھدے لوک سنگھ جی
راجہ گلاب سنگھ آپ چل کے
صاحب لوک جی اُساں پیہ دیا کرنی
دتے گڈھ مالوی دوآبیے جی
شاہ محمدا طرف کشمیر کے

چڑھے سورمے سنگھ دلیر میاں
جیسے بیلیوں نکلے شیر میاں
جنہاں قلعے نوائے نے ڈھیر میاں
ہویا حکم، نہ لاوندے دیر میاں
توپاں شہر تھیں باہر نکالیاں نے
توپاں نال امام بخش والیاں نے
مائی پھڑنا کسی تقصیر نوں جی
اُسی ماراں گے اُس بے پیر نوں جی
بیڑے توپاں دے سنگوں کھوہا آئے
سنگوں اپنا آپ گوا آئے
سنگوں گنجیاں ہتھ پھڑا آئے
تُسیں چنگیاں پُوریاں پا آئے
باہنوں پکڑ لاہور لیاندی ای
اوہ تن اپنا کم بنا کوڈا ای
وچوں سنگھاں دی فوج بھسکواندا ای
تُرت جموں ول کوچ کراوندا ای

چلیانوالہ کی لڑائی کے بعد انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد گجرات کی لڑائی ۲۱ فروری ۱۸۴۹ء میں ہوئی۔ اور لارڈ گو (GOUGH) نے سکھوں کی تمام پریشان شدہ فوج کو تباہ کر دیا۔ دلیپ سنگھ کو باقاعدہ طور ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء میں گدی سے اُتار دیا۔ پنجاب انگریزی مملکت میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح سے سکھوں کی سلطنت گلاب سنگھ کی غداری اور مہارانی جنداں کی

---

[1] دوکے [2] دریا کے درمیان جنگل [3] ماجھے والے [4] دوآبہ والے [5] توپ خانے [6] سلطان محمود غزنوی کی مانند [7] امام بخش کی توپوں کے ساتھ [8] خدا کے لئے کوئی فکر نہ کر [9] انگریزوں کو لاہور لے آیا۔
[10] انگریز کمانڈر سے اپنے لئے مہربانی طلب کی [11] مارہ اور دوابہ کے فوجی سپاہی نکال دئے [12] کشمیر کا تحفہ کر دیا۔

سازش سے تباہ ہوگئی۔

سرگزشت گلاب سنگھ

جس کی غداری نے سکھ حکومت کی کشتی ڈبودی اور خود جموں اور کشمیر کا مہاراجہ بن گیا

مہاراجہ رنجیت سنگھ باہر کے علاقوں سے اپنے پروردہ لوگ بھرتی کرتا تھا۔ ان میں پہلا شخص خوشحال سنگھ برہمن علاقہ سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ وہ سکھ ہوگیا۔ اور نئی بھرتی شدہ رجمنٹ میں شامل ہوگیا۔ بعد میں مہاراجہ کی پیشگی میں پیادہ ہوگیا۔ اور جلد ہی ۱۸۱۸ء میں جمعدار ہوگیا۔ یہ اور اس کا بھائی ۱۸۲۰ء میں جموں کے راجاؤں گلاب سنگھ وغیرہ سے مل گیا۔

گلاب سنگھ اسی جمعدار خوشحال سنگھ کی پلٹن میں سوار تھا۔

گلاب سنگھ عرف گلابو ۱۷۹۲ء میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔

گلابو کی زندگی کا آغاز قلعہ منگلا کے قلعدار کے پاس تین روپیہ ماہوار پر بطور سپاہی ہوا۔ یہاں سے وہ ملازمت چھوڑ کر یا ناپسندیدہ قرار دے کر نکالا گیا۔ اور سلطان خان والئی بھمبر کی فوج میں ملازم ہوگیا۔ وہاں سے بھی وہ نکالا گیا۔ اور واپس اپنے گھر موضع اسٹیل پور جو جموں سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر، جموں پٹھانکوٹ سڑک پر واقع ہے، چلا گیا۔

گلابو کے دو چھوٹے بھائی دھیانو (دھیان سنگھ) سُچیتو (سچیت سنگھ) تھے۔ دھیانو سکھ فوج میں بطور سپاہی ملازم ہوگیا۔ وہ کسی مہم میں مہاراجہ رنجیت کی قیام گاہ پر سنتری مقرر ہوگیا۔ مہاراجہ کو یہ خوبصورت ڈوگرہ راجپوت پسند آیا۔ اور اس کو اپنا ذاتی ملازم رکھ لیا۔ دھیان سنگھ نے بطور کمانڈر اور ناظم، اپنی قابلیت کا سکہ مہاراجہ پر بٹھایا۔ اور جلد ہی شاہی امورات کا میر حاجب بن گیا۔ دھیان سنگھ کی ترقی خاندان کے عروج کا باعث بنی۔ گلاب سنگھ نے، جو پریشان و مایوس گھر بیٹھا ہوا تھا۔ بھائی کو ملازمت کے لئے پیغام بھیجا۔ دھیان سنگھ نے اس کو سپاہی بھرتی کرادیا۔ اور جلد ہی اس کو فوج کا معمولی افسر بنوا دیا۔

گلاب سنگھ نے رئیس راجوڑی آغاجان کو گرفتار کرکے نام پیدا کرلیا۔

کلیم اللہ خاں وزیر آبادی کی تحریر شائع شدہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۵-۷-۶۵ کے مطابق راجوڑی کے رئیس کا نام راجہ اگر خان تھا۔ اس نے بڑی بہادری سے سکھ حکومت، انگریزوں اور گلاب سنگھ کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ مگر اپنے بھائی کی غداری سے شکست کھا گیا۔ اور اپنی زندگی کے بقیہ دن بطور قیدی

شاہی مسجد لاہور میں گزار دئے۔ لیکن معافی نہ مانگی۔

سب سے چھوٹا بھائی سچیت سنگھ بھی مہاراجہ کا ذاتی ملازم تھا۔ اس خوبصورت نوجوان نے اپنے اطوار سے مہاراجہ کو گرویدہ بنا کر ترقی کے زینے پر قدم رکھا۔

ان تینوں بھائیوں نے مہاراجہ پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرکے یکے بعد دیگرے راجہ کا خطاب حاصل کرلیا۔ اور حکومت میں کافی اثر و رسوخ پیدا کرلیا۔

یہ تینوں بھائی میاں کے نام سے بلائے جاتے تھے۔ ان بھائیوں کی لیاقت سے مہاراجہ اتنا متاثر ہوا کہ دھیان سنگھ کو ریاست پونچھ، سچیت سنگھ کو رام نگر اور گلاب سنگھ کو جموں دے دیا۔

ان تینوں بھائیوں میں گلاب سنگھ زیادہ ہوشیار اور چالاک تھا جموں کے علاقہ میں سکھوں کے ذریعہ سے اپنی راجپوت قوم میں اپنا اثر و رسوخ بڑھاتا رہا۔ دھیان سنگھ کم ہوشیار لیکن سنجیدہ اور مہذب تھا۔ وہ رنجیت سنگھ ہی کے پاس رہا۔ گلابو اپنی غیر معمولی قابلیت کی بناء پر راجہ گلاب سنگھ بن گیا۔ وہ پُر اثر شخصیت اور فولادی عزم کا انسان تھا اگرچہ وہ اپنا نام مشکل سے لکھ سکتا تھا تاہم اپنی ریاست کے حساب کتاب کا خود ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اور اکثر اپنے گھوڑوں کے راشن کا دانہ بھی اپنے سامنے تُلواتا تھا۔ وہ گنوار طبیعت کا آدمی تھا۔ دارالحکومت کی رہائش بھی اس کو شائستہ نہ بنا سکی۔ میک گریگر (MC GREGOR) کے مطابق اُس کے بھائی اس سے زیادہ شائستہ تھے۔ وہ ہمیشہ دارالحکومت میں ہی رہا کرتے تھے۔ اور گلاب سنگھ اپنی پہاڑی ریاست میں رہتا اور حدود ریاست کو وسیع کرنے کی فکر میں لگا رہتا۔

زیادہ شائستہ و مہذب (ان کا چھوٹا بھائی) سچیت سنگھ بحیثیت شاندار مصاحب اور بہادر سپاہی، مہاراجہ کے پاس رہا۔ اور کوئی اختیار حاصل کرنے کی کوشش نہ کی لہذا اس کا کوئی دشمن بھی نہ تھا۔

جب مہاراجہ رنجیت سنگھ جون ۱۸۳۹ء میں مرگیا اور کھڑک سنگھ گدی پر بیٹھا۔ تو گلاب سنگھ کا چھوٹا بھائی اس کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس وقت ان تینوں بھائیوں نے محلاتی سازش کے جال پھیلانے شروع کئے جس کے نتیجے میں سکھ حکومت کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔

ایک بیان کے مطابق (مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ یادداشت پہلی صدسالہ برسی۔ امرتسر ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۴۷)

دھیان سنگھ نے باوجود اظہار وفاداری، خفیہ طور پر اپنے بھائیوں کو پہاڑی علاقوں کی حکومت دے دی۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تاج کے لئے اپنے لڑکے ہیرا سنگھ کے لئے کوشش کی۔ اس غرض کیلئے

ڈوگرہ بھائیوں۔ دھیان سنگھ، گلاب سنگھ نے سب وارثان تخت کو بالواسطہ یا بلاواسطہ قتل کرا دیا۔
چونکہ مہاراجہ کھڑک سنگھ ان ڈوگرہ بھائیوں کے تسلط کے خلاف تھا۔ اس لئے دھیان سنگھ نے
کھڑک سنگھ اور اس کے سب لواحقین کو قتل کرا دیا۔

ان ڈوگرہ بھائیوں نے کنور نونہال سنگھ (کھڑک سنگھ کا اکلوتا بیٹا) سے سازش کرکے تخت پر اس کا قبضہ کرا دیا اور باپ کو اپنے گھر میں قید کرا دیا۔ چند ماہ بعد کھڑک سنگھ مرگیا۔ اغلباً اس کو زہر دیا گیا۔ کھڑک سنگھ کی موت ۵ نومبر ۱۸۴۰ء بعمر ۳۸ سال ہوئی۔ جس دن کھڑک سنگھ کی لاش چتہ پر جلائی گئی اسی دن کنور نونہال سنگھ، روشنائی دروازہ کی محراب کے نیچے دب کر مرگیا۔ یہ دوسرا شکار ڈوگرہ بھائیوں کے ہاتھ سے ہوا۔ دھیان سنگھ ابھی تک وزیراعظم تھا۔

یہاں پر آگے بڑھنے سے پہلے ان ڈوگرہ بھائیوں کے حسب و نسب پر سرکار انگریزی کی یادداشتوں دربارہ ریاستہائے ہندوستان سے جموں اور کشمیر کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔ جس سے ان بھائیوں کے حالات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

جموں اور کشمیر

راج ترنگنی (سنسکرت زبان میں تاریخ کشمیر) کے مطابق چودھویں صدی عیسوی تک بدھ مت اور ہندو مت کے خاندان اس ریاست پر حکمران رہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں مقامی مسلمان خاندانوں نے حکومت سنبھال لی اور شہنشاہ اکبر کے عہد تک حکمران رہے۔ ۱۵۸۷ء میں یہ سلطنت دہلی کا صوبہ بن گئی۔ ۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اور ۶۷ سال تک درانیوں کی حکومت رہی۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ فتح کرلیا۔

جموں کی مختصر تاریخ

رنجیت دیو۔ ڈوگرا سردار (راجپوت) جموں کا راجہ تھا جو ۱۷۸۰ء میں مرگیا۔ گدی نشینی کے جھگڑے میں سکھوں کو جموں پر اپنا اقتدار جمانے کا موقعہ مل گیا۔ رنجیت دیو کے تین پوتے تھے جن کے نام یہ ہیں۔ گلاب سنگھ، دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ ان تینوں نے لاہور دربار میں ملازمت اختیار کرلی اور اقتدار

۱؎ عہد انگریزی کی یادداشتیں۔ دربارہ ہندوستانی ریاستیں صفحہ ۵۶ ۱۹۲۱ء

حاصل کیا۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے جموں کا علاقہ گلاب سنگھ کو اور بھمبر، چبھال بمعہ پونچھ کے دھیان سنگھ کو اور رام نگر سچیت سنگھ کو بطور جاگیر دے دیا۔ سچیت سنگھ اور دھیان سنگھ ۱۸۴۴ء میں مارے گئے۔ دھیان سنگھ کے تین لڑکے تھے۔ ہیرا سنگھ۔ جواہر سنگھ اور موتی سنگھ۔ اپنے والد کی جاگیر کا وارث ہیرا سنگھ ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں اس کی موت کے بعد لاہور دربار نے یہ جاگیر ضبط کرلی۔

۱۸۴۶ء میں پہلی جنگ سکھاں کے خاتمہ پر گلاب سنگھ نے حکومت انگریزی اور لاہور دربار میں ثالث کا پارٹ ادا کیا۔ معاہدہ صلح میں سکھ مہاراجہ کو پنجاب کا بہت سا حصہ اور ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ دینا پڑا۔ چونکہ وہ روپیہ ادا نہ کرسکتا تھا۔ اس کے عوض میں اس نے اپنا ملک از بیاس تا اٹک بمعہ جموں اور کشمیر کے دینا منظور کیا۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ نے انتظامی و دفاعی مجبوریوں اور اس علاقہ سے آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے یہ منظور نہ کیا۔ اس پر گلاب سنگھ یہ رقم اس شرط پر دینے کے لئے رضامند ہوگیا کہ اس کو جموں اور کشمیر کا خودمختار مالک مانا جائے۔ لہٰذا ایک دوسرے معاہدہ۔ معاہدہ امرتسر مارچ ۱۸۴۶ء کے مطابق جموں اور کشمیر ۷۵ لاکھ کے عوض دے دیا گیا۔ اور ۲۵ لاکھ کے عوض پر لاہول اور کلو کا علاقہ سرکار انگریزی نے اپنے پاس رکھ لیا۔

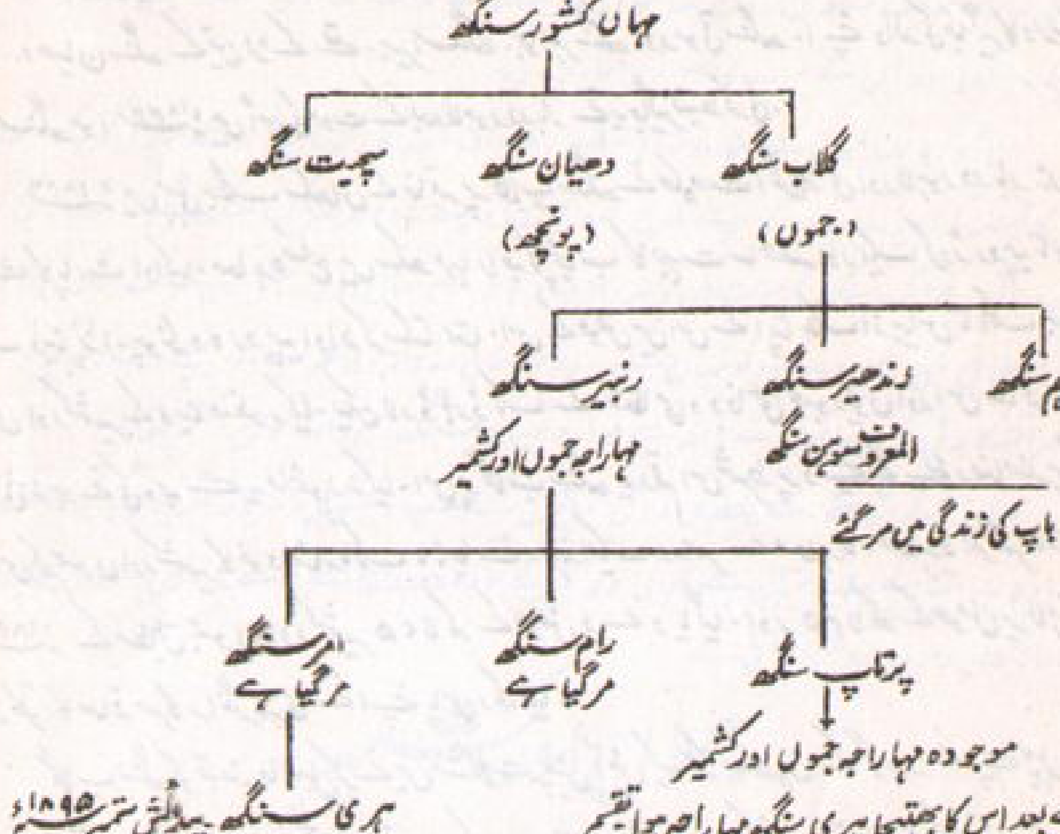
گلاب سنگھ کو قبضہ حاصل کرنے میں مشکلات پیش آئیں کیونکہ سکھوں کے گورنر نے پہلے پہل مزاحمت کی۔ لیکن ۱۸۴۶ء کے آخر میں انگریزی فوجوں کی مدد سے وہ جموں اور کشمیر پر قابض ہوگیا۔

علاقہ پونچھ

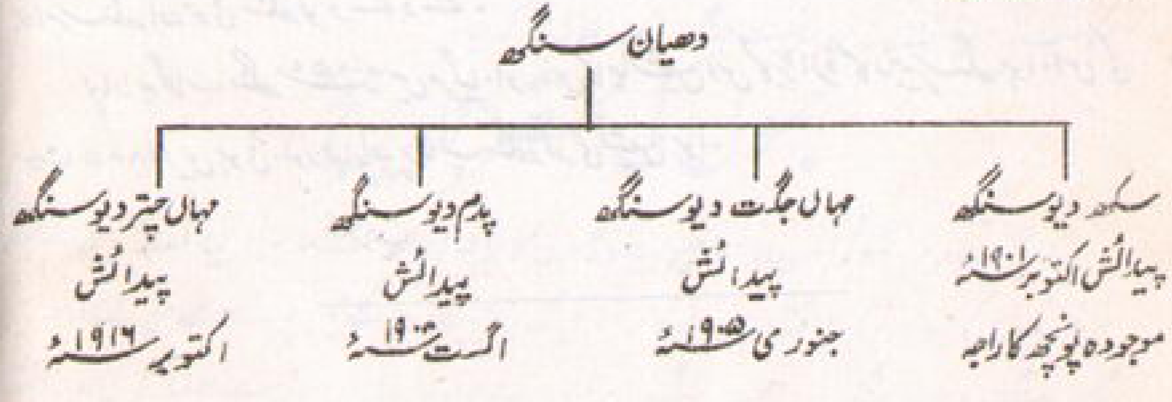
یہ علاقہ بھی جموں اور کشمیر میں شامل تھا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے پونچھ وچبیل اور دوسرے علاقے جواہر سنگھ اور موتی سنگھ کو دے دئے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۸۵۷ء میں مرگیا۔ اور اس کا جانشین اس کا بڑا لڑکا رنبیر سنگھ ہوا۔ اس کی موت ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ گدی نشین ہوا۔

شجرۂ نسب



اس کے بعد اس کا بھتیجا ہری سنگھ مہاراجہ ہوا تقسیم برصغیر پاک و ہند کے وقت وہ راجہ تھا بعد میں اس کو ہٹا کر اس کے لڑکے کرن سنگھ کو صدر ریاست بنایا گیا ۱۹۶۷ء میں اس کو حکومت ہند نے وہاں سے ہٹا کر مرکز میں وزیر بنا لیا۔



کنور نونہال سنگھ کی موت کا پس منظر

کنور نونہال سنگھ دل سے جموں کے راجاؤں دھیان سنگھ و گلاب سنگھ کو ختم یا کمزور کرنا چاہتا تھا۔ جنرل (VENTURA) اور سردار اجیت سنگھ سندھیانوالہ دونوں دھیان سنگھ کے مخالف تھے۔ نونہال سنگھ کابل و نیپال سے مل کر انگریزوں کو نکالنا چاہتا تھا۔ اور جموں کے راجہ کو ختم کر کے خود مختار مہاراجہ بننا چاہتا تھا جس وقت وہ تخت پر بیٹھا اس کی عمر بیس سال تھی۔ دھیان سنگھ و گلاب سنگھ نے اس کو راہ سے ہٹانے کے لئے قلعہ کا دروازہ اس کے وہاں سے گزرنے کے وقت گرانے کا خفیہ انتظام کر لیا تھا۔ اور اس پر ایک پردہ ڈالا ہوا تھا۔ اور نونہال سنگھ کے ساتھ گلاب سنگھ کا بڑا لڑکا بیٹھا ہوا تھا یہ تو اسی جگہ مرگیا۔ لیکن نونہال سنگھ بعد کو رات کے وقت مرگیا۔

شیر سنگھ اس وقت لاہور میں نہ تھا۔ انگریز اس کے حق میں تھے۔ کیونکہ وہ اچھی طبیعت اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔

دھیان سنگھ نے نونہال سنگھ کی موت کو خفیہ رکھا تاکہ شیر سنگھ آجائے۔

اس اثناء میں بی بی چاند کور بیوہ کھڑک سنگھ نے فوراً خلاف امید خود اختیار سنبھال لئے۔ اُس وقت کسی نے مخالفت نہ کی۔ کہ عام طور پر مشہور تھا کہ شیر سنگھ رنجیت سنگھ کا لڑکا نہیں۔ سکھ سردار جموں کے راجاؤں کے اثر و رسوخ کو پسند نہ کرتے تھے۔ چاند کور کی طرفداری بہت سے نامور لوگوں خاص کر سندھیانوالہ نے (جو رنجیت سنگھ کے ہم جدی تھے) کی۔ مہارانی چاند کور نے ہیرا سنگھ (پسر دھیان سنگھ) کو متبنیٰ بنا لیا۔ ساتھ ہی یہ بھی مشہور کر دیا کہ نونہال سنگھ کی بیوی کو حمل ہے۔ صلح صفائی کے لئے چند سکھوں نے بیوہ نونہال سنگھ کی شادی شیر سنگھ سے کرا دینے کی تجویز کی۔ اور چند نے عطر سنگھ سندھیانوالہ سے۔ لیکن مہارانی نے اتفاق نہ کیا۔ اور خود ہی حکومت سنبھالنے کی ٹھانی۔

چند ہفتوں کے بعد حکومت کی تشکیل جو بیان کی گئی وہ یہ تھی:۔

۱۔ مہارانی چاند کور بادشاہ۔ ۲۔ شیر سنگھ نائب (صدر کونسل حکومت) ۳۔ دھیان سنگھ وزیر۔ مگر یہ معاہدہ عارضی ہی رہا۔ کیونکہ اس کے بعد شیر سنگھ اور دھیان سنگھ لاہور سے عموماً غیر حاضر رہتے تھے اور اپنی جگہ پر جوڑ توڑ کرتے رہے۔

دھیان سنگھ کو شیر سنگھ کی۔ پدری حسب نسب مشکوک ہونے کی وجہ سے۔ کامیابی یقینی نظر آتی تھی۔ لہٰذا اُس نے انگریزوں کو یہ باور کرایا کہ رنجیت سنگھ کا ایک لڑکا۔ دلیپ سنگھ۔ اُس کی بیوی یا داشتہ

رانی جنداں سے تھا۔ یہ واقعہ نومبر۔ دسمبر ۱۸۴۱ء کا بیان ہوتا ہے۔

اگرچہ انگریزوں نے مہارانی چاند کور کو باضابطہ حکمران تو تسلیم نہ کیا لیکن اس کی حکومت کو بالفعل (DEFACTO) مان لیا۔

انگریز شیر سنگھ کے طرفدار تھے۔ اور دھیان سنگھ و گلاب سنگھ مہارانی کی حکومت کے۔ جو ہر حال میں مرد کی حکومت سے کمزور ہوتی ہے۔ بوجوہ طرفدار تھے۔ اور دھیان سنگھ مکمل طور پر وزیر مختار بننے کا خواہاں تھا۔ لیکن مہارانی کے صلاح کاروں نے اس کو نزدیک نہ آنے دیا۔ لہٰذا وہ دور ہی رہا۔ لیکن اندرونی طور پر شیر سنگھ کو کہتا رہا کہ مناسب وقت پر وہ اس کی امداد کرے گا۔

۱۴ جنوری ۱۸۴۱ء کو شیر سنگھ نے کچھ فوج ساتھ ملا لی اور قلعہ لاہور پر حملہ کر دیا۔ گلاب سنگھ اس حملے کے خلاف تھا۔ سکھوں میں دو دھڑے ہو گئے۔ آخر کار مشورہ سے فیصلہ ہوا کہ رانی چاند کور کے ساتھ عزت کا سلوک کر کے اس کو بہت سی جاگیر دی گئی۔ آخر کار اس کو شیر سنگھ کے اشارے پر لاٹھیاں مار مار کر جون ۱۸۴۲ء میں مار دیا گیا۔

شیر سنگھ کا عہدِ حکومت

شیر سنگھ پنجاب کا مہاراجہ بن گیا۔ دھیان سنگھ حسب سابق وزیر رہا۔ فوج کی تنخواہ ایک روپیہ ماہوار زیادہ کر دی گئی۔

عطر سنگھ و اجیت سنگھ سندھیانوالہ کو شیر سنگھ سے خطرہ محسوس ہوا۔ وہ لاہور سے بھاگ کر انگریزی علاقہ میں چلے گئے۔ لیکن لہنا سنگھ سندھیانوالہ جو اپنی فوج کے ساتھ کلّو اور منڈی میں تھا۔ وہاں ہی رہا۔

فوج شیر سنگھ کی پوری حکم بردار نہ تھی۔ اور پرانے افسروں کو جن سے فوج کی عداوت تھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ لاہور، کشمیر اور پشاور سب جگہوں پر یہی عمل کیا گیا۔

کشمیر میں میاں سنگھ گورنر کو قتل کر دیا گیا۔ چند انگریز افسروں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ پشاور میں جنرل (AVITABILA) کی بھی مخالفت کی گئی۔ وہ پشاور سے جلال آباد بھاگ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ لوگوں کو خیال تھا کہ فوج ملک میں لوٹ اور غارت مچا دے گی۔ تجار خوف زدہ تھے۔ شیر سنگھ خود گھبرایا ہوا تھا۔ کیونکہ انگریزوں کو ملک کا کچھ حصہ دے کر ان کی امداد لینا چاہتا تھا۔

لہنا سنگھ سندھیانوالہ کو اپنے فوجیوں نے منڈی کی پہاڑیوں میں قید کر لیا۔

اپریل ۱۸۴۱ء میں کشمیر میں گورنر کے قتل ہونے پر گلاب سنگھ کو امن بحال کرانے کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے

غلام محی الدین کو گورنر بااختیار مقرر کر دیا۔ یہ شخص گلاب سنگھ کا پروردہ تھا۔ اس طرح سے گلاب سنگھ نے کشمیر پر اختیارات حاصل کر لئے۔ مارچ ۱۸۴۳ء لہنا سنگھ مجیٹھیہ، زیارت مقامات مقدسہ (ہندوؤں و سکھاں) کے بہانہ سے پنجاب سے چلا گیا۔ اس کے بعد ایک مجہول آدمی لال سنگھ برہمن۔ جو جموں کے مہاجاؤں کا نوکر تھا۔ نے اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا .... اثر رانی جنداں پر تھا۔ اور رانی کو حقارت کے الفاظ سے یاد کرتا تھا۔ اور رانی کے بھائی جواہر سنگھ کے ساتھ ہمیشہ نفرت سے پیش آتا تھا۔

شیر سنگھ کو ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء کو امرتسر میں اپنی فوجوں کا معائنہ کرتے ہوئے اجیت سنگھ (جو ان دنوں مہاراجہ کے بہت نزدیک ہو گیا تھا) بہانہ سے اس کے سامنے جا کر گولی سے ہلاک کر دیا۔ اسی وقت لہنا سنگھ نے اس کے لڑکے پرتاپ سنگھ عمر بارہ سال کو قتل کر دیا۔

گلاب سنگھ نہایت زیرک انسان تھا۔ اس نے سلطنت انگریزی کے عروج کو بھانپ لیا۔ لہٰذا ان سے راہ و رسم شروع کر دی۔ ۱۸۴۱ء میں اس نے انگریزی فوج کو افغانستان پر حملہ کرنے کے لئے سکھ علاقہ سے گزرنے دیا۔ حالانکہ رنجیت سنگھ نے پہلی جنگ افغانستان کے موقعہ پر انگریزوں کو یہ رعایت نہ دی تھی۔ گلاب سنگھ نے انگریزوں کی سامانِ رسد سے بھی امداد کی۔ اس سلوک سے اس نے انگریزوں کو دوست بنا لیا۔

سکھوں کی پہلی جنگ ۴۶ - ۱۸۴۵ء کے دوران گلاب سنگھ نے خفیہ طور پر انگریزوں کی مدد کر کے اپنا مستقبل محفوظ کر لیا۔

شہر فیروز پور کی جنگ میں سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کر کے انگریزی لشکر کا صفایا کر دیا تھا جب رات ہو گئی اور دونوں فوجیں اپنے اپنے کیمپوں کو چلی گئیں تو اسی رات انگریزی کمانڈر نے سر ہنری ہارڈنگ گورنر جنرل کو جو کہ فیروز پور کے میدانِ جنگ سے قریب ہی خیمہ زن تھا یہ پیغام بھیجا۔

"کہ اگر سکھوں نے حملہ اسی تندی اور جوش سے دوبارہ کیا جیسا کہ انہوں نے کل کیا تھا۔ تو ایک انگریزی سپاہی بھی میدانِ جنگ سے زندہ بچ کر نہ جا سکے گا۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ ابھی رات کے اندھیرے میں فوج کو میدانِ جنگ سے ہٹا لیا جائے۔"

لیکن جواب آیا۔ "اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمے رہو۔ کل تمہارا پلہ بھاری رہے گا۔"

ایسے حالات میں جب نیم جاں انگریزی فوج پر صبح نمودار ہوئی۔ تو مخالف سکھوں کی فوج سے میدان خالی تھا۔ انگریزوں کی فتح اور سکھوں کی شکست کے لئے کیسی سازش کر دی گئی۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ ان دنوں پنجاب میں ایک قابل پولیٹکل افسر سر ہنری لارنس۔ جو کہ پہلی سکھوں

کی جنگ میں سر ہنری ہارڈنگ گورنر جنرل کا صلاح کار تھا۔ اس نے گلاب سنگھ کو کشمیر، لداخ اور بلتستان دینے کا وعدہ کرکے ساتھ ملا لیا تھا۔ گلاب سنگھ کا اثر سکھ دربار پر بہت تھا۔ اس نے فتح مند سکھوں کو راتوں رات واپس لوٹ جانے کی ترغیب دی اور سکھ کمانڈر نے اس کی بات مان لی۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اگر دوسرے روز سکھ لڑائی جاری رکھتے تو بقایا انگریزی فوج کا صفایا ہو جاتا۔ اس واقعہ کی تصدیق لفٹیننٹ جوزف کننگھم نے اپنی تاریخ (شائع شدہ ۱۸۴۹ء) سکھاں میں کی ہے۔ اس صاف گوئی کی بنا پر اس کو پولیٹیکل سروس سے پھر فوج کو بھیج دیا گیا۔

سبراؤں کی جنگ کے بعد گلاب سنگھ مصالحت کنندہ کے روپ میں نمودار ہوا اور سر ہنری لارنس کے صلاح کار کا کردار بھی ادا کیا۔ سکھ دربار کو کمزور کرنے کے لئے پنجاب کے حصے بخرے کر دئے گئے۔

اور تین حصوں میں اس کو تقسیم کر دیا گیا۔

۱۔ ایک حصہ سکھوں کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

۲۔ دوسرا حصہ انگریزوں کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

۳۔ گلاب سنگھ کی خدمات اور نقد ادائیگی کے صلہ میں کشمیر بمعہ پہاڑی علاقوں کے اُس کو دیا گیا۔ مہاراجہ کشمیر کا خطاب دے کر اس کو لاہور دربار سے آزاد کر دیا۔ اور سر ہنری لارنس کو مکمل اختیارات دے کر پنجاب میں ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔

کشمیر حاصل کرنے کے لئے گلاب سنگھ نے پچھتر لاکھ روپیہ قسطوں میں ادا کیا۔ جو اس نے شیخ سوداگر دلپسر مولا بخش ڈائرکٹر آرمی ٹرانسپورٹ و محکمہ رسد سکھ حکومت) سے لیا۔ اور اس کے صلہ میں اس کو وزیر بنا لیا۔

فروخت کشمیر کا یہ معاہدہ امرتسر میں ۱۵ مارچ ۱۸۴۶ء میں ہوا۔ جب معاہدہ کی تکمیل ہوئی یعنی انگریزوں کو فتح دلانے کے صلہ میں گلاب سنگھ کو کشمیر اور بیاس سے سندھ تک کا کوہستانی علاقہ دیا گیا۔ اور اُس کو اس علاقہ کا خود مختار راجہ مانا گیا۔ تو گلاب سنگھ اٹھا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر وائسرائے ہند کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ وہ ان کا زر خرید غلام ہے۔

اس فروخت پر جو اتنی کم رقم کے عوض ہوئی علامہ اقبالؒ نے اس کا ذکر شعروں میں کیا ہے ؎

باد صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی   حرفے ز ما بمجلس اقوام باز گوئے

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند   قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس واقعہ کی تصدیق تاریخ سکھاں مصنفہ کننگھم شائع شدہ لندن ۱۸۴۹ء سے ہوتی ہے۔

اس کے بعد جب مہاراجہ دلیپ سنگھ صغر سنی میں اپنی والدہ مہارانی جنداں کی سربراہی میں

سکھ تخت حکومت پر بیٹھا تو مہارانی جنداں نے گلاب سنگھ کو وزیر اعظم بنایا۔ یہ ایک سیاسی غلطی تھی۔ گلاب سنگھ نے حکومت کے تمام راز ہائے سلطنت سے انگریزوں کو باخبر کر دیا۔ سکھوں کی فوجی طاقت کو ناقص آلات حرب دے کر کمزور کر دیا جس سے سکھ سلطنت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

سکھوں کی دوسری لڑائی (مئی ۱۸۴۸ء تا فروری ۱۸۴۹ء) میں سکھوں کو گجرات کے میدان میں شکست فاش ہوئی۔ اور بقیہ پنجاب بھی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ اور سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ یہی گلاب سنگھ کی خواہش تھی کیونکہ طاقتور سکھ حکومت کی موجودگی میں وہ جموں اور کشمیر پر زیادہ دیر تک قابض نہ رہ سکتا تھا۔

سر لیپل گرفن اپنی تاریخ "رؤسائے پنجاب" میں گلاب سنگھ پر دوسری جنگ سکھاں کے شروع کرانے کا الزام دیتا ہے اور مزید لکھتا ہے کہ کس طرح گلاب سنگھ نے سکھوں کی شکست سے فائدہ اٹھایا سکھوں کی حکومت کے خاتمہ پر مہارانی جنداں اور دلیپ سنگھ کو جلا وطن کرکے ہندوستان بھیجا گیا۔

پہلے مہارانی جنداں کو ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء میں قلعہ شیخوپورہ میں۔ لاہور سے ۲۵ میل دور۔ رہنے کی جگہ تجویز ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد بنارس رہنے کا حکم ہوا۔ چندماہ وہ وہاں رہ کر پوشیدہ طور پر راجہ نیپال کے ہاں چلی گئی۔ ۱۸۶۲ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ کی خواہش پر انگلستان چلی گئی۔ وہاں ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا۔ دلیپ سنگھ کا انگلینڈ میں چار لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ وہاں اس نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اور وہاں ہی شادی کر لی۔

اگرچہ گلاب سنگھ نے کشمیر لے لیا۔ پھر بھی اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شیخ امام الدین گورنر کشمیر نے مقابلہ کیا۔ گلاب سنگھ کو انگریزوں سے درخواست امداد کرنی پڑی۔

لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے اپنے کمانڈر انچیف کو ۲۲ ستمبر ۱۸۴۶ء حکم دیا۔ کہ بریگیڈیر ویلر (WHEELER) جالندھر دوآب سے اپنی فوجوں کے ساتھ گلاب سنگھ کی مدد کرے۔ لاہور دربار کو بھی امداد کا حکم دیا گیا۔ یہ سب فوج امداد کے لئے تیار ہوئی۔ سر ہنری لارنس نے امام الدین گورنر کشمیر کو مقابلہ کرنے سے دست بردار کرا دیا اور وہ اکتوبر ۱۸۴۶ء میں کشمیر چھوڑ کر پنجاب میں انگریزوں کا پناہ گزین ہوا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ انگریزوں کی مدد سے سرینگر میں ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو داخل ہوا۔

کشمیر میں جگہ جگہ بغاوت ہوئی اور انگریزوں کی امداد سے لوگوں کو سخت سزائیں اور قتل عام کرکے مطیع کیا گیا۔ امن ہونے پر لوگوں پر سخت ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں لوگ غربت و افلاس کا شکار ہو گئے۔

سکھوں کی حکومت

کے ہزارہ میں آغاز کے اسباب

قاضی وہاب کے قتل کا معاملہ عہدِ دُرّانی کا آخری واقعہ ہے۔ اب سکھ طاقت پکڑ رہے تھے۔ رنجیت سنگھ نے دُرّانیوں سے خود مختاری حاصل کر لی تھی۔ لیکن سکھ ہزارہ میں ۱۸۱۸ء سے پہلے داخل نہیں ہو سکے۔ اُن کو ہزارہ میں داخل ہونے کی دعوت ایک قتل کے واقعہ سے ہوئی۔ ۱۸۱۸ء میں ہاشم خان ترک ساکن مانک رائے نے اپنے مقابل سردار کمال خان ترک کو قتل کر دیا۔ محمد خان ترین کمال خان کا طرفدار تھا۔ لہٰذا ہاشم خان نے اپنے بچاؤ کی خاطر سکھوں کو اپنی مدد کے لئے بُلا کر ملک سے غدّاری کی۔ اُس کی دعوت پر مکھن سنگھ حاکم راولپنڈی پانچ سو سواروں کے ساتھ آ کر اس ملک پر قابض ہو گیا۔ اور سرائے صالح میں اپنا قلعہ بنایا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۱۹ء میں کشمیر بھی فتح کر لیا۔ اور قلعہ اٹک بھی مہاراجہ کے تحت آ گیا۔ قلعہ اٹک کی حفاظت اور ملک پکھلی ہزارہ کے انتظام کے لئے بھائی حکم سنگھ چمنی کو مہاراجہ نے مقرر کیا۔ بھائی موصوف نے اپنے معتبر مکھن سنگھ نامی کو جو ایک دلیر آدمی تھا۔ ہزارہ کے معاملہ کی وصولی کے لئے مقرر کیا۔ مکھن سنگھ چند سوار لے کر آیا اور سرائے صالح میں قیام کیا۔ اور گڑھی خام جو پہلے سے موجود تھی اس کی مرمت کی۔ اس سے پہلے سردار مکھن سنگھ و جُون سنگھ راولپنڈی والوں کی طرف سے ایک دو فصل کا مالیہ بخشی بیکھراج نے ہزارہ سے وصول کیا۔ اور سرائے صالح میں گڑھی کی بنیاد رکھی۔ اور چند سپاہی اُس میں مقرر رکھے۔ جب مکھن سنگھ از جانب بھائی حکم سنگھ آیا۔ تو وہ سپاہی اُس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے فرمان کے مطابق کام کرنے لگے۔

اس وقت مبلغ بارہ ہزار روپیہ سال تمام کا ملک ہزارہ پر مقرر تھا۔ اور بموجب تقسیم ہر پٹی برابر ادا کرتی تھی۔ مکھن سنگھ کی آمد کے وقت فصل ربیع ۱۸۷۷ء بکرمی کا خام تھا۔ چند دن انتظار کے بعد جب فصل پکنے لگی تو مکھن سنگھ نے محمد خان ترین کو جو اس وقت گل ڈھیری میں تھا۔ برائے مالیہ خط لکھا۔ محمد خان نے جونہی اپنے منشی سے خط پڑھوا کر سنا۔ تو سخت جواب تحریر کیا۔ اس پر جانبین میں عداوت پڑ گئی محمد خان نے سب خوانینِ ہزارہ مشوانی اتمنولی وغیرہ کے ساتھ اتفاق کر کے سکندر پور مشہور بہ قاضی پور میں اپنی جمعیت اکٹھی کی۔ یہ سن کر مکھن سنگھ اپنے سواروں سمیت جو چالیس کے قریب ہوں گے سرائے صالح

سے روانہ ہوا۔ اور بہ مقام شاہ محمد ۱۸۲۰ء میں جنگ کی۔ مکھن سنگھ اگرچہ بہادر مرد تھا۔ لیکن ملکی لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ایک طرف چند سوار اور دوسری طرف ہزاروں ملکی اُولس دریائے دوڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بندوق سے فائر کر کے مکھن سنگھ کو گھوڑے پر سے گرا دیا۔ اور وہ وہیں مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اُس کے باقی آدمی فرار ہو گئے۔ اور قلعہ سرائے صالح میں جا کر قلعہ بند ہو گئے۔ اُن کا محاصرہ کیا گیا دو تین دن کے بعد جرگہ سیّد و علماء نے درمیان آ کر قسم و سوگند سے ان سپاہیوں کو قلعہ سے باہر نکالا۔ پیادہ سپاہی تو اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور سواروں نے قلعہ اٹک کی راہ لی۔ اور تین سپاہیوں نے وہاں جا کر حکماں سنگھ کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔

اس پر گورنر اٹک حکماں سنگھ چمنی فوج لے کر آیا۔ اور موضع موٹہ (نزد موضع ڈنگی) اور سلطان پور (براب دریائے ہرو) میں جنگ ہوئی۔ یہ جنگ ۱۸۲۱ء میں ہوئی اور محمد خان ترین نے مقابلہ کیا۔ اور حکماں سنگھ واپس چلا گیا۔ اس میں ڈنگی کے پانچ آدمی شہید ہوئے۔ وارث خان و سردار خان دو بھائی ڈنگی کے ترین اور تین نوکر ایک لوہار اور دو موچی۔ ان کی زیارت گاہیں اب بھی ڈنگی میں موجود ہیں) لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ مخالفین پر غالب نہیں آ سکتا۔ لہٰذا وہ واپس چلا گیا۔ اور لاہور امداد کے لئے لکھا۔ لاہور سے کرنل الٰہی بخش اور دیوان رام دیال اُس کی مدد کے لئے آئے۔ ہزارہ کا کچھ حصہ مطیع ہو گیا۔ لیکن محمد خان ترین، سید خانی اُتمان زئی اور مشوانیوں نے سکھوں کا مقابلہ بہ مقام ناڑہ۔ گندگر کے دامن میں کیا۔ سکھوں کو شکست ہوئی اور دیوان رام دیال مارا گیا۔ اس کی سمادھی موضع کانڈی کھلابٹ میں موجود ہے

۱۸۲۱ء میں رنجیت سنگھ نے سردار امر سنگھ مجیٹھیہ کو میدانِ ہزارہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ سوا تنیول اور تناولی کا علاقہ حکومت کشمیر کے ماتحت تھا۔ نیا گورنر ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف راغب کر لیا۔ دُرانیوں کے وقت کا بقایا مالیہ بھی وصول کر لیا۔ اور نیا خراج بھی لے لیا۔ لیکن جب وہ حسن علی خان کرڑال سے ناڑہ (تحصیل ایبٹ آباد) پر جنگ کر کے فاتحانہ واپس آ رہا تھا تو اس کی فوج پر عقب سے حملہ کر کے کرڑالوں نے اُس کی فوج کو تباہ کر دیا۔ اور سردار امر سنگھ خود بھی قتل ہو گیا یہ واقعہ نالہ سمندر کٹھہ معاون ہرو کے کنارے پر ہوا۔

اس واقعہ کو تاریخ مہتاب سنگھ میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ کہ ۱۸۲۱ء میں سردار امر سنگھ مجیٹھیہ جو ایک لائق افسر اور زمانہ کا بہترین تیر انداز تھا۔ ہزارہ کے انتظام کے لئے از طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ مامور ہوا۔ اور موضع کوٹ (کوٹ نجیب اللہ) مسکن مقدم مشرّف میں مقیم ہوا۔ اور رعایا کی خاطر داری اور حسنِ سلوک میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ بہت سے کسانوں کو تقاوی پر

تخم اور بیل دئے - اور لوگوں کی ہمدردی اور نیک نامی حاصل کی - بہت سے لوگ جو محمد خان ترین کی زبردستی اور تعدی سے ناراض تھے سردار موصوف کے پاس جمع ہوئے - اگرچہ سردار موصوف محمد خان کے ساتھ بھی حُسنِ سلوک سے پیش آتا تھا - لیکن اُس کی طرف سے بے فکر بھی نہ تھا -

سردار موصوف کو چند کم عقل اوباشوں نے مشورہ دیا کہ موضع نگری و مکول جو پرگنہ ناڑہ کرڑالاں سے متعلق ہیں اور حسن علی خان کرڑال کی جائے رہائش ہیں اور اُس وقت اُس کا باپ محمود خان کرڑال بھی وہاں پر موجود ہے اِن پر حملہ کیا جائے - میدان ہزارہ میں تاخت و تاراج سے رُعب داب سلطنت قائم کرنا مشکل ہے - لیکن نگری مکول کو ختم کرنا آسان تر ہے - اس نے دانا اور زیرک لوگوں سے مشورہ طلب نہ کیا - اور ایک سو پچاس سواروں اور مردم حشرات - راجہ ہائے خانپور یہ و مردم ہزارہ کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا - اگرچہ یہ دونوں مواضعات فتح ہو گئے - اور جو لوگ ان دیہات میں تھے اُن سے چند قتل بھی ہو گئے مگر بہت بھاگ گئے - اور دونوں گاؤں سے مال مویشی اور متاع کافی لُوٹ سے حاصل ہوا - لیکن پہاڑی علاقوں میں زبردست جمعیت کے بغیر انجام کار جنگ ختم نہیں ہو سکتی -

جس وقت کہ سردار موصوف خیریت سے واپس آنے لگا اور بعضے ملازمین اور مردم حشرات نے سامانِ لُوٹ مار لے کر اپنا راستہ لیا - تو سردار چند آدمیوں کے ساتھ رہ گیا - تھوڑی دیر بعد جب سب لوگ لُوٹ مار کا سامان لے کر بہت دور نکل گئے - تو سردار چند سواروں کے ساتھ وادی سمندر خان (سمند کٹھ) جو موضع سبھی کوٹ نگری و مکول کے نیچے واقع ہے طہارت کے لئے نیچے اترا - تاکہ طہارت کرنے کے بعد حسبِ معمول افیم کھا کر اور سوار ہو کر واپس جائے - اس اثناء میں ملکی لوگ، سمندرال، ڈھونڈ و چوکیال، ہر سہ قوم جو قرب و جوار میں رہتی تھیں - ڈھول کے ساتھ شور و غوغا کرتے ہوئے سامنے آئے اور سردار مذکور کا وادیٔ سمندر خان میں محاصرہ کر لیا - سردار مذکور اپنے چند سواروں کے ساتھ وادی کے نیچے ندی کے کنارے طہارت کے لئے بیٹھا ہوا تھا - ملکی لوگ چاروں طرف سے اُس کے سر پر جمع ہو گئے - سردار موصوف نے اپنی فوج اور حشری لوگوں کو مدد کے لئے بلایا لیکن اُن میں سے کوئی بھی واپس نہ ہوا اور نہ مدد دی - سردار نے کمان اُٹھائی اور تین دفعہ دشمنوں پر تیر چلایا لیکن ہر دفعہ زہ کمان سے اتر گئی - لاچار سردار مذکور نے بمعہ اپنے چھوٹے بھائی ہری سنگھ نہایت بہادری و سرخروئی سے جان دی اور دونوں بھائیوں کی لاشیں ایک ماہ یا زیادہ ندی کے کنارے پڑی رہیں آخر کار ہندوؤں اور برہمنوں کی درخواست پر لاشیں وہاں سے لا کر سرائے صالح میں جلائی گئیں - ان پر سمادھی بنائی گئی اور اب تک ڈھیری[1] قائم ہے -

[1] اب اس جگہ اور رنز دیک ہی برلب سڑک ایک باغ ہے -

اس پر لاہور سے مائی سدا[1] کور اور شیر سنگھ پسر رنجیت سنگھ معہ فوج لاہور سے آئے - انہوں نے میدان ہری پور میں اپنا کیمپ لگایا - اور تربیلہ میں ایک قلعہ بنایا - مالیہ پر نظر ثانی کی گئی اور مائی سدا کور نے محمد خان ترین کو اپنا مُنہ بولا بیٹا بنایا -

اسی اثناء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار ہری سنگھ کو جو حاکم کشمیر تھا - صوبہ کشمیر کا حساب دینے کے لئے لاہور بُلایا براستہ مظفر آباد و گڑھی حبیب اللہ اپنے سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ روانہ ہوا جب وہ مانگل پہنچا - تو جدون اور تنولی بہ تعداد پچیس ہزار اس کا راستہ روکنے کے لئے کھڑے ہو گئے - بات چیت سے فیصلہ نہ ہو سکا - اُس نے شہر مانگل پر حملہ کر دیا اور شہر کو جلا دیا - (آج تک اس رقبہ میں ہل چلاتے ہوئے لوگوں کو جلی ہوئی لکڑیاں اور پرانے برتن زمینوں سے ملتے ہیں) دو ہزار کے قریب ملکی لوگ قتل ہو گئے اور بہت سے آگ میں کود کر اور شہر پناہ سے چھلانگیں مار کر بھاگنے میں مر گئے - ہری سنگھ نے بطور سزا پانچ اور چھ روپیہ کے درمیان جرمانہ ہر جدون گھر سے وصول کیا - اُس میں فوج مقرر کی اور میدان ہری پور کی طرف روانہ ہوا - لاہور پہنچ کر مہاراجہ کی خدمت میں کشمیر سے خزانہ اور مال تحفہ پیش کیا - مہاراجہ اس سے اور اُسی کی فتح مانگل سے خوش ہو گیا اور اس سے گزشتہ حساب نہ لیا - اور اس کو تمام ہزارہ کا حاکم بنا دیا -

مانگل کی جنگ کی تفصیل مہتاب سنگھ کی تاریخ ہزارہ فارسی میں حسب ذیل ہے :-

سردار ہری سنگھ مہاراجہ کا حکم برائے حاضری لاہور ملتے ہی اپنے لشکر کے ساتھ براہِ مظفر آباد کشمیر سے روانہ ہوا (۱۸۲۱ء) اور منزلیں جلدی سے طے کرتا ہوا پکھلی میں داخل ہوا - یہاں پر محمد خان ترین کے اتفاق و معیت میں ہزارہ کے لوگ، افغان جدون اور تنولیوں نے جمع ہو کر موضع مانگل کا راستہ روک دیا - یہ راستہ تنگ و دشوار گزار ہے - سردار ہری سنگھ نے کہا کہ مجھے مہاراجہ صاحب نے جلدی لاہور بلایا ہے - لہذا آپ سب لوگ راستہ چھوڑ کر اپنے اپنے علاقوں کو چلے جائیں - اس کام کے لئے محمد امین خان صوابی کے چچا نجیب اللہ خان اور لالہ راج کنور جو کہ شنکیاری کے قلعہ کی فوج کا افسر تھا - کو وکیل بنا کر افغانوں کے پاس بھیجا - کہ تمہارے ملک کے ساتھ کوئی غرض نہیں - میں لاہور جا رہا ہوں - تاکہ مہاراجہ کے ساتھ شامل ہو کر منکیرہ کی مہم پہ جاؤں چونکہ میرا جانا ضروری اور فوری ہے

(نوٹ) منکیرہ : ملتان کے شمال اور جھنگ کے مغرب میں ہے - سکھوں کے زمانہ میں یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی - دوآبہ سندھ ساگر (مابین دریائے سندھ و جہلم) میں - منکیرہ میں ایک زبردست قلعہ تھا - اس علاقہ کے گورنر کے والد حافظ احمد خان نے جو برائے نام کابل حکومت کے ماتحت تھا - بہت عرصہ تک سکھوں کا مقابلہ کیا - لیکن اواخر ۱۸۲۱ء

لہٰذا راستہ چھوڑ دیں۔ مہاراجہ کا اپنے فوری حکم کی تہ میں مصر دیوان چند ندیم و مشیر کار دربار مہاراجہ کی انگیخت تھی۔ وہ سردار ہری سنگھ کا مخالف تھا۔ اور اُس نے مہاراجہ کے کان بھرے تھے۔ کہ سردار ہری سنگھ آپ کے ساتھ شامل ہو کر مہم منکیرہ میں شامل ہونا نہیں چاہتا اور سستی کر رہا ہے مصر مذکور کا بھائی بھی مہاراجہ کے پاس اسی قسم کی چغل خوری کر رہا تھا۔ ان باتوں کو سننے کے بعد سردار ہری سنگھ کی خواہش تھی کہ وہ جلدی لاہور پہنچ کر ان سخن سازوں کی باتوں کو ختم کردے اس واسطے وہ صلح صفائی کے ساتھ جلد ہی مانگل سے گزرنے کی کوشش کرتا تھا۔ نجیب اللہ خان و لالہ راج کنور جتنی نرمی و صلح جوئی سے بات کرتے تھے۔ افغان اتنے ہی زیادہ ضد کرتے تھے۔ اور سردار ہری سنگھ کی طرف پیغام بھیجا۔ کہ سردار کشمیر سے پشمینہ اور بے شمار دولت لایا ہے۔ ہم پشمینہ کا محصول اور اپنے راستے کے بدرقہ کا حق ضرور لیں گے۔ اگر سردار محصول و بدرقہ کا انکار کرتا ہے تو ہم ہرگز اُس کو اس راستے سے گزرنے نہ دیں گے۔ یہ بات سُن کر سردار اپنا ڈیرہ پکھلی سے کوچ کر کے مانسہرہ لے آیا۔ رات وہاں گزاری صبح پھر نجیب اللہ خان و لالہ راج کنور کو افغانوں کی طرف بھیجا۔ کہ مجھے جلدی جانا ہے اور چاہتا ہوں کہ تین روز کا سفر ایک روز میں طے کر کے مہاراجہ کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ دونوں مانگل میں پھر آئے اور بہت سمجھایا۔ لیکن جدونوں نے نہ مانا۔ یہاں تک کہ سردار کا ڈیرہ مانسہرہ سے کوچ کر کے سرحد جدون و پکھلی پر واقعہ بُت کے ساتھ فروکش ہوا۔ وقت نماز ظہر نجیب اللہ خان و لالہ راج کنور مایوس ہو کر ڈیرہ سردار میں حاضر ہوئے۔ اور افغانوں کی ضد و خودسری کے حالات بیان کئے کہ وہ کبھی بھی لشکر کا راستہ نہ چھوڑیں گے۔ صبح کے وقت سردار کوچ کر کے تکیہ مانگل جو مانگل سے بطرف شمال

بقیہ نوٹ ص۴۷

میں مہاراجہ رنجیت سنگھ خود مقابلہ کے لئے گیا۔ رنجیت سنگھ کی عزت مندانہ شرائط پہ قلعہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کا علاقہ اس کے عوض بطور جاگیر حافظ احمد خان کو دیا گیا (کننگھم تاریخ سکھاں ص ۱۵۶)

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری مورخہ ۳-۵-۱۸۴۸ء از ہری پور بجانب ریذیڈنٹ لاہور لکھا جب کہ اپریل ۱۸۴۸ء میں دیوان مولراج حاکم ملتان نے بغاوت کر دی تھی۔ کہ وہ ہزارہ سے فوجیں امداد کے لئے بھیجتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ راستہ میں منکیرہ کا زبردست قلعہ ہے اس کو فتح کر کے ملتان پر بڑھنا ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ منکیرہ کا قلعہ صحرا کے درمیان میں ہے کچی اینٹوں کا حصار ہے اور چاروں طرف خشک خندق ہے۔ اس کو پہنچنے کے لئے دریائے سندھ سے دو لمبی منزلیں طے کرنی ہوں گی۔ اور اس فاصلہ کے درمیانی کیمپ میں کنواں کھودنے کی ضرورت ہوگی۔

ایک بندوق کے فائر کے فاصلہ پر ہے، فروکش ہوا۔ پھر وکیلان مذکور کو افغانوں کی طرف کہلا بھیجا کہ اگر آج رات راستہ چھوڑ دیں اور اپنے گھروں کو چلے جائیں تو اُن کے لئے مفید ہے۔ اگر وہ نہ گئے تو صبح لشکر اسی راستے سے گزرے گا۔ اور پھر شکایت نہ کریں، یہ آخری اطلاع ہے۔ چونکہ اُولس افغان نے ۲۵ ہزار کی جمعیت بہم پہنچا لی تھی اور موضع مانگل کو مورچہ بندی و خاربندی سے محکم کر لیا تھا۔ انہوں نے تیسری بار بھی انکار ہی کیا۔ اور کہا کہ بغیر محصول ہرگز راستہ نہیں دیں گے۔ یہ وکیل اس دفعہ بھی مایوس لوٹے۔ ان کی جمعیت مورچہ بندی و پختگی موضع مانگل اور غرور و سرکشی افغانان سے سردار کو آگاہ کیا۔ یہ سن کر سردار نے کہا۔ کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ تلوار ہی آخری حیلہ اور علاج ہے۔ سردار موصوف نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا کہ صبح ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کس کو فتح اور کس کو شکست دیتا ہے۔ جو بھی شکست کھا گیا وہ نادم اور پشیمان ہوگا۔ پندرہ سولہ دفعہ سردار کو جوش آیا کہ حملہ کرے لیکن رات تھی خاموش ہو جاتا رہا۔ تمام رات سکھوں کا لشکر اپنے اوراد اور وظائف میں مصروف رہا۔ صبح سویرے فوج کا میمنہ اور میسرہ بنا کر مانگل شہر کے دروازے اور ڈیوڑھی سے جو جانب شمال تھی سید ھا اس پر حملہ آور ہوا۔ چونکہ اتنا فاصلہ نہ تھا۔ سردار کے سوار ہوتے ہی مانگل میں اُولس افغانان بندوقیں سر ہونی شروع ہو گئیں۔ لیکن لشکر سردار مانگل کی دیواروں کے نزدیک پہنچ گیا۔ چند آدمی بندوق سے قتل اور زخمی ہو گئے لیکن سردار موصوف اس بات سے بے پرواہ ہو کر شمشیر برہنہ بدست گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے مانگل کے دروازہ پر جا پہنچا۔ سکھ ہر طرف سے حملہ کر کے دیواروں پر چڑھ کر مکانوں کی چھتوں پر جا پہنچے۔ چونکہ سکھوں کا ستارہ اقبال بلندی پر تھا۔ بغیر سیڑھی اور ستون کے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ خوف سے مکانوں کے اندر چھپ گئے۔ سکھوں نے مکانوں کو آگ لگانی شروع کر دی۔ آگ کے لگتے ہی بہت سے لوگ مانگل سے نیچے کود پڑے۔ جس سے اُن کے ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گئے۔ افواہ ہے کہ دو ہزار کے قریب آدمی قتل ہوئے اور باقی کاہ در دہاں گرفتہ معافی کے لئے حاضر ہوئے اور جان بخشی کرائی۔ سردار موصوف کو بہت [illegible] خوشی ہوئی۔ جدونوں کے کل مددگار جو ہزارہ، تنول، ناڑہ [illegible] رہبر گلی وغیرہ سے لائے گئے تھے۔ سب اپنے گھروں کو بھاگ گئے۔ صبح کو جدونوں کا کل ملک خاک و خاکستر کر دیا جاتا۔ لیکن رات ہی کو جدون نواں شہر و دھمتوڑ کے کھتریوں کو ساتھ لے کر سردار موصوف کے سامنے حاضر ہوئے اور اپنی جسارت کا عذر کیا۔ کہ ہم لوگ زمیندار ہیں۔ ہمارا کچھ اختیار نہ تھا جو لوگ ہزارہ، تنول، ناڑہ و

نیلاں و بیرنگلی سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں مجبور کیا کہ پشمینہ کا محصول ہم ضرور لیں گے۔

سردار موصوف نے اُن کے جرم کو معاف کر دیا۔ اور حکم دیا کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر جا کر آباد ہو جائیں۔ کسی سے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے گی۔ اور فیصلہ اس بات پر ہوا کہ ہر گھر سے پانچ روپیہ آٹھ آنہ از تمام ملک جدون ہر سہ تپہ نواں شہر، مانگل، دھمتوڑ رجوعیہ سے تاوان بطور معاملہ سرکار لیا جائے۔ خانہ شماری کے لئے متصدی مقرر کر دئیے گئے۔ اور کل رقم جمع کر کے سردار کے خزانچی کے حوالے کر دی گئی۔ سردار نے چند دن نواں شہر میں ٹھہر کر گڑھی خام کی مرمت کر کے سپاہی مقرر کر دئیے۔ اس کے بعد وہ بمعہ فوج از راہ چنبہ، نوشہرہ ہزارہ کی طرف روانہ ہوا۔ محمد خان ترین نے اپنا اہل و عیال پہاڑ پر دگلا ڈھیری بھیج دیا۔ اور خود سری کوٹ کی طرف چلا گیا۔ اور اپنے بھتیجے بوستان خان کو سردار کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا۔ سردار موصوف بوستان خان کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور مہاراجہ صاحب والئی لاہور کے سامنے حاضر کر دیا۔

سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ کے دربار میں حاضر ہو کر بہت سے تحائف اور اعلیٰ گھوڑے بمعہ زین طلاء نقرہ اور نقد پیش کش کے طور پر پیش کئے۔ مہاراجہ صاحب والئ لاہور بے حد خوش ہوئے اور دربارِ عام میں اپنی زبان سے آفرین کہی۔ ایک ردی کاغذ ہاتھ میں لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے باآواز بلند کہا کہ یہ ملک کشمیر کے حساب کا کاغذ ہے اور یہ سردار ہری سنگھ کو مانگل کی فتح کے عوض میں معاف کر دیا گیا ہے۔ یہ کلمات سن کر سردار ہری سنگھ کے دوست خوش ہوئے اور دشمن نادم و پریشان۔

ہری سنگھ کا عہدِ حکومت

اور

ہزارہ کے واقعات ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۷ء

ہری سنگھ ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۷ء تک سوائے چند مختصر وقفوں کے ہزارہ کا حاکم رہا۔ اُس نے اپنی شجاعت اور طاقت سے ہزارہ کو مطیع کیا اور سکھوں کی حکومت کو مضبوط کر دیا۔

اُس کے حالات کو مہتاب سنگھ نے اپنی تاریخ ہزارہ (فارسی قلمی) میں تفصیل سے بیان کیا۔ جو من و عن درج ذیل ہے:-

کشمیر سے واپسی پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضری اور خوشنودی کے بعد سردار ہری سنگھ رخصت لے کر اپنے مسکن گوجرانوالہ میں آیا۔ موسم برسات اپنے وطن میں گزارا۔ دسہرہ کے مبارک دن پر

حسبِ دستور سب فوج اور افسران مہاراجہ کے حضور حاضر ہوتے تھے۔ سردار ہری سنگھ بھی حاضر ہوا دسہرہ کے ایام کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ پشاور کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں چھپلو جھنگی نزد راولپنڈی میں مقام کیا اور اپنی فوج کو سرداران پشاور سے گھوڑے لانے کے لئے روانہ کیا۔ اور بذات خود فوج کے ساتھ وہیں قیام کیا۔ یہاں پر محمد خان ترین بوساطت مصر دیوان چند جو سردار ہری سنگھ کا سخت دشمن تھا، مہاراجہ صاحب والئی لاہور کے سامنے پیش ہوا۔ مہاراجہ صاحب خان موصوف سے مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور خلعت عنایت کی۔ اور سردار ہری سنگھ کو ہزارہ کا حاکم بنایا۔ اور محمد خان ترین کو اُس کے ہمراہ رخصت کیا۔ اور سردار ہری سنگھ کو حکم دیا کہ وہ خان موصوف کی عزت وحرمت کا پاس کرے۔ اور بیس ہزار روپیہ کی جاگیر از ملک ہزارہ واگزار کرے۔

سردار ہری سنگھ نے بمعہ محمد خان ترین ۱۸۲۲ء میں وارد ہزارہ ہو کر ملک ہزارہ کی حکومت سنبھالی اور محمد خان ترین کو بیس ہزار کی جاگیر مندرجہ ذیل مواضعات سے دی۔

موضع جاگل، ڈھینڈہ، میلم، درویش، موضع بھیرہ، کالس عالم، گل ڈھیری، پنڈ خان خیل بمعہ بعض دیگر مواضعات۔

محمد خان ترین اس پر راضی نہ ہوا۔ اور کہا کہ اس کو پوری جاگیر بمطابق حکم نہیں دی گئی۔ صرف سترہ ہزار روپیہ کی جاگیر اس کو ملی ہے۔ اس پر مہاراجہ نے موضع پوڑ بعوض تین ہزار روپیہ کا پروانہ خان موصوف کو عطا کیا۔

اگرچہ خان موصوف کی تعظیم و تکریم از دربار مہاراجہ صاحب بہت ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ بوجہ تُند مزاجی کے راضی نہ ہوا۔ اور سردار ہری سنگھ کے ساتھ اَن بَن رہی۔ اُس کے ایماء پر لوگ معاملہ میں پس و پیش کرتے رہے۔ اور بہت سے لوگ بھاگ کر سری کوٹ میں جمع ہو گئے۔ اور بعض خوانین نے موضع سری دامن گندگر (نزد کالو پنڈ بھیرہ) میں پناہ لے رکھی تھی۔ اور معاملہ نہیں دیتے تھے۔

سردار علی الصبح سوار ہو کر بمعہ توپ و سوار و پیادہ سری (۱۸۲۲ء میں) پر حملہ آور ہوا۔ مخبران نے لوگوں کو حملہ کی خبر پہلے ہی دے دی۔ لوگوں نے اپنے اہل وعیال کو وہاں سے نکال کر پہاڑ پر بھیج دیا۔ اور خود گھروں میں قلعہ بند ہو گئے۔ سردار کی طرف سے توپ کے گولے اور بندوق کی گولیاں دیواروں پر لگ کر بے اثر ہو جاتی تھیں۔ اور محصورین کی جانب سے گولیاں سردار کے ملازمین کو لگتی تھیں دوپہر تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار ان لوگوں کی امداد کے لئے مشوانی، تربیلہ کے اتمان زئی۔ دریائے سندھ

سے پار کے یوسف زئی بھی پہنچ گئے۔ چند سکھ سپاہی جو پہاڑی پر چڑھ گئے تھے ان کو مشوانیوں نے حملہ کر کے وہیں ڈھیر کر دیا۔ سردار کو کامیابی کی امید نہ رہی۔ اور سردار کی فوج عاجز آ کر واپس آ گئی۔ مقدم مشرف خان جو اس وقت محمد خان کے خلاف اور سکھوں کا طرفدار ہو گیا تھا اس کے مشورہ سے سب فوج سکھوں کی اپنے مقام پر واپس آ گئی۔

قلعہ کرشن گڑھ کی تعمیر اور شہر ہری پور کی بنیاد ۱۸۲۳ء کو رکھی گئی۔ قلعہ ہرکشن گڑھ ابھی زیر تعمیر تھا مہاراجہ رنجیت سنگھ برائے سیر ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان وغیرہ کی طرف بمعہ لشکر روانہ ہوئے۔ اور سردار ہری سنگھ کو پروانہ بھیجا کہ وہ اپنی جمعیت کے ساتھ آ کر شامل ہو۔ یہ حکم ملتے ہی سردار ہری سنگھ نے دو سو سوار اور پانچ سو پیادہ سپاہی جوان دنوں ہی میں سنئے ملازم رکھے گئے تھے۔ اپنے بڑے لڑکے گوردت سنگھ کی زیر کمان ہزارہ کی حفاظت کے لئے چھوڑے۔ چونکہ یہ لڑکا خورد سال تھا لہٰذا اس کے خسر سردار ہرسا سنگھ کو اُس کا مشیر اور دارالمہام بنایا گیا۔ سردار ہری سنگھ خود مہاراجہ صاحب کی معیت کے لئے ڈیرہ اسمٰعیل خان کی طرف روانہ ہوا۔ منزلیں طے کرتا ہوا بمقام کوٹلہ خام مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

اُس کی غیر حاضری میں سردار ہرسا سنگھ نے کسی ضرورت کے لئے موضع درویش جو محمد خان کی جاگیر میں شامل تھا شیشم کا ایک درخت کٹوا لیا۔ محمد خان کو اس بات پر غصہ آیا۔ اور ڈھول بجوا کر ملکیہ لوگوں کو جمع کر کے قلعہ ہرکشن گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اور نوبت اس حد تک پہنچ گئی کہ کوئی سپاہی قلعہ سے باہر نہ جا سکتا تھا۔ سردار ہرسا سنگھ و گوردت سنگھ بہت تنگ ہوئے۔ لاچار سردار ہری سنگھ کو ان حالات سے بذریعہ عرضی باخبر کیا۔ یہ خبر بمقام شیب پور سردار موصوف کو ملی اور وہ فوراً یہ عرضی لے کر مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ مہاراجہ نے سردار موصوف کو بمعہ اپنی فوج اور سردار بدھ سنگھ کے ڈیرے کے ہمراہ رخصت کیا۔

ہزارہ پہنچنے کے لئے مسافت بہت تھی۔ اور طے کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ ہزارہ پہنچنے سے قبل قوم صواتی نے، نند حیاڑ، کونش اور بھوگڑ منگ سے جمع ہو کر قلعہ شنکیاری کا محاصرہ کر لیا۔ اور سپاہیوں کو قلعہ سے باہر آنا دشوار ہو گیا۔ موضع شنکیاری کے کھتری اور ہندو آبادی مسلمانوں کے خوف سے قلعہ کے اندر جمع ہو گئے۔ اور جو سامان وہ اٹھا کر لا سکتے تھے۔ وہ ساتھ قلعہ میں لے آئے جو سامان گھروں میں رہ گیا تھا۔ وہ لُوٹ لیا گیا۔ چند دن یہ محاصرہ قائم رہا۔ امداد آنے میں دیر ہونے کی وجہ سے لوگوں نے قلعہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اس اثناء میں تنولی اور افغان بھی جمع ہو گئے۔ جو لوگ قلعہ کے اندر تھے

ان سب کو قتل کر دیا۔ اور جو کھتری قلعہ کے اندر تھے ان کو قید کر کے بگری و نند حیاڑ کی طرف بھیج دیا۔ بعد میں ان کھتریوں اور عمر رسیدہ عورتوں سے جرمانہ لے کر رہا کر دیا۔ اور جوان عورتوں کو اپنے نکاح میں لے لیا۔

اسی طرح کا فساد علاقہ جدون میں بھی برپا ہو گیا۔ اور افغانوں نے قلعہ نواں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور اس پر بندوقوں سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ چونکہ قلعہ کے اندر ایک توپ تھی۔ اس واسطے نزدیک نہ آ سکے اور دور سے ہی بندوقیں چلاتے رہے۔ اور ابھی تک حملہ نہ کر سکے تھے۔ کہ سردار ہری سنگھ ہزارہ میں پہنچ گیا۔ پہنچتے ہی سردار ہرسا سنگھ کو آٹھ توپوں اور چند سوار و پیادہ کے ساتھ قلعہ نواں شہر کی امداد کے لئے بھیجا۔ سردار ہرسا سنگھ کے پہنچنے سے سپاہی حوصلہ مند ہو گئے۔ قلعہ میں خوراک کا ذخیرہ کم تھا۔ سپاہیوں کی طرف سے سردار ہری سنگھ کی خدمت میں عرض پیش کی گئی۔ کہ اس کا انتظام کیا جائے۔ سردار ہری سنگھ نے مزید امداد کے لئے مہاں سنگھ کو چند سوار و پیادہ کے ساتھ اور کچھ مبلغات برائے خرید جنس بھیجا۔ لیکن ان حالات میں جب کہ علاقہ کے لوگ محاصرہ پر بیٹھے تھے خرید جنس نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا مہاں سنگھ نے دو روز گزار کر تیسرے روز موضع نواں شہر پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ اہالیانِ دہ نے دیواروں اور مکانوں کی چھتوں پر مورچہ بندی کر رکھی تھی اور وہاں سے بندوقیں چلا رہے تھے۔ دو تین سوار اور تین چار پیادہ ان گولیوں سے قتل بھی ہوئے۔ لیکن اس نقصان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سردار مہاں سنگھ نے پُرزور حملہ کر دیا اور یکدم موضع نواں شہر میں داخل ہو گیا۔ پہلے پہل ایک مسجد جس میں تقریباً دو سو مسلمان جمع تھے، محاصرہ کیا۔ اور چاروں طرف سے مکان کو آگ لگا دی۔ بہت سے لوگ اندر ہی جل کر مر گئے اور جو باہر آئے اُن کو تلوار اور بندوق سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد نواں شہر کے لوگ گاؤں خالی کر کے بھاگ گئے۔ سکھوں نے نواں شہر سے جتنا غلّہ وہ سروں پر اٹھا کر لا سکتے تھے۔ لا کر قلعہ میں جمع کر دیا۔ اور مکمل فتح حاصل کر لی۔ تاکہ پھر کوئی اس طرح کی جرأت نہ کرے۔

سردار بدھ سنگھ سندھیانوالہ کی فوج سردار ہری سنگھ کے ساتھ ہزارہ میں آئی تھی۔ انہوں نے محمد خان ترین و ترک وغیرہ کو ورغلانا شروع کر دیا۔ سردار بدھ سنگھ نے ایک گھوڑا محمد خان ترین سے تحفہ کے طور پر قبول کر لیا۔ اور اس کی طرفداری کرنے لگا۔ اس کی شکایت سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ صاحب کی خدمت میں کی۔ مہاراجہ نے سردار بدھ سنگھ کو واپس بلا لیا۔ اور اس کی جگہ دوسری فوج بھیج دی۔

قلعہ نواں شہر کے محاصرہ کے اٹھ جانے سے بعد سردار ہری سنگھ بمعہ تمام فوج پکھلی کی طرف

روانہ ہوا۔ اور نواں شہر کی کارپردازی وتحصیل معاملہ کے لئے شاہ نام کھتری ساکن حضرو کو مقرر کیا۔

جب سردار مانسہرہ پہنچا تو وہاں ایک مضبوط قلعہ بنوایا۔ چند روز مانسہرہ میں ٹھہر کر ملک کے حالات سے آگاہی حاصل کی۔ کہ شنکیاری کے قلعہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے کتنی زیادتی کی۔ اور ہندوؤں کی عورتیں ابھی تک مسلمانوں کی قید میں ہیں۔ وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اور اس سوچ میں تھا کہ یکایک رات کو کسی جگہ پہنچ کر مسلمانوں کے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرے۔ اپنے رازداروں سے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مشورہ کرتا تھا۔ بے شمار دولت خواہوں نے سردار کو کہا۔ کہ تمام ملک پکھلی ویران ہے۔ کوئی صواتی گاؤں آباد نہیں۔ اگر کسی گاؤں میں کوئی ہے تو وہ صرف ضعیف، کمزور مزدور لوگ ہیں۔ اگر ہمت کر سکتے ہیں اور فاصلہ کی پرواہ نہیں کرتے تو ملک اگرور سولہ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ بلکہ پکھلی کے صواتی بھی وہاں ہی جمع ہیں۔ سردار ہری سنگھ نے یہ بات سن کر دوری کا خیال نہ کیا اور حملہ اگرور کی تیاری شروع کر دی۔ یہ تجویز خفیہ رکھی۔ اور فوج کو حکم دیا کہ دو تین روز کی روٹی پکا کر ساتھ لے لیں کہ کسی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ آدھی رات کو سوار ہو کر درہ اگرور کے راستہ پر روانہ ہوئے۔ چونکہ اس طرف جانا پہلی دفعہ ہوا تھا۔ راستہ بھول گئے اور رات پائیں پکھلی ہی میں گزر گئی۔

صبح روشنی ہونے پر اگرور کے راستہ پر روانہ ہوئے اور دوپہر کے وقت اگرور میں داخل ہوگئے۔ اگرور کی آبادی زیادہ تھی لیکن مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ ہر ایک نے اپنا اہل وعیال ساتھ لے کر فرار ہونا شروع کیا۔ فوج نے پہنچتے ہی مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ اور شنکیاری سے دو چند بلکہ زیادہ قتل عام کیا گیا۔ اور بچوں اور عورتوں کو قید کر کے فوج کے زیر حراست رکھا گیا۔ سکھوں کی فوج نے رات وہیں گزاری۔ دوسرے دن درہ کونش کی طرف کوچ کیا۔ درہ کونش وننجیاڑ سب بے چراغ ہو گئے تھے۔ ایک دن درہ کونش کے سر پر میدان چھتر میں فوج سردار نے قیام کیا۔ دوسرے دن شنکیاری کی طرف مراجعت کی۔ اور قلعہ شنکیاری کو از سر نو مرمت کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد چونکہ موسم برسات آگیا اس واسطے وہاں سے واپس ہو کر براہ مانسہرہ دیاوا (سرحد تناول کا شہر ہے) ہزارہ میں داخل ہوا۔

حبیب اللہ خان پدر محمد امین خان گڑھی والہ کی وساطت سے ایک ہندو عورت کے بدلے دو دو یا تین تین مسلمان قیدی دے کر سب کی خلاصی ہو گئی۔

سردار ہری سنگھ نے واپسی سے پہلے ہر قسم کے اجناس کا مکمل ذخیرہ گل۔ مانسہرہ وشنکیاری میں

جمع کرا دیا۔

جب سردار ہری سنگھ تنول پہنچا تو سربلند خان نے خوف کے مارے اپنے اہل وعیال وسامان خانگی کو نکال کر دور بھیج دیا۔ اور خود جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ جب سردار ہری سنگھ گلی شاہ متصل موضع بھوربج پہنچا تو تنولیوں نے بندوقوں سے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔

اگرچہ راستہ تنگ، پہاڑی اور دشوار گزار تھا۔ لیکن سردار بڑی ہمت و دلیری سے گزر گیا۔ اخسیری اور شنگڑی کو جلا دیا۔ جب سربلند خان لوگوں کی جمعیت کے ساتھ پہاڑی کی چوٹی ڈنہ پر چلا گیا تو سردار موصوف موضع دروازۂ بالا کے راستہ سے اوپر آیا۔ سربلند خان اس وقت اندوہ (وپنی) لوہا دان میں اپنی گڑھی میں تھا۔ اُس نے سردار کی آمد کی خبر سن کر اپنے بیٹے شیر محمد خان کو جو ایک بہادر اور شجاع مرد تھا۔ سردار کی فوج کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے ڈنہ پہاڑ کی چوٹی پر بھیجا۔ شیر محمد خان رات کے وقت اس چوٹی پر پہنچ گیا۔ اور بندوقوں سے جنگ شروع ہو گئی۔ سکھوں کی فوج بھاگ کر پتھروں کے نیچے چھپ گئی۔ اس وقت سردار ہری سنگھ نے سنتری کے ہاتھ سے بندوق لے کر خود شیر محمد خان پہ فائر کیا۔ گولی شیر محمد خان کو لگی۔ گولی لگتے ہی خان موصوف زمین پر گر گیا۔ باقی ماندہ لوگ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔ سکھوں نے حملہ کر کے اُن کا تعاقب کیا۔ بعض قتل ہو گئے اور بعض فرار ہو گئے۔ شیر محمد خان کا سر کاٹ کر لے آئے اور قلعہ کے دروازہ پر ایک لمبی لکڑی پر نصب کر دیا۔ سربلند خان کو اپنے اس بہادر، عادل، دیندار و ہوشیار فرزند کی موت سے اتنا صدمہ ہوا کہ خان و مال کو چھوڑ کر تنول سے وہ سری کوٹ میں آ کر مقیم ہو گیا۔ محمد خان ترین بھی وہیں تھا۔ دونوں یک جا ہو گئے لیکن کچھ چارہ کار نظر نہ آتا تھا۔

سکھ راج کے خیر خواہوں نے سردار ہری سنگھ سے کہا کہ جب تک گندگر یعنی سری کوٹ فتح نہیں ہوتا ملک میں امن و امان نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ پہلے اس قضیہ کا فیصلہ کیا جائے۔

سردار ہری سنگھ اپنی دلیری کی بنا پر اس معاملہ کو آسان سمجھا۔ اُس وقت اُس کے پاس سات ہزار بندوق، ایک سو زنبورہ اور دو توپیں تھیں۔ اس نے تسخیر سری کوٹ و تنبیہ قوم مشوانی و طاہر خیلی کے لئے اپنے نجومیوں سے ساعت سعید پوچھی۔ ان کی رائے پر شروع ماہ اسوج سنہ ۱۸۹۱ بکرمی (۱۸۳۴ء) حملہ کے لئے مقرر کیا۔ اور فوج وسامان کا خوب بندوبست شروع کیا۔

پہلے دن سردار کا ڈیرہ قلعہ ہرکشن گڑھ سے کوچ کر کے موضع ملکیار میں اقامت گزیں ہوا۔ دوسرے دن صبح طلوع آفتاب کے ساتھ ناڑہ۔ سید خانیاں۔ کے بالمقابل پہنچ کر حملہ شروع کر دیا۔ لوگ گاؤں

خالی کرکے پہاڑ پر چلے گئے ۔ اور سکھوں کی فوج ناڑہ کے مکانوں میں داخل ہوگئی ۔ لوگ پہاڑ پر سے آہستہ آہستہ سکھوں پر فائر کرتے رہے ۔ یہ حالت دوپہر تک جاری رہی ۔ اس وقت سردار نے اپنے افسروں کو تنبیہ کی کہ صبح سے اس وقت تک پہاڑ سے چند مسلمان گولیاں چلارہے ہیں اور تم میں کوئی ایسا نہیں کہ اوپر جاکر ان کو نیچے پکڑ لائے ۔ اس پر دو سکھ سردار اوپر گئے ۔ چونکہ پہاڑ پر چڑھنا مشکل تھا جو اوپر گئے زخمی ہوکر واپس آ گئے ۔ اور پہاڑی پر قبضہ نہ ہو سکا ۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ لوگ وہاں جمع ہوگئے ۔ دن چار گھڑی باقی تھا کہ سکھوں کے تمام افسر ہری سنگھ کے سامنے پیش ہوئے ۔ اُس کے سامنے بطور نصیحت گزشتہ واقعات شکست توپ خانہ الٰہی بخش خان اور دیوان رام دیال متوفی و دیگر افسران یاد کرائے ۔ اور کہا کہ آج پہاڑی پر قبضہ نہیں ہو سکتا ۔ پہاڑی پر چڑھنا مشکل ہے اور وقت بھی نہیں رہا ۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ کسی طریقہ سے واپس ہوکر اپنے ڈیرے کو چلے جائیں ۔ ایک دو دن کے بعد جب حالات بدل جائیں تو پھر حملہ کریں ۔ امید ہے فتح ہوگی ۔ چونکہ سردار طبعاً تند و تیز مزاج اور جابر تھا ۔ کسی کے کہنے پر عمل نہ کیا ۔ بلکہ افسرانِ مجلس پر طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا ۔ کہ اُن کو جان عزیز ہے ، اور اپنے بال بچے ، جاگیریں ، ملک اور مختلف نعمتیں یاد آرہی ہیں ۔ اور موت کے ڈر سے جنگ نہیں کر سکتے ۔ اگر اس جگہ سے بغیر فتح چلے جائیں تو کس جواں مردی پر مہاراجہ کو منہ دکھائیں گے ۔ یہ گفتگو کی ۔ اور دو آدمی اُن افسروں کی طرف جو زیارتِ شاہ شیر محمد غازی میں اور کچھ دریائے دوڑ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے ۔ پیغام دے کر بھیجے ۔ کہ سردار ہرسا سنگھ کالیہ ، دھیان سنگھ اور دوسرے افسروں کو کہو ۔ کہ جب کبھی روزانہ دربار لگتا تھا ۔ تو تم سب دربار میں جمع ہوتے تھے اور محفل خورد و نوش و رنگ تماشا میں ہر وقت موجود ہوتے تھے ۔ آج موت کے ڈر سے الگ ہوکر گوشہ گیر ہو جانا مناسب نہیں ۔ تمہارے شایانِ شان یہ بات ہے کہ جس کسی کو ہمارے ساتھ محبت و اتفاق کا دعوے ہو ۔ وہ یہ پیغام سنتے ہی حاضر ہو جائے ۔ اور جس کسی کو اپنی جان و مال اور اہل و عیال عزیز ہوں تو پھر اس کا اختیار ہے ۔ سردار ہری سنگھ کا یہ پیغام ہر ایک افسر نے سنا ۔ لیکن کوئی بھی سردار کی طرف راغب نہ ہوا ۔ مگر مہاں سنگھ جو ان دنوں سردار کے زیرِ عتاب تھا ہمت کرکے اپنے ایک دو جوان بھائیوں کے ساتھ سردار کی خدمت میں حاضر ہوگیا ۔ سردار نے بطور استہزاء کہا ۔ یہ جنگ ہے ۔ بچوں کا کھیل نہیں کہ تم ان کے ساتھ واپس آئے ہو ۔ مہاں سنگھ نے جواب دیا کہ جناب جو کچھ بھی ہوں ، زندہ یا مردہ ۔ آپ کا نمک خوار ہوں ۔ اس وقت اور کوئی نہیں آتا تھا اور میں حاضر ہوگیا ۔

اتنے میں سورج کے غروب ہوتے ہی مسلمانوں نے سردار کے کوٹھے کو جس میں اُس کے ساتھ چند اور آدمی بیٹھے تھے ۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ محاصرہ کر لیا ۔ اور تیزی سے بندوقوں کے فائر شروع کر دئے ۔ یہ کوٹھا مضبوط دیواروں والا تھا جب دیکھا کہ گولی اندر نہیں جا سکتی تو انہوں نے دیواروں میں سوراخ کرکے گولیاں برسانی شروع کر دیں ۔ اسی طرح ان سکھوں پر بھی جو دوسرے کوٹھوں میں تھے حملہ شروع کر دیا ۔ اور اتنا تنگ کیا کہ سب افسر اپنی تمام سپاہ کے ہمراہ کوٹھوں سے نکل کر اپنے ڈیروں کو چلے گئے ۔ سردار کو ساتھیوں نے مطلع کیا کہ سب لوگ سوائے اس کے چلے گئے ہیں ۔ اب کیا کریں ، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کوٹھے سے نکل کر باقی سپاہ سے مل جائیں ۔ اگر مرنا ہے ۔ تو جنگ کرکے مرنا اس سے بہتر ہے کہ یک جا کوٹھے میں بیٹھ کر جان دے دیں ۔ سردار اس بات پر راضی ہوگیا ۔ اور پہلے مہاں سنگھ کے چھوٹے بھائی کشن سنگھ کو باہر نکالا ۔ مسلمانوں نے اس کو باہر نکلتے ہی قتل کر دیا ۔ اس کے بعد سردار مہاں سنگھ و سردار ہری سنگھ دونوں باہر آئے ۔ دونوں زرہ پوش تھے ۔ مسلمانوں نے اُن پر پتھر مارے اور تلوار کے وار کئے ۔ سردار ہری سنگھ کوٹھے کے ساتھ کی پہاڑی سے چھلانگ لگا کر نیچے گر پڑا ۔ مہاں سنگھ اس سے قبل ہی چستی سے باہر آگیا تھا اور بچ گیا ۔ جب وہ اپنی فوج کے ساتھ آکر مل گیا تو ہر ایک سے پوچھتا تھا کہ سردار ہری سنگھ یہاں آیا تھا کہاں گیا ۔ ہر ایک اس سے کہتا تھا کہ کیا تُو دیوانہ ہو گیا ہے ۔ سردار ایک پہر دن رہتا تھا کہ مارا گیا تھا ۔ تو اب اس کا پوچھتا ہے کہ یہاں آیا تھا ۔ جب یہ تکرار زیادہ ہوا تو ہری سنگھ نے جو نزدیک ہی مجروح پڑا تھا سُن لیا ۔ اس نے سوچا کہ اگر بلند آواز سے مہاں سنگھ کو پکارتا ہوں تو مسلمان جو نزدیک ہیں سن کر حملہ کر دیں گے ۔ اور لشکر جو پہلے ہی ہزیمت خوردہ ہے ۔ بھاگ کھڑا ہوگا ۔ اور اس کو بھی جان سے مار دیں گے ۔ اس خیال سے سردار ہری سنگھ نے ایک سپاہی کا جو دوسرے ڈیرہ سے تھا پاس سے گزرتے ہوئے دامن پکڑ کر کھینچا اور آہستہ سے اس کے کان میں کہا کہ " میں سردار ہری سنگھ ہوں تو مجھے وہاں پہنچا جہاں سکھ اور مہاں سنگھ باتیں کر رہے ہیں "

سپاہی نے سردار کو پہچان لیا ۔ اور اپنی پیٹھ پر ڈال کر سردار مہاں سنگھ کے پاس پہنچا دیا ۔ مہاں سنگھ نے ہری سنگھ کو ایک دھونسہ (گھوڑے کی پیٹھ پر ایک بڑا نقارہ اعلان کے لئے رکھتے تھے اس کو دھونسہ کہتے تھے) والے کے گھوڑے پر جو پاس ہی کھڑا تھا اپنے پیچھے بٹھا لیا اور چند سواروں اور پیادوں کو لے کر قلعہ ہرکشن گڑھ کی طرف روانہ ہوگیا ۔ جب کھلابٹ پہنچے تو راستہ میں بوستان خان ترین برادر زادہ محمد خان بمعہ چند پیادہ نفر بمعہ بندوق توڑہ دار ہاتھ میں

لئے ہوئے بیٹھا تھا۔ سردار جہان سنگھ کو دیکھ کر تواضع کی اور کہا کہ رات یہاں ہی گزارے۔ جہان سنگھ کو فکر ہوا کہ اگر وہ کھڑا ہو کر یہ ظاہر کرے کہ سردار ہری سنگھ زخمی ہو گیا ہے اور اس کو ڈیرہ کی طرف لے جا رہا ہے۔ تو مسلمان جو متحد و متفق ہیں حملہ کر کے سردار کو اور اس کے تمام ہمراہیوں کو قتل کر دیں گے۔ اسی خوف کی وجہ سے اس گاؤں سے چارپائی بھی نہ لی۔ اور آگے روانہ ہو گیا۔ پڑھانہ پہنچ کر ایک زمیندار کی چارپائی پر جو کھیت میں پڑی تھی سردار ہری سنگھ کو ڈال کر ہرکشن گڑھ پہنچا دیا۔ رات کا کچھ حصہ گزر چکا تھا کہ سردار ہری سنگھ زخمی حالت میں قلعہ کے اندر پہنچ گیا۔ باقی فوج دوسرے دن دوپہر تک اپنے ڈیرہ پر پہنچ گئی۔

اس جنگ میں سردار جمیعت سنگھ اپنے خورد سال چھوٹے بھائی، و مولراج افسر ایک ہزار سوار اور دوسرے چھوٹے چھوٹے افسران اور بمعہ فوج کے کل چار سو کے قریب قتل ہوئے۔ مسلمانوں کی جانب سے دو چار آدمی زخمی ہوئے۔ بہت سا سامان، اسلحہ جات شمشیر بہ قبضۂ طلاء بندوقیں بمعہ ساز طلاد و نقرہ و چار آئینہ[1] و پیٹی ہا وغیرہ سکھوں سے مسلمانوں نے لوٹ لیا۔

سردار ہری سنگھ پتھروں کی ضربات سے بہت زیادہ زخمی اور کمزور ہو گیا تھا۔ اور باہر نہ نکل سکتا تھا۔ ملکی لوگوں نے اس کی موت کا اعلان کر دیا۔ اور ایک سکھ جو نلوی تھا اور سردار ہری سنگھ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اور جنگ ناڑہ میں قتل ہو گیا تھا اس کا سر کاٹ کر سری کوٹ لے گئے۔ اور وہاں لٹکا دیا۔ اور مشہور کر دیا کہ یہ سردار ہری سنگھ کا سر ہے۔ یہ خبر دور و نزدیک مشہور ہو گئی۔

جب جنگ کی یہ خبر مہاراجہ کو پہنچی تو یہ سنتے ہی خود بمعہ زبردست فوج، سامان جنگ ساتھ لے کر بعجلت تمام ہزارہ کی طرف روانہ ہوا۔

چند ہفتوں بعد سردار ہری سنگھ مالش و علاج سے رو بصحت ہو گیا۔ اور لوگوں کو اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دینے کے لئے علاقہ بگڑہ پر حملہ کا ارادہ کیا۔ رات سے ایک گھڑی[2] باقی تھی کہ سوار اور پیادہ فوج کے ہمراہ مواضعات علاقہ بگڑہ کی طرف جہاں بہت سے فراری لوگ بھی جمع تھے۔ حملہ کے لئے روانہ ہوا۔ سورج نکلتے ہی کہ زمیندار ابھی خواب غفلت سے اچھی طرح بیدار نہ ہوئے تھے۔ اُن کے سر پر جا پہنچا۔ افغان قوم سے جن لوگوں کو اسلحہ بند پایا ان کو قتل کر دیا۔

---

[1] چار آئینہ لوہے کی چار پلیٹیں جو جنگ کے وقت سینے پر اور جسم کے پچھلے حصہ پر دائیں بائیں باندھ لیتے تھے۔ یہ چاروں پلیٹیں زنجیروں سے جوڑ بھی لیتے تھے ایک طرف کھلی رہتی تھی جسے ڈوریوں سے باندھ لیتے تھے پرانے زمانے میں حفاظت کا خاص ذریعہ تھا۔ [2] گھڑی گھنٹہ کا ⅖ حصہ یعنی چوبیس منٹ

اور جو امان طلب کرنے کے لئے کاہ در دہان گرفتہ حاضر ہوئے ان کو امان دے دی گئی۔ اور مال و اسباب سب لوٹ کر واپس آ گئے۔ اُس وقت لوگوں کو یقین ہو گیا کہ سردار ہری سنگھ زندہ ہے ملکی لوگوں کو خوف و ہراس پیدا ہوا اور لوگ بھی محتاط ہو گئے۔

اس کے بعد مہاراجہ صاحب والئی لاہور بمعہ لشکر کشیر وارد ہزارہ ہوئے۔ اور دامن گندگر میں موضع جاگل و بھیرہ کے متصل قیام کیا۔ اپنی فوج کے تمام افسروں کو حکم دیا کہ کوہ گندگر پر جا کر سب افراد مشوانی و دیگر کوہستانیوں کو گرفتار کر کے لے آئیں اور پیش کریں۔

محمد خان ترین و ملک صالح محمد مشوانی و سربلند خان تنولی سب سری کوٹ میں موجود تھے۔ ان سب کے نام حکم جاری کیا کہ وہ سب حاضر حضور مہاراجہ صاحب حاضر ہو جائیں۔ یہ تینوں مہاراجہ کے حضور حاضر ہو گئے لیکن دوسرے لوگ، رعایا ملکان و مزارعان اپنی جان اور عزت کے خوف سے بمعہ اہل و عیال بھاگ کر سندھ پار چلے گئے۔ لیکن چند محض عاجز ضعیف اور مفلس لوگ ادھر ادھر پہاڑ پر ہی منتشر ہو گئے۔ اس طرح دو تین دن کے بعد جب فوج واپس آ گئی تو وہ اپنے گھروں میں آ گئے۔

یہاں سے مہاراجہ صاحب براہ تربیلہ ملک یوسف زئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ رات تربیلہ میں مقیم ہوئے دن کے وقت مہاراجہ صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کی سیر کو روانہ ہوئے۔ افغانان کھبل نے جب مہاراجہ کو دیکھا تو دریا پار سے ان پر بندوق سے فائر کئے۔ اس گستاخی سے مہاراجہ بہت ناراض ہوئے اور حکم دیا کہ صبح کے وقت کھبل کو خاک سیاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ صبح کے وقت مہاراجہ صاحب خود تو کوچ کر کے پایاب دریائے سندھ سے پار چلے گئے۔ اور نصف افسران بمعہ فوج نے جا کر موضع کھبل و کیا کو جن کو لوگوں نے پہلے ہی خالی کر دیا تھا اور بمعہ اہل و عیال کے پہاڑوں پر چلے گئے تھے، جلا کر خاکستر کر دیا۔ اور شام کو مہاراجہ کے ڈیرہ پر جو بیہور میں تھا آ کر شامل ہو گئے۔

اُسی وقت پائندہ خان تنولی نے اپنے وکیلوں کی زبانی مہاراجہ کو پیغام بھیجا۔ کہ وہ اپنے بیٹے کو دربار میں بھیجنا چاہتا ہے۔ لہذا مہاراجہ صاحب کسی معتبر آدمی کو بھیج دیں۔ تاکہ وہ اس کو لے جائے مہاراجہ صاحب نے جہان سنگھ کو اس کام کے لئے بھیجا۔ لیکن اسی اثناء میں مہاراجہ صاحب کا ڈیرہ بیہور سے کوچ کر کے علاقہ یوسف زئی کی طرف جا چکا تھا۔ لہذا پائندہ خان نے اپنے بیٹے کو بھیجنے میں پہلو تہی کی۔

محمد خان ترین، سربلند خان تنولی اور ملک صالح محمد خان مشوانی مہاراجہ کے ہمرکاب تھے۔ اور اُن کا روزانہ خرچ مہاراجہ صاحب دیتے تھے۔ اُن کو ساتھ لیتے ہوئے لاہور روانہ ہوئے۔ جب مہاراجہ

کاڈیرہ سرائے کالا پہنچا تو محمد خان ترین نے رخصت کی اجازت چاہی۔ تو صبح کے وقت اس کو بہ طریق قیدیاں ہاتھی پر سوار کر کے سردار جھنڈا سنگھ جو کہ مہاراجہ کا ندیم خاص تھا حکم دیا کہ وہ ساتھ جائے اور محمد خان کا بازو سردار ہری سنگھ کے ہاتھ میں ڈال کر رسید لائے۔

سردار ہری سنگھ کو مہاراجہ صاحب نے یوسف زئی روانہ ہونے کے وقت حکم دیا تھا کہ قلعہ سری کوٹ کو مرمت کر کے محکم کر دیا جائے۔ ہری سنگھ نے قلعہ مرمت کر کے اس میں پانچ سو سپاہی مقرر کر دئیے اور اُسی روز واپس ہزارہ میں پہنچا۔ جس دن کہ (جھنڈا سنگھ) محمد خان کو لایا۔ اور ہری سنگھ کے حوالہ کیا۔ اور مہاراجہ کا حکم سنایا۔ کہ محمد خان کے بازو کے عوض مہاراجہ صاحب ایک لاکھ روپیہ آپ سے لیں گے۔ ہری سنگھ نے ایک لاکھ روپیہ کی ادائیگی سے گھبرا کر محمد خان کو نہ لیا۔ اور واپس ہاتھی پر سوار مہاراجہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ اور عرض کی۔ "کہ تمام ملک، مال اور دولت حضور مہاراجہ کی ہے۔ اگر حضور کا حکم ہو تو میں آپ کی ہمرکابی کے لئے حاضر ہو جاؤں۔ اس ملک سے اتنا روپیہ وصول نہیں ہو سکتا۔ اس ملک کی آمدنی سے صرف سپاہ کا خرچ ہی پورا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ روپیہ کہاں سے لاؤں؟"

مہاراجہ صاحب اس پر محمد خان کو ساتھ لاہور لے گئے۔ اور بطور قیدیاں زیر حراست رکھا۔ صرف روزانہ خرچ اس کو دیتے تھے۔ تاوقتیکہ سردار ہری سنگھ ۱۱ مگھر سنہ ۱۸۸۱ بکرمی مطابق سنہ ۱۸۲۴ء کو قلعہ ناڑاں کرڑالاں کی تعمیر کے لئے روانہ ہوا۔ پہلے روز کشن گڑھ سے کوچ کر کے سرائے صالح میں قیام کیا۔ رات کے وقت بارش شروع ہو گئی۔ اور لگاتار چار روز بارش برستی رہی۔ پانچویں دن بارش ختم ہوئی۔ خیمہ جات کے خشک ہونے پر ناڑہ کی طرف کوچ کیا۔ سردار مہاں سنگھ کو بمعہ فوج کے پاپیادہ براہ بگڑہ وکہیر کی جانے کا حکم دیا اور خود سوار ہو کر بمعہ فوج براہ چھیہڑ سجی کوٹ میں داخل ہوا۔ اس کی جگہ پر حسن علی خان کرڑال حاضر خدمت ہوا۔ ایک رات سجی کوٹ میں گزاری اور حسن علی خان کو نگری، مکول وغیرہ ملک سے موروثی جاگیر عطا کی۔ اس کے ایک لڑکے کو ہمراہ رکھ کر قلعہ ناڑہ کی تعمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ابھی قلعہ کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی کہ برف باری شروع ہو گئی۔ اور اتنی زیادہ ہوئی کہ خیموں پر دو تین ہاتھ جمع ہو گئی۔ اور لوگ بہ سبب سخت سردی اور راشن نہ پہنچنے کی وجہ سے تنگ ہو گئے۔ اور سردار کو اس سخت سردی میں ایک دو دن کے لئے سخت بخار ہو گیا۔ مجبوراً سردار مہاں سنگھ کو اس جگہ تعمیر قلعہ کے لئے چھوڑ کر خود بمعہ فوج باندھی مشعل خان میں آ کر ڈیرہ کیا اس جگہ سے جنس و دیگر سامان کے بھیجنے کا انتظام کرتے رہے۔ ایک ماہ کے عرصہ میں قلعہ کی تعمیر کا

کام مکمل ہو گیا۔ اس میں حسن شاہ سید ساکن مانگلائے کو مقرر کر کے تھانہ میں سپاہی مقرر کر دئیے۔ اور سردار ہری سنگھ بمعہ سردار مہاں سنگھ ہزارہ کی طرف واپس ہوئے۔ دو چار روز کے بعد مہاں سنگھ کو خلعت فاخرہ بمعہ شمشیر و سپر و اسپ عنایت فرما کر ہزارہ کی حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دی۔ دو سو سوار اور ایک ہزار پیادہ فوج اس کے ساتھ مقرر کی۔ اس فوج کے علاوہ قلعہ جات گلی، دربند، شنکیاری، سری کوٹ، مانسہرہ، نواں شہر و ناڑہ کرڑالاں کی فوج بھی اس کے ماتحت تھی۔ خود سردار ہری سنگھ معہ لشکر لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں حضور مہاراجہ کا سلام کرنے کے بعد موسم برسات اپنے گاؤں گوجرانوالہ میں گزارنے کے لئے آ گیا۔ دسہرہ کے موقع پر پھر وہ مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

دسہرہ منانے کے بعد مہاراجہ نے سردار ہری سنگھ کو ملک راولپنڈی، دھنی، گھیب، کھاٹڑ و چھچھ کے معاملہ کی تحصیل کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور مہاراجہ کی خواہش کے مطابق محمد خان ترین کو بعوض پچاس ہزار روپیہ سکہ نانک شاہی لے کر وارد راولپنڈی ہوا۔

مہاں سنگھ کی حکومت کے وقت بوستان خان برادرزادہ محمد خان ترین اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا (جو اس سے پہلے محمد خان ترین کی گرفتاری کے وقت وہ معہ اہل و عیال فرار ہو کر کوہستان چلا گیا تھا) سردار مہاں سنگھ نے خان موصوف کے ذریعہ معاش کے لئے ایک ہزار کی جاگیر مقرر کر کے اس کو سردار ہری سنگھ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سردار ہری سنگھ نے اس کو مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ مہاراجہ صاحب نے پروانہ جاگیر کی منظوری دے کر رخصت کر دیا۔ اور شیر گڑھ میں رہنے کی اجازت دی۔ سردار ہری سنگھ معہ محمد خان ترین کے راولپنڈی پہنچے تو سردار مہاں سنگھ ہزارہ سے برائے سلام بمعہ فوج حاضر ہوا۔ ابھی ایک دو دن ہی گزرے تھے کہ بوستان خان ترین برادرزادہ محمد خان ترین کے ورغلانے پر مشوانیوں نے قلعہ سری کوٹ کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین نے سری کوٹ کی جانب سے ایک آدمی برائے اطلاع حالات سردار کی خدمت میں پہنچا۔ اور حالات کی تنگی بیان کی۔ کہ تین چار دن میں حوض سے پانی ختم ہو جائے گا۔ اور کوئی سپاہی باہر نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ بہت سے مشوانیوں نے جمع ہو کر قلعہ کا سخت محاصرہ کر رکھا ہے۔ سردار ہری سنگھ نے اسی وقت سردار مہاں سنگھ کو اس کی فوج اور اپنی طرف سے کچھ اور فوج دے کر ہزارہ کی طرف بھیجا۔ تاکہ رسد وغیرہ کا بندوبست کرے اور وہ خود اس کے پیچھے جلدی سے آ رہا ہے۔ دوسرے روز سردار ہری سنگھ بھی پہنچ گیا۔ اور موضع جاگل کے متصل اپنا ڈیرہ لگایا۔ شام کے وقت مشوانیوں نے کوہ گندگر پر ہزاروں جگہ روشنی کی تاکہ معلوم ہو کہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ سردار ہری سنگھ اگرچہ بہت دلاور اور شجاع آدمی تھا۔ لیکن

گزشتہ شکست نارڑہ نے اس کو بہت محتاط کر دیا تھا۔ لہذا وہ حملہ کرنے میں پس و پیش کر رہا تھا۔ ونتورہ (VENTURA) صاحب نے بحکم مہاراجہ صاحب پشاور کے سرداروں سے مقرر گھوڑے خراج حاصل کرنے کے لئے بمعہ تین پلٹن واہ متصل حسن ابدال میں آکر مقام کیا۔ اُسی وقت سردار ہری سنگھ نے ایک دوستانہ خط لکھ کر ایک معتبر آدمی کے ہاتھ اُس کو بھیجا ونتورہ (VENTURA) صاحب نے اس معتبر سے اس کام کے لئے مہاراجہ صاحب کا حکم مانگا۔ معتبر نے جواب دیا۔ "کہ اس وقت مہاراجہ کا حکم حاصل کرنا عراق سے تریاق لانا ہے۔ اور قلعہ سری کوٹ اس اثنا میں مفتوح ہو جائے گا۔ اور آپ پر بھی روشن ہے۔ کہ اگر قلعہ سری کوٹ نہ رہا تو پھر مہاراجہ صاحب کے بذاتِ خود آنے کے سوا اور کون گندگر میں قدم رکھ سکتا ہے۔" آخر ونتورہ صاحب نے اپنی تینوں پلٹنوں کے ساتھ آکر ہری سنگھ کے پاس موضع جاگل میں ڈیرہ کیا۔ دو گھڑی رات گزرنے کے بعد ونتورہ صاحب، سردار ہری سنگھ، سردار مہاں سنگھ و مقدم مشرف نے تنہائی میں باتیں کیں۔ مقدم مشرف نے کہا کہ اس سب فساد کی بنیاد میدان ہزارہ سے اٹھتی ہے جب تک اس بنیاد کا تدارک نہ کیا جائے گا۔ یہ فساد کبھی ختم نہ ہوگا۔ سب نے مقدم مشرف کے مشورہ کو پسند کیا۔ سردار ہری سنگھ نے اسی وقت پچیس سوار بھیج کر بوستان خان کو جو جاگل میں موجود تھا۔ گرفتار کر لیا۔ اور پچیس سوار سرائے صالح بھیجے تاکہ جلال خان دلازاک کو گرفتار کریں۔ اور اتنے ہی سوار راجہ ہاشم خان ترک کو گرفتار کرنے کے لئے مانکرائے بھیجے۔ چنانچہ یہ سب گرفتار ہو کر قلعہ ہرکشن گڑھ میں راتوں رات پہنچا دئے گئے۔

صبح سویرے دو گھڑی رات باقی تھی کہ سب لشکر طرم، تنبورہ اور ڈھول کی آواز پر تیار ہو کر سری کوٹ کی جانب روانہ ہوا۔ اور راہ سری کوٹ کے محافظ دستوں سے بندوقوں سے جنگ شروع ہو گئی۔ ونتورہ صاحب نے حزم و ہوشیاری سے ہر ایک پلٹن سے ایک ایک کمپنی بنائی اس طرح سے تین تین کمپنیوں کی ایک ٹکڑی فاصلہ سے ایک دوسرے کے بعد مارچ کرتے ہوئے روانہ ہوئی اُن کو حکم تھا۔ یہ تین تین کمپنیوں کی ٹکڑی یک جا مارچ کرتی رہے۔ نہ کوئی ان سے آگے جائے اور نہ کوئی پیچھے رہ جائے۔ ورنہ سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ کل آٹھ ٹکڑیاں بنائی گئیں۔

اس طرح سے جب پہلی ٹکڑی نے پیش قدمی کی تو مشوانیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہ سپاہی بلا خوف و خطر آگے بڑھتے چلے گئے اور چند مشوانیوں کو گولی اور سنگین سے قتل کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اور ان کی جگہ دوسری ٹکڑی آ گئی۔ اور یہ پہلا دستہ آگے بڑھ گیا۔ اسی طرح سے یہ

آٹھوں دستے باری باری سے آگے بڑھتے رہے۔ مشوانی تاب مقابلہ نہ لاکر فرار ہو گئے۔ اور سردار ہری سنگھ کا لشکر کوہ گندگر پر چڑھ گیا۔ سب مشوانی بھاگ کر چار کوہ کی چوٹی پر چلے گئے۔ صبح کے وقت سردار ہری سنگھ اور ونتورہ صاحب کی فوج نے دشمنوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور رات کو ڈیرہ سری کوٹ میں کیا۔ دوسرے دن ملک کا معاملہ جمع کرنا شروع کیا۔ جس دن کہ سردار مہاں سنگھ اور ونتورہ صاحب نے سری کوٹ سے کوچ کیا۔ سردار ہری سنگھ نے اپنے معتبر خاص بھیج کر مندرجہ ذیل اشخاص کو توپ سے اڑانے کا حکم دیا۔ بوستانؒ خان برادر زادہ محمد خان ترین درویش والہ شیر محمدؒ برادر صالح محمد خان مشوانی۔ سلیمؒ شاہ مشوانی۔ جلالؒ خان دلازاک سرائے صالح شیخ جدونؒ ساکن رجوعیہ۔ محمدؒ ترین ساکن درویش والا

جب سردار ہری سنگھ راولپنڈی پہنچا اور اس کو مشوانیوں کی بغاوت کی خبر ملی تو اس نے محمد خان ترین کو بلا کر کہا۔ "کہ میں نے سرکار مہاراجہ میں پچاس ہزار روپیہ تمہارے سر پر دیا۔ لہذا اس روپیہ کی ادائیگی کا تم کو بندوبست کرنا چاہیئے۔ کچھ رقم تم ادا کرو اور کچھ تمہارے ملک سے وصول کی جائے گی۔ یہ باتیں سن کر محمد خان ترین کلاں کو غصہ آیا۔ اور تنگ ترش باتیں کیں اور کہا۔ "کہ اب جب کہ میں تمہاری قید میں ہوں۔ پھر بھی فتنہ و فساد کی تہمت مجھ پر لگائی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں میرا کیا اختیار رہے"

سردار ہری سنگھ نے اس پر محمد خان کو محکم طور پر قید کر کے قلعہ ڈھیری، ملک کلر کہار (تحصیل چکوال) میں بھیج دیا۔ وہاں پر خوراک کے طور پر اُس کو نیم پاؤ آٹا اور ایک پاؤ نمک کی روٹی پکا کر روزانہ دی جاتی رہی۔ چند ماہ کے بعد خان موصوف اُسی جگہ فوت ہو گیا۔

سردار ہری سنگھ نے ایک پروانہ سردار مہاں سنگھ و ملکان و مقدمان کو لکھا۔ کہ تم اس وقت کہتے تھے کہ "محمد خان کو اس ملک سے اگر میں خارج کر دوں تو جو تاوان تم پر لگایا جائے گا تم ادا کرو گے۔ اب جب کہ محمد خان کو وطن سے خارج کر دیا گیا ہے تم سب پر واجب ہے کہ پچاس ہزار روپیہ جو محمد خان کے لئے مہاراجہ صاحب کو دیا گیا اس کی ادائیگی کرو"

یہ پروانہ پہنچتے ہی سردار مہاں سنگھ نے تمام ملکان اور مقدمان کو جمع کر کے کہا کہ دو روپے آٹھ آنے فی گھر سے تمام ملک پکھلی، جدون، تنول و تربیلہ اور ہزارہ سے اکٹھا کر کے کارداران حکومت کے حوالہ کریں۔ صرف سیّد، پیر، علماء، فقیر اور بیوہ عورتیں اس سے معاف ہوں گی۔ باقی ہر ایک سے وصول کیا جائے گا۔ اس طرح سے ساٹھ ہزار روپیہ گونڈہ جمع ہو گیا۔

سردار ہری سنگھ نے حکم دیا۔ سری کوٹ کا ملک ہرگز آباد نہ کیا جائے۔ اگر کسی نے بلا اجازت

اس علاقہ میں کوٹھہ یا چھپر بنایا تو قلعہ کے ملازمین اور سپاہیوں کا فرض ہے کہ فوراً اس کو آگ لگا دیں۔ ایک سال تک کسی مشوانی کو کسی قسم کی تعمیر کی اجازت نہ دی گئی۔ نہ رہائش کے لئے اور نہ ہی مال مویشی کے لئے۔ ایک مرتبہ بہت سے مشوانی پار دریائے سندھ سے واپس آئے اور بیل گرہان کے نزدیک چھپر بنائے۔ تھانیدار قلعہ سری کوٹ نے سردار مہاں سنگھ کو اطلاع بھیجی۔ سردار مہاں سنگھ نے کچھ فوج اور چند ملکی لوگ (حشرات) جمع کرکے تلافی کے لئے بھیجے۔ گرہان کے متصل مقابلہ ہوا مصرا سنگھ افسر فوج مہاں سنگھ اس جنگ میں مارا گیا۔ اور مشوانی پھر فرار ہوکر پار دریائے سندھ چلے گئے۔ اور پانچ سال تک وہ جلاوطن رہے (۱۸۳۳ء تک) اس عرصہ کے بعد مشوانی وہاں بود و باش اور معاش کے لئے بہت تنگ ہوئے۔ اور مُردہ کے لئے قبر کی جگہ بھی نہ پا سکتے تھے۔ لاچار ہوکر سردار ہری سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اِن دنوں وہ لاہور سے یوسف زئی کے علاقہ میں آیا ہوا تھا۔ عاجزانہ طور پر حاضر ہوکر عرض کی کہ ہم زمیندار لوگ ہیں۔ اپنے گناہ کی کافی سزا پا چکے ہیں اور گھر سے بے گھر ہیں۔ اور بہت تنگ ہیں۔ پھر کبھی ہم فساد نہیں کریں گے۔ تحریری معاہدہ لینے کے بعد سردار ہری سنگھ نے سردار مہاں سنگھ کو حکم دیا۔ کہ ان کی سزا اب معاف کی جاتی ہے اور ان کو رہنے کے لئے دیہات آباد کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

اس کے بعد مشوانیوں نے پھر کبھی کوئی فساد نہ سردار ہری سنگھ کے عہد حکومت میں کیا اور نہ ہی بعد میں۔ اگر کوئی اور قوم فتنہ و فساد کرتی تھی تو یہ حکومت کے ساتھ کمربستہ ہوکر مدافعت کرتے تھے۔

سردار مہاںؔ سنگھ کا دور

سردار مہاں سنگھ کو جب ہزارہ کا سربراہ بنایا گیا تو شروع شروع میں سردار ہری سنگھ کے مقرر کردہ ملازم ہی اپنے تھانوں پر تعینات رہے۔ بالائی پکھلی زیر حکومت گلاب سنگھ ڈھون تھانیدار شنکیاری تھی۔ پائیں پکھلی دُل سنگھ تھانہ دار گلی کے زیر تحویل تھی۔ مانسہرہ کا ملک حکم سنگھ تھانیدار قلعہ مانسہرہ کے ماتحت تھا۔ ملک تنول میں منصدی بھوانی داس مقرر تھا۔ ملک ناڑہ نلاں زیر سید حسن شاہ تھانہ دار ناڑہ تھا۔ ملک تربیلہ فتح سنگھ تھانیدار تربیلہ کے سپرد تھا۔ ان سب کو حکم تھا کہ ہر فصل کا مفصل حساب سردار مہاں سنگھ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس کی رضامندی کو اپنی سرخروئی سمجھیں۔

سرائے صالح کا علاقہ مول سنگھ مہریالہ کے حوالہ تھا جو ہری سنگھ کا بہترین خدمت گار رہا تھا۔

جب سردار مہاں سنگھ نے حکومت سنبھالی تو سب سے پہلے سرائے صالح کے ملک کے حساب کی پڑتال کی۔ اور مول سنگھ کو سرائے صالح سے نکال کر دربند قلعہ کا تھانیدار مقرر کرکے وہاں بھیج دیا۔ اور اس کی جگہ اپنے بڑے بھائی مسمّی عطر سنگھ کو مقرر کر دیا۔

اس کے بعد ملک کنہار، بھوگڑمنگ، درہ اگرور، ٹکڑی و نند صیاڑ کو بعوض تیس ہزار روپیہ حبیب اللہ خان کو تفویض کر دیا۔ خان موصوف نے اُنیس ہزار روپیہ نقد ادا کر دیا۔ اور گیارہ ہزار بقایا تھا۔ سردار مہاں سنگھ نے مسمی صوبہ خان برادر حبیب اللہ خان اور زمان خان برادر زادہ حبیب اللہ خان دونوں کو گرفتار کرکے قلعہ ہرکشن گڑھ میں بطور یرغمال قید کر دیا۔ کہ جب تک بقایا ادا نہیں کیا جائے گا۔ اُن کو رہا نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ زمان خان کے والد مسمی پائندہ خان خانخیل نے اپنا نصف حصہ ادا کرکے اپنے لڑکے کو رہا کرا لیا۔ صوبہ خان بعوض بقایا مزید ایک سال تک قید رہا۔ اور صوبہ خان کی جگہ پر حبیب اللہ خان کا لڑکا امین خان جو کہ اب حبیب اللہ خان کی ریاست کا مالک ہے گرفتار کر لیا گیا۔

درہ کنہار کا مشخصہ سیّد محمد علی شاہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اور درہ بھوگڑمنگ کا معاملہ تحصیل کے کاردار کے ذریعے سے وصول کیا گیا۔

درہ اگرور پر پائندہ خان تنولی قابض ہو گیا۔ اور نند صیاڑ و ٹکری بالکل یاغستان ہو گئے۔

درہ کنہار یعنی کاغان (کاغان) کا معاملہ ہمیشہ سے باقاعدگی سے ادا ہوتا رہا۔ لیکن محمد علی شاہ سے یہ پورا نہ ہو سکا۔ اور کچھ بقایا رہ گیا۔ لہٰذا محمد علی شاہ بھی موقوف کر دیا گیا۔ اور درہ کنہار کا معاملہ تحصیل خام ہو گیا۔ اور دو تین سال تک تحصیل خام کرکے داخل سرکار ہوتا رہا۔ اس علاقہ کا مالیہ حبیب اللہ خان کی جاگیر چھوڑ کر تیرہ ہزار روپیہ تھا۔ اور زمیندار مال گزار سالانہ ادا کرتے رہے کچھ بھی بقایا نہ رہا۔

اس کے بعد سردار مہاں سنگھ نے مانسہرہ کے تھانہ دار کو موقوف کر دیا کیونکہ اُس کے ذمے دو سال کا بقایا نکل آیا۔ اور وہ ادا نہ کر سکا۔ اس کو تبدیل کرکے سری کوٹ کے قلعہ کا تھانیدار مقرر کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ مانسہرہ میں اپنے ایک چھوٹے بھائی مسمّی نکل سین کو مقرر کر دیا۔

قلعہ گلی کا تھانیدار دُل سنگھ تھا۔ اور اس کے ماتحت علاقہ بھیرکنڈ بھی تھا۔ اگرچہ وہ گلی کا تھانیدار ہی رہا۔ لیکن بھیرکنڈ کا علاقہ اس سے الگ کرکے اس جگہ ایک کاردار آسانند منشی کو مقرر کر دیا۔

علاقہ نواں شہر میں بھی اپنے ایک رشتہ دار کاہن سنگھ نامی کو مقرر کر دیا۔ اور تنول میں اپنے عزیز و رشتہ دار بخشی سیوا رام کو مقرر کر دیا۔ اس طرح سے ضلع ہزارہ میں ہر ایک قلعہ پر اپنے رشتہ داروں کو مقرر کر دیا۔ اور ہر ایک سے بحساب کنکوت لیتا تھا۔ اور ملک کے دیگر محصول کا ٹھیکہ تیس ہزار روپیہ سالانہ پر ہر کشن مل ساکن مظفر آباد کو دے دیا۔

تربیلہ کا تھانیدار سردار ہری سنگھ کا مقرر کیا ہوا فتح سنگھ ہی رہا۔

مہاں سنگھ اور پائندہ خاں تنولی کی کشمکش

مہاں سنگھ کے دو سال کی حکمرانی میں پائندہ خان سے کشمکش ہوتی رہی۔ یہ کشمکش راجہ شیر محمد خان تنولی کو مہاں سنگھ کے قید کرنے سے شروع ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سردار ہری سنگھ نے شیر محمد خان کو علاقہ کولائی میں کرپلیاں اور لالوگلی بطور جاگیر دے رکھی تھی۔ اور اُس کو قلعہ قادر آباد بر کنارہ دریائے سندھ بالمقابل ڈیرہ کے بٹھا رکھا تھا۔ سردار مہاں سنگھ حساب کتاب اور سواروں کے ملاحظہ کے بہانے سے اُس کو قلعہ ہر کشن گڑھ کے اندر بلایا۔ اور معہ ایک دو معتبروں کے قید کر دیا۔ گھوڑے اور سواروں کا ساز و سامان ضبط کر لیا۔ اور سواروں کو خالی ہاتھ واپس کر دیا راجہ شیر محمد خان اور ایک معتبر شخص مسمیٰ گُلا کو قید میں رکھا۔ کچھ مدت کے بعد چار ہزار روپیہ جرمانہ لے کر رہا کر دیا۔ شیر محمد خان رہائی کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ دریائے سندھ پار جا کر موضع اِشمراہ متصل موضع انب سکونت پذیر ہو گیا۔

اس واقعہ سے پائندہ خاں کے دل میں کدورت پیدا ہو گئی۔ لیکن ظاہر نہ کیا۔ اور موقع کی تاک میں رہا۔

اس اثنا میں نہال سنگھ نامی سپاہی جو گلی قلعہ میں متعین تھا کسی کام کے لئے پائندہ خاں کی جاگیر کے علاقہ میں گیا۔ پائندہ خان کے آدمیوں نے اس کو راستہ میں قتل کر دیا۔ اس کے ہتھیار لے لئے۔ یہ ہتھیار پائندہ خان نے سردار مہاں سنگھ کے پاس بھیج دئے۔ اور کہلا بھیجا کہ افغانوں نے اس سپاہی کو قتل کیا اور ہتھیار لے جا رہے تھے کہ اُس کے آدمیوں نے یہ ہتھیار لے لئے جو بھیجے جا رہے ہیں۔ اس پر سے دونوں طرف سے دوستی کا اظہار کیا گیا۔ پائندہ خان کا ایک بھائی۔ اکبر علی خان۔ ایک راس سفید (نقرہ) گھوڑا اور ایک دستہ باز بطور تحفہ لے کر سردار مہاں سنگھ کے پاس حاضر ہوا۔ سردار مہاں سنگھ نے ایک جوڑہ طلائی خلعت

پائندہ خان کے لئے بھیجا اور اکبر علی خان کو بھی خلعت دے کر رخصت کیا۔

چند دن کے بعد پائندہ خان کے گھر کوئی شادی کی تقریب ہونے والی تھی۔ اس نے کنجروں اور دیگر اہل نشاط ساکن ہری پور کو بلایا۔ چنانچہ سب کنجر مہاں سنگھ کے پاس آئے اور عرض کی کہ ان کو دریائے پار جانا منظور نہیں۔ اور ان کو خوف معلوم ہوتا ہے۔ سردار مہاں سنگھ نے ان کو تسلی دی کہ کوئی فکر کی بات نہیں اس کے اور پائندہ خان کے درمیان دوستی ہے۔ ان کو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ کنجر مہاں سنگھ کی تسلی دلانے پر چلے گئے۔ وہاں پندرہ روز رہے اور شادی کی تقریب میں محفل نشاط و سرود منعقد کرتے رہے۔ جب شادی ختم ہو گئی تو رخصت کی اجازت چاہی۔ لیکن ایک نوبہار خوب رو کنجری کو مدد خان اپنے نکاح میں لایا۔ دوسری کو اکبر علی خان نے اپنے عقد میں لے لیا۔ اور تیسری نو سمہ جیتھا نوکر مدد خان نے لے لیا۔ جب ان تین کنجریوں کو لے لیا۔ تو کنجروں نے دو چار روز شور اور واویلا کیا۔ لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ کنجر مایوس و محروم ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ اور سردار مہاں سنگھ کے پاس فریادی ہوئے کہ اس کے کہنے پر وہ وہاں گئے۔ کوئی انعام نہ ملا بلکہ ان کی تین عورتیں بھی جبراً پکڑ لی گئیں۔ یہ بات سن کر مہاں سنگھ کو شرمندگی لاحق ہوئی۔ کہ اس کے کہنے پر وہ وہاں گئے تھے اور ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا۔ بہت رنجیدہ خاطر ہوا۔ لیکن ظاہراً پائندہ خان کے ساتھ نوشت و خواند اور مدارات کرتا رہا۔ لیکن دل میں اس حرکت کے تدارک کا فکر کرتا رہا۔

چند ایام کے بعد پائندہ خان کے چار معتبر نوکر برائے خرید اسپان و زین و سامان ہری پور بازار میں آئے۔ گھوڑے، سامان زین وغیرہ اور دیگر اشیاء خرید کر انب کو بھیج دیں۔ دوسرے دن وہ خود سردار مہاں سنگھ سے رخصت لے کر واپس ہوئے۔ اور رات صوابی میرا میں ڈیرہ کیا۔ سردار مہاں سنگھ نے اپنے آدمیوں سے مشورہ کر کے ان چاروں کو گرفتار کرنے کے لئے اپنے سوار بھیجے۔ اور ان کو گرفتار کر کے قلعہ ہر کشن میں لے آئے۔ اور بطور یرغمال قید کر دیا۔ اس گرفتاری پر سیدان صوابی بھی رنجیدہ ہوئے کہ اُن کے گھر سے گرفتار کرنا مناسب نہ تھا۔

جب پائندہ خان نے اپنے نوکروں کی گرفتاری کا واقعہ سُنا تو وہ فوراً اپنی جمعیت کے ساتھ سوار ہو کر دریائے سندھ کے اس پار آ گیا۔ اور قلعہ قادر آباد کا محاصرہ کر لیا۔ منیر خان پسر حبیب خان بڑیان والا تھانہ دار قلعہ تھا۔ دو تین دن اس نے حیلہ حوالہ سے گزارے۔ لیکن تیسرے روز پائندہ خان کے ملازموں کو قلعہ حوالہ کر کے باہر آ گیا۔ اُسی دن کرپلیاں کا قلعہ بھی پائندہ خان کے آدمیوں نے لے لیا۔ اس کے بعد پائندہ خان کلنجر کی طرف متوجہ ہوا۔ کلنجر کے زمیندار مہاں سنگھ کے پاس

امداد کے لئے[م] نے چنانچہ مہاں سنگھ نے خیر بخش حوالدار کی زیرِ سرکردگی چالیس سپاہی زمینداران کلنجر کی امداد کے لئے بھیجے۔

دوسرے دن پائندہ خان گندپ آیا۔ اور گندپ کے برج کے سپاہیوں کے ساتھ سارا دن جنگ رہی۔ سردار مہاں سنگھ نے تھانہ دار تربیلہ۔ فتح سنگھ کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ آگے اور ادھر سے وہ بمعہ فوج و امداد ملکیہ کے ساتھ آرہا ہے۔ تاکہ کلنجر کے پاس پائندہ خاں سے جنگ کی جائے۔ لہذا سردار مہاں سنگھ قلعہ ہرکشن گڑھ سے سوار ہو کر بمعہ سوار و پیادہ آدھی رات کو قلعہ بھارو کوٹ میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے بھتیجے موہر سنگھ کی زیرِ سرکردگی سوار و پیادہ فوج آگے بھیج دی اور خود سات آٹھ آدمیوں کے ساتھ بھارو کوٹ سے کوہ نذابی کے تنگ راستہ سے گزر کر صوابی میرا پہنچ گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ فتح سنگھ تھانہ دار تربیلہ نہیں پہنچا ہے اور کلنجر اور صوابی میرا کے لوگوں نے خار بندی کر لی ہے۔ اور پائندہ خان کے آدمی اُن کے درمیان موجود ہیں۔

صبح تک مہاں سنگھ کے آدمیوں نے فتح سنگھ کا انتظار کیا۔ لیکن وہ نہ آیا۔ اس کی یہ غیر حاضری دغابازی اور غداری شمار کی گئی۔

جب سپاہی موضع صوابی کی طرف بڑھے۔ تو سیدان صوابی نے بندوق کے فائر شروع کر دئے اسی طرح دیگر دیہات بھی مقابلہ کے لئے مستعد بیٹھے تھے۔ لہذا افسران فوج نے باہمی صلاح مشورہ اور ملکیہ لوگوں کی رائے کے بموجب واپسی کو بہتر سمجھا۔ کیونکہ پائندہ خان سے ایسے حالات میں جنگ کہ تمام باشندگان علاقہ دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ مناسب نہ سمجھی گئی۔ لوگوں نے ان کو یقین دلایا کہ ان کی واپسی پر کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے گی۔ موجودہ حالات میں جب کہ پائندہ خان نے ہم پر زور ڈال رکھا ہے آپ کی طرفداری نہیں کر سکتے۔

ملکیہ لوگوں کا مشورہ یہ تھا۔ کہ جب سکھوں کی فوج صوابی میرا میں آئے گی تو ان کی واپسی پر کوہ نذابی کی چوٹی پر بیٹھ کر ان کا اس تنگ راستہ میں صفایا کر دیا جائے گا۔ لیکن سردار مہاں سنگھ کی زندگی کے دن باقی تھے کہ وہ فوج کے ساتھ نہ آیا۔ اس وجہ سے لوگ اپنی تجویز پر عمل نہ کر سکے۔ سکھوں کی فوج تدبیر سے واپس ہوئی۔ پہلے پیادہ فوج کو کوہ نذابی کے سر پر بٹھا دیا گیا۔ جس قدر کمزور سوار و پیادہ تھے ان کو پہلے گزار گیا۔ ان کے بعد پیادہ و سوار متفق ہو کر گزرے۔ پھر بھی زمینداراں و سیدان صوابی پیچھے سے بندوقوں کے فائر کرتے رہے۔ لیکن کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اور فوج

خیریت سے نذابی سے گزر کر بھارو کوٹ میں جمع ہو گئی۔ اس کے بعد جو چالیس سپاہی زمینداران کلنجر اپنی امداد کے لئے ساتھ لائے تھے اُن کو پائندہ خان کے سپاہیوں کے ہاتھ قید کرا دیا۔ اور پائندہ خان سے مل گئے اور سکھوں کی اطاعت اور ادائیگی مال گزاری سے بالکل منحرف ہو گئے۔ جب پائندہ خان اپنا ڈیرہ صوابی میں لے آیا تو سیدان صوابی بھی اُس کے ساتھ مل گئے۔

سکھوں کے گرفتار شدہ چالیس سپاہی بھی ڈیرہ پائندہ خان میں زیرِ حراست تھے۔ اُن سے تمام اسلحہ لے لیا گیا تھا۔ اُن میں سے ایک سپاہی نصف شب کو بیدار ہو گیا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا "کہ اُٹھو اب وقت ہے پہرہ داروں پر یک جا حملہ کر کے اُن سے ہتھیار لے لو۔ اور پائندہ خان کو سوتے ہوئے قتل کر دو" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پہرہ دار سے جو اس پر مقرر تھا اور غافل تھا اسلحہ لے کر اس کو قتل کر دیا۔ اور پائندہ خان کو قتل کرنے کے لئے اس کی خواب گاہ کی طرف گیا۔ چنانچہ نزدیک پہنچ کر پائندہ خان کے ایک خدمت گار پر دو تین ہاتھ تلوار کے چلائے اور اس کو زخمی کر دیا۔ اس پر شور و غل اٹھا۔ اس کے ہمراہی ساتھ نہ آئے نہیں تو پائندہ خان کا کام تمام کر دیتے۔ پائندہ خان شور و غل سے اپنا ڈیرہ چھوڑ کر دوسرے ڈیرہ میں چلا گیا جب لوگ آگاہ ہوئے تو اس سپاہی اور اس کے ساتھیوں کو پابزنجیر کر کے انب کی طرف بھیج دیا گیا۔ اور پائندہ خان خود نالہ نذابی دسرن سے پار سیدان میں ایک دو روز سیر کر کے پار دریائے سندھ چلا گیا۔ نہ کوئی سکھ نہ ان کا کوئی سپاہی ان دنوں میں دریائے سرن سے پار گیا۔

پائندہ خان قلعہ دربند و گڑھی کا محاصرہ کرنے اور قبضہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کیونکہ یہ دونوں قلعے بہت مستحکم تھے۔

یہ کش مکش ماہ اسوج سے شروع ہو کر ماہ بیساکھ کے آخر تک جاری رہی۔ لیکن قلعہ جات گلی، دربند و گڑھی کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اور سپاہ قلعہ جات اپنی جگہ مضبوطی سے جمی رہی۔

اس اثناء میں خلیفہ سید احمد شاہ نے ملکی لشکر و مردمان یوسف زئی اور سرداران پشاور کے آدمیوں کے ساتھ چند دن تک سکھوں کی فوج کا محاصرہ کر لیا۔ سکھوں کی فوج کی تعداد قلیل تھی تقریباً دس بارہ ہزار اور ملکی لوگ جو سید احمد شاہ کے ساتھ تھے ان کی تعداد بالاتفاق ایک لاکھ پچیس ہزار تھی۔ سکھ پار دریائے سندھ وادیِ نری میں (سنگر[۱] زدہ) مورچہ بندی کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔

---

[۱] سنگر۔ لشکر کے گرد کانٹوں یا پتھروں یا لکڑی کے ڈنڈوں سے ایک مضبوط حصار تیار کر لیتے تھے۔ تاکہ رات کے وقت دشمن کے شب خون سے محفوظ رہیں۔ اسے بعض اوقات سنگھر بھی لکھا جاتا تھا۔

آخر کارجنگ ہوئی۔ سکھ فتح یاب ہوئے۔ بہت سے ملکی لوگ قتل ہوئے۔ اور شکست کھا کر بھاگ گئے۔

اس جنگ کے بعد ہری سنگھ نے کچھ سوار اور پیادے ہزارہ کی امداد کے لئے بھیجے۔

ان ایام میں پائندہ خان کے ساتھ صلح ہوگئی۔ اُس کے چار نوکر جو قلعہ ہرکشن گڑھ میں قید تھے۔ رہا
ردئے گئے۔ اور قلعہ کمبلیاں و قادر آباد جو پائندہ خان نے فتح کر لئے تھے۔ واگزار کر دئے گئے
ور قلعہ دربند و قلعہ گڑھی کا محاصرہ اُٹھا لیا گیا۔ آمدورفت باہمی شروع ہوگئی اور اہالیان کولائی
ندپ و کالنجر و صوابی بدستور سابق رعیت ہوگئے۔ لیکن اس فتنہ و فساد سے سرکاری معاملہ کو
ہت نقصان ہوا۔ تمام ملک کا مشخصہ محصول جو چھتیس ہزار روپیہ تھا۔ یہ ٹھیکہ ہرکشن مل کھتری
اکن مظفر آباد کا تھا۔ اُس کو ان آٹھ ماہ میں بیوپاریوں کی آمدورفت و خرید و فروخت کے بند ہو
نے سے تیرہ ہزار روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس بقایا کا مطالبہ اس سے کیا گیا۔ وہ متمول آدمی نہ تھا۔
س واسطے ادا نہ کرسکا۔ لاچار قید کر لیا گیا اور جب تک ہری سنگھ کی حکومت رہی مستاجر مذکور
ید میں رہا۔ اور سردار تیج سنگھ کے عہد میں اس کو رہائی ملی۔

سردار ہری سنگھ کے دل میں پائندہ خان کی مخالفت جاگزیں ہوگئی تھی اور وہ اس پر اعتبار
رتا تھا۔ لہٰذا سمت ۱۸۸۴ بکرمی (۱۸۲۷ء) میں جب سردار ہری سنگھ سرداران پشاور سے مقررہ
اج کے گھوڑے لے کر اور معاملہ یوسف زئی کی تحصیل کر کے واپس لاہور جا رہا تھا اور اس کے
اتھ راجہ سوچیت سنگھ (برادر راجہ گلاب سنگھ) کی فوج بہ سرکردگی سردار کیسرا سنگھ بھی تھی
راجہ صاحب سے چند روز کی رخصت لے کر وارد ہزارہ ہوا۔ تاکہ پائندہ خان کو تنبیہ کرے۔
ر اس کی درازدستی کا تدارک کرے۔ اور پھلڑہ جاگیر پائندہ خان میں ڈیرہ کیا۔ پائندہ خان اپنا لشکر
ع کر کے بھینگڑاہ پہاڑ پر بیٹھ گیا۔ چونکہ سردار ہری سنگھ کی رخصت تھوڑی تھی اور چاہتا تھا کہ
سی بہانہ سے پائندہ خان کے ساتھ جلدی صلح ہو سکے۔ تاکہ وہ واپس ہو سکے۔ پائندہ خان اپنی
پر بیٹھا رہا اور کوئی سوال و جواب نہ کیا۔ اور اپنے سپاہیوں اور ہمراہیوں کو حکم دیا کہ اگر سکھوں
وئی سپاہی یا سوار نظر آئے۔ تو قتل کر کے اُس کا سامان لوٹ لیا جائے۔ اور جو کوئی ایک سر لائے
اُس کو بیس روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے فوج کے راستے بند ہو گئے۔ اور کوئی غلہ وغیرہ
ن کو نہ پہنچ سکا۔ ڈیرہ میں آنے والے اور جانے والے بہت سے سپاہی قتل ہو گئے۔ اور ڈیرہ
عان میں جنس کی بہت گرانی ہوگئی۔ اس پر کیسرا سنگھ افسر فوج سوچیت سنگھ پر خفا ہوا۔ لاچار
دار ہری سنگھ نے اُس کی مرضی کے مطابق پائندہ خان سے دوستی کی باتیں کر کے ڈیرہ سے کوچ کر دیا۔

اور کچھ بندوبست یا فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس کے بعد پھر دوسری بار سردار ہری سنگھ سمت ۱۸۸۵ بکرمی (۱۸۲۸ء) میں ہزارہ آیا۔ اس دفعہ
اس کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ دیوان کرپارام پسر دیوان موتی رام باپ کی جگہ پر کشمیر کے ناظم کے طور پر
حکومت کرتا تھا۔ اور سلطان زبردست خان والی مظفر آباد کو گرفتار یا ملک بدر کرنا چاہتا تھا۔ اس نے
سردار ہری سنگھ کو اس طرف سے حملہ کرنے کیلئے بلایا۔ اور خود کشمیر سے جانب مظفر آباد روانہ ہوا۔ راستہ
میں تمام قلعہ جات کو مضبوط کرتا چلا آرہا تھا۔ کہ اس طرف سے سردار ہری سنگھ بھی وارد ہزارہ ہوا۔
سردار ہری سنگھ کو خط لکھا تھا کہ اُدھر سے وہ آئے اور اِدھر سے یہ۔ اور سرحد طرفین پر سرکش
یاغستان کے لوگوں کو مطیع کر دیا جائے۔ سردار خط کے ملتے ہی روانہ مظفر آباد ہوا۔ اور نالہ کنہار کے کنارے
متصل گڑھی سعادت خان (حال گڑھی حبیب اللہ خان) میں ڈیرہ لگا دیا۔ حبیب اللہ خان اپنے بیٹوں
بھائیوں اور بھتیجوں کے ساتھ سردار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نالہ کنہار پر پُل باندھ کر سب لشکر کو بخوبی
گزار کر لشکر کا پیش رو ہو کر آگے روانہ ہوا۔ اور سردار کو دریائے کشن گنگا پر پہنچا دیا جو مظفر آباد
کے نیچے بہتا ہے۔

سردار ہری سنگھ نے اس جگہ پہنچتے ہی دیوان کرپارام کو خط لکھا۔ "ہم آں مخلص مہربان کے خط پر
یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اگر آپ بھی جلدی سے پہنچ جائیں تو متفقہ طور پر سب کام سرانجام کیا جائے۔ میں
زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ بعد میں آپ شکایت نہ کریں۔"

دیوان نے یہ خط پڑھتے ہی فوراً جواب دیا۔ "کہ ہم کشمیر سے اپنے بل بوتے پر یہاں آئے ہیں اور
قلعہ چکار و قلعہ دوپٹہ کی مرمت کرا رہے ہیں جس وقت اس کام سے فراغت حاصل ہو جائے گی، آ
جائیں گے۔ اگر آں مہربان کو فرصت نہیں ہے تو آپ مختار ہیں۔"

سردار نے جب یہ خط پڑھا۔ تو سلطان زبردست خان نے چار ہزار روپیہ نذرانہ جو اس نے
بذریعہ جواہر شاہ برادر سپاہی ہریا سنگھ، شاہوکار ہرکشن گڑھ بھیجا تھا۔ قبول کر کے ڈیرہ کوچ کر کے
واپس روانہ ہوگیا۔

اس اثناء میں حبیب اللہ خان نے اپنے آدمیوں کو بھیج کر نالہ کنہار کا پل بطرف گھوڑی[1] کو تڑوا
دیا۔ اور جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ جب سردار دُب پہاڑ پر پہنچا تو گھوڑی کی طرف سلطان نجیب خان د

---

[1] گھوڑی آزاد کشمیر میں مظفر آباد سے اُس طرف ہے۔

حبیب اللہ خان کے آدمیوں نے جنگ شروع کر دی۔ سردار ہری سنگھ کوہستانی جنگ سے واقف اور تجربہ کار تھا۔ کچھ فکر نہ کیا اور پوری مستقل مزاجی سے ڈُب پہاڑ کو عبور کر کے نیچے اُتر آیا۔ اور گڑھی حبیب اللہ کے ساتھ ڈیرہ کیا۔ گڑھی حبیب اللہ کو لُوٹ کر جلا دیا۔ اور حبیب اللہ خان کی ایک پختہ حویلی میں تھانہ مقرر کر کے نتھا سنگھ کو تھانیدار مقرر کیا۔ ایک دو دن وہاں رہ کر دریائے کنہار پر پُل کر عبور کر کے اس طرف آ گیا۔ اور قلعہ مانسہرہ کے متصل ڈیرہ کیا۔

یہاں پر اُس پھلڑہ کی جانب سے خبر پہنچی۔ کہ احمد علی ہمشیر زادہ خلیفہ سیّد احمد شاہ کچھ جمعیت کے ساتھ پھلڑہ پہنچ گیا ہے۔ اور اس طرف آنے والا ہے اور یہ بھی خبر پہنچی کہ سلطان نجیب خان و حبیب اللہ خان نے متفق ہو کر نتھا سنگھ کو بمعہ لشکر اپنی حویلی سے نکال دیا ہے۔ اور بدستور حبیب اللہ خان اپنی حویلی میں مقیم ہو گیا ہے۔

اس خبر پر سردار ہری سنگھ فوراً سوار ہو کر دریائے کنہار پر پہنچ گیا۔ نتھا سنگھ پہلے ہی دریا کو عبور کر کے اس طرف آ چکا تھا۔ اور سردار کی خدمت میں حاضر ہوا۔

سردار ہری سنگھ سخت ناراض ہوا اور پابزنجیر کر کے قید کر دیا۔ وہ دو سال تک قید رہا۔ بعد میں دو ہزار روپیہ جرمانہ لے کر رہا کر دیا۔

سردار ہری سنگھ یہاں سے واپس ہو کر مانسہرہ پہنچا اور **بھوت کٹھہ** کے متصل ڈیرہ کیا۔

احمد علی ہمشیر زادہ خلیفہ صاحب ساٹھ نفر ہندوستانی اور دو تین ہزار ملکی لوگوں کے پھلڑہ میں مقیم تھا۔ جب یہ خبر سردار کو پہنچی تو اس نے مولوی سکندر کی تدبیر پر اپنا ڈیرہ اٹھا کر نواں شہر کی طرف رُخ کیا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ سردار ہزارہ کی طرف کسی کام کے لئے چلا گیا ہے۔ اس پر خلیفہ کے آدمی معہ احمد علی ہمشیرہ زادہ سیّد احمد شاہ جو کہ پھلڑہ میں تھے دلیر ہو کر بعض نالہ سرن کو پار کر کے اس طرف آ گئے اور بعض نے موضع **پونیاں** متصل پھلڑہ جمعیت قائم کی۔

سردار ہری سنگھ نے ابھی ایک پہر رات باقی تھی کہ بارود و اسلحہ لشکر میں تقسیم کر کے اور سوار ہو کر بطور چپاول بوقتِ طلوعِ آفتاب موضع پھلڑہ و کھرکہ سے نیچے نالہ سرن کو پار کرنا شروع کر دیا۔ احمد علی کے ہمراہی جو اُس پار تھے وہ سب بھاگ کر اُس پار چلے گئے۔ اور وہ اور ان کے دوسرے ہمراہی بھی پھلڑہ و پونیاں سے آ کر جمع ہو گئے اور فائر شروع کر دئے۔ اگرچہ اس یلغار میں سردار کے چار سوار گولی لگنے سے مر گئے۔ لیکن سردار فوج کو لے کر پار پہنچ گیا۔ احمد علی کے ساتھ ہمراہی جنگ پر مستعد ہو گئے اور دونوں طرف سے تیر و تفنگ کی بازی شروع ہو گئی۔ ملکیہ

لوگ تو سب بھاگ کر چوٹی پر چڑھ گئے۔ لیکن ہندوستانی مجاہدین نے بمعہ احمد علی نہایت جوانمردی اور کمال سرفرازی سے جنگ کی۔ سردار کے لشکر سے دو تین سوار اور ایک سو پیادے زخمی کر دئے لیکن تعداد میں تھوڑے ہونے کی وجہ سے آخر کار سب شہید ہو گئے۔ ایک شخص بھی زندہ نہ رہا۔ سردار پوری فتح و نصرت کے ساتھ اپنے ڈیرہ کو واپس ہو کر متوجہ ہزارہ ہوا۔ اور تھانہ دار اور کارگزار حسب دستور اپنے فرضِ منصبی میں مشغول ہو گئے۔

اس کے بعد خلیفہ سیّد احمد شاہ نے پائندہ خان تنولی کو لکھا۔ "کہ آپ میرے وزیر بن جائیں۔ اور میری خلافت پر بیعت کریں۔ اس میں آپ کے لئے انشاء اللہ بہتری ہو گی۔ اور آپ کی کرسی نشینی کا عمدہ بندوبست ہو گا"۔ چنانچہ پائندہ خان بہ وکالت حسن شاہ سیّد اس بات پر راضی ہو گیا۔ اور خلیفہ سیّد احمد شاہ اور پائندہ خان دونوں ملاقات کے لئے نزدیک ہوئے۔ چنانچہ خلیفہ صاحب پنجتار سے آ کر موضع کھبل میں اقامت گزیں ہوئے۔ دریائے سندھ کے دونوں طرف کے لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ اور قلعہ تربیلہ کا محاصرہ کیا۔ ہزارہ میں فوج کم تھی۔ یہی آٹھ سو کے قریب پیادہ اور ڈھائی سو کے قریب سوار مہاں سنگھ کے پاس تھے۔ باقی سپاہ اپنے اپنے قلعوں میں متعین تھی۔ ان ایام میں مہاراجہ صاحب کے حکم سے جنرل الارڈ صاحب تین رجمنٹ کے ساتھ موضع واہ متصل حسن ابدال میں وارد ہوا۔ یہ سن کر مہاں سنگھ نے خط دے کر اپنے ایک معتبر آدمی کو الارڈ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ اگرچہ اول تو اس نے بغیر حکم مہاراجہ صاحب امداد سے عذر کیا۔ لیکن بعد میں ایک رجمنٹ دُس کو دے کر دوئم دراگون (II DRAGONS) کہتے تھے۔ زیر سرکردگی سردھا سنگھ سندھیانوالہ روانہ کی۔ یہ رجمنٹ جلدی سے واہ سے معہ معتبر سردار مہاں سنگھ بھارو کوٹ پہنچ گئی ایک رات رجمنٹ نے بھارو کوٹ قیام کیا۔ دوسرے روز ہزارہ کی فوج نے تربیلہ کی طرف پیش قدمی کی اور یہ رجمنٹ ان کے پیچھے روانہ ہوئی۔

نوٹ:۔ جے پی فیریر (J.P.FERRIER) کے سفر نامہ ایران، افغانستان، ترکستان و بلوچستان کا مندرجہ ذیل اقتباس رنجیت سنگھ کا اپنی فوج کو نئے سرے سے یورپین کمانڈروں کے تحت تیار کرنے کو واضح کرتا ہے (ص ۳۴۸) رنجیت سنگھ نے بہت سے ان افسروں کو جنہوں نے نپولین بوناپارٹ کے ماتحت ملازمت کی اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ یعنی الارڈ (ALLARD) کورٹ (COURT) (دونوں فرانسیسی تھے) وینتورا (VENTURA) (یہ ملان اٹلی کا رہنے والا تھا) اور ابی طبیلہ (AVITABILE) (نیپلز کا رہنے والا۔ یہ سب بہادر اور قابل جنرل تھے

جب یہ فوج تربیلہ پہنچی تو زمینداران تربیلہ جو کہ اپنا مال ومتاع اور اہل وعیال پہلے ہی گھروں سے نکال چکے تھے، آمادہ جنگ ہو گئے۔ اور طرفین میں خوب بندوق کی جنگ ہوئی۔ آخر کار زمینداروں کے چند آدمی مارے گئے اور باقی فرار ہو گئے۔ اور قلعہ کا محاصرہ اٹھ گیا۔ اس رجمنٹ نے رات تربیلہ ہی میں گزاری۔ اس رجمنٹ کے پانچ چھ سوار جو تنخواہ لینے کے لئے پنڈدادنخان گئے ہوئے تھے بمعہ ہتھیار وغیرہ بہ سلامت واپس آکر الارڈ صاحب کے ڈیرہ واہ میں حاضر ہو گئے۔ محاصرہ اٹھ جانے کے بعد الارڈ صاحب نے تربیلہ سے کوچ کرکے رات چھچھ موضع غورغشتی میں قیام کیا۔ لیکن یہ سوار اپنی رجمنٹ سے ملنے کے لئے براہ غازی گھرڑی روانہ تربیلہ ہوئے۔ کسی نے ان کو منع نہ کیا کہ اس راستہ سے نہ جائیں۔ یہ چھ سوار گھوڑوں، ٹٹوؤں اور تھیلوں کے ساتھ اس راہ گھرڑی وغازی سے عازم تربیلہ ہوئے۔ جب یہ سوار موضع موہٹ پہنچے تو اہالیان موضع بڑی چاپلوسی اور خوشامد سے پیش آئے۔ اور کہا کہ تربیلہ یہاں سے دور ہے۔ آپ رات یہیں قیام کریں۔ چارپائیاں لاکر سواروں کو دیں۔ رسد و دانہ پیش کیا۔ سوار اتر پڑے۔ دانہ ورسد لے کر روٹی پکانے اور دیگر کاموں میں مشغول ہو گئے۔ کہ یک لخت زمینداران دہ نے اُن کے اسلحہ پر قبضہ کرکے حملہ کر دیا۔ اور سب کو قتل کر دیا۔ ایک ہی سکھ سپاہی بچا جس نے بھاگ کر رجمنٹ میں اس واقعہ کی خبر دی۔ موہٹ کے زمیندار سواروں کا مال متاع، گھوڑے اور نقدی جو کچھ بھی ان کے پاس تھا لیکر جالہ[1] پر سوار ہو کر دریائے سندھ کے درمیان بیلہ (جزیرہ) میں جاکر بیٹھ گئے۔

مہم تربیلہ کے بعد سب رجمنٹ الارڈ صاحب کے پاس جمع ہو گئی۔ اور جب اس نے اس واقعہ کی خبر سنی تو اس کے انتظام کا فکر کیا۔ ایک افغان مسمی چھلیل خان نے جو سکھوں کا بہت خیر خواہ تھا۔ الارڈ صاحب سے ملاقات کی۔ اس نے سب فوج سکھاں، پانچ سو سواروں کو اپنی رہنمائی میں ایک پایاب جگہ سے دریا پار کرا کر بیلہ میں پہنچا دیا۔ جب کہ مفسد بے فکر بیٹھے تھے۔ فوج نے ان سب کو بے خبری میں وہاں جالیا۔ اُن کے بال بچوں اور مردوں سے بہت کو قتل اور بعض کو گرفتار کر لیا۔ سب مال ومتاع غارت شدہ اور گھوڑوں کو قبضہ پر کر لیا۔ اور کما حقہٗ تدارک وتلافی واقعہ قتل سواراں وغارت اسباب مال کر دی گئی۔

---

[1] جالا کاٹڑیوں کو یک جا باندھ کر اس پر بیٹھ کر دریا پار کرتے ہیں۔

ملاقات سیّد احمد شہیدؒ و پائندہ خان

یہ ملاقات گڑھی ستھانہ و کیا میں ہوئی۔ ملاقات کے وقت پائندہ خان کے بھائیوں اور نوکروں نے سید شہیدؒ کے سامنے اتنی تعظیم وسرافگندگی سے پیش خدمت ہوئے جیسے کہ ان کا تمام عمر پائندہ خان کے ساتھ کوئی واسطہ اور غرض ہی نہ تھی۔ اور یہ سب لوگ گویا قدیم سے سید احمد شہیدؒ ہی کے پروردہ تھے۔ جب پائندہ خان نے اپنے بھائیوں، رشتہ داروں اور ملازموں کی یہ حالت دیکھی تو اس کے دل میں یہ وسواس اور وہم پیدا ہوا۔ کہ یہ سب لوگ بمعہ ملازمان کے سید صاحب کے اتنے تابعدار ہیں تو ضرور ایک روز اس کو گرفتار کر کے خلیفہ سید احمد صاحب کے حوالے کر دیں گے۔ اگرچہ ظاہراً ملاقات ہو گئی۔ لیکن پائندہ خان، دل میں بہت متفکر ومتوحش ہو گیا۔ اور اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ سید صاحب سے کنارہ کشی کرنی ہی بہتر ہے۔ اُن کے ساتھ رہ کر موافقت مشکل ہے۔ لہٰذا علیحدگی کا مشورہ کیا۔

اس اثناء میں سربلند خان تنولی، جس کی پائندہ خان کے ساتھ دشمنی تھی، اپنے بیٹے نواب خان کے ساتھ حضرت سیّد احمد شہیدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر نوکر ہو گیا۔ اور پائندہ خان کا سگا بھائی مدد خان بھی، جو پائندہ خان سے آزردہ خاطر تھا۔ خلیفہ صاحب کے ساتھ وقت موزوں کا منتظر تھا۔

سید شہیدؒ نے پائندہ خان کے ملک کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ مدد خان اور سربلند خان کی رہنمائی میں کوہستان کے راستہ سے آئے۔ پائندہ خان اپنی فوج سوار و پیادہ کے ساتھ انب میں تیار رکھ رہا تھا لیکن دل میں فکرمند تھا۔ کہ اُس کے اپنے نوکر ہی کہیں بے ایمانی سے اس کو گرفتار نہ کر لیں۔ جب اس نے دیکھا کہ مقابلہ میں اُس کے نوکر گولی ڈالے بغیر بندوق چلا رہے ہیں تو اپنے دس بارہ خیر خواہوں کے ساتھ چتر بھائیؒ کی گڑھی کی طرف چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی گڑھی دریائے سندھ کے درمیان ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ دو راتیں وہاں گزار کر اپنے بال بچوں کو دریائے پار گزار کر خود علاقہ لالی میں آکر بیٹھ گیا۔

جب سیّد احمد شہیدؒ نے اپنا مورچہ انب میں محکم کر لیا تو سب ملکی لوگوں نے عرض کی کہ اب ہم پائندہ خان سے کوئی واسطہ نہ رکھیں گے۔ اور آپ کی اور مدد خان کی نوکری کریں گے۔

جب خلیفہ صاحب کے چند آدمی دریا سے پار گئے تو پائندہ خان جان کے خوف سے وادئ

کولائی سے فرار ہو کر براہ شیرگڑھ اگرور کی طرف چلا گیا۔ اور اہل و اولاد اور اپنے لوگوں کے ساتھ اگرور میں مقیم ہو گیا۔ دو تین دن گزرے تھے کہ عبدالغفور خان اگرور والے نے، پائندہ خان کی بہن سے جو اس کے والد نواب خان نے اپنی عین حیات میں اُس کو نامزد کر دی تھی اور یہ نکاح کرا کے نہ دیتا تھا جبراً نکاح کرنے کا بندوبست کیا۔ اس بات سے پائندہ خان بہت ناراض اور رنجیدہ خاطر ہوا۔ اتفاقاً ان ایام میں سردار ہری سنگھ ہزارہ میں آیا ہوا تھا۔ اور قلعہ مانسہرہ میں اس کا ڈیرہ تھا۔ آدھی رات کے وقت پائندہ خان نے اپنے لڑکے جہانداد خان کو معہ اپنے معتبر آدمیوں کے سردار ہری سنگھ کے پاس بھیجا۔ کہ اس وقت میری عزت کا سوال ہے جس طرح سے بھی ہو میری مدد کریں۔ سردار ہری سنگھ نے ہزارہ کی فوج زیر سرکردگی مہاں سنگھ روانہ کی جو قلعہ گلی سے گزرتی ہوئی موضع چنڈیر میں جا کر مقیم ہوئی۔

اس فوج کے آجانے سے پائندہ خان کو تقویت حاصل ہوئی رات کو اگروریوں کی گرفت سے نکل بھاگا حالانکہ اگروریوں نے اسی رات پائندہ خان کو معہ اس کے چند آدمیوں کے جو اس کے ہمراہ تھے۔ قتل کر کے اس کی بہن سے عقد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پائندہ خان وہاں سے بھاگ کر موضع میرا میں آ کر مقیم ہوا۔

دوسرے دن گڑھی شوگلی جو مدد خان کے ماتحت تھی خلاص کر کے پائندہ خان کے حوالے کر دی۔ دوسرے روز سردار ہری سنگھ نے معہ لشکر اس کے ساتھ ڈیرہ کیا۔ اور پائندہ خان نے اپنا ڈیرہ ڈنڈا کھولیاں میں کیا۔

تیسرے روز سردار ہری سنگھ کی فوج اور پائندہ خان کے آدمیوں نے یک جا کر قلعہ جمبیری کا محاصرہ کیا۔ اس قلعہ میں محمد خان جو پائندہ خان کا چچا تھا۔ از طرف مدد خان مختار ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ دو روز بندوق و زنبورک وغیرہ سے جنگ ہوتی رہی۔ کسی اوس نے محصورین کی امداد نہ کی۔ تیسرے روز محمد خان قلعہ سے باہر آ کر حاضر ہو گیا۔ پائندہ خان اس کی خاطر مدارات کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے بعد جمبیری سے کوچ کر کے نکہ پانی کے راستہ سے وارد میدان دربند ہوئے چنانچہ سردار ہری سنگھ کی امداد سے ملک پائندہ خان کی رعیت بن گیا۔ لوگ شرمندہ و نادم ہو کر حاضر ہوتے تھے اور اس وقت پائندہ خان بھی حسب حال ان سے جرمانہ وصول کر کے معاف کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صرف قلعہ انب۔ کہ مسکن پائندہ خان تھا۔ اور دریا کے درمیان کا قلعہ چتربائی خلیفہ صاحب کے ماتحت رہ گئے۔ باقی سب ملک پھر سے پائندہ خان کے ماتحت آ گیا۔ سردار ہری سنگھ نے کہا کہ بقیہ دو قلعے بھی فتح کر لئے جاتے

لیکن دریا میں طغیانی ہے اس واسطے جب بھی طغیانی کم ہوئی بقیہ دونوں قلعے انب و چتربائی بھی فتح کر کے پائندہ خان کو دے دئے جائیں گے وہ تسلی رکھے۔ کوئی اندیشہ نہ کرے کہ وہ اب اُس کو اپنے معتقدوں میں شمار کرتا ہے۔

سردار ہری سنگھ ہزارہ کو واپس آ گیا اور پائندہ خان نے واندھی بگوائی کی طرف جا کر وہاں ڈیرہ کیا۔

پائندہ خان کے نصیب نے یاوری کی۔ دریائے سندھ کی طغیانی کم ہو گئی اور برسات کا موسم گزر گیا اور سردی کا موسم آ گیا۔

جب سردار ہری سنگھ ہزارہ سے لاہور کی طرف جانے لگا تو جہانداد خان پسر پائندہ خان کو جو سردار کی خدمت میں حاضر تھا ساتھ ہی لے گیا۔ لاہور پہنچنے پر جہانداد خان کو مہاراجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے کہا کہ اس کو بطور یرغمال لایا ہوں۔

اس اثناء میں جب یوسف زئی کے لوگوں نے خلیفہ سید احمد شاہ ؒ کے آدمیوں کو سب علاقہ یوسف زئی میں بہانہ سے قتل کر دیا۔ تو خلیفہ صاحبؒ گرو دہو کر تکری و نند صیاڑ کی طرف چلے گئے اور پائندہ خان نے قلعہ انب اور قلعہ چتربائی پر بغیر جنگ قبضہ کر لیا۔

چند روز بعد پائندہ خان اور سردار مہاں سنگھ کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ قلعہ دربند و گڑھی کا راستہ مسدود کر دیا گیا۔ علاقہ تنول حصہ پلال میں جو زیر حکومت سکھاں تھا۔ ڈاکہ اور شب خونی کی واردات پائندہ خان نے شروع کر دیں۔ لہٰذا سردار ہری سنگھ کو پھر ہزارہ آنا پڑا۔ قلعہ دربند گڑھی کے راستوں کو کھولنے اور قلعہ تاور آباد و قلعہ کربلیاں جن پر پائندہ خان نے قبضہ کر لیا تھا۔ واگذار کرنے کے لئے میدان میں آنا پڑا۔ سردار ہری سنگھ نے ہر طرف سے یورش کی۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہوا۔ کافی روز جنگ ہوتی رہی اور بہت سے جنگ آزمودہ لوگ سردار ہری سنگھ کی جانب سے مارے گئے۔ ایک دن سردار نے غصہ میں آ کر حکم دیا کہ جہانداد خان کو گولوں کی زد میں باندھ دیا جائے۔ شاید پائندہ خان اس ڈر سے کہ جہانداد کو گولی نہ لگے۔ گولہ باری بند کرا دے۔ لیکن پائندہ خان نے اپنے گولہ اندازوں اور بندوقچیوں کو حکم دیا کہ ہرگز صرفہ نہ کریں۔ یہ نامردوں کا کام ہے۔ اگرچہ جہانداد خان ادھر ہے تاہم اگر گولی اس کو بھی لگ جائے تو کوئی ہرج نہیں اور نہ مجھے غم ہو گا۔ چنانچہ گولہ باری بدستور جاری رہی مجبوراً سردار نے خود جہانداد کو کھول دیا اور ساتھ ڈیرہ میں لے آیا۔ بارہ دن تک یہ جنگ اور گولہ باری جاری رہی۔ آخر کار کچھ وکیلوں کی وساطت سے جانبین میں گفت و شنید ہوئی اور

صلح ہو گئی۔ قلعہ قادر آباد خلاص کر دیا گیا۔ اور دربند و گڑھی کا راستہ بھی کھول دیا گیا۔ اور راجا کے ذخیرے قلعوں میں داخل کر دئیے گئے۔ جہانداد خان حسب سابق قلعہ کشن گڑھ میں قید رہا اور سردار خود لاہور کی طرف چلا گیا۔ اور جہانداد خان کی رہائی کسی صورت سے عمل میں نہ آسکی۔

لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جس سال دوست محمد خان امیر کابل بذاتِ خود پشاور کی طرف آیا تو مہاراجہ صاحب والئی لاہور سکھوں کی جمعیت کے ساتھ روانۂ پشاور ہوا۔ تو راستہ میں مقام جہنجھ سے سعد اللہ خان جو زمینداران کھاٹڑے سے تھا کو بطور وکیل پائندہ خان کی طرف بھیجا کہ پائندہ خان کو تسلی دی جائے اور کہا جائے کہ اگر وہ خود حاضر ہو جائے تو اس کے بیٹے جہانداد خان کو رہا کر دیا جائے گا اور اس کی جاگیر میں اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔ جب سعد اللہ خان وہاں پائندہ خان کے پاس پہنچا۔ تو اس نے اس کو پابہ زنجیر کر کے قید کر دیا۔ پائندہ خان کے خیر اندیش اور نیک خواہوں نے اُس کو کہا کہ وکیلوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرتا۔ لیکن پائندہ خان نے کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ اور جواب دیا۔ "مجھے بھی معلوم ہے کہ مہاراجہ صاحب والئی لاہور کے وکیل کو قید کرنے کے بعد تنول میں رہنا محال ہے لیکن میں یقین کرتا ہوں کہ جہانداد خان کی خلاصی بھی اس اقدام کے بغیر ناممکن ہے۔ جب مہاراجہ مجھ پر حملہ کرے گا تو میں بھاگ کر پہاڑوں پر چلا جاؤں گا۔ لیکن سعد اللہ خان کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ اگرچہ مہاراجہ کی فوج میرے تعاقب میں پہنچ کر نزدیک ہو گئی تو سعد اللہ خان کو دریائے سندھ میں غرق کر دوں گا۔"

جب ان واقعات کی اطلاع مہاراجہ صاحب والئی لاہور سے مفصل بیان کی گئی تو مہاراجہ نے کہا کہ سچ ہے جہانداد خان کی رہائی کے بغیر سعد اللہ خان کی رہائی بھی مشکل ہے۔ لہٰذا سردار ہری سنگھ کے نام پروانہ جاری ہوا کہ جہانداد خان کو فوراً بحضور مہاراجہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ جہانداد خان کو سردار ہری سنگھ کے معتبروں کی معیت میں مہاراجہ کی خدمت میں حاضر کر دیا گیا۔ اُسی وقت جہانداد خان کو بھائی ماہون سنگھ کاردار علاقہ کنہار کے سپرد کر دیا گیا کہ اس کو پائندہ خان کے حوالے کر دیا جائے۔ اور سعد اللہ خان کو لے آئیں۔ بھائی مذکور نے جہانداد خان کو خانی زمان خان گندگریہ (طاہر خیلی۔ ش ب) کے حوالہ کر دیا۔ کہ اس کو پائندہ خان کے پاس پہنچوا دیا جائے۔ خانی زمان خان نے جہانداد خان کو پائندہ خان کے پاس پہنچا دیا۔ پائندہ خان نے بہت خوشی کی۔ اور سعد اللہ خان کو فوراً رہا کر کے خانی زمان خان گندگریہ کے آدمیوں کے حوالہ کر دیا۔

اس کے بعد پائندہ خان نے کبھی بھی جہانداد خان کو کسی حاکم یا سردار کی ملاقات کے لئے

نہ بھیجا۔ اور نہ خود ہی پائندہ خان نے کبھی کسی سردار، دُرّانی یا سکھ کے ساتھ ملاقات کی۔ اپنی جگہ پر الگ تھلگ رہتا تھا۔

مہاں سنگھ کی واپسی ہزارہ

سردار مہاں سنگھ ملک پکھلی کے بندوبست سے فارغ ہو کر ہزارہ کی طرف آیا۔ تو اُس نے راجگان خانپور کے ذمہ واجب الادا رقوم۔ کچھ بقایا قرضہ جات اور کچھ بقایا رقوم از نذرانہ سالانہ کا حساب طلب کیا۔ اگرچہ مہاں سنگھ کی جانب سے بھائی روپ سنگھ خاص طور پر خان پور کی تھانہ داری پر مقرر تھا اور راجگان نے اِن رقومات کے ادا نہ کر سکنے کی بابت کوئی عذر تھانہ دار کے سامنے پیش کیا۔ اور نہ ہی سردار مہاں سنگھ نے راجہ نجب خان کا جس کے ساتھ اس نے دستار تبدیل کی تھی کوئی لحاظ کیا اور سردار ہری سنگھ کو لکھا کہ راجگان خان پور اطاعت و خدمت سے پہلو تہی کرتے ہیں بلکہ فاسد ارادۂ بغاوت دل میں رکھتے ہیں۔ مہاں سنگھ کا یہ خط سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ صاحب والئی لاہور کی خدمت میں پیش کر کے یہ منظوری لے لی۔ کہ اگر راجگان حکم عدولی کریں تو ملک خان پور ضبط کر لیا جائے۔

یہ حکم حاصل کر لینے کے بعد سردار ہری سنگھ ایام دسہرہ کے بعد جب سرداران پشاور سے گھوڑے وغیرہ بطور نذرانہ اور معاملہ ملک یوسف زئی وصول کر لینے کے بعد راولپنڈی پہنچا تو راجگان خان پور کو حکم بھیجا کہ اگر خان پور کا ملک چاہتے ہیں تو فوراً حاضر ہو جائیں۔ غیر حاضری یا توقف کرنے پر اُن کی جاگیر ضبط کر لی جائے گی۔ اور ساتھ ہی اپنا ایک معتبر آدمی ان کی تسلی کے لئے بھی بھیج دیا کہ راجگان کو دلجمعی کرا کر حاضر کرے۔ اُس شخص نے تقریر و تمثیل سے راجگان کو بہت نصیحت و فہمائش کی۔ لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ راجہ نجب خان و راجہ علی گوہر خان حاضر ہونے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوئے۔ وہ معتبر لاچار ہو کر دونوں راجگان کا ایک ایک معتمد ساتھ لے کر سردار ہری سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ان معتمدوں نے ایک راس گھوڑا بطور نذرانہ سردار کی خدمت میں پیش کیا۔ سردار نے نذرانہ منظور کر لیا۔ اور ان معتبروں کو خلعت دے کر رخصت کر دیا۔ اور سردار مہاں سنگھ کو لکھ دیا کہ وہ ہزارہ کی طرف سے خان پور آئے اور ارجن سنگھ (پسر سردار ہری سنگھ) کو لکھا کہ وہ بھی جو فوج سردار ہری سنگھ کی۔ پلٹن و سوار ہمراہ کالا میں ہے لے کر خان پور کی طرف بڑھے۔ خود سردار ہری سنگھ علی الصبح راولپنڈی سے سوار ہو کر ہزارہ کو براہ شاہ اللہ دِتا خان پور کی طرف روانہ ہوا۔ جب راجگان خان پور نے تین اطراف سے فوج کو آتے

دیکھا تو اپنے اہل و عیال کو لے کر کوہستان ڈھونڈھاں مواضعات ہیر وغیرہ میں جا کر قیام کر لیا۔

سردار ہری سنگھ نے خان پور میں ڈیرہ کیا۔ اور ۱۸۸۸ء بکرمی مطابق ۱۸۳۱ء وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اب اس جگہ پر خان پور کا تھانہ ہے۔ اور اسی سال سے خان پور کا معاملہ شامل ہزارہ کیا گیا۔ قلعہ کی تعمیر کے بعد سردار ہری سنگھ تحصیل معاملہ راولپنڈی، گھیب، کھاٹر، دھنی و چھچھ ہزارہ کی خاطر راولپنڈی کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد راجگان خان پور نے دو تین دفعہ خان پور پر شب خون مارے اور طرفین کی جانب سے دو چار آدمی مارے گئے۔ اور کچھ زخمی ہوئے۔ لیکن راجگان کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ نہ ہی ان کو کچھ معاش کے لئے ملا۔ اور نہ ہی جاگیر۔ یہاں تک کہ سردار ہری سنگھ کی زندگی میں (یعنی ۱۸۳۷ء تک) اپنے وطن کی طرف نزدیک آنے کی بھی ہمت نہ ہوئی۔

سردار ہری سنگھ تحصیل معاملہ کے بعد موسم برسات میں اپنے مسکن گوجرانوالہ کو چلا گیا۔ موسم برسات گزر جانے کے بعد دسہرہ کے نزدیک مہاراجہ صاحب والی لاہور کے حضور حاضر ہو گیا۔

ایک دن (یعنی ۱۸۳۱ء میں) مہاراجہ صاحب والی لاہور کے دربار میں ذکر کیا گیا کہ راجہ شاہ ولی خان ماندلہ والا اہالیان راولپنڈی پر بہت ظلم و تعدی کرتا ہے۔ شام کے بعد اگر کوئی کھترانی (ہندو عورت) برائے قضاء حاجت باہر کھیتوں میں جائے تو شاہ ولی خان کے سوار اس کو پکڑ کر موضع ماندلہ میں لے جاتے ہیں اور دو چار دن قید رکھنے کے بعد اگر اس عورت کے ورثاء کسی بارسوخ زمیندار کی وساطت سے منت سماجت کریں تو حسب خواہش جرمانہ لے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات سن کر مہاراجہ صاحب والئ لاہور نے فرمایا۔ کہ اس قدر ظلم و تعدی پر بھی کوئی شاہ ولی خان راجہ ماندلہ کو تنبیہ نہیں کرتا۔ سردار ہری سنگھ نے جو اس وقت دربار میں حاضر تھا اٹھ کر عرض کی۔ کہ اگر حضور کا حکم ہو تو یہ کیا مشکل کام ہے۔

مہاراجہ نے فرمایا کہ ایسے اعمال کرنے والوں کو سخت سزا دی جانی چاہیئے۔

ایام دسہرہ کے گزرنے کے بعد مہاراجہ صاحب نے سردار ہری سنگھ کو سرداران پشاور سے خراج کے گھوڑے لینے اور معاملہ یوسف زئی جمع کرنے کے لئے بہت سی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ تاکہ راستہ میں راجہ شاہ ولی خان کو بھی سزا دیتا جائے۔ جب سردار راولپنڈی پہنچا۔ تو راجہ شاہ ولی خان اور انتظام ہزارہ وناہ کا فکر کیا۔ چنانچہ واقف کاران علاقہ سے وناہ کا راستہ پوچھا۔ لوگوں نے کہا کہ کوہ وناہ کا راستہ سخت دشوار ہے۔ اگر نیلاں بھوتو کا راستہ اختیار کیا جائے تو آسانی سے کوہ وناہ پر پہنچ جا سکتا ہے۔

لہذا سردار ہری سنگھ حسب تجویز واقف رہبر کو ساتھ لے کر براہ گولڑہ روانہ ہوا۔ راستہ میں گولڑہ کے عوام اور قرب و جوار کے لوگوں نے سردار سے عرض کی کہ آپ وناہ کے تدارک اور شاہ ولی خان ماندلہ

کی تنبیہ کا عزم رکھتے ہیں۔ حالانکہ بکہ خان گولڑہ ان سب سے زیادہ ظالم ہے۔ آپ اس کو کیوں سزا نہیں دیتے ہیں۔ سردار نے یہ بات سن کر بہت سے لوگوں سے اس بات کی تفتیش اور استفسار کیا۔ سب نے بکہ خان کے ظلم و زیادتی کی تصدیق کی۔ جب عام لوگوں سے بکہ خان گولڑہ کی بدنامی کا آوازہ سنا تو بکہ خان کو توپ سے اُڑا دیا۔ دوسرے دن ڈیرہ موضع نور پور پہنچا تو شاہ ولی خان ماندلہ کو معہ بال بچہ گرفتار کر کے قلعہ ہرکشن گڑھ (ہری پور) کی طرف بھیج دیا۔ چنانچہ وہ چند سال سردار ہری سنگھ کے بیٹے کے پاس قید رہا۔ اس کے بعد نور پور سے سوار ہو کر کوہ وناہ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وناہ کے ڈھونڈھوں نے کچھ دیر بندوق رانی کی۔ لیکن آخر کار سب لوگ اپنے اہل و عیال اور سامان کو اپنے گھروں سے نکالنے میں مصروف ہو گئے۔ اور سردار کی فوج وناہ میں داخل ہو گئی۔

وہاں پر ڈیرہ قائم ہو جانے کے بعد وناہ کا قلعہ تعمیر کرنے کی تجویز ہوئی۔ قلعہ کی بنیاد رکھی گئی مزدور و معمار اس کی تعمیر کے لئے مقرر کئے گئے۔ چونکہ وناہ کے سب لوگ بھاگ گئے تھے۔ اُن کے گھروں کو مسمار کر کے لکڑی، شہتیر اور دیگر سامان کو قلعہ کی تعمیر میں صرف کیا گیا۔ اور ایک ماہ کی مدت یعنی ابتداء ماہ مگھر ۱۸۸۹ء بکرمی مطابق ۱۸۳۲ء آخر ماہ پوہ قلعہ مکمل ہو گیا۔ (یہ قلعہ ۲۹ اگست ۱۸۶۱ء میں مسمار کر دیا گیا۔ ش۔ ب) اور چار سو سپاہیوں کی نفری اس تھانہ کے لئے مقرر کی گئی۔ اس قلعہ کی تعمیر سخت سردی کے موسم میں کی گئی۔ بنیاد رکھنے کے بعد بارہ دن تک برف باری ہوتی رہی جو سپاہی بھی پہرہ کے لئے کھڑا ہوتا تھا دو تین گھڑی میں برف کی سردی سے زمین پر گر پڑتا اور تھوڑی دیر کے بعد مر جاتا تھا۔ اگر کسی کو گرم ادویہ مثلاً جوز بوا (جائفل)، زعفران، افیون اور بادام میسر آ جاتے اور کھا لیتا تو بچ جاتا تھا۔ لیکن ہر ایک کو یہ ادویہ میسر نہ ہو سکتی تھیں۔ لہذا سردی دو چار گھڑی کے بعد جان لیوا ثابت ہو جاتی۔

جب قلعہ کے برج تیار ہو گئے۔ تمام ڈھونڈ، بہ اتفاق بیران پلاسی بیس ہزار کے قریب ہتھیار بند آدمیوں نے کہ ابھی رات کی دو گھڑی باقی تھی کہ ایک دن ڈیرہ پر حملہ کر دیا جس سے لشکر میں شور و غوغا پڑ گیا۔ سردار ہری سنگھ بہ کمال ہمت و دلاوری سب سے آگے بڑھا اور ایک ضرب توپ ہمراہ لے کر ملکیہ لوگوں کے مقابلہ پر آ گیا۔ چونکہ ملکی لوگ بہت زیادہ تھے اور سکھوں کی فوج مقابلہ میں کم تھی۔ لہذا مقابلہ بہت مشکل تھا۔ جب سکھوں کی توپ سے گولے برسنے شروع ہوئے اور پچاس کے قریب ملکیہ لوگ مارے گئے تو انہوں نے بھاگنے میں سلامتی سمجھی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ کھڑے ہوئے۔

قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد سردار ہری سنگھ نے پیران پلاسی کو جو اُس کی خدمت میں حاضر ہوئے موضع پلاسی و مال مُولہ بطور جاگیر علی الدوام تحریر کر دئیے۔ اور دوسرے زمینداران کو حسب حیثیت انعامات و خلعت عطا کئے۔ اور تمام ملک سے پانچ روپے فی گھر بطور نذرانہ وصول کر کے خود راولپنڈی کی طرف متوجہ ہوا کر وہاں سے علاقہ یوسف زئی و پشاور کو جائے۔

قلعہ وناہ میں منصب خان کو تھانہ دار مقرر کیا۔ سردار مہاں سنگھ ہزارہ میں آ کر اپنے کاروبار میں مشغول ہو گیا۔ جب سردی کا موسم شروع سال ۱۸۹۰ء بکرمی مطابق ۱۸۳۳ء کا آیا تو ملکیہ لوگوں نے پھر جمع ہو کر قلعہ وناہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت سردار ہری سنگھ پشاور میں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے ارجن سنگھ کو ایک پلٹن سوار و پیادہ کے ساتھ مدد کے لئے بھیجا۔ سردار لہنا سنگھ سندھیانوالہ[1] جو ان ایام میں چھچھ میں اترا ہوا تھا۔ اور سردار ہری سنگھ سے اس کی تازہ دوستی ہوئی تھی اس کو لکھا کہ وہ ارجن سنگھ کی مدد کرے۔ اگرچہ فوج وغیرہ اس کے ساتھ مقرر کر دی گئی ہے لیکن امید ہے کہ آں مہرباں بذاتِ خود وناہ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ چنانچہ ان سب نے براہ خان پور روانہ ہو کر تمام فوج کے ساتھ چلیس پہاڑ پر ڈیرہ لگایا۔ اس پہاڑ پر (چلیس پر) سردار مہاں سنگھ نے ایک بُرج بنا رکھا تھا لیکن مسلمانوں نے اسے گرا دیا تھا۔ پہلے اُس کو درست کیا گیا۔ اس اثناء میں پیران پلاسی و دیگر ملکیہ لوگ سردار لہنا سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کہ اگر منصب دار خان قلعہ کا تھانیدار رہا اور دوسرا کوئی آدمی ہو تو ہم خدمت کرنے کے لئے تیار رہیں۔ اگرچہ یہ معاہدہ سردار ہری سنگھ کو بہت ناپسند تھا لیکن سردار لہنا سنگھ کی مرضی کے مطابق منصب دار خان موقوف کر دیا گیا اور مرزا فقیر بیگ تھانہ وناہ کا تھانیدار مقرر کر دیا گیا۔ منصب دار خان قلعہ سے باہر آ کر ڈیرہ فوج میں آ گیا۔ لوگوں نے اپنی رضامندی سے مرزا فقیر بیگ کو قلعہ کے اندر داخل کر دیا۔ لوگوں کی طرف سے جھگڑا اور محاصرہ ختم کر دیا گیا۔ سب رعیت آرام و فراغت سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور معاملہ بموجب تشخیص مقررہ فصل بہ فصل ادا کرتے رہے۔ مرزا فقیر بیگ بڑا فراخ حوصلہ، خوش مزاج، نیک سیرت، سفید پوش، دیندار اور محسن کردار تھا۔ ہر شخص، ملک، رئیس و عام لوگوں سے ملاقات اور دوستی پیدا کی۔ ہر چھوٹے بڑے کو سردار ہری سنگھ کی مہربانی کا امیدوار بنایا اور خود کو ہر دلعزیز بنا لیا۔ چنانچہ معاملہ فصل اس کے حسن تدبر و دانائی سے وصول ہو کر داخلِ خزانہ سرکار رہا۔

آخر الامر سنہ ۱۸۹۲ء بکرمی مطابق ۱۸۳۵ء مرزا فقیر بیگ تھانہ دار قلعہ وناہ کسی کام کے لئے

---

[1] یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہم جدی ہیں۔

ہزارہ کو آیا۔ اس کی غیر حاضری میں ملکیہ لوگوں نے پھر فتنہ فساد برپا کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ جب یہ خبر ہزارہ میں پہنچی۔ اسی وقت مرزا فقیر بیگ ملکیہ لوگوں سے سازگاری کی بناء پر بغیر کسی اندیشہ کے قلعہ وناہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ موضع تیہلہ پہنچا تو بعض لوگوں نے اس کو منع کیا کہ یہ وقت وہاں جانے کا نہیں ہے لیکن مرزا مذکور نے اُن کے نیک مشورہ کی پرواہ نہ کی۔ اور کوہ وناہ پر چلا گیا اور چاہتا تھا کہ قلعہ کے اندر داخل ہو جائے لیکن ملکیہ لوگوں نے چاروں طرف سے جمع ہو کر اُس کو قتل کر دیا۔ اُس کے ساتھیوں میں سے وہی بچے جنہوں نے بھاگ کر جان بچالی۔ اگرچہ ملکیہ لوگوں نے دغا بازی سے مرزا مذکور کو قتل کر دیا لیکن قلعہ کے سپاہی اندر ہی رہے۔ اور مقابلہ پر جمے رہے۔ ملکیہ لوگ خود ہی پشیمان ہوئے اور محاصرہ اٹھا لیا۔ اور خود بخود حاضر ہو کر پھر اطاعت قبول کی۔ اور مقررہ سرکار کو ادا کرنے لگے۔ اس کے بعد کوئی فتنہ و فساد نہ کیا۔ قلعہ کی تعمیر سے لے کر سردار ہری سنگھ کے عہد حکومت و سرکردگی سردار مہاں سنگھ میں پھر کبھی وناہ کے علاقہ میں کوئی شورش نہ ہوئی۔ اس کے بعد سردار مہاں سنگھ واپس ہزارہ ہوا۔

شورش کرڑالاں

چونکہ احمد علی خان و فتح علی خان کرڑال ساکن ستوڑہ کو دیہات ناڑہ نلاں نہیں ملے تھے۔ اور وہ ستوڑہ میں بیٹھے ہوئے مقررہ جاگیر کھا رہے تھے۔ لہٰذا شورش و فساد برپا کر دیا۔ اور قلعہ وناہ ناڑہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کے اندر بہت سے مویشی قلت آب سے مر گئے۔

سردار مہاں سنگھ نے حکم سنگھ ملازم سردار ہری سنگھ سابق تھانہ دار خٹک کے ساتھ جو اب معزول ہو کر ہزارہ میں آیا تھا اس مسئلہ میں مشورہ کیا اور اس کے تدارک کے لئے نلاں پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی محاصرہ کھل گیا۔ ملکیہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ سردار مہاں سنگھ چند دن ناڑہ ہی میں مقیم رہا۔ ایک دن شکار کے لئے ستوڑہ گیا۔ کوئی کرڑال بھی سدِ راہ نہ ہوا۔ سب فوج ناڑہ سے گزر کر ستوڑہ میں پہنچ گئی۔ احمد علی خان و فتح علی خان کے گھروں کو جلا دیا گیا۔ اور سب مال و متاع لوٹ لیا۔ اور رات کو واپس اپنے ڈیرہ ناڑہ میں پہنچ گئے۔ دوسرے دن چونکہ کام آسان نظر آیا اور بغیر جنگ کے فتح دیکھی تو وہ سب فوج ستوڑہ میں داخل ہوئی۔ اور ایک کچی گڑھی وہاں تعمیر کی۔ احمد علی خان و فتح علی خان اپنے اہل و عیال کو ساتھ لے کر فرار ہو کر ماڑی ڈنگری کی طرف جا کر بیٹھ گئے۔

ستوڑہ کا قلعہ ایک ماہ میں تیار ہو گیا۔ اور سردار مہاں سنگھ تھانہ مقرر کر کے ایک سو بندوق

(سپاہی) وہاں چھوڑ کر خود ہزارہ کو واپس ہوگیا۔ ملک ستوڑہ کے دیہات جو جاگیر میں تھے وہ ضبط کر لئے
صرف ایک ہزار روپیہ کی جاگیر، دو تین چھوٹے چھوٹے گاؤں کی جو کہ دور واقع تھے۔ احمد علی خان و
فتح علی خان کو بطور گزارہ دے دی۔ اور تین ہزار کی جاگیر ضبط کرلی۔ یہ عمل سمت ۱۸۹۳ بکرمی مطابق ۱۸۳۶ء
میں ہوا۔ اسی سال قلعہ کی تعمیر بھی ختم ہوئی۔ اور اسی سال کے آخر میں سردار ہری سنگھ بمعہ فوج ہزارہ
میں آیا۔ اس کے بعد سردار چتر سنگھ اٹاری والا و تارا سنگھ اٹاری والا بھی سردار کی متابعت میں گئے۔

حملہ ملک اگرور

سردار ہری سنگھ نے ملک اگرور لینے کا ارادہ کیا اور ناگاہ فوری طور پر سب فوج کے ساتھ
موضع کولکہ واقعہ درہ اگرور میں داخل ہوئے۔ ایک ضرب توپ جو سردار کے ہمراہ تھی اس کو گڑھی کولکہ[1]
کے سامنے مورچہ باندھ کر توپ چلانی شروع کردی۔ ڈھائی سو کے قریب گولے چلے ہوں گے کہ قلعہ
مذکور کے سپاہیوں نے امان طلب کی۔ اور قلعہ سے باہر آگئے۔ سردار نے ان کی جان بخشی کی اور
رخصت کردیا۔ اور قلعہ کو اپنے ملازمان کے حوالے کردیا۔

اس کے بعد زمینداران اگرور حاضر ہوئے۔ اور اگرور کا بندوبست کرکے وہاں سے کوچ کیا۔ اور از
راہ گلی تنوعہ کوہ بھیگڑہ کی چوٹی پر جو بہت بلند و بالا ہے، آئے اور مقام چیکو لمن ایک گڑھی خشک
پیڑھ و دیار سے تعمیر کرکے تھانہ مقرر کیا۔ اور اس میں تین سو سپاہی مسلح بابندوق مقرر کئے اور موضع
کوٹ کمیاں کی طرف روانہ ہوا۔ زمیندار وہاں سے بھاگ کر ادھر ادھر چلے گئے۔ سردار نے وہاں بھی ایک
گڑھی تعمیر کرکے سردار مہان سنگھ کے حوالہ کی اور خود بمعہ فوج وہاں اتر کر پلیاں میں ڈیرہ کیا۔ سردار مہان سنگھ
نے مع ہزارہ کی فوج کے کوٹ کمیاں کی گڑھی تیار کی۔ سردار ہری سنگھ نے ہزارہ سے اجناس وغیرہ اس
گڑھی کے لئے منگوائے۔ گڑھی پندرہ سولہ روز میں تیار ہوگئی۔ سردار مہان سنگھ نے یہاں تھانہ مقرر کر
کے ساتھ سپاہی مسلح بابندوق بٹھادئے۔ اور جنس و دیگر ذخیرہ دے کر گڑھی کو محکم کرکے خود کر پلیاں میں
سردار ہری سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

جب سردار ہری سنگھ ان تھانوں کے سپاہیوں کی بھرتی سے فارغ ہوا تو پائندہ خان سے صلح صفائی
کی باتوں کا آغاز کیا۔ دن سے دو گھڑیاں باقی ہوں گی کہ پائندہ خان کے وکیل حاضر ہوئے اور اسی وقت
سامنے دریائے سندھ کے اس طرف چند بکریاں اور چاولوں کی بوریاں رکھی نظر آئیں اور یہ ظاہر کیا کہ یہ چاول

[1] خان اگرور کا قلعہ و رہائش کی جگہ تھی۔

بکریاں اور مرغ صلح صفائی کی ضمن میں بطور دعوت بھیجی گئی ہیں۔ اس پر سردار ہری سنگھ نے کہا آئیے کہ
سب دریا جا کر فی الحال ٹھنڈا پانی پئیں۔ چنانچہ سب فوج بلا خوف و خطر دریا کے کنارے پر آگئی اور
سکھوں نے ٹھنڈا پانی پیا۔ جب سردار بمعہ فوج کے پھلاہ بینی کے قریب جہاں دریا بہت تنگ ہے
اگر پتھر بھی اس کنارے سے پھینکا جائے تو وہ دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا ہے، پہنچا۔ تو جتنی بندوقیں
توپیں۔ زنبورک۔ و زنبیل پائندہ خان کے پاس تھیں اور اس نے پھلاہ بینی کے بالمقابل رکھی تھیں
یکبارگی آتش دے کر اس زور سے فائر کئے کہ اس شور و ہنگامہ سے سرداروں کے
سائبان (چھتریاں)، جو فراشوں کے ہاتھوں میں تھے سب زمین پر گر گئے۔ اور سردار بھی اپنے
گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے۔ اور دریا کے کنارہ کے پتھروں کی پناہ میں بیٹھ گئے۔ لیکن قدرت
ایزد جہاں آفریں نے سکھوں کو اس طرح بچایا کہ ایک گولی بھی کسی کو نہ لگی۔ اور سب سلامت بچ
گئے۔ غروب آفتاب کے بعد سردار پاپیادہ بغیر سواری اپنے ڈیرہ کو آیا۔ یہ واقعہ سردار مہان سنگھ
کے کوٹ کمیاں کی گڑھی مکمل کرکے واپس آنے سے ایک دن پہلے ہوا۔ دو چار روز بعد دونوں یکجا
روانہ ہوکر ہزارہ میں آئے۔

سردار ہری سنگھ اپنے لشکر کے ہمرکاب دارالسلطنت لاہور کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد وہ ہزارہ
میں نہیں آیا۔ یہ اس کا آخری دورہ تھا۔ سردار مہان سنگھ راولپنڈی تک سردار ہری سنگھ کے
ہمرکاب گیا اور وہاں سے رخصت لے کر واپس ہزارہ ہوا اور اپنے کاروبار میں مشغول ہوگیا۔

برسات کا موسم گزرنے کے بعد سردار ہری سنگھ دسہرہ پر مہاراجہ صاحب والئی لاہور کی
خدمت میں حسب دستور حاضر ہوا۔ وہاں سے اس کو ملک پشاور کی صوبیداری پر مقرر کیا گیا۔

اگرچہ اس کے بعد کے واقعات کا تعلق تاریخ ہزارہ سے نہیں۔ لیکن ہری سنگھ کی تاریخی شخصیت
کے پیش نظر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کامیاب زندگی کے آخری باب کو بھی زیر تحریر لایا جائے۔
لہذا تاریخ مہتاب سنگھ سے بقیہ حصہ بھی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

" لاہور سے صوبیداری پشاور کا حکم ملنے پر سردار ہری سنگھ وہاں سے رخصت ہوکر پہلے
ملک یوسف زئی میں آیا۔ جس کے بعد کنور شیر سنگھ کو مہاراجہ نے پشاور سے طلب کرلیا۔ اور وہ
لاہور کی طرف چلا گیا۔ ملک یوسف زئی میں پہنچ کر سردار ہری سنگھ اور کنور شیر سنگھ نے متفق
ہوکر (یعنی دوران سفر ملاقات پر) یہ فیصلہ کیا کہ پنج تار کو جو ایک محفوظ مقام تھا جلا دیا جائے
چند مال دار لوگ تو وہاں سے فرار ہوگئے۔ باقی لوگ جو مفلس اور محتاج تھے۔ وہیں ادھر ادھر

وقت گزارتے رہے۔ اور تین چار دن کے بعد بدستور اپنے گھروں میں آ گئے۔

پنج تار کی فتح کے بعد کنور شیر سنگھ لاہور کی طرف چلا گیا۔ اور سردار ہری سنگھ پشاور چلا گیا اور انتظام ملک پشاور میں مشغول ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے درہ خیبر کا ملاحظہ کیا۔ اور ایک خام قلعہ بمقام جمرود تعمیر کرنا شروع کیا۔ خود تو وہ دو تین دن وہاں رہا اور قلعہ کی بنیاد رکھ کر پشاور آ گیا۔ اور سردار مہاں سنگھ کو تعمیر مکمل کرنے کے لئے وہاں چھوڑ دیا۔ قلعہ کی بنیاد چھٹے مہینے کے شروع میں رکھی گئی اور آخر ماہ ماگھ سال سمت ۱۸۹۲ بکرمی مطابق ۱۸۳۵ء کو تعمیر مکمل ہو گئی۔ سردار مہاں سنگھ نے اجناس و ذخیرہ گولہ بارود و غلہ وغیرہ جمع کر کے قلعہ کو محکم کر دیا۔

اس پر خیبر کے لوگوں نے امیر دوست محمد خان والی کابل کو خبر دی اور فریاد کی کہ سکھوں نے جمرود یعنی کابل کے دروازہ کو فتح کر لیا ہے۔ اب وقت ہے کہ آپ مدد کریں۔ نہیں تو کچھ مدت کے بعد ملک کابل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ امیر موصوف نے رعایا خیبر کا استغاثہ سن کر اپنے دو بیٹوں محمد اکبر خان و محمد افضل خان کو حکم دیا۔ کہ ان کی امداد کریں۔

چنانچہ یہ دونوں دو ہزار پیادہ اور سات ہزار سوار لشکر اور اٹھارہ ضرب توپ خورد کے ساتھ خیبر کے لوگوں کی امداد کے لئے آئے۔ اور علی مسجد جو قلعہ جمرود سے ڈھائی کوس کے فاصلہ پر ہے۔ فروکش ہوگئے۔

سردار مہاں سنگھ کو بھی خبر پہنچ گئی کہ درانیوں کی فوج کابل سے پہنچ گئی ہے جس کا علی مسجد میں ڈیرہ ہے۔ سردار ہری سنگھ کو مطلع کیا گیا۔ اور اس نے مہاراجہ صاحب والی لاہور کو خبر بھیجی۔ کہ اس وقت ضروری ہے کہ کچھ فوج پشاور کی امداد کے لئے بھیجی جائے۔

انہی ایام میں کنور نونہال سنگھ کی شادی کا انتظام ہو رہا تھا لہٰذا کسی کو پشاور جانے کا حکم نہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ درانی فوج نے موضع جناکی میں پہنچ کر ڈیرہ کر لیا۔ ایک دن درانی سواروں نے آ کر قلعہ جمرود کے بعض سپاہیوں کو جو جمرود کے تالاب پر کپڑے دھو رہے تھے اور بعض لکڑیاں جمع کرنے کے لئے باہر گئے تھے قتل کر دیا

دستور یہ تھا کہ قلعہ کی ایک کمپنی ہر آٹھویں روز تبدیل ہوتی تھی۔ واقعہ کے روز ایک کمپنی قلعہ میں داخل ہونے والی تھی کہ اس وقت انہوں نے ان سواروں (درانیوں) کو دیکھا اور اپنی بندوقوں کے چقماق درست کر کے تیار ہو گئے۔ اس اثناء میں جو سپاہی قلعہ کی طرف دوڑ کر گیا وہ راستہ ہی میں قتل ہو گیا۔ اور ہر وہ شخص جو اس کمپنی سے نہ ملا وہ بھی سلامت نہ رہا۔ اس حملہ کے بعد درانی سوار واپس چلے

گئے۔ اُن کے دو تین گھوڑے رہ گئے اور چار پانچ سپاہی مارے گئے۔ قلعہ جمرود کے چودہ سپاہی مارے گئے۔ اسی طرح کی چپقلش ہر روز ہوتی تھی۔ آخر کار ۱۲ ریساکھ سمت ۱۸۹۲ بکرمی (سنہ ۱۸۳۵ء) کننگھم نے اپنی تاریخ سکھاں میں ۳۰ راپریل ۱۸۳۷ء لکھا ہے اور یہی صحیح ہے کہ درانی فوج نے خیبر و علی مسجد سے جمع ہو کر قلعہ جمرود کے گرد مورچہ بندی کر کے محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کے اندر بارہ سو بندوق موجود تھی ان میں آٹھ سو بندوق قابل جنگ سپاہیوں کے پاس تھی۔ اور چار سو گُماشتہ، بقال، خدمت گاروں وغیرہ کے پاس تھی۔ درانیوں نے تاریخ متذکرہ بالا پر قلعہ کے گرد مورچہ بندی کر کے تین ضرب توپ جنوب مغرب کی جانب اور چھ ضرب توپ مغرب کی جانب لگا دیں اور ان سے قلعہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اور چھ دن کے عرصہ میں جانب غرب کی فصیل اور جنوب مغرب کے گوشہ کا برج سر سے بنیاد تک مسمار کر دیا۔ اس حالت میں بلا شک درانی گھوڑے کو ایڑ لگا کر قلعہ کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔

محمد اکبر خان نے اس وقت خیبر کے لوگوں کو طلب کر کے کہا کہ تم نے خود بحضور امیر کبیر دوست محمد خان اقرار کیا تھا کہ جب توپ سے قلعہ کی دیوار گر جائے گی تو ہم خود قلعہ پر حملہ کر کے قلعہ کو لے لیں گے۔ اب قلعہ کی ایک دیوار اور ایک برج گر چکا ہے اور زمین کے برابر کر دیا گیا ہے تو وہاں خیبریوں حملہ نہیں کرتے۔ اب ہم کل جمعرات کو خود حملہ کریں گے۔

محصورین بھی بہت تنگ ہوئے۔ محاصرہ کے مورچے سخت تھے اگر محصورین میں سے کسی آدمی کی ایک انگلی بھی باہر سے نظر آ جاتی تو وہ گولی سے اُڑا دی جاتی تھی۔ ایک دفعہ چودہ آدمی قلعہ سے بغیر بندوق کے پہرہ تبدیل کرنے کے لئے گئے۔ جونہی ان کا سایہ محاصرین کو نظر پڑا اسب کو گولی سے اُڑا دیا قلعہ کے سپاہی یہ خبر سن کر کہ کل اُن پر حملہ ہونے والا ہے بہت خائف ہوئے۔ جب رات سے ایک پہر گزرا ہو گا کہ سب افسروں نے ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ سے سردار ہری سنگھ کی خدمت میں لکھا کہ کل جمعرات کو ان پر حملہ ہو گا۔ اگر حملہ سے پہلے کوئی مدد پہنچ گئی تو بہتر نہیں تو قلعہ کے سب سپاہی قتل ہو جائیں گے اور ہم سب سرکار کے نمک کی خاطر جان قربان کر دیں گے۔ اسی وقت یہ خط ایک سپاہی کو پچیس روپیہ انعام دے کر روانہ کیا۔ اس سپاہی نے کتے کی طرح دیوار قلعہ سے چھلانگ لگائی اور اسی طرح محاصرین سے نکل کر پشاور پہنچ گیا۔ اس سے اقرار کیا گیا تھا کہ جب وہ پشاور پہنچ جائے تو وہاں سے ایک ضرب توپ داغی جائے کہ اُن کو تسلی ہو جائے کہ ان کی عرضی سردار کی خدمت میں پہنچ گئی ہے وہ سپاہی رات سے دو گھڑی باقی تھی کہ پشاور پہنچ گیا۔ اور عرضی دفتر دیوانی میں دے دی۔ شیخ احمد منشی اسی وقت سردار ہری سنگھ کی طرف دوڑ کر گیا اور عرضی کا حال سنایا۔ اور حسب گفتہ سپاہی

ایک توپ داغی گئی۔ جس سے قلعہ جمرود کے افسران اور سپاہیوں کو معلوم ہو گیا کہ عرضی سردار ہری سنگھ کی خدمت میں پہنچ گئی ہے۔ یہ سب امید اور انتظار میں تھے کہ امداد ابھی آتی ہے۔ لیکن سردار کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ اور جلاّب لے رکھا تھا۔ صبح کو سوار ہو کر موضع تہکال کے برج سے کہ پشاور سے ڈیڑھ کوس جمرود کی طرف تھا پہنچا۔ شام تک دوربین سے دیکھتا رہا۔ دن سے چار گھڑی وقت باقی تھا کہ اس سپاہی کو افسروں کے نام پروانہ لکھ کر دیا گیا اور پچاس روپیہ زائد انعام دے کر کہا کہ تم یہ پروانہ جمرود میں پہنچا دو۔ اور قلعہ کے دفتر کو لکھا کہ یہ پروانہ پہنچانے پر اس سپاہی کو پانچ روپیہ اور دئے جائیں۔ اُس سپاہی کی جوانمردی پر آفرین کہ وہ ایسے وقت میں قلعہ جمرود کی طرف روانہ ہوا جب کہ قلعہ کے اندر کا ہر شخص قلعہ سے باہر نکل جانے کا آرزو مند تھا۔

دن کا دو گھڑی وقت باقی تھا کہ خیبر کے لوگوں نے جن کی تعداد بیس ہزار ہو گی۔ درّانی سواروں کے ساتھ جن کے ہاتھوں میں نیزے اور بلم تھے اور ان کے پیچھے محمد اکبر خان خود تھا۔ قلعہ پر ہلّہ بول دیا۔ اور چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ قلعہ کے اندر کے سپاہیوں نے بھی بے تحاشا بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ اگرچہ باہر سے توپ کے گولے اور بندوق کی گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی تھیں لیکن قلعہ کے اندر ایک سپاہی کو بھی نقصان نہ پہنچا۔ قلعہ کے اندر ایک توپ تھی اُن کو گولہ و غراب[لہ] اور زنبورہ دیا گیا۔ کہ بندوقوں کے علاوہ اُن کو بھی چلائیں۔ ملکیہ لوگوں سے جو لوگ پیادہ پا کر قلعہ کے دونوں طرف سے حملہ آور ہوئے تھے تین سو کے قریب قتل ہو گئے۔ اور لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور اُن کے پیچھے جو سوار حملہ آور تھے توپ و بندوق کے زخموں سے بیس کے قریب مارے گئے۔ حملہ ناکام ہوا۔ اور ملکیہ لوگ اور دُرّانی اپنے ڈیرہ کو واپس چلے گئے۔

اس وقت سپاہی مذکور پروانہ سردار ہری سنگھ لے کر داخل قلعہ جمرود ہوا۔ اس کے پہنچنے سے سب افسر بہت خوش ہوئے۔ اور دلیر ہو گئے اُس پروانہ میں لکھا تھا کہ "کل جمعہ ہے وہ ہمت کر کے اپنی جگہ پر مستقل طور پر قائم رہیں۔ اور ہفتہ کے روز جس جگہ بھی درّانیوں کی فوج ہو گی ان کے سر پر پہنچ جاؤں گا۔ وہ ہر حال میں تسلی رکھیں"

جمعہ کے دن خیبری و درّانی اپنے مُردوں کی تجہیز و تکفین میں تمام دن سرگردان رہے اور کچھ خیال

لہ غراب۔ ایسی توپ جس میں مختلف چیزیں یا لوہے کے ٹکڑے یا پتھر سے بھر کر چلایا جاتا تھا تاکہ سامنے کی کوئی چیز محفوظ نہ رہے اسے غراب مارنا کہتے تھے۔

دیا کہ سکھ حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اپنی توپ و تفنگ بند رکھی۔

ہفتہ کے روز علی الصبح سردار ہری سنگھ نے پشاور سے سوار ہو کر چھ پلٹن پیادہ اور ایک ہزار سوار۔ کل دس ہزار فوج کے ساتھ نالہ باڑہ پر پہنچ کر ڈیرہ کیا۔ اس فوج کے پہنچتے ہی خیبری و درّانی لوگوں کو فکر لاحق ہوا۔ اُنہوں نے اپنا محاصرہ قلعہ جمرود کے مشرق اور گوشہ شمال مشرق سے اُٹھا لیا۔ اور سب زور قلعہ کی فصیل کے مغرب اور بُرج گوشہ جنوب مغرب پر جمع کر دیا۔ تمام دن ڈیرہ کے انتظام میں مشغول رہے۔ اور قلعہ والوں کے ساتھ کچھ لمبا جھگڑا نہ کیا۔ دن کے وقت چار پانچ گولے مارے کہ رات ہو گئی۔ رات کے وقت قلعہ کی جانب سے گولیاں چلائی جاتی رہیں۔

ماہ بیساکھ کی بیس تاریخ سے بارہ جیٹھ تک قلعہ کے محاصرہ کے بیس بائیس دن ہو گئے۔ اس اثناء میں سردار ہری سنگھ کوچ کر کے قلعہ کے متصل آ گیا۔ سردار مہاں سنگھ معہ افسروں کے قلعہ سے باہر آ کر سردار کی تعظیم بجا لایا۔ اور عرض کیا۔ "بندہ نواز! میری رائے ہے کہ آج ڈیرہ اسی جگہ پر رہے امید ہے کہ آپ کے اقبال سے درّانی آج رات ہی کو فرار ہو جائیں گے اگر وہ نہ گئے تو فوج پیادہ آرام کرے گی۔ اور پھر رات سے جنگ شروع کر دی جائے گی" اس پر سردار ہری سنگھ نے کہا۔ "یہ کیا بات ہے۔ انہیں کل دن سے پہلے ہی ان کو تنبیہ اور سزا دی جائے گی۔ خاطر جمع رکھو۔ نصف سپاہ کمر بستہ برجوں پر بیٹھے رہیں۔ اور بقیہ نصف کمر بستہ تیار رہیں۔ اس تجویز پر عمل کریں"

اسی اثناء میں لشکر درّانی کی طرف سے ایک گولہ آیا جو سردار کے لشکر کے دھونسہ نواز کو لگا اور وہ گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ دوسرا گولہ آیا اور سردار کے پلٹن کے کمیدان صوبا سنگھ کے ایک خدمت گار کی گردن پر لگا اور وہ وہیں ہلاک ہو گیا۔ درّانی فوج کے سواروں نے جمعدار خوشحال سنگھ پر جو اُن کے مقابل میں تھا حملہ کر دیا۔ تو اس کے آدمی میدان سے پیچھے ہٹ گئے۔ جب سردار ہری سنگھ نے دیکھا تو حکم سنگھ سندھیا نوالہ اور جواہر سنگھ جمعدار کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی فوج سے اس کی مدد کریں۔ کہ اردلیوں کا ڈیرہ واپس ہو رہا ہے۔ جب بموجب حکم سردار ہری سنگھ حکم سنگھ و جواہر سنگھ مددگار فوج لے کر گھوڑے دوڑا کر جمعدار خوشحال سنگھ کے ڈیرہ کی مدد کے لئے پہنچے تو ان کے پہنچتے ہی درّانی فوج کے چند سوار گھوڑوں سے نیچے گر گئے۔ اور بعض گھوڑوں سمیت مارے گئے آخر کار درّانی فوج کے ڈیرہ کو شکست ہوئی اور وہ ایک پہاڑی سے دوسری پھر تیسری پہاڑی پر چڑھتے اور بھاگتے گئے۔ اور سکھوں کی فوج اُن کے تعاقب میں جاتی رہی۔ یہاں تک کہ پانچ پہاڑی ٹیلے درّانیوں سے خالی ہو گئے تیسری پہاڑی پر درانیوں کی جو صف

لہ چنداول، پیچھے رہنے والا۔

توپ جن کے گولہ انداز ہندو تھے سکھوں کے قبضہ میں آگئیں۔ گولہ اندازوں نے سکھوں کی منت و زاری کی کہ ان کو قتل نہ کریں۔ اور وہ بھی توپیں درانیوں کی طرف پھیر کر گولہ باری کرتے ہیں اور ہم تمہارے نوکر ہیں۔ لیکن سکھوں نے یہ باتیں نہ سنیں اور ان کو قتل کر کے توپوں، گھوڑوں، زینوں اور اسباب سمیت لوٹ لیا۔ اور ان توپوں پر سردار ہری سنگھ نے خود پہنچ کر قبضہ کر لیا۔ اور ان کو جمرود کے قلعہ میں بھیج دیا اور ساتھ ہی گھوڑے بھی روانہ کر دئے۔

اس اثناء میں سکھ ہارسن صاحب فرنگی کے خیمہ پر پہنچ گئے۔ ہارسن صاحب کی بیوی خیمے کے اندر بیٹھی ہوئی تھی۔ سکھ تلواریں نکال کر اس پر حملہ آور ہوئے۔ بی بی موصوف نے کہا۔ "ہم زنانہ ہیں اور زنانہ کے قتل کرنا کسی مذہب میں جائز نہیں۔ آپ گرفتار کر سکتے ہیں" لیکن سکھوں نے۔ بی بی مذکور کی کسی بات پر کان نہ دھرا اور تلواروں سے اُس کو قتل کر دیا۔ اور اس کا سب سامانِ ڈیرہ لوٹ لیا۔

ناگاہ اسی وقت دوست محمد خان کا ہمشیر زادہ شمس الدین خان اپنی ڈیڑھ ہزار فوج کے ساتھ یلغار کرتا ہوا اور بزن بزن کہتا ہوا پہنچ گیا۔ اس نے پہنچتے ہی سردار ہری سنگھ کے پیش رو سواروں پر حملہ کر [illegible] کہ پیشانی پر گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اسی طرح چند اور سوار بھی کام آئے۔ باقی سواروں کے پاؤں اپنی جگہ سے اکھڑ گئے۔ اور [illegible] گئے۔ اور بہت سے سوار اس جگہ گولی سے زخمی ہو کر مارے گئے۔ درانی فوج کے کچھ سوار ان کے تعاقب میں آئے اور سکھوں کے ڈیرہ کی فوج کے سر پر صف بستہ کھڑی تھی پہنچ گئے۔ سکھوں کی فوج کو ہزیمت ہوئی۔ اس بھاگڑ میں بہت سے پیادہ گھوڑوں کے نیچے آکر مر گئے۔ اور بہت سے سوار اپنے گھوڑوں سے زمین پر گر پڑے۔ سکھوں کی فوج سے ایک ہزار آدمی قلعہ جمرود سے متصل نالہ میں نیچے چھپے ہوئے کھڑے تھے۔ اور اس نالہ کے کنارے کے اوپر سردار ہری سنگھ خود بمعہ دو پلاٹون بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس جگہ سردار کی پشت پر توپ سے چند سوار مع گھوڑوں کے اور بعضے پیادے مارے گئے۔ توپ کے گولے دمبدم اس جگہ پر گر رہے تھے اور زمین سے گرد و غبار اُڑا رہے تھے۔ اس وقت افسروں نے اور خاص کر سردار کاہن سنگھ مجیٹھیہ و ہرلوک سنگھ و امیر خان قصابان پلاٹن۔ سب نے سردار ہری سنگھ کی خدمت میں عرض کی کہ فوج اس نالہ میں کھڑی ہے اور باوجود بہت دفعہ بلانے کے ادھر نہیں آتی۔ اور حضور کے سامنے آٹھ سوار مارے جا چکے ہیں اور ہم سب مارے جائیں گے کہ گولہ باری زوروں پر ہے بہتر یہ ہے کہ اس وقت ڈیرہ کو یہاں سے اُکھاڑ لیں کیونکہ افیون کھانے کا وقت بھی ہے۔ اور کل پھر ان سے مقابلہ کیا جائے گا۔ سردار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فوج کا مقابلہ ہوا اور اس کی فوج

شکست ہوئی اور بھاگ کر نالہ میں کھڑی ہوئی ہے اور اوپر نہیں آتی۔ ناچار اس نے پریم سنگھ و امیر خان پلاٹون کی دونوں کمپنیوں سے کہا۔ "کہ میں پہلے اُٹھ کر نالہ میں اُترتا ہوں۔ جب تک میں نالہ کے دوسرے کنارے پر چڑھ نہ جاؤں اس وقت تک وہ یہاں مقابلہ پر جمے رہیں۔ جب میں اُس کنارہ پر پہنچ جاؤں تو سب نیچے اتر کر میرے پیچھے آجانا۔ اگر تم نے جلدی کی تو درانی فوج سامنے کھڑی ہے۔ اُس حالت میں ایک شخص بھی بچ کر نہ جا سکے گا۔ اور وہ سب کو قتل کر دیں گے"

جب سردار اٹھ کر سوار ہوا اور ابھی پاؤں رکاب ہی میں تھا کہ دونوں پلٹنیں کود کر نالہ میں گر پڑیں ان پلٹنوں کے اپنی جگہ سے ہٹتے ہی درانی پلٹن کے سوار فوراً ان کی جگہ پر آگئے۔ اور بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ بہت سے آدمی نالہ کے اندر مارے گئے۔ اور سردار ہری سنگھ جو ابھی پچیس تیس قدم ہی اس طرف آیا ہوگا کہ اس نے دیکھا کہ تین ضرب توپ وہاں پڑی تھیں۔ ایک ان میں سے ٹوٹی ہوئی تھی اور دو گھوڑے میدان میں کھڑے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ ان کے گھوڑے کہاں ہیں اور توپخانہ کا کمیدان (COMMANDANT) کہاں ہے۔ گولہ اندازوں نے کہا کہ کمیدان بھاگ گیا ہے اور درانی توپ خانہ کے گھوڑے قلعہ جمرود کی طرف لے جائے گئے ہیں اور واپس نہیں لائے گئے۔ سردار وہاں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ توپوں کو لے جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہیں چھوڑ جاؤ۔

اسی اثناء میں توپوں کے گھوڑے آگئے اور ان کو توپوں کے آگے لے جانے کے لئے باندھا گیا۔ لیکن دونوں طرف سے توپوں اور بندوقوں سے اتنی گولہ باری ہو رہی تھی کہ گھوڑوں کے ہوش درست نہ رہے۔ وہ کبھی شمال اور کبھی مغرب کی طرف چل پڑتے۔ کہ ناگاہ درانی سواروں نے یکبارگی بندوقیں چلانی شروع کر دیں۔ اور چند گولیاں سردار کے پیٹ اور پہلو میں لگیں۔ اور ایک گولی سے زرہ آہنی جو سردار نے پہن رکھا تھا اس کی ایک کڑی جسم میں داخل ہو گئی اور سردار کا کام تمام کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھیوں کی زندگی باقی تھی وہ اسی حالت میں گھوڑے پر سوار نالہ کے کنارے بطرف قلعہ جمرود پہنچ گیا۔ اس کے سر سے خود و دستار گر پڑی لوگ دوڑ کر چارپائی قلعہ کے دروازہ سے لے آئے۔ سردار کو چارپائی پر ڈال کر قلعہ کے اندر ایک کوٹھہ میں چھپا دیا۔ اور مشہور کر دیا کہ سردار زخمی ہو گیا ہے لیکن زندہ ہے اس کا علاج اور مالش کی جا رہی ہے۔

درانیوں کی جانب سے توپ و تفنگ کی گولہ باری شام تک جاری رہی۔ سکھوں کی جانب سے بہت سے سپاہی مارے گئے۔ شام کے وقت سکھوں کی فوج نے دہری متصل قلعہ جمرود میں ڈیرہ کیا۔ جہاں آج کل برج ہری سنگھ تعمیر ہے۔ پانی کی تکلیف قلعہ کی سپاہ نے آٹھ روز تک دیکھی۔

جب ڈیرہ دہری کے متصل گیا تو اُس جگہ پانی دُرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ کیونکہ پانی کے نالہ کے کنارے ان کا ڈیرہ تھا۔ اگر وہ چاہتے تو نالہ توڑ کر پانی کا رُخ دوسری طرف کر سکتے تھے۔ سب افسروں کی رائے یہ تھی کہ پشاور جا کر ڈیرہ کریں۔ لیکن سردار مہاں سنگھ مُصر ہوا کہ یہی جگہ ٹھیک ہے۔ لاچار سب لوگ وہیں ٹھہر گئے۔ وہاں صرف ایک تالاب تھا۔ صبح سے شام تک اس تالاب کا پانی اور کیچڑ تک ڈیرہ کے گرد قدآدم سنگر یعنی دیوار چاروں طرف بنانے اور اس پر خار بندی کرنے پر خرچ ہو گیا۔ کارسازِ حقیقی کی مہربانی سے رات سے ایک پہر گزرا ہوگا کہ بارانِ رحمت شروع ہوئی۔ یہ ساری رات اور دوسرا دن اور رات برستی رہی۔ اور وہ تالاب جس کا پانی اور کیچڑ بھی ختم ہو چکا تھا از سرِ نو بھر گیا۔ اور اس قدر پانی جمع ہوگیا کہ اگر فوج دو تین ماہ بھی خرچ کرتی تو ختم نہ ہوتا۔ لشکر کے لوگوں کو اس سے خاطر جمعی ہوگئی۔ لیکن آٹے اور دانہ کی سخت تکلیف پیدا ہوگئی لشکر کے بازار میں ایک روپیہ میں بھی تین پاؤ آٹا دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔

جنس غلّہ گندم قلعہ کے گودام میں موجود تھی۔ سردار مہاں سنگھ نے تین سیر فی روپیہ کے حساب سے تمام لشکر پر فروخت کر دی۔ اس سے لشکر کی ہمت اور قوت زیادہ ہوگئی۔ لیکن یہ قیمت غلہ جمعدار خوشحال سنگھ کے آنے کے وقت تک وصول نہ کی جا سکی۔ کیونکہ جمعدار نے کہا کہ فوج خدمت سرکار میں حاضر ہے پشاور کے نرخ پر قیمت ادا کر دیں گے۔ اس کے بعد دس روز تک فوج اس مورچہ میں رہی۔ اور لپٹ ور سے امداد دس بارہ روز کے بعد پہنچی۔ اور ونتورہ صاحب بہادر فرانسیسی بمعہ پلٹن و جمعدار خوشحال سنگھ، کنور کھڑک سنگھ و نونہال سنگھ و راجہ دھیان سنگھ اور دوسری بہت سی فوج پہنچ گئی۔ اس امدادی فوج کے پہنچتے ہی دُرّانی فوج اپنا ڈیرہ اٹھا کر چناگی میں لے گئی۔ سکھوں کی فوج کا ڈیرہ جو جمرود میں تھا آکر کٹھہ پر جمع ہو گئے۔ اور سب لشکر کٹھہ بارہ پر یک جا جمع ہو گیا۔ اور چند روز وہیں ٹھہرے رہے۔ اور موجودہ قلعہ جمرود کی مرمت مکمل کر لی گئی۔

مسٹر گیرٹ (GARRET) کننگھم کی تاریخ سکھاں میں ص ۲۱۱ میں لکھتا ہے کہ محمد اکبر خان پسر امیر دوست محمد خان نے قلعہ جمرود پر ۳۰ اپریل ۱۸۳۷ء میں حملہ کیا۔ لیکن قلعہ نہ لے سکا۔ ہری سنگھ پسپائی اختیار کر کے محمد اکبر خان کو میدان میں لے آنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اپنی فوجوں کے ہر محاذ پر بہادری سے پھر کر جنگ کرتا رہا۔ اور مہلک طور پر زخمی ہوگیا۔ کابل کی فوج کو مزید کمک آجانے سے سکھوں کو شکست ہو گئی۔ لیکن سکھوں کی صرف دو توپیں ضائع ہوئیں اور دُرّانی قلعہ کو فتح نہ کر سکے۔ چند دن دیہات میں لوٹ مار کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔ اور لاہور سے سکھوں کی مزید

کمک آجانے کے ڈر سے دوسری جنگ لڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔ سردار ہری سنگھ ایک بہادر جرنیل تھا۔ ہزارہ میں اس کا آخری کارنامہ اگرور کی فتح تھا۔ وہ اپریل ۱۸۳۷ء قلعہ جمرود (خیبر) میں جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس نے اپنی قوت اور عظمت کا ہزارہ پر مستقل نشان چھوڑا ہے۔ اور آج بھی شہر ہری پور اور قلعہ ہری پور (ہرکشن گڑھ) کی شوکت و عظمت کا زندہ ثبوت ہیں۔ اس نے قوت اور رعب سے حکومت کی۔ پشاور کی سرحد کے لوگ اس کا نام (ہرِیا راغے) بطور ہَوّا کے بچوں کو ڈرایا کرتے تھے۔

سردار ہری سنگھ کے جانشین

ہری سنگھ کے قتل کے بعد مہاں سنگھ ہزارہ کا گورنر ہوا۔ لیکن اکتوبر ۱۸۳۷ء میں اس کو واپس بلا لیا گیا اور تیجا سنگھ اس کی جگہ گورنر ہوا۔ اور از ابتدائے خریف سمت ۱۸۹۴ بکرمی (۱۸۳۷ء) سب ملک ہزارہ اس کے ماتحت آگیا۔ سردار تیجا سنگھ نے اپنے بھائی دل سنگھ کا ردار راولپنڈی کو ملک ہزارہ تفویض کر دیا۔

ان ایام میں سردار دھیان سنگھ کی معرفت مہاراجہ لاہور سے، راجہ علی گوہر خان دو ہزار روپیہ کی جاگیر از تنگ خان پور کا پروانہ لایا۔ اس کے عوض اس کو سروہہ، انروٹہ، پکشاہی، دل سنگھ نے مقرر کر دیا۔ کہ وہ ان مواضعات میں آباد ہو جائیں۔ اور مہاراجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جائیں اس کے بعد چار سال تک کوئی خاص واقعہ قابلِ ذکر نہیں۔ ان ۱۸۴۱ء کا سیلاب دریائے سندھ ۲ جون کو آیا سخت ہولناک اور تباہ کن تھا۔ اس کی وجہ دریائے سندھ کے بالائی حصہ ایک ٹیلہ کے گر جانے سے دریا کا بند ہو جانا تھا۔ اور جب یہ بندھ کھل گیا تو سخت سیلاب آگیا۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ سکھوں کے قلعے دربند اور تربیلہ دونوں بہہ گئے۔ ان دنوں نواب پائندہ خان دریائے سندھ کے دائیں جانب قلعہ کھر کوٹ میں تھا۔ اس طوفان میں امب کا گاؤں اور سکھوں کا سب سامانِ جنگ بہہ گیا۔ اسی طوفان میں ستھانہ کا پرانا گاؤں بھی جو برلب دریا تھا بہہ گیا تھا۔ اس مصیبت پر فریقین نے جنگ بند کر دی اور پائندہ خان نے سکھ کمانڈر کو پیغام بھیجا کہ خدا نے جانبین کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے اور دونوں کو تباہ کر دیا ہے۔

دونوں طرف سے فوجیں اپنے اپنے علاقہ کو چلی گئیں۔ پائندہ خان تناول کو چلا گیا۔ اور سکھ ہری پور آ گئے ۔ مہتاب سنگھ نے اپنی تاریخ میں اس عرصہ کے واقعات کو بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

وہ لکھتا ہے :- کہ قلعہ جمرود کی جنگ اور درّانیوں کے چلے جانے کے بعد وہاں خبر پہنچی کہ کرڑالوں نے قلعہ ناڑہ کا محاصرہ کرکے قلعہ کو فتح کرلیا ہے اور تھانہ دار اور بعض سپاہیوں کو قتل کردیا ہے اور بعضے سپاہی فرار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ دھیان سنگھ وکنور نونہال سنگھ نے سردار مہاں سنگھ کو معہ رجمن شوک صاحب فرنگی، سوار وپیادہ کے ساتھ ہزارہ کی طرف بھیجا۔ لاہور سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جواہر سنگھ و بابا عطر سنگھ کو چند سواروں کے ساتھ ہزارہ بھیجا۔

جب سردار مہاں سنگھ ہزارہ پہنچا تو قلعہ ناڑہ کو کرڑال سے خلاص کرکے نئے سرے سے تھانہ بٹھایا۔ اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد پکھلی کی طرف روانہ ہوا۔ اور مانسہرہ میں قیام کیا۔ چند روز بعد رجمن شوک صاحب خود بخود خفا ہوکر لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ اُس کے پیچھے سردار ہری سنگھ والی پلٹنیں جو مہاں سنگھ کے ساتھ تھیں وہ بھی خود بخود بغیر اجازت لاہور کو روانہ ہوگئیں۔

جب برسات کے مہینے گزر گئے تو دسہرہ کے بعد مہاراجہ صاحب والی لاہور میانی و پنڈ دادن خان کی طرف تشریف لے گئے۔ اور مہاں سنگھ کو حکم بھیجا کہ ایک لاکھ روپیہ پانچ راس گھوڑے معہ زین طلائی و نقرہ، پانچ راس شُتر و دو دستہ باز اور پانچ شکاری کتے اور بیس راس خچر لے کر حاضر حضور ہو جاؤ۔ اور حضور مہاراجہ نے اپنے اردلی دیوا سنگھ پسر مہال سنگھ داسو والا کو یہ سب چیزیں لینے کے لئے بھیجا۔

چنانچہ سردار مہاں سنگھ نے اپنے چھوٹے بھائی صوبہ سنگھ کو ہزارہ میں اپنی جگہ چھوڑا اور گیارہ ماہ کاتک سمت ۱۸۹۰ بکرمی (۱۸۳۳ء) معہ جملہ اسباب نوشتہ مہاراجہ بغیر روپوں کے لاہور کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ ڈیرہ میانی میں بغیر روپیہ کے حاضر ہوا تو مہاراجہ نے پوچھا کہ نقدی کچھ نہیں لائے! اس پر مہاراجہ اُس سے خفا ہوگیا۔ اور سردار تیجا سنگھ پوربی کو دو رجمنٹ، ایک کمپنو آٹھ پلاٹن کے ساتھ ہزارہ بھیجا کہ جاکر قلعہ ہزارہ (ہرکشن گڑھ ۔ ہری پور) پر قبضہ کرلے۔ سردار تیجا سنگھ ہزارہ میں آکر مقیم ہوگیا۔ دو تین کے بعد صوبہ سنگھ برادر مہاں سنگھ سردار تیجا سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوگیا صوبہ سنگھ نے قلعہ کی چابی سردار تیجا سنگھ کے حوالہ کردی۔ سردار تیجا سنگھ نے قلعہ کے لینے کی رسید صوبہ سنگھ کو دے دی۔ اور جو کچھ قلعہ میں سردار مہاں سنگھ کے پاس از قسم امانت یا اس کا اور اہل وعیال کا سامان قلعہ میں تھا۔ بمعہ سکّہ و بارود اور اسلحہ جات کے ضبط کرلیا۔ یہ رسید صوبہ سنگھ نے مہاں سنگھ کو پہنچادی۔ اور اس نے یہ رسید بوساطت راجہ دھیان سنگھ بحضور مہاراجہ صاحب پیش کردی۔ اور ساتھ ہی تیس ہزار روپیہ نقد از سردار مہاں سنگھ نے، جو کہ مقرر کیا تھا۔ ادا کردیا۔ اور

ابتداء سے مقرر شدہ سب ہزارہ کا مالیہ جمع ہوکر داخل سرکار ہوتا رہا بعد سال (۱۸۴۱ء) سردار تیجا سنگھ معہ خرچ حضور مہاراجہ کی خدمت میں طلب کیا گیا۔

دوران حکومت تیجا سنگھ، نواب پائندہ خان اپنی فوج اور افغانوں کے آدمیوں تقریباً تین چار ہزار کے ساتھ دریائے سندھ کو عبور کرکے بھارو کوٹ میں آگیا۔ اور جوڑہ پنڈ کے متصل ڈیرہ ڈالا۔ سکھوں کے اہل کاروں کے ساتھ نامہ و پیام کیا۔ کہ سردار تیجا سنگھ نے اس کو آٹھ ہزار کی جاگیر دی ہے۔ اگر وہ اُس کو دی جائے تو وہ واپس چلا جائے گا۔ اگر نہ دی گئی تو وہ یہ آٹھ ہزار روپیہ اس ملک کے لوگوں سے وصول کرے گا۔ سردار تیجا سنگھ نے اپنے اہل کاروں کو لکھا کہ اگر وہ نقرہ گھوڑی دے تو جاگیر ادا کردی جائے اگر نہ دے تو کچھ بھی اس کو نہ دیا جائے۔ اور جب نواب پائندہ خان نے سردار کو براہ راست لکھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ اس نے اپنے اہل کاروں کو ادائیگی کے لئے لکھ دیا ہے۔ وہ اپنی مقررہ جاگیر اُن سے لے سکتا ہے۔ یہ باتیں پائندہ خان کے ساتھ بھارو کوٹ میں ہورہی تھیں چونکہ وہاں سکھوں کی فوج کم تھی۔ اور پائندہ خان کے ساتھ ملکی خوانین، غلام خان ترین وسیدان صوابی والہ و تنولی ودلازاک وترک سب متفق تھے۔ چنانچہ تیجا سنگھ کے اہل کاروں نے ایک ہزار سوار و پیادہ جمع کرکے کھلابٹ میں جمعیت کی۔ اور ان لوگوں کو روزانہ خرچ و رسد دیتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس ایک ہزار بندوق تھی۔ پھر بھی پائندہ خان اپنے چار سو سواروں کے ساتھ واڑی نزد کھلابٹ کی زیارت میں آیا اور فقیر کی درگاہ میں سلام کرکے اپنے ڈیرہ بمقام جوڑہ پنڈ کو واپس چلا گیا۔ اور سکھوں کے حشری ملکی لوگ جو کھلابٹ میں تھے کسی نے ایک فائر بھی نہ کیا۔ اس وجہ سے اہل کاران ــــ ظن ہوگئے۔ اور سوچا کہ فوج کم ہے۔ مبادا جنگ ہو جائے اور یہ ملکی لوگ بھی پائندہ خان سے مل جائیں اور ہماری فوج کو جو ــ بندوق ہے شکست نہ ہوجائے۔ اور چونکہ ہم تھوڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پھر قلعہ کو بچانا بھی مشکل ہوجائے۔ اس خیال سے جنگ نہ کی۔ اور حکمت عملی سے مبلغ چار ہزار روپیہ۔ ایک فصل کی جاگیر پائندہ خان کو دے دی۔ پائندہ خان یہ روپیہ لے کر اپنی جگہ کو واپس چلا گیا۔ اور تیجا سنگھ کے آدمی اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ہری پور شہر کے مہاجنوں اور ہزارہ کے ملکوں اور رئیسوں کو حکم لکھا کہ ایک روپیہ فی گھر جمع کریں۔ چنانچہ ہزارہ تا محال پکھلی ہر گھر سے ایک روپیہ وصول کیا گیا جو سولہ ہزار روپیہ (چار ہزار روپیہ خرچ کے مقابلہ میں) جمع ہوا۔

یہ ملک ابتداء ربیعہ سمت ۱۸۹۰ بکرمی (۱۸۳۳ء) لغایت خریف سمت ۱۸۹۶ بکرمی (۱۸۴۱ء) سردار تیجا سنگھ کے ماتحت رہا۔

پیارا سنگھ کاردار

سمت ۱۸۹۷ بکرمی (۱۸۴۲ء) پیارا سنگھ ساکن بُرہان کو اس ملک کا کاردار مقرر کیا گیا۔ اس کے وقت میں غلہ کا نرخ گراں تھا۔ اُس نے آتے ہی سب ملک کی آمدنی کا پٹہ چار لاکھ روپیہ مقرر کر دیا۔ اگرچہ خریف میں بارش اچھی ہونے سے غلہ ارزاں ہو گیا اور صرف ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہی ملک سے جمع ہو سکا۔ باقی سب مستاجر ملک سے فرار ہو گئے۔ کوئی پشاور چلا گیا اور کوئی کسی اور جگہ جا کر چھپ بیٹھا اور معاملہ پورا وصول نہ ہو سکا۔

سمت ۱۸۹۹ بکرمی مطابق ۱۸۴۲ء میں جب مہاراجہ شیر سنگھ والی لاہور تھا اس نے ملک ہزارہ اور کشمیر اپنے بیٹے کنور پرتاپ سنگھ کو جاگیر میں دے دیا۔

چنانچہ جب کنور پرتاپ سنگھ و مہاراجہ گلاب سنگھ و دیوان مولراج و سردار اپوڑ سنگھ جو کشمیر کو فوج کی شورش کی وجہ سے اُس کے بندوبست کرنے کے بعد ہزارہ میں آئے۔ ملک ہزارہ و کشمیر دونوں کا حاکم راجہ گلاب سنگھ کو بنا دیا گیا۔ جب کنور پرتاب سنگھ لاہور واپس جانے لگا تو گلاب سنگھ کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ لاہور جاتے ہوئے کنور صاحب نے راستہ میں شنکیاری میں قیام کیا۔ اور وہاں ہی مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے کاردار ارجیل سنگھ کو ہزارہ کا نائب حاکم مقرر کر دیا۔ کنور صاحب کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی۔

کنور صاحب و راجہ صاحب کے ہزارہ آنے سے پہلے ہی ارجیل سنگھ ہزارہ میں امداد کے لئے آیا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب پیارا سنگھ از پیش گاہ سردار تیجا سنگھ سمت ۱۸۹۷ بکرمی ہزارہ کا کاردار مقرر کیا گیا تھا اس نے آتے ہی ہزارہ میں معاملہ کی تحصیل کے لئے سخت اقدامات شروع کئے۔ زمینداروں کو گرفتار کر کے ان سے جرمانہ وصول کرنا شروع کیا۔ ایک شخص زبرُو نامی ساکن شیروان کو توپ کے آگے اُڑا دیا تھا۔ اور ایک زمیندار مُراد نامی زدوکوب سے فوت ہو گیا تھا۔ اس واسطے جب وہ بعض امورات کے علاقہ کلائی (موضع کالنجر۔ صوابی میرا۔ علاقہ بدہنک وغیرہ) کی طرف گیا تو اس کے ساتھ دو پلٹنیں۔ ایک مہاں سنگھ والی اور دوئم بدری ناتھ والی تھیں۔ لیکن جب پائندہ خان نے اپنے لشکر سمیت دریائے سندھ کے اس طرف آ کر ڈیرہ جمایا اور کرپلیاں کے پہاڑوں میں مقام کیا تو بندوق و زنبورک کے فائروں سے دونوں پلٹنوں کو اتنا تنگ کیا کہ وہ عاجز آ گئیں۔ اسی عرصہ میں سردار شام سنگھ اٹاری والا کا ڈیرہ اور مہاں ارجیل سنگھ پشاور سے واپس آ رہے تھے۔ اُن کو حکم تھا کہ اگر ہزارہ میں

کسی مدد کی ضرورت ہو تو وہ دیں۔ جب پیارا سنگھ نے اُن کو اپنی مدد کے لئے لکھا تو دونوں سردار اپنی فوج کے ساتھ اور سرکاری پلٹن کے ساتھ مدد کے لئے آ گئے۔ اور پہنچتے ہی دریائے سندھ کے کنارے ڈیرے ڈال دئے۔ کہ ناگاہ خدا کی قدرت سے بتاریخ ۱۲ ماہ جیٹھ سمت ۱۸۹۶ بکرمی مطابق ۱۲ جون ۱۸۴۱ء کو دریائے سندھ میں طوفانی سیلاب آ گیا۔ کہ سکھوں کی فوج جو کہ کنارہ دریا پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی۔ اس کا تمام اسباب، توپیں، زنبور خانہ، اونٹ، گھوڑے اور سپاہی سب کے سب جو کنارہ پر موجود تھے اس طوفان میں بہہ گئے۔ دن سے چھ گھڑیاں باقی تھیں کہ دریا میں طوفان آیا تھا۔ اگر رات ہوتی تو ایک متنفس بھی زندہ نہ بچتا۔ دن تھا۔ اور فوج پائندہ خان کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ صرف وہ پیادے جو کہ نوکر تھے اور ڈیرہ پر رہ گئے وہ اور ان کے خیمے، قناتیں اور توپیں ڈوب گئیں۔ بہت سے لوگوں اور ان کے بُوٹوں اور پیٹیوں کو دریا بہا لے گیا۔ جب رات ہو گئی تو سب امیر و فقیر زمین پر سو گئے کیونکہ نہ کسی کا بستر و قالین باقی رہا تھا۔ اور نہ فرش دری وغیرہ۔ دن کے آخری چھ گھڑی سے نصف رات تک طوفان کا زور رہا۔ آدھی رات کے بعد طوفان میں قدرے کمی واقع ہوئی۔ جب صبح ہوئی تو سب کیفیت معلوم کی گئی۔ تو معلوم ہوا کہ دربند، گڑھی، انب اور تربیلہ کے سب قلعے دریا بُرد ہو گئے۔ صرف سکھ اپنے قلعوں سے بھاگ کر باہر نکل آئے تھے۔ اور قلعہ گل جو رگیستان میں تھا اُس کو بھی خالی کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ چند روز تک ڈیرہ وہاں ہی رہا۔ قلعہ دربند کو از سر نو تعمیر کیا گیا۔ اور اُس میں تھانہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد لشکر کوچ کر کے ہزارہ میں آ گیا۔ میاں ارجیل سنگھ ہزارہ ہی میں رہ گیا۔ اور سردار شام سنگھ اٹاری والہ عازم لاہور ہو گیا۔

راجہ گلاب سنگھ و کنور پرتاپ سنگھ ابھی مظفر آباد ہی میں تھے۔ کہ میاں ارجیل سنگھ اُن کے استقبال کے لئے وہاں حاضر ہو گیا۔ راجہ صاحب و کنور صاحب ممدوح وہاں سے روانہ ہو کر پکھلی میں آئے۔ چند روز شنکیاری میں ٹھہرے اُس کے بعد کوہستان ڈیرہ (علاقہ کلائی) کی طرف گئے۔ وہاں انہوں نے پیغام بھیجا کہ پائندہ خان یا اُس کا لڑکا ملاقات کے لئے آئے۔ لیکن پائندہ خان نے پہلو تہی کی نہ خود آیا اور نہ لڑکے کو بھیجا۔ مجبوراً انہوں نے مدد خان برادر پائندہ خان کے ساتھ سوال جواب کیا۔ ان ایام میں مدد خان اپنے بھائی پائندہ خان سے رنجیدہ تھا۔ کیونکہ اس نے مدد خان کا ملک کچھ عرصہ سے چھین رکھا تھا۔

مدد خان بلانے پر حاضر ہو گیا۔ مدد خان کی آمد پر اُس کی بہت خاطر مدارات کی گئی اور پائندہ خان کا سب ملک مدد خان کو کنور پرتاپ سنگھ کی مُہر لگا کر دے دیا گیا۔ ریاست و خانی ملک تنول مدد خان

کے نام پر کر دی گئی۔ اُسی وقت سب ملک کا قبضہ مدد خان کو دیا گیا۔ اور پائندہ خان کے تصرف میں کچھ نہ رہا۔ یعنی ایک گاؤں بھی اس کے تصرف میں نہ رہا۔ اور اُس کو ریاست سے بدر کر دیا گیا۔ صرف اس کے ذاتی قلعے جو کہ اُنب میں تھے وہ اس کے پاس رہ گئے۔ اور وہیں کاشت وغیرہ سے اپنے مصارف پورے کرتا رہا۔ جب سال سمت ۱۸۹۸ بکرمی و سال ۱۸۹۹ء گزر گئے تو ابتدائے سمت ۱۹۰۰ بکرمی مطابق ۱۸۴۳ء میاں اربیل سنگھ لاہور کی طرف چلا گیا۔

دیوان مولراج دِلوالیہ

ستمبر ۱۸۴۳ء میں شیر سنگھ اور پرتاپ سنگھ لاہور میں قتل کر دئے گئے۔ تو سکھ دربار نے دلیپ سنگھ نابالغ کی سرپرستی میں حکومت لے لی۔ اور ہزارہ کو براہِ راست اپنے تحت میں لے لیا۔ اور دیوان مولراج دِلوالیہ (یہ مولراج ـ دیوان مولراج حاکم ملتان سے الگ ہے) کو ۱۸۴۳ء سمت ۱۹۰۰ میں اربیل سنگھ کی جگہ بھیج دیا۔ اس نے مالیہ از سرِ نو لگایا اور زیادہ لگایا۔ اس کی حکومت جابرانہ تھی لہٰذا بہت سے لوگ گاؤں سے بھاگ گئے اور دیہات خالی ہو گئے۔ فارسی تاریخ میں تحریر ہے "کہ میاں اربیل سنگھ کے لاہور جانے کے بعد ہزارہ کی حکومت کے دیوان مولراج مقرر کیا گیا۔ جس نے ابتداد ۱۸۴۳ء سے ملک کی معاملہ کی تحصیل و تنسیق عدالت بوجہ احسن کی۔ کہ رعایا اس کی مہربانی سے بہت مشکور ہوئی۔ اور مظلوموں کی حق رسی اور دادخواہوں کی عدالت ایسی کی جیسا کہ حق تھا۔ چنانچہ ہر کہ ومہ دیوان موصوف کی عدالت و ریاست پر راضی اور شاکر تھا۔ اور سب دعائیں کرتے تھے کہ اس کا عہد تا دیر رہے۔"

اس اثناء میں پائندہ خان نے جو اپنی جاگیر سے خارج تھا۔ افغانوں کی امداد سے کچھ فساد برپا کیا اُس کے تدارک کے لئے دو پلاٹن فوج جو کہ پلیاں میں تھی، بھیجی گئی۔ یہ فوج شنگڑی و پھوہار تک گئی وہاں جنگ ہوئی۔ پائندہ خان کو شکست ہوئی۔ خان موصوف اسی غم و افسوس میں فوت ہو گیا۔

قتل مہاراجہ شیر سنگھ و کنور پرتاپ سنگھ

مہاراجہ شیر سنگھ و کنور پرتاپ سنگھ باپ بیٹا دونوں اول ماہ اسوج سمت ۱۹۰۰ بکرمی مطابق ۱۵ ستمبر ۱۸۴۳ء لاہور میں سندھانوالہ خاندان سے بدھ سنگھ کے بھائی لہنا سنگھ اور بھتیجے اجیت سنگھ کے ہاتھ سے قتل ہو گئے جو خود بھی مارے گئے۔ اس قتل کی خبر سنتے ہی ہزارہ میں مولراج کو تپ محرقہ شروع ہو گیا۔ اور تین ماہ تک ابتدائے ماہ اسوج تا آخر ماہ مگھر بیمار رہا۔ اطباء کے شربت، حکماء کے معجون،

پیروں فقیروں کے منتر و نیاز سے قدرے صحت یاب ہوا۔

راجہ گلاب سنگھ کو دو دفعہ یہ ملک ہزارہ تفویض ہوا تھا۔ لیکن اُس سے کچھ انتظام نہ ہو سکا تھا۔ اس کے دل میں اس ناکامی کی بہت غیرت تھی جب قتل مہاراجہ شیر سنگھ کے بعد وہ لاہور گیا۔ اور راجہ ہیرا سنگھ کو جو اس وقت کارِ سلطنت کے بست و کشاد کا مالک تھا۔ تحریری عرضداشت پیش کی۔ کہتے ہیں کہ راجہ ہیرا سنگھ نے اپنے خانہ زاد منشی وزیر پنّوں کو ہزارہ بھیجا۔ جب وہ ہزارہ پہنچا تو اسی روز مولراج ہزارہ سے چلا گیا۔ اور موضع پنیاں (ہری پور ہزارہ سے ۵ میل بر شاہراہِ اعظم بطرف مغرب) ڈیرہ کیا۔ اور صبح کے وقت عازم لاہور ہو گیا۔ جب وہ لاہور پہنچا۔ تو راجہ ہیرا سنگھ خفا ہوا۔ کہ بغیر حکم کیوں آ گیا۔ لیکن اطراف قفری کا زمانہ تھا کسی کا رعب داب نہ تھا۔ ہاں ہوں میں وقت گزارا اور پھر ہزارہ کی حکومت پر سرفراز کر دیا گیا۔

دیوان مولراج کے واپس آنے تک وزیر پنّوں اور معز اللہ خان۔ معتبران راجہ گلاب سنگھ۔ قلعہ ہرکشن گڑھ میں مقیم رہ کر معاملہ فصل ربیع سمت ۱۹۰۱ بکرمی (۱۸۴۴ء) قبول کیا۔ دیوان مولراج لاہور سے ہزارہ پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنے گھر موضع دیوال میں گیا۔ اور دو ماہ تک گھر میں مقیم رہا۔ اس اثناء میں پنڈت چیلا رام وزیر راجہ ہیرا سنگھ مولراج کی طرف بار بار لکھتا رہا۔ کہ جلدی سے ہزارہ جا کر قلعہ کو آزاد کرائے۔ چنانچہ حسب الحکم دیوال سے روانہ ہو کر داخل ہزارہ ہوا۔ یہاں پہنچنے پر وزیر پنّوں اور معز اللہ خان معتمدان راجہ صاحب۔ سے بہت گفت و شنید ہوئی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ بغیر موت کے قلعہ ہرگز وہ اس کے حوالہ نہیں کریں گے۔ آخر کار ملک ہزارہ کے سب زمیندار اکٹھے ہوئے اور قلعہ ہرکشن گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ آٹھ دن جانبین میں توپ، تفنگ، زنبورہ و زنجیل سے جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار وزیر پنّوں اور معز اللہ خان نے سردار کاہن سنگھ مجیٹھیہ کی وساطت سے بات چیت کر کے قلعہ خالی کر دیا۔ اور جموں کو چلے گئے۔ اور مولراج قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اور تحصیل معاملہ فصل خریف سمت ۱۹۰۱ بکرمی (۱۸۴۴ء) شروع کر دیا۔

۱۸۴۴ء

اس سال کا خاص واقعہ دیوان ابراہیم کا قتل ہے۔ اس کو راجہ گلاب سنگھ نے جموں سے تھوڑی سی فوج کے ساتھ بھیجا۔ کاغان کے گاؤں سے تھوڑی دور نیچے ایک درّہ میں کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے کاغان کے سیّدوں اور بالاکوٹ کے سواتیوں نے اُسے سب فوج سمیت قتل کر دیا۔ اس جگہ کا نام ہی اس واقعہ سے دیوان بیلہ پڑ گیا ہے۔

سکھوں کی پہلی لڑائی

اور

ہزارہ میں فسادات ـــــــــ ۱۸۴۶ء

سکھوں کی اس لڑائی میں شکست اور انگریزوں کی فتح نے ہزارہ میں آزادی کی جنگ کے شعلے بھڑکا دیئے سب سے پہلے ڈھونڈ قوم اور پیران پلاسی نے اس مہم کا آغاز کیا۔ انہوں نے سکھوں کے قلعہ ماڑی پر حملہ کیا۔ اور دیوان مولراج کی بھیجی ہوئی فوج کے دو دستوں کو شکست دے دی۔ اس بدامنی کو لاہور سے مزید کمک آنے سے پہلے ہی دبایا جا سکا۔

اسی اثناء میں چند بقیہ ہندوستانی مجاہدین نے، جو سید احمد شہیدؒ کے زندہ ہونے پر یقین رکھتے تھے، کاغان میں تحریک آزادی شروع کر دی۔ اس تحریک میں شمالی ہزارہ کے بہت سے لوگ شامل ہو گئے اور سکھوں کے قلعوں واقع شنکیاری، بھیڑ کنڈ، گڑھی حبیب اللہ خان اور اگرور پر حملے کر دئے۔ اور سکھ سپاہیوں کو قتل کر دیا مشوانیوں نے قلعہ سری کوٹ لے لیا۔ گکھڑوں نے بہ سرکردگی راجہ حیدر بخش خان قلعہ خان پور لے لیا۔ اور اپنے ملک پر قبضہ کر لیا۔ نواب خان تنولی۔ خان شنگرھی جس کو دیوان مولراج نے سواتیوں کو خاموش کرانے کے لئے بھیجا تھا وہ بھی اُن سے مل گیا۔ اور قلعہ شیروان پر قبضہ کر لیا۔

دیوان مولراج کو شروع ہی میں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کہ اس کی فالتو فوج نے جو رجوعیہ میں مقیم تھی شمالی ہزارہ جانے سے انکار کر دیا۔ جب جدون اٹھ کھڑے ہوئے اور بگڑہ میں جمع ہوئے اور غلام خان ترین کے آدمی جاگل میں جمع ہوئے تو رجوعیہ والے سپاہی بھاگ کر قلعہ ہری پور کے باہر آ کر جمع ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہری پور شہر میں متعینہ سکھ سپاہی بھی، شہر پر ملکیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد، اس جگہ پر آ کر جمع ہو گئے۔ غلام خان ترین ہری پور شہر میں بیٹھ گیا۔ تارخیلی موضع ڈھیری (نزد سکندر پور)، نواب خان تنولی اپنی قوم کے ساتھ مانک رائے میں کرال، جدون اور دلازاک سرائے صالح میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے محاصرہ کر لینے کے بعد قلعہ ہری پور کو جانے والے پانی کے کٹھ کو جو دریائے دوڑ سے آتا تھا کاٹ دیا تا کہ پانی قلعہ کے اندر نہ جا سکے۔ بارہ دن میں قلعہ کے اندر پانی کے تالاب ختم ہو گئے۔ اور سکھوں کو مجبوراً قلعہ سے باہر آ کر جنگ کرنی پڑی۔

سکھ فوجوں نے بہت جلدی سب ملکیوں کو بھگا دیا۔ اور پھر پشاور کی کمک آنے پر نزدیکی مواضعات سے تعزیری سلوک بھی کیا۔ باوجود اس کامیابی کے دیوان مولراج نے جو دل ہار چکا تھا۔ ۱۶ راپریل کو قلعہ خالی کر دیا اور سب فوج کے ساتھ حسن ابدال چلا گیا۔ مہتاب سنگھ نے ہزارہ میں اس زمانہ کے فسادات کو

تفصیل اور پس منظر کے ساتھ لکھا ہے۔ جو کہ درج ذیل ہے۔

قتل راجہ ہیرا سنگھ

چند روز کے بعد (سمت ۱۹۰۱۔ ۴۴۔۱۸۴۳ء) گلاب سنگھ ہودوالہ و بدھ سنگھ مان آٹھ پلٹنوں کے ساتھ ہزارہ میں آ گئے۔ دیوان مولراج ان پلٹنوں کے ساتھ گڑھی حبیب اللہ خان کی طرف روانہ ہوا اور وہاں جا کر مقام کیا۔ وہاں پر اُس کو خبر پہنچی کہ راجہ ہیرا سنگھ، اس کا وزیر پنڈت چیلا رام اور میاں سوہن سنگھ دیوان راجہ گلاب سنگھ فوج کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ (۲۱ر دسمبر ۱۸۴۴ء) اور لاہور کی ریاست میاں راجہ جواہر سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ کے سپرد کر دی گئی ہے۔ جونہی یہ خبر فوج نے یہاں سنی تو بدھ سنگھ مان کی پلٹنیں خود بخود لاہور کی طرف روانہ ہو گئیں۔ اور کچھ وقفہ کے بعد سردار کاہن سنگھ مجیٹھیہ بھی لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔ اور دیوان مولراج ہزارہ کو واپس ہوا چند دنوں کے بعد گلاب سنگھ اور بدری ناتھ ہزارہ کی چھاؤنی کے لئے آ گئے۔ انہی دنوں میں پیران پلاسی نے حملہ کر کے قلعہ ماڑی کو لے لیا۔ جب گلاب سنگھ و بدری ناتھ کی دونوں پلٹنوں نے آ کر ماڑی کو پھر واپس لے لیا۔ ان پلٹنوں کے پہنچنے سے پہلے ہی مولراج نے تقریباً چار سو مسلح سپاہی از راہ ناڑہ اکڑالان بھیج دئے تھے اور راجہ علی بہادر خان خان پور والہ کو معہ مردم حشری ڈیرکوٹ کے راستہ سے ماڑی کی طرف بھیج دیا تھا۔

پیران پلاسی و حسن علی خان کرڑال نے باہمی مشورہ سے راجہ علی بہادر خان برادر راجہ علی گوہر خان پہلے قتل کر دیا۔ اور بعد ازاں اس فوج کے ساتھ جو ناڑہ کو جا رہی تھی۔ جنگ کی۔ اور ڈیڑھ سو کے قریب اس فوج سے قتل کر دئے۔ اور ناڑہ سے لے کر بگرہ تک اس فوج کا تعاقب کیا۔ اور فوج کو شکست دی۔ جب یہ دونوں نئی پلٹنیں۔ گلاب سنگھ و بدری ناتھ والی، پہنچیں تو انہوں نے قلعہ ماڑی کو فتح کر لیا۔ تھانہ پھر سے قائم کر دیا۔ اس کے بعد یہ دونوں پلٹنیں ہزارہ میں واپس آ گئیں اور نالہ دوڑ کے کنارے پر چھاؤنی ڈال دی۔ (مطابق تاریخ ہزارہ موضع رجوعیہ برلب دریائے دوڑ ڈیرہ کرایا۔ یقین غالب ہے کہ وہ بھاروکوٹ میں جمع ہوئیں۔ ش ب)

مولراج نے ہر چند اُن سے اصرار کیا کہ پکھلی میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور اُن کا وہاں جانا ضروری ہے لیکن انہوں نے حکم نہ مانا۔ اس وقت گڑھی حبیب اللہ میں سادات کاغان نے بمعہ ہندوستانی مجاہدین از جماعت خلیفہ سید احمد شہیدؒ علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ چونکہ فوج نے حکم نہ مانا اس لئے نواب خان تنولی کو اپنی ملازمین، برادری کے آدمیوں اور حشری لوگوں کے ساتھ گڑھی حبیب اللہ کی طرف بھیجا۔ ظاہراً

تو وہ سکھوں کی فوج کی مدد کے لئے گیا۔ لیکن اندرونی طور پر کاغان سے لے کر گندگڑھ کے سب رئیسوں سے خفیہ نوشت وخواند کر کے مشورہ کر لیا۔ اس اثناء میں ایک دو دفعہ مولراج کو لکھا کہ اگر اور فوج نہ آئی تو یہ کام بہت مشکل ہے۔ ادھر مولراج کے حکم کی کسی نے تعمیل نہ کی۔ اور کوئی فوج ادھر نہ گئی۔

نواب خان قلعہ گڑھی حبیب اللہ کو چھوڑ کر اپنے سپاہیوں سمیت تنول میں آ گیا۔ درہ کونش، اگروڑ، تندھیاڑ و کاغان، سب طرف شورش شروع ہو گئی۔ قلعہ مشنکیاری کا محاصرہ کیا گیا اور وعدہ وپیمان سے سپاہیوں کو قلعہ سے باہر آنے پر آمادہ کر لیا۔ جب تھانہ دار سپاہیوں کے ساتھ قلعہ سے باہر آ گیا تو ان سب کو شمشیر سے قتل کر دیا گیا۔ اور اسباب وسامان سب لوٹ لیا۔

اس کے بعد گڑھی اگروڑ اور تھانہ بھیر گنڈ کو بھی لے لیا گیا۔ سپاہیوں اور تھانہ داروں کو قتل کر دیا گیا لیکن قلعہ مانسہرہ کا تھانہ دار جو ایک ضعیف آدمی تھا حکمت عملی سے چند زمینداروں کو کچھ دے کر آدھی رات کو قلعہ سے باہر نکل کر صحیح وسلامت ہزارہ پہنچ گیا۔ نواب خان نے شیروان پہنچتے ہی ندھان سنگھ تھانہ دار شیروان پر حملہ کر کے اُس کو قید کر دیا۔ اور قلعہ کے اندر جو گھوڑے، نقد وجنس تھا وہ سب اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس کے بدلہ میں مولراج، حیات خان کو، جو نواب خان کا بہنوئی تھا۔ بیوی سمیت گرفتار کر کے قلعہ ہری پور میں لے گیا۔

جب نواب خان نے تنول پر قبضہ کر لیا تو اس اثناء میں مشوانیوں نے بھی قلعہ سری کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ کرڑالوں نے قلعہ ماڑی، ناڑہ، دخان پور پر قبضہ کر لیا۔ چاروں طرف سے لوگ قلعہ ہری پور پر حملہ آور ہوئے۔ مولراج کو اُس کے مشیروں نے بہت سمجھایا۔ کہ اپنی فوج نے حکم عدولی کی ہے اور شہر ہری پور کی حفاظت مشکل ہے۔ لہٰذا ہری پور کے کھتریوں کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی اپنی پناہ کی جگہوں میں چلے جائیں اور شہر کو خالی کر دیں۔ لیکن مولراج نے اس مشورہ پر عمل نہ کیا بلکہ شہر کے دروازوں پر پہرے بٹھا دئے کہ اگر کوئی کھتری سامان وغیرہ لے کر بھاگنا چاہے تو اس کو گرفتار کر کے قلعہ میں لے آئیں۔ لہٰذا اس گرفتاری کے خوف سے کسی شخص نے ایک سوئی تک باہر نہ بھیجی۔

جب نواب خان وغیرہ تنول میں اور دوسرے لوگ موضع پھر ہاڑی و باندھی وغیرہ دیہات میں جمع ہوئے تو غلام خان ترین بمعہ مشوانیوں وغیرہ کے فصیل میں آ گئے۔ کرڑال اور جدون سب موضع موہری بھیڑی علاقہ سرائے صالح میں جمع ہو گئے۔ تو سکھوں کی دونوں پلٹنوں نے (جو شمالی ہزارہ جانے سے انکاری ہو کر دریائے دوڑ چھاؤنی بھاروکوٹ میں بیٹھ گئی تھیں) بھاروکوٹ چھاؤنی کو چھوڑ قلعہ ہرکشن گڑھ کی شرقی فصیل کے متصل آ کر ہر چہار طرف سے خاربندی کر کے ڈیرہ جما لیا۔

ان پلٹنوں کے بھاگ جانے سے ملکیہ لوگ دلیر ہو گئے اور ۲۰ پھاگن سمت ۱۹۰۴ بکرمی مطابق مغتم...... ۱۸۴۷ء کے چاروں طرف سے رات کے وقت ہری پور شہر پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ شہر سے سب لوگ بمعہ زن وبچہ بمعہ دستی اسباب از قسم زیور و پارچات کے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ باقی لاکھوں روپوں کا مال از قسم ہر جنس بیوپار وغلہ یا کپڑا جو کچھ تھا وہ سب لوگوں نے لوٹ لیا۔ حملہ کے شروع میں شہر کی دو پلٹنوں نے مقابلہ کیا لیکن ملکی لوگ بہت زیادہ تھے اس واسطے یہ دونوں پلٹنیں شہر چھوڑ کر اپنی دوسری پلٹنوں کے پاس آ گئیں۔ شہر پر غلام خان ترین نے قبضہ کر لیا۔ ہزارہ کے سب لوگ اور مشوانی اُس کے ساتھ تھے سب تنول نواب خان کے ساتھ تھا۔ اور سب کرڑال اور جدون سرائے صالح میں جمع تھے۔

ہری پور شہر کے لوگوں کے گھروں میں جو غلہ تھا وہ کھاتے رہے اور لے جاتے رہے۔ دس بارہ دن اسی طرح محاصرہ رہا یہاں تک کہ قلعہ کے اندر پانی کی تنگی پیدا ہو گئی۔ باہر سے پانی کا کٹھہ لوگوں نے بند کر دیا۔ قلعہ کے گرد خندق کا پانی بھی خشک ہو گیا۔ قلعہ کے اندر کنوئیں اور تالاب کے پانی سے دو تین دن گزارا کیا گیا۔ آخر کنواں بھی خشک ہو گیا۔ قلعہ کے اندر لوگوں کو پانی کی تکلیف حد سے زیادہ ہو گئی۔

چنانچہ رات کے وقت شریف خان پوپل زئی (دُرّانی) معہ پانچ سوار قلعہ سے نکل کر پشاور کی طرف گیا۔ تاکہ امداد کے لئے فوج لائے۔ چنانچہ وہ ایک دو دن میں پشاور پہنچ گیا۔

ان دنوں میں شیر سنگھ پسر چتر سنگھ اٹاری والہ صوبہ پشاور کا ناظم تھا۔ اُس نے ہزارہ کا حال معلوم ہونے پر دو اور پلٹنیں کاہن سنگھ کے ساتھ ہزارہ کی امداد کے لئے بھیجیں۔ لیکن چند روز روٹی کے بغیر تو گزارہ ہو سکتا ہے۔ پانی کے بغیر ایک دن بھی مشکل ہے۔ ایک دن جب پانی کی تکلیف حد سے زیادہ ہو گئی تو ان پلٹنوں نے اپنا مال ومتاع واہل وعیال قلعہ کے اندر بھیج دیا اور خود جنگ کے لئے تیار ہو گئیں۔ دو ضرب توپ کے ساتھ پچھ کمپنی متفق ہو کر خاربندی سے باہر آ کر مصروف جنگ ہو گئیں۔

خان زمان خان گندگر یہ (طاہر خیلی) کے سوار اور پیادہ موضع ڈھیری وپھر ہالہ میں تھے۔ جب ایک گولہ ان میں گرا تو سب بھاگ کر گندگر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی طرح دوسرا گولہ مسجد مانک والے میں گرا۔ جہاں مولوی ولایت علی بمعہ ہندوستانی مجاہدین کے اقامت گزین تھا۔ وہیں اُن کا سکّہ و بارود بھی جمع تھا۔ گولہ لگتے ہی اس میں آگ لگ گئی۔ اور جو شخص اس پر پہرہ دار تھا۔ اُس کے پیٹ پر لگنے سے اس کا سب جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑ گیا۔ بارود میں آگ لگنے کے جوش سے سترہ آدمی جو نزدیک تھے۔ گھاس کے تنکوں کی مانند اڑ گئے۔ اس کے بعد باقی سب لوگ، افغان، جدون، تنولی اور ہندوستانیوں نے فرار ہو کر نگلڑہ، نوشہرہ (نزد سلطان پور) وغیرہ علاقوں میں جا کر دم لیا۔

جب غلام خان (جو شہر ہری پور میں تھا) نے سنا کہ خانی زمان خان اور نواب خان بھاگ گئے ہیں تو وہ بھی پابرہنہ گلدھیری کی طرف تیزی سے چلا گیا۔ اس کے بعد سکھ فوج کے سواروں نے سرائے صالح جاکر پانی کے کٹھہ کو مکمل طور پر درست کر دیا۔ اور پانی تکہ میں لے آئے۔ اور دن چار گھڑی باقی تھا کہ قلعہ کے گرد و نواح میں پانی جاری ہو گیا۔ اور حسب سابق سبزہ و باغ کو طراوت حاصل ہو گئی۔ اور لوگوں کی سب تکالیف جو پانی کے نہ ہونے سے تھیں دور ہو گئیں۔ سب نے اچھی طرح کپڑے دھوئے، غسل کیا اور مردوں نے سر دھوئے (سکھوں کا سر دھونا ضروری ہوتا ہے کہ ان کے سر پر بڑے بڑے کیس بال ہوتے ہیں) اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے غیب سے ان کی امداد کی۔

تین چار دن کے بعد شیر سنگھ اٹاری والہ کی بھیجی ہوئی پلٹنیں پہنچ گئیں۔ ان پلٹنوں کا افسر کاہن سنگھ تھا۔ اس نے چند دیہات کو جو دُور دُور آباد تھے۔ ہزاروی۔ چنانچہ موضع تُوردی (نزد گلدھیری) کو جو اس وقت آباد تھی لوٹ لیا۔ تمام ہزارہ ویران ہو گیا۔ ہری پور شہر میں جو مسلمان آباد تھے اُن کے گھروں کو جلا دیا گیا۔ ان کے مکانات کی لکڑی جس کو ضرورت ہوتی تھی جلانے کے لئے لے جاتا تھا۔

ان ہی دنوں میں لاہور سے راجہ لال سنگھ[1] کی جانب سے مولراج کو حکم پہنچا کہ تم ملک ہزارہ سے واپس آکر یہاں حاضر ہو جاؤ۔ اس حکم کے پہنچنے پر زیرک اور دانا لوگوں نے مولراج کو بہت سمجھایا کہ اس وقت لاہور میں کوئی شخص صاحب اختیار و سلطنت نہیں ہے۔ اگر لال سنگھ یہ لکھتا ہے۔ تو بُغض اور حسد کی نیت سے لکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جس وقت تم نے ہزارہ کو خالی کر دیا اور بغیر فوج کے چھوڑ کر لاہور چلے گئے تو یہ ملک مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ اور پھر راولپنڈی سے پشاور تک کی شاہراہ عام کس طرح جاری رہ سکے گی۔ اور پشاور و کشمیر کا راستہ کس طرح محفوظ رہے گا۔ حالانکہ اس وقت سب حالات ٹھیک ہیں۔ امن امان ہے۔ جب تم چلے گئے تو لوگ قلعہ ہرکشن گڑھ کو جلا دیں گے۔ اور پھر دوبارہ اس کو بنانے کے لئے ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑیں گے۔ اور تمہارا نام ہمیشہ بدنام رہے گا۔ کہ فلاں نے قلعہ خالی کر دیا۔ اور اتنا نقصان ہوا۔ لہٰذا اس حکم کی تعمیل ہرگز قرینِ صلاح نہیں۔

چونکہ مولراج بے وقوف اور تند طبع تھا۔ داناؤں کی نصیحت کو خاطر میں نہ لایا اور قلعہ کو خالی چھوڑ کر دو پلٹنوں کو ساتھ لے کر حسن ابدال کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں دو ڈھائی مہینہ قیام کیا۔ اور قلعہ کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ جونہی مولراج قلعہ کو خالی کر کے روانہ ہوا (بموجب تاریخ ہزارہ ۱۶ اپریل ۱۸۴۶ء)

---

[1] یہ جواہر سنگھ کے ساتھ ہی ۱۸۴۴ء میں برسر اقتدار آیا یہ رانی (دلیپ سنگھ کی ماں) کا منظورِ نظر تھا۔

غلام خان ترین نے دوسرے رئیسانِ ہزارہ کو جمع کیا۔ اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مولوی ولایت علی ہندوستانی کو قلعہ میں بٹھایا اور خود اختیار سنبھال لیا۔ اور حکومت شروع کر دی۔

(مطابق تاریخ ہزارہ مرتبہ ویس۔ سیّد اکبر ساکن ستھانہ کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ نواب خان تنولی اور غلام خان ترین اُس کے وزیر مقرر ہوئے۔ اور سکھوں کے آنے سے پہلے زمانہ کے حالات و رواج کے مطابق حکومت کا بندوبست کیا۔ ہزارہ میں اس عہد کو گنڈی مسلمانی سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ نظام حکومت بہت جلد ٹوٹ گیا) غلام خان نے چند ملکی سوار، موضع ملکیار، دھنی، و دیگر مواضعات سے بھرتی کر کے اس ملک میں اپنے ملازمین مقرر کر دئے۔ اسی طرح نواب خان نے میر سیف اللہ، و ذوالفقار شاہ کو سواروں کا افسر مقرر کر کے چند سوار نوکر کر لئے۔ افغانان جدون سے عطائی خان، پیر خان اور جلال خان جمع ہوئے اور اپنے ملک کی زمین کی تقسیم میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ان ایام میں جہانداد خان پسر پائندہ خان نے اپنے علاقہ جاگیر کے سب تھانہ جات کی سکھ فوج کو اپنی حفاظت و حراست میں لے لیا۔ اور اپنے موضع امب میں لے جاکر ان کی نگہداشت کی۔ یہ چار سو کے قریب بندوق بند سپاہی تھے۔ ان سب کو خرچ خوراک اپنی جانب سے دیتا رہا اور سب کی دلجمعی و تشفی کر کے وہاں رکھا۔ اور ان سے کہا کہ کچھ فکر و غم نہ کرو۔ اس وقت اگر تم کو دریا سے پار کر کے ہزارہ یا چھچھ کو بھیجتا ہوں۔ تو ملکی لوگ باغی ہو چکے ہیں تم کو نہ چھوڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔ جب اس ملک کا خاطر خواہ انتظام لاہور کی جانب سے ہو گیا اور کوئی حاکم اس ملک میں آ گیا تو تم سب کو اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔

چنانچہ اس حالت پر جہانداد خان کے علاقہ کے کل تھانہ جات دو تین ماہ تک اس کی نگرانی میں رہے۔

ہزارہ میں راجہ گلاب سنگھ کی مخالفت

مارچ ۱۸۴۶ء میں سکھ دربار اور انگریزوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس عہد نامہ کی صلح کی دفعہ بارہ کے رُو سے کشمیر اور اس کے ماتحت علاقے راجہ گلاب سنگھ کو دے دئے گئے۔ اور ایک الگ معاہدہ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کے مطابق سب پہاڑی علاقے بمع ملحقات جو دریائے سندھ کے مشرق اور دریائے راوی کے مغرب میں ہیں مہاراجہ گلاب سنگھ کو دے دئے گئے۔

اہل ہزارہ کو کشمیر کے ماتحت ہونے سے سخت رنج ہوا۔ لہٰذا سب اہل ہزارہ نے متفقہ طور پر اس امر کی مخالفت کی۔ اور مہاراجہ کے لئے حالات سخت تکلیف دہ بنا دئے۔ مہاراجہ نے دیوان ہری چند کو مالیہ جمع کرنے کے لئے بھیجا۔ جو براستہ خان پور میدان ہزارہ میں ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء کو داخل ہوا۔ بہت سے

خوانین نے حاضر ہو کر اطاعت قبول کی۔ اور راجہ حیدر بخش نے فصل ربیع کا مالیہ علاقہ خانپور کا ادا بھی کر دیا۔ لیکن یہ سب اطاعت سطحی تھی۔ جب میجر ایبٹ نومبر ۱۸۴۶ء میں حسن ابدال میں تھا۔ اور سکھ دربار کی طرف سے ہزارہ اور کشمیر کی حد برآری کے لئے آیا تھا۔ تو ایک وفد میدان ہزارہ کا اس کو ملا۔ اور درخواست کی کہ اُن کو کشمیر کے راجہ کی غلامی سے چھڑائے۔

وہ ہری پور پہنچا تو تمام علاقہ میں بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ اور سکھوں کی فوج جو چار ہزار کے قریب تھی قلعہ ہری پور میں محصور تھی۔ اس نے وہاں ان لوگوں کے قائد میر زمان خان اتمان زئی ساکن کھلابٹ کو صلح پہ راضی کر کے امن و امان قائم کر دیا۔ اور تین دن کے بعد خود حد برآری کے کام پر واپس چلا گیا۔

میدان ہری پور کے سوا باقی سب جگہ لوگ مہاراجہ گلاب سنگھ کے مخالف تھے۔ رجوعیہ اور نواں شہر میں جدونوں نے بہ امداد ہندوستانی مجاہدین جموں کی فوجوں کو شکست دے کر قتل کر دیا۔ میدان پکھلی میں بد امنی تھی۔ اور سادات کاغان اور سواتی، مجاہدین کی امداد کے ساتھ مہاراجہ کے مخالف تھے۔ آخری جنگ سے پہلے، ایک اور جنگ شیخ امام الدین گورنر کشمیر اور گلاب سنگھ (جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد پنجاب کا وزیر اعظم مقرر ہوا تھا) کے درمیان ہو چکی تھی۔ گلاب سنگھ نے معاہدہ امرتسر کے بعد کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین سے چارج لینے کے لئے اپنے وزیر لکھپت کی سرکردگی میں باقاعدہ فوج بھیج دی۔ لیکن شیخ امام الدین گورنر کشمیر نے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں لکھپت اور شیخ امام الدین کے مابین دریائے جہلم بشکر آچار یہ پہاڑی کے درمیان واقع میدانی حصہ میں سخت لڑائی ہوئی۔ جس میں گلاب سنگھ کی فوج کو نہ صرف شکست ہوئی بلکہ اس کا وزیر لکھپت اس جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد معاہدہ امرتسر کے ماتحت گلاب سنگھ نے انگریزوں سے امداد طلب کی۔ چنانچہ انگریزوں اور سکھوں کی افواج پھر کشمیر پہ حملہ آور ہوئیں۔ اس مرتبہ شیخ امام الدین خود مقابلہ پر نہیں آئے۔

۱۸۴۶ء کے آخر میں راجہ گلاب سنگھ نے شیخ امام الدین گورنر کشمیر کو، جو راجہ کو قبضہ کشمیر دینے کے مخالف تھا، شکست دے دی۔ اور اپنی فوج کی دس رجمنٹ زیر کمان دیوان کرم چند بہ ہمراہی مسٹر وانز اگنیو (WANS AGNEW) اور لفٹیننٹ لمسڈن (LUMSDEN) جو ریذیڈنٹ لاہور کا اسسٹنٹ تھا، سرینگر سے براہ مظفر آباد شمالی ہزارہ کو مطیع کرنے کے لئے بھیجیں۔ سواتیوں اور مجاہدین نے اس فوج کا راستہ درۂ دُب (مظفر آباد کے اوپر) میں روکا۔ اور مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ سکھ فوجیں ضلع ہزارہ میں داخل ہوئیں اور مہاراجہ کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن پہاڑی علاقے اسی طرح باغی رہے اور راجہ جموں کی فوجیں جو سکھوں کی فوج کے بعد آئیں اُن کو میر پور اور نمل میرا (نزد نتھیا گلی) میں سخت شکست ہوئی۔

اس عہد کے حالات کو مہتاب سنگھ نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:۔

جب راجہ گلاب سنگھ کی فوج معہ دیوان ہری چند ناظم ملک ہزارہ ۱۱ر جیٹھ سمت ۱۹۰۳ بکرمی مطابق ۲۲ر مئی ۱۸۴۶ء اس ملک میں داخل ہوئی۔ تو غلام خان ترین نے اپنے صلاح کاروں کے مشورہ سے قلعہ ہرکشن گڑھ کو آگ لگا کر جلا دیا۔ دیوان ہری چند نے آبادیٔ رعایا و مرمت شہر ہری پور و تعمیر قلعہ ہرکشن گڑھ، جو بالکل وحشت ناک حالت میں جلا ہوا اور مسمار تھا از سر نو تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنی فوج کا ڈیرہ اس نے چھاؤنی بھار و کوشہ میں کیا۔ جس میں بدری ناتھ اور گلاب سنگھ کی فوجوں نے ڈیرہ کیا تھا۔ اور جو بر لب دریائے دوڑ تھا۔ چنانچہ بعض زمیندار جو حاضر ہوئے ان سے معاملہ ربیع سمت ۱۹۰۳ (۱۸۴۶ء) وصول کرنا شروع کیا۔ زمینداران تربیلہ، سری کوٹ و علاقہ خالصہ وغیرہ حاضر نہ ہوئے۔ دیوان ہری چند نے جب کہ وہ خود خانپور ہی میں تھا۔ اوتم سنگھ والی پلٹن اور سوار فوج بھگوان سنگھ کے ساتھ قلعہ ہرکشن گڑھ بھیجی۔ بھگوان سنگھ دوسرے دن صبح سوار ہو کر کھلابٹ کی طرف گیا۔ اس وقت کھلابٹ اور واڑی کے سب لوگ واڑی میں جمع تھے۔ اُن کے ساتھ جنگ ہوئی۔ زمینداروں سے چند آدمی مارے گئے اور پانچ چھ سوار و پیادہ بھگوان سنگھ کی طرف سے کام آئے۔ اس کے بعد کچھ لوگ ادائیگی پر راضی ہوئے لیکن مجموعی طور پر کھلابٹ کے زمینداروں کی مہاراجہ گلاب سنگھ کے اہل کاروں کے ساتھ موافقت نہ ہو سکی۔

دیوان ہری چند نے معاملہ پکھلی، درہ کاگان و بھوگڑمنگ کی وصولی کے لئے پندرہ سو بندوقچی سوار و پیادہ مانسہرہ اور پکھلی کے لئے مامور کی۔ کہ وہاں جا کر مقیم ہو کر مالیہ وصول کریں۔ اس فوج میں افسر زیادہ تھے اور کوئی ایک ذمہ دار قائد نہ تھا۔ لہٰذا ان کے درمیان کسی رائے پر اتفاق نہ ہوتا تھا۔ یہ لشکر سلطان پور، چنبہ اور حویلیاں و رجوعیہ سے براہ دھمتوڑ گزر کر میر پور جاتا ہے تو وہاں دو راستے ملتے تھے ایک تلکھ[لہ] سے ہو کر براستہ درہ میر پور بہ طرف مانگل جاتا ہے اور دوسرا سلہڈ کو آتا ہے۔ جب یہ فوج نواں شہر میں وارد ہوئی تو وہاں مقام کیا۔ چونکہ افغانوں سے کوئی بھی دیوان ہری چند کے پاس نہ آیا تھا۔ لہٰذا فوج کے پہنچتے ہی افغانوں کے متعلق مشورہ شروع ہوا۔ کہ کیا کیا جائے۔ فوج کے افسروں کے درمیان کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا تھا۔ دو تین دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ نواب خان تنولی و مدد خان تنولی بھی اس فوج کے ساتھ تھے۔

جدون افغان از دیہات مانگل وغیرہ بمعہ پکھلی والوں کے جمع ہوئے۔ اور سکھوں کی فوج پر بندوقوں سے فائر کرنے شروع کر دئے۔ ادھر فوج بہت بے دل اور بطور بیگاریوں کے تھی۔ اس جنگ کے شروع ہوتے ہی بیگاری کے سواروں نے براستہ سلہڈ بھاگنا شروع کیا۔ اُن کو معلوم نہ تھا کہ یہ

لہ تلکھ موجودہ [illegible] کے ایک علاقہ میں ہے۔

راستہ سخت دشوار گزار ہے۔ اور ان کو اس طرف سے نہیں جانا چاہئے تھا۔ لیکن انہوں نے خیال کیا کہ وہ سوار ہیں آسانی سے نکل جائیں گے۔ جب یہ سوار سلہڈ کی وادی میں آئے تو شیخ البانڈھی اور سلہڈ کے لوگوں نے روک کر ان کے گھوڑے، اسباب و ہتھیار چھین لئے۔ بہتوں کو قتل کر دیا اور کچھ زندہ بھاگ گئے اور جا کر آدھی رات کے وقت دیوان ہری چند کو خبر دی۔ کہ یہ حالات پیش آئے۔ اس کے بعد دیوان ہری چند سے ملک کا کچھ انتظام نہ ہو سکا۔

قدرت الٰہی سے اسی سال میاتپ کی بیماری شہر میں عام ہوئی۔ لشکر سے بہت سے لوگ مر گئے۔ چنانچہ دیوان ہری چند بھی چند روز بخار میں مبتلا رہا اور چاہتا تھا کہ کسی بہانہ سے ملک سے نکل جائے۔

ان ایام میں سردار گلاب سنگھ پسر چتر سنگھ اٹاری والہ اپنے چند سواروں اور کاہن سنگھ مان کی دو پلٹنوں کے ساتھ وارد ہزارہ ہوا۔ سردار گلاب سنگھ کے آتے ہی دیوان ہری چند بمعہ فوج خود تو جموں کی طرف چلا گیا اور ملک ہزارہ کا انتظام سردار گلاب سنگھ و قاضی نادر علی ساکن تنوکر (نزد ہری پور) کے سپرد کر دیا۔ قاضی نادر علی نے خریف سمت <u>۱۹۰۳</u> کا معاملہ جس سے وصول ہو سکتا تھا لیا۔ عام لوگوں نے نہ دیا۔ نواب خان تنولی جو دیوان ہری چند کے آتے ہی خود حاضر ہوا تھا۔ اور شیروان کا قلعہ درست کر کے دیوان ہری چند کو خود وہاں لے گیا تھا۔ اس عمل میں دیوان ہری چند نے اس کو ایک ہزار روپیہ کی جاگیر لکھ دی تھی۔ اس نے بھی جنگ جدون تان کے بعد جا کر پھر قلعہ شیروان پر قبضہ کر لیا۔ اور سپاہیوں کو نکال دیا۔ اور ملک تنول میں فساد شروع کر دیا۔

اس اثناء میں سربلند خان والد نواب خان فوت ہو چکا تھا۔ نواب خان نے دیکھا کہ حالات خراب ہیں تو وہ اپنے اہل و عیال سمیت دریائے سندھ کے پار کھبل و ستھانہ میں جا کر بیٹھ گیا۔ چند دن وہاں رہا جب میجر ایبٹ صاحب ہزارہ میں تشریف لائے۔ تو وہ صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایبٹ صاحب نے اس کو ایک ہزار روپیہ سالانہ جاگیر عطا کی۔ (یعنی دیوان ہری چند کی دی ہوئی جاگیر کی تصدیق کر دی۔ ش۔ ب) دیوان ہری چند ماہ کاتک میں گیا تھا اور چیت میں دیوان جوالا سہائے (دیوان ہری چند کا بڑا بھائی) میجر ایبٹ کے ہمراہ ہزارہ میں آیا۔ چند روز یہاں رہا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ملک تکلیف دہ ہے اور یہاں ہمیشہ جھگڑے پیدا ہوتے رہیں گے۔ قاضی نادر علی کو ساتھ لے گیا۔ اور اس کی جگہ بخشی ہری سنگھ کو مقرر کر دیا۔ چنانچہ انہی ایام میں غلام خان ترین معرفت سردار گلاب سنگھ حاضر ہوا۔ اس کو گلاڈھیری میں پانچ ہزار روپیہ کی جاگیر دے دی گئی۔ اور وہ وہیں سکونت پذیر ہو گیا۔ قلعہ ہرکشن گڑھ جو مسمار ہو چکا تھا اس کی عمارت کی لکڑی سے غلام خان نے گلاڈھیری میں مکانات تعمیر کر لئے تھے۔

جب میجر ایبٹ پہلی دفعہ ہزارہ میں برائے حد برآری سرحد کھاشر و گندگر لاہور سے اور خان پور ہزارہ سے کرنے کے لئے مقرر ہو کر آیا۔ تو اس وقت (۱۸۴۶ء) میں قاضی نادر علی حاکم ہزارہ تھا۔ جب دوسری بار میجر ایبٹ (۱۸۴۷ء) میں آیا تو اس وقت بخشی ہری سنگھ مقرر ہو چکا تھا۔

جب دیوان جوالا سہائے لاہور پہنچا تو اس نے تجویز پیش کی کہ "ہزارہ کی بجائے ان کو منا ور و جیت گڑھ عطا کیا جائے۔ کیونکہ ہزارہ کا انتظام نہیں ہو سکتا"۔

لاہور ریذیڈنسی کی طرف سے راجہ گلاب سنگھ کی یہ عرضداشت منظور کر لی گئی۔ اور میجر ایبٹ صاحب دوبارہ سرحد کی طرف بھیجا گیا کہ حد جموں و لاہور کی پھر سے حد براری کی جائے۔ میجر ایبٹ اور سردار چتر سنگھ اٹاری والہ کو حاکم مقرر کرنے کے بعد چند پلاٹن فوج، چند ضرب توپ اور ایک رجمنٹ سواران دیگر معہ سردار جھنڈا سنگھ بو تالیہ کے بھیجا گیا۔ میجر ایبٹ صاحب نے قدرے فوج اور سردار جھنڈا سنگھ کو ساتھ لے کر سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ علاقہ گندگر نزدیک غازی) کی گڑھی مرمت کی۔ کچھ مدت کے بعد میجر ایبٹ دیول و کہوٹہ کے انتظام کے لئے تشریف لے گئے۔ دونوں قلعے تعمیر کر کے چھاریاں کی طرف تشریف لے گئے۔ اور ملک ہزارہ کے خان پور و دناہ وغیرہ کے علاقوں کی مالیہ کی کتابیں ترتیب دیں اور ملک کہوٹہ واگرور کی کتابیں درست کیں۔ اس کے بعد چھاریاں سے فوج پلٹن اور سردار جھنڈا سنگھ وغیرہ کو رخصت اور خود چند سواروں اور ایک کمپنی بطور پہرہ ساتھ لے کر سرحد کے ملاحظہ کے لئے گئے۔ اور نئی سرحد مقرر کر کے واپس ہزارہ میں آ گئے۔ سال سمت <u>۱۹۰۴</u> (۱۸۴۷ء) میں میجر ایبٹ صاحب نے ملک کی کتاب ہائے مالیہ مقرر کیں۔ اور شروع سمت <u>۱۹۰۵</u> (۱۸۴۸ء) میں سرحد کا ملاحظہ کیا۔ پھر ماہ بیساکھ سمت <u>۱۹۰۵</u> مطابق ۲ اپریل ۱۸۴۸ء ہزارہ میں داخل ہوئے۔ سات آٹھ دن بنگلہ میں آرام کرنے کے بعد دورہ کے لئے باغ خاکی و شیروان کی طرف گئے۔ دس بارہ روز باغ خاکی میں گزارے۔ پھر شیروان کے ساتھ پہاڑی پر مقیم ہوئے۔

ان ایام میں مولراج[1] نے بغاوت کی اور دو انگریزوں کو قتل کر دیا۔ اور آمادہ جنگ و فساد ہوا۔ میجر ایبٹ کو لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ سکھوں کی فوج باغی ہو گئی۔ اور چتر سنگھ ان سے متفق ہے۔ اگرچہ یہ بات چتر سنگھ کے متعلق باور نہ کی جا سکتی تھی۔ تاہم میجر ایبٹ نے ہوشیاری سے ہزارہ سے چند ضرب زنبورہ، سکہ و بارود مہیا کر لیا۔ ملکیہ زمینداروں کو بلا کر کہا کہ سنا جاتا ہے۔ سکھ آمادہ فساد ہیں۔ اگر کچھ واقعہ ہو جائے۔ تو ان کا کیا مشورہ ہے۔ ان سب نے کہا۔ کہ وہ ہمیشہ سکھوں سے لڑتے رہے ہیں اور اب اس کے ساتھ دل و جان سے ہو کر مقابلہ کریں گے۔

---

[1] مولراج حاکم ملتان اپنے باپ ساون مل حاکم ملتان کے قتل (ستمبر ۱۸۴۴ء) کے بعد حاکم ملتان ہوا تھا۔

اتنے میں سردار چتر سنگھ نے فوج کو قلعہ سے نکال کر دریا گے دوڑ پر جمع کر دیا۔ اور کنارا صاحب کو بھی جو سکھوں کا دوسرا یورپین ملازم تھا، سردار چتر سنگھ نے کہلا بھیجا کہ تم اپنی دو توپوں کو بھی ڈیرہ میں لے آؤ۔ اس نے جواب دیا کہ اگر کسی دشمن پر حملہ مقصود ہے۔ تو ہم سوار ہوتے ہیں اور توپیں لے جاتے ہیں۔ چھاؤنی ابھی نئی نئی تیار ہوئی ہے اور سب گھوڑے بھی نئے سدھائے ہوئے اور منہ زور ہیں۔ تو کیوں اس جگہ سے حرکت کریں۔ اس جواب پر سردار چتر سنگھ نے دو کمپنیوں کو حکم دیا کہ وہ جا کر کنارا صاحب سے دونوں توپیں لے آئیں۔ ان کمپنیوں نے آتے ہی فائر کر کے کنارا صاحب اور ایک گولہ انداز کو قتل کر دیا۔ اور دونوں توپیں ڈیرہ میں لے آئے۔ جب یہ خبر شیروان میں میجر ایبٹ صاحب کو پہنچی تو اُسی وقت ایک کمپنی سے جو اُس کے ساتھ تھی بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا مرضی ہے جو شخص میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے رہے اور جو اپنی پلٹن کی طرف جانا چاہتا ہے، اسی وقت اس کو پہرہ کی حفاظت میں وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ چنانچہ سب کمپنی نے رضامندی سے رخصت طلب کی اور ان کو بحفاظت پہرہ کے ساتھ ہزارہ میں پہنچا دیا۔

دوسرے دن میجر ایبٹ شیروان سے روانہ ہو کر ناڑہ سید خانیاں (نزد داڑی کھلابٹ) میں آ گیا۔ نئی فوج بھرتی شروع کی۔ ہزارہ، تنول اور یوسف زئی سے بہت سے لوگ آ کر ملازم ہوئے۔

ادھر چتر سنگھ نے تجویز کی کہ پکھلی کی فوج اور افسر۔ بھوپ سنگھ مان وغیرہ ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ چنانچہ میجر ایبٹ نے اس پکھلی والی فوج کا راستہ بند کرنے کے لئے حکم دیا۔ لیکن علاقہ کے زمینداروں نے اس حکم پر عمل نہ کیا۔ کیونکہ بعض سکھوں کے ساتھ دوستی رکھتے تھے۔ انہوں نے اس طرف سے چتر سنگھ کو سوار کر کے دھمتوڑ و نواں شہر تک پہنچا دیا۔ ادھر سے بھوپ سنگھ کو فوج سمیت سوار کرا کر ادھر لے آئے۔ چنانچہ میرپور اور مانگل کے درمیان دونوں فوجیں متفق ہو کر ہزارہ کی طرف آئیں۔ اگرچہ میجر ایبٹ نے ناڑہ سے اور کپتان نکلسن (NICHOLSON) نے حسن ابدال سے بعد اپنی افواج کے دھمتوڑ پہنچ کر لوگوں سے کہا کہ وہ ان کا راستہ بند کر دیں۔ لیکن ملکی سپاہ نے راستہ بند نہ کیا۔ اور ہر دو افواج۔ پکھلی و ہزارہ کو مل جانے دیا۔ چتر سنگھ جس دن سے ناظم ہزارہ ہو کر آیا اُسی دن سے فساد کا خیال اس کے دل میں تھا۔ اس نے ہزارہ میں آنے سے چند روز بعد ہی اپنے حجام مسمی مُسَندا نام کو خط دے کر دوست محمد کی طرف بھیجا تھا اور اس کا جواب اس حجام نے چتر سنگھ کو اس دن پہنچایا جس دن چتر سنگھ پکھلی کی

لہ کنارا صاحب کی چھاؤنی جس میں گھوڑے اور توپیں تھیں اس جگہ اب اسسٹنٹ کمشنر کا بنگلہ اور اس کی ملحقہ عمارت ہے ان کے بالمقابل سڑک کے کنارے موجودہ میونسپل گارڈن کے پاس قبر تھی جو چند سال ہوئے منہدم کر دی گئی ہے۔

فوج کو ساتھ لے کر سلطان پور وچنبہ پہنچا تھا۔ اور جب اس جوابی خط کو پڑھا تو اور زیادہ مغرور ہو کر ہزارہ پہنچا۔ اور پندرہ سو بندوق بند سپاہی بمعہ دو ضرب توپ قلعہ ہرکشن گڑھ میں چھوڑ کر، باقی سب فوج کے ساتھ چھچھ و اٹک کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند روز چھچھ میں ڈیرہ کیا اور پشاور فوج کے افسروں سے نوشت و خواند کرتا رہا لیکن انہوں نے اس کی بات رد کر دی۔

جس روز چتر سنگھ ہری پور سے کوچ کر کے موضع موٹہ میں فروکش ہوا۔ تو میجر ایبٹ اپنی فوج کو لے کر ناڑہ سے کوچ کر کے موضع بھیڈیاں اور پوڑ (میانہ) میں ڈیرہ کیا۔ کپتان نکلسن صاحب حسن ابدال میں تھا۔ ایک دن کے قیام کے بعد میجر ایبٹ نے آگے بڑھ کر سلطان پور میں مقام کیا۔

چتر سنگھ اپنی غلطیوں اور تقصیرات کی معافی کے لئے نامہ و پیام درمیان میں لایا۔ تارا سنگھ پسر چتر سنگھ میجر ایبٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صاحب موصوف نے اس کو اپنے ایک معتبر کے ساتھ کپتان نکلسن کے پاس بھیج دیا۔ اور خود کمر بستہ سب فوج کو ساتھ لے کر موضع موٹہ (نزد موضع ڈنگی) کے کسی (نالہ) پر آ گیا۔ دونوں طرف سے توپ و بندوق کے فائر شروع ہو گئے۔ شام سے رات کے ایک آدھ پاس گزرنے تک فائر جاری رہے۔ رات تھی۔ میجر ایبٹ طرح دے کر اپنے سب ہمراہیوں کے ساتھ حسن ابدال آ گئے۔ اور چتر سنگھ کے لڑکے کو جو کپتان نکلسن صاحب کے پاس تھا رخصت دے دی۔ چتر سنگھ نے ایک اور پلٹن کو جو کہوٹہ میں تھی بلا کر ساتھ ملا لیا۔ لیکن آخر کار کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

میجر ایبٹ واپس ہزارہ میں آ گئے۔ اور تین دن موضع مانک رائے میں قیام کیا۔ چوتھے دن ناڑہ سید خانیاں پہنچ گئے۔ چتر سنگھ نے چھچھ پہنچ کر پشاور کی فوج اور امیر دوست محمد خان سے نامہ و پیام کیا اور چھچھ سے واپس (اکتوبر ۱۸۴۸ء) ہو کر سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ) کے قلعہ میں متعین فوج کو ساتھ لینے کی غرض سے آیا۔ یہ سن کر میجر ایبٹ سری کوٹ کے راستہ اپنی فوج کے ساتھ سنبل کھنڈ (سلم کھنڈ) پہنچا۔ وہاں پر اس کی سکھوں کے ساتھ زبردست جنگ ہوئی۔ سکھوں کی فوج کے بہت سے سپاہی اور افسر مارے گئے۔ اور بہت سے زخمی ہو گئے۔ لیکن جاتے ہوئے چتر سنگھ سنبل کھنڈ کے قلعہ کی فوج کو اپنے ساتھ متفق کر کے لے گیا۔ تاکہ اٹک کے قلعہ کو خلاص کرائیں۔ لیکن اٹک کے قلعہ میں کپتان نکلسن نے فوج جمع کر رکھی تھی اور خود دو اور یورپین افسر دل کے ساتھ اندر موجود تھا۔ چتر سنگھ قلعہ پر قابو نہ پا سکا۔ میجر ایبٹ نے قلعہ اٹک کے لئے کچھ امداد دریا کے راستے سے بھیجی۔ لیکن یہ امداد اٹک کے قلعہ کے پاس کشتی کے ڈوب جانے سے نہ پہنچ سکی (اس کشتی میں ... خان پنی بھی تھا جس کا ذکر قوم پنی کے حالات میں درج کیا گیا ہے۔ ش ب)

آخر کار چتر سنگھ دریائے سندھ عبور کر کے پشاور کے افغانوں سلطان محمد خان و پیر محمد خان (اغلباً یار محمد خان)

ش ب) سے مشورہ کیا۔ آخر الامر دوست محمد خان کابل سے اور سلطان محمد خان و پیر محمد خان (یار محمد خان غالباً) ظاہراً سکھوں کے ساتھ اور باطن میں انگریزوں کے ساتھ مصلحت رکھتے تھے۔

جس وقت پشاور کی افواج نے بغاوت کی تو اُن کا کمانڈنگ افسر میجر جارج لارنس وہاں سے فرار (آخر اکتوبر ۱۸۴۸ء) ہو کر کوہاٹ چلا گیا۔ جہاں کہ سلطان محمد خان (یار محمد خان) کی جاگیر خاص تھی۔ چونکہ سلطان محمد خان و پیر محمد خان (یار محمد خان) کی اندرونی مصلحت سکھوں اور چتر سنگھ کے ساتھ تھی۔ وہ میجر جارج لارنس کو بمعہ متعلقان گرفتار کر کے چتر سنگھ کے پاس لے آئے۔ امیر دوست محمد خان بھی اُس وقت پہنچ گیا تھا۔ اٹک کا قلعہ انہوں نے لے لیا اور درّانی فوج نے قلعہ میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔

اس کے بعد چتر سنگھ درّانی فوج کو ہمراہ لے کر بارادہ جنگ ہزارہ کی طرف روانہ ہوا (جنوری ۱۸۴۹ء) درّانی فوج کے ساتھ غلام حیدر خان پسر امیر دوست محمد خان و سید گل بادشاہ پیرزادہ پشاور ہزارہ میں داخل ہوئے۔ اُن کے آنے سے پہلے میجر ایبٹ صاحب نے اپنی ملکیہ فوج معہ غلام خان (ترین) و میر زمان خان (سید خانی ساکن کھلابٹ) و قائم خان پنّی (اس کا حال پنی قوم کے حالات میں پڑھیں) کو تحصیل سے معاملہ وصول کرنے کے لئے پہلے سے بھیج رکھا تھا۔ اور معاملہ وصول ہو چکا تھا۔ اتنے میں درّانی فوج آ گئی۔ اس فوج نے پنیاں کے قریب موجودہ موضع کال پور کے سامنے ایک اونچی جگہ موسوم بہ کوپرا پر ڈیرہ کیا تھا۔ (ش۔ب) میر زمان خان و قائم خان پنی (میر زمان خان کی بیوی قائم خان پنی کی بہن تھی۔ ش۔ب) وغیرہ جو نیک دل لوگ تھے اور دولت انگریزی کے دلی خیر خواہ تھے۔ اپنے لوگوں کے ساتھ میجر ایبٹ کے پاس، جو اُس وقت سری کوٹ میں تھا، حاضر ہو گئے۔ لیکن غلام خان ترین اور اُس کا برادر زادہ فتح خان گلگڈھیری رہ گئے میں رہے۔ میجر ایبٹ نے بہت دفعہ بلایا۔ لیکن وہ نہ گئے۔ خانی زمان خان گندگریہ (طاہر خیلی خان) سری کوٹ میں میجر ایبٹ کے پاس گیا۔ اور شام کے وقت چار سو روپیہ نقد برائے سکّہ و بارود وصول کیا۔ کہ درانیوں کے ساتھ جنگ کرے گا لیکن آدھی رات کو وہاں سے فرار ہو گیا۔

غلام خان کے آدمیوں نے بقدر بارہ سو روپیہ خزانہ میجر ایبٹ سے لے کر راتوں رات غلام خان کے پاس چلے گئے۔ صبح کے وقت غلام خان گلگڈھیری سے سوار ہو کر غلام حیدر خان درّانی کی ملاقات کے لئے مُڑان گیا۔ جہاں کہ غلام حیدر خان نے ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ (درّانی اور ترین یک جدی ہیں۔ ش۔ب) اس سے ملاقات کی اور اس کو ہزارہ میں لے آیا۔

میجر ایبٹ لوگوں کی بے وفائی سے دلگیر ہوا اور مشوانیوں میں سے ملک صالح محمد اور اُس کے جنبہ کے لوگ ہی صرف میجر ایبٹ کے ساتھ رہے۔ باقی سب مشوانی مخالف ہو گئے۔ لہٰذا میجر ایبٹ

سری کوٹ سے کوچ کر کے (یعنی ناڑہ سید خانیاں سے) تنول کی طرف روانہ ہوا۔ اسی وقت غلام حیدر خان درّانی ڈیڑھ ہزار فوج کے ساتھ میجر ایبٹ کو گرفتار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اور سرن کے آر پار مقابلہ ہوا اس لئے میجر ایبٹ اپنا سب سامان لے کر کچھی تک آیا۔ اور گڑھی جو متصل جوڑہ پنڈ ہے۔ وہاں پر مورچہ لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ آخر کار درّانی سوار تاب مقابلہ نہ پا کر واپس ہو گئے۔ راستہ میں درّانیوں نے ستارہ خان ساکن پڈھانہ تعلقہ بھاڑوکوٹ جو پہلے میجر ایبٹ کے ساتھ نوکر رہ چکا تھا اور اس کا لڑکا مسمی شیر خان جو تین چار ماہ چتر سنگھ کے ساتھ نوکر رہ چکا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر قتل کر دیا۔ میجر ایبٹ خیر و عافیت سے شیروان پہنچ گیا۔ شیروان تک راستہ پر جا بجا مورچہ بندی کروا دی۔ اور خبر رسانی کا انتظام کر دیا۔

ایک دن غلام حیدر خان درّانی کو غلام خان ترین و حسن شاہ سید و بڈھا خان دلازاک سرائے صالح والا و حیات خان ترک مانک رائے والا متفقہ طور پر سوار کرا کر دیہات شنگڑی کی طرف لے گئے۔ اور چند مواضعات سے مال مویشی چرانے والے لوگوں کو گرفتار کر لائے اور چند گھر جلا دئے۔

جب گجرات و جہلم میں چتر سنگھ اور دُرانیوں کی فوج کو ایک سخت جنگ کے بعد شکست ہوئی اور سکھوں اور درانیوں کی فوج کے بہت سے سپاہی قتل ہو گئے تو دوسری طرف ملتان بھی فتح ہو گیا۔ اور درّانی فوج شکست کھا کر واپس ہو گئی۔ اور واپسی کے وقت ہزارہ میں موجود درّانی فوج کو ساتھ لے کر جلدی سے کابل کی راہ لی اور اپنے مقتولوں اور زخمیوں کا حساب نہ لیا۔ چتر سنگھ وغیرہ سب سکھ شکست کھا کر راولپنڈی میں آ گئے۔ وہاں سے اپنے بال کٹوا کر اور لباس تبدیل کر کے بصورت مسافران اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ اس طرح سے اُن کو کسی نے نہ پہچانا۔

میجر ایبٹ صاحب نے اس کے بعد شیروان سے کوچ کیا۔ اور جلدی جلدی کینتھل علاقہ خان پور میں فوج جمع کی۔ لوگوں اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ مارگلہ کے راستہ پر بیٹھ جائیں۔ درّانی فوج کو قتل کریں۔ اور ان کا سامان لوٹ لیں۔ لہٰذا دو تین روز تک فوج درّانیوں سے اونٹ، خیمے اور دیگر سامان لوٹ کراتی رہی۔ جب درّانی فرار ہو گئے اور سکھوں نے ہتھیار ڈال کر جان کی امان مانگ لی اور اپنے گھروں کی طرف تیزی سے چلے گئے۔ تو میجر ایبٹ ہزارہ میں آیا۔ اور قلعہ ہرکشن گڑھ کی سکھ فوج

ا درّانی فوج نے بھاڑوکوٹ میں ڈیرہ کیا۔ یہاں سے سکھوں نے اس فوج کو اپنی مدد کے واسطے۔ انگریزوں کے خلاف بلایا لیکن وہاں پر ۲۱ فروری ۱۸۴۹ء میں گجرات پر ان کو شکست ہوئی اور درّانی جلدی سے واپس چلے گئے (ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء)

اسلحہ۔ بندوق، کمر شمشیر حتیٰ کہ قبضہ شمشیر طلائی تک اُتروالیا۔ ان سپاہیوں کو قلعہ سے نکال دیا اور خود قلعہ میں داخل ہوگیا۔ اس روز سے یعنی ۷ر ماہ بیساکھ سمت ۱۹۰۶ بکرمی۔ مطابق ۱۶ر اپریل ۱۸۴۹ء میں ہزارہ میں انگریزی عمل دخل ہوگیا۔ درانیوں کی واپسی کے بعد انتظامیہ کی کارروائی ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے خط مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۸۴۹ء سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام خان ترین، جب درانی ہزارہ کے نزدیک پہنچے تو ان کے ساتھ مل گیا۔ بعد میں خود بخود اس نے اپنے آپ کو میجر ایبٹ کے حوالہ کر دیا۔ اور اس کو اٹک کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ غلام خان کی جاگیر اس سے پہلے ہی بموجب خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ مورخہ ۱۲ - ۵ - ۱۸۴۹ء ضبط کی گئی تھی۔ جس کی منظوری گورنمنٹ آف انڈیا نے دے دی۔ لیکن یہ لکھا کہ اس کا جواب سُنے بغیر قید کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کا جواب اور دوسرے قیدیوں کی جو اٹک میں بند ہیں پوری رپورٹ بھیجی جائے۔ بموجب خط مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۰ء جواب طلب کرنے اور ان اشخاص کی فہرست جو درانیوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے مانگی گئی۔ ایبٹ نے جواب دیا کہ اس فہرست اور بعد میں عدالتی کارروائی کی خبر سے تمام ضلع میں خوف وہراس پھیل جائے گا۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں۔ بہت سے وفادار لوگ خوف اور دباؤ کی وجہ سے درانیوں کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

اس پر حکومت ہند نے جواب دیا کہ ایسے بااثر افراد کی فہرست بمعہ وجہ شمولیت جو واقعی دشمنوں سے مل گئے تھے بھیجی جائے۔ ان اشخاص کی فہرست مطلوب نہیں۔ جن کی وفاداری مشکوک تھی۔

پھر سے ہزارہ کو سکھ دربار کے حوالہ کرنا

راجہ گلاب سنگھ ہزارہ کی حکومت اور مشکلات سے تنگ ہوا۔ اور اس نے اس علاقہ سے ہاتھ اٹھانے کی پیشکش کر دی۔ اگر سکھ دربار اس علاقہ کے بدلے میں (دریائے جہلم سے مغرب کا علاقہ) جموں کے نزدیک کا علاقہ دے دے۔ یہ تبادلہ اس شرط پر منظور کر لیا گیا کہ پہلے ہزارہ کا منصفانہ بندوبست کیا جائے۔ اس آمدنی سے جاگیروں اور معافی ناموں کی رقم منہا کر لینے کے بعد بقیہ آمدنی نصف کے برابر کا علاقہ جموں کے نزدیک دیا جائے۔ اس طرح سے یہ جنت نظیر ضلع ڈوگرا راج سے بچ گیا۔ اور اس کے روشن مستقبل کی بنیاد اُس دن سے پڑی۔

JAMES ABBOTT

جیمس ایبٹ

یہ ایک ان قابل ترین فوجی سول انگریزی افراد میں سے تھا جن کے ہاتھوں سے پنجاب میں انگریزی

سلطنت کی مستحکم بنیادیں لارنس (LAWRENC ES) بھائیوں کی قیادت میں قائم ہوئیں۔ فرنٹیئر پر دیگر افسران انگریزی ہربرٹ ایڈورڈز، جارج لارنس، جان نکلسن اور ہاروے لمسڈن وغیرہ تھے۔ اس نے ہزارہ کو گرویدہ کیا اور بہت تعمیری کام کیا۔ اس کا نام آج تک کہ اس کے گزرے ایک سو بیس سال کے قریب ہوگئے۔ ہزارہ میں ہر شخص کی زبان پر ہے۔ اس کی پیدائش انگلستان میں ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ وہ انگلستان کے مشہور سیاسی شخصیت ڈزرائیلی (DISRAELI) کا ہم جماعت تھا۔ ۱۸۲۳ء میں بنگال توپ خانہ میں لفٹیننٹ بھرتی ہوکر اسی سال کے آخر میں ہندوستان آیا۔ بھرت پور کے محاصرہ ۱۸۲۶ء میں شامل تھا۔ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۶ء میں ضلع آگرہ کے مالی بندوبست کا مہتمم رہا۔ ۱۸۳۸ء میں انگریزی فوج کے ہمراہ قندھار پہنچا۔ وہاں سے وہ میجر ٹاڈ (DARCY TODD) کا اسسٹنٹ ہوکر ہرات (افغانستان) بھیجا گیا۔ دسمبر ۱۸۳۹ء میں روسی قیدیوں کو خان خیوا کی قید سے رہا کرانے کے لئے مامور کیا گیا۔ مگر راستہ میں بحر کیپسین کے کنارے قزاقوں نے روسی سمجھ کر حملہ کر دیا۔ سب سامان لوٹ لیا اور اس کو بہت زدوکوب کیا جس سے اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں کٹ گئیں۔ وہ اٹھارہ دن تک تکلیف و صعوبت کے ساتھ ان کے ہاتھ میں قید رہا۔ آخر رشوت اور دھمکیوں سے ان سے خلاصی حاصل کی اور ایک روسی قلعہ میں پناہ لی۔ وہاں پر ڈاکٹر نے اس کے زخم کی مرہم پٹی وغیرہ کی۔ وہاں سے وہ ماسکو اور پھر سینٹ پیٹرز برگ پہنچا۔ وہ قیدیوں کو چھڑانے میں کامیاب ہوا۔ اور ۱۸۴۰ء میں انگلستان واپس ہوکر وزیر خارجہ انگلستان سے حکومت کا شکریہ اور زخموں کے لئے پنشن حاصل کی۔ ۱۸۴۱ء میں وہ پھر ہندوستان آیا اور ہارواڑ اور اندور میں تعینات رہا۔ ۱۸۴۶ء لاہور ریذیڈنسی کے ساتھ مقرر ہوا اور وہاں سے وہ حد برآری درمیان پنجاب و کشمیر کے لئے مقرر ہوا ۱۸۴۶ء کے آخر میں وہ اسی کام میں ہزارہ کی سرحد پر تھا۔ یہ حد برآری جون ۱۸۴۷ء میں مکمل کر دی گئی تھی اور اس کو ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر با اختیار کلی

حاشیہ

۱۸۴۴ء میں ایک افغان اخونزادہ صالح محمد کو ترکستان میں انگریز قیدیوں کی تلاش کے لئے بھیجا گیا تھا۔ یہ وہی منشی ہے جس نے بحیرہ کیپسین کے ساحل پر کیپٹن ایبٹ کی جان بچائی جب کہ وہ ترکمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اس منشی نے قابل اعتبار اور صحیح اطلاعات سٹوڈارٹ (STODART) اور کانالی (CONOLLY) کے قتل کے متعلق بہم پہنچائی تھیں۔

REERENCE

CARAVAN JOORNEYS &
WANDERINGS IN AFGHANISTAN
TURKISTAN & BALVCH ISTAN
1856

مقرر کیا گیا۔ وہ اس کام کے لئے از حد موزوں شخص تھا۔ اپنی پُر امید و مستعد طبیعت، دلیری اور مخلص مزاجی اور سخاوت طبع کی وجہ سے اس نے باشندگانِ ہزارہ کے دلوں میں بہت جلد گھر کر لیا۔ لوگ اس پر فدا تھے۔ اور وہ ان پر مہربان تھا۔ بچے اس کے گرد پروانوں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ وہ جب اس کو دیکھتے تو شور مچاتے کہ چاچا ایبٹ آ گیا۔ وہ بھی ان کی خوشنودی کے لئے جیبوں میں مٹھائی جمع رکھتا تھا سب بچے دوڑ دوڑ کر اُس کی جیب سے مٹھائی نکالتے تھے۔ ابھی اس کا ایک سال ہی اس ضلع میں ہوا تھا۔ کہ ریذیڈنٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔ "لوگ اس پر عاشق ہیں اور پرستش کی حد تک عاشق ہیں۔ جو لوگ بھی ہزارہ سے میری ملاقات کے لئے آتے ہیں اسی کی بے حد تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس قوم سے ہر کام حسب خواہش لے سکتا ہے۔ جس قوم کو سکھ اپنی تمام عہدِ حکومت میں کبھی بھی رام نہ کر سکے۔ اور جس کو ہوشیار گلاب سنگھ نے ہر شرط پر دربار کے حوالہ کرنا منظور کیا۔"

ایبٹ کی کارگزاری

ہزارہ میں قیام امن

ایبٹ یکم جون ۱۸۴۷ء کو ہزارہ میں داخل ہوا۔ اور سید حاجی ہری پور پہنچا۔ ۳ جون کو اس کو خبر ملی کہ دیوان کرم چند کو علاقہ ڈھونڈ میں شکست ہوئی۔ اُسی مہینہ میں اس نے نواں شہر اور مانسہرہ کے قلعوں کا معائنہ کیا دونوں قلعوں میں فوج بوجہ مدت سے تنخواہ نہ ملنے کے بغاوت پر تیار کھڑی تھی۔ اور علاقہ کے لوگوں کا حکومت کی ظلم و تعدی سے ناک میں دم تھا۔ مانسہرہ تحصیل کے دورہ میں وہ وانس اگنیو (VANSAGNEW) سے بھی گڑھی حبیب اللہ میں ملا۔ اور اس کے ساتھ علاقہ ڈھونڈ اور کڑال کے معاملات پر مشورہ کیا۔ ان علاقوں سے جموں کی فوجوں کو نکالنے کا انتظام کر کے مہینہ کے آخر میں ہری پور واپس پہنچ گیا۔

میجر ایبٹ کی تارخیلی قوم سے آویزش

یہ گندگر کی زبردست قوم میدانی علاقوں پر ہمیشہ یلغار کر کے واپس گندگر میں پناہ لیتی رہتی تھی۔ میجر ایبٹ نے ان کو مغلوب کرنے کے لئے لفٹیننٹ جان نکلسن سے مل کر حملہ کیا۔ نکلسن حسن ابدال سے براہ کھرڑی سلم کھنڈ (تارخیلی قوم کے مرکزی گاؤں) پر اور ایبٹ ہری پور کی طرف سے یکبارگی ۴ جولائی ۱۸۴۷ء میں حملہ آور ہوئے۔ لیکن تارخیلی اس حملہ کی خبر پا کر جلدی سے گاؤں خالی کر کے سری کوٹ کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ بہر حال دونوں فوجیں سلم کھنڈ پہنچیں۔ اور اس علاقہ کے فتح ہونے سے باقی

اقوام ہزارہ کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد جہان داد خان تنولی، ساداتِ کاغان اور ناڑہ کے کڑالوں نے اطاعت قبول کر لی۔ طاہر خیلی خوانین بھی چند ماہ کیمبل پور میں رہنے کے بعد واپس آ گئے کچھ عرصہ زیر حراست رہنے کے بعد ان کو رہا کر کے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

قوم ڈھونڈ سے آویزش

ہزارہ میں صرف ڈھونڈ ہی ایسی قوم تھی جو سب سے آخر مطیع ہوئی۔ میجر ایبٹ جب ناڑہ میں گیا اور کڑالوں کا نظم و نسق درست کر لیا۔ تو پھر وہ نومبر ۱۸۴۷ء میں خان پور گیا وہاں سے وہ دریائے ہرو کے راستہ سے علاقہ ڈھونڈ کی طرف گیا۔ اور ڈنہ (لورہ سے اوپر پہاڑ کی چوٹی) پر پہنچا۔ راولپنڈی سے بھی ایک فوج اس کی امداد کے لئے زیر کمان سردار جھنڈا سنگھ آ کر مل گئی۔ ڈھونڈ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جلد ہی مطیع ہو گئے۔ وہاں سے وہ کہوٹہ ضلع راولپنڈی گیا۔ کیونکہ مری کا ڈھونڈ علاقہ بھی اس کے ماتحت تھا۔ اُن کا انتظام وغیرہ کرنے کے بعد اس نے کشمیر پنجاب کی سرحد پر لگے ہوئے پیل پایوں (PILLARS) حد بندی کے میناروں کا بھی معائنہ کیا جو اس نے ایک سال پہلے لگوائے تھے۔

بغاوت ملتان

۱۶ اپریل ۱۸۴۸ء وانس اگنیو ________ اور اینڈرسن (ANDERSON) کو ملتان میں قتل کر دیا گیا۔ اور دوسرے سکھوں کی لڑائی شروع ہوئی۔ اور جس کے اختتام پر تمام پنجاب حکومت انگریزی کے ماتحت آ گیا۔ اس واقعہ کی اطلاع میجر ایبٹ کو ہری پور میں ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو ملی ان ایام میں قلعہ ہری پور (ہرکشن گڑھ) میں چار ہزار فوج زیر کمان ناظم سردار چتر سنگھ اور نائب ناظم سردار جھنڈا سنگھ تھی۔ دو رجمنٹ بمعہ توپ بمقام گاندھیاں (تحصیل مانسہرہ) زیر کمان کرنل بھوپ سنگھ اور بہادر سنگھ مقیم تھیں۔ اس طرح تھوڑی تھوڑی فوج جس میں سکھوں کے علاوہ پوربی اور مسلمان سپاہی تھے۔ ہزارہ کے چھوٹے چھوٹے قلعوں میں موجود تھی۔

سردار چتر سنگھ

سکھوں میں بہت بڑا سردار تھا۔ بہت بڑی جائداد اور جاگیر کا مالک تھا۔ اور مہاراجہ کشمیر کا دلی دوست تھا۔ اس کی لڑکی مہاراجہ دلیپ سنگھ (رنجیت سنگھ کا پوتا جو ان دنوں پنجاب کا برائے نام حکمران تھا) کو

منسوب تھی۔ یہ سکھ حکومت میں کافی مدت افسر اعلیٰ رہا۔ اگرچہ وہ بوڑھا تھا اور صحت کمزور تھی تاہم بہت ہوشیار، زیرک اور زمانہ شناس تھا۔ جھنڈا سنگھ کا جو ایک قابلِ اعتماد اور اچھا سپاہی تھا۔ اس پر کافی اثر تھا۔

میجر ایبٹ کے ساتھی صرف محکمہ (SVRVEY) (پیمائش) کے چند نفوس تھے اور ایک لفٹیننٹ رابنسن (R-C-ROBINSON) تھا۔ ۲ مئی ۱۸۴۸ء کو دربار لاہور سے حکم آیا۔ کہ فوج زیر کمان جھنڈا سنگھ ہری پور سے جنوب کی طرف جائے تاکہ سندھ ساگر دواب میں امن قائم رکھے۔ لہٰذا ۵ مئی ۱۸۴۸ء رسالہ اور پیادہ رجمنٹ بمعہ خوانین ہزارہ کے بھیجی گئی اور چند توپیں اور کچھ فوج ہری پور ہی رکھی گئی۔

ہزارہ مئی ۱۸۴۸ء

متذکرہ بالا فوج کے جانے کے بعد چند ہفتے امن و امان رہا۔ کبھی کبھی کرنل کنارا (CANARA) (جو امریکن تھا اور توپ خانہ کا کمانڈر تھا) کے سپاہیوں میں آثارِ بغاوت ظاہر ہوتے تھے۔ جو دیوان مولراج کی سازش کی وجہ سے تھے۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں سے نجات حاصل کی جائے۔ لیکن ظاہری تعلق مابین میجر ایبٹ و ناظم اچھا رہا۔ میجر ایبٹ کی کوشش تھی کہ لوگوں میں امن رہے۔ اور باوجود فوجوں کے چلے جانے اور کرڑالوں میں بدامنی کی افواہوں کے لوگ عام طور پر پُرسکون رہے۔

بغاوت کے آثار

میجر ایبٹ اور اس کے عملہ کی صحت ہری پور کے پانی سے خراب ہو گئی تھی لہٰذا اس نے ۲۳ مئی ۱۸۴۸ء کو ۱۴ میل دور علاقہ تناول (کچھی) میں اپنا کیمپ برائے تبدیلی آب و ہوا لگایا۔ اس کے ہری پور سے چلے جانے پر بدامنی کے آثار شروع ہو گئے۔ یکم جون کو وہ ہٹ کر اپنے بنگلے واقع شیروان چلا گیا۔ اسی اثناء میں حالات خراب ہوتے رہے۔ میجر ایبٹ کی ڈاک کے تھیلے راستہ میں روکے جانے لگے۔

اسی اثناء میں کوئی گرو لاہور سے آیا اور ناظم سے ملاقات کی۔ اور جھنڈا سنگھ کی چو رنگی رجمنٹ باغی ہو گئی۔ جولائی کے شروع میں پکھلی والی فوج کے، جو ملتان جانے کے لئے بے تاب تھی منحرف ہونے کی خبریں ملنے لگیں۔ اس پر میجر ایبٹ کو چتر سنگھ کے عزائم کے متعلق شک ہوا۔ وہی گرو پشاور سکھ فوجوں کے ورغلانے کے لئے بھیجا گیا۔ اور ہزارہ کے رئیسوں کو بھی منحرف کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ یکم اگست کو خبر ملی کہ پکھلی کی افواج آخر کار اپنے کمانڈروں کے نیم دلانہ مخالفت کے لئے حرکت میں آنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ایبٹ ان کا راستہ روکنے کے لئے تیار رہا۔ تاکہ یہ افواج ہری پور کی افواج سے نہ مل سکیں۔

ایبٹ نے تنولیوں اور جدونوں کو درہ سلہڈ و مانگل پر بٹھا دیا۔ تاکہ ان کا راستہ روک لیں۔ یہ دیکھ کر وہ افواج حرکت کرنے سے رک گئیں۔ اس اثناء میں سردار چتر سنگھ نے میجر ایبٹ کو شیروان میں ایک خط لکھا۔ کہ وہ وفادار ہے۔ اور اس ضمانت کے لئے وہ اپنے لڑکے عطر سنگھ کو بھیجنے کے لئے تیار ہے۔ ایبٹ نے اس میں کوئی دھوکا محسوس کیا اور نہ مانا۔ دوسرے دن کرنل کنارا کا خط ملا کہ چتر سنگھ کی فوج قلعہ سے باہر آ گئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ توپوں پر (جو کرنل کنارا کے ماتحت تھیں) قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس حملہ میں کرنل کنارا مارا گیا۔

کرنل کنارا

یہ سکھوں کے توپ خانہ کا افسر تھا اور امریکی تھا۔ جو چتر سنگھ کے حکم سے مارا گیا۔ اس کی قبر ڈاک بنگلہ ہری پور سے جانب مشرق لبِ سڑک جی ٹی روڈ تھی۔ چند سال ہوئے یہ قبر گرا دی گئی ہے اس کی قبر کا کتبہ پشاور کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اور کتبہ ملا ہے۔ انگریزی عبارت کا ملخص حسب ذیل ہے:-

بہ یادگار کرنل کنارا جو سکھ توپ خانہ کا افسر تھا۔ جب سکھ باغیوں نے اس سے توپیں حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا تو اس کے انکار پہ باغی سکھ فوجوں کے ہاتھ سے اکیلا جنگ کرتے ہوئے مارا گیا۔ کیونکہ اس کے اپنے ماتحت فوجی سکھوں سے جا ملے تھے ——— تاریخ ۶ جولائی ۱۸۴۸ء

سردار چتر سنگھ نے کرنل کنارا کے قاتلوں کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا۔ اور اپنے عمل سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ کس کا جانب دار تھا۔ اس کے بعد چتر سنگھ نے کوشش کی کہ نواب جہانداد خان والئے امب اس کے ساتھ مل جائے۔ اور مہاراجہ کشمیر کو بھی امداد کے لئے خطوط بھیجے۔ یہ سب خطوط میجر ایبٹ نے راستہ میں پکڑ لئے۔

حکومت انگریزی کی طرف سے بموجب خط نمبر ۱۴۹۲ مورخہ ۱۱ جون ۱۸۴۹ء از سیکرٹری گورنر جنرل ہند کرنل کنارا کے چار نابالغ بچوں کو اٹھارہ سال کی عمر تک کے لئے پندرہ روپیہ ماہوار فی کس بطور پنشن منظور کئے گئے۔

چتر سنگھ نے ان واقعات کو اپنی چالاکی سے دوسرا رنگ دینے کی کوشش کی اور ریذیڈنٹ لاہور کو لکھا کہ :- ایبٹ اہالیانِ ہزارہ کو سکھوں کے خلاف اکسا رہا ہے اور مجھ (چتر سنگھ) پر نہ اعتبار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اختیار میرے ہاتھ میں چھوڑا ہے۔ اور مجھے محض صفر کر دیا ہے۔ میں نے لوگوں کی بغاوت کے اندیشہ سے فوج اور توپیں شہر سے باہر نکال لی ہیں۔ تاکہ محفوظ مقام پر چلے جائیں۔ کرنل کنارا میرے حکم

نوٹ :- ان حالات کے ساتھ جناب سنگھ کی تحریر کردہ تاریخ ہزارہ سے مقابلہ کرنے سے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے

کی تعمیل کے انکار کی وجہ سے لوگوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہو سکتا ہے؟"

ریذیڈنٹ نے چتر سنگھ کی بات سے اتفاق کیا اور کرنل کنارا کے قتل سے چتر سنگھ کو بری سمجھتے ہوئے اپنا اسسٹنٹ تحقیق کے لئے ہزارہ بھیجا۔ تاکہ وہ مکمل تحقیقات کرے اور اختیار ایبٹ کے ہاتھ سے لے لے۔ لیکن ہزارہ کے نازک صورت حال کے پیش نظر دو دن بعد یہ حکم منسوخ کر دیا۔ اور سابق نائب ناظم ہری پور جھنڈا سنگھ کو ہزارہ بھیجا تاکہ ایبٹ اور چتر سنگھ میں صلح کرا دے۔ لیکن صورت حال دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ ایبٹ نے کوشش کی کہ چتر سنگھ کو نہ باہر سے اور نہ اندرون ہزارہ سے کوئی مدد مل سکے۔ وہ خود ۹ر اگست ۱۸۴۸ء کو شیروان سے ناڑہ۔ دامن گندگر میں آ گیا۔ اور ۱۲ر اگست لفٹیننٹ رابنسن کو درہ مانگل کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ اس اثناء میں جان نکلسن نے قلعہ اٹک پر قبضہ کرکے سکھوں کو باہر کر دیا۔ اور مارگلہ جا پہنچا۔ وہاں سے جو سکھ فوج زیر کمان پرتاپ سنگھ ہزارہ کی طرف آ رہی تھی اسے دھکی سے واپس راولپنڈی بھیج دیا۔ لیکن ابھی تک ریذیڈنٹ چتر سنگھ کے ساتھ صلح کی کوشش کر رہا تھا۔ جب جھنڈا سنگھ ناکام ہو کر واپس گیا۔ تو اس نے دیوان دینا ناتھ کو صلح کی غرض کے لئے بھیجا لہذا نکلسن اور ایبٹ اس اثناء میں چتر سنگھ پر کوئی حملہ نہ کر سکتے تھے۔ یہ بات چیت جاری تھی کہ چتر سنگھ اپنی فوج کو لے کر حسن ابدال کی طرف جانے لگا۔ ایبٹ نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے کیمپ کو جو حسن ابدال اور ہری پور کے درمیان تھا۔ جا لیا۔ بات چیت کی گئی۔ لیکن صلح نہ ہو سکی۔ چتر سنگھ پھر حسن ابدال کی طرف چل پڑا چتر سنگھ اپنی فوج لے کر عثمان کھٹڑ کی طرف چلا گیا۔ تاکہ پرتاپ سنگھ سے مل جائے۔ جو راولپنڈی سے پھر واپس آ گیا اور مارگلہ پار کر چکا تھا۔

اب سکھوں کی فوج نے ہری پور کے راستہ سے آ کر رجوعیہ میں کیمپ کیا (ستمبر ۱۸۴۸ء) تاکہ پکھلی کی فوج کی امداد کو پہنچ سکیں۔ ایبٹ اور نکلسن نے سلہڈ اور دھمتوڑ کے دروں پر اُن کا مقابلہ کیا۔ لیکن ناکام ہوئے۔ نکلسن حسن ابدال کو اور ایبٹ ناڑہ۔ اپنے محفوظ مقامات کو چلے گئے۔

۸ر اکتوبر ۱۸۴۸ء کو چتر سنگھ ہری پور میں چند روز قیام کرنے کے بعد چھچھ کے میدان کو چلا گیا۔ وہاں دریائے سندھ کے بائیں کنارے ہوتا ہوا ضلع ہزارہ کی حد میں اس خیال سے داخل ہوا کہ سلم کھنڈ قلعہ کے سکھ سپاہیوں کو آزاد کرائے۔ ایبٹ نے اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن وہ سلم کھنڈ کے سکھوں کو لے کر واپس ہو گیا۔ سکھوں کے دو سو فوجی قتل ہوئے ایبٹ کی طرف سے عطا محمد خان تازیخیل جو تلوار ہاتھ میں لئے حملہ کر رہا تھا۔ مارا گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایبٹ سری کوٹ اور ناڑہ میں خاموش بیٹھا رہا۔ کہ آخر اکتوبر ۱۸۴۸ء میں امیر دوست محمد خان پشاور آ گیا۔ ایبٹ نے جب یہ خبر سنی تو دسمبر میں دوست محمد خان کو ایک خط لکھا۔

آپ کی آمد امید ہے دوستانہ ہے۔ سرکار سکھوں کی بغاوت کو کچلنے کا پورا انتظام کر رہی ہے۔ اور وہ آپ کی امداد کی بھی طالب ہے۔ اگرچہ اُس کا یہ خط گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر تھا۔ اور غیر ماتحتانہ۔ تاہم اس خط نے دوست محمد خان کے دلی خیالات کو ظاہر کروا لیا۔ اس نے کہا کہ "وہ اضلاع پشاور۔ ڈیرہ جات ہزارہ کو اپنے لئے حاصل کرنے کے لئے آیا ہے۔"

سکھوں کے مقابلے میں یہ مصیبت زیادہ تھی کیونکہ افغان اور اہل ہزارہ مسلمان اور ایک قوم تھے دوست محمد خان نے اپنی فوج زیر کمان اپنے لڑکے غلام حیدر خان جنوری ۱۸۴۹ء ہزارہ میں بھیجی۔ اور کچھ خوانین ہزارہ اُن کے ساتھ مل گئے۔ ان خوانین میں سے قابل ذکر خانی زمان خان طاہر خیلی اور غلام خان ترین ہیں۔ جب افغان فوجیں ہزارہ میں داخل ہوئیں تو ایبٹ گندگر سے ہٹ کر شیروان آ گیا۔ کہ یہ محفوظ مقام اور کشمیر کو جانے والی افواج کے راستہ میں بھی تھا۔ اور یہاں ان کو کشمیر جانے کے لئے روکنا آسان تھا۔ ایبٹ کے گندگر سے چلے جانے کے بعد افغان افواج نے بہ رہنمائی خانی زمان خان طاہر خیلی سری کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد افغان فوج نے دریائے دوڑ کو عبور کرکے شیروان پر حملہ کرنے کے لئے بھاروکوٹ[1] میں مقام کیا۔ وہاں سے ان کو سکھوں نے اپنی امداد کے لئے فوری طور سے واپس بلایا۔ تاکہ انگریزی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ جو آخر کار شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن ۲۱ر فروری ۱۸۴۹ء کی جنگ گجرات میں انگریزی فوج کی مکمل فتح نے ان کے سب منصوبے خاک میں ملا دئے۔ افغان فوجیں جلدی سے اٹک پار کرکے اور پشاور خالی کرتے ہوئے واپس افغانستان پہنچ گئیں۔ اور ایبٹ اپنی لیوی (LEVY) سپاہیوں کے ساتھ مارگلہ پر جا پہنچا۔ اور وہاں سے اس نے آخری نقشہ۔ میدان راولپنڈی میں سکھوں کا انگریزی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا نظارہ مارگلہ کی چوٹی سے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سکھوں کی دوسری جنگ کے اختتام پر ایبٹ کے کارنامے۔ بہادری اور اثر و رسوخ۔ پر

---

[1] نوٹ ۱۔ بھاروکوٹ۔ مطابق صورت دیہی ۱۸۷۲ء یہ اخون خیلاں کی پرانی آبادی ہے اور اس علمداری کو چھ سو برس (یعنی ۱۸۷۲ء میں) گذرا ہوگا۔ کہ اقوام اتمان زئی نے بہ باعث قتل ہو جانے رضا خان سید خانی کے از دست سلیمانیاں (شلمانی قوم موسوم بہ اخون خیل۔ ش ب) ویران کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے پھر آباد ہو گئی لیکن دیوان ہری چند نے سمت ۱۹۰۳ (۱۸۴۶ء) میں جلا دیا۔ انگریزوں نے جوڑا پنڈ (متصل بھاروکوٹ) میں اپنی چھاؤنی بنائی ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے دھمتوڑ میں چھاؤنی بنائی۔ اور بعد میں میجر ایبٹ نے ایبٹ آباد کو چھاؤنی بنایا۔ بھاروکوٹ کی وجہ تسمیہ اونچی جگہ ہے اس واسطے بہ نام کوٹ نامزد ہے۔

حکومت اور پارلیمنٹ نے شکریہ ادا کیا۔ اور اُس کو ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر بنا دیا۔ وہ اس عہدہ پر ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک رہا۔ اس عرصہ میں اس نے ہزارہ میں مکمل امن وامان قائم کر دیا۔ نظامِ حکومت میں اصلاح کی۔ مالیہ کا بندوبست از سرِ نو کر کے لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ اور ملک خوشحال ہو گیا۔ اس کے دوران حکومت میں صرف دو قابلِ ذکر واقعات ہوئے۔ پہلی مہم ڈھاکہ کی طرف ہوئی اور دوسری سادات کاغان کے خلاف لو شکھا۔ بموجب ڈائری ۱۱-۴-۱۸۵۰ء ہری پور کا قلعہ، جیل، خزانہ اور عدالتیں جو سکھوں نے تباہ کر دی تھیں۔ میجر ایبٹ نے پھر سے اُن کو تعمیر کرایا۔ اس سے دو سال پہلے اس نے تمام ضلع میں مناسب جگہوں اور فاصلوں پر ضلع افسران کی آسانی اور رہائش کے ڈاک بنگلے بنائے۔ تاکہ دورہ کرنے والے افسر آرام سے مقام کر سکیں۔ ضلع کے لوگوں کے امن اور خوشحالی کے لئے ضروری تھا کہ انگریز افسر ہر جگہ موجود نظر آئیں۔ ۲۔ ڈائری ۱۴-۸-۱۸۵۰ء کے مطابق میجر ایبٹ نے سری کوٹ کے چار ملکوں کو جن کو خدمات کے صلہ میں تنخواہ نہیں ملی تھی۔ بیس ہزار روپیہ کی بچت سے دینا منظور کیا۔ ۳۔ میجر ایبٹ کے وقت یہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ تین سال سے زائد میعاد کے قیدی ضلع ہزارہ سے باہر بھیجے جائیں۔

مُہم کاغان ۱۸۵۲ء

سادات کاغان کے سخت سلوک کی شکایت کاغان کے گوجروں نے میجر ایبٹ سے کی۔ اور جا سوسوں نے ایبٹ کو یہ اطلاع بھی دی کہ سادات کاغان مجاہدین سے مل کر بغاوت کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور ڈھونڈ قوم کو بھی اُکسا رہے ہیں۔ لہٰذا ایبٹ نے ضامن شاہ رئیس سادات کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ ہری پور میں رکھا۔ لیکن ضامن شاہ کی درخواست پر بورڈ آف ایڈمنسٹریشن۔ لاہور نے ضامن شاہ کو ضمانت پر رہا کر دینے کا حکم دیا۔ ایبٹ نے اس کو رہا کر دیا۔ مگر اس کے لڑکے کو اپنے پاس رکھا۔ بعد میں وہ بھی بھاگ کر کاغان چلا گیا۔ واقعات بگڑتے گئے۔ یہاں تک کہ کمشنر پشاور کرنل میکیسن جب ہزارہ آیا تو ضامن شاہ اُس کے بلانے پر اس کے پاس نہ آیا۔ لہٰذا ایبٹ کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ بالاکوٹ سے کاغان بھیجا گیا اور لفٹیننٹ پیرس (PEARSE) ایک اور دستہ کے ساتھ کشمیر سے کاغان کی طرف بڑھا۔ اور لیوی کے سپاہی وادی بھوگڑمنگ میں موسے کے مصلّے سے چڑھ کر کاغان کی طرف بڑھے۔ سادات نے کوئی مقابلہ نہ کیا۔ اور اطاعت قبول کی۔ بطور سزا ان کو کاغان سے ملک بدر کر کے تاحکم ثانی پکھلی میں رہنے کا حکم دیا۔ مہم کے اختتام پر ایبٹ کی تجویز تھی کہ کاغان میں پولیس کی چوکی برائے امن قائم کی جائے۔ کمشنر کی رائے تھی کہ پہلے سڑک بنائی جائے تاکہ وقت ضرورت اس چوکی کو فوری طور

پہنچائی جا سکے۔ ان دو افسروں کے اختلاف میں زیادتی ہوتی گئی۔ اور آخر کار ایبٹ کو یہاں سے جانا پڑا۔ ایبٹ نے اس تبدیلی کے حکم کو خوشی سے منظور کیا۔ اور ہزارہ سے جو اس کو بے حد محبوب تھا۔ جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ ہزارہ کے لوگوں کو تین دن رات ناڑہ سید خانیاں کے مقام پر دعوت دیتا رہا۔ اور الوداع کہتا رہا۔ اپنا سب روپیہ خرچ کر کے جب وہ جانے لگا تو اس کی جیب میں صرف ایک ماہ کی تنخواہ تھی۔ لوگ حسرت کناں وگریہ کناں حسن ابدال تک اس کو رخصت کرنے کے لئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ نکلسن کی پرستش کرتے تھے۔ مگر ڈرتے بھی تھے۔ ایبٹ کی پرستش کرتے تھے اور محبت بھی کرتے تھے انگریزی حکومت کو مضبوط بنیاد اس ضلع میں اسی کے ہاتھ سے ملی۔

ایبٹ یہاں سے جا کر پھر فوج میں شامل ہوا اور اپنی پرانی رجمنٹ میں تعینات ہوا۔ اور انگریزی بارود کا کارخانہ (GUN POWDER) ایشاپور (نزد کلکتہ) کا انچارج مقرر ہوا۔ ۱۸۶۶ء میں کرنل بنا۔ اپنی شام زندگی (RYDE) جو جزیرہ وائٹ (ISLE OF WIGHT) میں ہے گزاری۔ اور ۱۸۹۶ء میں مر گیا۔

ایبٹ کے بعد ہربرٹ ایڈورڈز (HERBERT EDWARDS) ہزارہ کا ڈپٹی کمشنر بنا۔ اور آتے ہی اس نے ایبٹ کے نام پر ایبٹ آباد کے نام پر چھاؤنی بنوائی۔ اس سے پہلے فوجوں کی چھاؤنی بھاروکوٹ برلب دریائے دوڑ تھی۔ وہاں گرمی زیادہ تھی اس لئے اِسے چھوڑ کر ایبٹ آباد کو چھاؤنی بنایا گیا۔

ایڈورڈ کا یہاں اپنا بنگلہ بننے سے پہلے میکیسن (MACKESON) کمشنر پشاور قتل کیا گیا۔ اور ایڈورڈ پشاور کا کمشنر ہو کر وہاں چلا گیا۔

ہزارہ کے چند واقعات کی تفصیل
میجر ایبٹ کی ڈائری کی روشنی میں

میں کتاب (تاریخ ہزارہ بشمول عہد میجر ایبٹ) کی تحریر سے فارغ ہو چکا تھا کہ میجر ایبٹ کی مفصل ڈائری ۴۹-۱۸۴۸ء کا علم ہوا۔ اس کے مطالعہ سے میجر ایبٹ کی علمی قابلیت، سیاسی بالغ نظری اور صاحب حکمرانی اور دُور اندیشی کا پورا علم حاصل ہوتا ہے وہ اگرچہ ناظم ہزارہ۔ سردار چتر سنگھ۔ کے مشیر کی حیثیت سے یہاں مقیم تھا لیکن عملاً وہی حکمران تھا۔ ہزارہ میں فوج کی نقل وحرکت، اُن کی تنخواہ کی ادائیگی مالیہ اور واجبات حکومت کی وصولی، خزانہ کا انتظام اس کے حکم سے ہوتا تھا۔ نظام عدالت ہزارہ کا وہی سربراہ تھا۔ ہزارہ کے علاوہ اس کے حکم کا سکّہ ان سب امورات بالا میں، علاقہ چھچھ، کھاٹڑ،

پوٹھوار اور کہوٹہ (ضلع راولپنڈی) تک میں چلتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پشاور میں متعین انگریز افسروں
کا بھی مشیر تھا۔ اور اُن کو وہاں کے حالات اور واقعات پر موثر رائے دیتا تھا۔ اور ان کی کارکردگی پر
نظر رکھتا تھا۔ ریذیڈنٹ لاہور کو ان سب علاقوں کے حالات سے بذریعہ اپنی روزانہ ڈائری مطلع
کرتا رہتا تھا۔ یہ ڈائری بڑی زوردار ہوتی تھی اور اپنی رائے اور مشورہ کو صائب سمجھتا تھا۔ اور
اس پر عمل کے لئے زور بھی دیتا تھا یہاں تک کہ آخر ریذیڈنٹ نے اس تحکمانہ انداز میں دئے گئے مشورہ
پر ایک بہت سخت تنبیہ بھی کی۔ اور لکھا کہ اس کی رائے کا انداز افسرانہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کو
ماتحتانہ ہونا چاہیئے۔ اور اس کا انداز محکمانہ ضبط و نظم کے خلاف ہے جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ "میں
اپنی قوم و سلطنت کی بہتری کے لئے مخلصانہ اور زوردار رائے دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اس میں
شک نہیں کہ میں یقیناً ایک ماتحت ہوں۔ قانوناً اور عملاً۔ اور اپنے اس مقام سے بخوبی واقف بھی ہوں
لیکن صرف سلطنت کی بہتری کے لئے اپنی رائے اور مشورہ بے باکانہ طور پر پیش کرتا رہتا ہوں"

سردار چتر سنگھ اور دوسرے سکھ افسر میجر ایبٹ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ
انگریزی بالادستی کے اس علم نشان کے ختم کرنے کو انگریزی سلطنت کے ختم کرنے کے مترادف سمجھتے تھے
وہ اس کو گرفتار یا قتل کرانے کے درپے رہتے تھے۔ اُن کے اس مشورہ میں مہاراجہ گلاب سنگھ والی جموں و
بھی اندرونی طور پر شامل تھا۔ اگرچہ وہ اپنی فطری عیاری اور سیاسی چابکدستی سے اپنی شمولیت کو ظاہر
نہ ہونے دیتا تھا۔ اور ظاہراً انگریزوں کے ساتھ بھی راہ و رسم رکھتا تھا۔ میجر ایبٹ کو انگریزوں کے ساتھ
اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہتا تھا۔ لیکن ایبٹ اس کی چالبازیوں سے واقف تھا اور اس کے فریب میں
آتا تھا۔ اور ان سب پر کڑی نظر رکھتا تھا۔

سکھوں کی سازش گہری اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ میجر ایبٹ کی ڈاک بھی
ہی میں اچک لی جاتی تھی۔ مگر سکھوں کی کوئی چال میجر ایبٹ کو نہ خوف زدہ کر سکی اور نہ کوئی نقصان پہنچا
سکی۔ میجر ایبٹ ان انتہائی غیر موافق حالات میں اپنی فراست و ہوشیاری سے سکھوں کی تمام سازشوں
کا تار و پود بکھیرتا رہا۔ ان کے داؤں اور فریبوں کا توڑ کرتا رہا۔ اس نے اپنے اخلاق فاضلہ، بہادری اور حوصلہ
سے ملکی لوگوں کو ایسا گرویدہ کر لیا کہ وہ اس کی امداد کے لئے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ ہزارہ، چھچھ
کھاٹرہ، پوٹھوار اور کہوٹہ کے سب لوگ سکھوں کے ظلم و زیادتی سے نالاں تھے۔ اور میجر ایبٹ کی ذات
میں ان کو ایک نجات دہندہ مل گیا۔ اور وہ اُس کو سکھوں سے گلوخلاصی کا ضامن سمجھتے تھے۔

میجر ایبٹ اپنی ڈائری میں جا بجا ملکی لوگوں کی الفت اور امداد کا اعتراف کرتا ہے۔ اور ایک جگہ لکھتا

کہ وہ اکیلے ہی ملکی لوگوں کی امداد سے سب سکھ فوجوں کو شکست دے سکتا ہے۔ وہ اپنی ڈائری مورخہ
۱۸۴۸ء از شیروان میں لکھتا ہے کہ "اس ملک میں میری طاقت کا اندازہ فوج کی تعداد سے نہیں بلکہ لوگوں
کے اس اعتماد سے، جو وہ مجھ پر بطور اپنے خیر خواہ دوست کے رکھتے ہیں، لگایا جائے اور یہ بہت زیادہ
ہے۔ لہٰذا میں اپنے اس اثر و رسوخ کو اُن کے مقدمات نہ سن کر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

میجر ایبٹ کے دور کے تاریخی حالات، جو پہلے میں اپنی کتاب میں لکھ چکا ہوں۔ اس ڈائری سے اُن
کی تصدیق ہوتی ہے۔ یہ ڈائری اُن واقعات کا پس منظر بڑی تفصیل سے پیش کرتی ہے۔ میں صرف چند
واقعات کے پس منظر کے متعلق جستہ جستہ اقتباسات کا خلاصہ تحریر کرتا ہوں۔ تاکہ ان واقعات کی وضاحت
ہو جائے۔

بغاوتِ ملتان

اسباب:۔ اس کی رائے میں تمام سکھ افسر اور دیگر افراد کے ایماء اور امداد سے یہ بغاوت ہوئی
سکھ اپنی سلطنت کا احیاء چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مولراج کو اپنی امداد کا یقین دلا کر بغاوت کے
لئے اٹھایا۔ میجر ایبٹ کی رائے میں اس بغاوت کا مشہور کردار بھائی مہاراج سنگھ تھا۔ جو اس بغاوت کے
بانیوں یا امداد کرنے والوں میں سے تھا جب وہ اس مقصد کے لئے سندھ گیا ہوا تھا تو میجر ایبٹ نے
راجرس نیپیر (RODGERS NAPIER) سندھ کے انگریز فاتح کو مطلع کر دیا تھا کہ مہاراج سنگھ کو گرفتار کرنے
کے لئے خاص اہتمام اور کافی فوج کی ضرورت ہوگی۔ مگر نیپیر نے اس کا اتنا اہتمام نہ کیا۔ لہٰذا وہ سندھ میں گرفتار
نہ ہو سکا اور پنجاب بھاگ آیا۔ اسی طرح بھائی اجارہ سنگھ سوڈھی (جو چتر سنگھ کے پاس بغاوت کے جوڑ
توڑ کے لئے آیا تھا۔ میجر پشاور بھی گیا تھا) بھی اس مہم کا ایک موثر کردار تھا۔ اس کے ہری پور آنے
کے بعد یہ مشہور کیا گیا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ رُوپوش ہو گیا ہے۔ یا ملتان چلا گیا ہے۔ (ڈائری مورخہ
۱۱ جون ۱۸۴۸ء) لہٰذا دلیپ سنگھ کو حفاظت سے زیر نظر رکھنے کے لئے میجر ایبٹ نے ریذیڈنٹ
کو متوجہ کیا۔ بعد میں میجر ایبٹ کو اطلاع ملی کہ دلیپ سنگھ جموں چلا گیا ہے۔

مہاراجہ گلاب سنگھ والئی جموں و کشمیر بھی بغاوتِ ملتان کے حامیوں میں سے تھا اور اس بغاوت
کے جوڑ توڑ میں در پردہ سکھوں کے ساتھ تھا۔ میجر ایبٹ کا یہ خیال تھا کہ بحیثیت قوم، سب سکھ
بغاوتِ ملتان کے حامی ہیں۔ بعد کے واقعات نے اس خیال کو صحیح ثابت کر دیا۔ گاندھیاں کی فوج
کا اضطراب، جھنڈا سنگھ کے جوڑ توڑ، اور ہزارہ سے جو فوج انگریزوں کی امداد کے لئے بھیجی گئی

اُس کا مولراج سے مل جانا اِس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ بغاوتِ ملتان کے دوران سکھوں میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ ۱۵؍جیٹھ کو اُن کا روپوش گرو ظاہر ہوگا جس کی قیادت میں سکھ قوم کی حکومت پھر سے قائم ہو جائے گی۔ یہ تاریخ وقتاً فوقتاً ایک ایک ماہ پیچھے ہٹائی جاتی رہی۔ حتیٰ کہ انگریزوں نے ملتان فتح کر لیا۔ لیکن کوئی گرو ظاہر نہ ہوا۔ سکھوں کا یہ حربہ سکھ قوم کو جرأت آموزی کے لئے ایک اشتہاری حرکت (STUNT) تھی۔

قلعہ ملتان کے متعلق میجر ایبٹ، ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے کہ "یہ قلعہ ایک ڈھیری پر ہے۔ یہ ڈھیری کبھی پرانا شہر تھا۔ قلعہ اور ملتان شہر میں چار سو گز کا فاصلہ ہے۔ شہر بھی قلعہ بند ہے۔ قلعہ ملتان کی دیواریں مٹی کی ہیں۔ جس کو بیرونی طرف سے پختہ اینٹوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس قلعہ کی دیوار کو بھاری توپ خانہ کی گولہ باری سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اس قلعہ کی دیوار کو اس وقت تک نہ توڑ سکا تھا جب تک بھنگیوں کی توپ جو ۲۴ پونڈ کا گولہ پھینکتی ہے۔ نہ لائی گئی۔ قلعہ کے گرد خشک کھائی (خندق) ہے۔ لہٰذا محاصرہ کرنے والی فوج کے لئے پانی کا انتظام ضروری ہے۔"

ڈائری مورخہ ۳؍مئی ۱۸۴۸ء ہری پور

چترسنگھ کی بغاوت کے دوران میجر ایبٹ کی تگ و دو اور مختلف مقامات پر اقامت

ڈائری سے مندرجہ ذیل مقامات پر میجر ایبٹ کی اقامت کا پتہ چلتا ہے:-

موہٹ ۱۰؍اپریل ۱۸۴۸ء، ہری پور ۲۶؍اپریل تا ۲۲؍مئی ۱۸۴۸ء۔ کچھی ۲۲؍مئی تا یکم جون ۱۸۴۸ء۔ شیروان یکم جون تا ۸؍اگست ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ، گندگر ۹؍اگست تا ۱؍ستمبر ۱۸۴۸ء۔ سلہڈ ۹؍ستمبر ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ گندگر ۱۴؍ستمبر تا ۱؍اکتوبر ۱۸۴۸ء

چترسنگھ کی بغاوت کے لئے پخت و پُز اور میجر ایبٹ سے مقابلہ آرائی

ڈائری مورخہ ۲؍اگست ۱۸۴۸ء شیروان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل محمود، کرنل پرچپال سنگھ اور سردار چترسنگھ ہری پور میں تین دن رات باہم مشورہ کرتے رہے۔ ۱۲؍اگست ۱۸۴۸ء ناڑہ گندگر کی ڈائری کے مطابق سردار چترسنگھ نے کرنل بُدھ سنگھ مان (مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چچازاد بھائی) کو طعنہ دیا کہ اس کے خاندان کی خاطر اُس (چترسنگھ) نے بغاوت کی اور وہ (بدھ سنگھ مان) اس میں شامل ہو کر مدد دینے سے پہلو تہی کر رہا ہے۔

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری مورخہ ۲۹؍اگست ۱۸۴۸ء ناڑہ میں چترسنگھ کے ساتھ حسن ابدال کے قرب و جوار میں مقابلہ اور دیگر حالات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جس وقت جھنڈا سنگھ لاہور سے نمائندہ ہو کر آیا تھا۔ اُس وقت چترسنگھ کی حالت مایوس کن ہو چکی تھی۔ اُس کی پکھلی اور نواں شہر والی فوج مکمل طور پر محصور ہو چکی تھی۔ قلعہ اٹک ہمارے قبضہ میں تھا۔ مارگلہ کا درہ ہم نے (نکلسن نے) بند کر رکھا تھا۔ پرتاپ سنگھ کی فوج کو نکلسن نے اپنے قلعہ کو واپس بھیج دیا تھا۔ میں ہری پور کا محاصرہ کرنے والا تھا۔ اور چترسنگھ کو کوئی بیرونی امداد نہ مل سکی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فوج کسی کے حوالے کر کے خود بمعہ اپنے لڑکوں کے پہاڑوں میں چلا جائے۔ لیکن جھنڈا سنگھ (سکھوں کا ماہر سازشی اور بہتر کپتان) نے آ کر نئے سرے سے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ ادھر مجھے اطمینان دلایا کہ چترسنگھ صلح کر لے گا۔ میں نے اس کی بات کا اعتبار کر کے قلعہ کا پانی بند نہ کیا۔ حالانکہ نکلسن کی دھمکی نے جھنڈا سنگھ کو اطاعت پر مجبور کر کے واپس کیا تھا۔ اس گفت و شنید کے دوران چترسنگھ پکھلی کی فوج کو چھڑوانے کے لئے مضبوط ارادہ سے حملہ کے لئے تیار رہا۔ میں فوراً سلہڈ اور دھمتوڑ کے درّوں پر ان کا راستہ روکنے کے لئے پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر دوسرے دن نکلسن کا پیغام ملا کہ چترسنگھ ہری پور کی سب فوج کے ساتھ حسن ابدال کے لئے یکایک روانہ ہو گیا ہے۔ اور اس کو میری (نکلسن کی) لیوی (رنگروٹوں کی جماعت) نے موضع موڑہ (ڈنگی موڑہ - نزد حسن ابدال) کی گھاٹی (کھنڈر از نالہ کوہ) پر روک لیا ہے۔ لہٰذا میری (ایبٹ کی) تھوڑی سی فوج نے نکلسن سے جا ملنے کے لئے مارچ کیا۔ اور سخت دھوپ اور گرمی میں چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے چترسنگھ کی فوج کے عقب میں پہنچ گئی۔ دوسری صبح میں اس سے آگے نکل گیا۔ اس اثناء میں نکلسن اور چترسنگھ کے درمیان گفتگو جاری تھی۔ چترسنگھ نے بطور ضمانت اپنے لڑکے اوتار سنگھ (عطر سنگھ ؟) کو نکلسن کے پاس بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ جب چترسنگھ نے وعدہ ایفا نہ کیا تو میں نے نکلسن کی رائے کے مطابق ۲۲؍اگست ۱۸۴۸ء موضع موڑہ کے نالہ (کھنڈر) کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ تاکہ ہزارہ کی فوج (چترسنگھ کی فوج) کی رسد کا راستہ کاٹ دیا جائے۔ میں نے اس کھنڈر کا جو تیس فٹ گہرا تھا اور جس کی کئی شاخیں تھیں جائزہ لیا۔ تو اندازہ ہوا کہ یہ ماہر نشانہ بازوں کے لئے مورچہ کا کام دے سکتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں چترسنگھ کی فوج کو یہاں پر روک سکتا ہوں یا سخت نقصان پہنچا سکتا ہوں۔ آتے ہی نکلسن کا پیغام آیا۔ کہ اوتار سنگھ اس کے پاس حاضر ہو گیا ہے۔ چترسنگھ نے شکوہ کیا کہ میں نے اس کے لڑکے کے جانے کے بعد اس کا پیچھا کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے میری فوج کو نزدیک دیکھ کر ہی اپنے لڑکے کو نکلسن کے پاس بھیجا۔ نکلسن نے کہلا بھیجا کہ میں چترسنگھ کی رسد کا راستہ کھول دوں۔ میں اس پیغام

پر شتعل تھا۔ اگر میں نے پہلے سے نکلسن کے ساتھ اتفاق نہ کیا ہوتا تو میں یہ بات نہ مانتا۔

میں نے فوج کو واپس کرلیا۔ حالانکہ میری فوج کے لوگ بہت ناراض تھے اور ملامت کرتے تھے۔ اُن کا اعتماد مجھ پر نہ رہا۔ میں نے اپنا خیمہ سکھ فوج کے سامنے اونچائی پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں ان کے حرکات دیکھ سکتا تھا۔ اسی دن یعنی ۲۶ ر کو نکلسن نے اُن سے گفتگو کرنی تھی۔ مجھے سکھوں کے کیمپ میں دغابازی کے آثار نظر آئے۔ سورج غروب ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ جھنڈا سنگھ جب اپنے مشن سے واپس سکھ کیمپ میں پہنچا تو سکھ کیمپ نے مارچ کی تیاری شروع کردی۔ میں نے جلدی میں اپنے سپاہی (لیوی نئے بھرتی شدہ سپاہی) جو ادھر ادھر دیہات میں پھیلے ہوئے تھے جمع کئے۔ کیونکہ ان کے پاس خیمے نہ تھے کہ وہ میرے خیمہ کے اردگرد مقام کرسکتے۔ میں ان کو لے کر سکھوں سے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا اور جلدی سے موضع موڑہ کے نالہ میں داخل ہوگیا۔ تاکہ سکھوں کی توپیں نہ گزر سکیں۔ سکھ روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار تھے۔ سکھوں کا کیمپ نالے سے میرے مقابل کے فاصلے سے ایک چوتھائی تھا۔ میرے سپاہی جو روزہ کے سخت پابند اور روزہ سے تھے۔ پیاس سے بدحال ہورہے تھے۔ ان میں بہت سے اپنا کھانا تیار کررہے تھے۔ لہٰذا مجھے اپنی بندوق سے مسلح فوج جو دو ہزار تھی کے بڑے حصہ کو حرکت میں لانے کے لئے کافی وقت لگ گیا۔ روانگی پر میں نے اپنی فوج کو ہمت دلانے کے لئے کہا کہ رات کے اندھیرے میں توپ کی گولہ باری بے اثر ہوتی ہے۔ ہم بہت بہادری اور یقینی کامیابی کی امید پر حملہ آور ہوئے۔ اس نالہ سے پار ہونے کے لئے اس کے کنارہ پر پہلے قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اگر دشمن کا ہراول دستہ اس نالہ کو پہلے پار کرکے دوسرے کنارہ پر قبضہ کرلے، اور وہاں اپنی توپیں نصب کرلے تو دن کے وقت اپنی حفاظت مشکل ہوجاتی ہے۔ لیکن رات کے وقت مجھے بڑی امید تھی کہ میں ان کو اتنا نقصان پہنچا سکتا تھا جو ہمارے لئے بعد میں بہت فائدہ مند ہوتا۔ جب میں اپنے ایک سواروں کے دستہ کے ساتھ نالہ کے نزدیک پہنچا تو شام کی شفق کافی بڑھ چکی تھی۔ پیدل سپاہ ہمارے پیچھے، اکا دکا آرہی تھی۔ حالانکہ میں ان کو یکجا کرنے کے لئے بڑی کوشش کررہا تھا۔

اندھیرے میں جب میں نے سامنے دیکھا تو دو سیاہ پہاڑ نظر آئے میں سمجھا کہ دو ہاتھی آرہے ہیں۔ جن پر توپیں لدی ہوئی ہیں۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ میں ان کو اچانک پکڑ سکوں۔ اس سے پہلے ہماری تجویز یہ تھی کہ گھوڑے گاڑی کی آڑ میں پیادہ فوج آجانے تک، کھڑا رکھوں۔ جب میں ان کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دو دُور انداز توپیں (HOWITZERS) نصب ہیں اور وہ ہمارے سب راستہ پر دھڑا دھڑ فائر کرنے لگ پڑی ہیں۔ میں نے رسالہ ایک اوٹ

میں کھڑا دیا۔ اور پیدل سپاہ کی طرف لوٹا۔ اور اُن کو نالہ میں چھپ جانے کا حکم دیا۔ آہستہ آہستہ اُن کو اس لے گیا۔ میں اپنے دو ہزار تنخواہ دار اور صرف روٹی پر خوانین کے آدمیوں میں سے اس ناگہانی حملہ کے وقت صرف آٹھ سو سپاہی ہی اکٹھے کرسکا۔ جو میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوسکتے تھے۔ اور میرے پیچھے دست بدست لڑائی کے لئے آسکتے تھے۔ ہمارے توپوں تک پہنچنے سے قبل ہی سب سکھ فوج نالہ پار کرکے میدان میں آ کھڑی ہوئی۔ اور سخت اندھیرے کی وجہ سے ہم اُن کے موقعہ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اس عالم میں میرے آدمیوں نے بہت سی گولیاں اندھا دھند فائر کرکے ضائع کردیں۔ حالانکہ ان کو سنبھال کر رکھنے کی سخت ضرورت تھی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں اپنی سب پیادہ فوج سکھوں سے دست بدست لڑائی کے لئے نہیں لاسکتا تو میں اپنی سب فوج کو صبح کے وقت مارچ کرا کر کیپٹن نکلسن کے کیمپ میں لے گیا۔

اُس وقت پرتاب سنگھ کی فوج معہ دو توپوں اور چار سو سپاہیوں کے درہ مارگلہ سے گزر کر چلی گئی تھی۔ ہم نے مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ حسن ابدال جاکر حالات کا جائزہ لیں۔ اگر ہم دونوں مل کر حملہ کرسکتے ہیں تو ایسا کریں۔ نہیں تو اپنے اپنے علاقہ کو واپس چلے جائیں۔ اور ہزارہ اور اٹک کو قابو میں رکھنے کی کوشش کریں۔ وہاں پہنچنے پر ہماری یہ رائے قرار پائی۔ کہ ہم ایک دن سے زیادہ سکھوں کی چار رجمنٹوں، چار سو بے قاعدہ سپاہیوں اور آٹھ توپوں کا مقابلہ صرف ایک دن ہی کرسکتے ہیں۔ لہٰذا اپنی دونوں فوجوں کو شکست سے بچانے کے لئے ہمیں واپس جانا چاہئے۔ لہٰذا میں ۲۸ راگست صبح کوٹ نجیب اللہ کے لئے روانہ ہوا۔ جانے سے پہلے ہم دونوں (میں اور نکلسن) اس بات پر متفق ہوگئے کہ سردار جھنڈا سنگھ ہی ہماری موجودہ تکلیفات کا باعث ہے اور اس کو موقوف کردینا چاہئے۔ میں نے اس کی موقوفی کے حکم پر دستخط کرکے خط بند کردیا۔ لیکن بعد میں نکلسن نے اس پر ترس کھاکر اس پر عمل نہ کیا۔ اور میرے لئے انتہائی پریشانی پیدا کرکے اس کو وہاں ہی رہنے دیا۔ اب میں اس سے سخت نتائج کے برآمد ہونے سے فکرمند ہوں۔

سردار جھنڈا سنگھ نے سردار گلاب سنگھ کا ایک خط دکھایا کہ سردار اوتار سنگھ (پسر چتر سنگھ) کو لاہور بھیج دیا جائے۔ ہم دونوں۔ میں اور کیپٹن نکلسن۔ نے اس تجویز کو بہتر سمجھا اور سردار اوتار سنگھ کی مرضی سے اس کو لاہور بھیج دیا۔ راستہ میں وہ اپنی خوشی سے باپ سے مل گیا ہے۔ یا باپ نے راستہ روک کر اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ہر دو حالت میں یہ جھنڈا سنگھ کی کارستانی اور نئی غداری ہے۔ جھنڈا سنگھ کا ہزارہ کی فوج کو خاموش اور مطمئن کرکے اپنی جگہ پر بٹھانا۔ ایک بہانا تھا۔

بلکہ وہ سازش کے لئے آیا تھا — میں نے قلعہ ہرکشن گڑھ (قلعہ ہری پور) کے نزدیک کیمپ لگایا ہے اور صبح اس پر حملہ کروں گا۔"

۴ ستمبر ۱۸۴۸ء تارہ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "کیپٹن نکلسن اٹک کی طرف چلا گیا ہے۔ چتر سنگھ بھی اس کے پیچھے ۲۲ اگست ۱۸۴۸ء کو روانہ ہو گیا۔ مگر پشاور سے کسی امید پر امداد نہ ملنے کی وجہ سے واپس آگیا ہے اور پھر حسن ابدال پر قبضہ کر لیا ہے اور کل (۳ ستمبر ۱۸۴۸ء) آٹھ میل دور کیمپ لگایا تھا۔" ڈائری مورخہ ۷ ستمبر ۱۸۴۸ء تارہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سردار چتر سنگھ پوری طرح مخالفت میں سرگرم ہو گیا ہے۔ اور اس نے مارگلہ کا ایک برج جلا دیا۔ اور پھر اپنی فوج کے ساتھ پکھلی کی فوج کا راستہ کھولنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ میجر ایبٹ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ "میں اس کا راستہ روکنے کے لئے پکھلی اور دھمتوڑ کے لوگوں کو جمع کر رہا ہوں۔ اور ان کو ہمت دلانے کے لئے اعلان کر رہا ہوں کہ انگریزی فوج ہزارہ کے لئے روانہ ہو چکی ہے۔ توپوں سے مسلح مضبوط فوج کے ساتھ ہم کو مقابلہ کرنا ہو گا۔ جس میں آٹھ سو سپاہی مسلح۔ دو سو سوار، چار توپیں اور بیس زمبورے ہیں۔ تربیلہ۔ بھارہ کوٹ، غازی، ماڑی، چھچھیاں، اور خان پور کے قلعے، تھوڑے سے محاصرہ کے بعد فتح کر لئے گئے ہیں۔ اور دوسرے قلعوں پر حملے جاری ہیں جو قلعے وفادار ہیں ان پر حملہ مقصود نہیں لیکن بعض قلعوں پر حفاظت خود اختیاری کے لئے قبضہ ضروری ہے قلعہ سید پور (نزد خان پور) چتر سنگھ کا تھا۔ وہ میرے علم کے بغیر ہی محاصرہ کے بعد فتح کیا جا چکا ہے۔"

آگے چل کر پھر اسی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "چتر سنگھ اپنی بڑی توپیں اور فالتو سامان سرائے کالا نزد ٹیکسلا میں چھوڑ کر، چھ توپوں، چھ سو سواروں اور کافی پیدل سپاہیوں کے ساتھ ایک ہی مارچ میں ۱۵ میل کا فاصلہ طے کر کے ہری پور پہنچ گیا ہے۔ نکلسن اس مارچ کا سن کر روانہ ہو گیا اور راتوں رات ۲۵ میل کا فاصلہ طے کر کے اس سے آگے ہو گیا ہے۔ میں سلہڈ کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔"

۹ ستمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں ریذیڈنٹ کو لکھتا ہے کہ "درہ سلہڈ اور دھمتوڑ پر پوری حفاظت نہ تھی۔ سلہڈ پر صرف پچاس آدمی تھے۔ حالانکہ اس جگہ پر سات آٹھ سو آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اور درہ دھمتوڑ پر کوئی مسلح آدمی نہ تھا۔ حسن علی خان کرڑال باوجود صاف اور صریح حکم کے اپنے آدمی واپس لے گیا۔ میں نے سات سو آدمی سلہڈ میں مقرر کر دئے ہیں اور اب دھمتوڑ انتظام کے لئے جا رہا ہوں۔" وہاں پہنچ کر لکھتا ہے کہ "نکلسن اپنے نو سو پیدل سپاہیوں اور تین سو سواروں کے ساتھ دھمتوڑ میں آکر مجھ سے مل گیا۔ واقف کار لوگوں سے مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ اس طویل لائن کی حفاظت گیارہ سو سے کم سپاہیوں سے نہیں ہو سکتی۔ نکلسن یہاں ٹھہرنا چاہتا تھا میں نے اس کو

فوراً واپس کرنا چاہا۔ میری رائے تھی کہ دشمن کو راستہ دینا چاہئے۔ لیکن نکلسن نے مجھ سے اتفاق نہ کیا۔ اور دشمن سے مقابلہ کرنا چاہا۔ اس کے سپاہی حوصلہ مند ہیں۔ اور مزید کہا کہ وہ اس طرح سے نواں شہر کے چار سو سپاہیوں کو عقب پر حملہ کرنے سے روک لے گا۔ اور مجھے دشمن کے پہلو پر حملہ کرنے میں مدد دے گا میں اس پر عمل کرنے کو خودکشی سمجھتا ہوں۔"

ایبٹ اپنی ڈائری مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۴۸ء سلہڈ میں لکھتا ہے کہ "جب سکھ فوج روانہ ہوئی تو میں نے اپنے سات سو آدمی جمع کئے۔ اور سکھ فوج کو رجوعیہ میں۔ دھمتوڑ سے چھ میل کے فاصلہ پر جا لیا۔ سکھ فوج نے رجوعیہ میں مقام کیا۔ میں واپس دھمتوڑ چلا گیا۔ اور نکلسن سے مل گیا۔ وہ آج ہم پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ میں نے درہ سلہڈ خالی کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ درہ سلہڈ کو مڑ جائیں گے۔ لہذا ان کو درہ سلہڈ سے روکنے کے لئے میں نے چار سو مسلح سپاہی سلہڈ کو روانہ کر دئے ہیں۔ اب سکھ فوج جو تعداد میں ہم سے تین گنا ہے، اور جس میں چار ہزار سپاہی اور دس توپیں ہیں، ہمارے سامنے اور نزدیک ہے اور مقابلہ پر ملکی سپاہی ہیں۔ نہ معلوم یہ ان کے مقابلہ پر ٹھہر سکیں گے یا نہ۔" اس کے بعد میجر ایبٹ کی آویزش سکھوں سے سربن پہاڑ (بالمقابل ایبٹ آباد) میں ہوئی۔ وہ اپنی ڈائری مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۴۸ء دھمتوڑ میں لکھتا ہے کہ "سکھ فوج چار ہزار سے زیادہ تھی اور توپوں سے لیس تھی اور رجوعیہ سے روانہ ہو کر سربن پر چڑھ کر سلہڈ کو آرہے تھے ان کو روکنے کے لئے سربن پر میجر ایبٹ صبح سویرے آدمی متعین کر کے خود دوسرے مورچے کے انتظام میں لگ گیا کیونکہ سکھوں کی فوج سویرے ہی حرکت میں آگئی تھی۔ اور سکھ فوج کا ہراول دستہ اس کے سامنے سربن پر چڑھ رہا تھا اور سلہڈ کو جانے کے لئے پیش قدمی کر رہا تھا۔ ایبٹ لکھتا ہے کہ "میں نے پچاس آدمی سربن پہاڑ کی چڑھائی کے نصف پر ایک گاؤں میں بٹھا دئے۔ اور پھر وہاں سے واپس اپنی فوج کی طرف جو عقب میں تھی آنے لگا۔ تو فتح خان گھیبہ کے آدمیوں نے جو سربن کی چوٹی پر تھے مجھے آواز دی کہ اگر میں واپس گیا تو ہمارے یہ سب لوگ بھاگ جائیں گے۔ ان کی گھبراہٹ دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ اور اپنی فوج میں نہ آسکا۔ کہ کہیں یہ سب لوگ بھاگ نہ جائیں۔ اور سب فوج پر برا اثر پڑے۔" آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "جب سکھ فوج نزدیک آگئی تو ان چوٹیوں پر جہاں میں اور فتح خان گھیبہ کھڑے تھے۔ توپ کے گولے برسانے شروع کر دئے۔ ایک گولہ عین میرے سر پر سے گزرا۔ شاید سکھوں نے میرے سرخ وردی والے اردلیوں کی وجہ سے مجھے پہچان لیا۔ میرے سامنے اونچے پہاڑ پر نکلسن نے پشاوریوں کی چوکی بٹھا رکھی تھی۔ وہاں جنگل بھی تھا اور محفوظ مقام تھا۔ لیکن یہ لوگ شاید رشوت لے کر رات ہی کو چوکی خالی کر گئے۔ صبح کے وقت جب نکلسن ان کی امداد کے لئے پچاس آدمی اور لے کر گیا تو چوکی خالی تھی۔

اور وہ سب بھاگ چلے تھے۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ سکھوں کا ایک دستہ چوٹی کے نزدیک آگیا ہے تو وہ ...ی سے اور سپاہی لے جانے کے لئے واپس آیا۔ اس اثناء میں وہ پچاس آدمی مقابلہ پر ڈٹے رہے لیکن جب سکھ دس قدم دور رہ گئے تو وہ بھاگ آئے۔ اُن کے بھاگنے سے ہماری سب فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ ان میں سے بہتوں نے دشمن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ سکھوں نے اس چوٹی پر قبضہ کر لیا جس پر ہم قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان حالات میں ہم کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ میں مشکل سے نکلسن کو جا کر ملا۔ جو اپنے رسالہ کے پاس ہماری پسپائی کی لائن پر کھڑا تھا۔ ہم سالہڈ کے راستہ سے واپس ... آئے میں ناڑہ (گندگر) میں آگیا۔ نکلسن اپنے ضلع (پوٹھوار) کو چلا گیا۔ لفٹیننٹ رابنسن بھی میرے پاس آگیا۔

٢٠ ستمبر ١٨٤٨ء کو چتر سنگھ بھی اپنی فوج کے ساتھ ہری پور پہنچا۔ یعنی سریکن پر مقابلہ سے ٩ دن بعد

ڈائری مورخہ ٢٣ ستمبر ١٨٤٨ء۔ ناڑہ۔ کے مطابق چتر سنگھ ہری پور میں تھا اس نے شیروان کا قلعہ لینے کی کوشش کی لیکن تنولیوں نے اُسے مار بھگایا۔ پھر لکھتا ہے۔ کہ ٢٠/٢١ ستمبر ١٨٤٨ء کو اوتار سنگھ (عطر سنگھ) پسر چتر سنگھ نے قلعہ سید پور (نزد خان پور) پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اس کی حملہ آور فوج کے لیڈر کا سر ملکی لوگوں نے کاٹ کر میجر ایبٹ کے پاس ناڑہ کے مقام پر بھیج دیا۔ وہاں پر میجر ایبٹ کے آدمیوں نے تجویز کیا کہ حسب رواج زمانہ اس سر کو بانس پر لگا کر تشہیر کی جائے لیکن میجر ایبٹ نے کہا کہ "ہم ایسی کمینہ حرکات نہیں کرتے اور نہ ہم بیواؤں اور یتیموں کے خلاف جنگ کرتے ہیں" اور حکم دیا کہ اس سر کو شریفانہ طور پر سکھوں کی رسوم کے مطابق جلا دیا جائے۔

٢٠/٢١ ستمبر ١٨٤٨ء کی ڈائری ناڑہ میں لکھتا ہے کہ "چتر سنگھ ٢٠ ستمبر کو ہری پور پہنچا۔ وہ ناڑہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میرے آدمی اس کی گردن توڑ دیں گے۔ اس کے پاس گیارہ توپیں اور چالیس زنبورے ہیں" ٢٤ ستمبر ناڑہ۔ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "ہم چتر سنگھ کے حملہ کے منتظر ہیں۔ لوگوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ آخر دم تک میرے ساتھ رہیں گے۔ یہ مضبوط جگہ ہے تاریخ میں صرف ایک دفعہ ہی، بہت زیادہ فوج، اور غداری سے اس پر فتح حاصل کی جا سکی تھی۔ مجھے امید ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے۔ میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ فتح کی صورت میں چتر سنگھ اور اس کے حواری ختم ہو جائیں گے۔ اگر میں شکست کھا گیا اور مارا گیا تو یہ موت میری قوم کے ایک بہت حقیر فرزند (LEAST WORTHY OF HER SONS) کی موت ہوگی۔

٢٦ ستمبر ١٨٤٨ء ناڑہ۔ "چتر سنگھ کی فوج میں بے اتفاقی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ تو انگریزی فوج کی فتح ملتان کی خبر سے اور کچھ سپاہیوں کو تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے۔" "ہری پور میں میرے دو بنگلوں کو بمعہ میرے اور

رابنسن کے ذاتی اور سرکاری سامان کے سکھوں نے لُوٹ کر تباہ کر دئیے ہیں۔ چتر سنگھ ابھی ہری پور میں ہے۔

٢٩ ستمبر ١٨٤٨ء ناڑہ کی ڈائری میں لکھتا ہے۔ کہ "آج چتر سنگھ اپنی فوج سمیت چھچھ کو روانہ ہو گیا اور ٧ میل پر جا کر مقام کیا۔ یہاں وہ میرے ایک ہزار بندوقوں سے مسلح آدمیوں پر اپنی چھ رجمنٹ رسالہ اور توپوں سے حملہ کی جرأت نہ کر سکا۔ اور اپنا غصہ میرے ہری پور والے بنگلوں پر نکالا۔

چتر سنگھ نے یہاں سے جاتے وقت جن لوگوں کو قلعہ میں مقرر کیا تھا وہ اس کے ہری پور سے ایک میل تک جانے کے بعد ہی سے قلعہ خالی کر کے بھاگ گئے۔

میجر ایبٹ کی ڈائری مورخہ ٨ اکتوبر ١٨٤٨ء سے معلوم ہوتا ہے کہ چتر سنگھ شمس آباد میں تھا اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سربراہ کی حیثیت سے احکام جاری کرتا رہا۔ ٢٠ اکتوبر ١٨٤٨ء کو چتر سنگھ پتھر گڑھ، ١٠ نومبر ١٨٤٨ء شمس آباد، ١٠ دسمبر ١٨٤٨ء جہانگیرہ میں تھا۔ اور امیر دوست محمد خان والی کابل کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار رجمنٹ فوج تھی۔ جو رچھپال سنگھ، بابو پانڈے اور شاید بدھ سنگھ کی فوج پر مشتمل تھی۔ اس کا ایک دستہ جھنگ باتر اور ایک حسن ابدال میں ہے۔ وہ ٢٩ دسمبر ١٨٤٨ء تک مانسہرہ کیمپ میں تھا۔ اور ١٧ جنوری ١٨٤٩ء کو مانسہرہ سے سید حالا ... پہنچا۔ اور وہاں کے صرافوں سے جبراً آٹھ ہزار روپیہ لے کر جہلم چلا گیا۔

ضلع ہزارہ میں سکھوں کے قلعے

میجر ایبٹ کی ڈائری کے مطابق مندرجہ ذیل قلعے تھے:-

تحصیل ہری پور - غازی - مسلم گھنڈ - بھاروکوٹ - تربیلہ - ہری پور - ڈناہ (لورا) خانپور - سید پور - سریکوٹ (یہ قلعہ از سر نو میجر ایبٹ نے اپنی زیر نگرانی بنوایا۔ اور ٢٨ اپریل ١٨٤٩ء کو اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔

تحصیل ایبٹ آباد - نواں شہر - شیروان - تحصیل مانسہرہ - گاندھیاں (ہزارہ کی فوج کا مرکز) شنکیاری۔

میجر ایبٹ کے وقت ضلع ہزارہ و ملحقہ علاقہ جات کے سکھ فوجی افسران

١۔ کرنل بھوپ سنگھ مان۔ کمانڈر پکھلی بریگیڈ۔ متعینہ گاندھیاں، یہ کرنل مان سنگھ کا بھتیجا تھا اور میجر ایبٹ اس کو قابلِ اعتبار اور معزز آدمی سمجھتا تھا۔ بھوپ سنگھ اور مان سنگھ دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خاندان سے تھے۔ ٢۔ ایڈجوٹنٹ جنرل ارجل سنگھ۔ ٣۔ کرنل دھاڑا سنگھ۔ ٤۔ دیوان کرم چند۔ بہت مدت پکھلی میں رہا۔ بعد میں مہاراجہ کشمیر کی فوج کا کمانڈر ہو گیا۔ ٥۔ کرنل امیر چند۔ ٦۔ جنرل محمود شاہ ہزارہ کے توپ خانہ کا افسر اعلیٰ۔ ٧۔ سردار لال سنگھ۔ ٨۔ کرنل بدھ سنگھ کمانڈر پکھلی۔ ٩۔ بہادر سنگھ۔ ١٠۔ کرنل پرتاب سنگھ

کمانڈر افواج کہوٹہ (ضلع جہلم) ۱۱۔ کرنل بابو پانڈہ۔ کمانڈر فوج حسن ابدال۔ ۱۲۔ جنرل کاہن سنگھ۔ ۱۳۔ کرنل رچپال سنگھ۔ ۱۴۔ کرنل نورالدین افسر توپ خانہ، مسل رسالہ کھیلی۔ ۱۵۔ کرنل بالا سنگھ افسر توپ خانہ ہری پور ۱۶۔ سردار جھنڈا سنگھ افسر توپ خانہ شیروان۔ اس فہرست میں توپ خانہ کے دو افسر مسلمان ہیں اور جنرل الٰہی بخش خان مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مرکزی محکمہ توپ خانہ کا افسر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان توپ خانہ کے محکمہ پر چھائے ہوئے تھے۔

سکھوں کے عہد کے مظالم

بہ روایت میجر ایبٹ

ڈائری مورخہ ۶ مئی ۱۸۴۶ء میں وہ لکھتا ہے کہ "ضلع ہزارہ میں گائے کا ذبیحہ سکھوں کے عہد میں بند تھا" پھر حسرت کے ساتھ وہ لکھتا ہے کہ "میں آخری وقت تک (یعنی سکھوں کے عہد میں) اس پابندی کو دُور نہ کر سکا"۔ ڈائری ۱۴ مئی ۱۸۴۶ء میں لکھتا ہے کہ "ہری پور میں مسجد و مندر ساتھ ساتھ ہیں۔ اذان وقت سنکھ بجانے پر جھگڑا ہو گیا۔ سکھ ہندوؤں کی جانب داری کرتے ہیں۔ لہذا ہندو دلیر ہیں۔ میں نے سنکھ بجانے کا وقت بدل دیا ہے"۔ ڈائری مورخہ ۹ جون ۱۸۴۶ء میں رقمطراز ہے کہ "مانسہرہ کے قلعدار نے اذان بند کر دینے کا حکم دیا۔ اور مُلّا کو بے عزت کیا۔ ملتان کے حالات کی وجہ سے قلعدار دلیر ہو گیا۔ میں تفتیش کر رہا ہوں اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو قلعدار کو میں ہتھکڑی لگاؤں گا۔ کیونکہ اُس کے اس عمل سے ملک میں بغاوت پھیل سکتی ہے"۔

مہاراجہ گلاب سنگھ

ایبٹ کی ڈائری کے آئینہ میں

ڈائری مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۴۶ء ——— "یہ چتر سنگھ کا دلی دوست ہے۔ اور میاں جواہر سنگھ پسر دھیان سنگھ مہاراجہ پونچھ سے خائف ہے۔ کیونکہ جواہر سنگھ کشمیر میں گلاب سنگھ کی فوج میں ہر دلعزیز ہے۔ اور سب ڈوگرہ قوم کی ہمدردی میاں جواہر سنگھ کے ساتھ ہے۔

۲۔ سلطان حسین خان بمبہ والئ مظفر آباد پر گلاب سنگھ حملہ کرنا چاہتا ہے لیکن میرے ڈر سے یہ اقدام سے ہچکچاتا ہے۔ ۳۔ راجہ کرناؤ (علاقہ سرحد کشمیر) شیر احمد خان جو بموجب معاہدہ گلاب سنگھ کا باجگذار ہے۔ گلاب سنگھ اس پر حملہ کر کے اس کے علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو لکھا ہے کہ بموجب معاہدہ وہ اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے علاقہ پر قبضہ کر کے الحاق کرے گا۔ تو وہاں قبضہ رکھنے کے لئے فوج اور فوج رکھنے پر پانچ گنا زیادہ خرچ (یعنی اس علاقہ کی آمدنی سے پانچ گنا زیادہ) آئے گا۔ اور یہ اُس کے لئے مفید نہیں۔ گلاب سنگھ نے حملہ کرنے کے لئے یہ عذر تراشا ہے کہ راجہ کرناؤ نے ایک کھتری کی خونریزی کی ہے۔ اب ریذیڈنٹ کی خواہش پر گلاب سنگھ نے حملہ کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔

ڈائری مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء "دیوان جوالا سہائے کی لاہور میں موجودگی، اُس کے آقا گلاب سنگھ کے اخلاص عمل کی نشانی ہے۔ مہاراجہ کا تعلق، اپنے اس نوکر سے بہت گہرا ہے اور وہ اس پر بہت اعتماد کرتا ہے۔

کرنل کنارا

اور اس کے قتل کی تفصیل

ڈائری ۶ اگست ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ۔ میں میجر ایبٹ لکھتا ہے کہ "سیر سے واپس آنے پر کرنل کنارا کی طرف سے اطلاع آئی کہ چتر سنگھ نے اس کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج اور توپوں کو شہر سے باہر لائے اور کیمپ لگائے۔ کنارا نے انکار کیا کہ میرے (میجر ایبٹ) حکم کے بغیر ایسا کرنا بغاوت کا اقدام ہو گا لہذا اس نے مجھ سے حکم مانگا ہے کہ وہ ایسی حالت میں کیا کرے۔ اس اثناء میں اُس کا سکھوں سے مقابلہ ہو گیا۔ سردار چتر سنگھ نے دو کمپنیاں بھیجیں کہ وہ توپیں جبراً لے آئیں۔ اس پر کرنل کنارا نے توپ میں خود بارود ڈال دیا اور گولہ انداز کو حکم دیا کہ توپ چلاؤ لیکن وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ اور یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ وہ سردار کے نوکر ہیں۔ حوالدار کے پیہم انکار کرنے پر کرنل کنارا نے اس کو قتل کر دیا اور خود بتی لگائی۔ اتنے میں دو سپاہیوں نے فوراً اس پر فائر کر دئیے۔ اس پر کرنل نے ... اور ایک حملہ آور کو قتل کر دیا۔ مگر دوسرے نے کرنل کنارا کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ اس طرح سے ایک ایسا بہادر آدمی مر گیا جس میں گو تعلیم کی کمی اور دیگر فطری کمزوریاں تھیں لیکن بہادر اور وفادار اعلیٰ درجہ کا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کے لڑکوں کو جولاہور میں ہیں مناسب امداد دی جائے گی۔ مزید یہ کہ میں اُس کے قتل کا بدلہ لینے کی سفارش کرتا ہوں"۔

ڈائری مورخہ ۹ اگست ۱۸۴۸ء۔ ناڑہ میں لکھتا ہے کہ "اس واقعہ کے بعد سردار چتر سنگھ فوجوں کو اپنی امداد کے لئے بلا رہا ہے حالانکہ میں نے اس کو یقین دلایا ہے کہ اگر وہ کرنل کنارا کے قاتلوں کو میرے حوالے کر دے تو میں سب ملک میں دو چپڑاسیوں کے ذریعہ سے امن بحال کرا دوں گا"۔ ڈائری ۱۳ اگست ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ "چتر سنگھ پر حملہ کرنے سے پہلے اس کے وکیل کو مندرجہ ذیل شرائط صلح دے کر بھیجا گیا ہے:۔

۱۔ کنارا کے قاتل میرے حوالے کئے جائیں اور اس مقدمہ کا فیصلہ میں کروں گا۔ ۲۔ سب افواج اپنی چھاؤنیوں کو چلی جائیں۔ ۳۔ مہلت صرف ایک دن کی ہے۔

کرنل بھوپ سنگھ سے بھی جواب طلب کیا گیا اور اس کو کہا گیا کہ اگر اس کی افواج اپنی چھاؤنی میں رہیں تو محاصرہ والے دستے کھول دیئے جائیں گے اور تنخواہ افواج بھیج دی جائے گی۔ اشتہار بھی دیا گیا ہے کہ جو فوجی چھاؤنیوں سے آ گئے ہیں اگر وہ واپس چلے جائیں تو اُن کو معاف کر دیا جائے گا۔ سردار چتر سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باغی ہے۔"

لفٹیننٹ ہربرٹ

سردار چتر سنگھ کے اٹک پر حملہ کرنے کے وقت یہ قلعہ کا افسر انچارج تھا۔ سکھوں نے بہت عرصہ تک قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا۔ لیکن اس افسر نے بڑی دلیری اور استقلال سے قلعہ کو محفوظ رکھا۔ چونکہ خشکی کے سب راستے سکھوں نے بند کر رکھے تھے لہٰذا اس کو راشن پہنچانے کے لئے میجر ایبٹ نے تربیلہ سے بذریعہ کشتی سامان رسد وغیرہ بھیجنے کا انتظام کیا۔ اس کشتی میں غزن خان بن منیر خان ہیتی ایک انگریز کی معیت میں جا رہا تھا۔ قلعہ کے نزدیک کشتی پہنچی تو بڑے مشہور پتھروں سے جو آج تک بھی وہاں موجود ہیں ٹکرائی اور غزن خان ڈوب گیا۔

لفٹیننٹ ہربرٹ کے متعلق میجر ایبٹ کی ڈائری سے حالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

لفٹیننٹ ہربرٹ ۲۲ ستمبر ۱۸۴۸ء سے ۱۶ اکتوبر ۱۸۴۸ء قلعہ میں محصور رہا۔ قلعہ کے سامنے سکھوں کی بحیثیت فوج کے دو دستے کرنل رچپال سنگھ، پرتاپ سنگھ اور بدھ سنگھ کی رجمنٹیں بمعہ دس توپوں کے محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ گاہے گاہے توپ کے فائر بھی ہوتے رہتے تھے۔

میجر ایبٹ لکھتا ہے کہ قلعہ اٹک کی دیوار ۲۵ فٹ اونچی ہے اور گھڑے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ میجر ایبٹ نے جب سنا کہ لفٹیننٹ ہربرٹ کی فوج کے کچھ آدمی چتر سنگھ کی طرفداری کرتے ہوئے غداری کریں گے اور قلعہ کا دروازہ کھول دیں گے تو اس نے ہربرٹ کو لکھا کہ وہ قلعہ کے دروازہ کو دس بارہ فٹ اونچی پتھر کی دیوار بنا کر بند کر دے۔ جو اس نے بنا دی۔ اور اس قلعہ کے دروازہ پر قابلِ اعتبار گارڈ بمعہ توپ کے مقرر کر دے اور اس بات کا خیال رکھے کہ گولہ انداز غداری سے غلط سمت میں گولے نہ پھینکے۔ آخر کار ڈائری مورخہ ۴ جنوری ۱۸۴۹ء کے مطابق لفٹیننٹ ہربرٹ اپنے چھ ساتھیوں سمیت بذریعہ جالا دریا پار کر کے بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔

خوانین ہزارہ

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری میں جا بجا خوانین ہزارہ کا ذکر بھی کیا ہے چند ایک مندرجات یہ ہیں:۔

راجہ علی گوہر خان گکھڑ و جلال خان گکھڑ

علی گوہر خان کے متعلق لکھتا ہے کہ اس کی خط و کتابت سردار چتر سنگھ کے ساتھ ہے اور وہ اس کا ہمراز ہے۔ [illegible] جنوری ۱۸۴۹ء کی تاریخ کے تحت لکھتا ہے کہ "جلال خان گکھڑ کو امیر دوست محمد خان نے مہاراجہ کشمیر (گلاب سنگھ) کے پاس بھیجا ہے تاکہ مہاراجہ سے امیر کے لئے روپیہ کی امداد حاصل کرے۔ امیر دوست محمد خان نے دیگر خوانین ہزارہ کو بھی اطاعت کے لئے پروانے بھیجے ہیں۔"

۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کی تاریخ کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "جلال خان مہاراجہ کا پیغام لے کر امیر کے پاس واپس آ گیا ہے۔ جتنے دن وہ کشمیر میں رہا مہاراجہ کی طرف سے اُس کو پانچ روپیہ روزانہ خرچہ ملتا رہا۔"

ڈائری مورخہ یکم اپریل ۱۸۴۸ء "میدان ہزارہ کے سب خوانین دُرّانیوں سے مل گئے تھے۔ اور اب ہماری فتح کے بعد سب دریائے سندھ کے پار رہتے ہیں۔" مزید لکھتا ہے کہ "ہزارہ میں مشوانی قوم سب سے زیادہ بہادر قوم ہے۔" "یہ قوم میجر ایبٹ کی مخلصانہ طور پر وفادار رہی۔" ڈائری مورخہ ۴ اپریل ۱۸۴۸ء "جہانداد خان والیِ امب کالا ڈھاکہ کے لوگوں کو اگرور پر حملہ کرنے کے لئے اُکسا رہا ہے۔" ڈائری مورخہ ۸ مئی ۱۸۴۸ء "خانی زمان خان طاہر خیلی ہماری مخالفت پر نواب امب کو اپنی رعیت پر ظلم و زیادتی کی ترغیب کے [illegible] اثر کرتا ہے۔" مزید لکھتا ہے کہ "جہانداد خان کا چچا نواب خان بھاگ کر میرے پاس پناہ لینے کے لئے آ گیا ہے۔ اور وہ شکایت کرتا ہے کہ بارہ سو روپیہ کی جاگیر اُس کے لئے کافی نہیں۔" اپنی ڈائری مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء میں فتح خان ٹوانہ کے قتل کا ذکر کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "میں نے اِن ہی دنوں میں اسے مطلع کیا تھا کہ وہ محتاط رہے۔ کیونکہ سکھ اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا خط اس کو بروقت نہ مل سکا اور وہ قتل کر دیا گیا۔" ۲۹ ستمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "خانی زمان خان طاہر خیلی چتر سنگھ سے ساز باز کر رہا ہے اور اس کا ایک خط بنام چتر سنگھ پکڑا گیا ہے۔" آگے چل کر لکھتا ہے کہ "انہی ایام ۱۸۴۸ء میں ترس کھا کر میں نے اس کی اور سب تاہر خیلیوں کی جاگیر واگذار کر دی تھی۔" پھر لکھتا ہے۔ "فتح خان گھیبہ نے (فتح جنگ کا شہر اس کے نام پر آباد ہوا۔ ش ب) جس کی ضبط شدہ جائداد نکلسن نے واگزار کر دی تھی۔ چتر سنگھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ (فتح خان) نکلسن کو قتل کرا دے گا۔ ہم ایسے لوگوں کے درمیان کام کر رہے ہیں۔" ۱۳ مئی ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "کرڑالوں کے چیف سردار حسن علی خان جس نے سونڈوں کو مالیہ نہ دینے پر اُکسایا تھا۔ میرے سمن پر حاضر ہوا۔ ہزارہ کے خوانین میں یہ سب سے زیادہ [illegible] ہے۔ (میجر ایبٹ کا یہ قول خلاف واقعہ ہے اور اس کی شدید ناراضی کا مظہر ہے۔ ش ب)

امیر دوست محمد خان

امیر کے متعلق میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔ کہ وہ چتر سنگھ کی بغاوت کے دوران، اس (چتر سنگھ) کی دعوت پر ہزارہ پر حملہ آور ہونے کی غرض سے کابل سے آیا۔ میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق امیر دوست محمد خان ۲۰ دسمبر ۱۸۴۷ء پشاور پہنچا۔ اور قلعہ بالا حصار پر قبضہ کر لیا۔ بارک زئی سردار (سردار یار محمد خان وغیرہ) اپنی جاگیروں (کوہاٹ، ڈیرہ اسمٰعیل خان) کی طرف بھاگ گئے۔ اُس نے اپنے پوتے...... پسر محمد اکبر خان کو پشاور کا افسر عدالت اور لڑکے حیدر خان کو گورنر مقرر کر دیا۔ چتر سنگھ نے امیر دوست محمد خان کو جہلم تک کا علاقہ حوالہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ شرائط پیش کرنے میں مخلص نہ تھا۔ بلکہ اس نے یہ وعدہ بارک زئی سرداروں کو ڈرانے کے لئے کیا تھا۔ تاکہ یہ سُن کر بارک زئی سردار میجر لارنس کو اُس (چتر سنگھ) کے حوالہ کر دیں۔ جب چتر سنگھ کا یہ مقصد پورا ہو گیا تو امیر کو درخواست کی کہ وہ اب نہ آئے۔ لیکن امیر نے جواب دیا کہ اس نے فوج جمع کرنے پر بہت خرچ کیا ہے اور اب وہ کابل سے کافی دور ادھر آ گیا ہے۔ لہٰذا اب واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امیر کے ساتھ تین ہزار سپاہی اور توپیں بھی تھیں۔ اس نے ۲۶ دسمبر ۱۸۴۸ء کو خیر آباد کے قلعوں سے اٹک کے قلعہ پر گولے برسائے تھے۔ اور ۳۰ دسمبر ۱۸۴۸ء کی ڈائری میں وہ لکھتا ہے کہ "ایک ماہ ہوتا ہے کہ امیر کے ادھر آنے پر میجر ایبٹ نے اس کو ایک خط لکھا تھا کہ "امید ہے کہ وہ دوستانہ ارادہ سے ادھر آیا ہے۔ مگر اس کا جواب ظاہر کرتا ہے کہ وہ پشاور، ڈیرہ جات اور ہزارہ کی ملکیت کا دعوٰی دار ہے۔ اور وہ یہ علاقے اپنی فوج کے زور سے لے لے گا۔ اس کے بعد وہ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان خوشی سے صلح صفائی کرا دے گا۔" پھر لکھتا ہے کہ "اس نے ہزارہ کے خوانین کو بھی اطاعت کے لئے بلایا ہے۔ اس کے قاصد کے بیان کے مطابق اُس کے ساتھ بارہ ہزار فوج ہے جس میں چھ رجمنٹ پانچ پانچ سو کی اور تین سات سات کی ہیں۔" ڈائری مورخہ ۱۷ جنوری ۱۸۴۹ء میں لکھتا ہے کہ "امیر اپنے خط کے جواب کا اصرار کر رہا ہے۔" میں نے اس کو جواب دے دیا ہے کہ اُس کے دعوے کا جواب دینے کا میں مختار نہیں۔ یہ جواب میری حکومت ہی دے سکتی ہے۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "میری حکومت اس مطالبے کو دشمنی تصور کرے گی۔" مزید لکھتا ہے کہ "اگر اس نے اپنے لڑکے کو اٹک کے محاصرہ سے واپس نہ بلایا یا اس نے دریائے سندھ کو پار کیا تو یہ ہماری حکومت کے ساتھ دشمنی کا آغاز ہو گا۔ اس کے قاصد کو سمجھایا کہ وہ چتر سنگھ پر اعتبار نہ کرے۔ اگر چتر سنگھ موجودہ معرکہ میں کامیاب ہو گیا تو وہ امیر کو پشاور سے نکال دے گا۔" مورخہ ۶ جنوری ۱۸۴۹ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "کہا جاتا ہے کہ امیر دوست محمد خان کے ساتھ سات سو مُلّا (مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ش ب) جو انگریزوں کے حمایتی مسلمانوں پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں۔" آگے چل کر لکھتا ہے کہ "امیر نے اٹک سے سکھوں کو نکال دیا ہے۔"

ضلع ہزارہ میں انگریزی فوجوں کے قیام کیلئے صحت افزا مقام تجویز کرنے کے متعلق خط و کتابت

اس خط و کتابت سے میجر ایبٹ کی سیاسی بیداری، لوگوں کے عادات کا علم اور تاریخی واقعات سے باخبری کا اظہار ہوتا ہے جو قابلِ ستائش ہے۔ ڈائری مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۴۹ء سری کوٹ میں رقمطراز ہے کہ کیپٹن ہومز (HOLMES) رسالہ متعینہ راولپنڈی آج یہاں آیا۔ وہ فوج کے لئے صحت افزا مقام کی تلاش میں ہے۔ مجھے اس معاملہ۔ ہزارہ میں انگریزی افواج کے قیام میں تشویش ہے۔ ہزارہ اگرچہ پُرامن ہے اور لوگ انگریزی حکومت کی عزت بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک اسلحہ بند ہیں اور تقریباً تیس ہزار کے قریب اسلحہ بند آدمی اس وقت اس ضلع میں ہوں گے۔ ان میں پہاڑی علاقہ کے لوگ مثلاً گدگر، کڑال، اور ڈھونڈ بہت مضبوط ہیں۔ اور ان سے مقابلہ میں سکھوں کا بہت سا خزانہ اور آدمی خرچ ہو چکے ہیں۔ جو سکھوں کے ظلم و زیادتی کا نتیجہ تھا۔ اب چونکہ مالیہ کم کر دیا گیا ہے بے گار ختم کر دی گئی ہے، ملک آباد ہے۔ لوگ مطمئن اور خوش ہیں۔ امید ہے کچھ مدت کے بعد وہ اپنی پرانی عادت۔ اسلحہ سے کام لینا بھول جائیں گے۔ اس طرح سے حکومت کا خرچ بھی کم ہوتا جائے گا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ سب لوگ مسلمان ہیں۔ اگرچہ متعصب نہیں لیکن مذہب کے مخلص پابند اور پرہیزگار ہیں۔ اس وجہ سے پردہ کے سخت پابند ہیں۔ اپنے پیغمبر کے حکم کے خلاف کسی بھی بات پر سخت برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ اُن میں نافرمان اور بدعقیدہ لوگ بھی ہیں۔ لیکن یہ لوگ ان امورات کا اظہار ظاہراً نہیں کرتے۔ ان کی سکھوں سے عداوت کی بنیاد اُن کی اپنے مذہب پر پختگی، سکھوں کی بُت پرستی کی مخالفت۔ اُن کے سور کھانے اور شراب نوشی کی عادت سے بیزاری کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ سکھوں کے یہ معمولات سرِعام نہیں ہوا کرتے تھے جیسے کہ انگریزی سپاہیوں (گورہ فوج) کی بارکوں سے باہر نظر آتے ہیں۔ سکھ شراب پینے میں شریفانہ خُو، خوش باش باتونی اور لاف زن تھے لیکن بدمعاش نہ تھے۔ تاہم اہلِ ہزارہ اُن کی اِن عادات کی وجہ سے ان سے بیزار تھے لہٰذا جب تک ہزارہ کے لوگوں میں نظامِ حکومت کی مکمل اطاعت کا جذبہ پیدا نہ کر لیا جائے اور ہمارے گورہ فوج کے سپاہی ان لوگوں کے نزدیک رہنے لگیں تو یہ ان کے ایسے حالات کو دیکھ کر سکھوں سے بھی زیادہ ان سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور ہماری حکومت کی عزت ان کی آنکھوں میں نہ رہے گی۔ دوسرے یہ کہ انگریز افسر ہزارہ کی زبان سے ناواقفیت اور اس ملک کے حالات سے لاعلمی کو اپنی حاکمانہ دلیری کے زور سے پورا کریں گے اور وہ ان پہاڑوں کی شوریدہ سر مسلح علاقہ میں جو قانون سے یکسر ناواقف ہے بے محابا بغیر ہتھیار اور محافظ نوکروں کے، ان کی آبادیوں میں گھومیں گے۔ اور یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ کسی قاتل کو ان علاقوں سے گرفتار کرنا بالکل ناممکن ہے اور یہ لوگ ان افسروں کے رتبہ و حیثیت کو

جو بغیر نوکروں و اردلیوں کے پھرتے ہیں، جاننے سے قاصر ہیں نیز یہ کہ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں بہت حساس ہیں اور خود ہی بدلہ لینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لہذا یہ لوگ کسی ایسی جگہ پر فوج کا کیمپ نہ لگانے دیں گے جہاں سے ان کے گھر (مستورات) نظر آئیں۔ لہذا میری رائے میں ہزارہ (میدان ہزارہ) ڈھونڈ اور کرڑال کے پہاڑوں پر فوراً قبضہ کرنا اور وہاں پر انگریزی افسران اور افواج کا مقیم کر دینا ایک خطرناک تجربہ ہوگا۔ اگر افسروں کی حفاظت زندگی اور رعب میں ہماری سلطنت کا راز ہے اور ان کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر مسلم آبادی کے جذبات کو برانگیختہ کر کے ان کو مقابلہ کے لئے آمادہ کیا جائے تو ہم انگریزوں کے قاتلوں سے نہ لے سکیں گے۔ اور ہمارے افسران کی جان، و عزت کا تقدس برقرار نہ رکھا جا سکے گا۔ حکومت انگریزی کے تسلط سے پہلے یہ ضلع اس علاقہ کے قلعوں میں متعین افواج حکومت کے ساتھ کامیابی سے مسلح جنگیں کرچکا ہے۔ حالانکہ یہ قلعے ان پہاڑی علاقوں کو فتح کرنے کے بعد میں نے ہی شروع میں بنوائے تھے۔ اور پھر ان کا انتظام چتر سنگھ پر بہت اعتماد کرتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اس وقت میں اس کے ارادہ بغاوت سے آگاہ نہ تھا۔ ان سب قلعوں پر چتر سنگھ کے اپنے آدمی قابض تھے۔ اگر جنگ طول پکڑ جاتی اور سکھ ان میں جمع ہو جاتے تو ان قلعوں کی وجہ سے ہمیں جنگ میں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی۔ میں نے ان قلعوں کی ناکہ بندی کر دی۔ تاکہ قلعہ والوں کو باہر سے کوئی امداد نہ مل سکے۔ اس ناکہ بندی کی تاب نہ لا کر وہ ان کو خالی کر کے چلے گئے۔

سکھوں کے عہد حکومت میں ان ملکی لوگوں سے ہتھیار لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن میدانی علاقہ کے سوا کامیاب نہ ہو سکی۔ اور پہاڑوں میں اسلحہ اسی طرح موجود رہا۔ جس سے میدانی علاقہ کے لوگ پہاڑیوں کے رحم و کرم پر رہ گئے۔ اور یہ پہاڑی لوگ، کمزور حکومت کے لئے اسی طرح خطرہ بنے رہے۔ اب (یعنی اپریل ۱۸۴۹ء ش ب) راولپنڈی ضلع کے لوگوں سے اسلحہ لیا جا رہا ہے تو یہ سب ہزاروں کی تعداد میں پہاڑی لوگ چوتھائی قیمت پر خرید رہے ہیں۔ جب پہاڑی لوگوں کو ہم پر مکمل اعتماد ہو جائے گا اور وہ یقین کر لیں گے کہ ان کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے اسلحہ کی ضرورت نہیں تو پھر ان سے اسلحہ لیا جا سکے گا۔ لیکن یہ کافی مدت کے بعد اور قانون تدریجی (LAW OF GRADUAL PROGRESSION) کے مطابق آہستہ آہستہ۔ اور اسی طریق سے فطری اور اخلاقی امور میں امن و امان پیدا ہوتا ہے۔ تیزی کے عمل سے فساد اور بدامنی پیدا ہوتی ہے۔ حالات متذکرہ بالا کی بناء پر میں تجویز کرتا ہوں کہ یہ چھاؤنی ۱۔ موضع نور جو دریائے جہلم کے سامنے اور پہاڑ کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ میں ——— موزوں ہوگی۔ اس کی بلندی چھ ہزار فٹ ہے۔ پانی وافر اور جگہ کشادہ ہے۔ چیڑھ کے جنگل ہیں موسمی بخار (ملیریا) سے بھی جو ہزارہ کے سب

پہاڑوں میں موجود ہے۔ پاک ہے۔ اس پہاڑ پر برف رہتی ہے۔ راولپنڈی سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے اور میدانی علاقہ سے ایک منزل کے مارچ سے یہاں پہنچا جا سکتا ہے۔

۲۔ کروڑی پہاڑ جس کی بلندی کم ہے۔ مون سون کے موسم میں بخار عام ہوتا ہے۔ باقی موسم اس میں اچھے ہوتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو کروڑی نہیں پہنچ سکتے، نور اچھا ہے۔ یہ جگہ راولپنڈی سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

میری رائے میں انگریزی اور دیسی فوج کی مستقل رہائش کے لئے میدانی علاقے بہتر رہیں گے۔ تبدیلی آب و ہوا کے لئے گرمی کے موسم میں پہاڑوں پر جا سکتے ہیں۔ چونکہ نور (NAVRAV) اور کروڑی ہزارہ کے پہاڑی علاقوں کے سرے پر ہیں۔ لہذا ہزارہ کے لوگوں کا اعتراض کم ہوگا بہ نسبت دوسری جگہوں کے۔ ان ہر دو جگہوں پر ہزارہ سے دور کے علاقہ کے لوگوں۔ قوم ستی۔ سے چھاؤنی والوں کو واسطہ پڑے گا۔ اس قوم کو ہمسایوں سے کوئی ہمدردی نہیں (قوم ستی تحصیل مری کے پہاڑوں اور کہوٹہ کے شمالی مغربی کونہ میں آباد ہیں۔ ش ب)

۳۔ اگر میری رائے بالا قابل قبول نہ ہو تو پھر **میاں جانی** کی چوکی اور **موچھ پوری** (نتھیا گلی اور ڈونگا گلی کے پہاڑ) بہتر ہوں گے۔ ان کی بلندی دس ہزار فٹ ہے۔ اور یہ دونوں مقامات خود سر قوم ڈھونڈ کے درمیان ہیں۔ یہ قوم ناقابل اعتبار اور جنگ جو قوم ہے۔ ان ہر دو مقامات کو بلند پہاڑوں نے میدانی علاقہ سے الگ الگ کر رکھا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس آخری تجویز پر عمل کیا اور خانس پور انگریزی فوج کے لئے چھاؤنی بنائی۔ اب یہ جگہ دو تین سال ہوئے فوج سے خالی کی جا چکی ہے۔ فوج کے بنگلوں کی جگہ نیلام ہو کر **ایوبیہ** کی آبادی بن چکی ہے۔ ش ب)

۴۔ آخری تجویز۔ خانپور کے علاقہ کے پہاڑ راولپنڈی سے نزدیک لیکن موسمی بخار کا گھر ہیں۔ خاص کر مون سون سے اور اس کے بعد۔ حکومت کا جو حکم ہو تعمیل کی جائے گی۔ میں نے اپنی رائے دیانتداری سے دے دی ہے اور جو اعتراض اور مشکلات تھیں بیان کر دی ہیں۔ مگر یہ کہ دو تین سال بعد ہماری جو پوزیشن بھی پنجاب میں ہو گی سو ہو گی۔ بہرحال اس اثناء میں ہزارہ کے لوگوں کو بددل کرنا اور ناراض کرنا ٹھیک نہیں۔ میرا یقین ہے کہ اس عرصہ کے بعد ہزارہ کے لوگ ہماری حکومت پر اعتماد کلی کر لیں گے۔ اور اس وقت یہ لوگ انگریزی فوج کے افراد کا نشہ شراب میں چور ہو کر لڑکھڑانے اور گرنے کی حالت کو دیکھ اور ان کے سور کھانے کی عادت کو برداشت کر سکیں گے۔"

غلام خان ترین کی گرفتاری

مقامی روایات کے مطابق غلام خان ترین نے جب کہ درانی واپس چلے گئے اور سکھوں کا اقتدار بھی ختم ہوگیا اپنے معتقدوں یا مقامی سربرآوردہ لوگوں کے ایما پر خود ہی میجر ایبٹ کے پاس حاضر ہوگیا تھا۔ انہوں نے اس کو

تسلی دی کہ میجر ایبٹ اس کو گرفتار نہیں کرے گا۔ بلکہ معاف کر دے گا۔ کہا جاتا ہے کہ میجر ایبٹ کا ان سرکردہ لوگوں کو اپنے اعتماد میں لے کر غلام خان کو اس طریقہ سے آسان طور پر گرفتار کرنا مقصود تھا۔ اگر وہ خود اس کے پاس حاضر نہ ہوتا تو اس کی گرفتاری مشکل سے ہی عمل میں آ سکتی تھی۔ جب غلام خان بمقام ناڑہ میجر ایبٹ کے پاس حاضر ہوا تو اس کو گرفتار کر کے قلعہ ہر کشن گڑھ (قلعہ ہری پور) میں قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد کے واقعات میجر ایبٹ کی ڈائری مورخہ ۵؍ اپریل ۱۸۴۹ء کے مطابق حسب ذیل ہیں:-

"غلام خان میدانِ ہزارہ کا چیف (رئیس) ہر کشن گڑھ کے قلعہ میں قید ہے۔ اس سے علاقہ میں جوش اور اشتعال پیدا ہو گیا ہے۔ قلعہ کی حفاظت کے لئے فوج نہیں ہے۔ ملکی سپاہی ہی حفاظت پر مامور ہیں۔ جن کی ہمدردیاں ان قیدیوں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام خان کے ساتھ اور لوگ بھی اس وقت قلعہ میں زیر حراست تھے۔ ش ب) کے ساتھ ہیں۔ جوان کے ہم خاندان، ہم قوم اور ہم مذہب ہیں۔ لہٰذا میں نے کمان افسر قلعہ اٹک کی اجازت بہ امید منظوری لفٹیننٹ کرنل سر ایم۔ ایم۔ لارنس کمانڈنگ افسر راولپنڈی سے لے لی ہے۔ کہ اس خان مذکور کو قلعہ اٹک میں بند کر دیا جائے۔ اور درخواست کی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے۔ سوائے اس کے کہ جو حفاظت کے لئے ضروری ہو۔

جہانداد خان (نواب امب) کا وکیل نواب کو اُکسا رہا تھا کہ وہ اپنے دوست غلام خان کو طاقت کے زور سے رہا کرانے کی کوشش کرے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جہانداد خان کافی پیدل اور سوار فوج کے ساتھ ہزارہ میں اسی دن داخل ہوا جس دن غلام خان کو قلعہ ہر کشن گڑھ سے نکال کر اٹک بھیجا جا رہا تھا۔ ممکن ہے اُس کی یہ آمد یہاں اتفاقیہ اور غیر ارادی ہو۔ لیکن میں نے جہانداد خان کو بغیر اجازت اس طرح ہزارہ میں داخل ہونے پر ملامت کی۔ میں سارا دن ان حالات کی وجہ سے پریشان رہا۔ لیکن میری پارٹی قیدی (غلام خان) کو لے کر خیریت سے اٹک پہنچ گئی۔

میجر ایبٹ کا ہزارہ کا مکمل دورہ اختتام بغاوت پر

فساد کے دوران میجر ایبٹ زیادہ تر شیروان (تناول) اور ناڑہ سید خانیاں (گندگر) میں مقیم رہا۔ اول الذکر مقام پر حفاظت ذاتی آرام اور امن کی فضا میں مستقبل کی کارروائی کا پروگرام بنانے کے لئے اور آخر الذکر میں عملی کارروائی۔ سکھوں پر حملہ اور مدافعت کے لئے رہتا تھا۔ جب بغاوت فرو ہو گئی تو اس نے کل ضلع کا دورہ کر کے صورت حالات کا جائزہ لیا۔ اس کی ڈائری کی روشنی میں اس دورہ کی تفصیلات یہ ہیں:- ۲۸؍ اپریل ۱۸۴۹ء۔ غازی۔ کڑی دھر چٹی جانے کے لئے غازی کے راستہ سے مارچ کیا۔

ہوئی علاقہ غلام محی الدین خان طاہر خیلی میں ایک قلعہ بنانا چاہتا ہوں۔ جہاں سے وہ خود بخود ملک بدر ہو گیا ہے۔ میرا منشا ہزارہ میں موزوں جگہوں پر چوکیاں بنانا اور ان علاقوں کو دیکھنا ہے جہاں میں کبھی نہیں گیا ہوں۔ تاکہ مشکل کے وقت حفاظت کا انتظام کرنے کا بندوبست کر سکوں۔ اس وقت میں سری کوٹ کے قلعہ کی تعمیر میں مصروف رہا اور کہیں باہر نہ جا سکا۔

۲۸؍ اپریل ۱۸۴۹ء کڑی دھر چٹی۔ باغدرہ کے راستہ دھر چٹی گیا۔ یہ چڑھائی دنیا کی چڑھائیوں میں سخت ترین ہے۔ ایک سو ماہر نشانہ باز یہاں بیٹھ کر بڑی سے بڑی فوج کو تباہ کر سکتے ہیں۔ سری کوٹ کی چڑھائی اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ یہاں قلعہ کا کافی کام ہو چکا ہے۔ حالانکہ پتھر اور پانی دور سے لانا پڑتا ہے۔ یہ بہت ضروری قلعہ ہے۔ طاہر خیلی قوم کے بہت سے محفوظ مقامات اس سے نیچے ہیں۔ دوپہر کے وقت پیر تھان گندگر کی چوٹی پر چڑھا۔ یہ سات میل کا فاصلہ تھا۔ پانی یہاں نہیں۔ اس چوٹی کی دونوں طرف اُترائی بہت زیادہ ہے۔ نیچے میدان میں کسی نشانہ پر بھی گولی بڑی خوبی سے مار کر سکتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی بلندی ۴۰۰۰ فٹ ہوگی۔ یہ جگہ گندگر کے جنوبی حصہ کی کنجی ہے اور تمام مقامات اس سے نیچے کی چوٹیوں پر ہیں۔ یہاں آنے پر مجھے اس علاقہ کی فوجی اہمیت کے مقامات کا علم ہو گیا ہے۔

۳۰؍ اپریل ۱۸۴۹ء تربیلہ۔ آج تربیلہ آیا۔ یہاں ایک قلعہ بنا رہا ہوں۔ سکھوں کی بغاوت کے دوران میں نے یہاں کا چھوٹا سا قلعہ خود ہی برباد کرا دیا تھا۔ تاکہ اُن کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ اس قلعہ کے عین سامنے (موجودہ تھانہ تربیلہ اسی قلعہ میں ہے۔ ش ب) دریا سے پار باغی رہتے ہیں (موضع کھبل و کیا تھانہ تربیلہ کے سامنے ہیں۔ ش ب) یہ قلعہ ایسے لوگوں کے حملہ سے بچاؤ کا آسان طریقہ ہے۔ یہ قلعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ دریائے پار اسلحہ بند قوم ہے۔ چھاؤنی بنانے کی بجائے قلعہ بنانے پر خرچ پانچواں حصہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ دسواں۔

حاجی زمان خان (طاہر خیلی قوم کا رئیس) کھبل میں ہے۔ میں نے اپنی دوربین سے اسے کھبل سے تھانہ آتے ہوئے دیکھا۔ وہ کھبل اس واسطے گیا کہ لوگوں کو رشوت دے کر ہزارہ اور چھچھ کے فصلات کو لوٹنے کے لئے تیار کرے۔ ... شناوروں (ہوا سے بھری ہوئی کھال، جس پر لوگ لیٹ کر دریا پار کرتے ہیں۔ ش ب) کے ذریعہ دریا پار کرنے پر آمادہ کر سکے۔ میں میجر لارنس سے کہوں گا کہ وہ بیہور کے قلعہ پر قبضہ کرے۔ اسی راستہ سے ان پٹھانوں (دریائے سندھ سے مغربی کنارے والے) کو رسد آتی ہے۔"

۱۱؍ مئی ۱۸۴۹ء ہری پور واپس آیا ہوں۔ اور بارشوں کی وجہ سے رُکا ہوا ہوں۔ ۱۸؍ مئی ۱۸۴۹ء گذشتہ پچھلے آٹھ دس ماہ کے حسابات کی پڑتال اور درستی کر رہا ہوں۔ اس حساب کی درستی کی مشکلات

تین قسم کے روپوں میں حسابات رکھنے سے ہے۔ ۲۶ رمئی ۱۹۴۹ء تک ہری پور ہی میں رکا رہا۔ علاقہ کرڑال میں جانا ضروری ہے۔ لیکن کوئی افسر یہاں موجود نہیں جو دریائے سندھ پار مفروروں پر نظر رکھ سکے۔ میں مختلف مقامات کا دورہ کر کے مقدمات کو اُن کے جائے وقوع پر ہی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں اس سے لوگوں کو آرام ہو گا۔

حکومت کے ملٹری پولیس کے قیام کے حکم سے ناواقف ہوں۔

۱۰ رجون ۱۹۴۹ء رجوعیہ۔ ۱۱ رجون بھی یہاں ہی رہا۔ ۱۲ رجون ۱۹۴۹ء ناڑہ نیلاں (علاقہ کرڑال) یہ میاں جانی کی چوکی کی شاخ کے سرے پر واقع ہے۔ پہلے میں یہاں کبھی نہ آیا تھا۔ بلندی پانچ ہزار فٹ ہے۔ لیکن اس کے مناظر معمولی، غیر دلچسپ مثل شیروان، ڈنہ، سری کوٹ، سری بنگ، ماڑی، جموں اور پنج ہیں۔ ۱۳ رجون ۱۹۴۹ء میرانگل۔ "یہ مارچ بیس میل کا تھا۔ یہ دیہات میاں جانی کی چوکی کے دامن میں ہیں۔ یہاں بڑے تناور درختوں از قسم چیڑ (ھ)، شاہ بلوط، بیگو (YEW - سدا بہار درخت) اور منوں کے درمیان ایک چھوٹا سا قلعہ ہے۔ جہاں چند پولیس کے سپاہی حفاظت کے لئے مقرر ہیں۔"

۱۴ رجون ۱۹۴۹ء میاں جانی کی چوکی۔ بلندی دس ہزار فٹ۔ اس کی چوٹی سے سب میدانِ ہزارہ نظر آتا ہے۔ مری، گھوڑا گلی، فوجوں کے لئے صحت افزا مقامات ہیں۔ مری میں چار ماہ برف رہتی ہے۔ ڈھونڈ کرڑال اور ستی قوم، حکومت کی کمزوری سے قلعوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ مری کی بلندی سات ہزار فٹ ہے۔" ۱۸ رجون ۱۹۴۹ء مانسہرہ۔ "یہ بڑا قلعہ ہے۔ اس جگہ کرنل بھوپ سنگھ، سکھوں کا ایک اچھا اور قابل افسر ہے۔ مگر بغاوت میں ملوث ہے۔ اس نے بہت دنوں تک اپنی فوج کا کیمپ رکھا۔ اگر جھنڈا سنگھ ہزارہ نہ بھیجا جاتا تو یہ فوج ہتھیار ڈال دیتی اور بغاوت فرو کر دی جاتی۔ ان حالات کا ایک سکھ افسر کے پکڑے ہوئے خطوط سے پتہ چلا۔ ۱۹ رجون ۱۹۴۹ء شنکیاری۔ آج یہاں آیا۔ یہ جگہ پکھلی کے سرے پر واقع ہے۔ پہلے میں حد بندی میں مشغول رہا۔ پھر بغاوت ہو گئی۔ لہٰذا بہت مدت کے بعد پکھلی آیا ہوں۔ اب سب ملک زیر کاشت آ گیا ہے۔ ایک مربع گز زمین بھی کاشت کے بغیر نہیں رہی۔ یہ سب امن کی برکت ہے۔ ہزاروں لوگ واپس آ گئے ہیں اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے لگاتار جھگڑے ہو رہے ہیں۔

۲۰ رجون ۱۹۴۹ء کو یہاں ہی مقدمات فیصلہ کرنے کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔ بھوگڑ منگ کے درّے میں بہت ظلم و جبر ہوتا ہے۔ یہاں میرا کوئی قلعہ نہیں۔ لوگ ڈر کے مارے شکایت نہیں کر سکتے۔ میں ان حالات کی اصلاح کے لئے اس کے گرد و نواح میں سال میں چند ماہ گزارا کروں گا۔ اور اس درہ کا دورہ اکثر کروں گا۔ کچہری حسب معمول کی گئی۔ ۲۱ رجون ۱۹۴۹ء۔ "آج میں مانسہرہ واپس آ گیا ہوں۔ میں کئی

[illegible] سے پشاور لکڑی بھیجنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پکھلی میں لکڑی کافی ہے۔ لیکن دریائے سرن میں چندہ [illegible] سے زیادہ دور نہیں پہنچ سکتی۔ خشکی کا راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے ڈھلائی بذریعہ بار برداری بہت مشکل ہے۔ میں نے راستہ چوڑا کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ پشاور کے لئے عمارتی لکڑی کی بہت ضرورت ہے۔ ہری پور میں مل نہیں سکتی۔ دریائے دوڑ اور دریائے ہرو سے نہریں نکل جانے سے [illegible] بہت کم ہو گیا ہے اور لکڑی بہہ کر نیچے نہیں جا سکتی۔

۲۲ رجون ۱۹۴۹ء تک مقدمات کے فیصلہ کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔

۲۳ رجون ۱۹۴۹ء مانگل: "یہاں خان پور کے کاردار کا خط ملا۔ کہ راجہ حیدر بخش خان باغی ہو کر خان پور کے [illegible] میں چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کاردار اور راجہ کے درمیان کوئی ذاتی تنازعہ ہے۔ بہرحال [illegible] ضروری ہے۔ ہزارہ میں تھوڑی سی غفلت سے آگ بھڑک سکتی ہے۔ تھوڑا سا کام یہاں کرنے کے بعد نواں شہر گیا۔ کچھ مقدمات وہاں فیصلہ کرنے تھے۔ ۲۴ رجون ۱۹۴۹ء موضع چنبہ (نزد بال ڈھیر شمال) [illegible] گیا ہوں۔" ۲۵ رجون ۱۹۴۹ء گلڈھیری۔ "یہ غلام خان ترین کا مسکن ہے۔ جو اب قلعہ اٹک میں قید ہے [illegible] ہوشیار آدمی ہے کہ اس نے اپنے گاؤں کی عورتوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ اس نے ان کی حفاظت کے [illegible] اپنی جان قربان کر دی۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہے کہ ہزارہ میں درّانی اُسی کے بلانے پر آئے۔ مجھے یہ [illegible] نہ تھا کہ یہ جگہ اتنی محفوظ ہے۔ اگر ایک سو بندوقچی اس جگہ پر بیٹھے ہوئے ہوں تو درّانیوں کی پوری فوج اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے گی۔ میں نے غلام خان کو آدمی دئے تھے جن کی تنخواہ میں دیتا تھا۔ [illegible] مزید امداد کا وعدہ بھی درّانیوں کے حملہ کی صورت میں کیا تھا۔

گاؤں کی بوڑھی عورتیں جرگہ کی شکل میں میرے پاس اس کی رہائی کی درخواست لے کر آئیں۔

یہاں میرے بلانے پر راجہ حیدر بخش خان حاضر ہوا۔ لیکن صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے کہ آیا راجہ کا قصور ہے یا نہیں۔ مجھے خان پور جانا پڑے گا۔" ۲۶ رجون ۱۹۴۹ء۔ "چھچیاں کے چھوٹے سے قلعہ پر چڑھا اس کی بلندی ساڑھے پانچ ہزار فٹ ہے۔ اس سے اونچا پہاڑ سری بنگ سات ہزار فٹ ہے۔ یہ قلعہ میں نے اس وقت بنایا تھا۔ جب میں نے اس ضلع کی حد برداری پہلی دفعہ کی تھی۔ اس کے بعد آج یہاں آیا ہوں۔ یہ قلعہ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ گلڈھیری سے اونچا ہے اور خان پور کے علاقہ کا حصہ ہے۔ یہاں [illegible] وثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشمیر نے چھ سو توپیں چھپا کر رکھی ہوئی ہیں۔"

چند مزید مندرجات: ۱۔ میجر ایبٹ نے ۳۰ رجون ۱۹۴۹ء نئی فوجی بھرتی کے لئے لکھا۔

۷ ۱۰ اگست ۱۹۴۹ء ڈائری۔ مہاراجہ جموں کی دو توپیں سکھوں کے ساتھ جنگ کے زمانہ میں میجر ایبٹ

کے پاس تھیں۔ ۳۔ ارسلہ خان زیدہ ضلع مردان کے متعلق ڈائری مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۴۹ء میں لکھا ہے کہ گائیڈز رسالہ متعینہ مردان کے افسر نے ارسلہ خان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کو گرفتار نہ کر سکا۔

میجر ایبٹ کے روزانہ کے معمولات

اس ڈائری کے مندرجات کو اس کے روزانہ کے معمولات کے ذکر کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ تاکہ اس کی شخصیت عادات اور رجحانات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ کہ وہ کس قسم کا انسان تھا جس نے اس ضلع کے لوگوں کے دلوں کو اپنے اخلاق اور قابلیت سے مسخر کر لیا تھا۔ اور یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کی کامیابی کا راز اُس کے احساس فرض شناسی، مذہبی پابندی، اپنے معمولات میں استقلال، مستعدی اور محنت میں مضمر تھا۔

۱۔ وہ مذہب کا پابند تھا۔ ہر اتوار جہاں کہیں بھی مقام ہو، صبح کے وقت وہ عبادت کیا کرتا تھا۔ اس کا ذکر اس نے بڑے شوق اور دلی طمانیت سے بہت سی ڈائریوں میں کیا ہے۔

۲۔ صبح سویرے ہر روز وہ سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ ۳۔ سیر سے واپس ہو کر دس بجے تک سرکاری کام، دفتری کاغذات، اور سرکاری خطوط کے جوابات لکھتا تھا اور دیگر انتظامی معاملات کے بارے میں ملازمان کو ہدایات دیتا تھا۔ ۴۔ دوپہر کے کھانے کے بعد شام، غروب آفتاب تک لوگوں کی عرضیاں سنتا اور ان پر احکام صادر کرتا تھا۔ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا تھا۔ مقدمات کو بلا تاخیر روزانہ سننے اور بروقت فیصلہ کرنے کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ اس کی انصاف پروری سے لوگ مطمئن اور خوش تھے۔ اور اس پر کلی اعتماد رکھتے تھے اور ہر وقت اس کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ وہ اپنی ایک ڈائری میں (جس کا ذکر صفحات گزشتہ میں کیا جا چکا ہے) لوگوں کے اس اعتماد کو اپنی قوت اور اثر و رسوخ کی بنیاد سمجھتا تھا۔

ہزارہ دوران بغاوت میں

۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۸ء

اس مدت کے قابل ذکر واقعات میں سے ایک سادات کاغان کا واپس جانا ہے کہ یہ ایڈورڈز کے حکم بہ حیثیت کمشنر کے ۱۸۵۵ء میں واپس گئے۔ ان ایام میں میجر بیچر ڈپٹی کمشنر تھا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے شروع ہونے سے کچھ فوج دہلی بھیجی گئی۔ اور مقامی لیوی بھرتی کر کے گزر گاہوں۔ کشتیوں کے گھاٹ کی نگہبانی اور اندرونی حفاظت کے کام میں لگائی گئی۔ اور بقیہ فوج مری کی پہاڑیوں میں برائے حفاظت

مقرر کی گئی۔ ۳۰ جون ۱۸۵۷ء ہندوستانی فوج ۵۵ کے جو سپاہی مردان سے بھاگ کر ہزارہ میں داخل ہوئے ان کو تمام فوج اور عام لوگوں کے مجمع کے سامنے توپ سے اڑا دیا گیا۔

یہ سپاہی مردان سے بھاگ کر سوات سے ہوتے ہوئے کاغان میں داخل ہوئے اور پوربی ناڑ (کاغان میں اُن کے نام پر یہی موسوم ہے) میں گرفتار ہوئے اور توپ سے اڑائے گئے تھے۔ ان کی گرفتاری میں سوائے سادات اور گوجر سب کی اعانت شامل تھی۔ ان کو دریائے سندھ پار کرتے ہی گرفتار کرنے یا واپس دھکیل دینے کا کام کالا ڈھاکہ کی اقوام نے کرنل بیچر ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایماء پر کیا۔ ان ہندوستانی سپاہیوں میں سے نصف کے قریب کاغان سے اس طرف ہزارہ میں گرفتار کئے گئے۔ ان کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔ اور ان کی نعشوں کو ایک گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ اب ان شہیدوں کی زیارت، ایوب منزل ایبٹ آباد کے پائیں گڑھے میں بالمقابل آبادی جیل موجود ہے۔ لیکن ان شہیدوں کے نام اور کام سے محلہ کے لوگ، یعنی ملک پورہ، ایبٹ کے لوگ ناواقف ہیں۔

ان ایام میں مری پر ڈھونڈوں نے حملہ کیا۔ اگرچہ آخری وقت میں سردار حسن علی خان رئیس کرڑال ان سے الگ ہو گیا۔ لیکن راولپنڈی ضلع کے ڈھونڈوں نے حملہ کر دیا اور وہ پسپا ہوئے۔

غدر کے بعد کے واقعات

۱۔ اگرور کی مہم، جن کا ذکر کسی دوسری جگہ کیا جائے گا۔ ۲۔ گلیات میں موسم گرما کی رہائش کے لئے بنگلے اور چھاؤنیاں سنہ ۱۸۵۳ء میں بنائی گئیں۔ ۳۔ پہلا مکمل بندوبست ۱۸۷۲-۷۴ء کو مکمل ہو کر لوگوں کے لئے باعثِ اطمینان ہوا اور مالکانِ اراضی کی حد بندی ہو گئی۔ دوسرا بندوبست سنہ ۱۹۰۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوا۔ اور مالیہ نصف پیداوار کے حساب سے لگایا گیا۔ اور یہ ۳۰۸۳۹۴/= روپیہ سے بڑھ کر ۵۰۴۲۲۸/= روپیہ ہو گیا۔ ۴۔ حسن ابدال تا ایبٹ آباد کی سڑک ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۴ء پختہ کر دی گئی۔ یہ شاہراہِ عام مغلیہ سلطنت سے پہلے کی ہے۔ ۵۔ سڑک وادی کاغان تا چلاس خچروں کی آمد و رفت کے لئے ۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۸ء تک بنائی گئی۔ ۶۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک سڑک برائے آمد و رفت تانگہ مانسہرہ سے ہوتی ہوئی گڑھی حبیب اللہ تک بنائی گئی۔ اور سنہ ۱۹۰۴ء میں ضلع میں کافی سڑکیں بن جانے سے آمد و رفت کی کافی سہولتیں مہیا ہو گئیں۔ ۷۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں اٹک تحصیل ہزارہ کے ساتھ ملا دی گئی۔ لیکن سنہ ۱۹۰۱ء میں صوبہ سرحد بن جانے سے اٹک تحصیل پھر راولپنڈی کے ساتھ ملا دی گئی۔ اور ہزارہ صوبہ سرحد کا حصہ بن گیا۔ ۸۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ہزارہ صوبہ سرحد کا حصہ ہی رہا۔

اہلِ ہزارہ کی معیشت

از منہ قدیم و حال میں

اقوامِ عالم کا جو پہلا دورِ تاریخ کی روشنی میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگ ابتداء میں منتشر جنگلوں اور پہاڑ کے غاروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جڑی بوٹی اور شکار پر زندگی کا مدار تھا۔ پھر ایسا وقت آیا کہ ان کو یکجا رہنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ تاکہ وہ اجتماعی طور پر جنگلی درندوں اور جانوروں سے حفاظت کر سکیں۔ محض رہنے کی حالت و ماحول سے جب تہذیب و ترقی پر پہنچنے کی کوشش شروع ہوئی تو درمیانی حسب ذیل مدارج سے یہ راستہ طے ہوا۔

۱۔ کاشت کاری کی ابتداء

۲۔ معدنیات کی دریافت اور ان کے استعمال کا علم۔

۳۔ آخری درجہ مندرجہ بالا دونوں وجوہات کی بناء پر شہری زندگی کی ابتداء۔

اقوامِ ہزارہ بھی اِن مراتب تہذیب سے گزری ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قدیم ایام ہی سے مختلف مدارج کو بہت آہستہ روی سے طے کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آخری درجہ تہذیب یعنی شہری زندگی تک اِن کے سُست رو قدم زمانہ حال ہی میں پہنچے ہیں اور ابھی وہ اس منزل پر پوری طور پر متمکن نہیں ہوئے۔ تاہم یہ قدم پاکستان بن جانے (۱۹۴۷ء) کے بعد تیزی سے اٹھے اور شہری تمدن بہ زور طور پر نافذ العمل ہونے لگا۔ تاریخ کے مختلف ادوار کا نشان اب بھی ہزارہ میں پایا جاتا ہے۔ مشرقی اور شمالی و غربی علاقہ کے پہاڑی حصوں میں اب بھی چوپانی عام ہے اور بقیہ آبادی زراعت پیشہ۔ چونکہ دونوں پیشے موجودہ زمانہ میں آسائش و آرام کی زندگی کے متحمل نہیں ہو سکتے اس واسطے آبادی کی کثرت کی زندگی کا مدار سرکاری و نجی ملازمت پر رہا ہے۔ اس تنگی معیشت نے اہلِ ہزارہ کو دنیا کے سب گوشوں میں منتشر کر دیا ہے۔ امریکہ اور انگلینڈ تک یہ پہنچ چکے ہیں اور جنوب و سطی ایشیا میں انکی کافی تعداد ہے۔ چونکہ باشندگان ہزارہ شہری اور متمدن زندگی کے اسباب و ذرائع سے محروم ہیں اور ابھی تک پرانے زمانہ کے آباد شدہ دیہات میں جو شاہراہوں سے دور۔ پہاڑوں کی چوٹیوں۔ کھنڈروں کے کنارے یا جنگلوں میں واقع ہیں سکونت پذیر ہیں۔ تعلیم و تربیت اور عصری تہذیب کے فوائد سے محروم ہیں۔ اس واسطے بہت ہی پس ماندہ ہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد اہلِ ہزارہ نے بھی ترقی شروع کی۔ شہروں میں تجارت کی افزونی ہو رہی ہے اور بڑے بڑے کارخانے بھی لگ چکے ہیں۔ سب سے پہلے ہری پور

میں ٹیلیفون فیکٹری بہ عہدِ وزارت سردار بہادر خان ترین ساکن ریحانہ وزیر مواصلات پاکستان کی خاص کوشش سے بنی جس کا سنگِ بنیاد گورنر جنرل غلام محمد نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں رکھا۔ اب وہ روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ پہلے پہل جرمن انجنیروں نے اس میں کام کی ابتداء کی۔ اب پاکستانی خاص کر ہزارہ کے باشندے کافی تعداد میں اس فیکٹری میں کام کر رہے ہیں۔

اس کے بعد ہری پور میں سوات ٹیکسٹائل مل ۱۹۵۴ء میں بنی۔ اور ۱۹۶۲ء میں خیبر ٹیکسٹائل مل بالڈھیر میں بننی شروع ہوئی اور اوائل ۱۹۶۳ء میں سُوت بھی تیار کرنا شروع کر دیا۔ یہ فیکٹری بھی سردار بہادر خان کی راہ نمائی اور اثر و رسوخ سے بنی ہے اور ان کے ہی زیرِ اہتمام چل رہی ہے۔

ضلع ہزارہ میں پرانی تہذیبیں اور ان کے باقیات و اثرات

چونکہ یہ پُرانی تہذیبیں دنیا کے ہر حصّہ کے لوگوں کے اخلاق و اعمال پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ لہٰذا اُن کے اثرات جو اہلِ ہزارہ پر پڑے۔ ان کی دریافت کے لئے اِن تہذیبوں کا مجمل ذکر ضروری ہے۔

شمالی ہندوستان (ضمناً ہزارہ) ازمنہ قدیم سے باہر کی اقوام مثلاً مصریوں (شاہ مصر (OSIRIS) جس سے ایشور کا لفظ ہند میں مشہور رہا) شاہانِ بابل، شام، میڈیا، سفید ہن، ستھین، ایرانی، یونانی عرب، ترک، مغل، پھر ایرانی، افغان۔ اور آخر کار انگریزوں کے حملوں سے تاخت و تاراج ہوتا رہا۔ اور یہ سب اقوام اپنے اثرات کسی نہ کسی رنگ میں چھوڑتی رہیں۔ دنیا کی ان پرانی تہذیبوں میں زیادہ مشہور تین ہی تہذیبیں ہوئی ہیں:-

۱۔ وادیِ نیل کی تہذیب۔ یعنی مصری تہذیب۔ ۲۔ وادیِ دجلہ و فرات کی تہذیب یہ شہری تہذیب تھی۔ ان تہذیبوں کے باقیات ہڑپہ (ضلع ساہیوال) موہنجوڈارو (لاڑکانہ سندھ) میں ملے ہیں۔ حالانکہ ان دو مرکزوں میں چودہ سو میل کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مراکز کے درمیان سلسلہ آمد و رفت اور تجارت عام ہوگی۔ ۳۔ وادیِ سندھ کی تہذیب اس کا زمانہ سنہ ۲۲۵۰ق م سے سنہ ۱۷۵۰ق م تک ہے۔ اس تہذیب کے آثار اگرچہ ابھی تک اس ضلع میں روشنی میں نہیں آئے۔ لیکن یقین غالب ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے پر کہیں نہ کہیں مدفون آثار ضرور ہوں گے۔

یہ تہذیب دراوڑ قوم کی تہذیب تھی۔ اس قوم کے آثار شمالی سرحد پر پامیر کی دُرد قوم اور کافرستان کے علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور ایک رپورٹ کے مطابق سندھ کوہستان میں دُرد قوم آباد ہے۔

ان مندرجہ بالا تین قدیم تہذیبوں کے بعد مندرجہ ذیل اقوام اس خطۂ عالم پر ظہور پذیر ہوئیں اور

اپنے وقت میں اس ضلع میں اپنے اثرات چھوڑتی گئیں۔

۱- آریہ تہذیب

ان کا زمانہ سنہ ۱۵۰۰ ق م سے سنہ ۲۰۰ ق م تک ہے۔

اب سے کوئی چار ہزار سال پہلے آریہ قوم ہندوکش پہاڑ کو عبور کر کے براستہ کابل۔ غزنی۔ قندھار اور کوہ سلیمان، وادی سندھ میں داخل ہوئی۔ اس ضلع میں خاص کر ٹکلڑی و تندھیاڑ میں مواضعات کے نام سنسکرت میں ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریاؤں کا عمل داخل یہاں رہا ہے۔ (وادی سندھ و پنجاب) دراوڑ قوم کو جو اس خطہ کے مالک تھے بے دخل کر کے قابض ہو گئے۔ اور دراوڑ قوم کو جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا ہو گا۔ اگر یہ مفروضہ صحیح ہو تو دراوڑ قوم کے افراد ہزارہ کے شمال مشرقی پہاڑوں میں بھی آ کر آباد ہو گئے ہوں گے۔

ان کی آمد سے پہلے ہندوستان قبیلوں کی زمین اور بستیوں کا مجموعہ تھی۔

۲- ہندو تہذیب

آریہ قوم ہی اصل میں ہندو قوم کے اجداد ہیں۔ اور انہوں ہی نے اس ملک میں آ کر ہندو تہذیب کی بنیاد رکھی۔ یہ قوم ہندوستان میں آباد ہو کر اپنے عروج کو پہنچی۔ اور اس مدت میں نہ کوئی بیرونی حملہ آور آیا نہ اندرون ملک کے اصلی باشندوں ہی سے جنگ ہوئی۔ چوتھی صدی ق م کے آخر میں موریا سامراج قائم ہوا۔ سلطنت موریہ کے بادشاہ چندر گپت نے کشمیر اور شمالی سرحد پر حکومت کی۔ اور اس کے پوتے اشوک نے مانسہرہ (ضلع ہزارہ) کے ساتھ کی پہاڑی کے دامن میں ایک کتبہ کندہ کرایا تھا۔ جو آج تک موجود ہے۔ یہ کتبہ پرانے شاہراہ پر جو پکھلی کو جاتا تھا ایک پتھر پر کندہ کرایا ہوا ہے۔

اشوک کی موت (سنہ ۲۳۱ ق م) کے بعد بدھ مت کو زوال شروع ہوا۔ اور سنہ ۱۶۵ ق م میں بدھ سلطنت ہندوؤں کے قبضہ میں چلی گئی۔ موریا سامراج کے دو سو برس بعد شمالی ہند میں کُشن سامراج قائم ہوا۔ کشن قبیلے منگول ہندوستانیوں کے لئے بالکل غیر لوگ تھے۔ اور ان کا سامراج ایک دیو تھا۔ جس کا ایک قدم سندھ اور گنگا دوسرا قدم جیحوں و سیحوں کی وادیوں میں تھا۔ کشن خاندان کے سب سے ممتاز بادشاہ کنشک نے ہندوستانی اور وسط ایشیا کی یونانی تہذیبوں کو ملایا۔ اور مذہب کو اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ موریا سامراج گنگا کی وادی (مرکز پاٹلی پتر) سے شمال کی طرف اور وسط ہند کی شاہراہ سے مغرب کی طرف

پھیلا تھا۔ کشن سامراج پشاور سے جنوب کی طرف وسط ہند کے پہاڑوں اور جنگلوں تک جا پہنچا۔ گپت سامراج اس کے بعد چوتھی صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ گنگا کی وادی اور وسط ہند کی تجارتی شاہراہ تک محدود رہا۔ اس زمانہ کی خصوصیت بڑے شہر، ترقی یافتہ صنعت اور بیرونی تجارت کا پھیلاؤ ہے۔ صنعت و تجارت دوسرے پیشوں پر غالب آ گئیں۔ اگرچہ قوم کا کوئی تصور تو نہیں تھا لیکن کالی داس اور بھرتری ہری کے نظموں سے یقین ہوتا ہے کہ ملک کا تصور قائم ہو رہا تھا۔

اس کے بعد راجپوت دور ہے جس نے ہندوستان کو وادیوں اور شاہراہوں کی قید سے نکالا۔ ہندوستان کے مغربی حصے میں ایسے قبیلے جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ملک کے اندر گھس آئے تھے اور مشرق میں پرانے نیم مہذب قبیلے جو موقع کے انتظار میں بیٹھے تھے سیاسی میدان میں اتر آئے۔ یہ لوگ دیہاتی زندگی کے عادی تھے۔ انہوں نے شہر آباد نہیں کئے لیکن جنگل اور آبادی کی جو حدیں قائم ہو گئی تھیں۔ اُن کو انہوں نے توڑ دیا۔ اصول و قواعد کے مطابق ان کی سلطنتیں محفوظ و محدود نہ تھیں۔ انہوں نے سارے ہندوستان کو ایک دیہات، ایک زمینداری کی شکل دے دی۔

راجپوت دور وہ زمانہ بھی ہے جب جنوبی ہندوستان اور دکن کے حوصلہ مند بادشاہ شمال پر حملے کرنے لگے۔ اور شمال اور جنوب کے درمیان جو بیگانگی کی دیوار تھی وہ گرا دی گئی۔ اس طرح گپت سامراج کے تباہ ہونے سے تہذیب اور تمدن کو جو نقصان ہوا تھا وہ ملک کے تصور کو وسعت دے کر پورا کیا گیا۔ نشو و نما کے اس سلسلہ کی تکمیل مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ہندوستان کا لفظ وہ اپنے ساتھ لائے اور یہ اس ملک کا پہلا اور سب سے مستند نام ہے۔

ہندوستان کی آبادی کو ذات اور فرائض کی تقسیم کی دلدل سے گوتم بدھ نے نکالا۔ لیکن اشوک کے مرنے کے بعد بدھ مت نے اپنی حیثیت کھو دی۔ کشن سلطنت نے نئی نسلوں کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا۔ اور اس کے بعد سے بیرونی نسلیں ہندوستان کے اندر آتی اور آباد ہوتی رہیں۔ پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ گپت سلطنت میں شامل نہ تھے۔ گپت سلطنت کی تباہی کے بعد ایک نئی نسل جو کشتری کہلائی، تاریخ کے اس عہد میں نمودار ہوئی اور اس کا حاکم طبقہ راجپوت تھا۔

راجپوتوں کو بدھ متی عقائد سے عداوت تھی جب مسلمان یہاں آئے تو وہ ہندوستان کے نام کی طرح سیاسی اتحاد کا ارادہ بھی ساتھ لائے۔ محمود غزنوی کے بعد غزنی کی ریاست سلجوقیوں اور غز ترکوں کے سیلاب میں ڈوب چکی تھی۔ محمد غوری بھی اسی سیلاب کو روکنے کی کوشش میں لگا رہا اور اسی سے بچنے کے لئے ہندوستان کو ایک جائے پناہ بنانے کی فکر کی۔ اس کے مرنے کے بیس برس بعد تاتار خوارزم

خراسان اور ایران پر وہ ٹوٹ پڑے اور ۱۲۲۲ء سے کچھ اوپر اسّی برس تک افغانستان اور ماوراء النہر کے تاتار حاکم اس طرح گھات میں بیٹھے رہتے تھے کہ ہندوستان والوں کے ذراسی غفلت کرنے پر غضب ہو جاتا تھا۔ یہی مستقل خطرہ تھا جس کی بدولت ہندوستانی ترکوں کی سیاسی اہلیتیں اُبھریں اور ان کی سلطنت ایک مکمل سیاسی ادارہ بنی۔ ریاست کی سرحدیں محفوظ ہوگئیں۔ آٹھویں اور نویں صدی میں بدھ مت ہندوستان سے غائب ہوگیا۔

۳۔ ایرانی سلطنت کا غلبہ

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ پر ایرانیوں کی سلطنت ۵۰۰ ق م میں قائم ہوئی۔ جب کہ جین مت اور بدھ مت اس علاقہ میں امن و امان سے ترقی کر رہے تھے۔ سائرس (قرآن مجید کا ذوالقرنین) شاہِ ایران نے بلوچستان اور افغانستان پر قبضہ کر لیا اور دارائے اول نے گندھارا (ضلع پشاور و راولپنڈی) پر قبضہ کر لیا۔ ایرانی سلطنت کا دَور دو سو سال رہا۔

سکندر اعظم کی وفات (۳۲۳ ق م) کے بعد یہ علاقے پھر خود مختار ہوگئے۔

۴۔ یونانی دَور

ایرانی سلطنت سے ہندو بادشاہوں نے اپنی حکومت واپس لے لی تھی۔ جب سکندرِ اعظم ۳۲۶ ق م ایرانی شاہنشاہیت کو شکست دے کر افغانستان اور گندھارا کو (جس کا دارالخلافہ پشکراوتی۔ حال چارسدہ تھا) فتح کرتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا تو ٹیکسلا (جو بدھ مت کا علمی سنٹر تھا) کے حکمران نے جو راجہ پورس حکمران جہلم سے تنگ تھا۔ سکندرِ اعظم سے اتحاد کر کے اس کو راجہ پورس پر حملہ کرنے کے لئے بلایا۔ پورس کو شکست ہوئی۔

یہاں یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ہند و پاکستان کی ابتداء عام طور پر سکندرِ اعظم کے حملہ سے کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سکندرِ اعظم کے ساتھ بہترین دل و دماغ کے لوگ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے سفر کے حالات لکھے۔ اُن علاقوں کے نقشے کھینچے جہاں سے اُن کا گزر ہوا تھا مختلف آبادیوں کے افکار سے اپنی تصانیف کو مزین کیا۔

ضمناً سکندرِ اعظم کے حملوں کی چند تاریخیں تحریر کی جاتی ہیں:۔

افغانستان سے روانگی جون ۳۲۶ ق م — اساکینوں (باجوڑ سے مقابلہ) ستمبر ۳۲۶ ق م

ہاہن (ارنوس) کا محاصرہ نومبر ۳۲۶ ق م — ہاہن کی فتح دسمبر ۳۲۶ ق م

ہند میں آمد جنوری ۳۲۶ ق م

ایرانی و یونانی اثرات

... کے متعلق رہنمائے ٹیکسلا، از سر جان مارشل نے جو مفصل حالات لکھے ہیں، سے چند اقتباسات تحریر کئے جاتے ہیں ... ضلع ہزارہ، جو اس خطہ ہی میں واقع ہے ان حکومتوں کے عہد کے اثرات کا اندازہ ہو سکے۔ اس سے تاریخ کے ... عظیم اور پرانے دَور پر روشنی پڑتی ہے۔

ٹیکسلا — تاریخی حالات

شہر کا اصلی نام تکھ سلا یا تکھ شلا (سنسکرت تکشہ شلا۔ معنی تراشے ہوئے پتھر) ہے جس کو یونانی اور رومی مصنفوں نے ٹیکسلا لکھا ہے۔ شہر کی بنیاد نہایت قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ مہابھارت میں راجہ جنمے جیا کی مشہور سانپ کی قربانی کے حال میں ٹیکسلا کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد پانچویں صدی کے آغاز کے قریب ٹیکسلا کا صوبہ غالباً ایران کی اخمینی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ کیونکہ دارا کے جو کتبے پرسی پولس (قدیم ایران کا شہر) کے آثار پر اور نقش رستم میں دارا کی قبر پر کندہ ہیں۔ ان میں ایک نئے ہندی صوبہ کا ذکر ملتا ہے جس کو سلطنت کے تمام صوبوں سے زیادہ آباد اور زرخیز کہا گیا ہے۔ یہ صوبہ ایریہ، ارکوسیہ اور گندھاریہ سے بالکل جدا اور مختلف ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اغلباً پنجاب کے اس علاقے کا اکثر حصہ جو دریائے اٹک کے مشرق میں واقع ہے (جس میں ہزارہ بھی شامل ہے۔ ش ب) اور نیز تمام ملک سندھ اس صوبے میں شامل تھا۔

سکندرِ اعظم پنجاب میں ۳۲۶ ق م کے موسم بہار میں داخل ہوا۔ اس وقت سلطنت ٹیکسلا بہت آباد تھی۔ اس کی حدود ایک طرف اٹک اور دوسری طرف دریائے جہلم سے ٹکراتی تھی۔ راجہ امبھی والیٔ ٹیکسلا جو راجہ پورس والیٔ علاقہ جنوب جہلم (جو زبردست راجہ تھا) سے برسرِ پیکار تھا۔ اس نے سکندر کے پاس اپنا وفد بمقام اوہند (ہنڈ) بھیجا۔ سکندر کے ٹیکسلا آنے پر اس کی بہت خاطر کی اور اپنی فوج حملے کے وقت امداد کے لئے دی۔ سکندر نے مفتوحہ علاقہ سے راجہ ٹیکسلا کو انعام دیا اور راجہ پورس سے صلح کرا دی۔ ... سکندر نے مختلف قلعوں میں قلعہ گیر فوجیں متعین کر کے جابجا یونانی آبادیاں بھی قائم کیں۔ لیکن اس کی وفات کو جو ۳۲۳ ق م میں ہوئی چھ سال بھی نہ گزرے تھے کہ یونانی حکومت اُلٹ گئی اور چندر گپت نے یونانی افواج کو دریائے اٹک کے پار بھگا کر ٹیکسلا اور پنجاب کی دیگر ریاستوں کو سلطنت مگدھ میں شامل کر لیا۔ — اشوک کے بعد جو علاقے دارالخلافہ پٹنہ سے دور تھے۔ وہ سب خود مختار ہو گئے اور اسی طرح

ٹیکسلا بھی خود مختار ہوگیا۔ اور پھر باختری یونانیوں کے حملہ کا شکار ہوئے۔ یہ باختری یونانی حملہ آور ان یونانیوں کی اولاد تھے۔ جن کو سکندر اعظم نے باختر میں آباد کیا تھا۔ مگر ان کی حالت پنجاب کی نو آبادیوں سے مختلف تھی۔ کیونکہ نو آبادی کے قیام سے اس حملہ کے وقت تک یہ لوگ میدان ترقی میں برابر سرگرم رہے تھے۔ اس طرح گو سکندر کے ملک پنجاب کو فتح کرنے سے ہندوستان پر کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔ لیکن باختر کے آس پاس کے ممالک کی تسخیر شمال مغربی ہند میں یونانی تہذیب و تمدن کے قیام و ثبات کی بالواسطہ ذریعہ ہوئی۔ باختری حملہ آوروں نے سب سے پہلے انٹی اوکس کے داماد **ڈیمیٹریس** (DEMETRIUS) نے ۱۹۰ق م کے قریب وادی کابل، پنجاب، اور سندھ کے علاقے فتح کرلئے۔ اور اس کے بیس سال بعد **یوکرے ٹائیڈیز** (EUCRATIDES) نے **ڈیمیٹریس** سے باختر اور پھر تمام ہندوستانی مقبوضات چھین لئے جن میں ٹیکسلا بھی شامل تھا۔۔۔ یونانیوں کی حکومت ٹیکسلا میں ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ رہی ہوگی۔ کہ مغرب سے وحشی حملہ آوروں کے ایک ہی ریلے نے ان کو بھی صاف کردیا۔ یہ وحشی جو ہندوستان میں **ساکا** کے نام سے مشہور ہوئے۔ اصل میں تورانی تھے۔ مگر ایک زمانے سے سلطنت پارتھیا کے صوبہ سیستان میں بود و باش رکھتے اور وہاں کی پارتھیائی آبادی میں بے تکلف ملتے جلتے اور ان میں شادیاں کرتے تھے۔

سیستان سے نکل کر انہوں نے پہلے آرکوسیہ اور گرد و نواح کے ممالک پر قبضہ کیا اور اس کے بعد دریائے اٹک کو عبور کرکے پنجاب کی جانب بڑھے۔۔۔۔ ٹیکسلا کو فتح کیا۔ ارکوسیہ میں ان کا اقتدار ۹۵ق م میں ہوا اور دس یا پندرہ برس بعد وہ ٹیکسلا پہنچے۔ ملک میں حسب طریق قدیم مروجہ پنجاب جا بجا مرزبان یا صوبہ دار مقرر کئے۔۔۔۔ ٹیکسلا اور متھرا میں جو حاکم ان کے نائب تھے وہ بھی ساکا قوم کے تھے۔ اور قریبی رشتہ داریوں کی وجہ سے آپس میں ان کے گہرے تعلقات تھے۔

ایز (IZES) دوم کی وفات کے بعد پارتھیائی بادشاہ **گونڈوفرنیز** (GONDOPHARNES) نے ٹیکسلا اور آرکوسیہ کی سلطنتوں کو متحد کرکے اپنے زیر نگیں کرلیا۔ یہ بادشاہ نہایت باوقعت اور زبردست حکمران گزرا ہے اس کی شہرت کا غلغلہ یورپ تک جا پہنچا تھا۔ قدیم عیسائی تصنیفات میں مذکور ہے کہ اس کے دربار میں طامس حواری (ST: THOMAS) کو بھیجا گیا تھا۔ اس کے بعد گونڈوفرنیز وادی کابل کو ملحق کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس خطے میں ایک چھوٹی سی یونانی ریاست تھی۔ اس کا قلع قمع کیا اور اس کے آخری بادشاہ **ہرمیوس** (HERMAEUS) کو وہاں سے بھگا دیا۔ لیکن گونڈوفرنیز کے مرنے کے بعد اس کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔

کہتے ہیں کہ اپولونیس ساکن تیانہ (APPOLOIUS OF TYANA) غالباً ۴۴ء میں ٹیکسلا میں آیا تھا۔ یہ عہد ہندی پارتھیائی حکومت کا تھا۔ شاہ ٹیکسلا خود مختار تھا یعنی کابل کے پارتھیائی بادشاہ ورڈنیز (VARDANES) کے ماتحت نہ تھا۔ اور صوبہ قندھار بھی شاہ ٹیکسلا کے ماتحت تھا۔

ہندی پارتھیائی سلطنت کے زوال نے ہرمائنس کے لئے اپنی کھوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع دے دیا اس نے اہل کشان کے طاقتور سردار **کجولا کڈفائسز** (KAJLA KED PHISES) کے ساتھ اتحاد کرکے کابل، قندھار اور ٹیکسلا فتح کرلیا۔ قریباً ۶۰ء یا ۶۴ء میں۔ دوسری صدی عیسوی میں شاہ کنشک سریر آرائے سلطنت ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت زبردست اور باعظمت گزرا ہے اور اہل کشان میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کنشک نے اپنا صدر مقام دار السلطنت پرش پور یعنی موجودہ پشاور مقرر کیا۔ اور اپنی سلطنت کو اس قدر وسعت دی کہ وسط ایشیا سے حدود بنگالہ تک تمام ملک زیر نگیں کرلیا۔

اس کے پوتے واسودیو کی وفات جو غالباً تیسری صدی عیسوی کے پہلے نصف حصے میں واقع ہوئی کے بعد بہ تدریج اہل کشان کی طاقت کا زوال شروع ہوگیا۔ اگرچہ کچھ عرصہ کے لئے وہ پنجاب میں پھر سنبھل گئے لیکن یہ سنبھالا بھی صرف پانچویں صدی عیسوی تک رہا۔ جب کہ آفتالیوں (EPH THALITES) یعنی سفید اہل ہن (WHITE HANS) کے ایک زبردست حملے نے ان کو بالکل صاف کردیا۔

(نوٹ:۔ سلطنت کشان کا زوال غالباً کسی ساسانی حملے کی وجہ سے جلد مکمل ہوا جس کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ ٹیکسلا میں بہت سے ساسانی سکے کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں)

چینی سیاح فاہیان نے سن ۴۰۰ء میں ٹیکسلا آکر بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی آمد کے وقت شمال مغربی ہندوستان میں بدھ مذہب کی بڑی بڑی مشہور زیارت گاہیں نسبتاً آباد اور آسودہ حال تھیں۔۔۔۔ اور ان عمارات کی موجودہ حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس بے دردی اور بے جگری سے تباہ و برباد کی گئی ہوں گی۔ اس کے ذمہ دار یقیناً وحشیوں کے وہ گروہ تھے جو سفید ہن کہلاتے ہیں یہ لوگ ۴۵۵ء میں آئے۔ اور سلطنت کشان کو اپنے قبضہ و تصرف میں لانے کے بعد خاندان گپتا کی عظیم الشان سلطنت کا شیرازہ بھی بکھیر دیا۔

اس صدمہ عظیم کے بعد ٹیکسلا پھر کبھی نہ پنپ سکا۔ اور جب ہیوان چوانگ سانگ ساتویں صدی عیسوی میں یہاں آیا تو اس نے دیکھا کہ ٹیکسلا سلطنت کشمیر کا صوبہ بن چکا ہے۔ مقامی حکام آپس میں برسرپیکار رہتے ہیں اور بہت سی عبادت گاہیں تباہ و برباد ہو چکی ہیں۔

ٹیکسلا کے متعلق مشہور تاریخی واقعات

۵۵۸-۵۲۹ ق م سائرس (CYRUS) یا کورش بانی ہخامنشی سلطنت ایران۔

۵۶۳-۵۶۲ ق م شاکی منی گوتم بدھ کی ولادت —— ۵۲۷ یا ۴۶۷ ق م مہاویر بانی جین مذہب کی وفات —— ۵۲۱-۴۸۵ ق م دارائے گشتاسپ شاہ ایران۔ ٹیکسلا اور شمال مغربی ہند کا ایرانی سلطنت سے الحاق —— ۴۸۳ ق م بدھ کی وفات یا نروان —— ۳۱۷ ق م خاندان موریا کی بنا۔ ۳۱۲ ق م یکم اکتوبر سن سلجوقی کی ابتداء —— ۲۷۳ ق م اشوک کی تخت نشینی —— ۲۵۰ ق م باختر اور پارتھیا کا اعلان خود مختاری —— ۳۱۹ ق م گپتا خاندان کے بانی چندر گپت اول کی تاج پوشی سن گپتا کا اجراء —— ۲۲۶ ق م اردشیر بابکاں کا ایران کے ساسانی خاندان کی بنا ڈالنا۔

۵۲۰ ق م قندھار میں چینی سیاح چنگ یوں کی آمد —— ۶۲۹-۶۴۵ ہندوستان میں چینی سیاح [illegible] کی آمد۔

بیرونی حملہ اور شاہان باختر (بلخ)

ان کے حملے ۱۳۵ء ق م سے شروع ہوئے اور گندھارا بمعہ ٹیکسلا ان کے زیر نگیں ہوا۔ ان کی حکومت دو سو سال رہی۔ اس سلسلہ کا نامور حاکم جو پنجاب و کابل کا حکمران ہوا مینانڈر تھا۔

ستھین دور۔ قریب ۱۳۵ ق م

ستھین یعنی ساکا قوم نے چینیوں کے دباؤ سے مغرب کی طرف کوچ کیا اور باختر فتح کر لیا۔ اور پھر کابل اور بلوچستان بھی یونانیوں سے فتح کر لیا۔ انہی کے ساتھ پارتھین (پہلوا) سیستان اور قندھار سے آئے لیکن باختری یونانی گندھارا اور ٹیکسلا پر ۲۵ء ق م تک قابض رہے۔

کشن دور

۱۶۵ء ق م سے پہلی صدی عیسوی کے نصف تک اس قوم کے حملے سرحد پر شروع ہوئے اور یاونا (YAVANA) ساکا نے پہلوی حکمرانوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ۴۹ء ق م یہ ٹیکسلا پر حکمران ہو گئے اس اثناء میں ساکا اور پہلوا زیر سایہ کشن حکومت زیریں سندھ پر حکومت کرتے رہے۔ ساکا حکمرانوں مثلاً مینز (MANES) آزیز (AZES) اور آزی لوس (AZILIOES) کے سکے عام طور پر ٹیکسلا اور گندھارا سے ملتے رہتے ہیں۔ کشن بادشاہان میں سے تیسرے حکمران کنشک کی حکومت شمال

مغربی ہندوستان اور کشمیر پر حاوی تھی۔ اور پشاور اس کا دارالسلطنت تھا۔ اس خاندان کی حکومت سو سال تک رہی۔ اس خاندان کے خاتمہ کے بعد دو سو سال تاریخ ہند کے اوراق تاریکی میں ہیں۔ اس دوران ستھین وغیرہ (تاتاری) کے دوسرے قبیلے اس طرف آتے رہے۔ کنشک کے بعد وسط ایشیا کو ایک مضبوط قوم "سفید ہن" نمودار ہوئی۔ ان ہنوں نے گندھارا پر قبضہ کرنے کے بعد گپتا خاندان کی قیادت ختم کر دی۔ لیکن یہ حکومت دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ بعض مورخین کے خیال میں جاٹ اور راجپوت ان تاتاریوں کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہن کی آمد کے بعد اندازہ کے مطابق ۵۰۰ء سے ۸۰۰ء تک پھر کسی بیرونی حملہ کا پتہ نہیں چلتا۔

ہندو شاہیہ

دسویں صدی عیسوی میں ہندو شاہیہ گندھارا (صوبہ سرحد) سے نکل کر سوات اور لغمان افغانستان تک کی حکومت تھی۔ راجہ جے پال اس خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان کا پایہ تخت لاہور تحصیل صوابی ضلع مردان تھا۔ نہ لاہور پنجاب۔

انند پال اور محمود غزنوی کی جنگ میدان پشاور میں ہوئی۔ جب کہ وہ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ اسی لاہور تحصیل صوابی میں محمود غزنوی نے راجہ جے پال کو گرفتار کیا تھا۔ جے پال نے شکست کے بعد ہنڈ کی بجائے نندنہ (جو تحصیل پنڈ دادن خان میں چوہا سیدن شاہ سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس جگہ اب بھی آثار قدیمہ موجود ہیں) کو ۱۰۰۲ء کے بعد پایہ تخت بنایا۔

مسلمانوں کے حملوں کا آغاز

دسویں صدی عیسوی تک شمالی ہندوستان ہندو راجگان کے زیر نگیں رہا۔ اس صدی میں ترکوں کے حملے وسط ایشیا اور افغانستان سے ہندوستان پر شروع ہوئے۔ اس وقت کابل، کشمیر اور ملتان کا راجہ جے پال تھا۔ اس کے زمانہ میں غزنی کی مسلمان سلطنت اٹھ رہی تھی۔ راجہ جے پال نے اس سلطنت کو ابتداء ہی سے مٹا دینے کے منصوبے باندھے۔ اور حملہ کر دیا۔ لیکن شکست کھائی۔ اسی راجہ نے ۹۷۹ء میں دوسرا حملہ کر دیا لیکن صلح ہو گئی۔ ہندوستان پر سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کی ابتداء ان دو جنگوں سے ہوئی جو جے پال نے حملے کر کے شروع کی تھیں۔

ہزارہ میں موجودہ افغان قوموں کے اجداد محمود غزنوی کے ہمراہ تھے۔ گویا اس کے عہد سے پٹھانوں کا خروج سرحد، ہزارہ، ہندوستان کی طرف ہوا۔

درانیوں (افغانوں) کی آمد سے پہلے اس خطہ (ہزارہ) کی صحیح تاریخ تاریکی میں ہے۔ اگرچہ اس خطہ کا ذکر
اکبری میں ہے۔ اور فرشتہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان ہزارہ (حال علاقہ
ہری پور) حاکم اٹک کے ماتحت تھا جب کہ اس ضلع کے دوسرے حصوں پر گکھڑوں کی حکومت تھی جنہوں
ضلع راولپنڈی و جہلم کی تاریخ میں اپنا نام روشن کیا ہے۔ اور ان کی سلطنت کا اصلی مرکز اور حکومت کا دارالخلافہ
بھی وہیں تھا۔ جب مغلیہ سلطنت میں ضعف آ گیا (گکھڑ مغلوں کے حلیف اور مستقل بازو تھے) تو دریائے سندھ
سے پار افغان قوموں کے حملے شدت اختیار کر گئے اور اُن کے لئے ہزارہ ایک آسان شکار بن گیا۔ خاص اس
وقت میں جب کہ گکھڑوں کی حکومت بھی کمزور ہو گئی تھی اور پرانی قومیں۔ گوجر، کرڑال اور ڈھونڈ بھی
طاقت کھو چکی تھیں۔

ہزارہ کے بندوبست

نقل از قوم گکھڑ کے حالات وغیرہ مندرجہ بندوبست ۱۸۶۸-۷۲ء

ابتدائی عملداری سرکار انگریزی میں بھی ۱۸۴۷ء میں سے بندوبست سرسری اول تین سالہ بند
دوم پنج سالہ بلا دریافت حقوق ملکیت اس علاقہ کے دیہات کا علی العموم بنام اقوام متفرق قا
اراضی کے ہو گیا۔ اور قوم گکھڑ کو جو بعض دیہات پر قابض و نیز جاگیردار بھی تھی مدغیرہ تحقیقات
ملکیت کل علاقہ بندوبست قانونی پر ہوتا رہا۔ اور گو کہ میعاد بندوبست سرسری دوم کی ۱۹۱۳
مطابق ۱۸۵۶ء گزر چکی تھی۔ مگر ۱۸۶۱ء تک بندوبست قانونی شروع نہ ہوا۔ کچھ تحقیقات دیہہ
معمولی بطور سرسری کے بہ تیاری شجرہ ہائے انساب وغیرہ ہوتی رہی۔ ۱۸۶۲ء میں بندوبست قا
ماتحت حکام ضلع بہ عہد میجر آدمس صاحب جاری ہوا۔ اور تحقیقات حقوق اس علاقہ کی بطور گکھ
شروع ہوئی اور ایک مسل بہ تحریر اظہارات معتبران قوم گکھڑ یعنی راجگان وغیرہ اور اسی
نمبرداران اقوام متفرق معتبران و قابضان علاقہ میرے (اعظم بیگ) محکمہ میں مرتب ہوئے۔
ضروری بھی جس کے پاس جو تھیں وہ شامل اس کے کرائی گئیں اور وہ مسل روبروئے میجر آدمس
(ADAMS) کے بہ مقام بھلڑ بہ حاضری تمام متعلقین مقدمہ بعد سماعت تمام اظہارات و ملاحظہ
وگفتگو ہائے زبانی ہر ایک فریق کے جلسہ عام میں تصدیق ہوئے۔ صاحب بہادر نے بموجب خیال
وقت کے چٹھی انگریزی میں کچھ تجویز قائم کرنے۔ حقوق اس قوم گکھڑ کی تجویز اپنے صدر میں پیش کی
واسطے دریافت بعض امور اور بہ لحاظ بعض حالات کے واپس آئی اور بہ سبب تغیر و تبدل

حکام ضلع کے امورات سرحدی سے بندوبست قانونی پورا نہ چلا اور اس تجویز پر ملتوی ہو گیا کہ صاحب
بندوبست علیحدہ مقرر ہو کر اس کو انجام دیں۔ تا ۱۸۶۸ء میں محکمہ بندوبست بہ تشریف آوری کپتان
صاحب مہتمم بندوبست کے قائم ہوا۔ اب مارچ ۱۸۷۰ء میں قواعد بندوبست تحقیقات و تشخیص
ہر قسم کے حقداران اراضی کے سرکار تجویز ہو کر آئے۔

سب سے پہلا سرسری بندوبست سکھ دربار کے حکم سے میجر ایبٹ نے ۱۸۴۷ء میں کیا۔ اس بندوبست
ثانی ۱۸۵۲ء میں کی گئی۔ بموجب کاغذات سنٹرل گورنمنٹ آف انڈیا خط مورخہ ۲۶ راپریل ۱۸۵۰ء
بندوبست ۱۸۵۰ء میں نیول چیمبر لین کے زیر نگرانی ہوا تھا۔ کیونکہ اس خط میں یہ تحریر ہے کہ موضع دوبندی
چند منشی سرکار سکھاں کی جاگیر ایک ہزار روپیہ کی تھی، ضبط کی جائے۔ اور اس گاؤں سے مالیہ کنکوت
لیا جائے۔ بلکہ حسب ضابطہ پیمائش سے مقرر کیا جائے۔

پہلا قاعدہ بندوبست برطانوی عہد میں ۱۸۷۲-۷۳ء میں ہوا جو کپتان ویلس صاحب نے ۱۸۶۸ء میں
شروع کیا۔ اور ۱۸۷۴ء میں مکمل ہوا۔ دوسرا بندوبست ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر ۱۹۰۴ء میں ختم ہوا۔ اس کے
بعد اور بندوبست ہوئے جن کا حال کسی اور جگہ درج ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد

ہزارہ کا ترمیمی بندوبست مارچ ۱۹۴۹ء میں کیا گیا۔ کل مالیہ -/۵۵۲۰۳۰ روپیہ مقرر کیا گیا جبکہ
اس سے پہلے مالیہ -/۴۴۷۵۸۴۰ روپیہ تھا۔
بالائی تناول (جاگیر نواب صاحب امب) کا علاقہ ۱۹۵۰ء میں باضابطہ ضلع سے مدغم کر دیا گیا۔ اور
اس کا پہلا بندوبست ۱۹۵۱-۵۲ء میں ختم ہوا۔ کل مالیہ -/۱۶۵۵۴ روپیہ مقرر ہوا۔ اتمان زئی۔ امازئی بعد گدون
علاقہ کا پہلا بندوبست ۱۹۶۰-۶۲ء میں ہوا۔ ان علاقوں کا کل مالیہ -/۳۷۰۰۰ روپیہ اور دیگر محاصلات
۴۵۶۶ روپیہ اور جندرات کا -/۱۰۶۴ روپیہ مقرر ہوا۔ جو خریف ۱۹۶۲ء سے وصول کرنا شروع کیا گیا۔

بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء

چند حقائق ماخوذ از تاریخ ہزارہ۔ مرتبہ ویلس مہتمم بندوبست

۱۔ تعداد دیہات۔ تحصیل ہری پور ۳۱۰۔ ایبٹ آباد ۳۵۸۔ مانسہرہ ۲۱۸۔ میزان کل ۸۸۶
۲۔ بڑا شہر ہزارہ میں ہری پور ہے جو سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۰ بکرمی ۱۸۲۳ء خاص میدان ہزارہ میں

آباد کیا۔ سکھوں کے اور ابتدائی عہد انگریزی میں بھی یہی قصبہ ہزارہ کا صدر مقام رہا۔ ۱۸۵۳ء میں دھمتوڑ کے علاقہ میں صدر مقام مقرر رہا۔ بعد میں موجودہ جگہ پر جو میجر ایبٹ کے نام پر مشہور ہے ایبٹ آباد آباد ہوا۔

۳۔ تعداد پٹواریاں۔ مسلمان ۵۵۔ ہندو ۳۶۔ سکھ ۱۰۔ میزان کل ۱۰۱

۴۔ نتھیا گلی اور مری کے پہاڑوں میں سڑکیں ۱۸۵۶ء کے بعد بنائی گئیں جب قوم ڈھونڈ نے ۱۸۵۷ء میں مری میں شورش کی۔ اور خالس پور میں گورہ فوج کی چھاؤنی بنا دی گئی۔

۵۔ علاقہ کاغان کی بولی بہت شیریں ہے۔ باشندگان علاقہ اپنی شیریں گفتاری سے مثل پکا راگ، سننے والے کو مسحور کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے سننے والا ان کی بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

۶۔ دریائے سندھ میں دو دفعہ سخت طغیانی آئی ۱۰۔ ۱۱ ماہ جیٹھ سمت ۱۸۹۸ مطابق ۲ جون ۱۸۴۱ء
۲۔ ۱۲ ماہ بھادوں سمت ۱۹۱۴ مطابق ۲۶ اگست ۱۸۵۷ء

۷۔ کٹھہ رنگیلا، ہری پور۔ ایک ہندو ساکن درویش کا بنایا ہوا ہے۔

۸۔ کٹھہ جاگل۔ جاگل نجیب اللہ خان ترین کے حصہ میں تھا۔ اس نے اپنے خرچ سے کٹھہ کلاں رنگیلا سے جس قدر زائد پانی فالتو ہو کر گرے وہ کٹھہ جاگل میں جاتا تھا۔

۹۔ ذکر جھیل ہائے۔ سیف الملوک سر۔ لولو سر۔ بال سر۔ تینوں کاغان میں ہیں۔

۱۰۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کی بلندی۔ موسیٰ کا مصلیٰ کاغان ۱۳۳۷۸۔ بھلیچہ (کالا ڈھاکہ) ۹۶۴۴ ٹھنڈیانی ہربن (ایبٹ آباد) ۹۲۴۳۔ میاں جانی دی چوکی (جنوب مشرق ایبٹ آباد) ۹۷۹۳۔ موج پوری (جنوب مشرق ایبٹ آباد) ۹۲۳۲۔ پیر تھان (گندگر) ۴۴۱۹

۱۱۔ سڑک ہائے۔ ۱۔ پہلے زمانہ میں کوئی خاص سڑک اس ضلع میں نہ تھی۔ حاکمانِ وقت سیر کے لئے ہندوستان سے کشمیر یا کابل سے کشمیر کو جاتے ہوئے اس ضلع سے گزرتے تھے تو کوئی پختہ سڑک نہ تھی۔ راستہ حسب ذیل تھا۔

کشمیر سے پشاور۔ کشمیر سے بارہ مولا۔ اوڑی۔ مظفر آباد۔ بیرن گلی۔ دھمتوڑ۔ نواں شہر۔ سرائے صالح

دوسرا راستہ:۔ اوڑی سے دوپٹہ سلطان۔ مظفر آباد۔ گڑھی حبیب اللہ خان۔ چھتر بڑ۔ مانسہرہ۔ مانگلی۔ سلہڈ۔ نوشہرہ۔ سرائے صالح۔۔۔ سرائے صالح سے آگے۔۔۔ (سرائے صالح میں میر امنگ دیو پر مقام ہوتا تھا) سرائے صالح۔ سلطان پور علاقہ ہرو۔ حسن ابدال۔ اٹک۔ یہ کابل کے لئے تھا۔

لاہور کے لئے۔ سرائے صالح کے میر امنگ دیو سے حطار۔ سرائے کالا۔ مارگلہ۔ راولپنڈی۔

نوٹ:۔ تجارت کشمیر زیادہ تر پشمینہ کی تھی عموماً اکتوبر میں بغچہ ہائے پشمینہ جس کو بدری کہتے تھے کشمیر سے کابل کو روانہ ہوتے تھے۔ گڑھی حبیب اللہ سے مانگل تک سعادت خان صواتی کے زیر حفاظت

قافلے چلتے تھے اور اس کا بدرقہ ساتھ ہوتا تھا۔ اور پانچ روپیہ فی صد حق حفاظت مقرر تھا۔ مانگل سے مقصود تک قوم جدون کی حفاظت تھی۔ اور وہ بھی یہی حساب لیتے تھے۔ اس کے بعد علاقہ میدانی تھا اور بدرقہ کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔

جب سکھوں کی بدامنی شروع ہو گئی تو یہ قافلے مانسہرہ سے جلو، مربقہ۔ بھوہار۔ بیڑ کے راستے سے جانے لگے۔ اور تنولیوں نے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ اور وہ حق حفاظت پانچ فیصد لینے لگے۔ جب حکومت دورانی میں زیادہ ضعف ہونے لگا تو تنولیوں نے پندرہ، بیس اور پچیس فیصد تک لینا شروع کر دیا۔

یہ راستہ صرف پشمینہ (بدری) کے لئے تبدیل ہوا تھا۔ باقی فوج اور تجارت کا وہی پرانا راستہ رہا۔

۲۔ راولپنڈی سے ایک سڑک جو شاہ راہ لاہور پشاور سے جدا ہو کر اس ضلع میں آتی ہے۔ وہ موضع حطار۔ کوٹ نجیب اللہ۔ ہری پور۔ چھنبہ۔ سلطان پور۔ ایبٹ آباد سے ہو کر مانگل۔ مانسہرہ۔ گڑھی حبیب اللہ مظفر آباد جاتی ہے۔ اسی سڑک کی ایک شاخ مانسہرہ سے نکل کر میدان پکھل سے ہوتی ہوئی اگرور کو جاتی ہے۔ اس کی ایک شاخ ایبٹ آباد سے نکل کر شیروان۔ کرپلیاں۔ دربند تک جاتی ہے۔ اور اس کی ایک اور شاخ ایبٹ آباد سے دھمتوڑ۔ ڈونگا گلی۔ چھانگلہ گلی۔ مری پہنچ جاتی ہے۔ ایک شاخ ہری پور سے تربیلہ تک۔ اور اسی کی ایک شاخ داڑی۔ تھپلہ۔ صوابی میرا۔ علاقہ بدہنک۔ نواں گراں۔ کھرکوٹ۔ علاقہ کلالی تک

پرانے شاہراہ

اگرچہ مندرجہ بالا بیان بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق پہلے زمانہ میں کوئی خاص سڑک اس ضلع میں نہ تھی، لیکن تاریخی ثبوت موجود ہے کہ پرانے شاہراہ اس ضلع میں موجود تھے۔

سندھ تہذیب کے اثرات۔ موہنجوڈارو سے دو پہیوں والی گاڑی کے کھلونے برآمد ہوئے ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس ملک (موجودہ پاکستان) میں گاڑی کا رواج تھا۔ اور لازماً اس کے لئے سڑکیں بھی تھیں۔

۳۲۳ سنہ ق م میں جب سکندر اعظم ٹیکسلا پہنچا تو ملک میں سڑکیں موجود تھیں۔ جن پر قافلے اور مختلف قسم کی گاڑیاں چلتی تھیں۔ اور مقررہ فاصلہ پر سرائے اور فاصلوں کے نشان تھے۔ اور ڈاک رسانی کا مکمل انتظام تھا۔ یونانی مورخ میگا ستھینز لکھتا ہے:۔ کہ پاکستان میں ایرانی شاہی سڑکوں کی طرح سڑکیں موجود تھیں جن کی چوڑائی ۲۴ فٹ تھی اور ہر ۱½ میل پر ایک سنگ میل تھا۔ مسافروں کے لئے سرائیں تھیں اور پولیس تھانے تھے۔ جو سڑکیں شہروں کے درمیان سے گزرتی تھیں تو وہاں کے

لوگ سڑکوں کو درست حالت میں رکھنے کے ذمہ دار تھے ۔ اور جو کوئی سڑک کو خراب کرتا تھا۔ یا استعمال میں حارج ہوتا تھا اس کو جرمانہ کیا جاتا تھا۔ آگے چل کر شیر شاہ سوری نے ان ہی شاہ راہوں کو بہتر طور پر منظم کیا۔

ان تاریخی واقعات سے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ٹیکسلا اور ہزارہ میں کشادہ سڑکیں تھیں جن پر آمد و رفت ہوتی تھی۔ مغل بادشاہوں کے لشکر، سامان اور شاہی سواریاں اس ضلع سے گزر کر ہی کشمیر جاتی تھیں۔ اور یہی حال درانی اور سکھوں کی حکومت میں تھا۔ ان کی توپ گاڑیاں جن میں گھوڑے جتے ہوئے ہوتے تھے ان سڑکوں ہی سے گزرتے ہوں گے۔

قحط

حال قحط کلاں، جو سمت ۱۸۳۶ ۔ مطابق ۱۷۷۹ء میں ہوا

۵ ماہ کاتک سمت ۱۸۳۶ (۱۷۷۹ء) دو بجے دن ناگاہ ایک زلزلہ نہایت ہی زور سے ہوا۔ کہ اس کی ایک ہی جنبش سے ضلع کے سب دیہات کے کوٹھے ہائے گر گئے۔ اور ہزاروں آدمی دب کر مر گئے۔ جملہ مسلمانوں کو ایک ہی جگہ دفن کر دیا گیا۔ اور ہندوؤں کو ایک جگہ، گرے ہوئے مکانوں کی لکڑیوں سے جلا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک مہینہ تک نرم نرم بارش ہوتی رہی اور زلزلہ بھی نرم نرم آتا رہا۔ لوگ بہت زیادہ ڈرے ہوئے تھے اسی سمت ۱۸۳۶ سے قحط کے آثار شروع ہو گئے۔ بارش بند ہو گئی۔ اس دوران پکھلی کے جوہڑوں میں صرف کچھ پیداوار ہوتی رہی۔ نالہ سرن میں پانی اتنا کم ہو گیا تھا کہ لوگ پتھروں پر خشک پاؤں پار ہو جاتے تھے۔ کھلابٹ کے نزدیک جلسی اور مقصود کا پانی قائم رہا۔ اور ان علاقوں سے کچھ غلہ پیدا ہوتا رہا۔ پوٹھوہار سے اکثر لوگ اس ضلع میں آگئے اور کشمیر سے بھی۔ یہ قحط ربیع سمت ۱۸۳۷ (۱۷۸۰ء) سے شروع ہو کر بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار ہاڑ سمت ۱۸۴۱ (۱۷۸۴ء) میں بارشیں شروع ہو گئیں اور قحط ختم ہوا۔

۲۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں پنجاب اور کشمیر میں ۱۵۹۵ء تا ۱۵۹۸ء میں سخت قحط پڑا جس سے ہزارہ بھی متاثر ہوا۔ جون ۱۵۹۷ء میں اکبر بادشاہ کشمیر میں تھا۔ کشمیر سے بہت سے لوگ ہجرت کر کے چلے گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں جتنے کشمیری آباد ہیں اُن کے آباؤ اجداد اسی وجہ سے آئے ہوں گے۔ اکبر بادشاہ نے لوگوں کے لئے مفت لنگر جاری کئے۔ اور سب جوبات ٹیکس معاف کر دئے۔

۳۔ پنجاب و ہندوستان میں ۱۸۶۰-۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۹-۱۸۷۰ء میں شدید قحط پڑے تھے۔ مگر ہزارہ محفوظ رہا۔

۴۔ سنہ ۱۹۲۱ء کا قحط غلہ کی سخت گرانی کی شکل میں نمودار ہوا لیکن جلد ہی اس پر قابو پا لیا گیا۔

رواج نامہ ــــ اقوام ہزارہ

مرتبہ تاریخ ۱۷ اپریل ۱۸۶۹ء بندوبست قانونی ضلع ہزارہ سے چند اقتباسات

قوم تارخیلی

۱۔ رواج پگ ونڈ ہے۔ لیکن والد کو عین حیات میں اختیار ہے کہ پگ ونڈ کرے یا چونڈہ ونڈ۔ (پگ ونڈ۔ لڑکوں کے درمیان مساوی تقسیم۔ چونڈہ عورت کی بناء پر تقسیم)

۲۔ والد کو اختیار ہے جس بیٹے کو زائد حصہ دیوے۔ بعد فوتیدگی والد کے تقسیم برابر ہوگی۔

۳۔ خانگی کا حصہ جدا ہوتا ہے۔ اس کے منہا کرنے کے علاوہ حصہ خانگی کے تمام تقسیم حصہ بموجب شرعی۔ والد کو اختیار ہے کہ حصہ خانگی کم کرے یا زیادہ۔

۴۔ حصہ فرزندان مختلف اقوام کی عورات کا۔ والد کو اختیار ہے کہ فرزندان عورات اقوام اشراف و کمیان کو جس قدر چاہے حصہ دیوے۔ کچھ حصر اس بات پر نہیں کہ فرزندان اقوام اشراف مثلاً افغان و گکھڑ و تنولی کو بہ نسبت فرزندان عورات اقوام کمینہ مثلاً تیلی و بافندہ زاید حصہ دیوے خواہ کم دیوے اور بعد وفات اس کی اولاد عورت اشراف کو فوق ہے اولاد عورت کمین پر۔ کمی ذیل ہیں:۔ آوان، تیلی، گوجر، لوہار وغیرہ کو کچھ حصہ نہیں ملتا۔ ہاں اگر ڈولی میں کسی قوم سے منکوحہ ہو کر آوے۔ تو اُس کو رواج محروم نہیں کر سکتا۔ اور حصہ مساوی نہیں پاتا۔ گذارہ غلہ پانچ چھٹے تک پاتا ہے یا اراضی دو قلبہ ہا۔

رواج نامہ اُتمان زئی و ترین قوم کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۔ کہ ہزارہ میں آوان، تنولی اور گوجران سے پہلے آباد تھے۔

۲۔ تنولیوں میں صوبہ خانی اور کرڑالوں میں سرداروں کا گھر ہی ان (اتمان زئی و ترین اقوام) کے نزدیک قابلِ عزت تھا۔ اور ان کی ہمسری کے یہ قائل تھے۔

۳۔ اتمان زئی قوم کے رواج نامہ پر سب اکابرین کے انگوٹھے ثبت ہیں۔ سوائے خانی زمان خان آف کھلابٹ، انہوں نے اپنی قلم سے پختہ خط میں دستخط کیا ہے (خانی زمان خان بقلم خود کلابٹ والہ) انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کلابٹ (نہ کہ کھلابٹ) والہ تحریر کیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں اس وقت تک پشتو لہجہ و تلفظ کا اثر موجود تھا۔ اُن کے والد خان میر زمان خان اتمان زئی (پار دریائے سندھ سے) موضع کوٹھہ یا ٹوپی سے یہاں آئے۔ اور خانی زمان خان نے یہ دستخط ۱۸۶۲ء کے بندوبست کے رواج نامہ پر کئے ہیں۔ اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اُن کے آئے صرف ایک پشت (پچیس سال) گزر کر دوسری پشت کا یہ

عہد تھا۔ اس امر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ سیدخانیوں کی جاگیرنشی اور عہد انگریزی ہی سے باقی جاگیرداران، پرانے جاگیردار عہد مغلیہ، درّانی و سکھان سے ہے۔ تیسری بات قابلِ غور یہ ہے۔ کہ اس وقت باقی خوانین۔ خاص کر اُتمان زئی اَن پڑھ تھے۔

رواج نامہ قوم ڈھونڈ میں جولاہا۔ ترکھان، موچی، لوہار، گوجر اور آوان مستورات کو کمتر درجہ کا خیال کیا جاتا تھا۔ اور ان کی اولاد دوسری اقوام کی عورتوں سے کمتر درجہ کی خیال کی جاتی تھی۔

سکھوں کا عہد

اور

اُن کے مظالم کی داستانیں - چند زبانی روایتیں

سکھ قوم مسلمانوں سے عناد و دشمنی کے گہوارہ میں پروان چڑھی۔ اور ان کا قومی کردار مسلمانوں کی حکومت کی تخریب کے خمیر سے گوندھا گیا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن حقیقت کا اظہار مختصراً ان لفظوں میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جب سکھوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے اپنے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و سختی کی انتہا کردی۔ ان کے نزدیک کسی قانون یا اخلاق کی پابندی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ان کے اس خلل مزاج نے آخر کار اُن کے درمیان ایسی پھوٹ ڈالی۔ کہ قوم اپنے ہی افراد کو قتل و برباد کرتی رہی۔ اور اپنا چراغ اپنی ہی پھونکوں سے بجھا دیا۔

چونکہ اس قوم کی اُٹھان کی بنیاد کسی تعمیری جذبہ کے ماتحت نہ ہوئی تھی۔ وہ تخریب کے جذبے سے اُٹھی۔ اور اپنا تخریبی کردار ادا کر کے فنا ہوگئی۔ اصلاًیہ مسلمانوں کی حکومت کی تخریب کے لئے اُٹھی اور اپنا پارٹ ادا کر کے سلطنت کی سٹیج سے اتر کر حکومت انگریزوں کے حوالہ کر کے نابود ہوگئی۔

سکھوں کی سختی و مظالم کی داستانیں

اِن داستانوں کا پوری طرح اندراج تو ممکن نہیں کیونکہ وہ بہت ہیں اور ضلع ہزارہ کے چپہ چپہ پر اُن کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اور بطور قصہ ہائے پارینہ اب بھی بیان کی جاتی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے

۱۔ اُن کے عہد میں گائے بھینس ذبح کرنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینا تھا۔ اس ضمن میں زبانی روایتوں کی بجائے ایک تاریخی شہادت کافی ہے۔ جو پنجاب ریکارڈ آفس کے مانوگراف ۱۸۱۲ء ہے جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کے حالات باجی راؤ پیشوا پونا کو اس کا سفیر لاہور سے بھیجتا رہتا تھا درج ہیں وہ اپنی ڈائری مورخہ ۵ ار مارچ ۱۸۱۲ء میں لکھتا ہے۔ کہ جالندھر کے مسلمانوں پر ایک گائے ذبح کرنے پر

پانچ ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۲۔ سکھ حکومت کے زمانہ میں بیگار اور سختی کا عام رواج تھا۔ راستہ چلتے کسی شخص کو بھی بیگار میں پکڑ لیتے تھے

۳۔ سکھوں کے عہد میں مجرموں (یا ملزموں) کو مجمع عام میں سزا دی جاتی تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال دی جاتی ہے۔ ان کے زمانہ میں موضع ڈھینڈہ کے ایک مشہور ڈاکو کو موسم خان نمبردار دیہہ نے پکڑ کر سکھ حاکم کے سامنے پیش کیا۔ سکھ نے وہیں حکم دیا کہ اس کو درخت سے سولی دی جائے۔

حسب دستور ڈھول پٹوایا گیا تاکہ لوگ جمع ہو جائیں۔ لوگ جمع ہو گئے اور ڈاکو کو سولی دینے کا انتظام کیا جانے لگا۔ چور سکھوں کی ذہنیت سے واقف تھا۔ وہ تفتیش کے فن سے ناآشنا اور فوری حکم دینے کے عادی ہیں۔ کیوں نہ موسم خان نمبردار کو بھی اپنا ساتھی بتا کر سولی پر لٹکوا دیا جائے۔ اس ڈاکو نے ہزارہ کی زبان میں یہ گیت گانا شروع کر دیا ؎

موت دی ڈھولکی نہ مار سکھا   میں تے موسم خان کدے دے یار سکھا

ترجمہ :- اے سکھ، موت کی ڈھولکی پیٹ کیوں نہ بجا ہیں اور موسم خان نمبردار پرانے دوست و ہم پیشہ ہیں لہٰذا اس کو بھی میرے ساتھ سولی پر لٹکایا جائے۔

موسم خان زیرک آدمی تھا وہ سمجھ گیا کہ سکھوں کی حکومت میں دلیل و اپیل کی گنجائش نہیں۔ اور نہ صفائی و شہادت کارگر ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے فوراً اپنی حاضر جوابی سے جان بچائی اور کہا ؎

ڈب ڈب کے ڈھولکی مار سکھا   نہ چور، نہ چوراں دے یار سکھا

یعنی زور زور سے ڈھولکی بجاؤ مجھے کوئی فکر نہیں۔ کیونکہ نہ میں چور ہوں اور نہ چوروں کا دوست۔

۴۔ سکھوں کی حکومت کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی۔ مالیہ و دیگر واجبات حکومت کے جمع کرنے کے لئے کوئی مستقل نظام نہ تھا۔ عموماً گاؤں کے خان سے گاؤں کا مالیہ اجارہ کے طور پر اور تخمینہ سے مقرر کر کے وصول کیا جاتا تھا۔ اگر یہ خان کسی شخص کو عدم ادائیگی پر حاکم کے سامنے پیش کرتا۔ تو حاکم سخت جبر سے اور تکلیف دہی سے اس شخص سے مالیہ وصول کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں سے (کہا جاتا ہے) کہ ایک شخص سے وصول کے لئے سر پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا گیا تھا اور وہ شخص سارا دن کھڑا رکھا گیا۔

۵۔ جس طرف سے سکھوں کی فوج یا کسی گروہ کی آمد ہوتی ہے۔ لوگ اُن کے مظالم کے خوف سے گاؤں ویران کر کے پہاڑوں کے دامن میں پناہ لے لیتے تھے۔ غلہ و دیگر سامان جو ساتھ نہ لے جا سکتے تھے۔ گھروں میں کھود کر ان میں چھپا دیتے تھے ــــ ان مظالم کی وجہ سے اِن کی حکومت کو ہزارہ میں صرف ایک انگریز میجر ایبٹ ہی نے آ کر ختم کر دیا۔ جس ملک کو سکھ حکومت کے زور سے رعیت نہ کر سکے اس کو ایک ہوشیار

رحمدل اور قابل انگریز نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔

ہزارہ کے عہد ماضی کی چند نامور ہستیاں

میدان ہزارہ میں۔ قوم ترین کے حاکمانہ عہد کی زیادہ مشہور ہستی نجیب اللہ خان کی ہے۔ جو ابنائے ہزارہ میں پہلا شخص ہے۔ جو اس علاقہ کا حاکم حکومت درانی کی طرف سے مقرر ہوا۔ اس کا آبائی گاؤں درویش تھا۔ کوٹ نجیب اللہ خان (یعنی قلعہ بنا کردہ نجیب اللہ خان) اس کا بنا کردہ ہے۔ اس کی وفات کے بعد اس کی بیوی نبی بیگم حکومت کا کام بڑی قابلیت سے چلاتی رہی۔ کیونکہ اس کا بیٹا محمد خان نابالغ تھا اس نے مقدم مشرف کو اپنا نائب بنایا۔ اور اپنی فراست، قابلیت اور معاملہ فہمی سے کار حکومت کو خوب طور پر چلایا۔ محمد خان جب جوان ہوا۔ تو اس نے کاروبار حکومت سنبھال لیا۔ اس اثنا میں سکھوں کی آمد اس ضلع میں ہو چکی تھی۔ اس نے مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا۔ اور آخر جان کی بازی اُن کے ہاتھوں سے ہاری اس کے بعد غلام خان نے سکھوں اور پھر انگریزوں کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا۔ اور اپنے مشیروں کی بے وفائی سے آخر کار انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور انجام کار شہادت پائی۔

سکھوں کے زمانہ میں صالح محمد مشوانی۔ بوستان خان ترین اور شیخا جدون بھی نامور ہستیاں گزری ہیں۔ جو سکھوں سے مقابلہ کرنے کی پاداش میں توپ سے اُڑا دئے گئے تھے۔ سکھوں کے عہد میں ایک اور نامور ہستی میر زمان خان سید خانی کھلابٹ میں نمودار ہوئی اور اپنی بہادری اور ہمت سے علاقہ خالصہ میں اپنا رسوخ پیدا کیا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا خانی زمان خان عہد انگریزی میں بہت نامور گزرا ہے سکھوں کے زمانہ سے پہلے جلال خان پنی اور پھر اس کا بھتیجا منیر خان اپنی قوم اور علاقہ میں صاحب عزت اور با اقتدار رہے۔ اُن کی امداد و اعانت ہمیشہ میر زمان خان کے ساتھ رہی اور اس کا طاقت ور دست و بازو رہا۔ کرڑال قوم میں سردار حسن علی خان نامور سردار سکھوں کے عہد میں ہوا۔

سکھوں کے آخری زمانہ میں سید اکبر ستھانہ والے اور نواب خان تنولی، خان شنگڑی با اثر ہستیاں نمودار ہوئیں انہوں نے سکھوں کی حکومت کی جڑیں بامداد غلام خان ترین ہلا دیں۔

قوم گکھڑ میں بہت سے نامور لوگ پیدا ہوئے۔ اُن کے مفصل حالات اس قوم کی تاریخ میں درج ہیں یہ سلطان محمود غزنوی اور مغلیہ عہد میں بہت با اثر اور صاحب حکم رہے سکھوں کے عہد میں راجہ حیدر بخش خان نامور سردار ہوا

"بااخلیار قوم سے انگریزی عہد میں خانی زمان خان ایک زبردست انسان پیدا ہوا اس نے [illegible] کر لی لیکن انگریز کی غلامی قبول نہ کی۔

صوبہ اور ضلع کے درباری

مطابق ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء

صوبہ فہرست ۔ ضلع فہرست

۱ ۔ نواب سر محمد اکرم خان ولد جہانداد خان والئی امب تاریخ پیدائش ۱۸۴۶ء ۔ وفات جنوری ۱۹۰۶ء ۔ ۱۰

۲ ۔ خان بہادر راجہ جہانداد خان ولد راجہ حیدر بخش خان ۔ گکھڑ خانپور ۔ وفات نومبر ۱۹۰۶ء ۔

۳ ۔ راجہ شیر احمد خان ولد راجہ فیروز خان گکھڑ ۔ باغپور ڈھیری ۔ پیدائش ۱۸۶۰ء ۔ ۱۹

۴ ۔ محمد حسین خان ولد سمندر خان سواتی ۔ گڑھی حبیب اللہ خان ۔ پیدائش ۱۸۶۶ء ۔ ۱۸

۵ ۔ سلطان برکات خان بمبہ ولد رحمت اللہ خان ۔ بوئی ۔ پیدائش ۱۸۵۱ء ۔ ۲۰

۶ ۔ عطا محمد خان ولد عبدالرحمن خان تنولی ۔ خان پھلڑہ پیدائش ۱۸۶۹ء ۔ ۲۶

۷ ۔ خانی زمان خان ولد میر زمان خان ۔ اتمان زئی ۔ کھلابٹ ۔ وفات ۱۹۰۵ء ۔ ۲۸

۸ ۔ سید محمد خان ولد علی بہادر خان ۔ کرڑال ساکن ڈیران ۔ تاریخ پیدائش [illegible] ۔ ۱۰

۹ ۔ سلطان محمد خان ولد عطا محمد خان ۔ تنولی ۔ بیڑ ۔ پیدائش ۱۸۷۴ء ۔ ۱۵

۱۰ ۔ قاضی فضل الٰہی ولد قاضی فیض عالم آوان ۔ سکندر پور ۔ پیدائش ۱۸۶۷ء ۔ ۱۹

۱۱ ۔ دوست محمد خان ولد نواب خان تنولی ۔ شنگڑی پیدائش ۱۸۳۹ء ۔ ۲۱

۱۲ ۔ شاہداد خان ولد خداداد خان جدون ۔ بانڈہ پیر خان ۔ پیدائش ۱۸۷۲ء ۔ ۲۲

۱۳ ۔ غلام حیدر خان ولد عطا محمد خان ۔ سواتی ۔ دھریال (داگرور) پیدائش ۱۸۶۱ء ۔ ۳۹

۱۴ ۔ عطا محمد خان ولد حکیم خان ڈھونڈ ۔ لورا ۔ پیدائش ۱۸۴۶ء ۔ ۴۰

۱۵ ۔ غلام خان ولد امیر خان سواتی ۔ نندیہاڑ ۔ علاقہ غیر ۔ ۵۸

۱۶ ۔ رسالدار عبداللہ خان ولد عنایت اللہ خان تنولی ۔ چھجڑ ۔ پیدائش ۱۸۵۲ء ۔ ۶۸

۱۷ ۔ اکبر خان ولد غفور خان سواتی ۔ گیدڑ پور ۔ پیدائش ۱۸۴۱ء ۔ ۶۸

۱۸ ۔ محمد خان ولد خیر اللہ خان تنولی ۔ کٹھیالہ ۔ پیدائش ۱۸۶۶ء ۔ ۶۹

۱۹ ۔ راجہ محمد سرور خان ولد محمد خان ۔ گکھڑ خان پور ۔ پیدائش ۱۸۶۹ء ۔ ۷۰

۲۰ ۔ فقیر شاہ ولد بہادر شاہ ۔ سید ۔ کاغان ۔ پیدائش ۱۸۵۱ء ۔ ۸۹

۲۱ ۔ ستار شاہ ولد غلام شاہ قریشی ۔ پلاسی ۔ پیدائش ۱۸۵۱ء ۔ ۹۰

۹۱ - ۲۲ - فضل شاہ ولد مہتاب شاہ قریشی - پلاسی - پیدائش ۱۸۳۱ء

۹۲ - ۲۳ - محمد حسین خان ولد فیض طلب خان سواتی - مانسہرہ - پیدائش ۱۸۵۹ء

۹۳ - ۲۴ - احمد خان ولد قائم خان پنی - پنیاں - پیدائش ۱۸۱۵ء

۹۶ - ۲۵ - جیت سنگھ ولد نہال سنگھ - ہری پور - پیدائش ۱۸۶۳ء

۱۰۷ - ۲۶ - رحم اللہ خان ولد سیف اللہ خان - کشمیری ہری پور - پیدائش ۱۸۲۹ء

۱۰۹ - ۲۷ - لالہ روچا رام ولد تارا سنگھ - ایبٹ آباد - پیدائش ۱۸۴۴ء

۱۱۲ - ۲۸ - معز اللہ خان ولد عبد اللہ خان - اُتمان زئی - درگوٹی

۱۱۹ - ۲۹ - عطا محمد ولد خیر محمد - گوجر - دیدڑ - پیدائش ۱۸۴۶ء - وفات ۱۹۰۶ء

۳۰ - سردار میر عبد اللہ ولد غلام محمد - گوجر - کوٹ نجیب اللہ

حاکمانِ ہزارہ ——— عہدِ ماضی

یہ ضلع مختلف مقامی ہندو راجاؤں کے زیرِ نگیں رہا۔ مختلف مقامات کے نام آج تک سنسکرت کے معلوم ہوتے ہیں جو اس امر کی شہادت دیتے ہیں۔ تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے ۱۰۵۶ء کے بعد علاقہ خان پور میں گکھڑوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اور اُن کے زیرِ نگیں علاقہ ڈھونڈ و کرڑال بھی تھا اور مغلوں کے عہد میں بھی اسی خاندان کی حکومت تھی۔ اُن کا شجرہ نسب و گدی نشینی کے حالات قوم گکھڑ کے عنوان کے نیچے درج کئے گئے ہیں۔

پکھلی علاقہ دھمتوڑ (جدون) و تناول حاکم کشمیر سے متعلق رہا۔ اور اس کے حکام کا صدر مقام کشمیر تھا۔ کشمیر کا حاکم اپنا نائب یہاں تعینات کرتا تھا۔ چنانچہ مغلوں کے عہد میں سب سے پہلے ہزارہ کشمیر کے گورنر راجہ بیربر کے ماتحت تھا۔ بعد میں میدانِ ہزارہ بمعہ چھچھ کے حاکم اٹک سے متعلق رہا۔ حاکم اٹک (بنارس) میں رہتا تھا۔ درانیوں کے وقت تک یہی انتظام رہا۔

نوٹ :۔ قلعہ اٹک اور اس کے ساتھ ملحق شہر بنارس (جس کے آثار ابتک اٹک کے نزدیک شاہراہ عام پر موجود ہیں) اکبر بادشاہ نے ۱۵۸۶ء میں بنایا تھا جبکہ اس نے اپنی فوج یوسف زئیوں کے خلاف بھیجی تھی۔ یہاں سے ہی اکبر بادشاہ نے روشنائیوں (مریدان پیر روشن) کے خلاف اسی سال فوج بھیجی تھی۔ لیکن وہ ناکام واپس آئی۔ پشاور اور کابل کا راستہ نہ کھل سکا۔

عہدِ دُرّانی

میں ہزارہ کے تین ٹکڑے رہے

میدانِ ہزارہ پر نجیب اللہ خان ترین ۱۷۶۲ء تا ۱۷۹۹ء حاکم رہا۔ اور تناول پر صوبہ خان اور گلشیر خان حاکم رہے۔ پکھلی پر سعادت خان ۱۷۶۳-۶۴ء تا ۱۸۰۰ء سواتی کی حکومت تھی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا نجیب اللہ خان ۱۸۰۰ء تا ۱۸۳۱ء۔

ملکی حاکم

شروع شروع میں پرانا سلسلہ ہی قائم رہا۔ اور میدانِ ہری پور، بیوی نبی بیگم ۱۷۹۹ء تا ۱۸۱۶ء اپنے عامل مقرب مشرف کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔ اور بعد میں اس کا بیٹا محمد خان ۱۸۱۶ء تا ۱۸۲۴ء اور اس کا پوتا غلام خان اور سیدا کبر ستھانہ والا کچھ مدت حکومت کرتے رہے۔ تناول میں پائندہ خان ۱۸۲۱ء یا ۱۸۴۳ء اور نواب خان حاکم رہا۔ لیکن بعد میں سکھوں نے اپنی طرف سے سکھ حاکم مقرر کرنے شروع کر دئے۔

سکھ حاکم

۱- سردار ملکھا سنگھ و جوان سنگھ پنڈی والے۔ ان کا صدر مقام راولپنڈی تھا اور ہزارہ میں اُن کی جانب سے بخشی لیکھراج تحصیل مالیہ کے کام پر مقرر تھا۔

۲- حکم سنگھ چمنی۔ حاکم ہزارہ و چھچھ - صدر مقام اٹک ۱۸۱۹ء۔ اس کے عہد میں شاہ محمد و سرائے صالح میں گڑھی از دست مکھن سنگھ جو ہزارہ میں تحصیلدار تھا۔ تعمیر ہوئیں۔

۳- سردار امر سنگھ مجیٹھیہ ۱۸۲۱ء

۴- سردار ہری سنگھ ۱۸۲۲ء تا ۱۸۳۷ء سردار مہاں سنگھ بطور نائب کے ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک رہا۔ جب کہ ہری سنگھ پنجاب میں دوسرے علاقوں پر رہا۔

۵- سردار تیجا سنگھ سرما ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۱ء

۶- پیارا سنگھ ساکن برہان ۱۸۴۱ء تا ۱۸۴۳ء

۷- راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ بذریعہ نائب اربیل سنگھ سمت ۱۸۹۵ بکرمی ۱۸۴۴-۴۳ء

۸- دیوان مولراج از طرف دربار لاہور ۱۸۴۳ء

۹۔ منشی پنوں۔ ازطرف راجہ ہیرا سنگھ ۱۸۴۳ء۔ چند ماہ کے لئے۔

۱۰۔ دوسری بار۔ دیوان مولراج ۱۸۴۴ء تا ۱۶؍اپریل ۱۸۴۶ء

۱۱۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کو ہزارہ دیا گیا تو اس کی جانب سے دیوان ہری چند ۲۲؍مئی ۱۸۴۶ء تا سردار کا مک

۱۲۔ سردار گلاب سنگھ بذریعہ قاضی نادر علی خریف سمت ۱۹۰۳ بکرمی سرما ۱۸۴۶ء

۱۳۔ بخشی ہری سنگھ کانگ سمت ۱۹۰۳ بکرمی (۴۷) ۱۸۴۶ء

۱۴۔ چتر سنگھ ۱۸۴۷ء (معہ میجر ایبٹ)، نائب ناظم جھنڈا سنگھ۔ یہ آخری حاکم سکھ دربار کی طرف سے

اس کے بعد میجر ایبٹ نے ہزارہ لے لیا۔ اور وہ انگریزی عہد کا پہلا ڈپٹی کمشنر بنا (۱۸۴۹ء) اور ۱۸۵۳ء تک یہاں رہا۔

عہدِ انگریزی

ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر

۱۔ میجر جیمس ایبٹ مارچ ۱۸۴۹ء تا اپریل ۱۸۵۳ء ۔ مدت چار سال

۲۔ میجر ایچ۔ بی۔ ایڈورڈز مئی ۱۸۵۳ء تا ستمبر ۱۸۵۳ء ۔ مدت چار ماہ

۳۔ کیپٹن جے۔ آر۔ بیچر۔ اکتوبر ۱۸۵۳ء تا ۱۹؍اپریل ۱۸۵۹ء۔ مدت ۵½ سال

۴۔ میجر آر۔ ایڈمز (ADAMS) ۲۰؍اپریل ۱۸۵۹ء تا ۲۸؍فروری ۱۸۶۳ء۔ مدت ۴ سال

۵۔ میجر ایچ۔ ڈبلیو۔ ایچ کاکس یکم مارچ ۱۸۶۳ء تا ۲۵؍مارچ ۱۸۶۵ء۔ مدت ۲ سال

۶۔ میجر اے۔ منرو۔ ۲۵؍مارچ ۱۸۶۵ء تا ۳۰؍اپریل ۱۸۶۶ء۔ مدت ۱ سال

۷۔ کیپٹن ای۔ ایل۔ اومانی یکم جنوری ۱۸۶۶ء تا ۱۱؍مارچ ۱۸۷۱ء۔ مدت ۵ سال ۴ ماہ

۸۔ میجر جی۔ گر۔ شارٹ ۱۲؍مارچ ۱۸۷۱ء تا ۳۰؍نومبر ۱۸۷۲ء۔ مدت ۱ سال ۸ ماہ

۹۔ میجر جے۔ فرزل۔ یکم دسمبر ۱۸۷۲ء تا ۱۷؍مارچ ۱۸۷۳ء۔ مدت ۹ ماہ

۱۰۔ میجر ڈبلیو۔ جی۔ واٹرفیلڈ ۱۸؍مارچ ۱۸۷۳ء تا ۱۷؍ستمبر ۱۸۷۵ء

۱۱۔ میجر ٹی۔ جے۔ سی۔ پلوڈن ۱۸؍ستمبر ۱۸۷۵ء تا ۲۶؍جنوری ۱۸۷۵ء

۱۲۔ لفٹیننٹ کرنل۔ ڈبلیو۔ جی۔ واٹرفیلڈ ۲۷؍اکتوبر ۱۸۷۵ء تا ۵؍دسمبر ۱۸۷۶ء

۱۳۔ ایچ۔ سی۔ ٹی رابنسن اسکوائر۔ ۶؍دسمبر ۱۸۷۶ء تا ۱۲؍دسمبر ۱۸۷۶ء

۱۴۔ آر۔ اُڈنی اسکوائر ۱۳؍دسمبر ۱۸۷۶ء تا ۵؍مارچ ۱۸۷۷ء

۱۵۔ ایچ۔ سی۔ ٹی۔ رابنسن اسکوائر ۱۳؍اکتوبر ۱۸۷۷ء تا ۱۶؍نومبر ۱۸۷۷ء

۱۶۔ لفٹیننٹ کرنل۔ ڈبلیو۔ جی۔ واٹرفیلڈ ۱۷؍دسمبر ۱۸۷۷ء تا ۸؍جنوری ۱۸۷۸ء

۱۷۔ ایچ۔ سی۔ ٹی۔ رابنسن اسکوائر ۹؍جنوری ۱۸۷۸ء تا ۲۹؍جنوری ۱۸۷۸ء

۱۸۔ آر۔ اُڈنی اسکوائر ۳۰؍جنوری ۱۸۷۸ء تا ۱۷؍مارچ ۱۸۷۸ء

۱۹۔ کیپٹن۔ سی۔ ایف۔ میسی ۱۸؍مارچ ۱۸۷۸ء تا ۸؍اپریل ۱۸۷۸ء ۔ مدت ۲۰ دن

۲۰۔ اے۔ آر۔ بلمن اسکوائر۔ ۹؍اپریل ۱۸۷۸ء تا ۱۲؍دسمبر ۱۸۷۸ء ۔ مدت ۸ ماہ

۲۱۔ میجر ای۔ ایل۔ اومانی ۱۳؍دسمبر ۱۸۷۸ء تا ۷؍اپریل ۱۸۸۰ء

۲۲۔ میجر سی۔ میکنیل ۸؍اپریل ۱۸۸۰ء تا ۱۲؍دسمبر ۱۸۸۲ء۔ مدت دو سال ۸ ماہ

۲۳۔ لفٹیننٹ کرنل ای۔ جی۔ جی۔ ہیسٹنگز ۲۲؍دسمبر ۱۸۸۲ء تا ۵؍اکتوبر ۱۸۸۳ء۔ مدت ۱ سال ۱ ماہ

۲۴۔ میجر ٹی۔ جے۔ سی پلوڈن ۶؍اکتوبر ۱۸۸۳ء تا ۱۳؍دسمبر ۱۸۸۳ء

۲۵۔ لفٹیننٹ کرنل ای۔ جی۔ جی۔ ہیسٹنگز ۱۴؍دسمبر ۱۸۸۳ء تا ۱۷؍مارچ ۱۸۸۴ء

۲۶۔ ایف۔ ڈبلیو۔ آر۔ فرائر اسکوائر ۱۸؍مارچ ۱۸۸۴ء تا ۳۰؍جولائی ۱۸۸۴ء

۲۷۔ اے۔ ڈبلیو کرسٹی اسکوائر ۳۱؍جولائی تا ۱۷؍اگست ۱۸۸۴ء۔ مدت ۱۵ دن

۲۸۔ آر۔ سی۔ کلارک اسکوائر ۱۸؍اگست ۱۸۸۴ء تا ۲۸؍اکتوبر ۱۸۸۴ء

۲۹۔ ایف۔ ڈبلیو۔ فرائر اسکوائر ۲۹؍اکتوبر ۱۸۸۴ء تا یکم اگست ۱۸۸۶ء

۳۰۔ ایس۔ ایس۔ تھاربرن اسکوائر ۲؍اگست ۱۸۸۶ء تا ۱۸؍دسمبر ۱۸۸۶ء

۳۱۔ اے۔ ایف۔ ڈی۔ کننگھم اسکوائر ۱۹؍دسمبر ۱۸۸۶ء تا ۲۵؍مارچ ۱۸۸۷ء

۳۲۔ ایس۔ ایس۔ تھاربرن اسکوائر۔ ۲۶؍مارچ ۱۸۸۷ء تا ۲۳؍ستمبر ۱۸۸۷ء

۳۳۔ اے۔ ایف۔ ڈی کننگھم اسکوائر ۲۴؍ستمبر ۱۸۸۷ء تا یکم جنوری ۱۸۹۰ء

۳۴۔ کیپٹن۔ ای۔ انگلس ۲؍جنوری ۱۸۹۰ء تا ۴؍اپریل ۱۸۹۰ء ۔ مدت ۳ ماہ

۳۵۔ اے۔ ایف۔ ڈی کننگھم اسکوائر ۵؍اپریل ۱۸۹۰ء تا ۱۱؍فروری ۱۸۹۱ء

۳۶۔ سی۔ ای۔ ایف۔ بن بری اسکوائر ۱۲؍فروری ۱۸۹۱ء تا ۲۴؍جون ۱۸۹۱ء

۳۷۔ اے۔ ایف۔ ڈی کننگھم اسکوائر ۲۵؍جون ۱۸۹۱ء تا یکم اپریل ۱۸۹۲ء

۳۸۔ کیپٹن ای۔ انگلس ۲؍اپریل ۱۸۹۲ء تا ۲۰؍مئی ۱۸۹۲ء

۳۹۔ اے۔ ایف۔ ڈی۔ کننگھم اسکوائر ۲۱؍مئی ۱۸۹۲ء تا ۳۰؍ستمبر ۱۸۹۲ء

۴۰ - کیپٹن ای۔ انگلس یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء تا ۱۳ اکتوبر ۱۸۹۲ء

۴۱ - اے۔ ایف۔ ڈی کننگھم۔ اسکوائر ۱۴ اکتوبر ۱۸۹۲ء تا ۱۷ اپریل ۱۸۹۳ء

۴۲ - لفٹیننٹ کرنل جے۔ بی۔ ہچنسن ۱۸ اپریل ۱۸۹۳ء تا ۲۰ جولائی ۱۸۹۳ء

۴۳ - اے۔ ایف۔ ڈی۔ کننگھم اسکوائر ۲۱ جولائی ۱۸۹۳ء تا ۲۹ مارچ ۱۸۹۴ء

۴۴ - سی۔ ای۔ ایف۔ بن بری اسکوائر ۱۶ اپریل ۱۸۹۵ء تا ۵ جنوری ۱۸۹۶ء

۴۵ - لفٹیننٹ سی۔ بی۔ رالنسن ۶ جنوری ۱۸۹۶ء تا ۹ فروری ۱۸۹۶ء

۴۶ - آر۔ لو (LOVE) اسکوائر ۱۰ فروری ۱۸۹۶ء تا ۹ اپریل ۱۸۹۶ء

۴۷ - سی۔ ای۔ ایف۔ بن بری اسکوائر ۱۰ اپریل ۱۸۹۶ء تا ۲۰ نومبر ۱۸۹۶ء

۴۸ - اے۔ بی۔ کیمبل ویل۔ اسکوائر ۲۱ نومبر ۱۸۹۶ء تا ۳۱ جنوری ۱۸۹۷ء

۴۹ - کیپٹن سی۔ بی۔ رالنسن یکم فروری ۱۸۹۷ء تا ۱۶ اپریل ۱۸۹۷ء

۵۰ - ڈبلیو۔ آر۔ ایچ۔ مرک اسکوائر ۱۷ اپریل ۱۸۹۷ء تا ۶ مئی ۱۸۹۷ء

۵۱ - اے۔ ایچ۔ گرانٹ اسکوائر ۷ مئی ۱۸۹۷ء تا ۹ ستمبر ۱۸۹۷ء۔ مدت ۴ ماہ

۵۲ - کیپٹن ایچ۔ ایس۔ ناکس سٹرینگ ویز ۱۰ ستمبر ۱۸۹۷ء تا ۱۶ مئی ۱۸۹۸ء۔ مدت ۸ ماہ

۵۳ - آر۔ اے۔ مانٹ اسکوائر ۱۷ مئی ۱۸۹۸ء تا ۱۲ جون ۱۸۹۸ء۔ مدت ۱ ماہ

۵۴ - ڈبلیو۔ آر۔ ایچ۔ مرک اسکوائر ۱۳ جون ۱۸۹۸ء تا ۲ اگست ۱۸۹۸ء

۵۵ - آر۔ اے۔ مانٹ اسکوائر ۳ اگست ۱۸۹۸ء تا ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء

۵۶ - ڈبلیو۔ آر۔ ایچ۔ مرک اسکوائر ۶ دسمبر ۱۸۹۸ء تا ۳۱ مئی ۱۸۹۹ء

۵۷ - کیپٹن۔ سی۔ بی۔ رالنسن یکم جون ۱۸۹۹ء تا ۲۰ جولائی ۱۸۹۹ء

۵۸ - ڈبلیو۔ آر۔ ایچ۔ مرک اسکوائر ۲۱ جولائی ۱۸۹۹ء تا ۲۳ اکتوبر ۱۸۹۹ء

۵۹ - ڈی۔ بٹلر۔ اسکوائر ۲۴ اکتوبر ۱۸۹۹ء تا ۱۹ جنوری ۱۹۰۰ء

۶۰ - لفٹیننٹ کرنل ایچ۔ بی۔ پی۔ لے ۲۰ جنوری ۱۹۰۰ء تا ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء۔ مدت ۴ ماہ

۶۱ - کیپٹن سی۔ پی ڈاؤن ۱۴ مئی ۱۹۰۰ء تا ۱۷ جولائی ۱۹۰۰ء۔ مدت ۲ ماہ

۶۲ - لفٹیننٹ کرنل ایچ۔ پی۔ پی۔ لے ۱۸ جولائی ۱۹۰۰ء تا ۲۹ جنوری ۱۹۰۱ء۔ مدت ۶ ماہ

۶۳ - کیپٹن ڈی۔ بی۔ بلیکوے ۳۰ جنوری ۱۹۰۱ء تا ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء

۶۴ - کیپٹن سی۔ پی۔ تھامپسن ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۱ء تا ۱۴ مارچ ۱۹۰۵ء

۶۵ - پی۔ جے۔ جی۔ پاٹیان اسکوائر ۱۵ مارچ ۱۹۰۵ء تا ۲۷ جون ۱۹۰۵ء

۶۶ - جی۔ سی۔ ایل۔ ہاویل اسکوائر ۲۸ جون ۱۹۰۵ء تا ۲۶ نومبر ۱۹۰۵ء

۶۷ - جے۔ ایس۔ ڈانلڈ ۲۷ نومبر ۱۹۰۵ء

اس درمیانی وقفہ کے ڈپٹی کمشنروں کا ریکارڈ کہیں سے بھی دستیاب نہ ہو سکا لہٰذا اس عرصہ کی فہرست ڈپٹی کمشنران خالی رہ گئی۔

میجر سینٹ جان نومبر ۱۹۴۶ء تا ۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء

عہد پاکستان

ڈپٹی کمشنر

۱ - محمد نواز خان۔ عارضی (ڈیرہ اسمٰعیل خان) ۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء

۲ - غلام سرور خان (ساکن چھپالہ) ۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء تا ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء

۳ - شیر افضل خان (C.S.P) (ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خان) ۱۰ دسمبر ۱۹۴۹ء تا ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء

۴ - ہدایت اللہ خان (C.S.P) (ساکن طورو مردان) ۱۶ اگست ۱۹۵۰ء تا یکم اگست ۱۹۵۱ء

۵ - غلام داؤد خان۔ عارضی (ساکن لکی مروت) ۲ اگست ۱۹۵۱ء تا ۱۷ اگست ۱۹۵۱ء

۶ - مرزا فضل الرحمٰن (پشاور) ۱۸ اگست ۱۹۵۱ء تا ۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء

۷ - ولی محمد خان (ساکن شیرپاؤ۔ چارسدہ) یکم فروری ۱۹۵۳ء تا ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۳ء

۸ - عطاء اللہ جان (ساکن پشاور) ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۳ء تا ۱۶ مارچ ۱۹۵۵ء

۹ - ارباب نور محمد خان (ساکن تہکال) ۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء تا ۱۴ جون ۱۹۵۵ء

۱۰ - محمد جان (ساکن پشاور) ۱۵ جون ۱۹۵۵ء تا ۳ نومبر ۱۹۵۶ء

۱۱ - ظفر علی خان (ساکن پشاور) ۴ نومبر ۱۹۵۶ء تا ۹ مارچ ۱۹۵۹ء

۱۲ - سید منیر حسین (ساکن لاہور) ۱۰ مارچ ۱۹۵۹ء تا ۴ مارچ ۱۹۶۱ء

۱۳ - کیپٹن صبغۃ اللہ خان عارضی ۵ مارچ ۱۹۶۱ء تا ۴ اپریل ۱۹۶۱ء

۱۴ - محمد مسعود زمان (ساکن لاہور) ۵ اپریل ۱۹۶۱ء تا ۲۸ نومبر ۱۹۶۳ء

۱۵ - کیپٹن افتخار احمد صاحبزادہ (ساکن کوٹھہ۔ صوابی) ۲۹ نومبر ۱۹۶۳ء تا ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء

۱۶ - ولی محمد خان (ساکن شیرپاؤ۔ چارسدہ) ۶ دسمبر ۱۹۶۳ء تا ۱۵ دسمبر ۱۹۶۶ء

۱۷ - خان زادہ عبدالسلام خان (ساکن زیدہ - صوابی) ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۷ء

۱۸ - لفٹیننٹ کمانڈر اے - اے - نسیم ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء

ہزارہ میں دُرّانی، سکھ اور انگریز عہدِ حکومت پر تنقید

گزشتہ اوراق میں تفصیل سے اِن حکومتوں کے حالات تحریر کئے جا چکے ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر و جامع تنقید ان اقوام کے عہدِ حکومت بروایت نواب مظفر خان بنگش ساکن ہنگو ضلع کوہاٹ تحریر کی جائے۔ دُرّانی اور سکھ حکومت ایک طوفانی دور تھا۔ زمانہ کے حالات کے مطابق حکّام درانی و سکھان کا دورہ کبھی کبھار ہوتا تھا۔ اور صرف تفریح کے طور پر حکام آتے۔ سیر و شکار کرتے اور مالیہ وصول کر کے چلے جاتے۔ ان کی حکومتوں کے مستقل آثار کم ہی رہے۔ انگریز نے دل لگا کر حکومت کی اور اپنا خاص نقش چھوڑ گئے کچھ زمانہ کے حالات کچھ طویل مدت کی حکمرانی اور اس سے زیادہ امن و امان اور قانون عدل برائے رعیت سے ان کا اثر اس ضلع پہ کافی ہوا۔ اور ان کی عہدِ حکومت کے آثار کافی عیاں اور واضح ہیں۔

نواب مظفر خان بنگش ہنگو ضلع کوہاٹ ملحقہ علاقہ تیراہ کا نواب تھا۔ اور اس نے تین سلطنتوں۔ دُرّانی، سکھ اور پھر انگریز حکومت کا آغاز۔ کے ادوار اپنی زندگی میں دیکھے۔

اُن دنوں میں سرحد کے اضلاع کا کمشنر راولپنڈی میں رہتا تھا۔ موسم گرما میں کوہاٹ کے دورہ پر آیا۔ اور اپنے خیمہ میں فروکش ہوا۔ پرانے زمانہ میں بادشاہ، وزراء و دیگر عمائد سلطنت دوران سفر میں اپنا خیمہ و خرگاہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اسی میں فروکش ہوتے تھے۔ موجودہ وقت کے سرکٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے، ان کے قیام کے لئے نہ ہوتے تھے۔

یہ کمشنر بھی اپنے خیمہ میں فروکش تھا اور ضلع کے رؤسا ملاقات کے لئے جمع ہوئے ان میں نواب مظفر خان بھی تھا۔ انگریزی دستور کے مطابق ملاقاتی ایک ایک کر کے اندر جاتے سلام آداب اور عرض معروض کر کے واپس آجاتے۔ ملاقات شاید دیر سے شروع ہوئی اور نواب صاحب کو بہت دیر باہر بیٹھنا پڑا۔ اس انتظار کی طویل گھڑیوں میں فکر اور سوچ میں مشغول ہو گئے۔ دل ہی دل میں کچھ سوچ بچار کے بعد اپنے آپ ہنس پڑے۔

نوٹ:- بنگش قوم نے ۱۸۵۵ء میں انگریزوں سے زبردست مقابلہ کیا تھا لیکن اس اثنا میں بہادر شیر خان بنگش کی وفات سے کوہاٹ کا راستہ انگریزوں کے لئے کھل گیا۔ اور مظفر خان اور اس کا لڑکا بازگل سنہ ۱۸۹۱ء میں لاہور میں جلا وطن کر دیئے گئے۔

انگریز خیمہ کے اندر بیٹھا ہوا چلمن سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ نواب مظفر خان کے خود بخود ہنس پڑنے پر متعجب ہوا اور اس کو اندر بلایا اور پوچھا۔ "نواب صاحب آپ کس بات پر ہنسے؟" اُنہوں نے ٹالنا چاہا۔ لیکن کمشنر مصر ہوا کہ وہ بات جس پر وہ ہنسے بتلائی جائے۔ نواب صاحب نے کہا کہ "اگر آپ ناراض نہ ہوں تو بتلائے دیتا ہوں" کمشنر نے کہا کہ "ہاں ضرور بتلا دیئے" نواب صاحب نے کہا "میں بہت دیر سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھا تھا اس انتظار کی گھڑیوں میں مشغول رہنے کے لئے اپنی زندگی کے گزشتہ واقعات پر نظر دوڑانی شروع کر دی یہ ہنسی ان حالات پر فکر کے انجام میں اضطراراً ظاہر ہو گئی۔ سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے انہوں نے کہا "میں نے اپنی زندگی میں تین سلطنتوں کے دَور دیکھے ہیں۔ پہلا دَور دُرّانیوں کا دیکھا۔ اُس وقت جب کوئی حاکم آتا تھا تو اس کی آمد سے دو تین دن پہلے اس کا خیمہ و خرگاہ آجاتا تھا۔ آشپز (باورچی) اور دیگر ملازمین مطبخ پہنچ جاتے۔ دیگ۔ دیگ برے اور دیگر اسباب طعام و خوراک، دُنبے اور بکرے جمع کئے جاتے تھے۔ حاکم جب آجاتا تو ہم لوگوں کو وہ دعوت دیتا اور یک جائی کے دسترخوان پر جمع ہو کر کھانا کھاتے تھے۔ جتنے دن وہ رہتا یہی سلسلہ روز و شب جاری رہتا" ان کے دَور کے بعد سکھوں کی حکومت ہو گئی۔ وہ سلسلہ طعام و خوراک بند ہو گیا۔ کیونکہ سکھ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہ کھاتے تھے۔ ان کو شکار کا شوق ہوتا تھا۔ باز اور جُرّے ساتھ رکھتے تھے ہم بھی شکار کا شوق رکھتے تھے اور اپنے باز اور جُرّے رکھتے تھے۔ وہ ہم سب کو اپنے ساتھ شکار کو لے جاتے۔ شکار میں جب حاکم خوش ہو جاتا تو انعام میں کسی کو سونے کے کڑے، کسی کو سونے کا ہار وغیرہ دے دیا کرتے تھے۔ یہ چیزیں وہ پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کا دَور بھی گزر گیا۔ اب آپ کا دَور ہے۔ میں صبح سے یہاں بیٹھا ہوں۔ نہ دیگ ہے نہ دیگچہ دکھائی دیتا ہے اور نہ کوئی کھانے پکانے کا انتظام ہی نظر آتا ہے۔ اور نہ آپ کے بدن پر کوئی زیور ہے ایک قمیض اور ایک جانگیہ آپ کا لباس ہے۔ اس صورتِ حال پر غور کرنے کے بعد میں نے اپنے نفس سے کہا کہ صورتِ حالات تو یہ ہے تو مظفر خان پھر تم کس امید پر یہاں آئے ہو اس سے میں ہنس پڑا"

القصّہ دُرّانی حاکم کھانے پینے، اور مجلس آرائی کے شائق تھے۔ خوانین کے ساتھ گھل مل جانے کے عادی تھے۔ انتظام حکومت کی طرف خود کوئی توجہ نہ دیتے تھے۔ مقامی خوانین ہی خود مختارانہ طور پر اُن کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔

سکھوں کے عادات اُن سے مختلف تھے۔ اُن کی بنیادی عصبیت، مسلمانوں کی مخالفت تھی۔ جبر و اکراہ سے مالیہ اور جرمانہ وصول کرتے۔ شکار کا شوق کرتے۔ انگریز مدبّر تھے اور کارِ حکومت توجہ اور فرض سمجھ کر کرتے تھے۔ رعایا کے درمیان انصاف و عدل اُن کا شیوہ تھا۔ ذاتی طور پر کفایت شعار

تھے۔ ملکی لوگوں سے مکمل علیحدگی برتتے تھے۔ پہلی دو قوموں کی حکومت مختصر رہی مگر انگریز کو حکومت کے لئے کافی وقت ملا۔ جو اُن کی چند ذاتی صفات کی وجہ سے تھا۔

عہدِ انگریزی میں اصلاحات

ضلع ہزارہ میں سیاسی اصلاحات کا دور شروع ہونے پر جب ۱۹۳۲ء میں پہلی بار انتخاب ہوئے تو مندرجہ اصحاب ہزارہ سے صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔

۱۔ محمد زمان خان۔ کھلابٹ۔ تحصیل ہری پور

۲۔ عبدالقیوم خان۔ سفیدہ۔ تحصیل مانسہرہ

انتخابات ۱۹۳۶ء۔ برائے لیجسلیٹو اسمبلی سرحد

ہزارہ سے مندرجہ ذیل اشخاص منتخب ہوئے۔

ہری پور تحصیل۔ ۱۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خانپور۔ (آپ ٹوپی (اُتمان حلقہ) اور خان پور ہزارہ دونوں حلقوں سے بیک وقت کھڑے ہوئے۔ ٹوپی کے حلقے سے ہار گئے تھے)

۲۔ محمد سرور خان تارخیلی۔ سلم کھنڈ۔ ڈیموکریٹک پارٹی۔

۳۔ خان صاحب عبدالمجید خان تنولی۔ یونائیٹڈ مسلم پارٹی۔

۴۔ لفٹیننٹ محمد زمان خان آف چھبڈ۔ یونائیٹڈ مسلم پارٹی۔

تحصیل ایبٹ آباد۔ ۱۔ رائے بہادر لالہ ایشر داس نواں شہر۔ ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی

۲۔ راجہ عبدالرحمٰن خان نگری ٹوٹیال ۳۔ پیر محمد کامران۔ رجوعیہ۔ کانگرس

۴۔ رائے صاحب پرمانند۔ ایبٹ آباد ۵۔ خان صاحب راجہ عبدالرحمٰن خان۔ نگری ٹوٹیال ڈیموکریٹک پارٹی

تحصیل مانسہرہ۔ ۱۔ خان صاحب محمد عطائی خان۔ بٹل۔ ڈیموکریٹک پارٹی۔

۲۔ خان محمد عباس خان۔ شم الہٰی منگ۔ ڈیموکریٹک پارٹی

۳۔ خان فقیرا خان ملک پور۔ کانگرس

اس انتخاب کے بعد مندرجہ ذیل پارٹیاں بنیں۔ جن میں ہزارہ کے ممبران شامل ہوئے۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی زیر سرکردگی سر صاحبزادہ عبدالقیوم بنی۔ اس میں ہزارہ کے ممبران میں سے یہ ممبر شامل ہوئے

۱۔ خان صاحب عبدالمجید خان تنولی (۲) خان بہادر محمد زمان خان۔ کھلابٹ

کانگرس پارٹی زیر قیادت ڈاکٹر خان صاحب بنی ہزارہ سے یہ ممبران اس میں شامل ہوئے۔

۱۔ خان فقیرا خان۔ ملک پور ۲۔ پیر کامران۔ رجوعیہ

رائے بہادر لالہ ایشر داس ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔ اغلباً وہ اس کے لیڈر بھی تھے۔

ہزارہ کے مندرجہ ذیل ممبران نے ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔

۱۔ خان محمد سرور خان تارخیلی۔ سلم کھنڈ ۲۔ خان صاحب راجہ عبدالرحمٰن خان۔ نگری ٹوٹیال

۳۔ خان محمد عباس خان۔ شم الہٰی منگ ۴۔ خان صاحب محمد عطائی خان۔ بٹل

وزارتِ سرحد

پہلی وزارت سرحد نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم نے بہ امداد ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی مرتب کی لیکن ہزارہ سے کوئی وزیر نہ لیا۔ لہٰذا ڈیموکریٹک پارٹی مخالف گروپ میں بیٹھی۔ یہ پارٹی کانگرس پارٹی سے مل گئی۔ ان میں سے خان محمد سرور خان طاہر خیلی ڈپٹی سپیکر بن گیا۔

ممبران ہزارہ نے نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم سے کافی بات چیت کی کہ وہ ہزارہ سے ایک ممبر کو وزیر لے لیں لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئے۔

جب لیجسلیٹو اسمبلی کا اجلاس ایبٹ آباد میں ہوا تو مخالف پارٹی (کانگرس اور ڈیموکریٹک پارٹی) نے وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ایبٹ آباد (ٹاؤن ہال) میں پیش ہوئی۔ اور ۲۷ ووٹ اس کے حق میں اور ۲۲ ووٹ اس کے خلاف آئے۔ رائے صاحب پرمانند بیرسٹر ایبٹ آباد (سکھ نمائندہ) نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیا یعنی ضلع ہزارہ کے حق وزارت کی تائید کی۔

اس پر گورنر سرحد نے ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اُس نے خان عبدالغفار خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور بابو راجندر پرشاد لائے اور ان کی موجودگی میں جو اس غرض کے لئے ایبٹ آباد آئے تھے، وزارت بنائی۔ اس میں خان محمد عباس خان کو ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے وزیر لیا گیا۔ اور ان کو محکمہ جنگلات دیا گیا۔ نئی وزارت نے ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء کو حلف لیا۔

نواب سر عبدالقیوم کے عہد وزارت میں اپریل ۱۹۳۷ء کو ملک خدا بخش سپیکر (صدر) اور محمد سرور خان طاہر خیلی ڈپٹی سپیکر (نائب صدر) مقرر ہوئے۔

نواب سر عبدالقیوم ۳ نومبر ۱۹۳۷ء میں اچانک دماغ کی شریان پھٹ جانے سے (CEREBRAL - HAEMORRHAGE) فوت ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں کانگرس حکومتوں نے تمام ہندوستان میں استعفے دے تو سرحد حکومت نے بھی استعفا دیا۔ باقی ممبران وزارت کے ساتھ محمد عباس خان نے بھی استعفا دے دیا۔

جب سردار اورنگ زیب خان نے مسلم لیگ وزارت ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء میں بنائی جو ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء
تک رہی تو اس وزارت میں راجہ عبدالرحمن خان نگری ٹوٹیال کو ہزارہ سے لیا گیا۔ اور ان کو محکمہ اطلاعات دیا
گیا۔ اس وزارت کے دوران خان سردار بہادر خان ۱۲ اگست ۱۹۴۳ء میں اسمبلی کے صدر مقرر ہوئے۔
خان محمد سرور خان طاہر خیلی کی ممبری بذریعہ پٹیشن چھن گئی۔ اور ان کے بعد عبدالرشید خان طاہر خیلی ممبر چنے
گئے۔ نواب سر صاحبزادہ کے انتقال کے بعد راجہ منوچہر خان خانپور ممبر چنے گئے۔ مسلم لیگ وزارت
کے شکست کے بعد جب دوبارہ کانگرس وزارت ۱۶ مارچ ۱۹۴۵ء میں بنی تو خان محمد عباس خان کو پھر
وزیر لیا گیا۔ جب قائد اعظم ۱۹۴۵ء کے آخر میں پشاور تشریف لائے تو خان محمد عباس خان کانگرس وزارت
سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

پاکستان بننے سے پہلے فروری ۱۹۴۶ء میں جو انتخاب ہوئے۔ ہزارہ میں سوائے ایک کانگرسی ممبر
خان عبدالقیوم خان سواتی ساکن سفیدہ کے باقی سب مسلم لیگ ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں:۔
۱۔ خان محمد عباس خان۔ سم الٰہی منگ سابق وزیر۔ ۲۔ خان علی گوہر خان تانارہ۔ ۳۔ خان محمد فرید خان بیٹر۔
۴۔ خان بہادر جلال الدین ایبٹ آباد۔ ۵۔ خان سردار بہادر خان ریحانہ ہری پور۔ ۶۔ راجہ سرفراز خان نگری ٹوٹیال
۷۔ خان بہادر محمد زمان خان کھلابٹ۔ ۸۔ سلطان حسن علی خان بوئی۔ ۹۔ ملک میر داد خان منگ (کوٹ نجیب اللہ)

وزارت

انتخابات کے مکمل ہونے پر سرحد میں پھر کانگرس وزارت بن گئی۔ اس اسمبلی میں لیگ کے کل ۱۷ ممبر تھے جن
میں سے دو بنوں۔ دو ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ ایک پشاور شہر۔ ایک مردان اور دو بڑے زمیندار صوبہ سے جن میں
ایک ہزارہ کا اور باقی نو ہزارہ کے ممبر۔ یعنی ہزارہ سے کل دس ممبر لیگ میں شامل تھے۔ مسلم لیگ مخالف
بنچوں پر بیٹھی۔ مسلم لیگ نے عبدالقیوم خان بیرسٹر کو لیڈر مقرر کیا۔ اور حبیب اللہ خان (بنوں) کو ڈپٹی لیڈر
اور خان سردار بہادر خان کو سکرٹری چنا گیا۔

کانگرس وزارت کے موقوف ہونے پر مسلم لیگ وزارت بنی۔ عبدالقیوم خان بیرسٹر وزیر اعلیٰ ہوئے اور
ہزارہ سے محمد عباس خان (سم الٰہی منگ) وزیر بنے۔ محمد عباس خان کے خلاف عذرداری کی گئی جس کی وجہ
سے وہ ممبر نہ رہے۔ ان کے بعد فرید خان (بیٹر) وزیر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں خان بہادر جلال الدین خان وزیر ہوئے
بعد میں عذر داری کی بناء پر ممبری سے الگ کر دیئے گئے۔ اور فرید خان پھر وزیر بنے۔
خان بہادر جلال الدین کے ممبری سے الگ کئے جانے کے بعد غلام حسین بھاٹیا (ایبٹ آباد) ممبر ہوئے

انتخاب ۱۹۵۱ء

اس انتخاب میں ممبران کی تعداد زیادہ ہو گئی کیونکہ اس انتخاب کے لئے اسی ہزار آبادی کا حلقہ بنایا
گیا۔ اور مندرجہ ذیل ممبران ہزارہ سے منتخب ہوئے۔

۱۔ سید محمود شاہ۔ کاغان
۲۔ خان بہادر خان۔ گڑھی حبیب اللہ
۳۔ صاحبزادہ عتیق اللہ۔ بکوٹ
۴۔ راجہ سرفراز خان۔ نگری ٹوٹیال
۵۔ سلطان رکن الزمان خان۔ خانپور
۶۔ ملک میرداد خان۔ منگ (کوٹ نجیب اللہ)
۷۔ خان خواجہ محمد خان۔ درویش
۸۔ خان بہادر محمد زمان خان۔ کھلابٹ
۹۔ عبدالحق لودھی۔ دیرہ (تنول)
۱۰۔ عبدالقیوم خان بیرسٹر پشاور۔ از حلقہ اپر تناول۔ بلا مقابلہ
۱۱۔ کپتان آدم خان۔ ادگی
۱۲۔ خان شاد محمد خان۔ بفہ
۱۳۔ خان خداداد خان۔ بھوگڑ منگ
۱۴۔ ملک امیر عالم خان مانسہرہ
۱۵۔ خان محمد فرید خان۔ بیٹر
۱۶۔ ماسٹر عبدالحق۔ حویلیاں
۱۷۔ خان محمد اسلم خان۔ تربیلہ
۱۸۔ خان ولی محمد خان۔ بانڈہ پیر خان
۱۹۔ فقیرا خان جدون۔ دمتوڑ
۲۰۔ خان بہادر محمد جلال الدین

اس دور میں خان عبدالقیوم خان بیرسٹر پھر وزیر اعلیٰ ہوئے
تحریک تحفظ ختم نبوت کے پنجاب میں زور پکڑنے سے ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے خواجہ
ناظم الدین کی وزارت برطرف کر دی۔ اس کے بعد نئی وزارت میں خان عبدالقیوم خان کو مرکز میں وزیر لیا
گیا اور سرحد میں سردار عبدالرشید خان وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔

۱۹۵۵ء

وحدت مغربی پاکستان بننے سے پہلے خان سردار بہادر خان (ریحانہ) جو بلوچستان میں گورنر تھے
صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ ان کی وزارت میں ہزارہ کی جانب سے خان محمد فرید خان بیٹر
ہی وزیر رہے۔ صوبہ مغربی پاکستان بننے پر وہ اس صوبہ کے نمائندے کے طور پر وزارت مغربی پاکستان
میں شامل کئے گئے۔ بعد میں جب ری پبلکن پارٹی زیر قیادت ڈاکٹر خان صاحب بنی تو ان کی جگہ پر خان
خداداد خان (بھوگڑ منگ) وزیر صحت ہوئے۔ ۱۹۵۸ء تک (مارشل لاء) وزیر رہے۔

۱۹۵۵ء

وحدت مغربی پاکستان کے بن جانے پر مغربی پاکستان لاہور کی اسمبلی کے لئے بالواسطہ ممبر چُنے گئے۔

۱۔ خان خداداد خان۔ بھوگڑ منگ
۲۔ خان شاد محمد خان۔ بٹل
۳۔ سید محمود شاہ۔ کاغان
۴۔ خان ولی محمد خان۔ بانڈہ پیر خان
۵۔ خان محمد فرید خان۔ بیڑ
۶۔ خان فقیرا خان جدون۔ دھمتوڑ
۷۔ خان خواجہ محمد خان۔ درویش
۸۔ خان محمد اسلم خان۔ تربیلہ
۹۔ سردار محمد اسلم خان۔ باگن (نتھیا گلی)
۱۰۔ خان سردار بہادر خان۔ ریحانہ

یہ افراد مارشل لاء کے نفاذ (۱۹۵۸ء) تک مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے۔
جب ری پبلکن پارٹی زیر قیادت ڈاکٹر خان صاحب بنی تو خان سردار بہادر خان کی ان سے مخالفت ہو گئی۔ یہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی وزارت میں خان خداداد خان کو وزیر (صحت) لے لیا۔

بنیادی جمہوریت

بنیادی جمہوریت کے انتخابات دسمبر ۱۹۵۹ء میں ہوئے۔ اس کی بنیاد پر مئی ۱۹۶۲ء پر صوبائی اسمبلی کے لئے انتخابات ہوئے۔ ان میں مندرجہ ذیل افراد منتخب ہوئے۔

۱۔ مولوی غلام غوث۔ بفہ
۲۔ سلطان محمد خان۔ حویلیاں
۳۔ راجہ عنایت الرحمٰن۔ نگری ٹوٹیال
۴۔ میجر سلطان احمد خان ترین۔ ریحانہ
۵۔ خان ملنگ خان۔ بٹ گرام
۶۔ عبدالرحمٰن خان اوگی

قومی اسمبلی کے انتخاب اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوئے اور ممبر مندرجہ ذیل ہوئے۔

۱۔ خان سردار بہادر خان۔ ریحانہ
۲۔ خان محمد حنیف خان۔ مانسہرہ
۳۔ خان محمد ایوب خان۔ الائی

انتخاب ۱۹۶۴ء۔ صوبائی اسمبلی

۱۔ کپتان اختر ایوب خان۔ ریحانہ
۲۔ خان محمد اقبال خان جدون۔ ایبٹ آباد
۳۔ گل زمان خان۔ گ[illegible]ی والا
۴۔ اورنگ زیب خان۔ مانسہرہ
۵۔ خان ملنگ خان۔ بٹ گرام
۶۔ عبدالرحمٰن خان۔ اوگی

قومی اسمبلی

۱۔ کپتان گوہر ایوب خان۔ ریحانہ (۲) خان محمد حنیف خان۔ مانسہرہ (۳) خان محمد ایوب خان۔ الائی۔

چند دیگر واقعات

۱۔ ہزارہ کا ترمیمی بندوبست مارچ ۱۹۰۶ء میں کیا گیا کل مالیہ/۳۰۳۰ ۵ ۵ روپیہ مقرر کیا گیا جب کہ پہلے ۸۴۰ ۵ ۴۴ روپیہ تھا۔

۲۔ بالائی تناول (جاگیر نواب صاحب انب کا علاقہ) ۱۹۵۰ء میں باضابطہ طور پر ضلع سے ملحق کر دیا گیا۔ اور اس کا پہلا بندوبست ۱۹۵۱-۵۲ء میں ختم ہوا۔ تشخیص مالیہ/۱۶۵۵ ۵ ۴ روپیہ ہوئی۔

۳۔ فروری ۱۹۵۲ء میں سابق آزاد (علاقہ) تیکری ولیسی اور شندھیاڑ کا الحاق ضلع سے کیا گیا۔

۴۔ اُتمان زئی، آستانہ، ومواضعات کیا، کھبل دستھانہ کا الحاق مئی ۱۹۵۳ء میں کیا گیا۔

۵۔ اُتمان زئی، امازئی بمعہ گدون علاقہ کا پہلا بندوبست ۱۹۶۰-۶۲ء میں ہوا۔ ان علاقوں کا کل مالیہ ۳۷۰۰۰/ روپیہ۔ اور دیگر محاصلات کا ۶۶۴۵/ روپیہ اور جنگلات کا ۱۰۶۴/ روپیہ مقرر ہوا۔ جو خریف ۱۹۶۲ء سے ان سے وصول کرنا شروع کیا گیا۔

۶۔ دربند و شیر گڑھ کا پہلا بندوبست ۱۹۵۳-۵۴ء میں ختم ہوا۔ اور کل مالیہ ۶۳۳۰۰/ روپیہ مقرر ہوا۔

۷۔ جون ۱۹۵۵ء میں آزاد علاقے۔ پل۔ نیل شنگ۔ تھاکوٹ۔ الائی۔ اور سندھ کوہستان کا الحاق ضلع سے کیا گیا۔

۸۔ شہید گنج کی تحریک اگست ۱۹۳۵ء میں علاقہ غیر (الائی اور تکری) و مانسہرہ کے لوگ جہاد کیلئے جمع ہوئے۔

۹۔ سب سے پہلے ۱۹۴۰ء میں ہزارہ میں مسلم لیگ زیر صدارت خان بہادر علی گوہر خان ساکن مانسہرہ بنائی گئی۔

۱۰۔ تحریک پاکستان کے دوران ضلع ہزارہ کے لوگ آخر دم تک صف اول میں رہے۔ اس کے مشہور کارکن خان بہادر علی گوہر خان، مسٹر سجاد احمد جان۔ (حال جج سپریم کورٹ) خان بہادر جلال الدین عرف جلال بابا۔ خداداد خان بھوگڑ منگ، مولوی عبدالغنی سلہڈ، محمد جان خان بھوگڑ منگ۔ شیخ محمد احمد ایڈوکیٹ ایبٹ آباد سلطان حسن علی خان برچی۔ محمد ایوب خان سواتی مانسہرہ۔ خان بہادر محمد زمان خان کھلابٹ تھے۔

۱۱۔ فروری ۱۹۴۷ء میں سرحد میں کانگرس وزارت کے خلاف مسلم لیگ نے تحریک سول نافرمانی شروع کی اس تحریک کے دوران بہت سے لوگ سرحد میں گرفتار ہوئے۔ ہزارہ میں سرکردہ اشخاص گرفتار ہوئے ان میں قابلِ ذکر افراد یہ ہیں:۔ خان سردار بہادر خان۔ جلال بابا۔ خداداد خان۔ سلطان حسن علی خان، نرین خان کرٹال

ساکن نواں شہر۔ راجہ سردار خان ساکن نگری ٹوٹیال۔ سید محمود شاہ کا خان۔ قاضی اسدالحق ایڈوکیٹ۔ ایبٹ آباد۔ شیخ محمد احمد ایڈوکیٹ۔ ڈاکٹر غلام ربانی مانسہرہ۔ میاں فتاح اللہ ساکن کھنیاں۔ سردار محمد اسلم خان ساکن باگن۔ حکیم عبدالعزیز چشتی۔ غلام حسین بھانیا ساکن ایبٹ آباد۔ ماسٹر ریحان ساکن حویلیاں صفدر زمان شاہ ساکن علی خان۔ مولوی عبدالغنی سلہڈ۔ مولوی محمد اسحاق صاحب خطیب ایبٹ آباد۔ رسول خان و سکندر خان ساکن بفہ۔ پیر عتیق اللہ ساکن بکوٹ۔ محمد ایوب خان سواتی مانسہرہ

۱۲۔ مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کی جانب سے قابل ذکر نام مفتی محمد ادریس مانسہرہ (حال نامور ایڈوکیٹ وسیاست داں) اور طہماسپ خان (حال ایڈوکیٹ) ہیں۔

اس تحریک سول نافرمانی نے مارچ میں بہت زور پکڑا۔ ۲۳ر اپریل ۱۹۴۷ء حویلیاں میں مسلم لیگ کے جلوس پر پولیس نے فائرنگ کی۔ اور داؤد شاہ ولد کریم حیدر شاہ ساکن پنچ گرائیاں (موضع نزد حویلیاں) مارا گیا۔ اور غلام حیدر ولد شرف دین ساکن بانڈہ صاحب سخت زخمی ہوا۔

۱۹۴۷ء کے ریفرنڈم میں ضلع نے غالب اکثریت سے پاکستان کے لئے ووٹ دیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد قائد اعظم مرحوم نے پاکستان ملٹری اکاڈمی کا باقاعدہ طور یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو خود افتتاح کرنا تھا لیکن کثرت کار اور کمزور صحت کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا۔ یہ افتتاح آخر کار ان کی وفات کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان نے نومبر ۱۹۴۸ء میں کیا۔

عہدِ انگریزی کے اعلیٰ حکام سرحد

چیف کمشنران:۔

۱۔ سر ہیرلڈ ڈین ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک ۲۔ سر جارج روس کیپل ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۹ء تک
۳۔ سر ہملٹن گرانٹ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک ۴۔ سر جان میفی ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک
۵۔ سر نارمن بولٹن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک ۶۔ سر سٹوورٹ پیرس ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء تک
۷۔ سر رالف گرفتھ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک

گورنران سرحد

۱۔ سر رالف گرفتھ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک
۲۔ سر جان کننگھم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک
۳۔ سر اولف کیرو ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک

عہدِ پاکستان

۱۔ سر جارج کننگھم ۱۹۴۷۔۴۸ء ۲۔ سر امبروز ڈنڈاس ۱۹۴۸۔۴۹ء
۳۔ صاحبزادہ محمد خورشید ۱۹۴۹۔۵۰ء ۴۔ خان بہادر محمد ابراہیم خان۔ قائم مقام جنوری فروری ۱۹۵۰ء
۵۔ آئی آئی چندریگر ۱۹۵۰۔۵۱ء ۶۔ خواجہ شہاب الدین ۱۹۵۱۔۵۴ء ۷۔ خان قربان علی خان ۱۹۵۴۔۵۵ء

نوٹ:۔ اس کے بعد وحدت مغربی پاکستان بننے پر یہ عہدہ تخفیف میں آگیا۔

پاکستان کے گورنر جنرل

۱۔ قائد اعظم محمد علی جناح۔ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء تک
۲۔ خواجہ ناظم الدین۔ ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۸ء سے ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء تک
۳۔ غلام محمد ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۸ر اگست ۱۹۵۵ء تک
۴۔ اسکندر مرزا ۵ر اگست ۱۹۵۵ء قائم مقام۔ ۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء مستقل) سے ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء تک

پاکستان کے صدر

۱۔ اسکندر مرزا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء سے ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک

انقلابی حکومت کے صدر

۱۔ اسکندر مرزا ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک
۲۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء تک
۳۔ جنرل آغا محمد یحییٰ خان از ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء تا

ضمیمہ

تاریخ ہزارہ پر اثر انداز حکومتیں

ماخوذ از افغان یا پٹھان۔ اللہ بخش یوسفی مرحوم

۱۔ خاندان غزنویہ (ترک) ۹۸۶ء سے ۱۱۸۶ء تک ۲۔ خاندان غوری (پٹھان) ۱۱۸۶ء سے ۱۲۰۶ء تک

۳۔ خاندان غلاماں (ترک) سنہ ۱۲۰۶ء سے سنہ ۱۲۹۰ء تک ۴۔ خاندان خلجی (پٹھان) سنہ ۱۲۹۰ء سے سنہ ۱۳۲۰ء تک
۵۔ خاندانِ تغلق (ترک) سنہ ۱۳۲۰ء سے سنہ ۱۴۱۴ء تک ۶۔ سادات سنہ ۱۴۱۴ء سے سنہ ۱۴۵۱ء تک
۷۔ خاندان لودھی (پٹھان) سنہ ۱۴۵۱ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک ۸۔ مغل (ترک) سنہ ۱۵۲۶ء سے سنہ ۱۷۴۷ء تک
۹۔ سدوزئی (پٹھان) سنہ ۱۷۴۷ء سے سنہ ۱۸۱۸ء تک ۱۰۔ عہدِ سکھاں سنہ ۱۸۱۸ء سے سنہ ۱۸۴۹ء تک
۱۱۔ انگریز سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک

قوم پنّی

افغان اقوام میں سب سے پہلے یہ اپنے آبائی وطن سے نکلے اور سیدھے ہندوستان کے جنوبی حصہ تک پہنچے اور کارہائے نمایاں کئے جن کا مفصل ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ ہندوستان سے اس قوم کا ایک حصہ اس ملک میں آیا جب کہ دیگر افغان اقوام پہلے سے قابض ہو چکی تھیں۔ یہ یہاں اس ضلع کے جنوب مغربی حصہ پر قابض ہو گئی۔ ان کی حقیقی جولانگاہ ہندوستان کی وسیع سرزمین ہی ہے۔ وہاں سے اس قوم کے کچھ افراد اس طرف آئے اور وہ موجودہ مستقر میں آباد ہو گئی۔ جدون اور پنّی ہم جدی ہیں۔ ہندوستان سے واپسی پر یہ موضع غورغشتی میں اکٹھے آکر مقیم ہوئے۔ وہاں سے جدون مہابن (ضلع مردان) چلے گئے۔ اور پنّی میدان ہزارہ میں آگئے۔ ایبٹ آباد تحصیل کے جدون پار دریائے سندھ (مہابن) سے یہاں آکر آباد ہوئے۔

مشوانی بھی قوم پنّی کے نزدیک، میدان ہری پور کے مغربی گوشہ گندگر میں بوجہ قرابت رشتہ مطابق راوائی (جس کا بیان حالات مشوانی میں درج ہے) آباد ہوئے۔ قوم پنّی کے زمانہ آمد کے متعلق میں نے تواریخی کتب وغیرہ کی بناء پر اس کے حالات میں تحریر کر دیا ہے۔ لیکن اس کی تائید کے متعلق غور و فکر کرتا رہا۔ اس امر کے لئے میں نے پنیاں کے قبرستان سے بھی اندازہ لگایا۔ میں فوقتاً فوقتاً اپنی قوم کے قبرستان میں اپنے اسلاف خاص کر والدین اور ہمشیرہ کی قبور کی زیارت، دعا کرنے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے جاتا رہتا ہوں۔

قوم پنّی کا مرکزی گاؤں اور خانی کی جگہ، موضع پنیاں ہے۔ پنّی خان (مورث قوم پنّی) نے یہاں ہی آکر قیام کیا۔ اس کی اولاد نے اردگرد دوسرے مواضعات بعد میں آباد کئے۔ اس قوم کے مشہور اور سرکردہ افراد پنیاں کے قبرستان ہی میں محو خواب ہیں ان میں سے چند کے سنین وفات اور قبور معلوم ہیں۔

قومی تاریخ کے پس منظر میں ان قبور کی زیارت سے عبرت حاصل ہوتی ہے کہ کیسے کیسے حسین،

شہ زور، نامور لوگ جن کے نام و کام قوم میں زبان زد ہیں۔ شکستہ و نیم شکستہ قبروں میں بے کسی کی حالت میں پڑے سو رہے ہیں جن کے دیکھنے سے حضرت غوث اعظمؒ کا مقولہ یاد آجاتا ہے۔ "شکستہ قبروں پر غور کرو کہ کیسے کیسے حسینوں کی مٹی خراب ہو رہی ہے۔" بعض نامور افراد قوم کے تاریخی حالات سے اس قوم کی تاریخ کے منازل کا سراغ بھی لگتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے انداز میں اپنے اس شعر میں جو انہوں نے سر راس مسعود (سر سید علیہ الرحمت کے پوتے) کے انتقال پر لوح مزار کے لئے لکھا خوب پیش کیا ہے ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک داں، مرگ را خواب گراں

ان قبور سے قوم کے کاروان کے نقش پا سے اس قوم کی منازل اور سال و سن سے آگاہی ہوتی ہے۔

پنیاں کا قبرستان آبادی سے متصل ہے۔ جہاں پرانی آبادی کی حد ختم ہوئی وہاں سے اس شہر خموشاں کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو گاؤں کی آبادی سے جانب شمال مستطیل شکل میں شرقاً غرباً طول اور شمالاً جنوباً عرض میں ہے۔ ان کا دو تین شہداء کی قبور سے ہوتا ہے۔ جو اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس قوم کو یہاں پر غیر مسلم آبادی (جس کی آبادی کے پرانے نشانات آبادی بہ شکل ڈھیری موسوم بہ پنڈ میں گاؤں کے جنوب مشرقی کونہ پر اب بھی موجود ہے) سے رزم و پیکار ہوئی۔

اس قبرستان میں معلوم افراد کی قبور، جن کے سنہ وفات بھی معلوم ہیں کے فاصلہ کا اندازہ قبور سے کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ اس قبرستان میں ایک سال کے عرصہ میں بقدر ایک کرم طول میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کل قبرستان کا طول ۴۱۰ کرم ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اس قبرستان کا آغاز یعنی قوم کی آمد کو تقریباً ۴۱۰ سال ہو گئے۔ اس کی تائید مندرجہ ذیل امورات سے ہوتی ہے۔

۱۔ افغان اقوام سلطان محمود غزنوی کے ساتھ پہلے پہل ہندوستان کی طرف آئیں جو گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ چونکہ سلطان محمود غزنوی کا رخ ہندوستان کی طرف تھا۔ اس لئے یہ سب اقوام ہندوستان کے مرکزی خطوں کی طرف جاتی ہیں۔

پٹھانوں کا اس ضلع میں آنے کا زمانہ سترھویں صدی عیسوی کے آخر کا ہے اور سب سے پہلے دلازاک قوم اس ملک میں آئی۔ ۲۔ قوم پنّی کے شجرہ مندرجہ بندوبست ہزارہ سنہ ۱۸۶۲ء میں اس قوم کا مورث اعلیٰ پنّی خان آیا اور موضع پنیاں آباد کیا۔ اس شجرہ کے مطابق سنہ ۱۹۶۰ء تک اس قوم کی (بربناء شجرہ منیر خانی خاندان، جس میں اس قوم کی خانی ہے) کل ۱۴ پشتیں گزر چکی ہیں۔ تاریخی نظریہ کے مطابق ایک صدی میں چار پشت گزر جاتی ہیں۔ لہذا ان ۱۴ پشتوں کا عرصہ تقریباً ۳۵۰ سال ہوتا ہے۔

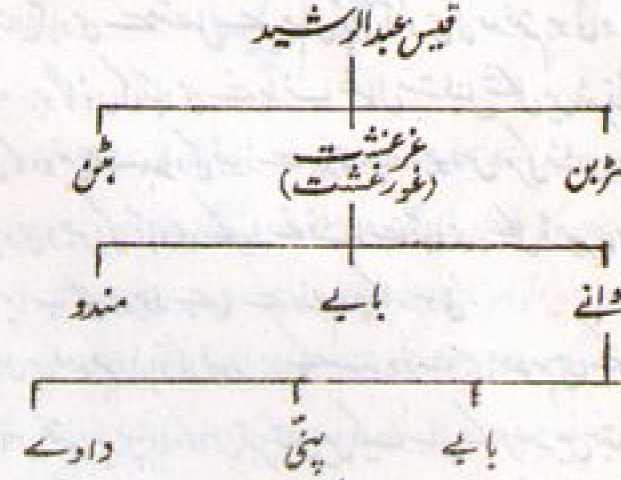
مندرجہ بالا تاریخی واقعات اور قبرستان کی پیمائش کے حساب سے اس قوم کو یہاں آئے ۴۰۰۔

۳۵ سال ہو گئے۔ اور یہ زمانہ سترھویں صدی عیسوی کے نصف کا ہوتا ہے۔

یہ قوم سب سے آخر میں آئی اور اس سنہ آمد تک سب افغان اقوام اپنی اپنی موجودہ مقامات پر آباد ہو چکی تھیں۔

قوم پنّی

افغان قوم کے شجرہ نسب کے مطابق پنی بن دانے بن غورغشت بن قیس عبدالرشید کی اولاد میں شجرہ حسب ذیل ہے :-



غورغشت قیس عبدالرشید کا منجھلا بیٹا تھا۔ اس کی اولاد میں چھ بڑی قوموں میں سے کاکڑ زیادہ مشہور رہیں اور قوی اور کثیر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اقوام غورغشت کو کاکڑ کی شاخیں سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پنی بھی ضلع ہزارہ میں کاکڑ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی ایک غالب وجہ یہ ہے کہ کاکڑ دانی ابن غورغشت کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس واسطے سب اولاد غورغشت کو کاکڑ ہی سمجھا جاتا رہا۔

آبائی وطن

اولادِ غورغشت کا آبائی وطن بھی کوہِ سلیمان کا علاقہ ہے جس کے شمالی حصہ میں قوم غلزئی مغرب اور جنوب کی طرف بلوچستان کی حد اور کچھ سپین ترین کی حد ہے قوم پنی زیادہ تر علاقہ سیوی میں آباد ہے۔

آبائی وطن سے خروج

پنی قبائل اپنی تاریخ کے سب سے قدیم دور میں اپنے آبائی وطن سے مغلوں کی تاخت و تاراج سین[1]

[1] افغانستان بزادواقی ص ۶۲۶

(یہ ہندوستان کے شاہانِ مغلیہ سے بہت پہلے کے مغلوں کے زمانہ کی بات ہے۔ جب کہ یہ مغل کابل، غزنی اور مابعد قندھار پر حکمران تھے) سے تنگ آکر کافی تعداد میں ہندوستان کی طرف کوچ کر گئے۔ جہاں انہوں نے بہت نام پیدا کیا۔ اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کے بعد جب سلطان بہلول لودھی (پہلا حکمران دہلی) کی خواہش پر بہت سی افغان قوموں نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی۔ تو ان میں پنی قوم کی بھی کافی تعداد ہندوستان گئی۔ لودھی افغان ۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء تک ہندوستان میں حکمران رہے۔

پنی قوم کو سلطان بہلول نے ڈھونڈہار (مارواڑ) میں آباد کیا۔ ۱۸۰۲ء تک پنی قوم کی رہائش کا ذکر جے پور، امبار، جودھپور اور ملحقہ علاقہ ڈھونڈہار میں ملتا ہے۔ وہاں ان کے سینکڑوں گاؤں آباد تھے۔ جن میں بعض گاؤں کی آبادی ایک ہزار سے پانچ ہزار تک تھی۔ یہ قوم تجارت پیشہ تھی اور اس کے کاروان دکن تک جایا کرتے تھے۔ دکن میں بھی اس قوم کے لوگ آباد ہو گئے تھے۔ جن میں چند بہت دولت مند تاجر تھے۔ باقی افراد دیگر پیشے بھی کرتے تھے۔ جب سُوری خاندان (جو لودھی قبیلہ ہی کی ایک شاخ ہے) کی سلطنت کو زوال ہوا۔ اور ہمایوں بادشاہ واپس آکر تخت دہلی پر بیٹھا تو پنی اور میانہ زا (پنی اور میانہ زا ایک ہی شاخ ہیں) نے قسمت آزمائی کے لئے دکن کا رخ کیا۔ اور کے خود مختار حکمرانوں کی ملازمت اختیار کر لی۔

شیر شاہ سُوری نے (۱۵۴۱ء سے ۱۵۴۵ء تک) جب قلعہ رہتاس صوبہ بہار بنایا تھا۔ جو اس وقت ہندوستان کے سب قلعوں سے مضبوط تر تھا اور اسی میں حکومت کا خزانہ رہتا تھا۔ تو اس کی حفاظت کے لئے اپنے ایک معتمد امیر اختیار خان پنی ہی کو محافظ بنایا۔

جب شاہجہان بادشاہ نے شاہزادہ اورنگ زیب کو ۱۶۵۵-۵۶ء میں دکن بھیجا تو احمد نگر کے مقام پر بہلول خان میانہ زا بیجاپور سے استقبال کے لئے حاضر ہوا۔ اور شاہ جہان بادشاہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی مقام پر اس کی ملاقات خضر خان بوڑھے زئی پنی سے ہوئی جو شاہزادہ اورنگزیب کے ہمراہ تھا۔ ان دونوں (خضر خان پنی اور بہلول خان میانہ زا) کی یہ ملاقات بہت مدت کے بعد ہوئی تھی اور بقول مورخ یہ پرانے دوست جو مدت سے بچھڑے ہوئے تھے ملے اور ان کی یہ ملاقات ان کے لئے باعث مسرت ہوئی۔ ان دونوں کے اجداد ایک قوم اور ایک ملک سے تھے اور یہ دونوں پڑوسی اور یک نسب ہونے کے علاوہ دوران تعلیم میں ہم جماعت بھی تھے۔ اکتوبر ۱۶۸۶ء میں جب

[1] تائید از تاریخ خورشید جہاں ص ۶۷۔

عادل شاہی حکومت کو شکست ہوئی اور بیجاپور ختم ہوگیا تو داؤد خان پنی پسر خضر خان کو بیجاپور کا فوجدار مقرر کر دیا گیا۔ وہ تین سال تک یہاں فوجدار رہا۔ اس کے بعد پائیں گھاٹ (حال صوبہ بمبئی ہندوستان) کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا۔

نوابانِ کرنول پٹھان خاندان سے ہیں۔ اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ خضر خان پنّی تھا۔ جو پورنی ئی (بوڑے زئی) قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ پٹھان عالمگیر کی فوج میں ایک معمولی درجہ کا افسر تھا۔ عالمگیر کی فوجیں جس وقت دکن میں آئیں تو خضر خان کی دوستی یہاں شاہ نور کے حاکم بہلول خان سے ہوئی اور یہ دوستی اس قدر بڑھی کہ بہلول خان نے جو عالمگیر کے دربار میں خاصا اثر رکھتا تھا۔ خضر خان کو کرنول کی جاگیر اس شرط پر دلائی کہ شاہنشاہی خدمت کے لئے تین ہزار سوار اور سات ہزار پیادے رکھے جائیں۔ اس علاقہ سے چونتیس لاکھ روپیہ سالانہ محاصل وصول ہوتے ہیں۔

جس وقت عالمگیر سے یہ جاگیر دلائی گئی تو کرنول ابھی بیجاپور کے ایک افسر کے ماتحت تھا۔ خضر خان، بہلول خان کو ساتھ لے کر آیا۔ ان دونوں کی متحدہ فوجوں کو دیکھ کر، کچھ خوف سے اور کچھ رشوت وغیرہ سے اس افسر نے قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ اس جاگیر کے انتظام سے فارغ ہو کر خضر خان اس محاصرہ میں شریک ہوا جو عالمگیر نے اورنگ آباد کا بذاتِ خاص کیا تھا۔ ایک دن جب وہ شاہنشاہ کی خدمت میں جا رہا تھا تو راستہ میں شیخ منہاج نے اس کو قتل کر دیا۔ معلوم نہیں ہوا کہ ان میں پہلے سے دشمنی تھی یا اور کوئی بات ہوئی۔ شیخ منہاج اپنی تیز زبانی کے لئے نہایت مشہور تھا۔

اس قتل کی خبر شہنشاہ کو ملی تو اس نے مصلحتاً دورانِ جنگ میں فوراً ہی قصاص لینا مناسب نہ سمجھا لیکن یہی خبر جب کرنول پہنچی تو خضر خان کا بیٹا داؤد خان پٹھانوں کی ایک بڑی جمعیت لے کر اورنگ آباد کی طرف بڑھا۔ عالمگیر کو جب یہ خبر ملی تو اس نے ایک بے چینی سی محسوس کی اس کو خوف تھا کہ داؤد خان کے آجانے سے فوج میں ایک انتشار پھیل جائے گا۔ کیونکہ اس میں شیخ منہاج کے بھی بہت سے طرفدار تھے اس وقت ذوالفقار خان جو شہنشاہ کا خانساماں تھا، شہنشاہ کو اطمینان دلایا کہ وہ داؤد خان کو سمجھا بجھا کر راستہ پر لے آئے گا۔ یہ خانساماں خضر خان کا منہ بولا بھائی تھا۔ اس نے داؤد خان کو لکھا کہ وہ اپنے باپ کے معاملہ کو شہنشاہ کی مرضی پر چھوڑ دے۔ داؤد خان نے اس نصیحت کو قبول کر لیا۔ اور اپنی فوج کو کرنول واپس بھیج دیا۔ اور پھر ذوالفقار خان کے پاس آیا۔ جہاں اس نے اس کو عالمگیر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور انصاف کی التجا کی۔ ابھی اس مقدمہ کی پوری کارروائی بھی نہیں ہوئی تھی کہ شیخ منہاج اپنے ہی ایک ملازم کے ہاتھ سے قتل ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد

لہ افغانہ

داؤد خان، عالمگیر کی فوج میں رہا اور اس نے بہت سی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ اور عالمگیر کی وفات کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں۔ ان میں وہ بھی شریک تھا۔

(نوٹ) مطابق تاریخ "پنجاب مغلوں کے ماتحت" مؤلفہ محمد اکبر (ص ۱۸۱) میں تحریر ہے۔ جب دارا پنجاب پہنچا۔ تو داؤد خان کو بیاس کے راستہ پر متعین کیا۔ کہ اورنگ زیب کی فوجوں کی پیش قدمی کا مقابلہ کرے۔ داؤد خان نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اورنگ زیب نے ایک دو گمنام خطوط سے دارا کے دل میں داؤد خان کے خلاف شک پیدا کر کے بدظن کر دیا۔ لیکن داؤد خان آخر تک دارا کا وفادار رہا۔ جب دارا شکست کھا کر پنجاب بھاگ گیا تو داؤد خان نے اس شرط پر اورنگ زیب کی اطاعت کی کہ اس کو کبھی دارا کے خلاف جنگ کے لئے نہ بھیجا جائے گا۔ اورنگ زیب نے یہ شرط مان لی (ص ۱۸۲)

مآثر عالمگیری میں ۱۷۰۴ء کے واقعات میں درج ہے کہ داؤد خان پنی ایک بہادر سپاہی اور حکومت کا قابلِ اعتماد حاکم تھا۔ آخر اپریل ۱۷۰۵ء جب بادشاہ نے واکان کرہ کے پہاڑی قلعہ واقعہ علاقہ سکھر پر حملہ کر کے اسے لے لیا۔ تو اس حملہ میں خضر خان اور اس کا بھائی بہادر خان بمعہ اپنی قوم اور سپاہ کے بادشاہ کے ساتھ تھا۔ داؤد خان پنی بادشاہ عالمگیر کے ساتھ اخیر عمر تک رہا۔ بادشاہ نے اپنی موت سے بیس دن پہلے (جو ۲۰ فروری ۱۷۰۷ء کو اورنگ آباد میں ہوئی) داؤد خان کو خاندیش کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔ اس حکم کے ملنے پر وہ برہان پور کے لئے روانہ ہوا۔

عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد تخت نشینی کے لئے جنگ برادران میں داؤد خان پنّی نے سلطان محمد اعظم (جو اس وقت دکن میں تھا) کا ساتھ دیا۔

جب فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) بادشاہ ہوا تو اس نے داؤد خان کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا اور چن قلیچ خان نظام الملک بہادر خان فتح جنگ کو فروری ۱۷۱۳ء میں دکن کے چھ صوبوں پر داؤد خان پنی کی جگہ صوبہ دار مقرر کیا۔ چونکہ فرخ سیر بادشاہ اپنے وزیروں، سید عبداللہ خان اور سیّد حسین علی خان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھا۔ اور ان دونوں بھائیوں کی قوت توڑنے کے لئے ان کو الگ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حسین علی خان خود دہلی میں رہ کر ہی دکن کی صوبہ داری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے حسین علی خان کو حکم دیا کہ دہلی سے دکن جا کر خود چارج لے لے۔ ساتھ ہی خفیہ طور پر داؤد خان کو لکھ بھیجا کہ جب حسین علی خان وہاں پہنچے تو اس کو چارج نہ دے اور اس کا مقابلہ کرے۔ اس جنگ میں داؤد خان پنی مارا گیا اور یہ حادثہ بادشاہ کی کمزوری کی وجہ سے پیش آیا۔

داؤد خان کی اولاد پٹھان بیوی سے نہ تھی لہٰذا اس کا جانشین اس کا بھائی علی خان ہوا۔ اس نے

ساڑھے پانچ سال حکومت کی۔ علی خان کے بعد اس کے بڑے لڑکے ابراہیم خان نے مسندِ ریاست سنبھالی۔ ابراہیم خان ادھونی کا بھی حاکم تھا۔ ابراہیم خان نے اپنی جدّی ریاست کی مسند خان جہان خان سے جب وہ دکن کا وائسرائے بن کر آیا پانچ لاکھ روپیہ نذر دے کر حاصل کر لی۔

اس نے کرنول کو خوب رونق دی۔ پٹھان قبیلوں کو بلا کر آباد کیا۔ شہر اور قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کی قلعہ کو جو اب تک مٹی کا تھا پتھر سے بنایا۔ جب ۱۷۲۲ء میں آصف جاہ اول وائسرائے بن کر آیا تو برہان پور جا کر اس نے اظہارِ اطاعت کیا۔ اس سے خوش ہو کر آصف جاہ نے بھی خان جہان کی دی ہوئی سند کی تصدیق و تجدید کی۔ یہ ریاست بوڑی زئی پنی قوم کے پاس کئی پشت تک رہی۔ اور انگریزوں، فرانسیسیوں اور نظام میں جو جنگیں وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں ان میں وہ شامل ہوتے رہے۔ اس کے چار سال بعد اس کی وفات پر اس کا بیٹا **الف خان پنی** مسند نشین ہوا۔ اس نے آصف جاہ کے دوسرے فرزند ناصر جنگ سے بہت دوستی بڑھائی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ناصر جنگ کو آصف جاہ سے منحرف کرنے میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان میں ایک الف خان بھی تھا۔ لیکن جب ناصر جنگ نے اطاعت کر لی تو آصف جاہ نے اُن لوگوں کو جو ناصر جنگ کے شریک تھے کوئی سزا نہیں دی۔ صرف اپنے روبرو آنے سے منع کر دیا۔ آصف جاہ کی اس کارروائی سے اوروں کے ساتھ الف خان کو بھی خوف پیدا ہو گیا۔ لیکن جب آصف جاہ کرناٹک کی تسخیر کے لیے جنوبی ہند کی طرف بڑھا تو اس نے تمام جاگیرداروں کے نام احکام بھیجے کہ اپنی اپنی فوجیں لے کر آئیں اور شریک ہو جائیں اس وقت الف خان نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے بیٹے بہادر خان کے ماتحت ایک بڑی فوج مع نذرانہ بھیج کر معافی کی خواستگاری کی۔ آصف جاہ نے نہ صرف معافی دی بلکہ بہادر خان سے بہت اچھا سلوک بھی کیا اور رخصت کی اجازت بھی دی۔ بیٹا جب یہ خوش خبری لے کر کرنول پہنچا تو الف خان خود بھی آصف جاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور ان تمام لڑائیوں میں حصہ لیا جو کرناٹک میں ہوئیں۔ جس کے بعد آصف جاہ نے اپنی جاگیر پر جانے کی اجازت دی۔ تیرہ سال حکومت کرنے کے بعد اس کی وفات پر اس کا بیٹا **بہادر خان پنی** جس کا دوسرا نام ہمت بہادر بھی تھا مسند نشین ہوا۔ اس کے ہاتھ سے ناصر جنگ قتل ہوا۔ اور اس واقعہ کے چھ ماہ بعد اپنے ہم ذات پٹھانوں کے ہاتھ سے **راتی چوٹی** کے ہنگامہ میں مارا گیا جس کے بعد اس کا بیٹا **منور خان پنی** مسند نشین ہوا۔ یہی منور خان ہے جس کا دوسرا نام **رَن مست خان** بھی ہے مکاتیب میں اسی کا ذکر ہے۔

دیکھو صحیفہ سلطان ٹیپو (تخت نشینی ۱۷۸۲ء اور شہادت ۱۷۹۹ء) از محمود خان بنگلوری (ص ۲۳۴ اردو تحقیق اکیڈمی)

ماٰثرِ عالمگیری میں تحریر ہے کہ عالمگیر کے چھبیسویں سال حکومت میں رن مست خان برادر خضر خان پنی و داؤد خان و سلیمان بیلوران رن مست خان بہ ستاذنی بہی پہ حاضر ہو کر خلعت دوست کے عطیہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

دن پہلے اپنی تمام قوم، مرد و عورت کو قلعہ کے باغ میں جمع کیا اور سب سامان، خزانہ و دولت جو اس کو ورثہ میں ملی تھی ان میں تقسیم کر دی۔ اپنے لئے صرف سفید کپڑوں کو ایک جوڑا رکھا اور اپنے پیچھے نیک نام اور اعمالِ حسنہ یادگار چھوڑ گیا۔

اس نواح میں دیگر پنی قبیلے میانڑہ اور دیگر افغان بھی کافی جائداد اور ملکیت رکھتے تھے۔

۱۷۹۹ء میں میسور کی چوتھی جنگ ہوئی اور سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا۔ تو اس کے بعد کرنول کی نوابی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کرک پیٹرک نے نوابانِ کرنول کے عہدِ حکومت کی جو تاریخیں دی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

	سن آغاز	مدت حکومت	سال وفات
۱- خضرو خان			۱۶۷۴ء
۲- داؤد خان	۱۶۷۴ء	۳۸	۱۷۱۲ء
۳- علی خان	۱۷۱۲ء	۵½	۱۷۱۷-۱۸ء
۴- ابراہیم خان	۱۷۱۷-۱۸ء	۱۳½	۱۷۳۱ء
۵- الف خان	۱۷۳۱ء	۱۳	۱۷۴۴ء
۶- بہادر خان یا ہمت بہادر	۱۷۴۴ء	۷½	۱۷۵۰-۵۱ء
۷- منور خان یا رَن مست خان	۱۷۵۱ء	۴۰	۱۷۹۲ء
۸- الف خان	۱۷۹۲ء	۷	۱۷۹۹ء

مکاتیبِ سُلطانی (ٹیپو سُلطان)

کرنل بٹسن کی کتاب سے ماخوذ

خط نمبر ۱۹۴ —— بنام رَن مست خان حاکم کرنول —— ۵ جنوری ۱۷۸۶ء

آپ کا نامۂ خیریت ملا۔

چند دن پہلے، ہم بنگلور وغیرہ کے قلعوں کے معائنہ کے لئے ایک بالکل معمولی فوج کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں خبر ملی کہ کورگ میں بغاوت پھیل گئی ہے۔ ابن الغرض اور قابو طلب باغیوں نے بڑی بڑی امیدیں باندھ کر ہماری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب سر اُٹھایا تھا۔ اس خبر کے ملتے ہی ہر ممکن سرعت سے ہم وہاں پہنچے اور ان قابو طلبیوں سے پچاس ہزار کو قید کر لیا گیا اور باقی کورگی ہماری فوج کی آمد کی خبر سُن کر ایسے جنگلوں میں جا کر چھپ گئے جہاں پرندے پَر مارتے ہوئے

رائچوٹی میں جس وقت ہنگامہ ہوا منور خان کرنول سے دُور نندیال میں تھا۔ گدک کے پالیگار نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کرنول پر قبضہ کر لیا۔ منور خان یہ دیکھ کر نندیال سے کڑپہ آیا۔ اور یہاں عبدالغنی خان حاکم کڑپہ سے مدد مانگی۔ اس نے بجائے فوجی کمک دینے کے نقد روپیہ دیا۔ اس روپیہ سے اُس نے سات سو پیادے اور تین سو سوار جمع کر کے کرنول پر چڑھائی کر دی۔ اس چھوٹی سی فوج کو دیکھ کر پالیگار نے بجائے قلعہ بند ہو کر لڑنے کے کھلے میدان میں آکر مقابلہ کیا۔ پالیگار کی اس فوج کو پٹھانوں نے نہایت آسانی سے کاٹ کر رکھ دیا۔ اور قلعہ پر قابض ہو گئے۔ منور خان نے قلعہ پر قبضہ کر کے حکومت شروع کی۔ چونکہ اس کی مسند نشینی کی اجازت دکن کے وائسرائے سے نہیں لی گئی تھی اس لئے نواب صلابت جنگ کے وزیر شاہ نواز خان نے کرنول پر فوج کشی کر دی۔ منور خان نے اس وقت کامل اظہارِ اطاعت کرتے ہوئے نذرانہ پیش کیا اور اس طرح حکومت بحال رہ گئی۔

ابھی اس سے چھٹکارا حاصل ہوا ہی تھا کہ کرنول کے دروازے پر سلطان حیدر علی جنوبی ہندوستان کا نامور فاتح آ نمودار ہوا۔ منور خان نے طاقت مقابلہ نہ دیکھ کر حیدر علی کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کیا۔ حیدر علی نے اس نذرانہ اور اظہارِ اطاعت کو قبول کر لیا۔

اس واقعہ کے بعد منور خان ۱۷۹۰ء تک حیدر علی اور بعد میں ٹیپو سلطان کو خراج دیتا رہا لیکن اس سال جب نظام مرہٹوں اور انگریزوں نے سلطنت خداداد پر چڑھائی کی تو منور خان نے بھی اپنی فوج اپنے بیٹے الف خان کے تحت دے کر سکندر جاہ کے ساتھ کر دیا جو حیدر آبادی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس جگہ پر یہ کہنا ضروری ہے کہ نہ صرف کرنول بلکہ بہت سے سرحدی حاکم بیک وقت دو دو طاقتوں کے ماتحت ہوتے تھے اور جس کا پلہ بھاری سمجھتے تھے اس کے ہی ساتھ ہو جاتے تھے۔ کرنول کی حالت بھی یہی تھی۔

منور خان ۱۷۹۲ء میں مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا **الف خان** مسند نشین ہوا۔

میسور کی تیسری جنگ ۱۷۹۲ء میں سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی اور نصف ملک ہاتھ سے نکل گیا تو کرنول کا علاقہ نظام کے حصہ میں آیا۔ لیکن الف خان بخلاف اپنے باپ کے ٹیپو سلطان کا طرفدار تھا۔ اس نے ۱۷۹۶ء میں کھلم کھلا نظام کی اطاعت سے انحراف کر کے ٹیپو سلطان سے ایکا کر لیا۔ نظام نے اس وقت چاہا کہ کمپنی کی فوج بھیج کر اسے راہ راست پر لائے۔ لیکن اس وقت کے گورنر جنرل سر جان شور نے فوج دینے سے انکار کر دیا۔ کرنول کا نام پھر ۱۷۹۶ء ۱۷۹۸ء میں آتا ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ سلطان نے نظام کو جہاد پر متوجہ کیا۔ لیکن نظام اس پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر کار کرنل تھامس منرو نے (جو بعد میں سر تھامس منرو ہوا) اس ریاست کو فتح کر لیا۔ اور کرنول کے آخری خان الف خان ولد منور خان نے شہر فتح ہونے سے ایک

ڈرتے ہیں۔ ان قیدیوں کو اُن کے ملک سے نکال کر یہاں لایا گیا اور انہیں مسلمان بنا کر احمدی فوج میں داخل کر لیا گیا۔ یہ خوشخبری دوستوں کے لئے باعثِ مسرت اور منافقوں کے لئے باعث تنبیہ ہے ہم نے آپ کو اپنا ایک مخلص دوست اور اسلام کا حامی سمجھ کر یہ اطلاع دی ہے۔ اب ہم نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس جانب (کرنول) ہماری فوج ظفر موج کے ساتھ آ کر اس دوست سے ملاقات کریں، جس کی ایک عرصہ سے ہمیں خواہش ہے۔ اس وقت راجہ دھرم داس اور خواجہ لطف اللہ (کرنول کے ایلچیاں) کو اجازت دے کر یہاں سے اس دوست کے پاس واپس بھیج دیا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ملاقات ہونے تک آں مہربان اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہیں گے۔

(کرک پیٹرک لکھتا ہے کہ اس خط کے پہنچنے پر رنمست خان نے اپنی اس فوج کو جو نندیال میں جمع ہو رہی تھی۔ واپس بُلا کر سلطان کی خدمت میں از سر نو تحائف بھیجے)

خط نمبر ۱۹۹ —— بنام رنمست خان حاکم کرنول۔ ۱۳ر جنوری ۱۷۸۶ء

آپ کی دوستی کی قدر کرتے ہوئے ہم نے گیارہ لاکھ کی رقم میں سے جو از راہ پیش کش واجب الادا تھی چار لاکھ روپے منہا کر دئے تھے۔ کیونکہ آپ کے وکیلوں نے آپ کی مشکلات کا ذکر کیا تھا اب اور پچاس روپے وضع کئے جاتے ہیں۔

اُس علاقہ کو جو اس دوست کا تھا اور اب ہمارے ماتحت ہے ہم نے دیوان اور بخشی فیض حصار (گوتی) کو لکھا ہے کہ یہ آپ کے حوالے کر دیا جائے۔ دوستی و محبت کا تقاضا ہے کہ ایسا ہی کیا جائے۔ امید مہربان وقت مقررہ پر واجب الادا رقم بھیج دیں گے۔ تاکہ دوستی کا سرچشمہ اور زیادہ جاری و پابند رہے۔ اُس قدر و منزلت کے لحاظ سے جو ہمارے دل میں آپ کے لئے ہے ایک مہتابی خلعت اور ایک ہاتھی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اپنی خیریت کی خبر سے ہمیں ہمیشہ مسرت بخشیں۔

تبصرہ۔ خط نمبر ۱۹۰ میں بتایا گیا تھا کہ کرنول کی فوج نندیال میں جمع ہو رہی تھی اور خط نمبر ۱۹۴ میں جب سلطان نے ادھر آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو رنمست خان نے ڈر کر سلطان کی خدمت میں تحائف بھیجے۔ جس کے جواب میں سلطان نے نہ صرف پیش کش کی رقم میں چار لاکھ روپے معاف کر دئے بلکہ وہ علاقہ بھی اس کو دے دیا۔ نیز خلعت اور ہاتھی بھی روانہ کئے۔

خط نمبر ۱۹۰ حسب ذیل ہے:۔

بنام میر قاسم علی خان۔ ناظم ڈاک گوتی (دیا گتی) ۲ر جنوری ۱۷۸۶ء

تم نے اطلاع دی ہے کہ حاکم کرنول کے ایک ہزار بے قاعدہ پیادے تین سو سوار اور پانچ سو باقاعدہ

فوج کے سپاہی شہر ننندیال میں آئے ہیں اور اُن کا ارادہ ہے کہ قریب کے اس قلعہ پر قبضہ کرلیں جو ہمارے ماتحت ہے۔ خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں اگر وہ اسی نیت سے آئے ہیں تو بہت جلد اس کا ثمر پائیں گے۔

خط نمبر ۳۱۹ بنام رُن مست خان۔ حاکم کرنول۔ ۹ر جولائی ۱۷۸۶ء

اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کے وکیل دھرم داس کو رخصتی پروانہ دے دیا گیا ہے تاکہ وہاں پہنچ کر آپ کو حالات موجودہ سے واقف کرے اور دونوں حکومتوں کے درمیان جو دوستانہ تعلقات ہیں ان کو اور زیادہ ترقی دے۔

علاقہ پنیالہ —— اور اس کی قدیم تاریخ

راورٹی نے اپنی کتاب "افغانستان کے متعلق یادداشتیں" میں صفحہ ۲۸۱ پر اس کا مفصل ذکر کیا۔ جو بجنسہٖ درج ذیل ہے :-

وادی سندھ پر مغلوں کے جو حملے ۲۲-۱۲۲۱ء میں ہوئے ان میں ہم ملک سیف الدین حسن قارلغ اور اس کے بیٹے ملک ناصرالدین محمد قارلغ کا نام پڑھتے ہیں۔ (سر اُلف کیرو اپنی کتاب پٹھان ۱۹۵۸ء میں صفحہ ۱۳۵ پر لکھتا ہے کہ چنگیز خان کا حملہ محمد شاہ والئی خوارزم پر ۱۲۱۹ء میں ہوا۔ والئی خوارزم کا لڑکا جلال الدین غزنی کا حاکم تھا وہ بھاگ کر کالا باغ کے علاقہ دریائے سندھ کو آگیا۔ اسی کے نام پر تھل کے علاقہ کو چول جلالی کہتے ہیں اور وہ ۱۲۲۱ء میں سندھ کے راستہ سے واپس چلا گیا۔ جو خلجی اس کے ساتھ تھے وہ دہلی میں التمش کے ساتھ جا ملے) اُن کے زیر حکومت غزنی، کرمان (کرم ایجنسی) اور بنیان (اغلباً موجودہ پنیالہ) کے علاقوں کے نام کا ذکر موجود ہے۔

خوارزم شاہیوں کی بربادی کے اسباب پر ایک نوٹ" الہلال" میں شائع ہوا تھا جو عبرت کے لئے درج ذیل ہے۔

"فتنۂ تاتار (جس نے ساتویں صدی میں تمام عالم اسلامی کو زیر و زبر کر دیا۔) اس کا پہلا سر مشق جلال الدین خوارزم شاہ تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ہلاکو خان کے حملہ آور فوج پیچھے پیچھے اور غفلت و مے گساری و مخموریت آگے آگے رہتی تھی۔ آج کسی شہر میں مقابلہ ہوا۔ تاتاریوں نے خوارزم شاہیوں کو پسپا کر دیا۔ بادشاہ ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ رات کو بڑی مشکل سے کسی مامن میں پناہ لی۔ لیکن پھر شراب و شاہد اور رود و سرود کا مشغلہ شروع ہو گیا۔ دوسرے دن تاتاری یہاں بھی آ پہنچے۔ اور خوارزم شاہ بھاگ کر کسی دوسری جگہ پناہ گزیں ہوا۔ پھر وہی دَور چل نکلا۔ اور رات بھر جام و مینا کی صحبت عیش میں بسر ہوئی۔ یہی تباہ کاریا

تھیں جن سے متاثر ہو کر بادشاہ کے خاص شاعر تنگ کا دل بھر آیا اور اس نے لکھا تھا کہ :-

شاہا ز مئے گراں چہ برخواہد خاست | وز مستی، بہرزمان چہ برخواہد خاست
شہ مست، جہاں خراب، دشمن پس و پیش | پیداست کزیں میاں چہ برخواہد خواست

بادشاہ اس پر بھی متاثر نہ ہوا اور آخر اپنی سلطنت ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کی ساری عزت و عظمت بھی کھو بیٹھا۔

ہندوستان میں ایک عہد تو وہ تھا کہ خان دوران کو عین معرکۂ جنگ میں نماز پڑھتے ہوئے گولی لگتی ہے وہ شہید ہو جاتا ہے۔ سپاہی بددل ہو جاتے ہیں۔ لشکر میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ اسی عالم میں معین الملک (میر منّو) اٹھتا ہے۔ مرحوم سپہ سالار کی لاش کو آگے رکھ لیتا ہے اور اس شدت سے حملہ کرتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی جیسے نبرد آزما کو دست ستیز پر پائے گریز کو ترجیح دینی پڑتی ہے"

مصنف طبقات ناصری کے بیان کے مطابق جب سلطان جلال الدین ہرات کے قرب و جوار سے آیا۔ تو پہلے غزنی میں داخل ہوا۔ وہاں سے وہ بنیاں آیا۔ تو یہاں سے بذریعہ کشتی دریائے سندھ کے راستہ سے اُچھ گیا۔

سلطان التمش جب ۳۶-۱۲۳۵ء میں سخت بیمار ہو کر دہلی کو واپس ہوا تو وہ دوآبہ چین اٹ (دوآبہ چناب جہلم) کو بنیان اور دریائے سندھ کے راستے سے جا رہا تھا۔ جب ملک سیف الدین حسن قارلغ کو غزنی اور کرمان چھوڑنا پڑا تو وہ علاقہ بنیان کی طرف ہٹ آیا۔ پھر جب اس کو اس جگہ سے بھی ہٹنا پڑا۔ تو وہ ملتان چلا گیا۔ اور اس پر قبضہ کر لیا۔

۳۷-۱۲۳۶ء میں ملک ناصرالدین محمد جو دہلی میں پناہ گزیں تھا بنیاں آگیا اور اپنے والد ملک سیف الدین حسن سے مل گیا۔ اس کا والد اس وقت اس علاقہ پر قابض تھا۔

سلطان ناصرالدین محمد شاہ

سلطانِ دہلی جب ۴۷-۱۲۴۶ء میں تخت نشین ہوا تو وہ بنیاں اور دریائے سندھ کے ساحل تک مغلوں کو شکست دینے کے لئے گیا۔ چونکہ وہ دریا سے پار نہیں ہوا اور بنیان تک ہی گیا تو لازماً بنیاں مشرقی کنارے ہی پر تھا۔ مندرجہ بالا تاریخی واقعات اور قدیم مسلمان مورخوں کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس علاقہ کو کوہِ جُود (جو دوآبہ سندھ ساگر کے شمالی حصہ میں ہے) کے اندر واقع یا اس سے ملحق بیان کرتے ہیں وہ خطۂ بنیاں اور اس کے ملحقات ہی ہیں جو شمال کی طرف پکھلی کے میدان اور اُس کے تین دروں تک پھیلا ہوا ہے اور جہاں پر قارلغ ترک قبیلے مغل حکمرانوں کے

ماتحت آباد ہوں گے۔ اس علاقہ ۔ موجودہ پنیاں ۔ میں پرانے زمانے کے بہت سے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ جو کہ پرانے شہروں اور قصبوں کے آثار ہیں۔ ان کھنڈرات کو اس علاقہ میں پنڈ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی اونچی جگہ۔ مثلاً ۱ پنیاں کے گاؤں کے ساتھ سڑک کے نزدیک بطرف جنوب پنیاں کا پنڈا ۔ ۲ پنیاں سے بطرف شمال مشرق ڈھینڈہ کے شارع عام پر مانکرائے کا پنڈ ۳ موضع بھیرہ کے نزدیک اراضیات موسومہ برنگڑ کا پنڈ ۔ اور ۴ پنیاں سے جانب جنوب جرنیلی سڑک سے جانب جنوب (کمال پورہ کے گاؤں کے سامنے) مہندرا پنڈ (یعنی پست پنڈ) بزبان ہندکو۔ لیکن ممکن ہے یہ پرانا نام ہو۔ اُن آثار سے مٹی کے کھلونے، بُت، اور تانبے کے سکے عام طور سے نکلتے رہتے ہیں۔ مانکرائے کے پنڈ سے چند سال ہوئے ایک زمیندار کو سونے کے کڑے اور دیگر زیورات بھی ملے تھے ۔ اُس زمانہ کے بڑے بڑے شہروں کی جگہ جو چھوٹے چھوٹے گاؤں رہ گئے ہیں۔ اب بھی پرانے ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اُن میں پنیاں کا گاؤں بھی ہے۔ پسا در ب فارسی اور تاجک زبان میں ہم معنی اور ہم بدل حرفات ہیں۔ اس لئے میری رائے میں موجودہ پنیاں یا بنیاں ہی تاریخ کے قاریخ ترکوں کا خطۂ بنیاں ہے ۔ دکیا عجب جو اسی طرح موضع بھیرہ بھی اسی زمانے کے ایک بڑے شہر کے نام والی آبادی ہو۔ اس گاؤں میں بہت پرانے زمانہ کا ایک کنواں آباد ہے ۔ اور گاؤں کے لئے ذریعہ آب نوشی۔ کنواں کی ساخت و تعمیر آثارِ قدیمہ کی طرز کی ہے ۔ ش ۔ ب)

اگر یہ ٹھیک ہے تو یہ ایک مضبوط وجہ اس بات کی ہو سکتی ہے کہ امیر تیمور تاریخ ہنگ ۔ یا ہزارہ کو اس جگہ رہنے کا حکم اسی بنا پر ملا ہو (امیر تیمور کا حملہ [illegible] ھ میں ہوا ہے) تا کہ وہ اپنی ہم قوم کے لئے جو وہاں پہلے ہی سے سکونت پذیر تھے، مضبوطی اور حفاظت کے ضامن ہو سکیں۔ اس زمانہ میں کسی افغان قوم کا سندھ کے مشرقی حصہ میں آباد ہونا قرین قیاس نہیں۔ اگرچہ لودھی قوم کا محمود غزنوی کے وقت ملتان میں موجود ہونا بیان ہوتا ہے ۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ملتان صوبہ کی حد اس زمانہ میں دریائے سندھ سے پار کوہ سلیمان کے دامن تک پھیلی ہوئی تھی۔ جو کہ لودھی قوم کی رہائش گاہ تھی۔ لہٰذا بہت ممکن ہے کہ عارضی طور پر چند گھرانے ملتان میں آکر آباد ہو گئے ہوں۔ اگرچہ بعد میں مغلوں، تاتاریوں ، اور ترکوں کے دباؤ کی وجہ سے افغان قومیں اپنا آبائی وطن چھوڑ کر دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں کی طرف ہجرت کرتی رہیں ۔ اور ان علاقوں کے باشندے مثلاً ۔ آوان ۔ کار ‘‘ کو اور مشرق کی طرف دھکیلتی رہیں ۔ آوان ۔ کار کے چند خاندان اب بھی درۂ شلوزان ۔ وادیٔ کرم میں آباد ہیں۔ اور اُن کے آبائی وطن غزنی اور کابل کے علاقوں پر مغل پھر تاتاری اور ترک قبضہ کرتے رہے ۔ اور غزنی و کابل کے مغربی

وسیع علاقوں میں آباد ہوتے رہے ۔

پنّی

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۔ پنی کی اولاد بہت کثیر تھی اور اپنے آبائی وطن ساوگر دامندا ہی علاقہ سیوی ستان (سیبی) سے نکالے گئے ۔ اور ملک میں منتشر ہو گئے ۔ اور زمانہ قدیم میں شمال کی طرف ہجرت کر گئے ۔ اُن کی بہت کم تعداد اپنے اصلی وطن میں رہ گئی ۔ زیادہ تعداد میں وہ ہندوستان چلے گئے ۔ جہاں اب تک اُن کی آبادیاں دکن تک پھیلی ہوئی ہیں۔

پھر وہ لکھتا ہے کہ جدون ، جو پنی کا ایک قبیلہ ہے اور دریائے سندھ کے مغرب ۔ مہابن ۔ میں آباد ہیں ۔ ان کے علاوہ پنی قوم جس کی تعداد چھ سات ہزار سے کم نہیں اس وقت ضلع ہزارہ میں موجود ہیں اور ان کے اٹھارہ بیس مواضعات ہیں ۔ اور ان کا مرکزی شہر نجیب اللہ گڑھ ہے (یہ مرکزی شہر حکومت ترین کا تھا ۔ ذکر پنی کا ۔ اس وقت قوم ترین کی حکومت تھی اور اس شہر کو نجیب اللہ خان ترین نے آباد کیا تھا ۔ اس کا نام کوٹ نجیب اللہ ہے ۔ ش ۔ ب) لیکن پنجاب کے الحاق کے بعد جو [illegible] میں ہوا ان علاقوں میں کافی تغیرات ہو چکے ہیں۔

قوم غورغشت کا چھچھ ہزارہ میں آنا

آدم خان ، سلطان سکندر لودھی کے وزیر ، آدم خان کے پوتا اشرف خان امارت کو لات مار کر صوفی بن گئے ۔ وہ شیخ احمد کے مُرید تھے ۔ ان کے شیخ نے اِن کے سپرد لنگر کا گدا کر دیا ۔ جس سے وہ عوام افاغنہ میں گدائے مشہور ہو گئے ۔ اور ان کی اولاد گدون مشہور ہوئی ۔ گدون سے باشندگان رش جیدون مشہور ہوئے ۔ شیخ اشرف المعروف شیخ گدون کے غورغشتی میں کافی مرید ہو چکے تھے ۔ جب سلطنت افاغنہ ابراہیم لودھی کی شکست ، و قتل کے بعد [illegible] ھ میں منہدم ہو گئی تو گدون بابا اپنے مریدوں سمیت اپنے اصلی وطن قندہار کی طرف چلے گئے ۔ پھر وہاں سے کسی وجہ سے اپنی قوم سے ناراض ہو کر معہ مریدان خود علاقہ چھچھ میں آ کر اپنی قوم کے نام پر قصبہ غورغشتی آباد کر کے دعوت تصوف و طریقت شروع کی ۔ ان کے پوتے شیخ خضر گدون نے علاقہ رش کے لال کافروں کے خلاف اعلان جہاد کیا ۔ قوم پنی و چھاچھی مرید حسن خان بن گدون کے زیر علم رش پر حملہ آور ہوئے اور بعد فتح یابی وہاں قابض ہوئے اور اسلام نافذ

لہ تحقیق میر افضل خان نظامی ۔ جدون ساکن نواں شہر

کرکے عشر جمع کیا۔ اب یہ طریقت کی گدی حکومت میں منتقل ہو رہی تھی شیخ خضر کے نواسہ سلطان محمود گدون کے زمانہ میں قوم پنی ترک قوم کی یورش سے اس علاقہ (یعنی رَش) سے بے دخل ہو کر موجودہ مقبوضہ علاقہ (ہری پور) پر قابض ہوئی۔ د مرور زمانہ سے سلطان محمود گدون کی جگہ سلطان محمود غزنوی کا تصور ذہنوں میں بیٹھ گیا) سلطان محمود واپسی رش کی تیاری ہی میں تھے کہ شاہ جہان کے حکم سے شہباز خان خٹک غور غشتی پر حملہ آور ہوا۔ د شہباز خان خٹک ولد یحییٰ خان ولد ملک اکوڑے خٹک ہے۔ ملک اکوڑے نے اکبر بادشاہ کی ملازمت حاصل کی اور خیر آباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ بطور جاگیر حاصل کیا۔ شاہی سڑک اٹک تا پشاور کی حفاظت اس کے سپرد ہوئی۔ اور مال مویشی کی آمد و رفت پر محصول وصول کرنے کا اختیار اس کو دیا گیا۔ شہباز خان کی ولادت ۹۱-۱۵۹۰ء ہے۔ از خوشحال خان خٹک مصنفہ دوست محمد کامل۔ ایڈووکیٹ پشاور۔ گویا سترھویں صدی کے شروع میں یہ واقعہ ہوا۔ ش ب)

لہٰذا سلطان محمد گدون غور غشتی سے بھاگ کر یا ورائے سندھ کوہ مہابن میں پناہ گزیں ہوئے۔ افراد قوم غور غشتی وہاں غور غشتی ہی میں رہ گئے۔ پنی ہزارہ (علاقہ ہری پور) میں رہ گئے۔ اور گدون کوہستان مہابن میں سکونت پذیر ہوئے۔ جو کاکڑ اور پنی غور غشتی میں رہ گئے وہ جدِّ اعلیٰ کے نام پر بدستور غور غشتی کہلائے۔ اور اس طرح ہر ایک گروہ کے درمیان ایک خلیج جدائی کی حائل ہو گئی۔ زمانہ گزرتا گیا۔ کہ فرخ سیر شاہ دہلی (۱۷۱۹-۱۷۱۳ء) کے زمانہ میں قوم گدون کا قافلہ مستقر جدید کی تلاش میں مہابن سے نکلا۔ اور ترکوں سے رش لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس قوم کی زیادہ آبادی کوہستان مہابن میں ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قوم پنی اور جدون کا تعلق غور غشتی ہونے کی وجہ سے جدی ہے۔

اقتباس از گزیٹیر ژوب۔ جلد اول مرتبہ ۱۹۰۶ء

قوم پنیؔ

قوم پنی غرغشت پٹھان ہیں۔ جن کی ایک شاخ سافی (صافی) نام تاحال قرب و جوار غزنی بہ تعداد کثیر آباد ہے۔ اور دوسری بڑی شاخ اس قوم کی بنام گدون مشہور ہے جو ضلع پشاور میں علاقہ یوسف زئی کے مشرق (مہابن) میں آباد ہے۔ ایک شاخ اس قوم کی غربی جانب سے کوہِ سلیمان میں داخل ہو کر وہاں سے جانب جنوب تدریجاً پھیل گئی۔ موسیٰ خیل اور اسوٹ جو ضلع لورالائی میں رہتے ہیں وہ پنی ہی ہیں۔ ان کی ایک دوسری شاخ نے درہ بولان سے نکل کر سانگان میں قدم جما لئے۔ اور آہستہ آہستہ بادرا، تویت منڈی اور سبی پر قابض ہو گئے۔ آخر کار انہوں نے خود قبضہ جما لیا یا حاکم قندھار نے اُن کو باز خان کا انتظام مفوض کر دیا۔ جو اب قوم پنی کے پاس ہے۔ پنی کی اولاد جنوبی ہند میں بھی پائی جاتی ہے جہاں

انہوں نے وقتاً فوقتاً تاریخ ہند میں کارہائے نمایاں کئے

خاندان بابر کے زوال سے پہلے اس قوم میں ایک نہایت ہی معروف و مشہور زمان سردار داؤد خان پنی گزرا ہے۔ جو اپنی جود و سخا کے لئے شہرۂ آفاق تھا اور جس کے متعلق یہ ضرب المثل زبان زدِ خلائق بنی۔

"بنی تے بنی، نہیں تے داؤد خاں پنی"

پنیال

تاریخ سنٹرل ایشیا، حصہ اول مصنفہ جی ایم میگریگر۔ کلکتہ ۱۸۷۳ء میں تحریر ہے۔

"پنیال...... اس گاؤں میں ۳۱۴ مکان ۱۲ دکانیں ۸ مسجدیں اور ۱۶۳۲ نفوس ہیں۔ یہ موضع سات کنوؤں سے سیراب ہوتا ہے۔ یہ کنوئیں بہت تھوڑے رقبے کو سیراب کرتے ہیں۔ بیشتر رقبہ بارانی ہے۔ (ش ب) اس موضع میں ۳۱ گھوڑے، ۹۰۸ مویشی، ۸۰ بھیڑ بکریاں ۹۴، اونٹ، گدھے ۲ خچریں اور اٹھارہ دوسرے جانور ہیں۔"

قوم پنی کی سیرت و کیرکٹر کے متعلق تاریخ ہزارہ (بربنائے بندوبست ۱۸۶۲ء) شائع شدہ ۱۸۶۸ء صفحہ ۶۶ میں یہ تحریر ہے۔ "اس ضلع کے گوشہ شمال و مغرب بہ کثرت قوم پنی پٹھان کی ہے۔ اس قوم کے قد طویل، فٹ تک اور بدن فربہی و لاغری میں متوسط قوی صحیح المزاج، متناسب الاعضاء، زبان ہندی ایک خاص لہجہ کی ملائم، لباس اکثر سفید، رنگ سفید گندم گوں، چہرہ اکثر گول، کمر بندی کے معمولی، دنگہ فساد نہایت کم، جرائم سرقہ و قتل بالکل نہیں۔ کار زراعت میں بہت محنتی، خوراک گندم، مکئی، باجرہ بسبب فراخی زمین ہر ایک آسودہ اور روپیہ اکثر جمع رکھتے ہیں۔ فضول خرچ قطعاً نہیں۔ نہ خوراک نہ لباس پر اور نہ زیادہ بیاہ شادی پر یا ماتم پر۔ اور یہی عادات اِن کی آج تک برابر قائم ہیں۔

صورت دیہی پنیال

بندوبست ۰۷-۱۹۰۶ء کے مطابق اس گاؤں کی آبادی کے حالات وغیرہ حسب ذیل ہیں۔

"اس گاؤں کی دو آبادیاں ہیں۔ پنیال اور ڈھیری، ڈھیری، آبادی پنیال سے جانب مشرق مائل بگوشۂ جنوب بفاصلہ ۳۰۰ کرم واقع ہے۔ زمین دونوں کی کھیت بٹ ہے۔ پرانی اور بڑی آبادی پنیال کی ہے۔ اس جگہ پہلے بھی کسی زمانہ میں کافروں کے وقت گاؤں آباد ہو کر ویران ہو چکا تھا۔ اس آبادی اور دیہی

کا مفصل حال معلوم نہیں۔ اصل میں اس جگہ جنگل اور ویرانہ تھا۔ کہتے ہیں کہ پہلے اس جگہ آبادی کافروں کی تھی۔ چنانچہ اب تک اس علاقہ کے رقبہ کے درمیان دو آبادی سابق کی بتفصیل پنڈ مانکر اُتے و پنڈ منڈرا کے موجود ہیں۔ اور کنوئیں بھی منہدم شدہ ان کے وقت کے وہاں موجود ہیں۔ ان کی ویرانی کا مفصل حال ظاہر نہیں ہو سکا۔ کہ قوم بینی کے داخل ہونے سے اُن کی ویرانی ہوئی یا کسی دوسرے صدمہ سے اجاڑ ہوئے۔ عملداری مسلمانی میں بینی خان مورث ہم قوم بینی کا ہمراہ بادشاہ سلطان محمود غزنوی کے اس ولایت سے اس ملک کو آیا۔ اور آبادی اس گاؤں کی پرانی تہ پر بحکم سلطان محمود غزنوی کی۔ اس گاؤں کے رقبہ پر کہ اس وقت بے تردد تھا (یعنی کاشت نہ ہوتی تھی) قبضہ پایا۔

ہماری قوم کے باقی بزرگ بھی بعد از بینی خان باوقات مختلف آ کر بذریعہ تردد کے اس گاؤں کی زمین پر قابض ہوئے۔ بڑے قحط میں (۱۸۵۵ء ش ب) جس کو تخمیناً ۱۲۰ سال کا عرصہ ہوا ہوگا یہ گاؤں ویران ہو گیا۔ اور ہمارے بزرگ گاؤں سے نکل گئے۔ بعد چھ برس کے ہمارے بزرگوں نے اس کو پھر آباد کیا۔ اس وقت دوسری آبادی یعنی ڈھیری کو اسلم خان و عظیم خان ہر دو برادران حقیقی اولاد موسیٰ خان پسر بینی خان نے اپنی زمین کے سر پر آباد کیا۔ ان کی اولاد اب تک وہاں آباد ہے۔ عہد مسلمانی و درانی میں اکثر دفعہ یہ گاؤں سوخت و تاراج ہوتا رہا۔ اور لوگ اُجڑ کر درہ پھگوچ گندگر کے دامن میں پناہ کے لئے جاتے رہے۔

دوسری جنگ سکھاں ۱۸۴۹ء کے آخر میں بینی خاندان موضع سری میں تھا جب کہ عزیز خان پسر منیر خان کی خبر دریائے سندھ میں ڈوب جانے کی ملی۔ وہ میجر ہربرٹ کو جو قلعہ اٹک میں محصور تھا، ہزارہ سے براہ دریا سامان رسد وغیرہ پہنچانے کے لئے متعین تھا۔ اور اس طرح کئی دفعہ پہلے بھی عملداری سکھاں میں اجڑتے رہے۔ مگر ایسے جاڑ کبھی نہیں ہوئے۔ کہ بعد اُجڑنے اس قوم کے کسی دوسری قوم کا دخل اس گاؤں پر ہو گیا ہو۔ یہی لوگ واپس ہو کر آباد ہوتے رہے۔ جب سے عملداری سرکار انگریزی ہوئی پھر کبھی ویران نہیں ہوا۔ ایک باندہ ڈھیری ہے۔ وہ بھی اس گاؤں کے رقبہ میں داخل ہے۔ اگرچہ کہتے ہیں کہ ایام سابق میں اس ڈھیری کے حدود رقبہ پنیاں سے علیحدہ تھے۔ مگر بسبب غلبہ ہو جانے قوم بینی کے اس کا رقبہ بھی پنیاں میں مخلوط ہو گیا۔ چنانچہ دو چار اشخاص اولاد موسیٰ خان پسر بینی خان سے اب بھی ڈھیری میں آباد ہیں۔

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈھیری زمانہ قدیم قبل از اسلام بہت بڑی آبادی تھی۔ اور کافی بڑا شہر تھا اور قلعہ بند تھا۔

مالگذاری۔ عملداری مسلمانی میں ہمارے بزرگ معزز و معتبر تھے اور ہماری قوم کا بڑا اُولس مشہور تھا۔

حکام وقت ان کی بہت رعایت کرتے تھے۔ اس سبب سے پیداوار زمین خود کھاتے رہے۔ معاملہ کسی کو نہیں دیتے تھے۔ البتہ جب کبھی نذرانہ حکام ڈمانیاں دینا ہوتا تھا تو ایک روپیہ یا دو روپیہ فی گھر وصول کر کے اٹک میں داخل کرتے رہتے۔ عملداری سکھاں میں کاروداران سکھاں کنکوت (اندازہ پیداوار فصل) غلہ بنام قابض زمین کر کے بعد معمولی چھوٹ کے جو مقرر ہوا اس کے نصف کی قیمت بہ نرخ گراں لگا کر وصول کرتے رہے۔ سردار ہری سنگھ کے وقت پٹہ اس گاؤں کا بنام دُرگا ہی کھتری سکنہ کوٹ نجیب اللہ بعوض الصاف (۱۹۰۰ روپیہ) روپیہ گنڈا ہوا۔ وہ کنکوت کی رُو سے بھاولی بحصہ پنج دو وصول کر کے معاملہ اپنے پاس سے داخل کرتا رہا۔ پھر دیوان مولراج کے وقت اجارہ اس گاؤں کا قائم خان (منیر خانی) نمبردار بشمول معز اللہ خان و ہر دو سعد اللہ خان بحصہ ذیل:

قائم خان۔ نصف معز اللہ خان، سعد اللہ خان و سعد اللہ خان ثانی بحصہ برابر۔ نصف

مقرر ہوا۔ ہم بھی بشرح صدر بھاولی وصول کر کے معاملہ اپنے پاس سے دیتے رہے۔ شروع سرکار انگریزی میں مالیہ بتعداد مبلغ (۹۶۲-۰) روپیہ سالانہ مقرر ہوا۔ بہ امتیاز سلسلہ نسب کے موجودہ خیل ہمارے حسب تفصیل ذیل ہے۔

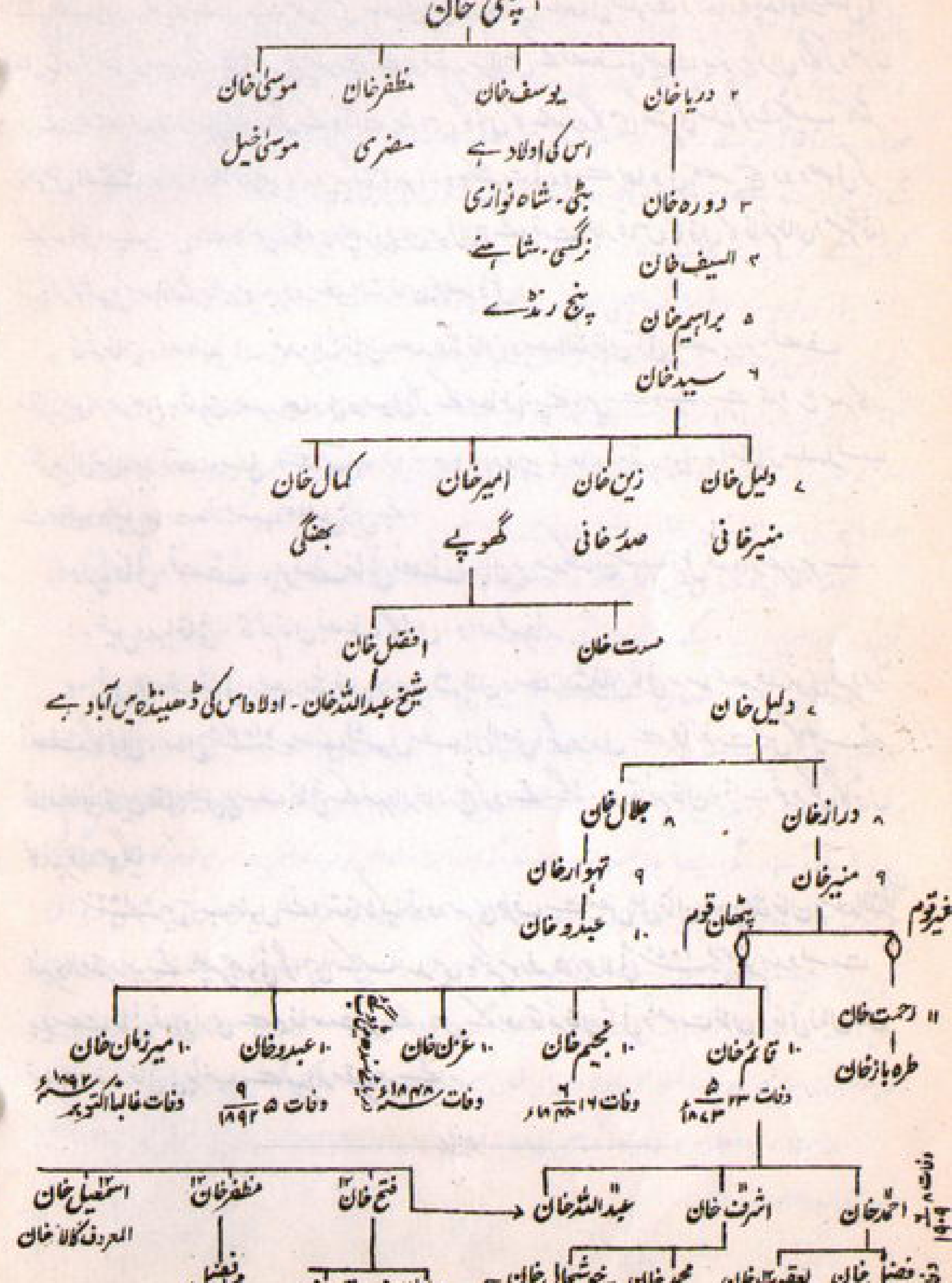
دریاخانی۔ نصف۔ یوسف خانی نصف۔ اُن میں چند کسان حسب ذیل نمبردار مقرر ہوئے۔

۱۔ خیل دریاخانی۔ قائم خان نصف گاؤں۔ واحد نمبردار

۲۔ خیل یوسف خانی۔ سعد اللہ خان و معز اللہ خان و سعد اللہ خان ثانی ہر سہ بحصہ مساوی نمبرداران نصف گاؤں۔ سال ۱۸۴۸ء یہ سب بشمول مفسدان (یعنی انگریزوں سے مخالفت جس کا لیڈر غلام خان ترین تھا) خیل یوسف خانی کے نمبردار خارج کر دیے گئے۔ اور قائم خان بذات خود کل گاؤں کا نمبردار ہو گیا۔

۱۸۶۰ء میں جب انہوں نے استغاثہ کیا۔ تو دوسری طرف سے فیض علی خان، معز اللہ خان و سعد اللہ خان نمبردار مقرر ہوئے۔ پھر جھوٹی گواہی کے سلسلہ میں بحکم مورخہ ۱۵ جولائی ۱۸۶۲ء مہتمم بندوبست یہ یوسف خانی نمبرداری سے برخاست ہوئے۔ اس کے بعد قائم خان ثانی و نعمت خان و خانی زمان خان خیل یوسف خانی کی جانب سے نمبردار مقرر ہوئے۔

شجرۂ نسب



قوم پنّی کے چند مشہور افراد

اس قوم کا مشہور خان جو عہد مسلمانی میں ہوا وہ بلحاظ روایت جلال خان جو پنی خان مورث کی آٹھویں پشت میں ہے اس شجرہ کی رو سے قائم خان پنی کی وفات تک (جو مئی ۱۸۷۳ء میں ہوئی) اس قوم کی دس پشت بنتی ہیں۔ جو علامہ ابن خلدون کے کلیہ تاریخی کے حساب سے ہر سو سال میں چار پشت ہوتی ہیں گویا پنی قوم کی اس علاقہ میں تا وفات قائم خان کم و بیش ڈھائی سو سال سے سکونت رہی۔ اس لحاظ سے اس قوم کی موجودہ جگہ پر سکونت سولھویں صدی کے آخر میں ثابت ہوتی ہے اور یہ قیاس تاریخ کی رو سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ غور غشت افغان ابراہیم لودھی کی شکست و موت کے بعد (۱۵۲۶ء) میں چھچھ ہزارہ کی طرف آئے۔ لہٰذا جلال خان پنی کا زمانہ سترھویں صدی عیسوی کا آخر تھا۔ اس کی جائے رہائش (سکونتی مکان) جس میں صلابت خان ولد قلندر خان (جلال خان کی اولاد) رہا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا حجرہ (منیر خانی حجرہ) موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق جو تاریخی لحاظ سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ جلال خان شاہ جہان بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا جب کہ وہ کشمیر کو جا رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کو انعام دیا۔ جس سے بڑی مسجد پنیاں (مشہور بہ خاناں کی مسجد) کا کنواں تیار کیا گیا تھا۔

اس نے اپنا جانشین اپنے بھتیجے منیر خان پسر دراز خان کو بنایا۔ کیونکہ وہ خانی کے لائق اور قابل شخص تھا۔ اس کے انتخاب پر تاریخ نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ منیر خان کی اولاد کثرت و لیاقت میں آج تک گاؤں میں معزز ہے۔ اور جلال خان کی اولاد گم نام ہو گئی۔ یہ دراز خان کا لڑکا تھا۔ وہ ایک مدبر لائق اور قابل عزت انسان تھا۔ قوم کی خانی اب تک اس کی اولاد میں سے بڑی شاخ میں ہے۔

قومی اثر و غلبہ کے وقت سے آج تک خانگی اسی خاندان میں ہے۔ دُرّانی۔ سکھ اور انگریز عہد حکومت میں اس خاندان کے افراد ہی رہنمائے قوم رہے۔ جس ابتدائی عہد میں سکھوں اور انگریزوں کی کشمکش رہی۔ قوم پنی نے انگریزوں کا ساتھ دیا جس کی بناء پر میجر ایبٹ پہلے انگریز ڈپٹی کمشنر نے اس قوم کے خان کو سندات دیں۔ انگریزی عملداری کے شروع میں منیر خانی خاندان کا تعلق بذریعہ رشتہ و ناطہ خاندان کھلابٹ سے ہوا۔ اور اس سے بہت پہلے تربیلہ کے اتمان زیوں، لنگرہ کے جدونوں اور ڈنگی کے ترینوں سے ہوا۔ میاں شاہ حسین خان (میانڑا پٹھان) ساکن ملکیار کی ایک پوتی جلال خان جدون ساکن لنگرہ سے بیاہی گئی تھی۔ اور دوسری معز اللہ خان ترین ساکن ڈنگی سے۔ منیر خانی خاندان کے رشتے خاندان ملکیار و ڈنگی سے ہوئے۔ منیر خان پنی کی بڑی لڑکی خان شاہ ولی خان اتمان زئی ساکن تربیلہ کی دادی تھی۔ اور چھوٹی

لڑکی میرزمان خان سید خانی ساکن کھلابٹ سے بیاہی گئی تھی۔

عبدو خان پسر منیر خان نے ملکیار کے میانزدا خاندان سے شادی کی۔ قائم خان کی پہلی بیوی تلوکر کے ترین خاندان سے (یہ خان صاحب عبدالمجید خان مرحوم کی پھوپھی تھیں) کی دوسری بیوی پنی خاندان سے کی۔ منیر خان کے دوسرے بیٹوں نے پنی خاندان ہی میں شادیاں کیں۔

قائم خان سکھوں کی سلطنت کے انجام اور انگریزی حکومت کے شروع سے مشہور رہا۔ وہ سکھ انگریز آویزش میں انگریزوں کا طرفدار تھا۔ میرزمان خان ساکن کھلابٹ کا دست و بازو رہا۔ میرزمان خان انگریزوں کا مخلص حلیف تھا اور یہ قائم خان پنی کا بہنوئی تھا۔ پنی قوم کی انگریز دوستی کی ایک زبردست وجہ یہ رشتہ داری بھی تھی۔ میجر ایبٹ نے اس خاندان کی امداد کو تسلیم کیا۔ اور جاگیر دی اور چند سرٹیفکیٹ قائم خان کو دئیے جن میں سے ایک کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

قوم پنی کے خان قائم خان نے گزشتہ جنگ سکھاں میں اپنی مخلصانہ اور دیانت دارانہ حوصلہ شجاعت سے اس تمام عرصہ میں امتیازی درجہ حاصل کیا۔ وہ ایک صاف گو اور نیک دل آدمی ہے۔ وہ ہزارہ بھر میں قابل عزت آدمی گنا جاتا ہے۔ اور وہی لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں جن کو اس کی برتری ناپسند ہے۔ وہ ہر خطرہ کے وقت اور گہرے اعتماد کی ضرورت کے موقع پر اپنے بہترین خاندان کے افراد بھائیوں۔ بیٹوں اور بھتیجوں کے ساتھ میرے دست راست پر رہا اور مخلصانہ خدمات انجام دیں۔

دوران جنگ میری ضروریات کے پیش نظر اس نے اپنی خدمات کا کسی قسم کا معاوضہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جنگ کے بعد اس کی حیا چشمی سے میں نے یہ غلط اندازہ لگایا کہ وہ اپنے لڑکوں اور بھتیجوں کو سوار پولیس میں بھرتی کرانے پر رضامند نہیں۔ حالانکہ وہ اس کے سب سے پہلے حقدار تھے۔ میں اپنی غلطی اس وقت تک معلوم نہ کر سکا جب تک کہ وقت ہاتھ سے نکل نہ گیا۔ اور میں اس کا کچھ مداوا نہ کر سکا۔ اور قائم خان کو ابھی تک اس کا معاوضہ نہیں مل سکا۔ میں اپنے اس وفادار دوست سے بہت افسوس کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں۔

جے۔ ایبٹ۔ سابق ڈپٹی کمشنر ہزارہ۔ مورخہ ٣ اپریل ١٨٥٣ء

احمد خان پسر قائم خان متقی، ہوشیار اور صاحب اثر خان تھا۔ اس کے بعد اس کا پوتا رسالدار میجر دوست محمد خان پسر فضل خان صاحب اثر اور بخت والا انسان گزرا ہے۔ فوج میں نوکر رہا اور پہلی عالمگیر جنگ میں فرانس میں رہا۔ ١٩٣١ء فوت ہوا۔

گنیا۔ جاگیر

حکومت ہندوستان نے اپنے حکم نمبر ٣٠٢٣ مورخہ ٨ جولائی ١٨٥٣ء میں موضع گنیا کی جاگیر ۸۰ روپیہ کی پنشن (دونوں دوامی) بحق قائم خان بعوض ملازمت سرکار منظور کی تھی۔ اور روازشان کا حق انتخاب بموجب کیس نمبر ۴ اپنے پاس رکھا۔

قائم خان کی وفات ۲۳ مئی ١٨٦٣ء میں ہوئی اور اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے احمد خان کو جانشین منظور کیا گیا۔ بموجب حکومت پنجاب چٹھی نمبر ١٢٥٨ مورخہ ٢٠ اگست ١٨٦٣ء اور احمد خان کے بیان پر کہ اس کے چچوں کو ان کی حین حیات اس جاگیر کا حصہ ان کو ملتا رہے۔ ان کی وفات کے بعد یہ جاگیردار کو ملے۔

اب چونکہ حین حیات والے حصہ دار فوت ہو چکے ہیں لہٰذا بموجب ریونیو کمشنر کی چٹھی نمبر ٢٤٨٤ مورخہ ١٨ اکتوبر ١٩٠٦ء جاگیردار کو یہ حصے بھی دئیے گئے۔ دس روپیہ اس جاگیر سے بطور زیلداره انعام دیا گیا۔

٨ جون ١٩٠٨ء کو فضل خان اپنے باپ احمد خان کی وفات پر جاگیردار رہا۔

مندرجہ بالا نقل رجسٹر جاگیر دفتر ڈپٹی کمشنر ہزارہ سے لی گئی۔ اس حکم کی پیشانی پر حسب ذیل شجرہ نسب تحریر ہے۔

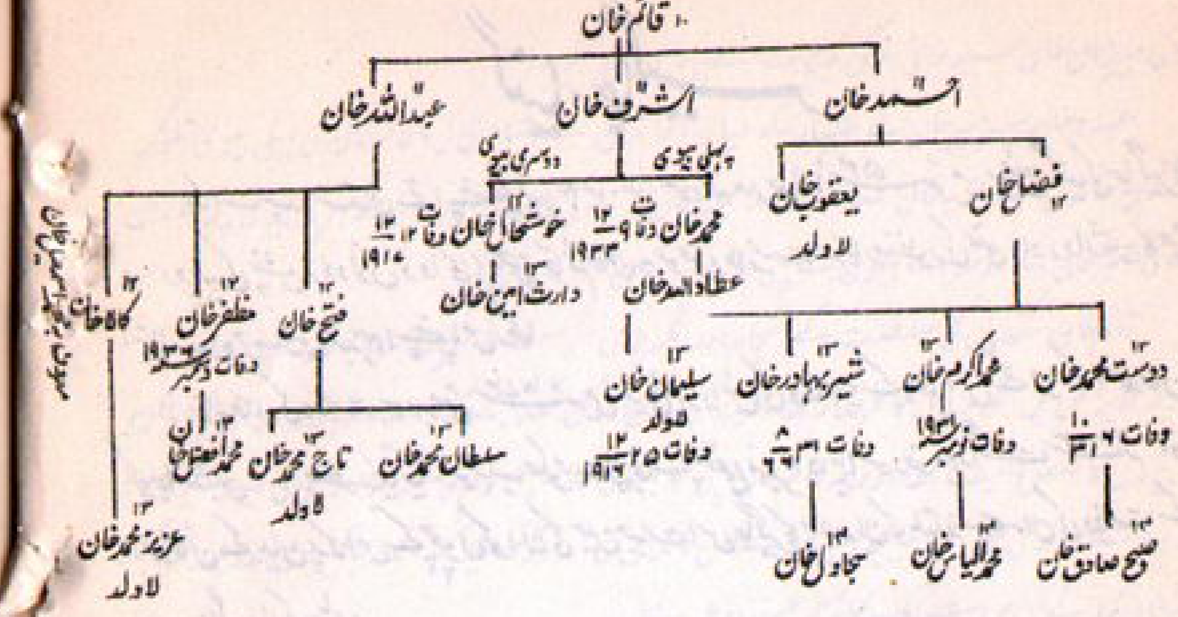
منیر خان

- قائم خان
- نجیبم خان
- عبدو خان
- میرزمان خان

خوانین پنی کی خدمات کے صلہ میں انگریزی حکومت نے قائم خان پنی کو خاندان میں بڑا لڑکا ہونے پر حسب قانون دوامی جاگیر موضع گنیا (نزد پنیاں) میں اور دوامی پنشن -/٩٨ روپیہ دی۔

قائم خان کی وفات ۲۳ مئی ١٨٦٣ء میں ہوئی۔ اس کا لڑکا احمد خان جانشین ہوا۔ اس حکم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قائم خان کے تین بھائی جو اس وقت زندہ تھے وہ بھی اس میں حصہ دار تھے۔ جو شجرہ نسب جاگیر کے حکم مورخہ ١٨٦٣ء درج اوپر مندرج ہے) میں قائم خان کے چوتھے بھائی غزن خان کا نام نہیں۔ کیونکہ وہ ١٨٤٢ء میں قلعہ اٹک میں محصور انگریزی فوج کو (سکھوں کی دوسری لڑائی کے دوران) راشن وغیرہ براہ دریائے اٹک لے جاتے ہوئے قلعہ کے پاس کشتی کے ٹوٹ جانے سے ڈوب کر فوت ہوا۔ اس کے ساتھ کشتی میں ایک انگریز بھی تھا لیکن وہ انگریز کسی پھٹے پر بیٹھ کر پار ہو گیا۔

نوٹ۔ جاگیر کے حکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نجیبم خان، عبدو خان اور میرزمان خان ١٩٠٦ء سے پہلے فوت ہو چکے تھے۔

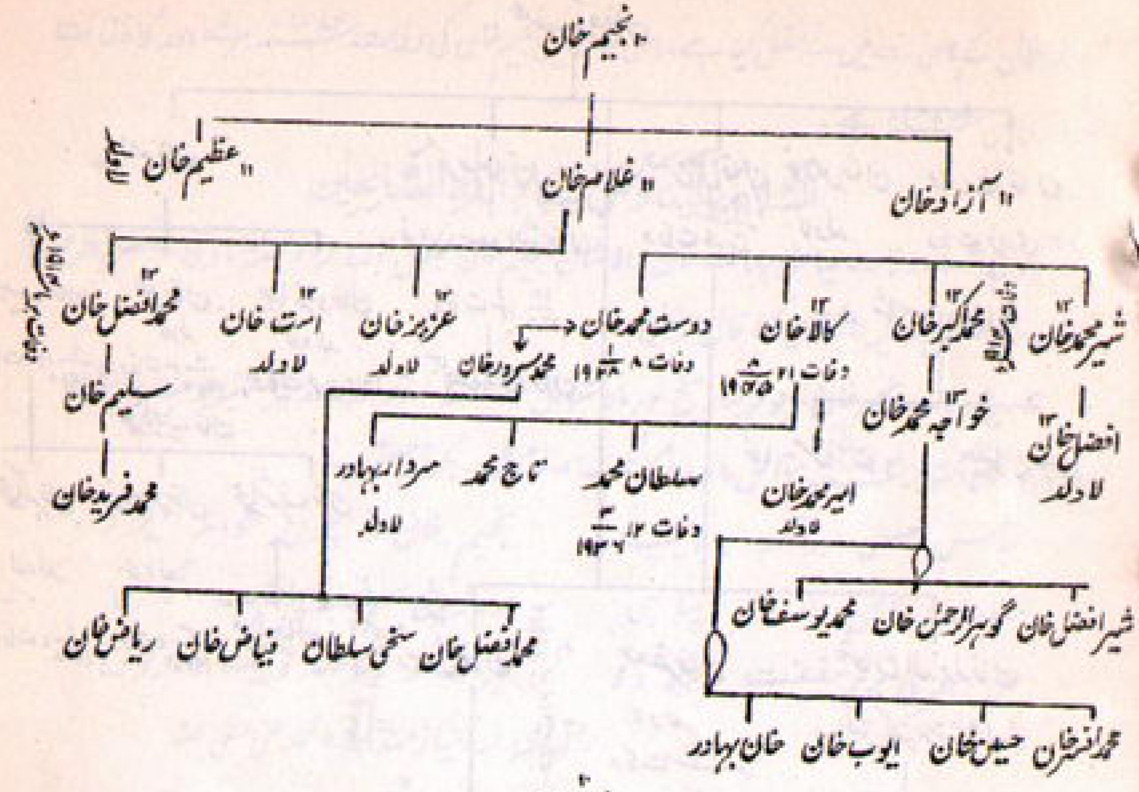


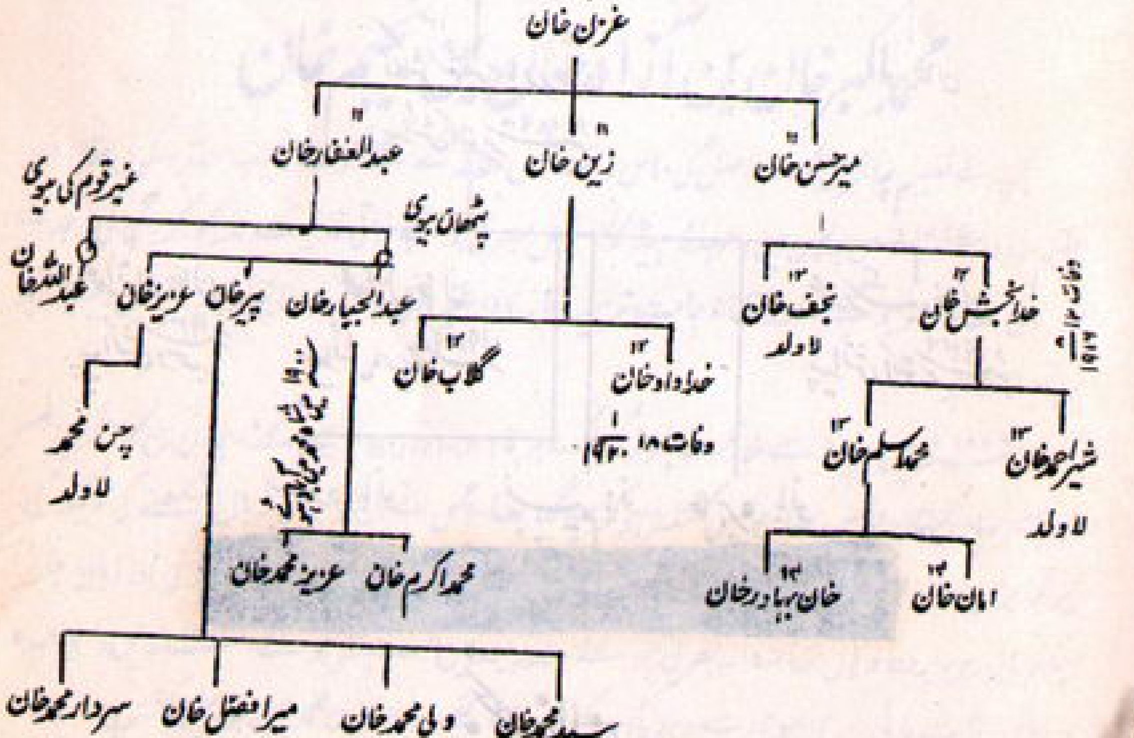
دوست محمد خان بن فضل خان خوبصورت، بلند قد و قامت کا جوان تھا۔ بخت و ستارہ بلند تھا۔ رسالدار میجر ہو کر ۱۹۱۸ء میں پنشن پر آیا۔ اس کا بھائی محمد اکرم خان فوج میں دفعدار تھا۔ ان کا تیسرا بھائی شیر بہادر خان پولیس کی ملازمت سے بہ عہدہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پنشن پر آیا۔ خاموش طبیعت اور دیانتدار انسان تھا۔

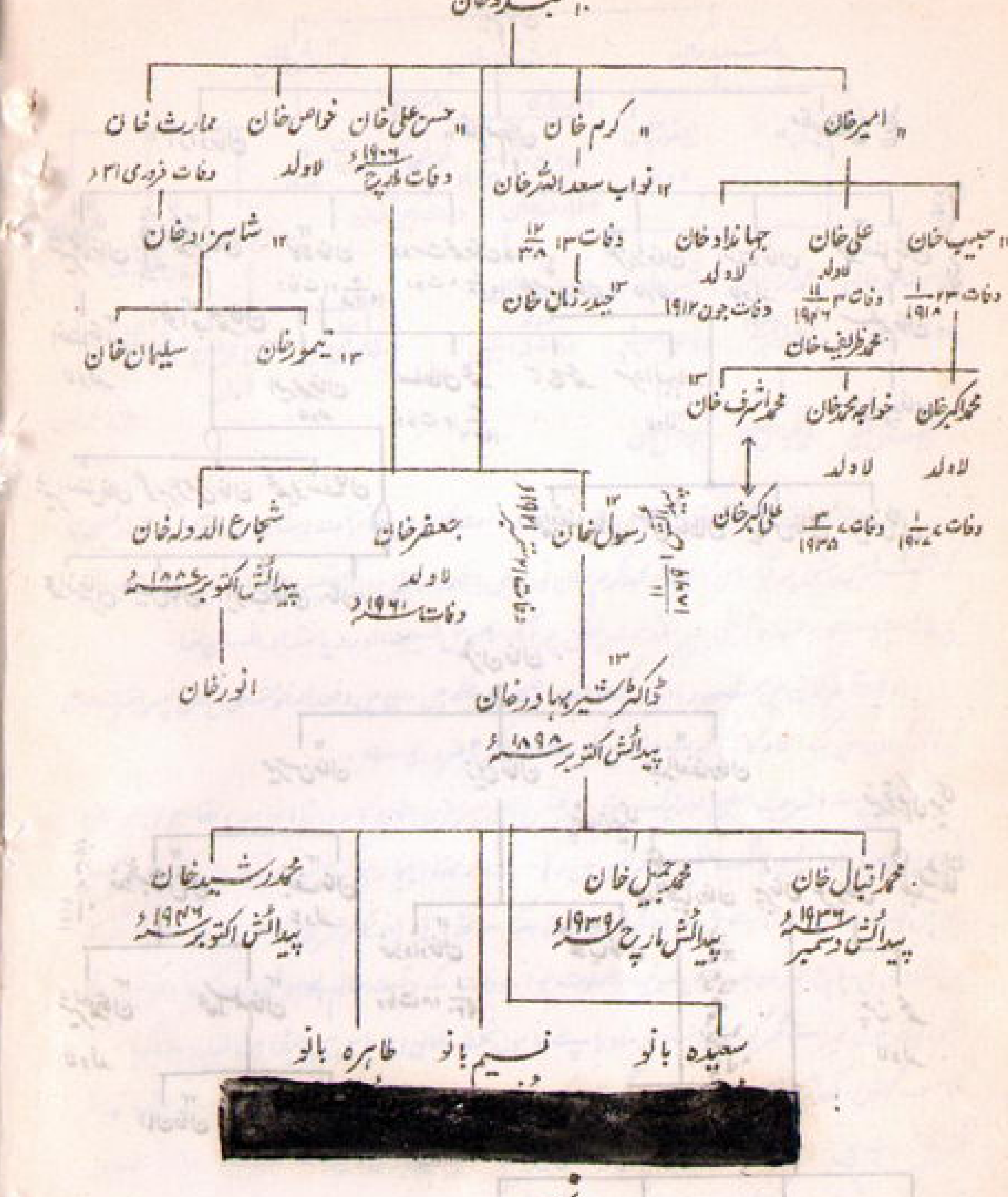
اولاد قائم خان میں مشہور افراد کے حالات لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں دفعدار خوشحال خان پسر اشرف خان کی زندگی اور اس کے انجام کا ذکر عبرت و تذکیر کے لئے درج کرنا ضروری ہے۔

یہ بچپن سے شریف الطبع اور نیک تھا۔ میر حسن خان پسر عزن خان کا دوہتا (نواسہ) تھا۔ جوان ہونے پر فوج میں بھرتی ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس میں رہا۔ دفعدار تھا۔ بیمار ہو کر پنشن پر آیا۔ اس کی والدہ بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی۔ اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہا۔ اور تمام عمر ان کا عملاً تابعدار رہا۔ آخر عمر میں شادی کی۔ پانچ چھ ماہ بعد مرض نمونیہ سے فوت ہوا۔ وفات کے وقت عالم بے ہوشی میں ایک دفعہ اس نے شور کیا کہ کیوں میرے گھر کو تباہ کرتے ہو۔ اور اپنے ماموں نجف خان (جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا) سے کہا "کہ کیا سب گاؤں اکھاڑ رہے ہیں۔ یا میرا ہی گھر تباہ کر رہے ہیں؟" انہوں نے کہا کہ "گاؤں تو آباد ہے صرف تمہارا گھر اجاڑ رہے ہیں۔" اس کے بعد ماموں نے اس کے کان میں کہا۔ کہ تمہاری بیوی امید سے ہے خدا تمہارا جانشین بیٹا پیدا کرے گا۔" اس کے بعد وہ وفات تک خاموش رہا۔

خدا کی قدرت سے اس کی وفات سے چار پانچ ماہ بعد اس کے گھر لڑکا بہ نام وارث امین پیدا ہوا۔ اور اب اس کے تین بیٹے ہیں۔







نجیم خان

بہت خود اعتماد تھا افسران کے میل ملاپ سے دور رہتا تھا۔ اور ایک منظم انسان تھا اس کی وفات پر اس وقت کے کسی عالم نے فارسی میں ایک یادداشت قطعہ لکھا تھا جو اس کے پوتے خواجہ محمد خان ولد

محمد اکبر خان کے پاس سے میں نے نقل کیا ہے۔ اس قطعہ میں نجیم خان کی وفات ۱۸۷۴ء ہے اور کاغذات سرکاری میں ۱۸۷۵ء ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْن

یادداشت وفات فیاض جہات خان والاشان نجیم خان جَعَلَ اللّٰہُ لہٗ الجنۃ ماویٰ الفضل والرضوان نسئال اللہ الفضل وعلیہ التکلان کما قال الرحمٰن

تاریخ وفات نجیم خان مرحوم بتاریخ ۲ ماہ شوال ۱۲۹۱ھ مقدسہ بروز پنجشنبہ بوقت چاشت مطابق ۶ ماہ اکتوبر ۱۸۷۴ء موافق ۲۹ ماہ کاتک سمت ۱۹۳۱ بکرماجیتی

نجیم خان را چوں خواند ایزد　　لباسِ جنتی بر او بہ پیچید
بروز پنج شنبہ چاشت گاہی　　خطابِ ارجعی او را پناہی
ہزار و دوصد ویک نود بودہ　　سنِ ہجری بروشفقت ربودہ

راقم الحروف نیازمند بندہ محمد علی عفی عنہ

محمد اکبر خان بن آزاد خان بن نجیم خان

آپ نے تعلیم پرائمری تک حاصل کی۔ اس وقت اس علاقہ کے لئے کوٹ نجیب اللہ سکول تھا۔ اور تعلیم اردو۔ ۱۸۷۵ء میں پولیس میں بعہدہ ہیڈ کانسٹیبل بھرتی ہوئے ذاتی قابلیت اور کارکردگی کی وجہ سے جلد ہی تھانہ دار ہو گئے۔ اور تھانہ جات تربیلہ، غازی، شیروان، ناڑہ، خانپور اور آخر میں ایبٹ آباد میں تعینات ہوئے۔

۱۸۸۶ء میں ہزارہ سے ملازمت چھوڑ کر ملک برما (BURMA) چلے گئے۔ جہاں ان کا انگریز افسر جو پہلے یہاں کپتان پولیس تھا۔ پولیس کمشنر ہو کر چلا گیا تھا۔ اُس نے اِن کو برمی زبان سیکھنے کی تاکید کی۔ کیونکہ برمی زبان جاننے کے بغیر وہاں ترقی نہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے شادی بھی وہیں کر لی اور زبان جلد سیکھ لی۔ اس پر وہ وہاں تھانہ دار بھرتی ہو گئے۔ اور بعد میں انسپکٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۱ء میں اسی عہدہ پہ وہاں وفات پائی۔ برمی بیوی سے وہاں اُن کے دو بیٹے تھے۔ ۱۔ سلطان محمد خان جو ڈپٹی کمشنری سے ریٹائر ہوئے اور ۲۔ سید محمد خان فوج میں کرنل تھا اور دوران ملازمت میں فوت ہوا۔ یہ دونوں بھائی رنگون میں رہتے تھے۔

پنیاں میں ان کے بیٹے خواجہ محمد خان ہیں پیدائش ۱۸۸۲ء ہے۔ اردو مڈل ۱۹۰۳ء میں پاس کیا۔ لیکن

تحریر اور فراست میں زمانہ حال کے بی اے سے زیادہ قابل ہیں ۔ زمینداری کا تجربہ اور کارکردگی بہترین ہے منظم اعلیٰ قسم کے ہیں ۱۹۶۶ء سے نظر کی کمزوری کی وجہ سے خانہ نشین ہیں ۔ نجیم خان کی اولاد سے تاج محمد خان بن کالا خان سب انسپکٹر پولیس سے ریٹائر ہو کر بہت مدت بہاول پور میں مقیم رہا ۔ ۱۹۶۶ء میں پنیاں آیا اور مقیم ہو گیا ہے ۔

غزن خان ولد منیر خان

اپنے خاندان میں یہ ایک بہادر اور نہایت دلیر آدمی تھا ۔ جب دوسری جنگ سکھاں میں میجر ہربرٹ اٹک کے قلعہ میں محصور ہو گیا (۱۸۴۷ء) تو سامان رسد وغیرہ پہنچانے کے لئے میجر ایبٹ نے اس کو مقرر کیا ۔ لہٰذا وہ سامان رسد وغیرہ لے کر بذریعہ کشتی تربیلہ سے بمعہ ایک انگریز ساتھی کے روانہ ہوا ۔ اور اس کی سفید نقرئی گھوڑی کو نوکر لے کر کنارہ دریا سے روانہ ہوا ۔ جب کشتی اٹک کے نزدیک پہنچی تو ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ۔ ان کا انگریز ساتھی تو کشتی کے ایک تختہ پر بیٹھ کر کنارے پر لگ گیا ۔ لیکن غزن خان کی کمر کے ساتھ تلوار اور ڈھال تھی اور ایک بندوق (پرانے زمانہ کی بندوقیں بہت لمبی اور بھاری ہوتی تھیں) ہاتھ میں تھی ۔ ان اشیاء کے بوجھ نے ان کو تہ آب کر دیا ۔

جب یہ حادثہ پیش آیا تو اس وقت قوم ہی کے مستورات وغیرہ حسب معمول زمانۂ جنگ میں گندگر کے علاقہ میں گئے ہوئے تھے ۔ اور منیر خانی موضع سری میں تھے ۔

غزن خان کے ڈوب جانے پر اس کے بیٹے میر حسن خان کے لئے گورنمنٹ برطانیہ نے بموجب سکرٹری گورنمنٹ ہند محکمہ خارجہ کے حکم نمبر ۳۰۴۴ مورخہ ۸ جولائی ۱۸۵۳ء مبلغ /۱۲۵ روپیہ پنشن تاحین حیات منظور کی جس کی تصدیق مہتمم بندوبست ہزارہ ۰۴-۱۸۶۷ء کیپٹن ای جی ۔ ویس نے بموجب اپنے نوٹ مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۶۸ء میں کی ۔

یہ پنشن میر حسن خان ۱۸۵۷ء تک (وفات تک) لیتے رہے ۔

(نوٹ ۔ یہ میر حسن خان میرے نانا تھے ۔ ش ب)

پروانہ پنشن کی نقل حسب ذیل ہے ۔

ترجمہ :۔ ہزارہ ۔ ایبٹ آباد کے دفتر بندوبست سے ایک نوٹ کی نقل جو کیپٹن ای جی ۔ ویس سٹلیمنٹ افسر نے مسٹر میکناب ڈپٹی کمشنر اور کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور کو جو مورخہ ۱۰ فروری ۱۸۶۷ء کو لکھا گیا ۔

۶۹ ۔ میر حسن خان ۔ ولد غزن خان (قائم خان پنی کا بھتیجا) — نقد پنشن ۔ مبلغ /۱۲۵ تازندگی ۔ بموجب چٹھی ۳۰۴۴ مورخہ ۸ جولائی ۱۸۵۳ء (نمبر ۶ رول I)

اس کے متعلق کوئی نئے حکم کی ضرورت نہیں فی الحال پنشنر کی وفات کے بعد اس پنشن کو واپس لے لینے پر کوئی اعتراض نہیں ۔ یہ پنشن اس پنشنر کے والد کی خدمات میں جب وہ سکھوں کی دوسری لڑائی میں سامان رسد برائے میجر ہربرٹ جو قلعہ اٹک میں تھا لے جاتے ہوئے دریائے سندھ میں ڈوب گیا ۔ دی گئی تھی ۔

میر حسن خان بن غزن خان

یہ میرے نانا تھے ۔ بہت متقی ۔ دیندار اور خوش خلق انسان تھے ۔ اپنی اولاد کو خود قرآن پڑھاتے تھے اور معنی بھی بتلاتے تھے ۔ اور چند سورتیں بھی یاد کراتے تھے ۔ دنیاوی معاملات میں کافی سوجھ بوجھ رکھتے تھے ۔ منیر خانی خاندان میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی سب زمین چک بندی کے طور پر یک جا کر لی ۔ جو جانب جنوب ناکوٹ نجیب اللہ تھی ۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی سب زمین اسی طرف پر جمع کی ہے کہ میرے بیٹے جب صبح زمین کی طرف جائیں تو سورج ان کے بائیں ہو جب واپس آئیں تو سورج پھر بھی ان کے بائیں ہو ۔ اور کبھی نہ منہ پر اور نہ پیٹھ پر لگے ۔

آپ کی سنت کی پیروی کی ایک بات یاد آ گئی جب میرے والد صاحب کی منگنی ان کی لڑکی سے ہو گئی تو اس وقت میرے والد بزرگوار داڑھی منڈاتے تھے ۔ ایک دفعہ جب ان کا آمنا سامنا میرے نانا مرحوم سے ہوا تو انہوں نے کہا ۔ " رسول خان ! اگر داڑھی نہ منڈائی جائے تو انگریز نوکر نہیں رکھتا " اسلوب نصیحت ایسا کارگر تھا کہ والد مرحوم نے اس دن سے ہی ڈاڑھی منڈانی بند کر دی ۔

میر حسن کا لڑکا خدا بخش خان ایک شہ زور انسان تھا ۔ اس وقت پہلوانی سیکھنے کا عام رواج تھا ۔ امیر خان پسر عبدو خان مشہور پہلوان تھا اور اس فن کا استاد مانا جاتا تھا ۔ اس کے پاس لوگ پہلوانی سیکھنے کے لئے آتے تھے ۔ ان کا مشہور شاگرد پہلوان خدا بخش خان منیر خانی اور احمد خان بن پائندہ خان بھنگی تھا ۔

خدا بخش خان کا بیٹا محمد اسلم خان قد آور اور خوش شکل مضبوط انسان ہے ۔ ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ عالمگیر میں یہ عراق میں تھا ۔ اس نے اور اس کی فوج نے ترکوں کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر دیا ۔ ان کی رجمنٹ کالا پانی بھیج دی گئی ۔ مدت بعد رہا ہو کر آیا ۔ زبردست شہ سوار ہے اور رسالہ میں منہ زور گھوڑوں کو سدھانے کے کام پر متعین رہا ۔ اب ۸۰ - ۷۵ سال عمر ہے ۔ ولولہ اور دلیری اب بھی جوانوں جیسی ہے ۔

عبدوخان

یہ ایک شہ زور۔ قوی اور بارعب انسان تھا۔ اس کا لڑکا امیر خان اور اس کے پوتے حبیب خان علی خان اور جہانداد خان اپنے وقت میں علاقہ کے بہادروں میں شمار ہوتے تھے اور ان کا رعب و اثر گاؤں اور مضافات میں بہت کافی تھا۔ افسوس ہے کہ بہادر باپ امیر خان کی سب اولاد تقریباً نابود ہو گئی۔ اُن سے ایک محمد اشرف خان پسر حبیب خان باقی ہے۔

عبدوخان کا دوسرا لڑکا کرم خان مولوی کے نام سے مشہور تھا۔ وہ ایک قابل حکیم تھا اور تقریباً عمر بھر بمبئی میں مطب کرتا رہا۔ بہت ہی حلیم طبیع انسان تھا۔ آخر ایام میں تپ دق میں مبتلا ہوا۔ کچھ عرصہ موضع سلہڈ۔ ایبٹ آباد میں برائے تبدیلِ آب و ہوا مقیم رہے۔ جب سخت بیمار رہے تو بہ سواری چارپائی پنیاں لائے گئے۔ مگر راستہ میں موضع شاہ محمد کے پاس فوت ہو گئے۔ سلہڈ کی رہائش کے وقت اور واپسی پر ان کا چھوٹا لڑکا سردار محمد خان اُن کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بعد میں جوان العمر مر گیا۔ اغلباً باپ سے تپ دق کا مرض لے لیا۔

مولوی کرم خان کی میت آبائی گاؤں پنیاں لے جا کر دفن کر دی گئی۔

حسن علی خان پسر سوم عبدوخان ایک خاموش طبیعت انسان تھا اور بہت صابر۔ وہ کثیر الاولاد تھا اس کا بڑا لڑکا رسول خان صاحب علم و فراست تھا۔ ان کی وفات ۲۹ محرم ۱۳۲۴ھ بہ شب یک شنبہ مطابق ۲۴ مارچ ۱۹۰۶ء ہوئی۔ ان کی قبر پر اُن کے فرزند رسول خان نے ایک پتھر کی سل کا شناختہ لگوایا جس پر یہ شعر کندہ کرایا ؎

بگذر اے دوست تا بوقت بہار ــــ سبزہ بینی دمیدہ از گلِ من

رسول خان بن حسن علی خان نے اپنی خداداد ذہانت، شوق اور محنت سے اس زمانہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی۔ وہ منیر خانی خاندان کے پہلے شخص تھے جنہوں نے اس وقت کے جاری شدہ سکول کوٹ نجیب اللہ سے ۱۸۸۸ء میں آٹھویں جماعت پاس کی۔ اس وقت اس سکول میں اتنی ہی تعلیم کا بندوبست تھا۔ اور پاس ہونے کے بعد وہیں نائب مدرس ہو گئے۔ ۱۰ اپریل ۱۸۹۰ء میں غازی۔ علاقہ تارخیلی کے مرکزی گاؤں کے اول مدرس مقرر ہوئے اور تقریباً اپنی اختتامِ زندگی تک (۱۹۲۱ء) میں وہیں رہے۔

آپ تین سال غازی میں رہے ہوں گے کہ ہزارہ کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر غلام محمد خان جو ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ آپ کو ٹریننگ کے لئے نارمل سکول راولپنڈی بھیج دیا۔ آپ جانے پر رضامند نہ تھے۔ اور

معذرت کی۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔ "رسول خان سنو۔ وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔ نئے ٹرینڈ اُستاد آ جائیں گے اور آپ کو اُن کے لئے جگہ خالی کرنی پڑے گی۔ میں پٹھان ہوں اور تم بھی پٹھان۔ لہٰذا میں تم کو ضرور بھیجوں گا۔ اور یہ شعر پڑھا۔ پہلا مصرعہ یاد سے اتر گیا ہے دوسرا ع تو مرن چوں جو ال مردان گور کن

چاروناچار والد صاحب مرحوم کو جانا پڑا۔ وہاں آپ دس ماہ یکم اکتوبر ۱۸۹۰ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۹۱ء تک رہے۔ اور امتحان میں بہت اچھی طرح کامیاب ہو کر واپس پھر غازی کے مدرسہ میں لگ گئے۔ راولپنڈی میں سکول کا ہیڈ ماسٹر سورج نرائن مہر تھا۔ والد مرحوم اس کی قابلیت کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔

آپ کی اتنی مدت اس سکول میں رہ جانے کا سبب قابلیت، اور فرض منصبی میں محنت و دیانت تھی۔ انہوں نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دئے کہ تمام قوم تارخیلی آپ کی گرویدہ ہو گئی۔ وہ خود بھی اس قوم کی ذہانت اور قابلیت کے ہمیشہ مدح خواں رہے۔ اور اپنے فرض منصبی میں کامیابی اور افسرانِ بالا کی خوشنودی، اپنے طالب علموں کی ذہانت اور قابلیت بتاتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ "مجھے دریائے سندھ کی ٹھنڈی ہوا، اور صبر دیانی اور طالب علموں کی ذہانت نے اتنی مدت غازی میں پابند کر رکھا۔ اُن کے کمرہ کی ایک کھڑکی دریائے سندھ کی طرف تھی اور اس کھڑکی کے سامنے اپنی چارپائی رکھتے تھے۔ سخت گرمیوں میں جب اس کھڑکی کو کھولتے تو اس زور سے ٹھنڈی ہوا آتی کہ انسان فوراً سو جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اس کھڑکی کے سامنے محنتی طالب علم بھی سو جاتا ہے۔ اور پانی کے لئے کبھی گھڑا نہ رکھتے تھے۔ ایک چھوٹا سا کوزہ ہوتا تھا۔ جب پانی کی ضرورت ہوتی تو ایک طالب علم فوراً وہ کوزہ دریا سے۔ چھرے کا پانی (جہاں پانی لہریں مار رہا ہوتا) بھر کر لاتے۔

آپ دریائے سندھ میں کبھی نہ نہائے۔ اگرچہ میں جب کبھی سکول کی چھٹیوں کے دوران آپ کے پاس جاتا تو روز دریا میں نہایا کرتا تھا۔ ہری پور سکول کی گرمی دریائے سندھ کے برفانی پانی سے فوراً دور ہو جاتی میں نے ایک دفعہ ان سے پوچھا کہ آپ کیوں دریا میں نہیں نہاتے۔ انہوں نے فرمایا۔ "کہ جب میں پہلی دفعہ یہاں آنے لگا۔ تو میری دادی نے کہا کہ رسول خان دریائے سندھ میں نہ نہانا۔ اس میں تمہارا دادا (عزان خان) ڈوب گیا تھا"۔ فرماتے تھے "کہ میں جب کبھی غلطی سے دریا میں نہاتا ہوں تو بیمار ہو جاتا ہوں دادی صاحبہ کی فرمائش کی حکم عدولی سے ایسا ہوتا ہے"۔

غازی سکول کے لوئر مڈل بن جانے پر آپ کی تبدیلی اپریل ۱۹۱۲ء میں کوٹ نجیب اللہ مڈل سکول میں بطور سیکنڈ ماسٹر ہو گئی۔ آپ کی تبدیلی پر جملہ خوانین طاہر خیلی اور عوام نے بہت اظہارِ تاسف کیا۔ خوانین میں

خان صاحب محمد عمر خان جاگیر دار غازی اور مولانا فضل احمد امام مسجد کے خطوط جذبات محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ جب غازی سے کوٹ نجیب اللہ تبدیل ہوکر آئے تو غازی سے، جو آپ کی مدت کی محبوب جگہ تھی، جدا ہونے پر بہت حسرت زدہ ہوئے اور کوٹ نجیب اللہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی۔ آپ مرض اسہال میں گرفتار ہوئے اور پانچ ماہ بیمار رہ کر ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ؀

آپ کی وفات پر آپ کے ہم عصروں اور افسران نے رنج و غم کا اظہار کیا۔ نمونہ کے لئے دو خطوط درج کرتا ہوں بہ لحاظ والد صاحب کے پرائمری سکول کے استاد کا ہے جو آخر کار کوٹ نجیب اللہ سکول کے ہیڈ ماسٹر بنے اور دوسرا خط ان کے افسر تعلیم۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ہزارہ حکیم بشیر الدین صاحب کا ہے۔

۲۔ ہیڈ ماسٹر۔ کوٹ نجیب اللہ

"عزیزی۔ دنیا کا دستور اسی طرح چلا آتا ہے۔ خداوند کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہے۔ آخر صبر کرنا پڑتا ہے۔ آپ صبر اختیار کریں اور خود کمر ہمت باندھ کر گھر والوں کو بھی تسلی دیویں اور اپنے تعلیمی کام کو سرانجام کرنے میں سعی کریں۔ آپ بالکل خداوند کریم کا بھروسہ رکھ کر اپنی تعلیم کا کام شروع رکھیں جس قدر خرچ آپ کو ضرورت ہوگا اللہ تعالیٰ خود مسبب الاسباب ہے۔ آپ کی حسب ضرورت مہیا کردیوے گا۔ بالکل تسلی رکھیں زیادہ کیا لکھوں۔ عمر دراز ہووے اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرو۔ فقط

امیر چند۔ ہیڈ ماسٹر۔ کوٹ نجیب اللہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

ترجمہ:۔ ایبٹ آباد۔ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۱ء

عزیزم شیر بہادر خان

مولوی صاحب کی اچانک موت کی غم ناک خبر سن کر صدمہ ہوا۔ اور اپنی دلی تعزیت و ہمدردی پیش کرتا ہوں۔ متوفی (خدا اس کی روح کو آرام بخشے) ضلع کا قابل ترین اور شریف ترین استاد تھا۔ اس کی وفات سے جو نقصان ہوا وہ ہر جگہ محسوس کیا جائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم خدا کی مرضی پر ہمہ تن راضی ہوکر اپنی تعلیم محنت سے جاری رکھوگے۔ اگر میں تمہاری کسی مدد کے قابل ہوں تو مجھے مطلع کرو۔

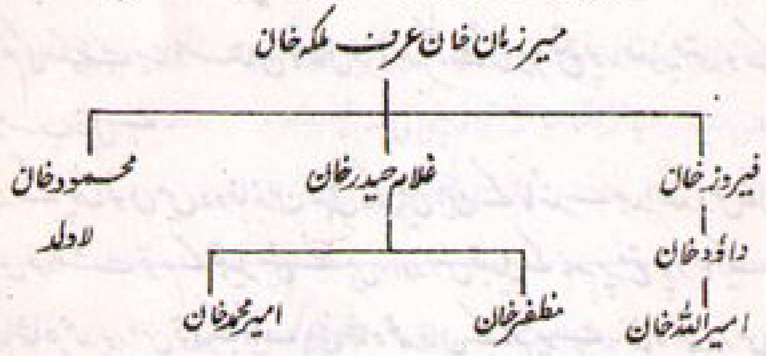
دستخط (بشیر حسین) اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس۔ ہزارہ

آپ نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں محمد جعفر خان اور شجاع الدولہ خان کو اپنے پاس غازی میں لے جاکر پرائمری تعلیم دلائی اور پھر مڈل سکول ہری پور میں بھی۔ محمد جعفر خان ۱۹۰۸ء میں فلپائن (فلپائن) نوکری کے لئے چلا گیا۔

اور شجاع الدولہ خان ۱۹۰۹ء میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہاں سے ۵ر جولائی ۱۹۱۲ء میں شجاع الدولہ خان امریکہ چلا گیا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۱۳ء میں محمد جعفر خان بھی امریکہ چلا گیا۔ یہ دونوں پھر وطن واپس نہیں آئے۔ محمد جعفر خان مئی ۱۹۶۱ء میں مقام سیاٹل (جہاں دونوں بھائی مدت سے مقیم تھے) لاولد فوت ہوا۔ شجاع الدولہ خان وہیں ہے اس کا ایک لڑکا انور خان نیویارک میں مشہور ڈائرکٹر آف بیلیٹ کمپنی بنام رابرٹ جعفری (اپنے چچا کے نام پر) کام کر رہا ہے اور بہت کامیاب ہے۔

میر زمان خان

منیر خان کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اور باپ اور بھائیوں کو بہت عزیز تھا۔ وہ اس کو ملک خان کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ اور اپنے بیٹے، بھتیجوں اور پوتوں میں ملک دادا جی کے نام سے مشہور ہے۔ ہزارہ میں سلطنت انگریزی کے شروع دور میں وہ درانیوں کا طرفدار اور غلام خان ترین کا ساتھی اور حلیف تھا اور میجر ایبٹ کے مخالف تھے۔ حالانکہ باقی سب بھائی میجر ایبٹ کے طرفدار تھے۔ جب انگریزی راج مستحکم ہوگیا۔ تو بھائیوں نے اس کو میجر ایبٹ کے انتقام سے محفوظ کرا لیا۔ اس کا بیٹا فیروز خان اثر و رسوخ والا اور زیرک انسان تھا۔ داؤد خان پسر فیروز خان بھی اپنے وقت میں نامور اور صاحب اثر رہا۔



پنیاں کے خوانین کی جاگیر۔ مختصر تواریخ

سردار ہری سنگھ نے قائم خان کو خدمات کے صلہ میں پنیاں کے گاؤں میں جاگیر دی جس کی مالیت تین سو ساٹھ روپیہ گنڈا تھی۔ دیوان ہری چند نے مزید خدمات کے صلہ میں پنیاں کی جاگیر ۳۶۰ روپیہ گنڈا کی بجائے ۴۰۰ روپیہ گنڈا کی جاگیر گنیا کا پورا گاؤں دے دیا۔

میجر ایبٹ نے مندرجہ بالا جاگیر ۴۰۰ روپیہ گنڈا کی سفارش کی اور ساتھ ۳۶ روپیہ نقد کی پنشن کی

۲۶۸ روپیہ قائم خان کی زندگی کے لئے اور ۲۶۸ روپیہ دوامی اس کے جانشینوں کے لئے۔ اگرچہ یہ جاگیر قائم خان کے نام پر تھی لیکن اوراس کے سب بھائی اس میں ہمیشہ شریک رہے۔ قائم خان کی وفات (۲۲ رمئی ۱۸۷۳ء) پر اس کا لڑکا احمد خان ۲/۳ حصہ جاگیر کا مالک ہوا۔ اور باقی ۱/۵ حصہ نجیم خان، عبدو خان اور میر زمان خان کو ان کی زندگی تک کے لئے ملا۔ ان کی وفات کے بعد مکمل جاگیر احمد خان کو ملی۔

نجیم خان ۱۶ رجون ۱۸۷۵ء میں، عبدو خان ۵ رستمبر ۱۸۹۲ء اور میر زمان خان کچھ مدت بعد (صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اغلباً آخر ۱۸۹۳ء) فوت ہوئے۔

احمد خان کی وفات ۸ رجون ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد فضل خان پسر احمد خان جاگیر دار ہوا۔ اس کی وفات ۳۰ رجنوری ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ اس کا بڑا لڑکا دوست محمد خان رسالدار میجر ۱۶ راکتوبر ۱۹۳۱ء میں اور دوسرا لڑکا محمد اکرم خان رسالدار میجر نومبر ۱۹۳۱ء میں فوت ہو چکا تھا۔ لہذا جاگیر داری صبح صادق خان پسر رسالدار میجر دوست محمد خان کو ملی۔

نوٹ :- عہد سکھاں میں قائم خان اپنی جاگیر سے بھاولی وصول کیا کرتا تھا۔

قوم پنی صوبہ متحدہ میں

پنی قوم کی سکونت ہندوستان کا حال جو ڈسٹرکٹ گزیٹ فتح پور صوبہ متحدہ کے ص ۱۰۰ پر تحریر ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"فتح پور کے پٹھانوں میں دو خاندان قابلِ ذکر ہیں جن کے نمائندے عبدالقدوس خان اور غلام مصطفیٰ خان ہیں۔ یہ دونوں غورغشت قوم کے قبیلہ پنی سے ہیں۔ اور اس قبیلہ کے نام پر فتح پور کا ایک محلہ موسوم ہے۔ اور دوسرا محلہ شاہ محمد پور اس قوم کے ایک بانی شاہ محمد خان کے نام پر ہے۔ شاہ محمد پور میں بارہ دری اور پنی باغ کے کھنڈرات آج تک موجود ہیں۔ ایک آبادی فتح پور کے مضافات میں، کمال خان پنی کی آبادکی ہوئی اب بھی بہ نام کمال پور موجود ہے۔ پنی قوم کے بہت سے افراد شاہانِ مغلیہ کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔ اور عبدالرحمٰن خان پنی ایک بہت بڑی جاگیر خالص پور لکھنؤ کے مالک تھے۔ نواب محمد شیر خان فتح پور میں رہتے تھے۔ اس کی بہت بڑی حویلی تھی۔ جو اب کھنڈر بن چکی ہے۔ اس کا پوتا خداداد خان اور تین لڑکے جن میں سب سے بڑا عبدالقدوس خان ہے جو ایک قومی کردار کا نمونہ اور بڑی جائداد کا مالک ہے۔

راورٹی کتاب کی مندرجہ ذیل یادداشت۔ حضرو کے علاقے اور اقوام کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔

ص ۲۳ - راولپنڈی سے حسن ابدال۔ برہان پہنچنے پر سڑک دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بائیں شاخ

شاہراہ ہے۔ جو اس وقت گھٹرہ قوم (حسن ابدال کا دارالخلافہ پرانے زمانہ میں نیلاب اور پھر بھتوت تھا جو اب ویران ہے) کی مخالفت کی وجہ سے بند ہے۔ دایاں راستہ جو ہم نے اختیار کیا اس ندی ہرو کے کنارے جاتا تھا، جو نیلاب کے مقام پر دریائے سندھ سے جا ملتی ہے۔ اس جگہ دو کروہ مغرب میں برہان سے اور تین کروہ شمال مغرب پر خوگیانی پٹھانوں کا گاؤں اسی نام پر آباد ہے۔ یہ علاقہ نشیب وفراز اور کھنڈرات ہیں۔ اور اس علاقہ سے افغانستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ خوگیانی سے ایک کروہ کے فاصلہ پر منٹوپہ (جغرافیہ کا ٹنگو) ہے یہ بھی اغلباً خوگیانی قوم کا ہے۔ اس کے شمال مغربی کونہ پر اور ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر حضرو ہے جس کی آبادی تین چار گاؤں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں غورغشت قوم (جس کے ۹۵ قبیلے ہیں) آباد ہے۔ اور اسی مقام پر دُرانی حکومت کا ضلع چھچھ ہزارہ کا داروغہ یا سپرنٹنڈنٹ رہتا ہے۔ حضرو کے مقام سے ایک کروہ بہ طرف شمال، شمال مغرب کی جانب دریائے سندھ کو عبور کرنے کا پتن ہے۔ حضرو کے لوگوں کی مادری زبان پشتو ہے۔ لیکن کچھ لوگ پنجابی بھی بولتے ہیں۔

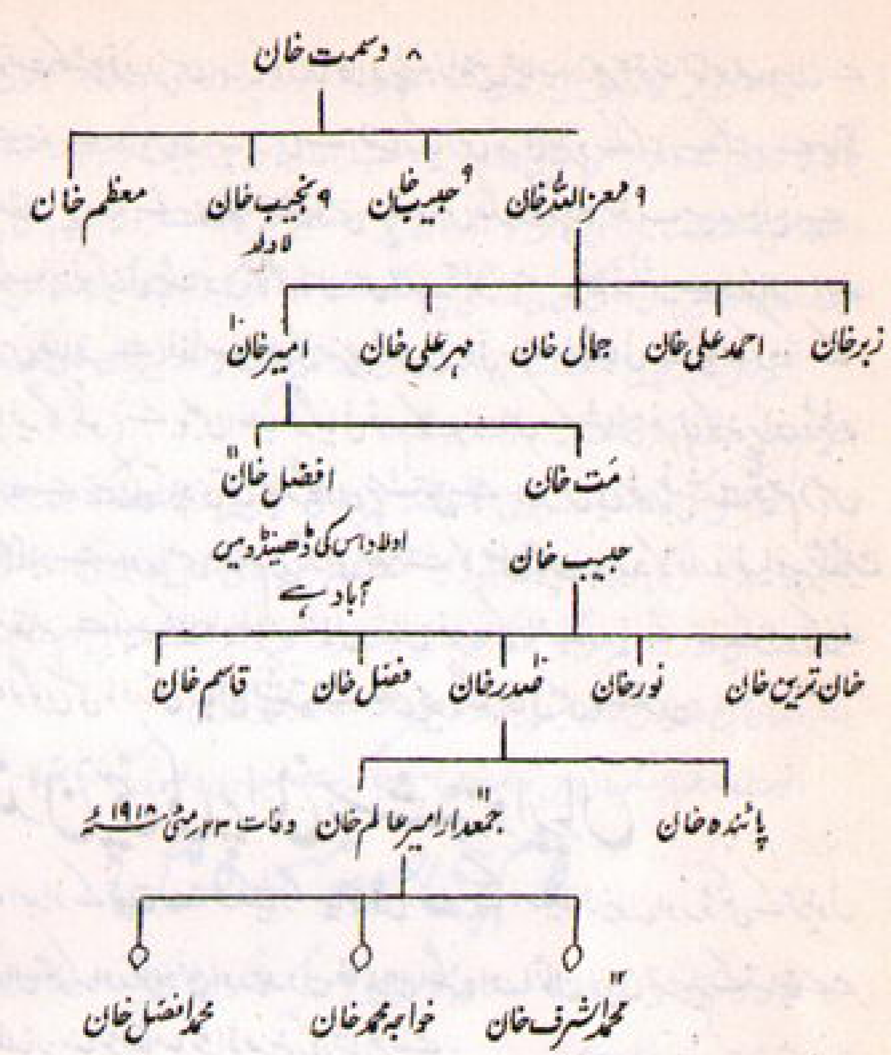
خاندان پنی کی پرانی رشتہ داریاں

اس خاندان کے اجداد کے تعلقات ناطہ ملکیار کے میانڑوں۔ گھلا بٹ کے سید خانیوں اور ڈنگی کے ترینوں کے ساتھ اور ترین خاندان تکوکرا اور نوردی اور جدون خاندان لنگرہ اور راتمان زیانِ تربیلہ کے ساتھ ہے۔ میاں شاہ حسین خان ملکیار۔ میانڑ اتھا میانڑ اقوم پنی کی شاخ ہے۔

- شاہ حسین خان
  - غلام مہدی خان
  - بی بی انور بیگم — جلال خان جدون لنگرہ سے بیاہی ہوئی تھی
  - بی بی گوہر نشاں — ڈنگی بیاہی ہوئی تھی اور محمد اللہ خان ترین ڈنگی کی بیوی تھی
  - بی بی صدرہ بیگم — ملکیار، لاولد

قوم پنی شاخ سید خان

- سید خان
  - ذلیل خان
  - زین خان
    - خان ترین — لاولد
    - رحمت خان
    - مظفر خان — لاولد



سید خان کا پسر دوم زین خان نہایت ہی متقی اور پرہیزگار تھا۔ اور بہ لقب شیخ زین خان مشہور تھا۔ نالۂ پنیاں، نزد گنیا کے جس چشمۂ آب پر وہ اکثر نماز گزار رہا کرتا تھا ان کی وجہ سے آج تک وہ جگہ شیخ زینا کے نام سے مشہور ہے۔

زین خان کی چوتھی پشت میں جمعدار میر عالم خان انگریزی حکومت کے عہد میں رسالہ فوج میں جمعدار تھے بلند قد و قامت اور مضبوط جوان تھے۔ اسی ملازمت سے پنشن پر آئے۔ ان کی اولاد میں (خان صاحب) حاجی محمد اشرف خان قابلِ ذکر ہیں۔ آپ افسر مال رہے اور اب پنشن پر ہیں۔ اغلباً ۱۹۳۰ء میں حج کیا اور ایک کتاب "رہنمائے مقاماتِ مقدسہ" لکھی۔ زمینداری کی ترقی میں بہت دلچسپی لیتے رہے۔ اپنی رائے پر سختی سے عمل کرنے والے سخت طبیعت کے مالک ہیں۔ شعرِ ذیل اُن کے حسبِ حال ہے ؎

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے ۔۔۔ یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گزشت

۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخاب میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ قوم بنی کی اکثریت نے

ان کا ساتھ دیا۔ لیکن ہار گئے بعد ۱۹۶۶ء سے کمزوری صحت کی وجہ سے خانہ نشین ہو گئے ہیں۔

پنیاں کے قدیم اُستاد اور علماء

زبانی تفتیش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس گاؤں میں سب سے پرانے اہلِ علم جو بڑے بوڑھوں کو یاد ہیں مندرجہ ذیل اشخاص گزرے ہیں۔ ۱۔ جلال خان بنی سے کچھ عرصہ پہلے اخون صاحب مشہور دینی رہنما گزرے ہیں ان کا نام آج تک بہت عزت سے لیا جاتا ہے نام و شجرہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن ان کا عزت و اکرام سے آج تک نام لینا ظاہر کرتا ہے کہ وہ ولی اللہ تھے۔ ۲۔ موضع ہیر والے مولوی صاحب نام ان کا کسی کو یاد نہیں۔ ایک درویش صفت انسان تھے۔ بڑی مسجد میں رہتے تھے اور مروجہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ ۳۔ میاں نور اللہ المعروف ننگا جاعلی (گاؤں میں لوگ اُن کو میاں ننگالی جی کے نام سے یاد کرتے ہیں) یہ پنیاں ہی کے باشندے تھے۔ اور موجودہ فقیر خاندان سے تھے۔ تفتیش سے معلوم ہوا ہے کہ واجبی علم دین رکھتے تھے۔ بعد میں ان کو پنیاں سے جلاوطن کیا گیا، اغلباً خاناں کی مخالفت کی وجہ سے۔ اور موضع درویش میں فوت ہوئے۔ اصلاً یہ آوان تھے۔ ۴۔ پنیاں کے پیر۔ ان کا مورثِ اعلیٰ میر احمد شاہ تھا۔ عہدِ سکھاں میں شیدو میں مقیم تھا۔ اور بہ روایت مولوی عبد الرحمان مرحوم وہاں کے نصف گاؤں کا حاکم تھا۔ اور ابتدائے حکومت انگریزی میں اسی عہدہ پر متعین رہا۔ کارِ تقدیر سے ان کے حرکات میں کچھ تغیر تبدل واقع ہونے پر وہاں کے خوانین ان سے بدظن ہو گئے۔ وہ ان کے خوف سے دریائے کابل کو بہ بازوئے خود عبور کر کے مفرور ہو کر چلے گئے اور مقام مانگل (تحصیل مانسہرہ) جا کر دم لیا۔ وہاں پیری مریدی کے سلسلہ میں چندے گزارا کیا۔ اتفاقاً مقدمہ مشرف کوٹ نجیب اللہ کی ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اُن کو کوٹ نجیب اللہ ساتھ لے آیا اور اپنے پاس رکھا۔ رفتہ رفتہ تعارف زیادہ ہوا۔ پھر ارسلا خان پسر عبد الغنی خان بنی اور اس کے بھائی وغیرہ ان کو پنیاں لائے اور اپنی مسجد کی امامت دے دی اور اپنا پیشوا بنایا۔

ارسلا خان نے اپنی لڑکی سے ان کی شادی بھی کر دی۔ اس کے بطن سے اُن کے دو لڑکے ہوئے۔ **گل بادشاہ** اور **سید احمد شاہ**۔ میر احمد شاہ کے پنیاں مقیم ہونے پر اُن کے چچا حافظ عبد الرؤف المعروف باباجی پنبوی بھی شیدو سے ہجرت کر کے یہاں آ گئے۔ ان کی اپنی بیوی ساتھ تھی۔ اس کے چار بیٹے ہوئے۔ میر ثاقب شاہ۔ یوسف شاہ۔ مقبول شاہ۔ میر احمد علی شاہ یہ چاروں لاولد تھے۔

مجھے پیر مقبول شاہ کے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ قد آور، موزوں فربہ بدن، گورا رنگ اور لمبی سرخ (حنائی) داڑھی رکھتے تھے۔ اور بہت وجیہہ اور پُراثر شخصیت تھے۔ ان کا ایک جنازہ میں شامل ہونا

اور اپنے ہاتھ سے قبر کو مٹی دیتے وقت آیت ذیل کا پڑھنا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (ترجمہ :۔ اس مٹی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اسی مٹی میں تم کو واپس داخل کریں گے اور اسی مٹی سے دوبارہ زندہ کر کے نکالیں گے۔

۴۔ پنیاں کے اخون زادے :۔ یہ اخون صاحب کی اولاد ہیں۔ وہ اصلاً گوجر تھے۔ پنیاں کے لوگ ان کے بہت عقیدت مند ہیں۔ اور آج تک ان کی اولاد کی عزت و تکریم کرتے ہیں۔ زنادہ میر جان سے کافی پہلے ہوئے ہیں۔ زیارت اُن کی پنیاں کے قبرستان میں موجود ہے۔ لوگ اب بھی اس پر جھنڈے وغیرہ چڑھاتے اور مرادیں مانگتے ہیں۔ ان کی اولاد سے اب کوئی قابلِ ذکر آدمی نہیں رہا۔

شاہ صاحب ڈھینڈہ

یہ میرے بچپن کے زمانہ میں پُر اثر واعظ مشہور تھے اور ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہماری قوم کے موضع ڈھینڈہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ ان کی خوش بیانی اور پُر رعب و باا ثر شخصیت سے علاقہ میں لوگ دینداری کی طرف مائل رہے۔ آپ کا اسم گرامی محمود شاہ تھا۔

بموجب تحریر سید عبدالواحد شاہ ڈھینڈوی ان کی زندگی کے مختصر حالات درج ذیل ہیں۔

آپ نے تکمیل تعلیم موضع لکھوکے ضلع فیروزپور میں پنجاب کے مشہور مفسر و محدث حافظ محمد صاحب سے حاصل کی۔ اور گرد و نواح میں اپنے وعظ و ارشاد سے نام پیدا کیا۔ اور اضلاع جھنگ، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں آپ کے مواعظ کی بدولت تعلیم اسلامی کا باغ ہرا ہوا۔ آپ نے پشاور میں اپنے وعظ کے اثر سے مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی رنگ میں ڈھال دیا۔ اور خلاف شرع رسومات کی بیخ کنی کر دی۔ اسی طرح آپ نے چکلی میں بھی وعظ کر کے رسوماتِ بد کی بیخ کنی کی۔

آپ کی شادی شہر ملتان کے ایک خدا رسیدہ بزرگ مولانا عبدالمالک کی دختر سے ہوئی۔ آپ کافی عرصہ وہاں رہے۔ آپ کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا سید احمد شاہ صاحب تھے۔ چونکہ اس وقت لڑکیوں کو جائیداد میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا اس واسطے انہوں نے اس خلاف اسلام قانون کی اصلاح گھر سے شروع کی۔ اور اپنے صاحب زادہ کی رضامندی سے نصف جائیداد صاحب زادی کے نام منتقل کر دی۔

وفات ۱۹۰۹ء میں ہوئی اور آپ کا روضہ ایک چار دیواری کے اندر بر شارع عام از ڈھینڈہ تا پنیاں (مقابر موضع ڈھینڈہ) میں ہے۔

سید محمود شاہ کے اجداد کا شجرہ نسب مطابق بیان ملک سردار محمد خان پنی نمبردار ڈھینڈہ درج

ذیل ہے :۔

سید عبداللہ شاہ (آپ مشہور عالم دین گزرے ہیں۔ سید عمر شاہ۔ میر محمود شاہ۔ یہ تینوں بھائی تھے۔

سید عبداللہ شاہ

سید احمد شاہ — عبدالحق شاہ — عبدالاحد شاہ — عبدالمجید شاہ

سید عمر شاہ

حافظ حسن شاہ — احمد شاہ — حافظ عبداللطیف شاہ

میر محمود شاہ

عبدالرحمٰن شاہ — سید محمود شاہ

یہ سب خاندان عالم اور اکثر حافظ تھے۔

ڈھینڈہ میں ایک اور مشہور پٹھان حافظ بہ نام امیر خان گزرے ہیں ان کا شجرہ حسب ذیل ہے :۔

عبداللہ خان

|

محمد خان

|

حسن خان

|

حافظ امیر خان

حافظ جی صاحب ساکن ڈھینڈہ

آپ آوان کار سے موضع ڈھینڈہ تشریف لائے۔ آپ کی مسجد اور تالاب (مشہور بہ حافظ جی صاحب کی بن اور مسجد) آج تک قائم ہیں۔ اس وقت کے شارع عام از سری کوٹ تا ہری پور یہ مسجد واقع تھی اور موضع ڈھینڈہ کے جنوبی حصہ رُخ بطرف میلم گاؤں کے ہے۔

آپ ایک متدین اور صاحب اثر بزرگ گزرے ہیں ان کی اولاد کا شجرہ حسب ذیل ہے جو ملک سردار محمد خان پنی نمبردار ڈھینڈہ سے معلوم ہوا۔

حافظ جی صاحب
- حافظ نواب صاحب
  - احمد جی
    - مولوی معصوم
    - قاضی عبدالقیوم
  - حافظ سراج احمد — ان کی اولادان کی مسجد کے ساتھ ملحق محلہ میں آباد ہے

روایت ہے کہ ایک دن وہ اپنی مسجد میں بیٹھے تھے اوران کے طالب علم اُن کے اردگرد بیٹھے ہوئے سبق پڑھ رہے تھے ۔ کہ غلام خان ترین حاکم وقت اپنی فوج کے ساتھ سری کوٹ کی جانب سے آیا ۔ اُن کے پاس سے گزرتے ہوئے طنزاً بولا " ٹھگار کوں کو لئے ہوئے بیٹھا ہے " یہ کہہ کر وہ چلا گیا ۔ کسی طالب علم نے حافظ صاحب سے کہا کہ صاحب! اس نے بہت ہتک کی بات کی ۔ تو حافظ صاحب نے جواب دیا کہ اس کی جڑ اکھاڑ دی گئی ہے ۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ کے بعد انگریزوں نے غلام خان کو گرفتار کر لیا واللہ اعلم

۶ - میاں گلمیر - میری اوائل عمر میں وہ زندہ تھے ۔ یہ اور ان کے خاندان کے سب لوگ ... علم دین کے جاننے والے تھے ۔ اور پنیاں کی مختلف مساجد کے امام رہے ۔ ان کا خاندان قطبال ، علاقہ کیمبل پور سے یہاں آکر آباد ہوا تھا ۔

۷ - مولوی عبدالرحمٰن - ان کے آباو اجداد شیدو سے پنیاں آئے ۔ مولوی صاحب مرحوم بہت بڑے عالم تھے ۔ خوب منطقی اور مناظر تھے ۔ ان کے اجداد انیسویں صدی کے شروع میں آئے ۔ ان کے والد میرے نانا میر حسن خان کے ہم عصر تھے ۔ مولوی عبدالرحمٰن مرحوم کے دو لڑکے عبیدالرحمٰن اور عزیز الرحمٰن ہیں ۔ علم دونوں کا کافی ہے ۔ مولوی عزیز الرحمٰن دینیات کے مدرس ہیں تدریس کا کام کرتے ہیں ۔ اور عبیدالرحمٰن گاؤں ہی میں مطب وغیرہ کرتے ہیں ۔ سیاست کے رسیا رہے ہیں ۔ اب دونوں ہری پور میں رہتے ہیں ۔

قوم پنیؔ کی زبان

حالات و واقعات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ منیر خان کے وقت سے ان کی زبان ہندکو تھی ۔ اگرچہ پشتو زبان کے چند الفاظ اب تک رائج ہیں ۔ مثلاً :-

۱ - رِشتینی - کسی معاملہ میں روبرو تحقیق کرنے کو رشتین کرنا کہتے ہیں جو پشتو زبان کے لفظ رشتیا (سچ) سے مشتق ہیں ۔

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب ساکن ... پہلوڑہ اپنی کتاب "القول العزیز" ... مولوی محمد معصوم صاحب ... [illegible]

تھے ۔ اور مولوی محمد معصوم صاحب سے حضرت شاہ محمد حسنؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور نے درس لیا تھا ۔

۲ - والد اور چچا کو کاکا کہتے ہیں ۔ جو پشتو زبان میں ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔

۳ - ٹخہ مرغوں کی کھانسی کی بیماری کو ٹخہ کہتے ہیں ۔ اور پشتو زبان میں یہ لفظ انسان کی کھانسی کے لئے مستعمل ہے ۔ لیکن کچھ مدت سے قوم پنی کی زبان ہندکو (پنجابی) ہی ہے ۔ اس کا مؤثر ثبوت اُن کی رائج الوقت زبان اور کہاوتیں ہیں ۔ چند کہاوتیں درج ذیل ہیں :-

۱ - کوئی جھنڈ سلکھنڑاں ، کوئی کھُر سلکھنڑاں ۔ یعنی کوئی بہو خوش بخت ہوتی ہے ۔ یا کوئی جانور جن کے آنے سے گھر میں خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے ۔

۲ - جس کجھ نہ ڈٹھا ، اُس دا پھیپھڑ مٹھا ۔ کم ظرف آدمی تھوڑی سی خوشحالی یا آمدنی سے مغرور ہو جاتا ہے ۔

۳ - جم نہ مُکی تے نک دا دے دا ۔ یعنی ابھی کسی کام کے لائق بھی نہیں ہوا ، کہ خاندانی فخر و مباہات کا اظہار کرتا ہے ۔

۴ - گھر کھانڑے ہاں نہیں ، تے اماں بھنانڑیں ہاں گئی لے ۔ یعنی غربت میں بھی اظہار تکبر ہے ۔

۵ - جمدی دا انگور نہیں چھپدا ۔ نالائق آدمی کے آثار پیدائش ہی سے ظاہر ہوتے ہیں ۔

۶ - جیہا منہ ، جیہی چپیڑ ۔ مطلب حصہ بقدر جُثہ

۷ - اِک نانہہ سو سُکھ - شروع ہی سے انکار اچھا ہے ۔

۸ - سچی کوڑوں شوم بھلا ، جیہڑا اتُرت دیوے جواب ۔ صاف جواب ، لارے لپٹے سے بہت بہتر ہے ۔

ہندکو زبان پر ایک مضمون "جمہور" ایبٹ آباد میں ۱۹۶۷ء میں چھپا تھا ۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

ہندکو بولی کی تاریخ

اس زبان کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی ۔ یہ ایک علاقائی بولی ہے ۔ اس کا کوئی لٹریچر نہیں ۔ لیکن دیہات میں اس زبان کی شاعری اور زندگی کے مسائل کو اس زبان میں نہایت عمدگی اور سادگی سے حل کیا جاتا ہے ۔

اس زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آریاؤں اور دراوڑ قوم کی زبان کے ملاپ سے پیدا ہوئی ۔ فاتح و مفتوح لڑے اور دوا ڑ کے علاوہ ایک دوسرے کی زبان پر بھی اثر ڈالا ۔

دراوڑی زبان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ زبان مغربی پاکستان کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی ہو گی ۔ یعنی ولیسی بولیاں جنہیں کول اور دراوڑ بولتے تھے ۔

گریرسن ماہر لسانیات اپنی کتاب (لسانیاتی تبصرہ ہند) میں دراوڑی ۔ ہندکو اور اردو کے بالمقابل الفاظ کی ایک فہرست دی ہے :-

دراوڑی	ہندکو	اردو	دراوڑی	ہندکو	اردو
کنڈا	کنڈا	کنارا	ڈوو	ڈھڈ	دودھ
کن	کن	کان	کمو	کم	کام
چم	چم	چمڑا	اتھ	ہتھ	ہاتھ
رت	رت	لہو			

ہندکو اور دراوڑی الفاظ کی مماثلت اس خیال کو اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے کہ آریوں کے داخلہ ہندو پاک سے قبل مغربی پاکستان کی بولیوں میں ہندکو کا بھی چرچا رہا ہوگا۔ قدیم دلیسی بولیوں کی مخصوص علامتوں اور دراوڑی زبانوں کے الفاظ کا آج تک ہندکو میں پایا جانا یہ سب باتیں نہ صرف ہندکو بلکہ اُسے دلیسی زبانوں کی فہرست میں لے آتی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ضلع ہزارہ کا تعلق صوبہ سرحد سے رہا ہے۔ لیکن ثقافتی و لسانی اعتبار سے یہ ضلع پنجاب سے وابستہ رہا اس لحاظ سے سرحد میں نمائندہ حیثیت ہزارہ کی ہندکو کو حاصل ہے۔ اور یہ جغرافیائی رشتے کے ماتحت نوّے فیصد پنجابی ہے۔ سرحد میں ہندکو کے مختلف نام اور شاخیں ہیں مثلاً ڈیرہ والی (ڈیرہ اسماعیل خان) کوہاٹی اور پشاوری (کوہاٹ اور پشاور میں) کے نام سے مشہور ہے۔

محل وقوع ۔ موضع پنیاں کشمیر کے راستہ پر واقع ہے۔ اسی راستہ سے مغل بادشاہ گزرتے تھے۔ اُن کا پڑاؤ خاص طور پر واہ (حسن ابدال) ہوتا تھا۔ پھر وہاں سے کبھی ہزارہ کی موجودہ سڑک کے راستے سے سلطانپور دھمتوڑ۔ گڑھی حبیب اللہ۔ کشمیر کو جاتے تھے۔ اور کبھی واہ سے حضرو۔ کنار دریائے سندھ۔ تربیلہ۔ بیڑ۔ مانسہرہ۔ اترشیشہ (پرانا نام عطرشیشہ تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ اس پڑاؤ پر نورجہاں بیگم کا عطر کا شیشہ رہ گیا تھا) گڑھی حبیب اللہ اور کشمیر یہ راستہ شاہان کابل کا عام راستہ کشمیر و کابل کے درمیان تھا۔

قوم پنی کے چار مشہور خیل

پنی خان
- دریا خان — منیر خانی۔ گھوپے۔ بھنگی۔ صدر خانی
- یوسف خان — بٹی۔ شاہ نوازی۔ شاہجنے۔ پنج رنڈے
- مظفر خان — مفری
- موسیٰ خان — موسیٰ خیل

خیل دریا خانی ۔ موضع پنیاں، جو جاگے خانگی ہے میں آباد ہیں۔ اور خیل مظفر خانی اور خیل یوسف خانی بھی یہاں ہی آباد ہیں۔ **موسیٰ خیل** ۔ مواضعات کالوپنڈ، بھیرہ، پہاڑو، بکہ، ٹوڈو اور کانگڑہ میں آباد ہیں۔

خیل دریا خانی حسب ذیل چار شاخوں میں تقسیم ہے:۔

دریا خان
- دلیل خان — منیر خانی
- شیخ زین خان — صدر خانی
- امیر خان — گھوپے
- کمال خانی — بھنگی

امیر خان کی اولاد گھوپے مشہور ہیں۔ روایت یہ ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ گاؤں کے نالہ کے نزدیک ہندوؤں کی کسی چھوٹی لڑکی کو ان کے کسی فرد نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ اور اس کا زیور اتار لیا تھا۔

کمال خان کی اولاد بھنگی کہلانے کے دو وجوہات بیان ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے آباء میں سے کوئی بھنگ کا رسیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی زمین میں بھنگ بہت ہوتی تھی اور لوگ جو اس کے رسیا تھے۔ وہاں سے لاتے تھے۔ اور پیتے تھے۔

پنیاں کی مساجد

ہر ایک محلہ اور بعض دفعہ ہر خاندان کی مسجد اور حجرہ الگ الگ ہوتا تھا۔

۱۔ بڑی مسجد خیل دریا خانی کی پہلی مسجد ہے۔ اور آبادی کے ساتھ ہی تعمیر شدہ معلوم ہوتی ہے۔ عہد سکھاں میں ایک دفعہ یہ مسجد ان کے ہاتھ سے جلائی گئی تھی۔ ۲۔ اس کے بعد دوسری بڑی مسجد موسوم بہ پیراں والی مسجد ہے جو خیل یوسف خانی کی مسجد ہے۔ ۳، ۴۔ ان دو مسجدوں کے بعد وقتاً فوقتاً دوسری مسجدیں بنائی گئیں۔ مثلاً بھنگیوں کی محلہ والی۔ اور گھوپوں کے محلہ والی۔ آخر الذکر میر حسن خان ولد عزن نے بنوائی تھی۔ جن کی وفات ۱۸۹۶ء میں ہوئی۔ ۵۔ پانچویں مسجد مفری محلہ میں خیل مظفر خانی کی ہے۔ یہ بھی پرانی مسجد معلوم ہوتی ہے۔ ۶۔ گڑھی والی مسجد۔ اس کا زمانہ تعمیر معلوم نہ ہو سکا۔ یہ مسجد شاہ نوازی خاندان کی ہے۔ ۷۔ مسجد واقع محلہ شاہجنے۔ گاؤں کے نچلے حصہ میں ہے۔ اور مفریوں کی مسجد کے نزدیک ہے۔ اور نالہ پنیاں کے کنارے پر ہے۔

حجرے

ہر گاؤں میں قدیم زمانہ میں حجرہ گاؤں کے جرگہ کی جگہ ہوتا تھا۔ یہ ایک بڑا سا مکان ہوتا تھا۔ اور اس کے سامنے ایک بڑا صحن۔ اس کے اندر چارپائیاں بچھی رہتی تھیں۔ اور چلم تمباکو بھی ہوتا تھا۔ دیواروں

کے ساتھ مٹی کا پلیٹ فارم (تھڑا) بھی ہوتا تھا۔ چارپائیاں بزرگان محلہ اور مہمانوں کے لئے ہوتی تھیں۔ اور تھڑے بچوں اور دوسرے درجہ کے لوگوں مثلاً گاؤں کے مزدور طبقہ کے لوگوں کے بیٹھنے کے لئے ہوتے تھے۔ پرانے زمانہ میں حجرہ گاؤں کی سیاسی زندگی اور مجلس کی جگہ ہوتی تھی۔ اور مندرجہ ذیل ضروریات کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

۱۔ معاشرتی مجلس و گفتگو کے لئے۔ ۲۔ مقدمات تفہیم و مصالحت کے لئے۔ ۳۔ مذہبی امور مثلاً نکاح، شادی وغیرہ کے لئے۔ ۴۔ مہمانوں کے لئے۔ زمانہ قدیم میں گاؤں کے خوانین اپنے گھر کے ساتھ مہمان خانہ نہیں بناتے تھے۔ جیسا کہ اب رواج ہو گیا ہے۔ کہ گھر کے ساتھ ہی ایک بیٹھک بنادی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں غیر آدمی کا گھر کے ساتھ رکھنا جہاں پر گھر کی مستورات کی آواز سنی جا سکے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ہر ایک شخص کا مہمان حجرہ میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہیں اس کی خاطر تواضع کی جاتی تھی۔ اور چلم تمباکو اور کھانا دیا جاتا تھا جس مہمان کا کوئی واقف نہ ہوتا وہ حجرہ کا مہمان سمجھا جاتا تھا اور سب لوگ اپنے اپنے گھر سے اس کے لئے کھانا لاتے تھے۔

حجرہ میں بہت سے معاشرتی امور سرانجام پاتے تھے۔ مثلاً منگنی، شادی اور موت کے وقت لوگ وہاں جمع ہو جاتے تھے اور مختلف رسومات وہاں ادا کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی تماشہ والا، مثلاً بندر والا۔ جادوگر، یا ناچ تماشہ والا آتا تو وہ حجرہ ہی میں اپنے کرتب دکھاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اپنے کاموں سے (زمیندار لوگ عموماً) فارغ ہو کر شام کو وہاں گپ شپ کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ اور رات گئے تک باتوں میں مشغول رہا کرتے تھے عموماً جوان عمر کے آدمی شادی سے پہلے وہیں سوتے بھی تھے۔

عید کے موقع پر بھی لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ مختلف کھیلیں، گانے بجانے اور میل ملاقات کا شغل انجام پاتا تھا۔ مختلف ورزشوں مثلاً بٹی (پتھر) اٹھانا۔ بینی (بازو) پکڑ کر زور آزمائی کرنا، کے مظاہرے بھی ہوتے تھے۔ سرکاری افسران بھی حجرہ ہی میں آکر قیام کرتے۔ افسران مال انتقال وغیرہ وہیں کرتے اور وہیں مقدمات کی سماعت اور فیصلے بھی کرتے۔ پرانے زمانہ میں لوگ اپنی تکلیفات اور شکایات حجرہ میں پیش کرتے تھے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے فریقین کے درمیان اسی وقت تسلی بخش فیصلے کرادیا کرتے تھے۔ حجرہ کی تنظیم مسلمان بادشاہوں کے زمانہ سے جاری تھی اور یہ ایک قسم کا مقامی انتظامی مرکز تھا۔ جب انگریزوں کی سلطنت آئی تو انہوں نے بھی اس تنظیم میں مداخلت نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے اسی تنظیم کو قانونی طور پر تسلیم کیا۔ سرحدی علاقوں میں اس تنظیم کی بنیاد پر جرگہ کا قانون حاوی کیا اور ایسے مقدمات جن میں کوئی قانونی ثبوت نہ ہوتا وہ جرگہ کے حوالے کئے جاتے رہے۔ اور اب تک یہ نظام رائج

ہے۔ بہت سے مقامی تنازعات بھی جرگے کے سپرد کر دئے جاتے رہے۔

اسی حجرہ میں قرض خواہ اپنے مطالبہ کے لئے مقروض کے خلاف شکایت کرتے تھے۔ یہاں اُن کا قرضہ ادا کروایا جاتا تھا۔ اور ضلع کی عدالتی کارروائی کی سردردی بھی نہ کرنا پڑتی تھی۔ حجرہ کی تنظیم اہل محلہ و دیہہ پر مضبوط گرفت رکھتی تھی۔ پرانے مقررشدہ حجرہ کے خلاف نیا حجرہ بنانا قانوناً منع تھا۔ تاکہ افتراق پیدا نہ ہو۔ حجرہ کی تنظیم اب بھی اس صوبہ کے سرحدی علاقوں، افغانستان، ایران اور ترکی میں موجود ہے۔

یہاں ۱۹۱۴ء کی جنگ سے بعد یہ تنظیم کمزور پڑ گئی ہے۔ بہت سے دیہاتی اب شہروں میں آباد ہو رہے ہیں۔ اور جو گاؤں میں صاحب حیثیت لوگ رہتے ہیں انہوں نے اپنے گھروں کے ساتھ بیٹھک بنا کر عوامی حجروں کو ختم ہی کر دیا ہے۔ اپنے وقت میں یہ رواج بہترین انتظام، افادہ و امن کا حامل رہا ہے۔

پنیاں میں حجرے

۱۔ سب سے بڑا اور مضبوط حجرہ منیر خانیوں کا تھا۔ منیر خانیوں کے جدّ جلال خان پنّی کا یہ حجرہ تھا اور اس کے گھر کے ساتھ پیوست تھا۔ اب بھی اس کا گھر پرانے حجرہ کے ساتھ جو بھنگیوں کی مسجد کے نزدیک ہے، موجود ہے۔ لیکن جلال خان کی اولاد منتشر ہو جانے سے غیر آباد ہے۔ جلال خان نے اپنی خانی اپنے بھتیجے منیر خان کو دے دی تھی۔ اس کے بعد یہ حجرہ منیر خانیوں (یعنی خانوں) کے حجرہ سے موسوم رہا۔ اب بھی موجود ہے لیکن اب موچیوں کی دکانیں ہی اس کی آبادی برقرار رکھی ہوئی ہیں۔

۲۔ دوسرا حجرہ قوم بٹی (پنی) کا تھا مگر وہ مدت سے ختم ہو چکا ہے اور وہاں اب لوگوں نے رہائشی مکان بنا لئے ہیں۔ ۳۔ تیسرا حجرہ شاہ نوازی قوم کا ہے جس کو گڑھی کا حجرہ کہتے ہیں۔ بہت اونچی جگہ مثل گڑھی ہے۔ اب بھی آباد ہے۔ ۴۔ ایک حجرہ امیر خان ولد عبدو خان منیر خانی کا تھا۔ کسی وقت میں بہت آباد اور بارعب جگہ تھی۔ لیکن اب وہاں بھی سکونت کے لئے مکان بن گئے ہیں۔ ۵۔ ایک حجرہ قبیلہ شاہ منڑے و پنج رنڈوں (قوم پنی کا ہے) لیکن اب برائے نام۔ ہی ہے۔

ہتھیار

قوم پنّی کے آثار قدیمہ میں پرانے زمانہ کی بہت لمبی نالی والی بندوقیں ہیں جن کو توڑے دار کہتے ہیں۔ ایک دو پستول (لمبی نالی والے) بھی خاندان میں پائے گئے لیکن زیادہ تر اور عام ہتھیار تلوار تھا۔

جو گاؤں میں اب بھی بعض کے پاس موجود ہیں۔ لیکن زرہ بکتر خاندان کے کسی آدمی کے گھر میں نہ پایا گیا پرانی تلواریں بھی اب کسی کے پاس نہیں۔ میرے خاندان کی دو تلواریں میرے پاس ہیں۔ اور ایک کے قبضہ پر چاندی کا کام کیا ہوا ہے۔

مکانات، طرزِ تعمیر وغیرہ

زمانہ قدیم چونکہ طوائف الملوکی اور بدامنی کا زمانہ تھا۔ لوگ عارضی طور پر چھپر نما مکان ہی بنایا کرتے تھے۔ جن سے وقتِ ضرورت وہ فوراً نکل جایا کرتے تھے۔ صحن خانہ میں عموماً ایک کنواں۔ دو چار گز گہرا ہوتا تھا جس میں وقتِ ہجرت فالتو سامان وغیرہ ڈال دیا کرتے تھے۔ اور اوپر سے بند کر دیا کرتے تھے پھر جب واپس آتے تھے تو اپنا سامان نکال لیا کرتے تھے۔

شروع عملداری انگریزی میں کچے مکانات کافی لمبے اور چوڑے (ایک ہی کمرہ) جن میں ستون لگائے جاتے تھے۔ بنانے کا رواج ہوا۔ اور غلہ اور سامان رکھنے کے لئے کلبوتے (مخروطی شکل ) اور کوٹھیاں () مٹی سے بنائی جاتی تھیں اور سب کنبہ اسی ایک کمرہ میں رہتا تھا۔ درمیان میں مٹی کا ایک چوکور چولھا جس کے تین پائے ہی ہوتے تھے۔ اس پر روٹی پکائی جاتی تھی اور سب خاندان اس کے اردگرد بیٹھتے تھے اور وہاں روٹی کھاتے تھے اور سردیوں میں گرم رکھنے کا ذریعہ تھا۔ اس کے بعد فارغ البال گھرانوں میں ایسے مکان کے دونوں سروں پر ایک ایک چھوٹی کوٹھڑی بنائی جانے لگی۔ اور ایک کو باورچی خانہ کے طور پر استعمال کرنے کا رواج شروع ہو گیا۔ ابتدائی دور میں مکان کے سامنے یا بغل میں ایک برآمدہ کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ جو اونچے طبقہ یعنی خوانین کے گھروں میں روٹی وغیرہ پکانے کے لئے موزوں سمجھا جاتا تھا، برآمدے کا رواج آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ اور کچے مکانوں کی جگہ پہلے پتھر سے پختہ مکانات بنے اور پھر اب اینٹ سے بنائے جانے لگے ہیں اور حال میں سیمنٹ کے بلاک بھی استعمال کئے جا رہے ہیں۔

لباس

ہماری قوم اور تقریباً اہلِ ہزارہ کا لباس بہت سادہ اور گھریلو سوت کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ کُرتہ جس کو خلقہ (خرقہ) کہتے تھے۔ ڈھیلا ڈھالا۔ کھلا سینہ، کھلے اور لمبے بازو والا ہوتا تھا۔ سینہ پر دونوں طرف کپڑے ہی کے تسمے (جن کو تنڑیاں کہتے تھے) لگے ہوتے تھے جن کو آگے باندھ لیتے تھے۔

اور جب کبھی کام کاج کرتے تو ان تسموں کو خلقہ لپیٹنے کے لئے پیچھے باندھ لیا کرتے تھے۔ پاجامہ بہت کھلے پائنچوں والا ہوتا تھا اور سر پر بڑی سفید پگڑی۔ عموماً ان کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کرتہ اور پاجامہ ایک خاکی پتھر سے رنگ کر مثل موجودہ ملیشیا کے رنگ کا استعمال ہوتا تھا۔ وہ کرتے اور پاجامے اب ناپید ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ قمیص اور موجودہ پاجامہ نے لے لی۔ کپڑا اکثر بازاری ہے اور رنگ دار۔ اب بھی گاہ گاہ پرانی طرز کا کرتہ اور پاجامہ نظر آجاتا ہے۔ لیکن وہ پگڑی غائب ہے۔ کچھ وقت پہلے کلاہ زری یا سادہ اور لُنگی سوتی پشاوری کا رواج تھا۔ بعد میں ٹوپی اور اب ننگے سر رہنا عام شیوہ ہو رہا ہے۔

شادی، رسومات

زمانہ قدیم میں عموماً بچوں کی چھوٹی عمر ہی سے منگنی کر دی جاتی تھی اور نشانی کے طور پر معمولی سا ایک زیور اور ایک جوڑا کپڑے دے دئے جاتے تھے۔ دادی، نانی یا ماں اپنی حسب مرضی یہ ناطہ کرا دیتی تھی۔ یہ عموماً اپنے خاندان کے اندر ہوتا تھا۔ باہر سے ناطے جوانی کے وقت میں کئے جاتے تھے۔ اب بچپن میں نسبت کر دینے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس سے بہت سے جھگڑے اور فساد خاندان کے اندر پیدا ہوتے رہتے تھے۔

پہلے زمانے میں لڑکیاں اپنے جہیز کے لئے کپڑے مثلاً کُرتے۔ پاجامے (ستھنیں) دوپٹے، لحاف توشک (تلائی) گھر ہی میں بناتے تھے۔ چرخہ کاتنے کا عام رواج تھا۔ لڑکیوں کا ضروری مشغلہ چرخہ کاتنا اور اپنا جہیز (داج) تیار کرنا ہوتا تھا۔ دوپٹے اور قمیص پر کرم اور ریشم کا کام بہت محنت سے کیا جاتا تھا۔ پاجاموں میں ریشم کی کناری ڈالی جاتی تھی۔ ٹوپیوں، سرہانے کے غلافوں پر بھی ریشم کا کام کیا جاتا تھا۔ بچی کو نیا گھر بسانے کے لئے سب ضروری قسم کا گھریلو سامان حتیٰ کہ سوئی تک دی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ لوازمات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اب کپڑے اور دیگر سامانِ خانہ داری بازار سے لئے جانے لگے ہیں۔ اور اخراجات بھی زیادہ کر لئے گئے ہیں۔ جہاں پہلے دو دو لحاف تلائی (میاں بیوی دونوں کے لئے) دئے جاتے تھے وہ آہستہ آہستہ یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ اب بیس بیس لحاف و توشک دئے جانے لگے ہیں۔ جو کبھی بھی استعمال میں نہیں آتے۔ تقریباتِ شادی۔ پر دولھا والے اپنے گاؤں کے سب مردوں اور عورتوں کو کھانا کھلایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اخراجات کی زیادتی سے یہ روٹی محلہ وار ہوئی۔ اور اب اپنے خاندان تک محدود ہو گئی ہے۔ لڑکی والے صرف اپنے خاندان کی

مستورات اور لڑکی کی سہیلیوں کو بھی روٹی دیتے ہیں جس کا خرچ دولھا والے برداشت کرتے ہیں۔

شادی سے دو تین روز پہلے لڑکی کو الگ بٹھا دیتے ہیں جس کو مائیاں کی رسم کہتے ہیں۔ شادی کے مقررہ دن پر لڑکا اپنے خاندان کے افراد اور دوست آشنا کو جمع کر کے بطور برات لڑکی کے گھر جاتا ہے لڑکے کو سہرا بندھوا کر اور گھوڑی پر سوار کر کے لے جاتے ہیں۔ سہرا اسکی بہنیں یا دوسرے قریبی رشتہ داروں کی لڑکیاں باندھتی ہیں۔ برات روانہ ہونے سے پہلے لڑکے کے والد کو اپنے رشتہ دار اور دوست بطور امداد نیندرہ (نیوتہ) دیتے تھے۔ گزشتہ زمانہ میں یہ ایک روپیہ فی کس ہوتا تھا۔ اس سے لڑکے والوں کو بروقت امداد ہو جاتی تھی۔ اور دینے والے پر بوجھ بھی نہ تھا۔ نیندرہ کی فہرست رکھی جاتی تھی۔ اور یہ نیندرہ دینے والوں کے لڑکوں وغیرہ کی شادی پر ادا کر دیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ سادہ رسم ظاہرداری کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئی۔ یعنی لوگوں کو دکھاوے کے لئے پانچ دس بیس اور سو روپیہ تک دینا شروع کر دیا۔ اتنی رقم دینے والے اور لینے والے دونوں کے لئے بوجھ بنی۔ ادائیگی نہ ہو سکی۔ اور یہ رسم ختم ہی ہو گئی۔ اس رسم کے موافق اور مخالف دلائل معاشرہ کے اہل الرائے میں پائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ شادی کے مصارف کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ دلیل وہاں درست ہے جہاں برادری کے تمام ارکان کو مالی لحاظ سے قریباً مساوی پایا جائے۔ اگر ایک تنگ دست ہو اور دوسرا بڑا مالدار ہو اور "نیندرہ" کی رقم مقررہ ہو تو غریب آدمی گھاٹے میں رہتا ہے۔ دوسرا اہل شرع اس رسم کے خلاف یہ سنگین دلیل پیش کرتے ہیں کہ نیندرہ ایک لحاظ سے قرض ہے۔ اور قرض کا لمبی مدت تک رہنا نجات اخروی کے لئے خطرناک ہے۔ برات کے ساتھ عموماً ڈھول تماشے ہوتے ہیں۔ پہلے پہلے شادی کے دن لڑکی والے کے گاؤں میں جوانوں کا مرغوب کھیل "تنتی" کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا۔ اور اب بھی کبھی کبھار یہ منظر دیکھنے میں آجاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں لوگ براتیوں سے بندوق کی نشانہ بازی کرایا کرتے تھے جس کو ٹمس مارنا کہتے تھے۔ اس کھیل کود کے خاتمے پر نکاح خوانی ہوتی تھی۔ اور کچھ شیرینی تقسیم کی جاتی تھی۔ مثلاً گڑ، بتاشے یا شکر۔ برات ۲، ۳ بجے دن اپنے گھر سے روانہ ہوتی تھی اور سرِ شام دُلہن کو اپنے گھر لے آتے تھے۔ ڈولی لڑکی والے، دولھا کے گھر پہنچاتے تھے۔ جس کو عموماً بھائی اور قریبی رشتہ دار اٹھا کر لے جاتے تھے۔ اور کچھ مزدور بھی ساتھ ہوتے تھے۔ اب تو موٹر میں برات لے جانے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ ہر قوم میں یہ رسومات الگ ہوتی ہیں اس ضمن میں قوم صواتی کی برات کی رسم بہ الفاظ علی اصغر خان صاحب ایڈووکیٹ ساکن سفیدہ تحصیل مانسہرہ (مقیم مردان) یہ تھی:" جب کوئی برات (جنج) آتی تو لڑکی کی طرف کے لوگ ان سے لڑائی کرتے تھے۔ یہ لڑائی بندوق سے نہیں بلکہ پتھروں سے ہوا کرتی تھی اور بعض اوقات شدید زخمات پہنچ جاتے تھے۔ اور اموات بھی واقع ہو جاتی تھیں۔ پھر مُلّا اور سیّد لوگ صلح کرا دیا کرتے تھے۔

اس کے بعد ایسا وقت آیا کہ جب تک جانجی (براتی) کسی اونچے درخت کے اوپر ایک بانس کے سرے پر باندھی ہوئی کٹوری کو بندوق کا نشانہ نہیں بناتے تھے ڈولی (دُلہن) نہیں دی جاتی تھی۔ بعد میں یہ رواج ہو گیا کہ ایک گہری چوبی کیل گاڑ دی جاتی تھی اور گھوڑ سوار جب تک نیزہ بازی کر کے اکھاڑ نہ لے جاتے، ڈولی نہ دی جاتی تھی۔

ان رسومات سے اس تھیوری کی تصدیق ہوتی ہے کہ زمانہ قدیم میں شادی کے لئے لوگ ہجوم کر کے لڑکی کو دوسرے قبیلوں سے بھگا لیا کرتے تھے۔ اس ہجوم میں جنگ و جدل ہوتا تھا۔ اس کے آثار قوم صواتی کی اس رسم قدیم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور پھر شادی کے لئے جنج۔ بہت سے لوگوں کے ہجوم کا لڑکی کی ڈولی لانے کے لئے جانا اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ زمانہ قدیم کی یلغار کی ایک تہذیب شدہ شکل ہے۔

غمی۔ تقریبات علاج بیماری

بیمار ہونے پر پہلے زمانہ میں لوگ دَم، درُود اور گٹ وغیرہ کرواتے تھے۔ مقبروں اور زیارتوں پر جاتے تھے۔ یا پرانے ٹوٹکے ٹونکے اور دیسی ادویہ استعمال کرتے تھے۔ یا یونانی دوائیں۔ انگریزی عملداری کے بعد سے انگریزی ادویہ کا استعمال شروع ہوا۔ اور اب آہستہ آہستہ اکثریت اس علاج پر کاربند ہو گئی ہے بیمار پرسی۔ دیہات میں بیمار پرسی کا رواج تکلیف دہ حد تک زیادہ ہے۔ لوگ بات بات پر جمع ہوتے ہیں۔ مستورات گھر میں ہجوم کرتی ہیں۔ یہ ایک رسم رہ گئی ہے۔ رُوح غائب، نہ تقاضا ہمدردی ہے اور نہ امداد کا جذبہ۔ زیادہ تر مجلس آرائی اور تماشہ بینی ہے۔ بیمار اور گھر والوں کے لئے مستقل عذاب۔ بیمار کی بیماری سر پر اور ان بیمار پرسی کرنے والوں مردوں اور عورتوں کی مزاج پُرسی اور خدمت گردن پر۔ ان دونوں کو اٹھانا ایک مصیبت کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ موت۔ موت پر کئے نقصان مابہ و دیگر شماتت ہمسایہ والا قصہ ہے۔ غریب ہو۔ امیر ہو۔ فارغ البال ہو۔ مقروض ہو اس کو "سوکی روٹی" اور اسقاط (مُردے کی تکفین و تدفین پر غریبوں اور ملاؤں کو نقدی حسب استطاعت برائے معافی گناہ تقسیم کرنا) اور اب تو مٹھائی بہ قدر حیثیت، گڑ، چھوہارے یا کشمش کی بوری بھی ساتھ جاتی ہے۔ مُردے کو دفن کرنے کے لئے گھر سے اٹھایا نہیں جاتا جب تک چاول پک کر تیار نہ ہو جاویں۔

اِدھر میت اٹھائی جاتی ہے اور اُدھر مخلوق روٹی پر ٹوٹ پڑتی ہے اس کا انتظام اتنا فوری اور ہنگامی ہوتا ہے کہ وارثانِ میت مدتوں تک زیر بار قرض رہتے ہیں ۔ لیکن یہ سب خرچ ناک رکھنے کے لئے ضروری ہے ۔ میت کی تدفین میں دیر ہو جائے تو خیر لیکن خیرات کی روٹی تیار ہونے پر ہی اس کو دفن کیا جائے گا ۔ اس رسم کی تکلیف کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو جائے گا ۔ ایک دفعہ میرے گاؤں میں ایک شخص فوت ہوا ۔ دُور دور سے لوگ جنازہ کے لئے جمع ہوئے ۔ بہت وقت گزر گیا لیکن میت اٹھائی نہ گئی ۔ جرگے کے لوگوں کے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ جلدی کرو ۔ دیر ہو رہی ہے لوگ دُور دُور سے آئے ہوئے ہیں ان کو واپس بھی جانا ہے ۔ جب یہ اصرار بہت بڑھنے لگا تو میت کا وارث جب اس مجلس میں آیا تو لوگوں نے اُسے کہا کہ اب دیر کیوں ہو رہی ہے ۔ اس نے تنگ آ کر کہا " جنازہ بھی تیار ہے ۔ قبر بھی تیار ہے ۔ لیکن کُفر تیار نہیں " یعنی ابھی تک خیرات کی روٹی تیار نہیں ہے ۔ اور اس کے تیار ہوتے ہی میت دفن کرنے کے لئے لے جائی جا سکتی ہے "

تقسیم وراثت

سب اقوام ہزارہ میں میرے علم کے مطابق تقسیم وراثت بروئے شریعت نہ تھی ۔ بلکہ بروئے رواج تھی ۔ بعد ۱۹۳۶ء سے بعد جب کہ قانونِ شریعت اس صوبہ میں رائج ہوا تو پھر تقسیم از روئے شریعت ہونے لگی ۔ لیکن پھر بھی لڑکیوں کو کسی نہ کسی بہانے سے وراثت ۔ جائداد غیر منقولہ سے محروم ہی رکھا جاتا ہے ۔ خاص کر پٹھانوں میں ۔

قوم پنی میں تقسیم رواج پر تھی ۔ شریعت نافذ ہونے کے باوجود بھی اس پر عمل درآمد کم ہی ہوتا ہے

قوم پنّی کے مرغوب مشغلے اور کھیلیں

میں اپنی قوم کے مشغلوں اور کھیلوں کو تفصیل سے بیان کر رہا ہوں ۔ اسی سے تمام ضلع پر قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ میری قوم اور اسی سے تمام ضلع ہزارہ کی اقوام بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہی ہیں ۔ اگرچہ پہاڑی اقوام کا مال بھیڑ بکری کی پرورش بنیادی پیشہ ہے ۔ زراعت پیشہ اقوام ہل چلانے اور دیگر مردانہ کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں ۔ ان کے شغل کے متعلق ایک روایت اُن کی عادت کی ترجمانی کرتی ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ کسی شخص نے ایک زمیندار پٹھان کو بحث و تکرار میں طعنہ دیا کہ چپ رہو ۔ میں نے تم کو دیکھا ہوا ہے ۔ اس نے جواب دیا کہ کیا دیکھا ہوا ہے ۔ تم نے مجھ کو دو ہی حالتوں میں دیکھا ہو گا ۔ ہل چلاتے یا گھوڑے پر

سوار ۔ زمانہ ماضی میں زندگی بہت سادہ تھی ۔ غلہ اور کپڑا لوگ اپنی کاشت اور محنت سے پیدا کر لیتے کرتے تھے ۔ اور یہی دو بنیادی ضروریات ہیں لہٰذا ان کو فراغت اور فرصت بہت ملتی تھی ۔ اس فرصت میں بچے ۔ جوان اور بوڑھے اپنے حسب حال کچھ نہ کچھ کھیل اور شغل میں وقت گزارتے تھے ۔ لیکن موجودہ زمانہ میں زندگی کی مصروفیات بہت زیادہ ہو گئی ہیں ۔ بالفاظ دیگر معاشی زندگی کے لئے سخت کوشی بڑھ گئی ۔ اور فرصت کے اوقات ہی میسر نہیں ہوتے ۔ لہٰذا وہ پرانے کھیل اور مشغلے ہر طبقہ سے تقریباً ختم ہو گئے ہیں ۔ پرانے زمانہ کے جتنے کھیل وغیرہ تھے وہ سب لوازمات سامان سے عموماً مبرّا تھے ۔ لہٰذا آسانی سے ہر جگہ ، گاؤں اور قریہ میں کھیلے جا سکتے تھے ۔

۱ ۔ اخروٹ اور ریٹھے کھیلنا ۔ اب یہ کھیل متروک ہوتے جا رہے ہیں ۔

۲ ۔ لنڈوکے ۔ یہ اب بالکل ہی متروک ہو گیا ہے ۔ اس میں آمنے سامنے دو پارٹیاں کھیلا کرتی تھیں دائیں ٹانگ کو اٹھا کر اس پاؤں کو دوسری ٹانگ سے پیچھے لے جا کر بائیں ہاتھ سے اس کے انگوٹھا کو پکڑ لیتے تھے ۔ اور ایک ٹانگ پر چھلانگ لگا کر دوڑتے تھے ۔ اور بالمقابل کو کھلے ہاتھ کی ہتھیلی سے دھکے دے کر گرانے کی کوشش کرتے تھے ۔ گویا یہ بدن کا توازن قائم رکھنے کی پریکٹس ہوتی تھی ۔

۳ ۔ کر مکریا ۔ ایک لڑکا دوسرے لڑکے کی گود میں سر رکھ کر زمین پر لیٹ جاتا تھا ۔ بیٹھا ہوا لڑکا اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بند کر دیتا تھا ۔ پھر باقی لڑکے ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ سے اس کی ٹانگوں پر سے ایک طرف سے دوسری طرف پار ہوتے تھے ۔ بیٹھا ہوا لڑکا آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے لیٹے ہوئے لڑکے سے سوال کرتا تھا " کر مکریا ، کون کریا " یعنی بتلاؤ اب تمہاری ٹانگوں پر سے کون گزرا ہے لیٹا ہوا لڑکا صرف انداز رفتار اور پاؤں کی آواز اور دوسرے حرکات و سکنات سے گزرنے والے لڑکے کا نام لیتا تھا ۔ جب تک وہ نہ بتلا سکتا تھا لڑکے اسی طرح باری باری سے گزرتے رہتے تھے ۔ جب وہ کسی لڑکے کا نام صحیح بتا دیتا تو اب وہ لڑکا اس کی جگہ لیٹ جاتا ۔ اور پھر یہ کھیل اسی طرح شروع ہوتا ۔ اس میں حواس سے شناخت کرانے کی پریکٹس کی جاتی تھی ۔ یہ بھی اب متروک ہو چکا ہے ۔

۴ ۔ آڑیا آڑیا ۔ یہ ایک دلچسپ کھیل تھا جو اب ختم ہو گیا ہے ۔ اس میں لڑکے دو پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے تھے ۔ اور ایک دوسرے سے دس پندرہ گز کے فاصلہ پر دیواروں کی اوٹ میں اپنا پرا نمبروار جماتے تھے ۔ جب دونوں پرے نمبروار کھڑے ہو جاتے تو ان کے لیڈر اپنی کمان بدل لیتے مثلاً دو پارٹیاں الف اور ب کی ہیں ۔ الف دوسری طرف جا کر ب پارٹی کی نگرانی کرتا اور ب جا کر الف پارٹی کی ۔ الف والا اس طرف سے اپنی پارٹی کے فرد سے جو نمبر اول پر کھڑا ہوا تھا آواز دیتے

پوچھتا " آڑیا آڑیا ، آڑے دا نام کیا " یعنی اے ساتھی ادھر کے ساتھی کا جو تمہاری نمبر کا ہے ۔ پر کھڑا ہے۔ کیا نام ہے ۔ وہ نام اگر صحیح بتا دیتا تو الف اپنی پارٹی کو آواز دیتا ۔ کہ آؤ سوار ہو جاؤ ۔ یہ سب دوسری طرف دوڑ کر جاتے اور بالمقابل والے گروہ کے پیٹھوں پر سوار ہو کر پھر اپنی جگہ واپس آجاتے ۔ اور پھر کھیل شروع ہو جاتا ۔ جب کبھی آواز پر نام صحیح نہ بتلایا جا سکتا تو نام بتلانے والے کو اپنا لیڈر آواز دیتا کہ تمہارا ساتھی جس کا تم نے نام لیا ہے وہ اول نمبر پر نہیں بلکہ تیسرے نمبر پر ہے لہذا تم بھی دو سے پیچھے ہو جاؤ ۔ ہر ایک لیڈر باری باری یہی آواز دیتا ۔ غلط ہونے پر آواز والا بھی اسی نمبر پر چلا جاتا جس پر بتلایا ہوا آدمی ہوتا ۔ یہ کھیل اسی طرح سے جاری رہتا ۔ اور آخر کار دماغی تربیت اور حسابی قواعد کا سکھلانے والا ثابت ہوتا تھا ۔ یہ کھیل بھی اب ناپید ہے ۔

۵ ۔ چھپن چھوت ۔ اس میں سب بچے چھپ جاتے تھے ۔ اور ایک بچہ اُن کو تلاش کرتا تھا ۔ جس کسی کو تلاش کے ہاتھ لگا (چھوت) لیتا تھا ۔ پھر وہ دوسروں کو تلاش کرتا تھا ۔ اور اسی طرح یہ کھیل دیر تک جاری رہتا تھا ۔

لڑکیوں کے کھیل

بچپن میں لڑکیاں ، گڈی گڈا کا کھیل کھیلا کرتی تھیں ۔ اس میں سب معاشرتی امور اور خانہ داری کے اطوار عملاً سکھائے جاتے تھے ۔ گڈے گڈیوں کے شادی بیاہ ، وغیرہ سب امورات عملاً ایکٹ کئے جاتے تھے ۔ یہ ایک قسم کی عملی تعلیم تھی ۔ جس سے بچیوں کو آئندہ گھریلو زندگی کے لئے تیار کرنا مقصود تھا ۔

جب عمر بارہ تیرہ سال سے زائد ہو جاتی تھی تو اُن کو چرخہ کاتنے کے لئے دیا جاتا تھا ۔ اس طرح سے ایک معاشی ضرورت یعنی کپڑا ہر گھر میں تیار کر لیا جاتا تھا ۔ اس کام کو دلچسپ بنانے کے لئے لڑکیاں ایک جگہ جمع ہو کر چرخہ کاتتی تھیں ۔ اور کاتنے میں مقابلے بھی ہوتے تھے ۔ اور ساتھ ہی ساتھ تھکان اُتارنے کے لئے وقفہ آرام میں ناچ اور گانا بھی کر لیا جاتا تھا ۔ کام کا کام اور کھیل کا کھیل ۔ اور اس میں ایک دوسرے سے مسابقت ۔ یعنی ٹورنمنٹ کی صورت ہوتی تھی ۔

پینگ جھولنا ۔ عید کے موقعوں پر لڑکیاں عام طور پر ایک جگہ کسی گھر میں ، گاؤں سے باہر (یا شہر میں قبرستان میں) بڑے درخت میں جھولا لٹکا کر جھولا کرتی تھیں ۔ اس جھولے پر (پینگ پر) ایک ایک اور دو دو لڑکیاں کھڑی ہو کر زور زور سے جھولا کرتی تھیں ۔ اور ایک دوسرے سے جھولا زیادہ اونچا لے جانے پر مقابلہ ہوا کرتا تھا ۔

کشیدہ کاڑھنا ۔ بچیوں اور پھر لڑکیوں کو کپڑوں پر ریشم سے پھول بنانے کی عملی تعلیم کا کام

دیا جاتا تھا ۔ یہ کام تقریباً ضلع کے ہر گوشہ میں کیا جاتا تھا ۔ اور بہترین صنعت شمار ہوتی تھی ۔ اور اب آہستہ آہستہ یہ صنعت کم ہوتی جا رہی ہے ۔ اس کی جگہ مشینی اور ولایتی کپڑے نے لے لی ہے ۔

چکی ۔ عموماً گزشتہ زمانہ میں گھر کے لئے روزانہ آٹا گھر ہی میں چکی پر پیس لیا جاتا تھا اور یہ کام لڑکیاں اور عورتیں مل کر کیا کرتی تھیں ۔

اقتصادی اور صحت جسمانی کے لحاظ سے یہ مفید تر مشغلہ تھا ۔ اس کی جگہ مدت ہوئی پن چکیوں نے لے لی تھی اور اب مشینوں سے کام لیا جاتا ہے ۔

جوان لڑکوں کے کھیل

۱ ۔ پہلے زمانہ میں جوان لڑکے اور متوسط عمر کے آدمی ایک بڑے ٹورنامنٹ کی شکل میں اخروٹ چرخی کے ذریعے کھیلتے تھے ۔ طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک حجرے کے صحن میں ایک معمولی سا گڑھا کھودا جاتا تھا ۔ اس میں چار پانچ سو کے قریب اخروٹ ڈال دئے جاتے تھے ۔ اس کے گرد ایک دائرہ چار پانچ کھیلنے والوں کا چھ فٹ نصف قطر کا بنایا جاتا تھا ۔ پھر کھیلنے والے اس دائرے کی لکیر پر کھڑے ہو کر چاروں طرف سے ایک لکڑی کی چرخی تقریباً بارہ انچ قطر اور ایک انچ موٹی سے مار کر ان اخروٹوں کو گڑھے سے باہر نکالتے تھے ۔ اور یہ کھیل کافی وقت تک جاری رہتا جب تک سب اخروٹ باہر نکال دئے جاتے ۔ یہ کھیل اب بالکل معدوم ہو چکا ہے ۔

۲ ۔ پینگ کا شغل بھی بڑے لڑکے کبھی کبھار کرتے تھے اب یہ نابود ہو گیا ہے ۔

۳ ۔ تتی ۔ یہ کھیل سب میدان ہزارہ میں بہت مقبول عام اور جوانمردانہ سمجھا جاتا تھا ۔ اس کھیل میں طاقت پھرتی اور ہنر کا مظاہرہ ہوتا تھا ۔ پہلے زمانہ میں تو بوجہ فارغ البالی اس کا چرچا بہت عام تھا ۔ لیکن اب بھی یہ کھیل وقتاً فوقتاً کھیلا جاتا ہے ۔ دور سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں ۔ اس کھیل میں سب نوجوان کپڑے اتار دیتے ہیں ۔ اور صرف ایک مختصر سا لنگوٹہ باندھ لیتے ہیں شوقین کھلاڑی اس لنگوٹے پر ریشم کا کام کرواتے ہیں اور بعض تو چھوٹے چھوٹے گھنگرو بھی اس پر لگواتے ہیں ۔ کھیل کے لئے دو پارٹیاں بن جاتی ہیں ایک پارٹی پہلے ایک ایک کھلاڑی کو باری باری سے میدان میں بھیجتی ہے ۔ دوسری پارٹی دو کھلاڑی اس کو پکڑنے کے لئے بھیجتی ہے ۔ پہلا کھلاڑی دوڑ کر میدان کے درمیان چلا جاتا ہے ۔ اس کو پکڑنے والے اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں ۔ کھیل میں تیز دوڑنا اور پکڑنے والوں کو تھپڑ مارنا ہوتا ہے ۔ اگر آگے بھاگنے والا ان دو میں سے کسی ایک کو تھپڑ لگا کر

بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجائے تو وہ جیت جاتا ہے .... پکڑنے والوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دونوں یک جا اس کے گرد ہو جائیں اور بھاگنے والے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اِن دونوں کو جدا کر کے ایک کو تھپیڑ رسید کر کے بھاگ جائے۔ پکڑنے والے اپنے خاص داؤں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ۱۔ ببینی (کلائی) پکڑ لینا یعنی تھپیڑ مارے جانے والے کے ہاتھ کو اپنی چھاتی پر دونوں بازوؤں سے مضبوط باندھ لیتے ہیں یا ۲۔ دور سے ایسی چھلانگ لگاتے ہیں کہ اپنی دونوں ٹانگوں سے بھاگنے والے کی ایک ٹانگ جکڑ لیتے ہیں۔ اور وہ گر جاتا ہے۔ اسے قینچی مارنا کہتے ہیں (نوٹ) اس کھیل میں علی بہادر خان ولد غلام حیدر خان پنی ساکن پنیاں اور خان بہادر خان ساکن بھیرہ اپنے وقت میں مشہور رہے)

۳۔ ایسے بھی ہوتا ہے کہ دونوں پکڑنے والے اس کو پکڑ کر گرا بھی لیتے ہیں۔ ہار جیت کا فیصلہ پکڑ لینے یا نہ پکڑے جانے پر کیا جاتا ہے۔ ۴۔ گتکہ اور پہلوانی۔ یہ دو مشغلے مضبوط اور دلیر جوانوں کے تھے۔ اِن کا رواج زمانہ قدیم میں بہت زیادہ تھا۔ اس فن کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ پنیاں میں امیر خان ولد عبدو خان۔ منیر خانی پہلوانی کے فن میں وقت کا استاد تھا۔

گتکہ ایک قسم کا پرانا فنِ حرب تھا۔ اور تلوار زنی کے لئے مشق تھی۔ اب یہ دونوں ہزارہ سے تقریباً معدوم ہو چکے ہیں۔ ۵۔ بٹی اٹھانا۔ یہ کھیل شہ زوری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ حجروں میں گول گول پتھر جو دو من کے قریب یا زیادہ وزن کے رکھے ہوتے تھے۔ اِن کو اٹھایا جاتا تھا۔ جو شخص چھاتی سے دور رکھ کر ان کو اٹھا کر سر سے اوپر لے جاتا وہ شہ زور مانا جاتا تھا۔

قوم پنی کے چند نامور افراد

۱۔ حبیب خان و جہانداد خان پسران امیر خان بن عبدو خان (منیر خانی) اپنے وقت کے بہادر انسان تھے۔ گاؤں میں ان کے رعب و داب کا ڈنکہ بجتا تھا۔ حبیب خان کا ایک بیٹا خواجہ محمد خان، باپ کی طرح دلیر اور قوم پرور انسان تھا۔ انٹرنس تک تعلیم تھی۔ نائب تحصیلدار رہا۔ قوم و خاندان کے لئے باعث عزت و فخر تھا۔ مگر افسوس جوانی ہی میں (۱۹۳۶ء) میں لاولد فوت ہوا۔

۲۔ علی بہادر خان پسر غلام حیدر خان پنی شاہنوازی اثر و رسوخ والا انسان تھا۔ بتی کے کھیل کا نامور جوان تھا۔ افسوس ۴۱-۱۹۴۰ء میں لاولد فوت ہوا۔

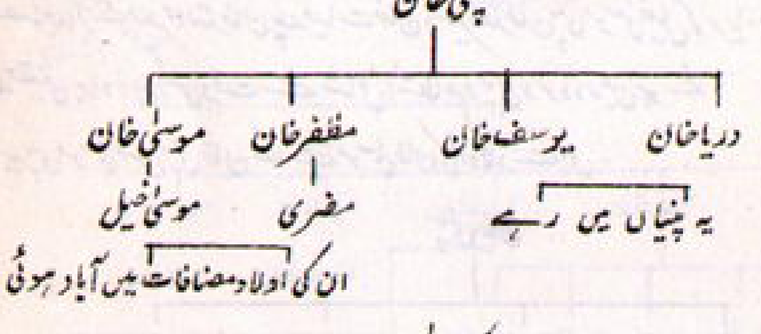
۳۔ رسالدار فیض اللہ خان۔ بٹی (قوم پنی) کا نامور شخص تھا۔ تعلیم کچھ نہ تھی۔ مگر اپنی ہمت و کارکردگی سے فوج میں رسالدار ہوا۔ قوم اور خاندان کے بہت سے جوان بھرتی کرائے۔ حرکت قلب بند ہونے سے ۱۹۲۰ء میں فوت ہوا۔

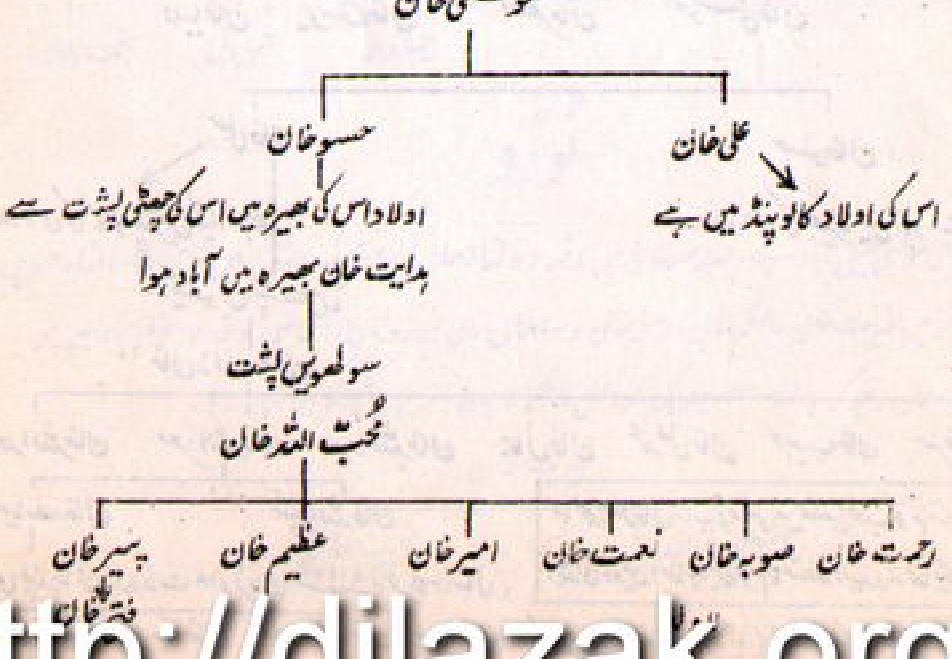
۴۔ داؤد خان پسر فیروز خان منیر خانی، مشہور انسان تھا۔ اس کا حجرہ بر لب سڑک موضع پنیاں مسافروں کی پناہ گاہ تھا۔ اس کا والد بزرگوار فیروز خان بہت دانا انسان تھا۔

۵۔ کرم خان المعروف کما منڈا بھنگی کمال خانی بہت بہادر انسان تھا۔ مقدم مشرف گوجر کا ہم عصر اور رفیق تھا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مقدم مشرف کے کارہائے نمایاں کرم خان کی امداد و رفاقت کی وجہ سے تھے۔

موضع بھیرہ

پنی موسیٰ خیل اور مضری آباد ہیں۔ بموجب کاغذات بندوبست ۱۸۷۲ء کے بیان کے مطابق عرصہ چار سو سال یعنی ۱۴۷۲ء میں نعمت خان پٹھان پنی مضری اور ہدایت، خان موسیٰ خان نے موضع پنیاں سے اٹھ کر اس گاؤں کے رقبہ پر جو بے تردد پڑا تھا دخل پایا اور آبادی شروع کی۔





عظیم خان

عبد اللہ خان — عطا محمد خان (لاولد)

یعقوب خان — سردار بہادر خان (لاولد)

سردار بہادر خان: یہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا اور مانسہرہ میں فوت ہوا

غیور خان — فضل الرحمن — محمد ایوب خان

موضع کالوپنڈ

اس گاؤں کی آبادی سے پہلے کالو نام زمیندار یہاں کاشت کرتا تھا۔ اس کے نام سے گاؤں کا نام کالو پنڈ مشہور ہوا۔ یہ گاؤں رقبہ پہاڑو میں ہے۔ عملداری سکھاں میں سردار ہری سنگھ نے رقبہ پہاڑو سے تیسرا حصہ جدا کر کے معز اللہ خان پدر حیات خان و شیر اللہ خان بہنی موسیٰ خیل کو دیا۔ سعد اللہ خان و عبد اللہ خان اس کے حقیقی برادران اسی وقت سے شامل انتظام دیہی و تردد زمین ہوئے۔

یہ بہنی موسیٰ خیل بہنی خان کے بیٹے موسیٰ خان کی اولاد سے ہیں۔

بہنی خان

دریا خان — یوسف خان — مظفر خان — موسیٰ خان

موسیٰ خان

علی خان (اولاد اس کی کالوپنڈ میں آباد ہے) — حسو خان (اولاد اس کی بھیرہ میں آباد ہے)

انیسویں پشت میں

خان زادہ خان

سعد اللہ خان — معز اللہ خان — بید اللہ خان — جمال خان — محمد علی خان — حبیب خان — سرفراز خان

معز اللہ خان: حیات خان — شیر اللہ خان

حاجی بلند خان (وفات ۱۸ فروری ۱۹۶۹ء بعمر ۷۰ سال)

محمد اسلم خان — تو جب خان — مصاحب خان (عہدہ سب انسپکٹر پولیس سے پنشن پر آیا) زمیندارہ کا شوقین اور بڑا اکارکن انسان ہے۔

محمد اسلم خان سب قوم بہنی میں مخلص محب قوم شریف انسان ابتدائی دو تین انتخاب میں قوم کا متفقہ امیدوار تھا لیکن ہارتا رہا۔

پہاڑو

پہاڑ خان نے آباد کیا۔ قوم موسیٰ خیل بہنی آباد ہے۔ یہ کالو پنڈ سے پرانی آبادی ہے۔

قوم پٹھان بہنی موسیٰ خیل

پہاڑ خان

سلیم خان

رحیم خان

سعد اللہ خان — نعیم خان

نعیم خان

آٹھویں پشت میں

سعد اللہ خان

عبد اللہ خان — مصری خان

چھٹی پشت

امیر خان

چمن خان — مہر خان — احمد خان — منیر خان — عبدو خان (لاولد)

چمن خان: میرزمان خان، مظفر خان

مہر خان: لعل خان، یعقوب خان، یوسف، بلاور خان، غفور خان

منیر خان: وارث خان

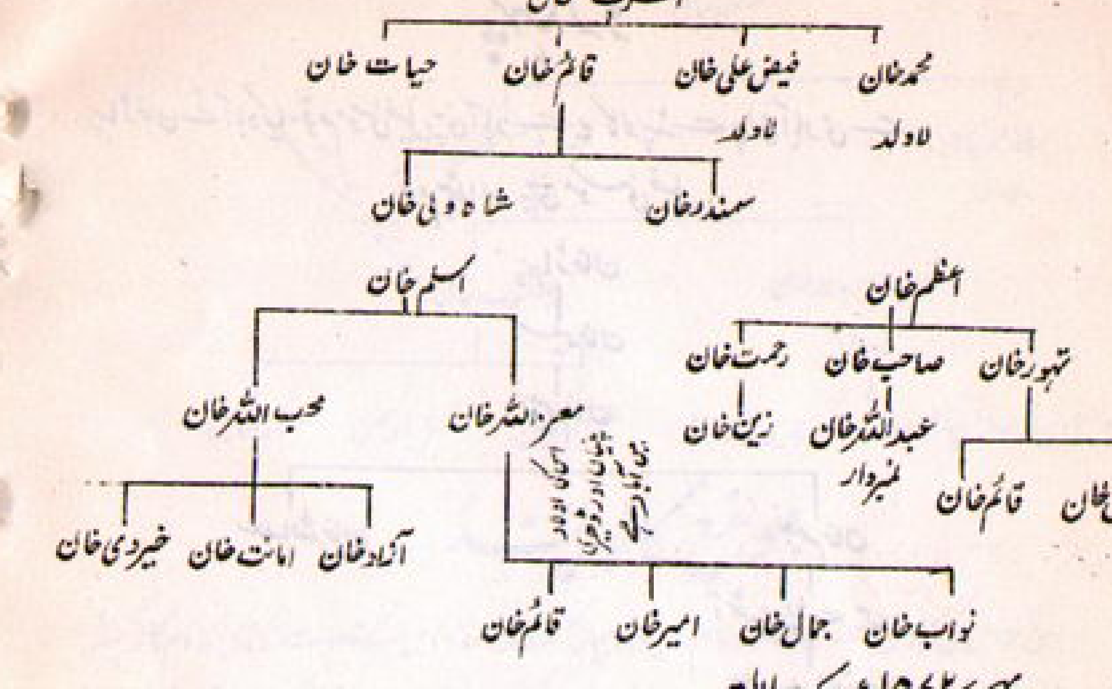
احمد خان: جہانداد — شیر دل — بخت خان

لوڈو

قوم بہنی موسیٰ خیل آباد ہے۔ عہد مسلمانی میں رقبہ دولتا (حال کوٹ نجیب اللہ) میں شامل تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں غیرت خان، اعظم خان، اسلم خان و سلطان خان مورثان اشخاص موجودہ قوم پٹھان بہنی موسیٰ خیل نے اس رقبہ کو دولتا سے جدا کر کے دخل مالکانہ پایا۔ ترینوں کا عمل حاکمانہ رہا۔

غیرت خان

اشرف خان — نجیب خان



صورت دیہی ۱۸۷۲ء کے مطابق :-

عملداری مسلمانی میں اول رقبہ دیہہ ہذا شامل موضع دولتا کے تھا جو اس وقت ویران ہے - اور اس کی بجائے کوٹ نجیب اللہ آباد ہوا ہے - وقت ویرانی دولتا کی جس کو عرصہ ایک سو برس سے زائد گزرا ہے - غیرت خان و اعظم خان و اسلم خان و سلطان خان مورثان ہم قوم پٹھان پنی کاکڑ موسیٰ خیل نے اس رقبہ کو دولتا سے جدا کر کے دخل مالکانہ پایا - اور منیر خان مورث ہم قوم پٹھان پنی کاکڑ نے بھی اسی وقت بذریعہ تردد زمین دخل مالکانہ حاصل کیا -

قبل از دخل ہمارے مورثان کے گاؤں آباد نہ تھا - ہمارے مورثان نے گاؤں آباد کیا جب سمندر خان درانی نے بہ سبب بدی حکام وقت کے اکثر دیہات ہزارہ کو جلا دیا تب یہ گاؤں بھی جل گیا تھا - چند روز کے بعد ہمارے بزرگوں نے آکر آباد کر لیا - دوسری دفعہ شورش مولراج میں بھی یہ گاؤں ویران ہوا - مگر زیادہ دیر ویران نہیں رہا - دو تین روز کے بعد ہمارے بزرگ آکر بدستور آباد ہو گئے -

وجہ تسمیہ معلوم نہیں پرانا نام ٹوڈر مشہور چلا آتا ہے -

حال مالگذاری سابقہ

عملداری مسلمانی میں بزرگان ہم قوم پنی موسیٰ خیل پیداوار زمین خود کھاتے رہے - اور حکام وقت کو معاملہ اپنے پاس سے دیتے رہے - عملداری سکھاں میں اول پٹہ ہم نمبرداروں کا ہوا - زمینداروں سے بھاؤلی لے کر

مالیہ سرکار اپنے پاس سے دیتے رہے - پھر جیون سنگھ کو یہ گاؤں جاگیر میں مل گیا - وہ بھی بھاؤلی بحصہ پنج دو لیتا رہا - اخیر عملداری سکھاں میں اس کی جاگیر ضبط ہو گئی - تو سرکار سکھان معرفت کارداران کنکوت کرا کر قیمت غلہ حصہ حاکمی ہر زمیندار سے نقد وصول کرتے رہے - شروع عملداری سرکار (انگریزی) میں اجارہ گاؤں کا بہ تعداد ایک سو پچیس (۱۲۵/-) روپیہ بنام ہم حیات خان و عبداللہ خان و جیون خان نمبرداران کے ہوا - ہم کل گاؤں سے بھاؤلی بحصہ پنج دو وصول کر کے معاملہ سرکار اپنے پاس سے ادا کرتے رہے -"

کانگڑہ

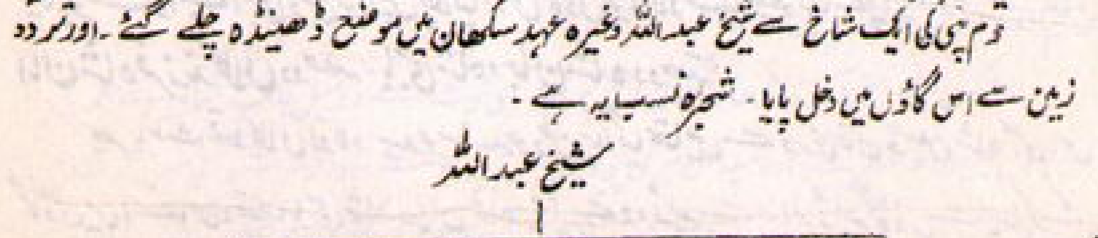
عملداری مسلمانی میں قوم پنی تارن نے دخل پایا - اور یہ گاؤں آباد کیا جب سمندر خان درانی نے اکثر دیہات ہزارہ جلائے تب یہ گاؤں بھی جلا کر ویران کر دیا - چند روز بعد پھر یہ گاؤں آباد کر لیا گیا - عہد سکھاں میں جب دیوان مولراج نے بانتقام شورش گنڈی مسلمانی اکثر دیہات ہزارہ کے جلائے تب یہ گاؤں بھی ویران ہو گیا - پھر قوم پنی نے آباد کیا - تب سے بدستور آباد ہے - بموجب صورت دیہی ۱۸۷۲ء اس میں قوم پنی تارن اور قوم تنولی مرجال آباد ہیں -

موضع گنیا

بموجب صورت دیہی ۱۸۷۲ء قوم پٹھان ترین پٹھان تارن، تنولی پلال، پٹھان سلمانی اور آوان قطب شاہی قابض ہیں -

موضع ڈھینڈہ

قوم پنی کی ایک شاخ سے شیخ عبداللہ وغیرہ عہد سکھاں میں موضع ڈھینڈہ چلے گئے - اور تردد زمین سے اس گاؤں میں دخل پایا - شجرہ نسب یہ ہے -



قوم مشوانی

تاریخ ہزارہ (بندوبست ۱۸۷۲ء)

میں اس قوم کے متعلق لکھا ہے۔ کہ یہ اپنے آپ کو حسینی سید کہتے اور اپنا مورث مشوان خان بتاتے ہیں اور اس کے نام پر مشوانی مشہور ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے عہد کے دوران یا بعد میں (دسویں صدی عیسوی) اس قوم کے دس بارہ کنبے یعنی گھر اس ملک میں آئے اور پہلے پہل اس جگہ جہاں کہ اب بھارو کا گاؤں آباد ہے آکر ٹھہرے۔ اس جگہ کے نزدیک ڈھاکہ سری کوٹ زیادہ ویران تھا اور یہ پہاڑ ملکیت قوم دلازاک کی تھی۔ اور دلازاک قوم کی آبادی اس وقت قلعہ سری کوٹ (تعمیر شدہ سرکار سکھاں) کے نزدیک موسوم بہ سانگوٹ (یا سالکوٹ) تھی۔ مشوانی قوم کے بزرگوں نے سری کوٹ کی جگہ کو دیکھا تو یہ جگہ ان کو خوش آئی۔ اور قوم دلازاک سے جو اس علاقہ کے وارث تھے اجازت لے کر جس جگہ کہ اب سری کوٹ آباد ہے۔ وہاں اپنی آبادی کی بنیاد ڈال اور آباد ہو گئے۔ لیکن صورت دیہی ۱۸۶۲ء سری کوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ عہد مسلمانی جب سلطان محمود شاہ اس ملک میں آیا۔ تو ہمراہ شاہ موصوف سید محمد گیسو دراز جد اعلیٰ کپور شاہ و محمد شاہ مورثان قوم مشوانی اس ملک میں آیا۔ بادشاہ نے اس ملک کو فتح کرنے کے بعد سید محمد گیسو دراز کو اس جگہ رہنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ بزرگ خود تو اپنے ملک کو واپس چلا گیا لیکن اپنے دو پوتے محمد شاہ و کپور شاہ کو اس جگہ چھوڑ گیا۔ انہوں نے رقبہ متعلقہ سری کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ تب سے مشوانی قوم کو اس رقبہ کی ملکیت حاصل ہے۔ دونوں بھائیوں کی تقسیم میں کنڈی محمد شاہ کے حصہ میں آئی۔ اور امر خانہ (انبار خانہ) اولاد کپور شاہ کے حصہ میں۔ اس گاؤں پر صرف شاہ مراد قابض رہا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ سید یعقوب و سید یوسف۔ سید یوسف تو اپنے اصلی وطن کو واپس چلا گیا۔ اس گاؤں کو اولاد سید یعقوب نے چار حصہ میں تقسیم کیا۔

امان شاہ فرزند کلاں دو حصہ۔ باجی شاہ و جان شاہ دو حصہ۔

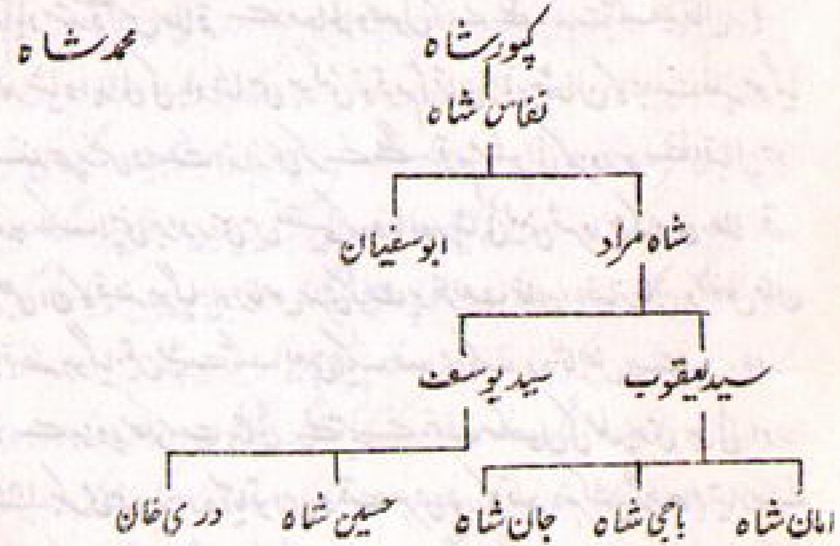
پھر باعث قحط کلاں اولاد سید یوسف جو وطن چلا گیا تھا میں سے دری خان و حسین شاہ بھی اس گاؤں میں آئے اس وقت باجی شاہ و جان شاہ نے اپنے دو ربعہ سے نصف ربعہ گاؤں سے جدا کر کے حسین شاہ کو دے دیا۔ اور دری خان کو کچھ گزارہ دے دیا۔

عہد مسلمانی میں سری کوٹ کی جگہ پر تین آبادیاں خارہ، کافرکوٹ[1] اور عثمان بانی معمورہ کا فرد کی

[1] نوٹ صہ ۲۴۳ پر ملاحظہ فرمائیے۔

تھی۔ لیکن یہ آبادی ہائے سلطان محمود کے ہمراہ مشوانیوں کے بزرگ آئے تھے، بالکل ویران کر دی تھیں ان کی جگہ پر مشوانیوں نے اپنی آبادیاں قائم کیں۔ عہد مسلمانی میں بہ باعث قحط کلاں (۱۷۸۳ء) سری کوٹ سات سال غیر آباد رہا۔ سرکار سکھاں کے وقت دو تین دفعہ ویران ہوا۔ چوتھی دفعہ جب سکھاں نے ویران کیا تو بارہ سال ویران رہا۔ پھر بہ حکم سردار ہری سنگھ ۱۸۱۹ء میں مشوانیوں نے آباد کیا۔

گاؤں کی وجہ تسمیہ۔ ڈھاکہ کے سر پر مضبوط جگہ (کوٹ) پر آباد ہونے کی وجہ سے سری کوٹ ہوا۔



لیکن اس بیان میں سلطان محمود کا نام غلطی سے تحریر کیا گیا ہے۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس ملک کی طرف آیا۔ اور سید محمد گیسو دراز چودھویں صدی عیسوی کے آخر یا پندرھویں صدی عیسوی کے شروع میں وارد علاقہ پٹھان (کابل وغیرہ) اور پھر ہندوستان میں وارد ہوئے ان کا ورود دکن میں ۱۴۰۰ء میں ہوا۔

تاریخ ہزارہ (مرتبہ واٹسن) کے بیان کے مطابق جب مشوانی سری کوٹ بہ اجازت مالکان (یعنی دلازاک) آباد ہو گئے تو تھوڑے عرصہ کے بعد دلازاک قوم کی ایک عورت مشوانی قوم کی آبادی میں کسی مشوانی کے گھر آکر غائب ہو گئی۔ اس پر دلازاک اور مشوانیوں میں فساد ہو گیا لڑائی ہوئی۔ قوم دلازاک کو شکست ہوئی اور وہ وہاں نہ ٹھہر سکے۔

دلازاکوں نے اپنی آبادی ڈھاکہ اتمان زئی پر جو سری کوٹ سے دو میل جانب شمال ہے تعمیر کی۔ لیکن وہاں بھی وہ نہ ٹھہر سکے۔ اور میدان ہری پور میں آکر آباد ہو گئے۔ اور قوم مشوانی سری کوٹ میں پوری قابض و آباد ہو گئی۔ دلازاک وسط ہزارہ میں سرائے صالح کے مقام پر پہنچ گئے اور آباد ہو گئے۔

نوٹ صہ ۲۴۲۔ بموجب تاریخ مہتاب سنگھ کافرکوٹ جو منترد اور کوکری پرانے شہر تھے۔ بگل (بمعنی گاؤں) کافرکوٹ کا نام دراج کوٹ تھا۔ اس کے نزدیک راجہ رسالو کا غار بیان تھا)

.... یہ ہجرت دلازاکوں کے لئے مفید اور سود مند ہوئی اور مشوانی آج تک دشوار گزار پہاڑ پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سری کوٹ آباد کرنے کے بعد مشوانیوں نے موضع گنڈی، اور عمر خانہ آباد کیا۔ آہستہ آہستہ کچھ مدت کے بعد قوم مشوانی کا زور ہو گیا اور وہ اس تمام علاقہ۔ اس پار سندھ کے حاکم و وارث ہو گئے۔ اور دیگر اقوام آباد شدہ اس علاقہ سے معاملہ وصول کرنے لگے۔ مدت تک یہ حال رہا۔

جب نادر شاہ و احمد شاہ ابدالی کی بادشاہی ہو گئی تو قوم اُتمان زئی پٹھان کا بہت غلبہ ہو گیا اور وہ اس پار دریائے سندھ پر بھی دست اندازی کرنے لگے۔ قوم مشوانی کمزور و بے اقبال ہو گئی۔ قوم اُتمان زئی نے یہ ملک اپنی برادری میں تقسیم کر دیا اور بٹائی لینی شروع کر دی۔ علاقہ سری کوٹ قوم مشوانی پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اور خاص سری کوٹ پر ظریف خان، اخبار خان و مقبل خان بزرگانِ قوم اُتمان زئی کا قبضہ ہو گیا۔ تین پشت تک یعنی ایک صدی تک وہ قابض رہے۔ اور مشوانی اصلی مالکان علاقہ سے بزورِ حکومت بٹائی لیتے رہے۔ جب سکھوں کی عملداری ہوئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ سمت ۱۸۸۱ بکرمی میں ہزارہ آیا تو اس وقت ہری پور کا قلعہ (ہرکشن گڑھ) تیار ہونے والا تھا۔ ترین قوم کے معزز افراد سکھوں سے روگردانی کرکے سندھ پار بھاگ گئے تھے چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ ان کی گوشمالی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ہری پور سے روانہ ہو کر براستہ گدوالیاں سری کوٹ آیا۔ قوم مشوانی کے سرکردہ افراد نے اظہارِ اطاعت کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ جب سری کوٹ سے سیر کرنے کے لئے صبح نکلا تو شہر سے تھوڑی دور جانے کے بعد گندگر کی چوٹی پہ پہنچ گیا۔ اور یہ جگہ اس کو بہت پسند آئی۔ چنانچہ دوسرے روز جرنیلوں اور دوسرے افسروں کو بھی اپنے ہمراہ چوٹی پر لے گیا۔ اور ان سے کہا کہ میں یہاں ایک بھاری قلعہ تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ جرنیلوں وغیرہ نے اُس کی اس تجویز کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور اس نے اُسی وقت حکم دیا کہ میں دو دن کے بعد غازی کی طرف چلا جاؤں گا۔ لیکن میدانِ ہزارہ کے تمام مستری اور کاریگر طلب کرکے یہاں قلعہ کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ اور اس ملک کے لوگوں سے کہا کہ ہم آنے والے فصل کی بٹائی یا معاملہ نہ وصول کریں گے۔ اس لئے یہ مزدوروں کا کام کریں۔ اور جن لوگوں کی زمین وغیرہ نہیں ان کو مزدوری دی جائے۔ قلعہ کی تیاری شروع ہو گئی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ پہاڑ سے اتر کر امر خانہ سے ہوتا ہوا علاقہ غازی میں چلا گیا۔ علاقہ غازی کے سربرآوردہ اشخاص نے جنگ یا صلح کرنے کے مشورہ کے بعد صلح کی تجویز کی۔ تمام سربرآوردہ افراد مہاراجہ رنجیت سنگھ

سے ملے اور اظہارِ وفاداری کیا۔ سردار رنجیت سنگھ نے خوش ہو کر ایک معقول جاگیر اُن کی مقرر کر دی۔ اس کے بعد جب مہاراجہ رنجیت سنگھ دریائے سندھ پر پہنچا تو اس وقت دریا بہت اترا ہوا تھا سردار نے خود اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اور نہایت سکون سے مع چند سرداروں کے دریا سے پار ہو گیا۔ بہت سے آدمیوں کو بلا تکلف پار ہوتے دیکھ کر پورے رسالے نے گھوڑے دریا میں ڈال دئیے۔ اور سارے دریا کے پار پہنچ گئے۔ اب پیدل فوجوں کی باری تھی۔ چنانچہ رنجیت سنگھ خود آیا اور ان کو سمجھایا کہ پانی سینے سے اوپر نہیں ہے اور پانی بالکل ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ تم لوگ فنِ تیراکی کے بھی ماہر ہو۔ البتہ جو لوگ ہزارہ کے ہمارے ساتھ ہیں وہ اگر تیرنا نہیں جانتے۔ تو اُنہیں اسی طرف ڈیرہ ڈال دینا چاہئے۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اس تقریر نے سب میں جرأت اور دلیری پیدا کر دی۔ اور وہ کپڑے سنبھال کر دریا میں داخل ہو گئے۔ بہت سے لوگ تو کد و کاوش کے دریا سے گزر کر دوسرے کنارے پر چلے گئے۔ اور جن میں چل کر جانے کی ہمت نہ تھی آدھے راستے کے بعد تیرنا شروع کر دیا۔ آخر سوائے پانچ چھ آدمیوں کے باقی سب سندھ کو عبور کرکے پار ہو گئے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے تو کھبل کو آگ لگا دی اور اس کے بعد موضع گیا پہنچا اور وہاں سے اپنے ملزم طلب کئے۔ خوانین گیا نے ملزم حوالے کر دئیے۔ یہ ان کو لے کر واپس غازی۔ غازی سے براستہ گنڈی امر خانہ (انبار خانہ) سری کوٹ پہنچا۔ اس وقت قلعہ زیرِ تعمیر تھا۔ قلعے کی تیاری کے دوران میں ان لوگوں پر سختی کی گئی تو آخر تنگ آ کر پٹھان اور مشوانی دونوں یہ علاقہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ معمولی جیسی طاقت سری کوٹ میں چھوڑ کر خود ہری پور اور ہری پور سے لاہور چلا گیا۔

اس موقع پر جب دونوں اقوام نے دیکھا کہ سری کوٹ میں بہت تھوڑے سپاہی ہیں تو دونوں اقوام نے مل کر ان پر چڑھائی کی اور سکھوں کو شکست دے کر دوبارہ اس پر قابض ہو گئے۔

پھر بعد اُس کے سردار ہری سنگھ و دونشورہ صاحب مع فوج کے آئے اور بوستان خان ترین و جلال خان دلازاک و شیر محمد و سلیم شاہ مشوانی کو توپ سے اڑا دیا۔ اور دوبارہ قلعہ سری کوٹ فتح کیا۔ پٹھان اور مشوانی قابضان نکل کر پار دریائے سندھ چلے گئے۔ چار پانچ برس کے بعد قوم مشوانی آ کر سردار ہری سنگھ کو ملے اور پھر بدستور اپنے علاقہ پر قابض ہوئے۔ عملداری سکھاں تک بدستور قابض رہے۔ عملداری سرکار میں بھی کبھی بے دخل نہ ہوئے۔ آج تک برابر قابض ہیں اور عہدِ سکھاں میں دخل قوم پٹھان اُتمان زئی کا ان سے اٹھ گیا۔ یہ قوم خوب مضبوط اور عمدہ سپاہی اور قوی دل ہے۔

ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء

ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء کے مطابق مشوانی قوم کی تعداد ۲۹۹۲ افراد ہے اور یہ سری کوٹ۔ گنڈی امرخانہ اور گدوالیاں کے مواضعات میں جو گندگر کے شمال مشرقی کوہ میں واقع ہیں، بستے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ ملحقہ دیہات میں بطور مزارع رہائش رکھتے ہیں۔ یہ اصل سے سید معلوم ہوتے ہیں۔ اور سید محمد گیسو دراز کے چار بیٹوں سے ایک ان کا مورث اعلیٰ بنام مشوانی تھا۔ اس نے کاکڑ کی لڑکی یا پوتی سے شادی کی تھی۔ اور کاکڑ کے والد دانی نے اس کو اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔ دوسرے سیّدان کو سید نہیں سمجھتے اور ان کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔

یہ قوم مضبوط، محنتی، اچھی عادات کے مالک، دیانتدار اور وفادار ہیں۔ ان کی ملکیت زمین تنگ ہونے کی وجہ سے ان کے بہت سے افراد سرکاری ملازمت میں ہیں اور ان کی وفاداری اور شجاعت شک و شبہ سے بالا ہے۔ انہوں نے ۱۸۲۵ء تک سکھوں کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا کبھی کامیاب ہوئے اور کبھی ناکام۔ بعد میں ہری سنگھ نے ان کو پانچ سال کے لئے سری کوٹ سے نکال دیا۔ یہ ۱۸۴۸ء میں میجر ایبٹ کے مضبوط حمایتی تھے۔ وہ ان کو "دنیا کی بہترین شجاع قوموں میں سے" کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اپنے کالے کپڑوں، پرانی لمبی بندوقوں، تلواروں، ڈھالوں، قومی جھنڈے کے ساتھ جب سری کوٹ کے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے ہیں تو یہ عجیب منظر ہوتا ہے۔ اور اپنی نقلی نقشہ جنگ سے پہاڑ میں گونج پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے اجتماع وہ ہر افسر کے وہاں جانے پر بطور استقبال کرتے ہیں۔ ضلع کی سب اقوام سے زیادہ وہ ایک انگریز افسر کو ان کی تاریخ و عادات متاثر کرتی ہے۔ ان کا سرگروہ سید شریف ساکن سری کوٹ ہے جس کی تھوڑی سی جاگیر ہے اور ۶۳ پنجابی میں جمعدار ہے۔ اور اس کی گاؤں سے غیر حاضری پر جب کہ وہ فوج میں ہوتا ہے۔ تو اس کا چچا سید محمود جو قوم کا بارسوخ آدمی ہے۔ اس کا قائم مقام ہوتا ہے۔"

حالات مشوانی

از سید یوسف شاہ ساکن سری کوٹ ۱۹۳۱ء کے بیان کے مطابق مشوانی سید محمد گیسو دراز کی اولاد ہیں۔ اور سید ہیں۔

سید محمد گیسو دراز
- ستوریانی
- مشوانی
- وردگ
- ہنی

سید محمد گیسو دراز ۴ رجب ۷۲۱ھ (۱۳۲۱ء) میں بغداد سے متصل ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ستائیس سال کی عمر میں عازم سفر ایران و افغانستان و ہندوستان ہوئے۔ ایران میں لقب گیسو دراز ہوا۔ افغانستان فرمل نام جگہ میں سکونت اختیار کی۔ اس کے متصل کا علاقہ خوڑہ مرغنے سے موسوم ہے۔ یہاں سے کوہ سلیمان، علاقہ کاکڑ، شیرانی اور کرانی کے درمیان ایک جگہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ ان تینوں اقوام میں سے انہوں نے شادی کی۔ کاکڑی قبیلے کی عورت کا بیٹا مشوانی تھا۔ شیرانی قبیلہ کی عورت کا ستوریانی اور کرانی عورت کے دو توام بیٹے ہونی و وردگ تھے۔

سری کوٹ کی آبادی

اس مؤلف کے بیان کے مطابق یہ بابر بادشاہ کے حملہ پانی پت کے وقت سے ہے۔ حالات مشوانی میں تحریر ہے کہ جب بابر بادشاہ صوبہ سرحد کو فتح کر کے پانی پت پر چڑھائی کے لئے روانہ ہوا تو سرحدی علاقہ میں ہزارہ کا بہت سا علاقہ غیر آباد پڑا ہوا تھا۔ اپنے ساتھ جو مجاہدین لایا تھا انہیں اس علاقہ میں رہنے کا حکم دے دیا۔ تاکہ مدت تک یہ علاقے اس کے قبضے میں رہے۔ اس وقت اس کا جنگی کیمپ گولڑہ میں تھا۔ یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے۔

راورٹی لکھتا ہے کہ سید محمد گیسو دراز اُش نزد بغداد کا رہنے والا تھا۔ اس نے کاکڑ کی لڑکی سے شادی کی اور اس کی اولاد سے مشوانی ہیں (مشوانی کی موجودہ جائے رہائش قوم ہنی برادر کاکڑ کے دیہات سے متصل ہے لہٰذا یہ بات بھی ان کے کاکڑ اور ہنی سے ہم رشتہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ش ب)

تاریخ فرشتہ میں سید محمد گیسو دراز کے متعلق مرقوم ہے کہ:-

۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں جب سید محمد گیسو دراز دکن میں حسن آباد گلبرگہ کے اطراف میں پہنچے تو سلطان فیروز شاہ بہمنی جو ایسے لوگوں کو عزیز سمجھتا تھا ان کے آنے سے بہت خوش ہوا اور اپنے پایۂ تخت فیروز آباد سے گلبرگہ آیا۔ جمیع امراء و ارکان دولت اور اولاد کو ان کے استقبال کے واسطے بھیجا۔ اور با عزت و اکرام شہر میں لائے۔ چونکہ فیروز شاہ حکیم طبیعت تھا جب سید محمد گیسو دراز کو علم ظاہری میں خصوصاً معقولات سے خالی دیکھا تو اس قدر توجہ نہ کی۔ مگر احمد خان خانِ خاناں نے بھائی کے [illegible] حسن اعتقاد تمام سید صاحب سے پیدا کیا اور ان کے واسطے ایک خانقاہ زر کثیر صرف کر کے تیار کرائی اور اکثر اوقات ان کی مجلس شریف میں حاضر ہو کر [illegible] خانقاہ کو انعام و احسان سے سرفراز کرتا تھا۔ غرضکہ ۸۲۰ھ ۱۴۱۷ء میں سلطان نے اپنے بڑے بیٹے حسن خان کو جو ایک عیاش اور

معتضد انتقال شاہزادہ معتقا ولیعہد کر کے تاج اور پٹکا شاہانہ اور چتر اور سراپردہ سیاہ اور ہاتھی اور تخت عنایت ... اور علماء درگاہ سے اس کی بیعت لے کر آدمی سید محمد گیسو دراز کے پاس بھیجا۔ کہ اس کے حق میں دعا خیر کرے۔ اور فاتحہ پڑھے۔ سید نے جواب دیا کہ جب تم نے شاہی اسے دے دی ہے فقیر کی دعا اور فاتحہ کی کیا حاجت ہے۔

سلطان فیروز شاہ نے دوبارہ آدمی بھیج کر الحاح اور منت میں مبالغہ کیا۔ سید نے فرمایا عالم بالا سے تاج شاہی تیرے بعد تیرے بھائی احمد خان خانِ خانان کے لئے نامزد ہوا ہے۔ اس بارہ میں کوشش کرنی بے فائدہ ہے۔ سلطان اس بات سے بہت رنجیدہ اور متالم ہوا اور آثار رنجش ظاہر کئے۔ اور یہ پیغام دیا کہ تمہارا خانقاہ قلعہ کے نزدیک ہے اور اژدہام خلق کا ہوتا ہے شہر سے باہر تشریف لے جائیے۔ سید محمد گیسو دراز ناچار ہو کر مع اپنے اہل و عیال بلدہ حسن ابدال گلبرگہ سے برآمد ہوئے اور شہر کے کنارے اس مقام پر کہ بالفعل مزار ان کا ہے فروکش ہوئے۔ اور ان کے مریدوں نے ہجوم کر کے ایک مکان نہایت پُرتکلف اور معقول ان کے واسطے تعمیر کیا۔

۱۔ فیروز شاہ نے احمد خان کو گرفتار کرنے کا بندوبست کیا لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ بعد میں فیروز شاہ نے اپنے لڑکے حسن خان کو بھیج کر احمد خان خانِ خاناں کو راضی کیا اور خود اس کی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اور وہ احمد شاہ بہمنی کے نام سے مشہور ہوا۔ احمد شاہ کے زمانہ میں سید محمد گیسو دراز کا سب دکن مرید ہوا اور ان کے خاندان کی بہت عزت ہوئی۔ احمد شاہ نے بہت سے قریئے اُن کو جاگیر میں دئے اور حسن آباد گلبرگہ میں ایک اعلیٰ مکان ان کے لئے تعمیر کیا۔

مآثر عالمگیری کے مطابق عالمگیر کے چھبیسویں سال بادشاہی میں حضرت بندہ نواز سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فرزند مسمی محمد یوسف کو مادہ فیل بطور انعام مرحمت فرما کر گلبرگہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت گیسو دراز نے اپنے زمانہ قیام دکن میں جو کتاب تصنیف کی اس پر ایک شذرہ جو ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

"دکنی دور کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو ہے۔ جو ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۶ء) میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال قبل لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ملا وجہی کی "سب رس"

اردو زبان کی پہلی نثری تصنیف نہیں ہے۔ اکثر محققین و ناقدین حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ یہ وہ تصنیف ہے جو حضرت گیسو دراز نے گلبرگہ (جنوبی ہندوستان) میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہاں کی مخلوق کو احکامِ الٰہی سمجھانے کے لئے مقامی زبان میں تصنیف فرمائی۔" (ماہنامہ سب رس حیدرآباد دکن جنوری ۱۹۶۶ء)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت گیسو دراز ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۶ء) میں جنوبی ہندوستان میں تھے۔

رواج نامہ بندوبست ۱۸۶۲ء

قوم مشوانی کی چھ شاخیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مانی خیل۔ ۲۔ درہ خیل۔ ۳۔ حسین خیل جو سری کوٹ میں آباد ہیں۔ ۴۔ محمد شاہی۔ ۵۔ تتر کونڈی میں اور ۶۔ کپور شاہی امرخانہ و سری کوٹ میں آباد ہیں۔

گوجر

ضلع ہزارہ کی قدیم ترین قوم ہے۔ ماضی بعید میں اس ملک پر ان کا قبضہ و اقتدار کافی مدت تک رہا۔ محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ افغان اقوام وقتاً فوقتاً یہاں آتی رہیں۔ بزور یا بذریعہ خرید و فروخت سے گوجروں کو اپنے املاک اور وطن سے محروم کرتی رہیں۔ قدیمی گوجران ہزارہ کا بقیہ پہاڑوں پر مقیم ہیں۔ تحصیل ہری پور کے گوجر باہر سے آ کر یہاں مقیم ہوئے۔

مسٹر الف کیرو کی تحقیق ہے کہ:-

"سب مورخ متفق ہیں کہ (EPHTHALITES-WHITE HUNS) سفید ہن کے ساتھ گُرجارا (گوجر) آئے۔ وہ قوم خود تو ختم ہو گئی لیکن گوجر یہاں باقی رہ گئے۔"

ونسنٹ سمتھ کی رائے کے مطابق:-

"سفید ہن نے راجپوتانہ اور پنجاب میں رہائش اختیار کی۔ ان کے ساتھ مشہور قوم گوجر بھی آئی۔ راجپوت اور جاٹ سفید ہن کی اولاد سے ہیں۔ اور گوجر بھی اصلاً ان ہی کے برادری چچا زاد ہیں۔"

بیلیو لکھتا ہے کہ راجپوت اور پٹھان کی عادات و رسومات ایک سی ہیں۔ اب ان ہر دو میں اسلام اور برہمن مذہب کی تفریق ہے۔ سفید ہن حاکم قوم تھی اور گوجران کی رعیت تھے۔ اب

پٹھان قوم نے سفید ہن کی جگہ لے لی ہے "

ہندوستان کے سب سے پہلے عرب سیاح سلیمان تاجر نے اپنا سفر نامہ ۲۳۷ھ میں لکھا جس میں اس نے ہندوستان کے چار مشہور خاندانی مہاراجوں بلہرا (بلادکوکن کا راجہ) ، جُزر (گجرات کا راجہ) طافن (دکن کا راجہ) اور رہمی راجہ کا ذکر کیا ہے۔

راجہ جُزر (گوجر) یہ راجہ بلہرا سے کمزور ہے اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ وہ زمین کے ایک ساحلی قطعے پر حکمران ہے۔ اس کے پاس فوج بہت زیادہ ہے اس کے جیسے گھوڑے کسی ہندوستانی راجہ کے پاس نہیں۔ یہاں کے لوگوں کے پاس دولت بہت زیادہ ہے۔ ان کے یہاں اونٹ اور مویشی بہت زیادہ ہیں اس کے علاقہ میں امن بہت زیادہ ہے۔ چوری نام کو نہیں۔

راجہ جُزر کے مقالہ کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی اپنی کتاب ہندو عرب کے تعلقات میں ص ۲۰ پر فرماتے ہیں :۔ " جُزر اصل میں گُجر ہے گوجر راجہ گجرات کے راجہ تھے "

گُرجر (گُجر)

تاریخ گُرجر مؤلفہ رانا حسن علی خان کے مطابق یہ اصلاً آریہ کھشتری ہیں جن کی مادری زبان سنسکرت تھی۔ پھر یہی زبان گجراتی ہوئی اور باہر جانے پر گوجری ہوئی۔ ان کا ابتدائی مذہب ویدک تھا ان کی کتاب گیتا تھی۔ ان کا ملک گجرات کہلاتا تھا۔ ان کا پرانا لباس انگرکھا۔ پاجامہ۔ اور پگڑی پر مشتمل تھا۔ یہ لباس دنیا میں کہیں نہ تھا۔

اس مصنف کی رائے میں مہابھارت کے بعد کھشتری سے مراد صرف گوجروں سے ہے۔

ہندوستان کی ملکی حکومتیں سنہ ۱۲۰۰ء تک بیرونی حملہ آوروں نے ختم کر دیں۔ اور گوجر (سلطنت ہائے ہند) چھوڑ کر کشمیر، چمبہ، ریگستانوں اور وندھیاچل کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ اور اپنی آزادی کا جھنڈا بلند رکھا سو سال بعد گوجروں کے آخری چراغ رنتھمبور، چتوڑ اور انہلواڑہ بھی علاؤ الدین خلجی نے گل کر دئے۔ مگر کشمیر میں گوجروں کی شمع حریت جلتی رہی۔ اسی طرح جگہ جگہ گوجروں کے دیگر خاندان اکبر کے زمانہ تک لڑتے رہے۔ مسلمان شاہان کشمیر اولاد شاہ میر گوجر تھے۔

گوجر سنہ ۵۰۰ء کے قریب ہندوستان میں سفید ہنوں کے ساتھ آئے۔ یہ سب انگریزی اور دوسری تواریخ کا خلاصہ اور لب لباب ہے۔ اس نظریہ پر مؤلف گُرجر نے تفصیل سے بحث کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ گوجر نہ تو ہونوں کے ساتھ آئے اور نہ ہونوں کے بعد آئے۔ بلکہ اس سے پیشتر گوجر یہاں موجود تھے

یہاں تک کہ یہ گوجر ہی کشان وغیرہ کھشتری تھے۔ جو ایک طرف وسط ایشیا سے ادھر ہندوستان تک حکمران تھے۔ مہاراجہ کنشک کشمیر کا باشندہ تھا اور قوم گوجر سے تھا۔

راورٹی کے بیان کے مطابق

گوجر قوم پشاور کے علاقہ اور افغانستان کے پہاڑوں سوات اور ہزارہ میں پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان پنجابی بولی سی ہے۔ یہ ان علاقوں کے اصلی باشندوں تاجک اقوام کے بقایا ہیں۔

قوم گوجر کتب تواریخ وغیرہ میں پرانے زمینداروں ملک ہندو پنجاب سے ہیں۔ ان کی اصلیت کا ذکر کچھ ضروری نہیں۔ لیکن اس ملک میں ان کے قبضہ کا حال لکھنا ضروری ہے۔ وہ قصص مشہورہ معتبران موجودہ تحقیقات بندوبست وملاحظہ اسناد قوم گوجر و ترک و دلازاک وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ دراصل آبادی قوم گوجر کی اس ملک میں بہت پرانی ہے۔ شاہان چغتائی کے وقت میں بھی یہ لوگ آباد تھے۔ اور بڑا گھر اس قوم سے دولتا چودھری کا تھا جس کی جگہ اب کوٹ نجیب اللہ آباد ہے۔ (شہر کے جنوب میں ایک بڑا تالاب جو مقامی زبان میں دولتے کی بن مشہور ہے۔ اب تک موجود ہے۔ ش ب)۔ و مشہور ہے کہ چند سال قبل احمد شاہ درانی کے جب کہ ۱۷۴۷ء تک سلطنت شاہان چغتائی دہلی کی قائم تھی اور عمل آئین ذاتی مقررہ شہنشاہ جلال الدین اکبر پر ہوتا تھا تو چار پٹی اس میدان ہزارہ حسب تفصیل ذیل مقرر تھیں۔ ۱۔ پٹی ترک مانگراسے ۲۔ پٹی دلازاک سرائے صالح ۳۔ پٹی گوجر دولتا جس کی جگہ اب کوٹ نجیب اللہ آباد ہے۔ ۴۔ پٹی ترینی درویش۔ پٹی گوجری کے وارث مقدمان کوٹ اولاد مقدم مشرت کے ہیں۔

احمد شاہ درانی سے کچھ روز پہلے ایک چوہدری کو جو سرگروہ قوم گوجر کا تھا قوم ترین نے مار ڈالا۔ اور اکثر دیہات گوجری پر بھی قبضہ قوم ترین کا ہو گیا۔ زیادہ تر اس واسطے کہ پھر عہد درانی قوم پٹھان کا ہو گیا اور زیادہ قوت اس ضلع کے اقوام پٹھان کو بھی ہوئی۔ تاہم عزت خاندان مقدم[1] مشرت کی بنی رہی۔ اور وہ مقدم کے لقب سے ملک میں بلائے جاتے رہے۔

۱۷۶۲ء میں نجیب اللہ خان سرکار درانی کی جانب سے ہزارہ کا حاکم ہو گیا اور اس کو زیادہ قوت ہو گئی اور اپنی برادری کی ملکیت رہن و بیع اور معاملہ سرکاری سے بہت کچھ اپنے قبضے میں کر لی۔ ۱۷۹۹ء میں وہ مر گیا تو اس کا فرزند محمد خان نابالغ رہ گیا اس کی بیوہ مسماۃ نیمی بیگم نیک بخت اور منتظم تھی۔ اور اس کی

---

[1] مقدم کا خطاب اورنگ زیب بادشاہ نے قوم گوجر کے سرگروہ چودھری دولت بیگ کو دیا تھا جب وہ بادشاہ کی آمد کی خبر کو اس کے استقبال کے لئے آگے پہنچے۔ (ش ب)

نیک بختی و انتظام کا اس ملک میں نہایت شہرہ ہے ۔ بہ سبب مرنے اور غلبہ اقوام غالب ہمسایہ و فساد و شرارت برادری کے نہایت تنگ آگئی ۔ اور قریب تھا کہ نجیب اللہ خان کا گھر بالکل تباہ ہو جائے ۔ قوم ہمسایہ نے ان کو یہاں تک تنگ کیا تھا کہ درویش ان کے گھر رات کو مہمان اگر ٹھہرتے تھے اور صبح کو لحاف اور توشک وغیرہ بھی اپنے گھوڑوں پر باندھ کرلے جاتے تھے ۔ کسی ترین کی یہ مجال نہ تھی کہ ان کو اس حرکت سے منع کرے ۔ اس اثناء میں کوٹ نجیب اللہ میں مقدم مشرف کی جوانی، شجاعت اور نیک بختی مشہور ہوئی بیوی بنی بیگم نے اس کو اپنا مختار کل مقرر کر دیا ۔ تاکہ وہ ہر طرح سے ان کے مال و جان کی حفاظت کرے مقدم مشرف نے اپنی ذاتی شجاعت و جوانمردی سے پٹی گوجری اور بیٹی تریٹی میں امن و امان قائم کر دیا اور شر و فساد قوم افغان وغیرہ سے علاقہ کو محفوظ کر دیا ۔

سنہ ۱۸۱۰ء میں محمد خان پسر نجیب اللہ خان جوان ہو گیا ۔ اور اس نے مقدم مشرف کو علیحدہ کر دیا ۔ مگر مقدم مشرف کو بہ سبب پرانے اثر و رسوخ، ملکیت و ذاتی جواں مردی کے بڑی قوت ہو گئی تھی ۔ اور قوم وراق کا بھی وقت آخر ہو گیا تھا اور آمد آمد سرکار سکھاں کی اس ملک میں سُنی جانے لگی تھی ۔ مقدم مشرف کی قوت کو کچھ نقصان نہ پہنچا ۔ اور ابتدائی عملداری سکھاں میں سرکار سکھاں نے بہ مشورہ مقدم مشرف کے انتظام ملکی شروع کیا ۔ اور اسی مقدم مشرف کو سب سے پہلے سرکار سکھاں سے جاگیر ایک ہزار کے ملی ۔ اور آبادی اکثر دیہات اس علاقہ کے اس کے ہاتھ سے ہوئی ۔ اور اسناد عہد سکھاں وغیرہ کی اس کی اولاد نے پیش کیں ۔ یہ اسناد زیادہ تر سکھوں کی ہیں اور سردار ہری سنگھ کے وقت کی ۵ رجیٹھ سمت ۱۸۹۳، ماہ ساون سمت ۱۸۹۳ - ۱۶ بیساکھ سمت ۱۸۸۰، ۲۹ رجیٹھ سمت ۱۸۹۱، ۲ ر پھاگن سمت ۱۸۸۵ کی ہیں ۔ جن سے پٹی گوجری و بیٹی ترکی پر سیادت اور فی گھر ۱۲ مالیہ لینا ۔ کوٹ نجیب اللہ کی سرداری و ملحقہ دیہات میں آبادی کا ذکر ہے ۔ سردار مہاں سنگھ کی بھی اسی تائید میں سندات ہیں ۔ ایک سند مہاراجہ رنجیت سنگھ کی محررہ ۲۴ رجیٹھ سمت ۱۸۹۳ بابت انتظام پائندہ خان تنولی ہے ۔ ایک سند عبداللہ خان درانی حاکم کشمیر کی بلا تاریخ ہے جس میں تمام مقدم مشرف کی سفارش برائے خلاص و روانگی ایک بیوپاری کے جس کو ظفر خان تارخیلی نے گوٹ کر قید کر لیا تھا ۔ اس سے عہد درانی میں اس کا اقتدار اور عزت پائی جاتی ہے ۔ ایک پروانہ رضا قلی خان عامل احمد شاہ درانی ۷ ر ربیع الثانی سنہ ۱۱۶۹ھ مقدم طلبو پدر مقدم مشرف کے نام ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند دیہات پٹی گوجری کے بہ پتہ دولتا کے ویران تھے اور مقدم طلبو استدعا آبادی کرتا ہے ۔ حکم ہوتا ہے کہ وہ آبادی کرے اور آمدنی غلہ سے فی من ایک سیر اور نقدی فی روپیہ سے ۲ ر بابت مالکانہ موجبوبات کے لیا کرے ۔

گو ظاہراً صحیح سند معلوم نہیں ہوتی اس کی نقل آئندہ صفحات میں دی جائے گی بہرحال مقدم مشرف کے اس علاقہ اور گرد و نواح میں بہت اچھے اخلاق و حالات حفاظت ملک و آبادی دیہات و شجاعت و جوانمردی ذاتی کے زبان زد خلائق ہیں ۔ اور آج تک لوگ خوشی سے اُس کا نام یاد کرتے ہیں ۔ اور یہ بات اس کی ضرب المثل ہے کہ کئی مرتبہ اَتُوس پٹھان اتمان زئی، تارخیلی، سیدخانی و ترک و دلازاک وغیرہ نے علیحدہ علیحدہ و نیز بہ ہیئت مجموعی چڑھائی اس علاقہ پر کی اور ہمیشہ تھوڑے آدمیوں کے ساتھ مقدم مشرف نے بہت قوت و غلبہ کے ساتھ ان کو شکست دی ۔ اور ان کو ہراساں ہو کر بھاگ جانا پڑا ۔ مقدم مشرف نے اپنی تمام عمر میں شکست نہیں کھائی آخر ایک شکست دغا سے موضع چنبہ پنڈ کی لڑائی میں کھائی اور اُسی کے غم میں مر گیا ۔ (مجھے بڑے بوڑھوں سے چار بیتہ کا ایک بند جو اس جنگ کے متعلق ہے یاد رہ گیا ہے :- ؎

فریب کیستا سعد الیے   ٹلے کا سبی آگے جُلے

آیا حکم ربّانی

ارمان مقدم مشرف دا   جیہڑا رہ ہویا میدانی

یہ خاندان عہد سلطانی و سرکار سکھاں اور بعد میں سرکار انگریزی کے وقت سے عزت دار رہا ہے اور مقدم مشرف کی اولاد کا قبضہ بھی ورثانہ علی الاتصال مندرجہ ذیل دیہات پر چلا آیا ہے ۔ کو کلیا۔ پنڈوری ۔ ڈنگی ۔ جھاڑ ۔ کوٹ نجیب اللہ ۔ ڈیڈر ۔ چنبہ ۔ پنڈ ۔ مقدم مشرف کی اولاد کی عزت سب لوگ کرتے ہیں ۔ اور زیادہ تر اس واسطے بھی اس گھر کی تعظیم کرتے ہیں کہ مقدم مشرف کے وقت جو کوئی جس قوم کا عمدہ کمر بند اور جوان مرد آدمی تھا وہ اس کا ملازم تھا ۔ اور اپنی تمام عمر میں کسی کو نوکر کے الفاظ سے نہیں بلایا ۔ رفیق، سنگی یعنی ہمراہی و مددگار کہتا رہا ۔ اور جب وہ لوگ نوکری نہیں کرتے تھے یا ضعیف ہو جاتے تھے تو بقدر ان کی نوکری یا کچھ کم اُن کے گھر میں مدت تک بموجب اپنی وسعت و طاقت کے پہنچی ۔ رہتا تھا ۔ یہاں تک کہ اب بھی بعض کی اولاد مقدم مشرف کی اولاد سے جو اس کا جانشین ہو فصل کے موقعہ پر کچھ لے جاتے رہے "

"رؤسائے باختیار و نامی خاندان پنجاب" مؤلفہ کرنل چارلس میسی ۱۸۹۴ء میں تحریر ہے :-

اورنگ زیب کے عہد میں چودھری دولت بیگ کو جو اس وقت اس قوم کا سرکردہ تھا مقدم کا خطاب ملا تھا ۔ ترینوں نے گوجروں کو ہزارہ کے بہت سے گاؤں سے نکال دیا ۔ ۱۷۶۲ء میں نجیب اللہ خان ترین، درانی بادشاہوں کی طرف سے ہزارہ کا حاکم ہو گیا ۔ اس کے بعد اس کی بیوہ نے

اپنے مقبوضات کا انتظام مقدم مشرف کے سپرد کیا۔ جس نے کئی سال تک تیہ ہائے ترین اور گوجر پر حکومت کی۔ اتمان زئیوں تنولیوں اور گکھڑوں سے مقابلہ کیا!!

ایک معتبر روایت کے مطابق :-

۱۔ سب سے پرانی قوم جو اس ضلع میں آباد ہے وہ گوجر قوم ہے یہ قوم راجپوت کی شاخ ہے۔ جب اس راجپوت قوم نے بدھ مت کو ہندوستان سے نکالنے کا فیصلہ کیا تو ان کا تعاقب ہزارہ کے پہاڑوں اور دروں تک کیا۔ جو بدھ مت کے پیروؤں کا مرکز تھا۔ اور یہ گوجر جو اب گندگر، مانسہرہ، کاغان، صوابی میرا (پہاڑوں کے سروں پر) آباد ہیں۔ اُن لوگوں کی نسل سے ہیں۔

۲۔ اس کے بعد دوسرا دور گجرات (پنجاب) یعنی ہندوستان کے گوجروں کا ہے جو کوٹ نجیب اللہ جاگل وغیرہ میں آباد ہیں۔ اور بعض مواضعات کے نام بھی مثلاً جاگل، پنڈوری، کالس، میرپور، ڈھینڈہ وغیرہ بھی وہ اپنے ساتھ گجرات کے مواضعات اور اپنی شاخوں کے نام ساتھ لائے۔

ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء کے مطابق

قوم گوجر اس ضلع میں بہت پرانے وقتوں سے آباد ہے۔ اور وہ ہزارہ کے میدان میں اقوام دلازاک اتمان زئی اور ترین کے یہاں آنے سے بہت پہلے قابض تھے۔ اور پہاڑوں پر تو ان کی آبادی بہت ہی پرانی ہے۔ اُن کی آبادی اس ضلع میں سب اقوام سے بہت زیادہ ہے۔ اور ۹۱۶۷۰ افراد پر مشتمل ہے۔ اور یہ ضلع کے سب علاقوں معہ ریاست تناول میں آباد ہیں بطور مالکان ان کی تعداد ہری پور تحصیل میں زیادہ ہے۔ اور بطور مزارعہ مانسہرہ تحصیل میں "اس قوم کی ایک سو ایک شاخوں میں سے تقریباً بیالیس ضلع ہزارہ میں ہیں اور ان میں کٹھانہ گوجر کوٹ نجیب اللہ میں، جاگل گوجر ہری پور کے نزدیک قابل ذکر ہیں۔ ان میں سرگروہ خاندان کوٹ نجیب اللہ کا ہے۔ جس کا جاگیردار مقدم میر عبداللہ ہے اس کا والد مقدم غلام محمد آنریری مجسٹریٹ تھا۔ اور اس کا ایک بھائی اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر۔ اور دوسرا سب انسپکٹر پولیس ہے۔ (سردار امیر عالم خان اسسٹنٹ کمشنر تھے جو ریٹائر ہو کر آنریری مجسٹریٹ درجہ اول ہوئے اور کوٹ نجیب اللہ میں مقیم ہوئے۔ انسپکٹر پولیس ان کے بھائی سید عالم خان تھے)

پہاڑوں کے گوجر مزارعہ غریب اور پس ماندہ ہیں۔ اور مالکوں کے اثر کے نیچے پسے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر ان کا گزارہ مال مویشی بھیڑ بکری پر ہے۔

قوم گوجر کی شاخیں

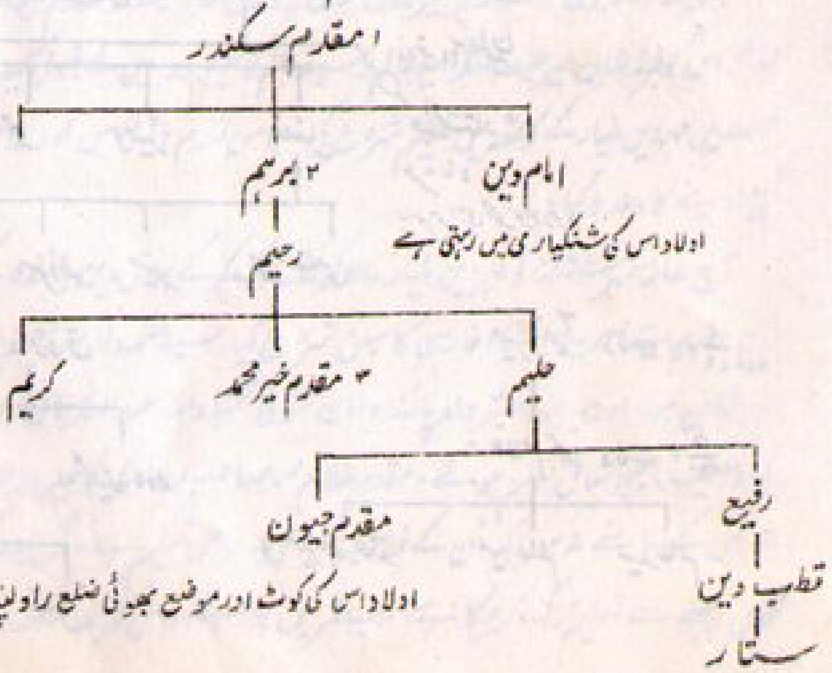
مطابق رواج نامہ بندوبست ضلع ہزارہ ۱۸۷۲ء

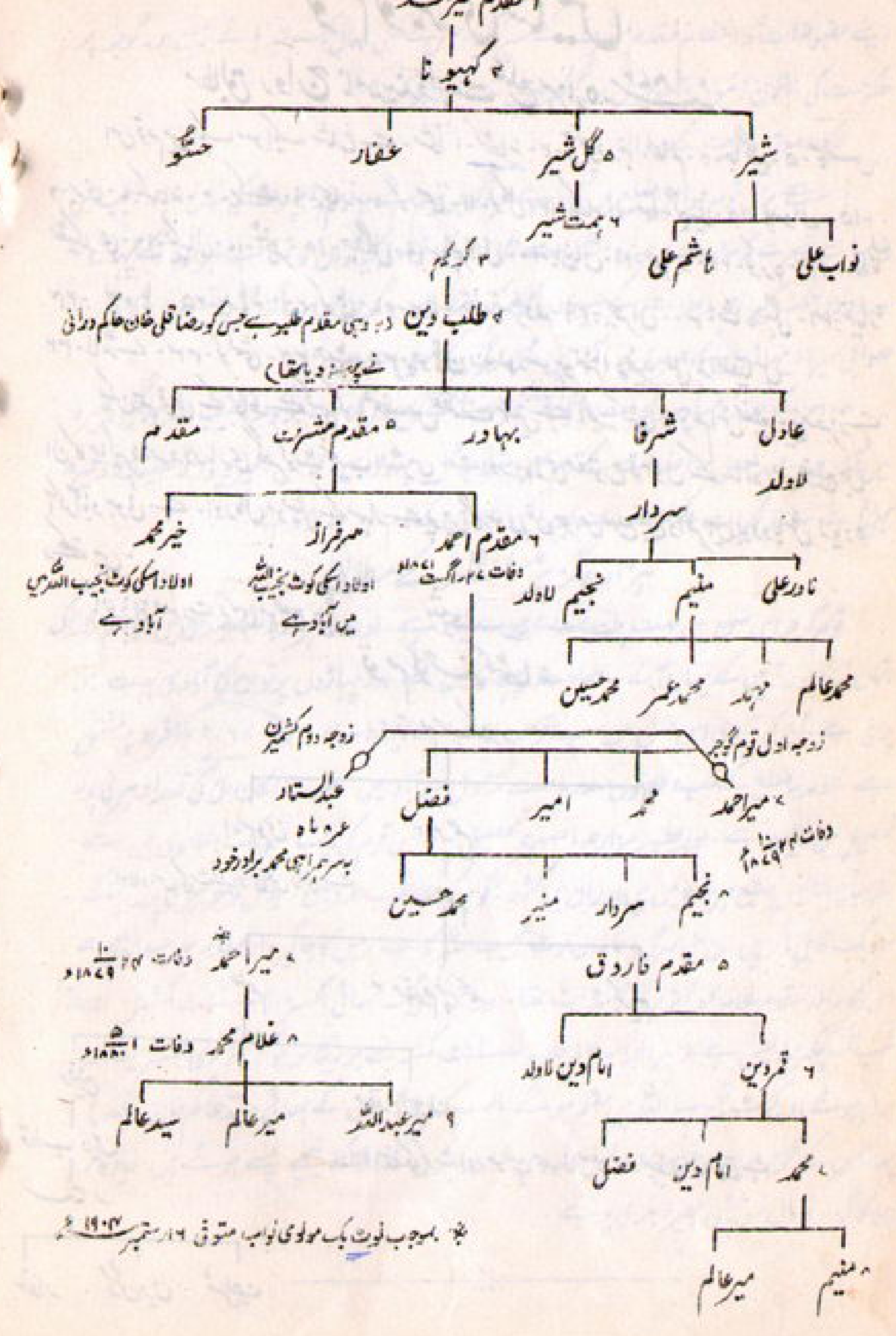
اس قوم میں ایک سو ایک شاخ ہے۔ مثلاً ۱۔ کٹھانہ ۲۔ چیچی ۳۔ عالم ۴۔ جاگل ۵۔ کالس ۶۔ بری ۷۔ کسانہ ۸۔ برگٹ ۹۔ بجار ۱۰۔ گورسی ۱۱۔ بوکل ۱۲۔ کھاری ۱۳۔ گہیلا ۱۴۔ پسوال ۱۵۔ ٹھیکری ۱۶۔ نکیال ۱۷۔ شنجر ۱۸۔ جنگل ۱۹۔ باہروال ۲۰۔ بانیاں ۲۱۔ جہارا ۲۲۔ لوکرہ ۲۳۔ روانال ۲۴۔ سوہا ۲۵۔ پدہانہ ۲۶۔ کوہلی ۲۷۔ برلا ۲۸۔ تیسڑور ۲۹۔ بجران ۳۰۔ شاہ ہگی ۳۱۔ نیارہ ۳۲۔ لانڈے ۳۳۔ کونشی ۳۴۔ جٹ ۳۵۔ چوہان ۳۶۔ سوہو تنترا وغیرہ علیٰ ہذا القیاس۔

لیکن ہم قومی کے لحاظ سے کسی کو بالتخصیص عظمت نہیں ہے البتہ کٹھانہ قوم اس ضلع میں معزز ہے ان کا جاگیردار و درباری گھر کوٹ نجیب اللہ میں ہے اور ہماری مفتوح قوموں کے ساتھ اس ضلع میں آکر آباد ہوئی ہے۔ اور مال مویشی کے سہارے پر چراگاہوں میں جو اس ضلع میں وافر ہیں بود و باش زیادہ رکھتے ہیں۔

ماخوذ از صورت دیہی موضع دیڈر

شجرہ نسب
قوم گوجر کٹھانہ





* بموجب نوٹ بک مولوی نواب متوفی ۱۶ ر ستمبر ۱۹۰۴ء

جاگیر مقدم مشرف بساکن کوٹ نجیب اللہ

مہاراجہ رنجیت سنگھ اور سردار ہری سنگھ نے مقدم مشرف کو مواضعات ڈنگی - جھاڑ اور کو کلیہ جاگیر ۵۰۰۰/ کی دی اور ایک جندر /۱۲۳۴ روپیہ کا دیا۔ دیوان ہری چند نے اپنے وقت میں اس کو مستقل کر دیا مقدم احمد کو میجر ایبٹ کی سفارش پر مقدم مشرف کا وارث جاگیر کیا۔ مقدم احمد ۱۴ر اگست ۱۸۱۰ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے میر احمد کو جاگیر دی گئی - مقدم میر احمد ۱۴ر اکتوبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہوا۔ اور جاگیر اس کے بڑے لڑکے غلام محمد کو ملی - وہ یکم مئی ۱۸۸۰ء کو فوت ہوا۔ تو مقدم میر عبداللہ بڑے لڑکے کو ملی - مقدم احمد و خیر محمد کی خدمات ۱۸۵۷ء کے عوض میں جاگیر و پنشن کل /۱۴۵۰ روپیہ دی گئی اس میں سے تیسر احصہ خیر محمد کو دیا گیا۔ بہ شرط تابعداری بڑے بھائی مقدم احمد کے۔

مولوی نواب علی منصور (جدون) کی ذاتی نوٹ بک سے چند اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں جن سے کوٹ نجیب اللہ کے سردار خاندان کے حالات، اس زمانہ کی تعلیم و طرز تدریس پر روشنی پڑتی ہے -

مولوی نواب علی اس وقت کی ایک مشہور شخصیت تھی۔ اس زمانہ کا تعلیم یافتہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقدمات میں لوگوں کو مشورہ بھی دیا کرتا تھا۔ اس واسطے وکیل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے -

چند اقتباسات

آج ۵ رماہ جون ۱۸۶۷ء کو میر زمان خان پھوپھی زاد مجھ کو مقدم غلام احمد صاحب کے پاس لے گیا۔ کہ اس کو فرزندان میر عبداللہ، میر عالم و سید عالم کو تعلیم دو۔ میں نے قبول کیا - میر زمان خان کے گھر متصل شمالی سمت میں مہردین ملیار کے کوٹھہ میں تعلیم شروع کی - ۱۲ من گندم ہاڑی میں اور ۱۲ من مکی خریف میں اور روٹی و کپڑا دینے کا وعدہ کیا۔

آج ۱۵ رستمبر ۱۸۶۷ء کو مہردین ملیار والا کوٹھہ ترک کر کے جلال دین بافندہ کے کوٹھہ میں تعلیم جاری کی - یہاں مقدم سید احمد نے انشاء و فارسی کا سبق شروع کیا۔ سید احمد ولد نور احمد ملیار و کریم بخش ولد مفضل دھوبی بھی شامل ہوا - اور میر عبداللہ ولد پائندہ خان تنولی گنیا والا - عبداللہ خان ولد عظیم خان بھیرہ والا (پنیاں کے نزدیک) بھی شامل تعلیم ہوئے - مقدم غلام محمد صاحب نے کہا کہ میرا والد مقدم میر احمد صاحب زندہ ہے اس کے سامنے نہ ہو تاکہ ان کے خلاف مرضی یہ خاص تعلیم ہے - مگر یاد رکھو کہ میر عبداللہ میرا پسر کلاں پہلے سے تعلیم ترک کر چکا ہے - اب عمر میں بڑا ہے - اس کو کچھ سکھا دو - مگر میر عالم و سید عالم کو پوری تعلیم دو -

میں نے خدا سے عہد کیا اور دعا کی کہ الٰہی! جیسے اس تیرے شریف و برگزیدہ بندہ نے ایسی دلی خواہش

ظاہر کی تو مجھ کو ہمت دے تا کہ جو کچھ شد و بود دیکھ کر انگریزی راج میں وہ درجات ملازمت میں پاویں کہ دنیا حیران رہ کر آفریں کہے۔ یہ دعا کچھ ایسے اخلاص سے کی گئی معلوم ہوتی ہے کہ واقعی سردار میر عالم خان اور سید عالم خان انگریزی راج میں اعلیٰ عہدوں کو پہنچے۔ اول الذکر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری سے ریٹائر ہوئے۔ خان بہادری کا خطاب پایا۔ دورانِ ملازمت جب وہ پشاور میں تھے۔ اپنی لیاقت، دلیری اور جرأت کار سے خاص نام پایا۔ پنشن لے کر آنریری مجسٹریٹ درجہ اول ہوئے۔ سید عالم خان انسپکٹر پولیس ہو گئے۔)

۲۔ آج یکم جون ۱۸۸۰ء تک میں نے میر عالم و سید عالم کو ابتدائی تعلیم سے شروع کرا کر سارے نظم و نثر فارسی کے علاوہ ابتدائے انشا پردازی سے ابوالفضل و بہارِ دانش تک تعلیم دے کر منشی گری میں ہوشیار بنا دیا۔ تو ناگہاں صبح طلوعِ آفتاب کے وقت میر عالم و سید عالم کو اپنا اسباب و چارپائی وغیرہ تعلیم گاہ سے اٹھاتے اور لے جاتے دیکھا۔ اور میرے ساتھ بات بھی نہیں کرتے۔ میں حیران کہ وجہ کیا ہے۔ با ایں تو وہ وقت تھا کہ میں چارپائی پر بیٹھتا تھا اور یہ نیچے زمین پر گرد و غبار میں بیٹھ کر سبق پڑھتے تھے۔ آج ایک دم ایسے گستاخ و بے ادب کیوں ہو گئے۔ دریافت پر دونوں نے بے ادبانہ الفاظ سے جواب دیا۔ ہم نہیں پڑھتے میں خاموش رہا۔

آج ۲ر جون [illegible] کو صبح کی روٹی کی تلاش میں بعض دوستانِ ذیل کے گھروں میں گیا۔ عبداللہ ولد درگاہی بافندہ جس کو کئی دفعہ پولیس سے چھڑوایا۔ پھر سید احمد ملیار شاگرد کے پاس گیا۔ پھر فضل ولی پسران میرو لالا و بابو بافندہ کے۔ مگر کسی نے روٹی کی صلاح نہ کی۔ دوپہر کے وقت فوراً میرا سی کے گھر گیا اس نے بھی، تازہ اور بہت سی روٹی کھلائی۔ ؎

ایک عالم کو آزما دیکھا جس کو دیکھا سو بیوفا دیکھا

اس اثناء میں مولوی نواب علی بارک ماستری میں نوکر ہو کر کابل کے لام میں براہ کوہاٹ چلا گیا۔ اور اپنے سفر کے حالات لکھے ہیں۔ اور پھر وطن آنے کا بیان تحریر کیا ہے۔

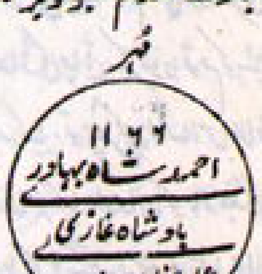
۳۔ ۱ر ۴ر اگست ۱۸۸۱ء کو خورم والے راستہ سے ڈھیری شاہان میں آیا۔ اور یہاں سے سواری یکہ گھر آیا یعنی کوٹ نجیب اللہ میں گھر ہونے کی اور تو کوئی صورت نہیں ہے اگر ہے تو یہ کہ میری پدری حویلی ہے جس میں میر زمان خان میرا چچا بھی زاد آباد تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کا ٹبر آباد ہے۔

معلوم ہوا کہ مقدم صاحب میر احمد صاحب کا میرے محاربہ کابل پر جانے کے بعد انتقال ہو گیا ہے جسب رسم جہاد، فاتحہ خوانی کرنا بہتر جانا۔ مقدم غلام محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جو غلام چچا و فضل ملک و دیگر لوگ پاس بیٹھے ہوئے تھے دریافت سے معلوم ہوا کہ وہ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۷۹ء کو فوت ہو گئے ہیں۔ دعا کی

مقدم غلام محمد صاحب نے فرمایا کہ لڑکوں کی غلطی ہے جو آپ سے روٹھ آئے۔ جب سے آپ گئے ہیں اُنہوں نے کچھ نہیں سیکھا۔ بلکہ سیکھا ہوا بھی فراموش کیا۔ آپ اسی طرح رہو اور میرے برادران دوست محمد و سلیمان کو بھی پڑھاؤ۔ اور میر عالم و سید عالم کو بھی مکمل کرو۔ چنانچہ میں نے دوبارہ مذکورین کو تعلیم شروع کی"

فرمانِ شاہی۔ احمد شاہ درانی کی نقل درج ذیل ہے جس سے اس علاقہ میں چند دیہات کی آبادی کی اجازت مقدم طلبو گوجر ساکن دولتہ کو دی گئی۔

مُہر



عاملانِ حال و استقبال ہزارہ قارلق آنکہ بوضوح پیوست کہ چند دیہات پنجی گوجری تپہ دولتہ ویران بودہ چوں مقدم طلبو سکنہ دولتہ استدعائی آبادی دیہات مذکور میدارد۔ لہذا بنظر رفاہیت رعایا و افزونی مالیہ شرف نفاذ یافت کہ ہر قدر کہ مومی الیہ آبادی دیہات ویران شدہ انجام تواند کرد چک بندی کردہ وہند حسب دستور قدیم از آمدنی غلہ فی من یک آثار نقدی فی روپیہ دو آنہ بابت نابکار معہ جبوبات عصارف معہ والہ معاف و مرفوع القلم دانستہ بتاکید مزید دانند۔

بتاریخ ہفتم ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ (۱۵ر جنوری [illegible])

ترجمہ

بنام گورنران موجودہ و آئندہ۔ علاقہ ہزارہ قارلق (موجودہ تحصیل ہری پور)

معلوم ہوا کہ پنجی گوجری، تپہ دولتہ (حال علاقہ کوٹ نجیب اللہ) ویران پڑے ہوئے ہیں۔ اور مقدم طلبو (مورث قوم گوجر کوٹ نجیب اللہ) اُن کو آباد کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ لہذا رعایا کے آرام اور مالیہ سرکار کی زیادتی کے لئے حکم از شرف حضور صادر ہوا۔ کہ ویران شدہ دیہات سے جتنے مواضعات یہ آباد کر سکے۔ چک بندی کر کے اس کے حوالہ کر دیں۔ پرانے دستور کے مطابق ایک من غلہ کی آمدنی سے ایک سیر اور ایک روپیہ سے دو آنے بابت .... معہ جبوبات بمصارف ...... معاف کر دیں اور تاکید مزید جانیں۔

۷ر ربیع الثانی ۱۱۶۶ھ - ۱۵ر جنوری ۱۷۵۳ء

تربیلہ کے گوجروں کے حالات

اس قوم کے متعلق مشہور ہے کہ یہ لوگ آج سے ساڑھے تین سو سال پہلے اکبر بادشاہ کے زمانہ میں علاقہ

سندھ پار سے آئے۔ جب وہ یہاں پہنچے تو اُن کے جد اعلیٰ راجہ رُستم گوجر کو یہ جگہ پسند آئی۔ یہاں پر ایسا بیلہ تھا جو مال مویشی کی پرورش کے لئے بہت اعلیٰ تھا۔ اور یہاں اس نے دریائے سندھ سے تھوڑے فاصلہ پر موضع گوجرہ کی بنیاد ڈالی۔ اور قوم گوجر کے جد اعلیٰ کا نام محمد جو مشہور ہوا جن کی اولاد سے سال ۱۹۶۲ء اس خاندان کے سرکردہ اللہ نور وغیرہ تھے۔ اُن کی آمد سے پہلے اس جگہ چند لوہاروں کے گھر تھے۔ گوجروں اور لوہاروں کے سرکردہ افراد نے ابھی گوجرہ اور لوہار پٹی کو پوری طرح آباد بھی نہ کیا تھا۔ کہ اس علاقہ میں قوم تنولی کا زور ہوگیا۔ اس وقت اس ملک میں بادشاہی تسلط بہت کم تھا۔ اس لئے کبھی ایک قوم کسی دوسری قوم پر اور دوسری قوم تیسری پر چڑھ دوڑتی۔ آپس میں لڑائیاں ہوتیں۔ مار دھاڑ کی جاتی۔ کمزور قوم کو اپنے علاقے چھوڑنے پڑتے۔ تنولیوں نے شمال کی طرف سے ڈل موہٹ وغیرہ پر قبضہ کیا۔ تو پھر کچھ لوگ اس علاقہ گوجرہ اور تربیلہ کی طرف بھی بڑھے۔ پہلے تو گوجروں اور لوہاروں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ان کو مار بھگایا مگر یہ جانتے تھے کہ ہمارے سامنے تنولیوں کے چند آدمی آئے ہیں۔ اگر یہ سب مل کر آگئے تو پھر مقابلہ محال ہے۔ چنانچہ گوجروں نے مشورہ کے بعد قوم سلیمانی کو جو بھار کوٹ میں آباد تھی یہاں لاکر بسانے کی کوشش کی۔ اور آخر یہ لوگ اس علاقہ کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر بھار کوٹ کو چھوڑ کر یہاں آگئے۔ چنانچہ موضع ٹاہلی انہی کی آباد کردہ ہے۔ تنولیوں نے جب دیکھا کہ اب گوجروں کے ساتھ سلیمانی بھی آکر آباد ہو گئے ہیں تو انہوں نے مل کر چڑھائی کی۔ پہلے تو گوجر اور سلیمانی دونوں کو شکست ہوئی۔ مگر تنولی اس ملک پر قبضہ نہ کر سکے کیونکہ تناولیوں کی اصلی عداوت اور لڑائی اُتمان زئی اور یوسف زئی سے تھی۔ کیونکہ یوسف زئی قوم نے ان کو اپنے علاقہ سے نکال کر اس ملک میں دھکیلا تھا۔ اس لئے تناولیوں کا رخ اس جانب پھر گیا۔ اور گوجروں وغیرہ کو کچھ آرام نصیب ہوا۔ لیکن ابھی تھوڑے دن گزرے کہ علاقہ اٹک سے ایک شاہی ملازم کسی نازیبا حرکت پر یہیں مار ڈالا گیا۔ غالباً بادشاہ کا کوئی نائب السلطنت اس وقت قلعہ میں تھا۔ جب یہ اطلاع وہاں پہنچی تو تفتیش شروع ہوئی۔ اور تفتیش میں یہ ثابت ہوا کہ ملازم مذکور کو سلیمانی قوم نے مارا ہے مگر گوجر بھی اس جرم کو مخفی رکھنے میں ان کے شامل حال ہیں۔ اب دونوں اقوام کے سرکردہ افراد پر ایک نئی مصیبت آپڑی۔ چنانچہ ہر دو اقوام نے اپنے بچاؤ کے ذرائع تلاش کئے تو ان کو پتہ لگا کہ مسمی حسن خان ترین جو علاقہ چھچھ میں رہتا تھا۔ نائب السلطنت کا ہم جلیس اور اٹک دربار میں عزت یافتہ تھا۔ غرض کہ ان لوگوں نے حسن خان کے پاس پہنچ کر منت خوشامد کی۔ اور اس نے عدالت میں اصل واقعہ کی نوعیت ظاہر کر کے ان کی سفارش کی تو ملزمان کو چھوڑ دیا گیا۔ چنانچہ یہ دونوں قومیں حسن خان کے اس احسان کو زیر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ اس کو اپنے علاقہ میں دعوت دی۔ اور جب وہ آیا تو اس احسان کے بدلے میں اپنے

ملک کا تیسرا حصہ اُسے پیش کر دیا۔ چنانچہ حسن خان نے اس پیش کش کو منظور کر لیا۔ اور وہ اپنے چند گھروں سمیت علاقہ چھچھ چھوڑ کر یہاں آگیا۔ اور اس نے موضع جٹو آباد کیا۔ اب یہ علاقہ تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور تینوں قومیں بحصہ برابر رہنے لگیں۔ چند سال اس طرح رہنے کے بعد پھر تنولیوں نے یورش کی۔ تو ان تینوں نے مل کر قوم اتمان زئی سے مدد طلب کی۔ اور ان کو اپنا حمایتی بنا کر اپنے ہمراہ لائے اب انہوں نے کئی بار لڑائی کر کے قوم تنولی کو شکستیں دیں۔ جب تنولی ہار چکے تو انہوں نے آئندہ فتنہ مٹانے کے لئے فیصلہ کیا۔ کہ اپنی اپنی پختہ حدود قائم کی جائیں چنانچہ جب ان میں صلح ہوگئی تو اب اُتمان زئی بگڑ بیٹھے اور انہوں نے خالی زمین پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اور قبضہ کی مضبوطی کے لئے اکا دُکا مکان بنانے شروع کئے۔ اور ساتھ ہی اعلان کر دیا جو شخص ہماری زمین کاشت کرے گا ہم کو بٹائی دے گا۔ چنانچہ اس طرح انہوں نے آہستہ آہستہ تقریباً چوتھائی حصہ ملک پر قبضہ کر لیا۔ ممکن ہے کہ دوسری تینوں قومیں تناولیوں سے مل کر ان کو ملک سے نکالنا چاہتیں تو نکال بھی دیتیں۔ مگر انہوں نے اتمان زئی کو اپنا محسن سمجھتے ہوئے ان سے لڑائی پسند نہ کی۔ آخر کچھ حصہ رضامندی سے ان کو دے دیا۔ اور تنولیوں سے پختہ حدود قائم کیں۔ تو اتمان زئی کے علاقے میں اُن کے ساتھ اکازئی اور یوسف زئی بھی آگئے۔ اب یہ علاقہ تین حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اب آپس میں قرعہ اندازی کی تو قوم سلیمانی کے ساتھ یعنی ٹاہلی کے علاقہ میں کنازئی، اور ترین کے ساتھ یعنی جٹو کے علاقہ میں اکازئی، اور آبادی موضع گوجرہ کے ساتھ علی زئی شامل ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد انہوں نے اپنے حصے فروخت کرنے اور ترین گوجر۔ سلیمانی نے خریدنے شروع کئے۔ چنانچہ اپنا زیادہ حصہ فروخت کر دیا جس سے بہت سا علاقہ دوبارہ اصل وارثوں یعنی گوجر سلیمانی اور ترین کے پاس آگیا۔ بہرحال اس کے بعد جلد ہی حکومت برطانیہ کا تسلط ہوگیا اور یہ لوگ اپنی اپنی ملکیت پر قابض رہے ؏

قوم گوجر کے چند مواضعات جاگیر اور ان کی تاریخ

موضع کوکلیا

کوکا خان پٹھان اکازئی نے آباد کیا۔ بعہد مسلمانی بڑے قحط میں ویران ہوا اور عہد درانی میں آباد ہوا۔

شجرہ



موضع کالس

پہلے گوجر گوت کالس اس میں آباد ہو چکے تھے۔ پھر قوم ترین کے عہد میں یہ گاؤں دلانا ک کے حصہ میں آیا۔

موضع سریہ

آبادی دو جگہ ہے سریہ اور راجپور۔ راجپور پرانی آبادی چودھری موسیٰ (مورث اعلیٰ قوم گوجر) نے آباد کی تھی۔ اُسی کی اولاد نے سریہ کی آبادی بھی کی۔ لیکن سریہ کی آبادی کا لاخان اللہ زئی ہی کی ثابت ہوتی ہے وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔ (نوٹ۔ عہد درانی سے سریہ بڑی آبادی ہے اور راجپور ر آج چند گھر ہی ہیں)

باندھی سریہ

قابض قوم گوجر کٹھانہ ہے۔ پٹھان اللہ زئی، آوان قطب شاہی اور سید گیلانی آباد ہیں۔

صورت دیہی کوٹ نجیب اللہ (۱۸۶۲ء)

یہ موضع من جملہ چوراسی ہزارہ سے ہے۔ اس کے رقبہ میں پرانی آبادی دولتا نامی ہوئی ہے جس کی آبادی کا دعویٰ چراغ دین چودھری کرتا ہے کہ مسمی سلیمان ہمارے بزرگ نے آباد کیا۔ اور اس کا فرزند دولت نام پر جو اُس وقت اور اُسی جگہ پیدا ہوا، دولتا نام رکھا۔

شاہداد خان ترین اپنے بزرگان کا آباد کیا ہوا بتلاتا ہے۔ مقدم احمد کے فرزند جو حاضر ہیں، مقدم سکندر کی آبادی بیان کرتے ہیں۔۔۔۔۔ چند مدت تک دولتا آباد رہا سمت ۱۸۱۶ بکرمی (۱۷۶۰ء) میں نجیب اللہ خان ترین نے کہ وہ درانیوں کی طرف اِن علاقہ جات پر مختار کار رہا، اپنا زور پیدا کرکے اس جگہ ایک قلعہ بنایا آبادی کی نیت سے مقدم طلب دین و مقدم مشرف کو آبادی کے اختیارات دئے انہوں نے زمینداران موضع دولتا کو کہ وہ لوگ اس جگہ بہ سبب قحط و خشکی آب تنگ آگئے تھے۔ اس جگہ سے لاکر یہاں آباد کئے۔ قوم کھتری و برہمن اور بعض دیگر زمینداران سرائے گدائی جو وہاں سے اجڑے ہوئے تھے شریک آبادی ہوئے۔ بلکہ کھتریاں کہتے ہیں کہ اول اول ہم حسب ایماء نجیب اللہ خان ترین آکر آباد ہوئے۔ اور دوسرے لوگ بعد میں آئے۔۔۔۔۔ ۵۰ سال ہوئے (یعنی ۱۸۱۲ء) کہ سمندر خان درانی اس ملک میں آیا۔ اور بہ مقام سری مقدم مشرف لڑائی کرکے اُس کو شکست دی۔ لیکن یہ گاؤں اس نے سوخت کرکے ویران کر دیا۔ بعد چند روز کے سمندر خان درانی مقدم مشرف کو بہ لحاظ اُس کی جوانمردی و ہمت طلب کرکے بعد عطائے خلعت آبادی کا حکم دیا۔ مقدم مشرف نے اُسی پہلی جگہ پر آبادی کی۔ مگر قلعہ نجیب اللہ خان بے مرمت و ناتیار پڑا رہا۔ پھر عملداری سکھاں میں یہ گاؤں

دو دفعہ ویران اور سوخت ہوا۔ پہلی دفعہ بھائی حکماں سنگھ اور دوسری دفعہ دیوان مولراج نے ویران کرکے سوخت کیا۔ مگر جلد ہی اسی وقت آباد ہوتا رہا۔ سردار ہری سنگھ کے عہد میں قلعہ بے مرمت ہوکر مسمار ہوگیا۔ دولتا کی آبادی کوٹ نجیب اللہ سے بطرف دکھن بہ فاصلہ ایک میل ہے۔

وجہ تسمیہ:- نجیب اللہ نے اپنا کوٹ بناکر تھانہ بٹھایا۔ اور اس کے نام پر کوٹ نجیب اللہ مشہور ہوگیا۔

جب سردار ہری سنگھ نے محمد خان کو مار دیا تو اس کے فرزندان فرار ہوکر پار دریائے سندھ کھبل چلے گئے۔ بعد مرنے سردار ہری سنگھ کے جہاں سنگھ نے احمد خان ولد محمد خان کو بلاکر موضع ڈویاں میں ایک ہزار کی جاگیر دی۔ اور حکم آبادی کوٹ نجیب اللہ کا دیا۔ پھر عملداری گلاب سنگھ میں غلام خان کو چار ہزار کی جاگیر دی۔ اور رسومات شادی وغیرہ میں ترین داگفتار ہوئے۔

سرائے گدائی

علاوہ دیگر سنگھاں میں بہ اجازت سردار ہری سنگھ نلوہ قوم گوجر چیچی کے مسمیان نور، سعد اللہ، کامول وغلام نے کوٹ نجیب اللہ سے آکر اس گاؤں کو آباد کیا۔ یہ رقبہ کوٹ نجیب اللہ کا تھا (یہ آبادی دوسری دفعہ ہوئی ہوگی۔ پہلی آبادی گدائی خان نے کی تھی۔ اور نجیب اللہ خان کے عہد میں اس آبادی سے بہت سے ہندو و دیگر لوگ کوٹ نجیب اللہ کے آباد ہونے کے وقت آکر آباد ہوگئے)

صورت دیہی کے مطابق گدائی خان ترین نے پہلے آباد کیا تھا۔ اور موجودہ ترلاکوٹ کی جگہ منیر خان ترین نے عہد اسلام میں ایک قلعہ بنایا تھا۔ اور قلعہ کو کوٹ بھی کہتے ہیں۔ اس کا نام کوٹ منیر خان مشہور رہا۔

پچھنبہ پنڈ

قوم گوجر کٹھانہ کا ہے اور عہد اسلام سے اُن کے قبضہ میں ہے۔ اس کو مقدم مشرف نے عہد سکھاں میں کوٹ سے الگ کیا۔ آبادی اس کی برائے روک مقام حملہ تارخیلیاں کے کالی گئی مقدم احمد کے حصہ میں تھا۔

جاگل

صورت دیہی قوم گوجر جاگل آباد ہے۔ دو سو برس سے زائد (یعنی ۱۶۶۲ء سے۔ ش ب) ہوتا ہے کہ چودھری جھنڈا ان کے مورث اعلیٰ نے گجرات سے آکر آباد کیا۔ سمندر خان درانی کے وقت کچھ ویرانی ہوئی۔ یہ بھی موضع ڈیڈر کی طرف اِن گوجروں کے پنجاب سے آنے کی تصدیق کا ثبوت ہے۔

بجیدہ۔ جوگی موڑہ میں گوجر چیچی اکبر بادشاہ کے وقت سے آباد ہیں۔

ڈیڈر۔ قوم گوجر کٹھانہ کا ہے۔ عملداری اسلام میں بادشاہ وقت کی جانب سے یہ علاقہ کوٹ نجیب اللہ مقدم سکندر بزرگ ہمارے کو عطا ہوا۔ اس وقت بزرگ مذکور نے گوجرات (پنجاب) کی طرف سے آکر

دخل مالکانہ اس گاؤں پر شامل کل علاقہ پایا۔ ترینوں کا اس علاقہ پر دخل حاکمانہ رہا ہے نہ کہ مالکانہ۔ عہدِ سکھاں میں مقدم مشرف نے زیادہ اقتدار و عزت حاصل کی اسی سبب سے کل اولاد مقدم سکندر کا دخل وراثت میں نہیں ہوا۔ مقدم مشرف بذات واحد مالک رہ کر اوروں کو گزارا دیتا رہا۔ اسی طرح اولاد مقدم مشرف میں بھی عمل رہا۔ اور مقدم احمد بڑا بیٹا اس کا قابضِ وراثت ہوا۔

وجہ تسمیہ:۔ پہلے گوجر دیڈڑ آباد تھے۔ لہٰذا یہی نام ہوا۔

موضع چھاڑ علاقہ کوٹ نجیب اللہ اس جگہ مقدم مشرف نے ایک برج واسطے حفاظت کوٹ از تارخیلاں گٹھ گر بنایا۔

ترین

یہ خوش نصیب قوم جب سے ہزارہ میں وارد ہوئی رُو بہ عروج رہی۔ اگرچہ اس کی زندگی میں نشیب فراز آتے رہے لیکن یہ اٹھ اٹھ کر آگے ہی بڑھتی رہی۔ ابدالی (درانی) اس کے ہم جد ہیں۔ احمد شاہ ابدالی اٹھارہویں صدی کے آخری نصف سے ذرا پہلے افغانستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اور شمالی ہندوستان دہلی تک اس نے فتح کر لیا۔ تو ترین قوم کو بھی ہزارہ میں عروج حاصل ہو گیا۔ درانیوں کی طرف سے نجیب اللہ خان ترین میدانِ ہزارہ کا حاکم ہو گیا۔ اس نے ۱۷۶۲ء سے ۱۷۹۹ء تک حکومت کی۔ اس کی وفات کے بعد اس کی نیک بخت اور پرہیزگار بیوی۔ بیوی۔ نا بیگم نے بڑی قابلیت سے اپنے صغر سن بیٹے محمد خان کا سربراہ ہو کر کاروبارِ حکومت چلایا۔ اس کے بیٹے محمد خان کے جوان ہونے کے وقت سکھوں کی حکومت کی طرف سے ہزارہ پر حملے شروع ہو گئے۔ محمد خان نے بڑی جوانمردی سے ان کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار ان ظالموں کے ہاتھ سے اس کو موت کا پیالہ چکھنا پڑا۔

سکھوں کے زوال اور انگریزوں کی آمد آمد کے وقت نجیب اللہ خان کا پوتا غلام خان بڑی شجاعت اور ہوشیاری سے سکھوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ آویزش میں آخر کار میدان ہار گیا۔

اس کی وفات (جو الہ آباد جیل میں پھانسی سے واقع ہوئی) کے بعد اس قوم کا آفتاب گہنا گیا۔ لیکن یہ قوم آہستہ آہستہ اٹھنے کا سامان کرتی رہی اور تقریباً سو سال کے بعد (اور یہ زمانہ قوموں کی زندگی میں بہت قلیل ہے) اس قوم کا ایک نامور فرد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ساکن ریحانہ ۱۹۵۸ء میں حکومت کا صدر ہوا۔ اور یہ قوم پھر اپنے انتہائی عروج کو پہنچی۔

ترین

یہ پٹھان اور اولاد سڑبن ہیں

ترین

ابدال — سپین — تور

ابدال: سدوزئی اور درّانی اس کی اولاد ہیں

سپین، تور: ان دونوں کی اولاد سپین ترین اور تور ترین کے نام سے مشہور ہے۔ تور ترین تحصیل ہری پور و تحصیل ژوب کی ضلع لورالائی بلوچستان میں آباد ہیں۔ کچھ سپین ترین تربیلہ میں اور باقی یہ قوم پشین میں آباد ہے۔ ان ترینوں ہی کی ایک شاخ ملکیار ہے جس کے نام پر ہری پور میں ملکیار کا ایک گاؤں آباد ہے۔

ترین نسب کے لحاظ سے شیرانیوں سے بھی ملتے ہیں۔ کوئٹہ، پشین، سبی اور لورالائی میں آباد ہونے سے قبل ترین قندھار کے گرد و نواح میں بستے تھے۔ تیموریوں کے زوال کے بعد انہوں نے وہاں کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابدال پسر ترین محمود غزنوی کا ہم عصر تھا۔ تور اور سپین ترین اپنے آبائی وطن سے ہزارہ میں آ کر آباد ہو گئے۔

مقامی روایات کے مطابق ان کی شاخ ملکیار نے چودھویں صدی عیسوی میں کاکڑ اور رشیدول کی اولاد سے پشین کو زمند سے فتح کر کے قبضہ کر لیا۔ شاہ جہان بادشاہ کے وقت میں یہ پریشان ہوئے لیکن آخر کار وہ اس ملک میں مضبوطی سے قائم ہو گئے۔ پکڑ خان ترین احمد شاہ ابدالی کا ہم عصر تھا۔ اس نے ترین اثر و رسوخ کو بہت بڑھایا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ اس کا پوتا پائندہ خان حکومت قندھار کا مخالف ہو گیا اس لئے اس کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ اور ترینوں کی طاقت پشین سے زائل ہو گئی۔

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ترین ہزارہ میں گوجر قوم کی دعوت پر آئے اور ان کو بے دخل کر کے اُن کے علاقوں پر آہستہ آہستہ قابض ہو گئے۔ تاریخی لحاظ سے اس قوم کا جو شخص سب سے پہلے ہزارہ میں آیا وہ شیر خان تھا۔ شیر خان کو گورنر قندھار نے ۱۶۳۱ء میں ملک بدر کر دیا تھا۔ یہاں آ کر شیر خان شاہ جہان کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اس نے شیر خان کو بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ اور ایک ہزار سوار رکھنے کی اجازت دی۔ اور دہ ہزاری منصب عطا کیا۔ شیر خان کو جاگیر بھی دی جو غالباً اسی علاقہ میں تھی جس میں اب یہ قوم رہتی ہے۔ تاریخ ہزارہ (ص ۴۸۵) کے مطابق یہ قوم ہزارہ اور اقوام

پٹھان ۔ یوسف زئی ۔ ترکلانی ۔ اتمان خیل ۔ محمد زئی ۔ ورک ۔ مَتّی ۔ سرکانی ۔ آفریدی ۔ مہمند ۔ خلیل خٹک وغیرہ بعہد سلطان محمود غزنوی آئی ۔ جب اس نے سومنات فتح کرلیا ۔ تو اقوام افغان کا ستر ہزار گھر خراسان سے ان علاقہ جات مفتوحہ ملک ہندوستان کو جو ویران ہو چکے تھے آباد کرنے کے لئے روانہ کیا ۔

۱۰۲۶ھ میں اس قوم ترین کا مورث اعلیٰ مسمی ہارون نے علاقہ چھچھ میں آکر موضع ہرون اپنے نام پر آباد کیا ۔ اور بہت مدت کے بعد اسی ہارون کی نسل سے بوستان خان مورث قوم ترین ہزارہ نے ۱۶۲۰ء میں موضع ڈوڈی آبی (نزد درویش) آباد کی ۔ اس کے بعد ۱۶۵۰ء میں بوستان خان کے پوتے ملک درویش نے موضع درویش کی آبادی اپنے نام پر کی ۔

حیات خوشحال خان خٹک مصنفہ دوست محمد کامل کے ص ۱۱۳ پر ایک تاریخی واقعہ تحریر ہے جس کا یہاں پر درج کرنا باعث دلچسپی ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ اپریل ۱۶۶۷ء میں موضع ہرون نزد حضرو یوسف زیوں اور مغل فوج میں سخت جنگ ہوئی ۔ اسی سال مئی میں صوبہ دار کابل ۔ نے شمشیر حیات خان ترین کو بادشاہی افواج متعینہ اٹک کی امداد کے لئے کابل سے بھیجا ۔

مزید تاریخ ہزارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گدائی خان پسر ملک درویش نے اور مواضعات آباد کئے ۔ خاص کر سرائے گدائی اسی کے نام پر ہے ۔ باقی دیہات پٹی ترینی کی آبادی نعمت خان ، عنایت خان و بہادر خان پسران گدائی خان اور ان کی اولاد نے کی ۔ بموجب تاریخ ہزارہ مہتاب سنگھ ترین قوم پٹی گوجری میں خرید فروخت سے قابض ہوئے ۔ اس کے مطابق ہزارہ میں اُس وقت چوراسی دیہات تھے ۔ جس کی وجہ سے اس کو چوراسی ہزارہ کہتے تھے ۔

۱ ۔ پٹی تورکی ۱۲ دیہات ۔ ۲ ۔ پٹی دلازاکی ۱۲ دیہات ۔ ۳ ۔ پٹی گوجری و ترینی ۱۲ دیہات ۔ ۴ ۔ پٹی خالصہ متعلق کھلابٹ ۱۲ دیہات ۔ جس زمانہ میں دیوان لعل چند نے آکر ملک ہزارہ کی تقسیم کی ۔ اس وقت گوجروں کے سرکردہ چوہدری موسیٰ و چوہدری عیسیٰ تھے ۔ ان کی رہائش موضع کاہل (کنڈی) اور راجپورہ نزد سریہ تھی) انتظام و قابلیت کی وجہ سے وہ حاکم وقت دیوان مول چند کے منظور نظر تھے ۔ اس وقت کے ترین قوم کا مورث ہمت خان ([illegible]) ان کی مقبولیت پر رشک کرنے لگا ۔ ان کو ایک جرگے کے لئے بلایا اور اپنے مسلح آدمی موضع ٹوڈو (نزد دینیاں) کے نالہ میں بٹھا دئے ۔ جب بات چیت کے بعد وہ اپنے گھر دولتاد پرانی آبادی کوٹ نجیب اللہ کے جنوب میں تھی اب ویران ہو چکی ہے ۔ جانے کے لئے وادی ٹوڈو کے نالہ میں پہنچے تو ان کو قتل کر دیا گیا ۔

ہمت خان ترین پٹی گوجری پر قابض ہو گیا ۔ اور کابل و کشمیر کا راستہ اس کے ہاتھ میں آگیا ۔ مسافروں سے

محصول وغیرہ لینے لگ گیا ۔ جب کبھی فوج آتی تو پہاڑوں میں چلا جاتا ۔ ہمت خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نجیب اللہ خان سردار رہا ۔ وہ شکار کا بہت شوقین تھا ۔ اس نے اپنے کام کے لئے مقدم مشرف کو کار دار رکھا ۔ اس نے ملک میں امن و امان قائم کیا ۔ مندرجہ بالا سب بیان مہتاب سنگھ کی تاریخ کا ہے ۔

کلیات ترین (مرتبہ ۱۹۷۴ء) میں تحریر ہے کہ ہرون کی اولاد سے چار شخص تھے ۔ ان میں سے ایک تربیلہ چلا گیا اور موضع جبڑو آباد کیا ۔ دوسرا علاقہ حسن ابدال کو چلا گیا اور وہاں خود وہ خورشین آباد کیا ۔ تیسرا ہندوستان کی طرف چلا گیا ۔ اور شہر چندیلہ ضلع مراد آباد آباد کیا ۔ اور چوتھا مورث اعلیٰ بوستان خان ہزارہ میں آیا ۔ اور موضع ڈوڈی آبی آباد کی ۔ بوستان خان اور اس کا بیٹا برّہ خان ڈوڈی میں رہے ۔ جب ملک درویش پسر برّہ خان جوان ہوا تو اس نے موضع درویش آباد کیا ۔

اس کلیات کے بموجب ترین قوم کی آبادی نے پانچ بادشاہیاں دیکھیں ۔ اول سلطان محمود غزنوی جس وقت وہ یہاں آکر آباد ہوئے ۔ دوم ۔ سلطنت شاہانِ دہلی ۔ سوم ۔ سلطنت درانیاں احمد شاہ وغیرہ ۔ چہارم عملداری سکھاں ۔ پنجم سرکار انگریزی ۔

درویش کے بعد دیگر مواضعات بھی آباد کئے حکومت کو مقررہ مالیہ دیتے رہے اور قوم ترین اپنے مقبوضات پر مالک رہی ۔ عملداری شاہانِ دہلی بہت مدت رہی چونکہ امن و عافیت تھی لہٰذا آبادی زیادہ ہوتی گئی ۔ شاہانِ دہلی کا ایک حاکم سکندر پور میں برائے وصولی مالیہ رہا کرتا تھا ۔ اور سب مالکان اپنے حصہ کا مالیہ اس کو ادا کرتے تھے ۔ یہ انتظام کافی مدت رہا ۔ پھر رحیم خان پسر عنایت خان کو اس حاکم نے سکندر پور کے قلعہ میں کسی تہمت کی بنا پر قتل کر ڈالا ۔ ہمت خان پسر رحیم خان نے دہلی میں جاکر فریاد کی ۔ تو حاکم سکندر پور معزول ہو گیا ۔ اور تحصیل معاملہ کے لئے اٹک منظور ہوئی ۔ لہٰذا کل وارثان ہزارہ ، چھچھ و گھاٹ وہاں جاکر معاملہ (مالیہ) دیتے رہے ۔ یہی حال سلطنت درانیاں میں قائم رہا ۔ جب تک ان کی بادشاہی قائم رہی ۔ وہ اکثر اس راہ سے کشمیر کو جایا کرتے تھے ۔ ہزارہ کا معاملہ (مالیہ) ہر سہ حصہ کا پٹی ترینی ، پٹی دلازاکی و پٹی تورکی کا بموجب دفتر بادشاہِ دہلی لیتے رہے ۔ جب ان کی سلطنت ضعیف ہو گئی اور کامل انتظام نہ رہا ۔ تو معاملہ میں نقصان آگیا ۔ اور یہ دستور ہو گیا کہ جب وہ مع فوج کشمیر کو جاتیں تو راستہ میں ہزارہ سے بھی معاملہ بزور جس قدر وصول کر سکیں کر لیں ۔ اور بطور ضیافت کے بھی کچھ لیں ۔ اور کبھی کبھی دیہات کو جلا دیں ۔ اور ہم لوگ معہ اہلیت علاقہ کنڈی کاہل چلے جائیں ۔ اور کبھی ان کو مل بھی جائیں ۔ چند مدت تقریباً آٹھ برس تک یہ حال رہا ۔ اس کے بعد ایک شخص منگل سنگھ راولپنڈی کے علاقہ سے آیا ۔ اس کے ساتھ جھگڑا ہوا ۔ ہم سے اس نے اس بات پر صلح کر لی ۔ کہ وہ ہم سے تعرض نہ کرے گا اور پٹی تورکی و دلازاکی سے معاملہ

وصول کرے گا۔ اس نے مانگرلئے کے نزدیک ڈھیری پیر مانکا پر ایک گڑھی بنائی۔ اس کے بعد لکھن سنگھ آیا۔ اس نے شاہ محمد و سرائے صالح میں گڑھی ڈالی۔ لیکن کچھ امن نہ ہوا۔ ہم بدستور اپنی پٹی سے معاملہ نقدی و بٹائی لیتے رہے۔ اس کے بعد امر سنگھ از طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ آیا۔ وہ حکومت سکھاں کی جانب سے آیا تھا اور ملک کو آباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اول ترینوں سے تجویز کر کے نادر خان و رحمت خان اولاد نجیب اللہ خان کو چہارم اپنے حصہ کی جاگیر کے طور مندرجہ ذیل دیہات الگ کر دیئے۔

ڈوئی ہر دو خشکی و آبی، درویش، ڈھینڈہ، بھوٹڑی، لدھا، کل علاقہ کنڈی کاہل اور بکہ۔ باقی دیہات بقیہ کل قوم ترین۔ ترین اپنے حصہ کے مزارعان سے دہ یکی (عشر، $\frac{1}{10}$ حصہ ش ب) لیتے رہے۔ چھ فصل (۳ سال ش ب) یہ حال رہا۔ پھر سردار ہری سنگھ حاکم ہزارہ ہو کر آ گیا۔ (سنہ ۱۸۲۲ء ش ب) سات آٹھ برس تک قوم ترین جاگیر چہارم اور نیز دہ یکی کل اپنی پٹی کی کھاتے رہے۔ اس کے علاوہ محمد خان دوسرے علاقہ کے دیہات۔ واہ۔ بیجاڑ۔ جہاں آباد۔ پوڑ۔ میں جاگیر کھاتا رہا۔

ہری سنگھ کے وقت میدان کے دیہات رعیت ہو گئے تھے۔ لیکن گرداگرد پہاڑی علاقے کے لوگ مثلاً سری کوٹ، گندگر، تنولی، جدون و کرڑال باغی رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی میدان ہزارہ کے دیہات کے لوگ فساد کر دیتے تھے۔ اس واسطے سردار ہری سنگھ کو شک ہوا کہ محمد خان وغیرہ قوم ترین کی صلاح سے یہ فساد ہوتا ہے۔ اس گمان پر سردار ہری سنگھ نے محمد خان کو قید کر دیا۔ اور اکثر زن و بچہ قوم ترین کو قلعہ ہرکشن گڑھ (ہری پور) میں قید رکھا۔ چنانچہ فتح خان بعمر ۴ برس اور پائندہ خان بعمر ۵ برس قید کئے گئے اور پابجولاں ہو کر یہ سب بچے قلعہ ہرکشن گڑھ میں پنجرہ میں قید رہتے تھے۔ قوم ترین کی جاگیر وغیرہ ضبط ہو گئی۔ جو ترین دہ یکی والے تھے وہ اپنے حصہ پر قابض رہے۔ جب قوم ترین کی پامالی ہو گئی تو دہ یکی والوں سے بھی زیادہ از حیثیت اسپ، باز وغیرہ گراں قیمت بطور نذرانہ طلب ہونے لگی۔ ترین اس دہ یکی حصہ سے بھی بہت تنگ ہوئے۔ لہٰذا جب کچھ نقدی بھی ان کے پاس نہ رہی تو اپنے حصے چھوڑ کر متفرق دیہات میں جا بسے۔ جو ترین قید میں تھے ان سے بہت بھاری جرمانے لے کر آزاد کیا۔ ترین قوم پر یہ وقت بہت عسرت کا تھا۔ محمد خان کے قید ہونے کے بعد اکثر ترین بے دخل ہو گئے۔

ترین قوم میں صاحب دستار و بزرگ قوم کا گھر نجیب اللہ خان کا رہا ہے۔ پھر وہ عہد درانی میں حاکم ہزارہ بھی ہو گیا۔ اس کا فرزند محمد خان بھی اس کے بعد اس کی جگہ خان ہوا۔ کلیات ترین میں دوسری اقوام میدانِ ہزارہ کے بیان کے مطابق اس میدانِ ہزارہ میں آبادی سب سے زیادہ قوم گوجر کی رہی ہے اسی وقت سے پٹھان۔ پنی۔ ملکیار، آوان وغیرہ آباد ہیں۔ اس سب میدانِ ہزارہ موجودہ پٹی ترینی،

تورکی، دلزاکی کا مشخصہ معاملہ کم و بیش بارہ ہزار ہوا کرتا تھا اور قوم گوجر کے رئیس چودھری عیسیٰ و موسیٰ راجپور کاہل میں رہتے تھے۔ اور ان کل دیہات کے تعلقہ دار تھے۔ ان کی معرفت معاملہ سرکاری وصول ہو کر خزانہ سرکار اٹک میں داخل ہوا کرتا تھا۔ گوجر اپنے دیہات کے اور قوم آوان، پٹھان پنی و ملکیار وغیرہ اپنے اپنے دیہات کے وارث تھے۔ چودھری عیسیٰ و موسیٰ ساکنان راجپور و کاہل آدمی ذی عزت دولت مند و تعلقہ دار تھے۔ اس وقت سوائے پٹی تورکی و دلزاکی کے خاص اس علاقہ کے دیہات جو اب بنام پٹی ترینی مشہور ہوتے ہیں۔ مفصلہ ذیل آباد تھے۔

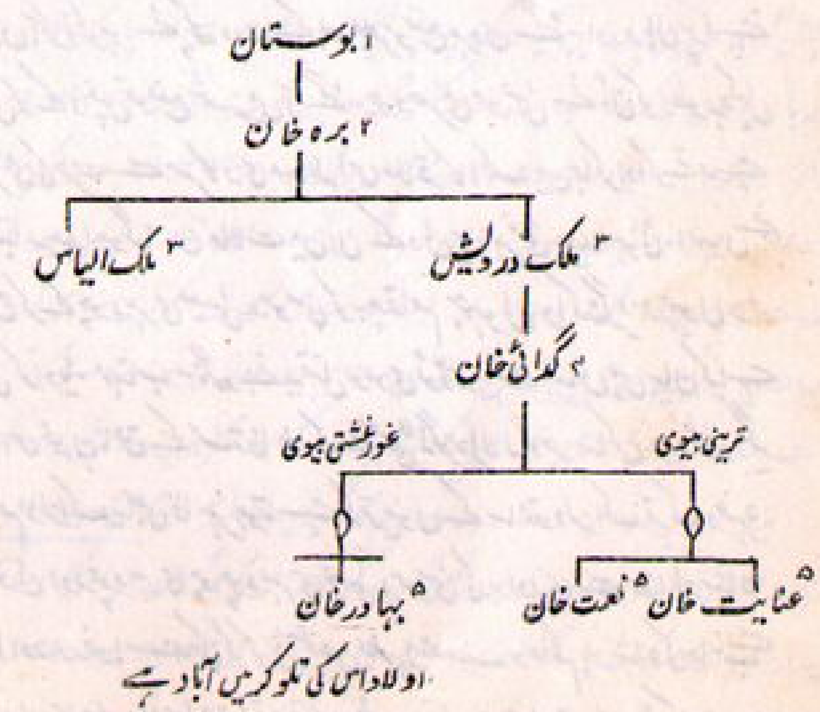
سمہ قریب درویش کے آباد تھا۔ اب وہ ویران ہے اور اس کی جگہ اب درویش آباد ہے دولتہ۔ اب ویران ہے اور اس کی جگہ کوٹ نجیب اللہ آباد ہے۔ چچیر پنیاں۔ ڈوئی خشکی و آبی۔ بھوٹڑہ۔ اب اس کی زمین شامل جاگل ہے۔ پہاڑو۔ موڑہ پرانا۔ اس جگہ اب موڑہ جدید آباد ہے۔ جاگل۔ ڈھینڈہ۔ میلم۔ ملکیار۔ سکندرپور۔ کاہل۔ گل ڈھیری۔ منگ۔ بریلہ۔ سریہ۔ کھیوا۔ ٹکمہ۔ کھدو پنجو۔ بانڈھی سیڑاں۔ میرپور۔

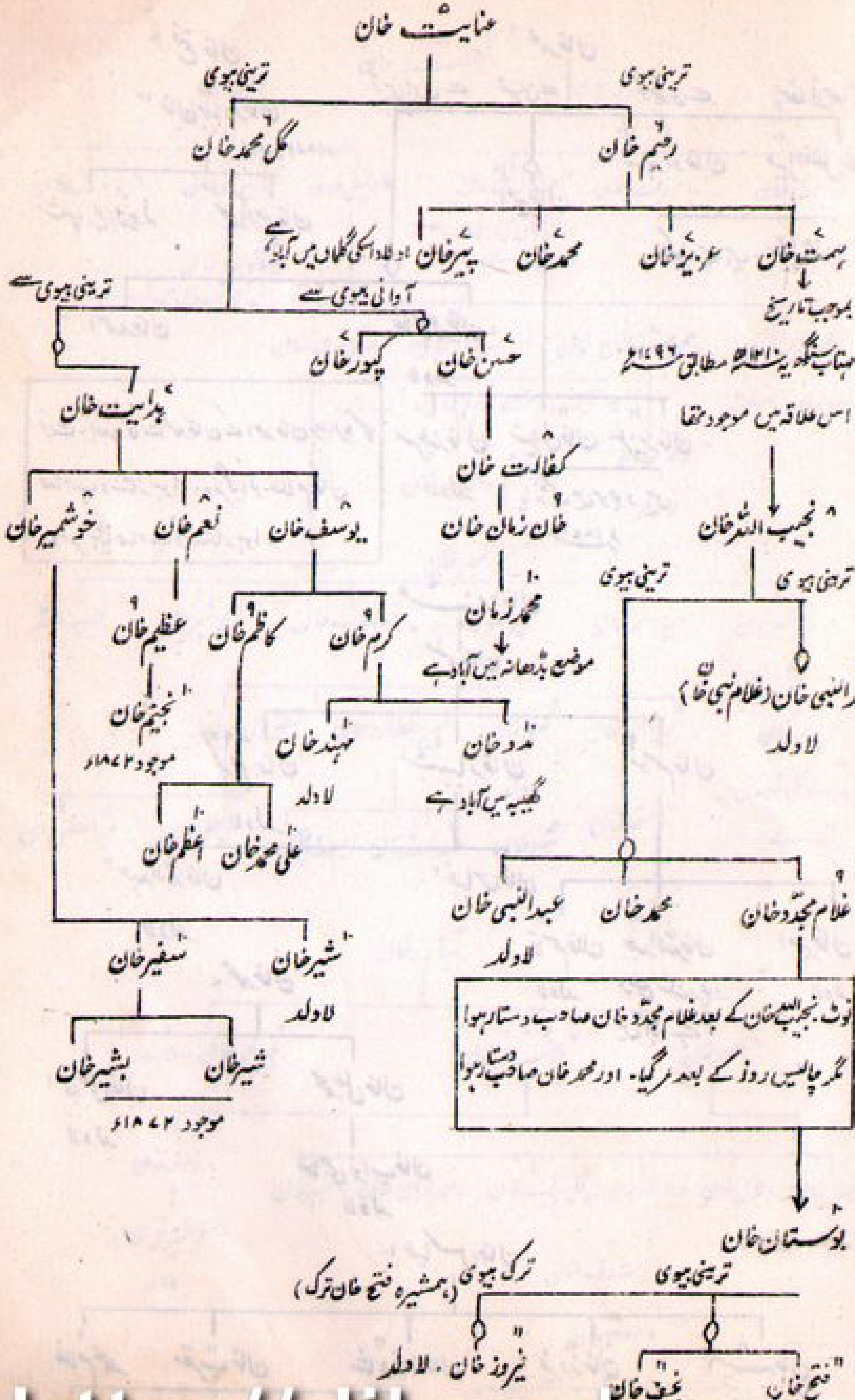
اور جب یہ گاؤں آباد تھے اور مختلف اقوام قابض تھیں تو قوم ترین کا اس ملک میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ مدت تک یہ حال رہا۔ پھر دو شخص ایک ملک درویش اور اس کا بھائی ملک الیاس ساکن موضع ہرون علاقہ چھچھ سے برادرانِ خود کے غلبہ سے مفرور ہو کر موضع شمسہ میں چودھری موسیٰ، عیسیٰ تعلقہ دار علاقہ کے ہاں آ کر نوکر ہو گئے۔ کچھ مدت کے بعد پھر موضع ہرون گئے۔ اور وہاں پر اپنے بھائی کے خون کے بدلہ میں قتل کر کے واپس موضع شمسہ میں آ گئے۔ چودھری موسیٰ نے ان کو بطور وکیل مجاز مقرر کیا۔ اور وہ چودھری کی طرف سے سرکاری معاملہ اس علاقہ کا اٹک میں جا کر ادا کرتے رہے اس آمد و رفت میں ان کا اعتبار پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں ان کے دل میں بدنیتی پیدا ہوئی۔ انہوں نے قوم جدون وغیرہ سے صلاح کر کے چودھری عیسیٰ و موسیٰ کو بمقام جھول واکنگڑ (جھول دا بمعنی جھومتا۔ ش ب) قتل کروا دیا۔ مہتاب سنگھ نے یہ قتل وادی ٹوڈو۔ نزد پنیاں میں بیان کیا ہے تفصیل پہلے دی جا چکی ہے اس خونِ ناحق کے استغاثہ کے لئے مسمی لالہ گوجر ساکن دیدڑ و دیگر چند افراد و مطابق کلیات قوم دلزاک یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ترینوں کے ساتھ دلزاک ترک وغیرہ اس قتل میں امدادی تھے) یا کوئی اور چودھری جو چودھری عیسیٰ و موسیٰ کی برادری سے تھا بادشاہ دہلی کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ کوئی شخص بطور منصف و حاکم بادشاہ کی جانب سے مقرر ہو کر ہزارہ جائے اور ہماری داد و انصاف قوم ترین وغیرہ اقوام ہم صلاح سے کر دیوے

اس وقت صالح محمد خان دلزاک آباد کنندہ سرائے صالح بادشاہ کی خدمت میں نوکر و حاضر تھا (یہاں یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۰۳۶ھ میں شہنشاہ جہانگیر نے دلازاکوں کو لاہور کی طرف جلاوطن کیا تھا۔ لہذا یہ استغاثہ اس سنہ سے بعد کا ہی ہو گا) صالح محمد نے چودھری کو فہمائش کی کہ بادشاہ کو اس کا نام (صالح محمد خان) درخواست میں پیش کرے۔ تاکہ وہ خود جا کر اس کی دادرسی اچھی طرح سے کرے۔ وقت استغاثہ چودھری مذکور نے صالح محمد خان کو ہمراہ لے جانا چاہا۔ بادشاہ کے حضور سے منظور رہوا۔ جب چودھری معہ صالح محمد ہزارہ میں آیا تو صالح محمد نے اُلس (مجمع عام) میں رضامندی ملک درویش وغیرہ مردمان قوم ترین و گوجر، دلازاک و ترک کے کرادی۔ اور چار تعلقہ دار مقرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک معاملہ اسی طرح ادا ہوتا رہا۔ قوم ترین روز بروز طاقتور ہوتے گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد قوم درّانی کی بادشاہی ہو گئی۔ چونکہ قوم ترین دُرّانی قوم کی برادری میں تھے۔ لہذا اس علاقہ میں قوم ترین کی پوری حکومت ہو گئی اور معاملہ سرکاری اُن کی معرفت ادا ہونے لگا۔ یہ حال عملداری سکھاں کے ابتدائی عہد تک رہا:

شجرہ نسب قوم ترین

مطابق تاریخ ہزارہ (ولیس) ـــــ و ـــــ صورت دیہی درویش





- ۱۱ فتح خان
  - ۱۲ خان بہادر خان — موجود ۱۸۷۲ء
    - شجاع الدولہ
    - ۱۳ محمد اکرم خان

- ۹ محمد خان
  - ترینی بیوی سے
    - احمد خان
    - ۱۰ غلام محمد خان — لاولد
  - تنولن سے
    - ۱۰ امیر خان
      - سربلند خان — لاولد
      - شیر دل خان
      - عزیز خان
      - پانڈک میں موجود ہیں ۱۸۷۲ء
  - گوجری سے
    - شاہداد خان
  - پٹھانی جاچھی
    - میر افضل خان
  - ملکیار میں ہیں۔ ۱۸۷۲ء

نوٹ۔ بعد وفات محمد خان کے احمد خان بڑا لڑکا صاحب دستار ہوا۔ وہ مرگیا تو غلام خان دوسرا بیٹا صاحب دستار ہوا۔

- عزیز خان
  - ۸ منیم خان
    - ۹ کرم خان — لاولد
    - ۹ شہباز خان
      - ۱۰ عبداللہ خان — لاولد
      - ۱۰ عباس خان
    - ۹ موسم خان
      - قاسم خان — لاولد
      - عبداللہ خان — موضع سکندرپور میں آباد ہے
      - امیر خان — لاولد

- ۷ محمد خان
  - احمد علی خان — لاولد
  - محمد علی خان
    - حاجی نواب خان — لاولد

- ۱۰ عباس خان
  - غلام محمد
  - مقرب خان
  - شاہ نواز خان
  - (← غیر قابض →)
  - فیروز خان — موجود ۱۸۷۲ء
  - امیر خان — لاولد

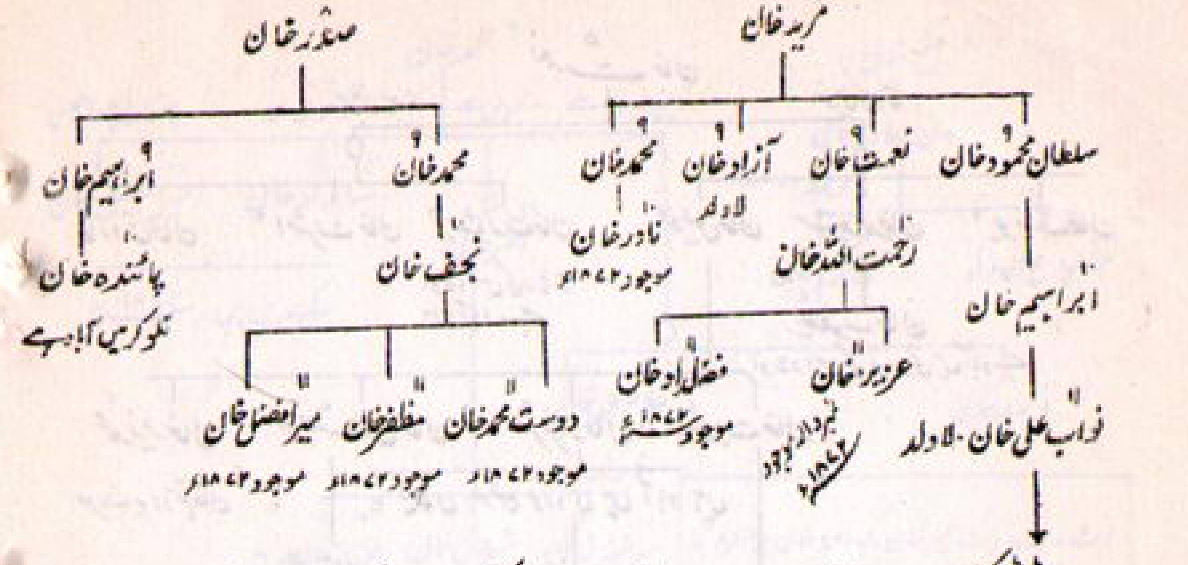
- نعمت خان
  - ترینی بیوی
    - فاروق خان
    - ۷ اشرف خان
    - ۷ بشارت خان — اولاد اس کی زمانہ میں آباد ہے
  - ترینی بیوی
    - ۷ دلیل خان
      - محمد زبیر خان — معروف بہ دوستم خان
      - محمد صلاح خان
        - ۸ رحم خان — لاولد
      - سرفراز خان
      - صلابت خان
      - یہ تینوں موضع فوردی میں آباد ہیں
    - سید محمد خان
      - یعقوب خان — اولاد اس کی فوردی میں آباد ہے
    - ۷ یوسف خان

- ۸ ذوالقدر خان
  - ۹ امیر خان
    - منیر خان — لاولد
    - میر احمد خان
    - میر محمود خان
    - قسطب خان
    - فتح شیر خان
    - نجیب اللہ

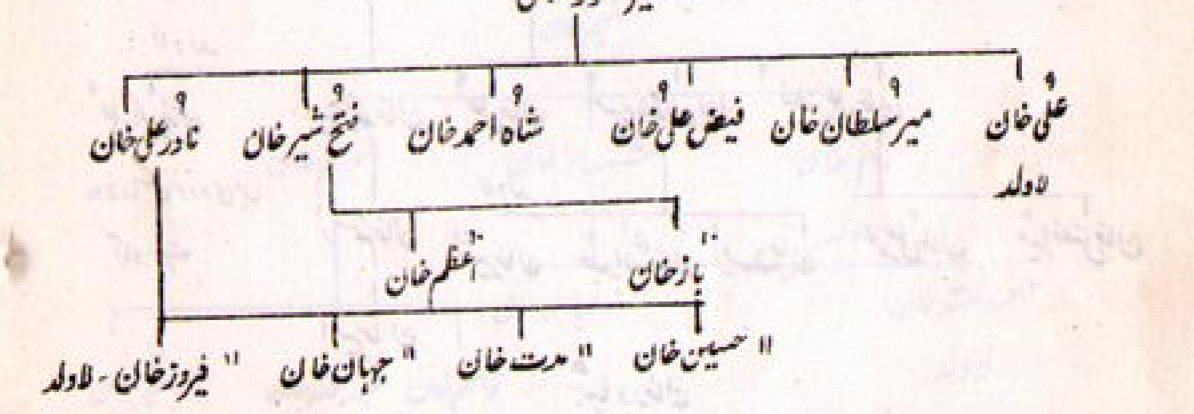
- علی اکبر خان — اولاد اسکی فوردی میں آباد ہے
- میر احمد خان
  - رستم خان
    - امیر خان
- علی خان — لاولد
- میر سلطان خان
  - شبیر خان
  - عبداللہ خان
  - الیاس خان
- فیض علی خان
  - محمد علی خان
  - میر افضل خان

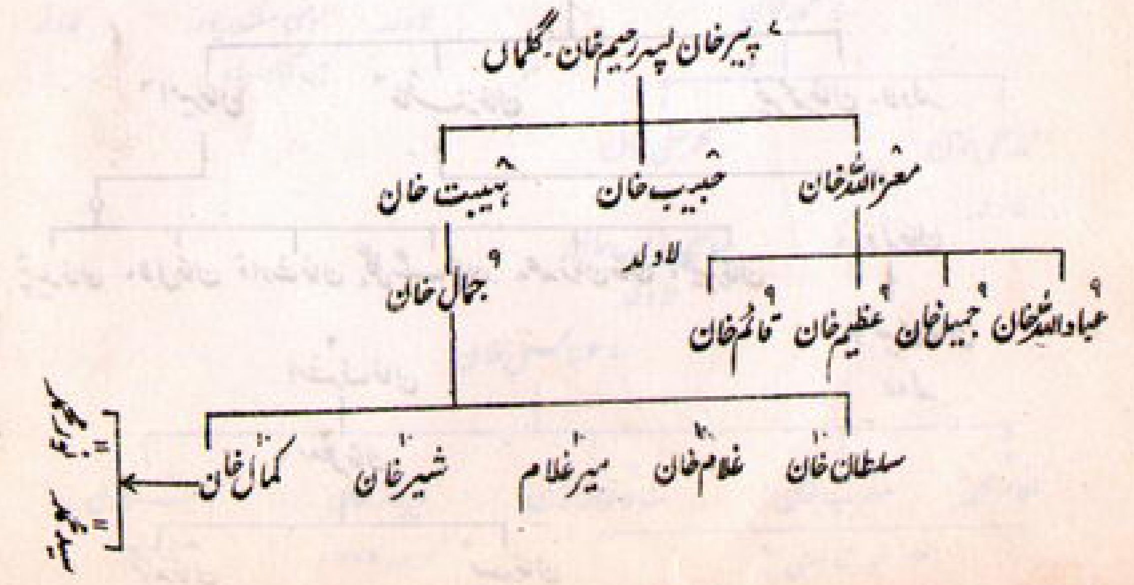
- بہادر خان
  - ۶ امیر خان
    - جمیلہ خان
    - لال خان
    - وارث خان
    - گل بیگ خان
    - محمد زمان خان
    - خیبر خان
  - ۶ خائستہ خان
    - ۷ زولہ خان
      - ۸ نوشیری خان — لاولد
  - خیر محمد خان۔ لاولد

- ۶ اشرف خان
  - ۷ معظم خان



ڈپٹی کمشنر ہزارہ اپنے خط مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۳ء بنام کمشنر پشاور میں لکھتا ہے :۔ ....ایک اور طاقت ور آدمی جس کے متعلق رپورٹ کی جاتی ہے کہ مجاہدین کا ایجنٹ ہے۔ وہ نواب علی خان ترین ساکن درویش ہے :۔ یہ مکمل خط حالات مجاہدین کے باب میں درج کیا گیا ہے ۔





ترین قوم کے دیہات - وجہ تسمیہ و حالات

۱۔ نوردی - عہد اسلام میں جب ملک درویش بزرگ ہم قوم ترین نے دخل واژنا نہ پایا تب یہ گاؤں بھی اس کے قبضہ مالکانہ میں آیا۔ وقت تقسیم باہمی قوم کے بحصہ نعمت خان مورث ہمارے کے آیا۔ مورث مذکور نے اشرف خان و بشارت خان ہر دو پسران اپنے کو موضع درویش و رہانہ کی وراثت سے حصہ دے کر علیحدہ کر دیا۔ اور یہ گاؤں دلیل خان و ہیبت خان و سید محمد خان ہر سہ فرزندان اپنے کو جو بزرگ ہمارے ہیں بحصہ مساوی دے دیا.... وقت دخل نعمت خان مورث کے گاؤں آباد نہ تھا مورث مذکور نے آبادی اس گاؤں کی کرائی۔ پیچھے بلوقات مختلف آبادی ہائے ذیل ڈوڈیاں - جامع حمایت مورہ - ڈھیریاں - گل ڈھیری بھی آباد ہو گئی۔

گل ڈھیری کی آبادی کی وجہ یہ ہے کہ عرصہ ایک سو سال کا ہوا ہے کہ نجیب اللہ خان ترین خان قوم تھا۔ اور سکونت اس کی موضع درویش میں تھی۔ اس کے ساتھ وقت، آمد و رفت دُرانیاں از جانب کابل بطرف کشمیر مقابلہ ہوتا تھا۔ اس نے یہ جگہ گل ڈھیری جو دامن کوہ میں واقع ہے۔ جائے امن سمجھ کر میر سلطان اصل وارث جو بزرگ ہم سلطان محمود وغیرہ کا ہے۔ واسطے اُن کے کڈہ یعنی اثاث البیت کی رکھ کر آبادی بنائی اور مقابلہ حکام وقت کا ہمراہ نجیب اللہ خان و پسرش محمد خان کے اکثر اسی جگہ ہوتا رہا۔ وقت عملداری سکھاں کے بسبب سکونت محمد خان ترین کے اس جگہ بڑی آبادی ہو گئی ہر قسم کے لوگ کھتری وغیرہ بسبب امن کے زیر پناہ محمد خان آکر آباد ہوئے۔ جب محمد خان مذکور کو سکھوں نے گرفتار کر لیا تو یہ آبادی ویران ہو گئی۔

نوردی - وجہ تسمیہ بوجہ اس جگہ زیارت شیخ نورالدین نامی کے ہے۔ اس کے نام پر نوردین گاؤں مشہور ہوا اور غلط العام سے نوردی ہو گیا۔

گل ڈھیری - ایک گول ڈھیری کے سر پر آباد ہے۔ گول ڈھیری نام تھا۔ غلط العام سے گل ڈھیری ہوا۔

کوٹ نجیب اللہ - (مہتاب سنگھ تاریخ ہزارہ) نجیب اللہ خان ترین نے آباد کیا۔ پرانی آبادی دوستا (گوجری عہد) کی بن کے قریب تھا۔ سرائے گدائی جو ایک پرانا اور بہت آباد شہر تھا۔ آبادی بھی زیادہ تھی۔ اصحاب تجارت و حرفہ کافی تعداد میں آباد تھے۔ لیکن طاہر خیلیوں کی تعدی سے محفوظ نہ تھا۔ لہذا نجیب اللہ خان نے اس کو غیر آباد کر کے کوٹ نجیب اللہ آباد کیا۔ یہاں پر لوگ امن و چین سے رہنے لگے اور آبادی بڑھنے لگی۔

عملداری علاقہ - ۱۷۴۳ء تک جب کہ سلطنت شاہان چغتائی قائم تھی۔ خاص معاملہ پٹی ترینی کا مقرر تھا۔

ادا کرتے رہے اور اپنے علاقہ سے بطور بٹائی، نقدی وجوب حسب رواج وصول کرتے رہے۔ قوم میں باہمی تقسیم بطور رپٹھان ولی اور برادری کے تحت تھی۔ کوئی خانی کی صورت نہ تھی۔ آپس میں خرید و فروخت سے اپنی جائیداد سے زائد پر دخل پایا جا سکتا تھا۔

جب ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ اور ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ درّانی کا زور ہوگیا۔ تو نجیب اللہ خان، جو گدائی خان کی چھٹی پشت میں ہے ۱۷۶۲ء میں حاکم ہزارہ ہو گیا۔ نجیب اللہ خان پہلے بھی اپنی قوم میں طاقت ور تھا اس ملازمت کی وجہ سے اس کی پوری خانی ہو گئی۔ اس کی وفات ۱۷۹۹ء میں ہوئی۔ راورٹی اپنی کتاب "اقوام افغانستان (ص ۲۷۷) پر لکھتا ہے کہ نجیب اللہ خان ساکن چھچھ ہزارہ درّانی بادشاہوں کا اطاعت گزار تھا۔ اور شاہ زمان کو جب وہ ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶-۱۷۹۷ء) میں پنجاب میں داخل ہوا تو اس کو فوج سے امداد دی تھی۔ اور شاہ زمان نے لاہور پر قبضہ کر کے سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچھ مدت کے لئے روکے رکھا۔ نجیب اللہ خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد خان خورد سال رہ گیا۔ جس قدر کہ نجیب اللہ خان کے گھر نے قوت پائی تھی اسی قدر یہ گھرانا کمزور ہوگیا۔ برادری اور ہمسایہ اقوام سید خانی، تارخیلی، ترک، دلازاک، جدون، اُتمان زئی، جن پر اس کی حکومت تھی ان سب نے فساد برپا کیا۔ سلطنت درّانی میں بھی ضعف آ گیا۔ ہر طرف سے برادری کے لوگ اس کی ملکیت دبانے لگے۔ اس کا گھر بالکل برباد ہونے کو تھا۔ بیوی بھنی بیگم بیوہ نجیب اللہ خان جو نہایت نیک بخت اور صاحب تدبیر عورت تھی اور نہایت نماز گزار اور تہجد خوان تھی۔ وہ رات کے پچھلے پہر جاگ جایا کرتی تھی۔ اس ابتر صورت حال کو سنوارنے کے لئے بیوی بھنی بیگم نے مقدم مشرف ساکن کوٹ نجیب اللہ کو اپنا مختار کل بنا دیا۔ یہ ایک جری، بہادر اور منتظم شخص تھا۔ اس فتح نصیب آدمی نے ایسا انتظام کیا۔ کہ برادری کے سب لوگ دب گئے۔ اور ہمسایہ اقوام کو پے درپے زبردست شکستیں دیں۔ بڑے بڑے سرکشوں کو مٹا کر کے چاہات میں ڈلوایا۔ اور نجیب اللہ خان کے وقت سے زیادہ رونق و عزت اس گھر کو دی۔ اور ایسا ہی دیہات مقبوضہ کا انتظام کیا۔

عہد محمد خان ولد نجیب اللہ خان

۱۸۱۶ء میں محمد خان جوان ہوگیا۔ اس کے عہد میں سکھوں کے حملے ہزارہ پر شروع ہو گئے۔ سکھوں کی آمد کی بناء ترک قوم کے دو رئیسوں کی باہمی آویزش سے ہوئی۔ ہاشم خان ترک نے دوسرے تپہ کے ترک رئیس کمال خان کو قتل کر دیا۔ فتح خان پسر کمال خان مقتول نے محمد خان کی پناہ لی۔ محمد خان نے اپنے زور سے

ہاشم خان کو وراثت مانکرائے سے خارج کر دیا۔ اس پر ہاشم خان سرائے کالا کے جاگیر دار سردار مکھن سنگھ کو محمد خان کے اخراج کے لئے چڑھا لایا۔ سردار مکھن سنگھ نے گل ڈھیری جائے سکونت محمد خان جلا دی اور اس ملک پر بزور قبضہ کر لیا۔ موضع شاہ محمد میں گڑھی تعمیر کر لی۔ اور پرانے قابضان سے نصف حصہ سرکاری لینا تجویز کیا۔ ایک سال اس کا قبضہ رہا۔ اور ۱۸۱۹ء میں بغاوت شروع ہو گئی۔ محمد خان ترین اور باقی اقوام ترک، دلازاک وغیرہ نے لشکر کشی کی اور مکھن سنگھ مارا گیا۔ اس کی گڑھی گرا دی گئی۔ ان اقوام کا پرانا اثر و رسوخ قائم ہونے ہی والا تھا کہ ۱۸۲۰ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے دیوان رام دیال آکر مسلط ہو گیا۔ وہ ناڑہ کی لڑائی میں مارا گیا۔ ۱۸۲۱ء میں امر سنگھ مجیٹھیہ آیا وہ ۱۸۲۲ء میں سمندر کٹھ (علاقہ کڑاں) میں مارا گیا۔ اور اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ بمعہ رنجیت سنگھ کی ساس کے آیا۔ وہ مقررہ نذرانہ وصول کر کے اور محمد خان کو اپنا فرزند بنا کر واپس چلی گئی۔

اسی سال (۱۸۲۲ء) میں سردار ہری سنگھ کو کشمیر سے آتے ہوئے مانگل کے مقام پر قوم جدون نے روکا۔ جنگ ہوئی۔ اکثر جدون قتل ہوئے۔ اور باقی مفرور ہو گئے۔ بطور جرمانہ سردار مذکور نے قوم جدون سے پانچ روپیہ فی گھر وصول کیا۔

۱۸۲۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے محمد خان کی بیس ہزار روپیہ کی جاگیر مقرر کر دی۔

اس اثناء میں محمد خان مقدم مشرف سے ناراض ہو گیا۔ اور یہاں سے وہ آویزش شروع ہو گئی جس سے ترین خاندان کو شکست ہوئی۔ مقدم مشرف جدا ہو گیا اور سردار ہری سنگھ کا ملازم ہو گیا۔ اور سردار ہری سنگھ سے ترینوں کی مخالفت کا آغاز ہوا۔ محمد خان کی بمعہ دوسرے خوانین و مشوانی قوم سری (نزد کالو پنڈ بھیرہ) کے مقام پر سردار ہری سنگھ سے سخت جنگ ہوئی۔ سردار نے شکست کھائی۔ ۱۸۲۲ء ہی میں بصلاح مقدم مشرف سردار ہری سنگھ، شہر ہری پور اور قلعہ ہرکشن گڑھ (موجودہ تحصیل و تھانہ) کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۲۳ء کا سال امن کا سال رہا۔ مگر قلعہ ابھی تیار نہ ہوا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار ہری سنگھ کو ڈیرہ جات کی طرف بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد ملک میں پھر شورش ہوئی۔ تمام سرگروہان اقوام نے اگرور کی سرحد تک شورش پھیلا دی۔ سردار ہری سنگھ نے فوراً واپس آکر اسی سال میں فتح پائی۔ ۱۸۲۴ء میں پھر ملک میں شورش ہوئی اور ناڑہ علاقہ کھلابٹ پر ایک بڑی لڑائی مابین مشوانی و دیگر اقوام اور سردار ہری سنگھ ہوئی۔ سردار زخمی ہوا اور فوج کو شکست ہوئی۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ خود لاہور سے یہاں آیا۔ قلعہ سری کوٹ تعمیر کرایا۔ پھر تربیلہ پہنچا۔ اور دریائے سندھ کو گھوڑوں پر پار کیا۔ موضع کھبل اور گیا کو جلا دیا۔ محمد خان ترین کو قید کر کے لاہور لے گئے۔

سردار ہری سنگھ نے پچیس ہزار روپے کر قتل کرنے کے لئے مہاراجہ سے اس کو واپس لے لیا۔ اور قلعہ کلّر علاقہ کھاٹڑ میں قید رکھا۔ لیکن صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ہری سنگھ نے محمد خان کو قلعہ روات ضلع راولپنڈی میں قید رکھا۔ روات میں پرانا گکھڑوں کے وقت کا قلعہ تھا۔ اور تنگ کھلا کھلا کر مار ڈالا۔ لیکن ملک میں فساد پھر بھی ختم نہ ہوا۔ لہذا مطابق مشورہ مقدم مشتر و دستورا صاحب اقوام کے سرگروہوں کو توپ سے اُڑانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح سے بوستان خان ترین محمد خان پسر پائندہ خان تلوکر والا سرگروہ قوم ترین، جلال خان دلازاک، شیر محمد سلیم شاہ مشوانی اور شیخا جدون پدر عبداللہ خان جنبہ والا کو توپ سے اڑا دیا۔ اور ان کے گھر والوں کو قلعہ میں قید رکھا۔ ملک میں امن ہو گیا۔

محمد خان کے لئے جو رقم سردار ہری سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ادا کی اس کی وصولی کے لئے ڈھائی روپیہ فی گھر تمام میدان ہزارہ سے وصول کیا۔ اس طرح سے چونسٹھ ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ ترین قوم شکستہ حال ہو گئی۔ البتہ آصف خان برادران نوردی والے، یا کرم خان پدر حبیب خان ساکن تلوکر وغیرہ نے چونکہ خدمت سرکار سکھاں کی اختیار کی اس لئے اپنی جائداد پر قابض رہ گئے۔

عہد سکھاں میں ایک دفعہ ۱۸۲۶ء میں احمد خان فرزند کلاں محمد خان کو بیس ہزار کی جاگیر ملی۔ لیکن وہ زیادہ مدت نہ کھا سکا۔ اس کے بعد ایک ہزار روپیہ کی جاگیر غلام خان فرزند محمد خان کو موضع کلاں توال میں ۱۸۴۵ء میں ملی۔ اسی سال ۱۸۴۵ء میں بوجہ ضعف سلطنت لاہور، دیوان مولراج کی بغاوت کے باعث ملک میں شورش ہوئی۔ اکثر قلعے دار مارے گئے اور تھانہ دار قتل کر دیئے گئے۔ دیوان مولراج قلعہ ہری پور میں قلعہ بند ہو گیا۔ شہر ہری پور جلا دیا گیا۔ بہت سا سرکاری اسباب لوٹ لیا گیا۔ اس شورش میں غلام خان ترین اور نواب خان تنولی وغیرہ سرگروہان بمعہ اپنی اپنی قوم کے جمع تھے۔ پندرہ روز قلعہ کا محاصرہ رہا۔ باہر سے کنٹھہ کا پانی بند کر دیا گیا۔ کہ قلعہ کے اندر نہ جا سکے۔ قلعے کے اندر کا کنواں خشک ہو گیا تو آخر مارچ ۱۸۴۶ء میں گورکھا پلٹن ملازمان سرکار سکھاں پانی لینے کے لئے باہر آئے اور چند گولے ملکی لوگوں کی طرف مارے سب لوگ بھاگ گئے۔ اور شام تک ایک آدمی بھی نہ رہا۔ دس دن کے بعد ۲۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو مولراج خود ہی قلعہ خالی کر گیا۔ غلام خان ترین، نواب خان تنولی، اور سید اکبر ساکن ستھانہ نے قبضہ کر لیا۔ سید اکبر کو امیر بنایا گیا۔ یہ عمل پندرہ روز تک رہا۔ ربیع سمت ۱۹۰۳ (اپریل ۱۸۴۶ء) میں یہ ملک مہاراجہ گلاب سنگھ کو مل گیا۔ جنرل اُتم سنگھ ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء کو بمعہ دیوان ہری چند، مہاراجہ کی جانب سے ناظم بن کر آیا۔ اس نے غلام خان کو پانچ ہزار اور فتح خان ترین کو ایک ہزار کی جاگیر دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ملکیوں کی لڑائی بابت فصل خریف سمت ۱۹۰۳ (دسمبر ۱۸۴۶ء) علاقہ ترش میں ہوئی کچھ بسبب سرسری بگاڑ اور کچھ نواب خان

و مدد خان تنولی کی بدعہدی کے مہاراجہ گلاب سنگھ کے آدمیوں کو شکست ہوئی اور تیرہ سو سوار قتل ہوئے۔ دیوان ہری چند کا دخل کامل نہ ہوا۔ دیوان ہری چند چلا گیا۔ اس کے کچھ آدمی پیچھے رہے اور بہ امداد فوج سرکار لاہور خریف کا کچھ معاملہ وصول کر لیا۔ ربیع سمت ۱۹۰۴ (۱۸۴۷ء) کا معاملہ بھی مہاراجہ کشمیر نے لیا۔ اسی اثناء میں میجر ایبٹ پہلے پہل سرحد راولپنڈی پہ مارچ ۱۸۴۷ء میں ....

.... از طرف لاہور دربار آئے۔ اور خریف ۱۸۴۷ء میں یہ علاقہ پھر متعلق سرکار ہو گیا۔ لہذا جون ۱۸۴۷ء میں میجر ایبٹ اس ضلع میں آئے اور سرسری بندوبست خریف سمت ۱۹۰۴ (دسمبر ۱۸۴۷ء) میں اس ملک کا کر دیا۔ شروع مئی ۱۸۴۸ء میں اس ملک میں چتر سنگھ والی شورش شروع ہوئی۔ غلام خان و فتح خان ترین بمعہ بہت سے رئیسان ضلع کے باغی ہو گئے۔ غلام خان میجر ایبٹ سے فرار ہو کر ۱۸۴۸ء میں دُرّانیوں سے جو اس شورش میں ہزارہ میں آ گئے تھے، جا ملا۔ ۱۲/۱۶ اپریل ۱۸۴۹ء کو یہ شورش رفع ہوئی۔

دُرّانیوں کا جو لشکر تسخیر ہزارہ کے لئے آیا تھا۔ اس نے آمد کے وقت ایک مقام کوپرہ پنڈ (نزد کمال پور۔ پنیاں) کے ٹیلے پر گیا تھا۔ اس لشکر کے آگے بڑھ کر ناڑہ سید خانیاں پر حملہ کیا تھا۔ سارا دن جنگ ہوتی رہی۔ لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔

غلام خان مفرور ہو کر ستھانہ (پار دریائے سندھ) چلا گیا۔ غلام خان کا بھائی   خان بیمار تھا۔ لہذا اس سے مواخذہ نہ کیا۔ اس کو ساٹھ روپیہ پنشن ملی۔ تمام خوانین ہزارہ نے میجر ایبٹ سے غلام خان کی معافی کی درخواست کی۔ میجر ایبٹ نے کہا کہ وہ غلام خان کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن جرگہ کے اصرار پر اس نے غلام خان کو اپنے خیمہ میں طلب کیا۔ ملاقات کے دوران غلام خان تاڑ گیا کہ میجر ایبٹ کی نیت صاف نہیں۔ لہذا وہ بھاگ کر ستھانہ چلا گیا۔ باوجود مخالفت کے غلام خان پھر واپس آیا۔ اور گرفتار ہو کر قلعہ الہ آباد بھیجا گیا۔ وہاں پر بحالت قید غلام خان ۱۸۵۶ء میں قلعہ میں فساد ہو گیا۔ جس پر اس کو پھانسی دی گئی۔ فتح خان ۱۸۵۸ء میں واپس آیا۔ اس کے واسطے ایک سو روپیہ پنشن مقرر ہوئی۔ غلام خان لاولد تھا۔ شاہداد و میر افضل اس کے دو سگے بھائی تھے۔ فتح خان کا بیٹا خان بہادر تھا۔ وہ پولیس سواران میں نوکر ہو کر ۱۸۸۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے دو بیٹے شجاع اللہ بعمر ۵ سال اور ...... محمد اکرم بعمر ۳ سال باقی رہے۔ غلام خان کے وزیر معتبر نادر خان و نجف خان تھے جو اس کے ہم جدی بھی تھے میجر ایبٹ صاحب کے وقت وہ سرکار کی خدمت گزار رہے ان کے نام دو سو چار روپیہ پنشن و جاگیر تھی۔

غلام خان کی گرفتاری وسزا کے متعلق چند خطوط دفتر مخطوطات قدیمہ پشاور میں محفوظ ہیں اور تاریخی دلچسپی کے حامل ہیں ان کے تراجم ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

یہ خطوط محکمہ امور خارجہ مرکزی حکومت ہند، کارروائی مقدمات سیاسی و فوجی پنجاب کی فائل میں تھے۔

۱- سب سے پہلا خط جو اس فائل میں ہے وہ میجر ایبٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا مورخہ ۱۳ رمئی ۱۸۴۹ء کا ہے جس میں اس نے غلام خان ترین کی گرفتاری اور اس کے اپنے پاس محبوس ہونے کی اطلاع دی۔ اور حکومت سے اس کے اور دوسرے سیاسی گرفتار شدہ لوگوں کے بارے میں احکام دریافت کئے ہیں۔ اس خط کے جواب میں حکومت نے لکھا:-

"تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ غلام خان کی جاگیر ضبط کر لی جائے۔ لیکن اس کا جواب دعویٰ لئے بغیر حکومت اس کو محبوس کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو کہا جائے کہ وہ اپنا دفاعی بیان اور شہادت صفائی پیش کرے۔ یہ بیانات بمعہ اسناد تحریری جو اس مقدمہ کے متعلق اس کے پاس ہوں حکومت کے غور کے لئے بھیجے جائیں اور اس کے اور دوسرے قیدیوں کے متعلق جو قلعہ اٹک میں بند ہیں رپورٹ بھیج دی جائے"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلام خان ۱۳ رمئی ۱۸۴۹ء میں اٹک کے قلعہ میں محبوس تھا۔ اور اس کے بعد الہ آباد بھیجا گیا۔

اپنے دوسرے خط مورخہ ۱۱ رجولائی ۱۸۴۹ء میں ڈپٹی کمشنر نے غلام خان جو دُرانیوں کے ہزارہ میں داخل ہوتے وقت ان سے مل گیا تھا اور بعد میں اپنے آپ کو میجر ایبٹ کے حوالہ کر دیا تھا کے متعلق تمام خط وکتابت بھیجی۔ غلام خان اب تک اٹک ہی میں تھا۔ اس کے بعد سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔ دفتر گورنر جنرل۔ یہ سب خط وکتابت حکومت کی اطلاع کے لئے پیش کرتا ہے اور اس میں لکھتا ہے کہ بورڈ سفارش کرتا ہے کہ غلام خان ترین کو یہاں سے ہندوستان لے جایا جائے۔ اور وہاں عمر قید کر دیا جائے اور اس کے عیال کے لئے تھوڑی سی پنشن منظور کی جائے۔

ان خطوط اور سکرٹری کے نوٹ کے جواب میں سکرٹری نے اپنے خط مورخہ ۸ رنومبر ۱۸۴۹ء میں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو مطلع کیا۔ کہ گورنر جنرل غلام خان ترین ہزارہ والے کو جو اس وقت قلعہ اٹک میں بند ہے ہندوستان بھیجنے کی منظوری دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ وہاں اس کو عمر بھر قید رکھا جائے اس کی جاگیر ضبط کی جائے اور اس کے عیال کو معمولی پنشن دی جائے۔ اور ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی جاتی ہے کہ غلام خان کو بحفاظت لاہور بھیج دیا جائے۔ اور اس کے عیال کو اس امر کی اور جاگیر کی ضبطی کی اطلاع دی جائے۔

اس خط کے بموجب غلام خان کو آخر ۱۸۴۹ء میں لاہور اور پھر الہ آباد منتقل کر دیا گیا ہوگا۔

غلام خان کی گرفتاری کے بعد مطابق بیان تاریخ ہزارہ از ولیس مہتمم بندوبست ۱۸۶۲ء اس کو لواحقین کو مندرجہ ذیل پنشن ملی۔

۱- غلام خان کی تین بیویاں تھیں۔ ایک کو پچاس روپیہ، دوسری کو ایک سو بیس روپیہ اور تیسری کو ایک سو روپیہ پنشن ملی۔ اور ناگی والدہ عمر بیاسی سال کو ایک سو روپیہ اور موضع پانڈک میں دس کنال زمین بھی۔ شاہداد خان پسر محمد خان عمر پچاس سال ساٹھ روپیہ پنشن زوجہ امیر خان پسر محمد خان کو چھتیس روپیہ پنشن شیر دل ولد امیر خان پسر محمد خان عمر بیس سال سو روپیہ جاگیر۔ فتح خان ولد بوستان خان ترین ساکن درویش پنشن ایک سو روپیہ اور جاگیر دو سو روپے ملی۔ نادر خان ولد آزاد خان درویش عمر ۵ سال۔ دوست محمد خان ولد نجف خان ساکن درویش عمر ۴۲ سال (ان دونوں کی یہ عمر ۱۸۶۲ء میں تحریر کی گئی ہے۔

جب نجیب اللہ خان ترین حاکم ہزارہ تھا تو شاہ تیمور شاہ دُرانی نے ایک فرمان بنام انعام سالانہ سلطان رستم علی خان و شاہ ولی خان گکھڑ کے لئے لکھا تھا۔ یہ تاریخی دستاویز محافظ خانہ ایبٹ آباد میں موجود ہے

نقل فرمان تیمور شاہ دُرّانی

آنکہ عالیجاہ! رفیع جائیگاہ، اخلاص وعقیدت دستگاہ نجیب اللہ خان ترینی۔ حاکم ہزارہ قارلق بالطاف روز افزون شاہانہ سرفراز گشتہ، بداند۔ کہ دریں وقت عالی شان رفیع جائیگاہان اخلاص و عقیدت دستگاہان رستم علی خان سلطان و شاہولی خان گکھڑہ بعرض عاکفان شدہ جلال سلطانی رسانیدند کہ ہر سالہ مبلغ چار ہزار روپیہ از بابت مالیات ہزارہ قارلق بصیغۂ انعام از قرار رقام مجدّد در وجہ ایشان مقرراست۔ کہ میگیرند واز خدمت اشرف استدعا نمودند کہ قریٔ مفصلہ ذیل محال ہزارہ قارلق از کنار اٹک، کہ خرابہ است بایشان، وہات ہزارہ قارلق، از کنار اٹک کہ خرابہ افتادہ وبتصرف سکان است، قریہ ہریلہ (ہریالہ) قریہ قطبا (قطبال) قریہ پنڈ (پنڈ) قریہ سالارکہ (سالار گاہ) قریہ بہار تہو (بھلا توپ) قریہ سحر جہاں آباد (جہان آباد) قریہ لورتہتو (اغلباً نیلا بھوتو) در عیض چہار ہزار روپیہ دادہ شود۔ کہ آباد ومتصرف شوند۔ بنابراں مقرر فرمودیم۔ کہ باید بحصول اطلاع برمضمون رقم مبارک ایشاں برسند و بینند۔ ہرگاہ جمیع مالیات قریہ جات مزبورہ مساوی چہار ہزار روپیہ بودہ باشد۔ بایشاں درعوض وجہ انعام آنہا واگذارند کہ متصرف شدہ برائے خود ضبط و ربط نمایند۔ وہرگاہ جمیع مالیہ دہات مزبورہ از مبلغ مرقوم اضافہ باشد چگونگی آنرا صریح

عرض نمایند کہ درزمانے ہرچہ از مصدرِ جلال مقرر شود بعمل آورند۔

قدر تلازم دانستہ درعہدہا فی شعبان المعظم ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء)

نجیب اللہ خان ترین درانیوں کی حکومت کے آغاز سے ہی ہزارہ کا حاکم ہوا۔ صوبہ سرحد زمانہ قدیم میں افغانستان کے ملحقات سے تھا۔ اور نادرشاہ ۱۷۴۷ء میں قتل کیا گیا جس کے بعد احمد شاہ ابدالی افغانستان کا بادشاہ ہوا۔ اور وہ ۱۷۵۹ء میں پہلی دفعہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ لہٰذا نجیب اللہ خان ترین اغلباً ان دو متذکرہ بالا سالوں پر حاکم ہزارہ ہوا۔ اور اپنی وفات ۱۷۹۹ء تک حاکم رہا۔

تاریخ ہزارہ ولیس کے مطابق نجیب اللہ خان ۱۷۶۲ء میں حاکم ہزارہ ہوا۔ اس حساب سے اس نے ۳۷ سال حکومت کی۔

ریحانہ (رہانہ)

یہ گاؤں سابق صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کا ہے۔ صورت دیہی بندوبست ۱۸۷۲ء میں وجہ تسمیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اصلی وجہ معلوم نہیں۔ یہ پرانا نام ہے۔ لیکن اخبار جمہور راسیٹ آباد نے اس گاؤں کی وجہ تسمیہ مندرجہ ذیل بیان کی۔

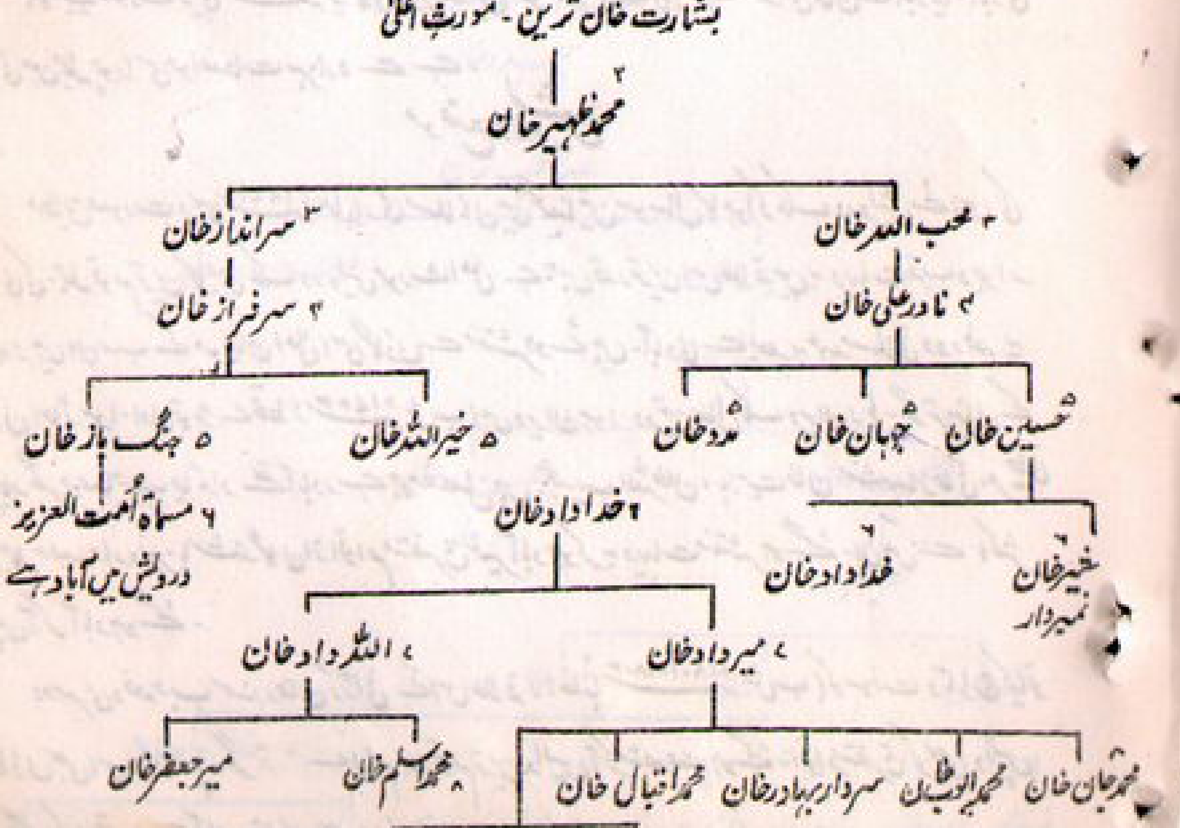
اس علاقہ کی پہاڑی سلسلوں کے درمیان ایک پہاڑی مکھیالہ نامی ہے جو ان میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ زمانہ قدیم میں جب جنگیں تیر و تفنگ سے ہوا کرتی تھیں اس پہاڑی کو دفاعی مقصد کے لئے چنا گیا تھا۔ اور اس پر ایک قلعہ تعمیر کیا گیا تھا جو گڑھ مکھیالہ کے نام سے مشہور تھا۔ آج بھی اس قلعے کی فصیل۔ اس میں بنے ہوئے مکانات اور بازار کے کھنڈرات اس میں موجود ہیں۔ اور ان کے دیکھنے سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ قلعہ کس قدر مضبوط اور عالی شان ہوا ہوگا۔ چونکہ اس قلعہ کے دائیں بائیں طرف بھی چھوٹی چھوٹی بلند پہاڑیاں ہیں جن سے ادھر ادھر دیکھنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اور اس بات کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ دشمن کہیں اچانک سر پر نہ آ پہنچے۔ لہٰذا اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہوئی کہ دشمن کی نگرانی کے لئے ایک چیک پوسٹ مقرر کی جائے۔ جہاں کچھ آدمی رہا کریں۔ جو آنے والے راستوں پر نظر رکھ کر دشمن کی آمد سے بروقت خبردار کر دیا کریں۔ اس مقصد کے لئے دو نالوں کے درمیان ایک جگہ منتخب کی گئی اور دو چار مکانات بنا کر وہاں چند پہرہ دار مقرر کر دئے گئے۔ ان چوکیداروں کو جن کا کام دشمن کو دور سے دیکھنے کا تھا۔ "ہیرنے والے" یعنی دیکھنے والا کہا جاتا تھا۔ اس علاقہ کی بولی میں آج بھی "ہیرنہ" کے معنی دیکھنا ہے۔ اس کے بعد جوں جوں

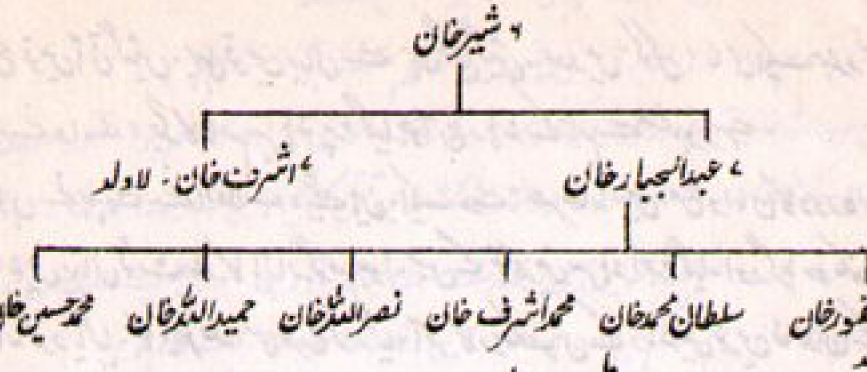
دوسری فاتح قومیں آتی گئیں۔ پہلی قومیں یہاں سے بھاگتی گئیں۔ بعد میں "گوکن" نامی ایک ہندو سردار کے زمانہ میں "ہیرنے والے" جگہ کا نام ہرہانہ پڑ گیا جو آج رہانہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس گاؤں نے بہت سے انقلاب دیکھے ہیں۔ ایک مدت "ہرھانہ" میں امن و امان کا دورہ رہا۔ لیکن ترکوں کے زمانہ میں یہاں لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ جس کے نتیجہ میں ہرہانہ اُجڑ گیا۔ اور گڑھ مکھیالہ ہمیشہ کے لئے مسمار کر دیا گیا۔ کافی عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ آخر کار سکھوں کے زمانہ میں ترین خاندان کے ایک باوقار اور بارعب سردار غلام خان گل ڈھیری والے نے اپنے بھائی نادر علی خان کو حکم دیا کہ وہ "ہرھانہ" کی بستی کو آباد کریں۔ نادر علی خان نے اس بستی کو از سرِ نو آباد کیا۔ اور یہ بستی اب رہانہ کے نام سے موجود ہے۔

صورت دیہی رہانہ کے مطابق یہ گاؤں عہدِ چغتائی سے آباد ہے۔ سمندر خان درانی نے ہزارہ کے دیگر دیہات کے ساتھ اس کو بھی جلا دیا تھا۔ اس گاؤں کے ساکنین چند مدت گل ڈھیری میں رہ کر بھلڑ ضلع راولپنڈی چلے گئے تھے۔ اخیر عہد سکھاں بہ اجازت سردار لہنا سنگھ کاردار واپس آ کر اس کو آباد کیا۔

شجرہ نسب





پنڈ جمال خان

یہ گاؤں بموجب صورت دیہی بندوبست ۱۸۶۲ء بہ حصہ نجیب اللہ خان سردار قوم آیا۔ محمد خان نے اس کو ترقی دی۔ اس گاؤں میں دلازاک بھی آباد ہیں۔ شروع عہد سرکار انگریزی میں بزرگان قوم ترین سرکار سے منحرف ہو گئے۔ فتح خان پار دریائے سندھ چلا گیا اور غلام خان گرفتار ہو گیا۔

وجہ تسمیہ۔ پرانی تہ کا نام پنڈ تھا۔ جمال خان نے آباد کیا۔ لہٰذا یہ نام ہوا۔

موضع پانڈک

بموجب صورت دیہی ۱۸۶۲ء یہ گاؤں عرصہ تین سو سال سے آباد ہے۔ گدائی خان نے آباد کیا۔ آبادی اس کی من جملہ چوراسی مواضعات ہزارہ سے ہے۔

موضع درویش

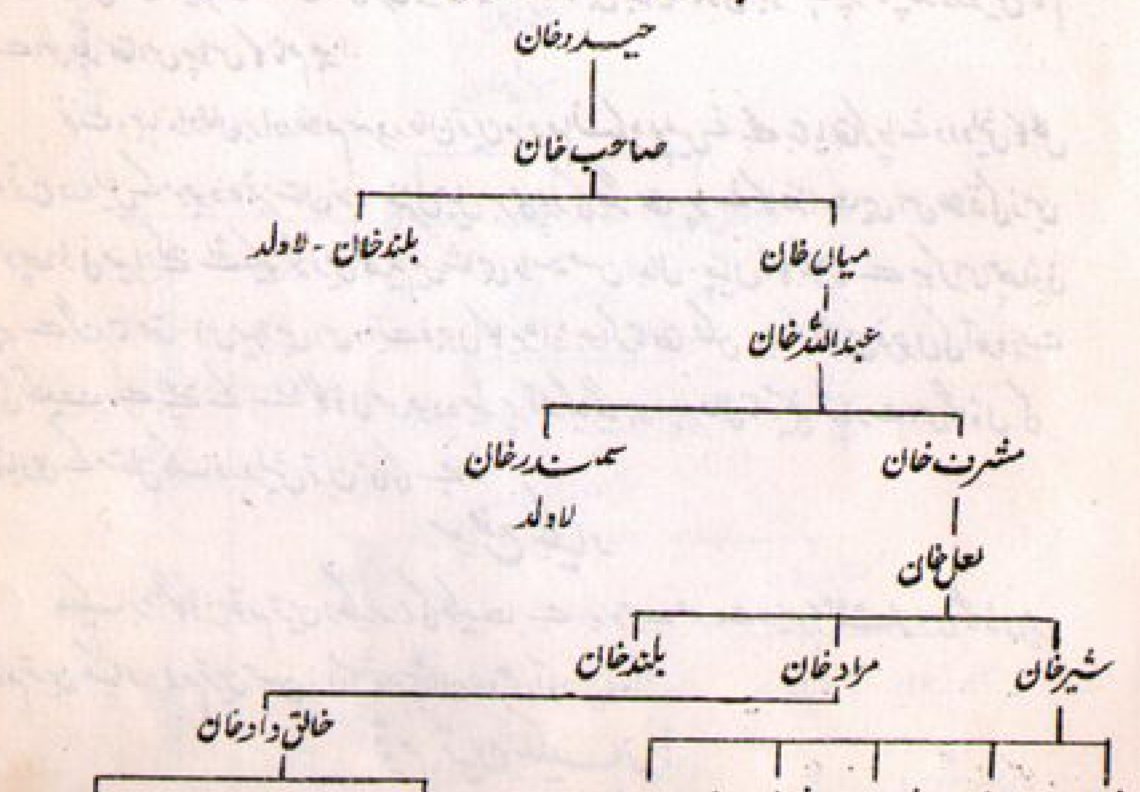
مطابق صورت دیہی ۱۸۶۲ء عملداری مسلمانان میں تخمیناً تین سو سال کا ہوا کہ ملک درویش نے اس کی آبادی کی۔ جملہ قوم ترین کا یہی ملک درویش مورث اعلیٰ ہے جس قدر ترین اس علاقہ میں بہ دیہات قرب وجوار موجود ہیں ان سب کے مورثانِ اعلیٰ اسی گاؤں سے منتشر ہوئے ہیں۔ آبادی سے بعد بہ عہد مسلمانی دو دفعہ یہ گاؤں اجاڑ ہوا۔ اول تو بڑے قحط (۱۷۸۳ء ش ب) میں ویران ہوا۔ دو تین سال تک ویران رہا۔ مگر ترینان کے دو چار گھر جو صاحب جائداد تھے آباد رہے جو مفصل ہیں۔ نجیب اللہ خان، ہدایت خان، شہباز خانی، مرید خانی باقی جملہ حصہ دار و نیز باشندگان از اقوام متفرق غیر آباد ہو کر بہ دیہات منتشر ہو گئے۔ ان میں سے اکثر واپس آ کر آباد ہو گئے۔

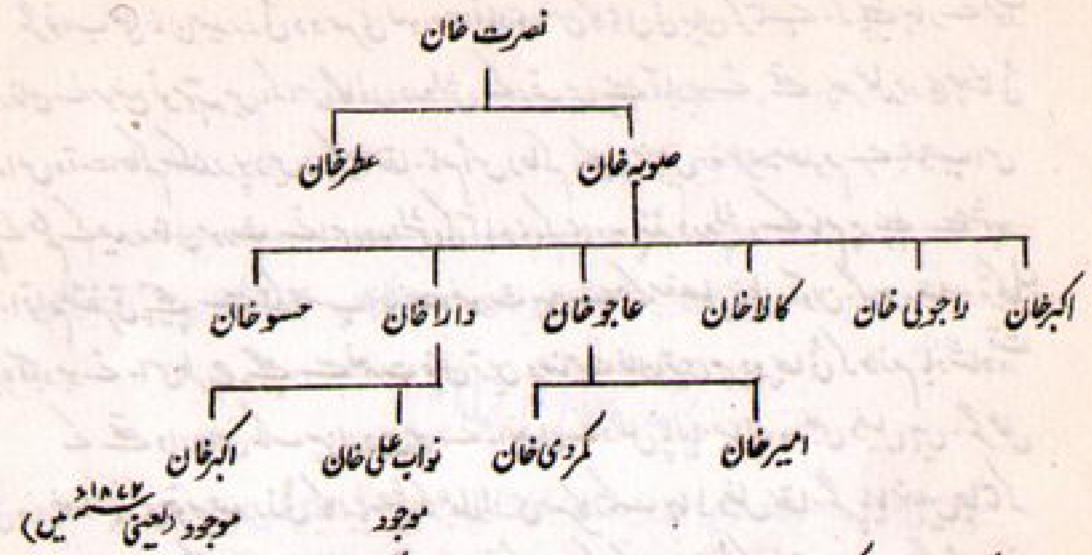
دوسری دفعہ جب سمندر خان درّانی نے اس علاقہ (اغلباً ۱۸۰۱-۱۸۰۲ء ش ب) کو سوخت و تاراج کیا تو یہ گاؤں بھی اس نے جلایا۔ مگر تھوڑے ایام بعد قوم ترین واپس آ کر متصرف ہو گئے۔ اقوام متفرق کو بھی واپس لا کر آباد کیا۔ تب سے آباد ہے پھر کبھی ویران نہیں ہوا۔

مگر نواب علی خان حیدرزئی دوسری صورت آبادی اس گاؤں کی بیان کرتا ہے۔ کہ پہلے ہمارے مورث حیدر خان نے موضع نوتھہ میں، کہ اس گاؤں درویش کے رقبہ میں پہلے آباد ہوئے تھے۔ پھر عملداری چغتائی میں کہ اس وقت حاکم سکندرپور میں رہا کرتا تھا۔ نام اُس (حاکم) کا یاد نہیں۔ نہ عرصہ معلوم ہے۔ بموجب اس حاکم کے حکم کے حیدر خان مورث نے اس درویش کی آبادی کری۔ یہ پنڈ درویش کے نام پر پہلے سے مشہور تھا۔ اقوام متفرق پیچھے سے آ کر حسب اجازت مورث ہمارے کے مفصل ذیل۔ آوان۔ گوجر۔ ملیار۔ ترکھان وغیرہ آباد ہوئے۔ اسی طرح پیچھے سے نعمت خان ترین و عنایت خان ترین ہر دو بھائی کہ ملازم بادشاہ وقت کے تھے وارد اس ملک ہزارہ میں ہوئے۔ انہوں نے دخل پا لیا۔ چنانچہ وہ بھی دخیل ہیں۔ مگر عمل دخل وارثانہ ہماری قوم حیدرزئی کا رہا۔ حتیٰ کہ عملداری سرکار تک ہمارا دخل تھا۔ مگر پایا نہیں جاتا کہ اس طرح ہو۔ اس بیان کی مخالفت نادر خان نمبردار نے کی۔ اور کہا کہ حیدرزئی کوئی قوم نہیں۔ نہ کوئی مورث اعلیٰ۔ یہ متفرق پٹھان ادھر ادھر سے آ کر آباد ہو گئے۔ اور اب حیدرزئی بنتے ہیں۔

صورت دیہی میں حیدرزئی پٹھانوں کا ایک مفصل شجرہ نسب بھی ہے۔ میں نے اتنی حد تک نقل کرنا مناسب سمجھا کہ نواب علی خان کی پشت تک پہنچ جائے۔ اور یہ حسب ذیل ہے:-

پٹھان حیدرزئی





اس گاؤں میں دلزاک اور اللہ زئی پٹھان بھی آباد ہیں۔ اور اُن کے بھی مفصل شجرہ نسب صورت دیہی میں دئے ہوئے ہیں۔

صورت دیہی بندوبست ۱۸۶۲ء

وجہ تسمیہ۔ ملک درویش نے آبادی اس گاؤں کی بنائی اس واسطے اس کے نام پر درویش مشہور ہو گیا۔ مگر نواب علی خان وغیرہ حیدر زئی اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس جگہ یہ گاؤں آباد ہے پرانا پنڈ درویش نام سے اس جگہ تھا اس پر اس کا نام ہوا۔

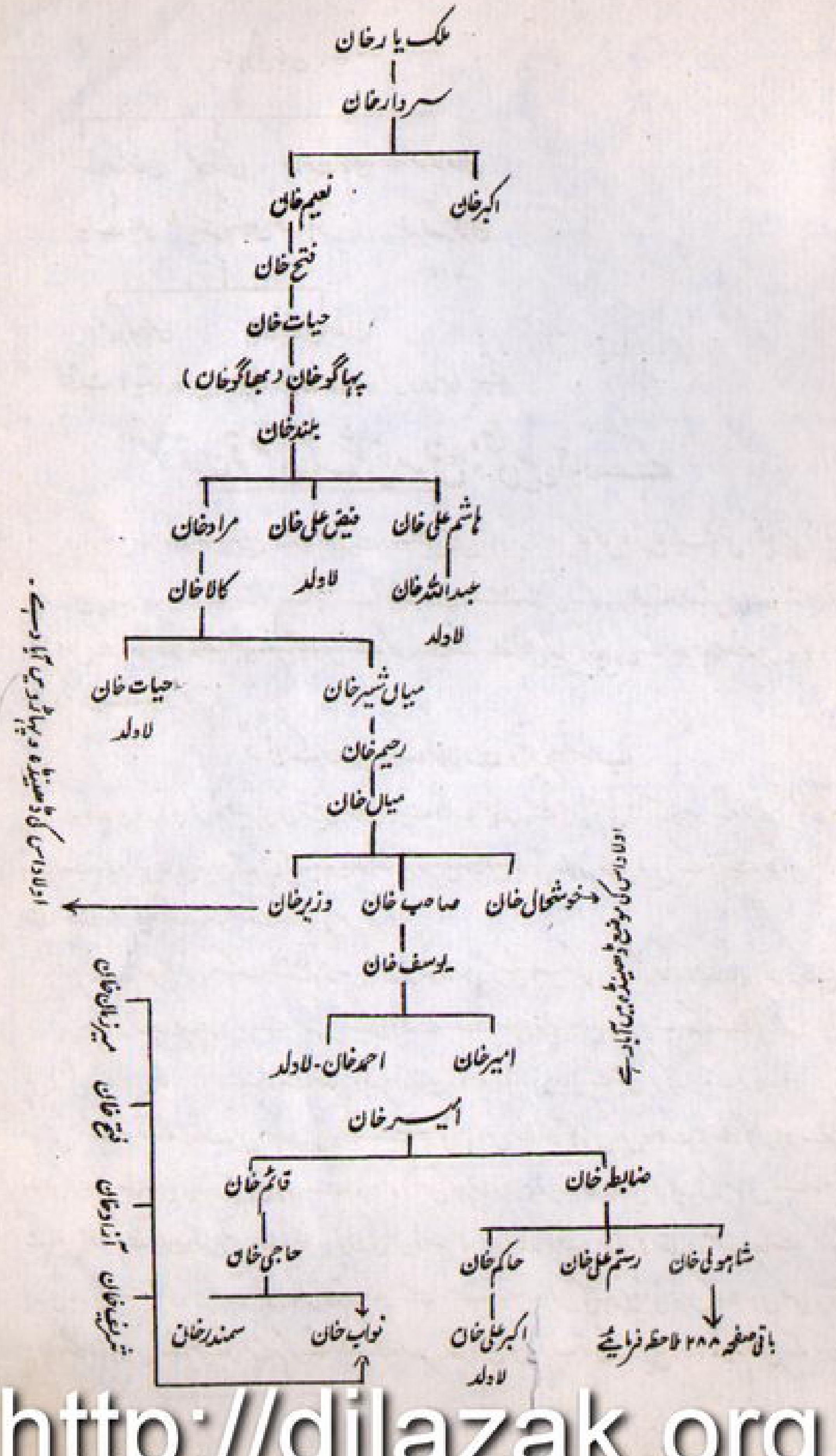
نوٹ۔ جہانداد خان برادر غلام سرور خان ترین مرحوم انسپکٹر پولیس نے مجھے بتایا تھا کہ پرانے درویش کا محل وقوع درویش کے موجودہ قبرستان نزد سنٹرل جیل ہری پور کی جگہ تھا۔ پرانے کاغذات میں اس علاقہ کی زمین کو چھاؤنی میرا کہتے تھے۔ کیونکہ زمین قدیم میں شاہی راستہ حسن ابدال۔ پنیاں۔ کانگڑہ سے ہو کر اس چھاؤنی پر سے گزرتا تھا۔ اس میرا میں اس وقت فوجوں کا پڑاؤ ہوا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ شاہی فوجوں کی آمد و رفت کی تکلیف سے بچنے کے لئے گاؤں موجودہ جگہ پر آباد کیا گیا ہو۔ بہر حال تاریخی شہادت اس گاؤں کی آبادی کے متعلق ملک درویش ترین ہی کی ہے۔

موضع ملکیار

یہ ایک بڑا گاؤں قوم ترین (ملکیار) کی ملکیت ہے۔ بموجب صورت دیہی ۱۸۶۲ء اس گاؤں میں قوم ترین ملکیار، قوم ترین حسن زئی، قوم پٹھان لودھی آباد ہیں۔

قوم ترین ملکیار

مورث اعلیٰ
ملک یار خان



- شاہولی خان
  - سعداللہ خان
    - حیات خان
  - محمد خان
    - پائندہ خان نمبردار
      - محمد اکبر خان
      - محمد یعقوب خان
  - عنایت خان
  - موسم خان
    - خیراللہ خان
      - لاولد

(نوٹ) پائندہ خان اپنے وقت کا نامور نمبردار ہوا ہے۔

ترین قوم کی ایک شاخ موضع ڈنگی میں آباد ہے

یہ موضع خداداد خان ترین نے بہ اجازت درویش خان آباد کیا۔ اس کا محل وقوع ایک ڈنگی (ٹیڑھی) زمین ہے۔ اس پر آباد ہونے سے یہ نام ہوا۔ بڑے قحط ہزارہ ۱۷۸۳ء میں یہ گاؤں غیر آباد نہیں ہوا تھا۔ ترین قوم کے زوال کے بعد یہ خاندان بھی اس گاؤں سے کچھ مدت کے لئے نکل گیا۔ سکھوں کے عہد حکومت میں یہ گاؤں مقدم مشرف کو جاگیر میں ملا۔

ڈنگی کے خاندان کے حالات و شجرہ نسب

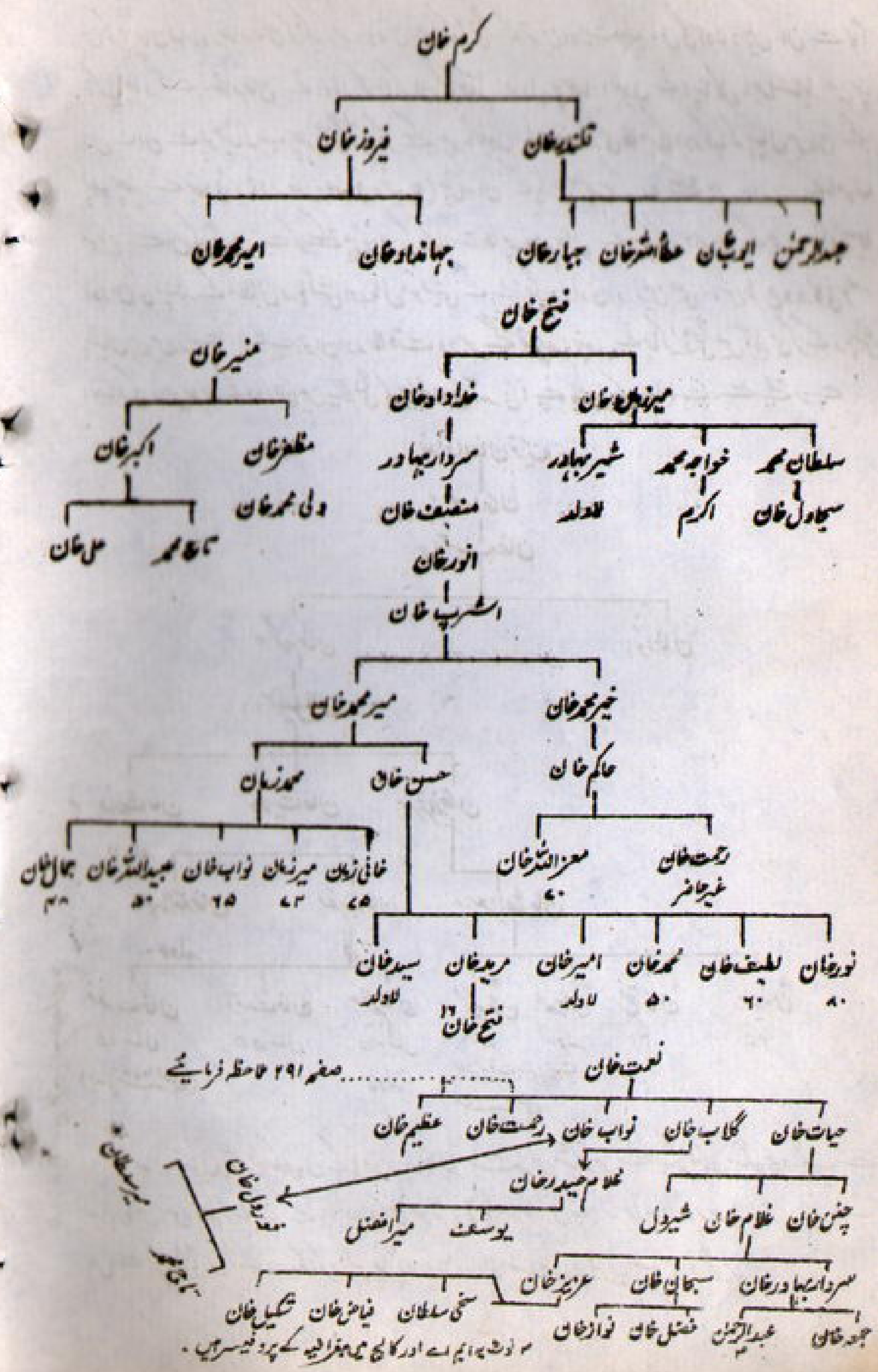
یہ خاندان نوروی گل ڈھیری کی ترین شاخ سے الگ ہو کر پہلے پہل ڈنگی آکر آباد ہوئے۔ ڈنگی کا گاؤں باجازت درویش خان نے ترین آباد کیا گیا۔ معزاللہ خان ترین ساکن ڈنگی غلام خان ترین کے وقت جوان العمر تھا۔ ۱۸۲۱ء کی جنگ موٹہ کے بعد وہ یتیم ہو گیا۔

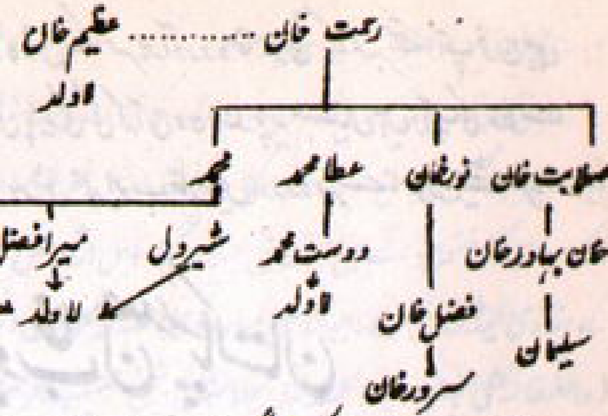
جنگ موٹہ - یہ جنگ ۱۸۲۱ء میں بمقام موٹہ نزد ڈنگی مابین حکماں سنگھ حاکم اٹک اور غلام خان ترین ہوئی۔ یہ علاقہ سرحد ہزارہ پر ہے۔ حکماں سنگھ اٹک سے ہزارہ میں امن قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس میں ڈنگی کے ترین خاندان سے وارث خان و سرفراز خان دو بھائی، اور ان کے تین نوکر (ایک لوہار اور دو موچی شہید ہوئے جنگ میں سکھوں کو شکست ہوئی) اس کے بعد گاؤں میں حالات ناساز گار ہوئے (خاص کر دیگر پٹھانوں کی زیادتی) کی وجہ سے وہ اور اس کا چچا زاد مقرب خان ڈنگی کو چھوڑ کر موہن اپنے ماموں کے پاس چلے گئے۔ ان دنوں میں غلام خان نوروی گل ڈھیری اپنا قلعہ وغیرہ بنوا رہا تھا اور ملحقہ دیہات کے لوگ باری باری سے بطور بیگار وہاں جا کر کام کرتے تھے۔ جب موہن والوں کی باری آئی تو ان کا ماموں کسی وجہ سے نہ جا سکا۔ اور اس نے اپنی جگہ پر کام کرنے کے لئے معزاللہ خان اور مقرب خان کو بھیج دیا۔ غلام خان کے وزیر نے

ان کو پہچان لیا۔ اور غلام خان کو کہا کہ یہ دونوں لڑکے ڈنگی کے ترین اور شہیدوں کی اولاد ہیں۔ ان سے کام نہ کرایا جاوے۔ غلام خان نے دونوں کو بلا کر ان کا حال احوال پوچھا۔ انہوں نے اپنا کل ماجرا سنایا۔ اس پر اس نے ان سے پوچھا کہ اب پھر ڈنگی آباد کر سکتے ہو۔ انہوں نے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ پنیاں میں ان کے پھوپھیرے بھائی (نادر خان صوفی وغیرہ) ہیں۔ ان کے پاس مقیم ہو کر رہ سکتے ہیں۔ اور ان کے ماموں موہن سے ان کی نگہداشت کر سکتے ہیں۔ ان کی استدعا پر غلام خان نے اپنا کاردار ان کے ہمراہ پنیاں بھیجا۔ اور ان کی پسند کے مطابق رہائش اور مال مویشی کے لئے جگہ دلوادی اور زمین بھی۔ اس طرح وہ کافی عرصہ پنیاں ہی میں رہے۔ اور جب جوان اور طاقت ور ہو گئے تو پھر انہوں نے جا کر ڈنگی میں آبادی کر کے رہائش اختیار کی۔ اس عرصہ کے دوران میں یہ ڈنگی کی جائداد کی آمدنی اپنے ماموں کی وساطت سے لیتے رہے۔

- ۱ خداداد خان ترین
  - ۲ طوطا خان
    - ۳ احمد خان
      - ۴ کرم خان
        - ۶ اسمٰعیل خان
          - ۴ وارث خان
            - لاولد
          - ولایت خان
            - عبداللہ خان
              - لاولد
            - مقرب خان
              - نعمت خان — ۷۵ سال (یعنی ۱۸۶۲ء میں)
              - رحمت خان — ۵۵ سال
              - عظیم خان — ۴۵ سال، لاولد
          - سرفراز خان
            - ۸ معزاللہ خان
              - کرم خان — ۵۰ (یعنی بوقت بندوبست ۱۸۶۲ء میں)
              - محمد خان — لاولد
              - فتح خان — ۴۰
              - منیر خان — ۳۵
      - انور خان

۴ یہ تینوں بھائی سکھوں کے ہاتھ سے غالباً ۱۸۲۱ء میں شہید ہوئے جبکہ حکماں سنگھ خود اٹک سے ہزارہ میں امن قائم کرنے کے لئے آیا اور موضع موٹہ (ڈنگی موٹہ ش ب) سرحد ہزارہ پر محمد خان ترین وغیرہ نے اس سے لڑائی کی وہ شکست کھا کر واپس چلا گیا۔ نوٹ۔ ان شہیدوں کی قبریں اب بھی ڈنگی میں مشہور ہیں۔





نوٹ۔ معزاللہ خان ساکن ڈھنگی، خداداد خان ترین جس نے ڈھنگی آبادکی، کی آٹھویں پشت میں اور غلام خان کے وقت (سنہ ۱۸۴۳ء) میں ہوا۔ تاریخی اندازہ سے آٹھ پشت دو سو سال میں ہوتی ہیں۔ لہذا خداداد خان جس نے ڈھنگی غالباً سنہ ۱۶۴۳ء میں آباد کی۔ اس حساب سے ملک درویش ترین کا زمانہ سنہ ۱۶۲۳ء ہوا۔

ترین قوم کے مشہور افراد

۱۔ عہد ماضی کے افراد کے حالات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ انہوں نے ہزارہ پر حکومت کی اور نام چھوڑا۔

۲۔ عہد حال کی چند قابلِ ذکر شخصیتیں یہ ہیں:-

خان میر افضل خان ڈھنگی درویش مرحوم آپ درویش میں قابلِ عزت خان ہوئے ہیں۔ نیک سیرت، اور پرہیزگار انسان تھے۔ تسبیح ہر وقت اُن کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ بڑے مجلس آرا شخص تھے۔ شیخ سعدی کی گلستان و بوستان نوکِ زبان تھی اور گفتگو میں حکایت و شعر برمحل خوب چسپاں کرتے تھے۔ ہزارہ میں اُن سے بہتر علم و تجربہ و اخلاق والا انسان میری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ کے بیٹے بھی اچھے اخلاق اور اثر و رسوخ والے ہیں۔ خواجہ محمد خان (پیدائش جون سنہ ۱۹۱۶ء) نے اپنی ہوشیاری اور حسنِ سلوک سے میدان ہری پور میں کافی اثر و رسوخ پیدا کیا سیاسی لحاظ سے آپ اس علاقہ میں با اثر شخصیت ہیں جب تک سرحد کونسل کے لئے کھڑے ہوتے رہے کامیاب رہے (سنہ ۱۹۵۱ء و سنہ ۱۹۵۵ء میں) زمینداری کی ترقی خاص کر باغات لگانے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔ شائستہ اخلاق کے آدمی ہیں۔ آپ کے ایک بھائی عبدالرحمٰن خان اخلاق و شرافت کا مجسمہ پاکستان کے سفیر متعینہ مغربی جرمنی ہیں۔ اُن کے دوسرے بھائی محمد سلیم خان مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ ایک سلیم الطبع ملنسار انسان ہیں۔

خاندان ریحانہ

ضلع ہزارہ کے اس گاؤں کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس گاؤں کی ایک قابلِ ذکر ہستی صدرِ پاکستان رہی ہے۔

رسالدار میجر میرداد خان صاحب مرحوم اس گاؤں کے سربرآوردہ خاندان کے ممبر تھے۔ آپ فوج میں نیک نام افسر رہے۔ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم اس پایہ کی کی کہ آج وہ بلند پایہ ہستیاں ہیں۔ آپ کی وفات ۲۷ ستمبر ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ آپ کے بڑے بیٹے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ہیں اور دوسرے نامور بیٹے سردار بہادر خان ہیں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان

آپ کی پیدائش ۱۴ رمئی ۱۹۰۷ء میں ریحانہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سرائے صالح وہری پور کے سکولوں میں پائی۔ ۱۹۲۳ء علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں فوج کی ملازمت کے لئے چنے گئے۔ اور سینڈہرسٹ انگلینڈ میں فوجی تربیت حاصل کی۔ ۲ر مارچ ۱۹۲۸ء میں آپ کو کمیشن مل گیا۔ مختلف چھاؤنیوں میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیم برصغیر ہندو پاکستان ہوئی تو آپ سرحدی سپیشل ملٹری کمانڈ کے کمانڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہ کمانڈ اگست ۱۹۴۷ء میں ختم کردی گئی اس کے بعد آپ وزیرستان بریگیڈ کے کمانڈنٹ مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان میں جنرل آفیسر کمانڈر مقرر ہوئے۔ اس وقت خواجہ ناظم الدین مرحوم وزیراعلیٰ تھے۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں جنرل ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں تعینات ہوئے جب کہ جنرل گریسی کمانڈر انچیف تھا۔ ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء میں کمانڈر انچیف مقرر کئے گئے۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مرکزی وزارت پاکستان میں شامل کئے گئے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں وزیراعظم (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر) ہوئے اور تین ہفتہ بعد صدر پاکستان ہوئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک صدر رہے۔

آپ کے عہد میں بہت سی دُور رس اصلاحات ہوئیں۔

۱۔ لوگوں نے اپنی پوشیدہ دولت کا برضا خود اعلان کیا جو قریباً ایک ارب ستر کروڑ روپیہ تھا۔
۲۔ ملازمین سول اور فوج کی تنخواہوں میں اضافہ کیا گیا۔
۳۔ بہت دُور رس زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا گیا۔
۴۔ نیا آئین ملک کو دیا گیا۔
۵۔ دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا اور ایک شاہانہ دارالخلافہ ابھی تک زیر تعمیر ہے۔
۶۔ زراعت کی ترقی کے لئے خاص اہتمام کیا جا رہا ہے ایک بڑا ڈیم منگلا بن کر تیار ہو چکا ہے۔ اور ایک

بہت بڑا ڈیم تربیلہ شروع ہو گیا ہے۔

ان کارناموں کے سرانجام دینے والے کے خلاف نومبر ۱۹۶۸ء سے حزب مخالف کی سیاسی سرگرمیاں آناً فاناً بہت تیز ہو گئیں۔ دس سالہ دورِ حکومت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پُرامن فضاء میں تعمیر و ترقی کا جشن ہو چکا تھا کہ ہفتہ کے ختم ہوتے ہی ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اس ارتعاش نے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔ حزب مخالف کے بنیادی لیڈر رول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ممتاز محمد خان دولتانہ۔ نوابزادہ نصراللہ خان۔ چودھری محمد علی مرحوم ذوالفقار علی بھٹو۔ عبدالحمید خان بھاشانی۔ شیخ مجیب الرحمن۔ کونسل مسلم لیگ۔ نظام اسلام پارٹی۔ جماعت اسلامی اور عوامی لیگ کی مخالفت اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر خارجہ پاکستان و دستِ راست صدر محمد ایوب خان کے نعرۂ مستانہ سے فوراً شعلہ کی صورت اختیار کر گئی۔ ان کے بعد سابق ایر مارشل محمد اصغر خان کی سیاست میں آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ دونوں اصحاب صدر کے دستِ راست اور محبوب ساتھی رہے تھے ؎

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم ۔۔۔ کہ با من آنچہ کرد، آں آشنا کرد

آخر یہ آگ اتنی تیز اور بے قابو ہو گئی کہ سب ملک کو بھسم کر دینے والی ہی تھی کہ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدرِ پاکستان نے ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ء کو ملک کے اختیارات جنرل آغا محمد یحییٰ خان کمانڈر انچیف افواج پاکستان کے حوالہ کر کے خود صدارت کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا۔ اس کے لگتے ہی یہ آگ یک لخت ٹھنڈی ہو گئی۔ ملک کی فضاء اعتدال پہ آ گئی۔

عنانِ اقتدار سے خود بخود ہاتھ اٹھا لینا بڑے دل و گردہ کا کام ہے۔ تاریخ میں اس کی مثال تقریباً عنقاء ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اس اقدام سے جہاں ملک کو بچا لیا وہاں اپنا مقام بھی تاریخ میں محفوظ کر لیا۔ یہ اُن کا تدبر ہے کہ فوجی جنرل ہوتے ہوئے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا اور ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ اس عہد با تدبیر و استحکام جس میں پاکستان کی ساکھ بیرونی دنیا میں قائم ہو گئی تھی کے انجام سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس دنیا میں صرف تدبیر ہی کارفرما نہیں بلکہ اصل کارفرما تقدیر ہے فاعتبروا یا اُولی الابصار علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں ؎

سلطنت نازک تر آمد از حباب ۔۔۔ از دمے او را تواں کردن خراب

خان سردار بہادر خان

پیدائش ۵ رجولائی ۱۹۰۸ء۔ ابتدائی تعلیم سرائے صالح وہری پور کے سکولوں میں ہوئی۔ آپ نے قانون کی ڈگری

بی اے ایل ایل بی علیگڑھ کالج سے لی۔ چند سے ایبٹ آباد میں پریکٹس کی لیکن آپ کی طبیعت کا رجحان سیاست کی طرف تھا۔ لہٰذا اس میدان کی طرف آ گئے اور اس میدان کے شہسوار ثابت ہوئے۔ قوم و ملک کی بہترین خدمت کی۔ اور ملک کے چنے ہوئے پارلیمنٹرین ثابت ہوئے۔

سابق سرحد اسمبلی ۱۷ر اگست ۱۹۴۲ء میں سپیکر ہوئے اور قابلیت کے ساتھ اس عہدہ کو نبھایا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں وزیر مواصلات مرکزی حکومت پاکستان مقرر ہوئے اور اکتوبر ۱۹۵۴ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ زیرک اور معاملہ فہم وزیر تھے۔ ان کے عہد کی ایک مفید قوم و ملک دونوں کے لئے یادگار ٹیلیفون فیکٹری واقع ہری پور ہے۔ فنی اعتبار سے یہ فیکٹری ملک کی ضروریات ٹیلیفون پوری طرح مہیا کرتی ہے۔ اور اب بیرونی ممالک کو بھی یہ سامان مہیا کرے گی۔

اہل ہزارہ کے ہزاروں لوگ مختلف درجہ ہائے ملازمت میں اس سے منسلک ہو گئے ہیں جن کو ایسے اداروں میں باہر جا کر کبھی ملازمت نہ مل سکتی۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں آپ بلوچستان کے گورنر مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں وزیراعلیٰ سابق صوبہ سرحد مقرر ہوئے ان کے عہد میں وحدت مغربی پاکستان کا عمل درآمد ہوا۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان میں وزارت ترقیات پر فائز ہوئے اور ۶ر مئی ۱۹۵۶ء میں بوجہ اختلاف مستعفی ہو گئے۔ وزارت چھوڑ دی لیکن مسلم لیگ کی ممبری نہ چھوڑی۔ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور مارچ ۱۹۶۵ء سے سیاست سے بیزار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔

سیاست سے علیحدہ ہونے کے بعد خیبر ٹیکسٹائل مل بالڈھیر لگائی جو ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ زرمبادلہ بھی مہیا کر رہی ہے اور سینکڑوں لوگ اس میں ملازمت کے ذریعہ سے اپنا روزگار حاصل کرتے ہیں۔

خان عبدالمجید خان - تکوکر

آپ نے سنہ میں ولایت سے بار ایٹ لاء کی ڈگری، اپنی محنت اور جانفشانی سے حاصل کی۔ اور پھر ملازمت سرکاری میں منسلک ہو گئے۔ ۱۹۳۵ء میں پنشن پر تشریف لائے اور سیاست میں حصہ لیا اور ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں سابق سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ آپ کا بیٹا محمد سلیم خان قابل انسان تھا۔ P.F.S میں رہے اور چند مدت بطور ٹریڈ ایجنٹ پاکستان کے نمائندہ رہے۔ آخر کار انگلینڈ میں حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہوئے۔ وہ اس وقت پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے۔

دلازاک

یہ بہت بڑی اور شاندار ماضی کی حامل قوم ہے اور ہزارہ میں گکھڑوں اور ترکوں کے بعد یہی قوم ہے جو ہزارہ میں آئی۔ افغانستان سے ہجرت کرنے کے بعد یہ پشاور میں آئی اور پھر ہزارہ میں۔ یہ سب زمانہ اس پر حوادث و ادبار کا گزرا جس سے اس کی طاقت و ناموری کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ اپنی جمعیت کے ہر بار منتشر ہونے پر آخر کار صالح محمد خان کے دوسری دفعہ ہزارہ میں آ جانے کے بعد ہی قوم کو سکون حاصل ہوا۔ اور وہ اپنے موجودہ مستقر پر تا حال آباد ہے۔ مندرجہ ذیل تاریخی حوالہ جات اس قوم کے ابتدائی زندگی کے مشکلات اور مصائب کی شہادت دیتے ہیں۔

اخون درویزہ کی روایت کے مطابق دلازاک افغان پہلے پہل ننگرہار میں آئے اور وہاں سے مشرق کی طرف چلے گئے۔ ان سے مدت بعد یوسفزئی اور مندڑ و دیگر افغان اس علاقہ میں آئے۔ اور یہ بھی سب مشرق کو جاتے رہے۔ اور سب سے آخر غوریخیل (غوری) آئے اور وہ بھی پہلوں کی طرح مشرق کو چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلازاک اس علاقہ (ننگرہار) میں اس وقت آئے جب چنگیز خان کے حملے نے ان ترک قبیلوں کو جو یہاں آباد تھے۔ تباہ کر دیا۔

جب یوسف زیوں اور مندڑ کے قبائل بوجہ قتل عام اپنے سرداروں اور اہل عیال کے جو مرزا الغ بیگ اکبر بادشاہ کے چچا کے ہاتھوں ہوا۔ قوت شکستہ اور تھکے ہوئے پشاور کے ضلع میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے افغان دلازاک بھائیوں سے درخواست کی کہ ان کو رہنے کے لئے جگہ دی جائے۔ دلازاکوں نے ان کو رہائش کے لئے علاقہ دوابہ (علاقہ چارسدہ) دیا۔ اس پر ان کے سردار ملک احمد نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن ساتھ ہی عرض کی کہ یہ علاقہ بہت تنگ ہے۔ اور ان کے بہت سے قبیلے ابھی پیچھے ہیں اگر وہ بھی یہاں آنا چاہتے ہیں۔ اور وہ صرف اس وقت تک وہاں ہیں جب تک ہم یہ ٹھکانا حاصل نہیں کر سکتے اگر وہ سب آ گئے تو ہم اس جگہ میں نہیں سما سکیں گے۔ اس پر دلازاکوں نے علاقہ دانش کول اور انبار تا حد باجوڑ دے دیا۔

راورٹی ص ۱۲۲

اخون درویزہ جو یوسف زیوں اور مندڑ کا روحانی پیشوا تھا۔ ان کے ساتھ ہی ننگرہار سے پشاور آ گیا تھا۔ بابر بادشاہ سے بہت پہلے دلازاک قوم کو یوسف زئی اور مندڑ قوم نے مقام کاٹلنگ شکست دے دی تھی۔ کیونکہ دلازاک قوم کا سلوک بہت مغرورانہ ہو گیا تھا۔ یہ جنگ گورنالہ کے کنارے پر ہوئی تھی۔ جو بگیاڑی اور کاٹلنگ کے درمیان ہے۔ قوم دلازاک کا لشکر شہباز گڑھ

سے روانہ ہوا تھا۔ اور یوسف زئی لشکر بمعہ منڈر۔ اتمان خیل اور محمد زئی اقوام کے لشکر کے سوات، باجوڑ، ہشت نگر اور سمہ سے جمع ہوا تھا۔ اس جنگ میں دلازاکوں کو سخت شکست ہوئی۔ دلازاک قوم کا دریائے سندھ کا شمالی علاقہ ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ صرف جنوبی حصہ بمعہ پشاور ان کے قبضہ میں رہ گیا لیکن ان کی قوت ریزہ ریزہ ہوگئی۔ اور ان کا مکمل زوال شروع ہوگیا۔ پشاور کا علاقہ بابر بادشاہ کے وقت سے بعد تک بھی ان کے قبضہ میں رہا۔ کیونکہ جب بابر بادشاہ پشاور (۱۵۱۹ء) گیا تو دلازاک ملکوں نے اس سے درخواست کی کہ ہشت نگر وغیرہ علاقہ میں جہاں سے وہ نکال دئے گئے ہیں۔ ان کا بہت سا غلہ رہ گیا ہے اور یہ کہ ان کو سمہ (صوابی مردان کا ضلع۔ ش ب) سے بھی نکال دیا گیا ہے۔

جب دلازاک کو شکست ہوئی اور وہ دریائے کابل کے شمال کا سب ملک کھو بیٹھے تو یہ ملک یوسف زئی۔ منڈر وغیرہ حلیف اقوام نے آپس میں تقسیم کر لیا۔

بابر۔ جہانگیر اور ابوالفضل سب اس پر متفق ہیں کہ دلازاک پٹھان ہیں۔ جہانگیر بادشاہ نے دلازاک اور کھٹڑ (غیر پٹھان قوم) ہر دو کو ہزارہ سے خارج کر دیا تھا جب کہ وہ ۱۰۱۵ھ مطابق ۱۶۰۷ء میں کابل جا رہا تھا۔ اس نے ظفر خان پسر زین خان کوکلتاش کو اٹک اور اس ضلع کا گورنر مقرر کیا اور حکم دیا کہ بوجہ فساد و شرارت کے ان ہر دو اقوام دلازاک اور کھٹڑ کو یہاں سے نکال کر لاہور بھیج دے۔ اور یہ کام اس کے کابل سے واپس آنے تک مکمل کر دے۔ اس حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ اور اس موقع پر تقریباً ایک لاکھ خاندان ان اقوام کا یہاں سے نکالا گیا۔

راورٹی کے بیان کے مطابق شروع سال ۹۲۵ھ مطابق جنوری ۱۵۱۹ء جب بابر نے باجوڑ پر حملہ کیا اور گبری سلطان کو شکست دی تو اس وقت خوگیانی قوم دوآبہ کے علاقہ میں سکونت پذیر تھی لیکن ترکلانی (یوسف زئی اور منڈر) اس وقت تک لغمان ہی میں تھے۔ اور آفریدی اس وقت کے قریب ہی دریائے باڑہ کے کنارے آکر آباد ہوئے تھے۔ محمد زئی اور کچھ اتمان خیل اس وقت نیک انہار (یعنی ننگرہار) ہی میں مقیم تھے۔

خوگیانی قوم کو بابر بادشاہ ہشت نگر کے ضلع میں بظاہر دلازاک پر حملے کے لئے لائے۔ لیکن یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ ان کا مقصد یوسف زئی اور منڈر پر حملہ کرنے کا تھا۔ مگر یوسف زئی اور منڈر اس جنگ میں غیر جانب دار رہے۔

دلازاک کو بابر بادشاہ اپنی تزک میں پٹھان، اچھے لوگ اور وفادار رعایا کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور

وہ اس کے بیٹے کے بھی وفادار رعایا رہے۔ یہی وجہ ہے مرزا کامران (ہمایوں بادشاہ کا بھائی) ان کا مخالف ہوگیا۔ راورٹی کے خیال میں دلازاک قوم کے ملک بدر ہونے کا زمانہ اغلباً ۹۴۰-۴۱ھ مطابق ۳۴-۱۵۳۳ء ہوگا۔ کیونکہ ہمایوں کو اپنی سلطنت ۹۴۰ھ (۱۵۳۳ء) (صحیح ۱۵۴۰ء) میں چھوڑنی پڑی اور شاہ ایران سے امداد مانگنی پڑی۔ جس کی مدد سے ہمایوں نے کابل کامران سے لے لیا۔ اور اس واقعہ سے بہت مدت پہلے دلازاک اپنے مقبوضات جو دریائے سندھ سے مغرب میں تھے کھو چکے تھے۔

کابل سے بے دخل ہونے کے بعد کامران نے جدوجہد کے لئے بہت دفعہ اپنے غوارہ خیل (خلیل و مہمند) دوستوں کے پاس پناہ لی۔ ۹۵۷ھ مطابق ۱۵۵۰ء میں کامران کو مکمل اور آخری شکست قبتر گرام نزد کابل خورد ہوئی اور وہ پناہ کے لئے پھر غوارہ خیل قوم کے پاس گیا۔ اور ان کی مدد سے اس نے ننگرہار ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں ہمایوں کے کیمپ پر شب خون مارا (ننگرہار میں مہمند و خلیل آباد تھے) جس میں ہمایوں کا بھائی ہندال مارا گیا۔ اس کے دوسرے سال کامران گرفتار ہوا اور اندھا کر دیا گیا۔

(کامران کی گرفتاری کا واقعہ تفصیل سے حالات گکھڑ میں تحریر کیا گیا ہے)

توزک جہانگیری (اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۶) میں تحریر ہے۔ "۱۵ محرم (۱۰۱۶ھ مطابق ۱۶۰۷ء) حسن ابدال سے روانہ ہو کر امروہی (اٹک اور حسن ابدال کے درمیان واقع تھی) میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں بہت ہی عمدہ اور ہموار سبزہ زار نظر سے گزرا جو ہر قسم کی ناہمواری سے خالی تھا۔ اس موضع اور اس کے ارد گرد کے علاقہ میں کھٹڑ و دلازاک قوم کے آٹھ ہزار گھرانے آباد ہیں۔ یہ لوگ طرح طرح کے فتنہ و فساد، چوری، چکاری اور راہ زنی کا کام کرتے ہیں۔ میں نے حکم دیا کہ اس علاقہ کی اور اٹک کی سرکاری عملداری ظفر خان ولد زین خان کوکہ کے سپرد کی جائے۔ جو میرے کابل سے واپسی تک کے عرصہ میں تمام دلازاک لوگوں کو اٹھوا کر لاہور لے جائے۔ جہاں اس قوم کے بڑوں کو گرفتار کر کے قید میں رکھا جائے۔

جمعرات ۲۵ جمادی الآخر۔ کابل سے واپسی پر بمقام ڈھکا ظفر خان ولد زین خان کوکہ نے اس منزل پر پہنچ کر شرف حضوری حاصل کیا۔ اسے میں نے دلازاک پٹھانوں اور کھٹڑ ذات کے لوگوں کو جو اٹک اور بیاس کے ارد گرد کے علاقوں میں رہ کر لوٹ مار کرنے کے علاوہ فتنہ و فساد برپا کرتے تھے ان کے منزل سے اکھاڑ کر لاہور روانہ کرنے کی خدمت پر مقرر کیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کے ایک لاکھ گھروں کو اکھاڑ کر دیار بھیجنے کے بعد مذکورہ منزل میں حاضر خدمت ہوا۔ آگاہی ہوئی کہ اس نے اپنے فریضہ کو اچھی طرح سے سرانجام دیا۔"

ماخوذ از تزک جہانگیری

آئینِ اکبری میں صوبہ لاہور کے متعلق دوآبہ سندھ ساگر یعنی درمیان دریائے جہلم و سندھ کی زیرمد پرگنات ہزارہ قارلق لکھا ہے۔ اس کے خانہ اراضی میں دو لاکھ چودہ ہزار چار سو تینتیس بیگھہ، خانہ جمع میں اٹھارہ لاکھ پانچ ہزار تین سو پینتالیس دام (فی روپیہ چالیس دام) جن کے پینتالیس ہزار ایک سو تینتیس روپیہ ہوئے۔ خانہ جاگیر میں پانچ ہزار تین سو دو دام۔ خانہ ملکیت زمینداری میں افغان دلازاک۔ خانہ سوار میں ایک سوار۔ خانہ پیادہ میں پانچ سو لکھا ہے۔ تمام میدانِ ہزارہ میں دوسری کوئی قوم تحریر نہیں ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت (اکبر بادشاہ کے وقت ش ب) معتبر قوم اس علاقہ میں یہی قوم دلازاک تھی۔

سر اَلف کیرو کے قول کے مطابق شجرہ نسب میں دلازاک کار لانڑی ہیں اور اُتمان خیل و اورک زئی کے بھائی ہیں۔ بابران کو افغان کہتا ہے۔

بحیثیت قوم یہ پشاور کے علاقہ سے معدوم ہیں۔ پشاور علاقہ د اُوڈزئی میں صرف ایک گاؤں دلازاک ہے۔

یہ قوم محمود غزنوی کے وقت مسلمان ہوئی اور اس کے ساتھ ہندوستان و سومنات کے حملوں میں شریک تھی۔

بموجب روایت دلازاک چند صدی پیشتر ننگرہار اور اس کے مغرب سے پشاور میں آچکے تھے۔

یوسف زئی خان، ملک احمد و کاجو (گجو) نے دلازاکوں کو شکست دی۔ گجو خان اس جنگ میں نوعمر جوان تھا اور خوب صورت مثل بابر تھا۔

جب دلازاک شکست کھا کر دریائے سندھ کو عبور کرنے کے لئے بھاگ رہے تھے تو گجو خان ان کے تعاقب میں وہاں پہنچ گیا۔ دلازاکوں کے خان نے اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے آدمیوں کو روک لے۔ تاکہ ان کی عورتیں دریا پار کر سکیں۔ نہیں تو وہ سب اپنے آپ کو دریا میں غرق کر دیں گے۔ یہ جنگ کاٹ لنگ کے مقام پر ۱۵۲۰ء میں ہوئی۔ گجو خان نے اپنے آدمی روک لئے۔ اس سلوک کی بنا پر دلازاک کے خان نے اپنی لڑکی گجو خان کو نکاح میں دے دی۔

جب یوسف زئی کابل کے قتل کے بعد تھکے ہارے ہوئے پشاور کے علاقہ میں آئے تو انہوں نے دلازاکوں کی پناہ لی۔ اور رہائش اور آبادی کے لئے جگہ کی درخواست کی۔ دلازاکوں نے اُن کو دوآبہ کا علاقہ (دریائے کابل اور دریائے سوات کا درمیانی علاقہ جہاں اب شبقدر ہے) دے دیا۔ یوسف زئی نے مزید درخواست کی کہ اُن کے بہت سے لوگ پیچھے ہیں۔ اور یہ علاقہ تھوڑا ہے۔ دلازاکوں نے دانش کول و انبھار تا باجوڑ بھی دے دیا۔ اور کہہ دیا کہ مزید ہشت نگر کا علاقہ بھی دہقانوں کو جو سوات کے جہانگیری سلطان کے ماتحت ہیں فتح کر کے لے سکتے ہو۔

ان یوسف زئیوں کا ملک احمد تھا۔ یوسف زیوں نے دوابہ - دانش کول - انبھار اور باجوڑ میں وادی لاشوڑہ (جہاں اب کھا ریاخار ہے) پر قبضہ کر لیا۔ اور جندول ہوتے ہوئے پنج کوڑا دریا تک پہنچ گئے۔ ان کے لشکر نے چارسدہ پر حملہ کر کے اسے لے لیا۔ اور دلازاکوں کے علاقہ میں ہوتی مردان میں کلپانڑی تک قبضہ کر لیا۔ اسی اثناء میں بابر ۱۵۱۹ء میں نمودار ہوا۔ دلازاک اپنا علاقہ (ہشت نگر) واپس لینے کی غرض سے بابر کے ساتھ ہو گئے۔ بابر کے جانے کے بعد گگیانیوں نے دلازاکوں پر حملہ کر دیا۔ لیکن بیلہ کے مقام پر سخت شکست کھائی۔ ملک احمد نے یہ بہانہ بنا کر دلازاکوں نے گگیانیوں پر ظلم کیا ہے۔ اور یوسف زیوں کو سمہ (مردان - صوابی) میں آباد ہونے کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ان پر حملہ کا انتظام کیا۔

یوسف زئی، مندڑ، اتمان خیل، گدون، محمد زئی نے متفقہ حملہ کیا۔ اور ایک زبردست جنگ کاٹ لنگ اور شہباز گڑھ کے درمیان نالہ گدر پر ہوئی۔ دلازاک کو شکست ہوئی وہ دریائے کابل کے جنوب کی طرف اپنی قوم کی طرف نہ جا سکے اور دریائے سندھ عبور کر کے چھچھ ہزارہ میں آ گئے۔ یہ جنگ کاٹ لنگ، بابر کے کاٹ لنگ کے حملہ ۱۵۱۹ء اور دہلی کی فتح ۱۵۲۶ء کے درمیانی عرصہ اغلباً ۱۵۲۵ء میں ہوئی۔ اسی جنگ میں ملک احمد نے دلازاک خان کی بیٹی سے شادی کی۔ لہذا دلازاک کی آمد چھچھ ہزارہ میں اغلباً ۱۵۲۵ء میں ہوئی۔

دلازاک کے دریائے کابل کے شمالی علاقہ میں شکست اور بھاگنے کے بعد دریائے کابل کے جنوبی علاقہ پر از خیبر تا خیر آباد، دلازاک قابض تھے۔ اس دوران میں اس علاقہ میں خٹک قوم کا نام نہیں آیا دریائے کابل کے جنوبی علاقہ میں قوم دلازاک کی شکست غوریہ خیل (خلیل و مہمند) کے ہاتھوں ۱۵۳۵ء میں ہوئی۔ سر اَلف کیرو کے بیان کے مطابق ۱۵۱۹ء میں بابر نے، باجوڑ، سوات اور علاقہ یوسف زئی پر حملہ کیا۔ جب وہ میدانِ پشاور میں پہنچا تو دلازاکوں نے اس کو مشورہ دیا۔ کہ یوسف زیوں کو شکست دینے کے لئے میدانِ ہشت نگر میں ان کو لوٹ لیا جائے۔ ہشت نگر کے میدان اور پشاور کے درمیان حفاظتی قلعے بنا لئے جائیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دلازاک میدانِ پشاور میں موجود تھے۔

اقوام و قبائل کے حالات میں ایٹکسن لکھتا ہے کہ یہ پٹھانوں کی ایک قابلِ ذکر اور بڑی قوم ہے اور پٹھانوں میں سب سے پہلے یہی قوم علاقہ پشاور میں داخل ہوئی۔ بموجب قول اخون درویزہ۔ یہ قوم امیر تیمور کے زمانے سے قبل مغرب و جنوب مغرب کی جانب سے ننگرہار میں داخل ہوئی۔ اور

شلمانیوں کی حلیف بن کر وادیِ پشاور میں مقیم ہوگئی۔ بابر بادشاہ اور اکبر کے زمانہ میں یہ اُولاساؤ اور باجوڑ کے مشرقی حصہ میں آباد تھے۔ اور دوآبہ کا علاقہ انہوں نے یوسف زئی اور مندڑ کو دے دیا۔ انہوں نے از خود یہ علاقہ اپنی طرف سے خوگیانیوں کو دے دیا۔ دلازاکوں نے ان کو جنگ کر کے وہاں سے نکال دیا اس پر ملک احمد کی سرکردگی میں یوسف زیوں اور مندڑ نے دلازاکوں پر حملہ کر دیا اور ان کو دریائے کابل کے شمال کے علاقہ سے نکال دیا۔ اس کے بعد خلیل اور مہمند قبائل کی انگیخت پر کامران نے ۹۴۰ھ ۱۵۳۴ء ان پر حملہ کر دیا اور ان کو پشاور اور دریائے سندھ سے مغرب کی طرف کے علاقہ سے نکال دیا۔ اس کے بعد (سنہ ۹۴۹ھ ۱۵۴۹ء) ملک احمد کے جانشین خان کاجو نے یوسف زئی اور مندڑ کی متفقہ قوت سے غوراہ خیل غوریاخیل (خلیل اور مہمند) کو مقام شیخ تاپور پر جنگ کر کے شکست دے دی۔ خان کاجو کی قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ایک وقت میں اس کے ماتحت ڈیڑھ لاکھ کی فوج تھی۔ اور اس کی حکومت ننگرہار سے مارگلہ تک اور شمالی سوات سے پنڈی اور کالاباغ تک تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آدم خان گکھڑ اس کا باجگذار تھا۔ تین یا چار سال بعد ۱۵۵۲ء ہمایوں پشاور پہنچا جبکہ قلعہ بالاحصار ویران پڑا تھا۔ اور سکندر خان کازک کو حاکم مقرر کیا۔ اس کے جاتے ہی خان کاجو (خان گجو) نے بگرام (پشاور) پر حملہ کر دیا اور سکندر خان کا محاصرہ کر لیا۔ جس نے آتشیں ہتھیاروں سے مدافعت کی۔ خان کاجو (گجو) کے پاس آتشیں ہتھیار نہ تھے۔ لہٰذا اس نے محاصرہ اٹھا لیا۔

خان کاجو (گجو خان) کا وزیر اور خان ملا (قاضی القضاۃ) شیخ ملی تھا۔ اس نے فتح شدہ علاقہ کو قوم میں تقسیم کر دیا۔

شیخ ملی کی تقسیم اراضیات ایک تاریخی اور مستند واقعہ ہے۔ پٹھان اب بھی اراضیات کی تقسیم پر اس کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس کی تقسیم کا ایک اصول یہ تھا۔ خوگہ سرہ خوگہ، ترخہ سرہ ترخہ (ہر ایک کو بہتر زمین سے الگ اور کمزور زمین سے ایک الگ حصہ ملے گا) اس اصول کی بنا پر اچھی اراضیات میل لمبی اور ایک بالشت چوڑی ہر حصہ دار دفتر کو ملی۔ یہ تکلیف دہ صورتِ حال۔ از رُوئے کاشت و برداشت فصل، صوابی ضلع مردان میں ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ اور سابق صوبہ سرحد میں اشتمال اراضی کا کام ۱۹۳۰ء میں اسی جگہ سے شروع ہوا۔

دلازاکوں کی آمد سے پہلے شلمانی (سلیمانی۔ یہ نام عربوں نے اِن اقوام کو، جو کوہ سلیمان اور اس کے اردگرد آباد تھیں، دیا تھا۔ ان اقوام کے مسلمان ہوجانے کے بعد اِن کو شلمانی سے یاد کیا جاتا رہا) سلطانِ سوات کے ماتحت تھے۔ دلازاکوں نے اِن قدیم باشندوں کو وہاں سے نکال دیا۔ یا اپنے میں جذب

کر لیا۔ اس طرح سے انہوں نے مشرقی باجوڑ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سے سوات کا علاقہ اور دریائے جندی (JINDE) سے دریائے کلپانی (یہ مردان کے ساتھ بہتا ہے) تک کا علاقہ اُن کے زیرِ نگیں آگیا۔

جس وقت قوم یوسف زئی اور مندڑ اس طرف آئے ان ایام میں شلمانی ہشت نگر کے علاقہ پر قابض تھے لیکن باجوڑ سے دریائے سندھ تک اور دریائے کابل کے شمال اور جنوب کے سب علاقہ پر دلازاکوں کا قبضہ تھا۔ جب بابر بادشاہ کے چچا مرزا الغ بیگ نے یوسف زئی اور مندڑ کو کابل سے نکالا۔ تو انہوں نے دلازاکوں سے امداد کی درخواست کی۔ اس پر دلازاکوں نے ان کو رہنے کے لئے شبقدر دوابہ دے دیا۔ اور وہ اس علاقہ میں آباد ہو گئے۔ لیکن ان میں سے کچھ مندڑ اپنے خان میر جمال امان زئی کی زیر سرکردگی انبارہ اور دانش کول کی طرف پھیل گئے۔ اور بہت سے مندڑ اور کچھ یوسف زئی باجوڑ کی طرف چلے گئے۔ جہاں ان کا مقابلہ عمر خیل دلازاکوں سے جو چانڈاول وادی میں رہتے تھے ہوا۔ انہوں نے دلازاکوں کو شکست دے دی اور ان کا خان ملک ہیبو مارا گیا۔

یوسف زئی۔ مندڑ اور خلیل (خلیل دوسرے غورہ خیل قبیلوں سے جھگڑنے کی وجہ سے شمالی قندھار سے آگئے تھے اور پہلے سے باجوڑ میں مقیم تھے) نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ لیکن جلدی ہی ان کا آپس میں تنازع ہو گیا۔ اور وادیِ ہندوراج میں جنگ ہوئی جس میں خلیل کو شکست فاش ہوئی اور اس کے بعد سے پھر وہ کبھی بھی باجوڑ میں آباد نہ ہو سکے۔

اسی اثناء میں خوگیانیوں نے باجوڑ میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے ملک احمد سے کی امداد کی درخواست کی۔ اس نے ان کو دوابہ دے دیا لیکن وہاں پر ان کی چپقلش دلازاکوں سے ہو گئی۔ اور آخرکار یوسف زئی اور مندڑ بھی ان کے مخالف ہو گئے۔ بعد میں یوسف زیوں نے خوگیانیوں اور دلازاکیوں کو آپس میں فیصلہ کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اسی لئے وہ اپنی امداد کے لئے بابر بادشاہ کو ۱۵۱۹ء میں ہشت نگر میں لے آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دلازاکوں نے خوگیانیوں کو مکمل شکست دے دی۔ دلازاک اپنی اس فتح پر بہت نازاں تھے۔ یہ بات ملک احمد کو بہت ناگوار معلوم ہوئی اور وہ حسد کرنے لگا۔ ملک احمد نے اپنی قوم اور حلیف اقوام کو جمع کر کے دلازاکوں پر حملہ کر دیا۔ ایک خونریز جنگ نالہ گذر (گذر رود) مابین کاٹلنگ اور شہباز گڑھ ہوئی جس میں دلازاکوں کو شکست عظیم ہوئی۔ اور وہ دریائے سندھ کی طرف بھاگے۔ ملک احمد کے لڑکے خان کاجو غیرت قومی کے زیر اثر ان کے تعاقب میں اس وقت تک التوا کی کہ ان کی مستورات دریائے سندھ سے پار ہو جائیں۔ آخرکار دلازاک قوم کے سردار کی لڑکی کی خان کاجو سے شادی کر دی گئی اور اس طرح دلازاک

قوم کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا۔

دلازاک بابر بادشاہ کے وفادار تھے۔ مگر کامران ان کا مخالف تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا سیاسی اقتدار پھر سے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ تاہم وہ آخر کار ایک سخت بربادکن جنگ کے بعد ہی مغلوب کئے جا سکے۔

کامران کی امداد پر خلیل اس کوشش میں رہے کہ دلازاکوں کو اُن کے بقیہ مقبوضات سے بھی بے دخل کر دیں اور وہ (خلیل) ۱۵۳۰ء تک ڈھکہ سے اٹک تک بمعہ درہ خیبر و کڑپہ کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق قوم دلازاک جس میں سے یہ دلازاک موجودہ حال بھی ہیں بقول مشہور سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے ساتھ ۱۰۲۴ء کے حملہ سومنات کے موقع پر یہ قوم موجود تھی۔ مگر اس ملک ہزارہ میں دلازاک نہیں تھے۔ پار دریائے سندھ جانب پشاور ان کا کچھ دخل تھا۔ قریب ۱۵۵۳ء کے اس ملک میں داخل ہوئے۔ ۱۶۰۵ء میں جب کہ شہنشاہ اکبر کا عہد تھا۔ یہ قوم میدان ہزارہ میں قابض ہوئی۔ ۱۶۰۷ء میں ظفر خان پسر زین خان کوکہ حاکم حدود اٹک نے بحکم شہنشاہ جہانگیر بسبب فساد و سرکشی ان کو لاہور کی طرف جلا وطن کر دیا۔ ان جلاوطن شدہ دلازاکوں سے صالح محمد اور شیر محمد خان برادر صالح محمد خان کا جو مورث اعلیٰ اس قوم کا ہے۔ نرہی کی طرف سے آ کر ۱۶۴۲ء میں دوبارہ دخل اس علاقہ پر پایا۔ شیر محمد خان کو تیر کا علاقہ ملا۔ اور صالح محمد خان نے ۱۶۴۲ء میں سرائے صالح آباد کی۔ ۱۷۲۳ء میں سرائے صالح پر اُتمان زیوں نے حملہ کرکے اس کو ویران کر دیا۔ لیکن جلد ہی اسے پھر آباد کر دیا گیا۔ ۱۸۱۶ء تک دلازاک حاکمان دُرانی کو ان کا مالکانہ ادا کرکے قابض رہے۔ ۱۸۱۶ء میں سردار مکھن سنگھ جو خود سر علاقہ پنڈی میں تھا اُن (دلازاکوں) کے علاقہ پر حملہ کیا۔ (ترکوں نے اس کو بلایا تھا) اور اسی سنہ میں اس نے شاہ محمد میں اپنی گڑھی بنائی۔ اور سلسلہ وراثت دلازاک کا شکست ہوا۔ میدان تو زیر حکومت مکھن سنگھ آ گیا۔ مگر جلال خان اس قوم کا سرگروہ موضع موہری میں جو دامن کوہ ہے اور لڑائی سے امن کی جگہ تھی، آباد ہو گیا۔ ان کا خاص دخل سرائے صالح کا ۱۸۱۸-۱۶ء سے چھوٹ گیا۔ اس اثناء میں اکثر دلازاک بلا تمیز اپنے حصہ و وراثت کے جہاں جگہ دیکھی آباد ہو گئے۔ اور اکثر موضع موہری میں جلال خان کے ساتھ رہے ۱۸۱۸ء میں سردار مکھن سنگھ تابع و زیر حکم مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہو گیا۔ ۱۸۲۰ء میں شاہ محمد میں سردار مکھن سنگھ کے ساتھ لڑائی ہوئی جس میں محمد خان ترین سرگروہ تھا۔ اس لڑائی میں مکھن سنگھ مارا گیا اس کی گڑھی گرائی گئی۔ اور قوم دلازاک کا دخل ہونے والا تھا کہ دیوان رام دیال وغیرہ مہاراجہ

رنجیت سنگھ کی طرف سے آ گئے اور ملک زیر حکم مہاراجہ صاحب ہو گیا۔ جلال خان وغیرہ دلازاکاں سے جو موضع موہری بھیڑی میں تھے زیادہ تعرض نہ کیا گیا۔ مگر ملک میں یورش اور فساد رہا۔ ۱۸۲۰ء میں دیوان رام دیال کے ساتھ لڑائی ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ۱۸۲۱ء میں امر سنگھ کے ساتھ علاقہ ناڑہ (کرڑال) میں لڑائی ہوئی وہ سمندر کٹھہ میں مارا گیا۔ اس سنہ میں مانگل میں لڑائی ہوئی۔ اور سردار ہری سنگھ نے فتح پائی ۱۸۲۲ء میں محمد خان کو بیس ہزار کی جاگیر دی۔ پھر بھی ان اقوام نے امن نہ ہونے دیا۔ پھر موضع سری میں لڑائی ہوئی اور اسی سنہ میں قلعہ ہری پور بنایا گیا اور ۱۸۲۳ء میں جب سردار ہری سنگھ لاہور چلا گیا تو پھر سب اقوام نے ملک میں یورش کی۔ سردار ہری سنگھ ۱۸۲۴ء میں واپس آیا۔ اور اس کو ثابت ہوا کہ بغیر نابود کرنے سرگروہان قوم (دلازاک و ترین وغیرہ) ملک کا انتظام نہیں ہوتا۔ اور یہ لوگ باوجود رعایت کے شرارت و فساد سے باز نہیں آتے۔ اس لئے پوستان خان ترین اور جلال خان سرگروہ قوم وغیرہ چند کسان کو توپ سے اُڑا دیا۔ اور ان کے گھر کے لوگ سب قید کر لئے۔ سب فتنہ ملک کا بیٹھ گیا اور انتظام سلطنت قائم ہو گیا۔ وراثت کی صورت بالکل شکست ہو گئی۔ اور یہ سب حقوق سردار سکھاں کے ہاتھ آ گئے جس کو چاہا بلا امتیاز مالک و مزارع کے اپنے کارداران کا مددگار بنایا جس نے چاہا اجارہ دیہات کا کیا۔ عہد سکھاں میں بڈھا خان قوم دلازاک سے اور بعض کھتری سرائے صالح اور حاجی خان غیر وارث اور اسی طرح اور چند در چند ملک چند سال کبھی ایک سال کبھی دو سال اجارہ کرتے رہے اور باقی سب بھاگ گئے اور قید ہوتے رہے۔ کسی نے کسی وقت اپنے حق جدید یا قدیم سے کوئی چیز عہد سکھاں میں نہیں کھائی۔ سرکار سکھاں اُن کے پُرانے حقوق کے دشمن تھے۔ کیونکہ جب تک ان کے ساتھ پرانے حقوق کے لحاظ سے رعایت کرتے رہے تب تک ان کے ساتھ و شرارت سے تکلیف پاتے رہے جب سے اُن کے حقوق نابود کر دئے اور سرگروہوں کو توپ سے اُڑا دیا۔ ملک میں امن ہو گیا۔ سلطنت میں یورش فساد نہ رہا۔ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۴۴ء تک اسی طرح حال رہا۔ ۱۸۴۵ء میں پھر اس ملک کے لوگوں نے تمام ملک میں یورش کی۔ تھانہ جات جا بجا مار لئے تھانہ دار قتل کر ڈالے۔ اور اس قوم کے لوگ بھی جو کچھ باقی جا بجا مثل مزارعان موجود تھے۔ اُنہوں نے بھی سر اٹھایا۔ اور پریشان حالت میں اپنے دیہات سے کچھ وصول بھی کیا۔ ہنوز زیادہ وصول کرنے نہیں پائے تھے کہ پھر مولراج و سکھاں کا قبضہ ہو گیا پھر ۱۸۴۶ء میں یہ ملک مہاراجہ گلاب سنگھ کو سرکار لاہور سے شامل کشمیر کر دیا گیا۔ اور ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء کو دیوان ہری چند مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے اس ملک میں آیا۔ اس کے ساتھ پھر ملک والوں نے ۱۸۴۶ء میں لڑائی کی۔ ۱۸۴۷ء میں یہ ملک متعلق سرکار لاہور ہوا۔ اور مشخصہ بندوبست سرسری

اس کا میجر ایبٹ صاحب بہادر نے کیا۔ اس وقت محمد بخش خان دلازاک جو اخیر عہد سکھاں میں آ کر موضع لبان باندھی و بھیڑی میں آباد ہوا تھا۔ مشخصہ داران دیہات کا ہوا اور بڈھا خان مشخصہ دار سرائے صالح کا تھا۔ وہ نمبردار سرائے صالح ہوا۔

جلال خان کا پوتا احمد خان بھی اس وقت باہر سے آ گیا تھا۔ وہ نصف بھیڑی کا نمبردار ہمراہ عبداللہ خان گوجر نمبردار عہد سکھاں کے کیا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں پھر یورش چتر سنگھ کی ہوئی۔ بڈھا خان و احمد خان باغیوں میں شامل ہوئے اور محمد بخش خان ایبٹ صاحب بہادر کے ہمراہ رہا۔ ابتدائے ۱۸۴۹ء میں یورش و شر رفع ہوا اور بڈھا خان قید کر لیا گیا اور وہ قید ہی میں مر گیا۔ اسباب ضبط ہوا اور سرائے صالح میں دخل محمد بخش خان کو دلایا گیا۔ اب تک وہ قابض ہے۔

اس قوم کی آبادی مندرجہ ذیل گاؤں میں ہے۔

اخون باندی۔ موہڑی۔ کلانواں۔ بھیڑی لبان باندھی۔ گنیا۔ سرائے صالح۔ مونن۔ چک شاہ محمد۔ مراد آباد۔ گہر خان۔ شاہ محمد۔ تربیلہ۔ تیر چھور۔ بھوٹڑی۔ میلم۔ بھیرہ۔ بکہ۔

کابل کی وادی کا نچلا حصہ، پشاور کا سب میدان بمعہ باجوڑ، چھچھ، ہزارہ اور جہلم تک کا علاقہ دلازاک قوم کا تھا۔ جہاں سے اب وہ بالکل معدوم ہو چکے ہیں۔

کامران پسر بابر بادشاہ کے دوران حکومت میں غوریا خیل قبائل (خلیل و مہمند) جو پندرھویں صدی میں غزنی کے مغرب میں آباد تھے اور بابر کے وقت میں (۱۵۱۹ء) مہمند کم از کم غزنی کے جنوب میں تھے۔ انہوں نے دلازاکوں کو کامران کی امداد سے دریائے سندھ سے اس پار دھکیل دیا۔

قوم دلازاک کی آمد کا حال

کلگیات قوم دلازاک کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہے جو انہوں نے بندوبست ۱۸۷۰ء میں خود بیان کیا۔

ہماری[1] قوم سلطان محمود کے وقت یا اس کے بعد قندہار سے بہ سبب نزاع و فساد قوم دُرّانی، علاقہ پشاور میں آئے۔ اس وقت پشاور کے علاقہ میں قبضہ قوم شلمانی یا سلیمانی کا تھا۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی ہماری قوم غالب آ گئی اور قوم سلیمانی کو بے دخل کر کے خود زور سے قابض ہو گئے (اور چند پشت وہاں رہے) اور مدت تک اس علاقہ پر قابض رہے اور ہماری قوم کی کثرت ہو گئی۔ اور تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد قوم اُتمان زئی قندھار سے آئے۔ ان کے ساتھ لڑائی ہوئی اور ہم کو شکست ہو گئی۔ ہم وہاں سے نکل کر تمام علاقہ یوسف زئی جس کو ملک سمّاں (سمہ بمعنی میدان۔ علاقہ مردان، صوابی۔ ش ب) بھی کہتے ہیں۔ قابض ہوئے۔ پھر دوسری لڑائی اُتمان زئی نے ہمارے ساتھ علاقہ یوسف زئی میں کی۔ دوبارہ ہم کو شکست ہوئی اور مغلوب ہو کر اس پار دریائے سندھ علاقہ ہزارہ میں آ گئے۔ جو اب بنام پچھی۔ تربیلی۔ دلزاکی۔ تور کی مشہور ہے۔ یہاں پہلے آبادی قوم گوجر کی تھی۔ اور اقوام متفرق بھی آباد تھیں۔ ہماری قوم بہ سبب کثرت مردماں کے تمام علاقہ ہزارہ میں پکھلی تک پھیل گئے۔ اور قوم گوجر سے اراضی لینی شروع کر دی۔ اور گوجر لوگ تنگ ہوئے۔ قوم گوجر مالگذار بادشاہی تھے۔ انہوں نے یہ خدمت شاہ دہلی سے ہماری قوم کے خلاف استغاثہ کیا۔ وہاں سے بادشاہی فوج قوم دلزاک کے اخراج کے لئے مقرر ہوئی اور جس قدر ہماری قوم کے آدمی اس علاقہ ہزارہ و پکھلی میں تھے سب کو معہ عیال و اطفال، اس علاقہ سے نکال کر ہندوستان کو لے گئے۔ اور ملک دکھن میں آباد کیا۔ اور اجازت نوکری کرنے کی بھی دی۔ اس وقت میں صالح محمد خان دلازاک جس نے آبادی خاص موضع سرائے صالح کی کی ہے وہ بھی ہمراہ اپنی قوم کے نکالا گیا تھا اور دربار شاہی میں کسی خدمت پر نوکر ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ آدمی ہماری قوم کے جو دور دراز علاقوں میں تھے یا بیمار تھے یا کسی اور سبب سے نہ جا سکے تو وہ اس علاقہ میں رہ گئے۔ انہی ایام اخراج قوم دلازاک میں قوم ترین بھی آ گئے تھے۔ اور ترک مانکرائے والے پہلے سے موجود تھے۔ قوم ترین نے مسمی موسیٰ گوجر چوہدری کا بل والہ کو بہ صلاح قوم ترک و بقیہ قوم دلزاک کے قتل کر ڈالا۔ اس خون کے استغاثہ کے لئے مسمی لالہ چوہدری ساکن موضع دیدڑ قوم گوجر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس جگہ دربار بادشاہی میں مسمی صالح محمد خان دلزاک ہمارا مورث اعلیٰ جو اپنی قوم دلزاک کے ساتھ یہاں سے نکالا گیا تھا، حاضر تھا۔ اس نے لالہ گوجر چوہدری وغیرہ ہمراہیاں اس کے، کو لباس و گفتگو سے شناخت کر لیا کہ یہ لوگ ہزارہ کے ہیں۔ اور حال دریافت کر کے اس کو فہمائش کی کہ واسطے ہمراہ لے جانے اپنے کے بادشاہ سے میری درخواست کرنا۔ میں تمہارا خون بہا بھی لے دوں گا۔ اور انتظام بھی بخوبی کر دوں گا۔ وہ اس کے حال سے ناواقف تھے۔ انہوں نے وقت فریاد رسی کے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ صالح محمد جو نوکر حضور کا ہے واسطے حق رسانی ہمارے کے ہمارے ہمراہ دیا جائے۔ یہ عرض چوہدری لالہ کی قبول ہوئی۔ اور صالح محمد ہندوستان سے ہمراہ لالہ کے اس جگہ آیا۔ اور جب یہاں پہنچ گیا تو قوم گوجر کو اطلاع ہو گئی کہ یہ تو اسی قوم دلزاک کا ہے جو ہمارے استغاثہ پر ہی اس جگہ سے

[1] یہ حال اس قوم نے ۱۸۶۲ء میں لکھوایا اور اس کی تصدیق اس وقت میاں صاحب ملکیار والا نے جو بڑے تاریخ دان و واقف حالات اس ضلع کے ہیں نے کی۔

نکالے گئے تھے۔ بلکہ یہ خان اُس قوم کا ہے چونکہ خود درخواست کر کے لا چکے تھے کچھ ذکر سکے اور صالح محمد نے ہمراہ ترین و ترک صلح صفائی کرا کے چار حصہ کل دیہات اس علاقہ ہزارہ کے کرا دئے۔ قوم دلزاک، قوم گوجر، قوم ترک، قوم ترین اور اس وقت ہزارہ کے چوراسی مواضعات تھے۔ اکیس اکیس ہر ایک کے یک حصہ میں آ گئے۔ اور قوم گوجر کا راضی نامہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔"

(یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ کلیات قوم ترین میں صرف ترینوں کو قاتل بیان کیا گیا لیکن مندرجہ بالا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ ترین، ترک، دلزاک وغیرہ۔ یعنی جو اقوام باہر سے اس ملک میں آئیں اور گوجروں کے ملک پر قبضہ کرتی چلی گئیں انہوں نے اتفاق سے اس قوم کے سرکردہ کو قتل کر دیا تا کہ راستہ صاف ہو جائے۔ خ ش ب)

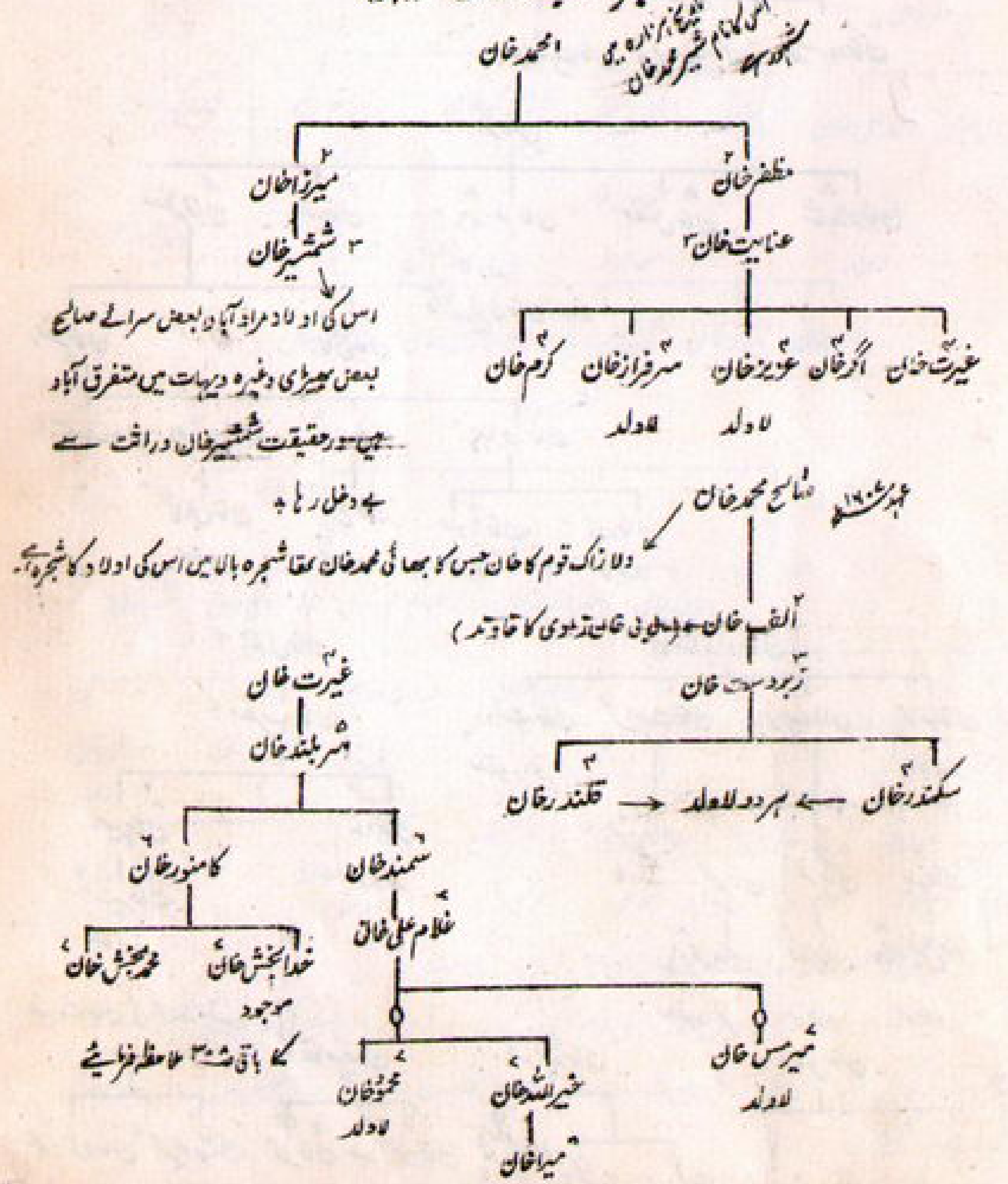
صالح محمد خان کے ہمراہ اس کا بھائی محمد خان بھی ہندوستان سے آیا تھا اس کو موضع تیر میں آباد کیا۔ یہ موضع بھی چوراسی ہزارہ سے ہے۔ صالح محمد خان نے خود موضع سرائے صالح کی آبادی کی۔ وراثت و خانی کل اکیس مواضعات پر صالح محمد خان کی رہی۔ باقی جس قدر دلزاک وقت اخراج اصل قوم کے اس ضلع میں رہ گئے تھے یا چند اشخاص ہمراہ صالح محمد خان کے آئے تھے وہ سب بطور نوکراں و مزارعان رہے۔ موضع تیر زیر قبضہ و وراثت محمد خان شمار ہوتا رہا۔ دوسرے کسی گاؤں سے محمد خان و اولاد محمد خان کا واسطہ نہ رہا۔ صالح محمد خان کا پسر الف خان ہوا۔ اس کی شادی مسماۃ خان زادی دختر بھاگو خان (بھاگو خان یوسف زیوں علاقہ مردان کا خان تھا اور اس کا عہد ۱۶۶۶-۷۶ء رہا ہے) جد فتح خان پنجتار والا (یہ وہی پنجتار ضلع مردان ہے جہاں سید احمد شہیدؒ مقیم رہے اور علاقہ یوسف زئی پر چند سے حکومت کی) اتمان زئی سے ہوئی۔ الف خان کا اس بیوی سے ایک پسر زبردست خان ہوا۔ زبردست خان کے دو بیٹے سکندر خان و قلندر خان ہوئے۔ لیکن زبردست خان و ہر دو پسر اس کے مسماۃ خان زادی کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے۔ اور خان زادی بیوہ الف خان لاولد رہی۔ مگر اپنی وراثت شوہر پر قابض رہی اور حکومت کرتی رہی۔ مگر اس کو احتیاج ہوشیار آدمیوں کی ہوئی۔ صالح محمد خان کے بھائی محمد خان کا پوتا مسمی عنایت خان مسماۃ خان زادی کا داماد تھا۔ وہ موضع تیر سے اٹھ کر بی بی خان زادی اپنی ساس کے پاس آ رہا۔ اس طرح سے اولاد محمد خان، بی بی خان زادی کے گھر میں دخیل ہو گئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مسمی بہرام خان[1] جو عنایت خان کا پوتا تھا اس نے بی بی خان زادی کو حربہ کتار سے بحالت بے خبری قتل کر دیا۔ اور خود

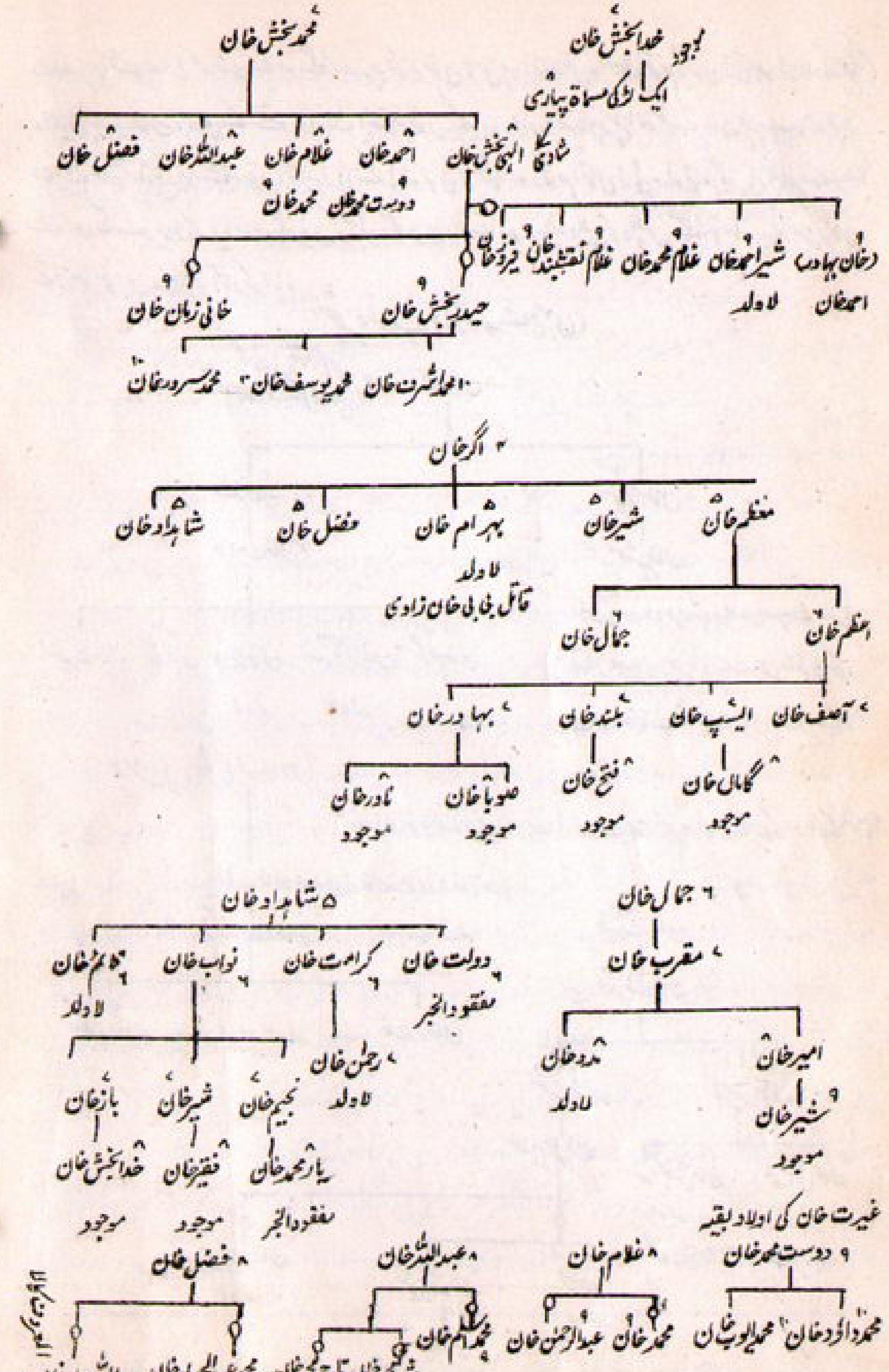
---

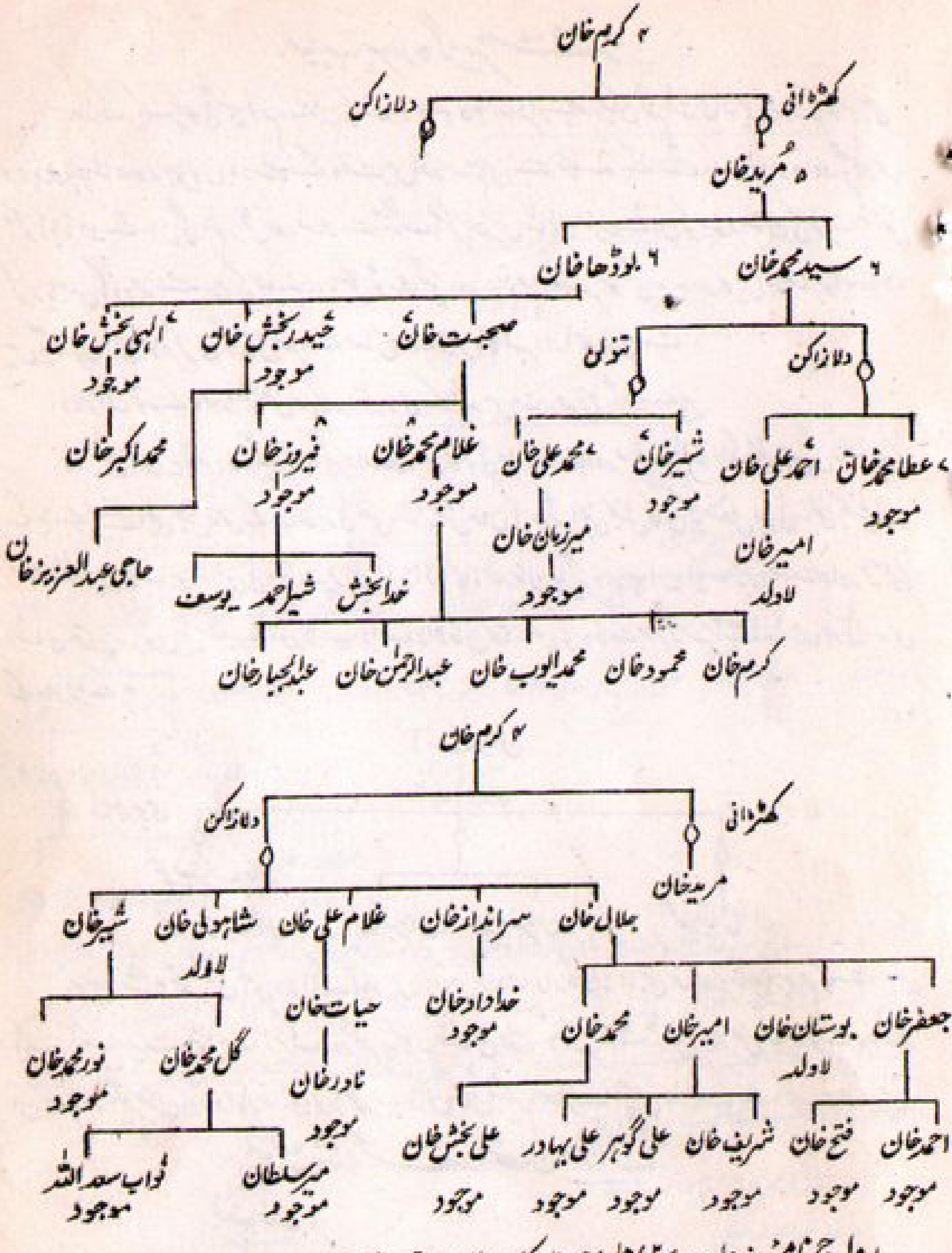
[1] بہرام خان کیفیات میں دوسری جگہ تحریر ہے کہ وہ اگر خان کا بیٹا تھا۔ اگر خان ساتویں پشت میں صالح محمد خان سے ملتا ہے

وارث وراثت صالح محمد خان کے ہو گئے۔ اور چونکہ یہ خون ناحق ہوا تھا اس واسطے قوم اُتمان زئی جو اولاد و ہم قوم والدین بی بی خان زادی کے تھے۔ واسطے انتقام خون کے ہماری وراثت پر چڑھ آئے۔ اور ہم سب اولاد عنایت خان مفرور ہو گئے۔ قوم اُتمان زئی کے ہاتھ کوئی نہ لگا۔ اور قوم اتمان زئی نے تمام گھر بار ہمارے لوٹ لئے اور ملک ویران کر دیا۔ اور گھروں کو آگ لگا دی۔ جب وہ اپنے وطن کو واپس گئے تو ہمارے بزرگان نے از سر نو اس علاقہ کو آباد کرایا۔

شجرہ نسب (از صورت دیہی)







رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء میں ان کا یہ بیان درج ہے:-

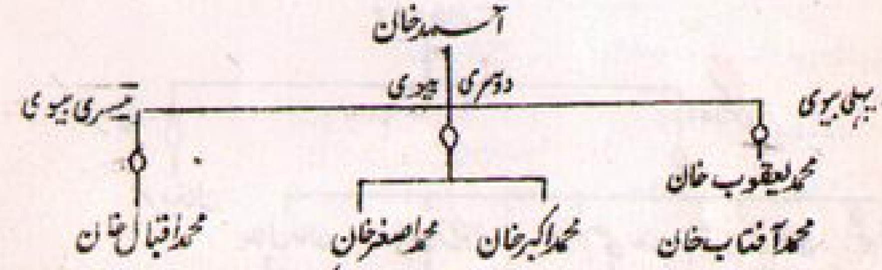
"ہماری قوم میں کوئی شاخ نہیں اور بہ مثل قوم ترک کے ہماری قوم بھی اسی ضلع کی قدیمی و پرانی قوم ہے۔ اور ہم نے ترکوں پر غلبہ پاکر ضلع ہذا میں بہت سے دیہات میں ملکیت حاصل کی اور تحصیل ہری پور میں چند دیہات کے مالک ہو گئے۔"

بموجب ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء

دلازاک ایک چھوٹی سی قوم ہے جن کی تعداد ۲۵۳۴ - افراد ہے۔ لیکن گذشتہ زمانہ میں یہ بڑی قوم تھی۔ وہ بابر بادشاہ اور ہمایوں بادشاہ کے وقت میں افغانستان سے نکالے گئے تھے۔ اور ہزارہ اور چھچھ میں آکر آباد ہوگئے۔ ان کی شورش اور فساد سے تنگ آکر بعد میں شاہانِ مغلیہ نے ان کو ہندوستان کی طرف منتقل کر دیا جس کی وجہ سے ان کی جمعیت بالکل ٹوٹ گئی اور یہ قوم منتشر ہوگئی۔ ہزارہ میں یہ چند مواضعات میں آباد ہیں۔ ان کا مرکزی گاؤں سرائے صالح ہے جس کا نمبردار احمد خان ہے۔

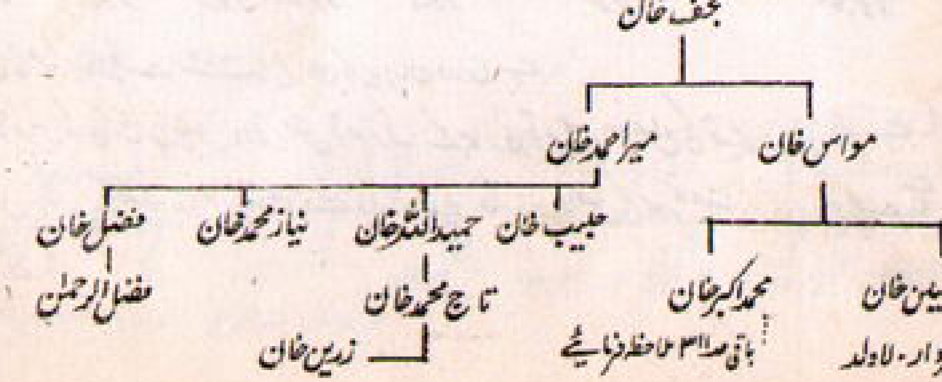
دلازاک قوم کے نامور اشخاص سرکار انگریزی کے عہد میں مندرجہ ذیل گزرے ہیں۔

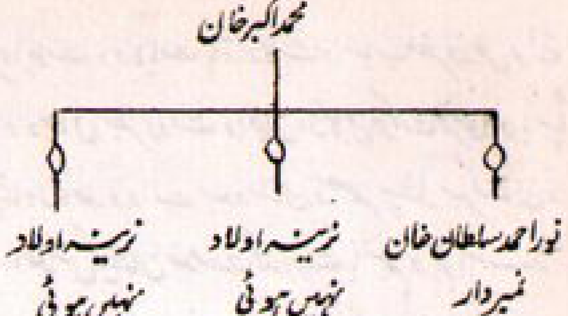
خدابخش خان یہ قوم دلازاک کا جاگیردار تھا اس کا کوئی لڑکا نہ تھا اور صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی اس کے بڑے بھتیجے الٰہی بخش خان کے ساتھ ہوئی تھی۔ خدابخش خان کی جاگیر الٰہی بخش خان کو منتقل ہوئی۔ الٰہی بخش خان ۱۹۰۵ء میں فوت ہوا۔ اس کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا احمد خان جاگیردار ہوا۔ یہ ایک زبردست اور خراج انسان تھا۔ پٹھانوں میں مضبوط اور رعب داب والا خان تھا۔ اس کی وفات ۸ر دسمبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ اس کے چار لڑکے ہیں۔

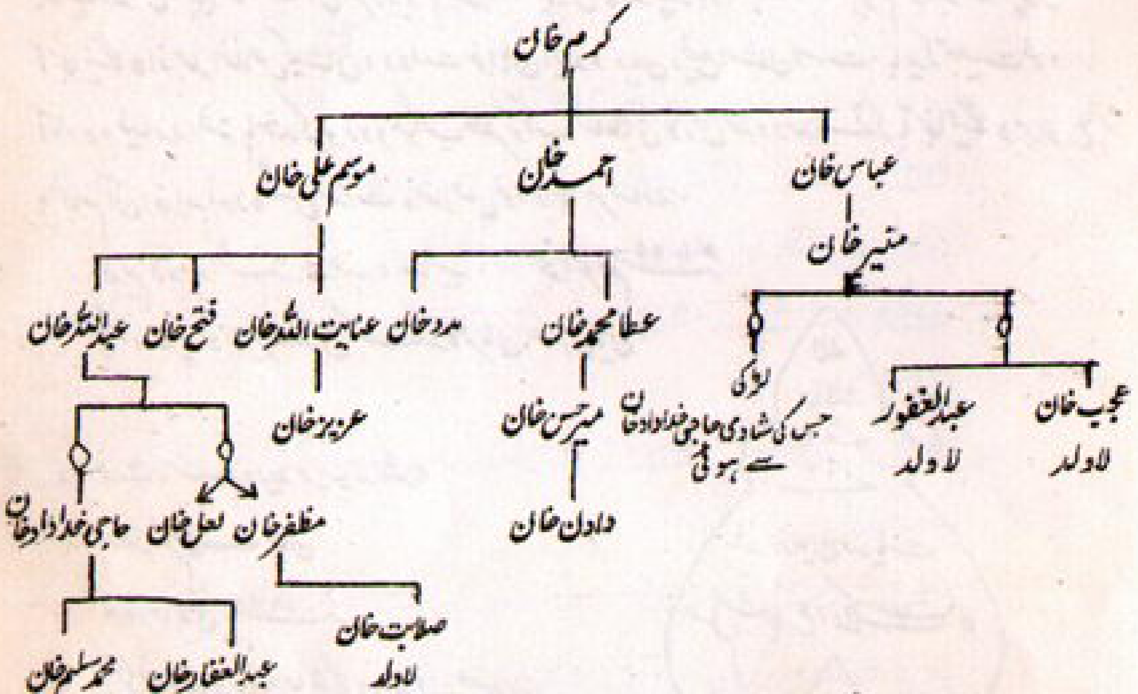


موضع شاہ محمد میں بھی دلازاک آباد ہیں ان میں عزت دار گھرانہ حاجی خداداد خان مرحوم کا ہے۔ وہ ایک نیک سیرت، نہایت زیرک اور تجربہ کار انسان تھا۔ دسمبر ۱۹۶۶ء میں بمرض نمونیہ فوت ہوئے۔ ان کا فرزند سلیم خان اور داماد حاجی نور احمد سلطان خان سلیم الفطرت، اچھی عادات کے مالک نوجوان ہیں۔

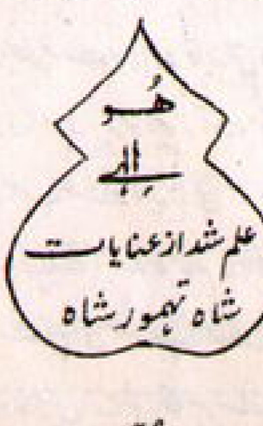
موضع شاہ محمد پٹھان دلزاک







سرائے صالح میں دلازاک خاندان سے محمد داؤد خان بن دوست محمد خان اولاد غیرت خان سے ایک معروف ہستی ہیں وہ ۱۹۶۰ء کے اوائل میں جوڈیشل کمشنر سرحد کے عہدہ سے پنشن پر آئے۔ قابل، دیانت دار، کارکن افسر ہونے کی وجہ سے نیک نام رہے۔ زراعت کی ترقی کا شوق رکھتے ہیں۔ باغات بھی کافی لگائے ہیں۔ اور ان کی غور و پرداخت کے علم کے ماہر بھی ہیں۔



سند و بریدہ و پیوند شدہ

مدخلہ شریف خان

۲۶ر جولائی ۱۸۶۲ء

آنکہ عالیجاہ رفیع جائیگاہ اخلاص و عقیدت دستگاہ

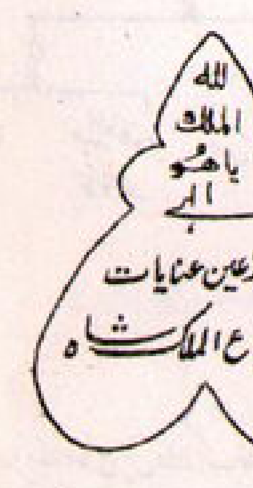
کرم خان دلہ زاک بالطاف

روز افزونِ شاہانہ سرافراز گشتہ بداند کہ چوں در نیولا قشو نہائے درانی و سائر افغانات و ہزارہ جات

وسیستان و اویماقات وخراساں وترکستان وغیرہ ایلات و ولایات باتدارکات واسباب ظفر ورطل لوائے فلک فرسا جمع آمدہ بودند۔ رایات فیروزی آیات جاہ وجلال بفر دولت واقبال از کابل حرکت فرمودہ باسپاہ بیحد و توپخانہ وآتشخانہ بیحد منزل بمنزل عازم پشاور وحدودات ہندوستان ومصمم پیشلہ سرکشان و نظام وبندوبست مہام کشمیر وغیرہ۔ آں سمت ہا۔ اخلاص کیشان خدمت گذارے باشیم و بخواستہ جناب اقدس الہٰی ساحت آں مرزوبوم جلد ..... یہاں کاغذ پھٹا ہوا ہے ..... ہجوم خواہد شد۔ چوں آنجاہیگاہ از جملہ اخلاص کیشان و دولت خواہان ایندو دمان رفیع الشان است۔ باید کہ جمعیت خود را آمادہ وطیار داشتہ باشد کہ بورود موکب ظفر کوکب سلطانی دراں حدود خدماتے کہ بآنجاہیگاہ مرجوع شود بانجام آں اقدام نمودہ حُسن خدمت واخلاص خود راظاہر سازد۔

قدیم لازم دانستہ درعہدہ سیاسیہ۔ محرم الحرام ۱۱۹۹ھ

پُشت پر مواہیر تصدیق کنندہ فرمان شاہی ہیں۔



نوٹ۔ سند درید و پیوند شدہ

مخلر شریف خان

۲۶ر جولائی ۱۸۶۳ء

آنکہ عالیجاہ رفیع جایگاہ اخلاص وعقیدت دستگاہ جلال خان دلہ زاک بالطاف

روز افزوں شاہانہ سرافراز گشتہ بداند کہ درینولا ازششماہیہ ہذا السنہ مبارکہ عالیجاہ رفیعجایگاہ سلامہ اعظام واخلاص وعقیدت فرجام مقرب الخاقان مرزا محمد شریف خان منشی سرکار خاصہ شریفہ رابحکومت ہزارہ قارلق وغیرہ ہا سرافراز وعالیجا نگاہ العظام مرزا ابوالقاسم خان را نائب اومقرر وما مور فرمودیم کہ آمدہ متوجہ جمع آوری مالیات ونظام حکومت آں قیام نماید

عالیجاہ نائب مشارُ الیہ ای وتمام مردم آں محال نزد او رجوع شدہ مالیات دیوانی سنوات گذشتہ وہذا السنہ وسالہائے آئندہ تمام وحال خود را باو دادہ از سخن حسابے او بیروں نروند۔ وجہہ او قات در تقدیم خدمات دیوانی حسب الصلاح عالیجاہ نائب مشارٌ الیہ بانجام رسانیدہ حُسن خدمتگذاری و دولتخواہی خود را بیش از بیش ظاہر سازد۔ کہ بہرہ مند وسرافراز خواہد شُد و ہرگاہ در خدمات سرکار و در رسانیدن مالیات خود نماید ولعرض اشرف رسد۔ لازمہ بازخواست بعمل خواہد آمد باید ہمچو

مقرر ورقدمات پادشاہی ساعی وسرگرم بودہ تحمل نماید کہ عالیجاہ نائب چگونگی خدمات رالعرض اشرف رساند درہر باب حسب بعمل آوردہ لازم دانستہ درعہدہ سیاسیہ

تحریر بتاریخ شعبان المعظم ۱۲۱۹ھ

پشت پر مواہیر

ملاحظہ شد
محمد الرحیم
امیدوار شفاعت

مُہر

اسناد قوم دلازاک

۱۔ ۱۱۷۷ھ سمت ۱۸۲۰ ۱۷۶۳ء خان جہاں وزیر احمد شاہ دُرانی۔
بنام کرم خان، معظم خان، شیرخان، ابراہیم خان و شاہداد خان

۲۔ ۱۱۷۹ھ سمت ۱۸۲۲ ۱۷۶۵ء نجیب[1] اللہ خان ترین۔ رسید از جانب نجیب اللہ خان ترین حاکم ازجانب دُرانی۔

۳۔ ۱۱۷۹ھ سمت ۱۸۲۲ ۱۷۶۵ء بشرح صدر رسید جات حصہ معظم خان وشیرخان و براہیم خان وشاہداد خان

۴۔ ۱۱۸۰ھ سمت ۱۸۲۳ ۱۷۶۶ء ایضاً۔ رسید از جانب نجیب اللہ خان حاکم دُرانی ....
بہ دیہات زورگیر وگروی تحت تربیتی، وکاکڑی وتنولی ؎

ہزارہ میں سب کاغذات سرکاری کی زبان فارسی رہی۔ حتیٰ کہ سکھوں کے عہد میں بھی۔ انگریزوں نے اردو میں کارروائی شروع کی۔

سادات

سادات۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد اور ان کے انوارِ رحمت کے حامل ہیں۔ مسلمانوں کے لئے علم وفضیلت کے چراغ ہدایت اور لشکرِ اسلام کے امیرِ لشکر ہیں۔ لہٰذا جہاں جہاں مسلمانوں کی جماعتیں یا لشکر گئے ہیں سادات کا ایک خاندان ضرور ان کے ہمراہ بطور ہادی اور سربراہ لشکر ہوکر گئے۔

---

[1] نجیب اللہ خان ترین ساکن درویش ۱۷۶۳ء میں حاکم ہزارہ ہوا اور تا وفات (۱۷۹۹ء) حاکم رہا۔

ہزارہ میں سید جلال بابا (جو سید علیؒ - پیر بابا کی اولاد سے ہیں) صواتی قوم کے سر لشکر ہو کر اس ملک میں آئے۔ ان کی اولاد۔ سادات، تمبڑی، کاغان اور صوابی میرا کے سادات ہیں۔ سادات گیلانی حوالہ د سلطان پور بطور ہادی و مرشد اس ضلع میں وارد ہوئے۔

سادات کاغان۔وادی کاغان

محلِ وقوع - حدود اربعہ اور رقبہ - یہ وادی پُر فضا جگہ اور رنگا رنگ کے پھول پودہ ہائے ادویات کے دل خوش کن علاقہ ہے۔ یہ ہزارہ کے انتہائی شمال میں ہے۔ مشرق میں کشمیر اور مغرب میں قبائلی علاقہ کے درمیان ایک پچر کی مانند واقع ہے۔ اس کی لمبائی براہِ راست سیدھے میں جنوب مغرب سے شمال مشرق تک ۶۰ میل اور بذریعہ سڑک بابوسر سے بالاکوٹ تک ۱۰۲ میل ہے اس کی اوسط چوڑائی ۱۵ میل ہے۔ اس وادی کے رقبہ کے آٹھویں حصہ میں تقریباً ایک تہائی زرعی زمین اور باقی جنگلات ہیں۔ بقیہ رقبہ بڑے بڑے پہاڑوں اور سبزہ زاروں پر مشتمل ہے۔ وادی کے بیچوں بیچ دریائے کنہار بہتا ہے۔ بالائی خطہ میں تین مشہور اور خوبصورت جھیلیں ہیں۔ ۱- لولوسر - ۲- دودی پت سر - ۳- سیف الملوک سر۔

سر یعنی جھیل استعمال ہوتا ہے۔ ان میں لولوسر سب سے بڑی جھیل ہے اور بابوسر سے دس میل مغرب میں ہے۔ اسی سے دریائے کنہار نکلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کی اندھی لڑکی اس پانی سے نہائی اور اس کی بینائی ہو گئی تھی۔ ۲- دودی پت سر پوربی ناڑ کے کٹھ کے سر پر اور بیسل سے تقریباً ۱۲ میل مشرق کی جانب واقع ہے۔ اسی جگہ پر ۱۸۵۷ء میں ۵۵ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ ۳- سیف الملوک سر یہ ناران سے تقریباً چھ میل مشرق کی طرف ہے اور اس سے ناران کا کٹھ نکلتا ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً گیارہ ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے متعلق سیف الملوک شاہزادہ دہلی کے سفر اور اس جگہ کی پری سے معاشقہ کی داستان زبانِ زد عام ہے کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ سال تک اس جگہ پر چلہ میں رہا۔ اور آخر کار اس نے بدری جمال تمام پریوں کی ملکہ کو یہاں دیکھا جو اپنی تین سو ساٹھ پریوں کے ساتھ دریا میں نہانے کے لئے آئی تھی۔ اُن کو شاہزادہ کی موجودگی کا علم نہ تھا سب نے کپڑے اتار کر کنارہ دریا پر رکھے اور نہانے لگیں۔ شاہزادہ ملکہ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا۔ اس واقعہ پر سب پریاں اپنے کپڑے پہن کر غائب ہو گئیں۔ لیکن ان کی ملکہ ننگی ہی دریا میں بیٹھی رہی۔ شاہزادہ نے کپڑے دینے سے انکار کر دیا جب تک وہ اس کی بیوی بننے کا عہد نہ کرے۔ ملکہ نے وعدہ کر لیا۔ لیکن اس پری کا ایک اور عاشق زبردست دیو تھا جو کہ نزدیک ہی پہاڑ میں رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ شاہزادہ ملکہ پری کو

ساتھ لئے جا رہا ہے تو وہ غضبناک ہوا۔ اور جا کر سیف الملوک سر کا ایک کنارا توڑ کر پانی کا طوفان بہا دیا۔ تاکہ وہ دونوں غرق ہو جائیں۔ لیکن وہ دونوں ایک پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور جب تک طوفان نہ تھما وہیں بیٹھے رہے۔ اس کے بعد شاہزادہ اپنی ملکہ کو دہلی ساتھ لے گیا۔ اور وہ دونوں مدت تک وہاں عیش کی زندگی گزارتے رہے۔

باشندگان

سب باشندے تقریباً سواتی، سید اور گوجر ہیں۔ ایک گاؤں سنگھر۔ مدہ خیل پٹھانوں کا ہے سید اور سواتی مالکان اور گوجر سب مزارعہ ہیں۔

تاریخ درّہ کاغان

تاریخ - کوہستانی علاقوں کی طرح کاغان بھی مدت تک غیر آباد، دشوار گزار اور نامعلوم رہا۔ اس کی پرانی تاریخ کا سراغ لگانا مشکل ہے لہذا اس کی پرانی تاریخ نامکمل ہی ہے۔

اصلی باشندے - چترال کے سرخ کافروں کی طرح اس ملک کے اصلی باشندے بھی کافر تھے۔ جن کا صحیح حال معلوم نہیں۔ اور یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اصلی وطن سے بوجہ آریوں۔ ایرانیوں، یونانیوں اور ہنوں کے حملوں سے ادھر آئے ہوں گے۔

وجہ تسمیہ - کاغان کا نام کگی یا کاگان ایک کافر کی بیوی کے نام کی وجہ سے ہے جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں رہتے تھے۔ اسی طرح اُس کی دوسری بیوی راجول کے نام پر راجول آباد ہے۔

ہندو عہد - میں کاغان حکومت اُلاشی یا اُرشہ (مطابق ہیون سانگ) اور ورساریجیو VARSAREGIO مطابق (PTOLEMI) کے ملک کا ایک حصہ تھا اور کشمیر کے شمال مغرب میں تھا۔ ساتویں صدی کے اس چینی سیاح کے بعد کئی صدیوں تک اُرشہ کشمیر کے ماتحت رہا۔ کلہانہ نے اپنی تصنیف راج ترنگنی میں اُرشہ (یعنی ہزارہ) کے حکمرانوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ مثلاً سمکرا، ورمان، کلاسہ، اُتسالہ، جے سمہا اور دیوتیہ۔ پرانے دیہات اور قلعوں کے آثار اور ان سے متعلق حکایتیں اس علاقہ میں ہندو راج کی مزید شہادت پیش کرتی ہیں۔

مسلمانوں کا عہد - سب سے پہلے امیر تیمور کا ذکر ہزارہ کے متعلق پڑھنے میں آتا ہے جب اس نے ۱۳۹۹ء میں دہلی فتح کرنے کے بعد اپنی فوج سے ایک ہزار سپاہیوں کی ایک رجمنٹ اس ضلع ہزارہ تارگنج میں چھوڑی۔ مغلوں کے زمانہ میں اس ضلع کا نام پکھلی سرکار۔ سلطان پکھل جہانگیری سلطان کے نام پر تھا۔ یہ دونوں نام (ہزارہ اور پکھلی سرکار) مغلوں کے زمانہ کے کاغذات، فرامین اور نشانات میں ملتے ہیں۔ جنوبی ہزارہ

یعنی پکھلی سرکار پنجاب صوبہ سے ملحق تھا اور شمالی ہزارہ بمعہ کاغان کے کشمیر کے ساتھ تھا۔

نور شاہ کا حملہ۔ موجودہ کاغان خاندان سادات کی تاریخ سے وابستہ ہے جو کہ اٹھارھویں صدی سے اس پر قابض ہیں۔ وادیٔ کاغان تاچار کو سیّد نور شاہ (غازی بابا) پسر سیّد جلال بابا ترمذی نے صواتی، کوہستانی اور بیراجی اقوام کی امداد سے فتح کیا۔ فتح کرنے کے بعد سیّد نور شاہ اپنے رفقاء شرف دین نور محمد کوہستانی وغیرہ سمیت اس وادی میں مسکن پذیر ہو گئے۔

عہد دُرّانی۔ اٹھارھویں صدی کے آخری نصف اور اُنیسویں صدی کے شروع میں سب ہزارہ دُرّانی حکومت کے ماتحت رہا۔ کشمیر کے راستہ (جو اس کے وسط سے گزرتا تھا) کی وجہ سے یہ علاقہ خاص اہمیت رکھتا تھا اور سیّدوں کی خاص عزت تھی۔

عہد سکھاں ۱۸۱۸ء میں ہزارہ سکھوں کے ماتحت آ گیا۔ ۱۸۱۹ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر کے شمالی ہزارہ بمعہ کاغان کو بھی اپنی مملکت میں داخل کر لیا۔

سکھوں کی حکومت سے تنگ آ کر سادات کاغان نے ہندوستانی مجاہدین کا ساتھ دیا اور سکھوں سے مقابلے کئے۔ مجاہدین کو شکست ہوئی اور سید احمد شہید بمعہ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔ دونوں کی لاش ٹکڑے کر کے دریا میں ڈال دی گئی تھی نکال کر شملہ میں دفن کیا گیا۔ اس کے بعد سادات کاغان اور ان کے صواتی ہمراہیوں نے سکھوں کی فوج کو جو دیوان ابراہیم کے زیر کمان تھی۔ مقام دیوان بیلہ میں تباہ کر دیا۔ جب کہ وہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے حکم سے چلاسیوں پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔ سکھوں کی پہلی جنگ کے موقعہ پر ہزارہ نے سکھوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ڈھونڈ قوم زیر قیادت پیر پلاسی سب سے پہلے اٹھی۔ اور انہوں نے دونوں فوجوں کو جو دیوان مولراج و لوالیہ نے ان کے خلاف بھیجی تھیں شکست دے دی۔ مجاہدین کوائی (کاغان) میں جمع ہوئے۔ ان کے ساتھ ہزارہ کے لوگ بھی شامل ہو گئے۔ اور سکھوں کے قلعوں واقع شنکیاری بھیر کنڈ گڑھی حبیب اللہ اور باگڑ پر حملہ کر کے سکھ سپاہی قتل کر دئے۔ اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ گکھڑوں نے خانپور کا قلعہ لے لیا۔ اور اپنے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور خوانین ہزارہ نے سیاہ کبر سائیں ستھانہ کو اپنا حاکم چن لیا۔ جنگ کے خاتمہ پر انگریزوں اور سکھوں کے معاہدہ کی دفعہ ۱۲ کی رو سے کشمیر (بمعہ کاغان) راجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا۔ لیکن اہل ہزارہ کی مخالفت اور راجہ گلاب سنگھ کی گھبراہٹ سے ہزارہ کے بدلہ میں جموں کا نزدیک علاقہ دے دیا گیا۔ اس طرح ہزارہ کا خوشنما ضلع گلاب سنگھ کے چنگل سے نکل گیا۔

عہد انگریزی۔ ۱۸۴۹ء کے آخر میں سکھ راج ختم ہو گیا اور انگریزی دور کے عروج کے آثار شروع ہو گئے۔ میجر ایبٹ ہزارہ کے پہلے ڈپٹی کمشنر کے عہد میں گوجروں نے مخالفت کی وجہ سے اس کے کان میں

سادات کے خلاف مجاہدین سے سازباز رکھنے اور علاقہ میں بغاوت پھیلانے کا الزام پھونک دیا۔ جس پر میجر ایبٹ نے ہر معتبر سیّدوں کے لڑکوں کو بطور حاضر باشی اپنے پاس رکھنے کی شرط لگا دی۔ اس پر سید بہت ناراض رہے اور آخر کار جب سیّد زمان شاہ کالا کا بھاگ گیا اور سید زمان شاہ نے کمشنر پشاور کے سامنے پیش ہونے سے انکار کر دیا تو ایک فوج کاغان بھیجی گئی۔ اور ان کو جبراً مطیع کیا گیا۔ ان کو کاغان سے نکال دیا گیا۔ ۱۸۵۲ء میں ان کو واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ہزارہ میں امن رہا۔ اور کاغان کے سیّدوں نے انگریزوں کی امداد کی۔ اور ۱۸۵۸ء ملکی فوج کو "دُودی بک" سر زمین گرفتار کرنے میں مدد دی۔

مالی بندوبست۔ پہلے بندوبست میں کل آمدنی ۱-۱۳-۹۰۶۳ تشخیص ہوئی جس میں سے حکومت کا مالیہ ۳۵۳۰۰۰ روپیہ مقرر ہوا۔ اس میں سے ۱۸۰۰ حکومت کو اور ۱۷۳۰ بصورت پنشن مختلف اشخاص کے نام منظور ہوا۔ اس کے بعد کرنل سر ہربرٹ ایڈورڈ کمشنر نے سیّدوں کو مزید ۱۰۰۰ روپیہ دے دیئے اور لکھا کہ اگرچہ ہم نے ان کی طاقت توڑ دی ہے تاہم ان کے علاقہ میں پیر ہونے اور ملحقہ قبائلی علاقہ پر اثر ہونے کی وجہ سے وہ سیاسی سرگرمی کے اہل ہیں۔ بہتر ہے کہ ان کو [illegible] اور طمانیت میں رکھا جائے۔ ۱۸۵۷ء میں اس نے ۸۰۰ روپیہ کا اور اضافہ کر دیا۔ اور اس طرح سے حکومت کی کل آمدنی سیّدوں کو دے دی سیّد میر گل شاہ کی دوامی جاگیر اور پنشن بحال رکھی گئی بشرطہ وفاداری۔ فوجی خدمت اور ان سرکاری خدمات کے صلہ میں جو وقتاً فوقتاً اُن سے مانگی جائیں۔

۱۹۰۷ء میں جب ہزارہ گزیٹیئر لکھا گیا۔ مالیہ کی کل آمدنی جندرات و زمین سے ۲۱۰۰۰ روپیہ سے زیادہ تھی۔ جو بیک مدت خریف کے فصل کی برداشت پر وصول کی جاتی تھی۔

سیّدوں کی عادات MCGREGOR تحریر کرتا ہے کہ سیّد طبعاً جنگجو نہیں، اور بے پرواہ طبیعت کے مالک ہیں وہ بہت مقروض رہتے ہیں۔ طبعاً کاہل اور سازشی ہیں اور آپس میں عناد رکھتے ہیں۔ بقول واٹسن سیّد کثیر الاولاد ہیں اور بے کار زندگی گزارتے ہیں۔ شریف النفس اور ذہین ہیں اور زمانہ کے رنگ کے ساتھ چلنے کو تیار رہتے ہیں COL. J. B. HUTCHINSON افسر کار خاص اپنی رپورٹ ۱۸۹۳ء میں لکھتے ہیں "سیّد طبعاً و تربیتاً سنگ دل اور استحصال کن ہیں وہ اپنے نوکروں اور مزارعوں سے سخت سلوک کرتے ہیں اور ان سے سب کچھ لے لیتے ہیں۔ باوجود اس کے وہ ایک اعلیٰ اور بہادر قوم ہیں۔ اُن سے سلوک کرنے میں ان کی عزت و خودداری کو ٹھیس نہیں لگانی چاہیے کہ وہ اس کے لئے بہت حساس ہیں اور اس صفت کو جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ ان کا ملحقہ علاقہ چلاس اور کوہستان میں بہت اثر ہے۔

یہ ان کے مورثِ اعلیٰ سیّد جلال بابا کی وجہ سے ہے جس نے اِن اقوام کو مسلمان بنایا تھا۔"

آخر میں اتنا لکھنا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آراء انگریزی حکام کی ہیں علاوہ ان معاملات میں اپنا نظریہ رکھتے تھے۔ جس میں بہت حصہ اُن کی سیاسی مخالفت کی وجہ سے

چند تاریخی واقعات :-

کاغان کی سڑک

۱۔ سب سے پہلے کاغان کی سڑک موسم گرما ۱۸۹۳ء میں بننی شروع ہوئی اور ۱۸۹۵ء تک زیرِ تعمیر تھی۔ اس وقت اس کی تعمیر کے کاغذات میں اپریل ۱۸۹۶ء میں ناران کا نام نارانگ لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح ۱۸۹۵ء میں یہی لفظ نارانگ استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ایک نوٹ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۸۹۸ء محررہ کپتان اے۔ بی۔ ڈیو دربارہ دعوی سیدانِ کاغان حسبِ ذیل ہے:-

(ل) چلاس اور تھاک کے لیڈروں کے بیانات کے مطابق اس علاقہ کے اصلی باشندے چلاسی تھے۔ جو دریائے سندھ کی وادی پر براستہ دریائے سندھ کھیلی و کاغان مختلف اوقات میں قافلہ در قافلہ یکے بعد دیگرے یہاں آتے رہے جب کہ وہ ابھی کافر یا بت پرست تھے۔ ان کو اپنے وطن سے مختلف حملہ آوروں کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ اِن کے اجداد میں سے ایک کا نام رام تھا جو سب سے پہلے سندھ کی وادی میں وارد ہوا اور دوسرا سلطان شمشیر جو کھیلی سے آیا۔

(ب) سیّد پیر بابا صواتی قوم کے ہمراہ آیا۔ اور اُن کو ترکوں سے کھیلی فتح کرنے جو اس ملک کے باشندے تھے میں مدد دی۔ صواتیوں نے پیر بابا کو کھیلی کا ½ حصہ اور کچھ حصہ علاقہ الائی کا ان کی امداد کے عوض دیدیا۔

(ب) قوم تھاک (جو کافر تھی) نے اسلام کی خوبیوں کا تذکرہ سُن کر اپنے نمائندے ضامن شاہ (دہلی شاہ) کے پاس بھیجے۔ وہ ان کے ساتھ الائی براہ دریائے سندھ (بابوسر کے راستہ سے نہیں) اُن کے وطن گیا اور اُن کو مسلمان بنایا۔ اہلِ چلاس اور اہلِ تھور کے سب علاقوں میں ان کی بہت عزت کی گئی۔ وہ پھر اپنے وطن دریا کے کنارے کنارے واپس آیا۔ واپس آنے کے بعد جب ضامن شاہ کو معلوم ہوا کہ لوگ پھر بُت پرستی کرنے لگ گئے ہیں تو شاہ زمان نے اپنے بیٹے غازی بابا عرف قاضی مُلا کے بھیجا کہ وہ وہیں رہیں اور مذہب کی تعلیم دیں۔ انہوں نے تھاک، تھور اور چلاس میں ایک ایک مسجد بنائی اور وہاں مُلا مقرر رکھے۔ غازی بابا ایک سال وہاں رہا۔ اس کے بعد براستہ بابوسر و کاغان واپس آیا۔ غازی بابا کو کاغان بہت پسند آیا۔ اور اس نے اس علاقہ کو لینے کی ٹھان لی۔ کیونکہ یہ علاقہ گوشہ نشینی اور خدا کی یاد میں مشغول رہنے کے لئے

بہت موزون تھا اور اس وقت سیّد عبادت گزاری ہی میں عمر بسر کرتے تھے۔ کاغان اس وقت گھنا جنگل تھا اور صرف موسم گرما میں لوگ وہاں مویشی چرانے کے لئے جایا کرتے تھے۔ سردیوں میں وہاں کوئی نہ رہتا تھا۔ کاغان ۔۔۔ قوم کے علاقہ پُنبل تک تھا اور اس سے نیچے صواتی قوم جس نے ترکوں کو نکال دیا تھا قابض تھی۔

غازی بابا بمع گرہ منگ واپس پہنچنے پر صواتیوں کے پاس گیا اور اُن سے کاغان کا وہ حصہ جو ان کے قبضہ میں تھا بطور جاگیر مانگا۔ صواتیوں نے انکار کیا تو غازی بابا تنولیوں کے راجہ (محمد اکرم خان موجودہ نواب کے دادا) کے پاس مدد کے لئے گیا۔ راجہ نے ایک لشکر جمع کیا اور موضع تھنی نزد مانسہرہ آیا اور صواتیوں سے جنگ کی جس کا فتح و شکست کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد کھیلی کے صواتی (یعنی بالاکوٹ صواتی) اپنے انکار پر شرمندہ ہوئے کہ انہوں نے اپنے پیر کے ساتھ کیوں یہ سلوک کیا۔ یہ غازی بابا کے پاس حاضر ہوئے اور اُس کو اپنے ساتھ لے آئے۔ قوم نے جرگہ میں فیصلہ کیا اور کاغان کا وہ حصہ جو تھنی نالہ (کاغان سے ۷ میل نیچے) سے پنبل تک کا علاقہ غازی بابا کو جاگیر میں دے دیا۔ غازی بابا وہاں سکونت پذیر ہو گیا اس کے بعد اس نے چلاسیوں سے سیری (سیدوں اور علاؤں کی زمین کا وہ قطعہ جو بطور جاگیر قوم سے دیا جاتا ہے۔ حق ب) مانگی۔ اُنہوں نے پنبل سے غازی بابا کی چیڑھ (درخت چیل) تک جو بوڑاوئی سے تین میل اوپر ہے دے دی۔ جھیل لالوسر (لولوسر) کا علاقہ بعد میں غازی بابا کو بطور جاگیر دیا گیا۔

۳۔ آر۔ ایچ کرک ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا خط بنام اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ چلاس مورخہ ۱۱ اگست ۱۸۹۸ء میں مندرجہ ذیل تاریخی واقعات کا ذکر ہے۔

(ل) ۔۔۔۔۔۔ تاریخی وجوہات جن کا ذکر منسلکہ نقشہ جات سے واضح ہے۔ کاغان کے سیّد اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ بطور خراج بشکل جانور یا آٹھ تولہ سونا چلاس کے مواضعات سے مندرجہ ذیل حساب سے لیتے رہے ہیں :-

۱۔ موضع چلاس - ۴ تولہ	۲۔ تھاک - ۱ تولہ
۳۔ تھور - ۲ تولہ	۴۔ ہُندر (ہُوندر) ۱ تولہ یا چار بکریاں

یہ خراج سیّدوں کے مختلف گھرانوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ موضع ہُندر کا خراج ۱۸۹۲ء تک باقاعدہ ادا ہوتا رہا۔ اور اس کے بعد ان لوگوں نے ادائیگی بند کر دی اور سیّدوں سے کہا کہ وہ پولیٹیکل ایجنٹ چلاس سے فیصلہ کرائیں۔

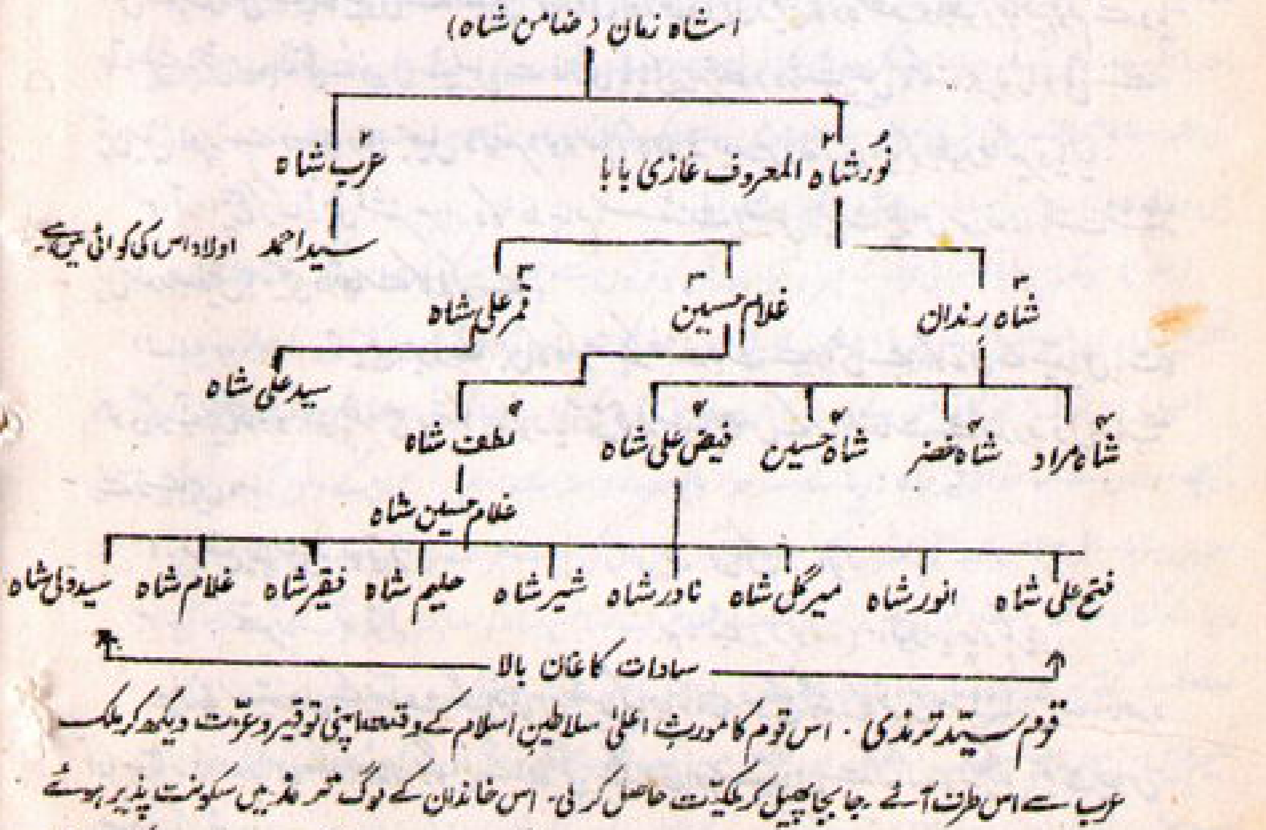
۴۔ کاغان کے سیّد اس دشوار گزار علاقے کے عملاً نیم آزاد حاکم رہے ہیں؛

سادات درہ کاغان

عہد اسلام میں پانچ پشت اب سے پہلے (۱۲۵ سال قبل از ۱۸۷۲ یعنی ۱۷۴۷ء میں) نورشاہ دالمشہور بہ غازی بابا جو سیّد جلال بابا کا پوتا تھا) نے صواتی اور کوہستانی لشکر وغیرہ کے ساتھ اس درہ پر چڑھائی کی اور بعد لڑائی یہ علاقہ فتح کر لیا۔ قوم پہوڑ۔ اصلی باشندگان کو نکال دیا۔ اور اپنی اولاد کو اس جگہ آباد کیا۔ اور قوم گوجر کو گرد و نواح سے لاکر آباد کیا۔

یہ درہ اس ضلع میں مشہور ہے۔ کاغان کی زیادہ آبادی اگرچہ قوم گوجر کی ہے لیکن مدت سے ملکیت اور اثر و رسوخ سیدوں کا ہے۔ سیدان کاغان و بیلہ کوائی کا مورث اعلیٰ شاہ زمان تھا۔ مختصر شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔

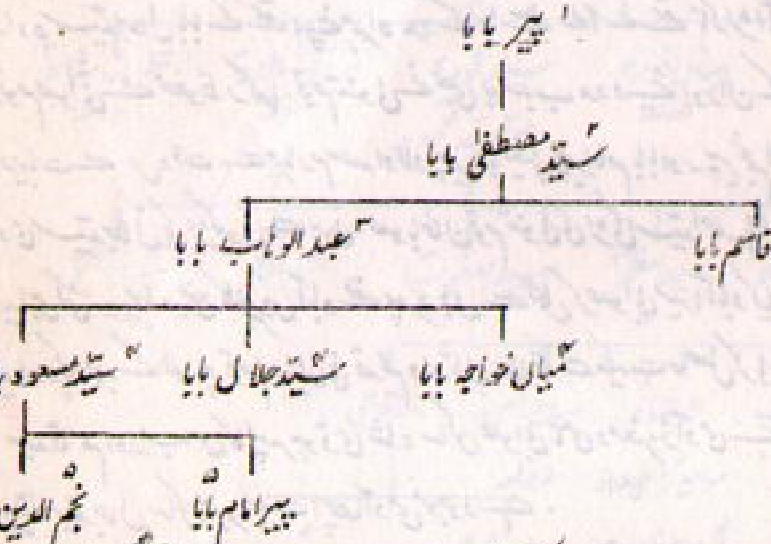
نوٹ۔ سید ضامن شاہ (زمان شاہ) جنگ بالاکوٹ میں حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے ساتھ بمعہ چالیس پچاس آدمیوں کے موجود تھے۔



قوم سیّد ترمذی۔ اس قوم کا مورث اعلیٰ سلاطین اسلام کے وقت اپنی توقیر و عزت دیکھ کر ملک عرب سے اس طرف آئے۔ جا بجا پھیل کر ملکیت حاصل کر لی۔ اس خاندان کے لوگ ترمذ میں سکونت پذیر ہوئے لہذا ترمذی مشہور ہوئے۔ اس ضلع میں یہ خاندان نہایت بزرگ مشہور ہے اور کاغان، مانسہرہ کے متصل چہم اور صوابی۔ مانیری (ضلع مردان) ستھانہ۔ ملکہ۔ منگل تھانہ۔ تختہ بند (علاقہ چغرزی و سوات) میں آباد ہیں۔

سادات گیلانی (واقعہ سلطان پور (ہزارہ میں) مظفر آباد۔ کھانیار علاقہ کشمیر میں آباد ہیں۔ سادات کی مزید مشہور شاخیں سیّد بخاری، بہاکری اور مشہدی ہیں۔

سادات کاغان (ترمذی) کی اس ضلع میں آبادی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ اکبر بادشاہ چغتائی کے عہد میں حضرت پیر بابا ترمذ سے نکل کر یوسف زئی کے علاقہ میں بہ تقریب سیر و سیاحت وارد ہوئے تھوڑی مدت اس ملک میں رہ کر ملک بُنیر کو چلے گئے۔ اُن کی بزرگی اور خاندانی نجابت کی وجہ سے اکثر لوگ اُن کے طالب اور مُرید ہو گئے۔ بنیر میں ان کی اولاد حسب ذیل ہے:۔



پیر بابا کی چوتھی پشت میں سیّد جلال بابا ملک بُنیر سے معہ مراد خان قوم عرب کشمیر کو جاتے ہوئے اس جگہ گلی باغ ریاست کی جگہ دیکھ کر مقیم ہو گئے۔ سلطان محمود ترک اس ملک کا فرماں روا تھا چونکہ دونوں خاندانی اور صاحب عزت تھے۔ بعد چندے سیّد جلال بابا کو بزرگ اور اچھا جان کر سلطان محمود نے اپنی دختر سے عقد کر کے درہ بھوگڑ منگ جہیز میں دے کر اسی جگہ آباد کر لیا۔ سیّد جلال بابا کا بہ سبب قرابت سلطان کے اندر باہر دخل ہو گیا۔ اور سب طرح سے فخر لے گیا۔ جب زور اس کا دن بدن زیادہ ہونے لگا تو سلطان کو یہ امر ناگوار معلوم ہوا اور اس کے مارنے کی فکر میں ہوا۔ اور خفیہ دزدان کو اس کے پیچھے چھوڑا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد بمقام ڈگ علاقہ بھوگڑ منگ سیّد جلال بابا پر پہنچ کر زخمی کیا۔ سید جلال بابا بوقوع اس حال کے ملک بُنیر اپنی اولاد بوم میں چلا گیا۔ ملک صواتی کے لوگ سید جلال بابا کی کرامت اور بزرگی کے خاندان کے معتقد تھے۔ اُن سے مشورہ کر کے لشکر سوات اپنے ہمراہ لیا۔ اور سلطان پر چڑھائی کر دی۔ اس موقع میں سلطان بذات خود بادشاہ دہلی کے پاس حاضر تھا۔ قوم صواتی نے بموجب راہ نمائی سید جلال بابا داماد سلطان کے اس ملک پکھلی پر قبضہ وارثانہ کر لیا۔ بعد قابض و دخیل ہونے سیّد جلال بابا نے کل ملک مقبوضہ

کا چہارم حصہ لے لیا۔ جن میں دیہات ذیل ہیں۔ بیلہ کوائی و درہ کاغان۔ سید جلال بابا کی اولاد سے بڑے بڑے نامی آدمی ذی عزت ہوتے رہے۔ سید جلال بابا کی پانچویں پشت سید فراز شاہ بابا پسر لذت شاہ بابا بوقت تیمور شاہ پسر احمد شاہ درانی ایک لاکھ روپیہ کی جاگیر ملک کشمیر میں کھاتا تھا۔ اور ملک پکھلی کا اجارہ دار تھا عہد سکھاں میں بھی صاحب عزت رہے اور سرکار انگریزی میں خیر خواہ رہے۔

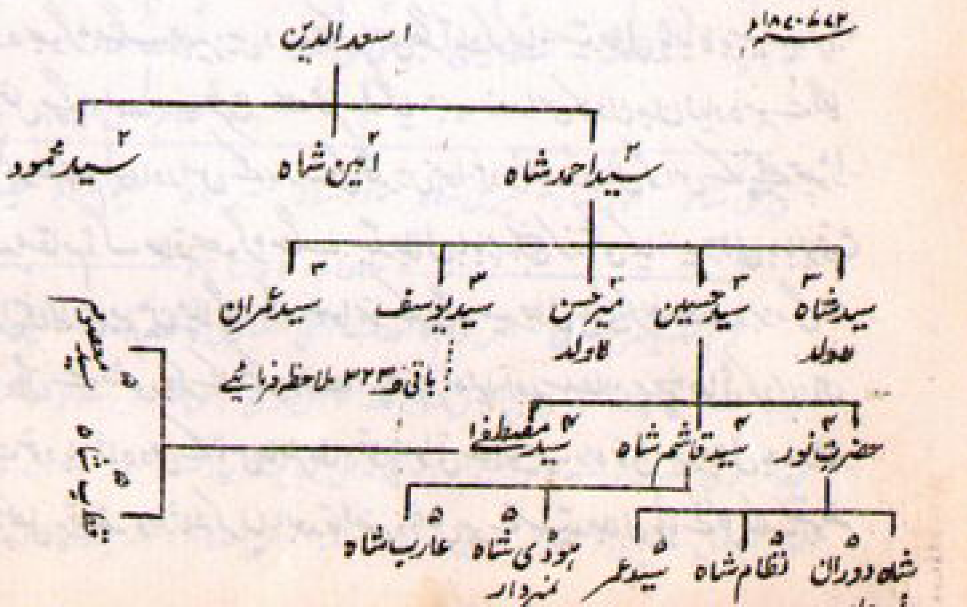
ملک پکھلی پر قبضہ پانے کے بعد سید جلال بابا نے جنوب مغرب کی جانب قوم تناول پر بھی قبضہ کرنا چاہا۔ تو قوم تناول نے بنیر سے پیر امام بابا، نجم الدین بابا پسران سید مسعود بابا اولاد پیر بابا سے جو برادرزادہ سید جلال بابا کے تھے اپنے ہمراہ مدد کے واسطے لے آئے تھے تاکہ لڑائی وغیرہ کر کے ملک تنولی کو غلبہ قوم صواتی سے محفوظ رکھا۔ قوم تنولی نے بھی بہ سبب مدد دینے اور ان کے بزرگ ہونے کے اپنی آبادی دیہات سے اس وقت سے چہارم حصہ اولاد پیر بابا یعنی پیر امام بابا اور پیر نجم الدین بابا کو دیا۔ ان دونوں کی شادی سید جلال کی لڑکیوں سے ہوئی۔ صوبا خان قوم تنولی کی لڑکی سید احمد بابا پسر سعدالدین کے ساتھ بیاہی گئی۔ یہ پہلے موضع کلنجر میں آباد تھے پھر وہاں سے نکل کر صوابی میرا آباد کیا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ بطور زر خرید اور کچھ ہبہ کے طور پر قوم سلیمانی قدیم وارثان علاقہ سے ملکیت حاصل کر لی۔

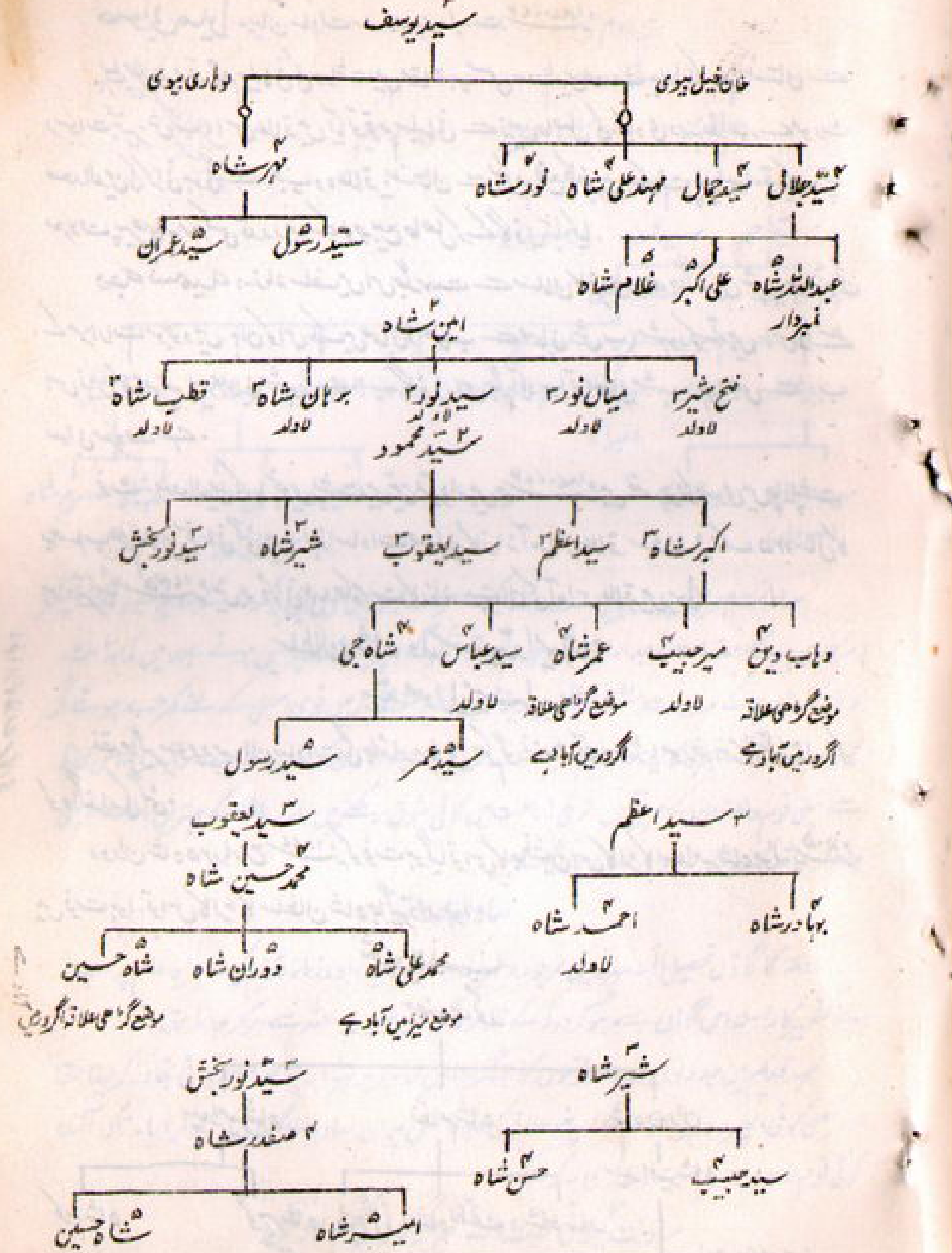
سید قاسم اور اب اس کا پسر ہوڈی شاہ ساکن صوابی نامی و معزز آدمی ہے۔ سید یوسف اور اب اس کا بیٹا سید جمال ساکن میرا بہت اچھا آدمی موجود ہے۔

سادات صوابی میرا
شجرہ نسب

قوم سید ترمذی

ماخوذ از صورت دیہی
صوابی میرا بندوبست
۱۸۷۰-۷۲ء





صوابی میرا ۔ بیان سادات مندرجہ بندوبست ۱۸۷۰-۷۲ء

پہلے پہل یہ رقبہ قوم سلیمانی کی وراثت میں تھا۔ جب مسمی سعدالدین مورث ہمارا ملک یاغستان سے (سوات بُنیر۔ ش ب) اس علاقہ میں آیا تو قوم سلیمانی سے زمین حاصل کی۔ آبادی دیہہ ہذا ہمارے مورث سعدالدین کی کرائی ہوئی ہے۔ جب وہ علاقہ یاغستان سے آکر موضع کلنجر میں سکونت پذیر ہوا۔ تو ایک تپہ معروف پیر صحابہ معہ کسی قدر رقبہ کے بوجہ بیع حاصل کرکے گاؤں آباد کیا۔

وجہ تسمیہ :۔ زمانہ سلف میں اس جگہ بہت سے مسلمان کافروں سے جنگ میں شہید ہوئے اُن کے مزارات موجود ہیں۔ ان کو اس ملک میں صحابی (اصحاب سے صحابی۔ ش ب) مشہور کرتے ہیں۔ اس واسطے اس زمین کا نام تپہ پیر صحابی مشہور ہے۔ جب گاؤں اس جگہ آباد ہوا تو صحابی مشہور رہا جس سے اب صوابی معروف ہے۔

نوٹ۔ سعدالدین کی پانچویں پشت میں تین ممبردار ہیں جو ۱۸۷۰-۷۲ء میں تھے۔ چونکہ صدی میں چار پشت بحساب علم التواریخ مانی گئی ہیں۔ لہذا سادات صوابی کا زمانہ آمد اس علاقہ ۱۸۷۰ء تک ۱۲۵ سال کا ہوا۔ قریباً ۱۷۴۵ء میں جو دُرانی عہد حکومت کا زمانہ ہے ان کی آمد اس علاقہ میں ہوئی

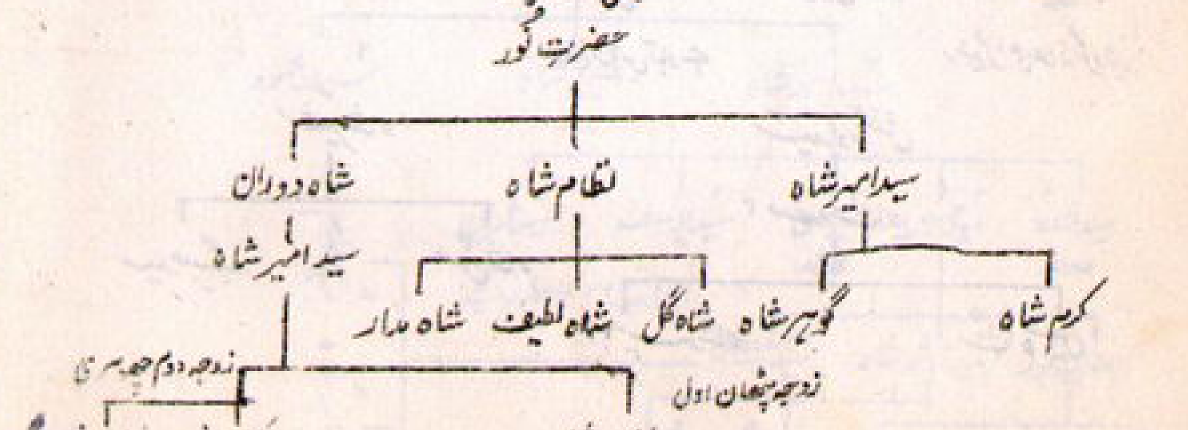
سلطان شاہ ولد سید امیر شاہ

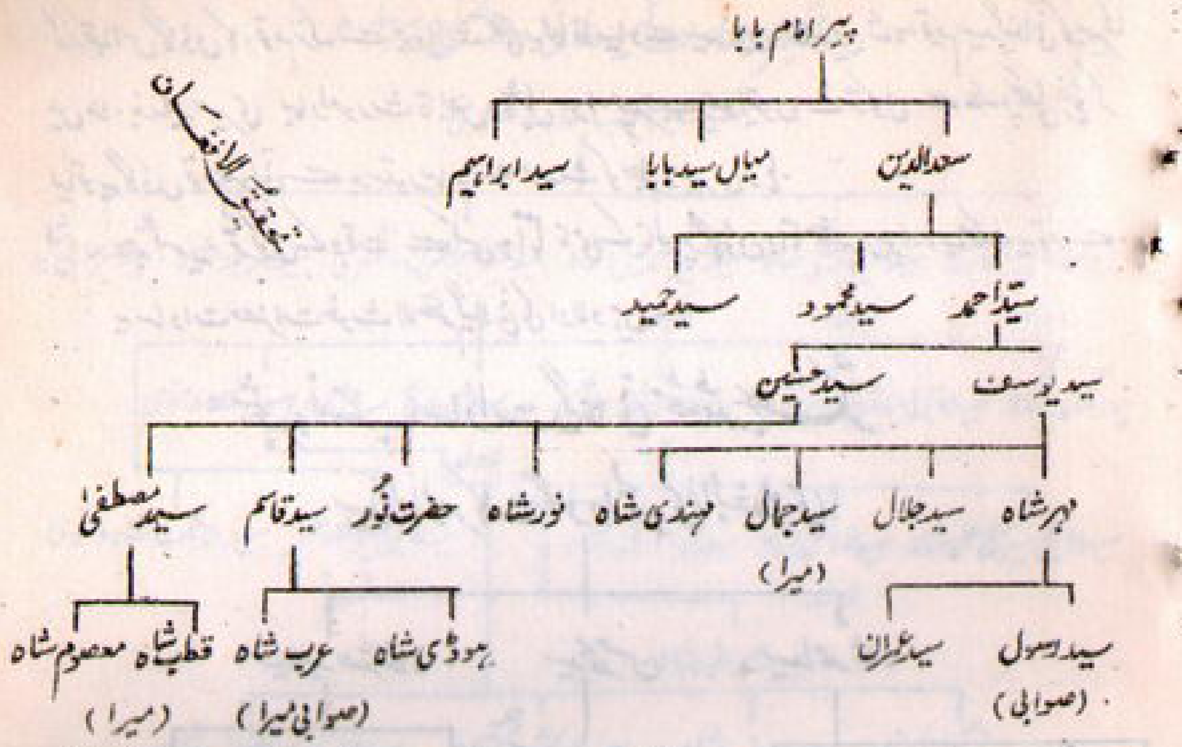
سید صوابی میرا

نقد جاگیر سو روپیہ۔ ان سادات کی جائداد مطابق حکم گورنمنٹ آف انڈیا مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۶۷ء کو واگذاشت کی گئی۔

دوران شاہ ۵ مارچ ۱۸۶۷ء کو فوت ہو گیا تو اس کا جانشین اس کا لڑکا سید امیر شاہ ہوا۔ یہ ۱۹۰۵ء میں فوت ہوا۔ تو اس کا لڑکا سلطان شاہ جاگیردار ہوا۔

شجرہ نسب





سادات صوابی میرا میں پیر سرور شاہ ایک معروف ہستی ہیں۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد پراسیکیوٹنگ انسپکٹر (سرکاری پیروکار مقدمات فوجداری) مقرر ہوئے۔ ترقی کرکے سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے۔ بعد میں کمانڈنٹ فرنٹیئر کنسٹیبلری کے عہدہ سے ۱۹۶۰-۶۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے لئے کھڑے ہوئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ تجربہ کار، معاملہ فہم، سیاست دان ہیں۔ اپنے خاندان کو انہوں نے بہت ترقی دی۔ اس لحاظ سے اپنی قوم و خاندان کے مربی ہیں۔ ترقی زراعت میں کافی شوق رکھتے ہیں۔ اور مالٹا کے بہترین باغات اپنی جائداد واقعہ کندریالہ (صوابی میرا) میں لگائے ہیں۔

سادات واتہ

واتہ کا گاؤں تحصیل مانسہرہ میں موجودہ سڑک سے قریب، اور زمانہ قدیم کی شاہراہ عام پر ہے۔ پہلے کشمیر کا راستہ اس گاؤں سے ہو کر دوگ کے نالہ نزد گڑھی حبیب اللہ سے ہو کر جاتا تھا۔

عہد قدیم میں جدونوں اور سواتیوں کا جھگڑا اس حدود پر ہوتا رہتا تھا کبھی کوئی تجاوز کر لیتا تھا اور کبھی کوئی۔ پھر دونوں اقوام نے اپنے علاقہ کی حدِ فاصل پیران سادات گیلانی کو آباد کر دیا۔ تاکہ آئندہ کوئی قوم اِدھر اُدھر دست اندازی نہ کر سکے۔

سادات گیلانی غوث الاعظم گیلانی کی اولاد ہیں

شجرہ نسب سادات ۱۸۷۲ء میں درج ہے کہ عرصہ چار پشت (یعنی ایک سو سال ش ب) کا گزرا ہے۔

کر رقبہ اس گاؤں کا، قوم ترک سے جو ارث تھی بلحاظ سیادت سید زین العابدین شاہ قوم سید گیلانی کو سیری میں ملا۔ بذریعہ سیری ہمارا مورث قابض و دخیل ہوا۔ پھر جب صواتیوں نے ترکوں سے ملک پکھلی فتح کر لیا تو یہ گاؤں قوم صواتی سے بدستور ہمارے مورث کو بطور سیری رہا۔

وجہ تسمیہ۔ ترکوں کے وقت سے کسی داتا نامی کے نام پر گاؤں داتا مشہور ہوا۔ اب تک یہ نام ہے۔

یہ سادات حضرات غوث الاعظم گیلانیؒ کی اولاد ہیں۔

شجرہ نسب سادات گیلانی ٹھٹھہ بھکر

سید ابوالبرکات محمود الحموی البغدادی

سید عبد اللہ شاہ — سید محمد حسن — سید احمد شاہ

سید عبد اللہ شاہ: سید حسن پشاوری — سید شاہ محمد فاضل (یہ صاحب سادات خانپور کے جد ہیں)

سید محمد حسن: سید بدر الدین (ان کی اولاد جہانگیر آباد دکن میں ہے)

سید احمد شاہ: سید بہادر شاہ — سید شرف الدین — سید حبیب شاہ — سید علی شاہ

سید حسن پشاوری: سید زین العابدین سلطانپوری (یہ صاحب سادات داتہ، سچی کوٹ و پیر کوٹ کے جد ہیں۔) — سید شاہ محمد غوث لاہوری (یہ صاحب سادات پشاور و مظفر آباد کے جد ہیں) — سید علی شاہ لاہوری (لاہور)

شجرہ اولاد سید زین العابدین سلطان پوری بن سید حسن پشاوری

سید زین العابدین سلطانپوری (ہزاروی)

سید میر حبیب شاہ مانگلوی[۱] — سید میر فقیر شاہ[۲] — سید میر اسمٰعیل شاہ[۳] — سید میر اسحٰق شاہ[۴] — سید شاہ عبد اللہ[۵] — سید میر علی اصغر

[illegible]

[۱] یہ صاحب سادات داتہ، گنڈی، نور سیری، کشمالی و بلیاسی کے جد ہیں۔

[۲] یہ صاحب سادات سچی کوٹ، پیر کوٹ و خانیار سری نگر کے جد ہیں۔

[۳] یہ صاحب سادات سندگراں و بوئی و دھمنی و انیور کے جد ہیں۔

[۴] یہ صاحب سادات سیری کے جد ہیں۔ [۵] یہ صاحب سادات سیالکوٹ کے جد ہیں۔

شجرہ سادات گیلانی داتہ ضلع ہزارہ

سید میر حبیب شاہ مانگلوی

سید شاہ حسین غازی (لاولد) — سید میر سید علی شاہ (لاولد) — سید میر احمد علی شاہ (لاولد) — سید میر زبیر الدین مانگلوی — سید میر بادشاہ — سید میر حاجی شاہ

سید میر زبیر الدین مانگلوی: سید سکندر شاہ — سید حاجی میر فقیر شاہ داتوی — سید میر نادر شاہ داتوی — سید میر شاہ عطا (لاولد) — سید حاجی میر رسول شاہ داتوی

سید میر نادر شاہ داتوی: سید حاجی میر فتح علی شاہ — سید ضامن شاہ (لاولد) — سید محمد اشرف شاہ

سید حاجی میر رسول شاہ داتوی: سید حاجی میر شاہ عمر (لاولد) — سید ملا نک شاہ داتوی

سید محمد انور شاہ

سید نور اللہ شاہ — سید یوسف شاہ (لاولد) — سید میر شیر شاہ — سید حاجی میر مقبول شاہ

سید حاجی میر فقیر شاہ داتوی

سید قدرت شاہ — سید محمد علی شاہ — سید حضرت شاہ — سید منظور شاہ (لاولد) — سید شاہ غلام شاہ

سید میر ملا نک شاہ داتوی

سید سکندر شاہ — سید سعادت شاہ (لاولد) — سید حیدر شاہ (لاولد) — سید عبادت شاہ

سید محمود صاحب کا مزار بھکر ملک ٹھٹھہ میں ہے یہی صاحب پہلے ملک ہند میں تشریف لائے ان کی تاریخ آمد در ملک ٹھٹھہ سنہ ۱۰۳۴ھ (سنہ ۱۶۲۵ء) ہے یہ زمانہ جہانگیر بادشاہ کا تھا۔ وہ ان کا آوازہ سن کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کر لی۔ وفات ۲ ربیع الاول سنہ ۱۰۹۹ھ (سنہ ۱۶۸۸ء) ہے ٹھٹھہ بھکر میں مدفون ہوئے۔ حضرت سید عبد اللہ قادری۔ آپ سید محمود صاحب کے بڑے فرزند ہیں ان کی پیدائش بھکر میں بماہ شعبان سنہ ۱۰۳۹ھ بعہد سلطان داد بخش عرف مرزا بلاقی واقع ہوئی اور وفات ذی الحجہ سنہ ۱۱۰۳ھ بمقام حجرہ شاہ ہوئی

[illegible]

اور وہیں مدفون ہوئے۔

تذکرہ سید حسن پشاوری

آپ حضرت سید عبداللہ کے فرزند ہیں آپ کو سید شاہ ابوالحسن بھی کہتے ہیں۔ تولد آپ کا جمادی الآخر سنہ ۱۰۲۳ھ میں بمقام سکھر بھکر ہوا۔ اور وفات جمعرات ۲۱ ذی قعد سنہ ۱۱۱۵ھ مطابق ۲۷ مارچ سنہ ۱۷۰۳ء بروز جمعہ واقع ہوئی جب آپ سفر عرب و ہندوستان سے پشاور وارد ہوئے۔ وہاں حضرت سید جمال ترمذی کی دختر نیک اختر سے نکاح کیا۔ آپ کی وفات پشاور میں ہوئی اور وہاں ہی دفن ہوئے۔

سید زین العابدین سلطان پوری

آپ کا مزار موضع سلطان پور ضلع ہزارہ میں واقع ہے۔ یہ فرزند شاہ ابوالحسن قادری و داماد عم خود شاہ محمد فاضل قادری ہیں۔

آپ کی ولادت پشاور سنہ ۱۰۹۰ھ (سنہ ۱۶۷۹ء) میں ہوئی۔ انہوں نے بہت سیاحت کی۔ اور بہت سے اولیاء سے کسب فیض کیا اور خاص کر اپنے عم سید شاہ محمد فاضل قادری سے جب سیاحت کشمیر کے لئے روانہ ہوئے اور ضلع ہزارہ میں برلب دریائے دوڑ موضع سلطانپور پہنچے تو آزاد خان دُرانی حاکم کشمیر خبر پاکر وہاں حاضر ہوا۔ موضع سلطان پور ان کو عطا کیا۔ اور اپنی لڑکی ان کے نکاح میں دے دی۔ اس کے بطن سے مسماۃ فاطمہ زوجہ میر محمود شاہ خانیاری اور دو فرزند سید میر فقیر شاہ و سید میر علی اصغر شاہ پیدا ہوئے۔ باقی اولاد دوسری بیوی سے ہوئی۔ جو شاہ محمد فاضل قادری خانیاری کی لڑکی تھی۔

آزاد خان دُرانی حاکم کشمیر اور سخی صوبہ خان والی تناول نے ان کو سلطان پور و موضع مانگل عنایت کئے ان کے پٹہ جات کی نقل درج ذیل ہے:۔

مقدمان و رعایائے موضع سلطان پور و نواحیہا ئے او بداند سیادت و نجابت پناہ حقائق و معارف آگاہ حضرت پیر و مرشد و داماد خود سید شاہ میر زین العابدین برادر کلاں حضرت شاہ محمد غوث لاہوری بن سید حسن پشاوری بن سید عبداللہ بھاکری ثم الحجروی بن سید محمود الحموی البغدادی ثم الٹھٹھوی البباکری رابرائے صرف لنگر دادہ شدہ۔ لہذا برائے شما نوشتہ مے شود کہ مزاحم نہ شوند۔ و پیداوار ہائے غلہ ہر قسم وخراج کہ قبل ازیں پیش من شدہ بود ازاں بعد ادائگی آنہا نزد مرشد موصوف و اولاد الاولاد آنحضرت باید نمود۔ اگر از شما کسے مزاحم باشد آں را تعزیر دادہ باشد چراکہ بطور جاگیر دہ مذکور مع نواحی ہائے متصلہ کہ جانب غرب شمال واقع ہستند علی الدوام زیر تصرف آنہا باشد تاکید اکید دانند

تحریر ۷ رجب سنہ ۱۱۹۹ھ العبد آزاد خان حاکم کشمیر (مہر)

۹ ستمبر سنہ ۱۷۸۱ء

مطابق "تذکرہ شاہ محمد غوث" از پیام شاہجہانپوری۔

سید حسن پشاوری کی پہلی بیوی جو کہ ملا محسن خان مضافات پشاور کے ایک رئیس کی بیٹی تھی سے ان کا بیٹا سید زین العابدین پیدا ہوا۔ وہ بڑا محدث اور فقیہ تھا جن کی وفات سنہ ۱۱۶۹ھ (سنہ ۱۷۵۶ء) میں ہوئی۔ یہ شاہ محمد غوث کے بڑے بھائی تھے۔ شاہ محمد غوث کی والدہ دوسری تھی۔

نقل پٹہ سخی صوبہ خان والئی تناول

بنام

تمامی مزارعان و مالیہ دہندگان موضع مانگل و سیری و ۔۔۔۔ تاکیداً نوشتہ باشم کہ دیہائے مذکور بطور (سیری) مرشد برحق سید شاہ زین العابدین بن سید حسن پشاوری کہ سید گیلانی است دادہ شدہ۔ آں صاحب ازاں بعد خود مالیہ و پیداوار غلہ ہائے از شما وصول خواہند کرد۔ پس شما را باید کہ مزاحم نشوند والا مستوجب سزا باشند۔ و ہمچنیں دیہائے مذکور زیر تصرف اولاد مرشد موصوف منظور بدستور سابق مے شود۔ تاکیداً تاکید است۔ و دریں قصور نہ کنند۔ کہ حضرت غوثیہ ناراض نشوند۔ چراکہ ناراضگی آنحضرت بعینہٖ ناراضگی حضرت سرور عالم و غوث الاعظم است۔ لہذا بحق شاہ موصوف نوشتہ شد۔ شما تاکید اکید دانند۔ تحریر ۲۳ صفر سنہ ۱۱۲۱ھ۔ مطابق تاریخ انگریزی ۱۳ مئی سنہ ۱۷۰۹ء۔ العبد صوبہ خان بن بہادر خان بن متوتی خان۔ بن شمشیر خان۔ بن شیر خان بن قاضی خان بن عبدالکریم خان بن آدم خان بن ہیر خان قوم مغل سکنہ پوہار والی تناول (مہر)

کتاب تذکرۃ السادات فارسی میں آپ کی نسبت جو حالات درج ہیں ان کا مختصر اقتباس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"آپ سنہ ۱۰۹۰ھ میں تولد ہوئے۔ اور اپنے چچا صاحب شاہ محمد فاضل خانیاری اور آزاد خان دُرانی حاکم کشمیر کے داماد ہیں۔ عرب و عجم و اکثر ممالک و بلاد و امصار کا سیر کیا اور مزارات اکابر اولیاء و صحبت مشائخ عظام سے فیض یاب ہوئے۔ پھر کابل گئے۔ وہاں سے واپس آکر کشمیر کے سیر کو گھر سے نکلے جب موضع سلطان پور ضلع ہزارہ میں پہنچے تو دریائے دوڑ کے کنارہ پر ایک خوش ہوا صاف چشمہ پر قیام فرما ہوئے۔ آزاد خان دُرانی حاکم کشمیر خبر آمد سن کر حاضر خدمت ہوا اور موضع مذکور مع اس کے متصلہ مواضعات کے دریائے دوڑ کے شمال مغرب میں واقع ہیں عطا کر کے پٹہ لکھ دیا۔ اور اپنی دختر نیک اختر بھی آپ کے نکاح میں لا کر فخر تعلقداری حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب سیر کشمیر سے فارغ ہوئے تو پھر موضع سلطان پور مقیم ہوئے اور حسب معمول لنگر جاری فرما کر طریقت و ارشاد کے کام

میں مشغول ہوئے۔ بہت لوگ حلقہ ارادت میں آکر مرید ہوئے۔ اس کے بعد سخی صوبہ خان سکنہ پھوہار والے تناولی نے مواضعات مانگل وسیری یہ دونوں مقامات آپ کے نذر کئے۔ اور پٹہ لکھ کر دے دیا۔ اور موضع سجی کوٹ کڑالوں نے عطا کیا جو آپ کے خاص مرید تھے۔ اور موضع داتہ ترکوں نے نذر کیا پھر موضع سلطان پور آپ نے مبلغ تین سو ساٹھ روپیہ میں باشندگان کے پاس رہن چھوڑ دیا۔ یہ روپیہ آپ نے لنگر میں صرف کیا۔ آپ نے دو شادیاں کیں ایک بی بی تاج النساء بنت شاہ محمد فاضل خانیاری عم خود، دوسری بی بی عائشہ بنت آزاد خان درانی صوبیدار پنجاب و کشمیر ....."

تذکرہ سید میر حبیب شاہ مانگلوی

آپ حضرت سید زین العابدین سلطان پوری کے تیسرے فرزند اور اپنے عم بزرگوار سید شاہ محمد غوث لاہو کے داماد ہیں۔ آپ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں تولد ہوئے۔ والد بزرگوار نے آپ کو مریدوں کی اصلاح قلب کے لئے موضع مانگل بھیجا۔ آپ نے بھی مانگل میں لنگر جاری کیا۔ شمس العارفین کے لقب سے ملقب ہیں۔ ۱۱۹۹ھ ۱۷۸۵ء میں وہیں مانگل وفات پاکر قدیم شہر سے شمال مشرق کی طرف موجودہ سڑک جہنیل کے پاس مدفون ہیں آپ کے فرزند ارجمند سید میر وزیرالدین شاہ بھی یہیں آپ کے پہلو میں مدفون ہیں۔ جو کہ سادات داتہ کے جد ہیں۔ یہ ۱۱۵۳ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۹۹ھ (۱۸۱۵ء) میں وفات پائی۔ اخیر ۱۲۳۰ھ میں ان دونوں باپ بیٹے نے موضع مانگل و موضع داتہ کو از سر نو آباد کیا۔

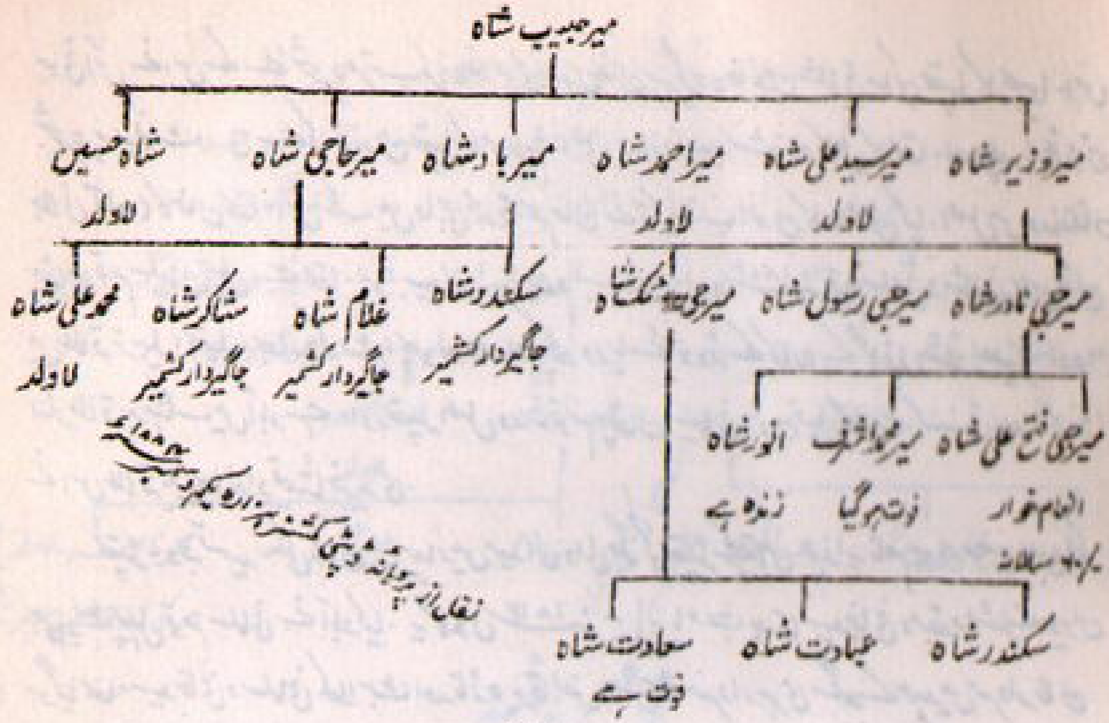
سید شاہ حسین غازی داتوی آپ حضرت سید میر حبیب شاہ مانگلوی کے فرزند ارجمند اور سید میر وزیرالدین شاہ کے بھائی ہیں۔ صاحب کرامات بزرگ گزرے ہیں۔ آپ کا مزار داتہ میں ہے

سید میر علی اصغر شاہ معروف کھانڈو والے صاحب سجی کوٹ

آپ ۱۱۲۳ھ میں تولد ہوئے اور ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی اور سجی کوٹ میں مدفون ہوئے۔ آپ حضرت سید زین العابدین سلطان پوری کے فرزند ارجمند ہیں آپ کھانڈو والے مشہور ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی سید میر فقیر شاہ بھی یہیں آپ کے پہلو میں مدفون ہیں۔ جو کہ ۱۱۲۰ھ میں تولد ہوئے۔ دونوں بھائی ایک ماں کے بطن سے ہیں اور دونوں حسب الارشاد والد ماجد خود مریدوں کی اصلاح قلب کے لئے سجی کوٹ علاقہ نارڑہ میں جاکر مقیم ہوئے۔

شجرہ نسب میر جی نادر شاہ معافی خور ساکن داتہ

میر حبیب شاہ



داتہ

از صورت دیہی بندوبست ۱۸۷۲ء

یہ گاؤں اول قوم ترک سے ۱۵۰ سال ہوئے آباد کیا۔ (یعنی ۱۷۲۰ء میں۔ ش ب) پھر ترک اور صواتی کی لڑائی ہوئی ترک مغلوب ہو کر فرار ہو گئے ..... ۷۰ سال (ستر سال) ہوتے ہیں (یعنی ۱۸۰۲ء ش ب) کہ آتا دخان درانی کشمیر کا حاکم ہو کر جاتا تھا (اس وقت کابل سے کشمیر کا راستہ درہ بیڑ سے ڈب، مانسہرہ، داتہ اور گڑھی حبیب اللہ سے ہو کر جاتا تھا۔ ش ب) کہ قوم صواتی سے جنگ ہوئی۔ اس نے مانگل ماری تو یہ گاؤں بھی غیر آباد ہو گیا۔ وجہ تسمیہ۔ داتا نام قوم ترک کے آدمی نے آباد کیا۔

قوم بلغادری

اس قوم کے متعلق مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے۔ اور نہ ہی شجرہ نسب۔ یہ قوم پار دریائے سندھ میں آباد ہے۔ تاریخ ہزارہ بندوبست ۱۸۷۲ء سے اس قوم کی آبادی مواضعات جموں، بھائی جگو، عیسیٰ (مواضعات جاگیر قوم تارخیلی بر لب دریائے سندھ) میں پائی جاتی ہے اس قوم کی رہائش موجودہ علاقہ طاہر خیلی تھا جس سے وہ تارخیلی قوم کی آمد سے بزور یا خرید و فروخت سے بے دخل ہو کر گمنام ہو گئے۔ افسوس باوجود تلاش اُن کے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے۔

سلمانی (شلمانی)

محمد اشرف خان ٹھیکیدار ساکن تھپلہ سے شلمانی قوم (اُس کی اپنی قوم) کے متعلق ایک دفعہ بات چیت

ہوئی اُس نے اس کے لئے شجرہ مرتب کردہ غلام محی الدین خان سرگروہ خاندان شلمانی ساکن تھپلہ کا بھیجا۔ اس شجرہ پر یہ نوٹ درج ہے کہ خاندان تھپلہ کا مورث اعلیٰ دراز خان باشندہ کابل کا تھا۔ احمد چلید باغ (نزد جلال آباد) کا خان تھا۔ اس ملک میں حاجی محمد قاسم خان نے آکر لقب اخون کا حاصل کیا۔ اصل میں دراز خان پٹھان قوم سلیمان خیل سے تھا۔ بموجب اندراج بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء قوم سلمانی (شلمانی) اس ضلع میں علاقہ تربیلہ، تھپلہ، بھاروکوٹ، پھولدھار اور کچھ دریائے دوڑ کے کنارہ کے گاؤں مثلاً بعسیرا اور لنگر علاقہ بدہنک میں آباد ہے۔ اور تھپلہ اصل وطن قوم پٹھان سلیمانی اخون خیل کا ہے۔ کسنتی احمد اکا خیل نے اس علاقہ میں جائداد قیمتاً خریدی۔

تھپلہ۔ وجہ تسمیہ ملکی زبان میں پہاڑ میں میدان والی جگہ کو تھپلہ کہتے ہیں۔ لہذا یہ نام ہوا۔ موضع بعسیرا کو بھی پہلے پہل قوم سلمانی نے آباد کیا۔ یہ گاؤں ۱۸۱۲ء میں بہ باعث بدی سید خانی در مقدم مشرف سیران ہوگیا تھا۔ سید خانی و سلمانی کھلابٹ اور نانڈہ پر قابض رہے۔ سردار ہری سنگھ کے عہد میں سردار خان خوشحال خانی، محمد خان ترین، کرم خان سلمانی نے بہ اجازت سردار موصوف پرانی تہ پر آبادی کی۔ مالکان قوم سلمانی یہیں آباد ہو گئے۔ اور سید خانی موضع کھلابٹ ہی میں رہ کر وہاں قابض ہو گئے۔

تاریخ آزاد پٹھان میں اللہ بخش یوسفی لکھتا ہے کہ اس قوم (شلمانی) کو ہمند قوم کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ اس قبیلہ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ دوسرے ہندی نژاد قبائل سے ہے۔ جب یوسف زئی درہ خیبر کے راستہ سے پشاور کا رخ کر رہے تھے۔ تو اس قبیلہ نے وادی کرم سے درہ خیبر کا رخ کیا تھا۔ اور جب یوسف زئیوں نے دلازاک قبیلہ کو ہشت نگر سے نکل جانے پر مجبور کیا اور خود اس علاقہ پر قابض ہو گئے۔ تو شلمانیوں کے مشرقی حصہ آبادی پر بھی حملے کئے جس سے یہ قوم ایک محدود حلقہ میں مقیم رہنے پر مجبور ہو گئی۔

نوٹ۔ بموجب بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء تربیلہ میں پرانی آبادی شلمانیوں کی ہے اور اُتمان زئی (یوسف زئیوں کی شاخ) بعد میں آئے۔

شجرہ نسب قوم سلمانی

مرتب کردہ غلام محی الدین خان۔ ساکن تھپلہ

- ۱ درازخان
  - ۲ گل محمد خان
    - حاجی محمد قاسم اخون زادہ

- ۳ حاجی محمد قاسم اخون زادہ
  - ۴ محمد انور — اس کی اولاد علاقہ اٹک، بسلوجوگی اور دھتوڑ میں ہے
  - ۴ محمد اشرف
    - ۵ نورالحق
    - ۵ محمد ایاز
      - میر غزن
      - میر عبداللہ
      - عبدالمجید
    - ۵ عبدالواحد
      - نیاز محمد
      - علی گوہر
      - محمد ناصر
    - ۵ عبدالصمد — لاولد
  - ۴ عبدالعزیز — اس کی اولاد موضع گنیا نزد پنیال میں آباد ہے۔

قوم یغنیہ

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق یہ اپنے آپ کو قوم قریش حضرت عثمانؓ کی اولاد سے بتلاتے ہیں جن کا مورث اعلیٰ سلطان کاشف خان عہد جہانگیر بادشاہ میں یعنی سولھویں صدی عیسوی میں بدخشاں اپنے بھائی تاج دین سے ناراض ہو کر تنہا ساتھ دس بارہ ملازمان کے ملک تبت کی راہ سے اس ملک میں آیا۔ اس وقت حکومت اس ملک میں ترکوں کی تھی۔ اور ملک زیادہ غیر آباد تھا۔ پہلے راجکوٹ نام ایک جگہ متعلق علاقہ کونٹر جو اس وقت مہاراجہ کشمیر کی حد میں ہے آباد ہوئے۔ رعیت قوم ترک سے تنگ تھی۔ انہوں نے اس کا آنا غنیمت سمجھا اور چند دیہات کی رعیت نے اتفاق کر کے معاملہ بھی ان کو دینا شروع کر دیا۔ ان دنوں قوم ترک کی جانب سے مسمی کمال بمقام کوڑمنگ جو قریب مظفر آباد کے ہے۔ عامل تھا۔ اُس کے ظلم سے لوگ نہایت تنگ تھے۔ اس نے بھی شادی اپنی دُختر کی سلطان کاشف سے کر دی۔ سلطان کاشف کی قوت زیادہ ہو گئی۔ مگر یہ امر کمال کو ناگوار ہوا۔ اس نے شکار کے بہانے سلطان کو باہر لے جا کر قتل کرا دیا۔ اور بیوہ سلطان دختر کمال حاملہ تھی۔ چھ ماہ کے بعد اس سے لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام سلطان قاسم رکھا اس نے بالغ ہو کر اپنے نانا کمال کو قتل کر دیا۔ اور قوت اس کی زیادہ ہو گئی۔ قوم ترک نے چاہا کہ سلطان قاسم کو گرفتار یا قتل کریں اور ملک اپنے پر دخل پاویں۔ مگر قوم ترک کے اقبال کا دورہ ختم ہو چکا تھا۔ سواتی کی طرف سے قوم سواتی نے غلبہ کر کے ملک پکھلی ترکوں سے لے لیا۔ اور ادھر سے سلطان قاسم نے یہ ملک علاقہ کونٹر، گھوڑی، درہ بالاکوٹ، دوپٹہ اپنے تحت حکومت کر لیا۔ ان علاقہ جات میں قوم سواتی پہلے کی

آباد تھی۔ باقی اقوام متفرق کچھ پہلے کچھ پیچھے آباد ہوئے۔ اور سلطان رعیت کو اکثر آباد کرتے رہے۔ اس قوم کے اکابر سے سلطان مظفر خان زیادہ تر صاحب اقبال ہوا۔ اس نے مظفر آباد بنام خود آباد کیا۔

سب سلطان اپنے علاقہ میں خود مختار رہے۔ حاکم کشمیر کو سالانہ ایک گھوڑا اور ایک باز نذرانہ پیش کرتے رہے۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اخیر میں جب کہ حکومت درانی میں عبد اللہ خان درانی حاکم کشمیر ہو کر آیا اس وقت ہمارے بزرگان سے سلطان حسن علی خان صاحب دستار و سلطان تھا۔ عبد اللہ خان نے ناظم سلطان سے طلب کیا اس نے نہ دیا۔ عبد اللہ خان نے کشمیر میں طلب کر کے ڈل میں غرق کرا دیا۔ پھر عبد اللہ خان جلد ہی تبدیل ہو گیا۔ اور محمد عظیم خان حاکم وقت ہو کر آیا۔ اس وقت سلطان زبردست خان پسر حسن علی خان سلطان تھا۔ اس نے واسطے موافقت حاکم کشمیر کے دختر اپنی کی شادی محمد عظیم خان سے کر دی اور پھر وہی ایک باز اور گھوڑا نذرانہ مقرر رہا اور جاگیر بھی بحال رہی۔

سرکار سکھاں میں جاگیر کم کر دی گئی اور مظفر آباد میں ایک تھانہ مقرر ہو گیا لیکن علاقہ پر دخل اندازی نہ ہوئی۔

شیخ غلام محی الدین حاکم کشمیر کی ریشہ دوانی سے زبردست خان اور اس کے بھتیجے حسین خان میں (بوجہ قدیمی عناد کسی خانگی معاملہ پر) مخالفت ڈلوا دی اور حسین خان کے ذریعہ سے زبردست خان کو قید کر کے کشمیر بھیج دیا اور حسین خان کو سلطان بنا دیا۔۔۔ اس کے بعد سلطان حسین خان کو بھی اپنے متعلق ایسے انجام کا شک ہوا۔ اس نے ملک میں بغاوت کرا دی۔ اور حبیب اللہ خان عموا تھی خان گڑھی کی معیت میں قلعہ مظفر آباد پر حملہ کر کے قلعہ فتح کر لیا۔ اس جنگ میں حبیب اللہ خان مارا گیا اور سلطان حسین خان نے اپنے سب ملک موروثی پر قبضہ کر لیا۔

جب مہاراجہ شیر سنگھ ۱۸۴۱ء میں تخت نشین ہوا تو آئے دن کی کشمیر کی شورش کو ختم کرنے کے لئے ایک مسلمان کو (جو کہ آغاز حکومت سکھاں سے اس وقت تک نہ ہوا تھا) شیخ امام دین پسر غلام محی الدین کو صوبیدار مقرر کیا۔ اس سے پہلے کرنل مہاں سنگھ ۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۱ء تک صوبیدار کشمیر رہا۔

۱۸۴۱ء میں زبردست خان و نجعت خان والی مظفر آباد نے بغاوت کی تھی مگر شکست کھائی۔

جب شیخ امام الدین کشمیر میں آیا تو اس نے تالیف قلوب شروع کی۔ سلطان زبردست خان کو قید سے رہا کر دیا اور قلعہ بھی مظفر آباد سے اٹھا لیا۔ شیخ امام الدین تین برس تک شہر میں رہا۔ بعد کو حکومت سکھاں آخر ہوئی۔

سلطان زبردست خان کی وفات کے بعد حسین خان سلطان ہوا۔

ابتدائے عملداری سرکار انگریزی یہ خطہ کشمیر تحت حکومت مہاراجہ گلاب سنگھ ہوا۔ سب ملک کا مالیہ مقرر ہو کر مہاراجہ گلاب سنگھ کو ادا ہوتا رہا۔ اور سلطان حسین خان بدستور سابق اختیار اپنے موروثی ملک پر رہا۔ بعد کو علاقہ بیرن گلی و دوارشٹہ حسب تجویز حکام صدر کے ماتحت حکومت راجہ گلاب سنگھ سے نکل کر شامل ہزارہ ہوا۔ (مطابق پروانہ میجر ایبٹ سابق ڈپٹی کمشنر ہزارہ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۸۴۷ء، سمت ۱۹۱۱ (۱۸۴۷ء) سے علاقہ متعلقہ کشمیر مہاراجہ نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔" اور حسین خان علاقہ بوئی ضلع ہزارہ میں آ گیا۔ سلطان حسین خان سمت ۱۹۱۷ (۱۸۶۰ء) میں لاولد فوت ہو گئے۔ اس کی وفات کے بعد برکات خان (برادر زادہ حسین خان) ولد رحمت اللہ خان سلطان ہوا۔

بمبہ

یہ کشمیر میں ایک بڑی قوم ہے اور ہزارہ میں اس قوم کے صرف دو خاندان ہیں جاگیردار بوئی اور خان جبڑی کلیش۔ جاگیردار سلطان برکات خان ضلع ہزارہ کے بڑے جاگیرداروں میں سے ہے اور اس کے ۳۵ گاؤں کی جاگیر سات ہزار روپیہ سے زیادہ کی ہے اس کے اجداد بہت بڑے آدمی تھے۔ اور مظفر آباد کے علاقہ بمعہ بوئی وغیرہ کے سلطان تھے۔ بعد میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کا علاقہ ان سے لے لیا۔

شجرہ نسب خاندان بمبہ

۱ سلطان محمد مظفر خان بانی مظفر آباد۔ وفات ۱۰۷۰ھ ۱۶۶۰ء

۲ سلطان ہیبت خان ثانی

۳ سلطان مردار شید

۴ سلطان محمود خان بمبہ وفات ۱۱۹۰ھ ۱۷۴۸ء

۵ سلطان حسن علی خان والی مظفر آباد ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء — ۵ سلطان اکبر علی خان والی گھوڑی ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء — ۵ سلطان ناصر علی خان والی کرناہ دروازہ ۱۱۹۸ھ ۱۷۸۴ء

۶ سلطان زبردست خان وفات ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء — ۶ مظفر خان ثانی۔ وفات بہ حیات سلطان زبردست خان مدفن مظفر آباد

عبد اللہ خان مقتول ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء

۸ رحمت اللہ خان وفات بحالت قید سرینگر ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء

(باقی صفحہ ۳۳۶ ملاحظہ فرمائیے)

رحمت اللہ خان
۹ سلطان محمد خان
۱۰ قطب الدین خان
وفات سنہ ۱۲۷۷ھ

مظفر خان ثانی
- سلطان حسین خان (آخری سلطان بمبہ مظفر آباد) — سنہ ۱۸۶۰ء
  واقعہ وفات پشاور ۔ مدفن بوئی
- حشمت اللہ خان

۵ سلطان اکبر علی خان والی گھوڑی
۶ سلطان نجف خان والی گھوڑی
- قطب الدین خان
  - فتح خان
  - ولی محمد خان
- فیروزدین خان

۸ ۔ وفات بحیات سلطان حسین خان
مدفن مظفر آباد ۔ وفات سنہ ۱۲۷۹ھ ۱۸۵۳ء

- ۹ سلطان محمد برکات خان جاگیردار بوئی
  مدفن بوئی ۔ وفات ۲۰ ستمبر ۱۹۲۳ء
  - ۱۰ خان صاحب سلطان حسن علی خان
    - ۱۱ عبدالقیوم خان
    - محمد کاشف خان
- ۹ عنایت اللہ خان ۔ بحیات سلطان محمد برکات خان ۔ مدفن بوئی
  - محمد اکبر خان ۔ وفات سنہ ۱۹۳۶ء

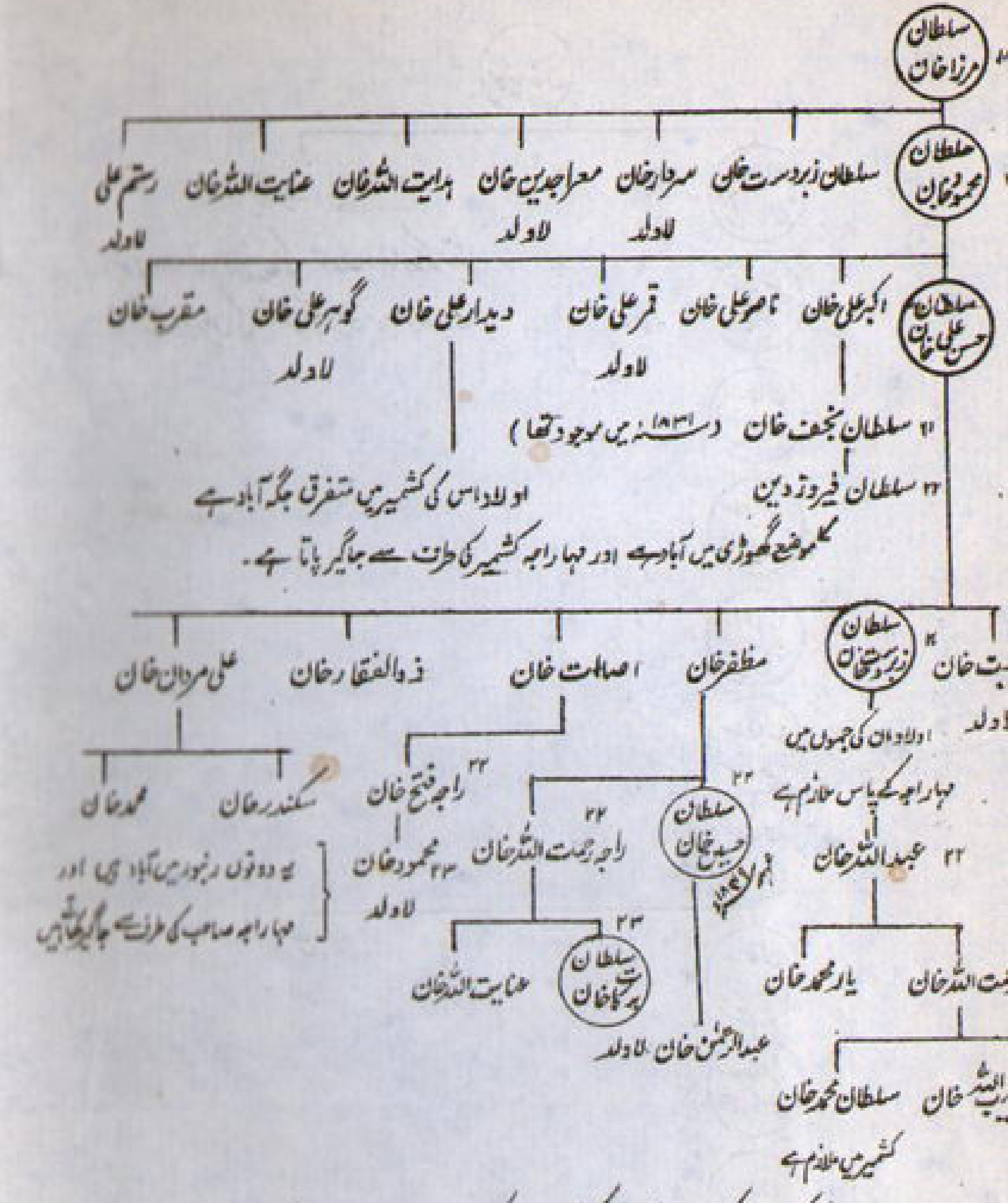
قوم بمبہ علاقہ بوئی

صورت وہی بوئی ۔ کے مطابق شجرہ نسب حسب ذیل ہے ۔ جو سلطان ہوئے اُن کے گرد حلقہ ڈالا گیا ہے ۔

سلطان کاشف
سلطان قاسم
ہیبت خان
صاحب خان
موتیا خان

باقی ص ۳۳۷ ملاحظہ فرمائیے

۵ موتیا خان
- پیر قطب ولی
  انہوں نے شادی نہیں کی ۔ تارک دنیا ہو کر فقیر ہو گئے ۔ قبر ان کی مظفر آباد میں موجود ہے
- ۶ سلطان فتح خان
- ۷ سلطان نوروز خان
- ۸ سلطان فتح خان
- ۹ سلطان جمال خان
- ۱۰ سلطان تاجدین خان
- ۱۱ سلطان سنگار خان
- ۱۲ سلطان دریا خان
  - صحیح خان ۔ لاولد
- ۱۳ سلطان کالیا خان
- ۱۴ سلطان شاہ خان
- ۱۵ سلطان مرزا خان
- ۱۶ سلطان مظفر خان
- ۱۷ سلطان ہیبت خان
  - ۱۸ سلطان مرزا خان
  - سلطان زبردست خان
  - ہدایت اللہ خان
  - عنایت اللہ خان



صورت دہرم بوٹی کے بیان کے مطابق قوم بمبہ کی آمد اس ملک میں اس طرح بیان ہوئی ہے :-

عرصہ دو سو پچاس برس (یعنی سنہ ۱۸۷۲ء بکرمی ش ب) کا ہوا ہے کہ سلطان کاشف ملک بدخشاں سے معہ دس بارہ [...] زمین خود اپنے ماموں سے ناراض ہو کر اس ملک میں آیا۔ اس زمانہ میں اس ملک میں حکومت ترکوں کی تھی۔ مگر کمال نامی [...]م سے رعیت ناراض تھی۔ سلطان کاشف نے مقام کر کے رعیت کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کیا۔ اور چند دیہات [...] قابض ہو گیا۔ اور کمال نے اس کو ناطہ بھی دیا۔ چونکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف زیادہ ہوا۔ اس نے سلطان [...]شف کو مار دیا۔ اس کے ہاں سلطان قاسم پیدا ہوا۔ اس نے کمال کو قتل کیا۔ اور ملک لے لیا۔ ۔ ۔ ۔ سولھویں پشت

میں سلطان مظفر خان زیادہ صاحب اقبال ہوا اُس نے سب ملک فتح کر لیا۔ ستارھویں پشت میں ہمت خان ہوا۔ اس کی اولاد میں ملک تقسیم ہوا۔ مگر سلطان ایک ہی ہوتا رہا۔ سلطان مظفر آباد میں رہتا تھا۔ سلطان قاسم کے وقت بوئی ایک جنگل تھا۔ ڈھائی سو سال ہوتے ہیں کہ بہ عہد مسلمانی سلطان صاحب موصوف نے اس جگہ آبادی کرائی۔ اس کی اولاد میں جو بھی سلطان ہوتا رہا یہاں جگہ ہوتا رہا۔ ان سلطانوں میں سے سلطان مظفر خان نے مظفر آباد آباد کیا۔ مگر اس کی اولاد سے سلطان پشت بہ پشت یہیں مقیم رہے۔

سلطان زبردست خان پسر سلطان حسن علی خان نے عرصہ سو سال ہوا کہ یہاں آ کر پرانی جگہ کا مکان چھوڑ کر نئی آبادی بنوائی۔ اور خود یہیں آ کر رہتا تھا۔ اس کے بعد سلطان حسین خان و رحمت اللہ خان بھی یہیں آباد رہے۔ اب سلطان برکات خان برادر زادہ سلطان حسین خان آباد ہے۔

وجہ تسمیہ۔ زمانہ قدیم میں یہاں پھلواڑی کے پودے بہ کثرت تھے جس سے خوشبو دار پھول نکلتے تھے ان کی خوشبو کی وجہ سے بوئی مشہور ہوا۔

چند تاریخی واقعات اقتباس از سیرت احمد شہیدؒ مولانا مہر

سلطان زبردست خان (شجرہ میں ۱۸ پشت) نے سید شہید سے مدد مانگی تھی۔ کیونکہ اس کو اس کے عم زاد بھائی نجف خان (شجرہ میں ۱۸ پشت) نے سکھوں سے مدد لے کر مظفر آباد سے نکال دیا تھا۔ اسی طرح نجف خان گھوڑی والا بھی اپنی ریاست سے نکل کر کوہ دراہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور راجہ منصور خان اپنے بھائی معز الدین کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا۔ سید صاحب نے مولوی خیر الدین صاحب کو بھیجا اور سلطان زبردست خان کا ملک لے کر اس کے حوالہ کر دیا۔

نجف خان سکھ افواج کے سپہ سالار شیر سنگھ کے ساتھ باہر چلا گیا۔ رنجیت سنگھ نے شیر سنگھ کو حکم دیا کہ خود حسن ابدال میں ٹھہرے رہو۔ اور فوج مظفر آباد بھیج دو۔

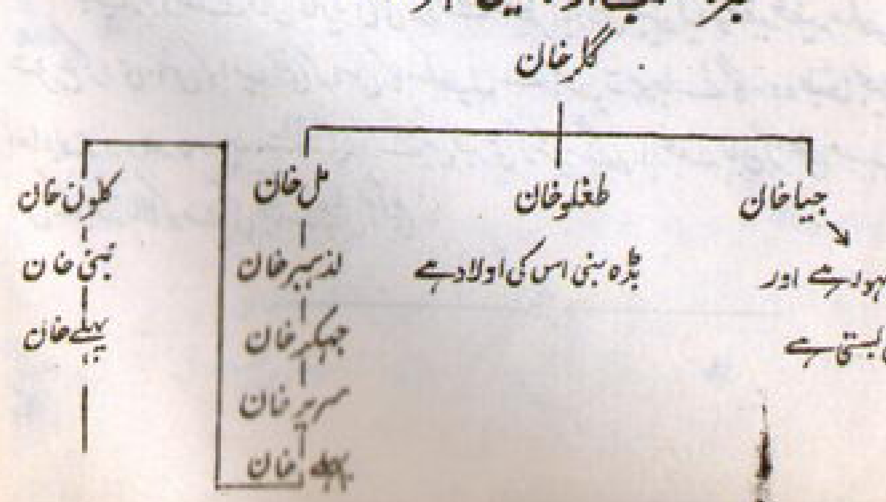
جب زبردست خان غازیوں کی مدد سے مظفر آباد میں بیٹھ گیا تو خفیہ خفیہ سکھوں سے ساز باز شروع کر دی۔ اس کو امید تھی کہ اس کا سکھوں سے سمجھوتہ ہو جائے گا۔ وہ طبعاً بخیل تھا اور غازیوں کی امداد با وجود وعدہ روپیہ سے نہ کی۔ اتنے میں خبر ملی کہ شیر سنگھ اور نجف خان گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد بالا کوٹ کی جنگ پیش آ گئی ۔

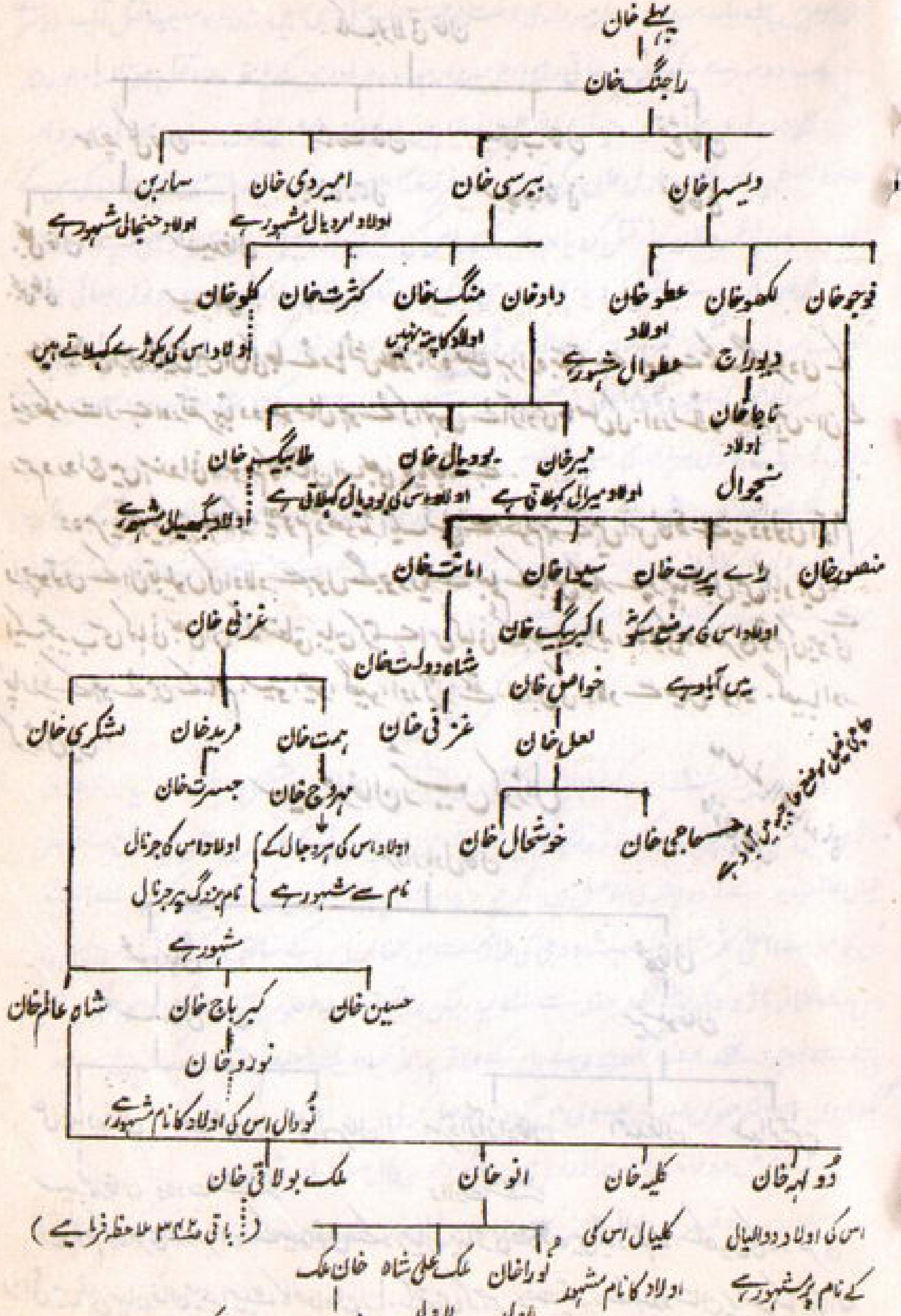
قوم کرڑال

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق

یہ قوم خود کو مغل ظاہر کر کے اپنی آمد کا حال اس طرح بیان کرتی ہے کہ بعہد سلطنت چغتائی گلر شاہ بزرگ ہمارا کیان سے اس ملک میں آیا جس کے نام سے اس ملک میں ہم اب کرڑال مشہور ہیں۔ ناڑہ میں اول اس نے سکونت اپنی اختیار کی۔ کچھ عرصہ کے بعد گکھڑان علاقہ بروالہ (عہد گکھڑان میں ان کا دارالسلطنت واقع ضلع جہلم) نے اس علاقہ پر حکومت اپنی پھیلانی شروع کی۔ اور معاملہ لینے پر تیار ہوئے۔ مورچہ کلے خان کرڑال نے دیہات متعلقہ اپنے کا معاملہ دینے سے عذر کیا۔ اس لئے راجہ مذکور اس کو قید کر کے خود یہاں سے چلا گیا۔ مورچہ کلے خان نے اس بے عزتی کے باعث طیش میں قسم کھائی کہ جب تک میں تم کو قتل نہ کروں مجھ پر کھانا حرام ہے۔ غرضیکہ اپنی قوم سے اتفاق کر کے اس نے راجہ کو قتل کر دیا۔ عہد سکھاں میں امر سنگھ مجیٹھیہ نے اس ملک پر یورش کر کے ناڑہ فتح کر لیا۔ اور اس جگہ قلعہ ڈالا مگر آخر کار سمندر کنٹھ میں کرڑالوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ اور قلعہ ناڑہ سکھوں کے قبضہ سے نکل گیا۔ اس کے انتقام کے واسطے سردار ہری سنگھ نے چڑھائی کی۔ مگر سردار حسن علی خان و احمد علی خان نے سردار موصوف سے مثال۔ ناڑہ وغیرہ دیہات جاگیر لے کر صلح کر لی۔ اور سردار ہری سنگھ نے قلعہ ناڑہ اپنے قبضہ میں رکھا۔ سنہ ۱۸۴۶ء میں یہ ملک مہاراجہ گلاب سنگھ کے تحت ہو گیا۔ دیوان ابراہیم مہاراجہ کی جانب سے کاروار ہو کر پرانے وصولی معاملہ مقرر ہوا۔ اول تو یہ قوم اس سے برسر فساد ہوئی اور آخر کار کچھ جاگیر وغیرہ ملنے پر اتفاق ہو گیا۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں جب یہ ملک سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا تو ان کی قدیمی جاگیر بحال ہوئی۔ سکھوں کے وقت خوف سے اس قوم نے اس قدر ملکیت مقبوضہ خود کا انتقال قوم جدون و حسن زئی کے ہاتھ کیا۔ کہ اب بہت سے گاؤں ان کے قبضہ میں ہیں۔

شجرہ نسب از تاریخ ہزارہ





- ملک بولاقی خان
  - مورچہ گل خان
    - بجلی خان — بجلی خانی
    - سید خان — سید خانی
  - بشارت خان — بشنارتال
  - مستجاب خان — مستجاب خانی
  - فتح خان — فتح خانی

مسٹر واٹسن اپنی تاریخ میں ان کی جائے رہائش علاقہ ناڑہ ضلع ہزارہ بتلاتا ہے۔ یہ مدت تک گکھڑوں کے زیر حکومت رہے اور تقریباً دو سو سال ہوئے کہ انہوں نے آزادی حاصل کی۔ اور نسلاً یہ ہندو ہیں۔ ان کے رسم و رواج میں ہندوانی رسوم کا نشان اب بھی پایا جاتا ہے۔

وہ مزید تحریر کرتا ہے کہ "یہ قوم ڈھونڈ ایک نسل سے معلوم ہوتے ہیں اس لحاظ سے یہ دونوں اقوام راجپوتوں کے ان قبیلوں کی اولاد سے ہوں گے جو دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر پہاڑوں میں آباد ہیں۔ ایک عجیب سی کہانی بھی ان کے متعلق بیان کرتا ہے اس کہانی کے بموجب راجہ رسالو کی دوسری قوم کی بیوی سے چار لڑکے ہوئے جن کے نام، سیو، تیو، گھیبو، اور کرڑو تھے۔ اور جن کی اولاد سے سیال، ٹوانہ، گھیبا اور کرڑال ہیں۔

سید محمد خان رئیس کرڑال

- سردار بادل خان
  - محمود خان
    - احمد علی خان
      - علی بہادر خان
        - سید محمد خان ولادت ۱۸۹۵ء
      - عطا محمد خان
      - علی گوہر خان
  - محمد خان
    - میر حسنو خان
      - سردار آزاد خان ولادت ۱۸۷۳ء
      - احمد خان
      - عبدالرحمن

یہ قوم کوہ مری اور ہزارہ کے میدانوں کے درمیان پہاڑی قطعات میں آباد ہے۔ سکھوں کی دوسری لڑائی میں علی بہادر خان میجر ایبٹ کا معاون رہا۔ کہتے ہیں کہ جس وقت تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس وقت سے قوم کرڑال علاقہ بکوٹ میں آباد ہے۔ یہ اور ڈھونڈ کئی سال تک گکھڑوں کے باجگذار رہے

اس قوم میں پہلے ایک سردار رہا۔ مگر سرداری وقت بوقت ایک خیل میں نہیں رہی۔ بسبب قتل ایک دوسرے کے ایک دوسرے کے گھر میں جاتی رہی۔ جو سردار ہوا وہ برادری کے ہاتھ سے قتل ہوتا رہا۔ اور دو دو جگہ بھی سرداری ہوتی رہی۔ چنانچہ اخیر عہد اسلام میں بادل خان و مصری خان دونوں بھائی سردار نصفا نصفی کے تھے۔ بادل خان مرگیا تو اس کے فرزند حسین خان نے دستار باندھی۔ حسین خان کو اس کے دوسرے بھائی محمود خان نے قتل کر دیا اور دستار اس کی لے لی۔ اور پھر مصری خان کو بھی اپنے دوسرے بھائی محمد خان کی مدد سے قتل کر دیا۔ اور مصری خان کی دستار محمد خان نے لے لی۔ پھر دونوں بھائی نصفا نصف سردار ہو گئے۔ محمود خان کی اولاد ہم ڈبران والے اور محمد خان کی اولاد ہم منال والے ہیں۔

سرداری کے صرف پانچ گاؤں تھے جن میں سے سردار دو حصہ رکھتا تھا اور تیسرے حصہ میں دوسرے بھائی کو۔ پانچ گاؤں سرداری کے یہ تھے۔

گل پھٹ گراں۔ بٹوٹنے۔ ترمو چھا۔ سروالہ۔ سرپلہ۔ عطا محمد خان وغیرہ کا بیان ہے کہ محمود خان کے بعد سرداری کا رواج ہمارے خاندان میں نہیں رہا۔ برابر حصہ کے ہم مستحق رہے چنانچہ گنڈی مسلمانی میں ہم نے علی بہادر خان کے ساتھ برابر حصہ پایا۔

کرڑال

ہزارہ گزیٹر ۱۹۰۷ء کے مطابق ان کی آبادی ۱۵،۳۴۳ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور زیادہ تر علاقہ ناڑہ مابین میدان رجوعیہ اور کوہ ڈونگا گلی میں رہتے ہیں اور کچھ بوئی کے علاقہ میں بھی ہیں۔ اُن کے متعلق خیال غالب یہ ہے کہ وہ ہندی الاصل ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو مغل بیان کرتے ہیں جو کیان سے آئے اُن کا مورث اعلیٰ کلمر شاہ شہنشاہ دہلی کی ملازمت میں تھا اور اس کے ساتھ وہ کشمیر کو گیا۔ واپسی پر اس نے علاقہ ناڑہ دبکوٹ گکھڑوں سے لے لیا۔ لیکن درحقیقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جگہ پر غالباً پہلے سے موجود تھے۔ جب گکھڑوں نے ان کے علاقہ پر حملہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گکھڑوں سے سترھویں صدی عیسوی میں آزادی حاصل کر لی۔

کرڑالوں میں دو خاندان سربرآوردہ ہیں۔ جاگیردار دیوال منال اور ڈبران سکھوں کے وقت میں دیوال منال کا سردار حسن علی خان تھا۔ جو بہت بارسوخ تھا لیکن ناقابلِ اعتبار

(پرغیاں حکومت انگریزی۔ش پ) ۱۸۵۶ء میں وہ ڈھونڈ قوم کے ساتھ مری پر حملہ کر کے تقریباً ال چکا تھا لیکن خاندان کے دوسرے آدمیوں نے اس کو روک دیا۔ اس کا جانشین اس کا لڑکا آزاد خان ہوا جو ۱۹۰۱ء میں فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بڑا لڑکا رحمت اللہ تھوڑے ہی عرصہ کے لئے سردار رہا۔ اور اس کو خاندانی جھگڑے کی بناء پر خاندان والوں نے ۱۹۰۵ء میں قتل کر دیا۔ وہ لاولد تھا۔ اور دوسرا کوئی قابل آدمی اس کے خاندان میں جو ذاتی فساد و حسد میں مبتلا تھے۔ نہ تھا۔ لہٰذا اس کی جاگیر جو چودہ ہزار روپیہ تھی پانچ سال کے لئے بند کر دی گئی۔ تاکہ اس عرصہ کے بعد اگر کوئی لائق آدمی اس خاندان سے نکل آئے تو اس کو دے دی جائے۔

خاندان ڈبران سے سید محمد خان جاگیردار ہے جس کی جاگیر ۸۰۰ روپیہ ہے۔ اس کے خاندان میں بھی باہم سخت مخالفت اور دشمنی ہے۔ دراصل کرڑالوں کے عادات اور طور طریقے دلکش نہیں ہیں۔ ان کے سرکردہ لوگ فتنہ پرداز اور جھگڑالو اور بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار ہیں۔ لیکن اس قوم کے عام لوگ خاموش، غریب طبع، سادہ اور امن پسند ہیں۔ صرف اپنے گھر اور کام سے غرض رکھتے ہیں اور محنتی ہیں۔

رو ملح نامہ بندوبست ۱۸۶۲ء

کرڑال۔ ہماری قوم میں حسب ذیل شاخیں ہیں:-

بولا قیال۔ بہر سیال۔ مہنگیال۔ اتوال۔ نوڑال۔ نجوال۔ میرال۔ ستوڑیال کل آٹھ شاخیں ہیں۔

جاگیر سرداران قوم کرڑال

سردار ہری سنگھ نے ۱۸۲۱ء میں سردار حسن علی خان کو ۱۲/۴/۲۱ روپیہ کی جاگیر حسب ذیل مواضعات میں دی تھی:- نگری پائیں۔ نگری بالا۔ مکول بالا۔ مکول پائیں۔ تنتریلہ۔ اخوڑہ۔ دیوال۔ سجکوٹ کا کچھ حصہ۔ بگن کا کچھ حصہ۔ موہری۔

زمانہ شورش میں سردار کی جاگیر ضبط ہوگئی۔ لیکن بعد میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے بحال کر دی۔ سکھوں کی جنگ ستلج کی شکست کے بعد سردار حسن علی خان خود مختار ہوگیا۔ لیکن مسلم کنسٹ کے فتح ہو جانے کے بعد وہ برٹش حکومت کا مطیع ہوگیا۔ اور اس کی جاگیر اس کے نام پر تصدیق کر دی گئی۔

سردار حسن علی خان ماہ دسمبر ۱۸۶۳ء میں فوت ہوگیا۔

شجرہ نسب سردار مہت خان

- نوازش علی خان
  - طیب خان
- سردار حسن علی خان
- عبدالنبی
  - فیروز خان
- نواب خان
- عبداللہ خان
- احمد علی
- نادر خان

سردار حسن علی خان

- اکبر علی
  - عطا محمد
  - دوست محمد
  - عبدالرحمن
  - فضل
- سردار آزاد خان
  - سردار رحمت اللہ خان
    - عبدالغنی
    - حسن
    - اشرف
    - عبدالحمید
    - گوہر الرحمن
  - عبدالمجید
  - خداداد خان
- احمد
- عبدالرحمن
- فیروز
- عبدالستار

نواب خان

- عبدالرحمان
- کرم خان
- عبدالرحیم
- اسمٰعیل
- عبداللہ
- احمد

ریونیو کمشنر کے خط محررہ ۲۳ نومبر ۱۹۴۲ء میں تحریر ہے کہ کرڑال قوم کے مندرجہ ذیل اشخاص جاگیردار ہیں:-

۱۔ سردار آزاد خان ساکن دیوال منال۔ ۲۔ سردار کرم خان ساکن دیوال منال۔ ۳۔ اکبر علی خان ساکن چندومیرا۔ ۴۔ سید محمد خان ساکن ڈبران۔

قوم کرڑال کے چند مواضعات

اقتباس از بندوبست ہزارہ ۱۸۷۰ء نگری بالا۔ سمندر کٹھہ، بیرن گلی، کرڑالوں کے گاؤں ہیں یہ کرڑال باگن سے، جو اصل جگہ اس قوم کی خانی کی ہے، آئے۔

باگن

عرصہ بارہ تیرہ پشت کا گزرا ہے (یعنی تقریباً تین سو سال ش پ) کہ مسمی امیر خان قوم کرڑال مورث اعلیٰ موضع منال سے اٹھ کر یہاں آیا اور اس جنگل کے ویران علاقہ کو آباد کیا۔ اس گاؤں کی آبادی پانچ جگہ ہے۔ باگن خاص۔ کیر۔ مشرق شمال مشرقی۔ کیر مشرق مائل بر جنوب۔ پسالہ۔ مولاچھ۔

باگن کے مندرجہ بالا مواضعات میں گوجر، گھوکھر، آوان، جنجوعہ وغیرہ بھی آباد ہیں۔

بیرن گلی

عملداری مسلمانی میں جب کہ حکومت قوم ترک کی تھی اس وقت کا حال ہے کہ مسمیان سواری خان۔ ارجن خان برادران و چچا زاد بوجہ ناراضی باگن سے نکل متلاشی دوسری جگہ کے ہوئے اور اس جگہ آئے۔ حکومت ترکان میں قضاء الٰہی سے زوال آگیا۔۔۔ ہر ایک قوم گردونواح کا یہ حال تھا کہ جو قوم غالب ہوتی وہ اردگرد

کے دیہات پر مار دھاڑ کرتی تھی چنانچہ ہم مالکان پر بھی جدون رش والے نیز قوم ڈھونڈ سولیا بکوٹ والے اکثر حملہ کرتے تھے۔

ڈھونڈ

ڈھونڈ کے متعلق بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہندی الاصل (ہندو سے مسلمان ہوئے) ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ قریشی ہیں۔ کرڑالوں کی طرح وہ بھی کچھ مدت گکھڑوں کے ماتحت رہے۔ وہ علاقہ بکوٹ میں سلسلۂ کوہ ٹوہ نگا گلی اور دریائے جہلم میں آباد ہیں۔ اور نالہ ہرو کے مشرقی شاخ کے دیا ڈھونڈ شاخ کے ہرو کی کرڑال شاخ سے ملنے کی جگہ تک، دونوں طرف آباد ہیں۔ وہ مری کے گردو نواح میں بھی آباد ہیں۔ اس ضلع میں اُن کی آبادی ۲۵۲۳۱ نفوس پر مشتمل ہے وہ جمہوریت پسند ہیں ان کا کوئی بڑا خان نہیں ہے کے سربرآوردہ خاندان بکوٹ اور مجوہاں میں ہیں۔ عادات و اطوار میں فتنہ پرداز اور مقدمہ باز ہیں (چونکہ انگریزوں سے آخر تک مقابلہ کرتے رہے۔ ش ب) بہت زیرک اور دغا باز ہیں۔ جسمانی لحاظ سے بہت مضبوط اور بلند قامت ہیں۔

ان میں سربرآوردہ اشخاص عطا محمد خان ساکن بورہ (جس کے باپ نے سرکار انگریزی کو سنہ ۱۸۵۷ء میں ڈھونڈ قوم کے متوقع حملہ مری سے خبردار کیا تھا) میردی خان ساکن ڈھیری کیالہ۔ حسین خان ساکن کالابن۔ قطب دین ساکن مجوہاں اور دوست محمد خان ساکن بکوٹ ہیں۔ دوست محمد خان کے والد حسن خان غدر کے ایام میں سرکار انگریزی کی قابل قدر خدمات کیں۔

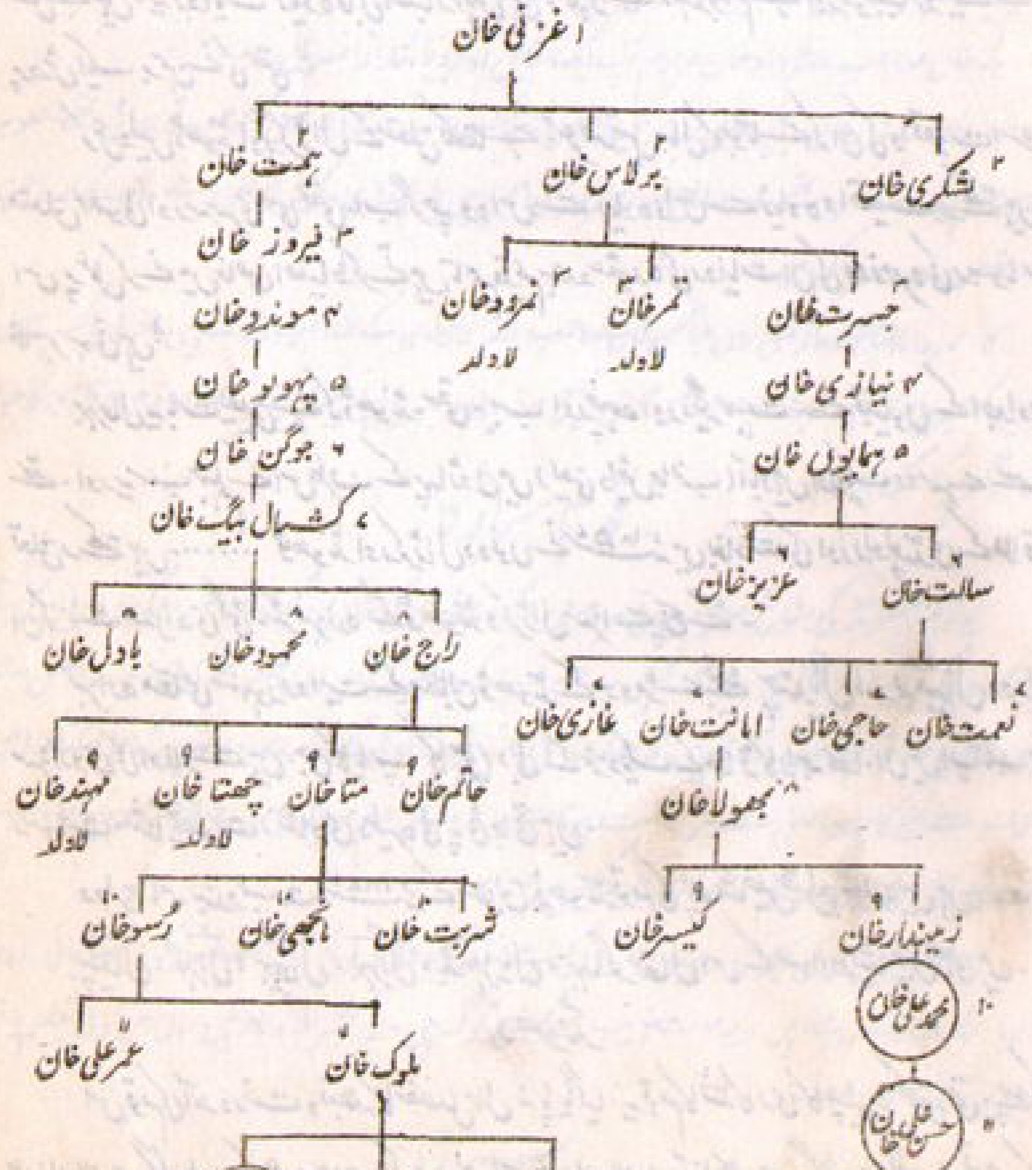
موضع ناڑہ۔ کرڑال۔ تپہ۔ موجوال کی ملکیت ہے۔ آبادی۔ حسب معتبران وغیرہ کا بیان ہے کہ غزنی خان مورث اعلیٰ قوم کرڑال جس کے وقت کو بارہ پشت گزر گیا۔ سجیکوٹ سے اٹھ کر اس گاؤں کو آباد کیا۔ جو لوگ اس کے ساتھ آکر آباد ہوئے ان کا صحیح حال معلوم نہیں ایک شخص مسمی دل بیگ میراسی گرسی خواں جس کو اپنی زبان میں گوسلی کہتے ہیں بہ حیثیت خدمت گزار کے غزنی کے ساتھ آباد ہوا تھا۔ اُس کی اولاد سے اب بھی اسی وقت میں موجود ہیں اور کوئی موجود نہیں۔ سردار محمود خان کے وقت جب درانی بارادہ جانے کشمیر کے ہزارہ کی طرف آئے تو یہ گاؤں جلا دیا۔ باشندگان سجیکوٹ و دیگر دیہات کوہ میں چلے گئے۔ صرف دو دفعہ غیر آباد رہا پھر بدستور اولاد غزنی خان آکر آباد ہو گئی۔ اور اب تک آباد ہے۔ عہد سکھاں میں امر سنگھ اس طرف آیا۔ اس نے اپنی فوج ناڑہ میں چھوڑی۔ مکول کی طرف جا کر قوم کرڑال سے جنگ کی۔ اس میں امر سنگھ مارا گیا۔ ناڑہ میں پھر غزنی خان کی اولاد آباد ہو گئی۔ اس کے بعد سردار محمد خان و سردار احمد علی خان کی باہم نا اتفاقی ہو گئی۔ ایک سال بعد سردار ہری سنگھ بہ رفاقت و معیت سردار احمد علی خان کے ناڑہ میں آیا اور اس نے قلعہ اپنا تعمیر کرایا

تو سردار محمد خان کی اولاد مکول وغیرہ کی طرف جا بسے۔ گاؤں جلا یا گیا۔ پھر جب سردار ہری سنگھ سے اتفاق ہوا تو آباد ہو گئے۔

جب میجر ایبٹ صاحب تشریف لائے سنہ ۱۸۴۴ء بذمرہ خرچ آبادی اس گاؤں کے سردار حسن علی خان و نواب خان و عزت خان و نادر علی خان کو بحصہ نصفا نصف عطا فرمایا۔ تو وہ یہاں میں شوق سے آکر کرڑال اولاد غزنی خان کے آباد ہو گئے۔

وجہ تسمیہ:۔ گردونواح میں ناڑے پانی کے بہت ہیں اس لئے زمین ناڑہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

شجرہ نسب موضع ناڑہ



○ دائرہ حکمران سرداری کی علامت۔

ڈھونڈ

یہ ہزارہ اور راولپنڈی حصہ شمالی میں آباد ہیں۔ اندوال بھی ڈھونڈ کے ساتھ کے قبیلے ہیں۔ ڈھونڈ اپنے آپ کو حضرت عباسؓ کی اولاد سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن ایک اور روایت کے مطابق ان کا مورث اعلیٰ تخت خان امیر تیمور کے ساتھ آیا۔ اور دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی اولاد سے زہراب خان شاہ جہاں کے وقت میں کہوٹہ چلا گیا۔ اور جدوال ڈھونڈ، سراڑہ، اور تنولی اُس کی اولاد سے ہیں۔ اس کا لڑکا مسمی کلہارا یا کلورائے کشمیر بھیجا گیا تھا۔ اس نے وہاں ایک کشمیری عورت سے شادی کر لی۔ ڈھونڈ اس کی نسل سے ہیں۔ یہ روایات زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ کلورائے، ہندو نام ہے اور بموجب روایت کے اس کی پرورش ایک برہمن نے کی تھی۔

کرنل ویلس ڈھونڈ اور کرڑال کے متعلق لکھتا ہے: "عرصہ تیس سال کا ہوتا ہے کہ ان کی واقفیت اسلام کے متعلق معمولی اور سرسری سی تھی۔ اب اگرچہ وہ اس سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرنے میں خاص احتیاط کرتے ہیں تاہم قدیم ہندو عقیدہ کی روایات ان کی روزمرہ کی رسومات سے ظاہر ہوتی ہیں"۔

بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ ڈھونڈ، ستی، بب اور جبہ اور دیگر بہت سے قبیلوں کے اجداد ہندو تھے۔ اور یہ سب جہلم کے اس طرف کے پہاڑوں میں (یعنی دائیں جانب) آباد ہیں اور ایک دوسرے سے قومی تعلق رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ڈھونڈ اور کرڑال دونوں نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی اور راولپنڈی کے علاقہ میں ان کو سخت سزا دی گئی۔ مگر ہزارہ کے ڈھونڈ و کرڑال سزا سے بچ گئے۔

ہزارہ مقامی مشہور روایت کے مطابق ڈھونڈ کے دو بڑے قبیلے چندیال اور رتنیال دو راجپوت سرداروں کی اولاد سے ہیں۔ جن کا باپ گاہی دہلی کے نزدیک کے علاقہ کا راجہ تھا۔ ان میں اب تک ہندوانہ رسومات، مثلاً چھوت، شادی وغیرہ کی پائی جاتی ہیں۔

رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق ڈھونڈ قوم کی چھ شاخیں ضلع ہزارہ میں ہیں۔

پیتال، گہرال، ہیجال، لہرال، بڈہریال، بھاگر تھال اس کے سوا اور شاخیں بھی ہیں۔

ڈھونڈ

اس قوم کی آمد و رفت و قبضہ کا مفصل حال نہ پایا گیا۔ یہ قوم کاشتکاری کا پیشہ رکھتی تھی۔ پہلے کبھی عہدِ اسلام میں گکھڑوں کی رعیت ہو چکے ہیں۔ پھر اسی عہدِ اسلام میں آزاد بھی ہو گئے۔ وہ لکھواتے ہیں کہ ہمارا قبضہ اس علاقہ پر بزور رہا۔ اور قوم جحجرہ کو ہمارے بزرگ نے نکال دیا۔ اور قتل کر ڈالا۔ اور ان کی آبادی

بہت کم تھی۔ اُن کے وقت صرف چار یا پانچ گاؤں آباد تھے۔ جب ہمارا قبضہ ہوا تو ہم نے آبادی بہت کی۔ اول بنیاد کل اولاد دوست محمد خان شہہال کی ڈالی ہے۔ اور تیہ خسال کی جگہ اصلی لورہ ہوا۔

قومِ ڈھونڈ کے نامور افرادِ زمانہ حال

۱۔ خان بہادر راجہ عبدالرحمٰن خان ساکن ٹوٹیال۔ آپ ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر تھے۔ جنہوں نے صاحبزادہ عبدالقیوم کی وزارت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اور ہزارہ کو پہلی بار وزارت میں حصہ ملا۔ آپ ہزارہ مسلم لیگ ایڈہاک کمیٹی کے ممبر تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بھی ممبر رہے۔

۲۔ خان صاحب اللہ داد خان مرحوم آپ ایک قابل اور دیانتدار افسر مال رہے۔

۳۔ راجہ سرفراز خان۔ آپ خان بہادر عبدالرحمٰن و خانصاحب اللہ داد خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ صوبہ سرحد مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ اور سابق صوبہ سرحد کی اسمبلی میں پارلیمنٹری سکرٹری بھی رہے۔ آپ کی مساعی سے مقصود لورہ سڑک بنی۔

۴۔ سردار عنایت الرحمٰن خان عباسی خان صاحب اللہ داد خان کے صاحبزادے ہیں۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے۔ آپ زبردست سیاسی آدمی فصیح مقرر اور بہترین پارلیمنٹری ہیں اور علاقہ میں رفاہی کاموں میں سرگرم کارکن ہیں۔

قوم سراڑہ

یہ قوم ڈھونڈ کی شاخ معلوم ہوتی ہے جن کے ساتھ ان کی شادی کے رشتے ہیں۔ لیکن وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ پاک پتن ضلع منٹگمری سے آئے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ بھی کرڑال اور ڈھونڈ کی طرح ہندو اصل سے ہوں۔ ان ہر سہ اقوام کی خیلوں کے نام میں آخر حرف "آل" مثل قوم تناولی کے آتا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرف سے ان کا ہندو اصل سے ہونا ثابت ہوتا ہے یا نہ۔ لیکن قوم سراڑہ میں یہ خیال ضرور پایا جاتا ہے کہ وہ قوم تناولی اور ڈھونڈ سے رشتہ رکھتے ہیں۔

اس ضلع میں ان کی آبادی ۳۳۲ نفوس کی ہے۔ اور وہ علاقہ بوئی مابین سلسلہ کوہ ٹھنڈیانی اور دریائے کنہار کے رہتے ہیں۔ یہ بہت غریب اور محنتی لوگ ہیں۔ اور کثیر الاولاد ہیں۔ ان میں کوئی تعلیم یافتہ دسر برآوردہ نہیں ہے۔

سراڑہ

اس قوم میں چودہ شاخ معروف ہیں۔ سعدوال۔ ادہالی۔ عارفال۔ شیرال۔ بوٹیال۔ گوبندیال

دمیال ۔ بھرمال ۔ تترال ۔ ستیال ۔ فتحیال ۔ لشکریال ۔ سوجوال ۔ پتوال

قوم ڈھونڈ کے چند مواضعات

اقتباس از صورت دیہی بندوبست ۱۸۷۲ء

بکوٹ ۔ اس کی آبادی سات گاؤں پر مشتمل ہے ۔ بکوٹ خاص ۔ مورکنڈی ۔ باندھی ۔ چکلی ۔ کہرسنڈ ۔ لکھن کلاں ۔ لکھن خورد ۔ عرصہ سولہ پشت ہوا (قریباً چار سو سال ۔ ش ب) کہ قوم ڈھونڈ کا مورث اعلیٰ بہلو خان کشمیر کی طرف سے اس ملک میں آیا ۔ اور بیروٹ میں آکر آباد ہوا ۔ اس سے تین پشت بعد اس کی اولاد نے جنگل کاٹ کر بکوٹ خاص آباد کیا ۔۔۔۔ گوجر ، جنجوعہ (جولاہا) بھی آباد ہیں ۔

لورا

عہد اسلام میں شامل دناہ تھا اور ڈھونڈ قوم کا گاؤں تھا ۔

دناہ

عہد اسلام میں ڈھونڈ قوم نے آباد کیا ۔ پہاڑ کی چوٹی (ڈنہ) پر واقع ہونے کی وجہ سے ڈنہ کے نام پر موسوم تھا ۔ غلط العام سے دناہ ہوگیا ۔

کوک منگ

سراڑہ قوم نے آباد کیا ۔ ڈھونڈ بھی آباد ہیں ۔

قوم گدون

مصنف تواریخ خورشید جہاں ۱۳۱۱ھ جناب شیر محمد خان صاحب مرحوم گنڈاپور میں اس قوم کا شجرہ نسب وحالات (ص ۲۰۴) درج ذیل ہیں :-

- گدون
  - سالار
    - مت خوازی
    - اتوزئی
      - عیسٰی خیل
      - عبدالرحیم زئی
        - علی شیر خیل
        - قلندر خیل
        - علی خیل
      - محمد خیل
    - سلیمان زئی
  - منصور
    - متے زئی
      - عمر زئی
      - الدوزئی
    - دولہ زئی
      - یعقوب زئی
      - حسن زئی
      - شامان زئی
      - بہلول زئی
    - خدر زئی

- خدر زئی
  - شیاب زئی
  - ماما زئی
  - خلیل زئی
  - امرا زئی
- قلندر خیل
  - دولت خیل
  - ادو خیل
- عمر زئی
  - گوڑ خیل
  - قمر خیل
  - یعقوب خیل
  - عیسٰی خیل
- الدوزئی
  - ولی خیل
  - قاسم خیل
  - شاہی خیل
  - اللہ داد خیل
  - خواجہ رستم نود
  - ادین زئی

یہ قوم اپنے آپ کو کاکڑ کی شاخ سے شمار کرتے ہیں لیکن اس بات کی سند افغانوں کی قدیم کتب انساب میں نہیں ملتی ۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ساہنگ بن پنی کے علی خیل اور موسیٰ خیل کے علاوہ بھی دو پسر تھے جو بسبب نزاع اپنی قوم سے الگ ہو کر کچھ مدت کوہ سفید میں رہے پھر وہاں سے اٹھ کر کوہستان

- پنی
  - ساہنگ
    - موسیٰ خیل
    - علی خیل

نواحی چھچھ و ہزارہ میں آباد ہوئے ۔ چونکہ لوگ پنی و کاکڑ کو ایک قوم خیال کرتے ہیں اس خیال سے گدون بھی کاکڑ کی ایک شاخ سمجھی گئی ۔ (اس بیان کی تصدیق اقوام پنی و غوغشتی کے وطن کے نزدیک قوم جدون کا پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قوم پنی کی شاخ سے ہیں) اس قوم کی دو بڑی شاخیں ہیں ۔ سالار و منصور ۔ اکثر جدون و گدون خصوصاً سالار ہزارہ میں دریائے دوڑ کے کنارہ سے علاقہ رش تک آباد ہیں ۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں قوم دلازاک مالک علاقہ پشاور و ہزارہ کی بربادی بوجہ بغاوت سے جدون اس ملک میں قابض ہوئے ۔

قوم جدون ہزارہ میں

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق

یہ قوم جدون جو اپنے آپ کو گدون بھی کہتے ہیں (گ ات ۔ ج کا بدل ہے) پٹھان مشہور ہیں ۔ مورث اعلیٰ اپنا اشرف خان کو کہتے ہیں ۔ اور اس کے دو پسر ایک سید خان دوسرا منصور خان ہوئے جن کے نام پر اس قوم کے

دوتپہ سلار، منصور مشہور ہیں ۔ اور حسن خان پوتا منصور خان کا ہوا ہے اس کی اولاد بنام حسن زئی مشہور ہے ۔ علاقہ رجوعیہ میں سلار اور علاقہ دھمتوڑ و علاقہ مانگل میں منصور آباد و قابض ہیں یہ قوم اپنی آمد کا وقت اس ضلع میں صاف نہیں بتا سکتے ۔ مگر اور اقوام گرد و جوار کے آمد و دخل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آمد تھوڑے روز قبل از احمد شاہ درانی کے ہوئی جس وقت کہ سلطنت چغتائی میں بعد انتقال عالمگیر بادشاہ کے سترھویں صدی عیسوی میں ضعف آیا ۔ اور پہلے یہ لوگ بطور کاشتکاران کے علاقہ بگڑہ میں بہ سبب تنگی زمین اور کثرت اولاد کے پار دریائے سندھ سے از موضع گندف بیک کے اس ضلع میں داخل ہوئے ۔ قوم ترک مانکرائے ۔ دلازاک سرائے صالح والے سے واسطے کاشت کے اراضی لے کر دس بارہ برس گزارہ کرتے رہے اور ۵۰۰، ۶۰۰ آدمی سے زیادہ یہ لوگ علاقہ پکھلی میں قوم صواتھی کے پاس بھی جا کر رہے ۔ اور ان سے اراضی موضع عنایت آباد و گیروال میں لے کر کاشت کرتے رہے ۔ پھر بعد تیس برس کے بہت سے لوگ اور پار سے آ گئے اور علاقہ رجوعیہ جو اکثر قوم کرڑال کی وراثت تھا اور دھمتوڑ و مانگل قوم ترک کی ملکیت تھا ۔ بعد لڑائی ہائے متواتر کے غلبہ و زور سے لے لیا ۔ اور ان ہر سہ علاقہ میں دفتر اپنا قائم کر دیا ۔ اور ویش یعنی تقسیم جاری کر دی اور علاقہ بگڑہ میں بھی گو کہ زور ان کا زیادہ ہو گیا ۔ مگر وہ دفتر نہیں قرار پایا ۔ بیع و رہن سے قطعات متفرق قوم ترک و دلازاک سے یہ لوگ لے کر قابض ہوتے رہے ۔ یہاں تک کہ اخیر میں بہت تھوڑے مواضعات مالکان کے رہن و بیع اس قوم سے بچے تھے ۔ پھر اصل مالکان قوم ترک و دلازاک سے کہ ضعف اور بے دخلی کے سبب کل پر قبضہ اس قوم جدون کا ہو گیا ۔

اور زیادہ تفصیل اپنے حال کی وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وقت آمد ہماری قوم کے کرڑالوں کے ملک میں مسمیان مستجاب خان اور عزیز خان کرڑال حاکم اور وارث اپنے ملک کے تھے ۔ اور تنول کے ملک میں صاحب خان و بہادر خان تنولی حکومت کرتے تھے ۔ اور ان دونوں قوموں اور علاقوں کی حد خاص نالہ دوڑ کی تھی ۔ نالہ دوڑ سے بطرف شمال و غرب جس جگہ اب موضع دھمتوڑ و بانڈہ بازار و ننگرہ، کالو میرا وغیرہ آباد ہیں ۔ یہ جگہ زیر حکومت اور وراثت تنولیوں کی تھی ۔ اور دوڑ سے بجانب شرق و جنوب جہاں اب موضع جسوال، گنیال، بانڈی عطائی خان و حویلیاں و سلطان پور و جنبہ وغیرہ آباد ہے ۔ یہ سب جگہ ماتحت کرڑالوں کے تھی ۔ اور گو کہ حکومت مقرر تھی لیکن اس وقت ملک بہت غیر آباد تھا ۔ خصوصاً حد کے قریب جہاں اب دیہات علاقہ دھمتوڑ رجوعیہ و نوشہرہ کے آباد ہیں ۔ اسی اثناء میں قوم تنولی اور کرڑال کے درمیان صورت دشمنی کی پیدا ہوئی اور وجہ یہ تھی کہ تنولیوں کی طرف سے واسطے قلبہ رانی زمین

زیر حکومت کرڑالوں کے اس موضع پر جہاں اب موضع جنبہ آباد ہے ہل بھیجے گئے ۔ قوم کرڑال کی جانب سے تنولیوں کی مخالفت کی گئی مگر کچھ اثر نہ ہوا ۔ آخر دونوں طرف سے جنگ کی تیاری ہوئی چونکہ اس وقت تنولی غالب تھے اور کرڑالوں کا حال نرم تھا اس لئے سردار کرڑالوں نے فوج صواتھی سے مدد چاہی اور بہ صلاح باہمی کل آبادی قوم جدون کے جو نووارد تھے واسطے کمک کرڑالوں کے روانہ کئے گئے ۔ اور کرڑالوں کی طرف سے وہ جگہ یہاں اب موضع جسوال و کہال (رجوعیہ اور دھمتوڑ کے درمیان) آباد ہیں ملنے کا وعدہ ہوا ۔..... راستہ میں رات موضع دھمتوڑ میں ہوئی ۔ ان سب آدمیوں نے اتفاق سے اس جگہ ہی رہائش پسند کی ۔ اور موقع آبادی موضع دھمتوڑ مل باہمی کی ۔ قوم تنولی اور کرڑال کو یہ امر ناگوار گزرا کہ ایک تیسری قوم بیچ میں آ گئی اور اپنا دخل کرنا شروع کیا ۔ ان دونوں قوموں نے بہ سبب اپنے اپنے خوف کے آپس میں اتفاق کر لیا ۔ ان دنوں میں نصف میرا علاقہ دھمتوڑ کے کچھ آدمی قوم ترک کے بھی موجود تھے ۔ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے ۔ اور ہر سہ قوم موجودہ نے اتفاق سے جدون کے اوپر فوج کشی کی اور لڑائی ہوتے ہوتے صاحب خان تنولی مارا گیا ۔ اور قوم تنولی و کرڑال کو شکست ہوئی ۔ ہم قوم جدون غالب ہوئے اور جدون نے دھمتوڑ کو آباد کیا ۔ اور اپنی قوم کے باقی لوگوں کو جو گندف وغیرہ میں آباد تھے پیغام بھیجا کہ اور بھی آدمی بھیجو ۔ ہماری قوم کے اس طرف سے بہت آدمی آ گئے ۔ اور رفتہ رفتہ ہماری قوم نے زیادہ ملکیت پر قبضہ کرنا شروع کیا اور ہر چند کہ قوم تنولی اور کرڑال نے بہت لڑائیاں کیں ۔ مگر ہماری قوم کا غلبہ روز بروز ہوتا گیا ۔ حتیٰ کہ کل علاقہ دھمتوڑ ۔ نواں شہر و مانگل و رجوعیہ ہماری قوم کے قبضہ میں آ گیا ۔ چونکہ ملک ویران تھا ۔ ہمارے بزرگوں نے بہت دیہات آباد کئے ۔ اور ہر سہ تپہ کے لوگ ابتداء میں دھمتوڑ کے اندر بستے رہے جس قدر ہماری وراثت کے دیہات ہیں ان میں صرف مانگل پہلے کا آباد تھا ۔ اور اس میں قوم تنولی رہتی تھی ۔ اور کوئی گاؤں آباد نہ تھا ۔ اس گاؤں سے قوم تنولی کو صاف نکال دیا گیا اور خود قابض ہو گئے اب ان تنولیوں کا کوئی شخص ہمارے دیہات وراثت میں آباد نہیں ہے ۔ اور جب ہماری قوم واسطے کمک کرڑال کے گئی تھی تو سید مرتضیٰ شاہ بھی ہمارے بزرگان کے ہمراہ تھا ۔ اور برابر لڑائی میں شامل رہا ۔ اور ملک کے قبضہ کرنے میں شریک ہوا جب ملک لے لیا اور آبادی بھی کچھ ہو گئی اور ہماری قوم کے لوگ پار سے بھی بہت سے رفتہ رفتہ آ گئے ۔ تو حاجت تقسیم ملک کی پڑی اور سب نے شامل ہو کر تقسیم اس طرح سے کی کہ اول چہارم ہمہ وراثت اولاد شاہ مرتضیٰ کو دے دی جائے ۔ پس چہارم حصہ میں ایک تو موضع چکی زمین پیدائش کی جو گرد و نواح میر پور و دھمتوڑ کے ہے دیا گیا اور باقی اس حصہ کے اندر میں ۔ دیہات متفرق ہیں بہ زمین سیری کی جو اولاد شاہ مرتضیٰ کو پسند ہوئی یا اس وقت بہ صلاح قوم مقرر

ہو گئی دے دی گئی۔ کہ وہ اب تک معلوم اور معین ہے اور بعد اس ہر سہ تپہ مذکور نے آپس میں تقسیم وراثت کر لی۔ اگرچہ بموجب شجرہ نسب اور حصص جدی کے تپہ حسن زئی کا حصہ قوم منصور کے نصف حصہ سے ششم حصہ ہوتا تھا یعنی کل سے بارھواں مگر اس وقت بلالحاظ حصہ جدی کے کل وراثت تین حصہ کی گئی کیونکہ حسن زیوں کے آدمی زیادہ تھے۔ اور کل وراثت کے تین حصہ بلالحاظ حصہ جدی کے کی گئی جو حسب ذیل ہے

دیہات علاقہ رجوعیہ	دیہات علاقہ دھمتوڑ معہ نصف حصہ دیہات مانگل	دیہات نواں شہر معہ نصف دیہات مانگل

اس کے بعد قرعہ اندازی کی گئی تو ۱ سلاروں کے حصہ میں ۲ حسن زیوں کے ۳ منصوروں کے حصہ میں آیا۔ اس کے بعد ہر تپہ اپنے علاقہ میں جا کر آباد ہو گیا۔ اور روز بروز آبادی زیادہ کرتے رہے اور قبل از عملداری سکھاں کے جہاں تک ہم کو یاد ہے حال مالگذاری سرکار کا اس طرح ہے کہ پادشاہت چغتائی میں حاکم قلعہ اٹک میں رہا کرتا تھا اور دو ہزار روپیہ رائج الوقت کل جدون پر مقرر تھا۔ یہ روپیہ قلعہ مذکور میں حاکم کی خدمت میں پہنچا دیا جایا کرتا تھا۔ اور یہ نہیں کہ ہر سال دیا جاتا تھا بلکہ دو دو چار چار سال کا ایک ہی دفعہ دے دیا جاتا تھا۔ اور بعد اس کے جب حکومت دُرانیوں کی ہوئی تب سے یہی دو ہزار روپیہ کل جدون دیتے تھے اور جس وقت کوئی صوبہ (حاکم صوبہ کو اس وقت صوبہ کہا جاتا تھا) ولایت سے کشمیر جاتا تھا۔ وہاں سے واپس ہو کر ولایت (یعنی کابل۔ ش ب) آتا تھا۔ وہ وصول کر لیتا تھا۔ اور اسی دو ہزار روپیہ کا ایک ایک ثلث ہر ایک تپہ بابت اپنے حصہ کے ادا کیا کرتا تھا۔

حال عملداری سکھاں:۔ ہمارے علاقہ میں سکھوں کا دخل اس طرح سے ہوا کہ سمت ۱۸۷۶ بکرمی (یہ واقعہ سنہ ۱۸۲۰ء کا ہے) میں سردار ہری سنگھ کشمیر سے آتا تھا۔ اور اس ملک کے راستہ سے لاہور کی طرف جانا چاہتا تھا۔ قوم جدون مانگل میں جمع ہوئی (اس وقت کشمیر کا راستہ مانگل اور دانہ کے درمیان نالہ سے ہو کر گوجری حبیب اللہ کے نالہ موسوم بہ دوگہ میں جا نکلتا تھا اور اسی جگہ سے جدونوں کے علاقہ کی حد شروع ہوتی تھی۔ ش ب) اور ارادہ لوٹنے کا کیا۔ اور اس نے نکل جانے کے واسطے کہا۔ مگر جدون نے راہ نہ دیا۔ بلکہ **پشمینہ** کا محصول مانگا۔ اس نے تنگ ہو کر جنگ کی، اور مانگل کو مارا (یعنی فتح کر لیا۔ ش ب) قوم جدون نے شکست کھائی اور سردار ہری سنگھ نے بعد فتح یابی کے کل جدونوں کے ملک سے پانچ روپیہ فی گھر تحصیل کیا اور اس کے بعد حکومت سکھوں کی ہمارے ملک پر بھی ہو گئی۔ اور بعدہٗ نواں شہر میں قلعہ مقرر ہوا۔ اور ہم واسطے حفاظت اپنی کے سرکار سکھاں کے ساتھ ان کی فوج سے بہت جنگ وجدال کرتے رہے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار رعیت ہو گئے۔ اور سردار مہاں سنگھ حاکم ہزارہ مقرر ہوا۔ اور سکھاں

نے معاملہ بطریق مختلف لینا شروع کیا۔ یعنی ابتدا میں تو کنکوت کر کے حصے نکالتے اور نصف غلہ لیتے تھے۔ اور غلہ پر اکتفا نہ تھا۔ نرخ گراں مقرر کر کے غلہ کی قیمت زمینداران سے نقد لے لیتے تھے۔ بعدہٗ بحساب دس روپیہ فی ہل کے معاملہ لینا شروع کیا۔ اور علاوہ اس جمع مقررہ دس روپیہ فی ہل کے سوایا ہر ایک گاؤں سے وصول ہوتا تھا۔ اور سوایا اس کو کہتے تھے کہ جس قدر روپیہ گاؤں کا ایک دفعہ مشخص ہو چکا علاوہ اس کے چہارم اور بھی لیتا تھا اور رسم بعہد سکھاں ہمارے علاقہ میں جاری نہیں ہوئی۔ جیسا کہ بکرے شادی کے۔ مگر یہ بھی دستور تھا کہ جو کوئی چیز اپنی فروخت کرنی ہو۔ وہ زیادہ قیمت پر حوالہ زمیندار دولت مند کے کر دیتے تھے۔ اور قطع نظر اس کے دولت مند آدمی کو بلا قصور لوٹ لیتے تھے۔ اور آسامی نادار و مفرور کا روپیہ اُس کے رشتہ داروں سے جس سے ہاتھ آجاوے وصول کرتے تھے۔ پس ان ظلموں سے ملک ویران ہونے لگا۔ اور وارث لوگ بے دخل ہو کر جا بجا چلے گئے۔ گو کہ عملداری سکھاں میں ہماری وراثت کے اندر کوئی گاؤں صاف ویران نہیں ہوا مگر آبادی کم ہو گئی تھی اور بہت زمین غیر آباد رہنے لگی۔ اور جب کہ انہوں نے خود ہر ایک قابض سے غلہ یا روپیہ براہ راست لینا شروع کیا تو اکثر مالک اور مزارعہ بالکل جاتے رہے۔

مولوی نواب خان جدون منصور ایک اہل علم اور مشہور آدمی گزرا ہے جو کوٹ نجیب اللہ میں سکونت رکھتا تھا۔ اس نے ایک بیاض میں جس میں ذاتی حالات تحریر کئے ہیں قوم جدون کے متعلق بھی ایک مختصر سا نوٹ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:۔

"جدون سلطان محمود غزنوی کے ساتھ سنہ ۳۹۲ھ (۱۰۰۱ء) آئے اور سلطان موصوف نے اُن کو علاقہ مہابن میں آباد کیا۔ تھوڑے ایام قبل احمد شاہ ابدالی یعنی سنہ ۱۷۰۷ء میں جب بعد انتقال عالمگیر بادشاہ سلطنت مغلیہ میں ضعف آیا تو تین تپہ سالار منصور حسن زئی کے چھ سو کمر بند جوانوں نے گندف سے آ کر دھمتوڑ علاقہ رُش پر حملہ کیا۔ اور رجوعیہ (کرڑالوں کا) اور نواں شہر و کھوکھر (تنولیوں کا) پر قبضہ کر لیا اور دھمتوڑ کو ریاست کی جگہ بنایا۔ بعد میں جدون ہر سہ تپہ نے اس علاقہ کو اس طرح تقسیم کیا۔

تمام علاقہ رجوعیہ	تمام علاقہ دھمتوڑ	تمام علاقہ نواں شہر	تمام علاقہ مانگل
سالار	حسن زئی	منصور	

حسن زئی بحصہ برابر۔"

راورٹی نے اپنی تاریخ میں تحریر کیا ہے کہ جدون پنی کی اولاد سے ہیں دریائے سندھ کے مغرب میں آباد ہیں (مہابن میں) صافی افغان، پنی کے ایک دوسرے لڑکے کی اولاد سے ہیں لہٰذا یہ جدون کے بھائی ہیں۔

بابر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ جب وہ پشاور کے علاقہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں تھا تو دلازاک ملکوں نے درخواست گزاری کہ ان کی قوم کے لوگوں کے پاس جو میدان میں تھے کافی غلہ تھا۔ لیکن وہ اب وہاں سے نکالے گئے ہیں اور ان کی موجودہ زمینیں جو مشرق میں کوہستان دھرم توڑ (حال دھمتوڑ) میں ہیں جدونوں کو دی جا سکتی ہیں۔ گویا اس وقت جدون ہزارہ میں موجود تھے۔

کیفیت ملک آورش بموجب تاریخ مہتاب سنگھ

"جدون ہرستہ تپہ۔ سالار، منصور اور حسن زئی علاقہ ملک یوسف زئی اس پار سندھ سے اس ملک میں آئے اور ملک رجوعیہ، دھمتوڑ، نواں شہر اور مانگل پر قبضہ کر لیا۔ سب افغان مساوی تھے کوئی خان یا افسر نہ تھا۔ جب کبھی صواتی یا تنولی اُن کے ملک پر حملہ آور ہوتے تو سب قوم جرگہ کے اتفاق سے جمع ہو کر مقابلہ کرتے۔ کڑال خود کمزور تھے اور ان افغانوں سے موافقت رکھتے تھے جب کبھی ناظم کشمیر اس راستے سے گزرتا تو کچھ نذرانہ از قسم اسپ، باز و چرغ اور کچھ نقد دے کر اپنے علاقہ سے گزار دیتے۔ یہ سب کام جرگہ قومی کے اتفاق سے انجام پذیر ہوتا اور کوئی بہت مشکل کام درپیش ہوتا تو دو دو یا چار چار افراد سفید ریش تجربہ کار ہر تپہ سے جمع ہو کر عقدہ کشائی کرتے جب کبھی دربار شاہی میں سوال و جواب کی ضرورت پیش آتی تو تپہ حسن زئی (ساکن دھمتوڑ) سے ایک شخص کے سر پر قوم کی خانی کی دستار بندی کر دیتے۔ اس خان کی نسل میں خانی موروثی ہو جاتی۔ چنانچہ سکھوں کے دورِ حکومت میں برخوردار خان دھمتوڑ ہرستہ تپہ کا خان تھا اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عنایت اللہ خان خان ہوا۔ ہرستہ تپہ اس کے صلاح و مشورہ کے پابند ہوتے تھے۔"

جدون

اس قوم کی تین شاخیں ہیں جو اس ضلع میں آباد ہیں۔ منصور، سالار، حسن زئی۔ سالار شاخ صرف سردار کے خاندان یا معاونین سے ہے۔ باقی اولس اور برادری ہے۔ ان کی قدیمی زبان اگرچہ پشتو تھی لیکن اب عموماً ہندکو بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب اُن کی مادری زبان ہندکو ہو گئی ہے۔ بہت ہی کم اشخاص ہوں گے جو پشتو بولتے ہیں۔ ہماری قوم احمد شاہ کے زمانہ میں گندف سے آئی اور طوائف الملوکی کی حالت میں اس ضلع کو پایا پہلے پہل کمزور قوم دلازاک اور ترک سے میدان اور اورش پر قابض ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ دلازاکوں کو پامال کر کے بگڑہ تک کے علاقہ کا قبضہ لے لیا۔

دھمتوڑ

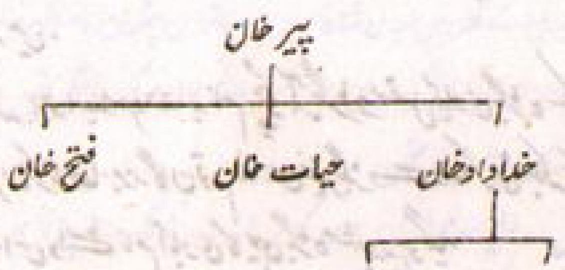
جدون قوم کا مرکزی گاؤں ہے۔ صورت دیہی بندوبست ۱۸۶۴ء کے مطابق جدون نے تقریباً پندرہ

عیسوی کے لگ بھگ یہ ملک تنولی اور کڑال اقوام نے لیا اور آباد کیا۔ پہلے زمانہ میں (حکومت ترک) یہ گاؤں آباد ہو چکا تھا۔ اور اس کا نام دھمدھوڑ تھا۔

جدون قوم کے جاگیردار

جاگیردار مانگل۔ پیر خان ولد قاسم خان عمر ۷۰ سال۔ وفات ۱۲ ستمبر ۱۸۶۳ء جاگیر۔ مانگل، ککوکھر (تحصیل ایبٹ آباد) پانڈھی، ڈھونڈاں، نور بیرتمن، مواہ کلاں، ترمادی (میرا کٹھیال) میرا کٹوال۔ پانڈھ صاحب خان کل ۵۵۰/۔ روپیہ۔ یہ جاگیر ۲ جیسا کہ ۱۸۵۱ء کو سردار ہری سنگھ نے مظفر آباد کی سڑک کی حفاظت کے لئے ۱۸۲۲ء پیر خان کو عطا کی۔ پیر خان کی وفات کے وقت اس کے تین لڑکے موجود تھے خداداد خان عمر ۳۵ سال، حیات عمر ۳۰ سال، فتح عمر ۲۰ سال۔ یہ پرانا خاندان جدون خاندان کی بڑی شاخ سے ہیں۔ خداداد خان ۲۰ فروری ۱۸۷۶ء میں فوت ہوا۔ جاگیر اس کے بڑے لڑکے شاہداد خان کو ملی۔

شجرہ نسب

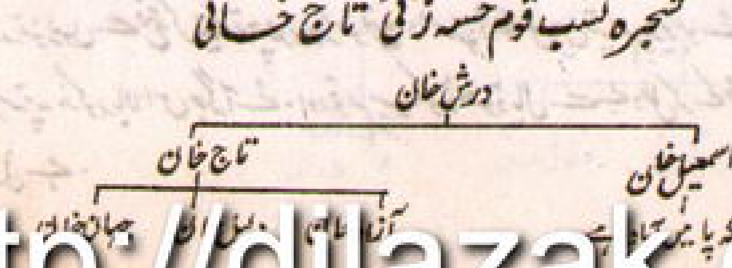


عہد برطانیہ میں پیر خان نے پہاڑی دروں کی ناکہ بندی کی جب کہ سکھ فوج پکھلی سے ادھر آئی۔ پیر خان کی شجاعت و وفاداری کے صلہ میں میجر ایبٹ نے اس کو تاحین حیات ۵۰ھ روپیہ ۱۲۰۰ روپیہ کی دوامی جاگیر عطا کی۔

جدونوں کے چند مواضعات کے حالات

۱۔ گوھی شیریاں اور بیرنقال کو، عہد اسلام میں تقریباً سو سال ہوتے ہیں (یعنی ۱۸۶۲ء) میں جدون حسن زئی تاج خانی نے آباد کیا۔ ۲۔ دُرش خیل۔ قوم حسنہ زئی (حسن زئی) تاج خانی کے مورث اعلیٰ دُرش خان کے نام پر آباد ہوا۔

شجرہ نسب قوم حسنہ زئی تاج خانی



۳۔ قاضی میرا (بگڑہ) کسی قاضی کے اس میرے پر مارے جانے سے قاضی میرا تھا۔ پھر گاؤں کا نام بھی یہی ہوا قوم حسہ زئی۔ پیروخیل و پنوخیل۔ مالک ہے۔

۴۔ زرتہ بٹہ (بگڑہ) قوم حسہ زئی۔ پیروخیل و پنوخیل مالک ہیں۔ جائے آبادی سرخ مٹی تھی لہذا یہ نام ہوا۔

۵۔ ڈھوک طورہ (بگڑہ) قوم حسہ زئی۔ پیروخیل مالک ہیں۔

۶۔ بگڑہ۔ پہلے یہ رقبہ موضع بگڑہ۔ اکثر ویران پڑا ہوا تھا اور کچھ زمین مزروعہ بھی تھی مگر قبضۂ ملکیت اُس مزروعہ زمین پر قوم ترک و دلازاک کا تھا۔ عملداری مسلماناں میں جدون قوم کے بزرگ بذریعہ سلسلۂ ملازمت گندف دپار دریائے سندھ علاقہ جدون مہابن) کی طرف سے آکر اس نواح میں ملازم رہے۔ اور کاشتکاری بھی بطور مزارعان ماتحت قوم ترک و دلازاک کرتے رہے۔ آخر بہ سبب عدم گزارہ کچھ تو واپس گندف دریا پار چلے گئے اور چند کسان منجملہ تپہ حسہ زئی جو دیہات بگڑہ، دھمتوڑ و مانگل کے ہیں۔ یہیں آباد رہے۔ چند مدت کے بعد قوم جدون کے بزرگان۔ قوم منصور و سالار نے اتفاق کرکے بہ ارادۂ ملک گیری اس طرف کا رخ کیا اور قوم ترک و دلازاک سے لڑائی کرکے اور اُن کو مغلوب کرکے دھمتوڑ و مانگل کے دیہات پر قبضہ پایا۔ اور رجوعیہ کی بھی ملکیت حاصل کر لی۔ اس وقت حسہ زئی کے تپہ نے بگڑہ، دھمتوڑ و مانگل پر دخل پالیا۔ اور منصور علاقہ نواں شہر میں رہے اور سالار رجوعیہ میں۔

وجہ تسمیہ۔ ایک چوآ (چشمہ) جو اب معروف بہ نام چوآ بگرط و متصل آبادی بگڑہ کے واقع ہے۔ قبل آبادی اس چوآ پر مستی بگڑہ فقیر رہا کرتا تھا۔ بزرگان قوم نے اس فقیر بگڑہ سے دعا کرائی بلکہ بنڈ (پتھر) بنیاد آبادی اس کے ہاتھ سے رکھوایا۔ اس واسطے نام آبادی کا یہی بگڑہ مشہور ہو گیا۔

آبادی شورگ (نزد بگڑہ) باعتبار نام زرفتہ جس میں یہ آبادی واقعہ ہے نامزد ہے۔

شیخن باندھی۔ بنیاد از دست میاں سرور شیخ اولاد حم بابا میرے والہ علاقہ پشاور سے جدونوں کے بزرگوں نے کرائی اس بزرگ کے یہ مالکان معتقد تھے۔

نواں شہر۔ عہد اسلام میں قبل از تصرف جدوناں، ڈھوڈیال داخلی نواں شہر میں قوم ہب قابض و متصرف تھی۔ اور دیگر دیہات دھمتوڑ وغیرہ میں قوم ترک و دلیل وراثت تھی۔ جب جدوناں ہمراہ تپہ۔ سالار منصور حسہ زئی نے پار دریائے سندھ ملک یاغستان موضع گندپ وغیرہ سے آکر بزور شمشیر و قوت اپنی قوم کے یہ ملک ترکوں اور تنولیوں سے فتح کر لیا۔ تو چند روز موضع دھمتوڑ خاص میں قیام پذیر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ بعد چند اشخاص ہمراہ تپہ مذکور بالا اس جگہ آئے۔ اور قوم ہب کو ڈھوڈیال سے بے دخل کرکے خود بود و باش رکھنے لگے۔ آبادی پرانی ہے۔

وجہ تسمیہ:۔ آبادی ڈھوڈیال۔ مسمی ڈھوڈا قوم ہب نے کرائی اس کے نام پر مشہور ہے۔

رجوعیہ ۔ حال آبادی اس جگہ کا یہ لوگ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ کہ عملداری مسلماناں میں قوم جدون نے یہ علاقہ رجوعیہ کا قوم کڑ ڑال و تنولی سے جنگ کرکے حاصل کیا۔ اور قوم سالار کے حصہ میں آیا۔ انہوں نے جس جگہ آباد کیا۔ اب بھی وہاں آباد ہے۔ اس کی آبادی دن بدن بڑھتی رہی اور اس علاقہ میں سب سے بڑا موضع ہے یہ کبھی بھی غیر آباد نہیں ہوا۔

وجہ تسمیہ:۔ کڑ ڑالوں کے وقت سے اس آبادی کا نام رجوعیہ مشہور ہے۔ جب پٹھانوں نے یہ جگہ آباد کی تو اس وقت سے پہلے نام پر ہی مشہور ہو گیا۔

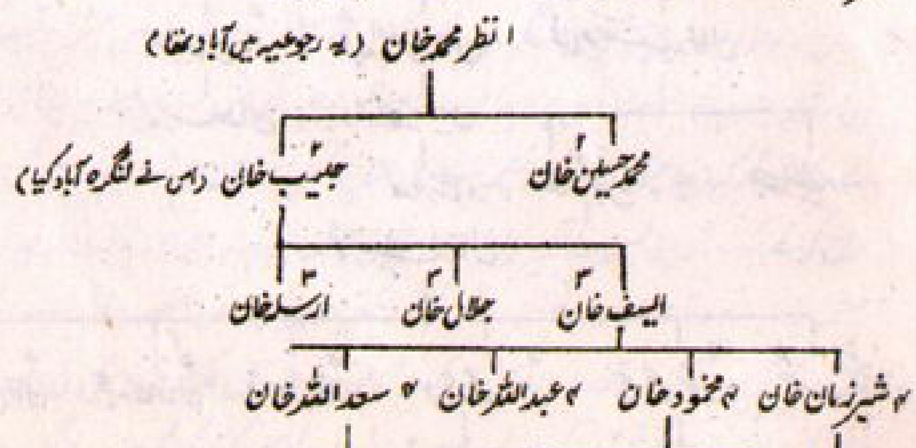
موضع لنگرہ (برلب دریائے دوڑ)

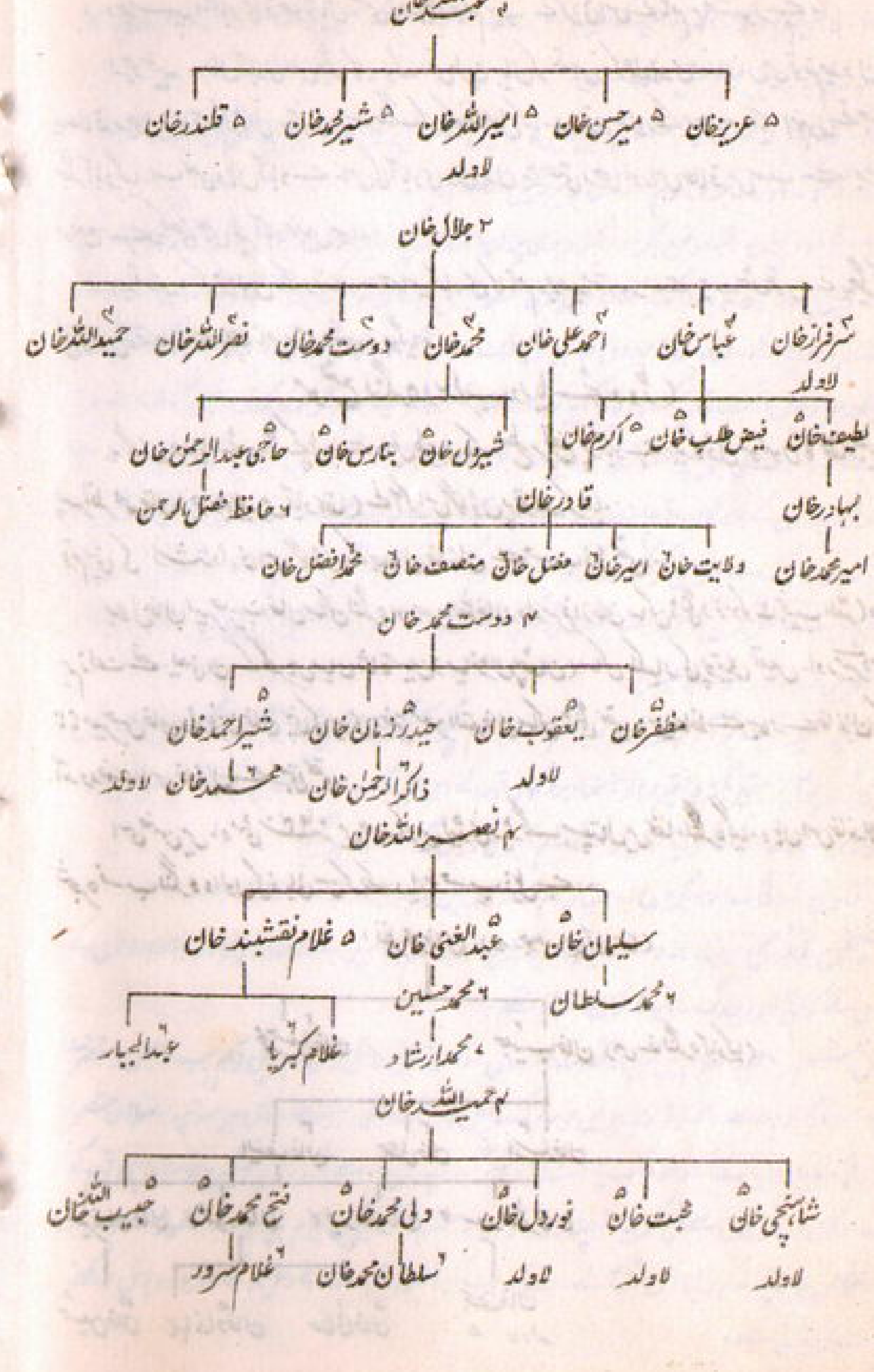
یہ گاؤں دریائے دوڑ کے پل سے دائیں طرف ایک سطح مرتفع پر آباد ہے۔ یہ گاؤں تنولیوں کا تھا حبیب خان پسر نظر محمد خان (جو رجوعیہ میں آباد تھا) نے آکر اس گاؤں پر قبضہ کر لیا۔

قوم بینی کی رشتہ داری اس گاؤں کے جدون خاندان سے حسب ذیل تھی:۔

جلال خان پسر حبیب خان ساکن لنگرہ اور معز اللہ خان ولد سرفراز خان ساکن ڈھگی (نزد کوٹ نجیب اللہ) دونوں ہم زلف تھے۔ یعنی ان کے گھر میں میاں شاہ حسین (میانزاں پٹھان) ساکن ملکیار کی پوتیاں تھیں۔ اور میرے (مؤلف) نانا میر حسن خان ولد عزن خان بینی کی بیوی دختر معز اللہ خان ساکن ڈھگی تھی۔ اس لحاظ سے ہمارے خاندان کی آمد و رفت اِس خاندان سے رہتی تھی۔

اسی ضمن میں ماہ مئی سنہ ۱۹۶۸ء میں جب کریں لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں تھا، لنگرہ گیا۔ وہاں اس خاندان کا شجرہ نسب لنگرہ والوں کی زبانی سن کر لکھ دیا۔ جو حسب ذیل ہے:۔





گوہر الرحمن خان جدون

زمانہ حال کی مشہور شخصیت قوم جدون میں خان گوہر الرحمن خان مرحوم کی تھی۔ آپ گمھاواں کے رہنے والے تھے۔ بعد میں ایبٹ آباد میں آکر سکونت اختیار کر لی۔ خاموش طبع و خوش اخلاق انسان تھے۔ وجیہہ شکل و صورت منکسر المزاج رکھتے تھے اپنی ذاتی ہمت اور محنت سے نام پیدا کیا۔ آپ ضلع ہزارہ میں مشہور پنڈی ہزارہ ٹرانسپورٹ کے سربراہ تھے۔ یہ ٹرانسپورٹ ۱۹۴۰-۴۱ء میں شروع ہوئی۔ جو بہت کامیاب ہے۔ پنڈی ہزارہ کے مسافر شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں۔ اس کی کامیابی کا راز تمام عملہ ٹرانسپورٹ کا لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک ہے۔ گوہر الرحمن خان کی وفات ۸ جنوری ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اُن کے جانشین اُن کے بڑے بیٹے محمد اقبال خان ہیں۔ آپ ۱۹۶۵ء کے انتخاب مغربی پاکستان اسمبلی میں اس علاقہ سے ممبر چنے گئے۔ اور پارلیمنٹری سکرٹری مارچ ۱۹۶۹ء (مارشل لاء لگنے) تک رہے۔ آپ سے چھوٹے دو بھائی محمد فرید خان اور امان اللہ خان ہیں۔ دونوں نے امریکہ سے اعلیٰ انجینئری ڈگریاں حاصل کیں۔ امان اللہ خان تو واپس آگئے ہیں۔ لیکن محمد فرید خان ابھی (۱۹۶۹ء) میں وہاں ہی ہیں سب سے چھوٹے سعد اللہ خان ہیں۔

جامع مسجد الیاسی، واقع نواں شہر نزد ایبٹ آباد

یہ مسجد نواں شہر اور کاکول اکاڈمی کے درمیان چشمہ الیاسی (موسوم بہ بزرگ الیاس) پر تعمیر کی گئی اس کی مختصر تاریخ درج ذیل ہے:-

یہ چشمہ ایک پہاڑی کھوہ سے نمودار ہو کر ایک نالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے پانی سے نواں شہر کا ملحقہ میدان رش سیراب ہوتا ہے۔ اس چشمہ کا پانی صحت کے لحاظ سے بہت مفید ہے۔ ایبٹ آباد کے سیاح عام طور پر اس چشمہ کا پانی منگوا کر پیا کرتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں لوگوں کو اس چشمہ پر قبضہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تاکہ ہندو یا گورنمنٹ اس پر اپنا قبضہ نہ جمالیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے ایبٹ آباد روڈ پر فوجی ضرورت کے لئے قبضہ کیا جا چکا تھا۔ اس چشمہ سے ذرا اوپر کسی مسلمان عورت نے اپنی گرہ سے تین سو روپیہ خرچ کر کے ایک چھوٹا مسجد نما تعمیر کرایا تاکہ مسلمان چشمہ پر نہا کر اس جگہ نماز ادا کر لیا کریں۔ کسی ہندو نے چشمہ پہ نہاتے وقت از راہ تمسخر یہ کہا کہ "دیکھو مسلمانوں نے یہ مسجد بنائی ہے جہاں پر شہر کے لوگ نماز ادا کیا کریں گے"۔ یہ بات نواں شہر کے ایک آدمی نے جو وہاں کھڑا تھا سن لی۔ اور اہالیان شہر کو غیرت دلائی کہ اب تو اس چشمہ پر ایک ایسی مسجد بنائی جائے جس کو دیکھ کر ہندو دنگ رہ جائیں۔ اور یہاں پر ہندوؤں کا قبضہ بھی نہ ہونے دیا جائے۔

چنانچہ نواں شہر اور اس کے مضافات کاکول، میرپور، شیخ البانڈی، دھمتوڑ، گھماواں اور ڈھیڈیال کے لوگوں نے ایک اجلاس میں شاندار جامع مسجد الیاسی کے بنانے کا منصوبہ بنایا اور اس مسجد کے لئے ۴۰ کنال پہاڑ وقف کر دیا۔ اور متفقہ ہمت اور کوشش سے پہاڑ کو ہتھوڑوں، بیلچوں اور کدالوں سے کاٹ کاٹ کر مسجد کے لئے جگہ ہموار کر دی گئی۔ اور تعمیر مسجد کے لئے الحاج مرزا غلام یوسف ہیڈ ماسٹر مڈل سکول نواں شہر کو اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی درخواست کی۔ کیونکہ اہالیانِ نواں شہر وغیرہ میں باہمی اختلافات تھے اور ان پر سب کو اعتماد تھا۔ مرزا صاحب موصوف نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر سکرٹری، خزانچی اور انتظامیہ ممبران کی کمیٹی بنا دی اور دس ارکان اُن پر نگران مقرر کر دئیے۔ چندہ محلہ وار شروع ہوا اور آمد و خرچ کے باقاعدہ حساب رکھنے کے لئے ہیڈ ماسٹر صاحب نے رجسٹروں میں اندراج شروع کر دیا ہر محلہ کا ممبر کردہ جمع شدہ رقم اُن کے پاس جمع کرواتا رہا۔ مختلف مدّات سے روپیہ حاصل ہوتا رہا۔ اہالیان نواں شہر نے جنگل سے مالکانہ حقوق کی جو رقم حاصل کی وہ بھی اسی مد میں جمع کرا دی۔ غرضیکہ تمام دیہات نے اس مسجد کے تعمیری خرچ میں دل کھول کر حصہ لیا۔ مسجد کی تعمیر کا کام مستری مغل دین ساکن ڈھیڈیال نے اپنے ذمہ لیا۔ مسجد کا نقشہ تعمیر اس کے دماغ میں ہی تھا۔ ۱۹۳۰ء سے کام شروع ہو کر مسجد کی زیریں منزل (غسل خانے، حوض، مسجد برائے نماز) تیار ہونے پر اندر سے سیڑھیوں کے ذریعہ اوپر کا حصہ ۱۹۴۱ء تک تیار ہو گیا۔ مسجد کی چھت گیری (CEILING) جاپان سے منگائی ہوئی چادروں سے کی گئی۔

چشمہ الیاسی سے تھوڑے فاصلہ پر چشمہ چنار کاری (چونا کاری) ہے۔ جہاں ایام قدیم سے چنار کا درخت ایک چشمہ پر کھڑا ہے جو سیاحوں کے لئے جاذبِ نظر ہے اس چشمہ کا پانی بھی نال ڈال کر مسجد کے صحن کے حوض میں برائے وضو لایا گیا ہے۔

مسجد الیاسی پر تقریباً ۱½ لاکھ روپیہ خرچ ہوا ۱۹۴۲ء سے بعد اہالیان نواں شہر نے اس مسجد کے ساتھ ایک دینی مدرسہ کا اجرا بھی کیا ہے۔ اس جامع مسجد کے خطیب مولوی عصمت اللہ صاحب مرحوم تھے۔ ان کے بعد قاضی محمد نواز صاحب فاضل دیوبند مقرر ہوئے۔ جو خطابت اور مدرسہ کے اعلیٰ مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۲ء تک مسجد کا حساب مرزا غلام یوسف صاحب کے پاس رہا۔ خان جلال خان، عبداللہ خان، فیض طلب بابا اور دیگر خوانین گھماواں ان کے معاون تھے۔

الحاج مرزا غلام یوسف صاحب ساکن موہڑہ غربی ضلع جہلم کے رہنے والے ہیں۔ آپ بحیثیت فارسی مدرس ۱۹۱۰ء میں ایم۔ بی مڈل سکول ہری پور میں آئے۔ چھنے کوٹ نجیب اللہ سکول۔ پھر نواں شہر اور آخرکار سرائے صالح مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے اور ۱۹۴۷ء میں سرائے صالح سے ریٹائر ہو کر اپنے وطن واپس گئے۔ آپ کے ہزاروں طالب علم ضلع ہزارہ میں میاں جوان کی تعلیم سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ — آخر میں جدون قوم کی ایک مشہور ہستی کا

ذکر کرتا ہوں۔ خانصاحب محمد اکرم خان جدون مرحوم ساکن نواں شہر ایک قابل، خوددار اور دیانتدار ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے ہیں۔ پُر رعب شخصیت تھی آپ کے بڑے بیٹے محمد علی خان صاحب جدون قابل پولیس افسر ہیں۔ دیانتداری اور حسن کارکردگی میں اپنے والد کے صحیح جانشین ہیں۔ ۱۹۶۹ء کے اوائل سے آزاد کشمیر کے انسپکٹر جنرل پولیس ہیں۔

قوم تنولی

تاریخ ہزارہ مرتبہ ۱۸۷۲ء کے مطابق یہ اپنے آپ کو مغل برلاس کہتے ہیں اور اپنی قوم کا سلسلہ نسب اپنے ایک مورثِ اعلیٰ امیر خان تک پہنچاتے ہیں۔ نواب محمد اکرم خان اس امیر خان کی پندرھویں پشت میں ہے۔ یہ امیر خان سوات کی ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔

ابٹسن اپنی کتاب "اقوام شمال مغربی سرحد" صفحہ ۲۰۵ پر لکھتا ہے "یہ مغل برلاس ہیں اور امیر خان کی اولاد ہیں۔ اپنا نام افغانستان کی کسی جگہ سے معنون بتلاتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ آرین ہیں۔ اور ہندوستانی نسل سے ہیں۔ یہ مہابن (علاقہ جدون۔ ضلع مردان) میں تھے۔ جہاں سے دو سو سال ہوئے ان کو یوسف زیوں نے نکال دیا (تاریخ مردم شماری ۱۸۵۳ء سے دو سو سال پہلے یعنی ۱۶۵۳ء ش ب) یہ اب میدان رش اور دریائے سندھ کے درمیان آباد ہیں"۔

امیر خان کے دو لڑکے تھے۔ ۱۔ پال خان ۲۔ ہندو خان۔ ان دونوں کی اولاد سے پلال اور ہندوال تنولی قوم کے دو ٹپے مشہور رہیں۔

تاریخ ہزارہ کے بیان کے مطابق یہ اپنی آمد کی صحیح سن و تاریخ نہیں بتلا سکتے۔ مگر شمار سلسلہ نسب و دیگر قرائن سے پایا جاتا ہے کہ قریب چار سو برس کا عرصہ ہوا کہ ان کا دخل و تصرف ملک تناول پر اول اول ہوا اور پھر بتدریج کل علاقہ پر قابض ہو گئے۔

ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء میں بھی ان کی مندرجہ بالا دو شاخوں کا ذکر ہے۔

۱۔ ہندوال۔ تناول بالا یعنی انب در بند میں رہتے ہیں۔

۲۔ پلال۔ یہ تناول پائیں میں رہتے ہیں جس میں بدہنک اور علاقہ گڑھیاں تحصیل مانسہرہ شامل ہے۔ مزید اس میں تحریر ہے کہ یہ قوم دریائے سندھ سے پار علاقہ مہابن سے آئی۔ جہاں سے یوسف زیوں نے ان کو ادھر دھکیل دیا تھا لیکن ان کا اصل وطن و نسب غیر یقینی ہے۔ ایک شجرہ نسب سے وہ جنجوعہ قوم سے ملتے ہیں لیکن وہ خود اپنے آپ کو مغل کہتے ہیں۔

موضع ڈیرہ، علاقہ تناول کی صورت دیہی بندوبست ۱۸۷۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں پہلے ہندو بُت پرست قوم کا دخل تھا۔ جب سلطان محمود غزنوی ہندوستان کی طرف گیا (گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں) تو اس کے لشکر کے ہمراہ ترک قوم (محمود غزنوی خود بھی ترک تھا۔ ش ب) آئی۔ تو انہوں نے بُت پرستوں

کو نکال کر اپنا دخل کر لیا۔ چند سے وہ قوم اس علاقہ کی حاکم و وارث رہی۔ عرصہ تخمیناً دو سو بیس سال کا ہوتا ہے (یعنی سترھویں صدی کے نصف اول میں۔ ش ب) کہ تنولی قوم ایران سے آئی اور دریائے سندھ کو پار کر کے پہلے پہل ڈیرہ اس گاؤں کے رقبہ میں کیا۔ (یہاں یہ نوٹ کرنا قابل ذکر ہے کہ کابل و ایران کی پرانی شاہراہ بطرف کشمیر اسی راستہ سے یعنی تربیلہ۔ گندف۔ توی۔ بیڑ۔ بھوہار۔ شہلیہ۔ ڈب مانسہرہ سے ہو کر جاتی تھی۔ ش ب) ترکان سے جنگ ہوئی۔ ترکوں کو شکست ہوئی۔ اور وہ بے دخل ہو کر چلے گئے۔ اور تنولیوں کا اس علاقہ پر قبضہ ہو گیا۔

تنولی قوم کا مشہور خان زبردست خان مشہور بہ صوبہ خان ہوا ہے چونکہ اس کو علاقہ تناول کی صوبہ داری از جانب حکومت دُرانی تفویض ہوئی تھی۔ اس واسطے وہ صوبہ خان سے مشہور رہا۔ اس کی اولاد صوبہ خانی ہوئی۔ اس نے اپنے عہد حکومت میں ایک پٹہ جس میں سادات سلطان پور نزد حویلیاں کو موضع ماگل وسیری عنایت کی۔ اس پر تاریخ ۲۴ صفر ۱۲۱۲ھ .... اور اپنا شجرہ یوں تحریر کیا ہے

صوبہ خان بن بہادر خان، بن متولی خان، بن شمشیر خان بن شیر خان بن قاضی خان بن عبدالکریم خان بن اکوم خان بن بیر خان مغل ساکن پوہار والئی تناول۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ ۱۔ کہ وہ اپنے آپ کو مغل کہتا ہے۔ ۲۔ اس نے اپنی نو پشت کا شجرہ بیان کیا۔ جو کلیہ ابن خلدون کے مطابق چار پشت اگر سو سال میں ہوں تو بیر خان مغل کا عہد ۱۱۲۱ھ سے ۲۲۵ سال پہلے ہوا ہے۔ جو زمانہ ۱۵۰۰ عیسوی کے برابر ہوتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم غالباً پندرھویں صدی عیسوی کے آخیر میں ضلع ہزارہ میں موجود تھی۔ اور یہ اندازہ تاریخ ہزارہ کے بیان کردہ اندازہ سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کی تائید کرتا ہے۔

راورٹی اپنی کتاب افغانستان میں ص ۵۷۶ پر لکھتا ہے کہ تناول ...... میں مختلف اقوام جن میں پٹھان بھی ہیں، بستی ہیں۔ اور پشتو زبان بولی جاتی ہے۔ خانی تنولیوں کے خاندان میں ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو قوم برلاس جو امیر تیمور کی اپنی قوم ہے کی نسل سے بیان کرتے ہیں۔ اور صفحہ ۲۷۶ پر تحریر کرتا ہے کہ اخون درویزہ اپنے تذکرہ (اپنے ہم عصروں کے حالات) میں لکھتا ہے کہ ملک احمد اور خان کاجو (گجو خان) کے وقت سے میرے وقت (اس کا زمانہ سولھویں صدی کا آخر ہے) تک یوسف زئی اور منڑ میں سب سے زیادہ زبردست خان علی اصغر خان ہوا ہے۔ اور انہی نے کوہستان تناول کو فتح کیا۔ اور اس کے پہلے باشندوں کو وہاں سے نکال دیا (یعنی سولھویں صدی عیسوی کے اول میں۔ ش ب) اور اس وقت سے افغانوں کے کچھ قبیلے دریائے سندھ کے کنارے پر ان علاقوں میں جو پہلے تناول میں شامل تھے آباد ہو گئے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تنولی قوم علاقہ تناول میں سولھویں صدی عیسوی سے پہلے یہاں آباد ہو چکی تھی مندرجہ بالا تاریخی حوالوں سے اُن کی ہزارہ میں آمد پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے درمیان کا زمانہ ہے۔ لیکن وہ کہاں سے آئے اس کا صحیح علم نہیں۔ اندازہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی آمد تاریخی لحاظ سے ترک قوم کے بعد ہوئی۔ اور افغانوں کے مختلف قبائل سے پہلے ہوئی۔

ریاست بالائی تناول

یہ ضلع ہزارہ کے مغربی حصہ کے وسط میں ہے۔ اس کے جنوب علاقہ بدھنک مغرب میں دریائے سندھ اور اس سے اوپر شمال کی جانب کالا ڈھاکہ ہے۔ مشرق میں ایبٹ آباد اور مانسہرہ کی تحصیلیں ہیں۔ اور شمال میں وادی اگرور۔ اس کا رقبہ ۲۰۴ مربع میل ہے۔ اس علاقہ میں تنولی قوم کی آبادی ساٹھ فیصدی اور گوجر بارہ فیصدی ہے۔ اس علاقہ کے مشرق کو نے سے دریائے سرن اور شمالی حصہ سے نالہ ناد جو وادی اگرور سے آتا ہے گزرتا ہے۔ اس علاقہ کا بڑا پہاڑ بھینگڑہ ان دو دریاؤں کے درمیان ہے جس میں بے شمار چیڑ اور دیار کے درخت ہیں۔ اس کی بلندی ۸۵۰۰ فٹ تک ہے۔ یہ سب علاقہ اب ضلع کے ساتھ ملحق کر دیا گیا ہے۔ پہلے اس میں دو ریاستیں تھیں۔ ۱۔ ریاست امب۔ ۲۔ ریاست پھلڑہ۔ ریاست پھلڑہ امب کے مقابلہ میں بہت چھوٹی ریاست تھی۔

ریاست امب

یہ ریاست نواب ہیبت خان کے وقت سے ہے۔ اور موجودہ نواب محمد فرید خان ان کی ساتویں پشت میں ہیں۔ یہ نواب خان ہندوال تنولیوں کا خان ہے۔ ہیبت خان نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہندوال قوم کے باقی چار خوانین پر سرداری حاصل کر لی۔ اور اس طرح وہ تیمپال کے خان گل شیر خان کا ہمسر بن گیا۔ گل شیر خان کو اس کا دعویٰ ہمسری ناگوار گزرا۔ اس نے علاقہ کلالئی جا کے رہائش ہیبت خان پر حملہ کر دیا اور اس علاقہ کے گاؤں جلا دیئے۔ ہیبت خان علاقہ سے نکل گیا۔ اور کچھ مدت بعد گل شیر خان کی اجازت سے واپس آ گیا۔ پائیدار صلح کے لئے گل شیر خان کی لڑکی ہیبت خان کے لڑکے ہاشم علی خان اور ہیبت خان کی لڑکی گل شیر خان کے لڑکے احمد علی خان کو منسوب کر دی گئی۔

تاریخ ہزارہ (فارسی قلمی) مولفہ صاحب سنگھ ناظم سرکار ہری سنگھ میں ان واقعات کو مفصل تحریر کیا ہے تناول۔ نصف تناول کا خان صوبہ خان بہت بلند اقبال شخص تھا۔ پلال قوم کا سردار تھا۔ اس نے

ملک ہزارہ و جدون و کھلی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ بہت رعیت پرور تھا۔ رعایا خوشحال تھی۔ تجار، کھتریاں و دیگر اقوام اس کے علاقہ میں آکر آباد ہونے لگیں۔ بھیرو کنڈ اس کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس کی اپنی رہائش موضع پھوہار بر لب دریائے سرن تھی۔ موضع بیڑ کو بھی آباد کیا اور باہر کے لوگ وہاں لا کر آباد کئے۔ جب صوبہ خان کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوا تو سب رعیت اور خاص کر بیڑ کے نو آباد لوگ مبارک باد کے لئے جمع ہوئے۔ خان موصوف نے کہا کہ مجھے بیٹے کی آمد سے نو آباد رعیت کی آمد عزیز تر ہے۔

وفات کے بعد اس کے چودہ لڑکے زندہ تھے۔ ایک بیوی سے دو فرزند محمد خان و احمد خان ملک کولائی موضع ڈیرہ میں مقیم تھے۔ پانچ لڑکے جو دوسری بیوی سے تھے گل شیر خان۔ محمود خان۔ فتح شیر خان۔ سرفراز خان و اشرف خان۔ یہ اپنے باپ کے مکان و مسکن موضع پھوہار میں رہے۔ اور تین لڑکے جو ایک بیوی سے تھے۔ ناصر خان، سربلند خان، و سمند خان یہ تینوں بھی پھوہار میں رہے اور چار بیٹے جو ایک کنیزک سے تھے جن کے نام معلوم نہیں موضع پھوہار ہی میں رہے۔ ان چاروں نے دریائے سندھ کے پار افغانوں سے صلاح مشورہ کر کے ان کے ہزار بندوق سے مسلح آدمیوں کو لے کر پھوہار پر چڑھائی کی اور باقی بھائیوں کو پھوہار سے نکال دیا۔ یہ سب بھائی گل شیر خان وغیرہ پھوہار سے نکل کر تربیلہ کے افغانوں کے پاس چلے گئے۔ محمد خان و احمد خان ملک تنول میں حصہ پلال کے خان بن گئے۔

...... محمد خان ظالم تھا۔ لوگوں کا مال تہمت لگا کر غصب کر لیتا تھا۔ دولت مندوں سے جرمانہ کے بہانے مال وصول کرتا اور جو ادا نہ کرتا اس کو قید کر دیتا تھا۔ آخر لوگ تنگ آ گئے اور مشورہ کیا کہ خلق خدا کو اس کے ظلم سے رہائی دلائیں۔ اب زیادہ دیر اس کی حکومت برداشت نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس کو روٹی کھلانے کے بہانے سے ڈیوڑھی میں بٹھایا اور شمشیر سے یک بارگی حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور گل شیر خان و برادرش کو خبر دی۔ وہ خبر سنتے ہی تربیلہ سے پھوہار پہنچے۔ محمد خان کو دفن کیا۔ صبح کے وقت پانچوں نے جمع ہو کر بسر عام خانی کی پگڑی فتح شیر خان کے سر پر باندھ کر تناول کے حصہ پلال کی ریاست کی خانی سپرد کر دی۔ وہ بہت نیک نام رہا۔ رعایا اور لوگوں سے بہت نیک سلوک کرتا تھا۔ جب فتح شیر خان کی وفات ہوئی تو سب لوگوں نے اتفاق سے گل شیر خان کو خان بنایا۔ یہ بھی بہت نیک نام رہا۔ اس کا سلوک ہندو اور مسلمان سے فیاضانہ تھا۔ ہندوؤں کو بیڑ میں دھرم سال بنانے کے لئے دو ہزار روپے دئے۔ موسم گرما میں علاقہ کولائی بہ کنارہ دریائے سندھ چلا جاتا تھا۔ اور موضع ڈیرہ میں رہائش رکھتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا احمد علی خان خان ہوا ؛

قوم تنولی کی شاخیں

بندوبست ۱۸۶۲ء کے رواج نامہ میں ان کی مندرجہ ذیل بڑی شاخیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ ہندوال جس میں سے نواب محمد اکرم خان چند دیہات کا جاگیردار اور اپنے موروثی ملک کا خود مختار ہے۔ اور فیر خان پھلڑہ جو اپنے علاقہ میں خود مختار رہے۔

۲۔ پلال۔ یہ شاخ زمانہ قدیم سے معزز چلی آتی ہے اور بڑے بڑے معرکوں میں ان کے قدیمی کارنامے تاریخی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان کا جد امجد صوبہ خان (اس کا اصل نام زبردست خان تھا لیکن صوبہ دار علاقہ ہونے کی وجہ سے صوبہ خان مشہور ہو گیا۔ ش ب) بڑا نامی گرامی گزرا ہے۔ اس کے نام پر اس کی اولاد کے معززین صوبہ خانی کہلاتے ہیں۔

تنولیوں میں حسب ذیل سات بڑی شاخیں ہیں :۔

میرال، سیدال، بنیال، بھیکریال، کرگوال، نری تال (ربی تال)، بھجوال۔ یہ قوم اس ضلع کی پہاڑی حصہ کی قدیمی قوم ہے اور قدیم زمانہ سے عرصہ تک خود مختار رہی ہے۔ فی الحال ضلع ہذا کا شمالی حصہ اس قوم کے سردار کے تسلط میں ہے اور وہ اس علاقہ میں خود مختار ہے"

تپہ ہائے تنولی کی باہمی آویزش، و دیگر حالات

تنولی قوم میں قدیم سے حکومت پلال تپہ میں رہی ہے۔ تپہ ہندوال میں کوئی ایک نامور خان نہ ہوا اگرچہ اپنے تپہ کے علاقہ کی حکومت ان ہی کے پاس رہی۔ تاآنکہ ۱۸۰۱ء میں ہیبت خان جس کی پانچویں پشت میں نواب اکرم خان ہوا۔ اس تپہ کا خان ہوا۔ اس نے اپنی قوت پیدا کی۔ چونکہ تپہ ہندوال کو بھی تپہ پلال کی طرح قوت کی خواہش تھی اس واسطے ہیبت خان نے اپنی ہمت سے چالیس پچاس سوار اور ایک سو قریباً پیادہ سپاہی جمع کر لئے اور کچھ قوت پیدا کر لی۔ ہیبت خان ۱۸۳۳ء میں فوت ہو گیا۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ہاشم علی خان ہوا۔ دوسرے تپہ پلال میں اس وقت احمد علی خان نے سر اٹھایا جو عطا محمد خان ساکن جبڑ کا دادا تھا۔ اور اپنے تپہ میں طاقت حاصل کی۔ ان دونوں خوانین میں باہم رشتہ داری تھی یعنی ایک کی بہن دوسرے کو بیاہی ہوئی تھی۔

ہاشم علی خان نے اپنے باپ سے زیادہ قوت حاصل کر لی جس سے احمد علی خان کو خدشہ ہوا۔ ہاشم علی خان کو راستہ سے ہٹانے کے لئے اس کو اور اپنی بہن کو اپنے گھر موضع ڈیرہ (نزد لالوگلی جو پلال تپہ کی جائے حکومت رہی ہے) میں بلایا اور وہاں پر اس کو بمعہ اس کے ایک سو آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اور اپنی بہن (بیوہ ہاشم علی خان) کو ہاشم علی خان کے بھائی نواب خان کے پاس بھیج دیا۔ نواب خان نے اپنے بھائی کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ اور

پٹھانوں سے مدد چاہی۔ لیکن کسی نے مدد نہ کی۔

اس واقعہ کو مہتاب سنگھ نے اپنی تاریخ ہزارہ میں مفصل تحریر کیا ہے جس سے ہندوال و پلال کی باہمی آویزش کا پس منظر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ ہیبت خان ہندوال تپہ کا خان موضع گلی بدرال میں سکونت رکھتا تھا۔ اس نے قوت بہم پہنچائی۔ اور گل شیر خان کے ساتھ دعویٰ ہمسری کا کیا۔ گل شیر خان۔ پلال تپہ کا خان کو یہ دعویٰ ناگوار گزرا۔ اس نے موضع گلی بدرال کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ہیبت خان مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ بجبوراً گل شیر خان کی تابعداری اختیار کی۔ گل شیر خان نے اس کو موضع گلی پھر سے آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ اس مصالحت کی رو سے احمد علی خان پسر گل شیر خان کا رشتہ ہیبت خان کی لڑکی سے ہو گیا اور گل شیر خان کی لڑکی کا رشتہ ہاشم علی خان پسر ہیبت خان سے ہو گیا۔

لیکن جانبین میں تخم کینہ بویا گیا۔

ہاشم علی خان و نواب خان پسران ہیبت خان دن بدن طاقتور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ان کے پاس تین سو سوار ملازم جمع ہو گئے۔ اس پر احمد علی خان پسر گل شیر خان کو فکر ہوا۔ کہ کہیں یہ ہماری خانی (پلال تپہ) جو تین پشت سے قائم ہے۔ اور تقریباً تمام تنول پر حاوی ہے۔ خطرے میں نہ پڑ جائے۔ ادھر تمام ہندوال تپہ نے اتفاق سے ہاشم علی خان کو اپنا سردار مقرر کر دیا۔ اور تپہ پلال سے ہمسری پیدا کر کے بے خوف ہو گئے۔ اور اپنے مواضعات دربند و گڑھی جو کہ گل شیر خان نے زبردستی ان سے لے لئے تھے۔ واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ احمد علی خان نے سوچا۔ کہ اگر ہاشم علی خان اسی طرح زور پکڑتا گیا۔ تو تمام ملک پر قابض ہو جائے گا۔ اور تپہ پلال کو تنول سے خارج کر دے گا۔

احمد علی خان نے اپنے تپہ سے مشورہ کیا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ ہاشم علی خان کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن ایسی تدبیر کی جائے کہ یہ کام حکمت سے ہو جائے۔ احمد علی خان نے یہ تجویز کی کہ ہاشم علی خان کو سیر و شکار کے لئے اپنے ہاں بلائے اور ساتھ ہی زوجہ ہاشم علی خان (جو احمد علی کی بہن تھی) کو بھی۔ اور پیغام یہ ہو کہ بعد از ملاقات و سیر و شکار جب ہاشم علی خان واپس جائے گا تو یہ دونوں مواضعات بطور چادر کے وہ اپنی بہن کو دے دے گا۔ ساتھ ہی ہاشم علی خان کو اس دوران قتل کرنے کے لئے چار آدمیوں کو تپہ پلال سے جو احمد علی خان کے زیر اثر تھے مقرر کر دیا۔ ایک رحمت خان لابیال جو فیروز خان کا دادا تھا۔ دوم رشید خان خان خیل والد ہاشم علی خان سری والہ۔ اور فضل خان و ناصر خان۔ کہ اب ان کی اولاد نہیں رہی۔ ان کے ساتھ مصلحت ہوئی کہ وقت موزوں پر وہ ہاشم علی خان کو قتل کر دیں۔

اس مصلحت کے بعد احمد علی خان نے ہاشم علی خان کی طرف مخلصانہ انداز میں خط لکھا:۔

رقعہ:۔ "برادرِ من۔ میرا دل آپ کی ملاقات، یک جا نشست و برخاست کے لئے جوش مارتا ہے لہٰذا میری خواہش ہے کہ آپ بمعہ اپنے گھر والوں کے چند روز کے لئے یہاں آئیں۔ کہ زندگی ندی کے پانی کی طرح جا رہی ہے۔ عمر پر کچھ اعتبار نہیں۔ چند دن اتفاق سے گزار کر خوشی حاصل کریں۔ اور آں مخلص کے ساتھ دن رات کے اوقات گزاریں جو حاصل زندگانی اور مقصود جہانی ہے۔ اس کے بعد آپ بہر دو خیر و عافیت سے یہاں سے رخصت ہوں۔ اور موضع دربند و گڑھی جن کی واپسی کے لئے آں برادر بہت خواہش مند ہے بطور چادر رخصتانہ اپنی بہن کو دے دوں گا۔"

خط کے ملتے ہی ہاشم خان بمعہ زوجہ خود، خلاف رائے نواب خان برادر خود، دیرہ علاقہ کلائی مسکن احمد علی خان میں چند نفر خدمت گاروں کے ساتھ آ گیا چونکہ اس کا پیمانۂ عمر پُر ہو چکا تھا۔ احمد علی خان کے جال میں پھنس گیا۔

احمد علی خان نے خوب خاطر مدارات کی اور ایسی تواضع و شفقت مخلصانہ کے ساتھ پیش آیا کہ ہاشم علی خان کو اپنا بھائی (رشتہ دار)، وطن اور ریاست بھول گئی۔ اور کسی چیز کی یاد نہ رہی۔ رات دن ہر وقت احمد علی خان کی ہمراہی میں سیر و سیاحت، فارغ البالی و خوشحالی میں مشغول رہا۔ اور احمد علی خان کی پاس خاطر کو ہر چیز پر مقدم رکھتا تھا۔ صبح سویرے یک جا سوار ہو کر چند نفر خدمت گاروں کو ساتھ لے کر، باز، جُرّہ اور شکاری کتے لئے ہوئے سیر و شکار کے لئے نکل جاتے تھے۔ اور شام کو شکار کر کے واپس آ جاتے۔ صبح و شام تازہ گوشت سے لذت اندوز ہوتے۔ اس طرح سے جب کافی دن گزر گئے۔ تو ایک دن ہاشم علی خان نے کہا کہ اگر بھائی کی مرضی ہو اور ناگوار خاطر نہ ہو تو میں چند روز کے لئے اپنے ہاں جا کر ملک و مال کا حال و احوال دیکھ آؤں اور پھر آ جاؤں اگرچہ جدائی کے لئے دل آمادہ نہیں ہوتا لیکن اپنے امورات خانگی کا جذبہ کھینچ رہا ہے۔ احمد علی خان نے اپنے مشیران خاص سے صلاح کی کہ اب وقت ہے کہ اس کا کام تمام کر دیا جائے۔ ہاشم علی خان سے درخواست کی کہ وہ دو دن اور ٹھہر جائے۔ ادھر ان چار اشخاص کو بلا بھیجا وہ سب یکے بعد دیگرے اس کے مسکن دیرہ میں جمع ہو گئے۔ ان سے کہا کہ اب وقت ہے۔ اپنا کام سرانجام دو۔ دوسرے دن ہاشم علی خان کو رخصت کرنے کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ پیشین کی نماز کے وقت ہاشم علی خان کے نوکر وضو و طہارت کے لئے دریائے سندھ کے کنارے چلے گئے۔ جو مکان سے نصف کوس ہے۔ اس اثناء میں احمد علی خان کو وقت مل گیا اور ان چاروں اشخاص کو اپنے پاس جمع کر لیا۔ اس وقت احمد علی خان ان چار آدمیوں سمیت مسجد کے ساتھ باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ہاشم علی خان اندر مستورات کے پاس تھا۔ احمد علی خان نے اس کو باہر بلایا۔ وہ باہر آ کر احمد علی خان کے ساتھ دو چار باتیں ہی کرنے پایا تھا کہ وہ چار شخص نماز کے بہانہ سے اٹھے اور تلواروں سے حملہ کر دیا۔

ہاشم علی خان نے کوشش کی کہ بھاگ کر زنان خانہ کے اندر چلا جائے لیکن قاتلان نے اس کو فرصت نہ دی۔ اس نے حرم سرائے کی ڈیوڑھی کی دیوار پر چڑھنا چاہا۔ لیکن قاتلان نے پے در پے وار کرکے اس کو نیچے گرا دیا۔ شور وشغب اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے متعلقین جو نماز کے لئے دریا کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اپنا سامان اور گھوڑے چھوڑ کر جان سلامت لے کر بھاگ گئے۔ ان میں سے بعض جو اپنے گھوڑوں اور سامان کی طمع کی خاطر موضع ڈیرہ کی طرف آئے ڈمیرہ اور لالوگلی کے لوگوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ شور وغوغا اور حرم سرائے کی گریہ وزاری کے بعد ہاشم علی خان کی نعش کی تکفین وتدفین میں مشغول ہوئے اس کو اور مقتول ساتھیوں کو موضع ڈیرہ میں دفن کر دیا گیا۔

اس واقعہ سے تین دن بعد نواب خان کو اپنے بھائی کی موت کا علم ہوا۔ اس نے ہاشم علی خان کی لاش حاصل کرنے کے لئے سادات وعلماء کا جرگہ بھیجا کہ لاش بھی لائیں اور زوجہ ہاشم علی خان کو بھی۔ لیکن احمد علی خان نے ان کی بات نہ مانی اور کہا کہ نہ لاش دیتا ہوں نہ ہی مستورات بھیجتا ہوں۔

بیس دن گزرنے کے بعد نواب خان نے میاں صاحب معارف آگاہی حامیٔ دین رسول اللہؐ، میاں لطیف اللہ سرخیل قدس اللہ مرقدہٗ کو کہ اپنے زمانہ کا سرآمد بزرگان تھا، بھیجا۔ کہ وہ ہاشم علی خان کی لاش اور اس کی بیوہ کو احمد علی خان سے لے آئیں۔ اگرچہ احمد علی خان یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھا لیکن میاں صاحب کے سوال سے جو عارف کامل انسان تھے انکار نہ کر سکا۔ اور ہاشم علی خان کی لاش اور اس کی بیوہ کو اُن کے ساتھ روانہ کر دیا۔ عدت کے پورا ہونے کے بعد نواب خان نے اس سے نکاح کر لیا۔ اور بعد میں اپنی قوت بازو سے دربند اور گڑھی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور روز بروز نواب خان کی قوت میں ترقی ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں اکبر علی خان جو احمد علی خان کا چچازاد بھائی تھا، اپنی وراثت پدری حاصل کرنے کے لئے عطا محمد خان ناظم کشمیر کے پاس جاکر امداد کا طالب ہوا۔ اس نے کچھ فوج کشمیری خان کی سرکردگی میں ہزارہ کی طرف بھیجی۔ یہ فوج ابھی ہزارہ نہ پہنچی تھی کہ احمد علی خان ان حالات سے باخبر ہو گیا۔ اس سراسیمگی کی حالت میں اس نے جلدی سے اپنی بیٹی کی شادی سیّد اعظم ستھانہ والہ سے کر دی اور گھر کا سب سامان از قسم زیور، برتن، کپڑے، فرش فروش اسلحہ جات، بندوقیں اور تلواریں جن کے قبضے طلا سے مرصع تھے اور تقریباً ایک لاکھ کا سامان ہو گا اپنے چند معتبرین کے ساتھ سیّد اعظم شاہ برادر سید اکبر شاہ ستھانہ والہ کے ہاں بھیج دیا۔ تاکہ جب دشمن اس کے ملک میں آ سکے اور وہ یہاں نہ رہ سکے تو موضع ستھانہ میں وقت گزار دے۔

جب لشکر مخالف تنول میں داخل ہو گیا تو احمد علی خان تنگ ہو کر مع مبلغ بارہ ہزار روپیہ نقد لے کر بھاگ کر مہابن (کوہ گندگھر) میں جاکر موضع بھیرواسہ میں مقیم ہو گیا۔ اگر اس وقت وہ موضع ستھانہ

کو جاتا تو سیدان ستھانہ اسی وقت اس کو قتل کر دیتے۔ چونکہ اس کی زندگی کے دن باقی تھے۔ وہ وہاں نہ گیا اور موضع بھیرواسہ کے لوگوں کے درمیان اوقات بسری کرتا رہا۔

جب کشمیر کی فوج داخل تنول ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ احمد علی خان ملک سے چلا گیا ہے۔ تو انہوں نے اکبر علی خان کو موضع بیچوہارہ بیٹر میں مقیم کر دیا۔ اور احمد علی خان کے مسکن موضع ڈیرہ کو جلا دیا اور واپس کشمیر چلی گئی۔

کشمیر کی فوج کے چلے جانے کے بعد احمد علی خان مہابن سے واپس آیا اور علاقہ کولائی کے لوگوں کا جرگہ طلب کرکے ان سے مشورت کی۔ اپنی سکونت موضع لالوگلی میں رکھی۔ ساکنان کولائی کہ اکثر قوم وقرال سے ہیں اور تیرہ پال کی پانچ قوموں میں سے ایک یہ ہے ان سب نے احمد علی خان کی حکومت کی ماتحتی قبول کر لی۔

کچھ مدت کے بعد سیّد اعظم شاہ ستھانہ والہ نے احمد علی خان کو کسی طریقہ سے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ احمد علی خان کا مال ومتاع جو اس کے پاس امانت تھا ہضم کیا جا سکے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ مشورہ کرکے احمد علی خان کو جرگہ کے لئے بلایا۔ تاکہ ریاست تنول کے انتظام کے متعلق اس کو مناسب امداد دی جائے وہ کولائی سے دریا عبور کرکے ستھانہ میں آیا۔ احمد علی خان اُن کی دعوت کو مخلصانہ سمجھ کر آیا۔ چونکہ وہ سادات کا بزرگ خاندان تھا اور پھر اس کی بیٹی کا رشتہ تھا لہٰذا وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کے پاس آیا۔ اس کے وہاں پہنچنے پر سب سادات نے اٹھ کر اس کی بہت تعظیم وتکریم کی۔ سب نے اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ مقررہ وقت نزدیک آجائے۔ احمد علی خان ان کی نیت بد کو تاڑ گیا۔ پیشاب کے بہانے جرگہ سے اٹھا، ازار بند ہاتھ میں لئے ہوئے کشتی کی طرف بڑھا تاکہ اس میں سوار ہو کر بچ نکلے۔ لیکن سیّد بھی سمجھ گئے۔ وہ تلواریں سونت کر اس کے پیچھے دوڑے۔ احمد علی خان نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دریا اس جگہ پایاب تھا لہٰذا ان کی تلواروں کی گیارہ ضربات اس کے سر، بازو اور پشت پر پڑیں لیکن وہ دریا میں غوطہ لگا کر پھر تیر کر کشتی تک پہنچ گیا۔ ملاح اس کو کشتی پر سوار کرکے واپس کولائی لے آئے۔ احمد علی خان کا سامان سادات ہی کے پاس رہا۔ جب احمد علی خان کے زخم ٹھیک ہو گئے تو اس نے اپنی جائے رہائش پھر ڈیرہ میں مقرر کی۔

اس اثناء میں نواب خان پدر پائندہ خان ہندوال نے زور پکڑا۔ پرانی دشمنی (قتل برادر خود ہاشم علی خان از دست احمد علی خان) کی بناء پر موضع بیچوہارہ میں آیا۔ دریائے سرن کے کنارے پر ایک کنوئیں کو درست کیا۔ اور اپنی فوج کے ساتھ بھارو کوٹ میں آیا (یہ پرانا قلعہ تھا اور دریائے دوڑ کے کنارے پر بالمقابل موضع تھیلہ یہ گاؤں ہے۔ ش ب)

سربلند خان پسر سرفراز خان ابن صوبہ خان جو موضع شنگڑی میں رہتا تھا یہ خبر سنتے ہی موضع دھمتوڑ

علاقہ جدون میں چلا گیا۔ محمد خان ترین حاکم ہزارہ (یعنی میدان ہری پور۔ اسی میں بھارہ کوٹ واقع ہے) نے سنا کہ نواب خان بھارہ کوٹ میں آ گیا ہے۔ تو محمد خان نے اپنی فوج کو تیار کر کے زیر اہتمام مقدم مشرف موضع سکندرپور میں چھوڑ کر خود نواب خان کی ملاقات کے لئے بھارہ کوٹ گیا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ سب لوگ بمعہ سادات علماء و بزرگان فرش پر بیٹھے ہیں اور نواب خان خود ایک چھوٹی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے اگرچہ محمد خان ترین فرش پر بیٹھ گیا لیکن اس کے دل میں عزت نفس اور غیرت نے جوش مارا کہ نواب خان اتنا مغرور ہے کہ اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتا۔ کچھ دیر بیٹھا اور اونچی آواز سے عام باتیں کیں۔ آخر میں محمد خان ترین نے کہا کہ اگر خان صاحب کی مرضی ہو تو چند روز مہربانی کر کے اپنے ڈیرہ کو سکندرپور لے جائیں۔ وہاں چند روز باز، شکرہ، بحرہ اور شکاری کتوں کے ساتھ اچھی طرح شکار کھیلیں۔ یہ بات سنتے ہی نواب خان خاموش ہو گیا اور فکر و اندیشہ نے اس پر غلبہ کیا۔ اور جواب نہ بن پڑا۔ محمد خان ترین کو بڑے اندیشہ و وسواس کے ساتھ رخصت کیا۔ اور خود بمعہ فوج بقدر ایک سوار، سات سو پیادہ واپس چلا گیا۔ اس بدحواسی میں اس کے دو گھوڑے راستہ ہی میں گر کر مر گئے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہزارہ کی طرف نہ آیا۔

اس اثناء میں احمد علی خان پلال نے اپنے عم زاد سربلند خان سے مصالحت کر لی۔ اور اتفاق کر لیا۔ کہ ان کے مابین نفاق ہو تو دشمن ان پر غالب آجاتا ہے۔ اور ہمارے موروثی و جدی ملک پر قبضہ کرتا ہے۔ اس میں دونوں جانب کا نقصان اور خون ریزی ہوتی ہے۔ جانبین میں عہد و سوگند و قسم و قرآن پر اتفاق ہوا۔ اگرچہ دونوں دلوں میں کھوٹ تھا۔ اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

دونوں صلاح و مشورہ سے رحمت خان لابیاں کو شیروان سے نکالنے کے لئے اس طرف روانہ ہوئے۔ تاکہ وہاں اس کا گھر بار لوٹ لیں۔ اور ساہوکار و ہندوان کو جو وہاں ہیں اور بہت دولت مند ہیں غارت کریں۔

دونوں مسلح ہو کر شیروان کی جانب روانہ ہوئے تو کھیالہ میں پہنچ کر روٹی کھائی۔ اور دوپہر کو آرام کیا۔ پیشین کی نماز کے وقت بیدار ہوئے استنجا و وضو سے فارغ ہو کر نماز کے لئے تیار ہوئے۔ سربلند خان نے مسجد ہی میں نماز پڑھنی شروع کی۔ اور احمد علی خان ایک کوٹھہ کی چھت پر نماز پڑھنے لگا۔ سربلند خان نے اپنے نوکروں سے کہہ رکھا تھا کہ جب احمد علی خاں رکوع کرے۔ گولی سے اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ گولی احمد علی خان کی پشت پر لگ کر سینہ سے نکل گئی وہ گرا اور مر گیا۔ مرے ہوئے کے سر پر کھڑے ہو کر گاموں خان پدر امان اللہ خان نے فائر کیا۔ جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا۔ اور سب کپڑے جل گئے۔ اس کے بعد سربلند خان تپہ پلال کا خان ہوا۔ اور موضع شنگرئی میں اقامت اختیار کی۔"

* * *

نواب خان اور محمد عظیم خان دُرانی کی مخالفت

اتفاق سے والدہ محمد عظیم خان و امیر دوست محمد خان کشمیر سے کابل کو اسی راستہ بیڑ و دربند سے جا رہی تھی۔ نواب خان نے اس کی بڑی خدمت و مہمانداری کی۔ آخر جاتے وقت نواب خان نے اس کا ایک آزار بند جو نہایت قیمتی تھا اُس سے طلب کیا (پرانے زمانہ میں یہ عام رسم تھی کہ آزار بند قیمتی ریشم وغیرہ کے ہوتے تھے۔ اور ان کے کناروں پر عام لوگ خوبصورت موتی و ریشمی پھول وغیرہ ٹانکتے تھے۔ امیروں کے ہاں جواہرات وغیرہ لگائے جاتے تھے۔ یہ رواج اب بھی خال خال نظر آہی جاتا ہے۔ ش ب) والدہ محمد عظیم خان نے اس میں اپنی بے عزتی سمجھی اور نواب خان کے اس سوال کو بے ادبی سمجھا۔ چونکہ فوج اس کے ہمراہ کم تھی اس واسطے اس نے اپنی نجات اسی میں سمجھی کہ آزار بند نواب خان کو دے دے۔ وہ تو کابل کو چلی گئی لیکن یہ ماجرا محمد عظیم خان کو کابل سے لکھ بھیجا۔ محمد عظیم خان دوسرے سال کشمیر سے کابل کو جا رہا تھا۔ تو جب وہ اس علاقہ میں پہنچا تو اس نے ایک دربار میں نواب خان کو بُلایا۔ نواب خان کو یہ فکر تھی کہ کہیں آزار بند کے بدلے اس کو گرفتار نہ کر لے۔ لہٰذا اس نے اپنے لڑکے کو ساتھ لے لیا اور سمجھا دیا کہ اگر دربار میں محمد عظیم خان کی نیت بدلی ہوئی نظر آئی تو وہ اس کو آنکھ سے اشارہ کر دے گا اور وہ فوراً واپس آ کر سب اہل و عیال کو لے کر مہابن کی طرف چلا جائے۔

لہٰذا جب وہ اس کے سامنے پیش ہوئے تو محمد عظیم خان کے طور طریقہ سے نواب خان کو گرفتاری کا فکر ہوا۔ اس نے آنکھ کا اشارہ کیا اور پائندہ خان وہاں سے نکل بھاگا۔ اور اپنے مال متاع و اہل و عیال کو لے کر مہابن کی طرف بھاگ گیا۔ محمد عظیم خان نے نواب خان کو گرفتار کر کے چمڑہ میں سی کر دریائے سندھ میں غرق کر دیا۔ اور اس کے بعد جب اپنی فوج اس کے گھر کے محاصرہ کے لئے بھیجی تو پائندہ خان بمعہ اہل و عیال فرار ہو چکا تھا۔

اس واقعہ کو مہتاب سنگھ نے بہت تفصیل سے لکھا:-

"سردار عظیم خان و عطا محمد خان بارک زئی جب وہ ناظم کشمیر تھے۔ ان کی والدہ کشمیر سے کابل از راہ پکھل جا رہی تھی۔ اور موضع گلی مسکن نواب خان میں وارد ہوئی۔ ظاہراً نواب خان نے از راہِ تواضع و تکریم پکھل تک جا کر اس کا استقبال کیا۔ اور اپنی جائے رہائش کو لے آیا۔ اور خدمت خوراک و سامان دیگر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن کوچ کے روز کسی جاہل کی انگیخت پر نواب خان نے خفیہ طور پر اس سے سوال کیا کہ سنا جاتا ہے کہ آپ کے پاجامۂ مبارک میں ایک بہت قیمتی اور خوبصورت آزار بند ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ وہ آزار بند

ازراہ نوازش مجھے عطا کریں گے۔ اگرچہ موصوفہ نے بہت بہانے کئے۔ لیکن نواب خان اپنے اصرار پر سختی پر اتر آیا۔ اس نے سوچا کہ راستہ پہاڑی اور تنگ و دشوار ہے اور گزر گھوڑوں، خچروں وغیرہ پر ہے۔ لہذا نواب خان کے ضرر کے خوف سے اُس نے آنا ربند اُس کو دے دیا۔ اور خیریت سے کابل پہنچ گئی۔ وہاں سے اپنے بیٹوں کو جو کشمیر کے ناظم تھے نواب خان کی شوخی، بے ادبی اور اپنی بے حرمتی کا حال لکھا۔ اور تاکید کی کہ نواب خان تنولی کو ایسی سزا دی جائے کہ تاریخ زمانہ میں اس کی داستان ثبت ہو جائے۔

کشمیر سے ان کا ہاتھ اس پر نہ پہنچ سکتا تھا۔ لیکن جب سردار عظیم خان کشمیر سے کابل کی طرف متوجہ ہوا تو اپنی ماں کے خط کو یاد کر کے پکھلی و گلی کے راستے سے دربند کو روانہ ہوا۔ وہ جانتا تھا اگر وہ نواب خان سے عداوت و خصومت سے پیش آئے تو وہ بھاگ کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے گا۔ اور جب میرا لشکر گزر جائے گا تو وہ پھر اپنی جگہ پہ آ جائے گا۔ ایسی حالت میں اس کو بے ادبی کی سزا نہ دی جا سکے گی۔ لہذا ازراہ دوراندیشی و منصوبہ بازی پکھلی پہنچنے سے پیشتر سید وحید شاہ ساکن موضع ٹوکوٹ تعلقہ پکھلی کو بلا کر بعطائے خلعت فاخرہ و دیگر لوازمہ مہمانداری سے خوش کر کے اس امر پر تیار کیا کہ وہ نواب خان کو سردار موصوف کے سامنے حاضر کرے۔ چونکہ سید وحید شاہ اور نواب خان ایک دوسرے کے مخلص صدیق اور دوست تھے۔ وہ نواب خان کو بمعہ پسر کلاں پائندہ خان کے سردار موصوف کے سامنے حاضر ہونے کے لئے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سردار موصوف نے دوبارہ سید وحید شاہ کو خلعت سے نوازا۔ نواب خان نے بھی سردار موصوف کی مہمانداری کے لوازمات از خوراک و سرود و تماشائے اہل نشاط و خیمہ و قیمتی فرش و فروش سے معزز مہمان کی خدمت کی۔ اور براہ موضع گلی، وموضع شونگلی، وموضع نکہ پانی جاتے ہوئے دریائے سندھ عبور کیا۔ سردار موصوف نے بھی نواب خان کی تعظیم و تکریم کی، اور اپنے ساتھ بٹھا کر ہم نوالہ و ہم پیالہ بنایا۔ اور نواب خان کے ڈیرہ پر تمام رات مجلس سرود و رقص رہی صبح سویرے جب سردار موصوف کے ڈیرے نے انب سے کوچ کیا اور براہ دیہات کیا دھکیل بطرف یوسف زئی متوجہ ہوئے۔ نواب خان و پائندہ خان کی نگہبانی کے لئے ہوشیار و چابکدست محافظ مقرر کئے گئے جب سردار کا ڈیرہ پیہور کے مقام پر اترا تو نواب خان کو اندیشہ ہوا لہذا اس نے پائندہ خان سے مشورہ کیا کہ ہم کو تو یہ اپنے ملک و عیال سے دور لے جا رہا ہے لہذا تم کو ایک حیلہ سے واپس بھیجتا ہوں لیکن میری زندگی سے ہاتھ دھو ڈالو۔ میں تم کو اہل و عیال لینے کے بہانے سے واپس کروں گا۔ لیکن خبردار تم واپس نہ آنا اور کسی پہاڑ کی چوٹی پر چلا جانا۔ اور سردار کے اس ملک سے چلے جانے کے بعد اپنے گھر واپس آ جانا۔ یہ مشورہ کرنے کے بعد نواب خان سردار موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس کی خواہش ہے کہ وہ

سردار موصوف کے ساتھ بمعہ اہل و عیال کابل جائے۔ اس لئے اُس کو دو تین ڈولے مستورات کو لانے کے لئے اور چند نوکر، اونٹ اور خچر سامان لانے کے لئے پائندہ خان کو دئے جائیں تاکہ وہ جا کر اہل و عیال کو بمعہ سامان ساتھ لے آئے۔ سردار عظیم خان نے جب یہ سنا کہ نواب خان اپنے سب بال بچوں کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو اس کو ایک نعمت عظیم سمجھا اور خوش ہوا کہ اس طرح پر نواب خان کو سب اہل و عیال سمیت اپنی والدہ کے سامنے پیش کر دے گا اور جس سزا کو وہ اپنی بے ادبی کے بدلہ دینے پر راضی ہوئی وہی ان کو دی جائے گی اُسی وقت ڈولہ بمعہ مزدوراں، اونٹ اور خچر عطا کر کے پائندہ خان کو اہل و عیال لانے کے لئے بھیج دیا۔ اس کا سب خاندان اس کے آنے سے پیشتر ہی پہاڑ کی چوٹی پر بھروا سہ اور شونگلی چلا گیا تھا۔ ڈولہ و مزدوراں و اونٹ اور خچروں کو نیچے چھوڑ کر پائندہ خان خود پہاڑ کی چوٹی پر چلا گیا اور ان کو پیغام بھجوایا کہ وہ چلے جائیں میرے اہل و عیال ہرگز نہیں آتے۔ لاچار حمالان ڈولہ، ساربان اور سائیس سب خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ اور سردار عظیم خان کو سب حال بیان کیا۔ یہ سن کر وہ بہت خفا اور غضب ناک ہوا نواب خان کو صبح کے وقت چمڑے میں سی کر دریائے لنڈا (دریائے کابل) میں جس کے کنارے پر اس کا ڈیرہ تھا۔ ڈال دیا۔ ڈالتے ہی وہ دریا میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد سردار عظیم خان کابل روانہ ہو گیا۔ سردار کے چلے جانے کی خبر سن کر پائندہ خان بمعہ اہل و عیال اپنے گھر انب میں آ گیا۔ انب کو پھر سے آباد کیا۔ اور ریاست تنول کے نصف پر جو ہندوال کا حصہ تھا حکمرانی کر کے اس کو خوب مضبوط کیا۔ سکھوں سے بڑی مردانگی اور دلیری سے لڑتا رہا۔

عہد پائندہ خان

نواب خان کے وقت تک سب تنولی تپہ ہندوال اپنے اپنے حصہ کے مالک و دفتری تھے۔ بعد مارے جانے نواب خان کے جب پائندہ خان اپنے علاقہ میں واپس آیا تو ایک شخص تنولی تپہ ہندوال نے پائندہ خان کو بطور طعن کہا۔ کہ اب تیرا باپ تو مارا گیا اور تو بھی ہماری طرح ایک دفتری رہے گا۔ تمہاری خانی نہ رہے گی۔ پائندہ خان نے اس کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن اس بات نے اس کے دل پر سخت اثر کیا۔ اتفاقاً انہی ایام میں چار سو سپاہی کشمیر سے بے نوکر ہو کر کابل کو جا رہے تھے اور نوکری کے متلاشی تھے پائندہ خان نے ان سب کو نوکر رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی قوم کے سب معتبر جمع کئے۔ ان میں جو بہت معزز تھے ان کو ایک دن میں ہی قتل کروا ڈالا۔ اور بہت سے دریائے سندھ میں غرق کرا دئے۔ پھر باقی ماندہ سے پوچھا کہ میں خان ہوں یا دفتری۔ سب نے اس کی خانی مانی۔ اور اپنی ملکیت و وراثت و دفتر سے بھی لادعویٰ ہو گئے۔ اس روز سے یہ سب لوگ مزارع ہو گئے اور پائندہ خان کل تپہ ہندوال کا واحد مالک

قرار پایا۔ اور اپنی ذاتی شجاعت و ہمت کے بل بوتے پر روز بروز طاقت ور ہوتا گیا۔ اور دو سو کے قریب سوار اور پانچ سو پیادہ سپاہی نوکر رکھتا تھا۔ اور سب رعیت وقتِ ضرورت اس کی حمایت پر کمربند تھی۔ اور باہر سے بھی لوگ اس کی مدد و کمربندی کے لئے آجاتے تھے۔

سکھوں اور تنولیوں کی آویزش

فتح مانگل (۱۸۲۱ء) کے بعد اکثر میدانِ ہزارہ پر سردار ہری سنگھ کا تسلط ہو گیا۔ لیکن ہر دو تیہ تنولی باغی رہے۔ اس وقت نواب خان کا والد سر بلند خان تیہ پلال کا خان تھا۔ سکھوں کے ساتھ لڑائی ہوئی سر بلند خان کو شکست ہوئی اور اس کے علاقہ پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ پائندہ خان بدستور باغی رہا۔

سر بلند خان نے پھر شورش کی۔ اور بمقام ڈنہ سردار ہری سنگھ سے جنگ ہوئی جس میں سر بلند خان کا لڑکا شیر محمد خان برادر کلاں نواب خان ہری سنگھ کی بندوق کے فائر سے مارا گیا۔ سر بلند خان مفرور ہو کر موضع لساں علاقہ پھلڑا ملک پائندہ خان میں چلا گیا۔ سردار ہری سنگھ نے پائندہ خان کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ سر بلند خان کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دے تو تیہ پلال کا سب ملک اُس (پائندہ خاں) کو دے دیا جائے گا۔ پائندہ خان نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور سر بلند خان کی گرفتاری کی تدبیر کرنے لگا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ سر بلند خان دریائے سندھ سے پار چلا گیا۔ پائندہ خان نے سردار ہری سنگھ کو کہلا بھیجا کہ میں نے سر بلند خان کے گرفتار کرنے کی تدابیر کیں لیکن وہ ہاتھ نہ آیا چونکہ میں نے اپنی طرف سے پوری سعی کی لہٰذا اس کا ملک میرے حوالہ کر دو۔ سردار نے جواب دیا کہ جس وعدہ پر ہم نے ملک دینا کیا تھا وہ وعدہ تم سے پورا نہ ہو سکا۔ ہم ملک نہیں دیتے۔ اس بنا پر سرکار سکھاں اور پائندہ خان کے درمیان فساد شروع ہو گیا پائندہ خان اس ملک پر دعویٰ کرتا رہا۔ لیکن اس کے جواب میں سردار ہری سنگھ نے پائندہ خان کے ملک کا اکثر حصہ دبا لیا۔ اور اس کو بہت تنگ کیا۔ صدہا لڑائیاں پائندہ خان اور سرکار سکھاں کے درمیان مشہور ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ پائندہ خان نے سکھوں کو خوب خوف زدہ رکھا۔ اس کے نام سے سکھ گھبراتے تھے۔ عام روایت مشہور ہے کہ سکھ کہتے تھے کہ اس کا اصلی نام کیا ہے لوگ جواب دیتے کہ اس کا نام پائندہ (پَیندا۔ پنجابی میں حملہ کرنے اور دبا لینے والے کو کہتے ہیں) سکھ کہتے کہ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ وہ پَیندا ہے مگر اس کا نام کیا ہے۔ اور ساتھ ہی سکھ کہتے کہ اگر ان کو زنجیر سے جکڑ کر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ پائندہ (پَیندا) خان آگیا ہے تو ہم اس درخت کو بھی اکھاڑ کر بھاگ جائیں گے۔

پائندہ خان نے سکھوں کے ہوشیار اور بہادر جرنیلوں سردار ہری سنگھ و سردار گلاب سنگھ کو کئی سال تک اپنے علاقہ کے پاس آنے نہ دیا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ کی ۱۸۲۴ء میں شکست کا حال سنا۔ تو خود فوج لے کر آیا۔ علاقہ ہری کوٹ کو فتح کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارہ تربیلہ گیا۔ وہاں سے پار جا کر گھبل کیا کو جلا دیا۔ تو پائندہ خان نے اپنا بیٹا جہانداد خان وہاں پر اس کے پاس برائے اطاعت بھیجا لیکن سکھوں کی موجودگی کو اپنے علاقہ میں برداشت نہ کر سکا۔ اور بھینگڑہ کے پہاڑ پر اقامت گزیں ہوتے ہوئے سکھوں پر گوریلا حملے کرتا رہا۔ ۱۸۲۶ء میں تنولیوں اور مجاہدین کی متحدہ فوج کو ہری سنگھ نے پُھلڑہ کے مقام پر شکست دے دی۔ تو پائندہ خان بہت کمزور ہو گیا۔ پائندہ خان نے مجاہدین کے ساتھ زیادہ اتحاد و دوستی کے لئے کوشش کی اور سید احمد شہیدؒ کی اطاعت بھی کی لیکن مدد خان اور نواب خان خانان شنگڑی پائندہ خان کے سخت رقیب تھے اور تیہ پلال کے خواہاں تھے۔ اور ان کا رسوخ مجاہدین کے ساتھ بہت گہرا تھا۔ لہٰذا پائندہ خان کی موافقت نہ ہو سکی۔ اور مجاہدین اس کے مخالف تھے۔ اور وہ کچھ مدت کے لئے اپنے ملک سے چلا گیا۔ اور سواتیوں کے علاقہ میں جا بسا۔ آخر کار ۱۸۳۱ء میں وہ خان اگرور کے پاس آگیا اور وہاں سے اپنے لڑکے جہانداد خان کو ہری سنگھ کے پاس مانسہرہ میں برائے امداد بھیجا۔ ہری سنگھ نے اس کی امداد کی اور مجاہدین کو اس کے علاقوں کے قلعوں (امب اور عشرہ) سے نکال دیا اس امداد کے عوض پائندہ خان نے اپنا لڑکا جہانداد خان سردار ہری سنگھ کے پاس بطور ضمانت بھیجا جس کو وہ ساتھ لاہور لے گیا۔ ۱۸۳۳ء میں

۱۸۳۴ء میں پائندہ خان نے سردار ہری سنگھ کے نائب مہان سنگھ سے جس سے اس کی دشمنی تھی خیر آباد (قادر آباد) اور کرپلیاں کے قلعے چھین لئے۔ اسی اثنا میں مجاہدین کے خلاف یوسف زئیوں نے بغاوت کی اور وہ ضلع مردان سے بھاگتے ہوئے پائندہ خان کے علاقہ کو بھی خالی کر گئے۔ اور اس طرح سے پائندہ خان نے اپنے اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۳۶ء کے اخیر میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پشاور کو جا رہا تھا۔ تو پائندہ خان کو بلایا کہ اس کی سکھوں کے ساتھ صلح صفائی کرا دے۔ لیکن پائندہ خان نے قاصد کو گرفتار کر لیا۔ اور جواب بھیجا کہ جب تک اس کے لڑکے جہانداد کو نہ چھوڑا جائے گا وہ اس قاصد کو نہیں چھوڑے گا۔ اس دلیرانہ اقدام پر ہری سنگھ نے جہانداد خان کو واپس بھیج دیا۔

ایک دو سال بعد جب کہ ہندوستانی مجاہدین ستھانہ میں واپس آ گئے تو پائندہ خان نے ان کی مدد سے خان اگرور کا علاقہ لے لیا اور اس کو وطن سے نکال دیا۔ اس کے مجاہدین علاقہ ٹیکری کی طرف بڑھے اور اس کو فتح کر لیا۔ لیکن اہالیان ٹیکری نے ان کی سختی کی وجہ سے پائندہ خان کو درخواست کی کہ وہ ان کو

مجاہدین سے چھڑا لئے۔ پائندہ خان نے مجاہدین کو پیغام بھیجا کہ وہ یوسف زئی پر حملہ کرنا چاہتا ہے لہٰذا وہ سب واپس آکر اس کے ساتھ شامل ہوں جب مجاہدین آ گئے تو ان کو ستھانہ واپس بھیج دیا۔

پائندہ خان کی حکومت کے آخری سال

۱۸۳۶ء میں سردار ہری سنگھ نے اگرور پر حملہ کیا اور پائندہ خان کے سپاہیوں کو نکال دیا۔ ملک میں دو اور قلعے بنا لئے۔ بعد ۱۸۳۷ء میں معمولی چپقلش ہوتی رہیں لیکن ۱۸۴۱ء کے طوفان نے ان کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا۔ مہاراجہ شیر سنگھ نے کشمیر اور ہزارہ اپنے لڑکے پرتاپ سنگھ کو جاگیر میں دے دیا۔ وہ ستمبر ۱۸۴۲ء میں کشمیر سے ہزارہ میں آیا۔ اور پائندہ خان کی ریاست میں دریائے سندھ کے کنارے مقام کیا۔ اور پائندہ خان کو بلایا۔ کنور پرتاپ سنگھ نے ہمراہی سکھ سرداروں کے مشورہ پر بہت سا ملک مدد خان کو دے دیا اور پائندہ خان کے لئے بہت کم چھوڑا۔ اور وہ بھی دریائے سندھ سے پار کا معمولی سا علاقہ۔ یہ واقعہ پائندہ خان کے آخری ایام میں ہوا۔ اور وہ ۱۸۴۴ء یا ۱۸۴۱ء یا ۱۸۴۳ء صحیح یہ آخری تاریخ معلوم ہوتی ہے میں فوت ہوگیا۔

نواب جہانداد خان

پائندہ خان کی وفات کے بعد جہانداد خان نواب ہوا۔ سکھوں کی پہلی جنگ کی وجہ سے سکھوں میں افراتفری تھی۔ نواب جہانداد خان نے اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۸۴۶ء میں اپنے آبائی علاقہ کے قلعوں پر جس پر سکھ قابض تھے حملہ کر کے واپس لے لئے لیکن دور اندیشی کی بناء پر کہ شاید سکھ دوبارہ حملہ آور ہوں۔ اس نے ان کے مغلوب سپاہیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا۔ جنگ کے اختتام پر ہزارہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو دے دیا گیا اس کی طرف سے دیوان ہری چند مالیہ جمع کرنے کے لئے آیا۔ اس نے جہانداد خان کا آبائی علاقہ اس کے سلوک کے پیش نظر بمعہ کلائی اور بدہنک اس کو جاگیر میں دے دیا۔ جب ہزارہ پھر سکھ دربار کو واپس کر دیا گیا اور سکھ دربار کی جانب سے میجر ایبٹ ہزارہ میں آیا۔ تاکہ اپنے بندوبست کا انتظام کرے۔ تو نواب جہانداد خان پہلے پہل اس کے پاس نہ آیا۔ لیکن جب سلم کھنڈ فتح ہوگیا اور تارخیلوں کی قوت منتشر ہو گئی تو اس نے بھی اطاعت کی طرف قدم اٹھایا اور ستمبر ۱۸۴۷ء میں ہری پور میں میجر ایبٹ کے پاس آیا۔ میجر ایبٹ نے اس کی آبائی جاگیر بمعہ کلائی و بدہنک اس کے نام پر منتقل کر دی لیکن کلائی اور بدہنک کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

نواب جہانداد خان نے اپنی موت (۱۸۵۸ء) تک سکھوں اور انگریزی حکومت کے ساتھ اتحاد رکھا۔

اور وہ باوجود چتر سنگھ کی ترغیب کے وفادار رہا۔ اگرچہ بعد میں اس نے ان حسن زیوں کو جو اس کے ملک میں تھے بطور یرغمال دینے سے انکار کیا۔ جب کہ حسن زیوں نے دو انگریزوں کارن اور ٹیپ کو قتل کر دیا تھا اور پھر یہ واقعہ کالا ڈھاکہ کی پہلی مہم کا باعث بنا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اس نے اپنے علاقہ کے قلعوں کو مضبوط کیا اور اس سمت میں امن بحال رکھا اور سرکار انگریزی کی امداد کے لئے سپاہی بھی مہیا کئے۔ اور ۱۸۵۸ء میں حملہ ستھانہ کے وقت وہ خود اپنی فوج کی کمان پر ساتھ موجود رہا۔ اس کے صلہ میں اس کے لئے نوابی کے خطاب اور پانچ ہزار روپیہ کی خلعت کی سفارش کی گئی۔ لیکن ان کی منظوری سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔

وہ اچھی خو بو رکھنے والا تھا لیکن شجاعت و دلیری میں اپنے باپ سے بہت کم تھا۔ اور وہ اپنے وزیروں کے ہاتھ میں تھا۔ خاص کر بوستان خان کا جس کے متعلق یہ شبہ تھا کہ متذکرہ بالا دو انگریزوں کے قتل میں اس کا ہاتھ تھا۔ اور آخر کار اس سیاسی قیدی کی حیثیت میں لاہور کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

نواب محمد اکرم خان

نواب جہانداد خان کی موت جب کہ وہ کشتی میں سوار دریائے سندھ عبور کر رہا تھا۔ فوراً بہ تاریخ ۶ر نومبر ۱۸۵۸ء میں واقعہ ہوئی۔ اس کا اکلوتا بیٹا محمد اکرم خان اس وقت نو سال کا تھا۔ یہ خدشہ تھا کہ پائندہ خان کا چھوٹا بھائی مدد خان جو پُھلڑا کا خان تھا نوابی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن میجر بیچر ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے کمال ہوشیاری سے اس خطرہ کا سدِ باب کر دیا اور مدد خان نے سب سے پہلے اکرم خان کے سر پر خانی کی پگڑی باندھی اور اس کی اطاعت قبول کی۔ ریاست کے انتظام کی باگ محمد اکرم خان کی دادی کے ہاتھ میں رہی جو کہ بہت زیرک اور ہوشیار عورت تھی اور قابل اعتماد آدمی اس کے صلاح کار مقرر کئے گئے۔ چند سال بعد ہی نوجوان نواب نے اپنے ملک پر قبضہ و اقتدار جما لیا۔ اور اپنی موت تک با اقتدار رہا۔

۱۸۶۸ء میں کالا ڈھاکہ کی دوسری مہم میں اس نے بڑی دلیری اور بہادری سے انگریزوں کی مدد کی۔ اُس کے باپ اور اُس کی اپنی خدمات کے صلہ میں اس کو نواب بہادر کا خطاب ۱۸۶۸ء میں ملا۔ جنوری ۱۸۷۰ء میں اس کو پانچ سو روپیہ ماہوار کا الاؤنس ملا۔ ۱۸۷۱ء میں سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب اور ۱۸۸۸ء میں کالا ڈھاکہ کی جنگ کے صلہ میں سر کا خطاب ملا۔

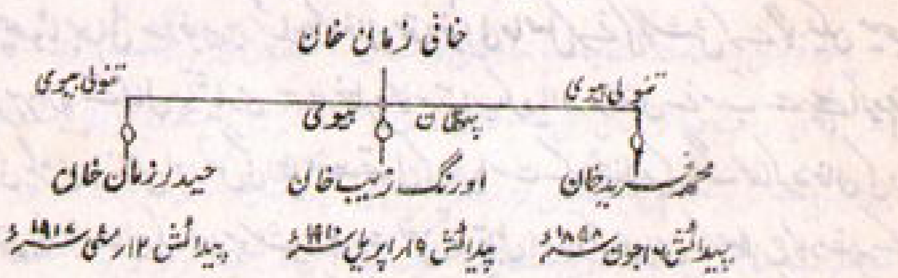
نواب محمد اکرم خان۔ سیرت و اطوار

وہ اپنے دادا پائندہ خان کی طرح شجاع، بہادر اور مضبوط کیریکٹر کا آدمی تھا۔ اور ریاست کا انتظام فولادی ہاتھ سے کیا۔ اس کی مخالفت کا انجام سخت تباہ کن تھا عمر کے آخری پندرہ سالوں میں

اگرچہ وہ بیمار رہا لیکن اس کا دماغ ویسا ہی بیدار رہا۔ اور عزم و تدبر میں بال برابر فرق نہ آیا۔ اپنے سیاسی شعور کی بنا پر اپنے مخالفین کا بہتر توڑ کرتا رہا۔ اپنی دولت اور حدود ریاست علاقہ غیر میں برابر توسیع کرتا رہا۔ اس کا اثر ورسوخ مداخیل اور حسن زیوں (ابراہیم خان حسن زئی کی لڑکی سے اس نے شادی کر لی تھی۔) بہت کافی تھا۔ اور سرکار انگریزی اپنی تمام مشکلات سرحدات کالا ڈھاکہ وغیرہ میں اس کی امداد ہی سے کامیاب ہوتی رہی۔

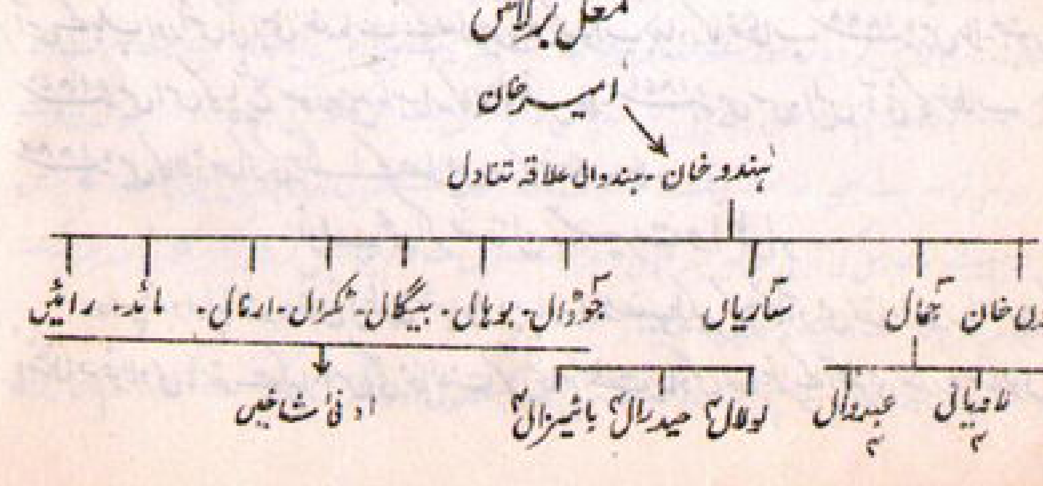
نواب محمد اکرم خان اور اس کا جانشین نواب خانیزمان خان

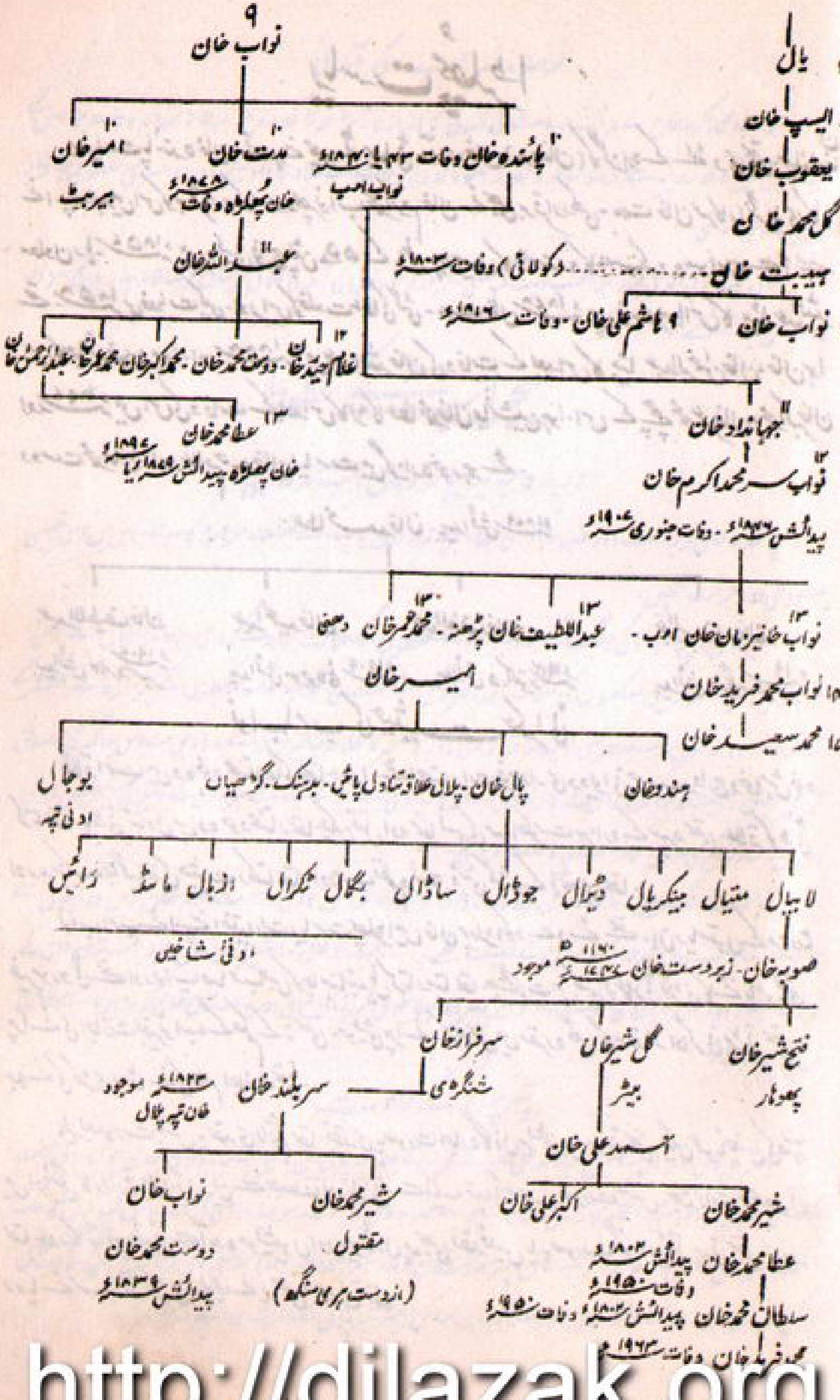
نواب محمد اکرم کے پندرہ بیٹے تھے۔ سب سے بڑا خانی زمان تھا جو ولی عہد بھی تھا۔ لیکن عمر کے آخری سالوں میں نواب محمد اکرم خان اس سے ناراض ہو گیا اور اپنے ایک چھوٹے لڑکے عبداللطیف خان کو ولیعہد بنانے کا خواہشمند تھا لیکن برطانوی حکومت نے خانی زمان خان ہی کو ولی عہد منظور کیا۔ محمد اکرم خان کی وفات کے بعد خانی زمان خان نواب ہوا۔ اس کی قوم اور سب بھائیوں نے اس کو نواب مانا۔ وراثت کی تقسیم میں پڑھنہ کا علاقہ عبداللطیف خان اور اس کے بھائیوں کو ملا۔ اور محمد عمر خان جو تیسری بیوی سے تھا اس کو دھمنی کا علاقہ دیا گیا۔ یہ سب بھائی نواب کے گزارہ خور کہلائے اور اس کے ماتحت نواب خانی زمان خان کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۶۳ء ہے اور وفات میں ہوئی۔



شجرہ نسب قوم تنولی

مغل برلاس





ریاست پھلڑا

یہ ریاست پائندہ خان نے اپنے چھوٹے بھائی مدّت خان (مددخان) کو گزارہ کے لئے دی تھی جہاندادخان نے اپنے عہد میں اس کو برقرار رکھا۔ اور پھر نواب محمد اکرم خان نے بھی برقرار رکھی۔ مدت خان سرکار انگریزی کا معاون رہا۔ ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج پلٹن ۵۵ کے باغی سپاہیوں کا راستہ روکا جبکہ وہ سوات سے آ رہے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں خدمات کیں۔ اور اس کو خلعت عطا کی گئی۔ مدت خان ۱۸۷۶ء میں فوت ہوا اس کا بیٹا عبداللہ اس کا جانشین ہوا۔ اور ۱۸۸۴ء میں عبداللہ خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن خان، خان ہوا اور ۱۸۹۶ء میں اس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا عطا محمد خان جانشین ہوا۔ اس کے چچے محمد عمر خان، محمد اکبر خان دوست محمد خان، اور غلام حیدر خان ریاست میں گزارہ خور ہو گئے۔

عطا محمد خان پیدائش ۱۸۷۹ء

عبداللطیف خان	عبدالحمید خان	عبدالغفور خان	عبدالستار خان
پیدائش ۱۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء	پیدائش ۳ر جولائی ۱۹۰۹ء	پیدائش ۵ر اکتوبر ۱۹۱۲ء	پیدائش ۸ر اگست ۱۹..ء

نواب امب کی حیثیت حکمرانی

علاقہ امب میں وہ خود مختار حاکم تھا۔ اور اپنے اختیارات فوجداری و دیوانی حسب رواج و خواہش خود کرتا تھا۔ بالائی تناول میں وہ خود مختار رہتا تھا۔ لیکن قتل اور پھانسی کی سزا حکومت ہزارہ کے سپرد تھی۔ علاقہ کولائی اور بدہنگ جاگیردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور سب نظم و نسق ڈپٹی کمشنر کے ہاتھ میں تھا۔

نواب امب نے اپنے اختیارات ریاست پھلڑا میں خان پھلڑا کو دے دئے تھے۔ ان ریاستوں کے مزارع غیر موروثی تھے اور نواب صاحب جس کو چاہتا تبدیل کرتا رہتا تھا۔ جنگلات میں کسی کو عمارتی لکڑی کاٹنے یا مویشی چرانے کی اجازت بغیر نواب کے حکم کے نہ تھی۔ مویشی چرانے کے عوض میں مقررہ گھی کی مقدار ادا کرنی پڑتی تھی۔ جلانے کی لکڑی اٹھانے کی عام اجازت تھی۔

مالیہ بصورت جنس یا نقدی لائج تھا۔ نقدی بصورت اجارہ گاؤں پر تشخیص ہوتی تھی۔ لیکن عموماً جنس کی صورت میں ادائیگی کا رواج تھا۔ آبی زمین سے نصف اور بارانی سے ایک تہائی حصہ بصورت جنس۔ جندرات پر محصول تھا۔ اور کاغان وغیرہ سے آمدہ مویشیوں اور ریوڑوں پر بھی نقد فیس یا بصورت گھی ادائیگی ہوتی تھی۔ اور دریائے سندھ سے لکڑی لے جانے پر بھی محصول تھا۔

نواب صاحب کی آمدنی

نواب محمد اکرم خان کے وقت ریاست کی آمدنی کا اندازہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تھا۔ وفات پر اس کے خزانہ میں تین لاکھ روپیہ سے زائد موجود تھا (سونا اور زیورات کے علاوہ) مویشی اور دوسری منقولہ جائداد بھی بہت زیادہ تھی۔

خان پھلڑا کی آمدنی بمقابلہ امب بہت کم تھی۔ گزارہ خوروں کی آمدنی نکال کر خان کو سالانہ چار پانچ ہزار روپیہ بچ جاتے تھے۔

میجر ایبٹ کے خطوط

دربارہ جاگیر جہانداد خان امب نمبر ۱۵ $\frac{6}{5}$

پائندہ خان زبردست اور مضبوط آدمی تھا۔ جہانداد خان باپ سے مختلف مزاج کا ہے۔ اس میں اس جیسی مضبوطی اور جرأت نہیں۔

سبراؤں (پنجاب) کی جنگ کے بعد ہزارہ نے سکھوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جہانداد خان نے اس دوران میں اپنے علاقہ میں سکھوں کی املاک اور افراد کی حفاظت کی۔ گلاب سنگھ سکھوں کے ہزارہ کے لشکر کے کمانڈر نے دوابہ سرن و سندھ میں بقیہ علاقہ۔ کولائی اور کانجر کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ میں نے اس جاگیر کی تصدیق کر دی۔ لیکن رعیت کو جہانداد خان کے کارندوں کے ظلم و زیادتی سے بچانے کے لئے ہر موضع کے مالیہ کی تشخیص کر دی اور بیگار اور جبری فوجی ملازمت کی ممانعت کر دی۔

گزشتہ جنگ میں جہانداد خان ہمارا وفادار رہا۔ حالانکہ اس کا دلی دوست غلام خان ترین دُرانیوں سے جا ملا۔ ..... امب اور عشرہ اقوام ہمارے ملکیت تھے۔ ..... جہانداد خان عملاً شیر زمان خان اور بوستان خان کے زیر اثر ہے۔ اور حسن زیوں کی جنگ کے موقع پر ہر دو بھائیوں شیر زمان خان اور بوستان خان کو ہزارہ سے خارج کر دینا چاہئے۔

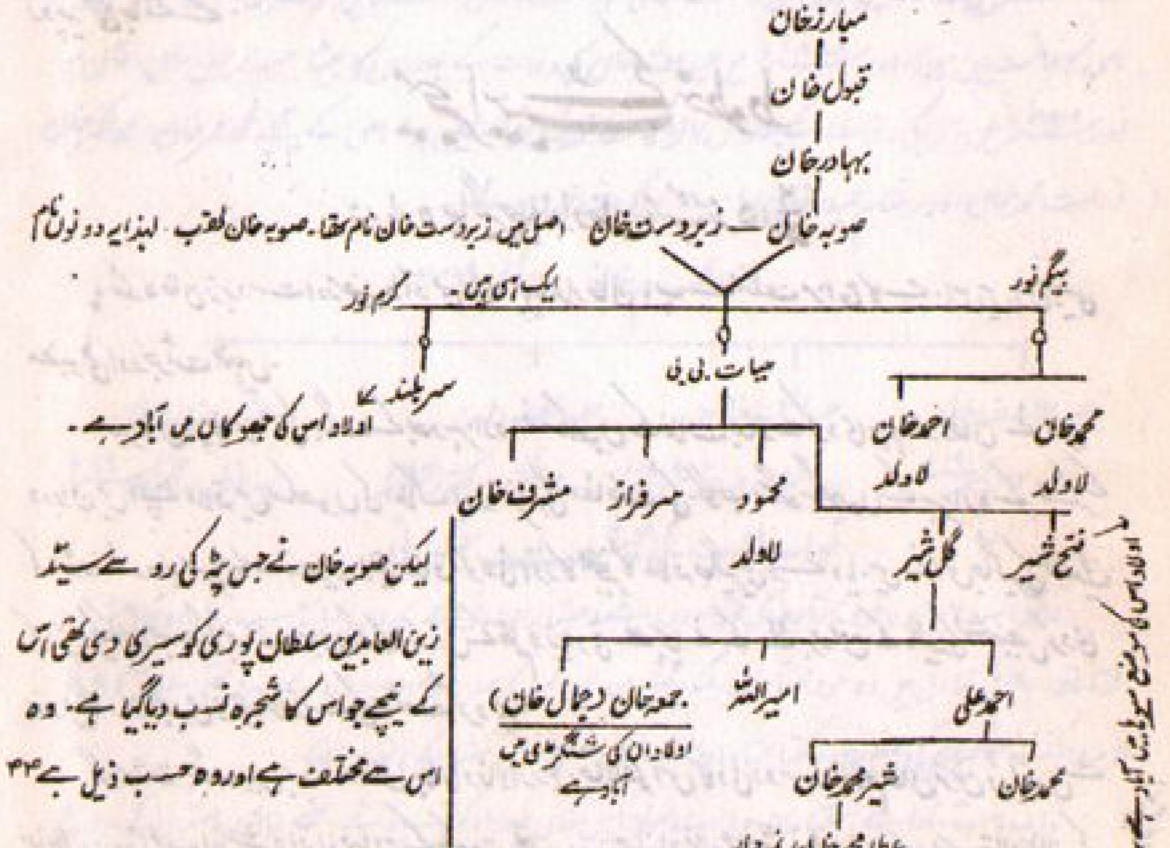
تپہ پلال کے حالات

ہاشم علی خان جندوال کے قتل اور احمد علی خان کے فرار کے بعد تپہ پلال میں باہمی کشت و خون جاری ہو گیا۔ اور سخت خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ انجام کار سربلند خان کے پوتے صوبہ خان کا اقتدار ہو گیا۔ اسی کی زندگی میں تپہ پلال کا ملک سکھوں کی عملداری میں آ گیا۔ نواب خان پسر سربلند خان کو اور شیر احمد خان پسر احمد علی خان کو جاگیر مل گئی۔ نواب شاہ ساکن شنگری رحمت اللہ خان اور عطا محمد خان ساکن بیٹر تپہ پلال کے وارث ہوئے۔

تپہ پلال میں صوبہ خانی گھر کی خانی ہے۔ صوبہ خان کی اولاد سے فتح شیر خان کی اولاد بھوبار میں۔ گل شیر خان کی اولاد بیٹر میں جاگیردار ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں مندرجہ بالا خوانین کی اولاد سے تین جاگیردار علی گوہر خان (بھوبار) سلطان محمد خان (بیٹر) اور دوست محمد خان (شنگرہی) میں تھے۔ سلطان محمد خان نواب امب کا داماد تھا۔

شجرہ قوم تنولی ۔ خان خیل

مطابق صورت دیہی موضع بیٹر



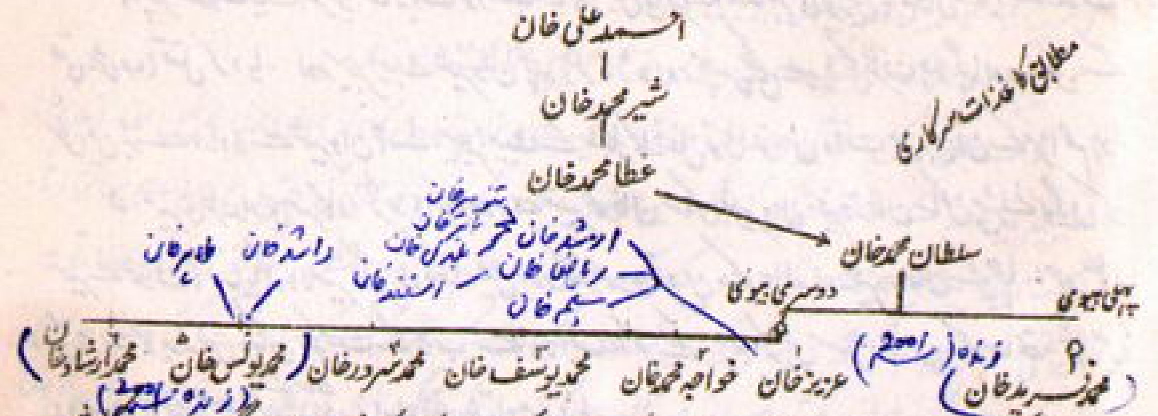
لیکن صوبہ خان نے جس پٹہ کی رو سے سید زین العابدین سلطان پوری کو سیری دی تھی اس کے نیچے جو اس کا شجرہ نسب دیا گیا ہے۔ وہ اس سے مختلف ہے اور وہ حسب ذیل ہے ۴۴

۴۴ بیر خان — آدم خان — عبدالکریم خان — قاضی خان — شیر خان — شمشیر خان — متولی خان — بہادر خان — صوبہ خان (زبردست خان)

اس شجرہ نسب میں صوبہ خان کا جدِ اعلیٰ بیر خان دکھایا گیا ہے۔ اور بندوبست ۱۸۷۲ء کی رو سے تنولیان ہزارہ کو امیر خان کی اولاد بتایا گیا ہے۔ اور یہ دونوں نام ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ صوبہ خان کی مہر جو بندوبست (تاریخ) ہزارہ ۱۸۷۲ء میں دی گئی ہے اس میں ۱۱۶۰ھ درج ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صوبہ خان ۱۷۶۰ء میں اس علاقہ کا صوبیدار تھا۔ یہ زمانہ احمد شاہ ابدالی کے عروج کا تھا۔ اور یہ اسی کی طرف سے اس علاقہ کا صوبیدار ہوگا۔ صوبہ خان کے عہد کی تاریخ بندوبست ہزارہ میں دئیے ہوئے شجرہ نسب سے بھی ہوتی ہے۔

عطا محمد خان صوبہ خان کی پانچویں پشت میں ہے۔ اور یہ ۱۸۷۲ء موجود تھا۔ گویا صوبہ خان سے تقریباً ۱۲۰ سال بعد اس کا زمانہ ہے لہٰذا صوبہ خان کا عہد یقیناً ۱۷۶۰ء کا زمانہ ہے۔

خانانِ بیٹر کا شجرہ نسب



حالات جاگیر۔ احمد علی خان تپہ پلال کا خان تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا لڑکا شیر محمد خان جاگیردار ہوا اس کا اثر و رسوخ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران بہت مفید ثابت ہوا۔ شیر محمد خان ۱۸۶۹ء میں فوت ہوگیا اور اس کا اکلوتا بیٹا عطا محمد خان جاگیردار ہوا۔ اس کی وفات ۱۸ نومبر ۱۸۷۲ء میں ہوئی۔ اور اس کا جانشین اس کا اکلوتا بیٹا سلطان محمد خان ہوا۔ سلطان محمد خان ۲۵ دسمبر ۱۹۳۵ء کو فوت ہوا۔ اس کا جانشین اس کا بڑا لڑکا محمد فرید خان ہوا جو کہ سب انسپکٹر پولیس تھا۔ محمد فرید خان پاکستان بننے کے بعد عبدالقیوم خان کی وزارت میں محکمہ صحت کا وزیر رہا۔

خان بیٹر کی جاگیر/ ۲۳۱ روپیہ تھی۔

خاندان چھمبڑ

کاغذات دفتر ڈپٹی کمشنر ہزارہ میں ایک انگریزی درخواست بنام کمشنر از جانب عنایت اللہ خان چھمبڑ ہے مندرجہ ذیل واقعات اختصار کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں اس سے تنولی خاندان چھمبڑ کی خدمات اور اس قوم کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس درخواست انگریزی پر عنایت اللہ خان کے اپنے دستخط انگریزی میں ہیں۔ اور تاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء درج ہے۔

۱۔ میرے دادا زبردست خان نے احمد شاہ ابدالی کی خدمات کے صلہ میں تناول کی صوبہ داری حاصل کی تھی۔ اور اس کو بارہ ہزار روپیہ کی جاگیر کشمیر میں اور بارہ ہزار روپیہ مالیہ ٹیکس کی شکل میں معاوضہ ملا۔ یہ ٹیکس اس مال پر لیا جاتا تھا جو کابل اور کشمیر کے درمیان تجارت کے لئے آتا تھا۔

۲۔ ملتان کی بغاوت میں میرا بھائی نواب خان میجر ایبٹ کے ہمراہ تھا۔

۳۔ چتر سنگھ کی بغاوت میں میجر ایبٹ کے ہمراہ میں معہ اپنے بھتیجے دوست محمد اور اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اس کے تعاقب میں گئے۔

۴۔ چتر سنگھ نے ایک انگریز سارجنٹ کو (اغلباً کنارا جس کی قبر اب تک ہری پور میں بالمقابل بنگلہ اسسٹنٹ کمشنر موجود تھی۔ ش ب) قتل کر دیا۔ اور میجر ایبٹ شیروان چھوڑ کر ناڑہ اور پھر پکھلی سوہا کی طرف چلا گیا اور مانگل کے خوانین بُرے ارادہ سے شیروان آئے۔ میجر ایبٹ کے بنگلہ کا قفل توڑا تو اس وقت میں ہی اُن کے مزاحم ہوا۔

۵۔ میری طرفداری سرکار انگریزی کی وجہ سے شیر محمد خان ساکن شیروان، فیروز خان ساکن بیڑ نے لوگوں کو میرے خلاف اُکسایا کہ وہ میرا گھر بار لُوٹ لیں اور شیر محمد و قمردین کے والد اور فیروز خان کے چچا، احمد علی کی موت کا بدلہ لیں۔ لیکن حکومت کے رُعب سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ جب کہ میں مسٹر رابنسن کے ساتھ مانگل میں دوست محمد خان میجر ایبٹ کے ساتھ اور نواب خان ملتان میں رہا۔

۶۔ گلی دوتار واقعہ دھمتوڑ کی لڑائی مابین (چتر سنگھ) اور جنرل نکلسن و میجر ایبٹ میں ان کے ہمراہ تھا۔

۷۔ ملتان کی جنگ میں جب سکھوں نے ڈاک روک لی تو میں اپنے آدمیوں کے ذریعے صحرا سے ڈاک ملتان پہنچاتا رہا۔

۸۔ جنگ سلم کھنڈ خلاف چتر سنگھ میں میرا ایک آدمی زخمی ہوا اور تنار خیلیوں کی طرف سے عطا محمد مارا گیا۔

۹۔ جب غلام حیدر خان دُرّانی ہزارہ میں آیا تو خانی زمان خان تنار خیلی میرے پاس آیا اور دوستی کا واسطہ دے کر کہا کہ دُرّانیوں نے ہزارہ لے لیا ہے اور وہ مجھے غلام حیدر خان کے پاس لے جا کر جاگیر دلوا دے گا۔ لیکن میں نے انکار کیا۔ حالانکہ ہزارہ کے سب رئیس سوائے میر زمان خان کھلابٹ، غلام حیدر خان سے مل گئے تھے۔ اور انہوں نے میری سب جائیداد لُوٹ لی تھی۔

۱۰۔ میں اور راجہ حیدر بخش میجر ایبٹ کے ہمراہ کالا ڈھاکہ کی جنگ میں شامل تھے۔ ہم ہی نے شنگلی کا قلعہ مسمار کیا اور کوہانی کے گاؤں کو جلایا۔

۱۱۔ ۱۸۵۷ء کے غدر دہلی کے وقت میں نے بمعہ اپنے آدمیوں کے میجر ایبٹ کے خزانہ دمیگزین کی حفاظت کی۔

۱۲۔ اسی زمانہ میں جب قوم ڈھونڈ علاقہ مری کے باشندوں نے بغاوت کی تو میرا بھائی نواب خان وہاں بھیجا گیا۔ سخت برف اور تیز روشنی کی وجہ سے وہ اندھا ہو گیا۔

۱۳۔ جنگ اگرور، بلند کوٹ، میں موجود تھا۔ میرے دو آدمی بھی مارے گئے تھے۔"

مندرجہ بالا درخواست اس زمانہ کے حالات پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ ایک واقعہ کی تائید میجر ایبٹ کے پروانہ سے ہوتی ہے جو اس نے عنایت اللہ خان و دیگر خوانین کو مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۴۸ء میں لکھا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"آپ نے بڑی بہادری اور شجاعت سے باغی سکھوں اور فتح مازلی (فتح مصلیٰ؟) کو ہری پور کی لڑائی میں شکست دی اور فتح حاصل کی۔ میں تمہاری ان بہترین خدمات کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ آپ اپنی اچھی خدمات اسی طرح جاری رکھیں گورنمنٹ کی مہربانی اور نوازش کا باعث ہوں گی۔"

میجر ایبٹ کے سرٹیفکیٹ ہزارہ مورخہ اپریل ۱۸۵۳ء کا ترجمہ

"نواب خان ساکن شنگڑی سربلند خان کا لڑکا ہے جو تمام تناول کا آخری خود مختار رئیس تھا۔ نواب خان نے میجر ایڈورڈ کے ساتھ ملتان کی جنگ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ ناڑہ کی مہموں میں میرے ساتھ رہا۔ یہ ایک اچھا سپاہی ہے جب کہ ہزارہ کے ایک با اثر رئیس غلام خان ترین نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ تو یہ مضبوطی سے میرے ساتھ رہا۔ اُس کی اس خدمت کے صلہ کے لئے حکومت کو سفارش کی گئی ہے۔ یہ اپنی جاگیر کے تبادلہ کی خواہش رکھتا ہے۔ اور میں افسوس کرتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں ہو سکے گا۔ ابھی تک پرانی جاگیروں کی منظوری بھی گورنمنٹ سے موصول نہیں ہوئی۔"

علاقہ تناول سے متعلق راورٹی کی کتاب "اقوام افغان" سے مندرجہ ذیل اقتباس تاریخی اہمیت کے حامل ہیں:-

پھوہار (بیڑ پھوہار) سے پانچ میل کے فاصلہ پر موضع گندف واقع ہے جس میں سید بستے ہیں۔ گندف سے آگے موضع توّبی ہے۔ جو اُتمان زئی منڈڑ کی شاخ ابازئی کا گاؤں ہے۔ شیر خان تنولیوں کے خان کا علاقہ گندف کے گاؤں پر ختم ہو جاتا ہے۔

توّبی سے آگے تربیلہ کا گاؤں ہے جو کافی آبادی والا گاؤں ہے اس میں ابازئی (اتمان زیوں کی شاخ) قوم بستی ہے اور بلند خان ابازئی قبیلہ کا سردار بھی یہیں رہتا ہے۔ اس جگہ بہت سی کشتیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں اور حسب دستور مسافروں اور سوداگروں سے محصول لیا جاتا ہے۔

چونکہ کابل، کشمیر، اور پکھلی کے سوداگر زیادہ تر یہیں سے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہیں۔ لہٰذا بلند خان کو سالانہ کچھ روپیہ تیمور شاہ سدوزئی کابل کے خزانہ سے حاکم اٹک کی معرفت بطور جاگیر یا الاؤنس اس گھاٹ کی حفاظت کے لئے ملتا ہے۔

ضلع تربیلہ کے آٹھ گاؤں دریائے سندھ کے مشرق میں اور تین (کھبل۔ کیا۔ ستھانہ) مغرب میں ہیں۔ یہاں پر دریائے سندھ سے کافی سونا نکالا جاتا ہے۔

دریائے سرن کوٹ عیسیٰ خان کے نزدیک (موجودہ بھاروکوٹ۔ ش ب) دریائے دھرم توڑ (دھمتوڑ یعنی دریائے دوڑ۔ ش ب) اور دریائے جلسی (یہ کھلابٹ کے پاس پانی کا نالہ ہے) سے مل جاتا ہے۔

کوٹ جلبسی خان کچی اینٹوں کا بنا ہوا پرانا قلعہ ہے جو کھلابٹ سے بطرف شمال۔ شمال مغرب دو کوس کے فاصلے پر ہے اور اس کے جنوب میں جلبسی او ر دریائے سیرن بہتا ہے۔ اور قلعہ کے مغرب میں یہ دوڑ اور جلبسی کے ملے ہوئے دریا میں مل کر تربیلہ کی طرف بہتا ہے۔ اس قلعہ کے مغرب میں سیّدوں کا گاؤں صوابی ایک کوس کے فاصلہ پر ہے ـــــ لالوگلی سے نصف کوس آگے گل شیر خان چیف آف تناول کا گاؤں ویرہ ہے۔ یہ خان شاہ کابل کا فرماں بردار ہے اور اس جگہ پر کشمیر، پکھلی اور پشاور کی قیمتی اشیاء کا کاروبار ہوتا ہے۔ گاؤں سے تھوڑی دور مغرب میں ایک بہت مضبوط قلعہ جو کچی اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ واقع ہے اس سے تھوڑی دور مغرب کی طرف دریائے سندھ بہتا ہے۔"

تنولیوں کے دیہات کے متعلق مختصر تاریخی حالات

موضع کالنجر۔ اندراں (تنولیوں) کا گاؤں ہے جو عہدِ مسلمانی سے اس پر قابض ہیں۔ پہلے ترک قوم یہاں آباد تھی۔ دو سو بیس سال ہوئے کہ ان کو بے دخل کر کے تنولیوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ صوبہ خانی خوانین کے ماتحت رہے ہیں۔ اس گاؤں پر سیّدان صوابی کا تصرف بوجہ اولاد پیر بابا کے ہونے کے رہا ہے۔ ترکاں کے وقت سے اس گاؤں کا عشر بزرگان سیّدان کا خان کو جو صوابی میراکے سیّدان کے یک جدّی ہیں ملا کرتا تھا۔ تو صوبہ خان کی طرف سے یہ عشر سیدان صوابی کو ملتا رہا۔

لالوگلی۔ یہ گاؤں ترکوں کے وقت سے جو اس کے اصلی وارث تھے، آباد تھا۔ اور قوم آوان۔ شدوال اس میں بستے تھے۔ جب تنولی پار دریائے سندھ سے آئے اور انہوں نے قوم ترک کو بے دخل کیا تب بموجب تقسیم قوم یہ گاؤں وراثتاً قوم تنولی متیال و بھنگریال میں نصفا نصف تقسیم ہوا۔

علاقہ بدہنگ۔ ۱۔ **موضع حال کالو**۔ یہ رقبہ موضع دیرہ کا ہے اور ترکوں کے وقت سے آباد ہے۔ کالو نام ایک شخص اس کا آباد کنندہ ہے جس کو یہ جاگیر میں ملا تھا۔ ۲۔ **موضع چیندہور**۔ ترکوں سے تنولیوں نے لیا وجہ تسمیہ چیندہ بیوی کی وجہ سے چیندور مشہور ہو گیا۔ خانقاہ اس کی اب تک موجود ہے۔

۳۔ **بدھوڑا**۔ آبادی عہدِ شاہان مسلمان سے ہے۔ وجہ تسمیہ باؤ درہ تھا۔ یعنی ہوا اس جگہ زیادہ چلتی تھی بکثرت استعمال بدھوڑا مشہور ہوا۔ اکثر لڑائی عہدِ سکھاں میں پائندہ خان امب والے سے یہیں ہوتی تھی۔ یہاں سکھوں کا ایک قلعہ تھا۔

۴۔ **سیدپور**۔ سیّدوں نے آباد کیا۔ لہٰذا یہ نام ہوا۔ ترکوں سے بزورِ شمشیر متوالی خان تنولی نے حاصل کیا۔ اب تنولی متیال آباد ہیں۔ یہ رقبہ بیشتر بھوپار کا ہے۔

۵۔ **لنگر۔ نوارگاہ۔ اونچا بیلہ**۔ لنگر کی آبادی سب سے پہلے شلمانیوں کے وقت کی پائی جاتی ہے۔ پھر یہ گاؤں تنولیوں نے کچھ بزور اور کچھ بزر حاصل کر لیا۔ یہ گاؤں سرحدبدی پر تھا۔ ادھر تنولی اور اُدھر تارخیلی وغیرہ تھے۔ پہلے صوبہ خانی اس پر قابض تھے۔ آخیر عملداری مسلمانان و شروع عملداری سکھاں میں نواب خان و پسرش پائندہ خان زور پکڑ کر غالب ہو گئے۔ اور صوبہ خانی مغلوب ہو گئے۔ نواب خان اور پائندہ خان نے اس گاؤں کو اور اس علاقہ کے دیگر دیہات کو اکثر ویران کیا۔ چونکہ اس دہ میں قوم سیّدو خان خیل آباد تھے۔ عموماً ان کا لحاظ ہی ہوتا تھا۔

وجہ تسمیہ۔ اس جگہ شفی خان شلمانی کا لنگر جاری تھا۔ اس واسطے یہ نام ہوا۔

۶۔ **موضع کھبی**۔ آبادی پرانی اور ہندوؤں کے زمانہ سے ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے حملہ ہندوستان کے وقت ہندو لوگوں کو مار بھگایا اور اس وقت یہ ملک قوم ترک کے قبضہ میں آیا۔ مگر ترکوں کے وقت بھی یہی قوم شدوال آوان بطور رعیت ترکان آباد تھے۔ ازاں بعد لابیہ خان تنولی نے پار سے آ کر اس گاؤں کو بشمول کل علاقہ بزورِ شمشیر ترکوں سے حاصل کیا۔

۷۔ **کھیری**۔ قوم شدوال آوان کی آبادی ترکوں کے وقت سے ہے

۸۔ **سدوبان**۔ ترکوں سے تنولیوں نے بزور لیا۔ بجوال تنولی قابض ہیں ان کے بزرگان کی جانب سے روح اللہ شدوال اور مہند اللہ بیروال کے پاس رہن تھا۔ نواب خان تنولی ساکن امب کے زمانہ میں ملک میں ویرانی ہوئی تو یہ گاؤں بھی بے چراغ ہو گیا۔

۹۔ **جھنجھکہ**۔ ترکوں سے تنولیوں نے بزور لیا۔ تنولی جھنسیال قابض ہیں۔ اور کچھ کرگیال بھی۔ نواب خان امب والا کے حملوں سے یہ بھی ویران ہوا۔ وجہ تسمیہ: ابتدائی آبادی میں ایک جھنج (برات) اس گاؤں میں آئی۔ اس کی خاطر مدارات اچھی طرح نہ ہوئی۔ برات والوں نے ازراہِ تمسخر اس گاؤں کا نام جھنجھکہ مشہور کر دیا۔

۱۰۔ **کنڈیالہ**۔ ترکوں سے تنولیوں نے بزور لیا۔ قوم تنولی تیولی خانی و بہادر خانی آباد ہیں۔ نواب خان تنولی کی لوٹ مار سے غیر آباد ہوا۔

۱۱۔ **ملیارہ**۔ بنا کردہ ایک ملیار کے ہے اس واسطے یہ نام ہوا۔ بے چراغ ہے۔ قوم تنولی خان خیل صوبہ خانی کا ہے۔

۱۲۔ **دکھوٹ**۔ اب بے چراغ ہے۔ بے دخلی ترکان کے بعد قوم جنگیریال آباد ہوئی۔

۱۳۔ **تومی**۔ علاقہ کولائی۔ قوم تنولی سنہال اور پٹھان اخون خیل آباد ہیں۔ سب سے پہلے مورث اعلیٰ ساہن نے آباد کیا۔ اور اپنی امداد کے لئے اخون خیل کو شریک ملکیت کیا۔

۱۴۔ **دیرہ**۔ علاقہ کولائی۔ یہ جگہ ترکوں سے تنولیوں نے بزور لی۔ قوم تنولی۔ خان خیل۔ صوبہ خانی قابض ہیں۔ وجہ تسمیہ چونکہ قوم تنولی نے بوقت حصول و دخل دریائے سندھ سے اپنے اسباب اس پار اتار کر اس جگہ ڈیرہ

جہاں یہ گاؤں آباد ہے ڈیرہ کیا تھا اس واسطے یہ نام ہوا۔

کرپلیاں۔ ملک تنولی، گوت بگیال۔ یہ موقع بھی تنولیوں نے پار دریائے سندھ سے آ کر ترکوں سے لیا۔ وجہ تسمیہ۔ قوم تنولی کی آبادی کے وقت ایک ترک نام کرپا تنولیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لہذا یہ نام ہوا۔

ماڑی۔ بوجہ ماڑی (کمزور) زمین کے نام ہوا۔ تنولیوں کے حملہ از پار دریائے سندھ کے وقت بھکیرا خان تنولی نے آ کر ترکوں سے بزور لیا۔

جَبَرل۔ عملداری مسلمانی میں تنولیوں نے ترکوں سے بزور لیا۔ وجہ تسمیہ۔ ترکوں کے وقت کسان قوم جبرل کے آباد ہونے کی وجہ سے یہ نام ہوا۔

گدا۔ ترکوں نے تنولیوں سے بزور لیا۔ آخیر عہد اسلام تک وراثت کی تقسیم میت کی اولاد نرینہ جو گھر بیٹھنا کے لائق ہوتا تھا کے حساب سے ہوتی تھی۔ بعد میں شیروان والوں نے لوٹ لیا۔

بیٹر۔ یہ بھی تنولیوں نے ترکوں سے بزور لیا۔ دو تین مرتبہ غیر آباد ہوا۔ پائندہ خان تنولی نے اس کو دوبارہ آباد کیا۔ سب سے پہلا خان جیر مبارز خان ہوا۔ جس کا شجرہ نسب یہ ہے۔

مبارز خان ـــــ قبول خان (صحیح نام متولی خان ہے دیکھو شجرہ نسب صوبہ خان) بہادر خان ـــــ صوبہ خان

نوٹ۔ تاریخ فارسی قلمی (جہاب سنگھ) میں تحریر ہے کہ صوبہ خان والی ریاست تنول (پلال) خود تو پھوڑا میں رہتا تھا لیکن بیٹر کو اپنے خاص اہتمام و توجہ سے تعمیر کرایا۔ لوگوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو دُور دُور سے لا کر آباد کیا۔

شیروان۔ قوم ترک کا تھا۔ تنولیوں نے بزور لیا۔ کاشتکار اقوام، آوان و سوھن قابض تھے اور تردد کرتے تھے جب تنولیوں کا قبضہ ہوا تو وہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اٹھارہ سال تک ویران رہا۔ تنولی تپہ خوشحال، تپہ عنا نتال، تپہ علیشال میں برابر تقسیم تھا۔

کونڈ چھپاراں۔ بدہنگ۔ قوم تنولی ستیال اولاد ستے خان قابض ہے جو تنولیوں کے ساتھ پار دریائے سندھ سے آیا تھا۔ یہ پہلے ترکوں کا تھا۔ وجہ تسمیہ۔ ابتدائی آبادی چھپاروں کی تھی۔

سنڈہ گنڈہ۔ قوم تنولی پھوال قابض ہے۔ نواب خان نے ویران کیا تھا۔ وجہ تسمیہ۔ ان کے مورث کے دو سنڈے اس کی زمین موسومہ بہ گنڈہ میں لڑے تھے۔ لہذا یہ نام ہوا۔

جھوکاں۔ (بدہنگ) تنولی صوبہ خانی قابض ہیں۔ وجہ تسمیہ۔ صوبہ خان نے اس موقع پر ایک چوکی حفاظت کے لئے بٹھا رکھی تھی۔ گاؤں آباد ہوا تو لفظ چوکی سے غلط العام جھوکاں مشہور ہو گیا۔

باندھی کبرگوال (بدہنگ) قابض تنولی کبرگوال (گوت) ہیں۔ نواب خان تنولی کے حملوں سے لوگ اُجڑ کر جھنگو

علاقہ رشش میں چلے گئے۔

جُبس گراں۔ بدہنگ۔ قوم تنولی دفروال قابض رہے۔ نواب خان نے اس کو اجاڑ دیا تھا چالیس سال ویران رہا آخر عہد سکھاں میں آباد ہوا۔

کھیری۔ بدہنگ۔ تنولی بہادر خانی قابض ہیں۔ قوم ترک کے وقت آبادی آوان شدوال کی تھی۔ نواب خان ہندوال امب والا کے حملوں سے اُجڑتا رہا۔ سکھوں کے وقت امن ہوا اور آباد ہوا۔

چنبیتری۔ بدہنگ۔ تنولی کرگوال قابض ہیں۔ نواب خان تنولی نے اس کو ویران کیا۔ اس نے گاؤں کو جلا دیا۔ بیس برس ویران رہا۔ مہاں سنگھ کے زمانے میں ان سکھوں کے کاردار بخشی سیوا رام کی اجازت سے آباد ہوا۔

قوم گکھڑ

ہزارہ میں باہر سے آنے والی اقوام میں یہ سب سے قدیم قوم ہے۔ شاندار ماضی کی حامل ہے اِن کی حکمرانی اٹک تا جہلم رہی۔ حکومت کا صدر مقام پوٹھوار میں رہا۔

ان کی عظمت و جلالت کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مغل شاہنشاہوں نے ان سے رشتہ داری کی قرابت پیدا کی۔ اور انہوں نے مغل سلطنت کے ساتھ تادم آخر وفاداری استوار رکھی۔ جس کی پاداش میں شیر شاہ سوری جیسے سلطان سے نبرد آزما رہے۔ مستند تواریخ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ گکھڑ:-

۱۔ ایرانی الاصل ہیں۔

۲۔ یہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ وارد پاک و ہند ہوئے۔

۳۔ سلطان محمود غزنوی نے ان کے سردار گکھڑ شاہ کو یہ علاقہ انتظام کے لئے سپرد کیا جس میں وہ آج تک آباد ہیں۔

۴۔ ہاتھی خان پہلا شخص ہے جس کو بابر بادشاہ نے خلعت کے ساتھ سلطان کا خطاب بھی دیا۔ اس سے پہلے وہ راجہ کے لقب سے ملقب تھے۔

۵۔ اس قوم میں لشکر خان پہلا شخص ہے جس کے نام کے ساتھ دیوان کا لفظ اضافہ کیا گیا۔ سلطان جلال کے بھائی مرزا عمر خان اور مرزا احمد لعیف کو مرزا کہا گیا جو مغلیہ عہد میں عموماً شاہزادوں کے لئے مقرر تھا۔ اور غالباً مغلیہ کے آخری عہد میں جب صوبیداری پر سرفراز کئے گئے تو ان کو نواب کہنے لگے۔

۶۔ سلطان محمود غزنوی کا مقابلہ اس علاقہ میں کھوکھروں سے جو نہایت بہادر ہندو قوم تھی ہوا۔ ان کی شکست کے بعد یہ علاقہ گکھڑوں کو ملا۔ اس علاقہ میں سلطان شہاب الدین غوری کھوکھروں اور ملاحدہ کی سازش سے قتل ہوا۔

ضلع ہزارہ میں قوم گکھڑ کے تاریخی حالات لکھنے سے پہلے اس قوم کی تاریخ بحیثیت مجموعی تحریر کی جاتی ہے یہ ایک عظیم قوم ہے۔ اور اپنا شاندار ماضی رکھتی ہے۔ اس کی حکومت از جہلم تا اٹک رہی ہے۔ ان کی تاریخ کا اقتباس مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کی ایک مفصل تنقید سے جو جولائی اگست ۱۹۴۷ء میں معارف اعظم گڑھ میں چھپی تھی۔ جستہ جستہ تحریر کئے جاتے ہیں۔ یہ تنقید گکھڑوں کی تاریخ موسومہ کے گوہر نامہ پر ہے۔ جس کا مصنف رائے زادہ دونی چند برہمن ہے عرف پال جو مبارز خان کے عہد (۱۱۴۳ھ ۱۷۲۵ء) میں قانون گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ گلیانہ تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ فارسی زبان کی معمولی تعلیم تھی۔ حکمت کا کام بھی کرتا تھا۔

اپنے باپ کی جگہ پر متصدیوں میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ دلاور خان گکھڑ کا عہد تھا۔ اور روشن علی خان اس کا دیوان جس نے ایک دن اچانک اس کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ جب رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو پیران پیر حضرت عبدالقادر جیلانی کے وسیلہ سے دعا مانگی جو مقبول ہوئی چونکہ گکھڑ اسی آستانہ کے نیازمندوں میں سے تھے۔ اس لئے ہر شخص نے اس رہائی کو ان کی کرامت سے تعبیر کیا۔ مصنف کو بغداد جا کر زیارت کرنے کا بے حد شوق ہو گیا۔ اس لئے وہ بغیر سامان سفر چل پڑا۔ مدت کے بعد بغداد میں داخل ہوا اور بارہ سال رہ کر موئے مبارک کے ساتھ اپنے وطن پوٹھوار واپس ہوا۔ مگر یہاں دل نہ لگا۔ اس لئے بلوٹ جھنگ سیال، خوشاب، بھیرہ، گجرات، وزیر آباد، سوہدرہ، سیالکوٹ کی سیر کرتے ہوئے جموں پہنچا۔ وہاں راجہ کے مصاحبوں میں داخل ہو کر خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگا۔

اس کتاب کی تصنیف کی وجہ کے تحت وہ لکھتا ہے۔ "ایک دن مجلس میں جموں، جسروٹہ، ہنڈور اور کھلور کے راجے جمع تھے۔ اسی اثناء میں میراثی آئے۔ ستار اور نے کے ساتھ رزمیہ نظمیں گانے لگے۔ جن میں ان کے بزرگوں کی شجاعت کے کارنامے بیان کئے گئے تھے۔

مصنف کا بیان ہے کہ مجھ سے نہ رہا گیا اور لشکر خان ولد سلطان آدم کے جموں پر حملہ کا ذکر کر دیا۔ ان لوگوں نے انکار کیا۔ اس دن تو میں گھر واپس آ گیا اور مہر گل میراثی کو بلا کر گکھڑوں کا نسب نامہ مرتب کر کے اس کو یاد کرایا چند دنوں کے بعد اس مجلس میں سب کے سامنے مہر گل سے سب حالات بیان کرائے۔ دلائل و شواہد سے ان کو منوایا۔ اس کے بعد راجہ کا دل مجھ سے صاف نہ رہا۔ اس لئے بغیر اطلاع وہاں سے سلطان بودھا خان کے قلعہ میں پہنچا۔ اس نے میری بڑی عزت افزائی کی۔ اس درمیان میں مہر گل میراثی سلطان مبارز خان کے دربار میں عید کے دن حاضر ہوا۔ اور اس نے وہ نسب کچھ سنایا جو جموں کے راجہ کے سامنے بیان کیا تھا۔ اور مصنف کے حالات سے بھی آگاہی دی۔ سلطان نے فوراً طلبی کا فرمان سلطان بودھا خان کے پاس بھیجا۔ اس نے

سلطان مبارز خان و سلطان بودھا خان ہم عصر ہوتے۔ یعنی ۱۱۴۳ھ

مصنف کو سلطان کے پاس بھیج دیا۔ جہاں سلطان مبارز خان نے بڑی عزت افزائی کی اور خلعت فاخرہ سے سرفراز فرما کر ارشاد کیا کہ فردوسی نے شاہان عجم کو زندہ کیا۔ گکھڑوں کی تاریخ لکھ کر تم شاہان کیخ (خاندان خسرو) کو زندہ کر دو"۔

مصنف کا بیان ہے کہ اگرچہ ذرہ کو آفتاب سے کیا نسبت۔ پیغمبر شعراء فردوسی طوسی کی اتباع میرے لئے ناممکن تھی۔ لیکن حکم حاکم کی تعمیل بھی ضروری تھی اس لئے ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۵ء) بہ عہد محمد شاہ بادشاہ دہلی موافق سنہ جلوس ماہ ذی قعدہ یک شنبہ کے دن اس کی ابتداء کر دی اور اسی سال کے آخر میں اس کتاب کو ختم کر کے اس کا نام "گوہر نامہ" رکھا۔ اس کے بعد اس کا تتمہ اس کے لڑکے رائے زادہ برج ناتھ نے تحریر کیا۔ اور اس کی اولاد میں سے رتن چند ( ) نے اس کا تکملہ انگریزوں کے عہد میں لکھ کر اس کو مکمل کر دیا۔

یہ کتاب فارسی نثر میں ہے وہ بہترین الفاظ اور پسندیدہ استعارات کے ساتھ اپنے مطلب کو شیریں طور پر ادا کرتا ہے۔ جگہ جگہ پر موتیوں سے اس نثر کو اس طرح پرویا ہے کہ پڑھنے والے کے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ ابتداء میں اس نے زیادہ تر فارسی اشعار دئے ہیں۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے اس پر وطنیت غالب آتی جاتی ہے اور اشعار پوٹھواری زبان میں لکھتا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آخر میں صفحے کے صفحے لکھتا چلا گیا ہے۔ اور اسی پر اس کا خاتمہ ہے۔

مواد تاریخ گکھڑاں۔ مصنف نے ماخذ کا ذکر صریح طور پر کہیں نہیں کیا۔ صرف دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۔ تاریخ فتح خانی مصنفہ مرزا قابل خان ابن مرزا زمان خان۔ ۲۔ تاریخ بڈھالان۔ یہ دونوں گکھڑوں کی ضمنی تاریخیں ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اسی طرح کی اور ضمنی تاریخیں مصنف کے پیش نظر ہوں۔ اغلب ہے کہ مندرجہ ذیل شکلوں سے اس کا مواد موجود ہو گا۔

۱۔ خاندانی کرسی نامہ (نسب نامہ)

۲۔ دیوانی دفتر کے کاغذات۔

۳۔ خاص خاص واقعات کی یادداشت۔

۴۔ مشہور جنگوں کی رزمیہ نظمیں جو بھاٹوں نے بنائیں۔

۵۔ خاص خاص حکمرانوں کے مشہور واقعات جو خاص و عام کے زبان زد تھے۔

۶۔ اور بہت ممکن ہے کہ کوئی مختصر سی تاریخ بھی اس کو دستیاب ہو گئی ہو جو اس کے پیش نظر ہو۔

تاریخ کی ابتداء۔ مؤلف نے تاریخ کی ابتداء اس طرح کی ہے۔ "سلطان کے گوہر، جو کیکاؤس، کیقباد، اور قیصر کا ہم عصر تھا۔ صفاہان کا بادشاہ تھا۔ کیکاؤس کی تخت نشینی انہی سرداران کیانی کی ممنون تھی"۔

ظاہر ہے کہ اس وقت ایران میں عراق عرب سے لے کر ترکستان کی سرحد تک صرف ایک ہی خود مختار سلطنت تھی جس کا شہنشاہ کے خسرو یا کیقباد تھا اور فردوسی کا مشہور ہیرو "رستم" اس کا قوت بازو تھا۔ پس صفاہان کا کوئی خود مختار بادشاہ تو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جس طرح خود رستم باوجود اس قدر عروج کے زابلستان پر ایک باجگذار کی حیثیت سے شاہ ایران کی طرف سے حاکم تھا اسی طرح "کے گوہر" بھی صفاہان کا حاکم ہوگا۔ مؤلف نے آگے چل کر لکھا ہے کہ سلطان کیدبن "کے گوہر" کو ملک گیری کا شوق پیدا ہوا چنانچہ بڑے ساز و سامان کے ساتھ اس نے ملک تبت پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر کے وہیں مقیم ہوگیا۔ اس کا لڑکا سلطان تبت، پھر سلطان جنت، سلطان شجاع، سلطان مدارگ، سلطان بہرہ مند، سلطان نظر، سلطان غالب، سلطان دولت، سلطان خان، سلطان قاب ہوا۔ ان کی گیارہ پشتیں تبت پر حکومت کرتی رہیں۔

مؤلف کا یہ بیان کہ "کے گوہر" کے لڑکے سلطان کید کو فتوحات کا شوق پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو کیونکہ فردوسی کے بیان کے مطابق **کیکاؤس** کی ساری زندگی فتوحات اور مدافعت میں گذری اور شمالی ہند ہمیشہ ایران کا باجگذار رہا۔ اور جب کبھی خراج میں غفلت کی گئی ایرانی فوج نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ انہی حملہ آوروں کے ساتھ "کے گوہر" کا لڑکا بھی آیا ہو۔ مؤلف لکھتا ہے کہ سلطان کید کی گیارھویں پشت میں سلطان قاب ہوا۔ اس نے موقع پا کر کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اور چک قوم کا سردار تنو ہر نامی نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان قاب کے لڑکے **فرخ** نامی سے کر دی۔ اس سے **یزداد** اور اس کا لڑکا نور بدر، اور اس کا فرزند **سلطان مراد** اور اس کا نور نظر **سلطان بختیار**، پھر اس کا بیٹا سلطان عالم اور اس کا لخت جگر **سلطان سمند** تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد سلطان محراب اور پھر سلطان رستم ہوا اور آخر میں سلطان **قابل** یہ سب تخت کشمیر پر رونق افروز ہوئے۔

آگے چل کر مؤلف لکھتا ہے کہ کشمیریوں نے موقع پا کر رستم کو قتل کر ڈالا۔ اور سلطان **قابل** وہاں سے کابل چلا گیا۔ اور تیاری کے بعد اس نے دوبارہ کشمیر کو فتح کر لیا۔ مؤلف نے آگے چل کر لکھا ہے کہ رستم کا لڑکا سلطان قابل ہوا جو کابل پر مستقل قابض تھا۔

ابوریحان بیرونی سے گکھڑوں کے قبضہ کابل کی تصدیق ہوتی ہے۔ کابل کی سرحد اس وقت لمغان تک تھی۔ اور لمغان سے اٹک تک خاندان جے پال ۔۔۔۔ بیرونی نے بتایا ہے کہ شاہ کابل کی سلطنت ساٹھ برس رہی اس حساب سے کابل پر گکھڑوں کا قبضہ چوتھی صدی کی ابتدا (۳۰۰ھ - ۹۱۳ء) میں ہوا۔

بلاذری نے لکھا ہے کہ عہد معاویہؓ میں مہلب بن ابی صفرہ نے تقریباً ۵۰ھ (۶۷۰ء) میں کابل فتح کیا (ص ۴۰۶) اس کے چلے جانے کے بعد شاہ کابل نے مسلمانوں کو نکال دیا۔ پھر عبداللہ بن ابی بکر والی سجستان

نے کابل والوں سے صلح کر لی۔ یعنی شاہ کابل اپنی جگہ پر مستقل رہا۔ یزید کے مر جانے پر کابل والوں نے غدر کیا۔ اور ابو عبیدہ بن زیاد کو گرفتار کر لیا۔ اور جب اس کی آزادی کے لئے فوج بھیجی گئی تو سردار یزید بن زیاد شہید ہوگیا۔ پھر طلحۃ الطلحیات نے پانچ لاکھ فدیہ دے کر ابو عبیدہ کو رہا کرایا۔ اس کے بعد مامون الرشید متوفی ۲۱۸ھ (۸۳۳ء) کے عہد میں کابل فتح ہوا۔ اور شاہ کابل مسلمان ہوگیا۔ بیرونی اور بلاذری دونوں کے بیان سے واضح ہوا کہ مسلم شاہ کابل کا خاندان تیسری صدی ہجری کے آخر تک حکمران رہا اور اس کے بعد گکھڑوں کا اس پر قبضہ ہوگیا۔

مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ سلطان کابل (گکھڑ) امیر سبکتگین کا ہم عصر تھا۔ کابل اور غزنہ کے دونوں امیروں میں لمغان کے مقام پر خوب جنگ ہوئی۔ اور آخر میں صلح ہو گئی۔ اور دونوں کے حدود مقرر ہو گئے۔

مؤلف کہتا ہے کہ "۳۶۹ھ (۹۷۹ء) میں شاہ کابل کی مدد سے سلطان ناصر الدین سبکتگین نے پاک و ہند پر پے در پے حملے کئے اور شاہ کی جرأت و ہمت اور جنگی قابلیت دیکھ کر اس کو سپہ سالار بنا دیا۔ اور کابل کا اپنے ملک کے ساتھ الحاق کر کے اس کو وہاں کا صوبیدار مقرر کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ وفات پا گیا۔ کوہ "عازمان عاشقان" پر اس کی قبر بنا دی گئی۔ اس کے پانچ لڑکے تھے۔ گکھڑ شاہ سب سے بڑا تھا وہی تخت نشین ہوا۔ ۳۸۶ھ (۹۹۶ء) میں سلطان سبکتگین کا انتقال ہو گیا۔ اور سلطان محمود تخت پر بیٹھا اس نے گکھڑ شاہ کو کابل کی صوبیداری پر برقرار رکھ کر اس کی عزت افزائی کی"۔

اس کے بعد مؤلف نے لکھا ہے کہ "۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں سلطان محمود نے گکھڑ شاہ کو "پوٹھوار" کا علاقہ جو دریائے بہٹ (جہلم) اور سندھ کے درمیان تھا بطور جاگیر عنایت فرمایا۔ اور کابل کی صوبیداری اپنی جگہ بحال رہی۔ پاک و ہند اور خراسان کے دروازہ کی حفاظت بخوبی ہو سکے۔ اس کے علاوہ جب سلطان نے دیکھا کہ پاک ہند کے گکھڑ تکلیف دہ ہیں تو اس نے کابلی گکھڑوں کو "پوٹھار" (زیرین کشمیر) کا علاقہ دے کر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے مقولہ پر عمل کیا نیز جیپال کا ایک بازو بھی زخمی کر دیا۔ تاکہ کشمیر کے لوہ کوٹ پر حملہ کرتے وقت یہ لوگ بہترین مددگار ثابت ہوں"۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ سلطان زین العابدین کشمیری کے عہد میں ملک کد نامی غزنہ کے ایک سردار نے جو حاکم کابل سے تعلق رکھتا تھا اس جگہ آ کر بزور یہ علاقہ (پوٹھار) کشمیریوں سے چھین لیا جو جہلم اور سندھ کے درمیان ہے۔

میرے خیال میں مصنف کے بیان اور ابوالفضل کی تحریر میں تطابق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ لوگ جو کابل اور غزنہ میں رہ گئے تھے وہ بھی اس عہد میں آ کر اپنی قوم سے مل گئے ہوں۔ بغرض گکھڑ قوم غزنویوں کے

آخر عہد تک آزادی اور شجاعت کے ساتھ اپنے مقبوضات کے تحفظ اور دفاع میں مصروف رہی۔

مولف نے لکھا ہے کہ سلطان راجو ایک دن شکار کے لئے دریائے جہٹ (جہلم) کے اس پار گیا۔ اور تیتر کو باز پر حملہ کرتے دیکھ کر اس زمین کی آب و ہوا کے صحت بخش ہونے کا یقین کیا۔ اور واپسی کے بعد ایک لشکر جرار کے ذریعہ اس ملک کو فتح کرکے " دانگلی " نامی ایک شہر آباد کیا۔ اور اس کو پایۂ تخت قرار دیا"

مولف کا بیان ہے کہ ایک سو چودہ برس چانہ و بھیرہ میں رہ کر دانگلی میں پایہ تخت تبدیل کیا"

پایہ تخت - مؤلف کے بیان کے مطابق ان کا پہلا پایہ تخت اصفہان تھا۔ پھر خراسان۔ اس کے بعد وہ تبت آئے۔ پھر کشمیر۔ (غالباً جموں) پھر کابل اور جب تعلقہ پوٹھوار میں مستقل جاگیردار ہوئے تو ایک سو چودہ سال تک چانہ اور پھیرہ میں رہے۔ ۵۰۵ھ میں دانگلی اس کے بعد پرہالہ اور ۸۴۲ھ میں گلیانہ کو مستقل دارالحکومت بنایا۔

مذہب - ابتداء میں یہ قوم آتش پرست تھی جب یہ لوگ تبت پہنچے تو قیاس چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد بدھ مذہب کے اثر سے یہ لوگ بدھ ہو گئے ہوں گے۔ لیکن جس وقت کشمیر سے کابل گئے تو اس وقت یہ لوگ ہندو مذہب کے پیرو تھے۔ بیرونی نے صاف طور پر لکھا ہے کہ کابل کا شاہی خاندان ہندو تھا۔ غالباً سورج دیوتا کو مانتے ہوں گے۔ کیونکہ تاریخوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو قومیں ایران کی طرف سے آئیں۔ ان میں سے اکثر سورج دیوتا کو ماننے والے ہیں جیسے مہر، گوجر، راجپوت وغیرہ۔ میرے خیال کے مطابق غزنوی عہد میں یہ مسلمان ہو گئے۔

خطابات - اس معاملہ میں مؤلف نے ابتداء سے غلط فہمی پیدا کرنے والے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس لئے اس کو نظر انداز کرکے میری تحقیق میں جو آیا ہے وہ درج ذیل کرتا ہوں۔ ابتداء میں یہ لوگ جب اصفہان میں تھے تو بہ حیثیت شاہزادے کے خاندانی خطاب " کئے " سے ممتاز تھے جس کا آخری شخص " گوہر " ہے۔ اس کے بعد جب تبت آ بسے اور ہندوستانی قوم میں مل کر رہنے لگے تو " راجہ " کا خطاب اختیار کیا۔ جیسے کیدڑج وغیرہ کشمیر اور جموں تک غالباً یہی خطاب رہا۔ اس کے بعد جب وہ کابل پر قابض رہے تو انہوں نے شاہ کا خطاب اختیار کیا۔ اور خاندان " شاہیہ " سے مشہور ہوئے اور جب شاہی خاندان کابل سے "پوٹھوار" آیا تو " بوگا " پہلا شخص ہے جس نے اپنے نام کے ساتھ " ملک " استعمال کیا۔ اسی خاندان میں ہمت خان کو احمد شاہ ابدالی نے راجہ کا خطاب عطا فرمایا۔ جو غالباً آج تک اس خاندان میں چلا آتا ہے۔ ملک گل محمد جس نے گلیانہ آباد کیا اس کا پوتا ملک فیروز خان ہوا۔ اس کے لڑکے جھنڈا خان کو چودھری راول کہا جاتا ہے اور غالباً آج تک ان کا خاندان چودھری کے نام سے مشہور ہے۔ مؤلف کے بیان کے مطابق ہاتھی خان پہلا آدمی ہے جس کو بابر بادشاہ نے خلعت فاخرہ کے ساتھ " سلطان " کا خطاب عنایت فرمایا۔ جو اس خاندان میں اس وقت تک

رائج ہے۔ اس قوم میں لشکر خان پہلا شخص ہے جس کے نام کے ساتھ " دیوان " کے لفظ کا اضافہ کیا گیا۔ سلطان جلال کے بھائی مرزا عمر خان اور مرزا شریف کو مرزا کہا گیا۔ جو مغلیہ عہد میں شاہزادوں کے لئے مقرر تھا اور غالباً مغلیہ کے آخری عہد میں جب صوبہ داری پر سرفراز کئے گئے تو ان کو " نواب " بھی کہنے لگے۔

انتظام مملکت - اگرچہ گکھڑ ایک جنگی قوم تھی پھر بھی ذاتی قابلیت اور اسلامی درباروں کی حاضری نے ان میں انتظامی قابلیت پیدا کر دی تھی۔ یہ مختلف قبیلوں میں منقسم تھے۔ ہر قبیلہ کا سردار علیحدہ ہوتا تھا اور ان سب کا سردار ایک ہوتا تھا جس کو بادشاہِ وقت کی طرف سے خلعت، خطاب اور سرداری کا مرتبہ ملا ہوتا تھا۔ یہ سردار (سلطان) خود مختار ہوتا تھا۔ مغلیہ سلطنت سے پہلے کسی کو خراج نہیں دیا۔ اس کے ماتحت ایک وزیر، ایک دیوان ہوتا۔ فوج کی سپہ سالاری خود ہی کرتا اور جنگ کے وقت ہر قبیلہ اپنی فوج لے کر سلطان کے جھنڈے کے نیچے جنگ کرتا تھا۔ مؤلف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سکہ بھی ان کا اپنا ہوتا تھا۔ دیوان کے ماتحت محکمہ دیوانی ہوتا۔ اس کے ماتحت متعدد منشی، اہل کار، متصدی، اہل عملہ اور خادم ہوتے تھے۔ لگان کی وصولی سالانہ ہوتی، کسی ماتحت قوم کی سرکشی پر فوج سے کام لیا جاتا تھا۔ شکست کے بعد یا تو معافی مانگ کر آباد رہتی ورنہ ان کو اس جگہ سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ مغلیہ عہد میں فوجی تنظیم پر زیادہ زور دیا گیا اور موجودہ تہذیب کے مطابق اسلحہ اور لباس سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عمار خان نے پانچ ہزار سپاہیوں کو ایک رنگ کے لباس اور ایک رنگ کے گھوڑے پر سوار کرکے اکبر بادشاہ کی نظر سے گزارے یہ بہادر اور غیرت مند قوم ہے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ میدانِ جنگ سے فرار کا عار اپنے سر لیا ہو۔ قانون گوئی کا عہدہ بھی قائم تھا اور قوم بھگوتان (ہندو) اس عہدہ پر سکھوں کی عملداری تک قائم رہی۔ اسی نے سلطان جلال خان کے عہد میں گاؤں کی پیمائش کرکے جدید طریقہ سے مالگزاری تشخیص کی۔

محکمہ عدالت بھی ان کے یہاں قائم تھا اور مستقل طور پر ایک قاضی رہتا۔ غالباً بڑے بڑے مقاموں میں ان کے نائب بھی رہتے تھے۔ اس قوم کے حکمرانوں کی بڑی تعداد عادل گزری ہے۔ انصاف ان کا پیشہ تھا۔ بعض دفعہ تو ان کو انصاف دلانے کے لئے جنگ بھی کرنی پڑی ہے۔ کاشتکاروں اور عام رعایا کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت ہی فیاضانہ تھا۔ لگان کی وصولی میں سختی سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور یہی اوصاف تھے جن کے باعث اس قوم کی ہر دلعزیزی ہو گئی۔ اور دوسروں میں جذب ہونے سے بچ گئی۔ آخر زمانہ میں آپس کی نااتفاقی نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی جس سے ان کی ہوا اکھڑ گئی۔ اور ان پر سکھ غالب آ گئے۔ اور آج بھی اگر یہ قوم آپس کی خانہ جنگی، کینہ اور حسد سے دل پاک کرکے متحد ہو جائے۔ اور ایک سردار کی ماتحتی میں خوشی سے کام انجام دینے کو تیار ہو جائے۔ تو یقین مانئے کہ ان کی قدیم عظمت پھر واپس آ سکتی ہے۔

مستورات۔ ان کی عورتیں عفت مآب، غیرت مند اور شرع کی پابند ہوتی تھیں۔ بزرگوں کی عزت کرتی تھیں اللہ والوں کے ساتھ دلی عقیدت سے پیش آتی تھیں۔ اپنی حکومت میں اپنی لڑکی کسی دوسری قوم کو کبھی نہیں دی دوسروں کی لڑکیاں بھی بہت کم لاتے تھے۔ اسی لئے ان کے خون میں گرمی آج تک رہی جو ایسی قوم کے لئے ضروری تھی۔ لونڈیوں کا بھی رواج تھا۔ اور ان کی لڑکیوں کو بھی وراثت میں حق ملتا تھا۔ بلکہ حکومت تک میں ان کو حصہ ملا ہے۔

رانی۔ اگر لوگ رضیہ بیگم۔ چاند بی بی۔ نورجہان اور اہلیا بائی پر فخر کر سکتے ہیں تو گکھڑ لوگ بھی اپنی ملکہ "رانی منگو" پر فخر کر سکتے ہیں۔ دیوان اللہ داد خان کی یہ منکوحہ زوجہ تھی۔ وہ مردانہ لباس پہن کر دیوان عام میں بیٹھتی اور ملک کا انتظام کرتی۔ وہ شاہانہ طریقہ سے تمام امور انجام دیتی بلکہ جنگ کے موقعہ پر اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان جنگ میں نکلتی، چند دفعہ جنگ میں کامیاب بھی رہی عالمگیر اورنگ زیب نے بھی اس کو خلعت فاخرہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ اس نے ملک "پوٹھوار" کو عدل سے بھر دیا۔ اس عفت مآب کی یاد مؤلف کے عہد تک لوگوں کے دلوں میں تازہ تھی۔ اس نے طبعی موت سے وفات پائی۔ اور اپنی یادگار ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔

آبادی۔ حکمرانوں نے اس ملک کو آباد کرنے میں بڑی کوشش کی۔ متعدد گاؤں بسائے مثلاً چانہ نبیر۔ پیر بالہ۔ مُواںکلی۔ اکبر آباد۔ گلیانہ اور راولپنڈی وغیرہ جن باغی قوموں کو شکست دے کر باہر نکال دیا جاتا یا خود بھاگ جاتیں، پوٹھوار کے حکمران کچھ عرصہ کے بعد جب امن اور سکون ہو جاتا تو پھر واپس آنے کی اجازت دے دیتے۔ اس سے آبادی میں کمی نہ ہونے پاتی۔ آبادی کو برقرار رکھنے کے لئے تالاب بنوائے، قحط کے ایام میں غریبوں کی بے حد مدد کرتے۔ تاکہ بھوکوں کو فاقہ سے باہر نہ جانا پڑے۔

حب وطن۔ اس قوم میں اپنے وطن کی وطن بدرجہ اتم ہے۔ بابر بادشاہ نے اپنے فتوحات کے دو حصے کر کے جب اس قوم کو دونوں میں سے ایک لینے کا اختیار دیا۔ تو ان لوگوں نے دوسرے حصے کی بجائے اپنے وطن کو ترجیح دی۔ اسی طرح اس قوم کے سردار کابل، سندھ، اودھ اور متعدد مقامات پر حاکم بنا کر بھیجے گئے اور جاگیریں بھی ان کو ملیں مگر اپنے وطن کو یہ نہ بھولے اور وطن چھوڑ کر کسی دوسری جگہ آبادی نہیں بسائی یہی سبب ہے کہ پوٹھوار اور پڑوس کے ملک کشمیر کے علاوہ کسی صوبہ میں ان کی کوئی مستقل آبادی آبادی نظر نہیں آتی۔

تنبیہ۔ از مولانا ابوظفر احمد صاحب ناقد گکھڑ نامہ۔ مؤلف نے یہ کتاب حاکم وقت کی فرمائش سے لکھی۔ اس لئے یہ خوشامد اور مبالغہ سے خالی نہیں لیکن راقم الحروف نے اس مقدمہ میں صرف وہی اوصاف

لئے ہیں جو صحیح اور مبالغہ سے خالی معلوم ہوئے۔"

ضلع ہزارہ میں قوم گکھڑ

یہ ضلع ہزارہ میں با اقتدار صاحب عزت اور زمانہ قدیم سے حکمران قوم رہی ہے۔ اس قوم کا مرکز علاقہ پوٹھوار ضلع جہلم میں رہا ہے۔ اور وہاں سے اس قوم کی ایک شاخ (سرنگال) ضلع ہزارہ میں آکر آباد ہوئی ضلع ہزارہ میں ان کے حسب نسب اور حالات تاریخ سے پہلے، اس قوم کے مرکز کے حسب نسب و تاریخی حالات تحریر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس پس منظر میں اس عظیم قوم کے کارہائے نمایاں و تاریخی مقام صحیح طور پر پیش نظر ہو جائے۔ یہاں پر ابٹسن کی کتاب دربارہ قبائل پنجاب و سرحد کا ایک اقتباس اس قوم کے بارے میں دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ "گکھڑ اغلباً ترکی نسل سے ہیں جن کے مورثان کو تیمور کے عہد کے جانشینوں نے راولپنڈی کے پہاڑی علاقوں میں جاگیریں دیں۔ وہ کھوکھر قوم سے یقیناً الگ ہیں۔ جو ظاہری طور اصلی باشندے اس ملک کے نہ بھی ہوں۔ تاہم وہ سابق مسلمان حملہ آوروں مثلاً آوان کے حلیف تھے۔"

گکھڑوں کے حالات۔ اقتباس از تاریخ جہلم

خلاصہ تاریخ بابر۔ خود نوشت سفر نامہ ۱۷، ۱۸ فروری ۱۵۱۹ء کو (بابر) نیلاب (نزد اٹک) کے مقام پر دریائے سندھ سے بذریعہ کشتی پار ہوا۔ نماز ظہر کے بعد روانہ ہو کر کچہ کوٹ (ہرو) میں مقام کیا۔ دوسرے دن کوچ کر کے کچہ کوٹ (ہرو) سے پار ہو کر شام کے قریب ڈرانگ ڈاکے (مارگلہ سے گزر کر) مقام کیا۔ سید قاسم اسحق آغا جو پچھلے گارڈ کے ساتھ آتا تھا۔ چند گوجروں کو جو شاہی ڈیرہ کے پیچھے پیچھے آتے تھے، لے آیا۔ ان میں سے بعضوں کو قتل کیا۔

۱۹ فروری۔ دوسرے روز ہم نے سنگ ڈاکے سے کوچ کر کے اور دریائے اسوہن (سواں) سے گزر کر وقت نماز ظہر کے مقام کیا۔ ہمارے ہمراہی آدھی رات تک آتے رہے کیونکہ یہ بڑا بھاری اور غیر معمولی کوچ تھا اور ہمارے گھوڑے بھی دبلے اور کمزور تھے ... پھر کلر کہار پہنچا۔ کلر کہار میں ایک باغ بہ نام باغ صفا لگایا۔

۲۰ فروری کو کلر کہار سے روانہ ہوا ... بطرف بھیرہ۔ اس علاقہ پر مدت تک ترکوں کا قبضہ رہا۔ اور یہ ان کی وراثت ہے لہذا میں نے اس کو اپنا ملک تصور کرتے ہوئے لوگوں کی دلگیری کی۔

بابر نامہ (ترجمہ تزک بابری از مرزا نصیر الدین حیدر) کا مصنف صفحہ ۱۲۰ پر تحریر کرتا ہے۔ "بھیرہ سے سات کوس شمال کی طرف ایک پہاڑ ہے اس کو ظفر نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں کوہ جود لکھا ہے اس کی وجہ تسمیہ معلوم نہ تھی۔ اب معلوم ہوا کہ اس پہاڑ کے لوگ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ ان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ملک کا نام

جودہ ہے۔ دوسری کا نام جنجوعہ۔ اس پہاڑ پر اور نیلاب اور بھیرہ میں جو قومیں آباد ہیں ان پر جنجوعہ قوم قدیم سے حکومت کرتی چلی آئی ہے۔ ۔۔۔۔ جودہ کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ اور جنجوعہ کی بھی۔ یہ پہاڑ جو بھیرہ سے سات کوس ہے کوہستان کشمیر (کوہستان کشمیر اور کوہ ہندوکش جو دوسری طرف واقع ہے) سے الگ ہو کر جنوب مغرب کے بیچ میں دینکوٹ[1] کے نیچے دریائے سندھ پر ختم ہوتا ہے آدھے پہاڑ میں قوم جودہ آباد ہے اور آدھے پہاڑ میں جنجوعہ۔ مگر جودہ ہی کے نام سے منسوب ہو کر کوہ جودہ کہلاتا ہے۔ ان کے سب سے بڑے سردار کو رائے کہتے ہیں اور اس کے بھائی بیٹوں کو ملک۔ یہ قوم جنجوعہ لشکر خان کی ننھیال ہے۔

دریائے سوہان (سواں) کی نواح میں جو قومیں ہیں اُن کے حاکم کا نام ہست تھا۔ اصل میں اسد نام سے اسد اور بعد میں ہست (غلط العام) ہو گیا۔

۔۔۔ ابھی دنوں میں وہاں (جب بھیرہ میں تھا۔ منوچہر خان جو لشکر خان جنجوعہ اور ملک ہست جنجوعہ کا قرابتی تھا۔ مجھے اطلاع دے کر ہندوستان سے چلا اور اوپر کے راستہ سے آنے لگا۔ تو تاتار خان گکھڑ سے اس کی ملاقات ہوئی اس نے اسے روک لیا۔ اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دی۔ چند روز منوچہر خان وہاں رہا پھر میرے پاس چلا آیا۔

مجھ کو تو مدت سے ہندوستان لینے کا خیال تھا۔ یہ قطعہ ملک جس میں بھیرہ۔ خوشاب۔ چناب اور چنیوٹ شامل ہے مدتوں ترکوں کے قبضہ میں رہا۔ اس کو اپنی ہی ملکیت تصور کئے ہوئے ہیں۔ اور مجھے یقین تھا کہ خواہ وہ بزور شمشیر خواہ بطریق صلح ہم اس کو لیں گے۔ اور لیں گے۔ اس وجہ سے ان پہاڑیوں (پہاڑی لوگوں) کے ساتھ عمدہ سلوک کرنا لازم تھا میں نے حکم دیا کہ ان کی ایک بھیڑ بلکہ رسی کے ٹکڑے اور ٹوٹی ہوئی سوئی کو بھی کوئی نگاہ بد سے نہ دیکھے اور ان کو نقصان نہ پہنچائے۔ یہاں سے چلے اور ظہر کے وقت کلر کہار میں اُترے۔

ہاتھی گکھڑ پر چڑھائی اور فتح۔ جنجوعہ، گکھڑ کے قدیمی دشمن ہیں۔ انہوں نے عرض کی کہ ہاتھی بڑا بدذات ہے۔ رستہ لوٹ لیتا ہے۔ اور مسافروں کو سخت پریشان کرتا ہے۔ یا تو اس کو یہاں سے نکال دیجئے یا پوری گوشمالی کر دیجئے۔ اس کام کے لئے دوسرے دن خواجہ میر میراں اور میرم ناصر کو میں نے لشکر میں متعین کیا اور خود چاشت کے وقت ہاتھی کے سر کچلنے کے لئے سوار ہوا۔ ہاتھی گکھڑ اسی زمانہ میں تاتار کو مار کر ملک پرہالہ (پھروالہ) دبا بیٹھا تھا۔ لشکر سے ہم علیحدہ ہوئے اور چلتے چلتے عصر کے وقت ٹھہرے۔ گھوڑوں کو ذرا سستایا اور دانہ کھلا کر عشاء کے وقت وہاں سے چلے۔ ملک ہست کا ایک ملازم سُرپا نام گوجر جادا رہبر تھا۔ رات بھر

---

[1] ڈھنکوٹ کالاباغ (برلب دریائے سندھ میانوالی کے ساتھ) سے چار میل بطرف مشرق ہے یہاں ایک پرانا قلعہ بھی ہے یہ کابل کی پرانی شاہراہ پر ہے۔

چلے اور صبح جا کر دم لیا۔ بیگ محمد مُغل کو لشکر کی طرف واپس پھیر دیا۔ دن نکلے ہم سوار ہوئے چاشت کے وقت جیبہ (زرہ بکتر) پہن قدم اٹھا کر چلے۔ کوس بھر سے پرہالہ کا سواد (علاقہ) دکھائی دیا۔ فوج درست کر کے روانہ کی گئی۔ برانغار (میمنہ) پرہالہ کے مشرق کی طرف گیا۔ قوچ بیگ کو جو جرانغار (میسرہ) کا سردار تھا مدد کے لئے اس کے پیچھے روانہ کیا۔ جرانغار اور قول کی فوج نے (قلب کی فوج نے) پرہالہ پر دھاوا کیا۔ دوست بیگ کو اُن لوگوں کی کمک کے لئے بھیجا۔ جو پرہالہ کے زیر دیوار پہنچ گئے تھے۔

پرہالہ ایسی جگہ پر ہے جہاں چاروں طرف کھڈ اور ٹیلے ہیں۔ شہر کے دو راستے ہیں۔ ایک جنوب مشرق سمت کے بیچ میں ہے۔ ہم اسی راستہ سے آئے۔ یہ راستہ کھڈوں میں سے ہے۔ اس کے دونوں طرف کھڈ اور ٹیلے ہیں۔ آدھ کوس سے شہر کے دروازہ تک اس راستہ کے کھڈ ایسے نزدیک ہو گئے ہیں کہ چار یا پانچ تالے سے ہو گئے ہیں۔ چنانچہ گز بھر بھی بڑی دیکھ بھال سے رستہ چلا جاتا ہے۔ دوسرا رستہ مغرب اور شمال کے مابین ہے وہ ایک کھُلے ہوئے درہ میں سے پرہالہ تک ہے اور ایک راستہ ہے۔ ان دونوں کے سوا تیسرا راستہ کسی طرف سے نہیں ہے۔

اگرچہ شہر کی چار دیواری نہیں ہے۔ مگر ایسی قلب کی جگہ ہے کہ حملہ کرنا بھی دشوار ہے۔ شہر کے گرد سات آٹھ گز چوڑان میں کھڈ واقع ہیں۔ جرانغار والے (میسرہ والے) ان سکڑے مقاموں سے نکل کر دروازہ پر جا پہنچے۔ ہاتھی نے تیس چالیس سواروں اور بہت سے پیدل آدمیوں کے ساتھ ہمارے لشکر کے مقدمہ کا مقابلہ کر کے اس کو ہٹا دیا۔ دوست بیگ جو پیچھے مدد پر تھا جا پہنچا۔ اور اس نے زبردست حملہ کیا۔ دشمن کے بہت سے آدمی گرائے اور اس کو ہزیمت دی ہاتھی ان کا بڑا بہادر مشہور تھا۔ ہر چند اُس نے ہاتھ پاؤں مارے مگر ٹھہر نہ سکا۔ آخر بھاگ نکلا۔ ان کھڈوں (کھنڈروں) میں سے بھاگ کر شہر میں پہنچا۔ اُس کو بھی نہ سنبھال سکا۔ حملہ آور اس کے پیچھے پیچھے شہر میں گھس گئے۔ آخر ہاتھی اُس دروازہ سے جو شمال و مغرب میں ہے نکل بھاگا۔ یہاں دوست بیگ نے بہت کوشش کی فتح دوست بیگ ہی کے نام پر ہوئی۔ میں اُسی دن پرہالہ میں آیا۔ تاتار کے مکانوں میں ٹھہرا۔ فوج کی صف بندی کے وقت اُس جمعیت میں سے جس کو اپنے پاس ٹھہرنے کے لئے مقرر کیا تھا کچھ لوگ حملہ آوروں میں مل گئے تھے۔ اُن میں سے امین محمد۔ قراجہ اور ترخان ارغون کو عدول حکمی کی سزا میں ایک گوجر رہبر کے ہمراہ لشکر کے سامنے ننگے سر ننگے پاؤں جنگل کی طرف نکلوا دیا۔

دوسرے دن مغرب و شمال کے مابین والے کھڈوں میں سے نکل ایک خوید زار میں مقام ہوا۔ بابو لی خزانچی کو کچھ سپاہیوں سمیت لشکر سے آگے سوہان (سواں) ندی کی طرف روانہ کیا۔ پنجشنبہ

پندرھویں تاریخ مقام اندرانہ[1] میں جو دریائے سوہان کے کنارے پر ہے خیمہ زن ہوئے۔ یہ اندرانہ ہمیشہ سے ملک جسرت کے باپ کے تخت میں تھا۔ ملک جسرت کے باپ کو جب سے ہاتھی نے مارا اس وقت سے وہ ویران پڑا تھا۔ اور ان دنوں میں بھی اجاڑ ہی تھا۔ جو اہل لشکر کنارہ کنار (گلر کہار) سے رخصت کر دیئے گئے تھے وہ بھی عشاء کے وقت یہاں آ گئے۔ ہاتھی نے جب تاتار کو مار دیا ہے تو پربت نام اپنے قرابت دار کے ہاتھ ایک گھوڑا معہ سامان بطریق پیش کش بھیجا تھا۔ پہلے اُسے حاضر ہونے کا موقعہ نہ ملا۔ اب پس ماندہ لشکر کے ہمراہ آ کر اس نے ملازمت حاصل کی۔ اور پیش کش گذرانی ...... دریائے سوہان عبور کر کے کُرشتہ پر منزل کی۔ ہاتھی کے قرابت دار پربت کو خلعت دیا۔ اور ہاتھی کے نام استمالت کا فرمان لکھ بھیجا۔

گکھڑ اُس پہاڑی ملک میں رہتے ہیں جو مابین نیلاب اور بھیرہ کے واقع ہے۔ اور کشمیر کے پہاڑی ملک سے ملتا ہے۔ یہاں اقوام جودھ اور جنجوعہ کے جاٹ اور گوجر اور اسی قسم کی اور قومیں بھی رہتی ہیں جنہوں نے دیہات آباد کئے اور ہر ایک گھاٹی اور ٹیلہ پر قیام کیا۔ ان کا حاکم قوم گکھڑ سے تھا۔ اور ان کی سلطنت جودھ اور جنجوعہ کے طرز کی ہے اس وقت ان قوموں کی حکومت جو ان پہاڑوں کے دامن میں آباد ہیں تاتار گکھڑ اور ہاتھی گکھڑ کے تحت میں تھے۔ یہ آپس میں چچازاد بھائی تھے اور کنڈھیں اور سیدھی اونچی پہاڑ میں ان کی جائے رہائش استحکام تھیں۔ تاتار کی جائے استحکام کا نام پڑبالہ (موجودہ بھروالہ) تھا۔ پڑبالہ کا پرانا قلعہ راولپنڈی سے طرف مشرق بفاصلہ قریب دس میل واقع ہے۔ پُل ایک پتھر کا بڑا عجیب سوہن (سوان دریائے) پر بنا ہوا ہے جو پرانی پہاڑوں سے بہت نیچے ہے۔ ہاتھی گکھڑ کا ملک بھی ان پہاڑوں کے نزدیک ملتا ہے اس نے بابا خان دائی کا لنگر کو اپنا ملک بنایا ہوا ہے۔ تاتار خان کا دولت خان پر بھروسہ تھا۔ مگر اکثر انواع سے اُس کے ماتحت تھا۔ ہاتھی اس سے کبھی نہیں ملتا تھا۔ مگر حالت آزادی اور فتنہ انگیزی میں مصروف تھا۔ تاتار نے اُمرائے ہندوستان سے رسوخ پیدا کر کے ان کی مرضی کے مطابق موقعہ پا کر اس کی فوج کا جو راستہ سے دور پڑے تھے محاصرہ کر لیا۔ اسی وقت جب ہم بھیرہ میں ہی تھے تو ہاتھی نے ایک فریب سے تاتار پر غلبہ پا کر اسے حیران کر کے قتل کیا۔ وہ گکھڑ عورت و کل اسباب پر قبضہ کر لیا تھا۔

---

[1] مرزا غلام یوسف صاحب ساکن موضع غوری ضلع جہلم جو سیر کے استاد ہیں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ اندرانہ شاید موجودہ اڈرانہ ہو جو لب گہان ندی ہے جو ڈومیلی اور رُہتاس کے پاس سے گذر کر دریائے جہلم میں گرتی ہے۔

گکھڑ قوم خاص کر ضلع راولپنڈی سے تعلق رکھتی ہے۔ اگرچہ قلعہ اوبریام جس جگہ یہ پہلے اُترے تھے۔ سلطان پور[2] ضلع ہذا یعنی جہلم میں واقع ہے۔ سلطان پور سے ان لوگوں کی جُدا جُدا چار بڑی نسلیں ہو گئیں۔ اسکندرال، بگیال، فیروزال اور مال۔ آخری قوم یعنی اومال سلطان آدم سے مشہور ہے۔ ان میں سے ایک کی اولاد سلطان ہاتھی خان تھا جس کے خاندان کا نام ہتھیال مشہور ہوا۔ جو اپنے اصل قدر پر بحال رہا ہے۔ ان چار فرقوں میں سے اول کے دو ضلع جہلم سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرداران لہڑی دیگر شاخ اسکندرال ہیں۔ راجہ دومیلی یا رُہتاس سرداران پدری، بجوالگراں، سنگھوئی بھیٹ، بڈھا گورہ، طوٹ، بگیال ہیں۔ ان کی چھوٹی شاخ تولا خان سے تولیال مشہور ہے۔

سلطان مقرب خان گکھڑوں کا ایک بڑا سردار جو گجرات سے اٹک تک حکمران تھا۔ قوم ہتھیال سے تھا۔ اس کا تعلق ضلع راولپنڈی سے تھا۔ مگر رُہتاس کا راجہ قوم بگیال اس کے بعد گکھڑوں کا بڑا سردار مشہور ہوا۔ جن کی لڑائیوں کا حال زیادہ تر دلچسپ ہے۔ ان کے متعلق اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ ہمت خان دومیلی نے بھکرال اور ہدبال کی مدد سے مقرب خان کے برخلاف سرکشی کی جس میں مقرب خان قتل ہوا اور گتیام کی باؤلی میں پھینکا گیا۔ تب ہمت خان تا عہد پٹھانان جن کے ہاتھ سے اس کی حکومت ختم ہوئی رُہتاس کا راجہ ہوا۔ تھوڑی مدت بعد اس کا بھتیجہ راجہ شیر جنگ پھر رہتاس پر قابض ہوا اگرچہ سکھ اور اس کے شریک بھائی اس کے نکالنے کے درپے رہے۔ مگر تاہم انگریزی عہد تھا اپنے حصہ پر قابض رہا اس گکھڑ کا سردار اکبر علی ۱۸۴۸ء میں انگریزوں کی طرف سے نکلسن صاحب کی فوج کے ساتھ جا ملا۔ اس کا بیٹا روشن خان آج تک ایک ہزار روپیہ کی جاگیر کھاتا ہے۔ اس کے چچازاد کرم دین نے ہمت خان کے بیٹے کو مار کر تھوڑے دنوں کے لئے رُہتاس پر قبضہ کر لیا۔ آخر اپنے بیٹے فیض طلب کی گولی سے جو اُس وقت منگلو کے قریب سکھوں سے لڑ رہا تھا۔ مارا گیا اُس کے مرنے پر اس کے بیٹے نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مگر ڈومیلی کے نزدیک سُور کا شکار کر رہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر ایک ہفتہ کے اندر مر گیا۔ اس واردات پر تیسرے چچازاد نور خان نے رُہتاس کو آن گھیرا جس کو گورمکھ سنگھ لہنہ نے جلد نکال دیا۔

ان تنازعات کے سبب گجرات کی دوائی کے بعد گکھڑ سکھوں کے ہاتھ آ گئے۔

سید خان سرگروہ گکھڑ کو عودار الخلافت چوآ کے نزدیک سے آباد کیا۔

گکھڑ و جنجوعہ۔ ان سرداران کی بڑی لڑائی شاید ملک دشمنی کے لئے تھی۔ جو ان سرد اقوام کے

---

[2] سلطان پور منہ دمنگلو دریا سے دوسری طرف علاقہ کشمیر میں ہے۔

قبضہ سے نکل چکا تھا۔

تاریخ رُہتاس میں گکھڑوں کا شجرہ نسب اور تاریخی حالات حسب ذیل ہیں :-

شاہ کامل خان (شاہ کابل خان ہو گا۔ ش پ)
|
گکھڑ شاہ
|
بیچ خان
|
مہاپال
|
سوہن خان

سوہن خان کے بیٹے:

- اسور خان
  - راجہ خان
  - سپہر خان
  - یرمنگ خان
  - مسکین خان
  - دور خان
    - ملک کلا خان
- منصور خان
  - بودھا خان (بموجب مصنف کے گوہر نامہ اس کا عہد ۱۴۲۵ء ہوتا ہے)
  - سونا خان
  - طلا خان — اس کے نام پر تپہ طلیالہ مشہور ہے اس کی اولاد بوٹنڈار، آڑہ، خورد، جسنوٹ اور بنڈرجوال میں آباد ہے۔

ملک کلا خان کے بیٹے:

- بیر خان — اولاد اس کی بیرال مشہور ہے
  - پہلو خان
    - ہاتھی خان — اس کی سنتان ہر دو ضلع جہلم ... کی آباد ہے۔ اولاد اس کی ... میں آباد ہے
  - تاتار خان
    - بیر خان
      - سلطان آدم — اولاد اس کی آدمال کہلاتی ہے اور سلطان پور موضع ... مشہور ... میں آباد ہے
      - سلطان سارنگ — اولاد اس کی سارنگال کہلاتی ہے اور خانپور گکھڑاں و سید پور گکھڑاں میں آباد ہے
- بگھا خان — بگھیاں اس کی اولاد ہیں
- فیروز خان — تپہ فیروزال۔ اولاد اس کی سکھو، سانگ، بڑالہ اور کوٹ فیروزال میں آباد ہے
- سکندر خان — اولاد اس کی مشہور بہ گوت اسکندرالہ ہے۔ دیہات ذیل میں آباد ہے۔ عمرال بڑا، پنڈوری، کوہتام علاقہ پھول، لڈی، رورتڑہ، بکوالہ، کروٹہ، سکندرال بڑھی سکندرال، کھربوٹ، گنڈاری، مالدیو، نکی شینپورہ اور جسروٹہ کھربوٹ کالایو۔

تاریخ رُہتاس کے مطابق شاہ کامل خان قوم مغل کیانی سلطان محمود غزنوی کے پاس آ کر رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ کابل میں رہا اور فوت ہو گیا۔ اس کا ایک بیٹا مسمی گکھڑ شاہ وہاں سے ملک پوٹھوار چلا آیا۔ اس وقت یہ ملک کشمیری پنڈتوں کے قبضہ میں تھا۔ اس نے جنگ کر کے اس ملک پر قبضہ کر لیا اور موضع دانگلی میں رہنے لگا جو اب تک مکان گکھڑاں کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان کمال خان ۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مبارک خان حکمران ہوا اس کے بعد محمد خان پسر سلطان آدم حکمران رہا۔ وہ بھی جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد گکھڑوں کی آپس میں جنگ ہوئی اور وہ کمزور ہو گئے۔ اور سرداری کا منصب سلطان محمد خان کے بیٹے علی خان کو ملا۔

بہادر شاہ کے عہد میں ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں سلطان معمار خان کو خطاب سرداری ملا۔ جب سلطان معمار خان نے وفات پائی تو جلال کو عہدہ ملا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اکبر قلی، اور سلطان مراد قلی کے نام سرداری رہی۔ پھر اس کا بیٹا دیوان اللہ داد خان ہوا۔ یہ بڑا خدا پرست تھا۔ اس کی بجائے سلطان دلاور خان کا بیٹا سردار ہوا۔ اس نے اچھی شان سے حکومت کی۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس لئے سرداری کا منصب معظم خان کے بیٹے سلطان مقرب خان کو ملا۔ یہ بڑا نامی گرامی ہوا بہت لڑائیاں کیں اور فتح پائی۔ ملک اٹک پر براجم قلی قوم گیپ (گھیب) سے جنگ کر کے متصرف ہوا۔ اور مہر نامی زمیندار قریشی ملوکی کو برباد کیا۔

مُہر سلطان مقرب خان پر یہ کندہ تھا۔

"درمیان اٹک جہلم شد مقرب بادشاہ"

جب نادر شاہ قزلباش ایران سے ہندوستان کو فتح کرنے کے آیا تو اس وقت تخت دہلی پر محمد شاہ چغتہ تخت نشین تھا۔ سلطان مقرب خان جس کا اصلی نام مکرم خان تھا۔ آ کر نادر شاہ کے قدم بوس ہوا۔ نادر شاہ نے خلعت دی...... نادر شاہ واپس چلا گیا۔

اس دوران میں سکھوں کا ایک مہنت آیا اور سلطان مقرب خان کو گجرات میں گوجروں نے سکھوں سے صلاح مشورے سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد نادر خان، بہادر علی خان، براجم خان، شادمان خان، سید اللہ خان پسران مقرب خان پرگنہ دانگلی اور پھروالہ پر قابض رہے۔

کلا خان کا ایک بیٹا بوگیا خان جس کی اولاد سے گوت بوگیال ہیں۔ سکھوں کے عہد میں بدستور خطاب سرداری اور راجیال ملک رُہتاس ان کے خاندان میں چلا آیا۔ چنانچہ ڈومیلی میں راجہ فضل داد خان ہوا ہے۔

ملویا خان

- دوہر خان
- جیبا خان
- بابک خان
- عیسٰی خان
- بابی خان

دوہر خان۔ تپہ دہو ڈھوالہ مشہور ہے۔

دوہر خان

- دولت پناہ — اولاد اس کی موضع بھیت سلال گجر میں آباد ہے
- گورپال — اولاد اس کی پیدی، پنڈ گول اندازاں میں آباد ہے۔
- مینھا خان — اولاد اس کی بڑا گورہ، مسولہ، تمرشا، کنبہ، رسیلہ خورد و کلاں میں آباد ہے
- تمر خان — اولاد اسکی سلطان تپہ ڈھوڈا میں ہے

بابک خان پسر بوگیان خان کی اولاد بار بکالہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور پنڈوری وچھوٹ میں آباد ہیں۔

عیسٰی خان

- بگھر خان — ملوٹ میں ہوا
- جیبا خان — اولاد اسکی تھوالہ میں ہے بساوا، جنڈالہ، چکیام، بوولہ، دوبیرا، راجہ تارہ، سوہن، رامدیال ساتوں میں آباد ہے
- ملہو خان — اولاد اس کی سنگھوٹی ملہو میں آباد ہے
- کیر خان — موضع جگہ، اٹیالہ، دوبیال، ہتیال، پڑی درویزہ، پھلیالہ علاقہ کھروڑی
- بانی خان — لاولد اس کا مقام دہریالہ ہوا ہے

ان سب میں منصب سرداری چلا آیا ہے۔

جیبا خان سے نوروز کا بیٹا سید علی ہے

سید علی

سنگو خان

- سنگر خان — اولاد اس کی سنگی، خاص، بٹالگراں، کلری میں آباد ہے
- شہنگ خان — اولاد اس کی دوبیلیں میں آباد ہے
  - صاحب خان
  - جیکلے خان
  - قادر علی خان
  - عبداللہ خان
  - باج مغفور خان

ڈومیل ان پانچوں میں برابر تقسیم ہوئی۔

قوم گکھڑ۔ مطابق تاریخ ہزارہ

کتب تواریخ و اسناد پیش کردہ قوم گکھڑ و قصہ ہائے مشہور و دریافت ہر قسم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قوم گکھڑ بہت پرانی اس نواح میں آباد اور قابض ہے۔

تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کید راج نے جس کی اولاد سے ساتویں پشت میں راجہ بکرماجیت ہوا ہے، شہر بھیرہ آباد کیا۔ اور قلعہ جموں بنایا اور مسمی درک قوم گکھڑ کو جو اس کے خویشاں میں سے تھا جموں کا حاکم بنایا۔ چند مدت کے بعد قوم گکھڑاں نے مردم کوہ نشین سے جو درمیان کابل و قندہار کے رہتے تھے مل کر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ کید راج پر چڑھائی کی۔ وہ عاجز آ گیا اور یہ سب ملک قوم گکھڑاں وغیرہ اقوام کے قبضہ میں رہا۔ جو اس وقت افغان (بموجب سر الف کیرو (کتاب پٹھان) کوہ سلیمان وغیرہ کے علاقہ میں ۵۰۰ ق م موجود تھے) کہلاتے ہیں۔ پس بموجب حساب عہد سلطنت اُن چھ راجوں کے ۲۰۹۶ برس قبل از بکرماجیت ہوتے ہیں۔ اور ۱۹۲۷ء اب بکرماجیت کو ہوئے۔ کل ۳۲۲۹ برس درک گکھڑ کو اس وقت تک (یعنی ۱۹۲۷ء) ہوتے ہیں (گویا وہ ۱۳۰۲ ق م میں آئے) اور اس سے بھی پہلے کی آبادی و قبضہ و دخل ان کا پایا جاتا ہے۔ نگارستان کشمیر میں ملک کَدُرک۔ ڈی کی آمد کے حالات میں لکھا ہے کہ سلطان زین العابدین سلطان کشمیر (جس نے کشمیر اور اس کے متعلقات پر ۵۲ سال حکومت کی۔ (۸۲۶ھ مطابق ۱۴۲۳ء ... میں فوت ہوا) کے زمانہ میں ایک شخص مسمی ملک کَدُر جو امرائے غزنی سے تھا اور اس وقت کے حاکم کابل کا ... تھا۔ علاقہ گکھڑ درمیان دریائے سندھ و جہلم (جو کشمیر کا حصہ تھا۔ اور سلطان کشمیر کے زیر نگیں تھا) پر آ کر قابض ہوا اور کشمیریوں کو جو اس علاقہ سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بیر اپنی قوم کا سردار ہوا اس کے بعد تاتار ناظم قبیلہ ہوا۔ اس نے ہی شیر خان اور سلیم خان کی مخالفت کی کیونکہ وہ اپنے آپ کو مغل قبیلہ سے بروئے خاندانی تعلق دوست سمجھتا تھا۔ وہ بابر بادشاہ کے ساتھ بمعہ اپنی قوم کے سپاہیوں رانا سانگا چتوڑ کی مہم کے لئے بھیجا گیا تھا۔ تاتار کے دو لڑکے تھے سلطان ارنگ و سلطان آدم۔

آئین اکبری سے جو نہایت معتبر کتاب اور شہنشاہ اکبر کا مجموعہ اعمال نامہ ہے اور جو بڑے معتبر مورخ ابو الفضل کی ۱۰۰۶ھ و ۱۵۹۷ء کی لکھی ہوئی ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ ملک پوٹھوہار میں جا بجا قوم گکھڑ کی ریاست و قبضہ تھا۔ اور جہاں سرکار پکھلی کا حدود اربعہ لکھا ہے۔ وہاں جنوب میں اُس کو گکھڑ تحریر کیا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اس وقت یعنی ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء میں یہ علاقہ کرڑاں، ڈھونڈ بھی یعنی بکوٹ و ناڑہ وغیرہ میں بھی دخل اس قوم گکھڑ کا تھا۔ اس کی تصدیق قوم کرڑال

سے بھی ہوتی ہے۔ پھر جہاں فہرست منصب داراں کی ہے۔ اس میں نام جلال خان پوتا سلطان آدم گکھڑ کا منصب نُہ صدی لکھا ہے جس کی تنخواہ بموجب اس وقت کے سکہ کے ۸۱۰۰ روپیہ ماہوار بنتی ہے۔ اکبر قلی خان پسر جلال خان کا منصب ہزاری تھا۔ جس کی تنخواہ ۹۱۰۰ روپیہ ماہوار ہوتی ہے۔ مبارک خان پسر کمال خان گکھڑ پوتا سلطان سارنگ خان منصب نُہ صدی اکبری۔ نظر خان گکھڑ پور (پسر) سیدن منصب پانچ صدی اور شاہ محمد خان پور (پسر) اسید خان گکھڑ منصب دو صد پہنچا۔

آئینِ اکبری صفحہ ۱۷۰ پر تحریر ہے کہ ۴۲۳ھ مطابق ۱۰۳۲ء میں جس کو ۹۴۴ سال ہوئے جب کہ داخل اسلام کا ہند میں ہونا شروع ہوا تو راجہ لاہور کی مخالفت گکھڑان کے ساتھ ہوگئی۔ اور گکھڑ بہ سبب قرب و جوار کے افغانان کے ساتھ متفق ہو گئے۔ اور راجہ نے افغانوں کے ساتھ صلح کر لی اور چند مواضع ان کو چھوڑ دیے۔

اور صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے کہ ۳۹۳ھ مطابق ۱۰۰۸ء سلطان محمود واسطے تادیب راجہ انندپال کے جب عازم ہندوستان ہوا اور تمام راجہ ہائے ہندوستان بہ پاس مذہب دفعِ سلطان محمود کے ساتھ مقابل ہوئے پالیس روز تک ڈیرہ دونوں لشکروں کا ایک دوسرے کے مقابل پڑا رہا اور انندپال کی طرف ہندوستان وغیرہ سے روز بروز راجہ ہائے وغیرہ جمع ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ گکّار گکھڑ (دکھوکھر ش ب) بھی پہنچ گئے۔

اور بڑا افساد برپا کیا...... تیس ہزار پیادہ قوم گکھڑ (دکھوکھر ش ب) کا باوصف احتیاط سلطان محمود بہ کمال دلاوری خندق سے گود کر سواروں میں آپڑے اور تین چار ہزار مسلمانوں کو ایک دم میں قتل کر دیا۔ یہاں تک کہ سلطان محمود نے ان سے تنگ آ کر اس روز کی لڑائی موقوف رکھنی چاہی۔ مگر اتفاق سے فیلِ انندپال بھاگا اور سب ہندوؤں کو شکست ہوگئی۔

توزکِ جہانگیری میں شہنشاہ جہانگیر لکھتے ہیں۔ یکم محرم ۲ جلوس مطابق ۱۶۰۷ء روہتاس منزل پہونچے یہ قلعہ شیر شاہ افغان نے واسطے تادیب و سرکوبی قوم گکھڑ کے جو سرکش ہیں تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ پھر سلیم شاہ پسر اس کے نے اس کو اتمام کو پہنچایا۔ چالیس لاکھ پچیس ہزار روپیہ اس پر صرف ہوا ہے۔

چہارم محرم روز سہ شنبہ دوسری منزل ٹیلہ ہوا۔ یہ زبان گکھڑان پُشتہ کو کہتے ہیں۔ روز پنج شنبہ چھٹی محرم کے بہتیا مقام ہوا۔ اس محل کو ہاتیہ اس سبب سے کہتے ہیں کہ آباد کردہ ایک گکھڑ کا ہے جس کا نام ہاتھی تھا۔ اور مارگلہ سے اس ہاتھیا تک کو پوٹھوار کہتے ہیں۔ اور روہتاس سے ہاتھیا تک جگہ بوگیا لالان کی ہے۔ کہ گکھڑان کے خویش و ہم جدی ہیں۔ روز شنبہ ہشتم محرم سنہ ایہ کور مقام ہوا۔ بزبان گکھڑ کو رخیبر و شکستگی کو کہتے ہیں۔ یہ ولایت بہت کم درخت ہے۔ یوم یک شنبہ نہم محرم راولپنڈی

مقام ہوا اس کو راول نام ہندو نے آباد کیا ہے۔ پنڈی بہ زبان گکھڑان موضع کو کہتے ہیں...... اور پنج شنبہ دہم محرم موضع خربوزہ مقام ہوا۔ ایک گنبد گکھڑان نے پہلے زمانہ میں بنا رکھا ہے۔ اور اس جگہ مسافروں سے محصول لیتے تھے۔ اور شکل اُس گنبد کی خربوزہ کی طرح بنائی گئی ہے۔ اس واسطے خربوزہ مشہور ہے۔ روز سہ شنبہ یازدہم محرم کالاپانی مقام ہوا۔ کہ ہندی میں کالاپانی سے مُراد ہے۔ اس منزل پر ایک گھاٹی ہے۔ مارگلہ نام۔ لفظ مار مارنے کو، اور لفظ گلہ قافلہ کو کہتے ہیں یعنی جگہ مارنے قافلہ کی۔ حدِ ولایت گکھڑان اس جگہ تک ہے۔

عجب حیوان صفت یہ جماعت ہے ہمیشہ آپس میں لڑائی جھگڑا اور جھگڑا تنازع کرتے رہتے ہیں ہر چند ہم نے چاہا کہ آپس میں ان کی صلح ہووے۔ لیکن ہماری اس خواہش کا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جانِ جاہل بسختی ارزانی۔

پانزدہم محرم امروہی مقام ہوا۔ اس نواح میں سات آٹھ ہزار گھر قوم دلازاک و کھٹڑ کا ہے۔ چند در چند اقسام کے فساد و ظلم و راہزنی ان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ہم نے حکم دیا کہ ظفر خان پسر زین خان کو کہ تمام دلازاکان کو یہاں سے کوچ کرا کر لاہور کو روانہ کر دے۔ اور اسی طرح کلاں تران قوم کھٹڑ کو ہماری واپسی تک قید و محبوس رکھے۔ (دشت ۱۶۰۷ء)

اور ۱۴ جلوس مطابق ۱۶۱۸ء میں جب کہ شہنشاہ کشمیر کو براہ پکھلی گئے ہیں تو حال حدود پکھلی میں لکھتے ہیں کہ سرکار پکھلی کی جانب جنوب حد قوم گکھڑ کی ہے اور اس وقت دھمتوڑ داخل پکھلی تھا۔ اور ۱۵ جلوس مطابق ۱۶۱۹ء میں جب کہ سیر کشمیر کے واسطے آئے تو کشمیر سے روز شنبہ بست پنجم ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء لکھتے ہیں جس کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ جلال خان گکھڑ کہ آدمی پورانہ و آزمودہ کار تھا۔ لڑائی افغانان بنگش میں بہ سبب جلدی کرنے سید عزت خان کے، بہ شجاعت و دلاوری قتل ہوا۔ اور منصب نُہ صدی رکھتا تھا پسر اس کا مسمی اکبر قلی جو واسطے فتح قلعہ کانگڑہ کے مقرر تھا۔ ہم نے اس کو طلب کر کے منصب ہزاری ذات و ہزار سوار عنایت کیا۔ اور ملک موروثی اس کا بدستور قدیم بوجہ جاگیر مقرر رکھ کر گھوڑا و خلعت دے کر بہ کمک لشکر بنگش بھیجا۔ اور تاریخ فرشتہ کے مقالہ دوم ص ۵۵۴ پر لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

طائفہ گکھڑان جو ہمیشہ اطاعت خاندان تیموریہ کی کرتے تھے شیر شاہ افغان نے اپنے عہدِ سلطنت میں چند مرتبہ ان پر لشکر کشی کر کے ان کی ولایت کو خراب کیا جب کچھ فائدہ نہ ہوا اور سرکشی ان کی اسی طرح رہی تو خود آیا اور سارنگ خان سردار قوم کو مکر و حیلہ سے مار ڈالا۔ اس کے بیٹے کمال خان کو قلعہ گوالیار

میں قید کرا دیا۔ اس کے بعد سلطان آدم گکھڑ برادر سارنگ خان اپنی قوم کا حاکم ہو کر اُسی طرح افغانانِ شیر شاہ کے مخالف و مقابل رہا۔

شیر شاہ کے بعد اُس کے لڑکے سلیم شاہ نے بھی اسی طرح اس قوم پر لشکر کشی کی۔ گکھڑوں نے سلیم شاہ کے لشکر کو ایسا تنگ کیا کہ اپنے ڈیرہ سے کوئی لشکری باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ جو کوئی نکلتا اس کو گکھڑ گرفتار کر کے کابل، قندھار و بدخشاں بھیج دیتے تھے۔ جس پر بڑا رحم کریں اس کو گراں قیمت پر لشکر میں فروخت کر دیتے تھے۔ سلیم شاہ اُن کی تمام ولایت کو خراب و برباد کر کے خود تو واپس اپنے پایۂ تخت گوالیار کو چلا گیا اور امرائے پنجاب کو ان کی بیخ کنی کا حکم دے گیا۔ وہاں پہنچ کر ایک قلعہ کے ایک مکان میں قوم گکھڑ کے تمام قیدیوں کو جن میں کمال خان گکھڑ بھی تھا، بند کر کے سُرنگ سے اڑا دیا۔ اتفاق سے کمال خان پسر سارنگ ایک کونے میں صحیح و سالم بچ گیا۔

کمال خان کے بچ جانے کے متعلق مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں یہ قصّہ لکھا ہے:-

" کمال خان کی بہن سلیم شاہ کے نکاح میں تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ رات کو قیدیوں کو بارود لگا کر جلا دیا جائے گا تو اس نے اس کی اطلاع اپنے بھائی کمال خان کے پاس بھجوا دی۔ اور ساتھ ہی روئی سے بھرے ہوئے چار لحاف اور کئی مشک پانی بھی اُس کے پاس بھیج دیا۔ کمال خان نے غسل کے بہانہ سے ان لحافوں کو پانی میں اچھی طرح بھگو دیا۔ اور ان کو اوڑھ کر سب سے الگ ایک کونے میں جا کر پڑ رہا۔ جب آگ لگائی گئی تو سب قیدی جل کر راکھ بن گئے۔ مگر کمال خان ان لحافوں میں زندہ بچ گیا۔ صبح جب سلیم شاہ آتش زدگی کا تماشہ دیکھنے قیدخانہ میں آیا تو کمال خان کو سلامت دیکھ کر کہا۔ "چونکہ تو میرے ساتھ سچا خلوص رکھتا تھا اس لئے آگ سے تجھے گزند نہ پہنچا۔ اور قسم کھا کر کہا کہ میں اب کبھی بھی تجھے گزند نہ پہنچاؤں گا" اور رہا کر کے اسے اپنے علاقہ گکھڑ پر حاکم مقرر کر دیا۔"

جب سلیم شاہ مر گیا اور ہمایوں بادشاہ واپس آ گیا تو کمال خان نے اس کی بہت عمدہ خدمات اپنی وسعت کے مطابق کی۔

اکبر بادشاہ کے وقت سرکار کڑہ و مانک پور جاگیر پا کر پٹھانوں کے ساتھ لڑائی میں بہادری کے کارنامے کئے۔ اس وجہ سے بادشاہ نے حکم دیا کہ امرائے پنجاب سلطان آدم گکھڑ کو نکال کر کمال خان کو اس کی جگہ اپنی قوم کا سردار بنا دیں۔

اگرچہ گکھڑ بحیثیت قوم اکبر بادشاہ کے وفادار تھے۔ لیکن سلطان آدم اکبر بادشاہ کے حکم کی تعمیل سے قاصر تھا۔ سلطان آدم نے انکار کیا اور شاہی فوجوں کا بمقام ہالاں (جو جہلم کے مغرب میں واقع ہے) مقابلہ کیا۔

بہت قتل و خون کے بعد شکست کھائی۔ سلطان آدم کو قید کر لیا گیا اور اس کا لڑکا مسمی لشکری کشمیر کو بھاگ گیا۔ بعد میں وہ بھی گرفتار کر لیا گیا اور دونوں کو کمال خان کے حوالہ کر دیا گیا۔ اس نے لشکری کو تو قتل کر دیا۔ اور آدم کو موت تک قید میں رکھا۔

امرائے پنجاب نے سنہ ۹۷۰ھ مطابق ۱۵۶۲ء باتفاق کمال خان کو سردار قوم گکھڑ کا کر دیا۔ اس طرح سے کمال نے ملک کی حکومت مغلوں کی ماتحتی میں سنبھالی۔

بہت سے گکھڑ سردار مغلوں کی حکومت میں ملازم تھے۔ کچھ پکھلی، بنوں اور بنگش کے فوجدار تھے۔ سید خان (سعید خان) برادر کمال خان شاہی ملازمت میں تھا اور پندرہ سو سواروں کا کمانڈار تھا۔ اور کمال کے بیٹے مبارک اور جلال بھی اسی منصب پر شاہی ملازمت میں تھے۔ گکھڑوں کو شاہی خاندان میں خاص وقعت تھی۔ کیونکہ سید خان کی لڑکی شاہی حرم میں جہانگیر بادشاہ کو زمانہ شاہزادگی میں بیاہی ہوئی تھی۔

ہمایوں بادشاہ کی واپسی پر قوم گکھڑ کے کارنامے

کامران کی گرفتاری

میدان ننگرہار سے شکست کھا کر کامران اسلام شاہ سوری کے پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی مدد کرے گا۔ لیکن اس کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ وہاں سے وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اور راستہ میں سلطان آدم گکھڑ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے فرار اور پھر گرفتاری کی جو تفصیل مُلّا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں دی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

کامران مرزا ہمایوں سے شکست کھا کر کابل سے ہندوستان آیا تھا تاکہ سلیم شاہ سے مدد لے کر ہمایوں سے دوبارہ مقابلہ کرے۔ سلیم شاہ نے اپنے لشکر سے ہیموں بقال کو اس کے استقبال کے لئے منتخب کیا کیونکہ اس کو پٹھانوں پر اعتبار نہ تھا۔ مرزا کامران نے اس استقبال کو ہتک سمجھا اور ہندوستان کا رُخ کرنے پر پشیمان ہوا۔ علاوہ ازیں کامران کو امید تھی کہ سلیم شاہ ملاقات کے وقت تعظیم و تکریم سے پیش آئے گا لیکن جب وہ ملنے گیا تو سلیم شاہ دربار میں بڑے تکبر اور غرور کے ساتھ بیٹھا رہا۔ سرمست خان افغان داؤد زئی نے جو بار بکی کے عہدہ پر تھا۔ معمولی ملازمین کے درجہ کی تعظیمات ادا کیں۔ اور نہایت بدتمیزی کے ساتھ مرزا کی گردن کو بادشاہ کے سامنے جھکا کر چلا چلا کر کئی مرتبہ کہا۔ "بادشاہ نظر دولت۔ کامران مقدم زادہ کابل دعا کرتا ہے۔" سلیم شاہ نے نہایت بے پرواہی کے ساتھ مرزا کو دیکھا اور کہا "خوش آمدی" اپنے سراپردہ کے قریب اس کے لئے ایک ڈیرہ اور شامیانہ لگوا دیا۔ اور ایک خلعت، ایک کنیز، اور ایک

خواجہ سرا اس کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے خدمت پر متعین کر دئے۔ اور کبھی کبھی مرزا کو اپنے ہاں بلا کر شعر و سخن کی باتیں کر لیا کرتا تھا۔ لیکن یہ صحبتیں تلخ ہی رہتی تھیں۔

کامران مرزا ان تکلفات اور مراسم سے نہایت تنگ آ چکا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار اور نکل بھاگنے کا موقعہ دیکھ رہا تھا ـــ پٹھان ہندی زبان میں اس کو چھیڑا کرتے تھے جب دربار میں آتا تو کہتے تھے "موزا آیا ہے" ایک مرتبہ مرزا نے سلیم شاہ کے حضور میں ایک امیر سے پوچھا "موزا" کسے کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا "مرد عظیم الشان کو" اس وقت سلیم شاہ نے حکم دے دیا کہ آئندہ کوئی مرزا کے متعلق یہ لفظ نہ کہے اور نہ اس کا مضحکہ اڑائے۔

کامران مرزا کا فرار۔ ایک دن سلیم شاہ نے مرزا سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ مرزا نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ـــ

گردش گردون گردان گردناں را گرد کرد

بر سر اہل تمیز ان ناقصاں را مرد کرد

سلیم شاہ اس وقت تو اس کنایہ کو سمجھ کر ٹال گیا۔ لیکن خفیہ احکام جاری کر دئے کہ "مرزا کی سخت نگرانی کی جائے تاکہ وہ کہیں نکل کر جانہ سکے" مرزا نے زمینداروں کے ذریعہ کسی پہاڑی راجہ کو بہت سے وعدوں کے ساتھ اس بات کے لئے آمادہ کر لیا۔ کہ وہ اسے بھاگنے میں مدد دے۔ چنانچہ راجہ نے دریائے چناب کے کنارے کئی گھوڑوں کی ڈاک بٹھا دی اور کامران رات میں چادر اوڑھ کر ڈیرہ سے نکل گیا۔ محافظوں نے سمجھا مرزا کے سراپردہ سے کوئی عورت نکل کر جا رہی ہے۔ اس کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر دریا عبور کر گیا۔ اور اس راجہ کے ہاں چلا گیا۔ وہاں سے برقعہ اوڑھ کر ایک نگہبان کے ساتھ راجہ کے آدمیوں کے ہمراہ آگے روانہ ہو گیا۔ جب وہ موضع گھری میں دریائے بہت (جہلم) کے کنارے پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ اس لئے وہاں ٹھہر گیا۔ یہ موضع سلطان پور کے نواح میں قلعہ رہتاس سے تین کوس پر ہے۔ کسی نے سلطان پور کے حاکم سلطان آدم کو خبر پہنچا دی کہ ایک مغل عورت جلو دار کے ہمراہ تنہا فلاں جگہ ٹھہری ہوئی ہے۔ اور وہ صبح وہاں سے چلی جائے گی۔ سلطان آدم نے آدمی دوڑا کر تحقیق کرائی۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ خود مرزا کی ملاقات کے لئے آیا۔ مرزا نے سلطان آدم کی بڑی خوشامد کر کے اس سے یہ قول لیا کہ وہ اُسے اس مقام تک پہنچا دے گا۔ اس وقت ہمایوں بھی کہیں قریب پہنچا ہوا تھا۔ سلطان آدم نے سارا حال اس کے پاس لکھ بھیجا۔ اور مرزا کی جاں بخشی کی درخواست کی۔ ہمایوں نے اس کے حسب مرضی فرمان لکھ کر بھیج دیا اور دو سال بعد مرزا کو اپنے ہاں طلب کر کے آنکھوں میں نشتر پھیر کر اُسے مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔

چونکہ مرزا کامران کی گرفتاری از دست سلطان آدم خان اور ہمایوں بادشاہ کے حوالہ کرنے میں تفصیلی

حالات میں مورخوں کے بیان مختلف ہیں۔ لہذا تذکرۃ الواقعات (جوہر آفتابچی)[1] سے ان واقعات کو تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔ تاکہ اس معاملہ کی تفصیل واضح ہو سکے۔

جوہر آفتابچی کامران کے واقعہ سے ۱۹ سال پہلے سے ہمایوں بادشاہ کا خاص ملازم، رکابدار تھا اور ہندوستان سے جانے اور پھر واپس آنے تک اس کے ساتھ رہا۔ اس واسطے اس سے زیادہ معتبر راوی اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر آنکھوں میں سلائی پھرانے کا حکم بادشاہ سے لینے اور اس پر عمل درآمد کرانے کا بھی وہ واحد ذمہ دار فرد تھا۔

جوہر آفتابچی کے الفاظ میں تفصیل واقعہ حسب ذیل ہے:۔

جب ہمایوں بادشاہ کابل میں داخل ہوئے اور چاہتے تھے کہ قندھار کے راستے سے ہندوستان کو لینے کی تدبیر کریں۔ اس اثناء میں سلطان آدم گکھڑ کی طرف سے ایک عرضداشت پہنچی کہ مرزا کامران میرے پاس پہنچ گیا ہے حضرت بادشاہ بہت جلد تشریف لاویں۔ چنانچہ بادشاہ کوچ کر کے بنگش (وادی کرم) میں آ گئے۔ سر آلف کیرو (مصنف پٹھان) کے بیان کے مطابق ہمایوں خیبر کا راستہ نہ پا کر کرم کے راستے سے آیا تھا۔ در سمند (ننددٹل) کے مقام پر سخت جنگ ہوئی اور یہاں ہی سلطان آدم کا پیغام اس کو ملا۔

یہ اس نے تحریر نہیں کیا کہ جنگ کس سے ہوئی۔ جوہر آفتابچی ملازم ہمایوں بادشاہ نے تذکرۃ الواقعات میں جہاں اس تمام واقعہ کامران کے حالات کو تحریر کیا ہے اس کو بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ وہ اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ جب بادشاہ بنگش میں آ گئے اور سنا کہ ایک شخص شیخ مدنی نے بنگش کے گرد و نواح میں اپنے واسطے ایک جگہ قائم کر لی ہے اور لوگوں کو بہکاتا ہے۔ تو بادشاہ نے قراچا خان اور کچھ اور آدمیوں کو بھیجا کہ اس کو سزا دیں۔ انہوں نے اس کے اہل و عیال کو قید کر لیا۔ اور وہ خود دھن کوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کوچ کرتے ہوئے سلطان آدم کے علاقے میں پہنچے۔ سلطان آدم دس کوس کے فاصلے پر تھا کہ اس کا ایک ایلچی مسمی دھارن آیا اور کہا کہ بادشاہ بہت جلد تشریف لائیں۔ چنانچہ آدھا دن باقی تھا۔ کہ حضرت بادشاہ بیرولہ (موجودہ بھیروالہ ضلع جہلم) کے قریب پہنچے۔ یہاں پر دھارن اور بھورن دو ہندو آئے اور عرض کیا کہ مرزا کامران کہتے ہیں اور آگے آئیے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ اچھا مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد آئیں گے۔ اسی عرصے میں قرا بہادر، بادشاہزادہ اور سلطان آدم آ گئے۔ اور ان کے ساتھی بھی پہنچے۔ بادشاہ نے دو رکعت نماز ادا کی اور پلنگ پر

---

[1] تذکرۃ الواقعات جوہر آفتابچی کی ذاتی ڈائری ہے جس کا اردو ترجمہ سید معین الحق جنرل سکرٹری و ڈائرکٹر آف ریسرچ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کیا۔ در ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ تفصیل اسی کتاب سے ہے۔

بیٹھ گئے۔ قرا بہادر، اور سلطان آدم نے حاضر ہو کر شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ بادشاہ نے کہا۔ کہ اے
سلطان آدم تم نے تباہ کر دیا۔ سلطان نے عرض کیا کہ میں دریائے سندھ کے کنارے پر حاضر ہو کر قدم
بوسی سے مشرف ہوتا لیکن میرے ہاں مہمان تھے۔ اس لئے حاضری سے مجبور تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ یہاں
کی حاضری وہاں کی حاضری سے بہتر ہے۔ اس کے بعد سلطان آدم نے کہا کہ مرزا کامران آپ کو اور آگے
بلاتا ہے۔ اس بات سے بادشاہ کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا۔ سلطان آدم نے عرض کیا کہ مرزا کامران
میری قید میں ہے۔ حضور والا تشریف لے چلیں۔ اس پر بادشاہ دریا کے کنارے جا کر ٹھہر گئے۔ دو گھڑی
رات گزری تھی کہ مرزا کامران حاضر ہوا اور سر نیچے کر لیا۔ بادشاہ نے مزاج پوچھا اور اپنے داہنے ہاتھ
کی جانب بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ مرزا کامران پلنگ سے تکیہ لگا کر سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھ گیا۔
بائیں ہاتھ کی جانب شاہزادہ عالمیان محمد اکبر شاہ اور سامنے شاہ ابوالمعالی تردی بیگ خان مسند خان آدم
اور منعم خان بیٹھ گئے۔ حضرت بادشاہ نے کمالی کو طلب فرمایا۔ ایک دو اچھی پوریاں نوش فرمائیں۔ آدھی
مرزا کامران کو دی۔ اسی اثناء میں مرزا کامران نے کہا کہ محمود خان نیازی اور کمالی خان پسر سلطان شاہ
اور اسلام خان نیازی، اور سلطان آدم کے بیٹے لشکری، کل بادشاہ کی قدمبوسی سے مشرف ہوں گے۔
بادشاہ نے فرمایا ٹھیک ہے، اور سلطان آدم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ وہ لوگ کل ہم سے ملیں سلطان
مذکور نے عرض کیا کہ بہت مناسب ہے۔ وہ کل حضور سے ملیں۔ یہ ان کی بڑی کم نصیبی ہو گی کہ بادشاہ
اتنی دور سے تشریف لائیں اور وہ شرف قدم بوسی حاصل نہ کریں۔ سلطان مذکور نے ایک آدمی بھیجا
کہ وہ آئیں اور قدم بوسی سے مشرف ہوں۔ اس کے بعد وہ آئے۔ پہلے محمود خان نیازی، پھر سلطان
کے بیٹے لشکری نے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ شامیانے لگا دئے گئے ہیں۔
فرمایا کہ بس قیام گاہ پر سلطان چاہئے۔ پھر حضرت بادشاہ نے فرمایا۔ کہیں پان ملے گا۔ سلطان آدم کے
بیٹے لشکری نے بارہ بیڑے پیش کئے۔ ایک خود کھا لیا۔ اور گیارہ گیارہ آدمیوں کو تقسیم کئے فرمایا کہ
لشکری نے عجیب کام کیا ہے۔ جتنے پان درکار تھے۔ اتنے ہی لایا۔ اس کے بعد بادشاہ سوار ہو کر
قیام گاہ پر تشریف لائے اور شاہی مجلس آراستہ کی۔ خوش آواز گویوں نے گایا بجایا۔ تمام رات
عیش میں گزاری۔ صبح کو نماز فجر کے بعد حضرت بادشاہ سو گئے۔ مرزا کامران بھی اپنی قیام گاہ پر
چلے گئے۔ ظہر کی نماز کے بعد کھانا لگایا گیا۔ کھایا اور دستر خوان اٹھایا گیا۔ یہ رات بھی عیش و عشرت
میں بسر کی۔ دوسرے روز امراء نے کہا کہ مرزا کامران کے معاملہ پر غور فرمایا جائے۔ حضرت بادشاہ نے
فرمایا سلطان آدم کو خلعت دے کر جو کچھ مناسب ہو گا وہ کریں گے تیسرے روز سلطان آدم کو

خلعت عطا کیا۔ اور علم و نقارہ جو بادشاہی کے مراتب ہیں اس کو خود مرحمت فرما کر رخصت کیا۔ چوتھے روز
مرزا کامران کے معاملے پر غور کیا۔ اور یہ طے فرمایا کہ مرزا کامران کے آدمیوں کو علیحدہ کیا جائے۔ خنجر بیگ،
عارف بیگ، علی دوست اور سیدی محمد بکینہ اور بندہ خاکسار جوہر کو حکم دیا کہ مرزا کامران کی خدمت
میں جائیں۔ اور ارشاد ہوا کہ اے غلام تو جانتا ہے کہ تجھ کو کہاں بھیجا جاتا ہے۔ خاکسار جوہر نے جواب
دیا کہ حضور میں جانتا ہوں فرمایا کہ خیمے کے اندر کی خدمت تیرے سپرد ہے۔ غیندا پنے اوپر حرام کر لے۔
حضرت بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں ہم عصر کے وقت مرزا کامران کے پاس پہنچے۔ مرزا نے جائے نماز طلب
کی۔ بندہ جوہر نے جائے نماز پیش کی اور مغرب کی نماز خیمے کے اندر ادا کی۔ بندہ سے دریافت کیا۔ اے
غلام تیرا نام کیا ہے۔ بندہ نے عرض کیا۔ جوہر۔ پھر کہا۔ اے بہتر تو خدمت گاری جانتا ہے؟ بندہ نے
عرض کیا۔ کہ ہاں اپنی بساط کے مطابق۔ اس کے بعد میں خدمت گاری میں مشغول ہو گیا۔ دریافت کیا کہ حضرت
بادشاہ کی خدمت میں تو کتنے سال سے ہے۔ میں نے عرض کیا انیس سال سے خدمت میں ہوں (چونکہ یہ واقعات
سنہ ۹۶۰ھ (۱۵۵۳ء) کے ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جوہر سنہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ہمایوں کی خدمت
میں آیا ہو گا)، فرمایا تو بہت پرانا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں۔ پھر فرمایا کہ کیا تو مرزا عسکری کی خدمت میں بھی
رہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ لیکن جلال نامی ایک (غلام) میرے ساتھ تھا۔ جو مرزا عسکری کی خدمت
کرتا تھا۔ پھر فرمایا کہ رمضان المبارک سنہ ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) میں ہمارے روزے قضا ہو گئے تھے۔ کیا تو ہمارے
عوض روزے رکھ سکتا ہے (اسی سال کامران کو ننگرہار کی جنگ میں شکست ہوئی تھی۔ اور شاید اسی
حالت میں رمضان کے روزے اس سے قضا ہو گئے ہوں۔ ش ب) فقیر جوہر نے عرض کیا کہ ہاں میں قضا روزے
رکھ سکتا ہوں۔ لیکن مرزا کو اپنے قضا روزے خود رکھنے چاہئیں۔ ذرا ہمت رکھئے اور بزدلی کو دل میں
جگہ نہ دیجئے۔ اس کے بعد دریافت کیا کہ تجھ کو کچھ معلوم ہے کہ مجھ کو قتل کیا جائے گا۔ فقیر نے جواب
دیا کہ حضرت بادشاہ مزاج شاہانہ رکھتے ہیں۔ لیکن میں اپنی عقل سے اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی شخص
اپنے ہاتھ کو خود نہیں توڑتا اور حضرت بادشاہ محمد ہمایوں تو بہت با مروت ہیں۔ رات اسی طرح پر گزری
علی الصبح ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ اور یہ طے کیا کہ مرزا کامران کو اندھا کر دیا جائے (دفت نژ
تذکرۃ الواقعات۔ لشکر کے امراء اور علماء کا اصرار تھا کہ کامران کو قتل کیا جائے لیکن ہمایوں نے اس کو اندھا
کرنے ہی پر اکتفا کیا) جب بادشاہ یہ حکم دے کر روانہ ہو گئے تو کوئی شخص مرزا کامران کی آنکھوں پر
نشتر نہیں چلاتا تھا۔ لوگ آپس میں ایسے شخص کو تلاش کرتے تھے۔ اتنے میں سلطان علی بخشی نے علی دوست
ایشک آقا سے کہا کہ تو نشتر مار۔ علی دوست نے جواب دیا کہ۔ جب تو کسی کو ایک شہ رُخی بھی دیتا ہے

تو حضرت بادشاہ سے عرض کر دیتا ہے۔ میں حضرت بادشاہ کے حکم کے بغیر صرف تیرے کہنے پر یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔ کل اگر حضرت بادشاہ نے دریافت کیا کہ یہ کام تو نے کیوں کیا اور ہمارے بھائی کو بے کار کر دیا۔ تو کیا میں اس وقت یہ کہوں گا کہ سلطان علی نے کہا تھا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" وہ آپس میں یہی گفتگو کر رہے تھے۔ جوہر خاکسار نے کہا کہ میں جا کر بادشاہ سے عرض کرتا ہوں۔ علی دوست نے بھی ترکی میں بادشاہ سے عرض کیا کہ اے بادشاہ تابعداروں میں کوئی شخص یہ کام نہیں کرتا۔ حضرت بادشاہ نے ترکی میں گالی دے کر فرمایا کہ تجھ کو کیا ہو گیا ہے۔ تو تعمیل کر۔ اس حکم کے بعد لوگ مرزا کامران کے پاس آئے اور غلام علی نے مرزا سے عرض کیا۔ کہ اے مرزا یہ بات اگر میں خود کہتا ہوں تو خدائے تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے۔ لیکن حضرت بادشاہ کے حکم میں چارہ نہیں۔ حکم یہی ہے کہ تمہاری آنکھوں پر نشتر مارا جائے۔ مرزا نے کہا کہ مجھ کو مار ڈالو۔ غلام علی نے جواب دیا۔ خداوند، کون تم کو مار سکتا ہے۔ پھر وہ اس کام کو انجام دینے کی فکر میں لگ گئے۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اس کا گولہ بنایا اور اس فراش نے جس نے مرزا کے پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ مرزا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کے بعد وہ مرزا کے ہاتھ پکڑ کر خیمے سے باہر لائے اور مرزا کو بٹھا کر اس کی آنکھوں میں نشتر لگایا۔ اِلا ماشاء اللہ پچاس نشتر مارے۔

لیکن اس بہادر مرد نے دم بھی نہ مارا۔ جو شخص مرزا کے زانو پر بیٹھا تھا۔ مرزا نے اس سے صرف یہ کہا کہ تو میرے زانو پر کس لئے بیٹھا ہے۔ جب تک تمہارا اطمینان نہ ہو گا تم نہ چھوڑو گے۔ سوائے اس بات کے اور کچھ نہ کہا۔ اور مردوں کی مانند مستقل مزاج رہا۔ کردی بیوہ دار نے اس کی آنکھوں میں نمک چھوڑ دیا۔ اس مجبوری کی حالت میں اس نے اَللہ کا نام لیا۔ اور اس کے بعد یہ الفاظ کہے۔ "اے خدا! دنیا میں جو کچھ میں نے کیا اس کی سزا مجھ مل چکی۔ عقبیٰ میں معافی کا امیدوار ہوں!" اس کے بعد مرزا کو سوار کر کے لشکر میں لائے۔ قریب ہی سلطان فیروز کا بنایا ہوا ایک باغ تھا۔ اسی میں قیام کیا۔ کیونکہ ہوا گرم ہو گئی تھی اس کے بعد سوار ہو کر لشکر میں آ گئے۔ مرزا قاسم کوہ پور کے خیمے میں کھڑے تھے۔ وہیں اترے۔

جوہر فقیر کہتا ہے چونکہ مرزا کو بہت زیادہ بے تاب اور پریشان دیکھا تھا اس کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ اپنی قیام گاہ پر آیا اور کارخانے میں آ کر متفکر ہوا۔ علی دوست، سلطان بار بیگی، غلام علی شش انگشت داروغہ فراش خانہ اور فقیر جوہر گھوڑے دوڑا کر بادشاہ کی خدمت میں گئے۔ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کہ اس فقیر پر بادشاہ کی نظر پڑی۔ جان محمد کتاب دار کو فقیر کی طرف روانہ کیا کہ اس غلام سے دریافت کرے کہ جس کام پر متعین کیا گیا تھا اس کا کیا انجام ہوا۔ اور اس جگہ پر کیسے آیا۔ بندہ خاکسار جوہر نے عرض کیا کہ جس کام پر بھیجا گیا تھا وہ پورا ہو گیا۔ حضرت بادشاہ نے فرمایا۔ اب تو وہاں مت جا۔ اور غسل کا

پانی تیار کر۔ اس کے بعد بادشاہ کوچ کرتے ہوئے پیرانہ جانوہ (جانوہ ایک قبیلہ تھا جو بھیرہ کے علاقہ میں آباد تھا پیرانہ اس کا سردار تھا) کے علاقہ میں پہنچے۔ پیرانہ مذکور نے آ کر شرفِ قدم بوسی حاصل کیا۔ سلطان آدم نے پیرانہ کے لئے درخواست کی اور حضرت بادشاہ نے اسے سلطان آدم کے حوالہ کیا۔

قوم گکھڑ اور شیر شاہ سُوری

گکھڑوں کی ہمایوں سے وفاداری — اور — شیر شاہ سے چپقلش

میجر راورٹی اپنی کتاب "اقوام افغانستان۔ یادداشتیں" میں لکھتا ہے کہ جب ہمایوں بادشاہ ہندوستان سے رمضان سنہ ۱۵۴۰ء میں براہ پنج ند۔ روہڑی بھاگا تو وہ تقریباً دو سال تک صوبہ سندھ میں پھرتا رہا جب شیر شاہ اسی سال اس کے تعاقب میں خوشاب پہنچا تو سب افغان قومیں مطیعانہ اس کے سامنے پیش ہوئیں لیکن ایک قوم گکھڑ جو اس وقت سلطان سارنگ کے زیر قیادت تھی، حاضر نہ ہوئی۔

عباس سروانی نے جو شیر شاہ کا معاصر تھا۔ تاریخ شاہی جس کا ترجمہ ایڈورڈ کلایو بیلی نے انگریزی میں کیا اور جس کو ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہندوستان میں نقل کیا ہے۔ لکھی ہے۔ اُس میں وہ لکھتا ہے کہ جب شیر شاہ سُوری سنہ ۱۵۴۱ء میں خوشاب میں مقیم تھا۔ تو سلطان سارنگ اُس کے حکم ملنے پر بھی اس کے پاس حاضر نہ ہوا۔ بلکہ تیروں سے بھری ہوئی ایک ترکش، اور دو شیر کے بچے بھیج دئے۔ یہ تمثیلی جواب شیر شاہ کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس پر شیر شاہ نے گکھڑوں کے ملک پر حملہ کر دیا۔ اور اس کی فوجوں نے زیر کمان جنرل خواص بمقام روات سنہ ۱۵۴۲ء میں ایک خونریز جنگ لڑی۔ سلطان سارنگ بمعہ اپنے دستوں کے میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ دشمن کی فوجوں نے گکھڑوں کے ملک کو تہ و بالا کر دیا۔ اس کے بعد جلد ہی شیر شاہ اپنے گورنر خضر خان بیرک کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بنگال چلا گیا۔ اور اپنی کچھ فوج قلعہ رُہتاس میں چھوڑ گیا۔ سلطان آدم خان برادر سلطان سارنگ جو اس کے بعد ملک کا حاکم ہوا نے سلطان سارنگ اور اس کے مقتول ہمراہیوں کو روات میں دفن کر دیا۔ اور اس پر ایک شاندار مقبرہ بنوایا جس کا ذکر کیگوہر نامہ (تاریخ گکھڑ) جو شاہ جہان بادشاہ کے زمانہ میں لکھی گئی، میں یوں تحریر ہے:۔

"سلطان سارنگ اور اس کے بڑے بھائی اور اس کے بھتیجوں کی نعشیں روات۔ میدان لشکرگاہ"

کے نزدیک دفن کی گئی تھیں۔ جو کہ شاہراہ عام پہ اور پرگنہ پھروالہ (پروالہ) کی سرحد پر ہے۔ قبر پر عالی شان مقبرہ سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں سے بنایا گیا۔

نوٹ۔ گکھڑ روات۔ ڈن گلی کے علاقہ میں اپنی فوج کا کثیر تعداد رکھتے تھے جو اس زمانہ میں اُن کا دارالخلافہ تھا۔

ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ اس علاقہ کی حفاظت کے لئے یہاں دس ہزار پیادہ اور پندرہ ہزار سوار رکھے جاتے تھے۔

شیر شاہ نے فتح کے بعد ایک نیا رُہتاس قلعہ گکھڑوں کے ملک میں بنایا۔ تا کہ ان کے ملک کے اندر خنجر کا کام دے۔ اور ساتھ ہی کابل اور لاہور کے درمیان کا راستہ مغلوں کے حملہ سے محفوظ کر دے۔ پٹھانوں میں سے صرف ایک قبیلہ، نیازی پٹھان، شیر شاہ کے مخالف تھے۔ وہ بھاگ کر گکھڑوں کے ملک میں چلے گئے۔ گکھڑ ہمایوں بادشاہ کے وفادار تھے۔ اس لئے گکھڑوں اور نیازیوں کو شیر شاہ اور سلیم شاہ نے مکمل طور پر تباہ کر دیا۔

نیازی کشمیر میں داخل ہونا چاہتے تھے لیکن کشمیر کے حاکم مرزا حیدر نے جو دُغلاتی مغل تھا۔ اسلام شاہ کو راضی کرنے کے لئے تمام کشمیر کے درّے اور راستے نیازیوں پر بند کر دئے۔ نیازی کشمیر میں داخل نہ ہو سکے۔ اور راجوڑی کی طرف واپس آ گئے۔ نیازی سردار اعظم ہمایوں نے اپنی ماں اور بیٹا اسلام شاہ کے پاس بطور یرغمال بھیجے۔ اسلام شاہ واپس آ کر بن سیالکوٹ پر فروکش ہوا۔

کشمیریوں نے زیرِ حکم مرزا حیدر راجوڑی کے مقام پہ اعظم ہمایوں پر حملہ کیا۔ اعظم ہمایوں بڑی بہادری سے لڑا اور اپنے بھائیوں عیسیٰ، شہباز اور سعید سمیت قتل ہوا۔ مرزا حیدر نے ان سب کے سر اسلام شاہ کے پاس بمقام بن سیالکوٹ بھیجے۔

گکھڑ افغانوں کے مخالف اور مغلوں کے ساتھ تھے اور ہمایوں بادشاہ کے وفادار تھے۔ ابوالفضل اکبر نامہ میں سلطان سارنگ اور سلطان آدم گکھڑ کو ایک معزز اور قابلِ اعتبار زمیندار تحریر کرتا ہے۔ دوسری جگہ سلطان آدم کو سرگروہ گکھڑ تحریر کرتا ہے۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ گکھڑ ایک بڑا طائفہ ہے اور دریائے جہلم اور سندھ کے درمیان رہتے ہیں۔

شیر شاہ کا حسب و نسب۔ اور ابتدائی زندگی

شیر شاہ سوری کے باپ کا نام حسن تھا۔ اور دادا کا ابراہیم۔ یہ کوہستان روہ کے رہنے والے تھے۔ کوہستان روہ کا طول سواد بجوڑ (سوات باجوڑ) سے قصبہ سوی (سیوی) کوئٹہ تک ہے۔

جو بھکر میں شامل ہے اور عرض حسن ابدال سے کابل تک ہے۔ اس کوہستان میں افغانوں کے چند قبائل آباد ہیں جن میں ایک قبیلہ سُور ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سلاطین غور کی نسل سے خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہزادہ محمد سوری زمانہ سابق میں وطنِ مالوف سے نکل کر روہ کے افغانوں میں آ گیا۔ جب ایک رئیس کو اس کا نسب تحقیق ہوا تو باوجود اس کے کہ اپنی بیٹی کسی دوسرے قبیلے میں نہیں دیتے تھے۔ برخلاف رسم قدیم کے اس نے محمد سُور کو اپنا داماد بنا لیا۔ اس کی اولاد سُوری ہوئی۔ اس روایت کے مطابق افغانان سُور سب افاغنہ میں اشرف ہوں گے۔

سکندر لودھی کے پاس شیر شاہ کا دادا ابراہیم سُور نوکری کے لئے دہلی آیا۔ اور سلطان بہلول لودھی کے ایک سردار کی نوکری کر لی۔ اور چند روز حصار فیروزہ اور کچھ مدت نارنول میں مقرر رہا۔ جب بہلول لودھی کے بعد سکندر لودھی خود بادشاہ ہوا اور اس کے امراء میں سے جمال خان جون پور کا حاکم ہوا تو اس نے قدیمی نوکر ابراہیم سُور کے بیٹے حسن سور کو رُہتاس کے علاقہ سے سہسرام و خواص پور ٹانڈہ بطور جاگیر عطا کر کے پانچ سو سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ حسن سُور کے آٹھ بیٹوں سے فرید و نظام ایک افغانی لڑکی سے تھے اور باقی لڑکے کنیزوں کے بطن سے تھے۔ چونکہ حسن سُور کو فرید سے اتنی اُلفت نہ تھی۔ وہ رنجیدہ ہو کر جمال خان کی خدمت میں چلا گیا۔ حسن نے جمال خان کو عرضی بھیجی کہ میرے لڑکے کو دلاسہ دے کر میرے پاس ارسال فرمایا جائے تا کہ یہاں علم سیکھے۔ اور اخلاق و آداب حاصل کرے۔ جمال خان نے ہر چند اس سے کہا۔ اس نے یہی عرض کیا کہ سہسرام سے زیادہ علماء جون پور میں موجود ہیں۔ میں یہیں طالب علمی کرتا ہوں۔ چنانچہ اس نے اس زمانہ کے رسوم کے موافق گلستان، بوستان، سکندر نامہ، کافیہ عربی مع حواشی و دیگر کتب علمی تمام کیں۔ اور نثر و نظم و تواریخ میں بھی دستگاہ پائی۔ دو تین سال بعد حسن سور جون پور آیا۔ تو عزیز و اقارب نے فرید کو باپ سے ملایا۔ اور آخر حسن سور نے جاگیر کا داروغہ کر کے روانہ کیا۔ اس نے وقت رخصت عرض کی کہ حضور جاگیرات کا انتظام عدل پر ہے اگر اس کام پر مقرر کیا جاتا ہوں تو عدل سے تجاوز نہیں کروں گا۔ اور نوکر آپ کے اکثر خویش و یگانہ ہیں اگر ظلم کریں تو میں رعایت نہیں کروں گا۔ اس قسم کے معروضات کر کے جاگیر پر روانہ ہوا۔

رُہتاس اور شیر شاہ بانیِ قلعہ کی کہانی

شیر شاہ سوری کا بانیٔ قلعہ رہتاس کی کہانی بیان کریں جس نے شیر کی ایک دن کی زندگی کو گیدڑ کی صد سالہ زندگی پر ترجیح دی۔

والد کا خواب - فرید خان کا والد ایک جوانمرد آدمی تھا۔ جو حاکم جون پور کی طرف سے پرگنہ بہرام پور کا جاگیردار تھا۔ اور پانچ صد سواروں کا کماندار۔ کہتے ہیں۔ ایام حمل میں ایک رات حسن خان کی بیوی نے خواب دیکھا۔ "ماہے از آسمان بہ کنارِ آں رسید" ترجمہ۔ ایک چاند آسمان سے اس کی آغوش میں پہنچا" خواب حسن خان سے بیان کیا۔ تو اس نے ایک تازیانہ مارا۔ کہ خواب بیان کرنے سے اثر زائل ہو جاتا ہے۔ باپ کو کیا معلوم تھا کہ یہ وہی فرید خان ہے جس نے آگے چل کر شیر شاہ کا نام اختیار کیا۔

درویش کی پیش گوئی - روایت ہے۔ کہ بچپن میں فرید خان ایک دام کے لئے رو رہا تھا۔ ایک درویش مسافر کا گزر ہوا۔ اس نے سن کر کہا۔ تعجب ہے۔ ہندوستان کا بادشاہ ایک دام کے لئے رو رہا ہے۔

فرید خان جوان ہوا تو حاکم پٹنہ کے ہاں ملازم ہوا۔ پٹنہ کا حاکم شکار میں اسے ہمراہ لے جاتا۔ دوران شکار ایک دفعہ شیر حاکم پٹنہ پر جھپٹا۔ وہ اس کی زندگی کا رشتہ کاٹنے ہی والا تھا کہ فرید خان نے جرأت اور مردانگی سے شیر کو تلوار کی نوک پر روکا اور تھوڑی دیر میں اُس کو ڈھیر کر دیا۔ آقا کی جان بچائی اور پٹنہ کو یتیم ہونے سے بچا لیا۔ اس دن سے فرید خان، شیر خان کے نام سے مشہور ہو گیا۔

شیر خان بابر کے دربار میں - بابر جب آگرہ میں تخت نشین ہوا۔ تو مشہور جرنیل جُنید برلاس کی وساطت سے شیر خان بابری دربار میں پہنچا۔ شیر خان کی پیشانی سے شاہانہ جلال عیاں تھا۔ بابر نے تھوڑے ہی دنوں میں اس کی پیشانی کی تحریروں کو پڑھ لیا۔ وہ اُسے دیکھتا تو پریشان ہو جاتا۔ تاریخ رُہتاس میں ذکر ہے۔ شیر خان جب بابری دربار میں آتا تو بابر کے لئے غور و فکر کی دعوت لے کر آتا۔ شیر خان کی پیشانی پر وہ جہانبانی اور حکمرانی کے آثار دیکھتا اور کہتا۔ "شاہی و گدائی زمانے اور وقت کے انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ مبادا یہ میری نسل سے حکومت چھین لے۔ اسے ٹھکانے لگانا چاہیئے" (تاریخ رُہتاس قلمی)

بابر کے دربار سے فرار - شیر خان بابر کے ارادے سے باخبر ہوا تو بھاگ کر بہار کے حاکم سلطان محمد لوہانی کے یہاں آگیا۔ اور اس کے بیٹے کا اتالیق بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد سلطان فوت ہوا اور یہ وزیر بن گیا اور ایسا اثر و رسوخ پیدا کیا۔ کہ بہار کے وارث کو بھاگتے ہی بنی۔ اور یہ بادشاہ بن بیٹھا۔ اسی دوران

میں حسن خان (فرید خان کا والد) نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور شیر خان اپنے موروثی ملک پر قابض ہوا اور وہ اس طرح مستقبل میں اقبال و فتح مندی کے امکانات روشن کرنے کے قابل ہوا۔

شیر خان کے اندیشے اور منصوبے - شیر خان شروع ہی سے مغلوں کو ہندوستان کے تخت کا حقدار نہ مانتا تھا (بابر نے حکومت ہندوستان افغانوں سے لی ہے۔ ش ب) اور عنانِ اختیار اُن کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتا تھا۔ بابری دربار سے فرار نے اس کے عزم کو اور بھی پختہ کر دیا۔ اب ہمایوں ہی اس کا ایک رقیب تھا جس سے مڈبھیڑ ناگزیر تھی۔

قلعہ رہتاس۔ دکن - یہ قلعہ اس نے دکن کے والی برہمن راجہ چتامن سے ایک حیلہ سے لیا۔ وہ اس کے پاس گیا اور کہا کہ محرمات باندیوں کے ساتھ پناہ لینے آیا ہوں۔ میری امداد کریں۔ سادہ لوح راجہ مان گیا۔ شیر شاہ ایک ہزار جنگجو قلعہ کے اندر لے گیا۔ اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ زمانہ سنہ ۱۵۴۰ء کا تھا۔ اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ اور فرید خان نے شیر خان اور اس کے بعد شیر شاہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔

ہمایوں سے جنگ - راجہ چتامن والیٔ قلعہ رہتاس (دکن) کو اسیر کر لینے کے بعد اس نے نہایت مؤثر قدم اٹھایا۔ مرزا کامران برادر ہمایوں والئے لاہور کو اپنے ساتھ متفق کیا۔ مرزا کامران اور شیر شاہ کے اتحاد نے بابری سلطنت میں نزاع کی حالت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب قنوج میں شیر شاہ اور ہمایوں صف آرا ہوئے تو آسمان نے بھی شیر شاہ کا ساتھ دیا۔ ہمایوں بھائی سے امداد کا طالب ہو کر لاہور کی طرف منزلیں مارتا ہوا آیا۔ اور ہر چند کہ امراء اور وزراء نے مرزا کامران کو بھائی کی مدد کے لئے اُبھارا مگر وہ تیار نہ ہوا۔ ہمایوں بھائی کی طرف سے مایوس ہو کر آگے بڑھا۔ شیر شاہ تعاقب کے لئے برابر چلا آتا تھا۔ یہ دیکھ کر ہمایوں دریائے جہلم عبور کر کے سندھ کی طرف چل دیا۔ لٹے ہوئے تاجدار نے اِدھر اُدھر سے فوج جمع کر کے حکومت واپس لینے کی کوشش کی۔ مگر قدرت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس حالت میں اس کی مدد پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوا۔

دریائے جہلم کے پار - ہمایوں کے تعاقب میں شیر شاہ دریائے جہلم کے پار اُترا تو سلطان سارنگ نے شیر شاہ کا راستہ روکا۔ اور ہمایوں کے لئے سنبھلنے کا موقعہ پیدا کر دیا۔ سلطان سارنگ سے نزاع ایک طویل جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ اور شیر شاہ سوری تعاقب جاری نہ رکھ سکا۔ چنانچہ اس نے سلطان سارنگ سے نبٹنے کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دئے۔

قوم گکھڑ - دریائے جہلم اور سندھ کا یہ درمیانی علاقہ اس زمانہ میں گکھڑوں کے زیر نگیں تھا سلطان سارنگ اور سلطان آدم کے درمیان یہ علاقہ بٹا ہوا تھا۔ پوٹھوار (راولپنڈی ضلع) کی حکومت

سلطان سارنگ کے ہاتھ میں تھی۔ دونوں بھائی بابر کے ہمرکاب پانی پت کے میدان میں دادِ شجاعت دے کر بابر کے دربار میں مقبول ہو چکے تھے اور خاندان تیموریہ کے حلیف چلے آتے تھے۔ تاریخ فرشتہ اور بعض دوسری تواریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوم تیموری دورِ اقتدار سے پہلے کبھی خود مختار رہی ہے اور کبھی دہلی کے تخت کی اطاعت گزار۔ تاریخ جہلم میں بحوالہ تاریخ فرشتہ مرقوم ہے جس کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ گکھڑ جو ہمیشہ اطاعت خاندان تیموریہ کی کرتے تھے۔ ان کی ولایت درمیان بہت (دریائے جہلم) اور سندھ کے واقع ہے۔

تاریخ جہلم میں مرقوم ہے کہ شیر شاہ سے حفاظت کے لئے سلطان سارنگ نے ایک دیوار پتھر و چونے سے واقع موضع سلطان پور تحصیل جہلم بنوائی۔ جس کے آثار اب تک باقی ہیں۔ بیان ہوتا ہے کہ سلطان سارنگ مورثِ اعلیٰ و سردار قوم گکھڑ کی بود و باش اس موضع میں تھی۔ جب ہمایوں بادشاہ اور شیر شاہ کا مقابلہ قریب دہلی ہوا اور ہمایوں کی قوت میں ضعف آیا۔ تو وہ اسی لاستہ سے کابل کی طرف بھاگ نکلنے کے لئے آیا۔ اس موقع پر سلطان سارنگ ہمایوں بادشاہ کا مددگار رہا۔ اور بخوف شیر شاہ، سلطان سارنگ نے یہ دیوار برائے حفاظت بنوائی۔ کہتے ہیں کہ یہ دیوار گوشہ جنوب و شرق دریا سے شروع ہو کر گوشہ شمال و غرب میں تخمیناً ۵ میل تیار ہوئی۔ اور اس کے درمیان دروازے رکھے گئے۔ یہ دیوار بلندی میں ۲۰ فٹ اور عرض میں ۱۲ فٹ کے قریب ہے۔ اب بھی ۴۰۰ کرم کے فاصلہ تک موجود ہے۔ اور ایک دروازہ بھی موجود ہے باقی سب دیوار مسمار ہو گئی ہے۔

قلعہ رہتاس کی تعمیر۔ الغرض جب سلطان سارنگ اپنی روش پر ڈٹا رہا تو شیر شاہ نے یہاں قلعہ تعمیر کرنے کی تجویز سوچی۔ وہ یہ سمجھتا تھا۔ کہ ہمایوں اپنی حکومت کھو دینے کے بعد کبھی بھی آرام کی نیند نہیں سو سکتا۔ ایران کا بادشاہ طہماسپ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ اس واسطے اُسے ہندوستان آنے والے راستوں کو محفوظ کرنا تھا۔ اور گکھڑوں کو بھی سیدھا کرنا تھا۔ وہ ایسی رصدگاہ کا متلاشی تھا جہاں سے اسے دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں۔ اور جہاں سے اس کے ترکش کے ایک تیر سے بیک وقت دو شکار کئے جا سکیں۔ یعنی :-

۱۔ ہمایوں ہندوستان میں داخل نہ ہو سکے۔

۲۔ گکھڑوں کا دم خم بھی ختم ہو جائے۔

چنانچہ اس نے اپنے دارالمہام شاہو سلطان کو حکم دیا کہ وہ سرزمین بہت و جہلم میں ایسی جگہ تلاش کرے جہاں ایسا قلعہ تعمیر ہو سکے۔ جس میں تیس ہزار سوار، پچاس ہزار پیدل، پچاس ضرب توپیں اور

پانچ سو تیر انداز رہ سکیں۔

شاہو سلطان کی انتخاب کردہ زمین گھان ندی کے کنارے پر ہے۔ جس کو یہ ندی نصف دائرہ کی شکل میں شمال اور شمال سے مشرق کی جانب گھیرتی ہوئی چلی گئی ہے۔ جنوب کی طرف ویران پہاڑی ہے۔ موجودہ جرنیلی سڑک سے چار میل کے فاصلہ پر اور موضع دینہ سے جنوب مشرق کی طرف قلعہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ موجودہ جرنیلی سڑک شیر شاہ کی تعمیر کردہ ہے۔ اور کبھی اسی قلعہ کے خواص خانی دروازہ کے نیچے سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر آج بھی سراؤں، اور باولیوں کے نشانات ملتے ہیں۔

قلعہ کی عمارت

یہ عمارت قلعہ خورد اور قلعہ کلاں کی صورت میں منقسم اور متحد ہے۔ قلعہ خورد کی تعمیر کا انتظام پہلے ہوا۔ یہی قلعہ اندرون یا اندر کوٹ کہلاتا ہے۔ یہ شاہی محلات اور حرم سراؤں پر مشتمل تھا جن کے آج محض چند نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ حصہ شیر شاہ کی حیات میں مکمل ہوا۔ ہر دو قلعہ کی دیوار کنگرہ دار ہے دیواروں میں جگہ جگہ بُرج بنائے گئے ہیں جن سے قلعہ کی سطوت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ بارش کے پانی کے نکاس کے لئے جگہ جگہ نالیاں رکھی گئی ہیں جن سے قلعہ کے اندر پانی جمع ہونے نہیں پاتا۔ اندرون قلعہ تین کنوئیں اور تین باولیاں ہیں۔ جو اب منہدم ہو چکے ہیں۔ دیوار اکثر جگہ پر محراب دار ہے۔ جو ظاہر کرتی ہے کہ ایسے حصوں میں سپاہ رہتی ہوگی۔ یہ محرابیں بارش وغیرہ میں گشتی دستوں کی حفاظت کرتی تھیں۔ اکثر دروازے ایسے ہیں کہ ان کا بالائی حصہ بالاخانے یا غُرفے کی صورت کا ہے اور رہائش کے قابل ہے۔

دیوار ہر مقام سے ۳۰ فٹ کے قریب چوڑی ہے اور بیرونی رُخ سے ۴۰ فٹ بلند ہے۔ اندر سے زمین ناہموار ہے جس کی وجہ سے کہیں زیادہ اونچی اور کہیں کم۔ قلعہ کے چاروں طرف ایسی قدرتی کھائی و خندق نے گھیر رکھا ہے جس میں پانی بہتا ہے اور اس طرح خندق کا کام دیتی ہے۔ شمال سے جنوب میں دروازہ خواص خانی سے دروازہ سہیل تک چار فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ اور مشرق سے مغرب کی طرف دونوں دیواروں میں ڈیڑھ میل کی دوری ہے۔ اس طرح دیواروں نے ۱۳۵۷ بیگھہ (تقریباً ½ ۶۷۸، ایکڑ) زمین کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

تاریخ جہلم میں مرقوم ہے کہ :- اس قلعہ کے اندر ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جس میں محل شاہی ہوتا تھا اور بیگمات رہتی تھیں۔ اب اس میں شہر رہتاس آباد ہے۔ اس قلعہ کو اندر کوٹ کہتے ہیں۔ حدود قلعہ کے اندر ۴۴ گھماؤں کے قریب ہے۔ قلعہ کے ۱۲ دروازے ان ناموں سے مشہور ہیں :-

خواص خانی، موری، طلائی، شیشی، لنگر خوانی، کابلی، باولی والا، سہیل، چپلی والا، گٹالی،

شاہ چاندولی، کشمیری۔۔۔؟

شہنشاہ ہندوستان جہانگیر ۱۰۲۹ھ میں رہتاس آئے اور قلعہ رہتاس میں مقیم ہوئے۔ تزک جہانگیری میں لکھتے ہیں :-

روز دوشنبہ غرۂ محرم از کنار دریائے بہت کوچ فرمودہ یک روز درمیان بہ قلعہ رُہتاس کہ بنائے شیرخان افغان است رسیدم۔ ایں قلعہ را در شکستگی زمین بنا نہادہ کہ بآں استحکام جائے خیال نتواں کرد۔ چوں ایں بولایت گکھڑاں متصل است۔ وآنہا جمیع متمرد و سرکش اند۔ آں قلعہ را خاص بجہت تنبیہ و سرکوبی آں بخاطر گذرانیدہ بود۔ کہ بساز دچوں پارہ کار کردند شیرخان در گذشت و پسر او سلیم خان توفیق اتمام یافت۔ بر ہر یکے دروازہ مخرچ قلعہ را بر سنگے کندہ نصب نمودہ اند۔ شانزدہ کروڑ دو لک وبست پنج ہزار و کسرے خرچ آں عمارت شدہ کہ بحساب ہندوستان چہل لک وبست و پنج ہزار روپیہ باشد موافق داد و ستد ایران یک صد و بست ہزار تومان و مطابق معمول توران یک ارب وبست ویک لک وہفتاد و پنج ہزار کہ حالی نامند، ے شود۔

ہمایوں کی آمد۔ شیر شاہ سوری کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ تخت نشین ہوا۔ سلیم شاہ اگرچہ باہوش اور ذہین بادشاہ تھا۔ مگر شیر شاہ جیسے اوصاف اس میں موجود نہ تھے۔ سلطان آدم والئی سلطان پور دیو تھوار) جو ہمایوں کا حلیف تھا۔ اُسے ایران پیغام بھیجا۔ کہ شیر شاہ مر چکا ہے۔ اور سوری اقتدار زوال پذیر ہے چنانچہ ہمایوں ایران سے لشکر جرار لے کر روانہ ہوا کچھ عرصہ کابل و قندھار کی فتح میں صرف ہوا اور آخر کار ۹۶۲ھ میں ہندوستان کی طرف بڑھا۔ مرزا کامران والئی لاہور ہمایوں کے ڈر سے بھاگ کر سلطان آدم کے پاس پناہ گزیں ہوا جس نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنے پاس روکے رکھا۔

ہمایوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ قلعہ رُہتاس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ مگر جب رہتاس پہنچا تو اکابرین نے مشورہ دیا کہ قسم پوری کرنے کے لئے ایک گولہ قلعہ پر پھینکے چنانچہ ایک گولہ قلعہ پر مارا جس سے شاہ چاندولی دروازہ کی محراب ٹوٹ گئی۔

شیر شاہ کی زندگی ایک نظر میں

سالِ ولادت رجب ۸۷۷ھ دسمبر ۱۴۷۲ء   سالِ جلوس ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء)

مقامِ جلوس۔ آگرہ   دار الخلافہ۔ دہلی

مدت سلطنت ۴ سال ۴ ماہ ۱۵ یوم   سالِ وفات ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ (۲۱ مئی ۱۵۴۵ء)

مدفن۔ سہسرام

آئینہ دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا "افسوس مجھے شام کے وقت بادشاہی ملی" نام فرید خان ولد حسن خان سُور

شیر شاہ کی انگوٹھی کے نگینہ پر یہ سجع تھا۔ ؎

شیر شاہ بن حسن سُور قائم   خلّد اللہ باقی تُرا باد دائم

کسی شاعر نے اس کے مرنے کی تاریخ یوں لکھی ؎

شیر شاہے کہ از مہابت او   شیر و بُز آب را بہم مے خورد

چوں برفت از جہاں بدارِ بقا۔ گشت تاریخ او، ز آتش مُرد

۹۵۲ھ

گکھڑوں کے مزید حالات

خلاصۃ التواریخ (تصنیف سوجان سنگھ بہ عہدِ عالمگیر بادشاہ ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء کی ہے) میں جہاں چوحدی کشمیر کی لکھی ہے۔ وہاں جنوب و غرب میں حد گکھڑاوں کی تحریر کی ہے۔ دوسری جگہ جہاں ذکر تسخیر ولایت گکھڑاں تحریر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ یہ ولایت درمیان دریائے بہت و سندھ کے واقع ہے۔ حاکم اس کا خود مختار رہا ہے کبھی فرمانبرداری بادشاہانِ دہلی کی نہیں کی ہے۔ اور بعض تواریخ میں لکھا ہے کہ یہ ولایت از قدیم داخل کشمیر تھی۔ سلطان محمود غزنوی نے فتح کر کے اپنے ایک امیر کو جو نسل کیانیاں سے تھا اور گکھڑ نام رکھتا تھا سپرد کر دی۔ اُس وقت سے گکھڑ اُس میں ہیں۔

باقی حال بھی مطابق تاریخ فرشتہ اس نے لکھا ہے۔ کہ جب کمال خان بعد رہائی از سلیم شاہ کے ہمایوں بادشاہ اور اکبر بادشاہ کی جنگ مرہٹہ وغیرہ میں عمدہ خدمات کیں تو شہنشاہِ اکبر نے اس پر بڑی مہربانی کی۔ تو اس نے خواہش اپنے ملک موروثی کے حاصل کرنے کی کی۔ فرمانِ شاہی بنام سلطان آدم گکھڑ صادر ہوا۔ "کہ اُس نے مرزا کامران کو قید کرنے میں حضرت ہمایوں کی نیک خدمت کی ہے اور اس کا خاندان سلطنت کی فرماں برداری ظاہر کرتا ہے۔ ہم نے از روئے مفضل و کرم نصف ولایت سلطان آدم پر قائم رکھی اور نصف ولایت کمال خان کو، جو وارثِ ملک ہے۔ اور اس نے خدمات شائستہ کی ہیں عطا کرتے ہیں۔" سلطانِ آدم نے اس فرمان پر عمل نہ کیا۔ اور امیر محمد خان معہ امرائے پنجاب بیخ کنی سلطانِ آدم اور اعانت کمال خان کے لئے متعین ہوئے۔ سلطان آدم قصبہ ہیلاں پار جہلم کے پہنچ کر لشکر بادشاہی سے لڑا اور شکست کھائی۔ امیر محمد خان نے اس کا تعاقب کر کے

تمام ولایت پامال کی اور داخل ممالک محروسہ ہوئی۔ شہنشاہ نے تمام وہ ملک کمال عنایت سے کمال خان کو عنایت فرمایا۔ اور سلطان آدم بالکل خارج کیا گیا۔

کتاب سیر المتاخرین میں بھی صفحہ ۲۰۷ پر اسی کے مطابق لکھا ہے۔

تمام کتب و حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم گکھڑ خواہ ابتداء میں ہندو تھی۔ اور اصلی متوطن پنجاب کے ہیں یا کیانی تھے۔ اس مسئلے کا صحیح حل تو نہیں مل سکتا مگر زیادہ تصدیق ان کی اصل ہندو ہونے کی ہوتی ہے اور قابلِ اعتبار بھی یہی امر ہے۔ کیونکہ راجہ کید راج کے وقت اُن کا موجود ہونا اور پھر سلطان محمود غزنوی کے خلاف بہ ہمراہی و اعانت راجہ ہائے ہند میدانِ پشاور میں لڑنا اور ان کی رسومات بابت شادی و دختر کشی وغیرہ اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ پُرانی قوم اسی ملک کی ہے اور ابتداء میں ہندو تھی۔ بلکہ اب تک ان کی شادیوں میں ہندوانِ پنجاب کی بہت سی رسومات جاری ہیں اور برہمن اب تک (یعنی ۱۸۶۲ء تک) ان کے گھر میں باوجود اسلام کے رسوم شادی وغیرہ ادا کرنے کے لئے مقرر رہا ہے۔ اب چند سال سے نہیں۔ اور راب جو راجہ گدی نشین ہوتا ہے تو قشقہ یعنی ٹیکہ کیسر و صندل کا مثل راجہ ہائے ہندو کے پیشانی پر لگتا ہے۔ اس کی تصدیق ایک بیان سے جو راجہ جہاندادخان نے ۱۸۶۶ء اپنے حقوق خانی کے متعلق دیا، بھی ہوتی ہے۔ یہ خط جہاں اور تاریخی واقعات پر روشنی ڈالتا ہے وہ اس امر کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ بہرحال یہ قوم بڑی معتبر اور بہ کثرت تھی۔ دریائے جہلم و سندھ کے درمیان اسی قوم کا غلبہ و زور تھا اور اسی قوم کی وراثت اور حکومت تھی۔ کیونکہ جب ایک ایک لڑائی میں اُن کا تیس تیس ہزار پیادہ لڑائی پر جاتا تھا۔ تو پھر اُن کی وراثت و دخل میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اور ابتدائے حکومت شیر شاہ افغان و ہمایوں بادشاہ سے ان کا بڑا باعزت و بہادر رہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح جو اسناد عہد شاہان دہلی و نیز عملداری دُرّانی کی ابتدائی ۱۱۴۹ھ مطابق ۱۷۳۶ء سے ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء تک اس قوم نے داخل کئے ہیں۔ ان سے بھی ان کا دخل و قبضہ وارثانہ و بااختیار رہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اور مندرجہ ذیل دیہات بھی اِن ہی کے نام پر آباد شدہ از کتب مذکورہ معلوم ہوتا ہے مثلاً :-

۱۔ نظر پور معروف نجف پور۔ آباد کردہ نظر خان پسر سید خان گکھڑ

۲۔ کمال پور۔ آباد کردہ کمال خان۔ برادر زادہ سلطان آدم جس نے دوبارہ اس ملک موروثی پر دخل پایا۔

۳۔ خان پور۔ آباد کردہ دیوان فتح خان۔ اس میں جو رہائشی مکان دیوان فتح خان نے اپنے لئے بنایا اس کا نام تارا منڈل رکھا۔

۴۔ فتح آباد معروف ترناوہ۔ دیوان فتح خان کا آباد کردہ ہے۔ عملداری سکھاں میں ایک کنٹھ پر پانی ترناوہ سے چڑھایا گیا۔ اسی کے نام سے شہرت پا گیا۔

۵۔ بادل پور۔ آباد کردہ بادل خان جانی بیگی کا ہے۔

۶۔ اجمیر پور معروف سرادہنہ۔ اجمیر خان کا آباد کردہ ہے۔ بڑے قحط میں (۱۷۸۳ء) جب ویران ہوا تو قوم سرادہنہ کی معرفت آباد کرایا۔

۷۔ مبارز آباد۔ مبارز خان گکھڑ کا آباد کردہ ہے۔

۸۔ پنڈ گھاگرا۔ قوم گکھڑ کے نام سے مشہور ہے۔

۹۔ باغ پور ڈھیری۔ راجہ علی گوہر خان نے آباد کی۔

گکھڑ دُرّانی اور سکھوں کے عہد میں

شاہانِ دُرّانی جن کی سلطنت ۱۷۹۵ء میں ختم ہو گئی۔ اُن کے وقت تک کسی بادشاہ نے اِن سے کچھ بھی بطورِ مالیہ نہیں لیا۔ البتہ شاہانِ دہلی ایک اسپ لیتے تھے۔ وہی دُرّانی لیتے رہے۔ بلکہ علاوہ اس کے ان کی جاگیرات کشمیر وغیرہ میں تھیں۔ اور اسی طرح بڑے بڑے منصب اور تنخواہ بادشاہانِ دہلی سے پاتے رہے۔

جب سلطنت دُرّانی کا خاتمہ ہو گیا اور قوم سکھ نے پنجاب کی جانب سے سر اٹھایا تو ۱۸۱۶ء تک اُن پر نہ حکومت دُرّانی کی اور نہ دخل قوم سکھ کا ہوا۔ اس عرصہ میں دو دفعہ اتفاق مقابلہ کا سکھوں سے اُن کو پڑا۔ اول قریب سمت ۱۸۵۲ بکرمی مطابق ۱۷۹۵ء کے جب گوجر سنگھ نامی ایک بھنگی سردار نے جہلم کی طرف سے اس قوم پر چڑھائی کی۔ اس وقت جعفر خان و شیر محمد خان راجہ موجود تھے۔ راجگان نے اپنی جمعیت کے ساتھ اس سے مقابلہ کیا اور موضع چھوہ میں قریب خانقاہ جس کو دادا شہید کہتے ہیں جنگ ہوئی سردار مذکور مارا گیا۔ اور اس کی فوج شکست کھا کر مفرور ہو گئی۔ اکثر مال از قسم ہتھیار و گھوڑے و نقد و پارچہ سکھاں کا غنیمت میں راجگان کو ملا۔

پھر سمت ۱۸۷۲ بکرمی مطابق ۱۸۱۵ء میں سردار صاحب سنگھ نے علاقہ سید پور پر حملہ کیا۔ اس وقت مہند علی خان و شیر محمد خان راجہ تھے۔ انہوں نے وہاں جا کر مقابلہ کیا۔ لیکن مغلوب ہو گئے اور علاقہ سید پور اُن سے چھوٹ گیا۔

اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جب زور ہو گیا تو راجگانِ خان پور ۱۸۱۲ء سے ...... اسپ کے پانچ سو روپیہ سالانہ نذرانہ دیتے رہے۔ ۱۸۲۴ء میں سردار ہری سنگھ نے نذرانہ زیادہ

کرنا چاہا۔ اس پر سردار ہری سنگھ سے نا اتفاقی ہو گئی۔ آخر قبل از جنگ و فساد اس پر صلح ہوئی کہ پانچ ہزار روپیہ سالانہ دیویں۔ یہ ایک سال دیا۔ دوسرے سال ۱۸۲۶ء میں علاوہ اس کے سات مُہار شتر، چار راس خچر اور چار قلادہ سگ شکاری اور دو راس اسپ مقرر ہوئے۔ یہ معاملہ چار برس تک رہا پھر سردار ہری سنگھ نے پورا معاملہ طلب کیا۔ اور راجگان نے نہ دیا۔ ۱۸۳۰ء میں لڑائی ہوئی اور راجگان خان پور سے نکل گئے۔ اور خود اکثر دیہات اپنے علاقہ کے جلا دئے۔ پھر ۱۸۳۱ء میں صلح اس پر ہوئی کہ نصف علاقہ کی پیداوار سرکار سکھاں کا اور نصف راجگان کا ہو۔ ایک فصل یہ عمل ہوا۔ پھر سرکار سکھاں نے پورا معاملہ تمام علاقہ کا راجگان سے طلب کیا انہوں نے نہ دیا۔ اس پر سردار ہری سنگھ جو فوج بہ تعداد ایک کمپ واسطے صفائی ملک یوسف زئی کے لایا تھا۔ وہ اول از راہ شاہ اللہ دتا خان پور لایا۔ اور راجگان خان پور سے بے دخل ہو گئے اور لڑائی نہ ہوئی۔

قلعہ خان پور سردار ہری سنگھ نے ۱۸۳۱ء (سمت ۱۸۸۸) میں تعمیر کرایا جو اب تک موجود ہے۔ اب اس میں ڈاک بنگلہ ہے۔ (ش ب)

اس وقت راجہ علی گوہر خان موضع سیٹر علاقہ دِناہ میں چلا گیا۔ اور راجہ نجف خان موضع تجوال علاقہ ناڑہ میں سکونت پذیر ہوا۔ یہ موضع تجوال سردار احمد علی خان و فتح علی خان کرڑالوں کا تھا۔ جو انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی راجہ نجف خان کو برائے گزارہ دیا۔ یہ راجگان ۱۸۳۶ء تک اپنے علاقہ سے مال چوری و ڈاکہ سے اور کچھ لوگوں کی رضامندی سے وصول کرتے رہے۔ لیکن جب سرکار سکھاں کا زور زیادہ ہو گیا اور راجگان بے خرچ ہو گئے تو ۱۸۳۶ء (سمت ۱۸۹۴) میں راجہ علی گوہر خان نے معرفت راجہ گلاب سنگھ کی خدمت میں رجوع کیا۔ اور راجہ نجف خان بھی بوساطت بھائی دل سنگھ کاردار راولپنڈی کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پاس حاضر ہوا۔ راجہ علی گوہر خان کو بشرط نوکری و حاضر باشی ایک ہزار روپیہ کی جاگیر موضع بھرڑے، پکشاہی و نروڑہ میں مل گئی۔ اور راجہ نجف خان کے واسطے ایک سو روپیہ ماہوار خرچ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مقرر کر کے لاہور میں اپنے پاس رکھا۔ اور وعدہ جاگیر دینے کا کیا۔ جاگیر کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ مہاراجہ مر گیا۔

قاضی خاندان خان پور

خان پور کے قاضیوں کے نام تین دستاویزات از سرکار سکھاں ہوا۔ بھادوں سمت ۱۸۸۹ بکرمی ۱۵ بھادوں سمت ۱۸۸۹ اور ۲۵ جیٹھ سمت ۱۸۹۰ بکرمی جن پر ہری سنگھ کی مہریں ہیں کی طرف سے دی گئی تھیں۔

اور یہ علاقہ ان کو اُس وقت تفویض ہوا تھا جب راجگان خان پور معزول ہو کر چلے گئے تھے۔ یہ تینوں بھائی تھے جن کے نام فضل احمد، نور احمد اور محمد اشرف تھے۔ قاضی نور احمد کی اولاد کا شجرہ یہ ہے:۔

قاضی نور احمد
|
قاضی فیض احمد
|
قاضی عبد المجید
|
قاضی عبد اللطیف (لاولد) — قاضی عبد السلام
قاضی عبد السلام
|
قاضی عبد الرؤف

دوسرے بھائیوں کی اولاد کا شجرہ نہ مل سکا۔

نقشہ تاریخ ہائے گدی نشینی راجگان گکھڑ خان پور جو ۱۸۶۴ء میں مرزا اعظم بیگ، نائب مہتمم بندوبست نے اس وقت تیار کروایا تھا۔

تاریخ ہائے گدی نشینی راجگانِ گکھڑ خان پور

تواریخ عہد: سنہ ھ	تواریخ عہد: سنہ ء	مدت گدی نشینی	شجرہ نسب	کیفیت ضروری
سنہ ۹۰۰ھ لغایت ۹۳۰ھ	سنہ ۱۴۹۴ء تا ۱۵۲۴ء	۳۱ سال	سلطان تاتار	سنہ ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں سلطان ہاتھی برادر تاتار سے حضرت بابر شاہ بادشاہ کی لڑائی قلعہ پھیرالہ (ضلع جہلم) میں ہوئی۔ سلطان ہاتھی کو شکست ہوئی۔
سنہ ۹۳۱ھ لغایت ۹۴۹ھ	سنہ ۱۵۲۴ء تا ۱۵۴۲ء	۱۹ سال	۲ سلطان سارنگ	سنہ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں شیر شاہ نے اس کو گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں محبوس کیا
سنہ ۹۵۰ھ لغایت ۹۶۵ھ	سنہ ۱۵۴۳ء تا ۱۵۵۷ء	۱۲ سال	۲ سلطان آدم	بعد محبوس ہونے سارنگ کے یہ شخص بجائے اس کے سلطان ہوا۔

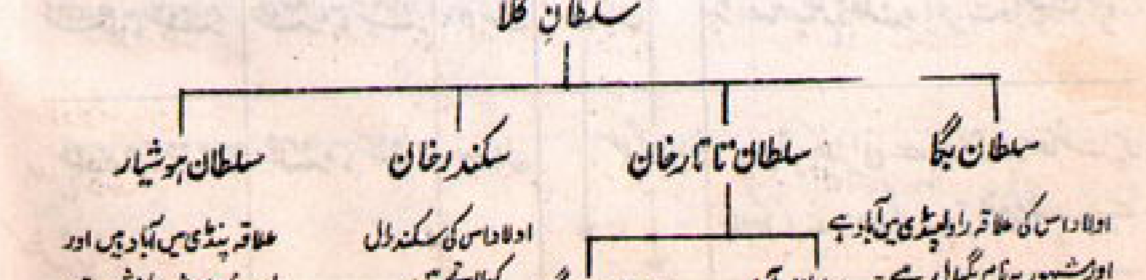
سنہ ۹۶۳ھ لغایت سنہ ۹۸۵ھ	سنہ ۱۵۵۵ء تا سنہ ۱۵۷۶ء	۲۰ سال	سلطان سارنگ / کمال خان	یہ کمال خان سلطان سارنگ کے ساتھ قلعہ گوالیار میں محبوس تھا جب قلعہ اڑایا گیا تو یہ بچ گیا۔ اکبر بادشاہ کے حضور اس نے خدمات کیں۔ بادشاہ نے سلطان آدم کو نکال کر بجائے اس کے اس کو سلطان بنایا اور مبارک خان اس کا (کمال خان کا) منصب نہ صدی رکھتا تھا۔ (آئین اکبری)
سنہ ۹۸۶ھ لغایت سنہ ۱۰۰۵ھ	سنہ ۱۵۷۷ء تا سنہ ۱۵۹۶ء	۲۰ سال	سید خان	بعد مرنے کمال خان کے یہ سلطان ہوا اس کی اپنی اولاد نابالغ تھی۔ کمال خان نے بحالت حیات خود اس کو اپنی جگہ سلطان بنایا۔
سنہ ۱۰۰۶ھ لغایت سنہ ۱۰۲۰ھ	سنہ ۱۵۹۷ء تا سنہ ۱۶۱۰ء	۱۵ سال	فتح خان	آباد کنندہ خان پور
سنہ ۱۰۲۱ھ لغایت سنہ ۱۰۴۵ھ	سنہ ۱۶۱۱ء تا سنہ ۱۶۳۵ء	۲۵ سال	شاہ بیگ خان	جان بیگ خان حقیقی برادر شاہ بیگ خان تھا جس کی اولاد جانی بیگی مشہور ہیں۔ گرم تھون والے
سنہ ۱۰۴۶ھ لغایت سنہ ۱۰۷۰ھ	سنہ ۱۶۳۶ء تا سنہ ۱۶۵۹ء	۲۵ سال	اجمیر خان	
سنہ ۱۰۷۱ھ لغایت سنہ ۱۰۹۰ھ	سنہ ۱۶۶۰ء تا سنہ ۱۶۷۸ء	۲۰ سال	بشارت خان	
سنہ ۱۰۹۱ھ لغایت سنہ ۱۱۲۵ھ	سنہ ۱۶۷۹ء تا سنہ ۱۷۱۲ء	۳۵ سال	نامدار خان	اس کے تیسرے حصہ کا دعویٰ محمد خان خورد کرتا ہے اسی کے عہد میں جانی بیگی بعد لڑائی کے محروم الارث کئے گئے
سنہ ۱۱۲۶ھ لغایت سنہ ۱۱۴۵ھ	سنہ ۱۷۱۳ء تا سنہ ۱۷۳۳ء	۲۱ سال	جلال خان	اس کے نام کے فرمان بادشاہی اکثر ہیں بنام جلال قلی کے

سنہ ۱۱۴۶ھ تا سنہ ۱۱۴۶ھ	سنہ ۱۷۳۳ء تا سنہ ۱۷۳۳ء		نامدار خان / جلال خان / مرید خان	نامدار خان کے دونوں بیٹوں نے علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ مرید خان چھوٹا تھا اس کی چھوٹی طرف مقرر ہوئی جلال خان بڑا تھا اس کی بڑی طرف مقرر ہوئی۔
سنہ ۱۱۵۱ھ تا سنہ ۱۱۹۳ھ	سنہ ۱۷۳۳ء تا سنہ ۱۷۷۹ء	۴۳ سال	نوازش علی خان	
سنہ ۱۱۴۶ھ تا سنہ ۱۱۹۵ھ	سنہ ۱۷۳۳ء تا سنہ ۱۷۸۰ء	۴۰ سال	رستم علیخان	لاولد
سنہ ۱۱۹۵ھ تا سنہ ۱۲۰۳ھ	سنہ ۱۷۸۰ء تا سنہ ۱۷۹۰ء	۱۰ سال	شاہ ولی خان	داماد رستم علی خان کا ہے کل علاقہ کا یہ قابض ہو گیا تھا بعد مرنے رستم علی خان کے۔ سیر چشم او رسخی مشہور رہے
سنہ ۱۲۰۳ھ تا سنہ ۱۲۱۶ھ	سنہ ۱۷۸۹ء تا سنہ ۱۸۰۱ء	۱۳ سال	جعفر خان	یہ نانا حیدر بخش خان کا ہے اور داماد رستم علی خان کا اور بشرع صدر
سنہ ۱۲۱۶ھ تا سنہ ۱۲۴۰ھ	سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۲۴ء	۲۴ سال	مہدی علیخان	اس نے رستم علی خان کا حصہ شیر محمد خان کو تفویض کیا ہے
سنہ ۱۲۳۶ھ تا سنہ ۱۲۴۰ھ	سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۸۲۴ء	سال	شیر محمد خان	رستم علی خان کا داماد لیکن اس کی دختر سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔
سنہ ۱۲۴۱ھ تا سنہ ۱۲۷۶ھ	سنہ ۱۸۲۵ء تا سنہ ۱۸۶۳ء	۴۰ سال	نجف خان	بڑا صاحب علم و عقلمند و باعزت و باغیرت مشہور ہے
سنہ ۱۲۴۱ھ تا سنہ ۱۲۸۰ھ	سنہ ۱۸۲۵ء تا سنہ ۱۸۶۳ء	۴۰ سال	علی گوہر خان	والدہ قوم کھٹرانی سے ہے محتاط و حفاظت اپنی جان کی کرنے والا و باادب متواضع مشہور رہے

۱۲۶۳ھ تا ۱۲۸۳ھ	۱۸۴۶ء تا ۱۸۶۵ء	۱۲ سال	حیدر بخش خان		۱۴ برس قبل از مرنے نجف خان کے راجہ حیدر بخش گدی نشین ہوا اس واسطے کہ راجہ نجف خان، مرض فالج سے بیمار ہوگیا تھا۔ اس نے بحالت بیماری بحیاتِ خود دستار بندی اس کو بندھوائی اور یہ راجہ راست باز و نیک نیت مشہور ہے۔
۱۲۷۶ھ	۱۸۶۰ء		موجود	فیروز خان	اس کا بیان ہے کہ تین برس پہلے اپنے مرنے کے راجہ علی گوہر خان نے مجھ کو گدی نشین کر دیا تھا اور یہ راجہ ہوشیار اپنے کاموں کا اور کاردار اس وقت کا مشہور ہے۔
۱۲۹۲ھ	۱۸۱۵ء		موجود ہے	جہانداد خان	اب تک موجود ہے۔ اوسط سال ۱۲۹۲ھ میں راجہ حیدر بخش خان فوت ہوگیا اور اسی سال میں وقت مرنے اس کے یہ گدی نشین ہوا۔ تاریخ گدی نشینی اس کی ۱۸ جون ۱۸۶۵ء ہے یہ راجہ صاحب علم و سلیم الطبع و نیک نیت جوان صالح زیبندۂ ریاست اور منصف مزاج ہے۔

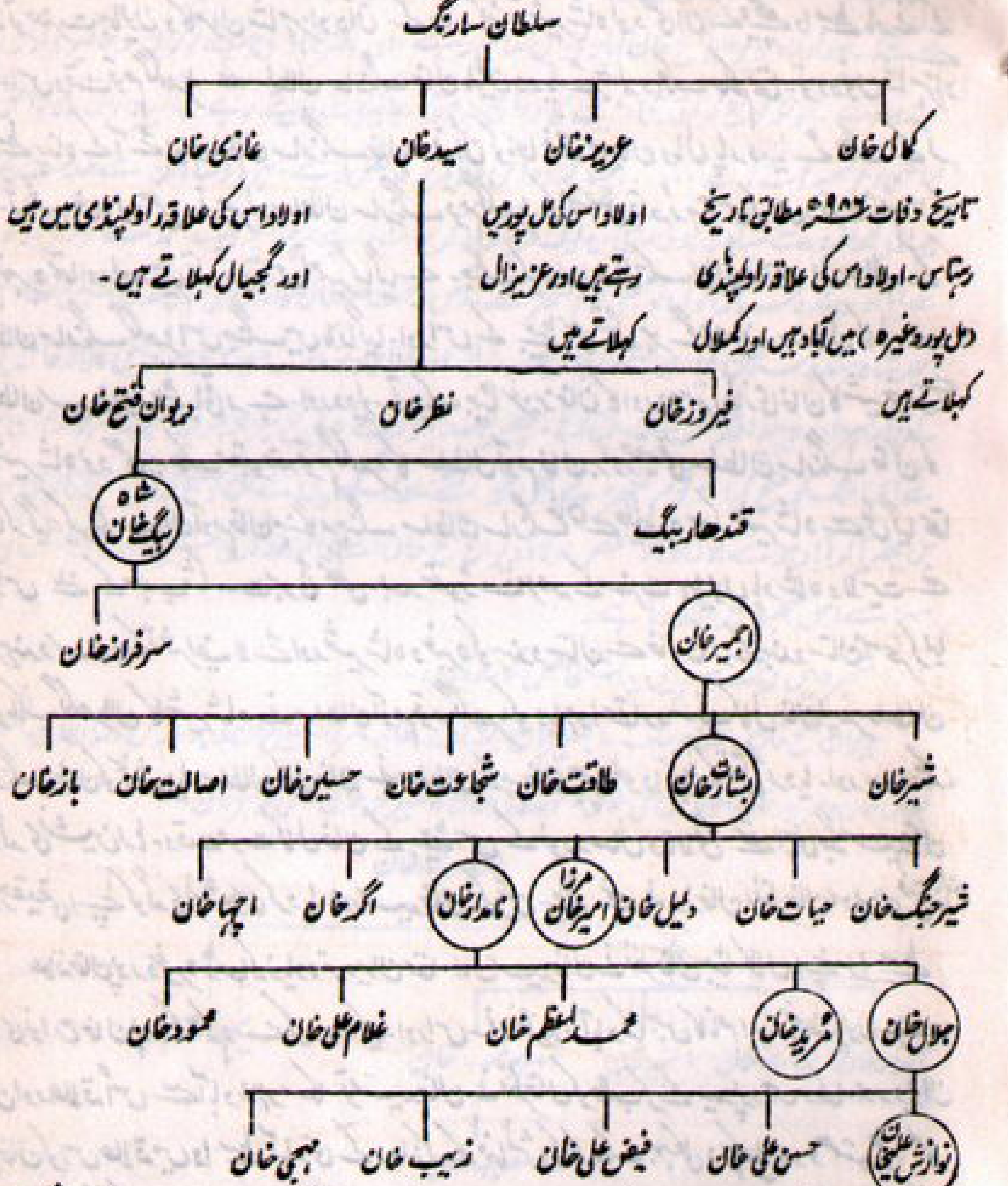
کلیات قوم گکھڑ

بندوبست ۱۸۷۲ء۔ شجرۂ نسب



سلطان آدم

اولاد اس کی علاقہ راولپنڈی و علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ والیٔ کشمیر میں آباد ہیں اور ادمال کہلاتے ہیں۔



صورت دیہی۔ بہ زبانی راجہ علی گوہر خان و راجہ حیدر بخش خان قوم گکھڑ ایسا دریافت ہوا کہ قوم گکھڑ اولاد نوشیروان بادشاہ کے ہیں۔ اور ان کو کہیانے بھی کہتے ہیں اور سلطنت اس قوم کی ولایت میں رہی اور اصل ملک اپنا سیستان بیان کرتے ہیں۔ تو اس قوم کے بزرگان سے مسمی گکھڑ شاہ ولایت سے بطور سیر جانب کشمیر گیا اور فوج بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہ نواح کشمیر میں فوت ہوگیا۔ اور بیٹے اس کے نامعلوم الاسم مع فوج

اس نواح میں قائم رہے۔ ولایت کو واپس نہ گئے۔ اور ریاست اُن کی مابین دریائے جہلم و اٹک مقرر رہی۔ تاکہ تھوڑے عرصہ میں حضرت بابر بادشاہ چغتائی ولایت سے ہندوستان کو تشریف لائے اور پھر واپس گئے تو حضرت ہمایوں و کامران شاہزادہ اُن کے رہ گئے تو شیر شاہ لودھی اُن کے پیچھے واسطے مارنے کے لگا۔ اس وقت قوم گکھڑ سے سلطان سارنگ خان مابین دریائے جہلم و اٹک حاکم تھا۔ تو دونوں شاہزادے واسطے پناہ کے آگئے اور سلطان سارنگ خان نے اُن کو بحافظت، جان و مال پار دریائے اٹک کے کر دیا۔ تو شیر شاہ لودھی نے ہمراہ سلطان سارنگ قوم گکھڑ کے متصل قلعہ رُہتاس کہ اس وقت نام اس کا کوتہرہ تھا اور بعد میں قلعہ رُہتاس تعمیر کیا گیا ہے۔ جنگ کیا۔ اور سال تک لڑائی رہی۔ بعد سال کے سلطان سارنگ گکھڑ اس جنگ میں مارا گیا۔ اور اس کے بیٹے بھی قتل ہو گئے صرف سلطان کمال اور سلطان سید خان بیٹے باقی رہے۔ اور دو پوتے ایک بیٹا عزیز خان کا اور دوسرا غازی خان کا شیر خوار رہے اور شیر شاہ لودھی یہ ملک مقبوضہ قوم گکھڑ کا سلطان آدم خان برادر حقیقی سلطان سارنگ خان کو عطا کر گیا۔ کیونکہ سلطان آدم خان ہنگام جنگ سلطان سارنگ خان سے علیحدہ ہو کر شیر شاہ سے مل گیا تھا اور اس ملنے کے سبب شکست ہوئی تھی۔ بعد تھوڑے عرصہ کے حضرت ہمایوں بادشاہ ولایت سے پھر ہندوستان کو تشریف لائے اور شیر شاہ وغیرہ کو ہندوستان سے خارج کر کے ہندوستان مسخر کر لیا تو جو ملک گکھڑان کا شیر شاہ نے سلطان آدم قوم گکھڑ کو دیا ہوا تھا وہ سب کمال خان پسر سلطان سارنگ خان کو بخش دیا۔ سلطان کمال خان نے سلطان آدم خان چچا خود اپنے کو قتل کر دیا۔ اور مدت تک خود گدی نشین رہا۔ وقت موت کمال خان کے بیٹے اس کے خورد سال و نالائق تھے اپنی جگہ سید خان برادر حقیقی اپنے کو گدی نشین کر دیا۔ اور سید خان کے تین بیٹے تھے فیروز خان، نظر خان، دیوان فتح خان

علاقہ خان پور وغیرہ ڈھاکہ زیادہ تر ویران تھا۔ اول سید خان نے نظر خان بیٹا کلاں اپنے واسطے آبادی نواح خان پور کے حکم دے کر روانہ کیا۔ اور اس نے نظر پور آباد کیا جس کا نام اب نجف پور ہے۔ لیکن اور علاقہ اُس سے آباد نہ ہو سکا۔ تو سید خان نے نظر خان کو طلب کر کے سید پور میں رکھا۔ اور دیوان فتح خان کو اس علاقہ میں واسطے آبادی کے روانہ کر کے فہمائش کی کہ ملک بھکلی (بھیکلی) و دھمنوڑ کا محاصل تحصیل کر کے ہمارے پاس روانہ کرتے رہنا۔ اور علاقہ خان پور تمہارے معاش میں ہے کہ جس قدر آباد ہے اس سے زیادہ آباد کر کے محاصل اس کا اپنے صرف میں لاؤ۔ چنانچہ دیوان فتح خان جس کی اولاد قوم گکھڑ راجگان خان پور اب موجود ہیں۔ حسب حکم سید خان اپنے باپ کے علاقہ خان پور میں آیا۔ اور اول بنیاد خان پور کی رکھی اس وقت شاہ عیسیٰ قتال فقیر تھے۔ اُن کے حکم سے ان کے ایک فقیر نے خان پور میں آکر جہاں حویلی راجہ حیدر بخش خان

ہے۔ ایک ستون کلاں چوب ٹاہلی کو کھڑا کر دیا۔ کہ آج تک برابر وہ ستون قائم ہے۔ (ایسی ہی روایت موضع درویش کے متعلق بھی ہے۔ پہلے درویش موجودہ قبرستان درویش کے ساتھ آباد تھا۔ وہاں ایک فقیر نے اسی طرح بڑی لکڑی ٹاہلی کی زمین میں گاڑ دی تھی۔) بعد آبادی خانپور کے اکثر دیہات گرد و نواح کے آباد ہو گئے۔ اور اولاد دیوان فتح خان آبادی میں ساعی رہے۔ اور اکثر آبادی اپنے نوکران و جاگیر داران سے کراتے رہے۔ کیونکہ فوج کو نقدی دینے کا رواج نہ تھا۔ جاگیرات دیتے رہے۔ جاگیر داران کے لواحق آبادی اراضی و کوٹھہ بانٹے کرتے ...... چنانچہ وہ اس علاقہ پر قابض رہے۔ ہر بادشاہ ان سے خدمت لیتا رہا جہاں کچھ ضرورت سپاہ کی ہوتی رہی۔ یہ لوگ کمر باندھ کر جاتے رہے۔ چنانچہ جب احمد شاہ درّانی ولایت سے آیا اور ہندوستان کو گیا تو بھی قوم گکھڑ سے۔ اُس وقت سلطان نوازش علی خان گدی نشین تھا۔ ہمراہ احمد شاہ ہندوستان گیا۔ اور متھرا جا کر خوب لڑا۔ اور علاوہ از ملک موروثی خود اس علاقہ خان پور کے چار ہزار روپیہ نقد کشمیر سے ملتا رہا۔ پھر بعہد تیمور شاہ پانچ ہزار ہو گیا۔ جب سردار ہری سنگھ نے اس ملک کو فتح کیا۔ تو قوم گکھڑ بے دخل ہو گئے۔ اور سکھوں نے ان کو نکال دیا۔ عملداری سرکار میں پھر آکر آباد ہوئے اور جو جو شخص اولاد دیوان فتح خان سے راجہ اور گدی نشین ہوتا رہا اس کو رنگ سبز سے اس شجرہ میں لکھ دیا ہے۔

شجرہ میں رنگ سبز میں یہ اشخاص تحریر ہیں:۔

دیوان فتح خان۔ شاہ بیگ۔ اجمیر خان۔ بشارت خان۔ مرزا امیر جان و برادرش نامدار جان۔ شمشیر خانؒ جلال خان و مرید خان۔ نوازش علی خان۔ مہند علی خان و شیر محمد خان۔ علی گوہر خان۔



کرم داد خان

- خداداد خان
  - سفو خان — موجود
  - شیر علی خان — موجود
- ولی داد خان
- محمد علی خان
  - نادر خان — موجود
  - فضل داد خان — موجود

دیوان اجمیر خان

- بشارت خان
- اصالت خان
  - فتح خان
    - شادی خان — لاولد
  - مصاحب بیگ خان
    - سراب خان — لاولد
    - جتو خان — لاولد
    - فتح خان
      - سعادت خان
        - ارسلا خان
    - مازو خان
      - شہباز خان
        - محمد خان
- شجاعت خان
- نجابت خان

- فرید خان
- جلال خان
- محمد اعظم خان
- محمود خان
- غلام علی خان
  - امانت خان
    - بہادر خان
    - احمد خان — لاولد
    - حیات خان — لاولد

راجہ قندھار بیگ خان سکنہ گرمتھون

راجہ قندھار بیگ خان

راجہ گل محمد خان

- عزت خان
- بہادر خان
  - قائم خان
    - حیات خان — لاولد
    - ملک خان — لاولد

عزت خان

دریم خان

خداداد خان

- الف خان
  - محمد خان
- شرف خان

اقتباسات از "رؤسائے با اختیار و نامی خاندانِ پنجاب"

مؤلفہ جناب کرنل چارلس فرانسس میسی صاحب جس کو لالہ بھگوانداس صاحب چیف جج ریاست کپور تھلہ نے ترجمہ کیا۔ مطبع اسلامیہ لاہور میں ۱۸۹۲ء میں چھپا۔

شجرہ نسب راجہ جہانداد خان، خان بہادر گکھڑ۔ رئیس خان پور

۱ سلطان سارنگ

- سلطان کمال خان — وفات ۱۶۹۵ء
- ۲ سلطان سعید خان
  - ۳ فتح خان
  - ۴ شاہ بیگ
  - ۵ سلطان اجمیر
  - ۶ بشارت
  - ۷ نامدار خان
    - ۸ سلطان جلال خان (بابت ہجرت ... سری کوٹ کے مطابق امیر دوست محمد خان جب دو ہزار ... ۱۸۳۹ ... سندھ پہنچا تو اس نے جلال خان کو مہاراجہ گلاب سنگھ والئی کشمیر کے پاس ... ۱۸۴۰ء کو برائے امداد روپیہ بھیجا)
      - ۹ نوازش علی خان
        - ۱۰ سلطان جعفر خان — وفات ۱۸۱۰ء
        - ۱۰ مہدی علی خان — وفات ۱۸۴۶ء
        - ۱۰ شیر محمد — وفات ۱۸۴۹ء
        - ۱۰ (دسید) سعید محمد خان — وفات ۱۸۳۵ء
    - ۸ فرید خان
    - ۸ محمد عظیم خان
      - ۹ فتح علی خان
        - ۱۰ امیر ... وفات ۱۸۳۵ء
        - ۱۱ راجہ محمد خان۔ وفات ۱۸۸۱ء
        - ۱۲ راجہ محمد ... خان۔ ولادت ۱۸۶۵ء
        - ۱۳ محمد خسرو خان۔ ولادت ۱۸۸۵ء
- ۲ عدول خان

۱۰ مہدی علی خان

۱۱ سردار مدد خان — وفات ۱۸۸۲ء
۱۱ راجہ نجف خان (پسر کلاں) — وفات ۱۸۶۰ء
۱۱ نادر خان (سب سے چھوٹا)۔ بموجب تاریخ مہتاب سنگھ ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔

۱۲ عطا علی — ولادت ۱۸۱۶ء
۱۲ غلام محمد خان — ولادت ۱۸۲۰ء

تاریخ مہتاب سنگھ میں شجرہ نسب کچھ مختلف ہے جو حسب ذیل ہے

سلطان نوازش علی خان

سلطان مہند علی خان — راجہ شیر محمد خان — سید محمد خان

سلطان مہند علی خان: نجف خان ← ایک والدہ → مدد خان؛ امیر علی ← ایک والدہ → نادر خان
امیر علی — لاولد
نادر خان — لاولد — ۱۸۵۷ء
مدد خان: راجہ غلام محمد خان — راجہ عطا علی خان ۱۸۵۷ء

راجہ شیر محمد خان: راجہ علی گوہر خان — علی بہادر خان

سید محمد خان: راجہ نیاز علی خان — راجہ غلام محمد خان

نجف خان: راجہ حسن خان — راجہ حیدر بخش خان

تین لڑکے دوسری ماؤں سے ہیں جو خورد سال ہیں ان کے نام ابھی تک (یعنی ۱۸۴۷ء تک) مشہور نہیں ہوئے

بموجب کیفیات گکھڑاں یہ نام ۱۸۶۲ء–۱۸۶۳ء میں ← سلطان خان — شادمان خان — حسو خان ۔ لاولد

۱۱ راجہ نجف خان (وفات ۱۸۶۰ء)

۱۲ راجہ حیدر بخش خان — وفات ۱۸۵۵ء
۱۲ راجہ شادمان خان — ولادت ۱۸۲۹ء
۱۲ راجہ سلطان خان — ولادت ۱۸۳۳ء

۱۳ راجہ جہانداد خان — ولادت ۱۸۴۴ء
راجہ فضل داد — ولادت ۱۸۵۵ء
محمود خان — ولادت ۱۸۵۸ء
۱۳ یوسف خان — ولادت ۱۸۵۹ء
۱۳ حسین خان — ولادت ۱۸۶۲ء
۱۳ محمد جعفر — ولادت ۱۸۶۳ء

۱۴ سلطان حیدر زمان خان — صفدر زمان خان — منوچہر خان
۱۵ لہ سلطان رکن الزمان خان ← ایرج زمان خان
وفات ۱۸۶۳ء

۱۰ شیر محمد (وفات ۱۸۲۹ء)
۱۱ راجہ علی گوہر خان (وفات ۱۸۶۳ء)

۱۲ راجہ فیروز خان (ولادت ۱۸۳۶ء)
۱۲ عزیز خان (وفات ۱۸۰۰ء)

۱۳ راجہ شیر احمد خان — ولادت ۱۸۰۰ء
۱۳ راجہ گوہر الرحمٰن خان — ولادت ۱۸۴۶ء
۱۳ فرمان علی (ولادت ۱۸۶۶ء)

۱۰ سید محمد خان — وفات ۱۸۳۵ء
۱۱ راجہ نیاز علی خان — وفات ۱۸۵۶ء
۱۲ راجہ نور محمد خان — ولادت ۱۸۵۳ء

اس خاندان خان پور کی شاخ سولھویں صدی کے آخر میں اپنے خاندان (گکھڑ راولپنڈی) سے الگ ہوئی اور سلطان سعید خان کا بیٹا فتح خان کوہ نور پور۔ راولپنڈی سے آکر خان پور میں آباد ہوا۔

خان پور کے گکھڑ ۱۸۳۱ء تک جب کہ سکھوں کا ملک ہزارہ پر اچھی طرح سے تسلط ہو گیا۔ اقوام کرڑال و ڈھونڈ ان کے باجگذار تھے۔

کابل سے کشمیر کی سڑک جو پہاڑ سے گزرتی تھی اس پر جو اقوام آباد تھیں اُن میں امن قائم رکھنے کے لئے سلطان جعفر خان رئیس خان پور نے خاص کام کیا۔

راولپنڈی کا کردار

مکھن سنگھ ۱۸۱۵ء میں ۵۰۰ سو سواروں کے ساتھ ہزارہ آیا۔ مگر دوسرے سال ترین کے رئیس (محمد خان) سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد دیوان رام دیال کمانیر ناڑہ (گندگر) ترین و دیگر اقوام کی مجموعی جمعیت سے لڑ کر مارا گیا۔ ۱۸۲۲ء میں ہزارہ کا علاقہ سردار ہری سنگھ نلوہ ناظم کشمیر کے سپرد کیا گیا۔ مگر اس سے انتظام نہ ہو سکا۔ ۱۸۲۴ء میں اس نے ناڑہ پر سخت شکست کھائی۔

خان پور کے گکھڑ میجر ایبٹ کے ہمیشہ وفادار رہے۔ ۱۸۶۲ء میں کرنل ولیس (W A C E) نے بندوبست کیا اور گکھڑوں کو ۲۰ مواضعات جاگیر میں دئے۔

راجہ جہانداد خان ۱۸۶۷ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوا۔ ۱۸۶۹ء کی مہم اگرور میں برابر موجود رہا۔ ۱۸۸۰ء میں سر لیپل گرفن صاحب کے ماتحت کابل میں پولٹیکل افسر تھا۔

چنانچہ یکم اپریل ۱۹۶۳ء کے پرچہ میں زیر عنوان اوراق پارینہ از قلم مختار ٹونکی سرمور گزٹ مطبوعہ ۸ اگست ۱۸۸۹ء کے چودھویں اور آخری صفحہ پر نجم الہند سردار محمد حیات خان کی صحت یابی اور خان بہادر راجہ جہانداد خان بہادر چیف آف گکھڑ کی شاہ پور تبدیلی کی اطلاع دی گئی ہے ...... اس سے معلوم ہوا کہ راجہ جہانداد خان ۱۸۸۹ء میں شاہ پور (ضلع سرگودھا) میں تعینات تھے۔

چونکہ اس خبر میں سردار محمد حیات خان اور راجہ جہانداد خان کا ذکر یکجا کیا گیا ہے۔ اس واسطے ایک واقعہ اسی مناسبت سے تحریر کر رہا ہوں۔ یہ دونوں گہرے دوست تھے اور ہم وطن بھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سردار محمد حیات خان ریل میں کہیں جا رہے تھے۔ اور فسٹ کلاس میں بیٹھے تھے۔ کہ ایک انگریز اندر آگیا۔ اس نے سادہ لباس میں اس دیسی کو فسٹ کلاس میں بیٹھا دیکھ کر کچھ تحقیر آمیز رویہ اختیار کیا۔ انہوں نے بھی جواباً ایسا کیا۔ انگریز نے ان کا نام پوچھا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ راجہ جہانداد خان چیف آف گکھڑ۔ اس انگریز نے گورنر سے شکایت کی۔ کہ راجہ جہانداد خان نے اس کی ہتک کی ہے۔ گورنر نے جب راجہ صاحب سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ اس تاریخ اور وقت پر تو وہ راولپنڈی کی میں عدالت کر رہا تھا۔ انگریز ثبوت نہ دے سکا اور بات ٹل گئی۔ بعد میں سردار صاحب نے راجہ صاحب کو بتلایا کہ یہ کام انہوں نے کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ راجہ صاحب اس دن راولپنڈی عدالت کر رہے تھے اور انگریز کی بات جھوٹ قرار دے دی جائے گی۔ اور نہ راجہ صاحب پر آنچ آتی نہ اُن پر۔

تاریخ ہزارہ مہتاب سنگھ میں تحریر ہے کہ ملک گکھڑ کے مالک تین بھائی تھے۔ سلطان مہند علی خان راجہ شیر محمد خان و سوئم سید محمد خان۔ سید محمد خان کا ملک میں کچھ حصہ نہ تھا۔ اس کو دو گاؤں گزارا کے لئے الگ دئے ہوئے تھے۔ سلطان مہند علی خان مسند نشین تھا۔ اس کا اور راجہ شیر محمد خان کا نصف نصف حصہ تھا۔ دونوں یکجا اتفاق سے ملک سے اپنا اپنا حصہ کھاتے تھے۔ جو کچھ حاکمانِ وقت کا نذرانہ یا ریاست کا خرچ و مہمانداری پر ہوتا تھا۔ وہ نصف النصف دیتے تھے۔ سلطان مہند علی خان کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا راجہ نجف خان، دوئم مدد خان و سوئم نادر خان تھا۔ اور کچھ کنیز زادہ بھی تھے۔ انہی میں سے حسین بخش خان چند مدت مامور رہا اور فرمان علی خان بھی جو راجہ شیر محمد خان کی اولاد سے تھا اور راجہ علی گوہر خان کا بڑا لڑکا تھا۔ دوسرا علی بہادر خان۔ راجہ علی گوہر خان زندہ ہے (یعنی ۱۸۷۲ء سال کتاب تاریخ مہتاب سنگھ۔ ش ب) اور علی بہادر خان جس کا ذکر مولراج کی حکومت کے ذکر میں کیا جائے گا۔ ملکی فساد و ویران پلاسی والہ و حسن علی کرڑال ہیں مولراج نے علی بہادر خان کو جس کی رشتہ داری حسن علی خان کرڑال کے ساتھ تھی، سرحد دیر کوٹ کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ اور اسی جنگ میں ملکی لوگوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سلطان مہند علی خان متوفی کا بڑا لڑکا نجب خان زندہ ہے۔ لیکن اس کی زبان ۲/۳ حصہ لال (گونگی) ہے۔ اور اس کی منہ سے بات نہیں نکل سکتی۔

راجہ نجب خان کے دو لڑکے، راجہ حسن خان و راجہ حیدر بخش خان۔ ایک ماں سے ہیں۔ اور دو تین لڑکے جو دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے ہیں چھوٹے ہیں۔ کہ ان کے نام ابھی تک مشہور نہیں ہوئے۔

راجہ نجب خان کا بھائی مدد خان جو ایک دانا، نیک پارسا اور نیک خو مرد تھا فوت ہو چکا ہے اُس کے دو بیٹے ہیں بنام راجہ غلام محمد خان و راجہ عطا علی خان۔ اور سلطان مہند علی خان کے چھوٹے بھائی راجہ سید محمد خان کے دو بیٹے، راجہ نیاز علی خان و راجہ غلام محمد خان ہیں۔ انہوں نے خان پور کے حصہ کا دعوے نہیں کیا اور وہ ملازمت کر کے وقت گزار رہے ہیں۔ ملک خان پور کو سلطان مہند علی خان و راجہ شیر محمد خان نے نصفا نصف تقسیم کر کے قبضہ کر لیا ہے۔ اگرچہ ملک کی تقسیم باقاعدہ طور پر نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ہر موضع میں نصف حصہ سلطان مہند علی خان اور نصف حصہ راجہ شیر محمد خان اس طرح مقرر کیا ہے۔ کہ ایک ایک آسامی، گھر، زمین، باغ اور درخت جو کچھ بھی ہیں الگ الگ نامزد کر دئے ہیں کہ یہ سلطان مہند علی خان کے ہیں اور یہ راجہ شیر محمد خان کے۔ اور دونوں نے سرحد پر اہلِ سادات اور اپنی برادری قوم گکھڑ کو حسب ضرورت جاگیر الگ کر کے دے دی ہے اور بعضوں کو ماہوار نقد دیتے ہیں۔ بھاری اسلحہ جات مثلاً توپ، زنبورک سے ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

چند تاریخی سندات

چند سندات جو تاریخی لحاظ سے اہم ہیں اور اس قوم کو وقتاً فوقتاً شاہان افغانستان و دہلی سے ملیں۔ اُن کی نقول حسب ذیل ہیں۔ اصل سندات کلیات گکھڑ میں ان بادشاہان کے مواہیر سے مزین ہیں اور قابلِ دید ہیں۔

(مہر: محمد فرخ سیر بادشاہ غازی ۱۱۲۴ فضل علی یحیٰ ابن قدرہ)

چودھریان و قانونگویان متصدیان و رعایا و مزارعان پرگنہ فتحپور بابری من اعمال دوابہ سندھ ساگر مضاف صوبہ پنجاب بدانند کہ بموجب پروانہ معہ مہر نواب حمید الملک قطب الملک مدار المہام۔ قطب الملک یمین الدولہ سید عبداللہ خان بہادر ظفر جنگ سپہ سالار یار وفادار توم ۱۲ ار شوال سنہ جلوس مبلغ ہشتاد و پنج ہزار دام پرگنہ مذکور از قعر سکندری ابتدائی خریف ...... نامدار دولہ بشارت لگر مقرر گشتہ باید کہ بالواجب و حقوق دیوانی را از قرار واقع راستی موافق ضابطہ معمول بگماشتہ مشار الیہ جواب مے گفتہ باشند و از یں جا حالے و صلاح و صوابدید گماشتہ موصی الیہ بیرون نروند ۲۶ ذی حجہ۔

نقل فرمان تیمور شاہ درانی آنکہ عالیجاہ رفیع جایگاہ، اخلاص و عقیدت دستگاہ نجیب اللہ خان ترینی حاکم ہزارہ قارلق بالطاف روز افزوں شاہانہ سرافراز گشتہ بدانند کہ دریں وقت عالی شان رفیع جایگاہاں اخلاص و عقیدت دستگاہاں رستم علی خاں سلطان و

شاہول خان گکھڑ بعرض عاکفاں شدہ جلال سلطانی رسانیدند کہ ہر سالہ مبلغ چار ہزار روپیہ از بابت مالیات ہزارہ قارلق بصیغہ انعام از قرار ارقام مجدّد در وجہ ایشان مقرر است کہ میگیرند واز خدمت اشرف استدعا نمودند کہ قراء مفصلہ ذیل محال ہزارہ قارلق وکنارہ اٹک کہ خراب است بایشان

دہات ہزارہ قارلق ۔ از کنارہ اٹک کہ خرابہ افتادہ افتادہ وبتصرف سکان است قریہ ہربلہ (ہریالہ) ۔

قریہ قطبہ (قطبال) قریہ پند (پنڈ) قریہ سالارکہ (سالارگاہ) قریہ بہلرتو (بھلڑتوپ) قریہ بحرجہاں آباد (جہان آباد) قریہ تہتو (نیلاں بھوتو؟)

درعوض چہار ہزار روپیہ دادہ شود ۔ کہ آباد وتصرف شوند ۔ بنا براں مقرر فرمودیم ۔ کہ باید بحصول اطلاع بر مضمون رقم مبارک ایشان برسند وبینند ہرگاہ جمیع مالیات قریہجات مزبورہ مساوی چہار ہزار روپیہ بودہ باشد بایشان درعوض وجہ انعام آنہا واگذارند کہ متصرف شدہ برائے خود ضبط وربط نمایند وہرگاہ جمیع مالیہ دہات مزبورہ از مبلغ مرقوم اضافہ باشد چگونگی آن را صریح عرض نمایند کہ درمانے ہرچہ از مصدر جلال مقرر شود بعمل آورند ۔

تقدیم ملازم دانستہ درعہدہ ۔ فی ۸ رشعبان المعظم ۱۱۹۴ھ ۔ ۱۷۸۰ء

مہر شاہ زمان

آنکہ بنا بر الطاف موفورہ شاہانہ دربار عالیجاہ رفیع جایگاہ اخلاص وعقیدت دستگاہ سلطان شیر محمد خان کہکہ خانپوری دستہ عالیجاہ رفیع جایگاہ وزارت پناہ حشمت وشوکت دستگاہ جلالت وبسالت انتباہ امیر الامراء العظام اسوۃ الکبراء الفخام رموزدان امور سلطانی وقائق سنج اشغال پناہ ۔ واقف رموز شاہانہ محرم اسرار خدیوانہ جملۃ الملک مدار المہام دولت خورہ صداقت ارسام اعتماد الدولہ ...... وفادار دُرّانی سدوزائے بہادر وزیر اعظم ودستور معظم سرکار خاصہ شریفہ ......

مساوی یک ہزار روپیہ بودہ باشد کہ بصیغہ مواجب ہمہ سالہ در ...... اومرحمت وبرقرار فرمودیم کہ ہر سالہ مبلغ مذکور الاحکام وعمال خطہ کشمیر نقد بازیافت وصرف خود نمودہ بخدمت گزاری قیام نماید حکام وعمال حال واستقبال خطہ کشمیر بنحو مقرر ہر سالہ مبلغ مزبور را در ...... سلطان شیر محمد خان مشار الیہ برقرار ودرشتہ داشتہ مقرر رفیض در ضمن سواد رقم ۔ بخرج خود مجری ومحسوب داشتہ ہر سالہ در این خصوص رقم مجدد مطالبہ نمایند مستوفیان عظام کرام ولشکر نویسان عساکر نصرت فرجام ...... رقم ...... را ثبت دفاتر خلود لازم نمودہ

شوال ۱۲۱۳ھ ۔ مارچ ۱۷۹۹ء

اَلحُکمُ لِلّٰہِ وَالمُلکُ لِلّٰہِ
وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیداً

خان علی
سلطان مہند

منکہ مہند علی خان ابن نوازش علی خان مغفور مرحوم اقرار کردم واعتراف صحیح شرعی آوردم برایں قسم کہ دریں وقت طوعاً ورغبتاً بلا جبراً واکراہاً کہ نصف حصہ خانپور ربعہ تعلقہ سلطان مغفرت نشان رستم علی خان ونصف حصہ سید پور قدیمہ وجدیدہ سوائے اوقاف ومساجد وشوارع عام بہ برادر عزیز القدر شیر محمد خان دادم وقابض ومتصرف ساختم ومشار الیہ در مجلس واحد قبول نمود ۔ اگر من بعد احدی دعوی وخلے نماید در شرع شریف دروغ وکاذب باشد ۔ وکان ذالک بمحضر من العدول والعقاد تحریر با تاریخ ہفتم شہر شعبان المعظم ۱۲۳۶ھ ۔ مئی ۱۸۲۱ء

قوم گکھڑ کے عہد حاضر کے چند نامور افراد

۱ ۔ راجہ نادر خان گکھڑ ۔ اس نامور سردار نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کیا ۔ انگریزوں نے بغاوت کو کچل دیا ۔ نادر خاں کو گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں اسے پھانسی دی گئی ۔ اسی سال ماہ ستمبر میں تین سو حریت پسندوں نے مری پر حملہ بول دیا ۔ لیکن انگریزی فوج نے اس حملہ کو ناکام بنا دیا اور اس کے لیڈروں کو سخت سزائیں دی گئیں ۔

کرنل نکلسن نے اس علاقہ گکھڑ کے سرداروں کے ساتھ دو بڑی جنگیں لڑیں ۔ اور ایک جنگ میں زخمی ہو گیا تھا ۔ اور اس جگہ (مارگلہ) پر اب بھی نکلسن کی یادگار موجود ہے ۔

۲ ۔ راجہ جہانداد خان ۔ یہ ایک عالم، کامیاب سیاست دان اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا ۔ انہوں نے ایک بہترین لائبریری اپنے ہاں پرانی کتابوں کی جمع کر رکھی تھی ۔ مدت سے مجھے شوق تھا کہ میں ان کی یہ لائبریری دیکھوں .... میں ۳ر اگست ۱۹۵۲ء کو جب خانپور گیا تو اس لائبریری کو دیکھنے کے لئے خاص طور پر گیا ۔ مگر افسوس اور تو کوئی کتاب وہاں نہ تھی ۔ صرف ایک قلمی نسخہ قرآن مجید دکھایا گیا ۔ سلطان رکن الزماں خان مرحوم چیف نے بیان کیا کہ یہ نسخہ ان کے دادا صاحب مرحوم راجہ جہانداد خان چیف آف گکھڑ نے لاہور کے ایک رئیس زادہ سے چالیس ہزار روپیہ میں خریدا تھا اس کا عربی متن اور ترجمہ (فارسی) قابل دید وصد تعریف ہے ۔ اس کے حاشیے جو سنہری نقوش سے مزین ہیں لاثانی ہیں ۔ ہر دو مقابل صفحوں کی نقاشی اول سے آخر تک مختلف اور قابل دید ہے ۔ یہ نقوش اُز

گلکاری بے حد دیدہ زیب اور بالکل تازہ معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے اوراق بے حد نفیس اور جھلی دار کاغذ پر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چمڑے سے بنایا گیا ہے۔ ہر دو اوراق کے درمیان ایک بہت ہی باریک جھلی کا ورق لگایا گیا ہے۔ جو ہرن کے پیٹ کی جھلی سے تیار شدہ بتایا گیا ہے۔ ان جھلی کے بہت سے کاغذات میں گول، بالکل مدور سوراخ موجود ہیں جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہرن کو شکار کرتے وقت کی گولی سے پیدا ہوئے۔ سلطان رکن الزمان خان نے بیان کیا۔ کہ ایک انگریز ایک لاکھ روپیہ صرف قرآن مجید کے سب صفحات کے فوٹو لینے کے بعد دینے کو تیار تھا۔ مگر اس کی اجازت نہ دی گئی۔

قرآن مجید کے آخر میں کاتب اور جس کے لئے یہ نسخہ تیار ہوا کے متعلق تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ اس کا کاتب محمد عصمت اللہ خان ہے اور اس نے یہ نسخہ مجد الدولہ بہادر بہرام جنگ کے لئے جمادی الاول ۱۱۹۰ھ (جولائی ۱۷۷۶ء) مطابق سال جلوس ۱۸ کو تیار کیا۔

اس نسخہ قرآن کے متعلق حاجی محمد اشرف خان پنی کی روایت ہے۔ کہ ان کو راجہ صاحب جہانداد خان مرحوم کے ملازم نے بوقت زیارت اس قرآن شریف کے بتلایا تھا کہ قرآن کا یہ نسخہ غدر دہلی میں ایک گورے سپاہی کے ہاتھ لگا۔ اس سے جسٹس شاہ دین مرحوم ساکن لاہور کے والد نے خرید لیا۔ جب راجہ جہانداد خان لاہور میں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ تو جسٹس شاہ دین مرحوم کو بیرسٹری کے لئے انگلینڈ جانے کے لئے روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس نے یہ نسخہ گروی (وہ بیچ دینے کے حق میں قطعاً نہ تھے) سترہ ہزار روپے میں رکھ دیا۔ حالانکہ راجہ صاحب مرحوم اس کو مکمل طور پر خریدنے کے لئے تیس ہزار روپیہ تک دینے کے لئے تیار تھے۔ بعد میں یہ نسخہ راجہ صاحب نے مزید چار ہزار روپیہ اُن کے ورثاء کو دے کر حاصل کر لیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب امیر حبیب اللہ خان والئی افغانستان ہندوستان آنے والے تھے۔ تو اس وقت کے چیف کمشنر ڈین صاحب نے راجہ صاحب مرحوم سے استدعا کی کہ یہ نسخہ امیر حبیب اللہ خان کو نذر کرنے کے لئے اسے دے دیں۔ راجہ صاحب مرحوم نے اس امر سے انکار کیا اور کہا کہ وہ بذاتِ خود یہ قرآن مجید امیر صاحب کی خدمت میں بہ مقام خانپور پیش کریں گے۔ اس تقریب کے لئے انہوں نے ایک نیا محل بھی تیار کرایا (جو اب ان کی اولاد کا مسکن ہے) اس میں امیر صاحب کے بیٹھنے کے لئے ایک خاص کمرہ بنا کر آراستہ بھی کیا۔ اور اس میں ایک بہت خوبصورت سنہری کرسی بچھائی گئی۔

اس محل کو دیکھنے کے لئے چیف کمشنر خود گیا۔ جب اس نے کمرہ خاص کو دیکھا تو اس نے راجہ صاحب سے اس خاص کرسی پہ بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ راجہ صاحب نے جواباً اپنی ملکی زبان کے خاص لہجہ میں فرمایا:۔

"میرا گوشت اور پوست حضور کا ہے۔ لیکن یہ کرسی میں نے امیر صاحب کے لئے ہی بنوائی ہے۔"

افسوس کہ اجل نے امیر مرحوم کو مہلت نہ دی اور اس نذرانے کے پیش کرنے کی نوبت نہ آئی۔

(راجہ جہانداد خان ۱۸۸۰ء میں کابل میں پولیٹیکل افسر تھے۔ امیر کابل سے اُن کے ذاتی مراسم تھے۔ انہوں نے شادی بھی کابل کے سردار خیل خاندان سے کی تھی۔)

راجہ جہانداد خان اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ زبان عربی و فارسی کے تھے۔ بے حد ذہین اور حافظہ اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے۔ بعقل سلیم کے ساتھ وفادار سرکار انگریزی تھے۔ نوع اشرف کے جو سامان بکار ہیں وہ اکثر ان میں پائے جاتے تھے۔ ملک، قوم اور سرکار میں ان کی بڑی عزت تھی۔ (تاریخ ہزارہ ۱۸۷۲ء ولیس)

مختصر تاریخی واقعات

اخذ کردہ از بیان راجہ جہانداد خان ساکن خانپور۔

جو انہوں نے ۱۸۶۲ء میں اپنے رئیس قوم ہونے کے جواز کے متعلق دیا۔ اور راجہ رستم علی خان و نوازش علی خان کے دعوے کو جھوٹا ثابت کیا۔

۱۔ سردار سکھاں نے صاف لکھا ہے کہ علی بہادر چچا فیروز خان جو کابل میں نوکر رہا۔ نوکری کے صلہ میں ایک ہزار کی جاگیر لی۔ پھر وہاں سے نوکری چھوڑ کر آیا تو دیوان مولراج کا نوکر رہا۔ شیر محمد خان کشمیر میں نوکر رہا۔ راجہ علی گوہر خان لاہور جا کر راجہ گلاب سنگھ کا نوکر ہوا۔ گویا یہ سب نوکری پیشہ ہے۔

۲۔ نوازش علی خان میرا پردادا ہمراہ احمد شاہ بادشاہ کے متھرا کی لڑائی میں گیا۔ وہاں سے بعد فتح کے خلعت و خطاب سلطانی کا ملا۔ جب سے سلطان کہلانے لگے میرے باپ دادا نوکری کے لئے کسی کے ملک میں نہیں گئے بلکہ اپنے ملک میں رہے اور حکومت کرتے رہے۔

۳۔ قلعہ خانپور میرے باپ راجہ حیدر بخش خان نے مارا۔

۴۔ میری دستار بندی کم عمری میں ہوئی اور یہ تمام فیروز خان وغیرہ کا گھر حاضر تھا۔ اس وقت راجگان کی دستار بندی روضہ پیر شاہ عنایت ولایت واقع خانپور میں ہوتی تھی۔ اور یہ سب لوگ بمعہ صاحب دستار کے یہاں آتے۔ پہلے روضہ کا فقیر اس دستار کو ہاتھ لگاتا پھر سب لوگ لگاتے برکت کے واسطے۔ اور وہ فقیر پھر یہ پگڑی صاحب دستار کے سر پر رکھتا ہے اور صندل کا قشقہ بھی پیشانی پر لگاتا ہے۔ اس کے بعد نقارہ بجتا ہے اور شیرینی تقسیم ہوتی ہے اور بڑی خوشی ہوتی ہے اور علاقہ میں گیت گائے جاتے ہیں۔ خاص خانپور میں گیت زیادہ گاتے ہیں یہ رسم برابر فتح خان کے وقت سے میری

وقت تک باوجودیکہ میں یتیم رہ گیا تھا...... یہ رسم ہوئی۔

راجہ جہانداد خان مرحوم کی علمی و دینی وجاہت کا اندازہ "نوائے وقت" میں "شاہی مسجد لاہور کے خطیب" کے زیر عنوان ایک مسلسل مضمون سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۶۶ء میں راجہ جہانداد خان کے متعلق مندرجہ ذیل حالات تحریر کئے ہیں:۔

"مسجد کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۸ء میں جب سرسید احمد خان مرحوم بانی مسلم یونیورسٹی یہاں تشریف لائے تو سلاہور میں بڑے دھوم دھام سے محمڈن ایجوکیشنل کانگرس (اسلامی جماعت تعلیم) کا جلسہ بھی ہوا تھا جس کے روح رواں خان بہادر برکت علی خان (پیدائش ۱۸۳۲ء۔ وفات ۱۹۰۵ء) تھے جس میں مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد جیسے لوگ شامل ہوئے تھے تو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۸ء کو بروز جمعہ یہاں مولوی نذیر احمد دہلوی کے لیکچر برائے ادائیگی نماز جمعہ سرسید تشریف لائے تو خان بہادر راجہ جہانداد خان نے نماز جمعہ پڑھائی۔ اور خطبہ بھی پڑھا۔ اور ادائے نماز کے بعد سید صاحب حوض مسجد کے کنارے تشریف لائے۔ اور لوگوں کی مشتاق آنکھیں آپ کی زیارت سے مستفیض ہوئیں"۔

خلاصہ اسناد داخل کردہ راجگان خانپور۔ کلیات بندوبست ہزارہ ۱۸۷۰–۷۲ء

داخل کردہ کے نام۔ ۱۔ راجہ علی گوہر خان۔ فرمان تیمور شاہ بادشاہ پسر احمد شاہ درانی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رستم علی خان و شادمان خان کہ بزرگان راجہ حیدر بخش خان و راجہ علی گوہر خان نے برائے آبادی چند دیہات ۱ بر بلیہ۔ قطبا دینگ وغیرہ کے لئے بعوض للعہ۔ (چار ہزار) اور نقدی جاگیر بادشاہ سے منظور ہوئی۔

۲۔ داخل کنندہ۔ راجہ حیدر بخش خان۔ پروانہ صوبہ دار اس میں وقت ۱۲۵۸ھ درم بابت جاگیر نامدار خان درج ہے۔ اور بنام قانون گویاں و چوہدریاں کے لکھا ہے۔ کہ وہ ان کے اصلاح و صوابدید سے باہر نہ ہوں۔

۳۔ داخل کنندہ۔ راجہ علی گوہر خان۔ فرمان احمد شاہ درانی۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس طرف یا کشمیر میں جب شورش فساد ہوتا تھا تو راجگان سے مدد واسطے دفع فساد کے لئے لئے جاتے تھے معہ اپنی جمعیت سپاہ کے راجگان خدمت پر حاضر ہوتے تھے۔

۴۔ داخل کنندہ۔ راجہ علی گوہر خان۔ فرمان احمد شاہ درانی۔ اس فرمان سے ثابت ہوتا ہے کہ خانپور میں دو راجہ بزرگاں راجہ حیدر بخش خان و علی گوہر خان مقرر تھے اور کوئی اور راجہ نہ تھا۔

۵۔ داخل کنندہ سند۔ راجہ علی گوہر خان۔ فرمان شاہ زمان شاہ اس میں ایک ہزار روپیہ کی جاگیر بنام شیر محمد خان پدر راجہ علی گوہر خان مقرر ہوئی ہے۔ یعنی نقد ایک روپیہ کشمیر پر مقرر ہوا ہے۔

قوم ترک

موجودہ تاریخ ہزارہ بندوبست ۱۸۷۰–۷۲ء کی بنا پر تحریر کی گئی۔ اس کے مطابق اس قوم کی رہائش مانگرائے بتائی گئی ہے جس کا اقتباس نیچے دیا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اقوام جو باہر سے اس خطہ میں آئیں ان میں قدیم ترین قوم ترک قوم ہے۔ اور اس قوم کی اس پورے ضلع پر حکومت رہی اور انہی کے ایک قبیلہ قارلغ ہزارہ کے نام پر اس ضلع کا نام پڑا۔ لیکن افسوس ہے کہ میری نظر سے کوئی تحریر اس زمانہ کے متعلق نہ گزری۔ جس سے اس قدیم قوم کی پوری تاریخ لکھی جا سکے۔

متفرق روایات سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم کی حکومت کا صدر مقام گلی باغ نزد بفہ اور دھمتوڑ رہا۔ ان کی عیش و عشرت کی داستانیں زبان زد عام ہیں اور دھمتوڑ اور گلی باغ کے غسل کے تالابوں سے ان کو مربوط کیا جانا بیان ہوتا ہے۔

ان ترکوں کی اولاد سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی باقی نہ رہا۔ شاید موضع بسحالی تحصیل مانسہرہ کے ترک ان کی اولاد سے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ مانگرائے کے ترک بھی ان ترکوں کی اولاد ہوں۔ اور اپنی قدیمی مسکن گلی باغ وغیرہ سے بے دخل ہونے کے بعد مانگرائے میں جا کر اقامت گزیں ہو گئے ہوں۔ یا تیموری ترکوں کی اولاد سے ہوں۔ توزک جہانگیری میں مرقوم ہے کہ جب جہانگیر بادشاہ اس طرف سے کشمیر گیا تو ترکوں کے سرکردہ اس علاقہ میں صاحب عزت تھے۔

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہ کے ترک حاکمان چنگیز کے ساتھ آئے تھے اور وہ یہاں بس گئے۔ پھر تیمور نے ۱۳۹۹ء میں انہی کی خاطر ایک رجمنٹ قارلغ ہزارہ کی یہاں تعینات کی جس سے ان کی حکومت کی بنیاد پڑی۔ تاریخ ہزارہ کا بیان اگر صحیح ہے تو ان کی حکومت ۱۳۹۹ء سے ۱۷۶۵ء تک ضرور رہی۔ اور بعد میں ان کا نام صرف قوم کے چند افراد کے باقی رہنے سے اس خطہ میں رہ گیا۔ اس قوم کا عروج اور زوال (سلطنت مغلیہ) کے ساتھ وابستہ سمجھنا چاہئے۔

ایک ایسی بڑی قوم جس نے مدت دراز تک ہندوستان پر اور ضمناً ہزارہ پر حکومت کی۔ اس کے افراد اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس انقلابات ہیں زمانہ کے۔

ان کی تاریخ میں (اور ہر قوم کی تاریخ عروج و زوال میں) عبرت کا سامان وافر موجود ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ؏

تاریخ ہزارہ کے مطابق

خاص اس قوم ترک موجودہ کا کوئی پُرانا تعلق اس ملک میں نہیں پایا جاتا۔ یہ خود بیان کرتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے وقت سنہ ۱۶۶۶ء میں طوک خان مورثِ اعلیٰ ان کا معہ ایک فرزند مسمی عزت خان اور اپنے دو پوتوں محمد خان اور عمر پیز خان اول اول موضع علی خان آیا جو قریب مانگرائے کے ہے۔ کہ اس وقت بجائے سرائے صالح اس علاقہ میں یہی شہر تھا (یعنی سرائے صالح آباد نہ تھا) اور مانگرائے میں قوم غور غشتی کا دخل تھا۔ ان کے ساتھ سنہ ۱۶۶۹ء میں لڑائی ہوئی۔ وہ قوم اُسی سال قتل و بے دخل کی گئی۔ اور ترکوں نے مانگرائے آباد کیا۔ اور تمام دیہاتی علاقہ پر قابض ہو گئے اور دونوں طرف طوک خان کے دونوں پوتوں نے یہ دیہات تقسیم کر لئے۔ طرف عمر پیز خان کے معروف کمال خانی اور طرف محمد خان معروف ہاشم خانی کہلائی اور ان کا دخل بطور راجگی و خانگی رہا۔ ایک آدمی راجہ و سردار رہتا تھا۔ دوسرے بھائی گزارہ پاتے رہے۔ اور دفتری کہلاتے تھے۔ بادشاہانِ چغتائی کو تین ہزار مالیہ ان دیہاتی علاقوں کا دیتے رہے۔ اس وقت کل ہزارہ کا مالیہ بارہ ہزار تھا۔ کہ چہارم حصہ کل میدان ہزارہ سے یہ دیہات شمار ہوتے تھے۔ اس وقت یہ ملک اٹک کے ساتھ شامل تھا جب سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور سنہ ۱۷۴۶ء میں احمد شاہ درانی کا زور و دخل ہو گیا تو یہ ملک متعلق کشمیر کیا گیا۔ اور معاملہ مقررہ سرکار کشمیر میں ادا کرتے رہے۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں باہم ہر دو طرف کے سخت دشمنی پیدا ہو گئی۔ اور عنایت خان طرف محمد خان نے مسمی کلیچ بیگ ہمشیرہ زادہ سلام خان طرف عمر پیز خان کو قتل کر دیا اور اس کے بدلہ میں سلام خان نے عنایت خان کو قتل کرا دیا۔ پھر اسی سال سنہ ۱۸۰۲ء میں مسماۃ جیونی بیگم والدہ عنایت خان۔ جو کہ برکات خان تنولی کی ہمشیرہ تھی نے سلام خان کو اس کے دو رشتہ داراں سمیت رتابنہ میں قتل کرا دیا۔ اور عنایت خان کا فرزند ہاشم خان نابالغ رہ گیا۔ حکومت اس طرف کی جیونی بیگم والدہ عنایت خان کرتی رہی۔ جب ہاشم خان جوان ہوا تو اس نے سنہ ۱۸۱۶ء میں کمال خان کو قتل کرا دیا۔ فتح خان پسر کمال خان خورد سال رہ گیا (تاریخ مہتاب سنگھ کے مطابق مانگرانے کے ترک محمد خان و طوک خان کی اولاد ہیں۔ ہاشم خان و کمال خان ریاست پنجی تور کی پر مشترکہ حکومت کرتے تھے۔ راجہ ہاشم خان بھائیوں پر زور آور تھا۔ ایک دن آدھی رات کے وقت راجہ کمال خان کو بمعہ متعلقان قتل کر کے پنجی تور کی کا واحد مالک بن گیا اور سب بھائیوں کو دبا لیا۔ ان (کمال خان) جنبہ محمد خان ترین کیساتھ تھا۔ محمد خان ترین نے مدد کی اور سنہ ۱۸۱۶ء میں ہاشم خان کو بالکل اپنی عداوت سے نکال دیا وہ بیدخل ہو گیا اور قبضہ فتح خان پسر کمال خان کا ہونے والا تھا۔ کہ ہاشم خان پنڈی کی طرف جا کر سردار مکھن سنگھ کو اپنی مدد کے واسطے لایا۔ وہ مع فوج کے اس ملک میں داخل ہوا اور محمد خان ترین کے ساتھ سنہ ۱۸۱۷ء میں لڑائی ہوئی۔ محمد خان نے شکست کھائی۔ محمد خان کی جائے مسکن گل ڈھیری مکھن سنگھ نے راجہ ہاشم خان کے ساتھ مل کر جلا دی۔ اور سردار مکھن سنگھ نے اپنی گڑھی شاہ محمد میں تعمیر کر لی۔ اس طرح سنہ ۱۸۱۷ء سے دراصل سلسلہ وراثت اس قوم کا شکست ہو گیا اور ایک سال سنہ ۱۸۱۸ء چہارم پختہ قوم ترک، دلازاک و ترین کو دی اور سنہ ۱۸۱۹ء میں یہ سردار مکھن سنگھ متعلق مہاراجہ رنجیت سنگھ ہو گیا (پہلے یہ خود مختار جاگیردار تھا) فساد رفع نہ ہوا اس نے چہارم دینے سے بھی جواب دے دیا۔ اور سنہ ۱۸۲۰ء میں پھر بڑی شورش ملک میں ہوئی۔ اور محمد خان ترین اور اس قوم ترک و دلازاک نے مکھن سنگھ کے ساتھ موضع شاہ محمد میں لڑائی کی۔ اس لڑائی میں مکھن سنگھ مارا گیا۔ اور اسی سنہ ۱۸۲۰ء میں دیوان رام دیال مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے آیا۔ وہ بھی ناڑہ کی لڑائی میں مشوانی وغیرہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ سنہ ۱۸۲۱ء میں سردار امر سنگھ مجیٹھیہ واسطے انتظام ملک کے آیا۔ اور سمندر کٹھہ علاقہ ناڑہ بیلاں میں قتل ہوا۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں کمان اس ملک پر سردار ہری سنگھ کی ہو گئی۔ اس نے شہر اور قلعہ ہری پور کی بنا رکھی۔ اقوام کے سرگروہوں کو جاگیریں دینے کی تجویز کی۔ اس قوم میں سے ہاشم خان کو ایک ہزار کی جاگیر دی۔ مگر پھر بھی فساد شرارت ملک سے دور نہ ہوا۔ سنہ ۱۸۲۳ء میں سردار ہری سنگھ لاہور کی طرف گیا۔ پیچھے ایک بڑی شورش ملک میں پیدا ہوئی۔ تھانہ شنکیاری و دربند، نواں شہر و اگرور وغیرہ اقوام ملکی نے مار لئے۔ سنہ ۱۸۲۴ء میں سردار ہری سنگھ نے واپس آ کر سب پر فتح پائی۔ اور اگرور مار کر بہت سی عورتیں پنجاب کی طرف لے جا کر بیچ ڈالیں۔ اسی سال سنہ ۱۸۲۴ء میں ناڑہ کی لڑائی مشوانی و سید خانی وغیرہ ملک والوں سے ہوئی۔ سردار ہری سنگھ نے شکست کھائی۔ اور پھر اسی سال سنہ ۱۸۲۴ء میں فتح پائی۔ اور اُس کو ثابت ہوا کہ جب تک ان اقوام ترک، دلازاک و ترین وغیرہ کے سرگروہ توپ سے نہ اڑائے جائیں ملک کی شورش ختم نہ ہو گی۔ اس لئے بوستان خان ترین۔ محمد خان پدر پائندہ خان تمو کروالا۔ جلال خان دلازاک۔ شبیر محمد و صالح محمد مشوانی و شیخا چھدون پدر عبداللہ خان جنبہ والا توپ سے اڑا دئے گئے۔ ملک میں امن ہو گیا۔ اس وقت ہاشم خان و فتح خان اس قوم ترک کے سرگروہ مفرور ہو گئے تھے۔ سردار کے ہاتھ نہ آئے۔ پھر سردار تیجا سنگھ کے وقت بھی جاگیر ایک ہزار کی ہاشم خان کو جب وہ دوبارہ سنہ ۱۸۳۰ء میں آ کر ملا ہوئی۔ اس کے عمل کا یقین نہیں ہے۔ سب ترک دراصل سنہ ۱۸۱۷ء سے بعد شکست ہونے سلسلہ وراثت کے پریشان رہے۔

ہر جس نے جس گاؤں کو ایک دو سال اجارہ وغیرہ پر کھایا تو مثل اور لوگوں کے کھایا۔ وراثت کی بنیاد پر نہیں کھایا۔ اس وقت اجارہ کھتری و مزارعہ وغیرہ بہت کیا کرتے تھے۔ جو ہمت و دولت والا ہوا کرتا تھا۔ اجارہ ایک دو فصل کا جس گاؤں کا چاہتا تھا کر لیتا تھا۔ ۱۸۴۴ء میں ہاشم خان ترک مر گیا۔ اخیر عہد سکھاں میں ۱۸۴۵ء کو یورش دیوان مولراج والی ہوئی۔ اور ایک فصل دخل سلطنت کا اٹھ گیا۔ اس وقت جو لوگ تھے۔ انہوں نے ملک سے کچھ وصول کیا۔ ہنوز زیادہ وصول کرنے نہیں پائے تھے۔ کہ مولراج اور سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ اور ۱۸۴۶ء میں یہ ملک راجہ گلاب سنگھ صاحب کو سرکار انگریزی سے شامل کشمیر کر دیا گیا۔ اور ۲۲ کو دیوان ہری چند مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے اس ملک میں آیا۔ اس کے ساتھ پھر لڑائی ملک والوں نے ۱۸۴۶ء میں کی۔ پھر یہ ملک ۱۸۴۷ء میں متعلق سرکار ہوا اور میجر ایبٹ صاحب بہادر نے مشخصہ بندوبست سرسری اس کا کیا۔ اس وقت حیات خان و فتح خان مشخصہ دار موضع مانکرائے کے ہوئے پھر ۱۸۴۸ء میں شورش چتر سنگھ کی ہوئی۔ حیات خان پسر ہاشم خان اور فتح خان پسر کمال خان جو سرگروہ قوم ترک کے مخالف ہو گئے اور مہندا خان پسر ہاشم خان نے مخالفت نہ کی۔ بعد رفع شورش کے ۱۸۴۹ء میں مخالف قید کئے گئے اور کتاب مانکرائے بنام مہندا خان کی ہوئی اس سے انتظام روپیہ کا نہ ہو سکا۔ پھر ۱۸۵۲ء میں چراغ علی شاہ و ملک غیبے کے نام بندوبست ہوا۔ اس علاقہ مانکرائے میں ہر کوئی قوم اپنے اپنے قبضہ کی رسید سے متحمل نفع نقصان رہے۔ بندوبست حال میں بعد از تحقیقات ہو کہ ہر کوئی بقدر قبضہ رہنے کے مالک مقرر ہوا۔ اور یہ قوم ترک بھی موضع مانکرائے و لہکہ مالک قرار پائی۔

ہزارہ کے ترک ان قارلق خاندانوں کی اولاد سے ہیں۔ جن کو امیر تیمور لنگ نے چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندوستان کے حملے سے واپسی پر ہزارہ میں بسا دیا تھا۔ ایک وقت میں ان کی غالب اکثریت اور حکومت تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ پٹھان اور دیگر اقوام نے ان کو اپنی جائیداد و ملکیت سے بے دخل کر دیا اور ۱۷۸۶ء میں ان کو ہم تیمور شاہ دُرانی کے آگے درخواست کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ ان کی درخواست یہ تھی کہ ان کو اپنے آبائی مرکزی مقام مانکرائے میں جس سے ان کو قوم غورغشتی نے بے دخل کر دیا ہے واپس بسایا جائے۔ ان کی درخواست منظور ہوئی اور وہ اب تک مانکرائے میں جو اس ضلع میں ترکوں کا صدر مقام ہے موجود ہیں۔ لیکن ان کی گزشتہ شان و شوکت ختم ہو چکی ہے اور صرف چند اور گاؤں میں ان کی قوم کے افراد ہری پور تحصیل میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۲۳۷۹ افراد تھی جب کہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۳۸۲ تھی۔ وہ ایک رو بہ تنزل قوم معلوم ہوتے ہیں ان میں کوئی بااثر آدمی نہیں اور نہ ان میں کوئی قوت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

ترک

ہماری قوم میں کوئی شاخ نہیں ہے اور چند دیہات تحصیل مانسہرہ و ہری پور میں آباد ہیں۔ اور اس ملک کی قدیمی قوم ہے۔

کلیات قوم ترک ۱۸۶۹ء

(بیان ترکان ۹ راکتوبر ۱۸۶۳ء)

مانکرائے۔ حسب تشریح کلیات قوم ترک راجہ ملوک خان ترک قوم کے مورث اعلیٰ بہ عہد اورنگزیب بادشاہ غورغشتی قوم کو اپنے علاقہ پٹھی توری سے بزور شمشیر بے دخل کر کے خود قابض ہو گیا۔ اس وقت سے قوم ترک کا قبضہ ہے۔

جب سردار ہری سنگھ نے مانگل مار لیا اور سکھوں کا عمل دخل ہو گیا تو بہ سبب جنگ ترک قوم وراثت مانکرائے سے بے دخل ہو گئی۔

تواریخ۔ اصل میں یہ قوم مغل ہے۔ ان کا بزرگ جس کے نام پر ترک مشہور ہیں مستی تور تھا جس کا سلسلہ نسب بادشاہان ایران سے ملتا ہے۔ اس کے نام پر اپنی ذات کا نام مشہور ہونا بیان کرتے ہیں۔ بڑا گاؤں اس علاقہ میں مانکرائے ہے۔ اس قوم کی اصل سکونت بھی یہی گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے نام پر علاقہ کا نام مشہور ہوا۔ عہد اورنگزیب بادشاہ چغتائی کے عہد میں ملوک خان مورث اعلیٰ اس قوم کا اس ملک میں آیا۔ یہ بات معلوم نہیں کہ کس علاقہ اور کس شہر سے آیا اور کس طرح پر جاگیرداری یا زمینداری پر آیا۔

(نوٹ متعین زمانہ آمد ملوک خان۔ راجہ ہاشم خان نے ۱۸۱۹ء میں کمال خان کو قتل کیا۔ بموجب شجرہ جو آخر میں درج ہے۔ ہاشم خان، ملوک خان کی آٹھویں پشت میں ہے۔ لہٰذا ملوک خان کا زمانہ بموجب چار پشت ایک صدی میں ۱۶۱۹ء ہوا۔ ش ب) لیکن اس قدر مشہور ہے کہ دہلی کی طرف سے آیا اور اس کے ساتھ اس کا ایک لڑکا عزت خان اور دو پوتے محمد خان و تبریز خان تھے۔ اول اول وہ موضع سلطان پور علاقہ ہری پور میں آیا۔ پھر انہی ایام میں وہاں سے اٹھ کر موضع علی خان میں کہ اس وقت اس کی آبادی دوسری جگہ پر تھی اور اچھی تھی، آ کر رہے۔ سرائے صالح اس وقت آباد نہ تھی۔ موضع مانکرائے آباد تھا۔ اور قوم غورغشتی بمنزلہ وارثان اور اقوام متفرق بطور کاشتکار وہاں سکونت پذیر تھے۔ ترک قوم کے مورث اپنے گھوڑوں کو نالہ دوڑ کے درمیان واقع زمینوں کے جو زمینداران غورغشتی کی تھی، چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ زمیندار آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے ان گھوڑوں کو اپنی اپنی زمین سے نکال کر دوسرے کے

کیست میں داخل کر دیا کرتے تھے۔ قوم ترک کے مورث نے ان کی نااتفاقی کی وجہ سے اس قوم کا اخراج اور اپنا قبضہ کر لینا آسان سمجھ کر قوم غورغشتی سے جنگ کی اور ان کو قتل کر ڈالا۔ جو تھوڑے سے کسی سبب سے بچ گئے وہ نکل گئے۔ اُن کے ساتھ اکثر کاشتکار بھی نکل گئے۔ مانکرائے کی آبادی اس جنگ میں ویران ہو گئی۔ بعد فتح پرانی آبادی کی جگہ چھوڑ کر دوسری جہاں اب یہ آباد ہے اور اُس وقت اس جگہ کو بہڑیاں دی ڈھیری کہتے تھے آبادی بنائی۔ جو آج تک موجود ہے۔ اور پرانی آبادی کے موقعہ سے اب تک بنیاد ہائے چونہ۔ کنیٹہ (کنکریٹ) اور پتھر اس میں سے نکالتے ہیں اور اس کو پیر مانکا دی ڈھیری کہتے ہیں۔ اس وقت میدان ہزارہ میں ۴۸ موضع آباد تھے۔ اور قوم گوجر اکثر پر قابض تھی۔ قوم ترین و دلازاک بھی اس وقت ملک میں بموجب ذکر مندرجہ کیفیت کلیات اپنے اپنے قوم کے آچکی تھی۔ قوم دلازاک کے آدمی بہت تھے وہ تمام دیہات میں جو اس وقت آباد تھے، پھیل گئے اور گوجروں کو تکلیف دی۔ انہوں نے (گوجروں نے) بحضور بادشاہ استغاثہ کیا۔ تب قوم دلازاک اس ملک سے نکال کر ہندوستان میں بسائے گئے مگر پھر بھی کچھ لوگ اس قوم کے اس ملک میں رہ گئے تھے۔ بار دیگر ہر سہ اقوام، ترک ترین و دلازاک نے باہم مصلحت کر کے ارادہ نکال دینے قوم گوجر کا کیا۔ اور ایک شخص مسمی چوہدری موسیٰ ساکن کابل کو قتل کر دیا۔ جب قوم گوجر برائے استغاثہ اس خون ناحق کے دہلی گئی تو اتفاق سے صالح محمد قوم دلازاک جو پہلے نکالا گیا تھا۔ خدمت شاہ میں حاضر تھا۔ اس نے دریافت حال ان کا کر کے اُن کو یہ فہمائش کر دی کہ بادشاہ سے درخواست کر کے مجھ کو ہمراہ لے چلو۔ کہ تمہارا تصفیہ کر دوں گا۔ وہ اس کے حال سے ناواقف تھے۔ اُنہوں نے وہی درخواست کر کے صالح محمد کو دادرسی کے واسطے ساتھ لیا۔ اور ملک ہزارہ میں آ گئے۔ اس وقت صالح محمد نے قوم ترک و ترین سے اتفاق کر کے ملک ہزارہ کو چار حصہ برابر میں تقسیم کیا۔ قوم ترک کا ایک حصہ۔ قوم ترین ایک حصہ۔ قوم دلازاک کا ایک حصہ۔ اور من جملہ ۴۸ آباد مواضعات کے ۱۲ مواضعات فی حصہ آ گئے۔ بعد اس عمل کے اپنے حصہ پر پورا دخل وارثانہ وحاکمانہ اس قوم کا ہو گیا۔ اور ان کے دیہات بحسب وراثت بنام پنج تورکی مشہور ہوئے۔ جب تک عملداری مسلمانان رہی اس وقت تک یہ قوم اپنی پنج تورکی پر پوری طرح دخیل رہی۔ اور سعی و کوشش کر کے اور گاؤں بھی آباد کئے۔ چنانچہ تفصیل دیہات جو اس وقت آباد تھے یہ ہے:۔

ڈھیری۔ قاضیاں۔ جیئر۔ باندھی میرداد۔ تنور۔ مقصود۔ ملکھن۔ نوشہرہ۔ جب اُنہوں نے قبضہ و دخل پنج تورکی پر پالیا تو رفتہ رفتہ اور دیہات آباد کئے۔ چنانچہ عملداری مسلمانی میں کل دیہات

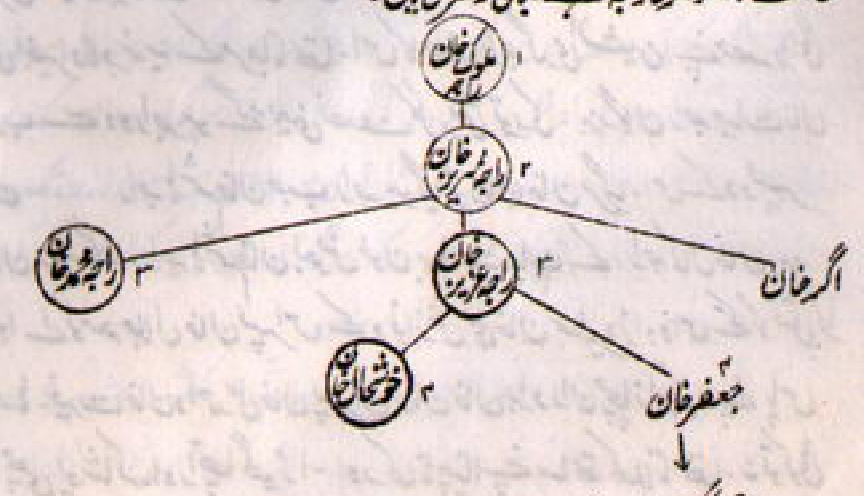
اُن کے قبضہ میں یہ تھے:۔ مانکرائے۔ جیئر۔ کہکہ۔ پراگہ (پھرہالہ) نڑتوپہ۔ پھراڑی۔ گاڑ۔ موسیٰ۔ شاہ محمود ملکھن۔ دوبندی۔ پنڈ ہاشم خان۔ ڈھیری۔ قاضیاں۔ باندھی میرداد۔ تیلور۔ پنسٹ۔ باہنڈہ۔ کرکم۔ بھیڑیاں ضلع پنڈی۔ نوشہرہ۔ کیالگ۔ چھتے۔ بھکے۔ بگرہ نصف۔ رتابنہ۔ سیریاں نصف۔ بجوالہ درشخیل۔ بیکے۔ کوٹی نصف۔ پھولالہ گلی۔ برتھال۔ مقصود۔ کوکہ۔ چھترڑی۔ بہیرہ۔ پنڈ مانکرائے داخلی پنیاں۔ کنڈل۔ طورکا باندہ۔ گجل۔ ساچہیا۔ گھوشان۔ ہر ایک تا عملداری سکھاں تپہ تورکی میں شامل رہے۔ اور اب تک اسی تپہ میں ہیں۔ اور موضع نوشہرہ پاس پیر خان جدون کے اور دیہات ذیل۔ کنڈل۔ گجل پاس نواب خان تنولی کے۔ اور پٹ پاس احمد علی خان خانخیل و سیدان مانکرائے و کرکم پاس احمد علی خان۔ حمید خان خانخیل و بھکے پاس قبول خانی کے و کوکہ پاس بوستان خان ترین و زمیندار دیہہ مذکور۔ پنڈاں پاس قوم ترین کے رہن ہو گئے۔ اور باقی دیہات قوم جدون و تنولیاں نے دبا لئے۔ اور دیہات ذیل جامہ علوی۔ جوگی۔ سوہترا۔ جھڑے پنڈ جو دراصل تپہ خالصہ قوم خوشحال خانی پٹھانوں کے وراثت کے تھے۔ جب کروڑی مل کاردار نے علاقہ بندی جدید کی تو یہ دیہات بھی پنج تورکی میں شامل کر دئے چنانچہ اب تک علاقہ مانکرائے و پنج تورکی میں شمار ہوتے ہیں۔ جس وقت مورث اعلیٰ اس قوم نے قبضہ پایا تو قوم غورغشتی آباد تھے۔ جس طرح سے ان سے برتاؤ کیا وہ اوپر درج ہو چکا ہے۔ اس وقت اُن میں سے کوئی موجود نہیں۔۔۔۔ مورث کے ساتھ سیدان اور آوان بھی آئے۔۔۔۔۔ طریق تقسیم وراثت اس قوم میں بعینہ ایسا ہے جیسا کہ قوم گکھڑ ساکن خانپور کا ہے۔ یعنی اول تو اس قوم ترک میں جب تک ایک شخص گدی نشین و راجہ ہوتا رہا تب تک وہ اپنے برادران کو جس جس گاؤں سے مناسب سمجھتا رہا۔ گذارہ دیتا رہا۔ کسی شخص کو برادران وغیرہ سے کبھی حصہ تقسیم کر کے نہیں دیا۔ جس کو جس قدر اراضی کسی گاؤں میں ملتی تھی اس کا وہ دفتری شمار ہوتا تھا اور وہی زمین اس کی اولاد میں تقسیم ہوتی تھی۔ اور جو کوئی ان دفتریان سے لاولد یعنی بغیر اولاد نرینہ کے مر جاتا تھا۔ اس کا حصہ راجہ گدی نشین اپنے حصہ راجگی میں شامل کر لیتا تھا۔ جب سے دو راجہ ہو گئے یعنی نصف کل پنج تورکی۔ بزرگان راجہ حیات خان و نصف بزرگان فتح خان۔۔۔۔۔ راجہ ہاشم خان جب راجہ ہو گیا تو زمان خان مر گیا۔ اس کے دو پسر غیرت خان و احمد علی خان رہ گئے۔ راجہ ہاشم خان بعوض خون بہا اپنے باپ کے، راجہ کمال خان پسر فتح خان دوسری طرف والے کو معہ جلال خان پسر اس کے و نوازش علی خان ہمشیرہ زادہ اس کے کو قتل کر ڈالا۔ پھر راجگی اپنی کرتا رہا۔ غیرت خان و احمد علی خان پسران زمان خان برادران چچازاد کو اپنے پاس سے گذارہ دیتا رہا۔ اچھی پوشاک اور اچھا گھوڑا۔ اور کھانا پینا اپنے ساتھ کھلاتا تھا۔ نہ تو کوئی

حصہ اپنی راجگی کا ان کو علیحدہ دیا کہ کسی حصہ کے راجہ سمجھے جائیں اور نہ کوئی اراضی یا گاؤں علیحدہ کر کے دیا۔ کہ یہ دونوں اُس کے دفتری متصور ہوں۔ اسی طرح سے گزارہ ہوتا تھا کہ سرکار سکھاں کا دخل ہو گیا۔ ابتداء میں چہارم پر جاگیر راجہ ہاشم خان کو ملی اس سے بھی غیرت خان و احمد علی خان کو جس قدر چاہتا ویسا گزارہ دیتا تھا۔ اور اچھا گزارہ دیتا تھا۔ پھر سب بے دخل ہو گئے اور سکھوں کے وقت پہلے اس جگہ دھور سنگھ سردار نے پانچ سو سوار کے ساتھ جب چھاپا مارا تو اس وقت اس قوم کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ جب مکھن سنگھ سمت ۱۸۶۲ میں اس جگہ آیا تو اس کے آنے کا سبب یہ تھا۔ کہ راجہ ہاشم خان نے جب کمال خان کو مار دیا۔ تو ترین ان کے ہمراہ ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے دوبندی اور پنڈ ہاشم خان کو مار لیا۔ راجہ مذکور بمقام کچھی چلا گیا۔ اور وہاں سے بھائی حکماں سنگھ کے پاس بمقام اٹک چلا گیا۔ دو ماہ اس جگہ رہا۔ بعدہٗ مکھن سنگھ پانچ سو سوار اور کچھ پیادہ لے کر اس ملک میں پہنچے پہلے چھاپا مارا۔ پھر گل ڈھیری ماری۔ اور مکھن سنگھ نے شاہ محمد سرائے صالح میں قلعہ بنوایا۔ سمت ۱۸۶۷ء میں مکھن سنگھ از دست محمد خان ترین وغیرہ مارا گیا۔ پھر سمت ۱۸۷۴ بکرمی جب ہری سنگھ نے مانگل ماری تو اس ملک پر سکھوں کا پورا دخل ہو گیا۔

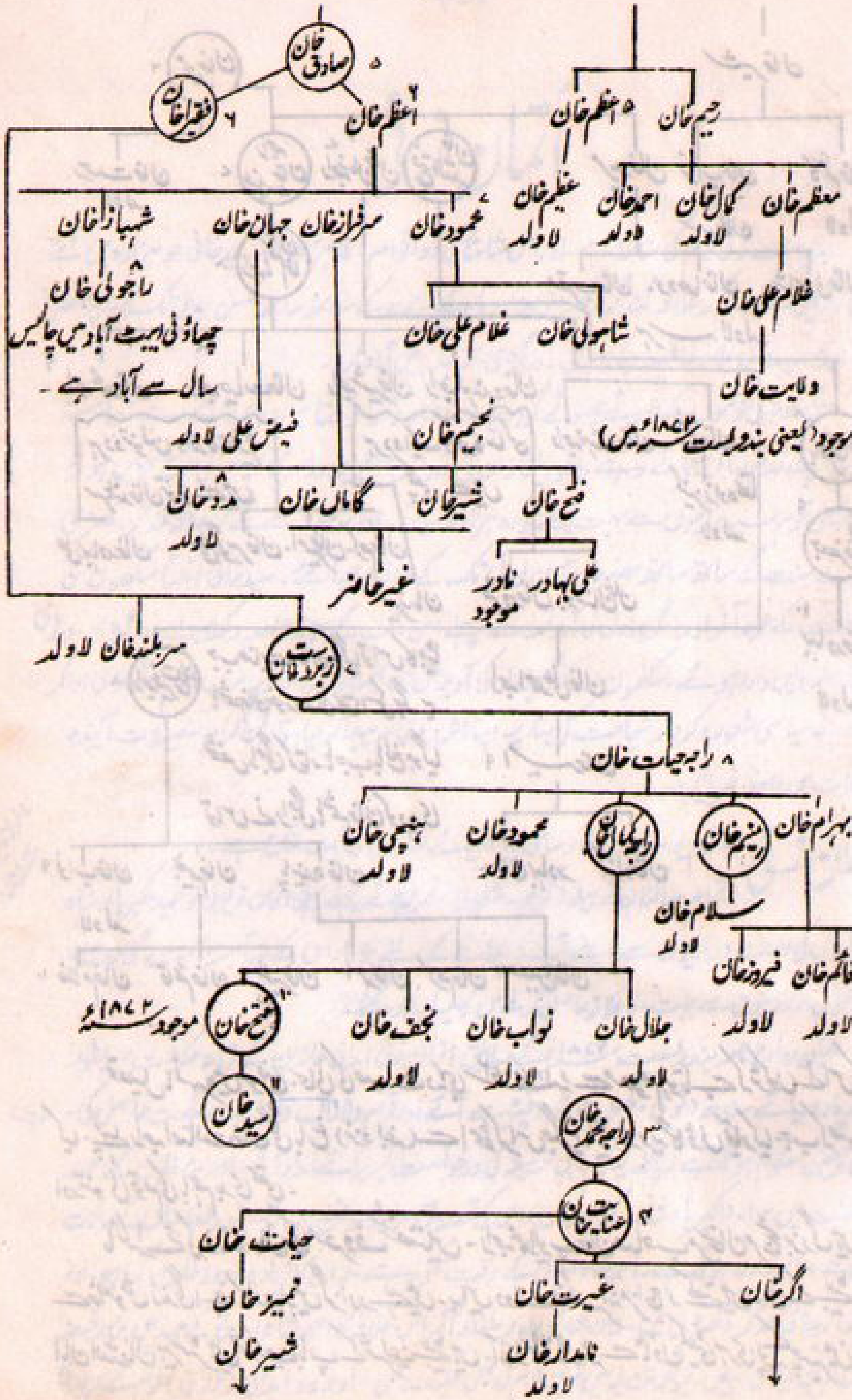
۱۸۴۷ء میں چتر سنگھ کا فساد ہو گیا۔ راجہ حیات خان و فتح خان وغیرہ چتر سنگھ کے ساتھ شامل ہو گئے اس واسطے دیہات بھی ان سے جاتے رہے۔ دیگر اشخاص کے سمت ۱۹۰۶ء میں مقرر ہو گئے اور حیات خان کو دو برس سرکار نے قید رکھا۔ پھر رہا ہو گیا۔ اور سمت ۱۹۰۷ بکرمی سرکار کی خدمت کی اور جرم معاف ہو گیا۔

شجرہ نسب

شناخت :- دائرہ راجہ ہے۔ باقی دفتری ہیں۔



(باقی اگلے صفحہ پر)



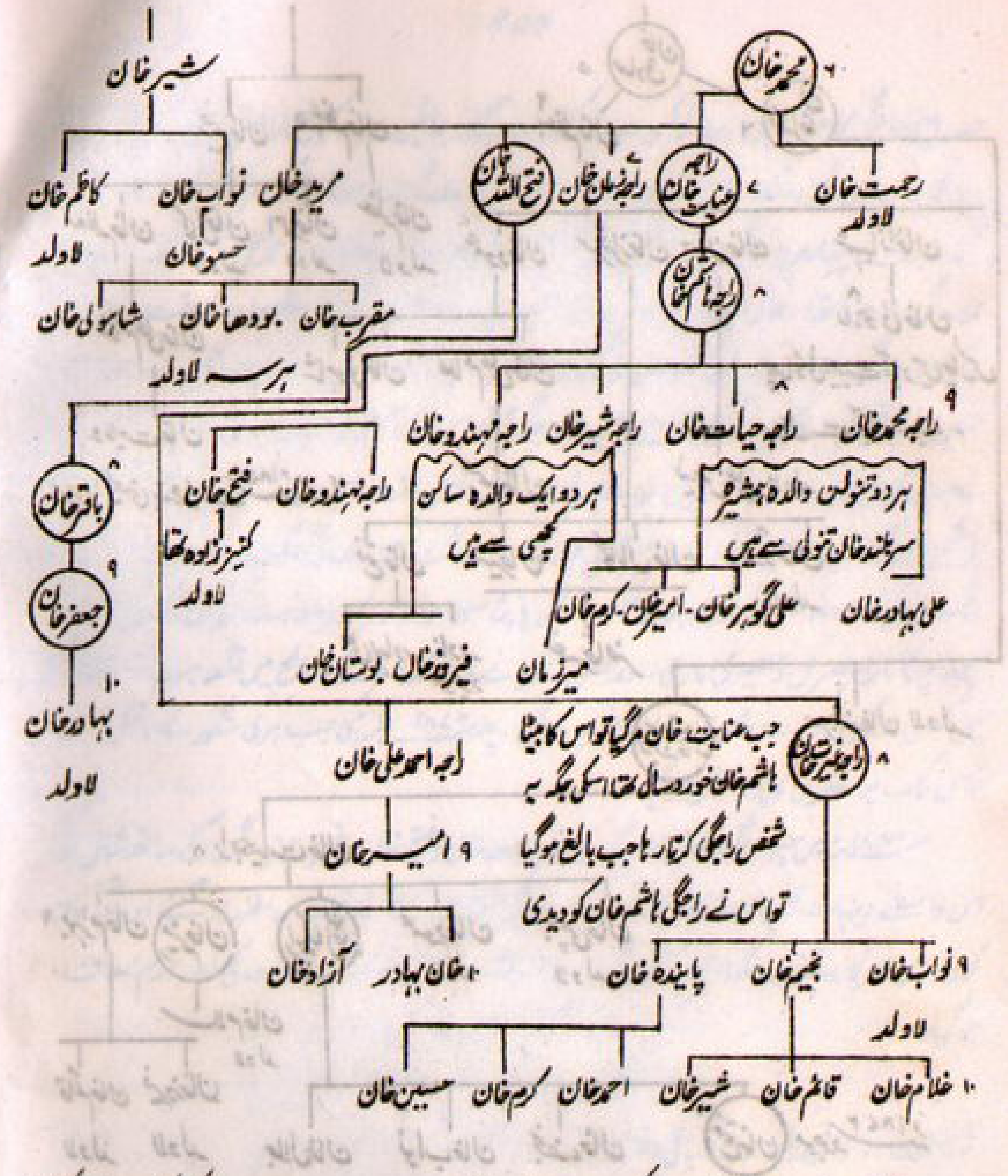
اُتمان زئی

یہ یوسف زئی قوم کی شاخ ہے۔ اور اس شاخ کی دو اقوام۔ طاہر خیلی و سیدخانی جو ہزارہ میں آئے قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر علاقہ گندگر و کھڑی (ز دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ حسن ابدال تک) پر متصرف ہیں۔ اور سیدخانی علاقہ خالصہ (کھلابٹ۔ درگڑی۔ تربیلہ) میں آباد ہیں۔

ان دونوں قوموں کے چھوٹے چھوٹے گروہ یا چند افراد وقتاً فوقتاً ہزارہ میں آتے رہے اور آہستہ آہستہ اپنے قدم یہاں جماتے رہے۔ بطور یلغار ان کی آمد اس ضلع میں دوسری اقوام کی طرح نہیں ہوئی طاہر خیلی قوم سیدخانیوں سے بہت پہلے وارد ہزارہ ہوئی۔ اور تربیلہ سے لے کر علاقہ گندگر۔ کھڑی۔ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ حضرو اور حسن ابدال تک کے علاقہ پر چھا گئے۔ سیدخانی اغلباً سکھوں کی سلطنت کے عہد آخر اور انگریزوں کی آمد آمد سے پہلے اس ملک کے علاقہ خالصہ (کھلابٹ۔ درگڑی۔ درڑی اور تربیلہ) میں وارد ہوئے۔ سکھوں اور انگریزوں کی آویزش میں بھرپور کردار از جانب حکام انگریزی ادا کر کے اپنے سیاسی شعور و کردار شجاعت کی بنا پر اپنا اثر و مقام پیدا کر لیا۔ قارئین کرام تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

اُتمان زئی یہ قوم یوسف زئی (ساکن پار دریائے سندھ) کی ایک شاخ ہے۔ اقوام ساکنانِ تربیلہ (گوجر۔ شلمانی۔ ترین) نے پہلے پہل اتمان زیوں کو عہد اکبر بادشاہ تنولیوں کی دست درازیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے بلایا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ گوجروں۔ شلمانیوں اور ترینوں سے بہت سا علاقہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق اتمان زئی ابدالی خاندان کے زمانہ حکومت میں بطور یلغار پار دریائے سندھ (ٹوپی۔ کھبل۔ کوٹھہ وغیرہ) سے آئے اور قوم دلازاک و ترک سے ملکیت حاصل کی۔ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ قوم اہل تربیلہ کی درخواست پر برائے امداد آئی۔ اور یہ مغلوں کے عہد سلطنت میں ہوا۔ (اکبر بادشاہ کے عہد میں) اس کی تصدیق مزید موضع جھاڑ، جٹو و لقمانیاں کے حالات صورت دیہی سے ہوتی ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے وقت ممکن ہے۔ کہ ان کا زیادہ زور و غلبہ ہو گیا ہو۔ اور خاص کر علاقہ گندگر و کھڑی میں۔ لیکن ان کا بطور یلغار آ کر اس علاقہ کا احمد شاہ ابدالی کے عہد میں بزور قبضہ کر لینا قرین قیاس نہیں۔ کیونکہ تربیلہ میں ترین قوم کی بھی ملکیت تھی۔ اور وہ ابدالی (دُرانی) قوم کے ہم جدی



تحصیل مانسہرہ میں موضع بجالی کی صورت دیہی ۱۸۷۰-۷۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے اس کو آباد کیا۔ پہلے راجہ اصالت خان گلی باغ (نزد بفہ) سے اٹھ کر اس جگہ پر آیا۔ اور یہ گاؤں آباد کیا۔ جب کہ سواتی اور تنولی قوم کی باہم بدی تھی۔

مانگرائے کی زمانہ حال کی معروف شخصیتیں۔ راجہ محمد ایوب خان صاحب مرنجان مرنج بزرگ ہیں۔ مدت سے خاموش زندگی اپنے کاروبار میں گزار رہے ہیں۔ باایں دولت منکسرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ ان کے بیٹے راجہ امان اللہ خان بیرسٹر ہیں شریف باپ کے شریف بیٹے ہیں۔ آغاز ۱۹۶۹ء سے ٹاؤن کمیٹی ہری پور کے چیئرمین ہیں۔

ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تیمور شاہ کے زمانہ سلطنت میں نجیب اللہ خان ترین حاکم ہزارہ ہوا۔ لہذا اس وقت ترینوں سے بزور یہ علاقہ لے لینا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

اللہ بخش یوسفی یوسف زیوں کے حالات میں لکھتا ہے۔ کہ بھاگو خان کو شاہ جہان بادشاہ نے اغلباً سنہ ۱۶۴۲ء میں کوہ گندگر کا میدانی علاقہ (مغربی طرف) تربیلہ اور غازی کی سرحد سے چھچھ تک دے دیا۔ لہذا یوسف زئی (اتمان زئی) اس وقت تک بکثرت اس علاقہ میں آباد دکھائی دیتے تھے۔ بھاگو خان نے ہزارہ کو فتح کرنے کا اقدام اغلباً سنہ ۱۶۶۰-۱۶۶۲ء میں کیا۔ لیکن سردار شادمان و دوسرے افسران جو قلعہ اٹک کی حفاظت پر مامور تھے۔ انہوں نے لازماً حکومت کو اس طرح متوجہ کیا ہوگا۔ تو حکومت سے ٹکر ہوئی۔ اس سے پہلے مصری خان امازئی نے (یہ خان ہمایوں بادشاہ اور شیر شاہ کے وقت تھا) تناول ہزارہ پر حملہ کیا۔ ان شاخوں میں علی زئی کی تعداد ہزارہ میں سب سے زیادہ ہے۔

علی زئی کے تین نامور خیل یہ ہیں:۔

۱۔ طاہر خیلی (تار خیلی)۔ ۲۔ سید خانی۔ ۳۔ خوشحال خانی۔ تار خیلی علاقہ کھری و گندگر میں۔ کنازئی تربیلہ اور خالصہ میں دریائے دوڑ کے پائیں آب میں آباد ہیں۔ اکازئی اس ضلع میں بہت تھوڑے ہیں۔

اتخیل سیدخانی ۔ ان میں معزز خاندان کھلابٹ کا ہے۔ ان کا جد امجد میر زمان خان بہت بہادر اور میجر ایبٹ کا نہایت وفادار ساتھی تھا۔ اس کی بہادری کے کارنامے بہت ہیں۔ لیکن ایک واقعہ اس جگہ قابل ذکر ہے۔ ایک وقت ایسا آیا۔ کہ سب سکھ لشکر ہزارہ سے چلا گیا۔ اور ان کے ایک ہزار سپاہی قلعہ ہری پور میں مورچہ گزیں ہو گئے۔ میر زمان خان نے میجر ایبٹ سے ہری پور کے دیہات سے مالیہ جمع کرنے کی اجازت مانگی۔ اس کام کے لئے ابھی وہ موضع درویش ہی میں تھا۔ کہ سب سکھ لشکر قلعہ ہری پور سے نکل کر اس پر حملہ آور ہوا۔ لیکن اس نے اپنے تیس سوار ساتھیوں کے ساتھ اس پامردی سے مقابلہ کیا۔ کہ وہ بھاگ کر پھر قلعہ میں داخل ہو گئے۔

میر زمان خان کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خانی زمان خان جانشین ہوا۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح حکومت کا وفادار تھا وہ بہت خراج اور سخی انسان تھا۔

میجر ایبٹ کے بیان کے مطابق حکومت کے لئے خانانِ کھلابٹ سے زیادہ وفادار اور کوئی اس ضلع میں نہیں تھا۔

میر زمان خان کا والد سعد اللہ خان بھی بہادری میں مشہور تھا۔ میجر ایبٹ نے اس کی وفات پر انگلینڈ

سے سنگ مرمر کا ایک کتبہ اس کی قبر پر لگانے کے لئے بھیجا تھا جس پر مندرجہ ذیل یادداشت کندہ تھی۔

ترجمہ:۔ بیادگار سعد اللہ خان سید خانی، خان کھلابٹ۔ ناڑہ کا بہادر محافظ جس نے سکھوں کے تین حملوں کا مقابلہ کیا۔ اس نے زندگی مصائب اور تکالیف میں گزاری۔ معزز اور سب سے زیادہ قابل عزت۔ وفات سنہ ۱۸۵۲ء عمر ۹۵ سال۔ یہ پتھر اس کے دوست میجر جیمس ایبٹ نے نصب کرایا۔

نوٹ۔ یہ پتھر اس کی قبر پر نہ لگایا گیا۔ بلکہ بطور خاندانی یادگار خانانِ کھلابٹ کے پاس محفوظ ہے۔

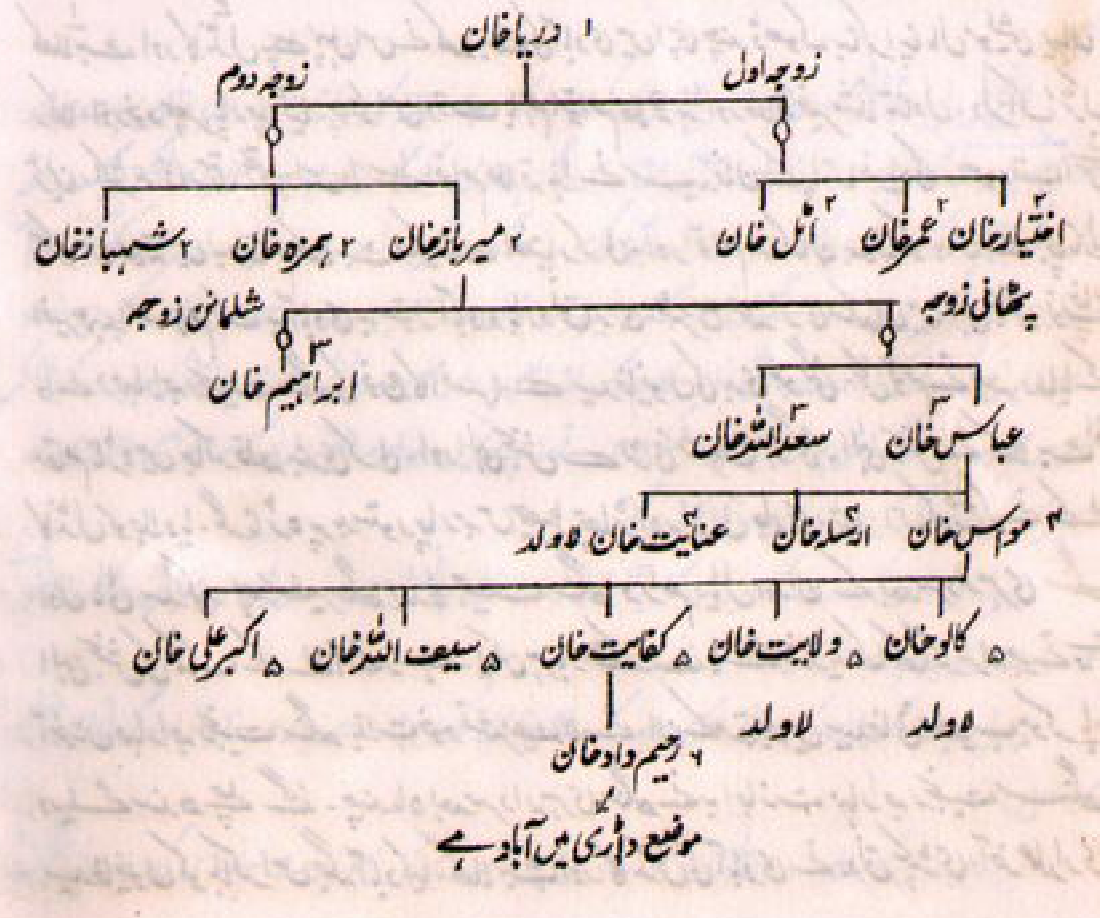
سنہ ۱۸۶۲ء کے بندوبست کے مطابق سید خانیوں کے مورث سید خان نے تین سو سال پہلے (یعنی پندرہ سو عیسوی میں) خالصہ پر بزور شمشیر دخل وارثانہ پایا۔ اسی وقت رقبہ کھلابٹ پر بھی قبضہ کیا۔ اس کی وفات کے بعد کھلابٹ کا گاؤں اور اس کا رقبہ عظمت خان برادر سید خان کو دیا گیا۔ اور باقی رقبہ خالصہ اس کے پسران رضا خان۔ دریا خان۔ مقرب خان۔ بہادر خان۔ قطب خان۔ اور الیپ خان پر مساوی تقسیم کیا گیا۔ یہ علاقہ خالصہ قوم گوجر کا تھا۔ اور وہی یہاں بستے تھے۔ سید خان جب پار دریائے سندھ سے موضع کوٹھہ علاقہ یوسف زئی سے اس علاقہ میں آیا۔ تو اس وقت اس جگہ صرف دو پرانی آبادیاں تھیں۔ کھلابٹ اور کانڈل پہلے پہل اس نے کھلابٹ کی آبادی میں اپنی چند ڈھوک بنا کر اپنا مال مویشی یہاں رکھا۔ اور خود پھر پار چلا گیا۔ چونکہ اس وقت باہم اقوام علاقہ ہذا اور علاقہ غیر مثلاً تناول، دلزاک، ترک و ترین، اکثر بدی رہتی تھی۔ اس واسطے اقوام علاقہ ہذا نے سید خان کے پاس فریاد کی۔ اس وقت اس نے آکر اس علاقہ میں بمقام کھلابٹ سکونت اختیار کر لی۔ اور اقوام ساکنانِ علاقہ کو بدی سے بچا نارہا۔ اخیر عہدِ اسلام تک یہ آبادی بدستور آباد و بارونق رہی۔ شروع عملداری سکھاں میں الٰہی بخش توپخانہ والے (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کا افسر) سے سید خانیوں کی بدی ہوگئی۔ کل قوم نے معہ رعایا کے مقام ناڑہ میں جاکر قلعہ بندی کر لی۔ اور الٰہی بخش سے لڑائی شروع ہوگئی۔ الٰہی بخش نے کھلابٹ اور کانڈل کو جلا دیا۔ مگر ناڑہ پر بدستور چار برس چھیڑ چھاڑ اور لڑائی جاری رہی۔ اس کو فتح کرنے کے لئے اول مائی سدا کور، پھر شیر سنگھ بعدہٗ جمیت سنگھ و رام دیال اور ان کے بعد سردار ہری سنگھ الٰہی بخش کی کمک کے لئے آتے رہے۔ لیکن ہر بار شکست ہائے شدید کھا کر فرار ہوتے رہے آخر میں مہاراجہ رنجیت سنگھ بذاتِ خود تشریف لائے۔ ان کے مقابلہ میں سید خانی مغلوب ہو کر پار دریائے سندھ چلے گئے۔ چند ماہ بعد سردار ہری سنگھ نے بہ اجازت مہاراجہ رنجیت سنگھ سید خانیوں کو بلا کر اس جگہ آباد کیا۔ کھلابٹ اور کانڈل کی آبادی نے رونق پکڑی۔ آخر عملداری

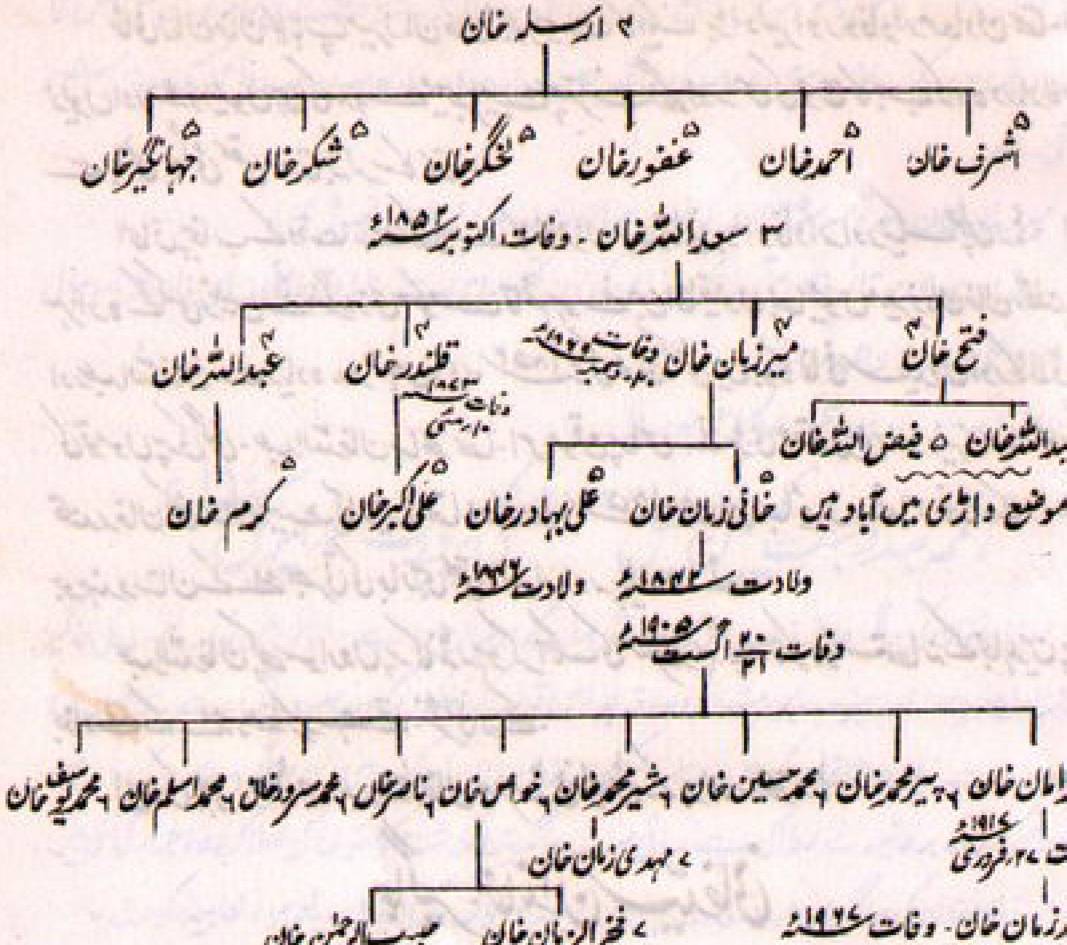
سکھاں میں دیوان مولراج سے لڑائی ہوئی۔ اور لُنڈی مسلمانی ہوگئی۔ اس وقت پھر کھلابٹ جلا دیا گیا۔ اور لوگ موضع ناڑہ پر چڑھ گئے۔ دیوان مذکور سے بدی کار ہے۔ تاوقتیکہ میجر ایبٹ تشریف لائے۔ اس وقت قدرے امن ہوگیا۔ اور اس کی اجازت سے پھر کھلابٹ اور کانڈل آباد کر لئے گئے۔

اس کے بعد چتر سنگھ کی شورش ہوئی۔ اور اولاد سعد اللہ خان، میر باز خانی مفرور ہو گئے اور میجر ایبٹ کے ساتھ کمر بندی کرتے پھرے جب میجر ایبٹ نے پورا پورا قبضہ کر لیا تو ملک میں امن و امان ہوگیا۔ اس کے بعد پھر ان گاؤں کی ویرانی نہیں ہوئی۔

وجہ تسمیہ کھلابٹ۔ کھلابٹ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک اونچا پتھر سیدھا کھڑا تھا جس کا نچلا حصہ زمین میں گڑا ہوا تھا۔ مقامی زبان میں پتھر کو "بٹ" اور کھڑا کو "کھلا" کہتے ہیں اس لئے اس جگہ کا نام کھلابٹ مشہور ہوگیا۔

شجرہ نسب خاندان کھلابٹ





رؤسائے با اختیار و نامی خاندان پنجاب

مؤلفہ کرنل چارلس فرانسس میسی مطبوعہ ۱۸۹۴ء نے خاندان کھلابٹ کے حالات کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

خانی زمان خان سید خانی شاخ اُتمان زئی کا سرکردہ ہے۔ اس شاخ کا مورث اعلیٰ بابا سید خان احمد شاہ درانی کے زمانہ میں کوٹھہ اور ٹوپی (پار دریائے سندھ) پر قابض تھا۔ اس نے اپنے مقبوضات واقع ہزارہ کی حفاظت کے لئے کھلابٹ آباد کیا۔ یہ تنولیوں اور ترینوں سے ہمیشہ لڑتا رہا اور اپنی سرداری ہمیشہ قائم رکھی۔ اور اپنے علاقہ کو رفتہ رفتہ وسعت دی۔

اس کا پوتا سعد اللہ خان سکھوں کے بڑے دلیر مخالفوں میں سے تھا۔ اس نے سردار ہری سنگھ کو بمقام ناڑہ شکست دی۔ میجر ایبٹ نے اس واقعہ کی یاد میں جہاں سعد اللہ خان اور اس کے ساتھیوں نے لشکر فتح پائی تھی۔ ایک سفید منار تعمیر کرایا۔

خانی زمان خان کا باپ میر زمان خان میجر ایبٹ کا ایک بڑا دلیر اور وفادار معاون تھا۔ اتمان زیوں اور مشوانیوں ہی کی مدد سے میجر ایبٹ چتر سنگھ اور اس کی فوج کا جب کہ وہ دربار لاہور سے باغی ہو گئی تھی مقابلہ کر سکا تھا۔

الحاق پنجاب کے وقت سے کھلابٹ کا خاندان سیدخانی بڑا وفادار اور نیک چلن رہا۔ اور ہزارہ کے کسی رئیس نے انگریزی حکومت قائم ہونے میں ان تینوں بھائیوں میر زمان خان، قلندر خان اور عبداللہ خان سے زیادہ مدد نہیں دی۔ ۱۸۵۲ء کی فوج کشی میں جو کاغانی سیدوں اور کالا ڈھاکہ کی قوموں پر کی گئی۔ عبداللہ خان ساتھ تھا۔ اس موقع پر اس نے بڑی عقلمندی اور دلیری سے کام کیا قلندر خان کئی سال ایبٹ آباد میں تھانہ دار رہا۔ ۱۸۵۷ء میں ان بھائیوں نے اس فوج کے واسطے جو ہندوستان کے لئے بھرتی کی جا رہی تھی۔ سوار اور پیادہ دئے۔

عبداللہ خان کچھ سواروں پر کمانڈر ہو کر اٹک کی سرحد پر گیا۔ تاکہ وہ ستھانہ کے مجاہدین پر جو بغاوت کے لئے وعظ کر رہے تھے۔ نگرانی رکھے۔

امبیلہ کی پہلی لڑائی میں عبداللہ خان سر سنڈنی کاٹن کے برابر ساتھ رہا۔

جاگیر۔ خاندان سیّدخانی

۱۸۶۸-۶۹ء کے باقاعدہ بندوبست کے سلسلے میں ڈپٹی کمشنر بیچر (BECHER) نے اپنے ہاتھ سے شجرہ نسب سعداللہ خان و پسران درج کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ کہ گندگر جو کہ ضلع ہزارہ کا قلعہ ہے اس کی چابی میر زمان خان کے پاس ہے جب چتر سنگھ کی بغاوت (۱۸۴۸ء) میں ظاہر ہوئی تو انگریزی افسران نے اپنا کیمپ ناڑہ میں لگایا۔ کیونکہ ایک تو یہ جگہ محفوظ تھی جہاں پر سکھوں کو فیصلہ کن شکست دی گئی تھی اور دوسرے میر زمان خان کی شجاعت اور اس کے خاندان کی مخلص حمایت کا یقین اور بھروسہ تھا۔ سات ماہ تک اس شجاعت واخلاص کی آزمائش کی گئی جب کہ سکھ اور درانی فوجیں عین سامنے فروکش تھیں۔ اور چتر سنگھ اور دوست محمد خان کی جانب سے بہت ہی دل لبھا لینے والی پیش کشیں ہوتی رہیں۔ لیکن میر زمان خان کی شجاعت اور وفاداری میں بال بھر بھی فرق نہ آیا۔ اور جب اس کو سکھوں کے ایک ہزار سپاہی جو قلعہ ہرکشن گڑھ سے نکل کر حملہ آور ہو رہے تھے مقابلہ کے لئے حکم دیا گیا۔ تو وہ تلوار بدست ان پر ٹوٹ پڑا۔ اور ان کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر کے شکست فاش دی۔ یہ ہزارہ کے ایک اہم مقام پر قابض ہے۔ جہاں پر اس کے مقابلہ پر سکھوں اور درانیوں کی

متفقہ فوجیں ٹکرا کر پاش پاش ہوئیں۔ ضلع ہزارہ کا انگریز حاکم گزشتہ جنگ کی تمام مدت میں اس کا مہمان رہا۔ اس کے لئے دو ہزار روپیہ کی جاگیر حین حیات اور بارہ سو روپیہ دوامی کی سفارش کی جاتی ہے۔

میر زمان خان ۲۰ر نومبر ۱۸۶۹ء کو فوت ہوا اور مندرجہ ذیل اولاد چھوڑی:۔

۱۔ پٹھان بیوی جو قائم خان ہتی ساکن پنیاں کی بہن تھی۔ اس سے بڑا بیٹا خانی زمان خان عمر ۲۰ سال دوسرا لڑکا علی بہادر خان عمر ۱۵ سال۔

۲۔ غیر قوم بیوی سے۔ تیسرا لڑکا عمر ۴ سال۔

مہتمم بندوبست کیپٹن ویس (WACE) کی رپورٹ ۱۳ر اپریل ۱۸۷۰ء

میر زمان خان کی جاگیر علاقہ خالصہ ہری پور و تربیلہ کے درمیان میں ہے۔ شمال میں نواب امب کی جاگیر علاقہ تناول ہے۔ اور جنوب میں مشوانی علاقہ جو اس قوم کے ملکوں کو انعام دیا گیا ہے۔ تارخیلیوں کا نصف سے زیادہ علاقہ جاگیر میں ہے۔ لیکن میر زمان خان کی ایک ہی ایسی جاگیر ہے جو کہ ہماری موجودہ حکومت برطانیہ نے عطا کی ہے۔ باقی سب جاگیریں گزشتہ حکومتوں کی عطا کردہ اجرا کی گئی ہیں۔

میر زمان خان کی جاگیریں مواضعات ذیل ہیں بصیرہ، کاگ، کھلابٹ، بادہو، محابیہ، کوٹ۔

میزان کل مالیہ ۲۰۳۶/ روپیہ۔

اس رپورٹ پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اپنی سفارش کمشنر پشاور کو ۱۵ر جون ۱۸۷۰ء میں بھیجتے ہوئے لکھا:۔

میر زمان خان مرحوم جاگیردار ایک مشہور قابل عزت اور وفادار انسان تھا جس نے ہماری حکومت کے ابتدا میں اس ضلع میں میجر ایبٹ کی بے بہا امداد کی۔ اس بات کے کہنے میں کچھ مبالغہ نہیں کہ اگر میر زمان خان اور اس کے خاندان کی بے مثال شجاعت اور وفاداری میجر ایبٹ کے ساتھ نہ ہوتی تو اس کو بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی ان کے ہاتھوں میں امانت تھی۔ اور انہوں نے اس امانت کی عزت و دیانت سے نگہداشت کی۔

یہ رئیس اور قاضی عبدالغفار ساکن سکندر پور میجر ایبٹ کے خاص صلاح کار اور حمایتی تھے۔ میری رائے میں اس کے خاندان کے ساتھ اگر حکومت فراخدلانہ سلوک کرے تو یہ صحیح اور مناسب ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سابقہ شاندار خدمات حکومت کو یاد ہیں اور دوسرے خوانین کو باور

کرایا جا سکے کہ حکومت ایسی خدمات کا صلہ اعلیٰ طور پر عطا کرتی ہے۔

میں اس جذبہ کے ماتحت سفارش کرتا ہوں کہ بڑے لڑکے خانی زمان خان کو اپنے باپ میر زمان خان کی پوری جاگیر عطا کی جائے۔

بموجب خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام ریونیو کمشنر، خانی زمان خان جاگیردار، آنریری مجسٹریٹ، سول جج اور پراونشل درباری ۲۴ اگست ۱۹۰۸ء کو فوت ہوا اور اس کی جاگیر اس کے لڑکے محمد امان خان کو جو رسالہ ۱۹ میں رسالدار تھا، عطا ہوئی۔ خان بہادر محمد امان خان ساکن کھلابٹ جاگیردار اور پراونشل درباری کی وفات ۱۰ فروری ۱۹۱۷ء کو ہوئی اور اس کی جانشینی کے لئے اس کے جوان عمر کے بیٹے محمد زمان خان عمر ۱۰ سال جب کہ وہ ہری پور میونسپل سکول (یہ اب گورنمنٹ ہائی سکول ہو گیا ہے) میں زیرِ تعلیم تھا۔ کی سفارش ہوئی۔ سفارش میں تحریر کیا گیا کہ وہ تعلیم یافتہ اور ذہین ہے۔ اور پختہ عمر ہونے پر اتمان زیوں کے چیف ہونے کے فرائض بوجہ احسن ادا کرے گا۔ (اور یہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ ش ب)

قلندر خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ نے ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک پیادہ لیوی (LEVY) میں اور اس کے بعد ۱۸۶۹ء تک پولیس میں خدمت کی۔ وہ ۱۰ مئی ۱۸۷۳ء کو فوت ہوا۔

عبداللہ خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ ہری پور کا کوتوال رہا۔

فضل خان اتمان زئی (سید خانی) ساکن ٹوپی ضلع مردان کو خدمات کے صلہ میں سکھوں نے موضع مراد آباد و گہر خان بطور جاگیر دئے۔ جس کی مالیت ۱۷۳۲/ روپیہ تھی۔ فضل خان نے یہ جاگیر ۲۰ سال کھائی اس کے بعد میر غزن خان پسرش نے ۱۰ سال کھائی۔ سرکار انگریزی نے اس جاگیر کو جاری رکھا۔

زمانہ حال میں قوم سید خانی کے نامور افراد (۱) خان بہادر محمد زمان خان مرحوم بن محمد امان خان بن خانی زمان خان مدبر صاحب الرائے انسان تھے۔ حکامِ وقت۔ انگریزی و عہد پاکستان، میں صاحب اثر تھے۔ ہزارہ میں چیف آف اُتمان زئی تھے۔ مگر مزاج منکسرانہ اور طبیعت سادہ تھی۔ سیاست ملکی پر خوب نظر تھی۔ پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ گفتگو مدلل، پُر از حکمت اور موثر ہوتی تھی۔

۲۔ خان فخر الزمان خان بن ناصر خان بن خانی زمان خان آپ خاموش، سنجیدہ، متین اور خوش اخلاق انسان ہیں پاکستان کے C.S.P میں ۱۹۶۶ء سے کُرم ایجنسی میں پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔

۲۔ خیل تارخیلی (طاہر خیلی) یہ قوم اُتمان زئی تپہ علی زئی سے ہیں۔ طاہر خان مورث اعلیٰ کے نام سے طاہر خیلی مشہور ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے دور سے قدرے پیشتر ۱۷۴۷ء میں ان کا دخل علاقہ جات کھلابٹ و گندگر میں ہوا۔ پہلے ان علاقہ جات پر قبضہ قوم سلیمانی (شلمانی)

نوٹ۔ سلیمانی عرف پٹھان کو کہتے ہیں۔

دقوم بلعادری کا تھا۔ رہن، بیع و غلبہ وغیرہ سے اس قوم نے دخل پا لیا۔ احمد شاہ درانی کے عہد میں بلند خان پسر طاہر خان پانی پت کی لڑائی میں حاضر اور خدمت گزار رہا۔ اس کا لڑکا فتح خان بھی معزز آدمی ہوا ہے۔

یہ قوم علاقہ کھلابٹ و گندگر ضلع ہزارہ اور ہرو ضلع راولپنڈی پر از روئے وراثت و حکومت قابض تھے۔ عملداری سکھاں کے چند سال بعد گندگر و کھلابٹ ان کی سالم ملکیت رہی۔ لیکن ہرو سے نصف پیداوار سرکاری ہو گئی۔ شاہانِ سلف سے عہد سکھاں تک وراثت ملک مکمل طور پر ان کی تھی۔ اور کچھ مالیہ وغیرہ نہ دیتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں شورش چتر سنگھ میں خانی زمان خان و غلام محی الدین بمعہ دیگر خوانین کے وراثت سے بے دخل ہو گئے۔ اور کرم خان پسر خانی زمان خان چند سال قید رہ کر بھی اپنی وراثت سے بے دخل پھرتا رہا۔ خانی زمان خان پار دریائے سندھ علاقہ غیر چلا گیا اور وہیں فوت ہوا۔ بندوبست ۱۸۶۴ء میں سرکار انگریزی نے وراثت واپس کی۔ لیکن جاگیر بدستور ضبط رہی۔ ہندوستان و خراسان کی بڑی شاہ راہ اس قوم کی سکونت سے گزرتی تھی۔ اور ان کا اس علاقہ کے سفر و تجارت پر قبضہ و استیلاء رہا۔ اور ان کے حملے ضلع ہزارہ و ضلع راولپنڈی پر ہوتے رہے۔

شاہانِ چغتائی کے وقت یہ اس علاقہ میں موجود نہ تھے۔ ان کا مکمل دخل سلطنت درانی کے عہد میں ہوا۔ ہزارہ گزیٹیر ۱۹۰۷ء میں تحریر ہے کہ اگرچہ یہ اُتمان زیوں کی شاخ ہے لیکن ان کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ان کے رسوم و عادات اُتمان زیوں سے مختلف ہیں۔ ان میں ترکہ کی تقسیم پگ ونڈ کے اصول پر ہے۔ حالانکہ ہزارہ کے اُتمان زیوں کی تقسیم چونڈا ونڈ پر ہے۔

ان کا خان خانی زمان خان سکنہ کو ٹھیرہ تھا۔ لیکن بغاوت کی وجہ سے اُس کی خانی جاتی رہی۔ اس قوم میں اچھا خاندان محمد خان سکنہ خربانڈہ کا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے وہ فاتر العقل ہے۔

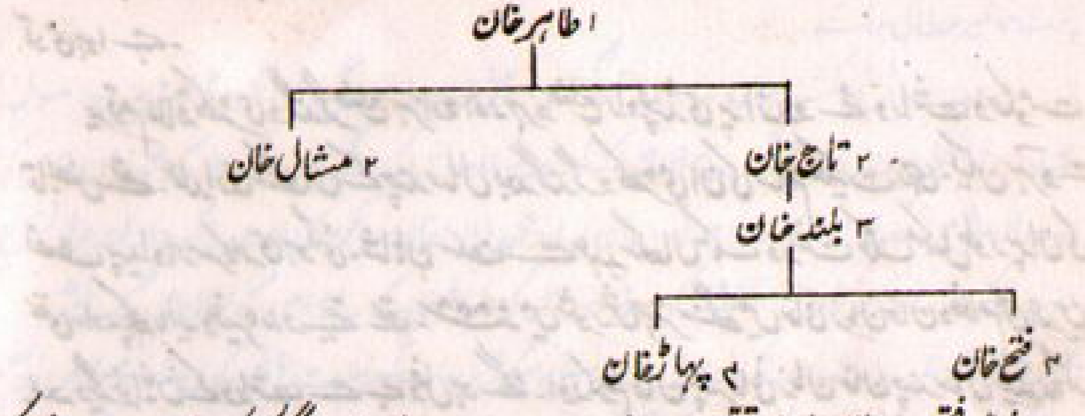
نوٹ ۱: اس قوم میں افغانی مساوات و برادری کا ایک ایسا نظام ہے جو کسی اور پٹھان قوم میں نہیں۔ اس قوم کا ہر فرد بحصہ مساوی جاگیر میں حصہ دار ہوتا ہے۔ بخلاف دوسرے افغان اقوام جن میں بڑا بھائی ہی سالم جاگیر کا مالک ہوتا ہے۔

۲۔ ۱۸۷۲ء میں بموجب تاریخ ہزارہ یہ قوم گھر میں پشتو زبان بولتی تھی۔

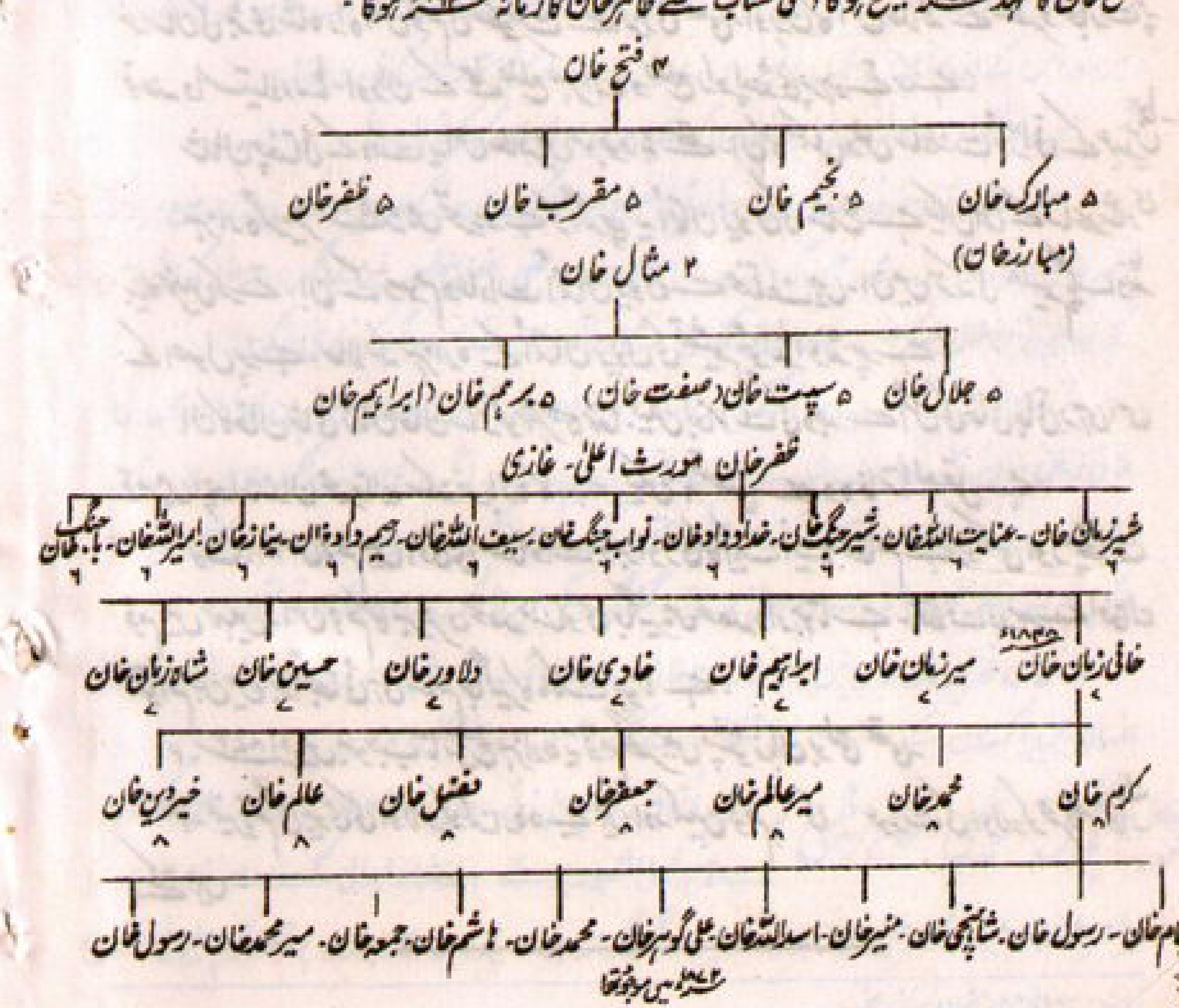
۳۔ غیر قوم کی بیوی کی اولاد کو گزارہ دیتے ہیں اور کمین قوم کی عورت کی اولاد کو محروم الارث رکھتے ہیں۔

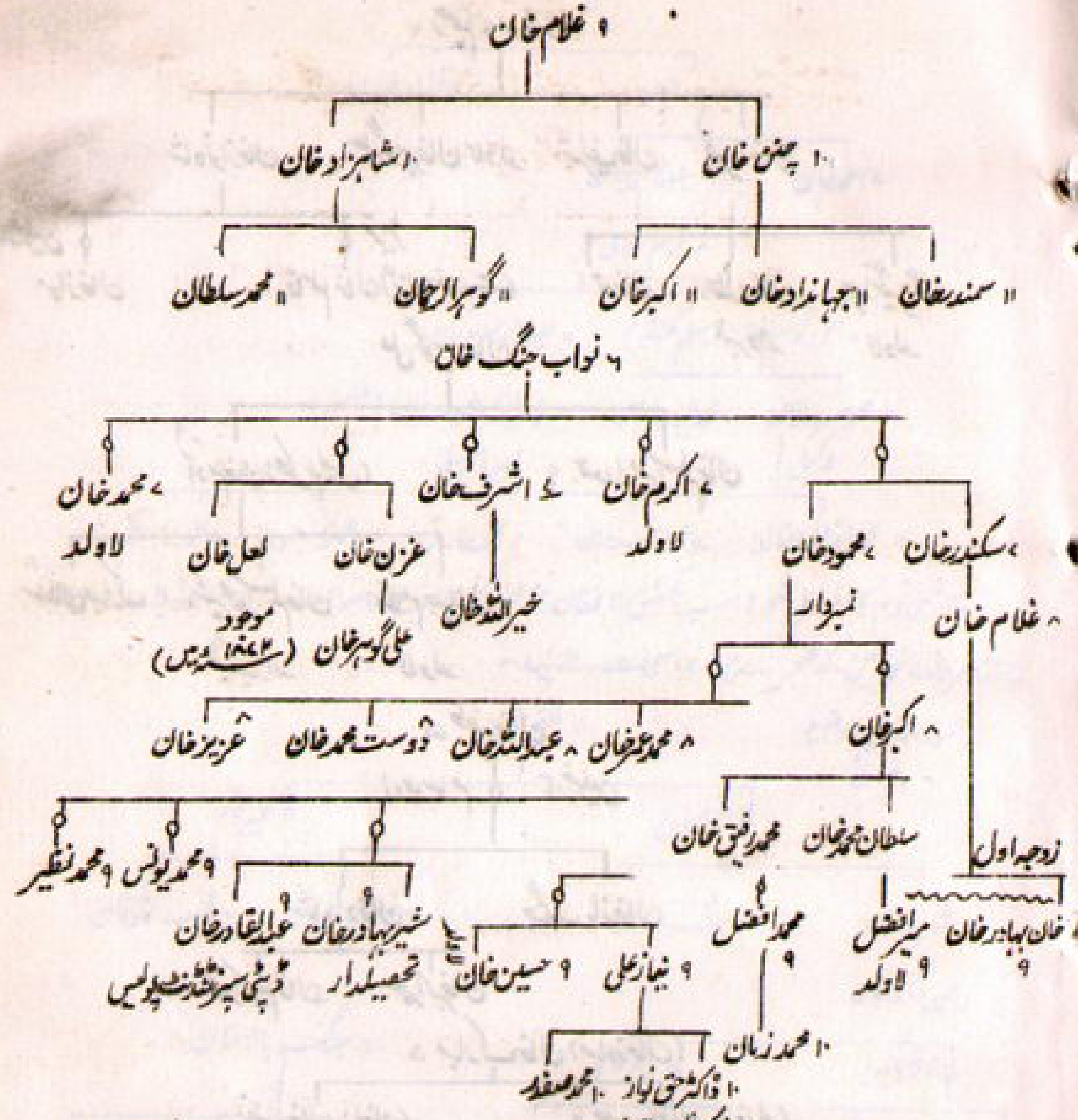
طاہرخیلی

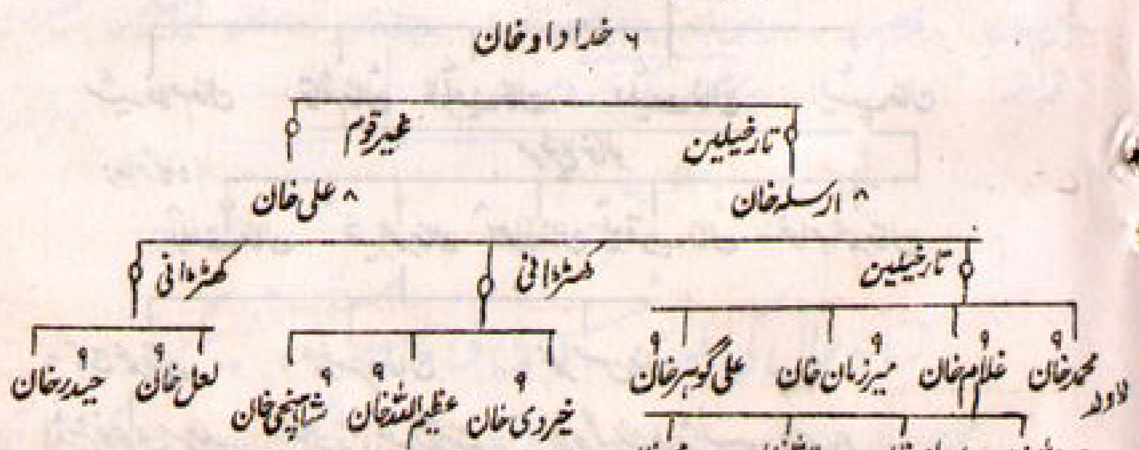
شجرہ نسب — ماخوذ از کاغذات بندوبست ۱۸۷۲ء



نوٹ - فتح خان ۱۸۶۳ء میں قتل ہوا یہ غلط معلوم ہوتا ہے یہ ۱۷۶۳ء ہو گا کیونکہ خانی زمان خان تارخیلی کا عہد ۱۸۴۳ء ہے اور وہ طاہر خان کی آٹھویں پشت میں ہے - ایک صدی میں چار پشت کے حساب سے فتح خان کا عہد ۱۷۶۳ء صحیح ہو گا اسی حساب سے طاہر خان کا زمانہ ۱۶۶۳ء ہو گا -







۶ رحیم داد خان
- شاہ نواز خان
  - تارخیلین: موازخان
  - تریٹر: قاسم خان (گزارہ خور ہے)
    - علی گوہر خان
      - آدم خان (محکمہ پولیس)
        - سلطان مبارک
        - شیر محمد اسلم خان — ٹھیکیدار
        - غلام جیلانی — لاولد
      - ۹ جمعدار میر اسلم خان
- علی گوہر خان لاولد
- شریف خان
- فیروز خان
  - احمد خان
  - جمال خان — نمبردار
  - جہانگیر خان — لاولد

۵ ظفر خان
- زوجہ سوم تارخیلین
  - شاہداد خان
    - محمد اکرم خان
    - محمد اکبر خان
  - جنگ باز خان

۵ مبارک خان (مبارز خان)
- ۶ نصیر خان (بغداد)
- ۶ حبیب خان (خالو)
  - شہید غلام خان (عامگاہ)
  - قاسم خان
  - ظریف خان
  - لطیف خان
  - الیپ خان

موضع خالو
- یوسف خان
- شیر محمد خان
  - ۹ تاج محمد خان — ایڈیٹر نوجوان سرحد
    - ۱۰ رضا علی
    - ۱۰ محمد مشتاق
  - ۹ محمد خسرو خان — پنشنر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس
  - ۹ محمد احسن خان — منیجر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس
- اجون خان
- یعقوب خان
- خواجہ محمد خان

۵ مقرب خان
- سعادت خان
  - ۷ احمد خان
  - ۷ عطا محمد خان
    - ۸ کرم خان
      - ۹ علی گوہر خان (اسسٹنٹ کمشنر)
        - ۱۰ محمد مسعود خان — وکیل
        - ۱۰ محمد ایوب خان
        - ۱۰ عبدالرشید خان (علیگ) — ممبر اسمبلی
          - ۱۱ محمد اقبال خان
          - ۱۱ محمد اسد خان
          - ۱۱ محمد طارق
          - ۱۱ محمد مسعود
          - ۱۱ محمد راشد
      - ۹ عبدالرحمن خان
- ۶ آزاد خان

تارخیلی قوم کا مفصل شجرہ نسب تحقیق الافغان مؤلفہ سمیع اللہ جان صاحب ساکن ڈھوڈیال مانسہرہ میں ہے چند معروف خوانین کے شجرے میں نے اسی سے لئے ہیں۔

۵ ظفر خان — صورت دیہی موضع بھائی
- تارخیلین
  - ۶ شاہداد خان
    - ۷ سیرداد خان
      - تارخیلین
        - ۸ اکرم خان — نمبردار
        - ۸ غلام خان
      - غیر قوم
        - ۸ خواص خان
        - ۸ عباس خان
        - ان کا گزارہ کھوئی درہ میں ہے
  - ۶ جنگ باز خان
- غیر قوم
  - ۶ نصراللہ خان
  - ۶ مجیب اللہ خان

۶ جنگ باز خان
- سرانداز خان
  - تارخیلین: ۸ جہانداد خان
  - غیر قوم: ۸ کالا خان
- زرداد خان
- میر افضل خان
- عظیم خان
  - موسیٰ خان

زمانہ حال کی طاہر خیلی کی نامور شخصیتیں

۱۔ محمد عمر خان مرحوم نمبردار غازی۔ یہ عالم شخص تھے۔ اور زندگی عزت و وقار سے گزاری۔ آپ

کتابوں کے عاشق تھے اور اپنے علاقہ میں عزت و وقار سے دیکھے جاتے تھے۔ چند سال نواب امب کے وزیر رہے۔ اپنے علم و تجربہ سے ریاست کی خدمت و تعمیر کی۔

۲۔ **شیر بہادر خان** مرحوم ولد محمد عمر خان مرحوم ساکن غازی۔ آپ علم دوست باپ کے قابل ترین فرزند تھے۔ آپ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ تعلیم کے بعد تحصیل دار ہوئے۔ اغلباً سنہ ۱۹۱۴-۱۵ء میں وانا جنوبی وزیرستان میں تھے۔ کہ راستہ میں تانگہ پر جاتے ہوئے مسعود قوم کے چند افراد نے آپ کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ آپ کی فطانت اور قابلیت کے والد مرحوم اتنے گرویدہ تھے کہ میرا نام بھی ان کے نام پر رکھا۔

۳ – ان کے دوسرے بھائی **عبدالقادر خان** مرحوم پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے پنشن پر آئے۔ ایک فرشتہ سیرت انسان تھے اور محکمہ پولیس میں رہ کر اس دیانت اور شرافت سے وقت گزارا کہ آج تک ان کا نام زبانوں پر ہے۔ سنہ میں اپنے گاؤں غازی کی سڑک کے کنارے پر کھڑے تھے کہ موٹر لاری کی ٹکر سے زخمی ہو کر فوت ہوئے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

انہوں نے اپنے بھائی شیر بہادر خان صاحب مرحوم کی کتابوں سے الہلال کے مجلدات، میری درخواست پر مجھے عنایت کئے۔ جو میرے پاس ہیں اور اس علم پرور و شریف خاندان کی یاد تازہ رکھتی ہیں۔ خدا ان سب کو جنت الفردوس عنایت فرمائے۔

۴۔ **محمد سرور خان** ۔ آپ بہت ذہین قابل اور ہمدرد قوم انسان تھے۔ سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنے۔ اور انہی ایام میں ہری پور میں تعینات ہوئے۔ ملازمت میں جی نہیں لگا۔ چھوڑ کر سیاست میں داخل ہوئے سنہ ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ آپ نے اسمبلی میں اپنی ڈیموکریٹک پارٹی بنائی۔ آپ اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر بن گئے۔ چونکہ نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اپنی وزارت میں کوئی ممبر ہزارہ سے نہ لیا۔ لہٰذا آپ کی پارٹی نے حزب اختلاف (کانگرس پارٹی) سے مل کر وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا۔ اور سر صاحبزادہ مرحوم کو استعفا دینا پڑا۔

۵۔ **تاج محمد خان** ۔ حب قومی و وطنی سے سرشار ہیں۔ تیس چالیس سال سے ایک جانباز کی طرح سیاسی حالات پر اپنے ہفتہ وار اخبار "نوجوان سرحد" (جس کے وہ خود مدیر ہیں) میں تبصرہ و تنقید کرتے رہتے ہیں۔ اور حق کی بات یہ ہے کہ ان کا وجود قوم و وطن کے لئے اس قحط الرجال میں بہت غنیمت ہے۔

ان کے ایک صاحبزادہ مسٹر رضا علی، نامور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔ اور سائنس کی تعلیم میں بہت اونچی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اور امید ہے کہ وہ دنیا میں ایک نامور سائنسدان بنیں گے نوجوانی میں پختہ کار انسان ہیں۔

۶۔ **محمد احسن خان** برادر تاج محمد خان ایک شریف ہمدرد قوم و وطن انسان ہیں۔ پہلے کواپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر تھے۔ اور آج کل گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سرحد کے منیجر ہیں۔

۷۔ آخر میں تارخیلی قوم کے ہونہار قابل اور شریف انسان کا نام تحریر کرتا ہوں جس نے اپنی جوانامرگی میں خاندان، قوم اور ہزارہ کو سوگوار کر دیا۔ یہ کیپٹن اسد خان پسر محمد سرور خان طاہر خیلی ہیں۔ پہلے فوج میں تھے امتحان مقابلہ میں سول سروس کے لئے منتخب کئے گئے۔ اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ آخر کار پولیٹیکل ایجنٹ گلگت تھے کہ سنہ ۱۹۶۰ء کے آغاز میں راولپنڈی سے بذریعہ ہوائی جہاز گلگت جا رہے تھے کہ جہاز کاغان کے سربفلک پہاڑوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اور وہ بھی جاں بحق ہو گئے۔ ہ

پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

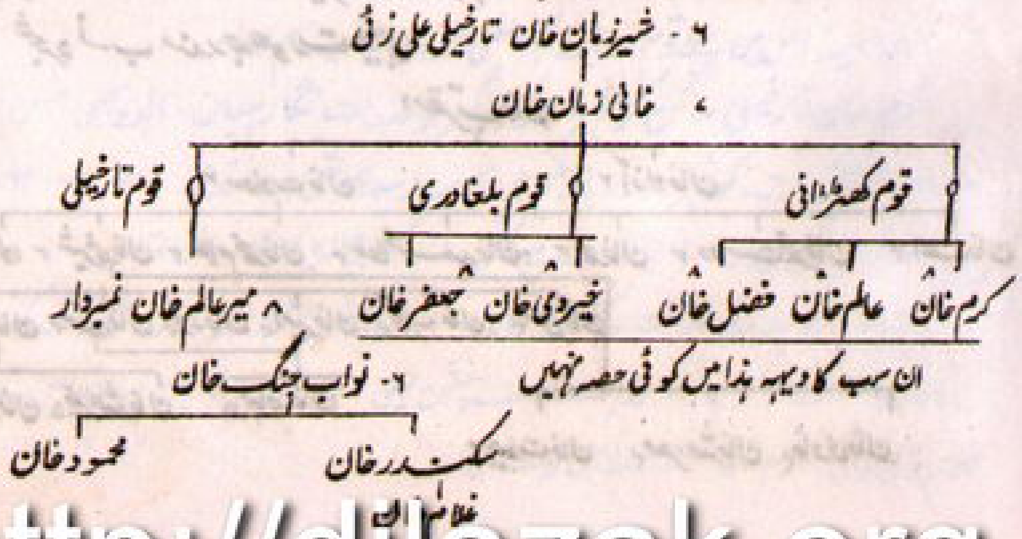
قوم طاہر خیلی کے بعض دیہات کے حالات

موضع غازی ۔ اس گاؤں میں مغل (گوت برلاس) اور گوریا بھی آباد ہیں۔

احمد شاہ ابدالی کے وقت سے تارخیلی تا حال وارث و قابض ہیں۔ آبادی اس گاؤں کی بہت پرانی ہے۔ پائندہ خان پارک زئی نے اس گاؤں کو جلایا۔ پائندہ خان کے چلے جانے کے تین چار دن بعد تارخیلی پھر آ کر آباد ہو گئے۔

کسی مغل نے یہ گاؤں بنام بہادر قوم خود آباد کیا لہٰذا بنام غازی نامزد ہے۔ پرانی وراثت اقوام برلاس (مغل) اپنی بیان کرتے ہیں۔ تارخیلی احمد شاہ ابدالی کے وقت سے دخیل ہوئے۔

• صورت دیہی موضع جلو کے شجرہ نسب کا اندراج



موضع جبوٹوں۔ پہلی آبادی مسمی جبوٹوں خان قوم بلعادری نے کی تھی۔ اسی کے نام سے مشہور ہے۔

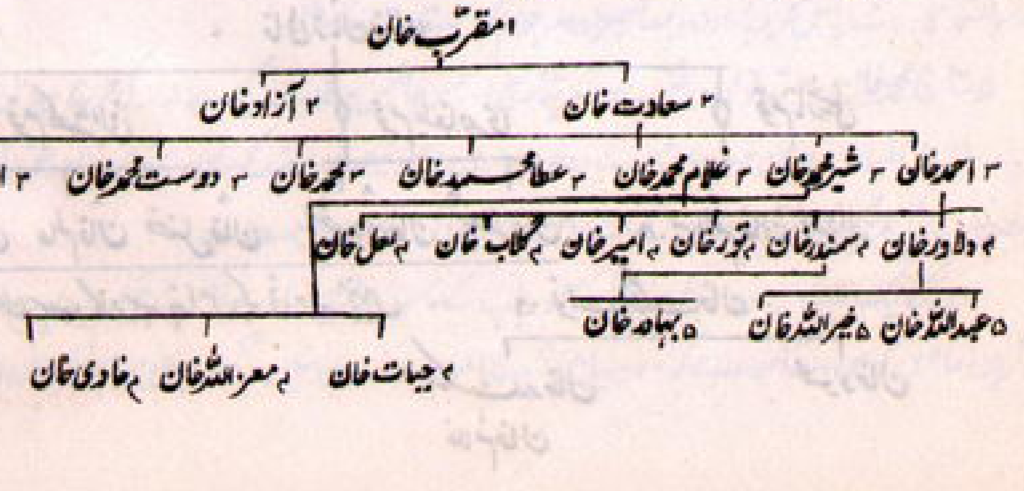
سلم کھنڈ۔ بہت پرانی آبادی ہے۔ جس وقت یہ گاؤں بقبضہ قوم تارخیلی آیا تو یہ آباد تھا۔ ۱۸۳۶ء میں فتح خان تارخیلی کو پائندہ خان نے قتل کر دیا۔ تو اس نے یہ گاؤں جلا دیا۔ ساکنان فرار ہو گئے۔ اس کے جانے کے بعد پھر وہ آ گئے اور آباد ہو گئے۔ اس وقت سے تا عملداری سکھاں آباد چلا آیا ہے۔ اور اقوام تارخیلی پندرہ برس تک خرباڑہ میں رہنے کے بعد آ کر اس میں آباد ہو گئے۔ عملداری سکھاں میں آبادی پرانی ویران کر کے موقع حال پر آبادی کی۔ کیونکہ وہاں پر غنیم سے بچاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ وہ نسبتاً پہاڑ میں تھا...... سردار منگل سنگھ نے سنہ ۔۔ بکرما جیتی میں یہ گاؤں جلا دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد پھر آبادی ہو گئی۔ پھر بی بی سدا کور نے جلایا.... اس کے بعد سردار ہری سنگھ نے جلایا.... اس کے بعد سردار لہنا سنگھ نے جلا دیا..... پھر سردار تیجا سنگھ نے بہمراہی خان زمان خان تارخیلی جلا دیا..... پھر سردار جتر سنگھ نے جلایا۔ اس کے بعد سے اب تک آباد ہے۔

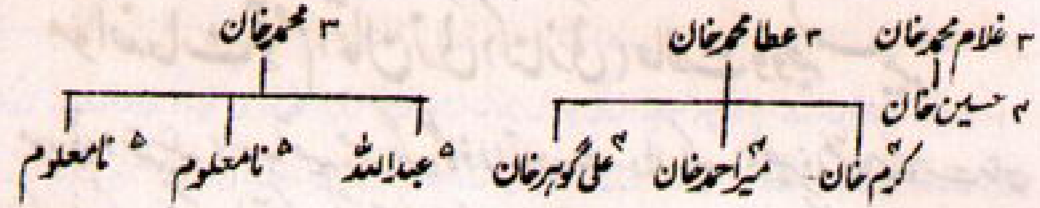
سرکار دولت مدار کے وقت میں درہ ۱۸۵۱ء، ۱۸۵۲ء تربیلہ شیخاں، ۱۸۵۳ء مجھیاری گوجراں ۱۸۶۲ء سرائے سیدو دلازاک بانڈہ جات آباد ہوا۔

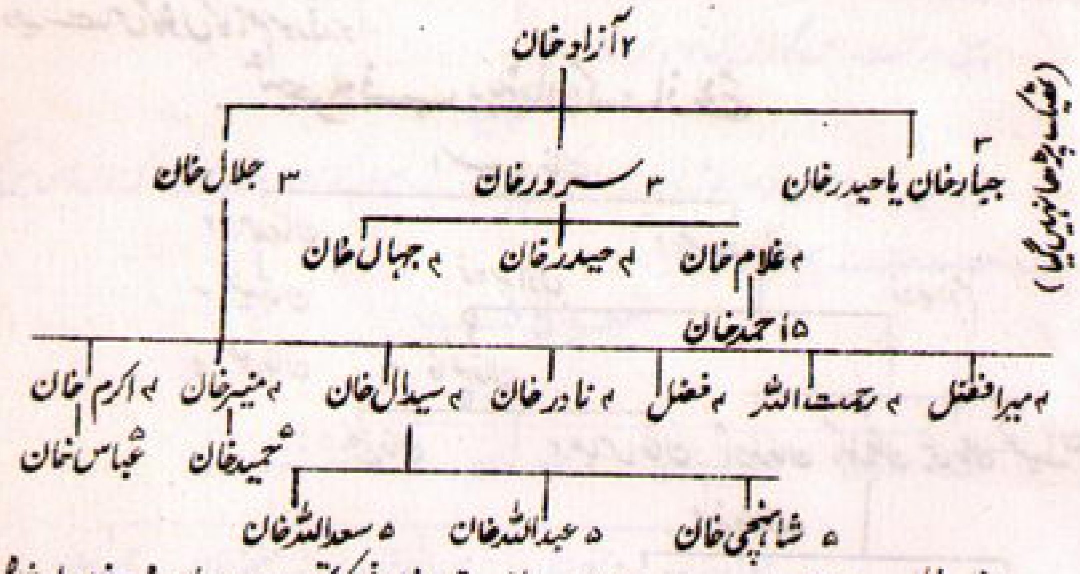
وجہ تسمیہ:۔ یہاں سمل کا ایک درخت تھا۔ آبادی کا نام سمل کھنڈ کے بجائے سلم کھنڈ مشہور ہوا۔ اس کا رقبہ پرانی آبادی کا ہے۔ اس کا رقبہ جدا نہیں۔ اور گرد پرانی ہندوؤں کی آبادی کے آثار ہیں۔ مثلاً کافر کوٹ... بت بھی نکلتے ہیں۔ پرانا نام سمرقند بھی سنا جاتا ہے۔ شاید سمرقند سے سلم کھنڈ بن گیا ہو۔

پرانے وارث اس گاؤں کے اقوام لودی و قاضیاں ہیں جن کی اولاد اب تک موجود ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے وقت سے یہ گاؤں بصیغہ جاگیر و دیگر مواضعات علاقہ گندگر بلند خان تارخیلی کو ملا۔ تو وہ دخیل ہو کر اشان وغیرہ سکنائے دیہہ سے معاملہ وصول کراتا رہا۔

شجرہ نسب مندرجہ صورت دیہی







موضع ڈل۔ علاقہ تربیلہ ۔ دیہہ ہذا اصل وراثت قوم شلمانی کی تھی۔ ان سے بعہد محمد شاہ بادشاہ کے ہمارے مورث داراشاہ اکازئی نے بعوض دس ہزار روپیہ کے زر خرید کی۔ وجہ تسمیہ معلوم نہیں۔

خرباڑہ علاقہ گندگر۔ قوم تارخیلی علی زئی کا گاؤں ہے۔

حال آبادی۔ جب فتح خان بزرگ ہمارے کو وراثت ملی تو اس نے یہ رقبہ موضع عیسیٰ سے جدا کر کے آبادی اس کی شامل موضع پیپلالہ کی جو پرانا گاؤں تھا، کرائی۔ پھر فتح خان بزرگ پائندہ خان بارکزئی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور اس نے موضع کو بھی شامل کل علاقہ جلا دیا۔

وجہ تسمیہ۔ اس میں پہلے قوم خرباڑہ آباد تھی اس واسطے یہ نام ہوا۔

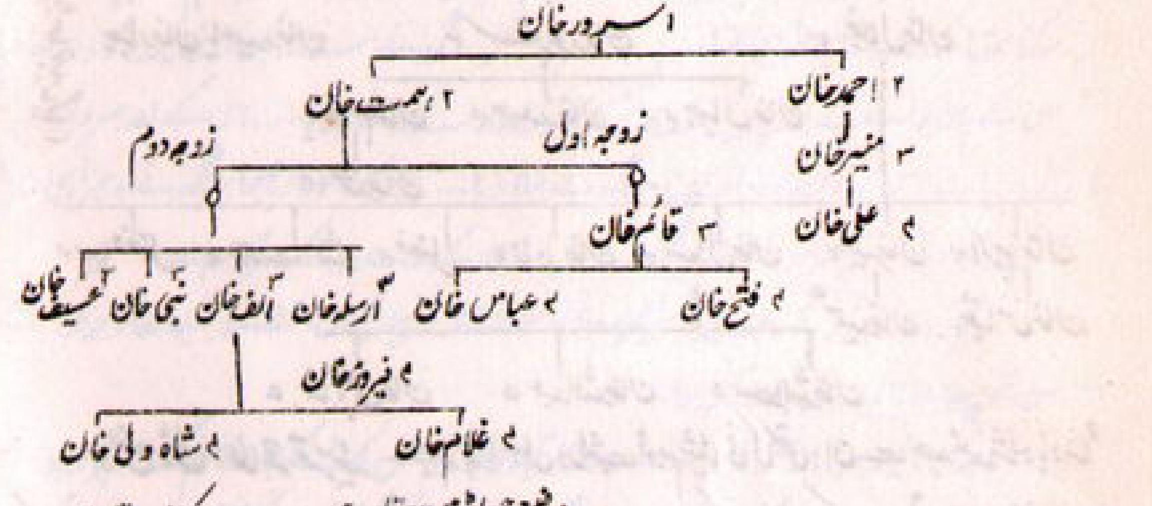
کرم خان تارخیلی ساکن کوٹھڑہ کی جاگیر مواضعات نگارچیاں۔ الدوجبی۔ حسن پور۔ صوبڑہ۔ تھلی کوٹ۔ کوٹھڑہ اور بانڈہ میں بحصہ رسدی تھی اور نقدی 0-15-2095 اور غلہ 1823 روپیہ کل میزان 3882 روپیہ تھی۔ اس کا بڑا لڑکا غلام خان تھا۔

کرم خان کو غدر کی خدمات کے صلہ سالانہ ۱۰۰۰ کی پنشن ۱۸۵۸ء میں ملی تھی۔ اس کی وفات ۱۱ر جنوری ۱۸۶۷ء کو ہوئی۔ اور اسے نصف پنشن یعنی ۵۰۰ سالانہ تاحین حیات اس کے لڑکے غلام خان کو ملی۔ غلام خان ۱۸۸۶ء میں فوت ہوا۔

مواضعات قوم اُتمان زئی (کنازئی) حالات ووجہ تسمیہ

موورتی (تربیلہ) وجہ تسمیہ جس جگہ یہ گاؤں آباد ہے۔ وہاں ایک ڈھیری تھی اس کو ہمت خان نے ہموار کرنے کے لئے کھودا۔ تو ایک مُورت یعنی بُت ہنود کا ملا۔ ہمت خان نے اس کو توڑ ڈالا۔ اس مورت کی وجہ سے اس گاؤں کا نام موورتی ہوا۔

شجرہ نسب۔ پٹھان کنازئی



موضع جھاڑ میں رہتا ہے　　　　کیا میں رہتا ہے

گوجرا (تربیلہ) یہ تپہ گوجر پرانے وارث ہیں۔ جب اکبر بادشاہ نے ملک اٹک کا قوم ترین دگوجر سے لے لیا۔ اور یہ رقبہ تربیلا کا اُن کو اس کے عوض دیا۔ تب ان کا بزرگ محمد جوگی اس ملک میں آیا اور اس نے یہ آبادی معروف گوجرا آباد کی۔ اور تیسرا حصہ تربیلہ سے تقسیم کر کے اس نے اسے قبضہ میں کیا۔ اس طرح کہ بادشاہ نے تہائی سلیمانیوں کو۔ اور تہائی ترینوں کو اور تہائی گوجروں کو دی۔ اور زمین اس طرح پر تقسیم کرتے تھے کہ قطعات اس کے باعتبار مساوی کامل ہوں۔

جٹو (تربیلہ) وجہ تسمیہ۔ جٹو نامی ہندو جو حکام وقت کی طرف سے کاردار اس ملک کا تھا۔ قوم شلمانی نے اس جگہ پر مار ڈالا تھا۔ تب سے یہ جگہ قتل جٹو کے نام سے مشہور ہوئی جب گاؤں آباد ہوا تب بھی وہی نام جٹو ہوا۔

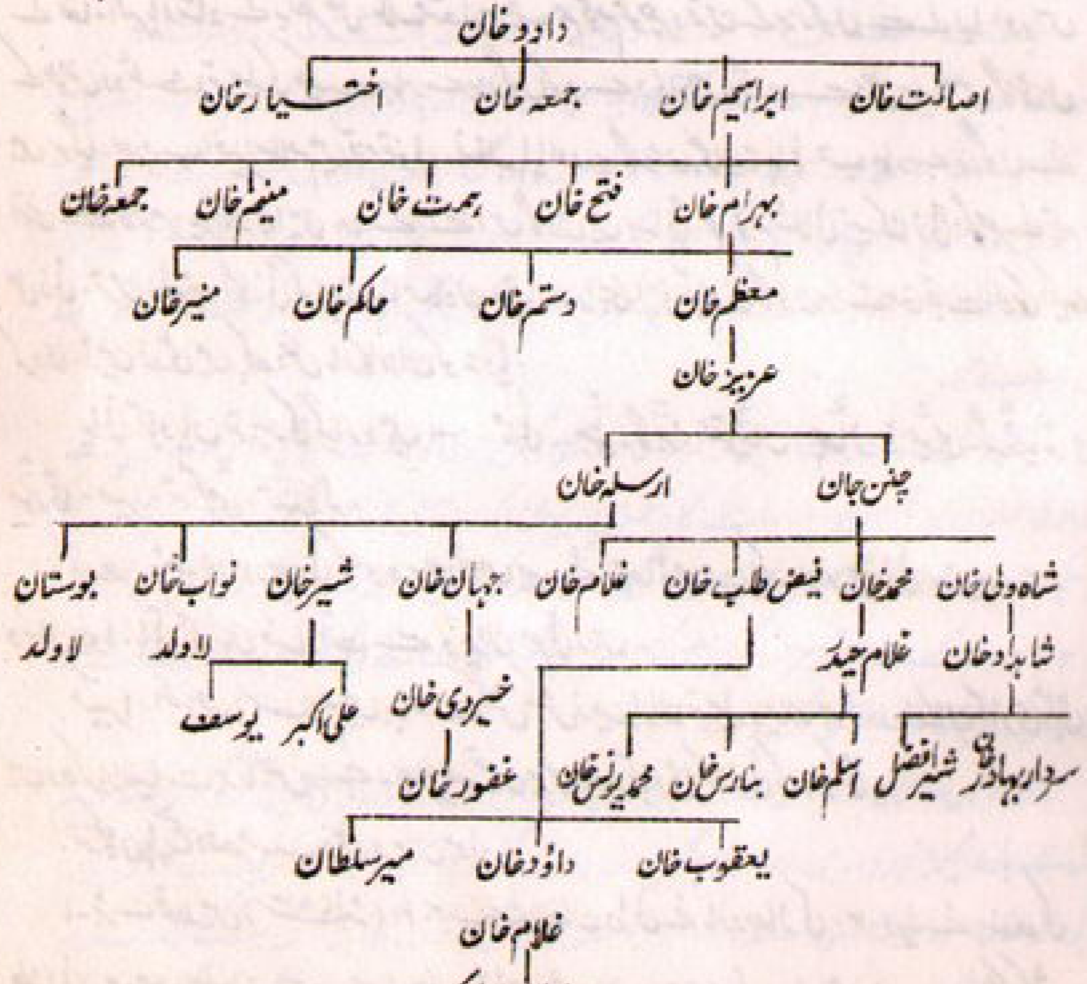
پرانی آبادی اس گاؤں کی قوم ترین کی ہے۔ جو اس وقت تک آباد ہیں۔ حسب تشریح مندرجہ کیفیت عام موضع گوجرہ جس وقت قوم اکازئی، کنازئی و علی زئی تینوں تپہ پار دریائے سندھ سے قریب عملداری اکبر بادشاہ حسب درخواست قوم سلمانی، گوجر و ترین کے اس ملک میں آئے۔ اس وقت ان چھ قوموں کے درمیان یہ اقرار ہو

گیا تھا۔ کہ بشرط دفع ہو جانے قوم تنولی کے زمین زرعی اصل وارثان کی ہوگی اور زمین سکنی پر یہ تینوں تپے آمدہ از پار دریا قابض رہیں گے۔ چنانچہ شرط ان کی پوری ہوئی۔ یعنی قوم تنولی اٹھا دی گئی۔ اُس وقت اس گاؤں میں جس قدر ترین آباد تھے۔ اُس قدر زمین سکنی ان کے قبضہ میں رہی۔ اور باقی زمین سکنی پر قوم اکازئی بموجب وعدہ کے قابض ہوئے۔ اور زمین زرعی قوم اکازئی نے قوم ترین، گوجر و سلمانی سے قیمتاً خریدی۔ پہلی وراثت اس گاؤں میں قوم ترین کی ہے۔

لقمانیا

وجہ تسمیہ۔ مسمی لقمان قوم بجوڑی نے اس کو پہلے آباد کیا۔ اس کے نام پر لقمانیا ہوا۔ کنازئی اس میں آباد ہیں۔ اصالت خان نے پہلے آکر یہاں آباد کی۔

شجرہ نسب



نوٹ۔ ۱۔ شاہ ولی خان کی بہن امیر خان ولد عبدو خان پنجی کی بیوی تھی
۲۔ منیر خان بنی کی بہن معظم خان تربیلہ کی بیوی تھی

موضع تربکھی (تربیلہ) یہ گاؤں اصل میں وراثت قوم شلمانی تربیلہ والوں کے تھا۔ ان سے طاہر خان موروث قوم نے زرخرید کرکے اپنی وراثت میں کر لیا۔ اس کے دو فرزند ہوئے۔ بڑا بیٹا تاج خان علاقہ گندگر میں چلا گیا۔ اس کو اس گاؤں سے کچھ حصہ نہ ملا۔ کُل گاؤں بقبضہ مشال خان پسر دوم طاہر خان کے آیا۔۔۔۔۔

شجرہ نسب

طاہر خان

تاج خان — مشال خان

مشال خان: جلال خان — سپت خان — برہم خان

نوٹ۔ گوجر۔ دلازاک و چھچلاک بھی طاہر خان نے لاکر آباد کئے۔

موضع جھاڑ (تربیلہ) نقل از صورت دیہی ۔ یہ گاؤں پرانی وراثت ہم قوم شلمانی ٹاہلی والوں کے تھا۔ اکبر بادشاہ نے بہ نظر ملکی، ملک متعلقہ اٹک ہم قوم گوجرو ترین کے بزرگوں سے لے لیا۔ اور اس کے عوض دو ثلث تربیلہ کی ملکیت ہمارے بزرگوں کو دے دی۔ اس وقت سے دخل ہمارا اس گاؤں میں ہو گیا۔ پھر جب اخیر اسلام میں قوم تنولی نے غلبہ پایا اور یہ گاؤں بھی لینا چاہا۔ تب ہمارے بزرگوں نے اتمان سے لاکر مزید آبادی اپنی مدد کے لئے اس گاؤں میں بسائی۔ ہم قوم شلمانی تپہ کنازئی، گوجر نے تپہ علی زئی۔ ترین نے تپہ اکازئی کو اپنا اپنا معاون بنایا۔ اور اپنی اپنی آبادی گاؤں برائے حفاظت ان کی ملکیت کردی۔ زمین زرعی میں کچھ دخل مالکانہ ان کو نہ دیا۔

پرانی آبادیاں تربیلہ کی گیارہ ہیں:۔ ٹاہلی۔ جٹو۔ گوجرؔ۔ لقمانیاں۔ جھاڑ۔ ڈھیری۔ گدڑ باندی موری۔ میرا۔ تربکھی۔ تندولہ۔

نوٹ۔ ڈھیری اور موری کبھی ویران نہیں ہوئے۔ جھاڑ صرف ایک دفعہ طغیانی سندھ سے ویران ہوا۔ باقی آبادیاں فسادات سے ویران ہوتی رہیں۔

میرا۔ اخیر عہد اسلام میں بباعث کش مکش زمینداران تربیلہ ویران ہوا اور مالکان آبادی ٹاہلی میں رہ کر اراضیات پر قابض رہے۔ پھر عرصہ تیس برس بعد آبادی کنازئی کی ہو گئی۔

تربکھی پانچ دفعہ حسب ذیل ویران ہوا۔

۱۔ بڑے قحط میں (۱۷۸۳ء)۔ ۲۔ جب سمندر خان درانی نے مار دھاڑ کی۔ ۳۔ دریائے سندھ کی طغیانی۔ ۴۔ جب خلیفہ صاحب (حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمۃ) نے دریائے سندھ سے لشکر کشی

نوٹ:۔ ۱۔ تقریباً نصف تربکھی شلمانی قوم آباد ہے۔ ۲۔ ٹاہلی والے۔ اخون خیل بھی شلمانی ہیں۔

کرکے رسوائی کی۔ ۵۔ سردار ہری سنگھ کے وقت۔

وجہ تسمیہ:۔ ٹاہلی۔ بوجہ ایک بہت بڑے درخت ٹاہلی کے اس جگہ پر ہونے کے یہ نام ہوا۔

جھاڑ۔ پہلے یہاں جھاڑ جنگل تھا۔ تندولہ۔ ایک قسم کا ساگ ہے جو یہاں بکثرت ہوتا ہے۔

موضع کاگ۔ پرانی وراثت قوم گوجر اولاد علاؤالدین تھکر یٹہ کی تھی۔ یسدغانی جب سندھ پار سے آئے تو بزور قابض ہوئے۔ پہلے اس میں گوجر۔ سلمانی، آوان اور کھتری آباد تھے۔

وجہ تسمیہ:۔ پرانا نام علاؤالدین کاگ ہے۔ اب صرف کاگ رہ گیا۔ عہد درانی میں باز یا گھوڑا کل علاقہ کی جانب سے بطور نذر دے کر حاکم کو رخصت کرتے تھے۔ سرکار سکھاں میں میر زمان خان کو جاگیر ملی۔

تربیلہ ڈیم (سدِّ تربیلہ)

چند حقائق

ماخوذ از تربیلہ ڈیم سپلیمنٹ پاکستان ٹائمز ۴، نومبر ۱۹۶۸ء

ضرورت تعمیر۔ تقسیم برصغیر پاک و ہند سے ستلج، بیاس اور راوی دریاؤں کا پانی جس پر پنجاب (حصہ پاکستان) کی زرعی معیشت کا دارومدار ہے، ہندوستان کی طرف چلا گیا۔ بعد میں دونوں ممالک کے باہمی سمجھوتہ سے منگلا اور تربیلا ڈیم پانی کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بنانے کا فیصلہ ہوا۔ منگلا ڈیم تو بن چکا ہے اور تربیلہ بند کا کام ۴، نومبر ۱۹۶۸ء سے صحیح طور پر شروع کر دیا گیا۔ خیال ہے کہ ۱۹۷۵ء تک یہ بند مکمل ہو جائے گا۔

۲۔ یہ کثیر المقاصد بند ہے۔ پانی کی فراوانی اور بجلی کی ایزادی کا باعث ہوگا۔ اس سے دریائے سندھ کی طغیانی پر بھی قابو پایا جا سکے گا۔ تکمیل پر یہاں ایک قابل قدر سیرگاہ بن جائے گی۔ اور ملکی و غیر ملکی سیاحوں کے لئے کشش کا باعث ہوگی۔ اس بند کی جھیل سے مچھلیوں کی افزائش میں ترقی ہوگی۔

۳۔ اس بند کے لئے اسی ہزار ایکڑ زمین کا حصول ہوگا۔ حکومت نے لوگوں کو معاوضہ دینے کے لئے مندرجہ ذیل فراخدلانہ طریقہ کا حکم دیا ہے۔

الف۔ جس خاندان کے پاس نصف ایکڑ آب پاش زمین یا چار ایکڑ بارانی زمین ہوگی اس کو کم از کم ساڑھے بارہ ایکڑ نہری زمین دوسری جگہ پر دی جائے گی۔ ب۔ ان اشخاص کو جھنگ، لائل پور، سرگودھا، ملتان اور سابق صوبہ سندھ کے نہری حصہ میں آباد کیا جائے گا۔ ج۔ اس بند کے بن جانے پر ایک سو چالیس گاؤں جن کی آبادی اسی ہزار (سولہ ہزار خاندان) اور رقبہ زمین ایک لاکھ ایکڑ ہوگا زیر آب آجائے گا۔ د۔ جن خاندانوں کے پاس نصف ایکڑ نہری یا چار ایکڑ بارانی سے کم زمین ہوگی۔

ان کو نقد معاوضہ دیا جائے گا۔ اور ان کو تربیلہ بند کے اردگرد نواحی بستیوں (جو اس غرض کے لئے بنائیں جائیں گی) میں آباد کیا جائے گا۔ ۵۔ اس بند کی تعمیر سے قوم اتمان زئی (جن کے مرکزی گاؤں تربیلہ، کھلابٹ داڑی اور ردرگڑی ہیں) قوم سادات (صوابی میر کے نواحی گاؤں) اور قوم تنولی (امب دربند و مضافات) زیر آب آجائیں گے۔ اسی ہزار افراد، ہزارہ، ریاست امب دربند کے اور مردان ضلع کے بہت قلیل اس سے متاثر ہوں گے۔

صواتی

آبادی کے لحاظ سے ہزارہ کی بہت بڑی قوم ہے۔ اور پوری دو تحصیلوں، مانسہرہ اور بٹگرام میں آباد ہے۔ ہزارہ میں ان کی آمد اغلباً ۱۵۱۵ء ہے۔ زمانہ قدیم میں ان کی وسیع سلطنت مشتمل بر باجوڑ سوات، بنیر اور مالاکنڈ تا ہشت نگر رہی ہے۔

حسب و نسب کے لحاظ سے گبری تاجک (مغل) ہیں۔ اور بعض مورخوں کے نزدیک یہ افغان قوم ہے۔ آیندہ صفحات میں اس مسئلہ پر مفصل بحث آرہی ہے۔ یہ قوم بہت سے قبیلوں میں منقسم ہے۔ سیاسی شعور کے لحاظ سے ہزارہ میں صف اول میں ہیں۔ اور تحریکات آزادی کے سرخیل ہیں۔ اس قوم میں دینی و دنیوی اعلیٰ پایہ کے ہوئے ہیں۔ اور اب اس قوم کی اکثریت تعلیم یافتہ اور اعلیٰ مناصب پر فائز

صواتی

الفنسٹن کی رائے میں صواتی جن کو بعض دفعہ دہقانی بھی کہا جاتا ہے۔ ہندی الاصل معلوم ہوتے ہیں۔ زمانہ گذشتہ میں ان کی سلطنت جہلم سے جلال آباد (ننگر ہار) تک تھی۔ اور آخر میں صرف سوات اور بنیر تک محدود ہو گئی۔ جہاں سے ان کو پندرھویں صدی کے آخر میں یوسف زیوں نے نکال دیا۔ ان کی کافی تعداد اب بھی ان علاقوں میں ہے۔

اس امر کی تصدیق راورٹی نے بھی اپنی تصنیف افغان قوم میں کی ہے۔ اس کی رائے میں پکھلی آخری گبری سلطان پکھل کے نام سے منسوب معلوم ہوتی ہے۔ اس نے مزید لکھا ہے جب یوسف زئی قوم نے باجوڑ، سوات اور بنیر میں زور پکڑ لیا۔ اور بابر بادشاہ نے حیدر علی گبری سلطان باجوڑ پر فتح پا کر اس کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تو سلطان اویس (۹۲۶ AIS) پسر سلطان پکھل نے جو سوات کا آخری گبری بادشاہ تھا۔ اپنا ملک چھوڑ کر درہ نہاک (کاشغر) میں پناہ لی۔ صواتی قوم نے دریائے سندھ کو پار

ہزارہ کی تاریخ ص ۱۲۸ (margin note)

ص ۲۶۳ (margin note)

کر کے مشرقی علاقہ میں اقوام کھکھہ و ہنبہ کو جن کے خوانین کی اس علاقہ میں قدیم سے حکومت تھی آگے دھکیل دیا اور ملک پکھلی پر خود قبضہ کر لیا۔

جہانگیری سلطان

اغلباً سنہ ۱۴۸۰ء و سنہ ۱۴۹۰ء کے درمیان پشاور اور باجوڑ میں دلازاک اور ان کے دہقان آباد تھے۔ یہ دہقان جو ہشت نگر میں آباد تھے سوات کے جہانگیری سلطان کی رعیت تھے۔ ان جہانگیری سلاطین کا دارالخلافہ منگلور تھا۔ جہانگیریوں کے آخری سلطان سلطان اویس نے بابر کے ساتھ گفتگو کی۔ آخر کار بابر نے اس کو دریائے سندھ سے پار ہزارہ کو بھگا دیا۔

نوٹ۔ بعض مورخ چترال کے حکمرانوں کو ان کی اولاد مانتے ہیں۔

ہشت نگر کے دہقانوں کو یوسف زیوں نے دلازاکوں کے ایماء پر حملہ کر کے بھگا دیا۔ اور یہ دہقان شکست کے بعد براہ مورہ تھانہ (مالاکنڈ ایجنسی) میں جہاں ان کے سرگروہ میر ہندہ کی ملکیت تھی چلے گئے۔

اس واقعہ سے پہلے جہانگیری سلطان، سلطان اویس نے یوسف زیوں سے قرابت کر لی تھی۔ اور ملک احمد کی ہمشیرہ سے شادی کر لی۔ لیکن یوسف زیوں نے رات کے وقت مالاکنڈ میں جہانگیری سلطان کی فوج پر اچانک حملہ کر کے اس کو لے لیا۔ سلطان موضع تھانہ (مالاکنڈ ایجنسی) کو چلا گیا۔ یوسف زیوں کی سوات پر قابض ہونے کی تاریخ اغلباً ۱۵۱۵ء ہے۔

سر آلف کیرو اپنی کتاب (پٹھان ص ۲۳۹) میں لکھتے ہیں کہ صواتی صوات کے پرانے باشندوں کی اولاد سے ہیں جن کو یوسف زیوں نے بابر کے زمانہ سے کچھ پہلے صوات فتح کر کے نکال دیا تھا (بابر نے پشاور سنہ ۱۵۱۹ء میں فتح کیا تھا)

راورٹی کے بیان کے مطابق سب گبری قبیلے (تاجک قبیلے) افغانوں کے ان علاقوں میں آنے سے صدیوں پہلے کے مسلمان تھے اور نسل سے مغل ہیں اور ترک نہیں۔

تاریخ "ریاست سوات" محمد آصف خان مولف میں لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے محمود غزنوی نے سوات کو فتح کر کے اسلام یہاں پھیلایا۔ اس کے ساتھ جو سواتی اور دلازاک پٹھان آئے تھے۔ ان کو یہاں آباد کیا۔ سنہ ۱۰۲۴ء (سنہ ۴۱۵ھ) تک سواتی اور دلازاک اس میں آباد رہے۔ لیکن سنہ ۴۰۲ھ (سنہ ۱۰۱۱ء) کے بعد ان میں اختلاف پیدا ہونے شروع ہوئے۔ آخر کار سوات کے علاقہ سے سواتیوں نے دلازاکوں کو بے دخل کر دیا۔ دلازاک وہاں سے نکل کر ضلع مردان اور پشاور میں آباد ہو گئے۔ صواتیوں کی آخری آمد ضلع ہزارہ میں سترھویں صدی عیسوی میں شروع ہو گئی۔ جب کہ سید جلال بابا جو کہ سید علی ترمذی (پیر بابا سنہ ۵۰۳ اھ) سے

سر آلف کیرو (پٹھان) ص ۲۳۹ (margin note)

۵۸۳ھ) کی اولاد سے تھا۔ بمعہ اپنے بہت سے مریدوں، ان کے بال بچوں اور سامان کے پار دریائے سندھ سے آیا۔

تاریخ ہزارہ کے مطابق صواتیوں کی آمد ترکوں کے عہد حکومت میں ہوئی۔ اُس وقت اس ملک میں حکومت ترک کی تھی۔ ان ترکوں کا ایک حاکم دھمتوڑ میں اور اس کا دوسرا بھائی شاہ محمود گُلی باغ میں حاکم تھا۔ شاہ محمود کے دو لڑکے مسمیٰ مُرید خان اور عامل خان تھے۔ اس شاہ محمود کا داماد سید جلال ترمذی تھا۔ جو کہ سادات کاغان کا مورث اعلیٰ ہے۔ شاہ محمود نے اس کو دامادی جہیز میں علاقہ بھوگڑمنگ دیا تھا۔ اس سید جلال بابا کے پاس گڑھی والے خان خیل کا ایک بزرگ مسمیٰ بھائی خان نوکر معتبر و وکیل تھا۔ اسی بھائی خان کا فرزند مراد خان شاہ محمود کے پاس ملازم ہو گیا۔ اور وہ بھی مختار و معتبر ہوا۔

کسی نارضامندی کی بنا پر سید جلال بابا واپس سوات چلا گیا۔ اور بہ بیان سیدان کاغانی چار ہزار روپیہ صرف کر کے ایک بہت بڑا لشکر مختلف قبائل سوات کا ساتھ لایا۔ ترکوں کا ملک ۱۷۰۳ء میں فتح کر کے اپنا قبضہ کر لیا۔

اس واقع کو دوست محمد خان کامل مصنف "خوشحال خان خٹک" نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

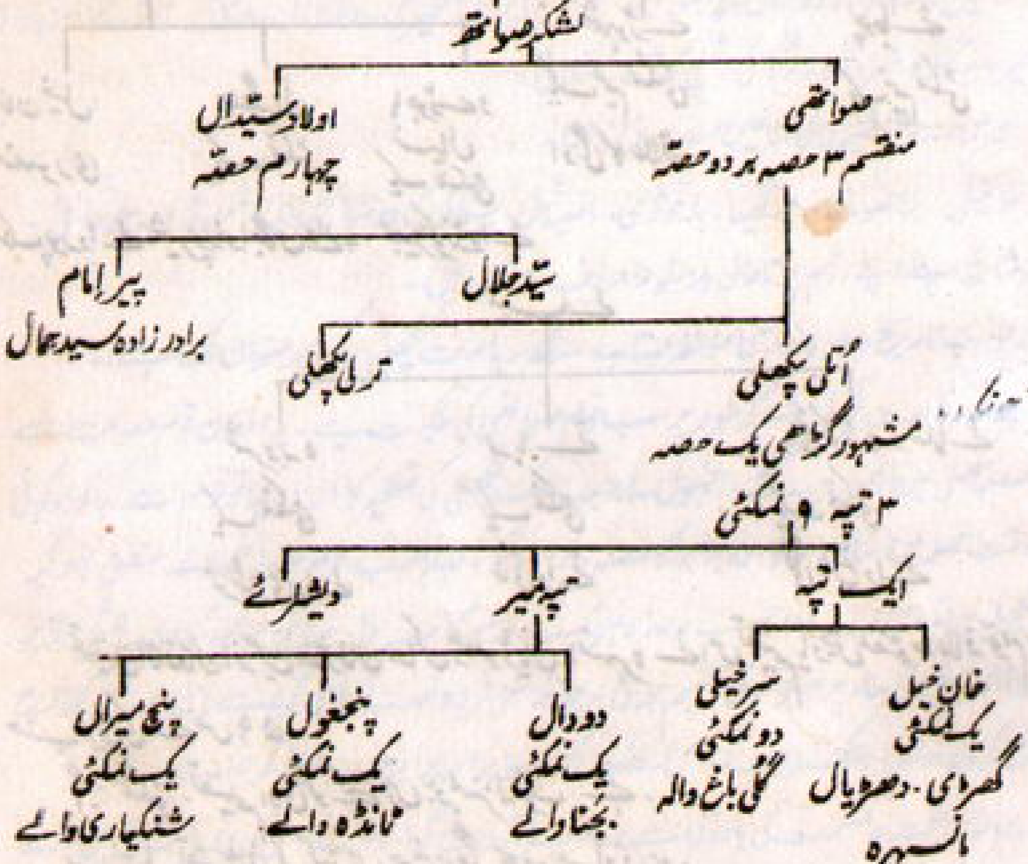
"یوسف زیوں کی بغاوت رمضان ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶-۶۷ء) میں زیر قیادت بہاکو خان (بھاگو خان) اور مُلا چالاک ہوئی۔ (بہ قیاس سرجادو ناتھ سرکار، بحوالہ عالمگیر نامہ یہ مُلا جلال تھا۔ جو غلطی سے چالاک لکھا گیا ہے۔) پھر انہوں نے دس ہزار آدمیوں کا لشکر لے کر دریائے سندھ کو عبور کیا۔ اور قلعہ چھا چھل (چنیچل) واقعہ پکھلی کو (ہزارہ) کے مرزبان بنام شادمان کے گماشتہ سے بزور شمشیر لے لیا۔"

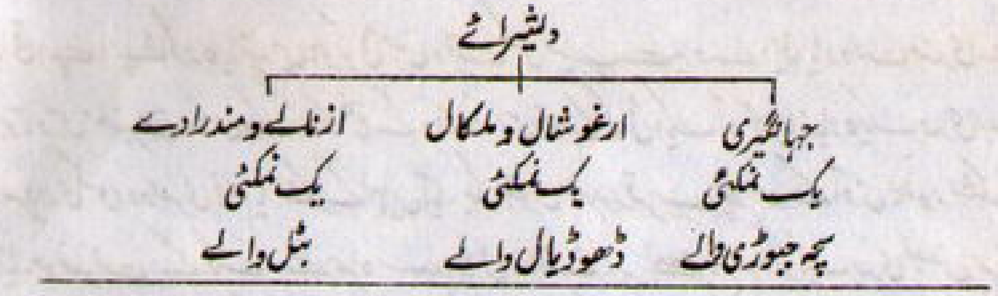
یہ بغاوت عہد مغلیہ میں ہوئی۔ اور انہوں نے پکھلی میں قدم رکھا۔ حاکم نام سے ترک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ سواتی اس ملک یا علاقہ چھا چھل میں موجود تھے یا نہ۔ بہرحال تاریخ ہزارہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید جلال بابا کے ہمراہیوں میں سے اکثر واپس چلے گئے۔ مگر جن کا کوئی ورثہ سوات میں نہ تھا اور متفرق قوم کے آدمی تھے۔ وہ اس ملک میں رہ گئے۔ چند سال خود سید جلال نے قبضہ رکھا۔ جب کہ شاہ زمان فرزند سید جلال اس ملک کو اپنے نانا شاہ محمود کا ملک تصور کرتا تھا۔ گو کہ سید جلال اس وعدہ پر لوگوں کو لایا تھا۔ کہ تم کو تقسیم ملک مقبوضہ کی کر دوں گا۔ بعد آٹھ دس برس کے شاہ زمان پسر سید جلال مر گیا۔ تو سوائے درہ بھوگڑمنگ جو پہلے سے سید جلال کے قبضہ میں تھا چہارم حصہ خود اس نے لیا اور تین حصہ اس لشکر پر تقسیم کر دیا۔ سرداری اور رخانی بھائی خان کے گھر کی اور سید جلال بابا کی اولاد کی رہی۔ اور اگرور میں عنایت اللہ خان دادا عطا محمد خان کا خان رہا۔

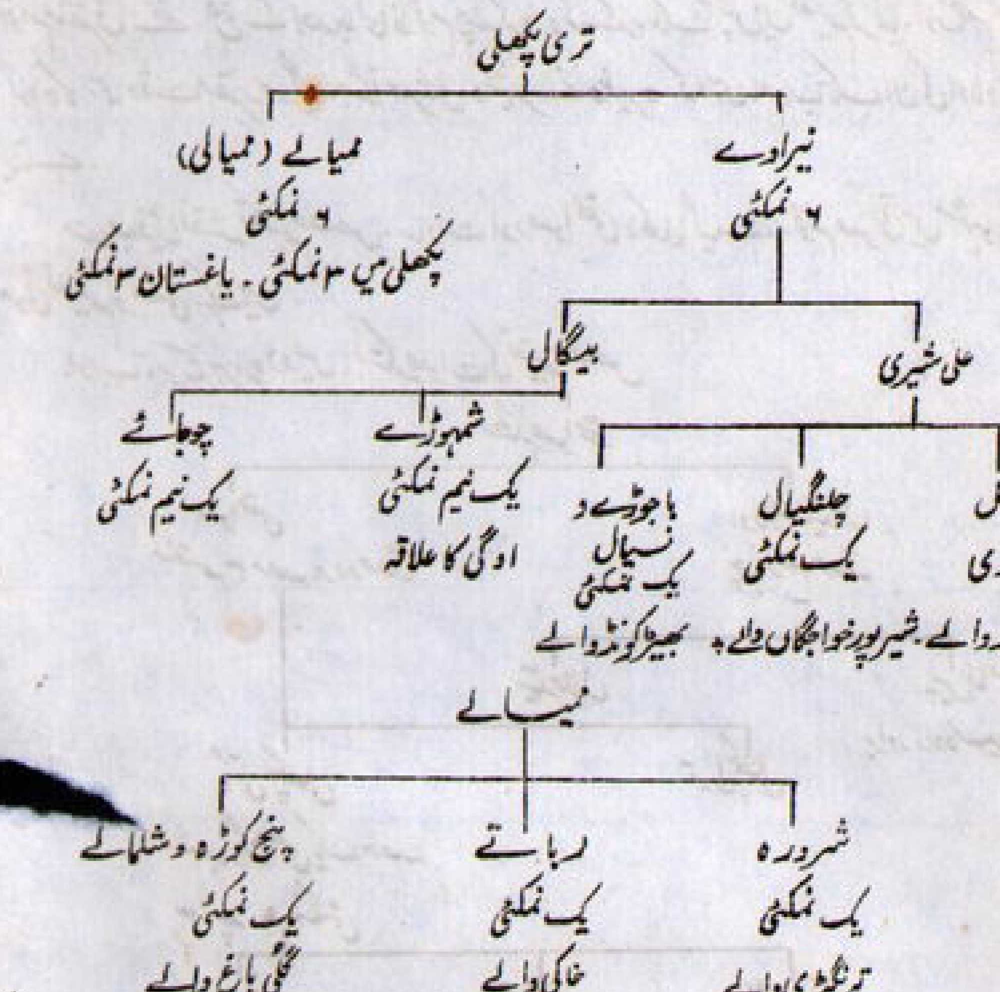
باقی اپنے اپنے گروہ یا تپہ میں جو کوئی جس وقت کسی سبب سے بروئے دینی یا دولت مندی سے اچھا ہوتا وہی معتبر تھا۔ اس ملک کے فتح کے وقت اس قوم کا کوئی ایک آدمی یا زیادہ یک جدی بصورت سرداری کسی دوسری قوم یا لشکر کے نہیں آیا۔ بلکہ بقول مشہور قریب چھ سو کے آدمی بطور لشکر کے آیا۔ جو صوات کے ملک سے ہمراہ سید جلال بابا آئے۔ یہ بعضے باہم دگر یک جدی بعض ہم قوم اور اقوام متفرق تھے۔ فتح کے بعد بلا لحاظ قوم چند گروہ کر کے یہ ملک آپس میں تقسیم کر لیا۔ اور نام بھی ہر گروہ کا اسی وقت مقرر ہو گیا۔ مثلاً سرخیل و لشیلرئے وغیرہ۔ کہ وہی نام اب تک ان کی اولاد پر بولا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل نقشہ تقسیم حصص۔ سادات اور صواتھی دکھایا گیا ہے۔ قوم صواتی میں مشہور اور موٹی تقسیم کو نمکئی کہتے ہیں۔

بموجب تاریخ ہزارہ (ولیس) لشکر صوات کی تقسیم حصص۔







تحقیق الافغان از سمیع اللہ خان ساکن ڈھوڈیال مانسہرہ نے اس تقسیم یا ریش مفتوحہ علاقہ قوم سواتی کی تشریح حسب ذیل کی ہے ص ۵۹ ۔

ا۔ نمکئی۔ تقسیم اولیٰ کو کہتے ہیں جو بمنزلہ طرف ہے ۔

۲۔ ترہا۔ تقسیم ثانی کو کہتے ہیں جو تین جگہ بحصہ مساوی ہو۔

۳۔ ثل۔ موضع ہذا میں تقسیم ثالث کا نام۔ باقی علاقہ میں علی العموم بمنزلہ طرف کے ہے ۔

۴۔ خیل۔ تقسیم رابعہ کا نام ہے۔ کسی جگہ تقسیم ثالث کو بھی کہتے ہیں۔

۵۔ کڈہ۔ نام حصہ۔ گاؤں اور خیل کے اندر۔ یہ آخری درجہ تقسیم ہوتا ہے۔

۶۔ موٹھی۔

۷۔ دفتر۔ ورثہ کو کہتے ہیں جو تقسیم قوم کی رُو سے ملا ہو۔

نوٹ:- ۱۔ اوتلی پکھلی والوں سب کا یاغستان میں پورا قبضہ ہے اور ترلی پکھلی والوں میں سے علی شیری اور ان میں سے صرف خان خیل بلا صورے و چلنگیاں کا قبضہ ہے۔

۲۔ سادات کا بھی یاغستان میں کچھ قبضہ نہیں۔

۳۔ علاقہ سرکار میں صواتیوں کے مزارع عام طور پر تنولی، گوجر اور کشمیری ہیں۔ اور بعض جگہ ملیار ہیں۔ علاقہ یاغستان میں ہر جگہ مزارع گوجر ہی ہیں۔

اس قوم میں شاخ ہائے حسب ذیل ہیں:-

خانخیل۔ سرخیل۔ دوڈال۔ پانجخول۔ پیچ میرال۔ جہانگیری۔ ارغشال۔ ملکال۔ ازنالے۔ مندراڑے علی شیر۔ بیگال۔ شرداڑہ۔ رباتی۔ پنج کوڑہ۔ شلمانی۔

ان میں سے علی شیری کی شاخیں حسب ذیل ہیں۔

خانخیل۔ بلاصوری۔ چنگلیاں۔ باجوڑی۔ انسیال۔ بیگال کی دو شاخیں ہیں۔ شمہوڑی۔ چھوجائی۔

باقی ہر شاخ اپنے اپنے نام پر تا حال بدستور معروف و مشہور ہیں۔

بموجب تاریخ ہزارہ فارسی مؤلفہ مہتاب سنگھ ریاست پکھلی کے زیر عنوان لکھا ہے:-

"چونکہ ریاست پکھلی مشترکہ طور پر سب قوم صواتی کی ملکیت ہے۔ یہ افغان قوم صوات سے آکر ملک پکھلی پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے جب ملک پکھلی کی تسخیر کا ارادہ کیا تو قوم سے کہا کہ جو کوئی اس وقت حملہ میں شامل ہو گا وہ برابر کا حصہ دار ہو گا۔ لہذا سب قوم صواتی نے متفق ہو کر ملک پکھلی پر قبضہ کر لیا۔ اور حسب وعدہ ہر ایک کو برابر کا حصہ ملا۔ چنانچہ ہر تپہ کا حصہ نمکی مقرر کیا۔ اور اس نمکی کی بناء پر ہر قوم کی تقسیم ہوئی۔ چونکہ کسی فرد واحد نے اپنی گرہ سے اس حملہ پر کچھ خرچ نہ کیا تھا کہ وہ حاکم و مالک بن جاتا۔ اس لئے ہر ایک کو برابر برابر حصہ ملا۔ مگر چند مدت کے بعد سعادت خان بخت و قسمت کی یاوری سے صاحب عزت بن گیا۔ قوم نے اس کو دربار شاہی میں جانے اور امراء و وزراء سے ملاقات کرنے کے لئے منتخب کیا۔ اور طے پایا کہ اس کا فیصلہ قوم کو منظور رہو گا۔ خان موصوف نے رہائش کے لئے موضع گرحی موسوم بہ گرھی سعادت خان (موجودہ گرھی حبیب اللہ خان۔ یہ نام اس کے لڑکے کے نام پر پڑ گیا۔ ش ب) آباد کی۔ اور اس کو نمکی کے حصہ سے چری بطور دستار زیادہ

دی گئی۔ جب کبھی دُرانیوں کی طرف سے حاکم کشمیر کی طرف جاتا تو خان موصوف اُس کے ہمرکاب ہو کر جانے کے لئے ایک دو منزل اس کے استقبال کے لئے حاضر ہوتا اور کشمیر تک پہنچاتا۔ جب وہ کشمیر سے کابل کی طرف جاتا تو مظفر آباد پہنچ کر اس کا استقبال کرتا۔ اور اپنے ملک کی حدود سے بہ سلامت گزار کر واپس آتا اس خدمت کے صلہ میں اس کو کشمیر سے بھی کچھ جاگیر ملتی تھی۔ حاکم کشمیر کی آمد و رفت پر ملک پکھلی کا مقررشدہ مالیہ بھی اس حاکم کی خدمت میں پیش کرتا۔ جب کبھی تنول کا رئیس یا افغانان جدون جھگڑا فساد برپا کرتے۔ تو سب قوم خان موصوف کی سرکردگی میں مقابلہ کرتے۔ خان موصوف کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹے نجیب اللہ خان اور حبیب اللہ خان قائم مقام رہ گئے۔ حبیب اللہ خان چھوٹے بھائی نے دستار خانی نجیب اللہ خان کے سر پہ باندھی۔ نجیب اللہ خان نے بھی اپنے باپ کے دستور کے مطابق اپنے بھائیوں سے اتفاق و مراعات رکھ کر وقت گزارتا رہا۔

اس قوم کی شاخیں اب مندرجہ ذیل علاقوں میں آباد ہیں۔ سلطنت انگریزی سے پہلے یہ قبائل ہر تین سال کے بعد اپنا ملک نئے سرے سے تقسیم کرتے تھے۔ اور سب مقامات ایک دوسرے کے ساتھ بدل لیتے تھے۔ لیکن انگریزی عہد کے وقت سے بعد جہاں کوئی قبیلہ قابض تھا وہیں ڈٹا رہا ہے۔

۱۔ خان خیل۔ راج دواری۔ نیل شنگ۔ شملائی۔ بن سیر۔ گڑھی حبیب اللہ۔ کرتول۔ روہ۔ کچھ حصہ مانسہرہ۔ ہمشیریاں۔ ساڑی۔ ترکناں۔ شم الہی منگ۔

۲۔ سرخیلی۔ بفہ۔ بالاکوٹ۔ چھپر گرام (کچھ حصہ) تھاکوٹ۔ بالی منگ (نصف حصہ) عنایت آباد۔ بانڈہ پیراں۔

۳۔ پنج غول۔ ٹانڈہ۔ شنکیاری۔ بالی منگ (کچھ حصہ) پھگوڑہ۔ چھپر گرام۔ تمتی۔ اجمیرا۔

۴۔ دُوداں۔ بیجنہ۔ بنگرام۔ کوانٹری۔ سانڈے سر۔ شوہال نجف خان۔ حریہ۔ منور۔ چھچھ مُنڈا کچھ پنچول۔ ہنگرامی۔

۵۔ پنج میراں۔ شنکیاری۔ بٹہ موہڑی۔ گگڑ شنگ۔ بیدادی۔ شنئی۔ شنگوڑی۔ رچھ میرا۔ کھنڈے۔

۶۔ جہانگیری۔ بھوگڑمنگ۔ جیوڑی۔ سچہ کلاں۔ دھمڑیال۔ چٹہ بٹہ۔ سانڈے سر۔ کونکٹے۔ بلبڑ کوٹ کانڈی۔ چٹی ڈھیری۔ مانسہرہ (کچھ حصہ) روگرہ۔ خان پور۔ گگی باغ۔

۷۔ ارغشال و ملکال۔ ڈھوڈیال۔ آبل۔ ٹکری۔ کوزہ بانڈہ۔ گل ملکال۔ نیل بن۔ بن سچہ۔ گھنول۔ مانسہرہ۔ شارکولی۔ ناکوٹ۔

۸۔ ازناے۔ بل کوٹ۔ تھاکوٹ۔ (کچھ حصہ) کوٹلی بالا۔ وتری۔ بتل (تھوڑا حصہ)

۹۔ مندرادے۔ بتل۔ اچھڑیاں۔ جانگلی۔ کو منگ بالا۔ مانسہرہ (کچھ حصہ) ملکان۔ گل تند ؟

۱۰۔ بیگال۔ علاقہ اگرور۔ شمدھڑہ۔ اوگی۔ بازار۔ کٹھائی۔ اربوڑہ۔ چھچھ بالا و ترلا۔ جسکوٹ۔ شاہ کوٹ دھڑہ۔ گل ڈھیری۔

۱۱۔ شروزہ۔ ترنگڑی بالا و پائیں۔ صابر شاہ۔ میراجیا۔ جسوال (یا جسوال) پانو ڈھیری۔

۱۲۔ رباطی۔ خاکی

۱۳۔ پیچکوٹا و شملائی۔ گگی باغ۔ حفیظ باندھی۔ ترلی وُتلی۔ نوکوٹ۔ تاجل۔ غازی کوٹ۔

کشمیر کے سلاطین جن کا نسب گیری سواتی سے ملتا ہے

شاہ میر جو بعد میں سلطان شمس الدین کے نام سے مشہور ہوا۔ اور جس نے کشمیر اور اس کے ملحقات پر ۷۴۲ھ سے ۷۴۷ھ (۱۳۴۱ء سے ۱۳۴۹-۵۰ء) تک حکومت کی۔ اور بعضوں کے قول کے مطابق ۷۴۳ھ سے ۷۴۷ھ تک حکومت کی۔ اور جس نے کشمیر میں اسلام پھیلانے کی ابتدا کی وہ سوات کا گیبری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا شجرہ نسب پانڈو کے تیسرے بیٹے ارجن سے ملایا تھا۔ پہلے پہل وہ راجہ رنچن[1] کا وزیر بنا۔ آخر کار اودن دیو[2] کی وفات کے بعد شاہ میر نے پہلے راجہ کی بیوہ کوتہ رتن جس کو کوتہ زین بھی کہتے ہیں سے شادی کرلی۔ اور حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اور اپنا نام سلطان شمس الدین رکھ لیا۔ اور کوتہ رتن یا کوتہ زین کو جو دو دفعہ بیوہ ہو چکی تھی کو شادی پر مجبور کرلیا۔

اقتباسات و ملخص از نگارستانِ کشمیر

از قاضی ظہور الحسن سیوہارہ۔ ضلع بجنور

رنجو عرف رینچن شاہ ۱۳۲۵ء میں تخت نشین ہوا ۔۔۔ شاہ میر کو وزیر اور رینچہ بٹ کو سپہ سالار بنایا۔۔۔ ۱۳۲۳ء میں زولجو تاتاری نے جو راجہ قندہار کا سپہ سالار تھا۔ کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ کشتواڑ کو بھاگ گیا۔ زولجو نے قبضہ کرکے خوب قتل و غارت کیا۔ آٹھ ماہ بعد واپس ہوا۔ راستہ میں شدت برف سے معہ ہمراہیوں کے ہلاک ہوا۔

رنجو بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن عقائد میں مذبذب تھا تبت سے جب یہ نکلا تو صاحب ہوش تھا۔

---

[1] رنجو۔ نگارستان کشمیر ص ۱۴۱ [2] اودیان دیو۔ نگارستان کشمیر ص ۱۴۲

تبت میں مسلمانوں کو دیکھ چکا تھا۔ یہاں شاہ میر کی صحبت سے اسلام سے مانوس ہو چکا تھا۔ آخر حضرت بلبل شاہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اس کا سالار اودن چند اور اس کی بیوی کوٹہ رانی اور بہت سے آدمی مسلمان ہوئے رتنچو کا نام صدرالدین قرار پایا یہ ۱۳۲۵ء میں مسلمان ہوا اور ۱۳۲۶ء میں انتقال کیا۔

۱۳۲۶ء سے ۱۳۴۳ء راجہ اودیان دیو

کوٹہ رانی سلطان صدرالدین کی محبوب بیوی تھی اور مسلمان ہو گئی تھی۔ اس نے راجہ سہدیو کے بھائی اودیان دیو کو جو ذوالقدر خان عرف زولچو کے حملہ کے وقت بھاگ گیا تھا۔ اور اسی زمانہ میں پکھلی دغالباً پکھلی ہو گا ش ب) میں مقیم تھا بلا کر تخت نشین کر دیا۔ اصل میں حکومت رانی کرتی تھی۔ یہ خود کم عقل اور کم ہمت تھا۔

۱۳۳۱ء میں ڈل نام ایک ترک نے کشمیر پر حملہ کیا۔ راجہ سب کو چھوڑ کر بھاگ کر تبت کو چلا گیا۔ رانی نے شاہ میر کو ترک کے مقابلہ پر مامور کیا۔ اس نے ترکوں کو سخت شکست دی۔ اس سے شاہ میر کی ملک میں خوب دھاک بیٹھ گئی۔ شاہ میر کے بیٹوں جمشید و علاؤالدین کو علاقہ کامراج میں عہدے دئے گئے۔ شاہ میر کی طرف عام رجوعات دیکھ کر راجہ اور رانی اس کا اقتدار گھٹانے کی فکر میں ہوئے راجہ نے شاہ میر کا اپنے پاس آنا جانا بند کر دیا۔ اس زمانے میں معتوبین سلاطین کا جو حال ہوتا تھا۔ اس سے تاریخ بین اصحاب خوب واقف ہیں۔

راجہ کی وفات کے بعد کوٹہ رانی ۱۳۴۳ء میں خود تخت نشین ہو گئی۔ کوٹہ رانی نے پچاس دن خود مختارانہ حکومت کی۔

عہدِ اسلام

سلطان شمس الدین

راجہ سہدیو (۱۳۰۱ء میں تخت نشین ہوا تھا) کے عہد میں اپنے وطن کنٹر (یہ علاقہ سوات سے آگے ہے اور مضافات کابل سے ہے) ایک شخص شاہ میر نام آیا۔ بعض مورخین نے اس کو سیّد لکھا ہے۔ بعض نے وطن کے لحاظ سے مغل بتایا ہے بعض نے ارجن پانڈو کی نسل سے بتایا ہے۔ صحیح وہ ہے جو صاحب مکمل تاریخ کشمیر نے لکھا ہے کہ شیخ تھا۔ راجہ نے شاہ میر کو نوکر رکھ لیا تھا۔

صدرالدین (رتنچو) کی وفات کے بعد کوٹہ رانی نے اودیان راؤ کو راجہ بنا لیا۔ اور اس سے عقد بھی کر لیا۔ گویا کہ مرتد بھی ہو گئی۔ شاہ میر کو یہ بات ناگوار گذری۔ راجہ کی وفات کے بعد شاہ میر نے حکومت

پر قبضہ کر لیا۔ اور کوٹہ رانی سے عقد کر لیا۔ لیکن رانی سے وہ مطمئن نہ تھا۔ لہٰذا اس کو نظر بند کر دیا۔ رانی نے چھری مار کر خود کشی کر لی۔

شاہ میر (سلطان شمس الدین) نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی سلطان کی تاریخ وفات (آمد شمس باز زیر سحاب) ہے ۷۴۲ھ

تین سال پانچ ماہ کی حکمرانی کے بعد وفات پائی جمشید اور علی دو بیٹے چھوڑے۔ اس کے زمانہ تک کشمیر میں سن بکرمی کا رواج تھا۔ سلطان نے اس کو موقوف کر کے ایک نیا اسلامی سن ایجاد کیا جس کی ابتدا رینچن شاہ کی تاجپوشی سے قرار دی۔ یہ سن شاہانِ مغلیہ کے عہد تک کشمیر میں رائج رہا۔

خان اگرور

تاریخ ہزارہ ص ۹۹۱

ابتدائی عملداری سرکار میں اس کا پورا حال معلوم نہیں ہوا تھا۔ عطا محمد خان صوابتی خان تھا اور اس کو ایک ہزار روپیہ کی جاگیر سرکار سکھاں کی جانب سے معاف تھی۔ باقی صوابتی بھی اس علاقہ کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اور عطا محمد خان جاگیردار، خان خیال کیا جاتا رہا۔ ۱۸۶۱-۶۲ء کا بندوبست ضلع ختم ہوا۔ لیکن اس علاقہ کا بندوبست نہ ہوا۔ یکم نومبر ۱۸۶۶ء میں ایک تھانہ زیر سرکردگی شاہزادہ اسمٰعیل خان بمشاہرہ تیس روپیہ ماہوار بعہدہ تھانیدار بمعہ ۱۷ سپاہی کے کچھ موضع اوگی میں مقرر ہوا۔ اور مئی ۱۸۶۶ء میں اس کا قانونی بندوبست شروع ہوا۔ اور ۲۲ جولائی ۱۸۶۵ء کو ختم ہوا۔

۳۰ جولائی ۱۸۶۸ء کو قوم حسن زئی۔ چغرزئی۔ اکازئی۔ اور ویشی وغیرہ یاغستانی اقوام نے دن کے وقت تھانہ پر دھاڑا مارا۔ اور قتل اور نقصان کیا۔ عطا محمد خان کی جاگیر سرکار نے ضبط کی۔ اور ۱۷ اگست ۱۸۶۸ء کو راولپنڈی اور پھر وہ لاہور بھیجا گیا۔ ______ سرکار نے اس علاقہ یاغستان پر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں لشکر کشی کر کے تمام کالا ڈھاکہ سر کر لیا۔ اور جرگہ کے حاضر ہونے اور جرمانہ ادا کرنے کے بعد ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو لشکر سرکار واپس آیا۔ اور پختہ تھانہ تعمیر ہو گیا۔

یاغستانیوں نے ۱۰ جولائی ۱۸۶۹ء کو موضع برچڑ۔ گلڈھیری کے کوٹھے جلا دئے۔ اور ۲۹ اگست ۱۸۶۹ء کو موضع جسکوٹ پر دھاڑا مارا۔ ۴ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو پھر سرکاری فوج اس علاقہ میں متعین ہوئی اور حسن زئی کا موضع شاہ ٹوپ ۸ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں جلا دیا۔

محققین بندوبست سے صورت حقیقت تمام علاقہ اگرور کی حسب ذیل پائی جاتی ہے۔

۱۔ یہ کہ جب سلطان شادم خان ترک گلی باغ والے سے لشکر صواتھ نے جو ملک صواتھ سے ہر ایک

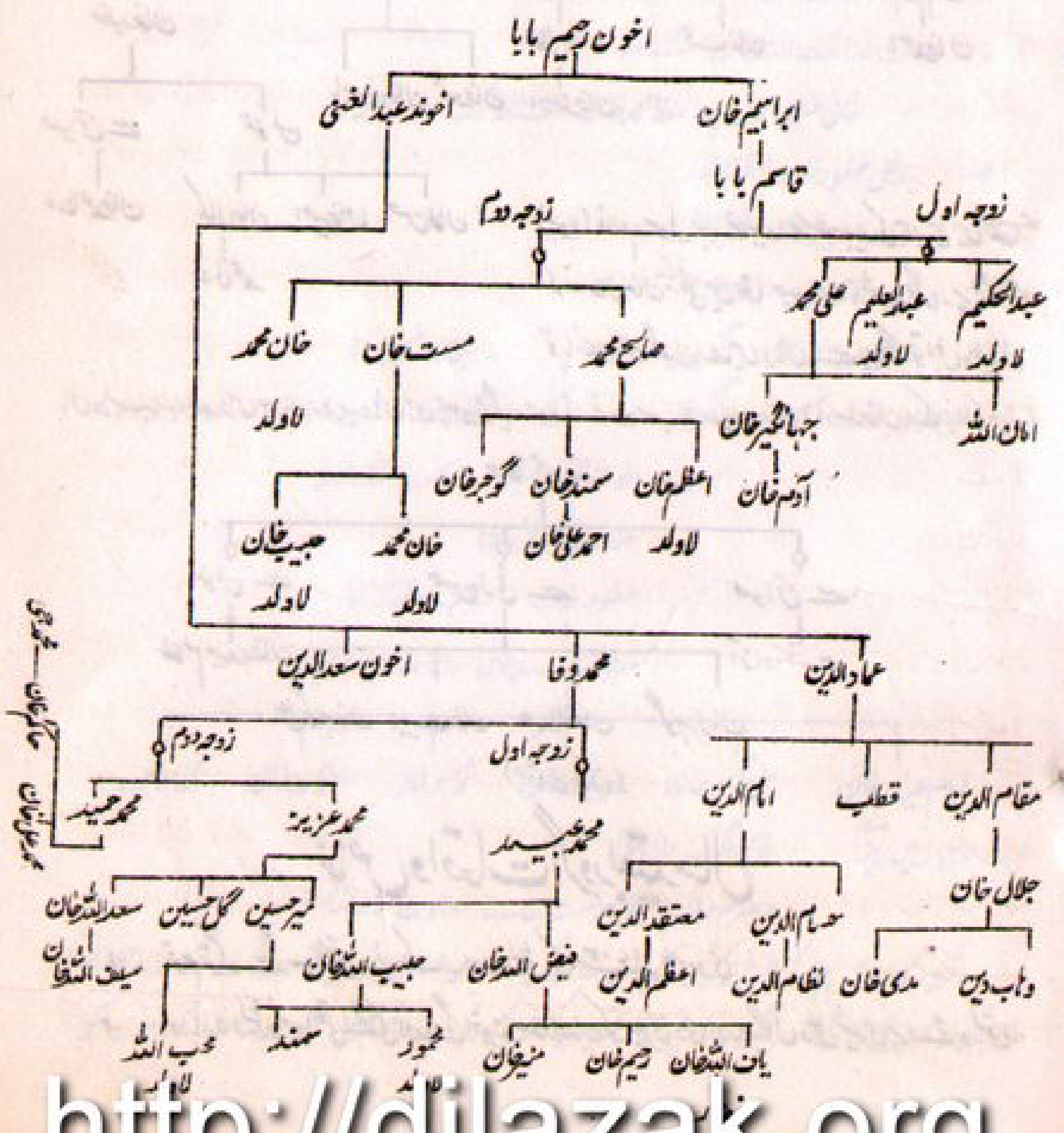
قوم کا آدمی یا دوسرے قسم کے جو کوئی لڑائی کا شوق رکھتا تھا۔ یا زمین چاہتا تھا۔ ایک لشکر بن کر بموجب رہنمائی سید جلال داماد سلطان کے جیسا کہ لشکر کا دستور ہے کہ ہر ایک قوم چھوٹی بڑی شریف و رذیل لشکر میں ہوتے ہیں۔ آیا اور قبضہ ملک پر پایا۔ تو چہارم سید جلال نے اس علاقہ سے بھی علیحدہ کر لیا۔ اور باقی دو حصہ ادنٹی پکھل اور ترلی پکھل میں تقسیم ہوا۔ بموجب ولیش اس علاقہ کو بھی مثل دوسرے علاقہ جات کے سب بھیالے ترادے مشترک کھاتے تھے۔ یعنی علاقہ تپہ تپہ میں منقسم نہ تھا۔ ایک پشت یہ صورت رہی یعنی تپہ بیگال سے بزرگان عطا محمد خان مسمی اخون رحیم بابا صوابتھ سے آیا۔ وہ اپنی عمر میں اس ولیش کی صورت پر ایک علاقہ متعلقہ پکھل ترلی میں اپنا حصہ کھاتا رہا۔ جب اخون عبد الغنی پسر اخون رحیم بابا کا وقت آیا۔ اخون سعد الدین پسر عبد الغنی نے بہ سبب جواں مردی اپنے بیٹے عنائت اللہ خان کے اور نیز قوم تناولی کے کچھ زور پکڑا۔ اور جس قدر علی شیری علاقہ اگرور میں تھے وہ یہاں سے نکل کر پکھل میں چلے گئے۔ اور بیگال پکھل سے نکل کر اگرور میں آ گئے۔ تو علی شیری کا وراثت اگرور سے اور بیگال کا پکھل سے کچھ واسطہ نہ رہا۔ اس وقت اخون عبد الغنی و اخون سعد الدین نے خاص علاقہ اگرور کی ولیش (تقسیم) بیگال کے درمیان کی۔ اس وقت سے اس علاقہ کی وراثت بیگال کی ہوئی۔

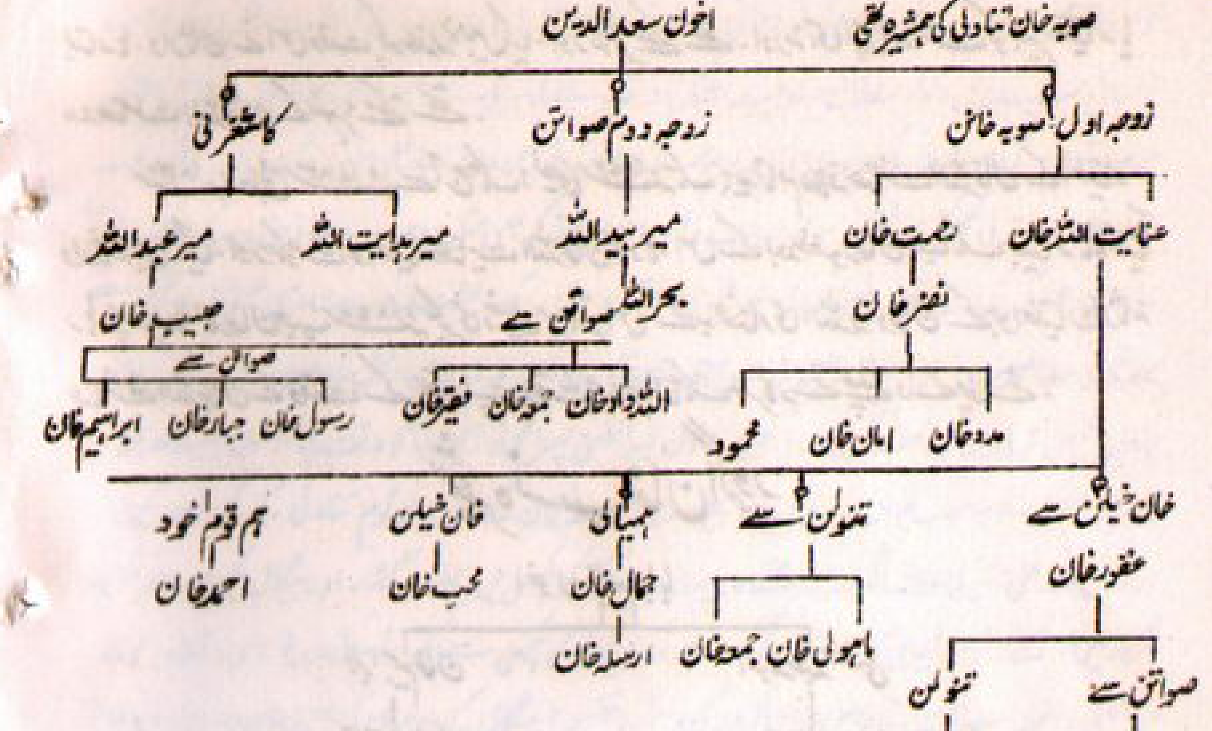
اخون عبد الغنی و اخون سعد الدین کی زندگی تک یہ صورت رہی۔ اور گو کہ طریق خانگی کا اخوند سعد الدین کے گھر میں ہو گیا تھا۔ اور عنائت اللہ خان دراصل پورا خان بھی ہو گیا تھا۔ مگر اخوند سعد الدین نے وراثت میں زیادہ تغیر و تبدل نہیں کرایا۔ اور حکم و اختیار باقی سب قوم بیگال پر اس کا ہو گیا تھا۔ سعد الدین کے مرنے کے بعد جب عنائت اللہ خان پورا خان ہو گیا اور اس کے باقی برادران اس کے زیر سایہ اور زیر حکم آ گئے۔ اس اس وقت سرحدی حفاظت کے لئے بڑی محنت و قوت کی ضرورت ہوئی۔ کیونکہ سرحد تناول پر نواب خان تنولی پدر پائندہ خان نہایت زبردست اور زور آور خان ہو گیا۔ اور سرحد پکھل پر حسن زئی نادر شاہ دادا حسن علی خان حسن زئی کا نہایت قوی اور صاحب داعیہ پیدا ہوا۔ ان ہر دو خوانین سرحدی کے علاقہ ایسا عمدہ میدانی علاقہ نہ تھا۔ ہر ایک چاہتا تھا ______ کہ یہ علاقہ اس کے قبضہ میں آ جائے۔ اور ان دونوں خوانین نے صد ہا لڑائیاں دونوں نے اتفاق کر کے اور علیحدہ علیحدہ بھی عنائت اللہ خان سے لڑیں۔ اس وقت وراثت کا کھانا دشوار ہو گیا تھا۔ اور ہر روز لڑائی کے سبب وارث لوگ تنگ آ گئے تھے اور عنائت اللہ خان برابر دونوں سے لڑتا رہا۔ اور علاقہ سنبھالا ہوا تھا۔ مگر وہ وقت ایسا تھا کہ بغیر ایک حاکم با اختیار یہ علاقہ ایک ہفتہ بھی وارثان کے قبضہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس لئے عنایت اللہ خان نے اکثر دیہات وارثان سے باختیار خود لے کر اپنے ملازمان کے سپرد کر دئے اور خدمت کمر بندی کی دونوں سے

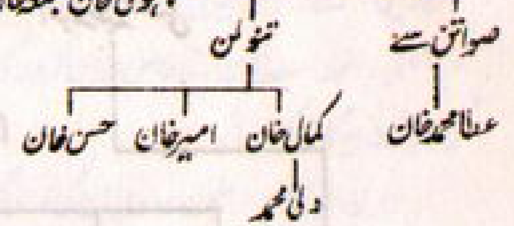
لیتا رہا۔ وارثان نے اس وقت کچھ عذر نہیں کیا۔ اور نہ کر سکتے تھے۔ اور نہ ہی اپنی وراثت کو بغیر اختیار یا مدد عنائت اللہ خان کے ٹھہرا سکتے تھے۔

سنہ ۱۲۸۰ھ بمطابق سنہ ۱۸۶۳ء سے آج تک (یعنی سنہ ۱۹۶۲ء تک) یہ تمام علاقہ عنائت اللہ خان کے اختیار وارثانہ میں آ گیا۔ اور حکومت و اختیار عنایت اللہ خان کا رہا۔ اس کے بعد غفور خان جب تک جیتا رہا با اختیار رہا۔ پھر عطا محمد خان جب سنہ ۱۲۹۵ھ ہجری دخیل ہوا تو اس نے بہ مختاری اللہ داد خان کے جو اختیار وارثانہ عنائت اللہ خان کے وقت کے تھے اپنے وقت میں جہاں تک سرکار نے چلنے دئے چلائے۔

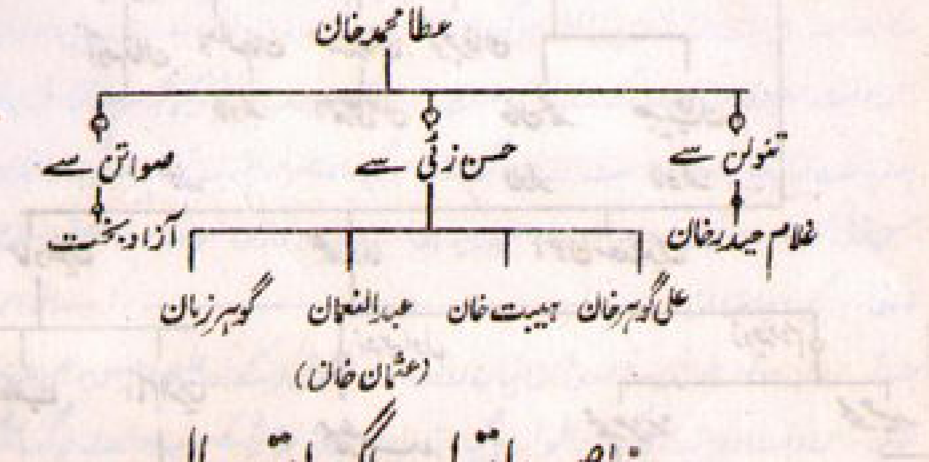
شجرہ نسب خان اگرور







(مولانا غلام رسول مہر نے سید احمد شہید کی تاریخ میں لکھا ہے کہ ارسلان خان تنگی میں تھا۔ جب مولانا شہید اگرور پر بڑھے تو پائندہ خان گھبراہٹ میں وہاں سے بھاگا تو اہل و عیال مال و اسباب بمعہ دس ہزار روپیہ وہاں ہی چھوڑ گیا۔ مولانا نے وہ سب ارسلان خان (ارسلہ خان) کے حوالہ کر دیا۔)



خاص واقعات اگرور بقید سال

۱- قوم ترک سے سواتھی نے ملک لیا اور ویلش کی ۱۷۰۳ء عیسوی

۲- دوبارہ ویلش سواتھی نے کی اور اوگی اخوند سعدالدین کو سیری دی اور بیگال وعلی شیری بروئے ویلش

زمین کھانے لگے۔ ۱۷۴۴ء

۳- قوم سواتھی نے اوگی کو گھیر لیا۔ اخون سعدالدین کی بی بی صوبہ خان تنولی کی ہمشیرہ تھی اور اس کے بلانے پر اس کا بھائی امداد کے لئے آیا۔ اور گھیرے سے چھڑا لیا۔ ۱۷۵۱ء

۴- اخوند سعدالدین کو قوم سواتھی نے مسجد خواجگان میں روکا۔ عنایت اللہ سواتھیوں کو قتل کر کے اپنے باپ کو گھوڑے کے پیچھے بٹھا کر اوگی لے آیا۔ ۱۷۶۳ء

۵- دوبارہ ویلش اخون سعدالدین نے علاقہ اگرور کے درمیان اپنی قوم بیگال کے کی۔ اور قوم نے موضع اربوڑہ دستار میں عنایت اللہ خان کو دیا۔ ۱۷۸۳ء

۶- بلاشرکت خانگی عنایت اللہ خان ۱۸۱۸ء مدت ۳۵ سال

۷- وفات عنایت اللہ خان ۱۸۱۹ء

۸- خانی غفور خان پدر عطا محمد خان ۱۸۳۵ء تک۔ ۱۷ برس

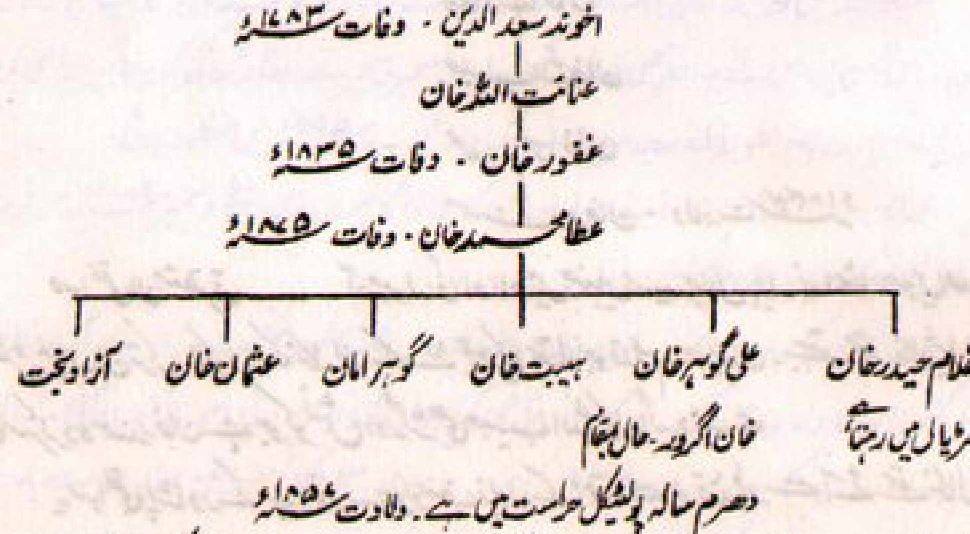
۹- بیدخل غفور خان۔ ۱۸۳۴ء

۱۰- وفات غفور خان ۱۸۳۵ء

۱۱- دخل عطا محمد خان ۱۸۴۱ء

۱۲- بیدخل عطا محمد خان اگست ۱۸۶۸ء ۲۷ برس دخیل رہا

علی گوہر خان۔ رئیس اگرور (اقتباسات از روسائے باختیار و نامی خاندان پنجاب)



اگرور کا علاقہ پہلے کرلاغ ترکوں کے پاس تھا جو کہ پندرھویں صدی میں امیر تیمور لنگ کے ساتھ آئے۔ جس میں دھمتوڑ۔ تناول اور اگرور شامل تھا۔ یہ صوبہ کشمیر کا دور دراز کا ضلع سمجھا جاتا تھا۔ کرلاغوں کو

سواتیوں نے نکال دیا۔ جنہوں نے سید جلال بابا (۱۵۲۰ء) کے زیر حکم دریائے اٹک عبور کرکے دریا کے اس طرف کے بہت سے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ آخرکار بیگال فرقہ (سواتیوں کا ایک فرقہ ہے) اخوند سعدالدین کے زیر حکم اگرور پر قبضہ کر لیا۔ اس کے جانشینوں کی حسن زیوں اور تناول کے رئیسوں سے جنگ ہوتی رہتی تھی۔ سن ۱۸۳۵ء میں پائندہ خان نواب تناول نے غفور خان اگرور کو قتل کروا دیا۔ سردار ہری سنگھ کے جانشین نے اگرور کا علاقہ غفور خان کے لڑکے کو دلوا دیا۔ جب ۱۸۴۹ء میں سرکار انگریزی نے اس ضلع کو لیا تو عطا محمد خان خان تھا۔

(۱۸۲۵ء میں انگریزوں نے ایک مہم بھیجی کیونکہ محکمہ نمک کے دو انگریز افسر مارے گئے تھے ش پ)

۱۸۶۸ء میں جب انگریزوں نے اگرور میں تھانہ ڈالنا چاہا۔ تو عطا محمد خان نے اس بات سے ناراض ہو کر کالا ڈھاکہ کی قوموں کو بلوے کے لئے برانگیختہ کیا۔ انہوں نے وادیٔ اگرور پر چڑھائی کی اور جو نیا تھانہ بنایا گیا تھا۔ اس کو جلا دیا۔ اس پر خان کو لاہور بھیج دیا گیا (۱۸۷۰ء میں عطا محمد خان کو پھر اگرور واپس آنے دیا گیا۔ ش ب) مگر چند سال بعد رہا کر دیا گیا۔ اور ۱۸۷۵ء میں فوت ہو گیا۔

سرحد اگرور کی قوموں سے جو خطائیں ہوئی تھیں ان کے بارے میں علی گوہر خان کی نسبت بھی دغا بازی کا شک تھا۔ اس وجہ سے یہ ۱۸۸۱ء میں اگرور سے باہر بھیجا گیا۔ اب دھرم سالہ میں رہتا ہے اس کے چھوٹے بھائی خان پور میں رہتے ہیں۔

سمندر خان صوابئی۔ رئیس گڑھی حبیب اللہ (اقتباس از رؤسائے با اختیار)

سعادت خان
|
حبیب اللہ خان
|
محمد امین خان
|
سمندر خان - ولادت ۱۸۴۷ء

صوابئی ان متفرق آدمیوں کی اولاد ہیں جنہیں سید جلال بابا نے اٹھارھویں صدی کے شروع میں ان ترک مالکوں کے نکالنے کے لئے جمع کیا تھا۔ جو قدیم سے یہاں رہتے تھے۔ خان خیل صوابئیوں کا سرکردہ سمندر خان ہے جو کونش اور گڑھی حبیب اللہ کا جاگیر دار ہے۔

یہ صوابئی پشاور کے میدانوں سے یوسف زیوں کے ہاتھ سے جو قندھار سے آئے تھے نکال دئے گئے اور یہاں آباد ہوئے۔

موضع گڑھی کی بنیاد تیمور شاہ کے عہد سے سعادت خان نے ڈالی۔ اور اس کے بیٹے کے نام پر گڑھی حبیب اللہ مشہور ہوئی۔

وفات سمندر خان۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا تار بنام کمشنر پشاور ۳۱ $\frac{12}{89}$ کے مطابق یہ ہے:۔

سمندر خان، خان گڑھی رات کو ۳۰ $\frac{12}{1889}$ یک لخت فوت ہو گیا۔ وہ عرصہ سے بیمار تھا۔

یہ علاقہ کونش اور گڑھی حبیب اللہ میں ۹۱۱۳ روپے کی جاگیر رکھتا تھا۔ پہلے پہل یہ جاگیر سکھوں نے دی تھی۔

سمندر خان صوابئی خان خیل

ڈھوڈیال خان خیل بیوی: محمد حسین خان (عمر ۲۵ سال)، محمد اکرم خان (۲۳ سال)
کونش بیوی: سکندر خان (۲۲)، فتح خان (۹)، عبدالرحمن (۶)
جہانگیری بیوی: محمد اکبر خان (۱۴)

مختصر کوائف جاگیر محمد حسین خان۔ خان گڑھی حبیب اللہ خان (از بندوبست ہزارہ ۱۸۷۴ء)

لفٹیننٹ لمسڈن اور مسٹر وانس اگنیو کی سفارش پر مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس کی خدمات کے صلہ میں ۱۸۴۶ء علاقہ کنہار و کونش میں پانچ ہزار روپیہ کی جاگیر دی۔ میجر ایبٹ نے سفارش کی کہ اس کو ۵۶۸۷-۸-۰ روپیہ تاحین حیات جاگیر دی جائے۔

محمد امین خان اپنے سپاہیوں سمیت ۱۸۵۲ء کاغان پر چڑھائی کے وقت کرنل میکی سن کے ہمراہ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں محمد امین خان بذاتِ خود آخری سرحد تک گیا تاکہ ہندوستانی باغی سپاہیوں کا راستہ روک دے۔ اس ضمن میں اس نے بہت اچھی خدمات کیں۔ لہٰذا میجر بیچر نے سفارش کی کہ یہ جاگیر دوامی کر دی جائے اور ایک ہزار روپیہ بطور خلعت مزید منظور کیا جائے۔ یہ ۱۸۹۵ء میں منظور ہوئی۔

محمد امین خان ۱۸۶۹ء میں فوت ہوا۔ اور اس کا بڑا لڑکا سمندر خان ۳۰ دسمبر ۱۸۸۹ء میں فوت ہوا اور اس کا لڑکا حسین خان جانشین ہوا۔

خان گڑھی کا مورثِ اعلیٰ سعادت خان اپنے وقت میں ایک مشہور شخصیت رہی۔ اور آزاد خان خود مختار حاکم کشمیر اس کا داماد تھا۔ آزاد خان کا والد حاجی کریم داد خان بامے زئی احمد شاہ درانی کے وقت حاکم کشمیر تھا۔ اور اس کے امراء میں سے تھا۔ اس کا سب سے چھوٹا لڑکا آزاد خان تھا۔ جو اپنے باپ کی وفات پر کشمیر کا خود مختار حاکم بن گیا۔

ان باپ بیٹے کے متعلق نگارستان کشمیر میں مفصل تاریخی حالات تحریر ہیں۔ جو عبرت و دلچسپی کیلئے

تحریر کئے جاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پشت پر سعادت خان کی طاقت اور اثر تھا۔

حاجی کریم داد خان صوبیدار کشمیر

سرحد ہزارہ کے چند واقعات (ملک سواتی)

۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں امیر خان سابق صوبیدار کو جو تیمور شاہ سے باغی ہو گیا تھا گرفتار کر کے صوبیدار بنا۔ ۱۲۰۰ھ میں اسکردو کو فتح کیا اور راجہ مراد خان والی اسکردو مغلوب ہوا۔ ۱۲۰۱ھ میں راجہ محمود خان والی مظفر آباد کی گوشمالی کی۔ ۱۲۰۷ھ میں تیمور شاہ کے بھائی سکندر شاہ نے کامراج میں آ کر شورش بپا کی۔ حاجی نے اپنے بیٹے آزاد خان کو سکندر کے مقابلہ پر بھیجا۔ سکندر مغلوب ہو کر بھاگ گیا۔ ۱۲۰۸ھ میں حاجی کا انتقال ہو گیا۔ صوبہ اپنے بیٹے آزاد خان کو سپرد کر گیا۔

بادشاہ نے آزاد خان کو صوبہ دار تسلیم کر لیا۔ اس نے بادشاہ سے بغاوت کر دی اور سلطان قسطنطنیہ کے نام کا سکہ و خطبہ جاری کیا اپنا لقب نادر شاہ ثانی رکھا۔ بادشاہ نے آزاد خان کے بھائیوں مرتضیٰ خان و نسان خان کو اس کی سرکوبی کے لئے تیس ہزار سوار کے ساتھ بھیجا لیکن آزاد خان نے اس لشکر کو شکست دی۔ مرتضیٰ نے پھر جمعیت فراہم کر کے جنگ کی مگر شکست کھائی اور پشاور کو بھاگ گیا۔ اب آزاد خان نے فیض اللہ خان کو معافی کے لئے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن بادشاہ نے معافی نہ دی۔ بادشاہ نے سیف الدولہ مدد خان کو پچاس ہزار سوار دے کر آزاد خان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ مدد خان نے آزاد خان کو شکست دی۔ آزاد خان ادھر ادھر پھرتا ہوا پونچھ گیا۔ وہاں پر راجہ رستم خان والی پونچھ کے خلاف تدبیریں کرنے لگا۔ راجہ کو خبر ہو گئی اس نے اسے محصور کر لیا۔ اتفاقاً اسی روز مدد خان کی فوج کا ایک افسر اسلام خان بھی پہنچ گیا۔ آزاد خان نے محاصرہ سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔ اسلام خان نے اس کا سر کاٹ کر مدد خان کے پاس بھیجدیا۔ مدد خان نے یہ سر کابل بھیج دیا۔

صواتھی

مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۴۹۸۹۳ ہے۔ یہ مانسہرہ تحصیل کے زیادہ حصہ میں آباد ہیں وہ پٹھان یوسف زئی کی شاخ سے ہونا بیان کرتے ہیں۔ بلکہ راناڑئی سے جو یوسف زئی کے اجداد ہیں انہوں نے اس کے ثبوت میں کچھ شجرے نسب بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا اس قوم کی آبادی پہلے ملک سوات میں تھی۔ اور یہ ایک مختلف اقوام کا مجموعہ ہیں۔ ان کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ ۱۔ گبری (یا اتلی پکھلی) میانی مترواوی (یا ترلی پکھلی)

گبری۔ کاغان۔ بالاکوٹ۔ گڑھی حبیب اللہ۔ مانسہرہ۔ شنکیاری۔ بھوگڑمنگ اور کونش کے علاقوں اور علاقہ غیر نندہاڑ اور رچھا کوٹ میں آباد ہیں۔

میانی۔ مترواوی، بھیر کنڈ۔ اگرور کے علاقوں اور غیر علاقہ ٹکری اور ویشی میں آباد ہیں۔

ان کا قومی اور آبائی خان محمد حسین خان ساکن گڑھی حبیب اللہ ہے جو خان خیل شاخ سے ہے۔ ان خان خیلوں کا دعویٰ ہے کہ وہ صواتھی نہیں ہیں۔ بلکہ قریشی ہیں۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ صواتھی مختلف اقوام کا مجموعہ ہیں۔ یہ خان اس ضلع میں سب سے بڑا جاگیردار ہے جس کی سالانہ جاگیر بائیس ہزار روپیہ ہے۔ اس قوم کے دوسرے سربرآوردہ خوانین محمد اکبر خان ساکن گیدڑپور محمد حسین خان ساکن مانسہرہ۔ بہرہ خان ساکن کونش اور مظفر خان ساکن بھوگڑمنگ ہیں۔ جلاوطن خان اگرور بھی صواتھی ہے۔

پہلے گزیٹیر میں صواتھیوں کو اچھی صفات سے یاد نہیں کیا گیا۔ بہرحال یہ ذہین لوگ ہیں۔ مقدمہ باز اور مزارعوں پر سخت گیر ہیں۔ قد و قامت میں کمزور ہیں۔ اس واسطے ان کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔

قوم صواتی کے مشہور دیہات

مانسہرہ۔ وجہ تسمیہ۔ صواتیوں کی آمد سے پہلے کا نام ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانہ میں مان سنگھ ہندو نے آباد کیا تھا۔ صواتیوں نے پرانی تہ پر آبادی کی اور وہی نام رہا۔

صواتیوں نے جب یہ ملک ترکوں سے لیا تو مندرجہ ذیل چار دیہات جو سرحدات پر تھے عام ویش میں نہیں رکھے گئے تھے۔ ان چاروں دیہات کو چار پایہ بھی کہتے ہیں۔ ان کی حفاظت کا کام سب قوم کے سپرد زیر سرکردگی خان سید خان خان خیل ساکن گڑھی حبیب اللہ تھا۔

۱۔ برارکوٹ۔ زیادہ تر حد کشمیر سے ملتا تھا۔

۲۔ گڑھی حبیب اللہ۔ حد کشمیر و ملک بمبہ سے ملتی تھی۔

۳۔ مانسہرہ۔ سرحد قوم جدون و تنولی پر واقعہ تھا۔

۴۔ رچھا کوٹ۔ یاغستان قوم پٹھان کی سرحد پر تھا۔

محمد سید خان خود گڑھی حبیب اللہ میں رہا۔ اور اپنے بیٹے سعادت خان کو ساتھ رکھا باقی تین جگہیں اپنے باقی تین لڑکوں کو تقسیم کر دیں۔

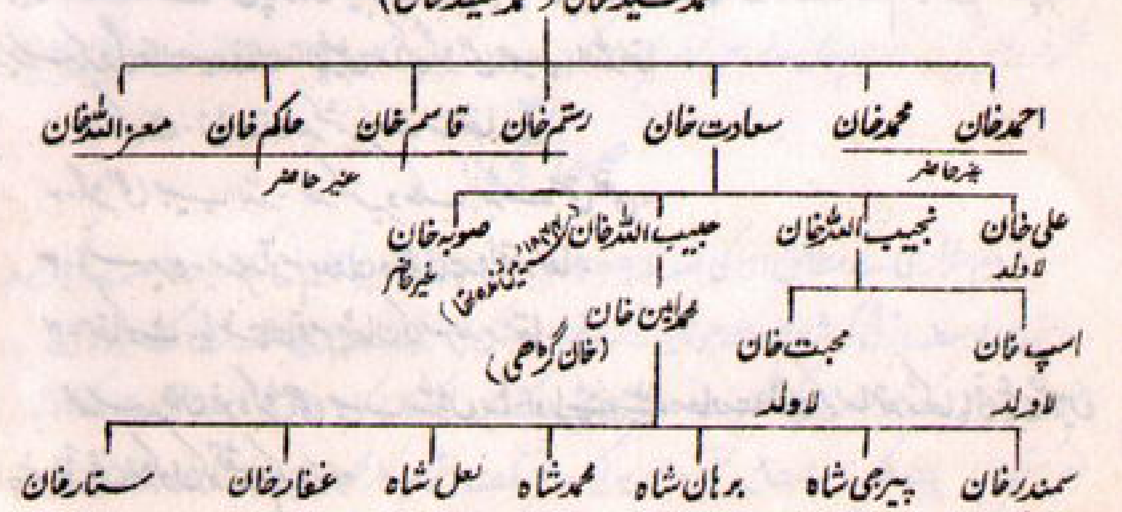
(ان واقعات کی [illegible] سے اقتباسات)

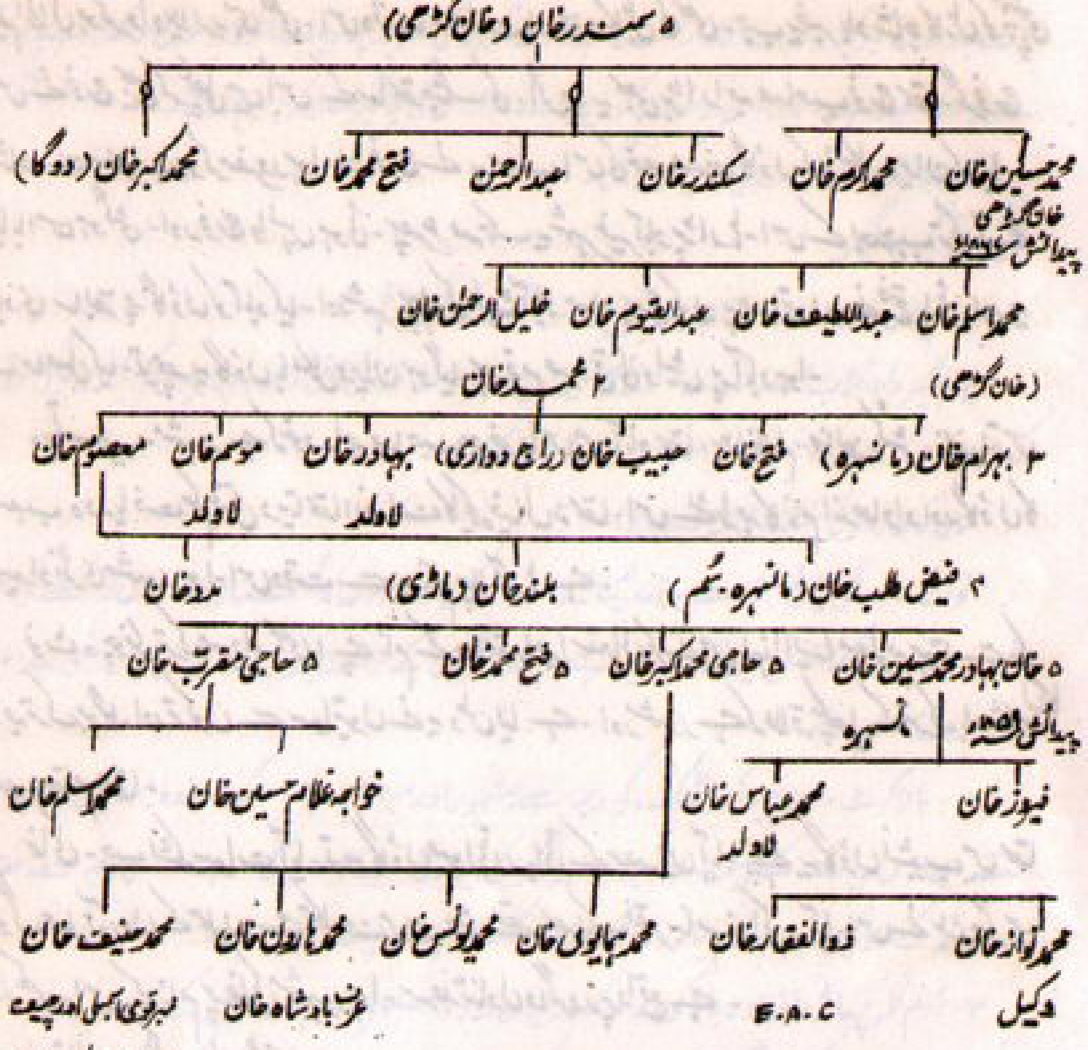
گڑھی حبیب اللہ

عرصہ ڈیڑھ سو سال (۱۸۶۲ء تک) ہوا جب صواتیوں نے پچھلی ترکوں سے بزور لے لی۔ تو یہ گاؤں بھی ان کے قبضہ میں آیا۔ جیسا کہ مانسہرہ کے حالات کے تحت تحریر کیا گیا۔ اس میں سید خان بمعہ اپنے لڑکے سعادت خان کے آباد ہو گیا۔ سید خان کی وفات کے بعد سعادت خان، خان ہوا۔ اس کو تیمور شاہ دُرّانی کی طرف سے جاگیر بھی عطا ہوئی۔ سعادت خان کے بعد اس کا لڑکا نجیب اللہ خان، خان ہوا۔ سنہ ۱۸۲۱ء میں سکھوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مانگل کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ تب اس کا لڑکا ہیبت خان صاحب دستار ہوا۔ اور خانی کا انتظام حبیب اللہ خان کے سپرد تھا۔ ہیبت خان کی وفات کے بعد اس کا چچا حبیب اللہ خان برادر نجیب اللہ خان گڑھی کا خان مقرر ہوا۔ حبیب اللہ خان مظفر آباد میں جو برائے امداد قوم بمبہ بہ باعث رشتہ داری کے گیا تھا جنگ میں مارا گیا۔ اس کے بعد امین خان والد سمندر خان صاحب دستار اور خان ہوا۔ امین خان نے سنہ ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا لڑکا سمندر خان، خان ہوا۔

وجہ تسمیہ:۔ سرحد کشمیر پر یہ ایک قلعہ تھا۔ قلعہ کو ملکی زبان میں گڑھی کہتے ہیں۔ پہلے یہ محمد سید خان کے نام پر مشہور رہتا۔ پھر نجیب اللہ کے نام پر گڑھی نجیب اللہ خان مشہور ہوئی۔ پھر حبیب اللہ خان کے نام پر گڑھی حبیب اللہ خان مشہور رہی۔ محمد امین خان جب خان ہوا تو اس نے اپنے باپ کے نام پر ہی نام برقرار رکھا۔

شجرہ نسب صواتی خان خیل گڑھی حبیب اللہ





بیدادی

صورت دیہی بندوبست سنہ ۱۸۷۲ء۔ سنہ ۱۸۹۹ء میں اول میاں عیسیٰ خان و غازی خان قوم ترک نے باجازت دیوان کرم چند حاکم وقت یہ گاؤں آباد کیا۔ عرصہ چار برس تک آباد رہا۔ جب ہم قوم صواتیاں گوت پنج میراں اور پنج مخول نے دیہات ورثہ بانٹنے کے باہم ولیش (تقسیم) کیا۔ تو قوم ترک کو نکال دیا۔

وجہ تسمیہ۔ ترکوں کے عہد سے پہلے راجہ جٹا سنگھ نامی ایک حاکم بڑا ظالم اس جگہ رہتا تھا۔ اس کے ظلم کی وجہ سے گاؤں بیدادی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اب تک یہی نام ہے۔ عہد مسلمانی سے قبل یہ گاؤں آباد ہوا تھا آبادی اس کی بہت پرانی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ اسلام سے پہلے ایک راجہ جٹا سنگھ، جٹا نامی، صاحب اقبال جس کے زیر حکومت ملک پنجاب و کشمیر وغیرہ کوہستان تھا۔ یہ گاؤں آباد کیا ہوا اس کا ہے۔ اور عدالت گاہ اس کی مشہور ہے۔ وہ یہاں رہتا تھا مگر بڑا سخت ظالم تھا۔ کل رعایا اس کے ہاتھ سے

سقیم الحال ہو کر واویلا کر رہی تھی۔ اس وقت سلطنت بادشاہ کابل کی تھی۔ جب یہ خبر بادشاہ کابل کو پہنچی تو اس نے فوج بھیج کر پکھلی میں اُس کے ساتھ جنگ کی۔ اگرچہ یہ بھی بڑا راجہ صاحب فوج تھا۔ مگر فوج بادشاہ سے مغلوب ہو کر مفرور ہوا۔ اور فوج نے بہ سبب اس کی خصومت گاؤں کو بالکل ویران کر دیا۔ رعایا باامن ہو گئی۔ اور فوج واپس ہوئی۔ پھر عرصہ تک یہ شہر غیر آباد پڑا رہا۔ اس کے بعد جب ترک آئے تو آبادی سابقہ پر گاؤں کو آباد کیا۔ اور شہر پہلے کی طرح آباد ہوا۔ پھر ترکوں پر سواتیوں نے فتح پائی۔ اور یہ ملک حاصل کیا۔ تو پھر یہ گاؤں بالکل ویران ہو گیا۔ پھر قوم سواتی کی ولیش پر آباد ہوا۔

وجہ تسمیہ:۔ مشہور ہے کہ خود راجہ صاحب جو خود اس میں آباد تھا، بڑا ظالم، مخالف کُش، ناخدا ترس بلا سبب و دریافت حکم قتل دیتا تھا انصاف کا کچھ خیال نہ تھا۔ اس لئے راجہ کا نام اندھا داد اور گاؤں کا نام بیداد نگری مشہور ہوا۔ اس وقت سے یہ نام چلا آ رہا ہے۔

نوٹ۔ چونکہ ترک سردار بھی اپنے نام کے ساتھ راجہ استعمال کرتے ہیں لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ راجہ ترک ہوگا۔ اور ترکوں سے سواتیوں نے یہ وطن لیا ہے۔ اور مشہور ہے کہ علاقہ پکھلی کے ترک بادشاہوں کا یہ صدر مقام تھا۔

خاکی۔ جب لشکر سوات آیا۔ تو یہ گاؤں سواتی ربانی کے حصہ میں آیا۔ پہلے یہ گاؤں نشیب میں تھا اور لوگ حملہ آوروں کے حملوں سے تکلیف میں رہتے تھے۔ پھر ایک فقیر بنام خاکی آیا۔ اس نے بلند جگہ پر بنیاد رکھی۔ اس کے نام پر خاکی مشہور ہوا۔ سرحد تناول و اگرور پر واقع ہے۔

اللہ داد خان۔ ساکن دلبوڑی

عطا محمد خان اگروری کا پھوپھی زاد تھا۔ اس کو سنہ ۱۸۵۷ء کی خدمات میں جاگیر ملی تھی۔ پھر پولیٹیکل وجوہات سے اگرور کی جاگیر موضع چھو ہرہری پور سے تبدیل کر دی گئی تھی۔ اس کی وفات پر اُس کی جاگیر اس کے دوسرے لڑکے عبداللہ خان کو دی گئی۔

شجرہ نسب اللہ داد خان

- تنولی بیوی
  - جہانداد خان — عمر ۵۳ سال
- سواتی بیوی
  - عبداللہ خان — عمر ۴۴ سال
  - بہرام خان — عمر ۴۰ سال
- گوجر بیوی
  - غازی خان — عمر ۳۰ سال
  - نواب خان — عمر ۲۵ سال
  - میر زمان — نابالغ
  - عبدالرحمٰن — نابالغ

ڈپٹی کمشنر کا خط بنام کمشنر مورخہ ۴ / ۱۱ / ۱۸۹۸ء

اللہ داد خان کو خان اگرور عطا محمد خان نے ورغلا کر حملہ پولیس چوکی اوگی میں شامل کر لیا تھا۔ لیکن وہ

بہت بارسوخ کیرکٹر والا اور وفادار انسان ہے۔ وہ اگرور کی سرحد پر بہت اثر و رسوخ رکھتا ہے اور ہمارے لئے بہت مفید ہے۔ لہٰذا اس کو معاف کر دیا جائے اور اس کی جاگیر بحال کر دی جائے۔

آخر بمنظوری حکومت یہ بحال کر دی گئی۔

گلی باغ کی جاگیر

بنام لال خان ولد بہت خان جہانگیری سواتی ساکن گلی باغ

یہ جاگیر راجہ گلاب سنگھ نے سنہ ۱۸۵۴ء میں بدیں شرط عنایت کی تھی کہ ۲۵ سپاہیوں کی ایک چوکی ڈوم گلہ کے درہ بر سڑک مابین مانسہرہ و بالاکوٹ کی حفاظت کرے۔

لال خان جولائی سنہ ۱۹۱۰ء میں فوت ہوا۔

نوٹ۔ ۱۔ گلی باغ بفہ سے بہ قدر تین میل دور ترک بادشاہوں کا گلستان تھا۔ اس واسطے گلی باغ مشہور ہوا۔ اس کے متصل عیدگاہ کا رقبہ ہے۔ یہاں ترکوں کے وقت عید کی نماز پڑھی جاتی تھی لہٰذا عیدگاہ کے نام سے مشہور ہوا۔

۲۔ بالاکوٹ۔ بالا پیر کی بیٹھک کی وجہ سے مشہور اور موسوم ہے۔ سکھ، ہندو، مسلمان سب اس کے معتقد ہیں۔ اس زیارت کے چشمہ سے جذام اور گلڑ کی بیماری سے صحت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے حکومت نے اس جگہ کے نزدیک جذام کے بیماروں کے علاج کے لئے ایک ہسپتال بنا دیا ہے۔

۳۔ ڈوم گلہ پہاڑ۔ بفہ اور بالاکوٹ کے درمیان اور مانسہرہ سے چودہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں ایک لنگڑا ڈوم یہاں رہا کرتا تھا۔ جو اپنے ساتھ میان میں لکڑی کی تلوار رکھتا تھا اور مسافروں کو قتل کی دھمکی دے کر اُن کو لوٹا کرتا تھا اس وجہ سے اس کو ڈوم گلہ کہتے ہیں۔ یہ ڈوم آخر ایک من چلے کے ہاتھ سے قتل ہو گیا۔

خاندان بٹل

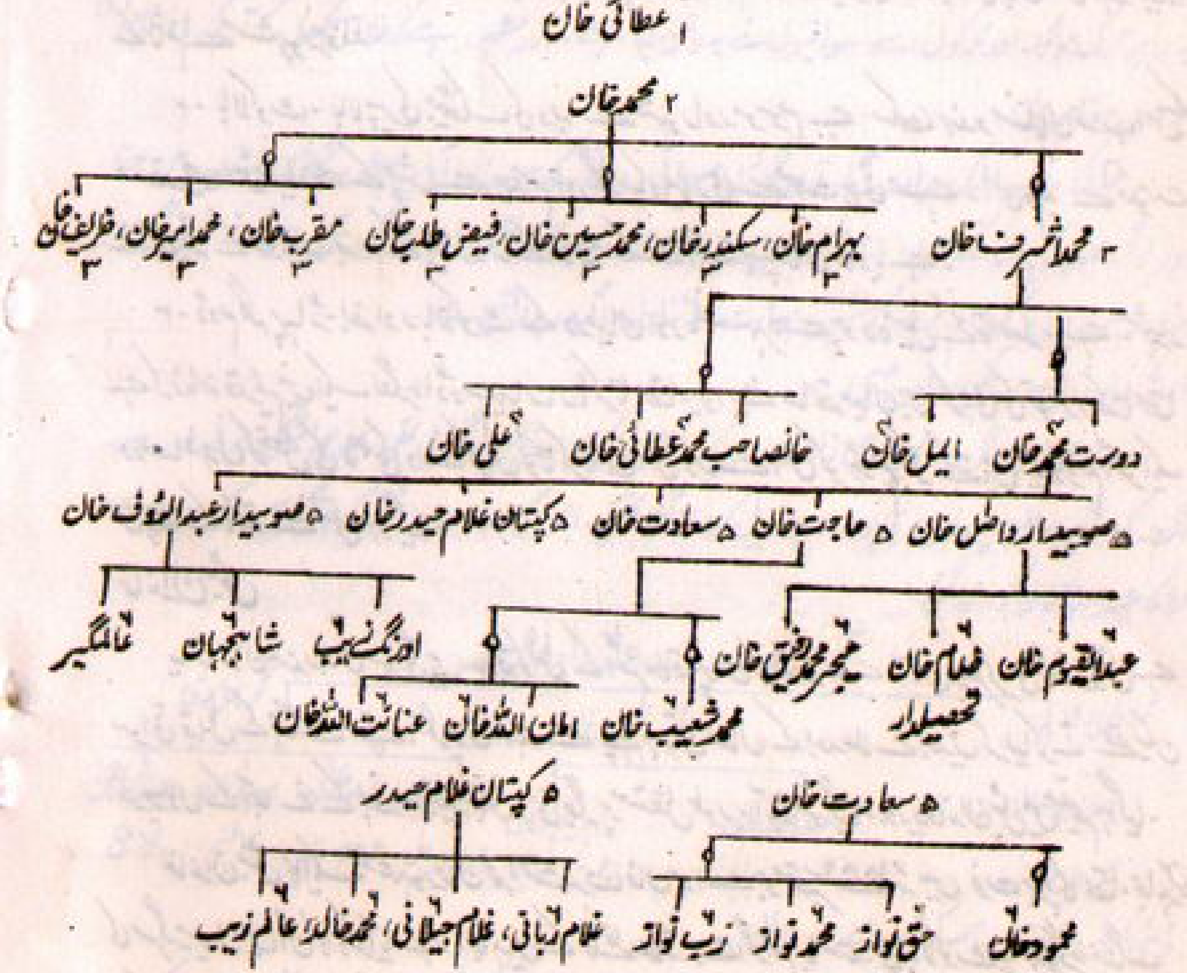
یہ خاندان منڈراوی سواتی ہیں۔ علاقہ کونش کے اکثر علاقہ پر ان کا قبضہ ہے۔ جس کا مرکزی گاؤں بٹل ہے سواتی قبائل کے مختلف حصے انگریزی عہد سے پہلے ہر تین سال کے بعد علاقے تبدیل کر لیا کرتے تھے لیکن انگریزوں کے آجانے کے بعد ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ پر مستقل طور پر آباد ہو گیا۔ اور یہ خاندان بٹل میں مقیم ہو گیا۔

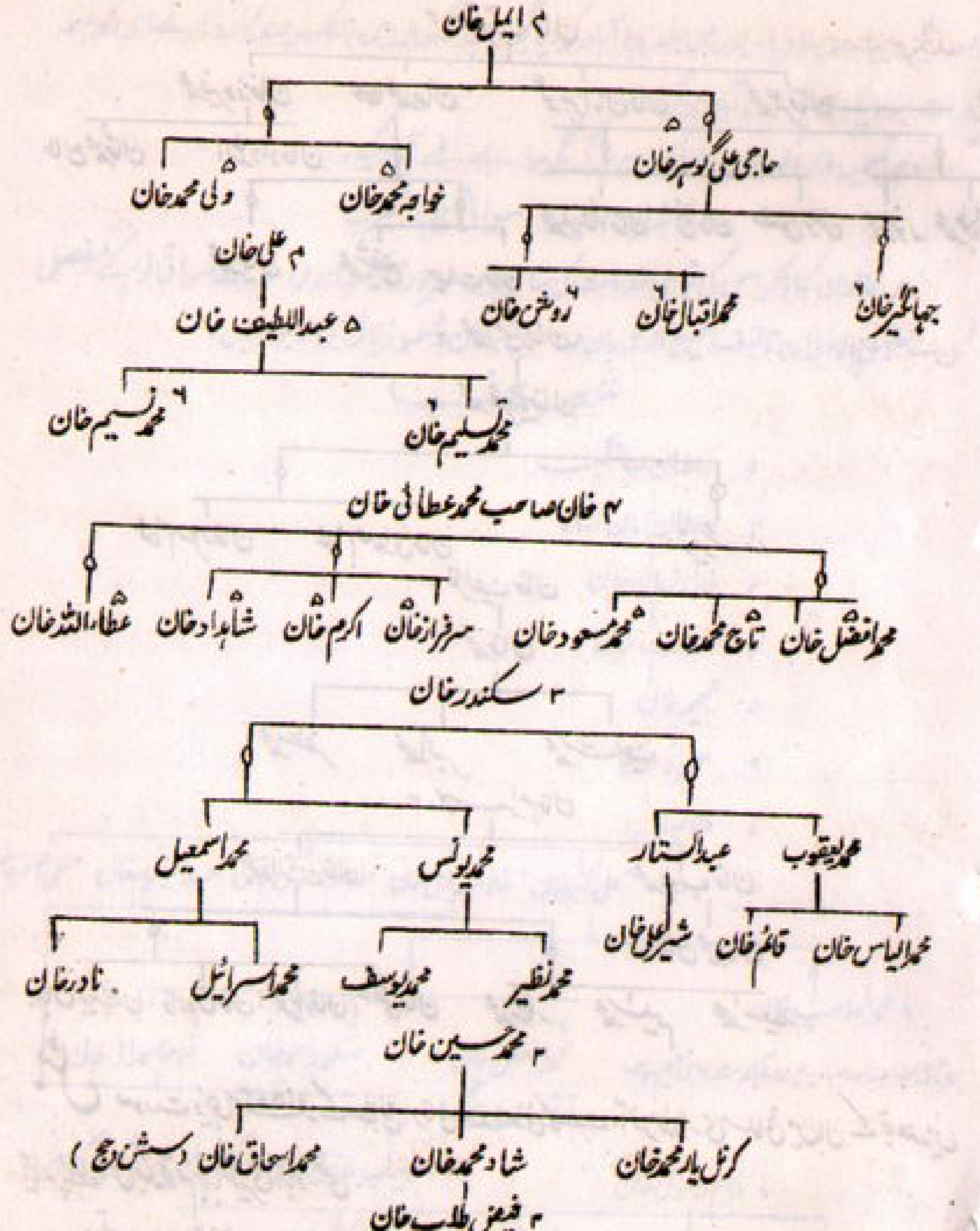
خاندان بٹل کا ایک مشہور خان محمد اشرف خان ہوا ہے جو ستمبر ۱۸۹۶ء میں فوت ہو چکا تھا۔ مجاہدین کی سرگرمیوں میں اُن کا ذکر آیا ہے۔ مجاہدین کے قافلے علاقہ بٹ گرام براستہ بٹل بالاکوٹ یا بھوگڑمنگ جایا کرتے تھے تو ان کی مناسب امداد کی جاتی تھی۔

محمد اشرف خان کی وفات کے بعد بہرام خان اس خاندان کے سرکردہ فرد تھے اور تازیست سربراہی کرتے رہے ۔ ان کی وفات کے بعد خان صاحب محمد عطائی خان خاندان بٹل کی قیادت کرتے رہے ۔

۱۹۳۶ء میں وہ سرحد صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے ۔ ان کے اہتمام و کوشش سے ہزارہ کے ممبران نے ڈیموکریٹک پارٹی بنائی ۔ جس کے دوسرے ممبر محمد سرور خان طاہر خیلی ، راجہ عبدالرحمٰن خان نگری ٹوٹیال اور محمد عباس خان شم الہیٰ منگ (مانسہرہ) تھے ۔ ان کی کوشش سے ہزارہ کے ایک ممبر کو وزارت میں شامل کر لیا گیا ۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے داماد شاد محمد خان نے ۱۹۵۱ء میں محکمہ تعلیم سے استعفاء دے کر اسمبلی کا انتخاب مسلم لیگ ٹکٹ پر لڑا ۔ اور کامیاب ہوئے اور ۱۹۵۶ء تک اسمبلی کے ممبر رہے ۔ خوش اخلاق ، مستعد اور قومی کارکن ہیں ۔ اپنے علاقہ کی ترقی میں کوشاں رہتے ہیں ۔ اور اس کوشش میں بوجہ اخلاص کے کامیاب ہیں ۔

شجرہ نسب خاندان بٹل (مندرا وی سواتی)





۳ مقرب خان

محمد فیروز خان ، عطا محمد خان ، گوہر امان خان ، محمد عمر خان ، گوہر خان

طالع محمد خان ، اللہ داد خان

محمد جان ، محمد شفیع ، حیات خان

محمد ارشاد خان ، فتح خان ، مفضل الرحمن ، محمد انور ، محمد طہماسپ

۲ محمد امیر خان

محمد فرید خان

غلام سرور خان ، غلام صمدانی خان ، وزیر محمد

۳ ظریف خان

محمد خان

محمد مظفر ، محمد اکبر ، محمد شریف

۳ بہرام خان

عبدالرحمن خان ، محمد ایوب خان

سلطان محمد خان

جہان زیب خان ، فاروق خان ، گلزار خان ، مفتی خان ، محمد نثار ، محمد سلیم ، محمد سعید

بٹل صورت دیہی ۱۸۷۲ء کے مطابق ارنالی مندر اولی کا ہے۔ آخر علاداری مسلاقی میں ان کے قبضہ میں آیا۔ پہلے اس جگہ قوم جہانگیری آباد تھی۔

وجہ تسمیہ:۔ پرانا نام ہے۔ وجہ معلوم نہیں۔

بالاکوٹ صواتی قوم کا ہے۔ مختلف خیل یہ ہیں۔ چوراخیل ، ہارون خیل ، کمال خیل ، اسمٰعیل خیل۔ بوچہ خیل ، علی خیل ، انچہ خیل ، پائندہ خیل ، آدمان خیل ، ربیلا خیل ، جوگا خیل ، خان خیل ، احمد خیل علی محمد خیل ۔ یار محمد خیل ۔ ڈنڈا خیل ۔ دوالے ، قوم گوجر ۔ کٹھانہ اور سید صورت دیہی کا بیان ہے۔ عہد اسلام میں جب ہمارے بزرگوں نے اس پر قبضہ کیا۔ تو گاؤں آباد تھا۔ اخیر عہد اسلام میں سلطان متولی بنبہ نے

بمعہ دیگر دیہات جلا دیا۔ بعد میں جلد ہی آباد کر دیا گیا۔ عہد سکھاں میں نانک چند کاردار نے اس کو بمعہ دیہات جلا دیا۔ پھر جلدی آباد ہو گیا۔

وجہ تسمیہ اس کو بالا پیر جو ایک بزرگ گزرا ہے۔ نے آباد کیا۔

خاندانِ سفیدہ ۔ سواتی جہانگیری

اس خاندان کا ذکر اس کی قومی خدمات کی بنا پر میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ویسے صواتی قوم کے مفصل شجرے تحقیق الافغان تالیف سمیع اللہ جان صاحب ساکن ڈھوڈیال میں موجود ہیں۔

شجرہ نسب

۱ سلطان جہانگیر

۲ سلطان امان شاہ

۳ خانی زمان خان

۴ سعادت خان

۵ نجیم خان

۶ حمزہ خان

۷ غلام خان

۸ علی اصغر خان ، ۸ عبدالقیوم خان ، غلام رسول خان ، ۸ غلام ربانی خان ، ۸ علی اکبر خان

۹ محمد طہماسپ خان ریٹائرڈ صوبیدار اب یہ حیدرآباد سندھ میں مقیم ہے

۹ محمد افضل خان بی اے ایل ایل بی علیگ ، ۹ منظور احمد خان ، ۹ غلام صمدانی خان

۹ حبیب الرحمن خان ریٹائرڈ چیرمین یونین کمیٹی

۸ غلام رسول خان

۹ محمد انور خان ، ۹ شوکت علی خان ، ۹ مظہر الحق خان ، ۹ نثار الحق خان ، ۹ فدا محمد خان

۸ عبدالقیوم خان

توفیق خان ، جاوید خان ، طارق خان ، محمد سلیم خان ، بصیر احمد خان ، نصیر احمد خان

۸ علی اصغر خان

۹ اورنگ زیب خان سکواڈرن لیڈر ، ۹ جہان زیب خان ڈپٹی کمشنر ، ۹ عالم زیب خان ، ۹ اختر زیب خان

سیاسی خدمات کے لحاظ سے اس خاندان کے نامور افراد غلام رسول خان اور عبدالقیوم خان ہیں۔

غلام رسول خان - تاریخ پیدائش ۱۸۸۲ء ہے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد غالباً ۱۹۰۳ء میں گھر سے نکلے۔ ۱۹۰۸ء میں واپس آئے۔ اس اثنا میں افریقہ کے مختلف حصوں میں پھرتے رہے۔ (دارالاسلام ممباسہ (مشرقی افریقہ) میں، کچھ مدت گزار کر وسطی افریقہ میں گھومتے رہے۔ آخر کار جنوبی افریقہ۔ ٹرنسوال میں تقریباً چار سال مقیم رہے۔ واپسی پر سیاسی خیالات میں کافی تبدیلی لے کر آئے یہاں پر یہ بات قابل لحاظ ہے۔ کہ ہزارہ سے عموماً اور مانسہرہ سے خاص کر بہت سے لوگ افریقہ۔ امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا (برما انڈونیشیا۔ ملائشیا۔ سیام۔ ہانگ کانگ) تلاش روزگار میں جاتے رہے۔ اور واپسی پر اس سیاحت کے دوران میں ان ممالک سے سیاسی خیالات کا اثر لے کر آتے رہے۔ چونکہ تحصیل مانسہرہ سے کافی لوگ باہر جاتے رہے۔ لہذا تحصیل مانسہرہ کے لوگ سیاست ہزارہ میں سرکردہ حیثیت کے حامل رہے اور اب بھی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سیاسی زندگی کی حرارت اس تحصیل میں اول نمبر پر ہے۔

غلام رسول خان، ٹرنسوال کے قیام کے دوران گاندھی جی وہاں کی عدالت اعلیٰ (سپریم کورٹ) میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ وہاں پر تمام ہندوستانی۔ ہندو مسلمان ایک قوم تھے۔ جن کے ساتھ گوروں کا سلوک غیر مہذبانہ بلکہ وحشیانہ تھا۔ گاندھی جی کے خیالات میں بھی تبدیلی وہیں ہوئی۔ اور وہیں سے غلام رسول خان کے خیالات میں بھی تبدیلی ہوئی۔ واپس آنے کے بعد تادم مرگ (سال ۱۹۵۱ء) خفیہ پولیس ان کے پیچھے لگی رہی۔ وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ سال ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ بہ سلسلہ خلافت تحریک گرفتار ہوئے۔ دوبارہ ۱۹۲۰ء معہ کئی رشتہ داروں کے گرفتار ہوئے۔ اور چند ماہ بعد رہا کر دئے گئے آخر ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے اور زیر دفعہ چالیس سرحدی قانون تین سال با مشقت کی سزا پائی۔ سال ۱۹۲۴ء میں رہا ہوئے سیاسی تحریکات میں ہمیشہ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ آخر دم تک قومی خدمت کا وطیرہ رہا۔ ۳ر جولائی ۱۹۵۱ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

عبدالقیوم خان - پیدائش ۱۸۹۳ء ہے۔ یہ ملایا (حال ملیشیا) کچھ مدت کے لئے گئے اور جلدی ہی واپس آ گئے۔ اور سونی پت میں اپنے بھائی غلام ربانی خان کے پاس جو وہاں گرداور قانون گو تھے۔ رہے وہاں مڈل پاس کیا اور میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد و ایم۔ اے۔ او ہائی سکول امرتسر سے سال ۱۹۱۲ء میں پاس کیا۔ اس وقت ان کے بھائی غلام ربانی خان امرتسر سے آ گئے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں بی اے پاس کیا۔ ان کا نام ای۔ اے۔ سی (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) بطور امیدوار درج ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت بہ سرکردگی مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہروی نے زور پکڑا۔ یہ اس تحریک میں شامل ہو گئے

ڈپٹی کمشنر ہزارہ (کرنل جیمس۔ ایک سخت گیر اور جابر انگریز) نے ان کو بلا کر نصیحت وغیرہ کی کہ وہ تحریک میں حصہ نہ لیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مذہبی معاملہ ہے اور وہ اس سے دست بردار نہ ہوں گے۔ اس پر ڈپٹی کمشنر نے ان کا نام خارج کرا دیا۔

۱۹۲۱ء میں خلافت کمیٹی پشاور کے سکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ گرفتار ہوئے اور تین سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ ان کو سنٹرل جیل پشاور میں رکھا گیا۔ وہیں ان کے بڑے بھائی غلام رسول خان، ملک خدا بخش مرحوم سابق جوڈیشنل کمشنر سرحد۔ محمد جان خان بیرسٹر ساکن بنوں و دیگر علماء خلافت تحریک بھی قید تھے۔ بڑی استقامت سے قید گزاری ۱۹۲۴ء یا شروع ۱۹۲۵ء میں رہا ہوئے۔

اس کے بعد آپ ایل۔ ایل بی کے لئے علی گڑھ کالج گئے۔ ان ہی ایام میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان بھی وہاں زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۴۳ء ترک موالات کانگرس کے سکرٹری رہے پہلی ۱۹۳۲/۳۳ء سرحدی لیجسلیٹو کونسل کے لئے تحصیل مانسہرہ سے واحد نشست کے واحد نمائندہ چنے گئے تھے۔

دوسرے انتخاب ۱۹۳۷ء میں کامیاب نہ ہو سکے۔

- -

- -

تیسرے انتخاب ۱۹۴۵ء میں پھر - - - - - - - - - - - - کامیاب ہوئے۔ قاضی عطاء اللہ (مردان) وزیر مال کے اصرار پر ان کے پارلیمنٹری سکرٹری کے عہدہ قبول کر لیا۔ ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ لیکن کام برائے نام تھا کچھ مدت بعد اس لئے استعفاء دے دیا کہ کام کچھ بھی نہیں اور سرکاری خزانہ سے مفت میں ایک ہزار ماہوار لینا حرام ہے۔

پاکستان بنتے پر وہ حکومت سرحد کے ہم نوا نہ ہو سکے۔ حالانکہ کانگرس ممبر اپنا مقام چھوڑ چکے تھے۔ اس اثناء میں اُن پر ایک مقدمہ بنا کر جیل بھیج دیا گیا۔ تین ماہ تک حوالات میں رہے۔ آخر کار ہائیکورٹ نے رہا کر دیا۔

۱۹۴۰ء میں جب کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو کانگرس نے عدم تعاون کا اور فوج میں بھرتی حرام ہے کا نعرہ شروع کیا۔ ہزارہ (مانسہرہ) میں بھی یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ سب لیڈر باری باری سے نعرہ لگاتے اور جیل چلے جاتے تھے۔ جب ان کی باری آئی تو اِن کو ہائی کمانڈ کا حکم تھا کہ بفہ جا کر

بازار میں یہ نعرہ لگانا ہے۔ تاریخ مقررہ پران کی اکلوتی لڑکی سخت بیمار تھی اس کو بادیدہ تر آخری بار دیکھ کر دو تین سو قدم گئے ہونگے کہ وہ فوت ہو گئی لوگ دوڑ کر گئے کہ جنازہ کر کے جائیں لیکن کہنے لگے "اپنے وقت پر نہ پہنچ سکوں گا۔ اس لئے واپس نہیں جا سکتا۔ لڑکی کو دفن کر دو اور میرے لئے دعا کرو۔"

اپنے وقت پر بغہ پہنچے اور نعرہ لگایا۔ پولیس کھڑی تھی گرفتار کر لیا۔ اور چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ پورے چھ ماہ قید گزار کر واپس آ گئے۔

خوب قوم و آزادی وطن کے لئے سب کچھ نثار کر دیا۔ سب اراضیات رہن کر چکے تھے۔ مالی حالت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ آخر ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء کو ہزارہ کا یہ جلیل القدر فرزند، عزم و استقلال کا پہاڑ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔

علی اصغر خان ۔ اس خاندان میں سب سے چھوٹے بھائی ہیں ۔ نامور ایڈوکیٹ ہیں اور مدت سے مردان ہی میں رہائش رکھتے ہیں۔ ہزارہ کے لئے باعث فخر ہیں۔ آپ کی پیدائش اگست ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ انٹرنس ایم اے او سکول امرتسر میں اپنے بڑے بھائی غلام ربانی خان نائب تحصیلدار بندوبست کے زیر سایہ رہ کر پاس کی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں ۱۹۱۳ء (جب کہ کالج پورا تیار بھی نہ ہوا تھا) داخلہ لیا۔ ۱۹۱۸ء میں بی اے کیا۔ ایل ایل بی علی گڑھ کالج (الہ آباد یونیورسٹی) سے ۱۹۲۰ء میں کی۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں مردان پریکٹس شروع کی۔ اور تا حال وہیں مقیم ہیں۔ نواب محمد اکبر خان ہوتی کے مستقل وکیل رہے۔ آپکے چار لڑکے ہیں۔ اور سب ہی لائق اور اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔

آپ نے ۱۹۳۰-۳۱ء کی تحریک آزادی میں حصہ لیا اور چھ ماہ ہری پور جیل میں بھی گزارے۔ ماضی قریب حال میں تحصیل مانسہرہ کے مندرجہ ذیل خوانین قابل ذکر ہیں۔

مانسہرہ کا خان، زمان خان تھا۔ گیدڑ پور کا خان حاجی اکبر خان تھا۔ بجنہ کا خان عبدالحمید خان اور شل کا بیرہ خان تھا۔

زمان خان مانسہرہ کا واحد خان ہوا ہے اس کا لڑکا جمعہ خان مشہور و معروف مہمان نواز تھا۔ جمعہ خان کا بیٹا خان بہادر علی گوہر خان تھا جو ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کشمیر تھا۔ وہ کچھ مدت سری نگر کا گورنر بھی رہا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں قتل ہوئے۔ ان کا ایک بیٹا محمد اکبر خان مانسہرہ ٹاؤن کمیٹی کا چیرمین ہے ۔ خان بہادر علی گوہر خان مرحوم کا چچا زاد بھائی محمد ایوب خان ہے جو کئی سال مانسہرہ ٹاؤن کمیٹی کا چیئرمین رہا۔ ایک مستقل طبیعت کا انسان ہے۔ فرض منصبی پر مضبوطی سے قائم رہتا ہے۔ مجلس آرا اور خوش طبیعت ہیں

معمر ہو جانے کی وجہ سے اب گوشہ نشین سے ہو گئے ہیں۔ زمانہ حال کے مانسہرہ کے دیگر برگزیدہ افراد یہ ہیں:-

۱۔ حاجی سربلند خان اچھڑیاں، زمانہ شناس تجربہ کار اور صاحب دولت و اخلاق انسان ہیں۔

۲۔ خان بہادر غلام ربانی خان، آپ خان مطیع اللہ خان صاحب تحصیلدار مرحوم کے فرزند ہیں۔ بہت مشہور سیاست دان اور ماہر ایڈوکیٹ ہیں۔ اب زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے خانہ نشین سے ہو گئے ہیں۔ آپ کے بیٹے قابل اور نامور افراد ہیں۔ محمد بشیر خان C.S.P (۲) بریگیڈیر ممتاز خان ستارۂ پاکستان فوج۔

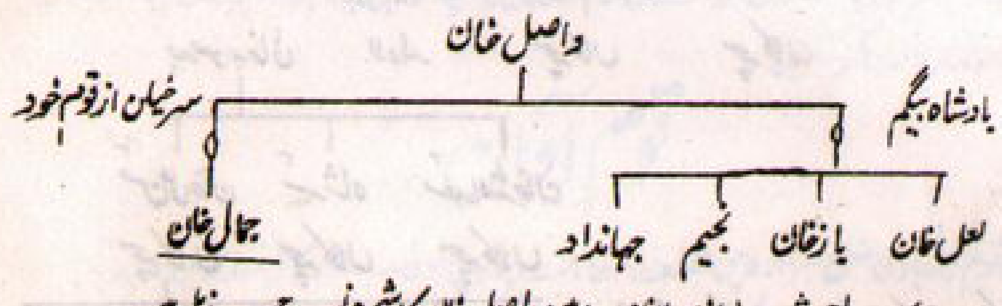
۳۔ کرنل شوکت خان انجینیر۔

مانسہرہ کے خان سرفراز خان آج کل بنوں کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ وطن دوست، احباب پرور اور قابل ترین پولیٹکل افسر ہیں۔ (۱۹۶۸ء کے آخر میں پنشن پر آ گئے ہیں) خان محمد حنیف خان قومی اسمبلی کے چیف پارلیمنٹری سکرٹری ہیں۔ آپ کے دادا مرحوم خان بہادر محمد حسین خان مانسہرہ کے قابل عزت ہستی تھے آپ آنریری مجسٹریٹ تھے۔ آپ کے دو فرزند نامور ہوئے۔ محمد فیروز خان جو تحصیلدار تھے شرافت و حیا کے پتلے تھے۔ اور ان کے بھائی محمد عباس خان نے سیاست میں نام پیدا کیا۔ ان کے حالات کسی دوسری جگہ درج کئے گئے ہیں۔

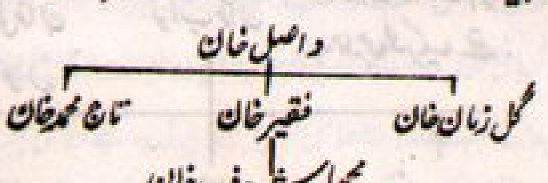
بالاکوٹ

صواتی - سرخیلی - بجوری

شجرہ نسب مطابق بندوبست ہزارہ ۱۸۷۲ء



سیرت سید احمد شہید (از مولانا مہر) میں واصل خان کا شجرہ نسب حسب ذیل ہیں۔



مولانا مہر تحریر کرتے ہیں کہ سید احمد شہیدؒ معرکہ بالاکوٹ کے ایام میں واصل خان کی حویلی میں ٹھہرے تھے۔

اور یہ شجرہ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں بالاکوٹ جاکر مرتب کیا۔ لکھتے ہیں:۔
محمد اشرف خان ۱۹۴۶ء میں موجود تھا۔
بالاکوٹ میں ایک دوسرا مشہور خاندان لہاری لغماتی ہیں۔ شجرہ نسب یہ ہے۔

۱ غلام خان
۲ محب اللہ خان
۳ سیف اللہ خان۔ یہ علاقہ خود کی جماعت مجاہدین کے لیڈر تھے۔
۴ جمعہ خان

۵ بہادر خان — وفات اپریل ۱۹۶۷ء
۵ ناصر خان — محمد اعظم خان
۵ نادر خان — لاولد۔ وفات ۱۹۶۰ء

۶ امان اللہ خان — ۶ محمد سرور خان — ۶ محمد فرید خان — ۶ شیر افضل خان

خاندان سچہ و بھوگڑ منگ ۔ سواتی۔ جہانگیری

۱ جہان بیگ خان

۲ صوبہ خان — جد صوبہ خانی
۲ جہانگیر خان — لاولد
۲ اجرام خان — سچہ کلاں
۲ حافظ خان — سچہ کلاں

۳ حسن علی خان — سچہ کلاں
۳ سید شاہ — سچہ کلاں
۳ سعد اللہ خان — سچہ کلاں

فیروز خان — سچہ کلاں
دیدار علی خان — سچہ کلاں
نواب خان

خان بھوگڑ منگ ہمراہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ بالاکوٹ میں سکھوں پر حملہ میں شریک تھے۔

خان بہادر مظفر خان — ارسلا خان — غلام حیدر خان

حاجی جان محمد خان — محمد افضل خان — محمد سرور خان — سرفراز خان — خداداد خان سابق وزیر صحت — میر داد خان

ریاض محمد خان ۵۰۸ نیاز محمد خان

۲ صوبہ خان سچہ کلاں
۳ سعد اللہ خان
۴ اجرام خان
۵ زید اللہ خان

۶ عظیم اللہ خان — ۶ محمد اکبر خان

۷ محمد عمر خان — ۷ محمد نواز — ۷ محمد کرم خان — ۷ گوہر خان — ۷ عبد الغنی خان

چند تاریخی واقعات

۱۔ سچہ کے خان حسن علی خان پر شبہ کیا جاتا تھا کہ وہ سکھوں کا طرفدار تھا۔ (سیرت شہید مولانا مہر ص ۱۵)
۲۔ حسن علی خان نے اپنے بھائی کی حویلی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے لئے موضع سچہ میں خالی کرادی تھی۔ (۱۶۰ء)
۳۔ سر جارج روس کیپل مشہور چیف کمشنر صوبہ سرحد ہزارہ کے دورہ پر دادی کونش میں بمعہ تمام عملہ کے خان عظیم اللہ خان کا مہمان ہوا کرتا تھا تمام مہمانوں اور ان کے گھوڑوں تک کا راشن یہ خان دیا کرتا تھا۔
۴۔ خاندان بھوگڑ منگ میں موجودہ زمانہ کی مشہور شخصیت خداداد خان کی ہے۔ آپ ۱۹۵۶ء میں وزیر صحت مغربی پاکستان تھے۔ مارشل لاء کی وجہ سے سول حکومت معطل ہوجانے پر وہ بھی اپنے ہاں اگر سماجی کاموں میں پھر مشغول ہوگئے۔ آپ نے قائداعظم کے فرمان کے مطابق سواتی قوم میں مسلم لیگ کو ایک بااثر اور فعال پارٹی بنایا۔ کانگرس حکومت کی مخالفت میں آپ کو جیل جانا پڑا۔ اب بھی سیاست قومی اور ملکی میں موثر کردار ادا کرتے ہیں۔

قوم آوان

اس قوم کی آبادی ضلع ہزارہ میں مختلف مقامات پر پھیلی ہوئی ہے اور کافی تعداد میں ہے۔
میں نے بہت کوشش کی کہ ان کا مکمل حسب و نسب سنہ آمد وغیرہ کا سراغ لگاؤں۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مندرجہ ذیل معلومات کچھ زبانی اور قدرے تاریخ ہزارہ (بندوبست ۱۸۷۲ء) اور تاریخ جہلم سے دستیاب ہوئیں۔ تاریخ جہلم تصنیف ۱۹۰۴ء سے اس قوم کی آمد پر قدرے روشنی پڑتی ہے۔ اس میں یہ اندراج ہے۔ "کل مغربی حصہ ضلع جہلم قوم آوان کے قبضہ میں ہے۔ جو اغلباً ڈھائی سو برس سے یہاں آباد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہرات سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ اور شاید بیکٹرین (باختری) یونانیوں کی

اولاد سے ہیں۔ تاتار کے لوگوں نے اِن کو بلخ سے جنوب کی طرف نکال دیا۔ ہرات سے پھرتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ یہ لوگ اپنے افسران کی زیرِ نگرانی فتح کرتے ہوئے جلد ہی علاقہ جات تلہ گنگ۔ بکھڑ۔ میانوالی۔ جبی۔ بھون۔ کیسکے۔ نور پور۔ کالا کہار۔ اور تھل کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ اور قدیم مالکان قوم جنجوعہ کے راجگان کو نکال دیا۔ یہ لوگ اپنے سرداران کو "ملک" کہتے ہیں۔

راورٹی کی رائے میں بُدلی یا بُدنی بہت سے قبائل کا مجموعہ تھا۔ جو ننگر ہار سے تا دریائے سندھ کے درمیانی علاقہ پر قابض تھے۔ جب افغان اقوام علاقہ بنگش (موجودہ کُرم) میں داخل ہوئیں تو بُدلی یا بُدنی وہاں سے نکال دئیے گئے۔ اگرچہ راورٹی اُن کو بُدھ قرار دینے کے حق میں نہیں تاہم وہ بموجب رائے اخون درویزہ (۹۳۳ھ سے ۱۰۳۶ھ) کے کافر تھے۔ راورٹی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان بُدلی قبائل کو حاکم تیرہ (PICH) اور لغمان نے وہاں سے نکالا تھا۔ وہاں سے نکالے جانے کے بعد مشرق کی طرف چلے گئے اور اخون درویزہ کے قول کے مطابق وہ مشرق میں اپنے ہم قوموں سے جا ملے۔ راورٹی کے خیال میں آوان، کھٹڑ اور گکھڑ وہی بُدلی یا بُدنی اقوام ہیں جو دریائے سندھ کو عبور کر کے سندھ ساگر دوآب میں آکر آباد ہو گئے۔

اسی کتاب ابٹسن جلد سوم میں صفحہ ۲۵، ۲۶، ۲۷ پر تحریر کرتا ہے۔ کہ آوان زیادہ تر سلسلہ کوہ نمک میں پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی اس سے مشرق، مغرب اور جنوب کے علاقہ میں آباد ہیں۔ جہلم سے دریائے سندھ تک ان کی آبادی کی کثرت ہے۔ اور یہ کوہ سلیمان اور کوہ سفید کے دامن تک بھی آباد ہیں۔ زمانہ قدیم میں سلسلہ کوہ نمک کے مغربی طرف کے میدان میں یہ قوم قابض تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ پٹھانوں نے اٹک پار سے آکر اور جہلم کی طرف سے ٹوانوں نے ان کو بے دخل کر دیا۔

وجہ تسمیہ:۔ یہ عرب معلوم ہوتے ہیں اور لفظ اعوان معاون افواج عرب سے اِن کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو قطب شاہ کی اولاد جو خود حضرت علیؓ کی اولاد سے تھے جانتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے خیال میں وہ علوی تھے۔ خاندانِ عباسیہ کی مخالفت سے وہ سندھ میں آباد ہوئے اور بعد میں سبکتگین سے مل گئے۔ اور اُس کے اعوان (معاون) کہلائے۔

لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ قطب شاہ کی اولاد ہیں۔ جو ہرات کا حاکم تھا۔ اور محمود غزنوی کے ہمراہ ہندوستان پر چڑھائی کے وقت ہمراہ آیا۔ قطب شاہ کے ساتھ اس کے مندرجہ ذیل لڑکے بھی آئے۔

۱۔ گوہر شاہ (گُمراڑہ) جو سکیسر کے نزدیک مقیم ہو گیا۔

۲۔ کلان شاہ (کلگان) جو دھن کوٹ (کالا باغ) میں مقیم ہو گیا۔

۳۔ چوہان۔ جو دریائے سندھ کے پہاڑوں میں مقیم ہو گیا۔

۴۔ کھوکھر یا (محمد شاہ) جو چناب کے علاقہ میں متوطن ہو گیا۔

۵۔ توری اور جھاج جو تیراہ وغیرہ میں مقیم ہو گئے۔

"تحقیق الاعوان" کے مصنف خواص خان کے مطابق اعوان (آوان غلط ہے) محمد ابن الحنفیہ بن علیؓ کی اولاد ہیں۔ اور محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں آئے اور اعوان کا خطاب پایا۔ میر قطب شاہ ان کے مورث ہیں جن کا سن وفات ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) ہے۔ اور ان کا مدفن غزنی میں ہے۔

تحقیق الاعوان کے مطابق اعوان قوم کی ۸۳ گوتیں ہیں۔ ہزارہ میں اعوانوں کی آمد قحط ۱۷۸۳ء سے بعد کی ہے۔ یہ لوگ پشوار سے یہاں آئے۔ اسی وقت میں کشمیری بھی بہت سی تعداد میں کشمیر سے ترک وطن کر گئے اور ہزارہ میں بھی آئے۔

تحقیق الاعوان نے رئیس گھرانہ قوم اعوان کالا باغ کے متعلق مندرجہ ذیل حالات تحریر کئے ہیں۔ جس سے ان کی تاریخ کے ایک گوشہ پر روشنی پڑتی ہے۔

کالا باغ

جب قطب شاہ بابا نے اپنے مفتوحہ علاقہ کو تقسیم کیا۔ تو ان کے ہندوستانی حرموں میں سے بڑے بیٹے مزمل علی کلگان کے حصہ میں قلعہ ڈھنکوٹ (کالا باغ سے جانب مشرق چار میل کے فاصلہ پر) آیا۔

۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ نے ایک تجارتی وفد کابل بھیجا۔ جو اسی راستہ سے گزرا۔ اس علاقہ کا رئیس اس وقت ملک اللہ یار خان اعوان تھا۔

شجرہ

ملک اللہ یار خان (وفات ۱۸۶۳ء)
|
ملک مظفر خان (وفات ۱۹۰۸ء)
|
نواب عطا محمد خان (وفات ۱۹۲۴ء)
|
ملک امیر محمد خان (وفات بذریعہ قتل ۱۹۶۷ء)

تحقیق الاعوان کے مؤلف نے مولانا غلام رسول مہر (مسلم ٹاؤن لاہور) کو بھی اعوان بتایا ہے۔ ان سے میرا نیازمندانہ رسم و راہ ہے۔ اُن سے استفسار کیا گیا۔ انہوں نے تحریر فرمایا کہ وہ اعوان یا آوان میں

انہوں نے بھی اس قوم کے حالات دیکھنے کی کوشش کی اور اس ضمن میں باب الاعوان، زاد الاعوان وغیرہ بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ لیکن کوئی بھی علمی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے مستند معلوم نہ ہوئی وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

میرا خیال ہے کہ قطب شاہ یا عون قطب شاہ کے باب میں یہ کہنا کہ وہ محمود غزنوی کے ساتھ آئے تھے۔ صحیح نہیں۔ غوری کے ساتھ ممکن ہے درست ہو۔ اب مدت سے میری یہ رائے ہو گئی ہے کہ قطب شاہ بھی داتا گنج بخش کی طرح داعی اسلام تھے۔ باہر سے آ کر شمالی و مغربی پنجاب میں تبلیغ شروع کی اور ایک اچھا گروہ معاونین کا پیدا کر لیا۔ چونکہ بعد کے دور میں یہ لوگ فوجی خدمات دینے میں پیش پیش رہے۔ اس لئے خدمات عسکری کے سلسلے کا پیوند محمود غزنوی سے ملا یا گیا۔ اور ایک ایسی تاریخ مرتب ہوئی جو بجائے خود کتنی ہی اہم ہو لیکن جب تک پس منظر کے اعتبار سے تاریخ کے اعتبار سے تاریخ کے اوراق کے ساتھ مناسبت و مطابقت پیدا نہ کرے گی۔ قابلِ قبول کیونکر ہو گی۔"

۱۸۶۲ء کے بندوبست میں تنولیوں کے دیہات کی صورت دیکھی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آوان ترکوں کے وقت میں بعض دیہات میں ان کے تحت کاشتکاری کرتے تھے۔ مثلاً دیہات بدہنک میں۔ تنولیوں کا زمانہ آمد سولھویں سترھویں صدی عیسوی معلوم ہوتا ہے۔ لہذا آوان ان سے پہلے سے یہاں موجود ہیں۔ اور چونکہ ترکوں کے وقت وہ موجود تھے۔ اور ترک غالباً محمود غزنوی کے وقت میں آئے جو گیارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ لہذا گمان غالب یہ ہے کہ آوان ترکوں سے پہلے اس ملک میں آئے۔ اگر راورٹی کی رائے کو مان لیا جائے کہ وہ بدلی یا بدنی اقوام ہیں تو ان کا زمانہ آمد یا سکونت زمانہ محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو گا۔

آوان قوم مندرجہ ذیل دیہات میں آباد ہے۔

تحصیل مانسہرہ :۔ شاہ خیل گڑھی۔ عطر شیشہ۔ جلّو۔ شیلیہ۔ ہردو بلہنگ۔ منگلور۔ کھواڑی۔ بلوٹھ۔ بیدڑہ۔ دیگراں۔ چھوٹا مُزلفہ۔ نوکوٹ گینٹ۔ اربوڑہ (اگرور) ہیڑ۔ (کونش)

علاقہ ٹھنڈیانی :۔ بھلکوٹ۔ پنگھوڑا۔ نڑی۔ جنوٹ۔ کھکھریالہ اور علاقہ ترناٹی کے مواضعات علاقہ تناول میں بہت سے گاؤں میں آباد ہیں۔ کاغان میں بھی ان کی آبادیاں ہیں۔

تحصیل ہری پور :۔ خان پور کے علاقہ میں اور کنڈی کا بل ہیں۔

تحصیل مانسہرہ میں اعوان قوم کی نامور ہستی ملک امیر عالم خان اعوان کی ہے۔ یہ اعوان قوم کی مشہور ہستی ہے۔ ۱۹۰۱ء میں بمقام لبرکوٹ تحصیل مانسہرہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک ہائی سکول مانسہرہ سے

۱۹۱۷ء میں پاس کی پھر اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہوئے۔ ترک موالات کے سلسلہ میں ۱۹۲۰ء کو کالج ترک کر کے جامعہ ملیہ اسلامیہ (زیر مولانا محمد علی جوہر) میں تعلیم حاصل کی اور تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر ۱۹۲۱ء میں ہزارہ میں تین سال قید کی سزا (بہ ضمن عدم ادخالِ ضمانت) کاٹی۔ ۱۹۲۴ء میں روزنامہ تنظیم میں بطور معاون شامل ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں واپس آئے۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں راولپنڈی سے ہفتہ وار "ترجمانِ سرحد" جاری کیا۔ ۱۹۲۹ء میں تیسری پنجاب نوجوان بھارت سبھا منعقدہ امرتسر کی صدارت کی۔ ۱۹۳۰ء میں زیر دفعہ ۱۲۴ ایک سال قید کی سزا قلعہ اٹک کے کیمپ جیل میں گزاری۔ ۱۹۴۲ء میں پھر چھ ماہ قید رہے۔ ۱۹۵۱ء میں سرحد اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور بالاتفاق ۱۹۵۳ء میں ڈپٹی سپیکر (نائب صدر) منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں جب صوبہ سرحد وحدت مغربی پاکستان میں مدغم ہو گیا تو سیاست سے علیحدگی اور مکمل گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

سیاسی زندگی کے دور میں پہلے خلافت و کانگرس سے وابستہ رہے اور ۱۹۴۶ء سے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ زیادہ تعلق غریب طبقہ کے معاملات سلجھانے سے رہا۔ موروثی مزارعان کی تحریک جس کی سربراہی انہوں نے کی۔ آخر کار اُن کو ملکیت عطا کرانے پر اس سے سبکدوش ہو گئے۔

قوم آوان کی شاخیں

رواج نامہ بندوبست ۱۸۷۲ء کے مطابق اس قوم کی بڑی بڑی شاخیں جو اس ضلع میں آباد ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔ گولڑہ۔ قطب شاہی۔ کھوکھر، چوہان۔ کلگال۔ ان کے علاوہ برسین، کٹھوال۔ بدن۔ مرجان۔ پوٹھواری بھی اس قوم کی شاخیں ہیں۔

سردار گھر سکندر پور کا ہے۔

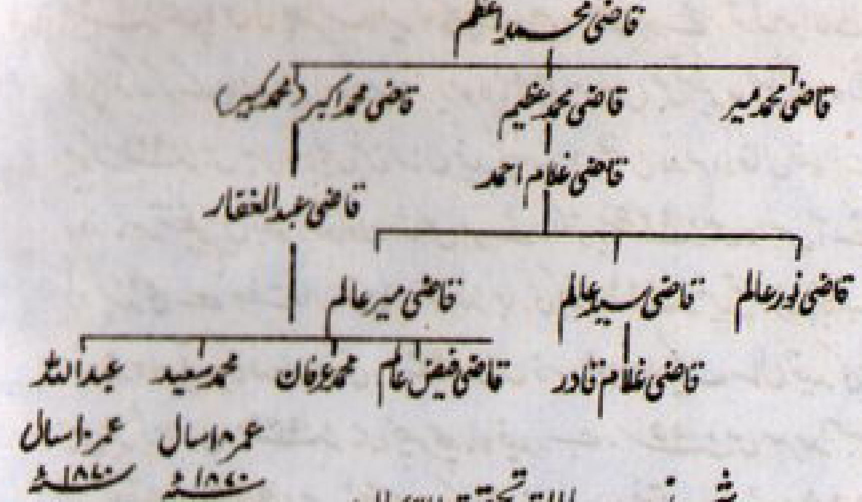
قوم قاضی (آوان) سکندر پور

تاریخ ہزارہ کے مطابق

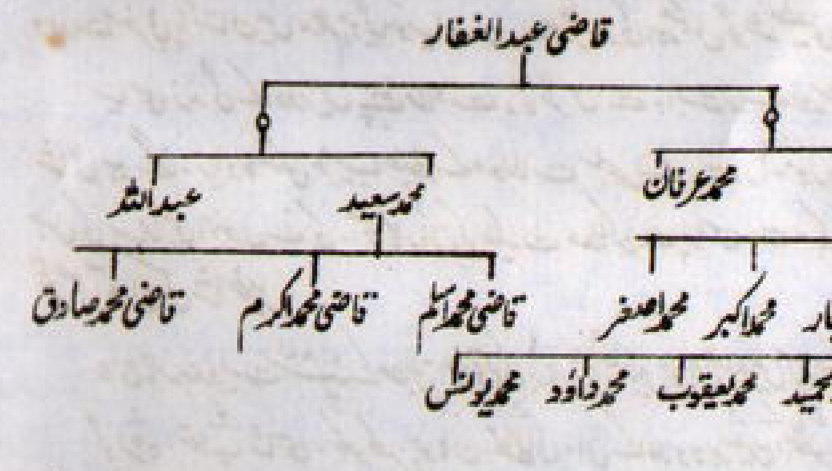
یہ خاندان جس کے اس وقت دو گھر مشہور ہیں۔ قاضی عبد الغفار اور قاضی غلام احمد کا ہے۔ اصل میں قوم آوان گوت گورڑہ (گولڑہ) سے اپنی نسبت بیان کرتے ہیں۔ بسبب علم قاضی کے نام سے اُن کی شہرت ہے اور اصلی جگہ اپنی موضع گولڑہ ضلع راولپنڈی ظاہر کرتے ہیں اور سلسلہ یہ لکھواتے ہیں۔

مورث اعلیٰ حافظ سعد اللہ

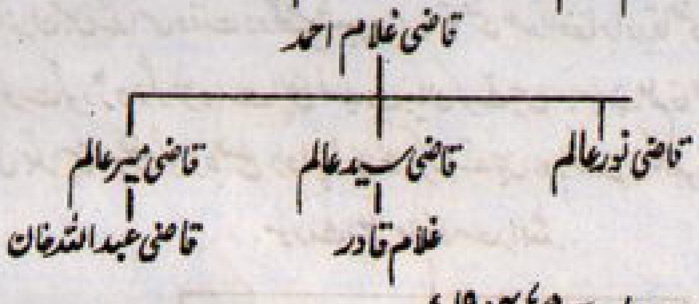
قاضی محمد اعظم | محمد اکبر | محمد انور



شجرہ نسب مطابق تحقیق الاعوان



مطابق تاریخ ہزارہ ولیس ۱۸۷۱ء قاضی عبدالغفار صاحب ہوشیار آدمی تھے۔ حاکمان سرکار سکھاں کے مددگار رہے۔ پھر ابتدائی عہد انگریزی میں میجر ایبٹ کو ۱۸۴۷ء کی شورش میں ہر قسم کی مدد دی اور جاگیر پائی۔ علم دار گھرانہ کے فرد تھے۔ مدت تک تحصیلدار رہے۔ ۱۸۷۰-۷۱ء کے دوران وفات پائی۔ اُن کے بڑے بیٹے قاضی فیض عالم نے علم اور رہنمائی میں بڑا نام پایا۔



حالات بموجب بندوبست ہزارہ ۱۹۰۵-۱۹۰۷ء

سب سے نمایاں خاندان اس قوم میں سکندرپور کے قاضیوں کا ہے جو گولڑہ قطب شاہی ہیں۔ ان کے سربراہ

قاضی فضل الہی ہیں جو قاضی عبدالغفار کے پوتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار میجر ایبٹ کا دایاں بازو تھا۔ اس کی جاگیر دو ہزار روپیہ سے متجاوز ہے۔ قاضی فضل الہی ہری پور کے میونسپل کمشنر ہیں۔ اس خاندان کا دوسرا نامور رکن قاضی عبداللہ جان جو ہری پور میں مجسٹریٹ ہے۔ اس کا والد خان صاحب قاضی میر عالم ایک مشہور رای۔ اسے بھی تھا۔ جسے ریٹائر ہونے پر فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔" آپ قاضی عبدالغفار کے ہمشیرہ زادہ تھے بڑے صاحب علم اپنی لیاقت اور پرورش حکام سے محرری کے عہدے سے ترقی کی۔ جائیداد بھی کافی پیدا کی۔ عزت دار، لائق اور صاحب علم انسان تھے (تاریخ ہزارہ ولیس)

اس خاندان کے نامور رکن قاضی محمد اسلم صاحب ایڈووکیٹ ہیں۔ پرانے وکیل اور تجربہ کار انسان ہیں۔ اپنے خاندان کو بنانے میں ان کا ہاتھ ہے۔ شروع سے ہی پشاور میں اقامت گزیں ہیں۔ باوجود کہن سالی کے دماغ حاضر ہے۔ حالات زمانہ پر پوری نظر ہے۔ اور خوب مجلس آرا ہیں۔ ان کے ایک بھائی قاضی محمد اکرم ہری پور میں اور دوسرے بھائی قاضی محمد صادق ایبٹ آباد میں وکالت کرتے ہیں۔

کرنل قاضی محمد یوسف صاحب مرحوم خلف قاضی فضل الہی صاحب مرنجان مرنج، تجربہ کار، سنجیدہ انسان تھے۔ ہر لحاظ سے قابل تعریف انسان تھے۔

بموجب بندوبست ۱۸۷۲ء مندرجہ ذیل پانچ مواضعات ان کی ملکیت قرار پائے۔

۱۔ سکندر پور۔ قوم ترین کی ملکیت ہے۔ ان کے دخل میں آیا۔
۲۔ کھیوہ۔ قوم ترین کی ملکیت ہے۔
۳۔ ہری پور۔ قوم ترین کی ملکیت ہے۔ پہلے سرداری ہری سنگھ نے ان کو دیا اور بعد میں میجر ایبٹ نے بھی اس کو ان کے نام منتقل کر دیا۔
۴۔ ڈھیری۔ قوم ترک کی ملکیت تھی۔ ان کی طرف سے بطور سیری دیا گیا۔
۵۔ قاضیاں۔ قوم ترین کی ملکیت ہے۔

صورت دیہی کی رو سے چک سکندرپور عہد مسلمانی میں (یعنی سکھوں سے پہلے) آوان گولڑہ کو بطور سیری جاگیر کے ملا تھا۔ موہڑی ملیا۔ اصلی مالک قطب شاہی آوان ہیں۔ بعد میں دوسری اقوام آکر آباد ہو گئیں۔

تواریخی حالات

عہد سکھاں میں یہ خاندان خیر خواہ سرکار رو وقت رہا۔ قاضی غلام احمد معروف ملازم سرکار سکھاں تھا۔ اور قاضی عبدالغفار نے ۱۸۴۷ء کی شورش (چتر سنگھ کی بغاوت) میں میجر ایبٹ کی بڑی عمدہ خدمات کیں۔ اور اس کے عوض میں جاگیر، انعام و تحصیلداری پائی اور پھر عملداری سرکار انگریزی میں قاضی میر عالم صاحب نے اپنی محنت و لیاقت سے بہت عزت

حاصل کی اور اس ضلع کے اکسٹرا اسسٹنٹ ہوئے۔

ایک خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۰ء ایبٹ آباد سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی عبدالغفار کو میجر ایبٹ نے فروری ۱۸۵۳ء میں ہری پور کا تحصیلدار مقرر کیا تھا۔ یہ اُن خدمات کا صلہ تھا جو اس نے سکھوں (چتر سنگھ) کی بغاوت کے دوران میں حکومت انگریزی کے لئے کی تھیں۔ بعد میں ان کو اس صلہ میں ۱۹۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن ملی۔ جو بعد میں نقد پنشن و جاگیر میں تبدیل کی گئی۔ جاگیر میں موضع ڈھیری (۵۲ ۵ روپیہ) اور سکندر پور (۲۳۰ روپیہ) کل ۷۸۲ روپیہ کی تھی۔

قاضی عبدالغفار ۱۸۶۲ء میں فوت ہوئے۔

نوٹ۔ سند میں قاضی عبدالغفار ولد قاضی محمد کبیر درج ہے۔ حالانکہ شجرہ میں قاضی محمد اکبر ہے۔

ہری پور شہر

بہ موجب سوانح دیہی ہری پور سمت ۱۸۷۸ بکرمی (۲۲-۱۸۲۱ء) بکرمی میں سردار ہری سنگھ نے آباد کیا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ سمت ۱۸۸۰ بکرمی (۱۸۲۳ء) میں آباد کیا گیا۔ یہ زمین ترینوں کی ملکیت تھی۔ قاضی عبدالغفار سکندر پور کے بیان مورخہ ۱۸۶۹ء کے مطابق سردار ہری سنگھ نے قاضی عبدالغفار کی معرفت و زیر نگرانی تعمیر قلعہ و آبادی شہر ہری پور کرائی۔ قاضی میر عالم نے اعتراض کیا کہ اس وقت قاضی عبدالغفار کی عمر ساٹھ سال ہے۔ اور قلعہ و شہر کی آبادی کو ۴۹ سال ہو گئے۔ تو اس وقت قاضی عبدالغفار کی عمر گیارہ سال تھی لہذا قاضی عبدالغفار کو صغر سنی میں کس طرح آبادی کا کام سپرد ہوا۔

سمت ۱۹۰۲ بکرمی (۱۸۴۵ء) بہ عہد دیوان مولراج شہر و قلعہ سوختہ ہوا۔

قاضی میر عالم نے بیان کیا کہ سردار ہری سنگھ نے قلعہ و شہر کی تعمیر میرے والد قاضی غلام احمد سے سمت ۱۸۷۵ (۱۸۱۸ء) بکرمی میں کرائی۔" (یہ صریحاً غلط ہے کیونکہ سردار ہری سنگھ ۱۸۲۲ء میں حاکم ہزارہ مقرر ہوا تھا۔ ش ب) سردار ہری سنگھ نے اپنی فوج و دیگر اہلکاران کی سہولت کے پیش نظر یہ آبادی کرائی اور اس میں مختلف پیشہ ور اقوام آباد کیں۔ اغلباً ساری اقوام وہ پنجاب سے لایا۔ صورت رہی ۱۸۷۲ء سے مندرجہ ذیل اقوام آباد دکھائی گئی ہیں۔ اور ان سب کے شجرہ نسب لگا دئے گئے ہیں۔

اقوام:۔ تنولی۔ اعوان۔ قریشی۔ جوگی۔ سنیاسی۔ اودریسی۔ برہمن۔ کھتری۔ بھٹ۔ اروڑہ۔ ملیار۔ تیلی۔ گاذر (دھوبی) لوہار۔ نجار (ترکھان) کھٹیک۔ کشمیری۔ ماشکی۔ قصاب۔ کمانگر۔ راسے (شجرہ نسب حکایات بیان کرنیوالے) جہبور۔ قلعی گر۔ بافندہ۔ گوجر۔ شیخ۔ موچی۔ کنجر۔ حجام۔

خویشگی پٹھان

ضلع ہزارہ میں اس قوم کے چند گھر موضع ڈنگی (نزد موضع موٹہ) تحصیل ہری پور میں ہیں۔ لیکن ان پٹھانوں کی ایک زبردست ریاست قصور ضلع لاہور میں مدتوں رہی اور آخر سکھوں کے ہاتھوں اور باہمی نااتفاقی کے باعث ختم ہوئی۔ خویشگی پٹھان جمند فرزند دوم خرشبون بن سڑبن کی اولاد ہیں۔ ان کا اصلی وطن علاقہ پشنگ تھا۔ ترینوں سے بدی کی وجہ سے ان کی ایک شاخ ملتان کی طرف آگئی۔ اور دوسری کابل چلی گئی۔ یہ شاخ بابر بادشاہ کے ہمراہ بسربراہی سلیم خان سردار خود دہلی کی جنگ میں شامل ہوئے۔ کامیابی کے بعد بابر بادشاہ اور ہمایوں بادشاہ نے ان پر بہت عنایات کیں اور پھر یہ قصور آکر آباد ہوئے۔ ان کی مشہور شاخیں بلگ زئی۔ حسین زئی۔ عارف زئی، چنو زئی وغیرہ ہیں۔

تاریخ قصور

یہ تاریخ خان صاحب ہدایت اللہ خان مرحوم بلگرزئی قصوری اور منشی محمد نورالدین صاحب قصوری کی یادداشتوں سے مرتب کی گئی ہے۔

قصور ایک پرانا شہر ہے کبھی کسی زمانہ میں یہ شہر خوب آباد تھا۔ اب وہاں صرف نام ہی نام رہ گیا ہے اس کا صحیح حال تو نہیں کھلتا۔ کہ یہ کب آباد ہوا۔ کس نے آباد کیا۔ مگر عام طور پر مشہور ہے۔ کہ راجہ رام چندر کے بیٹے کشو نے یہ شہر برلب دریائے بیاس بسایا۔ اور اپنے نام پر کشو نام رکھا۔ جو کثرت استعمال سے کشو کا قصور ہوا جس طرح اس کے دوسرے بھائی لو نے برلب راوی شہر لاہور بسایا .... اکثر کاغذات میں جو تین چار سو سال کے ہیں قصور ہی نظر آیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ یہ نام قصر (واحد) سے قصور (جمع) کے ہے اور قصر محل کو کہتے ہیں اس وقت اس کی آبادی رئیسانہ اور نوابانہ طرز کی ہوگی اور رہائش کے لئے محلات کی کثرت ہوگی۔ لہذا قصور نام ہوا۔

جب بابر بادشاہ بعزم فتح ہندوستان آیا۔ تو پانچ سات سو نفر متفرق اقوام افغانان از طرف غزنی اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جنہوں نے جنگ ہندوستان میں بہادری دکھائی۔ اور یہ قصبہ قصور ان کو بطور جاگیر مرحمت ہوا۔

بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ رائے سنگھ یا بھگوان سنگھ بیکا نیریہ اس قصبہ کا حاکم تھا۔ اور افغانان اس کی اجازت سے بہ صلہ بہادری درباب گرفتاری پیرا بلوچ قزاق جو اس زمانہ میں دیہات کو لوٹنے کے لئے آپڑتا تھا آباد ہوئے تھے۔ یہ حال بابر بادشاہ کے وقت میں افغانان کا آنا اور اس قصبہ پر قبضہ پا جانے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

چونکہ سلطنت مغلیہ میں افغانان اچھے اچھے منصب پا گئے تھے اس واسطے رفتہ رفتہ افغانان کی ریاست قصور میں اس قدر ہو گئی کہ بائیس رئیسوں کی علیحدہ علیحدہ نوبت بجتی تھی اور اس شہر کی آبادی تین میل طول شرقاً غرباً اور دو میل عرض جنوباً شمالاً ہو گئی تھی۔

ابراہیم خان اپنی کتاب "سیرستان" میں لکھتا ہے کہ یہ سب ترقی مناصب افغاناں اور آبادی ہر قسم کے لوگوں اور پیشہ وروں کی، بہ عہد اکبر بادشاہ ہوئی۔ شاہ جہان کے وقت میں قطب خان ولد نذر محمد خان علی زئی بہ دلیہ محاصرہ قلعہ چتوڑ گڑھ بہ خطاب نوابی پہنچا۔ بہ عہد عالمگیر محمد شداد خان خلف زئی افغان کو ریاست ملی۔ محمد شاہ کی سلطنت میں حسین خان ولد سردار خان خلف زئی رئیس افغانان مقرر ہوا۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ قطب خان کے جو بہ عہد عالمگیر نواب ہو گئے تھے۔ اُن کے بعد رحیم داد خان و کمال الدین خان خلف زئی اور اُس کے بعد حسین خان رئیس افغانان ہوئے۔ غرضیکہ جب نواب حسین خان قصور کا حاکم ہوا۔ اس زمانہ میں صوبہ دار لاہور عبدالصمد خان تھا۔ حسین خان اور عبدالصمد خان میں مخالفت پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ بہ مقام ہرجو کی جو اب متعلق بہ تحصیل چونیاں ہے۔ سنہ ۱۸۱۶ء مطابق سنہ ۱۷۵۹ء بمطابق سنہ ۱۱۷۳ ہجری باہم دگر سخت جنگ ہوئی۔ فریقین نے داد شجاعت دی۔ لیکن آخر کار رکھیت صوبہ دار کے ہاتھ رہا۔ اور قصور والوں کو شکست ہوئی۔ نواب حسین خان شہید ہوئے مگر ریاست افغانانِ قصور ہی میں رہی۔

سنہ ۱۷۶۳ء، سمت ۱۸۲۰، سنہ ۱۱۸۰ھ میں جب سلطنت دہلی میں ضعف آگیا۔ تو سکھوں نے زور پکڑا۔ اسی زمانہ میں قصور والوں نے بھنگی سردار کا اسباب لوٹ لیا۔ سردار جھنڈا سنگھ اور سردار گنڈا سنگھ سرداران بھنگی بہ جمعیت کثیر قصور پر آپڑے۔ افغانوں نے بھی مقابلہ کیا۔ مگر بعد جنگ عظیم ہزیمت اٹھائی۔ سکھوں نے شہر قدیم کو تاراج اور مسمار کر دیا۔ غلام محی الدین خان افغان کو اپنی طرف سے مختارِ حکومت بنا کر چلے گئے۔ اس جنگ اور صدمہ لوٹ مار سے اصل آبادی شہر قصور بالکل برباد اور ویران ہو گئی۔ اور چونکہ اس شہر کی کوئی شہر پناہ نہ تھی اس واسطے جو لوگ باقی رہ گئے تھے۔ بخوف لوٹ مار دھاڑ ان کوٹ ہائے میں جن کی شہر پناہ موجود تھی، جا بسے تھے۔

یہ کوٹ اس لڑائی سے پہلے تعمیر ہو چکے تھے۔ پُرانا شہر سب خراب ہو گیا۔ ان کوٹ ہائے کا بیان بعد میں کیا جائے گا۔ بسنہ ۱۸۱۱ء میں سرداران بھنگی سے پٹھانوں کی پھر لڑائی ہوئی۔ اور عبدالغنی خان کے قلعہ میں صدہا آدمی قتل ہوئے اور قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ اُسی دن سے اس قلعہ کا نام قتل گڑھی مشہور ہوا۔ انجام کار بقیۃ السیف سے تین لاکھ روپیہ لے کر سکھ واپس چلے گئے۔ اور اپنا قلعہ اور معاملہ مقرر کر دیا۔ اور ۱۷۹۳ء تک بدستور عملداری بھنگیاں کی رہی۔ قتل گڑھی کی خوں ریزی کے بعد حاجی رانجھے خان اور عثمان خان یہاں کے حاکم ہوئے۔ یہ دونوں برہان الدین خان اور چلے خان کی اولاد سے تھے۔ ان کے بعد نظام الدین خان اور ان کے حقیقی بھائی قطب الدین خان تمام علاقہ پر قابض اور متصرف ہو گئے اسی زمانہ میں چار کوٹ اور آباد ہو گئے۔ کوٹ فتح دین خان۔ کوٹ پیرانواں۔ کوٹ حلیم خان۔ کوٹ عیسیٰ خان۔ بجائے قتل گڑھی پرانے کوٹ کے یہ سب قلعے ہر سردار نے اپنے نام پر بنائے تھے۔

۱۔ کوٹ خواجہ حسین خان تعمیر سنہ ۱۶۵۳ء یا (سنہ ۱۷۱۲ء) میں نواب حسین خان نے تیار کرایا اور خواجہ حسین خان دولت زئی ملازم خود کو عطا فرمایا۔ اور اس کے نام سے مشہور ہے۔ مگر آبادی اس کی زیادہ اس وقت ہوئی جب سکھوں کی جنگ کی وجہ سے اصل شہر اجاڑ ہو گیا۔ اور لوگ آ کر اس میں آباد ہو گئے۔

۲۔ کوٹ قلعہ پختہ۔ تعمیر سنہ ۱۷۴۲ء جب پرانا شہر آباد تھا تو کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے یہ بنا ہوا تھا۔ محمد خان عیسیٰ زئی افغان نے آباد کیا تھا۔ اور عملداری سکھاں کے وقت اس میں فوجی سپاہی رہتے تھے۔ اس واسطے بنام قلعہ مشہور رہے۔

۳۔ کوٹ غلام محی الدین خان۔ سنہ ۱۷۴۶ء یا سنہ ۱۷۴۹ء میں غلام محی الدین خان دولت زئی نے تیار کرایا تھا۔

۴۔ کوٹ مراد خان۔ سنہ ۱۷۴۶ء یا سنہ ۱۷۴۹ء میں مُراد خان اکازئی نے تعمیر کرایا۔ اور آبادی زیادہ بروقت اجڑنے اصل شہر کے ہوئی۔

۵۔ قتل گڑھی۔ بہ عہد نواب حسین خان تیار ہوا تھا۔ بہ مقابلہ سکھاں سنہ ۱۷۷۰ء میں اسی کوٹ میں بہت افغان قتل ہوئے اسی روز سے اس کا نام قتل گڑھی مشہور ہے۔ سنہ ۱۷۹۹ء میں اس کی بجائے عبدالغنی خان اکازئی نے از سر نو کوٹ تعمیر کرایا۔

۶۔ کوٹ اعظم خان سنہ ۱۷۴۹ء یا سنہ ۱۷۶۵ء میں اعظم خان بلکزئی نے تعمیر کرایا۔

۷۔ کوٹ بدر الدین خان سنہ ۱۷۹۹ء میں بدر الدین خان دولت زئی نے تعمیر کرایا۔

۸۔ کوٹ عثمان خان۔ سنہ ۱۷۷۶ء یا سنہ ۱۷۷۷ء میں عثمان خان اکازئی نے تعمیر کرایا۔

۹۔ کوٹ رکن الدین۔ سنہ ۱۷۷۸ء میں رکن الدین خان دولت زئی نے تعمیر کرایا۔

سنہ ۱۷۹۳ء کے بعد بھنگی سرداروں کا جانشین گلاب سنگھ ہوا جو کاہل الوجود تھا۔ لہٰذا حکومت ان کی کمزور ہو گئی۔ اور شاہ زمان خان شاہ کابل کی آمد کی خبر سے یا اس کے ایماء یا بأخذ شیوہ مار دھاڑ حسب رواج سکھاں اور بہم سانی جمعیت افغاناں اور بعد از برخاست تھانہ سکھاں، نظام الدین خان و قطب دین خان ہر دو برادران حقیقی پسران موج الدین خان سنہ ۱۷۹۶ء میں قصور پر قابض ہو گئے۔ اور اپنی حکومت جاری کی۔ اس وقت مندرجہ ذیل کوٹ ہائے اور تعمیر ہوئے۔

۱۰۔ کوٹ فتح دین خان۔ سنہ ۱۷۹۶ء میں نظام الدین خان حسن زئی نے اپنے پسر فتح دین خان کے نام پر تعمیر کیا۔

۱۱۔ نواں قلعہ۔ یعنی کوٹ حلیم خان بنگزئی و عظیم خان وتوزئی افغاناں نے سنہ ۱۷۹۶ء میں تیار کر کے نواں قلعہ کے نام سے معروف کیا۔

۱۲۔ کوٹ پیراں والا۔ پیر عبدالرحمٰن خان چنوزئی نے سنہ ۱۸۰۱ء میں تعمیر کرا کر بنام پیرانوالہ مشہور کیا۔

واضح ہو کہ اب منجملہ بارہ کوٹ ہائے کے کوٹ حسین خان۔ کوٹ غلام محی الدین۔ کوٹ بدرالدین کوٹ عثمان خان۔ آبادی شہر قصور میں شامل ہو گئے ہیں۔ باقی ماندہ الگ الگ ہیں۔

نظام الدین خان چھ سال تک حکمرانی کرتا رہا۔

جب لاہور پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ اور گلاب سنگھ بھنگی سردار نے لاہور واپس لینے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ پر چڑھائی کی تو نواب نظام الدین خان بھی گلاب سنگھ کے ساتھ تھا۔ اس وجہ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نواب نظام الدین خان سے ناراضی تھی۔ جب اس کو بعد تسلّط لاہور (سنہ ۱۸۰۰ء) فرصت ہوئی تو وہ سنہ ۱۸۰۱ء میں قصور پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بہت دفعہ حملے کئے لیکن ہر دفعہ ناکام ہو کر واپس جاتا رہا۔ حق یہ ہے کہ نواب مرحوم بڑا مرد میدان اور ذی حوصلہ تھا اگر وہ زندہ رہتا تو رنجیت سنگھ کبھی بھی قصور کا مالک نہ ہو سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ سنہ ۱۸۰۲ء میں فساد باہمی افغاناں سے نظام الدین خان ایک پٹھان واصل خان (یا فاضل خان) وغیرہ افغاناں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا برادر حقیقی قطب الدین خان ریاست پر جانشین ہوا۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے میدان مصاف پا کر جمعیت کثیر لا کر قطب الدین خان پر یورش کی اور فتح پائی۔ چراغِ دولت افاغنہ بجھ گیا۔ ۱۱ برس تک اس خاندان میں قصور کی حکومت رہی۔

اور بعد فتح قصور قطب الدین خان کو قلعہ ممدوٹ معہ دیہات متعلقہ برائے رہائش دیا گیا۔ اور قصور میں علمداری رنجیت سنگھ ہو گئی۔ اس نے یہ ملک سردار نہال سنگھ اٹاری والے کو جاگیر میں دے دیا۔ شروع علمداری سرکار انگریزی میں یہ خالصہ سرکار رہا۔

اب اس شہر کا حال یہ ہے کہ آبادی سب کوٹوں کی پختہ ہے۔ کوٹ میں کچھ بازار بھی موجود ہیں لیکن جو چار کوٹ شامل آبادی شہر قصور ہیں۔ اُن میں آبادی اور رونق زیادہ ہے اور بازار کلاں بھی اس میں ہے۔ آبادی میں ہندو مسلمان سب قسم کے لوگ آباد تھے۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد سب ہندو وہاں سے نکل گئے ہیں۔ خوجہ قوم کی کثرت ہے اور تجارت پر اُن ہی کا قبضہ ہے۔ اور کافی دولت مند ہیں۔ چمڑہ کا روزگار بہت ہے اور میتھی جو مشہور تحفۂ قصور ہے باہر بھیجی جاتی ہے۔

پہلے کچہری شہر کے اندر تھی۔ سنہ ۱۸۶۵ء میں باہر بنائی گئی ہے۔

قصور کی آبادی

ایک روایت کے مطابق خویشگی پٹھان سنہ ۱۵۶۰ء میں عہد اکبر بادشاہ میں بصورت ایک گروہ جس میں ۳۵۰۰ اشخاص تھے، قندھار سے آیا اور یہاں آباد ہو گیا۔

سکھوں کے عہد میں بھنگی مسل کا سربراہ گلاب سنگھ ان پر غالب آیا۔ لیکن سنہ ۱۷۹۴ء میں نظام الدین خان اور قطب الدین خان نے سکھوں کو قصور سے نکال دیا۔ نظام الدین سردار منتخب ہوا جب رنجیت سنگھ کا سنہ ۱۸۰۰ء میں لاہور پر قبضہ ہو گیا۔ تو سنہ ۱۸۰۱ء میں اس نے قصور پر حملہ کیا۔ آخر صلح ہو گئی اور رنجیت سنگھ نذرانہ لے کر واپس چلا گیا۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں نظام الدین خان نے اپنے سالوں واصل خان حاجی خان و نجیب خان کی جاگیر ضبط کر لی۔ جس پر انہوں (واصل خان) نے نظام الدین خان کو قتل کر دیا۔ قطب الدین خان قصور میں موجود نہ تھا۔ جب وہ آیا۔ تو اس نے قاتلوں کو اعظم خان کے قلعہ (کوٹ اعظم خان) میں گھیر لیا۔ حاجی خان تو بھاگ کر دکن چلا گیا مگر واصل خان و نجیب خان کو قتل کر دیا۔

نظام الدین خان کے بعد عنانِ حکومت اُس کے بھائی قطب الدین خان نے سنبھالی۔ حالانکہ نظام الدین خان کا اکلوتا بیٹا فتح دین خان موجود تھا۔

قطب الدین خان سنہ ۱۸۰۷ء تک حکمران رہا۔ فتح دین خان کے ایماء پر رنجیت سنگھ نے قصور فتح کر کے خود قبضہ کر لیا۔ اور فتح دین خان کو حکومت نہ دی۔

شجرہ نسب

سورج الدین خان حسن زئی
- نظام الدین خان
  - فتح دین خان
- قطب دین خان

ہزارہ کی سرحدی اقوام

پشاور سے چلاس تک ہزارہ کی مغربی سرحد پر مختلف اقوام چھوٹی چھوٹی وادیوں اور پہاڑوں پر آباد ہیں۔ اور عموماً آزاد رہی ہیں۔ لیکن آج وہ سب پاکستان کی زیر حکومت ہیں۔

قوم اُتمان زئی

مواضعات کھبل اور کیا۔ مہابن کے دامن میں آباد ہیں۔ ان کی تربیلے کے اُتمان زیوں سے قرابت داری ہے اور یہ دونوں دائیں اور بائیں کنارے پر ایک دوسرے کے ساتھ ملحق اراضیات رکھتے ہیں۔ یہ بھی اب ضلع ہزارہ کے ایک حصہ ہیں۔

مجاہدین ان کی آبادی ایک زمانہ میں ستھانہ میں رہی۔ اور حکومت ہزارہ کے لئے یہ بہت مدت تک دردسر بنے رہے۔

امازئی۔ اتمان زیوں کے شمال میں قوم امازئی ہے۔ نواب امب دامب دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر نواب صاحب کا پرانا دارالحکومت ہے) کے علاقہ کے ساتھ ساتھ اس قوم کا علاقہ ہے۔

مداخیل۔ حسن زئی۔ اور اکازئی۔ مداخیل۔ مہابن کی شمالی ترائی میں آباد ہیں۔ ان سے آگے حسن زئی قوم ہے جو دریائے سندھ کے دونوں جانب آباد ہے جو سندھ کے بائیں کنارے پر ہیں۔ وہ کوہ سیاہ کے مغربی ترائی کے جنوبی حصہ میں ہیں۔ حسن زئی قوم کی شمال میں اور کوہ سیاہ کے دوسرے ترائیوں میں لیکن سب ہی سندھ کے بائیں کنارے پر اکازئی قوم آباد ہے۔ یہ سب اقوام یوسف زئی پٹھانوں میں عیسیٰ زئی خیل کی شاخیں ہیں۔ شمالی حصہ میں ان اقوام کے سرحد اگرور سے ملتی ہے۔ اور کوہ سیاہ ان کی حد بندی کرتا ہے۔

چغرزئی اور پر یری وال۔ اکازئی قوم کے شمال میں چغرزئی قوم جو یوسف زئی کے قبیلہ ملی زئی کی شاخ ہے اس قوم اور شمالی اگرور کے درمیان پر یری سید آباد ہیں۔

بٹگری۔ دلیشی۔ نندہار اور الائی یہ سب سے حکومت ہزارہ کے زیرنگیں ہو چکے ہیں۔ بٹگری ایک زرخیز وادی ہے اور سواتھی اس میں آباد ہیں۔ یہ اگرور کے شمال میں واقع ہے

دلیشی۔ پہاڑوں اور تنگ دروں کا علاقہ ہے جو پر یری اور ٹیکری کے شمال اور اس کا جنوبی سرا اگرور کے شمال میں ہے۔ یہ علاقہ بھی سواتھیوں کا ہے۔

نندے ہاڑ۔ دلیشی اور کوئش اور بھوگر منگ کے درمیان واقع ہے۔ یہ بھی سواتھی قوم کا علاقہ ہے

الائی۔ نندے ہاڑ سے بعد الائی کا علاقہ ہے۔ اور اس میں بھی قوم سواتھی آباد ہے۔ جس کی جنوبی حد اور بھوگر منگ کے درہ کے درمیان موسیٰ کا مصلیٰ کا پہاڑ حد فاصل ہے۔

الائی کے لوگوں نے شہید گنج واقع لاہور کی مسجد کے جھگڑے میں کافی حصہ لیا۔ اور سرحد ہزارہ پر بدامنی کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ اسی سلسلہ میں اس قوم نے ۱۹، ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء موضع بٹل پر حملہ بھی کیا۔

جو رپورٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اس واقعہ کے متعلق لکھی تھی اس سے الائی کی اقوام اور ان سے شجرہ نسب کا بھی ذکر کیا تھا۔

وہ لکھتا ہے کہ الائی میں دو بڑی قومیں ہیں۔ ۱۔ ہبل۔ ۲۔ تور۔

ہبل کا سرگروہ روشن خان ساکن الائی ہے اور تور کا خان شیر محمد خان۔

روشن خان کا نزدیکی رشتہ دار قلندر خان، برکتی خان اور محمود شاہ خان، خلاف سرکار (انگریزی) علانیہ کام کر رہے ہیں۔ اور غیر علاقہ کے لوگوں نے خون سے لکھے ہوئے خطوط کابل، مہمند، آفریدی، وزیر اور مسعود اقوام کو لکھے ہیں۔ مسلمانان الائی۔ نندہاڑ اور کوہستان آمادۂ جہاد ہیں۔ مُلّا اور طالب علم اس تحریک کے سربراہ ہیں۔

شجرہ نسب

ہبل
- ارسلا خان
  - غازی خان
  - سمندر خان
  - ستا خان

تور
- بہادر خان
  - شیر محمد خان
  - نام نامعلوم
    - محمد اکبر خان



موضع شارکل، نزد بٹل میں فرنٹیر کنسٹبلری کا قلعہ اس ڈاکہ کے بعد بنایا گیا۔

کوہستان :۔ الائی کے شمال میں علاقہ کوہستان ہے اور وادی کاغان اور دریائے سندھ کے درمیان کا پہاڑی علاقہ ہے۔ یہ ہندو الاصل معلوم ہوتے ہیں۔ اور اب وہ سب مسلمان ہیں۔ اُن کی زبان گلگت اور لداخ کی زبان سے ملتی ہے۔ ان کے متعلق اقتباسات جو سندھ کوہستان رپورٹ مرتبہ مسٹر ایمرسن آئی۔ سی۔ ایس سے ماخوذ ہیں۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

سندھ کوہستان

ماخوذ از رپورٹ ۱۹۴۱ء مسٹر ایمرسن ۱۰۷۔۵

جغرافیائی تقسیم۔ سندھ کے دائیں طرف سوات کوہستان اور بائیں سندھ کوہستان ہے اور دونوں حصے سندھ کوہستان ایک قوم ہیں۔ ان لوگوں کی زبان شینا ہے اور یہ اصلاً دَرد قوم ہے اور گرد و نواح کے پٹھانوں سے نسلاً الگ۔

تقسیم چار بڑے رقبے ہیں۔

۱۔ ہربن۔ ۲۔ جل کوٹ۔ ۳۔ چلاس۔ ۴۔ کولائی۔

تاریخ ۔ ۱۸۵۷ء میں ان لوگوں نے گوجروں اور سیدوں کے ساتھ مل کر بقیہ باغی ہندوستانی رجمنٹ ۵۵ کو جب وہ کشمیر کو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قتل کر دیا۔

۱۸۸۸ء میں ان کی ناکہ بندی کی گئی۔ کیونکہ انہوں نے ایک کاغان ٹھیکہ دار سے اپنے تنازعہ کا فیصلہ زور سے کرنا چاہا۔ اور کاغان کے علاقہ پر چڑھ آئے۔ ۵ مارچ ۱۸۵۳ء میں انہوں نے چلاس والوں سے مل کر چلاس کے قلعہ پر حملہ کیا۔ بہت سے آدمی اُن کے مارے گئے۔ اور وہاں پر انہوں نے ایک مقبرہ شہید بابا کے نام پر بنایا جس کی وہ بہت عزت کرتے ہیں۔

راجہ پختون ولی نے اپنی حکومت ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان تنگیر اور دریل پر حاصل کر لی۔

والی سوات نے جب بُنیر ۱۹۲۳ء میں لے لیا۔ تو وہ کوہستانیوں کے قریب آ گیا۔ اس نے کانا اور چکیسر بھی اسی سال فتح کر لیا۔ ان علاقوں میں صواتی آباد تھے۔ موسم گرما ۱۹۲۶ء میں اس نے دو کوہستانی گاؤں بشم اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۶ء میں والی سوات نے وادی دُبیر پر قبضہ کر لیا اور بنکڈ، رانیلیہ، دُبیر اور جیجل میں اپنے قلعے بنا لئے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں والی نے ڈنڈورہ اور جنوری ۱۹۳۹ء پٹن پر قبضہ کر لیا۔ جولائی ۱۹۳۹ء میں کاندیہ، رزیکہ، وادی میدان پر والی کا قبضہ ہو گیا۔ اور آخر کار دریائے سندھ کے دائیں طرف سب علاقہ تنگیر تک والی کا قبضہ ہو گیا۔

ادویات بہت زیادہ ہے۔ کُٹھ تقریباً ختم ہو گئی ہے اور ———— اچھی قسم قسم کا نہیں ہے۔ تمباکو سنگ اور دوسری بوٹیاں جن کو میں پہچان نہ سکا افراط سے بہت پیدا ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی زراعت کاشتکار کرتے ہیں۔ بیج۔ بیل اور ہل مالک کا ہوتا ہے۔ اور کاشتکار کو چوتھا یا تیسرا حصہ پیداوار کا دیتے ہیں۔ ان کی بھیڑ و بکریوں کے ریوڑ کو چرانے کے لئے عموماً گوجر ہوتے ہیں۔ جن کو وہ سردیوں میں نو روپے، ایک جوڑا کپڑوں کا اور ساٹھ پیمانہ مکی دیتے ہیں اور گرمیوں میں پھر ایک دوسرا جوڑا کپڑوں کا پچاس پیمانہ مکی کا اور بارہ بکریاں دیتے ہیں۔

یہ سب علاقہ نہری ہے۔ ان کے گاؤں دریائے سندھ کے کنارے۔ یا اس کے معاون ندی نالوں کے کنارے پر ہوتے ہیں۔ ملک زرخیز ہے۔ مکی اور گیہوں پیدا ہوتے ہیں۔ چاول کاشت نہیں کیا جاتا۔ غذا عموماً مکی ہے۔ اخروٹ۔ انار۔ انگور۔ انجیر اور آڑو لگائے جاتے ہیں۔ سبزی۔ آلو۔ شلغم۔ ٹماٹر۔ کدو۔ پیاز۔ تمباکو اور سرخ مرچ کاشت کئے جاتے ہیں۔

عورتیں گھر کے کام کے علاوہ کھیتوں پر بھی کام کرتی ہیں لیکن مرد کبھی کبھی کھاد اور فصلات کی نگرانی کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی چراگاہ نہیں ہیں وہ ایک مقررہ رقم دے کر اپنے مویشی چرا سکتے ہیں۔

چراگاہ کے نرخ نرخ ایک موسم کے یہ ہیں:۔ چالیس بکریوں کے چھ روپیہ یا ایک بکری۔ ایک گائے بیس بکریوں کے برابر اور ایک بھینس تیس بکریوں کے برابر گنی جاتی ہے۔

ہر ایک جندر لگا سکتا ہے اور پسوائی میں ۱/۱۲ حصہ آٹا لیتا ہے۔

جنگلات کی آمدنی شریعت کے مطابق گاؤں پر تقسیم کی جاتی ہے۔ ایک مرد = دو عورت۔ بالغ و نابالغ سب یکساں تصور ہوتے ہیں۔

پیشہ ور اس علاقہ میں بہت کم ہیں۔ علاقہ ہربن سمار کے گاؤں میں میں نے ایک لوہار دیکھا جو ایک اخروٹ کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پاس ایک لوہے کی اہرن اور بکرے کی کھال کی ایک پھونکنی تھی۔ اور ایک جولاہا تھا۔ ان کو ہر گھر سے سالانہ ایک بھیڑ کی اُون۔ ایک دن کا گھی اور پانچ پیمانہ مکی ملتی ہے۔

اسی علاقہ میں ایک معمار ستون خان (شین) ہے جو گاؤں میں بُرج بناتا ہے اور ۵۵/- ، ۸۰/- اور ۱۵۰/- روپیہ ایک منزل ، دو منزل اور تین منزلہ مکان کے حساب سے لیتا ہے ان برجوں کے ساتھ مکان بھی ہوتے ہیں۔

لوہار کو پانچ اوڈی مکی یا چاول خریف میں اور اتنی ہی گندم ربیع میں فی ہل ادا کی جاتی ہے۔ میراثی اور حجام سالانہ ایک سیر گھی۔ ایک سیر اُون۔ نصف اوڈی غلہ فی آدمی کے حساب سے لیتے ہیں۔ اور ملاح ایک اوڈی غلہ فی گھر سالانہ لیتے ہیں۔ (اوڈی پیمانہ ۲½ سیر کا ہوتا ہے)

جل کوٹ کے علاقہ میں ایک بستی ۵۰۰ جولاہوں کی ہے۔

دریائے سندھ کی ریت سے سونا دھو کر نکالا جاتا ہے اور ایک آدمی روزانہ ایک روپیہ کا سونا نکال لیتا ہے اور یہ چلاس کے ہندوؤں پر بیچ دیا جاتا ہے۔

مقدمات شریعت کی رُو سے مُلّا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ فیصلے رائے عامہ کے باعث قبول کرنے پڑتے ہیں۔ وراثت بروئے شریعت تقسیم ہوتی ہے اور عورتیں بھی حصہ پاتی ہیں۔ بھائی بہنوں سے درخواست کرکے عموماً ان کا حصہ واپس لے لیتے ہیں۔

فوجداری: قتل کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ لیکن کمزور پانچ سو روپیہ یا کچھ کم و بیش لے کر صلح کر لیتا ہے۔

چوری معدوم ہے۔

علاقہ گورا اور تھور جو پہلے سے گلگت ایجنسی سے ملحق ہیں۔ اُن ہی کے شرائط پر کوہستانی بھی سرکار کی رعیت بننے کے لئے تیار ہیں۔

سرحد کاغان و چلاس

تنازعہ مابین جل کوٹی اور تھور

فیصلہ ڈپٹی کمشنر ۱۴ جون ۱۹۰۰ء سے مندرجہ ذیل حقائق معلوم ہوئے۔

سپاٹ کا علاقہ اصلاً شنکئی قوم کا ہے اور چلاسی ، تھور اور ہربن اس کے تبادل ہیں۔ سپاٹ کا علاقہ

۲۵×۱۲ میل ہے اور بڑی چراگاہ ہے۔ اس علاقہ کا پانی جل کوٹ کے علاقہ سے ہو کر دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ چونکہ جل کوٹی قوم کی تعداد اب زیادہ ہو گئی ہے اس لئے انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا ہے

چلاس لداخ اور گلگت کے مشرق اور کاغان کی وادی شمالی سرحد کے ساتھ ساتھ چلاس کی حد ہے اگرچہ یہ لوگ کوہستانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن ان کی زبان کوہستانیوں سے مختلف ہے۔ یہ قوم پرامن طور سے سوداگری اور گلہ بانی کا پیشہ کرتے ہیں۔

ہزارہ سرحد کی جنگیں

اقوام سرحد کی ہزارہ کی انگریزی حکومت سے پہلی ٹکر ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ دو انگریز مسٹر کارن (CARNE) اور ٹیپ (TAPP) قتل ہو گئے۔ یہ دونوں محکمہ نمک کے افسر تھے۔ ان دنوں میں کوہاٹ کے نمک کی درآمد اس طرف بغیر اجازت محکمہ نمک کے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس غرض کے لئے ایک چوکی موضع غازی میں بھی تھی۔ چونکہ کوہاٹ کا نمک سرحدات ہزارہ کی اقوام میں پہنچ رہا تھا لہذا یہ دو افسر موسم خزاں ۱۸۵۱ء میں اس امر کی تحقیق کے لئے از خود خلاف حکم میجر ایبٹ کے نواب جہانداد خان والئی امب کے علاقہ میں آئے ابھی وہ اُسی کے علاقہ میں تھے کہ سرحد حسن زئی کے قریب ان دونوں کو حسن زئی کے چند مسلح افراد نے قتل کر دیا۔ اس پر جتنے حسن زئی نواب صاحب کے علاقہ میں ملے اُن کو اُس نے حکومت ہزارہ کے حوالہ کر دیا۔ حسن زیوں نے انتقام کے لئے نواب امب پر سخت حملے شروع کر دئے دو سرحدی قلعے چھبیری اور شنگلئی اپنے قبضہ میں کر لئے اور اس کے علاقہ میں لوٹ مار شروع کر دی اور لوگوں کو نواب کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے لگے۔ لہذا سرکار انگریزی کو ان کے خلاف قدم اٹھانا پڑا۔ دسمبر ۱۸۵۲ء میں کالا ڈھاکہ ہر دو اطراف سے حملہ کیا گیا۔ حسن زیوں نے کوئی خاص مقابلہ نہ کیا۔ ان کے چند گاؤں جلا دئے گئے۔ اور جنوری ۱۸۵۳ء میں فوجیں واپس آ گئیں۔ اس کو کافی سزا سمجھ کر حسن زیوں کے آدمی رہا کر دئے گئے۔

ہندوستانی مجاہدین پر حملہ انگریزی افواج کالا ڈھاکہ کی مہم سے واپس آنے کے بعد مجاہدین کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کیونکہ انہوں نے حسن زیوں کی امداد کی تھی۔ نواب امب کا قلعہ کوٹلہ (دریائے سندھ کے دائیں طرف) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۷ر جنوری کو میجر ایبٹ تھوڑی فوج لے کر پلیاں سے دریا پار کر کے ان پر حملہ آور ہوا۔ لیکن وہ پہلے ہی بھاگ گئے۔ اور حملہ آور تنولیوں کے تعاقب سے تیس چالیس آدمی مارے گئے۔ ستھانہ خالی ہو گیا۔ مزید کارروائی

کئے بغیر فوج واپس آگئی۔

۳۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں مجاہدین نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اسسٹنٹ کمشنر مردان پر حملہ کیا حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان کو ختم کر دیا جائے لہٰذا ایک فوج زیر کمان سر سڈنی کاٹن خدوخیل قوم (ضلع مردان) کو مناسب سزا دیتے ہوئے کھبل کی طرف بڑھی۔ ہزارہ سے میجر بیچر ڈپٹی کمشنر فوج لے کر دریائے سندھ سے پار ہوا۔ دونوں طرف سے ستھانہ پر حملہ کیا گیا۔ مجاہدین شوق شہادت میں بہترین کپڑے زیب تن کئے ہوئے مقابلہ میں صف آرا ہوئے اور مطابق ہزارہ گزیٹیر کے پینتیس ۳۵ مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ ستھانہ کے دونوں حصے جلا دئے گئے۔ ۱۸۵۸ء کی جنگ کے بعد اتمان زئیوں اور ضلع مردان کے جدون قوم نے ذمہ لیا۔ کہ وہ مجاہدین کو پھر ستھانہ آباد نہ کرنے دیں گے۔ اس کے بعد مجاہدین مہابن کے شمالی حصہ میں ملکہ میں جاگزیں ہو گئے۔

۱۸۶۳ء میں مجاہدین پھر ستھانہ آگئے اور اتمان زئی اور جدون قوم نے ان کی کوئی مزاحمت نہ کی اس بنا پر ان ہر دو اقوام کی ناکہ بندی کی گئی۔ مجاہدین اور حسن زئی حملے کرتے رہے۔ اس کے نتیجے میں امبیلہ کی مشہور جنگ ہوئی۔ مجاہدین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ستھانہ اور ملکہ جلا دئے گئے اور آئندہ کے لئے اقوام جدون، اتمان زئی، مدا خیل، اور امازئی نے مجاہدین کو پھر آباد نہ ہونے کی ضمانت دی۔

۵۔ کالا ڈھاکہ دوسری مہم ۱۸۶۸ء۔ جولائی ۱۸۶۸ء میں اکازئی، چغرزئی اور سادات پریری کانے متفق ہو کر پولیس تھانہ اوگی پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ ان کا حملہ دست بدست لڑائی سے پسپا کر دیا گیا۔ لیکن کافی لوٹ ہوئی اور چار پولیس کے سپاہی ساتھ لے گئے۔ اس حملہ کے پس منظر میں خان اگرور کا ہاتھ تھا چونکہ ۱۸۷۲ء سے پہلے کے سرسری بندوبست میں اس کا حق ملکیت نہ مانا گیا تھا اور اوگی میں پولیس تھانہ ہونے کی وجہ سے اس کی حکومت کے رعب میں فرق آتا تھا۔ لہٰذا وہ سخت ناراض تھا۔ لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا اور خان کو گرفتار کر کے ایبٹ آباد لایا گیا۔

وادیٔ اگرور میں چند روز بدامنی رہی لیکن انجام کار اس پر قابو پا لیا گیا۔ جب کہ ایک بھاری فوج سے ستمبر کے آخر میں ان اقوام پر حملہ کیا گیا۔ جس پر ان قوموں نے جلدی سے اطاعت قبول کر لی۔ ان اقوام پر معمولی تعزیری جرمانے اور تاوان مقرر کر دیا گیا جو انہوں نے ادا کر دیا۔ منشا صرف اُن کے رعب کو زائل کرنا تھا۔ قتل وغارت مطلوب نہیں تھی۔

۶۔ دوسری مہم کالا ڈھاکہ کے بعد کے واقعات:۔ گذشتہ مہم میں چونکہ نرمی برتی گئی تھی اس لئے اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا۔ جولائی ۱۸۶۹ء میں حسن زئیوں، پریری سادات اور اکازئیوں نے اگرور کے

دو چھوٹے مواضعات پر حملہ کر کے ان کو جلا دیا۔ گاؤں والوں کے چار آدمی مارے گئے اور سترہ زخمی ہوئے اگست میں جسکوٹ پر حملہ ہوا مقابلہ میں اس گاؤں کے چند آدمی اور ایک پولیس کا سپاہی قتل ہوئے۔ اس کے جواب میں ۲ اکتوبر کو ایک فوج زیر کمان کرنل راتھنی اگرور میں داخل ہوئی۔ اور اکازئیوں کا گاؤں شاہ توت جلا دیا گیا۔ اس کی سب زمین ضبط کر لی گئی۔ اور حکم دیا گیا کہ اکازئی پھر اس گاؤں میں حکومت کی اجازت کے بغیر آباد نہیں ہو سکتے۔ آئندہ کے استحکام کے لئے اگرور میں فوج متعین کی گئی۔

اکتوبر ۱۸۶۸ء میں پھر کالا ڈھاکہ کی قبائل۔ اکازئی اور خان خیل حسن زئی نے پہاڑ کے دامن کے تین گاؤں برچہ، سنبل بوت اور بھولوبہ پر حملے کئے۔ گاؤں جلا دئے گئے اور کچھ آدمی بھی قتل کر دئے۔ سرکاری فوج ان حملوں کی روک تو نہ کر سکی۔ لیکن شاہ توت کے گرد ونواح کے فصلات کو برباد کر دیا گیا۔

خانِ اگرور کی واپسی اور بعد کے حالات ۱۸۷۰ء

کیپٹن ویس مہتمم بندوبست کی تفتیش پر خان اگرور بے گناہ ثابت ہوا۔ خان کو لاہور سے رہا کر دیا گیا۔ اور وہ اپنے وطن واپس آگیا۔ اس کے آنے سے علاقہ میں امن قائم ہو گیا۔ موسم خزاں کے آخر میں فوج علاقہ اگرور سے واپس بلائی گئی۔ تھوڑی سی فوج اوگی میں باقی رکھی گئی۔

اکازئی کی ناراضی۔ چونکہ موضع شہتوت کے آباد کرنے کی اُن کو اجازت نہ دی گئی اور خان اگرور کی جائداد سے بھی ان کو کچھ نہ ملا۔ لہٰذا جون ۱۸۷۱ء میں انہوں نے کانگو، گل ڈھیری، اور بھولوبہ پر حملہ کر کے ان تینوں گاؤں کو جلا دیا۔ اس کا بدلہ لینے کیلئے علی گوہر خان اگرور نے حکومت کی اجازت کے بغیر اپنے تین سو آدمی بھیج کر ان کا ایک گاؤں علی خان جلا دیا۔

۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۳ء میں اکازئی اور حسن زئی کبھی کبھی معمولی وارادات کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۷۳ء میں اکازئی اور چغرزئی نے موضع شہتوت کے نہ ملنے پر موضع برچہ پر حملہ کیا۔ ۱۸۷۴ء میں اکازئی وارداتیں کرتے رہے۔ اور مئی ۱۸۷۵ء میں حسن زئی اور چغرزئی نے مل کر موضع گھانیاں پر حملہ کیا۔ لیکن غلام حیدر خان پسر خانِ اگرور نے اور پولیس نے مل کر ان کو بھگا دیا۔

اکازئی اور حسن زئی کی اطاعت

مندرجہ بالا واقعات کی بنا پر ان اقوام پر فوج سے حملہ کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اور تجاویز سوچی جانے لگیں اس اثنا میں ستمبر ۱۸۷۵ء میں اکازئی جرگہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس آیا۔ اور اپنے گزشتہ کارناموں کی معافی

مانگی اور مکمل اطاعت کا عہد کیا۔ اور موضع شہتوت پر بھی اپنا دعویٰ ترک کر دیا۔ دسمبر ۱۸۷۵ء میں حسن زیوں کے جرگہ نے بھی آکر انہی شرائط پر اطاعت قبول کر لی۔

عطا محمد خان۔ خانِ اگرور کی وفات۔ ۱۸۷۵ء کے آخر میں عطا محمد خان فوت ہوگیا۔ اس کا نابالغ لڑکا علی گوہر خان خان ہوا۔

عروج ہاشم علی خان۔ حسن زئی کا خان

۱۸۷۵ء کے تصفیہ کے بعد چند سال تک حسن زئی اور اکازئی امن میں مخل نہ ہوئے لیکن ۱۸۸۰ء میں ہاشم علی خان حسن زئی نے ایک واقعہ سے ناموری حاصل کر لی۔ اور اس کے بعد وہ مصائب پیدا کرتا رہا۔ فروری ۱۸۸۰ء میں حسن زئی کے خان احمد علی خان کو ایک دوسرے خان مسمی فیروز خان نے قتل کر دیا۔ احمد علی خان کے چھوٹے بھائی ہاشم علی خان نے مدخیل فیروز خان کو وطن سے بھاگ جانے اور نواب امب کے علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

مارچ ۱۸۸۲ء میں ہاشم علی خان نے سرکاری علاقہ میں داخل ہو کر اوگی کے نزدیک موضع "گُلکہ" میں فیروز خان کے ماموں زاد بھائیوں مظفر خان اور سمندر خان کو اس بناء پر قتل کر دیا کہ اس کے بھائی کے قتل میں ان کا ہاتھ تھا۔ حکومت نے اس واقعہ پر ہاشم علی خان پر دو ہزار روپیہ جرمانہ کر دیا اور حسن زیوں کو مطلع کر دیا۔ کہ یہ حسن زئی بہ حیثیت قوم اپنے خان کی حرکات کے ذمہ دار ہوں گے۔ جرمانہ ادا نہ کیا گیا لیکن حسن زئی کچھ عرصہ کے لئے خاموش رہے۔

خان اگرور۔ علی گوہر خان اور اس کے چچا زاد عبد اللہ خان ولد اللہ داد خان کی چپقلش

اللہ داد خان پنجاب کے الحاق سے پہلے عطا محمد خان اگرور کا بہ عمر صغر سنی سربراہ تھا۔ اُن کے درمیان عداوت تھی۔ یہی عداوت ورثہ میں اُن کے لڑکے کو ملی ۔ ۱۸۸۲ء کے آخر میں علی گوہر خان نے ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو درخواست دی کہ اگرور کے چھ گاؤں جو عبد اللہ خان کے پاس پٹہ پر ہیں لے لئے جائیں۔ اپریل ۱۸۸۴ء میں عبد اللہ خان نے خلاف وعدہ اگرور سے نکل کر پریری سادات کے علاقہ میں چلا گیا۔ وہاں سادات پریری اکازئی اور چغرزئی کی امداد سے اگرور میں فسادات کرنے لگا۔ اور بہت سے گاؤں پر یکے بعد دیگرے حملے کئے۔ اس بناء پر عبد اللہ خان کا الاؤنس ۵۹۲ روپیہ جو سرکار نے دے رکھا تھا ضبط کر لیا گیا۔ اس کو مفرور قرار دیا گیا۔ اور پریری سادات، اکازئی اور چغرزئی کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ اس کے بعد ان اقوام سے مختلف اوقات اور جگہوں پر تصادم ہوتا رہا۔ ۱۸۸۵ء کا سال خاموشی سے گزرا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ اقوام اب عبد اللہ خان کی طرفداری میں ناکامی محسوس کرنے لگی تھیں۔ اکتوبر ۱۸۸۵ء

میں پریری سادات اور چغرزئی نے اطاعت قبول کر لی۔ اور جرگہ برائے معافی بھیجا۔ ان سادات پر چھ سو روپیہ اور چغرزئیوں پر آٹھ سو روپیہ جرمانہ کر دیا گیا۔ اور ان کے جو آدمی بطور یرغمال راولپنڈی میں مارچ ۱۸۸۵ء سے زیر حراست تھے، چھوڑ دئے گئے۔ آئندہ کے لئے ان دونوں قوموں نے چند آدمی بطور یرغمال دے دئے جو ایبٹ آباد میں رکھے گئے۔

اکازئی مخالف ہی رہے اور ان کی ناکہ بندی ۱۸۸۶ء اور ۱۸۸۷ء میں بھی جاری رہی۔

اگرچہ پریری سادات اور چغرزئی نے اطاعت قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ درپردہ عبد اللہ خان کی طرفداری کرتے رہے۔ جولائی ۱۸۸۷ء میں عبد اللہ خان نے معہ اپنے بھائیوں اور چغرزئی افراد موضع باگڑیاں پر حملہ کیا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ جانبین سے کچھ آدمی بھی مارے گئے۔ اگست ۱۸۸۷ء میں پریری سادات کے چغرزئی مزارعوں نے موضع گھانیاں کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ اس پر سادات کے یرغمال کو جیل میں ڈال دیا گیا۔

ان واقعات سے حکومت نے یہ اندازہ لگایا کہ نرم سلوک کا ان اقوام پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ اور وہ دلیر ہو گئے ہیں اور ان کو سخت سزا دینے کا وقت آگیا ہے۔ اسی اثناء میں ہاشم علی خان کے آدمیوں نے جنوری ۱۸۸۸ء میں اودے گرام، اگرور کے ایک گاؤں پر حملہ کیا۔ دو آدمی قتل کر دئے اور دو کو ساتھ لے گئے۔ ان دو آدمیوں کی فوراً واپسی کا حکم دے گیا۔ لیکن انہوں نے انکار کیا۔ اس پر حسن زیوں کو بہ حیثیت قوم یہ تنبیہ کی گئی کہ وہ سب اس کارروائی کے ذمہ دار ہیں انہوں نے سختی سے جواب دیا۔ تفتیش سے پتہ چلا کہ اس میں خان اگرور اور اس کے کاردار فضل علی کا ہاتھ تھا۔ لہذا فضل علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور خان اگرور کو لاہور جلاوطن کر دیا گیا۔ اور حکومت نے فیصلہ کیا۔ کہ پریری سادات اور خان خیل حسن زیوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ لہذا اپریل میں پریری سادات اور حسن زئی کے خلاف ناکہ بندی کی گئی۔ ۱۸ جون ۱۸۸۸ء کو دو انگریز افسران کے ماتحت تھوڑی سی فوج سرحد کی دیکھ بھال کے لئے بھیجی گئی۔ اقوام نے پہاڑ پر سے گولیاں چلائیں۔ جانبین سے چند آدمی مارے گئے۔ اور دو انگریز افسر بھی مقتول ہوئے۔ تمام اقوام اور عبد اللہ خان بھی بمعہ چند مجاہدین، از میدان۔ نزد پلوسی۔ سے آکر جمع ہو گئے۔ حکومت نے مزید حملہ کرنا اس وقت مناسب نہ سمجھ کر فوج واپس کر لی۔

کالا ڈھاکہ کی تیسری مہم

مندرجہ بالا واقعات کے بدلے میں انگریزی حکومت نے مجاہدین میدان کو بھی ناکہ بندی میں شامل

کر لیا۔ اور خان اگرور کو جس کو لاہور سے مری میں تبدیل کر دیا تھا، گرفتار کر لیا۔ اور ان اقوام پر حملہ کا انتظام کیا جانے لگا۔ بکم اکتوبر ۱۸۶۸ء کو ایک مضبوط فوج اوگی اور دربند میں جمع کی گئی۔ ان اقوام سے مطالبہ کیا گیا کہ دو آدمی جن کو وہ پکڑ کر لے گئے تھے واپس کریں۔ حسن زئی ترپن ہزار روپیہ جرمانہ دیں۔ اور ہاشم علی خان کو حوالہ کریں۔ اکازئی چار ہزار روپیہ جرمانہ ادا کریں۔ سید اور جعفر زئی پندرہ سو روپیہ جرمانہ دیں۔ اور ٹیکری والے ایک ہزار روپیہ جرمانہ دیں۔ اور سب اقوام بطور ضمانت اپنے چند افراد حوالہ کریں۔ یہ شرائط اقوام نے منظور نہ کیں۔ اور ان سے چار طرف سے حملہ کر دیا گیا۔ سب کالا ڈھاکہ میں فوج پھیل گئی۔ بہت سے گاؤں جلا دئے گئے۔ مجاہدین کا گاؤں میدان بھی جلا دیا گیا ان اقوام کا بہت سا گھاس اور غلہ تباہ کر دیا گیا۔ اس علاقہ میں صرف موضع کوٹکئی پر مجاہدین نے بڑی دلیری سے فوج پر حملہ کیا۔ اور ان کے اٹھاسی آدمی شہید ہو گئے۔ ۱۹ اکتوبر کو اکازیوں نے اطاعت قبول کر لی اور سب شرائط منظور کر لیں۔ ۲۰ اکتوبر کو حسن زیوں نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اور پچھتر ہزار روپیہ جرمانہ (اب یہ زیادہ کر دیا گیا تھا) ادا کر دیا۔

اس کے بعد فوج ٹیکری اور پریری کی طرف متوجہ ہوئی۔ ٹیکری والوں نے فوراً ایک ہزار روپیہ جرمانہ ادا کر دیا۔ لیکن پریری والے نہ آئے۔ لہذا ان کے گاؤں۔ گڑھی اور کوپرا جلا دئے گئے۔ اس دفعہ فوج تھاکوٹ پر بھی پہنچی۔ ۱۸۶۸ء کی مہم میں یہاں فوج نہ پہنچی تھی۔

الائی- اور اہلیان الائی کی دراز دستیاں

اگست ۱۸۶۸ء میں الائی والوں نے مسٹر سکاٹ کی پیمائش کرنے والی پارٹی پر جب کہ وہ بھوگڑ منگ کے درّے میں کام کر رہے تھے حملہ کیا۔ اس جرم کی پاداش میں الائی والوں پر پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا جو انہوں نے ادا نہ کیا۔

۱۸۷۴ء میں انہوں نے علاقہ سرکار میں کوہستانیوں پر حملہ کیا۔ اس کے جواب میں کچھ الائی وال گرفتار کر لئے گئے۔ اور ان کے خلاف ناکہ بندی کی گئی۔ اس کے بعد ان کا ایک جرگہ پہلی دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس آیا اور اطاعت قبول کی۔

۱۸۷۷ء میں انہوں نے بٹل پر حملہ کیا۔ لہذا ان کی پھر ناکہ بندی کی گئی۔ جو چند سال تک رہی۔

۱۸۸۰ء میں جن ہندوؤں کو وہ بٹل کے ڈاکہ میں لے گئے تھے انہیں واپس لائے اور ۱۸۸۱ء میں انہوں نے ۵۰۰ روپیہ جرمانہ دے کر اپنے آدمی حکومت سے چھڑا لئے۔ لیکن باقی مطالبات انہوں نے پورے نہ

کئے جو یہ تھے :-

۱- بٹل پر ڈاکہ ڈالنے پر ۵۰۰۰ روپیہ کا جرمانہ
۲- مسٹر سکاٹ پر حملہ کا ۵۰۰ روپیہ جرمانہ
۳- اپنے خان ارسلہ خان کی حوالگی۔

اس کے بعد ایک دفعہ حملہ کر کے ارسلہ خان کے گاؤں پوکل کو جلا دیا گیا۔ ناکہ بندی اٹھالی گئی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد پریری سادات نے ۱۵۰۰ روپیہ جرمانہ ادا کر دیا۔

کالا ڈھاکہ کی چوتھی مہم

اگرچہ گذشتہ مہیں کامیاب رہیں لیکن اقوام کالا ڈھاکہ سے پھر جلد ہی تصادم ہو گیا۔ ان اقوام کے ساتھ شرط صلح میں یہ بات شامل تھی کہ وہ سرکاری افسران و فوج کے اگرور یا سرحد کالا ڈھاکہ پر جانے پر مداخلت نہ کریں گے۔ اس بناء پر حکومت نے مارچ ۱۸۹۰ء اگرور سے کالا ڈھاکہ تک سڑکیں بنانے کا انتظام کیا۔ اور موسم خزاں میں سرحد کالا ڈھاکہ پر سے ایک دستہ فوج کے مشقی مارچ کا انتظام بھی کیا۔ اس کام کے لئے جب اکتوبر سنہ ۱۸۹۰ء میں ایبٹ آباد سے فوج اگرور میں جمع ہوئی تو ہاشم علی خان کے بھائی سکندر خان بمعہ کچھ اکازئی و خان خیل حسن زئی افراد کے ساتھ موضع برچار میں آکر کیمپ پر گولیاں چلائیں۔

دوسرے دن افواج واپس بلالی گئیں اور اقوام کالا ڈھاکہ کو مطلع کر دیا گیا۔ موسم بہار میں ان کو مناسب سزا دی جائے گی۔ مارچ ۱۸۹۱ء میں ایک فوج چھ ہزار کے قریب بمعہ اٹھارہ توپوں کے میجر جنرل الکس کے زیر کمان دربند میں جمع ہوئی۔ جب فوج نے حرکت کی تو ان اقوام نے کوئی مقابلہ نہ کیا۔ ہاشم علی خان بھاگ کر جعفر زئی علاقہ نزد سرحد بنیر چلا گیا۔ فوج نے حسن زئی کے علاقہ سے گزر کر علاقہ اکازئی کو بھی پامال کیا۔ مقابلہ صرف سرحد جعفر زئی پر بنیر والوں، چدونوں اور ہندوستانی مجاہدین نے کیا۔ مجاہدین نے سر توڑ مقابلہ کیا۔ لیکن آخر کار یہ سب منتشر ہو گئے۔

شرائط صلح حسن زئی اور اکازئی کے جرگہ نے مندرجہ ذیل شرائط مئی ۱۸۹۱ء میں قبول کریں۔

۱- اپنے علاقہ سے ہاشم علی خان کی دائمی جلاوطنی بمعہ اس کے رشتہ داراں سکندر خان، شیخ عطا محمد اور طوطا زرخان۔
۲- ہندوستانی مجاہدین کو اپنے علاقہ میں آباد نہ ہونے دینا۔
۳- خان خیل کے چار منزلہ قبیلوں سے باہر خان سیری مقرر کرنا اور اس کی نیک چلنی کی ضمانت۔

سادات پیربری اور مدہ خیل جرگہ نے بھی اسی قسم کی شرائط پر صلح کر لی۔

انتخاب ابراہیم خان بطور خان سیری اقوام کا مواجب اور اقوام سے سرحدی پولیس کا بھرتی کرنا۔

معاہدہ کی رُو سے ہاشم علی خان کے مخالف ابراہیم خان کو سیری کا خان منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب میں نواب امب (اس کی لڑکی ابراہیم خان کو بیاہی ہوئی تھی) نے امداد کی۔ اس کے انتخاب پر حکومت نے اس کو کافی رقم اور بندوقیں بطور تحفہ دیں۔ اور دو ہزار روپیہ سالانہ مواجب مقرر کیا۔ اس کے علاوہ امن قائم رکھنے کی خاطر مسٹر فریڈرک کننگم ڈپٹی کمشنر کی تجویز پر چند او رخوانین (ملکوں) کو بھی مواجب دے گئے اور ان اقوام کے چند آدمی بارڈر پولیس کے لئے بھرتی کئے گئے۔

مواجب حسب وار قوم

۱۔	حسن زیوں کے ملکوں کو	۱۲۰۰	روپیہ
۲۔	اکازئی ”	۸۰۰	”
۳۔	مدہ خیل ”	۱۰۰۰	”
۴۔	پربری وال ”	۵۰۰	”
۵۔	دیشی۔ جگیری۔ نندہار ”	۱۰۰۰	”
	میزان	۵۰۰۰	روپیہ

ان انتظامات کے مکمل ہوجانے پر فوج واپس بلائی گئی۔

مہم عیسیٰ زئی ۱۸۹۲ء

معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہاشم علی خان اپریل ۱۸۹۲ء دُور چغرزئی کے علاقہ سے مدا خیل اور حسن زئی کے مواضعات میں آگیا جون میں مداخیل کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ اور عیسیٰ زئی کے تینوں خیل۔ حسن زئی۔ آکازئی اور مدا خیل کو نوٹس دیا گیا کہ وہ ہاشم علی خان کو لے آئیں اگرچہ ہاشم علی خان اور اس کے رشتہ داروں کو تین سو روپیہ ماہوار گزارہ بھی دینا حکومت نے منظور کیا لیکن وہ نہ آیا۔ اس واسطے ایک فوج۔ چھ ہزار جوان۔ زیر کمان میجر جنرل لاک ہارٹ دربند میں جمع ہوئی۔ فوج نے دربند سے اوپر جا کر دریائے سندھ کو عبور کیا اور موضع بائیکہ جہاں ہاشم علی خان سکونت پذیر تھا، پر بڑھی۔ لیکن اس کو اور ملحقہ دیہات کو خالی پایا۔ ان دیہات کو جلا کر فوج واپس آگئی۔

۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۵ء تک سرحد کالا ڈھاکہ پرامن رہی۔ اس کے بعد ہاشم علی نے آنے کی کوشش کی لیکن اس دفعہ اس کا الاؤنس کم کر دیا گیا یعنی ۱۵۰ اس کے لئے ۵۰ روپیہ اس کے بھائی

سکندر خان اور ۵۰ روپیہ اس کے چچازاد طرہ باز خان کے لئے۔ بشرطیکہ راولپنڈی یا پشاور ضلع میں رہائش رکھے یہ اس نے منظور نہ کیا۔ اور اپنے علاقہ سے چغرزئی میں جلاوطن رہا۔

ابراہیم خان کا قتل اور سیری کا جلایا جانا

ابراہیم خان کمزور ثابت ہوا۔ اور قوم پر اس کا کوئی اثر نہ تھا سنہ ۱۹۰۶ء میں سیری کے حالات خراب ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں ابراہیم خان نے اپنے چچا زاد عیسیٰ خان کو۔ جو مدت سے اس کا مخالف تھا، مروا دیا۔ اس پر عیسیٰ زئی قبائل اس سے منحرف ہوگئیں۔ عرصہ تک اس قتل پر قوموں میں جرگے ہوتے رہے۔ لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر کار قبائل نے اپریل سنہ ۱۹۰۶ء میں سیری پر حملہ کر دیا۔ اور اس کو جلا دیا۔ اور حکومت کو مطلع کر دیا کہ وہ ابراہیم خان کو اپنا خان نہیں مانتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد اکازئیوں کی مدد سے ابراہیم خان نے پھر سیری پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کو پھر سے تعمیر کرنے لگا۔ ستمبر میں حسن زیوں نے سیری پر حملہ کر دیا۔ اور بُرج جو ابراہیم خان نے بنایا تھا گرا دیا۔ ۳ر نومبر سنہ ۱۹۰۶ء کو سکندر خان اور طرہ باز خان دونوں نے مسجد کے گرد جس میں ابراہیم خان ٹھہرا ہوا تھا گھیرا ڈال کر آگ لگا دی۔ ابراہیم خان نکل کر بھاگنے لگا کہ اس کو گولی مار دی گئی۔

اس کے بعد کافی عرصہ تک خان کا انتخاب بھی باعث گفتگو رہا۔ آخر کار حکومت نے مئی سنہ ۱۹۰۷ء ہاشم علی خان کے بڑے لڑکے شیر علی خان کو اس شرط پر خان مقرر کرنا منظور کر لیا۔ کہ وہ امن و امان کی ضمانت دے۔ خان اگرور جلاوطن رہا۔ اور اگرور اور اس کی سرحدات پرامن رہا۔

سیّد احمد شہید علیہ الرحمۃ

اور

جماعت مجاہدین

سوانح حضرت سیّد شہیدؒ پر مولانا غلام رسول صاحب مہر کی کتاب "سیرت سیّد شہیدؒ" تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔ میرے جیسے ہیچمدان کو اس موضوع پر قلم اٹھانا ہرگز زیب نہیں دیتا۔ لیکن اس نامور شہیدؒ کے ساتھ جو میری عقیدت ہے۔ وہ مجبور کرتی ہے کہ میں بھی لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے اس بات میں اگرچہ مختلف ماخذوں سے استفادہ کیا۔ لیکن ان میں سرِفہرست حضرت مولانا غلام رسول صاحب مہر ہی کی کتاب ہے۔

اس کے علاوہ میری تلاش نے مجھے دو ایسے ماخذوں تک پہنچایا جو دوسرے مصنفین کی دسترس سے باہر ہے۔ اول تاریخ مہتاب سنگھ (فارسی قلمی ۱۸۲۴ء) دوم انگریزی دور ۱۸۶۳ء سے ۱۸۹۵ء تک کی سرکاری اسناد بہ صورت خط و کتابت مابین افسران سابق صوبہ سرحد، در بارہ حالات ہندوستانی مجاہدین جس سے حضرت شہیدؒ کے خلفاء کے دور کے ایسے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جو پہلے قدرے مستور رہے ہیں۔

میں نے ان سب خطوط کا ترجمہ اور چند کی نقل من و عن درج کر دی ہے۔ تاکہ قارئین کرام کو حضرت شہید علیہ الرحمۃ کے خلفاء و جماعت مجاہدین کا سرحدی مقامات کی صبر آزما حالات میں استقلال، بعض قبائل سرحد کی بے اعتنائی و تکلیف دہی بوجہ مقاصدِ دینی سے بے خبری، ہندوستان کے معتقدین کی عقیدت اور جان و مال سے خدمت اور ان کے سفیروں کا ہندوستان سے روپیہ وغیرہ سرحدی مقامات تک پہنچانے میں جاں بازی اور ہمت کی تفصیل سامنے آجائے۔

سیّد احمد شہید علیہ الرحمۃ کی زیرِ قیادت مجاہدین نے اس ضلع کی تاریخ پر کافی اثر ڈالا۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اپنی بدنصیبی سے اس زرّین موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس چراغ سے روشنی حاصل نہ کی۔ اور غلامی کی تاریکی کا دور لمبا ہو گیا۔ ورنہ پاکستان سو ڈیڑھ سو سال پہلے ہی بن جاتا۔ اور اس کا دائرہ تمام برصغیر پر حاوی ہوتا۔

سیّد احمد شہیدؒ علیہ الرحمۃ نے جہاد فی سبیل اللہ کی سعی اور آخر کار اس راہ میں شہادت سے ابدی مقام حاصل کر لیا۔ ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمہ نے اپنے جریدہ الہلال میں ایسے ہی مجاہد افراد کے متعلق تحریر فرمایا تھا ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔ آگ کی ایک چنگاری بڑے بڑے آتش کدوں اور تنوروں کو شعلوں سے بھر دیتی ہے۔ ایک بیج صدہا شاخیں اور ہزاروں پھل پیدا کر دیتا ہے۔ بارانِ رحمت الٰہی کا ایک شاداب دن پوری فصل کو سرسبز کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ موتی کا ایک بڑا دانہ پورے ہار کی عزت بڑھا دیتا ہے۔ ہیرے کا ایک درخشندہ ٹکڑا پورے تاج کے حسن و جمال کے لئے بس کرتا ہے۔ کیوڑے کا ایک درخت پورے باغ کے معطر ہونے کے لئے، گلاب کا ایک قیمتی پھول پورے ایوان و منزل کی رونق کے لئے اور بہ تمثیل سادہ تر، ایک چراغ پورے گھر کی روشنی کے لئے کافی ہوتا ہے یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔ قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو ہزاروں افراد کے ذریعہ نہیں، بلکہ سرچشمۂ حیات ایک یا ایک سے زیادہ چند نفوس قلیلہ و عدیدہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے مگر قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت میں جب ایک عمدہ بیج بارآور ہو کر سر اٹھاتا ہے۔ تو اس سے صدہا شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اور ان میں ہزارہا تر و تازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔ پس باغ کی زمین کی طرح اس سرزمین کی شادابی کے لئے بھی بہت سے خاردار اور بے ثمر جھاڑیوں اور درختوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ہی درخت کی۔

ایک ہی انسان چاہیے جو انسان ہو۔ اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کر دے اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے ہے۔ مگر اقوام کی زندگی صرف اشخاص ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں۔ اور زندہ ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کی موت و حیات کے یہی معنی ہیں ....

..........کہ پہلی صورت میں ان نفوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں۔ جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی۔ اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود ہوتے ہیں۔ جو اپنی زندگی کے سرچشمے سے پوری قوم کے کشتِ اقبال کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں ؎

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

سید احمد شہیدؒ نے اپنے مریدوں کی معیت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ اور آخر کار قصبہ بالاکوٹ میں سکھ فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ؎

بنا کردند خوش رسمے، بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگرچہ انہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ظالمانہ حکومت کا تختہ الٹنے میں ناکامی ہوئی لیکن انہوں نے جہاد سے رنجیت سنگھ کی سطوت کی جڑیں ہلا دیں اور دنیا کو بتا دیا کہ مسلمانوں کی غیرت ابھی مُردہ نہیں ہوئی۔ اس خاکستر میں ابھی خودی کی چنگاری موجود ہے اور وقت موزوں پر شعلہ ہلاکت خیز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اس حقیقت کو سید عبدالجبار شاہ مرحوم ساکن ستھانہ (نزد کھبل۔ کیا) نے مطابق کیرو (تاریخ پٹھان میں ص ۳۲۶) میں یوں بیان کیا:۔

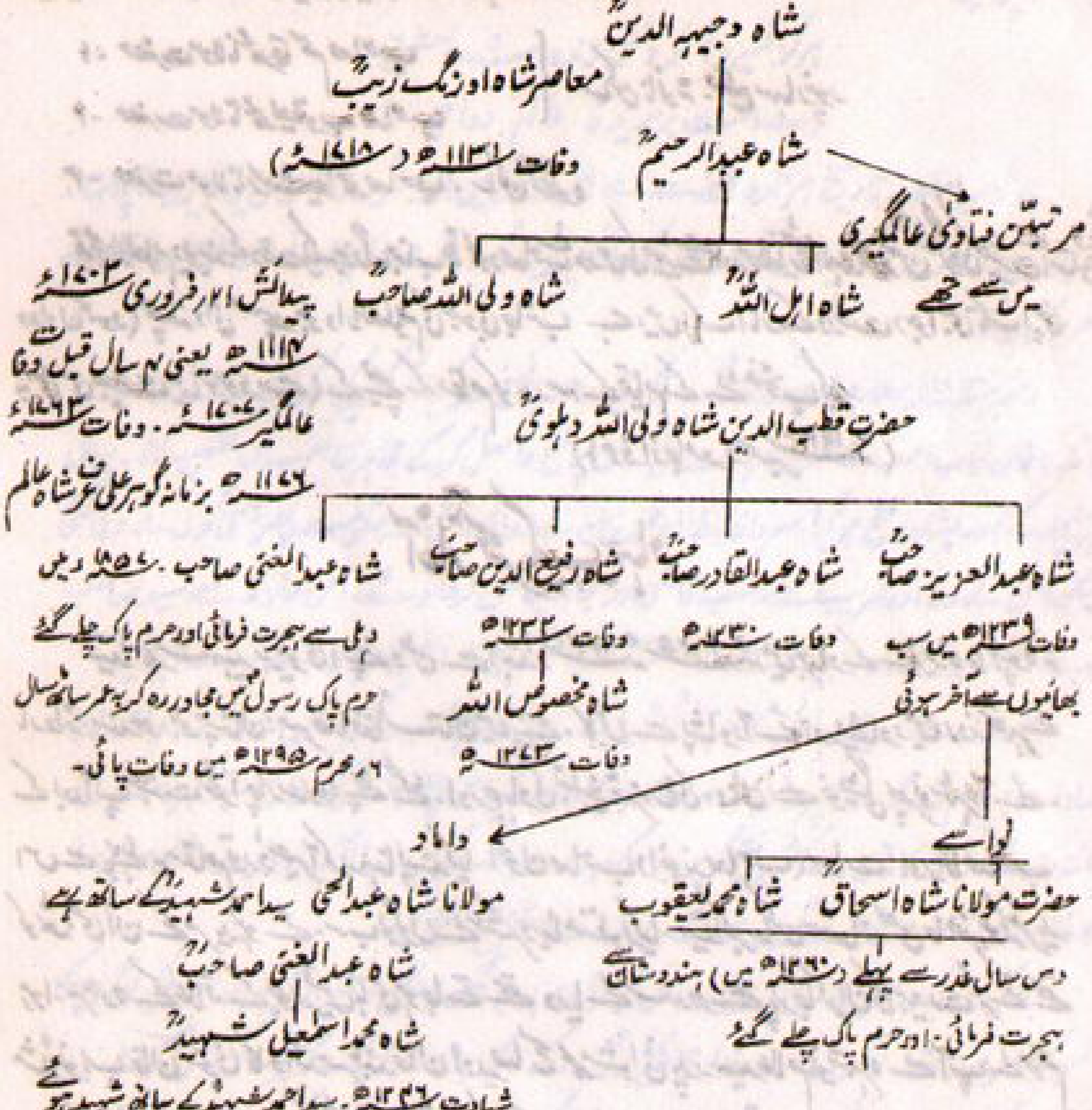
"سید احمدؒ بریلوی مجددؔ کی حیثیت سے آئے اور ہمارے اجداد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ تاکہ مظلوم مخلوق کو سکھوں کے جبر و استبداد سے نجات دیں۔ انہوں نے اس مقصد میں سب سے بڑی قربانی دی اور شہید ہو گئے۔ لیکن دنیا کو معلوم ہے کہ سکھ شاہی بھی ان کی شہادت سے پندرہ برس بعد صفحۂ ہستی سے مٹ گئی"۔

خاندان ولی اللّٰہی

سرزمین پاک و ہند میں اسلامی علوم و فنون کی دعوت و تجدید اور تحریک آزادیٔ مسلمانان کی بنیاد اسی خاندان کے ہاتھوں رکھی گئی۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک آزادی اسی سلسلہ طلائے ناب کی کڑی ہوئی جو اس علاقہ میں شروع ہوئی اور مدت تک شمع آزادی کے پروانوں نے اس کو زندہ رکھا۔ لہٰذا خاندان ولی اللّٰہی کی مختصر تاریخ تحریر کی جاتی ہے۔ کیونکہ

ایں سلسلہ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

شجرہ نسب



شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ آپ کے والد کا سلسلہ حضرت فاروق اعظمؓ اور والدہ کا حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ کے بزرگوں میں شیخ شمس الدین وارد ہند ہوئے اور رہتک میں مقیم ہوئے۔ آپ کی اولاد میں شیخ قائم الدین نے فوجی زندگی اختیار کر لی۔ اور چنانچہ شاہ ولی اللہ کے دادا شیخ وجیہہ الدین اورنگ زیب کے لشکر میں ایک معزز فوجی عہدہ دار تھے۔ اور حسب خواہش دیرینہ نربدا کے کنارے ڈاکوؤں کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ شیخ وجیہہ الدین کے تین فرزند تھے شیخ ابوالرضا محمد۔ شیخ عبدالرحیم۔ شیخ عبدالحکیم۔

دیوبند میں دارالعلوم کی بنیاد شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے جن شاگردوں نے رکھی وہ مندرجہ

حضرت سید احمد شہیدؒ کی آمد ہزارہ تا شہادت

آپ پٹھانان یوسف زئی سے تنگ اور ناراض ہو کر ہزارہ آئے وجہ یہ تھی کہ پٹھانوں میں رواج یہ تھا کہ جب کسی کی لڑکی جوان ہو جاتی تھی تو اس کو اپنے خاندان و کفو میں کسی پٹھان سے منگنی کر دیتے تھے لیکن جب تک وہ شخص ایک سو اسی روپیہ ادا نہ کرے شادی نہیں ہوتی تھی۔ سید احمد شہیدؒ نے اس کو بدعت جان کر تمام ملک یوسف زئی میں منادی کرادی کہ کوئی شخص لڑکیوں پر روپیہ نہ لے۔ حضرت دولہا مُلّا کو پانچ آنہ دے کر نکاح پڑھا لیوے۔ اس طرح سے بہت سے لوگوں کی شادی ہو گئی جو بھاری قیمت ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس پر سب افغان خفا ہوئے اور لوگ طعنہ دینے لگے کہ اب لڑکیوں کی قیمت پانچ آنے مقرر ہو گئی ہے۔ اس ناراضی کی بناء پر سب افغان آپ کے مخالف ہو گئے۔ اور آپ کو ملک یوسف زئی چھوڑ کر ہزارہ آنا پڑا۔ ملک یوسف زئی میں ایک مقررہ دن ہر گاؤں میں مجاہدین کو قتل کر دیا گیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ڈیڑھ سو کے قریب آدمی پنجتار میں تھے آپ فتح خان پنجتار کی رہنمائی میں از راہ کوہستان دریائے سندھ پار کر کے تیکری و تندھیاڑ کی طرف چلے گئے۔ خان گڑھی حبیب اللہ خان اس وقت سکھوں سے ناراض تھا۔ اس نے آپ کو اپنے آدمیوں کے ساتھ موضع راج دواری (علاقہ تندھیاڑ) میں جگہ دی اور خود بھی ان کی متابعت اختیار کر لی۔ کچھ مدت بعد سید صاحب راج دواری[1] سے درہ بھوگڑ منگ میں آ گئے۔ کچھ دن بھوگڑ منگ میں رہ کر بالاکوٹ اور درہ کاہگان (کاغان) میں آ گئے۔ افواہ یہ تھی کہ آپ کشمیر جا رہے ہیں۔ اور جو رئیس بھی مثلاً حبیب اللہ خان وغیرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ اس کو ملک کشمیر کی ریاست میں جاگیر کا پروانہ لکھ دیتے تھے۔

ان حالات کے تدارک کے لئے کنور شیر سنگھ آٹھ ہزار فوج کے ساتھ اس مُہم کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ سردار عطر سنگھ کالیاں والہ۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا و ساد ھو سنگھ نہنگ۔ رتن سنگھ گرنگلو۔ وزیر سنگھ رنگر نگلہ و گورمکھ سنگھ و لکھمی سنگھ جو جوالا سنگھ بھدانیہ کا چچا جو ملک یوسف زئی کے معاملہ کی تحصیل اور پشاور گھوڑے لانے کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس مہم میں مامور کئے گئے۔ تاکہ خلیفہ سید احمد شاہ کو کشمیر جانے سے روک دیں۔ اور جہاں وہ ہو اُس سے مقابلہ کریں۔ جب کنور شیر سنگھ اپنی فوج بالا کے ساتھ ہزارہ سے گزر کر پکھلی میں شنکیاری کے مقام پر فروکش ہوا

---

[1] راج دواری علاقہ غیر میں خان گڑھی کی جاگیر میں ہے مجاہدین کا مرکز رہا ہے یہاں سے وہ بھوگڑ منگ اور بالاکوٹ جایا کرتے تھے۔

تو اس وقت سید شہیدؒ بھوگڑ منگ کے درہ میں تھے جو شنکیاری سے آٹھ دس کوس کے فاصلہ پر ہو گا مندرجہ بالا سب سرداروں نے کنور شیر سنگھ کو مشورہ دیا کہ خلیفہ جب سرکاری علاقہ میں خلش پیدا کرے تو اس کے ساتھ مقابلہ کیا جائے۔ یہ علاقہ چونکہ سردار ہری سنگھ کی جاگیر ہے۔ اس جگہ سردار ہری سنگھ کو خود اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ سب نے اتفاق اس بات پر کیا۔ کہ پہلے مظفر آباد جائیں اور اس جگہ کا بندوبست کریں۔ اس کے بعد مزید کارروائی کے لئے غور کیا جائے گا۔ کنور شیر سنگھ ان کی اس رائے سے متفق ہو گیا۔ اگرچہ سردار مہاں سنگھ (نائب ہری سنگھ) نے بہت کہا۔ کہ جناب خلیفہ صاحب بھوگڑ منگ میں موجود ہے۔ اس سے مقابلہ چھوڑ کر مظفر آباد جانے میں کیا مصلحت ہے۔ لیکن سرداروں نے اس کی بات کی طرف توجہ ہی نہ دی۔ اور خواہ مخواہ لشکر نے مظفر آباد کی طرف کوچ کیا۔ اور کنور شیر سنگھ نے اپنی فوج اور مرقومہ بالا ساتھیوں کے ساتھ کوچ کر کے دریائے کشن گنگا جو مظفر آباد کے نیچے بہتا ہے کے کنارے موضع گوجرہ میں مقام کیا۔

ملکیہ لوگ جنہوں نے قلعہ مظفر آباد کا محاصرہ کیا ہوا تھا فوج کے خوف سے متفرق ہو کر فرار ہو گئے اور قلعہ مظفر آباد کا محاصرہ ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد سلطان بخت خان گھوڑی والہ کنور شیر سنگھ کے سلام کے لئے حاضر ہوا۔ کنور شیر سنگھ نے سلطان موصوف کی اچھی پذیرائی کی۔ اور سلطان کے ساتھ مکمل عہد و پیمان کر کے عہد نامہ سیاہی کیسر یعنی زعفران کے قلم سے لکھ کر دیا۔ کہ ملک مظفر آباد سلطان بخت خان کو دیا گیا ہے۔ کوئی اس کی ملکیت میں شریک نہیں۔ چند دن ڈیرہ گوجرہ ہی میں رہا۔ اور مظفر آباد کے نظم و انتظام کو مکمل کیا گیا۔

اس اثناء میں خلیفہ صاحب اپنی جمعیت بھوگڑ منگ میں چھوڑ کر خود بالاکوٹ میں آ کر مقیم ہو گئے اہالیان، رعایا و زمیندران سب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر سردار مہاں سنگھ نے کنور شیر سنگھ کی خدمت میں عرض کیا کہ ملک کا معاملہ تو خلیفہ صاحب وصول کر رہا ہے اور سب رعیت اس کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ ہم قلعہ جات کے سپاہیوں کی تنخواہ کہاں سے دیں گے چنانچہ کنور شیر سنگھ نے حکم دیا کہ سردار مہاں سنگھ اپنی فوج کے ساتھ بمعہ وزیر سنگھ رنگر نگلہ و ساد ھو سنگھ نہنگ و رتن سنگھ گرنگلو کوچ کر کے گڑھی حبیب اللہ میں جا کر ڈیرہ لگائیں اور سردار مہاں سنگھ جس طرح کا بندوبست کرنا چاہے وہ اس کی مدد کریں۔

اس جگہ سے ڈیرہ سردار مہاں سنگھ اٹھ کر گڑھی حبیب اللہ پہنچا۔ اس کے ہمراہ متفق ہو کر مہاں سنگھ کا لیا بمعہ دو سو آدمیوں، وزیر سنگھ رنگر نگلہ کے ساتھ بھی اتنے ہی آدمی، رتن سنگھ گرنگلو کے ساتھ

بھی یہی تعداد اور سادھو سنگھ نہنگ کے ساتھ ایک سو آدمی تھے، روانہ ہو کر گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئے۔ دریائے کنہار کے کنارہ پر ڈیرہ مقرر کیا۔ سردار ہری سنگھ گڑھی کے قلعہ جس کا نام فتح گڑھی رکھا گیا تعمیر شروع کی۔ دو تین دن میں قلعہ کی دیواریں کسی جگہ ایک ہاتھ اور کسی جگہ نصف ہاتھ تک تیار ہو گئی تھیں۔ کہ ایک روز جب چار گھڑی دن باقی تھا۔ مخبر نے خبر دی کہ آج خلیفہ صاحب بالاکوٹ سے اٹھ کر دریائے کنہار کے کنارے کے قریب آ گیا ہے۔ اور اسی رات ڈیرہ پر شب خون مارے گا۔ یہ خبر سنتے ہی ڈیرہ کے افسر بسبب کمی فوج خوف سے بید کی طرح لرزنے لگے۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ آخر کار جرأت کر کے انہوں نے اپنے ڈیرہ کے گرد خندق کھود کر خار بندی کر لی۔ اور جتنا پتھر اور لکڑی ہاتھی اس کو حصار کے دو دروازوں پر جمع کر دیا گیا۔

رات کے چار گھڑی گزرنے پر صبح طلوع آفتاب تک ڈیرہ میں شور و غوغا سے زلزلہ برپا رہا۔ لوگ کبھی کہتے کہ مجاہدین اس طرف سے آ گئے۔ کبھی کہتے کہ اُس طرف سے۔ سب سوار و پیادہ مسلح ہو کر کبھی مشرق کو جاتے اور کبھی مغرب کو۔ اور ڈھول و نقارے بجتے رہے۔ اور اس عرصہ میں کسی شخص نے بھی ڈیرہ میں خوف کی وجہ سے آرام نہ کیا۔ آدھی رات کو کمال اضطراری اور بیقراری کی حالت میں سب افسران ایک جگہ جمع ہوئے اور ایک عرضی کنور شیر سنگھ کو بدیں مضمون لکھ کر روانہ کی۔ "مخبر نے خبر دی ہے کہ خلیفہ سید احمد شاہ بمعہ اپنی جمعیت کے بالاکوٹ سے دریائے کنہار کو عبور کر چکا ہے۔ اور ہمارے ڈیرہ پر شب خون کا ارادہ رکھتا ہے۔ ذات عالی پر روشن ہے کہ ہمارے پاس آٹھ سو کے قریب آدمی ہیں۔ اگر خلیفہ نے حملہ کر دیا تو ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔ امید ہے آپ توجہ فرما کر مدد فرمائیں گے۔" جونہی یہ خط اسی رات کنور شیر سنگھ کو ملا۔ اس نے فوراً تیاری کا حکم دے دیا۔ رات کا وقت تھا۔ فوج کے تیار ہونے اور سواروں کو گھوڑے زین کرنے میں وقت لگا۔ رات ایک دو گھڑی باقی تھی۔ کہ فوج تیار ہو کر روانہ ہوئی۔ اور سورج نکلتے ہی گڑھی حبیب اللہ پہنچ گئی۔ اس کے پہنچنے پر لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اور تعمیر قلعہ گڑھی جاری کر دی گئی۔ سولہ روز میں قلعہ تیار ہو گیا۔ اس اثناء میں کنور شیر سنگھ معہ افسران کے سوار ہو کر ایک دو دفعہ بالاکوٹ سے نزدیک موزوں جگہ برائے ڈیرہ دیکھنے کے لئے گیا۔ چونکہ گڑھی تیار ہو گئی تھی لہٰذا اس جگہ سے کوچ کر کے کوٹ بھلہ میں جو بالاکوٹ سے تین کوس کے فاصلہ پر دریائے کنہار کے اس طرف تھا، ڈیرہ کیا۔ خلیفہ صاحب بالاکوٹ میں تھے۔ کنور شیر سنگھ نے ایک دو بار دریا کے کنارے بالاکوٹ کے نزدیک جا کر دوربین سے مجاہدین کو دیکھا۔ کیونکہ اس طرف سے خلیفہ صاحب کے ڈیرہ پر کچھ بھی قابو نہ چل سکتا تھا۔ اور آپس میں صلاح مشورہ جاری تھے۔ کہ ایک روز خلیفہ صاحب نے چار پانچ سو ملکی لوگ بندوقوں سمیت کنہار

عبور کر کے سروٹ کے جنگل میں جہاں سے سکھوں کے ڈیرہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا، چھپا دئے۔ بالاکوٹ کے ڈیرے کے سامنے چاول پکا کر بکھیر دئے۔ جن کو چگنے کے لئے پرندے جمع ہو گئے۔ جب طلوع آفتاب سے دو تین گھڑی بعد کنور شیر سنگھ نے دوربین سے دیکھا تو لوگوں کو آواز دی کہ خلیفہ صاحب بالاکوٹ سے بھاگ گیا ہے۔ اس امر کی تصدیق کے لئے پانچ سوار اور پانچ پیادہ سپاہی پار جانے کے لئے روانہ کئے۔ کہ جلدی خبر لائیں۔ جونہی یہ لوگ سروٹ کے جنگل میں جہاں مجاہدین چھپے ہوئے تھے اُن کے نزدیک پہنچے تو مجاہدین یک بارا اٹھے اور پانچوں سواروں، اور تین پیادوں کو قتل کر دیا۔ مگر دو پیادے جو تیرنا جانتے تھے دریا میں کود پڑے اور تیراکی کی قوت سے دریا کے راستے سے اپنے ڈیرہ پر پہنچ گئے۔ اور خبر دی کہ وہ پانچ سوار اور تین پیادہ قتل ہو گئے۔ اور یہ خود براہ دریا تیر کر پہنچے ہیں۔ اس پر تمام افسران ایک جگہ بیٹھے اور مشورہ کیا کہ ہم کو بھی دریا کے اس طرف جا کر خلیفہ صاحب کی فوج سے جنگ کرنی چاہئے۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ اپنا ڈیرہ اسی جگہ پر رہے اور اس کی حفاظت کے لئے کشمیر کی فوج جو ایک ہزار کے قریب ہے اور ٹیک سنگھ جمعدار قلعہ کرناہ کے ماتحت ہے یہاں رہے۔ اور باقی تمام فوج دریا کے اس پار جا کر خلیفہ صاحب کی فوج سے جنگ کرے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایک گوجر نے راہ نمائی کی اور فوج ڈیساں دولولہ سے گرھ کر ہٹی کوٹ کے پہاڑ کے ڈنہ (چوٹی) پر پہنچ گئی۔ اور ہزارہ کی فوج جو اس شکار میں تھی وہ بھی ازراہ تمری بالا اسی پہاڑ پر آ گئی۔ چند آدمی خلیفہ کی جانب سے نکہ پانی[1] کے راستہ پر بطور جاسوس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے جنگ ہوئی۔ تین چار آدمی مارے گئے۔ باقی فرار ہو گئے جنگ کے لئے خلیفہ کی جانب سے ایک ہزار بندوق بالاکوٹ سے روانہ ہوئی۔ لیکن ان کی آمد سے پہلے ہی سکھوں کی فوج پہاڑ کے ڈنہ پر پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا فوج خلیفہ راستہ ہی سے واپس ہو گئی۔

جب سکھوں کی فوج معہ کنور شیر سنگھ و افسران پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے حیران ہوئے کہ روٹی کے بغیر تو ایک دو دن گزارے جا سکتے ہیں۔ لیکن پانی کے بغیر کس طرح گزارہ ہو گا۔ سب لوگ اسی فکر میں تھے۔ کہ قضاء و قدر کی امداد سے ابر کا ایک ٹکڑہ شمال کی جانب سے اٹھا اور پہاڑ کے اس ڈنہ پر اتنی باریک ژالہ باری ہوئی جس سے کسی انسان یا جانور کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ لیکن پینے اور روٹی پکانے کے لئے اتنا پانی فراہم ہو گیا کہ سب نے اپنے برتن اس سے بھر لئے۔ ایک ساعت میں خوشگوار اور میٹھا پانی میسّر ہو گیا۔ بیساکھ کے دن تھے اور آبِ شیریں، خوشگوار اور سرد کی

[1] نکہ پانی میں ان شہداء کی قبریں موجود ہیں اور مقام کا نام شہید گلی ہے۔

ضرورت تھی کہ آسمانی امداد سے سکھوں کی تمام فوج نے پانی اور روٹی سے آسودہ ہو کر رات آرام اور آسائش سے بسر کی۔ صبح کے وقت تمام افسران کنور شیر سنگھ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ پہاڑ کی اس چوٹی کو قبضہ میں رکھنا نہایت ضروری ہے۔ پس یہ مصلحت ٹھہری کہ سردار جہاں سنگھ معہ فوج ہزارہ و لکھی سنگھ عمومی سردار جوالا سنگھ پڈانیہ (بھدانیہ) آگے جا کر خلیفہ صاحب سے جنگ کریں اور باقی فوج پیچھے سے مدد کرے۔ سردار جہاں سنگھ اور سردار لکھی سنگھ یہ سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بالاکوٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو گولی کے فاصلہ تک گئے ہوں گے کہ سردار شام سنگھ اٹاری والے نے کہا کہ یہ تو ٹھیک بات نہ ہوئی۔ اگر ان دونوں نے جنگ کی اور فتح پائی تو ہم اور دوسرے کس حساب کتاب شمار میں ہوں گے خدانخواستہ اگر ان کو شکست ہو گئی۔ تو پھر ہم کس حساب کتاب میں ہوں گے۔ یہ بات سنتے ہی سب افسران کو فکر زیادہ ہوئی۔ اور سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہ ہم سب حملہ کریں گے۔ اگر فتح ہو گئی تو اس پہاڑ کے قبضہ کی حاجت ہی نہ رہے گی۔ اگر شکست ہو گئی تو ہمیں لاہور کون جانے دے گا۔ راستہ میں سب ملکی مسلمان ہیں۔ وہ کب ہم کو جانے دیں گے۔ اس لئے ہم سب کو یکبار حملہ کرنا چاہئے۔ سب فوج بیٹی کوٹ سے روانہ ہوئی۔ پہاڑ کے دامن میں اول ہوتر (چاول کے کھیت جو زیر آب رہتے ہیں۔ ش ب) کی زمین ہے اور اس کے بعد بالاکوٹ کا گاؤں ہے۔ بالاکوٹ میں خلیفہ صاحب کے لوگ بھی تیر، تفنگ اور زنبورک سے تیار تھے۔ جانبین سے بندوق و زنبورک کے فائر شروع ہو گئے۔ سکھوں کی طرف ایک توپ بھی تھی جس کو وہ کشمیر سے لائے تھے۔ اس کو میدان جنگ میں لایا گیا اور اس سے بھی گولے برسنے شروع ہو گئے۔ سورج چڑھے ایک پہر سے لے کر دو پہر تک جنگ جاری رہی۔ سب سے پہلے بندوق کی ایک گولی ہزارہ فوج کے نشانچی (علم بردار) کے سینہ پر لگی۔ کیونکہ وہ سب سے آگے تھا۔ اور دوسری گولی سردار جوالا سنگھ بھدانیہ کے نشانچی کو لگی۔ جب دونوں نشانچی زمین پر گر پڑے اور ان کے نشان سرنگوں ہوتے ہی دوسرے سکھوں نے اگرچہ سنبھال لئے لیکن ان نشانوں کے گرتے ہی خلیفہ صاحب کے آدمیوں نے فی الفور حملہ کر دیا۔ بلکہ خلیفہ صاحب اور مولوی اسماعیل کہ دونوں اس فوج کے بڑے افسر تھے بذات خود حملہ کرتے ہوئے اور اللہ اکبر کہتے ہوئے ڈاڑھیاں دانتوں میں پکڑے ہوئے (ریش در دہاں گرفتہ) اور اُس ہوتر زمین میں جو دونوں فوجوں کے درمیان تھی۔ آ کر بلند آواز سے کہا کہ کافر گئے زور کا حملہ کرو۔ چونکہ قضا و قدر کا فیصلہ یہ تھا کہ حیات خلیفہ احمد شاہ صاحب و مولوی اسمٰعیل صاحب بلکہ ان کے تمام ہمراہیوں کا خاتمہ برلب دریا ہونا تھا۔ سب نے یکبارگی ہوتر کی زمین سے گزر کر دامن کوہ کی طرف حملہ کیا۔ جہاں ایک طرف سردار شام سنگھ و پرتاپ سنگھ اٹاری والہ

کی فوج تھی۔ دوسری طرف سردار عطر سنگھ کالیاں والہ و گورمکھ سنگھ بھلہ کی فوج تھی۔ اور ہزارہ کی فوج معہ جہاں سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی فوج بالمقابل تھی۔ اول سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور میدان سے بھاگنے لگے۔ آخر کنور شیر سنگھ تلوار نیام سے نکال کر سب سے آگے آ گیا۔ اگرچہ سردار جہاں سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے منع کیا۔ کہ اکیلے آگے جانا مناسب نہیں۔ لیکن کنور شیر سنگھ نے اُس وقت کسی کی بات پر کان نہ دھرا۔ اور ہاتھ میں شمشیر برہنہ لئے ہوئے دس بارہ قدم سب سے آگے آ گیا۔ اور جو کوئی واپس بھاگتا۔ اس کو گالیوں اور چھڑوں سے مار کر واپس کرتا تھا۔ اور ایک اپنا فراش سردار شام سنگھ و پرتاپ سنگھ اٹاری والہ کی طرف بھیجا کہ ہوشیار رہیں اور بندوقیں چلائیں۔ اور ایک آدمی عطر سنگھ کالیاں والہ کی طرف بھیجا کہ آفرین تم نے خوب فائر کئے۔ چنانچہ دونوں طرف بندوقیں زور شور سے چلنی شروع ہو گئیں۔ ایک سو ستاسی آدمی بمعہ خلیفہ صاحب کے اُسی ہوتر کی زمین میں لاش پر لاش گر کر شہید ہو گئے۔ اسی طرح تقریباً چار سو ہندوستانی جو خلیفہ صاحب پر جان قربان کرتے تھے وہیں ڈھیر ہو گئے اور خلیفہ صاحب خود اُسی جگہ ایک گولی دائیں بازو پر اور ایک چھاتی پر دل کے اوپر لگنے سے شہید ہو گئے۔ خلیفہ صاحب کے ساتھیوں میں سے قریباً اسی آدمی ہوں گے جنہوں نے تین دفعہ حملہ کیا۔ کہ خلیفہ صاحب کی لاش اٹھا کر لے جائیں لیکن بندوق کی گولیاں بصورت طوفانی بارش کے برس رہی تھیں لہذا وہ لاش اٹھا کر نہ لے جا سکے۔ لاچار انہوں نے خلیفہ کا سر لاش سے الگ کر لیا۔ کہ اس کو لے جائیں۔ لیکن تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ جو شخص خلیفہ کا سر اٹھائے لئے جا رہا تھا گولی لگنے سے گر کر مر گیا۔ لیکن مرتے مرتے اس نے خلیفہ کا سر سرسوں کے خرمن میں جہاں وہ گرا تھا چھپا دیا۔ اس کے باقی ساتھی فرار ہو گئے سکھوں نے اُن کا تعاقب کیا اور بالاکوٹ میں جا کر خلیفہ صاحب کا ڈیرہ اور اس کے ساتھیوں کے گھر لوٹ لئے۔ بالاکوٹ کے مکانوں کو آگ لگا دی۔ اور خلیفہ صاحب کے ڈیرہ سے آٹھ زنبورے، ایک ہاتھی، بارہ گھوڑے اور چند راس قاطران (خچر) سکھوں کے سپاہیوں کے ہاتھ لگے۔ جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد سکھوں نے اپنا ڈیرہ دریائے کنہار کے کنارہ پر لگایا۔ کنور شیر سنگھ بمعہ دوسرے سرداران کے تربت گاہ کے ملاحظہ کے لئے سوار ہو کر میدان جنگ سے گزرے خلیفہ صاحب کی لاش کو دیکھ کر خیال کیا کہ یہ کسی رئیس کی لاش ہے۔ لہذا اس کو اٹھوا کر ڈیرہ کے نزدیک لائے۔ اور سائبان کے سایہ میں رکھی۔ کنور شیر سنگھ نے حکم دیا۔ کہ اگر کوئی شخص خلیفہ صاحب کی لاش کو پہچانتا ہے تو آئے اور شناخت کرے۔ چونکہ نواب خان تنولی (رئیس شنگھڑی۔ ش ب) کو جو تین سال سے زیادہ عرصہ تک خلیفہ صاحب کی ملازمت میں رہا تھا حاضر کیا گیا۔ کنور شیر سنگھ نے اس سے پوچھا۔ کہ تم اتنے

سال خلیفہ کی ملازمت میں رہے۔ کیا تم پہچانتے ہو کہ یہ لاش اس کی ہے یا کسی اور کی۔ نواب خان نے دیکھ کر کہا۔ کہ اگر سر ہوتا تو میں شناخت کر لیتا۔ سر کے بغیر شناخت مشکل ہے۔ لیکن خلیفہ سید احمد شاہ کے ایک نشانی ہے۔ کہ اس کے پاؤں کے سب ناخن ناقص اور خراب ہیں۔ کپڑا اٹھا کر دیکھا گیا تو ان کے دس کے دس پاؤں کے ناخن ناقص اور خراب تھے۔ اگرچہ سب نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب ہی کی ہے۔ لیکن کافی یقین نہ ہوا۔ اسی فکر میں تھے کہ ایک سپاہی کالا خان تنولی پدر فیروز خان تنولی بوقت عصر (یک گھڑی روز باقی ماندہ بود) آیا اور کہا۔ کہ اگر مجھے کچھ انعام دیا جائے تو میں خلیفہ کے سر کا پتہ بتا سکتا ہوں۔ چنانچہ کنور شیر سنگھ نے پچیس روپیہ اس سپاہی کو انعام دیا اور پچیس سوار اور پچاس پیادہ اس کے ساتھ بھیجے کہ جس جگہ یہ خلیفہ کا سر بتائے وہاں سے لے آئیں۔ اس سپاہی نے ان کو سرسوں کے خرمن سے خلیفہ کا سر نکال کر دے دیا۔ کیونکہ وہ سپاہی جب کہ خلیفہ کا سر اس خرمن میں رکھا جا رہا تھا تو وہ دیکھ رہا تھا وہ سوار اور پیادے سر لے کر جب آ رہے تھے تو دیر ہو جانے کی وجہ سے رات ہو چلی تھی۔ لہٰذا ڈیرہ میں ان کے آنے سے خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ کہ دشمن کے سوار و پیادہ آ گئے ہیں۔ شور و غل برپا ہو گیا چنانچہ سب فوج ہتھیار سنبھال کر گھوڑوں پر زینیں درست کرنے لگی۔ اور کسی یہ خیال نہ رہا کہ یہ تو اپنے ہی لوگ تھے جو خلیفہ کا سر لینے کے لئے گئے تھے جب یہ معلوم ہوا تو پھر سب کو تسلی ہوئی خلیفہ کا سر لا کر لاش کے برابر رکھا گیا۔ کنور شیر سنگھ نے پھر نواب خان تنولی کو بلا کر ملاحظہ کرایا کہ اب اچھی طرح سے شناخت کرے کہ یہ لاش خلیفہ صاحب ہی کی ہے یا کسی اور کی۔ نواب خان تنولی نے سر کا ملاحظہ کرنے کے بعد کہا کہ یقیناً یہ لاش اور سر خلیفہ صاحب ہی کا ہے۔

تمام رات سکھوں کے ڈیرہ کے مسلمان ملازم جاگتے رہے اور مرثیہ پڑھتے رہے۔ دوسرے دن کنور شیر سنگھ سے شربت و شادیانہ کا انعام لے کر لاشہ خلیفہؒ کو کنہار کے کنارے کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ تیسرے روز جب ڈیرہ کی فوج نے گڑھی حبیب اللہ کی طرف کوچ کر دیا تو سردار مہاں سنگھ و سردار لکھی سنگھ کو حکم ملا کہ وہ تیار رہیں۔ ڈیرہ کا سامان روانہ کرنے کے بعد منتظر رہیں اور جب تمام فوج گڑھی پنی کوٹ سے گزر کر اس طرف ہو جائے۔ اس کے بعد وہ آئیں۔ چنانچہ حسب الحکم دونوں سردار وہاں ٹھہر گئے۔ اور مشورہ کرنے لگے کہ زندگی میں تو خلیفہ صاحب نے اس ملک میں شور و فساد برپا رکھا۔ اب اگر اس کی لاش یہاں قبر میں رہ گئی تو بہت سے مسلمان اس کی پرستش کریں گے اور کرامات کا ظہور مشہور کریں گے۔ بہتر یہ ہے کہ خلیفہ سید احمد شاہ کی لاش قبر سے نکال کر دریائے کنہار میں پھینک دیں۔ چنانچہ ساتھ ہی آٹھ نہنگ سنگھ کھڑے تھے کہ دونوں

سرداروں نے ان کو پچیس روپیہ دے کر کہا۔ کہ یہ ثواب کا کام ہے۔ کہ خلیفہ صاحب کی لاش کو قبر سے نکال کر دریائے کنہار جو ساتھ ہی ہے میں ڈال دو۔ چنانچہ ان نہنگوں نے لاش قبر سے نکالی۔ شمشیر سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا کنہار میں پھینک دی۔ اس کے بعد جب فوج گڑھی سے گزر گئی تو سردار مہاں سنگھ اور سردار لکھی سنگھ دونوں اس کے تعاقب میں کوچ کر کے گڑھی کے نزدیک ڈیرہ لگایا۔ دسویں روز وہاں سے کوچ کر کے مانسہرہ آ گئے اور اسی طرح منزل بمنزل کوچ کر کے کنور شیر سنگھ معہ دوسرے افسران داخل لاہور ہوئے۔ اور مہاں سنگھ ہزارہ کے کام میں مشغول ہوئے یہ واقعات بتاریخ ۲۰ بیساکھ ۱۸۸۸ بکرمی مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئے۔ کہ جنگ عظیم مابین خلیفہ سید احمد شاہ و کنور شیر سنگھ بموضع بالاکوٹ تعلقہ درہ کنہار کا ہزگان واقع ہوئی اور قفس عنصری خلیفہ سید احمد شاہ نے بندوق کی گولی سے وفات پائی"۔

اس مجاہدانہ کارنامے کی عام تاریخ لوگوں کو بس یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار کر کے سکھوں سے مقابلہ کیا۔ اور صوبہ سرحد میں ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقہ میں وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ بادی النظر میں یہ تاریخ کا ایک معمولی سا واقعہ نظر آتا ہے۔ کہ کچھ خانقاہ نشین مسند ارشاد سے اٹھ کر جہاد میں اتر آئے۔ اور اپنے مذہب کی سربلندی اور اپنے ہم مذہبوں کی عزت و آبرو کے لئے وقت کی ایک قوت سے ٹکرا گئے۔ اور ناکام رہے۔ لیکن اس ناتمام کوشش کے اثرات ہماری بعد کی ساری سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں۔

حضرت سید احمد شہیدؒ نے اخلاص عمل سے عقیدت مندوں کے دلوں میں ایسی جگہ حاصل کر لی تھی کہ بہتوں کو ان کی وفات کا یقین تک نہ آتا تھا۔ ایک مدت تک یہی خیال رہا کہ آپ مصلحتاً روپوش ہو گئے ہیں اور مناسب وقت پر ظاہر ہوں گے۔ مجاہدین نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی وہ ہماری سیاسی زندگی کو مسلسل نور عطا کرتی رہتی ہے۔ وہ خلفاء حضرت سید احمد کا گروہ ہوں جو سرحد میں جہاد کرتا رہا۔ یا علماء صادق پور ہوں یا علماء دیوبند ۱۸۵۷ء کی تحریک ہو یا تحریک پاکستان وغیرہ ان سب کا محور یہی مشہد بالاکوٹ ہے۔ شہدائے بالاکوٹ کی تحریک اس برعظیم میں مظلوموں کی دادرسی اور حق کی حمایت میں پہلی عوامی تحریک تھی۔ ہماری بعد کی تمام سیاسی تحریکیں بلاواسطہ یا بالواسطہ اسی سے متاثر ہیں۔ ہماری ہر سیاسی سعی میں شہدائے بالاکوٹ کا خون جھلک رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سانحہ کے چالیس برس بعد بھی سیاسی ملزم پھانسی کی کوٹھڑیوں کے روزنوں میں سے حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی راہ دیکھا کرتے تھے اور ان کے اشتیاق و انتظار میں نہایت

درد سے میر درد کے یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

آتنا پیغام درد کہنا جب صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے۔ دن بہت انتظار میں گزرے

حقیقت یہ ہے کہ شہید نہیں مرتے بلکہ وہ زندہ جاوید ہستی رکھتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ

ترجمہ:- جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے اُن کے مُردہ ہونے کا گمان مت کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے اللہ کے ہاں سے رزق دئے جاتے ہیں۔

جماعت مجاہدین

تاریخ امارتِ مجاہدین

حضرت خلیفہ سید احمد شہیدؒ کی شہادت اور سانحہ بالاکوٹ کے بعد بقیہ ہندوستانی مجاہدین کا غان چلے گئے۔ اور خاموشی و گمنامی کی زندگی میں مصلحت سمجھی۔ ایک سال گزر جانے کے بعد مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی اور مولانا محمد علی رام پوری نے ہندوستان میں پھر تحریک پیدا کی۔ اور مجاہدین کو سرزمین ہزارہ پہنچنے کے لئے تیار کیا۔ چنانچہ ۱۲۳۲ھ کے آخر میں مولوی ولی محمد اور مولوی نصیر الدین (یہ مولوی نصیر الدین منگلوری تھے جو سید صاحب کے ساتھ سرحد آئے تھے اور جنگ بالاکوٹ کے وقت درہ بھوگڑ منگ کی حفاظت پر مامور تھے یہ اور شیخ ولی محمد ہی اگرور میں اور دوسرے مقامات پر پائندہ خان کے ساتھ رہے۔ ان کی شہادت ٹوپی میں ہوئی مولانا مہر) کی سرکردگی میں ۴۰ مجاہدین کا قافلہ ستھانہ پہنچا۔ اس طرح ہندوستان سے مجاہدین آنے شروع ہوئے اور اگلے سال میں ۵۰۰ کے قریب ستھانہ میں جمع ہوگئے۔ ان مجاہدین کی جماعت میں اس وقت ۲۳ ممتاز ترین افراد جماعت میں سے ایک جعفر خان ترین ہزاروی اور دوسرا حسین خان ترین ہزاروی بھی شامل تھے۔

ان ایام میں نواب پائندہ خان والی امب نے غفور خان و کمال خان خوانین اگرور کو شکست دے کر ان کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ دونوں بھائی علاقہ تکری نندھیاڑ چلے گئے۔ نواب پائندہ خان نے مجاہدین ستھانہ سے دوستانہ مراسم قائم کرنے میں بہتری سمجھی۔ اور انہی تعلقات کی بنا پر مولوی ولی محمد صاحب اور نصیر الدین صاحب کو اگرور کے انتظام کے لئے دعوت دی۔ چنانچہ یہ دونوں امیر معہ اسلامی لشکر اگرور پہنچے اور موضع جسکوٹ کے قلعہ میں قیام کیا۔

اس اثنا میں خان شاہنچی خان تکڑی کے خلاف اس علاقہ میں بغاوت ہوگئی اور وہ بھاگ کر نواب پائندہ خان سے امداد کا طالب ہوا اس نے مولوی صاحبان سے امداد کی اپیل کی۔ اور اسلامی لشکر کو اس کی پشت پناہی کے لئے تکڑی بھیجا گیا۔ مولوی ولی محمد نے وہاں جاکر غفور خان اور کمال خان کو بھی اسلامی حمیت پر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور الائی تک غلبہ حاصل کر لیا۔ پھر سے یہاں اسلامی حکومت ہوگئی۔ دوسری طرف درہ کونش میں سکھ عملداری تھی۔ بٹل میں سکھوں کا قلعہ تھا۔ سکھوں کے ساتھ جنگ کی تیاری کی گئی لیکن جنگ میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ فریقین ہار جیت کے بغیر واپس ہوگئے۔ اس پر سکھوں نے درپردہ اسلامی علاقہ میں سازش شروع کردی۔ اور اپنے جاسوس بھیج کر مقامی خوانین کو ہم خیال بنانے کی مہم تیز کردی۔ ہزارہ میں اگرور۔ بٹل۔ نندھیاڑ کے علاقہ کے لوگوں نے مجاہدین کی اطاعت مان لی تھی۔ اس دوران میں نواب امب پائندہ خان مجاہدین کے ساتھ تھا۔ اور خانانِ اگرور مخالف تھے۔ (سرگزشت مجاہدین مہر ص ۲۰) اچانک ایک دن مولوی صاحبان کو اطلاع ملی کہ غفور خان، کمال خان اور مارک خان مندراڑ سکھوں کے ساتھ رابطہ رکھتے ہیں۔ اس شبہ کی بناء پر تینوں خوانین کو قتل کرادیا۔ اس پر لوگ مجاہدین کے مخالف ہوگئے اور پائندہ خان کو مجبور کیا کہ اسلامی لشکر کو واپس بلائے۔ اس نے کسی بہانہ سے دونوں مولوی صاحبان کو بلا کر ستھانہ بھیج دیا۔ مولوی ولی محمد صاحب تو ہندوستان چلے گئے اور مولوی نصیر الدین نے ارسلا خان خان زیدہ کے امداد کے لئے ٹوپی پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور خان ہنجار فتح خان سے ٹوپی کا گاؤں لے لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی مجاہدین نے ٹوپی ہی میں قیام رکھا۔ لیکن ایک رات اچانک فتح خان نے حملہ کرکے سب مجاہدین کو بمع مولوی نصیر الدین شہید کردیا۔

اس کے بعد ستھانہ میں ۲۵۰ مجاہدین نے مولوی محمد حسین کو اپنا امیر مقرر کر لیا۔ ایک سال تک یہ لوگ یہاں رہے۔ لیکن معاشی تنگی کی وجہ سے ان کو ہجرت کرنی پڑی۔ چنانچہ مولوی محمد حسین معہ برادر خود حافظ جی ابھیرہ خوشاب کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے بھی وہ لوگوں کی وہابی تحریک کی مخالفت کی وجہ سے ہندوستان چلے گئے۔

ایک سال تک مجاہدین بے نام و نشان رہے۔ اس سال کے بعد ایک دوسرے نصیر الدین معہ دو مصاحبوں کے خفیہ حالات معلوم کرنے کے لئے ستھانہ پہنچے۔ مختلف دیہات میں اپنی منتشر قوت کا جائزہ لے کر وہ واپس چلے گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دوبارہ وہ براہ شکارپور غزنی، کابل و پشاور ہوتے ہوئے ستھانہ پہنچے۔ اور پھر ۵۰۰ کے قریب مجاہدین اکٹھے ہوگئے۔ ہندوستان سے بھی مجاہدین

کے قافلے آنے شروع ہو گئے۔ ستھانہ مجاہدین کی جدوجہد کا مرکز بن گیا۔ اور یہ منتشر قوت باطل کے ساتھ ایک بار پھر ٹکرانے کے لئے متحد ہونا شروع ہو گئی۔ مولوی نصیر الدین نرم مزاج اور اچھے سیاست دان تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگ ان سے بہت مانوس ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے سیاسی قوت پیدا کر لی۔

ایک دن نواب پائندہ خان کو پیغام بھیجا کہ میری حمایت کا اعلان کرو۔ ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ نواب نے حمایت کے اعلان میں مصلحت نہ سمجھی۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں دوستانہ مراسم پیدا کر لئے۔ بلکہ بطور مہمان اپنے پاس امب بلا لیا۔ اور مہمانی کی۔ جب امب سے مولوی صاحب واپس ہوئے تو بیمار پڑ گئے۔ اور یہی بیماری موت کا باعث بنی۔ بعض روایات میں انہیں زہر دینے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن ایک باہمت نواب سے ایسی بزدلانہ حرکت کی امید ہرگز نہیں کی جا سکتی۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد جماعت مجاہدین ایک بار پھر منتشر ہو گئی۔ اکثر ہندوستانی مجاہدین واپس ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک یہی حالت رہی۔ تاآنکہ سنہ ۱۸۴۵ء میں محمد قاسم جو ہندوستان گیا ہوا تھا واپس آیا۔ اور موضع کوائی علاقہ کاغان میں قیام کیا۔ علاقہ بھر کے علماء کے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ مُلّا قادر ڈنگری والا ان کا ہم مسلک تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے اس تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے یہ تجویز کی کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی مُہر کھدائی جائے اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک خطوط لکھے جائیں کہ حضرت صاحب بقید حیات ہیں۔ اور عنقریب ظہور فرمائیں گے۔ اس پروپیگنڈہ کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ لوگ پھر سے جمع ہونا شروع ہو گئے (۱۸۴۶ء) مولوی محمد قاسم کو امیر منتخب کر لیا۔ ادھر عظیم آباد (پٹنہ) بہار میں مولوی ولایت علی جو حضرت کا معتمد خاص تھا۔ تحریک کا دوبارہ نگران بن گیا۔ اور جملہ مصارف وہاں سے بھیجتا رہا۔ یہ تحریک ترقی کر گئی۔ یہاں تک کہ اٹھارہ سو مجاہدین جمع ہو گئے۔ علاقہ کاغان میں اسلامی قوانین رائج ہو گئے۔ زرعی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ اور مالکانِ اراضیات کو روزینہ ملنا شروع ہوا۔

ل[1] یہ مولوی نصیر الدین دہلوی ہیں یہ دو بھائی تھے۔ ایک سید ناصر الدین دوسرے سید نصیر الدین۔ میری معلومات کے مطابق یہ دونوں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (برادر شاہ عبد العزیز محدث بن شاہ ولی اللہ دہلوی) کی صاحبزادی امۃ اللہ کے فرزند تھے۔ جن کی شادی غالباً شیخ کمال الدین تھانیسری سے ہوئی تھی۔ مولوی نصیر الدین کی شادی شاہ اسحٰق کی صاحبزادی سے ہوئی۔ سندھ ہی میں رہے۔ شاہ شجاع اور انگریزوں کے خلاف امیر دوست محمد خان کی طرف سے غزنی میں رہے تھے بعد میں دیوبند پہنچے۔ اور وہاں طبعی اسباب سے وفات پائی۔ (مولانا مہر)

بہار سے مولوی ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولوی عنایت علی یہاں تشریف لے آئے۔ اس کے یہاں پہنچنے پر امارت اسے سونپی گئی۔ اور مولوی قاسم علی ۲۰۵ مجاہدین کو لے کر حسن علی خان کرڑال کے پاس علاقہ لورہ میں چلا گیا۔ اور یہاں مذہبی تبلیغ شروع کر دی۔

اسلامی جماعت کی امارت ایک سال تک (یعنی ۱۸۴۵ء تک) مولوی عنایت علی کے پاس رہی لیکن اس عرصہ کے بعد مولوی ولایت علی صاحب معہ اپنے اہل و عیال و معتمدین مولوی مقصود علی اور مولوی زین العابدین، بہار سے کاغان تشریف لائے۔ انہوں نے یہاں حضرت صاحب کے زندہ ہونے کے ثبوت کو غلط پایا۔ اور کچھ روز قیام کرنے کے بعد اپنے بھائی کو ہمراہ لے کر واپس بنگال چلے گئے۔ (مولانا مہر نے یہاں یہ تصحیح فرمائی ہے۔ "یہ صحیح نہیں۔ اس وقت مرکز مجاہدین فتح گڑھ (سکھوں کا دیا ہوا نام) میں رکھا تھا۔ مولانا نے اس پر قبضہ کر کے اس کا نام اسلام گڑھ رکھا۔ یہ مقام شاید گوجرہ یا گوجری ہی ہو۔ مولانا ولایت علی اسلام گڑھ میں مقیم ہوئے تھے۔ یہ حالات ایک مکتوب میں بیان ہوئے ہیں۔ جس کی نقل میں نے حیدرآباد سے حاصل کی تھی پھر گلاب سنگھ اور انگریزوں سے لڑائی ہوئی۔ جو درہ دب کی جنگ کہلاتی ہے۔ اس میں شکست کے بعد مولانا ولایت علی اور عنایت علی سوات کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں انگریزوں نے گرفتار کر کے پٹنہ پہنچا دیا اور دو سال کے مچلکے لے لئے" مولوی مقصود علی یہاں ہی تھے۔ انہوں نے سید ضامن شاہ کے پاس کوائی میں مستقل قیام کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لاہور کی حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ انگریزوں کا سیلاب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اور سکھ ان کے لئے چھاؤنیاں خالی کر رہے تھے۔ ان حالات میں مجاہدین نے کوائی سے نکل کر بالاکوٹ پر قبضہ کر لیا (غالباً ۱۸۴۵ء) اور گڑھی حبیب اللہ پر بھی تسلط جما لیا۔ اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرداران ہزارہ نے ۱۸۴۵ء میں اپنے اپنے علاقہ میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ بالاکوٹ سے بڑھ کر سواتی قبیلہ کی اعانت سے میدان پکھلی پر بھی جماعت اسلامی کا قبضہ ہو گیا۔ مولوی مقصود علی کے معتمدین میں سید ضامن شاہ اور نصرت علی خان سر خیلی بالاکوٹی سر برست تھے۔ محمد امین خان گڑھی حبیب اللہ والا بھی بطور نظر بند اس جماعت کے ہمراہ تھا۔ کاغان۔ بالاکوٹ۔ گڑھی۔ پکھلی اور تلی بشمول درہ بھوگڑمنگ کا مالیہ تین فصل کا بیت المال میں جمع کیا گیا۔ ترلی پکھلی نے بھی بعد از معمولی جھڑپ مالیہ ادا کر دیا۔ اور علاقہ رش سے پیر خان جدون نے (پانڈہ پیر خان والا) حمایت کا اعلان کر کے مالیہ کی فراہمی شروع کر دی۔

چونکہ یہ ضلع مہاراجہ گلاب سنگھ کو معاہدہ امرتسر کی رُو سے تفویض ہو چکا تھا۔ اس لئے ملکی انتظام

کے لئے مہاراجہ کی جانب سے دیوان ہری چند حاکم ہزارہ ہو کر ہری پور (خان پور میں ۲۲ مئی ۱۸۴۶ء) پہنچا۔ اس نے پکھلی پر قبضہ کرنے کے لئے فوج بھیجی۔ میدان رش میں جنگ ہوئی۔ اس میں چھ سو کے قریب ہندوستانی اور پانچ ہزار سے زائد ملکی مجاہدین تھے۔ سکھوں کو شکست فاش ہوئی اور قبضہ مجاہدین بدستور رہا۔

اگلے سال (۱۸۴۷ء) مہاراجہ نے دیوان کرم چند[۱] و فرانسیسی جرنیل دنتورہ صاحب اور ولیس صاحب کی قیادت میں کشمیر کی جانب سے فوج بھیجی۔ گڑھی حبیب اللہ کی عقبی پہاڑی (درہ ڈب) پر لڑائی ہوئی اس لڑائی میں سکھوں کو فتح نصیب ہوئی۔ چونکہ گڑھی حبیب اللہ محمد امین خان کی ذاتی ملکیت تھی۔ اس لئے سکھوں نے محمد امین خان کو قبضہ دلا دیا۔ جماعت مجاہدین سے محمد امین خان کی علیحدگی سے باقی ملکی باشندے فرار اختیار کر گئے۔

ضامن[۲] شاہ صاحب معہ چھ سو ہندوستانی مجاہدین کے بالاکوٹ سے روانہ ہو گئے۔ لیکن باشندگان بالاکوٹ نے بھی سکھوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اور وہاں ٹھہرنا مناسب نہ رہا۔ تو ہندوستانی مجاہدین کا گروہ ضامن شاہ کی قیادت میں بیلہ کوائی (کاغان) پہنچ گیا۔ دیوان کرم چند نے ضامن شاہ سے فرمائش کی کہ ہندوستانیوں کو واپس ہندوستان بھیجا جائے۔ شاہ صاحب پہلے تو ٹال مٹول کرتے رہے لیکن ملکی باشندوں کی غداری کی وجہ سے دل برداشتہ ہو کر مجاہدین خود بخود ہندوستان چلے گئے۔ لیکن ان میں سے میر اولاد علی معہ چالیس مجاہدین کے ستھانہ میں جا کر قیام پذیر ہو گئے۔ ادھر میدان ہزارہ کے پہاڑی خطہ علاقہ لورہ میں مولوی قاسم علی، خان حسن علی خان کے پاس رہ گیا تھا۔ جب ہزارہ کا انتظام مہاراجہ گلاب سنگھ سے نہ ہو سکا تو گڑھی حبیب اللہ سے اس طرف کا علاقہ پنجاب کے ساتھ ملحق ہو کر انگریزوں کو واپس دے دیا گیا۔ اور ہزارہ کے انتظام کے لئے میجر ایبٹ (۱۸۴۹ء) یہاں آیا۔ اس نے پہلے صدر مقام نواں شہر کی بجائے موجودہ ایبٹ آباد شہر کی جگہ صدر مقام بنایا۔ ہزارہ میں قدم جماتے ہی ایبٹ صاحب نے حسن علی خان کو بلایا اور حکم دیا کہ اپنے ہمراہ مولوی قاسم علی کو بھی حاضر کیا جائے۔ حسن علی خان خود نہ آیا اور مولوی صاحب کو بھیج دیا۔ ایبٹ نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "ہمارے خلیفہ صاحب حضرت سید احمد شاہ بریلوی زندہ ہیں اور وہ عنقریب ظہور کریں گے

---

۱ لیکن جناب سنگھ کے بیان کے مطابق دیوان کرم چند کے ساتھ وانتر اگینو اور لمیسٹان تھے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے

۲ بقول مولانا مہر اس جنگ کے کارفرما مولانا ولائت علی اور مولانا عنایت علی ہی تھے

جب ان کا ظہور ہو گا تو ہم لوگ جہاد کریں گے"۔

ایبٹ نے دوبارہ پوچھا کہ آپ کس کے ساتھ جہاد کریں گے۔ آپ کے دشمن (سکھ) تو مغلوب ہو چکے ہیں۔ تو مولوی صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ "جہاد اس جنگ کو کہا جاتا ہے جو حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے لڑی جائے۔ ہماری جنگ صرف کفار سے ہوتی ہے جس میں آپ بھی شامل ہیں"۔ ایبٹ صاحب خاموش ہو گیا اور اپنا غصہ ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور خاموشی سے مولوی صاحب کو موضع عالم (نزد ملیم ہری پور) نظر بند کر دیا۔ ان کے ہمراہ جو تھوڑے سے مجاہدین تھے ان کو ہندوستان واپس بھیج دیا۔ ایک سال بعد (یعنی ۱۸۴۸ء) مولوی صاحب کی موت کسی سازش کے نتیجے سے واقع ہو گئی۔

ادھر ستھانہ میں مولوی اولاد علی کو خرچ کی تنگی پیدا ہو گئی۔ سید اکبر شاہ نے دو پن چکیاں ان کے خرچ کے لئے مقرر کر دی تھیں لیکن ان سے ان کا گزارہ نہ چل سکا۔ یہاں سے بھی مجاہدین واپس ہوتے گئے۔ اور تھوڑے عرصہ میں سب چلے گئے۔ اس طرح سے پھر یہ تحریک ختم ہو گئی۔ لیکن حکومت الٰہیہ کی لگن چند سینوں میں زندہ تھی۔ کچھ عرصہ خاموشی کے بعد پھر سے مولوی نور اللہ کی امارت میں مجاہدین کی آمد شروع ہوئی۔ ادھر بہار (بنگال) سے مولوی عنایت علی معہ اہل و عیال و زر کثیر براہ حسن ابدال۔ اٹک۔ ٹوپی ستھانہ پہنچے۔ اور یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا اور مستقل رہائش اختیار کر لی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے امب پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ چنانچہ ریاست کے ایک گاؤں کوٹلہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ (۱۸۵۲-۵۳ء) لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد انگریزی اور ریاستی فوج کی متحدہ قوت نے وہ گاؤں ان سے چھین لیا۔ اور بہت سے مجاہدین کو شہید کر دیا اور مولوی عنایت علی کو گرفتار کرانے کی سازش شروع کر دی۔ چنانچہ مولوی صاحب نے ستھانہ سے ہجرت کر کے منگل تھانہ۔ علاقہ صوابی مردان، میں قیام کیا۔ وہاں سے نزدیک علاقہ شدم (موضع رستم) میں انگریزی چھاؤنی پر کامیاب چھاپہ مارا۔ کافی مال اور گھوڑے قبضہ میں کر لئے۔ لیکن ستھانہ سے مولوی ولایت علی کی وفات (ان کی وفات ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ مطابق ۶ نومبر ۱۸۵۲ء ستھانہ میں ہوئی) کی خبر سن کر ستھانہ پہنچے اور یہاں رسمی طور پر امیر مقرر ہو گئے۔ لیکن

مطابق کاغذات سرکار انگریزی در بارہ مجاہدین مولانا عنایت علی جولائی ۱۸۵۸ء میں موضع نارنجی ضلع مردان میں تھے۔ اور نارنجی کی جنگ میں ان کے ساتھ ۲۵ مجاہدین جن میں رجمنٹ ۵۵ (NATIVE INFANTRY) کے سپاہی بھی تھے۔ یہ سپاہی مردان چھاؤنی سے بھاگ کر مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ یہاں سے اگست ۱۸۵۸ء میں مولوی عنایت علی چنگلئی چلے گئے۔

چند ماہ بعد یہ بھی وفات پا گئے۔ اور مولوی نور اللہ صاحب پھر سے امیر مقرر ہو گئے۔ چنانچہ ان ہی کے زمانہ میں، سال ۱۸۵۷ء میں ستھانہ پر فوج کشی ہوئی۔ نواب صاحب کی فوج بھی انگریزوں کی امداد پر تھی اس جنگ میں ۴۵ مجاہدین شہید ہوئے۔ دو کو پھانسی دی گئی۔ اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ اور ساری جماعت کو منتشر کر کے ستھانہ کو آگ لگا دی گئی۔ مولوی نور اللہ موضع ملکہ (علاقہ جدون) میں جا کر آباد ہو گئے اس واقعہ کی خبر ہندوستان پہنچی تو وہاں سے مولوی مقصود علی صاحب یہاں آئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہاں ہی وفات پا گئے۔

اس کے بعد مولوی عبد اللہ ولد مولوی ولایت علی جو یہاں ہی تھے۔ اس تحریک کے امیر مقرر ہوئے ان کی امارت کے دوران سال ۶۳-۱۸۶۴ء مشہور جنگ امبیلہ ہوئی جس میں مجاہدین کی تعداد ۱۳۰۰ تھی۔ لیکن انگریزوں نے ہزاروں پیادے۔ سوار، بندوقیں اور توپیں مقابلہ کے لئے لا کھڑی کر دیں اس جنگ میں مجاہدین میں سے ۳۵۰ آدمی شہید ہوئے۔ اور ان کی رہائش گاہ کو پھر سے جلا دیا گیا۔ یہ لوگ ریاست سوات چلے گئے جہاں سے اخون صاحب نے اختلاف کی وجہ سے ان کو ملک بدر کر دیا۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے خطوط سے اقتباسات

ملکہ۔ جائے رہائش مجاہدین

۱۔ ۱۴ مارچ ۱۸۶۳ء۔ ہندوستانیوں کو خاص امداد نواب ٹونک راجپوتانہ سے ملتی ہے۔ اور اس کی رپورٹ ایبٹ نے ۱۸۵۱ء میں گورنمنٹ کو کی تھی۔

۲۔ ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء۔ مجاہدین کی تعداد ۱۵۰۰ ہے جن میں سے ایک ہزار کے قریب جنگ آزما ہیں۔ مولوی عبد اللہ ان کے امیر ہیں اور ان کے پاس کافی روپیہ اور ہتھیار ہیں۔ اور انہوں نے دو چھوٹی توپیں بھی بنائی ہیں۔ گزشتہ دو سال میں ان کی جمعیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ اور رنگروٹوں کی بہت سی تعداد تین ماہ گزشتہ کے دوران میں ان کو پہنچ چکی ہے۔ یہ لوگ ہنڈ اور جھنڈا بوقہ کے راستہ سے آتے ہیں۔ ان لوگوں میں قابل ذکر ایک نجیب اللہ ہے جو رجمنٹ ۵۵ میں خانساماں تھا۔ اور دوسرا طفیل اللہ ساکن تھانیسر جو ان کے لئے چندہ جمع کرتا تھا۔ ایک اور ممتاز رکن مولوی تبرک اللہ ساکن تھانیسر ہے جو حکمت کا کام کرتا ہے۔

۳۔ ۲۷ اپریل ۱۸۶۳ء امب پر حملہ کا خطرہ ہندوستانیوں سے ہے۔

۴۔ ۴ اگست ۱۸۶۳ء مولوی عبد اللہ اور مبارک شاہ حملہ امب پر تیار ہیں۔

۵۔ ۱۷ فروری ۱۸۶۸ء مولوی عبد اللہ پلوسی میں تھے۔ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔

فوجی عجائب خانہ راولپنڈی میں مجاہدین کے تین جھنڈے بہ نام "سیف اللہ" "صبغۃ اللہ" اور "حجۃ اللہ" جو انہوں نے ۱۸۶۳ء کی جنگ کالا ڈھاکہ ہزارہ میں استعمال کئے اب تک موجود ہیں۔ سیف اللہ کا نقشہ حسب ذیل ہے:- مولوی عبد اللہ کی امارت کے عہد میں یہ جھنڈے تھے۔

اللہ

اللہ اکبر

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ

المولٰی

مجاہدین کا علم

"سیف اللہ"

سورۃ انفال ۳۹-۴۰

ستھانہ

تاریخ ستھانہ، عزم و شجاعت کی داستان ہے۔ ستھانہ کا تعلق تاریخ ہزارہ کے ساتھ قدیم اور ہزارہ کے لئے باعث فخر ہے۔ اس سرزمین سے تحریک آزادی کے مجاہد پیدا ہوئے اور سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کی سکونت، بیعت اور بعد میں ان کے خلفاء کے مسکن اور جہاد آزادی کے معرکوں کا شرف اس کو حاصل ہے۔ اس کی آبادی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک خط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۶۵ء میں تحریر ہے کہ "سرکار انگریزی کی حد سے متصل بہت سال ہوئے کہ چند سید گھرانوں نے جن کے گرد پنجاب، سرحد اور رشتہ کے لوگ جمع ہو گئے تھے اس کی بنیاد ڈالی۔ ان کی کل تعداد تقریباً پانچ سو کے قریب تھی۔ وہ خود تو کمزور تھے لیکن سرکار انگریزی کے علاقہ میں فتنہ انگیزی کا مرکز تھے۔ اور سرکار انگریزی کے علاقہ کے جرائم پیشہ اشخاص اور دیگر پناہ گزینوں کے لئے جائے پناہ تھے۔

سید اکبر ان کا سرغنہ تھا۔ جو بعد میں سوات کا بادشاہ بنا اور اوائل ۱۸۵۷ء میں فوت ہو گیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سرگزشت مجاہدین" میں صفحہ ۳۰۹ پر تحریر فرمایا ہے کہ "اٹھارھویں صدی عیسوی میں سید ضامن شاہ نے اس گاؤں کو آباد کیا۔ قدیم ستھانہ برلب دریائے سندھ آباد تھا۔ لیکن ۱۸۴۱ء میں دریائے سندھ میں ایک خوفناک طغیانی آئی جس میں ستھانہ برباد

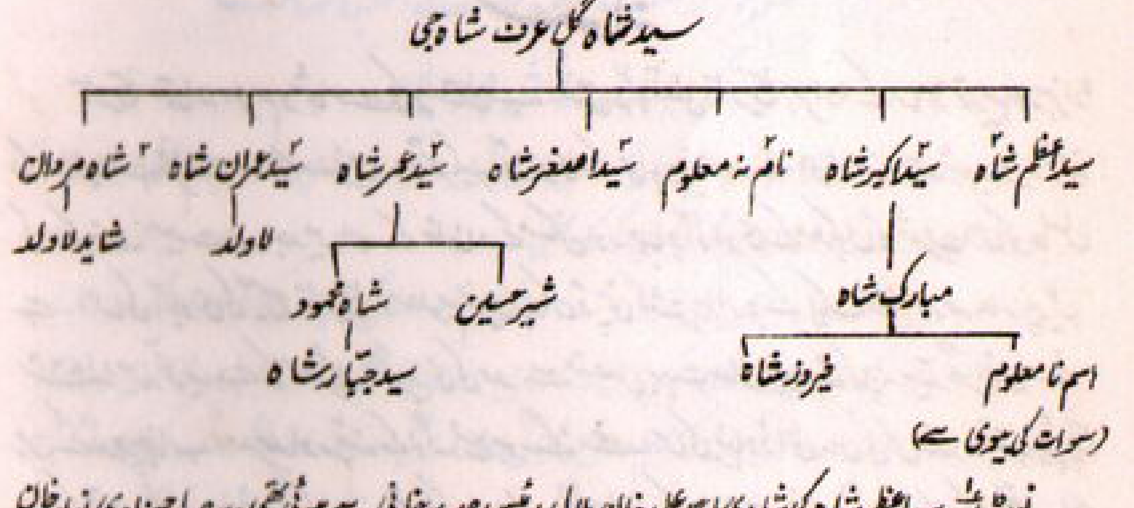
ہوگیا۔ اس بستی میں زندوں کے مکانات یا مُردوں کی قبروں کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ موجودہ ستھانہ دریا سے دور بنایا گیا۔"

وجہ تسمیہ:۔ اس گاؤں میں سادات کی رہائش تھی اور غالباً اس وجہ سے آستانہ کے نام سے مشہور ہوگا۔ بعد میں غلط العام ہوکر ستھانہ ہوگیا۔

سرکار انگریزی کے کاغذات بابت مجاہدین میں ایک خط قاضی میر عالم صاحب (ساکن سکندر پور جو شروع عملداری انگریزی میں ہزارہ کے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے) میں ستھانہ کے حالات حسب ذیل ہیں:۔

یہ خط مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۵ء کا تحریر کردہ ہے۔

"ستھانہ کے سید، سید خوجہ بابا کی اولاد سے ہیں، جو ترمذی سید ہیں۔ اور پیر بابا (بُنیر والے) کی اولاد میں ان کی قوم آج کل منگل تھانہ، تختہ بند وغیرہ جگھوں علاقہ غیر میں آباد ہے اور ان کی ایک شاخ سادات صوابی۔ میرا اور رگندف علاقہ سرکار میں آباد ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ قوم دلیری اور راہ زنی کے لئے مشہور رہی ہے۔ سادات ستھانہ کی شہرت سید اکبر کے زمانہ میں اپنے انتہاء عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ان کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔



نوٹ[1]:۔ سید اعظم شاہ کی شادی احمد علی خان پلال رئیس صوبہ خانی سے ہوئی تھی۔ یہ صاحبزادی نواب خان ہندوال کی بھانجی تھی۔ اس کی دوسری بہن پائندہ خان نواب امب کی بیوی تھی۔

[2]۔ سید اکبر ۱۸۴۷ء میں زندہ تھا۔ مطابق سر آلف کیرو ۱۸۲۳ء میں جنگ سکھاں کے خلاف یوسف زیوں کا یہ قائد تھا (" پٹھان " ص ۲۹۹)

عہد سکھاں میں سید اکبر نے اپنی قابلیت اور حوصلہ سے طاقت حاصل کرلی۔ ہزارہ کے خوانین اور دوسرے لوگ جو سکھوں سے بھاگ کر ستھانہ پہنچے تھے وہاں کو پناہ دیتا تھا اور ان لوگوں سے کچھ مال متاع لے کر

ان کو ستھانہ میں آباد ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ یہ لوگ وقتاً فوقتاً اس کو نقدی بھی دیا کرتے تھے۔ وہ علاقہ کے پٹھان اقوام امازئی۔ مداخیل۔ اُتمان زئی۔ گدون وغیرہ کا پیر تھا۔ اور وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ پائندہ خان تنولی موجودہ نواب محمد اکرم خان کے (دادا) نواب امب کے مقابلہ کا حریف بن گیا تھا۔ اور وہ ہندوستانی مجاہدین کی مدد سے جب کبھی اس کو موقع ملتا تھا نواب امب کے علاقہ کو نقصان پہنچاتا رہتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک دفعہ ستھانہ کو جلا دیا تھا لیکن مہاراجہ کے جانے کے بعد ہندوستانی پھر آکر آباد ہوگئے۔ ستھانہ کے سیدوں کی جائیداد ستھانہ اور ملکہ دونوں جگہ میں ہے۔ ستھانہ۔ کھبل اور کیا کے اتمان زیوں نے ان کو دیا۔ اور ملکہ کا علاقہ سیدوں نے امازئی اور گدون اقوام سے گرو لیا۔ چونکہ ان کا قبضہ اب بہت پرانا ہوگیا ہے اس واسطے اب یہ اصلی مالک ہی تصور کئے جاتے ہیں۔

سید اکبر کی رشتہ داری امب اور اتمان زیوں سے حسب ذیل ہے۔

سید اعظم کی بیوی احمد علی خان تنولی (خیل صوبہ خانی) کی بیٹی تھی۔ جو کہ سلطان محمد خان جاگیردار بیٹر (بجواب زیر کورٹ آف وارڈ ہے) کا پڑدادا تھا۔ احمد علی خان کی دوسری بیٹی نواب پائندہ خان (نواب محمد اکرم خان کا پڑدادا) کی بیوی تھی۔ سید اعظم کی بیٹی سید اکبر کے بیٹے مبارک شاہ کو بیاہی گئی تھی۔ جس سے فیروز شاہ پیدا ہوا۔

مبارک شاہ کی ماں علی جان ساکن مورتی علاقہ تربیلہ کی بہن تھی۔ مورتی علاقہ سرکار انگریزی میں ہے اور اتمان زئی اس علاقہ میں آباد ہیں۔ عبداللہ ملک ساکن کھبل مبارک شاہ کے خالو کا لڑکا ہے۔

سید اکبر ہمیشہ سرکار انگریزی کا مخالف اور دشمن تھا اور سرکاری علاقہ کے مفروروں کو پناہ دیا کرتا تھا۔ ہندوستانی مجاہدین کا ایک گروہ ہمیشہ سید اکبر کے پاس رہتا تھا۔ ان کی مدد سے ایک دفعہ اس نے کوٹلہ کا قلعہ نواب جہانداد خان (والد نواب محمد اکرم خان) سے لے لیا تھا۔ لیکن جلدی ہی سرکار انگریزی کی امداد سے پھر یہ قلعہ نواب نے اس سے واپس لے لیا۔ باوجود نزدیکی رشتہ داری کے۔ ان دو خاندانوں میں ہمیشہ عداوت رہی۔

میجر ایبٹ کے زمانہ میں ستھانہ کے لوگ ہمیشہ اس سرحد پر واردات کرتے رہتے تھے اور اس سرحد پر حکومت اور مقامی افسر خاص توجہ دیتے تھے۔

سنہ ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء میں سید اکبر بہ منظوری اخون صاحب سوات کا بادشاہ بنایا گیا۔ (لیکن مولانا مہر نے اپنی کتاب سرگزشت مجاہدین صفحہ ۵۴۵ پر تحریر کیا ہے کہ وہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک سوات کا بادشاہ

رہا (جو سید عبدالجبار شاہ کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی ہے) سرکارِ انگریزی کے کاغذات میں ایک خط کپتان پلوڈن اسسٹنٹ کمشنر مردان محررہ ۱۲ر جون ۱۸۶۷ء بنام کمشنر پشاور سے معلوم ہوتا ہے کہ سید اکبر شاہ ۱۸۵۰ء میں اخون صاحب کی خواہش و رضامندی سے سوات کا بادشاہ بنا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ ان واقعات سے قبل ۱۸۲۴ء میں ہری سنگھ نلوہ کی شکست کے بعد سید اکبر کی دستار بندی قلعہ ہری پور میں ہوئی۔ اور اس کو بادشاہ کا لقب دیا گیا۔ نواب خان رئیس شنگردی (سرائے نعمت خان) اور غلام خان ترین ساکن درویش وزیر مقرر ہوئے۔ اور سیف اللہ خان رسالدار کو میر منشی کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ یہ انتظام چونکہ بہت تھوڑی دیر قائم رہا۔ اس لئے مقامی لوگوں میں یہ دور گنڈی مسلمانی کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی وہ اسلامی حکومت جو بہت تھوڑی دیر قائم رہی۔

۱۸۵۸ء میں سرکارِ انگریزی نے ستھانہ پر حملہ کیا اور اس کو جلا دیا۔ ۱۸۵۸ء کی جنگ ستھانہ کے متعلق نیول (NEVILL) اپنی کتاب COMPAIGNS on The NORTH WEST FRONTER (شمال مغربی سرحد پر علا ۱۹۱۲ء) مجاہدین کے مقابلہ کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔ ہندوستانیوں (یعنی مجاہدین) کی جنگ جوش شجاعت کا عین مظاہرہ تھا۔ وہ بڑی بہادری سے ایک کے بعد ایک میدان جنگ میں آتا اور مکمل خاموشی۔ بغیر کسی نعرہ یا آواز۔ داد شجاعت دیتا۔ سب مجاہدین بہترین لباس جو اسی غرض کے لئے تھا پہن کر آتے عموماً یہ سفید تھا لیکن اُن کے چند سرکردہ افراد مخمل کے چُغے بھی پہنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اتمان زئی اور گدون اقوام سے عہد لیا گیا کہ وہ سیدوں اور ہندوستانیوں کو پھر آباد نہ ہونے دیں گے۔ گو کچھ زمینوں کی کاشت سید اور ہندوستانی کرتے رہے۔ لیکن وہاں آباد نہ ہوئے۔

۱۸۶۱ء میں کچھ جرائم پیشہ افراد نے سرکاری علاقہ میں دست درازیاں کیں اس پر اتمان زئی اور گدون قبائل پر جرمانے کئے گئے کیونکہ وہ معاہدہ پر پابند نہ رہے۔ اس پر یہ دونوں اقوام دشمن ہو گئے اور انہوں نے سیدوں کو ستھانہ میں آباد ہونے کی اجازت دے دی اور معاہدہ توڑ دیا۔ اس کا انجام امبیلہ کی جنگ میں نمودار ہوا۔

۱۸۸۲ء میں مبارک شاہ فوت ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے گولی لگی۔ لیکن شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ سید محمود نے اس کو قتل کیا۔ اس واقعہ سے مبارک شاہ اور محمود شاہ میں دشمنی شروع ہو گئی۔

محمود شاہ ۱۸۹۰ء میں حسن زئیوں کے علاقہ میں ایک آدمی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ ایک شاہ رسول بعمر ۴ سال اور دوسرا اس سے چھوٹا تھا۔ بڑا لڑکا فیروز شاہ کے ہاتھ سے قتل ہوا اور چھوٹے کا کچھ حال معلوم نہیں۔ فیروز شاہ نے شیر حسین کو بھی قتل کر دیا۔ سید عمران بھی مر گیا۔ اس

کی اولاد کا کچھ حال معلوم نہیں ہے۔ شاید وہ لاولد تھا۔ یہی حال شاہ مدار کا تھا۔

فیروز شاہ (اب یہی اکیلا وارث رہا) کا کوئی اثر و رسوخ نہ تھا اور جو تھا وہ بھی اب نہیں رہا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا ہے۔ نواب محمد اکرم خان کے ساتھ اس کی دوستی' پرانی روایات کے خلاف اسی کمزوری کی وجہ سے ہے۔ اس دوستی و اتحاد کی وجہ سے اس نے ۱۸۸۰ء میں نواب صاحب کو ایک توپ دی جو کہ فیروز شاہ کے خاندان کے پاس ہندوستانی چھوڑ گئے تھے۔ اب فیروز شاہ کو نواب کے زیر اثر اور ماتحت سمجھنا چاہئے۔

محمود شاہ (یا شاہ محمود) نے انگریزی رسالہ میں بہ حیثیت رسالدار ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۱ء تک نوکری کی اور پھر تخفیف میں آگیا۔

منڈی گاؤں (بازار) کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ جگہ کاروان و قافلہ ہائے تجارت کے راستہ پر تھی۔ اور اس جگہ پہلے زمانہ میں سوداگروں کے قافلے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں چند گھر سیدوں کے آباد ہیں۔ یہ ستھانہ کے سیدوں کے رشتہ دار ہیں۔ اور اس گاؤں کی زمین کے مالک ہیں۔ یہ جگہ ستھانہ کے نزدیک ہے۔ اور ہمیشہ سے ستھانہ کے سیدوں کے ماتحت رہی ہے۔ جب ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوجیں ستھانہ کے سیدوں کے خلاف بھیجی گئی تھیں تو منڈی کے سیدوں نے سرکارِ انگریزی کی مدد کی تھی۔ کیونکہ وہ ستھانہ کے سیدوں کے ہاتھوں سے تنگ تھے۔ اسی واسطے منڈی کو اس وقت تباہی سے بچا لیا گیا تھا۔ لیکن ۱۸۶۳ء میں میجر ہیو جیمس کمشنر کے حکم سے اس گاؤں کو گرا دیا گیا تھا۔ کیونکہ جب انگریزی فوجیں ستھانہ کے خلاف بھیجی گئیں تو ہندوستانیوں کا ایک قلعہ منڈی کے علاقہ میں تھا۔ تباہ کرنے کے بعد منڈی بھی ضبط کر لی تھی۔ لیکن پھر لوگوں نے بغیر اجازت حکومت کے اس کو آباد کر لیا (اس خط کے حاشیہ پر کسی افسر کا نوٹ ہے:۔ شاید ۱۰، ۱۲ یا ۱۵ سال ہوئے اس وقت سیدوں اور ان کے فقیروں سمیت بارہ تیرہ گھر ہیں۔ ن (۸) مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۸۶۷ء)

اب جب کہ سیدوں کی طاقت کمزور ہو گئی ہے اور ان کے خاندان کے افراد کی تعداد کم ہو گئی ہے یہ بہتر ہو گا کہ ان کا مال متاع ان کو واپس کر دیا جائے۔ اس شرط پر کہ وہ آئندہ کے لئے امن و امان سے رہنے کا عہد کریں۔ ان کو ستھانہ آباد کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ لیکن ان کو اپنی زمینوں پر' جو ابھی تک ان کے قبضہ میں ہیں۔ جو کاغذات میں برائے نام ضبط تصور ہوتی ہیں۔ کاشت کی اجازت دی جائے۔ اس طرح سے احکام ضبطی کے عمل درآمد کے بارے میں جو دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ بھی دور ہو جائیں گی کیونکہ اس وقت احکام ضبطی پر پوری طرح عمل نہیں کرایا جا سکا۔

میں نے ۱۹۶۳ء میں سنا تھا کہ نواب محمد اکرم خان ستھانہ کو بیع یا رہن خریدنا چاہتا تھا لیکن اس کا

کوئی نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہوا۔ اگر وہ اس کو خرید لیتا۔ تو یہ بہت سے وجوہات کی بنا پر بہت ہی اچھا ہوتا۔ (نوٹ) پیر شاہ نواب کے پاس رہتا ہے۔ وہ اس امر کا خواہشمند تھا۔ کہ نواب اس جگہ کو خرید لے کیونکہ فیروز شاہ نے اس پر بزور قبضہ کر لیا تھا۔ پیلا)

یہ بہت ممکن ہے اگر یہ معاملہ نواب صاحب کو سمجھایا جائے اور اس کو خریدنے کی ترغیب دی جائے تو فیروز شاہ جس کی مالی حالت بہت کمزور ہے اور اس وقت نواب صاحب کے ساتھ اس کے خوشگوار تعلقات بھی ہیں۔ یہ سودا منظور کرلے گا۔ اس طرح سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔ اس کے بعد منڈی بھی سیدوں کو دی جائے تاکہ وہ زیر بار احسان محسوس کریں۔ اس قضیہ کے فیصلہ کے لئے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ فیروز شاہ خود بخود بذریعہ وفد یا نواب صاحب سرکار کو اپنی تابعداری کا یقین دلائے۔ اور یہ درخواست کرے کہ ستھانہ اس کو دیا جاوے۔ اس پر حکومت اُس کی اس درخواست کو منظور کرلے۔"

مندرجہ بالا خط کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی تاریخ اور مترجم کا نام آخر میں این۔ ڈین ۵ رنومبر ۱۸۸۶ء درج ہے۔

۱۸۸۶ء میں ستید اپنے محفوظ مقام پلوسی اور اسمس سے پھر ستھانہ کو آئے۔ لیکن پسپا کر دئے گئے۔ ۹ رنومبر ۱۸۸۶ء میں وہ ستھانہ میں آباد تھے مسافروں کو لوٹا جاتا تھا۔ فیروز شاہ نے ایک برج بنایا تھا۔ یہ برج اس نے منڈی اور ستھانہ سے الگ لوہی شاہ نور پور (ستھانہ اور منڈی سے اوپر) بنایا تھا۔ وہ لکڑی جو دریا سے گزرتی تھی اس پر محصول لیتا تھا اور مویشیوں کی چرائی پر محصول وصول کرتا تھا۔ کاغذات سرکاری میں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کی ایک رپورٹ مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۸۸۶ء بنام کمشنر میں تحریر ہے کہ کھبل کے ملک نے رپورٹ کی ہے کہ فیروز شاہ نے جہانگیرہ کے ملاح غلام دین سے دس روپیہ بہ زور بطور محصول لیا۔ مفصل رپورٹ یہ ہے:۔

ڈپٹی انسپکٹر کرپلیاں اپنی رپورٹ نمبر ۲۲ مورخہ ۹ دسمبر ۱۸۸۶ء میں تحریر کرتا ہے کہ غلام دین ملاح ولد عبداللہ ساکن جہانگیرہ نے رپورٹ کی ہے کہ وہ دیار کا جالا دربند سے اٹک بتاریخ ۵ دسمبر ۱۸۸۶ء لے جارہا تھا کہ منڈی کے نزدیک سید فیروز شاہ کے آدمیوں نے اس پر فائر کئے۔ اور آوازدی کہ جالا کو کنارے پر لگاؤ۔ اس نے جالا کنارے پر لگایا۔ تو فیروز شاہ کے آدمیوں نے اس سے کمبل اور بیس روپے چھین لئے اس خطرہ کے پیش نظر اب کوئی شخص دربند سے لکڑی دریا میں نہیں لا رہا۔ اندیشہ ہے کہ لکڑی کی تجارت بند ہو جائے گی۔"

اس پر کمشنر پشاور نے فیروز شاہ کو خط بذریعہ آزاد خان ساکن طوطالی کو لکھا کہ تم اس برج کو گرا دو۔

اس پر فیروز شاہ نے جواب دیا کہ وہ حکومت انگریزی کے کہنے پر گرا دے گا۔ لیکن اُتمان زئیوں کے کہنے پر نہیں گرائے گا۔ اور اگر سرکار کی خواہش ہوئی تو میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ اگرچہ میرا باپ کبھی بھی بلانے پر آپ کے پاس نہیں آیا۔ یا میں اپنے بھائی کو علاقہ انگریزی بطور یرغمال بھیج دوں گا۔ کہ وہ وہاں رہے۔ ستھانہ میرا علاقہ ہے۔ اور میں بھی اُتمان زیوں (کھبل کیا کے لوگ) اور نواب امب کی طرح محصول لے سکتا ہوں"۔ اس پر ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے مندرجہ ذیل رپورٹ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۶ء کمشنر پشاور کو بھیجی۔

۱۔ کھبل اور کیا کے اُتمان زئی اس سامانِ تجارت پر محصول لیتے ہیں جو ان کے ملک میں سے خشکی یا تری کے راستے سے گزرتا ہے۔ خشکی کے راستہ سے محصول تو وہ پرانے زمانہ سے لے رہے ہیں۔ جب کہ وہ پہلے پہل یہاں دریا کے کنارے آباد ہوئے تھے۔ دریا کا محصول وہ ایک پشت سے لے رہے ہیں۔ یہ محصول تقریباً ۳۵ سال سے ہے جب کہ کاکا خیل میانڑوں نے لکڑی کی تجارت کو بذریعہ دریا فروغ دینا شروع کیا۔ اور اب دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ محصول کی شرح ایک گیلی پر آٹھ روپیہ اور فی ملاح ۴ آنہ ہے۔ اس محصول پر آج تک تاجروں کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی کوئی جھگڑا ہوا۔ ہاں اُتمان زئیوں کے اپنے درمیان اس محصول کی تقسیم پر (مابین کنازئی، علی زئی اور اکازئی) جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ محصول لینے کا حق یا رسم جو قوم استعمال کرتی ہے وہ کسی طرح ایک فرد کے حق کے برابر نہیں ہو سکتا۔ فیروز شاہ کیلئے اس حق کو اس بناء پر کہ اس کی زمین بھی دریا کے کنارے پر ہے۔ استعمال نہیں کر سکتا۔

فیروز شاہ نے ستھانہ میں ایک مسجد بھی بنانی شروع کی ہے۔ اور لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ حکومت نے اس کو ستھانہ اور منڈی میں آباد ہونے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ اور اس کے آدمی شاہ نور کی لڑی میں، جو گڑھی اس نے حال میں تیار کی ہے، موجود ہیں۔ تاجروں کی مزید کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی۔ شاید انہوں نے بطور خود اس سے معاملہ کر لیا ہے۔ اور اس کو خفیہ ادائیگی کر رہے ہیں۔

مورخہ ۱۷ ر فروری ۱۸۸۶ء ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے کمشنر پشاور کو مطلع کیا کہ دفعتہً کھبل اور کیا کے اُتمان زیوں نے اس کی گڑھی کو گھیر لیا۔ اور ایک ملا کی سفارش پر فیروز شاہ کو بمعہ ملازموں کے نکلنے دیا اور گڑھی۔ مکانات اور مسجد کو جو فیروز شاہ نے بنوائے تھے جلا کر برباد کیا۔ اس جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ فیروز شاہ تاجروں کی لوٹ مار سے جو امب سے اُتمان زیوں کے گاؤں کو جاتے تھے اتمان زئی تنگ آگئے تھے۔ اس واقعہ کی اطلاع سے دو دن پہلے (۱۳ ر فروری) آزاد خان طوطالی کا نمبردار (قوم خدوخیل) میرے پاس فیروز شاہ کا مورخہ ۱۱ ر دسمبر ۱۸۸۶ء ایک خط لایا تھا۔ اور اس کے پاس آپ کا پروانہ بھی تھا جس میں آپ نے فیروز شاہ کے متعلق اس کو ہدایات دی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے بتلایا کہ یہ پروانہ جب اُس نے

فیروز شاہ کو دکھایا۔ تو فیروز شاہ اس کو فوراً مولوی عبداللہ امیر مجاہدین ساکن پلوسی کے پاس لے گیا۔ اور آزاد خان نے کہا کہ وہ اور مولوی عبدالله ایک شخص ہیں۔ اس کے بعد فیروز شاہ نے جدونوں اور اکازئی کی امداد سے فروری ۱۸۶۸ء میں اپنی گڑھی منڈی میں بسالی۔ اور جولائی تک ستھانہ کی آبادی دُگنی ہوگئی۔

فیروز شاہ کا حُلیہ

بموجب خط از جانب اسسٹنٹ کمشنر مردان۔ محررہ بروز ہفتہ۔ (تاریخ ندارد)

بنام ڈپٹی کمشنر پشاور

میں آپ کو فیروز شاہ کے متعلق تین ذرائع سے حاصل کی ہوئی رپورٹیں بھیج رہا ہوں جس کی شناخت کے متعلق اب کچھ شک نہیں رہے گا۔ ایک برہمن مسمی ہیرا جس سے میں نے کچھ عرصہ ہوا امتحان پاس کرنے کے لئے ناگری پڑھی تھی وہ خود وہاں گیا ہے۔ اور فیروز شاہ کو اس نے دیکھا ہے اس کے بیان کے مطابق وہ ۳۵ سال کی عمر کا ہے۔ قد ۵ فٹ سات یا آٹھ انچ ہے۔ دُبلے بدن کا اور سفید رنگ کا ہے۔ پتلی ناک ڈاڑھی چار انگل کے برابر اور نکیلی۔ ناک نقشہ چاک چوبند، بڑی کالی آنکھیں، کالے خمدار ابرو۔ سر مونڈھا ہوا۔ ایک آنکھ میں موتیا بند۔ درمیانے قسم کے کان، چہرہ پر کوئی خاص نشان نہیں۔ بائیں پاؤں پر زخم کا نشان۔

فیروز شاہ نے کہا کہ وہ روس، استنبول، اور کابل گیا۔ لیکن کسی نے اس کو زیادہ عرصہ کے لئے پناہ نہ دی اور نہ ہی کوئی اس کا طرفدار ہوا۔ اب وہ فقیرانہ زندگی بسر کرنے کا متمنی ہے اگرچہ ہندوستانی اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

جنگ آزما سپاہی	عورتیں	لڑکے	لڑکیاں
۹۰۰	۳۱	۴۷	۳۲

اُن کے پاس تیس گھوڑے بمعہ ٹٹوؤں، ۵ ۴ خچریں، دو پہاڑی توپیں۔ ایک بیل، ۳ شاہین توپیں ۴ چمڑے کی توپیں۔ جو سات دفعہ فائر کرنے کے بعد آٹھویں فائر پر پھٹ جاتی ہیں۔ یہ چمڑے کی توپیں جو فیروز شاہ نے بنائی ہیں۔ عجیب اور خطرناک سمجھی جاتی ہیں۔

فیروز شاہ پشتو نہیں بول سکتا۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا ہے اور وہ ہر قیمت پر بھی ہمیں نقصان پہنچانے کے ذرائع ڈھونڈتا ہے۔ وہ گلا نوباڑی (پھولوں کی باڑی) جتیارہ گلا نو باڑی کے سامنے علاقہ مغرزئی میں ہے۔ وہ ہر اُس بنیر وال خان سے دوستی کا خواہاں ہے جو ان کی امداد طلب کرے۔ ان کے کار دار (قاصد) جو ان کے لئے روپیہ لے جاتے ہیں ان کے پاس سے کچھ برآمد

نہیں ہو سکتا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے ہر شہر میں دو تین کارکن ہوتے ہیں۔

اسی طرح ایک اردو کا رقعہ باجلاس صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر یوسف زئی (یعنی مردان) مجریہ یکم ماہ مئی ۱۸۶۸ء میں فیروز شاہ کے حُلیہ کے لئے تحویر ہے اس کی پشت پر اردو میں اس کا حلیہ منجانب امیر خان ساکن شیوہ محررہ ۱۹ر جون ۱۸۶۸ء درج ہے۔ جو اس نے بذریعہ ایک معتبر مخبر غیر علاقہ میں بھیج کر منگوایا۔ ایک اور رپورٹ میں سمندر خان مانیری پایاں نے فیروز شاہ کا حُلیہ بیان کیا اور اطلاع دی کہ وہ دہلی کا شاہزادہ نہیں جو اس نے جھوٹ مشہور کیا ہے۔ (یہاں میرے مسودے پر مولانا مہر نے یہ نوٹ دیا ہے "یہاں واقعات میں اختلاط ہوگیا ہے۔ شہزادہ فیروز شاہ دہلوی بھی ۱۸۶۸ء کے آس پاس مجاہدین کے پاس پہنچا تھا۔ جب اُن کے سروسامان کی بے مائیگی دیکھی تو واپس چلا گیا۔ بہ روایات مختلف ۱۸۹۵ء میں بمقام مکہ مکرمہ وفات پائی)

یہ فیروز شاہ بن مبارک شاہ ستھانوی بعد کا آدمی ہے۔

فیروز شاہ شاہزادہ دہلی پر مولانا مہر نے اپنی کتاب سرگزشت مجاہدین میں تحریر فرمایا ہے۔

کرنل وائلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں وہ (مجاہدین) علاقہ چنگرزئی (جہاں پر وہ جنگ امبیلہ کے بعد سے اقامت گزیں تھے) سے اٹھ کر باج کٹہ واقع بُنیر میں منتقل ہو چکے تھے یہیں اپریل ۱۸۶۸ء میں فیروز شاہ ان سے آملا جو دہلی کے آخری بادشاہ کا فرزند تھا۔

شہزادہ فیروز شاہ۔ ابو ظفر بہادر شاہ کا فرزند نہ تھا جیسا کہ وائلی نے لکھا ہے۔ بلکہ چچیرا بھائی تھا۔ یعنی شاہ عالم ثانی کا پوتا اور شہزادہ ناظم بخت برادر اکبر شاہ ثانی کا فرزند تھا ۱۸۵۶ء میں حج کے لئے چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی کے وقت "غدر" شروع ہو چکا تھا۔ راستے ہی میں شہزادے نے ایک فوج کی کمان سنبھال لی۔ اور دیر تک انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا جب انگریز ہندوستان پر دوبارہ مسلط ہو گئے تو شہزادہ آزاد علاقے میں چلا گیا۔ ۱۸۶۸ء میں مجاہدین کے پاس پہنچا غالباً یہ خیال کر کے کہ اتنے تھوڑے آدمیوں سے انگریزوں کے خلاف موثر اقدام نہ کیا جا سکے گا۔ وہ وہاں چلا گیا تھا۔ بعد کی زندگی کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے ترکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ اور وہیں فوت ہوا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مکہ معظمہ چلا گیا۔ اور وہاں ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔

مجاہدین کی نقل و حرکت

مختلف مقامات پر رہائش

اور

جنگِ امبیلہ

سرکارِ انگریزی کے کاغذات کی روشنی میں

جنگِ امبیلہ (دسمبر ۱۸۶۳ء) اپنے ایک طویل خط میں جو ایڈجوٹنٹ جنرل نے ۱۷ دسمبر ۱۸۶۳ء میں سکرٹری پنجاب گورنمنٹ کو لکھا۔ اس میں مسلمانوں کی میدان کارزار میں شجاعت اور جہادِ دینی میں استقلال کا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا ہے۔

OF ALL THE FANATICISMS MUSSALMAN'S FANATACIMS IS THE BLINDEST AND MOST VEHEMENT

جس کا ترجمہ کما حقہ مشکل ہے تاہم مندرجہ ذیل ترجمہ سے انگریزی کے الفاظ کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔

ترجمہ :- تمام مذہبی تعصبات میں مسلمانوں کا مذہبی تعصب نہایت پرجوش اور بہت تُند و تیز ہے۔

کمشنر پشاور اپنے ایک طویل خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۴ء میں رائٹ آنریبل ڈیوینر اسکوائر سکرٹری گورنمنٹ پنجاب کو امبیلہ کی جنگ کے متعلق تفصیلی روداد پیش کرتے ہوئے پیراگراف ۱۲ میں لکھتا ہے "ہمارے مقابل جنگ میں سب سے پہلے صف آرا ہندوستانی مجاہدین زیر سرکردگی مولوی عبداللہ تھے۔ ان کی تعداد شروع میں ۹۰۰ کے قریب تھی اور ان میں زیادہ تعداد جوش جہاد میں اپنی جانیں قربان کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اور اسی جذبہ سے سرشار لوگ ہی اپنے گھر بار ہندوستان میں چھوڑ کر ان سخت پہاڑوں میں آکر رہائش اختیار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی اس جگہ بہت سخت حالات میں گزرتی ہے۔ ان کی زبان، عادات اور اغراض مقامی لوگوں سے بہت ہی مختلف ہیں۔ اور وہ اس قوت لایموت پر گزارہ کرتے ہیں۔ جو مولوی عبداللہ ان کے لئے مہیا کرتے ہیں۔ اور پھر سامان جنگ ان کو بہت ہی گراں قیمت پر ملتا ہے۔ یہ فوجی ڈرل ہماری فوجوں کی طرح کرتے ہیں۔ اور کافی تعداد کے پاس ہماری

ہندوستانی فوج کی طرح وردی بھی ہے۔ ان کے تین جمعدار ہماری فوج کے جمعدار تھے جو سابق ۵۵ رجمنٹ میں تھے (اس رجمنٹ نے مردان میں بغاوت کی تھی۔ ان کے سپاہی مجاہدین کے ساتھ مل کر سرحد پشاور، ہزارہ اور کاغان میں جنگ کرتے رہے تھے۔ ش ب) مولوی عبداللہ خود اس علاقہ میں چار سال سے (یعنی ۱۸۶۰ء) ہے۔ وہ مولوی عنائت علی کا جس نے ہمیں ۱۸۵۸ء میں تارنجی کے مقام پر سخت تکلیف میں ڈالا تھا بھتیجا ہے اور بہت ہی قابل انسان ہے۔ ہندوستان میں جتنا چندہ جمع ہوتا ہے وہ اسی کے پاس آتا ہے اور وہی اس کو خرچ کرتا ہے۔ مجاہدین کے لئے بہت کافی چندہ اس کے پاس آتا ہے۔ اس کی زبردست خواہش ہے کہ سوات کی بادشاہی سید مبارک شاہ ولد سید اکبر شاہ کے لئے حاصل کرے۔ سادات ستھانہ کے ساتھ ان مجاہدین کی گہری رفاقت ہے۔ اور ان کی تاریخ سے حکومت واقف ہے۔ ان سادات ستھانہ میں سے صرف محمود شاہ نے زیادہ حصہ ہماری مخالفت میں لیا۔ سید محمود شاہ ۱۸۵۸ء کے حملہ ستھانہ کے بعد کچھ عرصہ کے لئے ہماری ملازمت میں تھا۔ اس خاندان کے بزرگ سید مبارک شاہ نے کوئی عملی حصہ ہمارے خلاف نہیں لیا۔

پیرا نمبر ۴۹ - ملکہ سلسلہ مہابن کے شمالی حصہ میں ایک سطح مرتفع پر کافی کشادہ جگہ پر واقع ہے۔ یہ جگہ ان پہاڑوں میں سب سے بڑا میدان ہے۔ اس میں بہت سی عمارات ہیں۔ اور خاص کر قابل ذکر مولوی صاحب کا دیوان عام، سپاہیوں کے لئے بارکیں، گھوڑوں کے لئے اصطبل، بارود کا کارخانہ ہیں۔ ان عمارات کے گرد کوئی خاص قلعہ بند فصیل تو نہیں ہے۔ لیکن گھروں کی بیرونی دیواریں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہونے کی وجہ سے ایک مسلسل دیوار بن گئی ہے اور اس دیوار کے درمیان ایک خفیہ راستہ ہے۔ پھاٹک کے اوپر ایک برج بھی ہے۔ امبیلہ کی جنگ کے اختتام پر یہ جگہ مجاہدین نے خالی کردی تھی۔ اور ۲۲ جنوری کی صبح کو گنیر اور امازئی کے لوگوں نے لیوی کی معیت میں اس کو جلانا اور تباہ کرنا شروع کر دیا۔

پیرا نمبر ۵۴ - مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۶۳ء کو جدون قوم کے سب ملک سوائے ملک عیسیٰ جو مجاہدین کا طرفدار تھا۔ انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ وہ بمقام مینی (ننڈو ٹوپی) کمشنر سے ملیں۔

پیرا نمبر ۵۶ - محمد شاہ ساکن اسماعیلہ جدون قوم کی طرف بطور قاصد بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ دوسرے خانان پر اعتماد نہ تھا۔

پیرا نمبر ۵۷ - سب جدون ملک بمعہ عیسیٰ خان حاضر ہو گئے۔

پیرا نمبر ۶۰، ۶۱ - گزشتہ جولائی (۱۸۶۳ء) میں سیدوں اور ہندوستانیوں نے آکر منڈی کو جو ستھانہ

کے ساتھ ہے۔ پھر آباد کر لیا۔ اور ایک معمولی سا قلعہ پتھروں سے بنا لیا۔ یہ گاؤں سیدوں کی ملکیت ہے جو سادات ستھانہ مبارک شاہ کے خاندان سے الگ ہیں۔ یہ گاؤں ۱۸۵۸ء میں تباہ کرنے سے بچا لیا گیا تھا۔ کیونکہ منڈی والوں پر کوئی شکایت نہ تھی۔ اب جب کہ ہندوستانیوں نے منڈی پر قبضہ کر لیا ہے لہٰذا ان کے اس گاؤں کو تباہ کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ منڈی کا سید ہندوستانیوں کے آگے بے دست و پا ہیں اور یہ کام جدون اور اتمان زئی قوم کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے یہ کام کرنے کا عہد کیا۔ یہ قومیں ۳ر جنوری ۱۸۶۴ء کھبل کے مقام پر جمع ہوئیں۔ اور میرے اور کرنل وائلڈ کے ہمراہ ۴ر جنوری کو منڈی پہنچیں۔ کرنل وائلڈ کے ساتھ کچھ فوج بھی تھی۔ یہ گاؤں اب کافی ترقی کر چکا ہے۔ اور اس میں چند اچھے مکان بھی تھے۔ جدون اور اتمان زئی جرگہ نے گاؤں کو جلا دیا۔ اور قلعہ گرا دیا۔ ستھانہ ابھی تک ملبہ کا ڈھیر ہے جب سے سر سڈنی کاٹن نے اس کو تباہ کیا تھا۔"

پیرا نمبر ۶۵۔ ہندوستانیوں کی تعداد کبھی ۹۰ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور اس میں نصف کے قریب امبیلہ کی جنگ میں قتل (شہید۔ ش ب) اور زخمی ہوئے باقی دور پہاڑوں میں حسن زئیوں کے علاقہ میں پناہ گزین ہیں۔ اور کچھ مولوی عبداللہ اور اخون صاحب کے پاس سوات کی سرحد پر ہیں۔ ہمارے اقدام سے ان کی مکمل ناکہ بندی ہو گئی ہے۔ اگر وہ اسی علاقہ میں رہے تو ان کو کوئی امداد ہندوستان سے نہ پہنچ سکے گی۔ اور ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ لیکن اخون صاحب سوات ان کے لئے سوات میں رہائش کی جگہ کے لئے اپنا اثر استعمال کر رہا ہے۔ اگرچہ وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا شاید آخر کار کامیاب ہو جائے۔ چونکہ ہمارا منشا اس جماعت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے تاکہ آئے دن کی لڑائیوں سے ہم اپنی حفاظت کر سکیں۔ اس وقت وہ پریشان حال اور گھبرائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں نے یہ مناسب سمجھا کہ ان کو گزشتہ اعمال سے معاف کر دوں بشرطیکہ وہ سب واپس ہندوستان چلے جائیں۔ اور میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ راستہ کا خرچ بھی ان کو دیا جائے گا۔ مولوی قدرتی طور پر اس صورت حال کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ اس طرح سے وہ اکیلا رہ جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اور عنقریب ان سب ہندوستانیوں کے واپس جانے کی خوشخبری پہنچانے کی خوشی حاصل کروں گا۔"

جنگ امبیلہ کے بعد مجاہدین کچھ مدت علاقہ چغرزئی (برندو ندی کے شمال) میں رہے لیکن اخوند صاحب سے ناخوشگوار تعلقات کی بنا پر ان کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ ان کی تعداد اس وقت تقریباً سات سو تھی۔ اور وہ ملکا چلے گئے۔ وہاں سے بھی نکالے گئے۔ پھر علاقہ چغرزئی میں گئے بعد ازاں پلوسی چلے گئے۔

وہاں سے تاکوٹ (تھاکوٹ) منتقل ہوئے۔ انجام کار حسن زئیوں کے علاقہ میں پہنچے۔ اور پلوسی کے قریب میدان میں کھجور میں پٹے پر لے لی۔ وہاں وہ ۱۸۸۸ء تک رہے۔ صفحہ ۲۷۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکا میں ان کا قیام ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۴ء تک رہا۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے تین سال ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۶ء میں گلونو بازی نزد بٹیارہ علاقہ چغرزئی میں گزاری۔

فہرست مولویان و سرگروہان مجاہدین ساکن ملکہ و ستھانہ

انڈر سکرٹری۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے خط کے مطابق

۱۔ مولوی عبداللہ ولد مولوی ولایت علی۔ ساکن پٹنہ۔ یہ آدمی سب شہادت میں اور خط و کتابت میں بابو صاحب کے نام سے مشہور ہے یہ ان کا بڑا ملا اور امیر ہے عمر ۴۶ سال ہے فی الحال بٹیارہ علاقہ چغرزئی بمعہ اپنے بھائی عبدالکریم

۲۔ مولوی فیاض علی ولد الٰہی بخش ساکن پٹنہ۔ عمر ۵۴ سال

۳۔ مولوی اسحاق ولد مقصود علی۔ سابق ساکن بہار۔ بعد میں دیناپور نزد پٹنہ عمر ۷۰ سال۔

۴۔ مولوی یعقوب ولد مقصود علی متذکرہ بالا۔ ساکن دیناپور عمر ۲۷ سال۔

۵۔ مولوی ابراہیم پلاس پور (پلاس پور۔ ش ب) ضلع براسیت

۶۔ مولوی میزان الرحمٰن ساکن ٹیکھوار ضلع سلہٹ اور بعد میں بیگم بازار۔ ڈھاکہ

۷۔ مولوی بصیر الدین ولد مولوی ابراہیم ساکن اروڈابی پرگنہ کرچو رائن۔ فرید پور

۸۔ مولوی حافظ عبدالمجید ولد مولوی عنایت علی۔ ساکن صادق پور۔ پٹنہ

۹۔ مولوی محمد احسان ولد یحییٰ علی۔ ساکن صادق پور۔ پٹنہ

۱۰۔ مولوی عبدالقادر ولد مولوی احمد اللہ ساکن صادق پور۔ پٹنہ

مقدمہ و کارروائی پولیس۔ خاص رپورٹ، پولیس ڈیپارٹمنٹ ضلع لدھیانہ

۱۱ر اکتوبر ۱۸۶۵ء

عبدالرحیم کو ابھی لاہور بھیجا جا رہا ہے۔ یہ فرحت حسین برادر ولایت علی کا لڑکا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اگر حکومت اس کو اجازت دے تو وہ خود اپنے آدمی سرحد بھیج دے گا۔ تاکہ وہ سب مولویوں کو واپس اپنے گھروں کو لانے کا انتظام کرے گا۔ یہ ایک اہم معاملہ ہے۔ اور میں اس کی درخواست پر

یہ رپورٹ بھیج رہا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کارروائی کی پہل اور انتظام اس کی طرف سے ہوگا نہ کہ حکومت کی طرف سے ۔ لاہور پہنچنے پر اس کے ساتھ بات چیت دوسرے قیدیوں کے سامنے کی جا سکتی ہے۔

دستخط۔ آر۔ ڈی پارسن۔ ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس۔

عبدالرحیم کی تجویز سے انسپکٹر جنرل پولیس نے اتفاق نہ کیا۔ اس کو لاہور ہی میں تا حکم ثانی رکھا گیا۔ اس کے ساتھی انڈمان بھیجے جا چکے ہیں۔ یہ بھی لکھا گیا کہ مولوی عبداللہ نے اپنی جائیداد ہندوستان میں پہلے ہی فروخت کر دی ہے۔ ڈاکٹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۸۶۵ء

کاغذات سرکاری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۶ء میں ہندوستانی مجاہدین نے راہداری حاصل کرنے کی امداد کے لئے درخواست کی۔ کہ ان کو اپنے وطن واپس جانے دیا جائے۔ اور ساتھ ہی کہا۔ کہ اگر ان کو نہ جانے دیا گیا تو وہ کابل چلے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ دکھائی گئی ہے کہ وہ کمزور ہو گئے تھے اور اخون صاحب سوات نے ان کو نکالنے کے لئے بُنیر والوں کو سخت احکام دے دئے تھے۔

مجاہدین کے سفراء کی گرفتاری کے لئے مطابق رپورٹ مورخہ ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء ڈپٹی کمشنر ہزارہ محررہ پولیس کی چوکیاں بمقامات حطار، تھپلہ، صوابی میرا مضبوط کر دی گئی تھیں۔ اور اسی طرح خاکی اور اوگی کی چوکیوں کو بھی خبردار کر دیا گیا۔ تاکہ ان مجاہدین کے سفراء جو ہندوستان سے ان کے لئے سامان اور چندہ لاتے ہیں ان کو گرفتار کیا جا سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفراء راولپنڈی سے حطار (شادی حطار) تھپلہ اور صوابی میرا سے ہو کر جاتے تھے۔

خط از جانب مولوی عبداللہ بنام نواب امب

خان والاشان صاحب شوکت و ریاست والی ملک و حکومت اکرم خان صاحب زاد اللہ عزتکم

پس از سلام مسنون کہ مسنونِ خیر الانام است واضح باد کہ ایں جانب با جمیع متعلقانِ خود از فضلِ سبحانہٗ تعالیٰ بخیریت تمام و صحت داری مزاج آں والاشان شب و روز از درگاہِ رب العلمین مطلوب۔ زبانی مفتی محمد حسن صاحب احوال بخوبی واضح گردید۔ آنچہ آں والاشان منشاء ایں جانب درباب صلح استفسار نمودہ اند، صاحبا! خلاصۂ منشاء نحیف درباب صلح خواہند کرد، انشاء اللہ تعالیٰ صورت صلح بانجام خواہد رسید۔ و تفصیل ایں خلاصہ موقوف بر ملاقات۔ پس مناسب کہ آں والاشان از ایں جانب ملاقی شوند کہ تفصیلش بیان کردہ آید۔ و مقام ملاقات دریں ایام جوشش دریا اباسین در ملک حسن زئی گڑھی یا مسکن نحیف است۔ و در ایام غیر جوشش دریا نیز ہر دو جائے۔

مذکور الصدر بہتر ورنہ موضع گنڈی مسکن عبدالغفور ملازم آں صاحب یا موضع کنار را تقرر دہند۔

(مُہر)
عبداللہ

مندرجہ ذیل خط پر تاریخ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا خط ہے۔ جو نواب صاحب کو بھیجا گیا۔ اس خط کا انگریزی ترجمہ فائل پر ہے لیکن اصل خط فائل پر نہیں۔ انگریزی سے اردو ترجمہ مندرج ذیل ہے۔

القاب، دعا سلام کے بعد تحریر ہے کہ میں مفتی صاحب سے ملا ہوں .... اور باتیں کی ہیں۔ اور اس کی باتوں کو اچھی طرح سے میں نے سمجھ لیا ہے۔ آپ نے صلح کے بارے میں میری رائے دریافت کی ہے میں مختصر طور پر ان کو بیان کر دیتا ہوں۔ کہ اگر انگریزی حکومت اور ملکہ عادلانہ اور پختہ معاہدہ دربارہ صلح میرے ساتھ کریں۔ تو انشاء اللہ فیصلہ ہو جائے گا۔ تفصیل ملاقات ہی میں بیان کی جا سکتی ہے۔ لہذا آپ بمعہ ان انگریزی افسران کے جو پولیٹیکل معاملات میں مہارت رکھتے ہوں میرے ساتھ ملاقات کریں۔ میں ان کو سب معاملات تفصیل سے بیان کر دوں گا۔ ایک اطلاع (خبر یا بات) یہ ہے کہ جب انگریزی فوجوں نے سرحد سوات پر حملہ کیا۔ تو خانان سوات نے بہ منظوری ہر دو پسران اخون صاحب سوات سید احمد، جو ایک اچھے سید خاندان سے تھا کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ اور اس کے ہاتھ پر جہاد اور ملک کی حفاظت کے لئے بیعت کر لی۔ لیکن جب وہ اپنے وعدہ کے مطابق عمل نہ کر سکے تو انہوں نے مجھ سے درگزر کی درخواست کرتے ہوئے اپنی بداعمالیوں کی معافی کے لئے اپنے نمائندے بھیجے۔ یہ سب حالات حامل رقعہ ہذا بیان کرے گا۔ ان کے نمائندے پھر آئے ہیں۔ اور تمام شرائط مانتے ہیں۔ اور درخواست کرتے ہیں کہ میں اپنی فوج ان کے ساتھ بھیجوں۔ میرے نمائندے بھی وہاں گئے تھے۔ ان کا استقبال عزت سے کیا گیا۔ اور ان کے سامنے وفاداری اور دوستی کا حلف پیش کیا گیا۔ (یہ دونوں خطوط ۱۸۷۸ء کے موسم گرما میں تحریر کئے گئے معلوم ہوتے ہیں۔ ش۔ب)

مندرجہ ذیل خط جو مولوی عبداللہ کی جانب سے مفتی محمد حسن کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے انگریزی ترجمہ پر تاریخ ۶ رجب (۲۵ جولائی ۱۸۷۸ء) درج ہے۔

یہ خط اور اس کا لفافہ بجنسہٖ فائل پر موجود ہیں۔ لفافہ پر پتہ یہ ہے :۔

لفافہ ہذا بمطالعہ ساطعہ عالیجاہ رفیع جایگاہ رفعت و عوالیم تبت پائگاہ نواب اکرم خان صاحب زاد اللہ تعالیٰ اقبالکم و احسن بالکم، در آید مورخہ ۶ شہر رجب المرجب ۱۲۹۵ھ ۔

نقل خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عالیجاہ رفیع جائیگاہ حشمت و شوکت دستگاہ رفعت و عظمت پائگاہ نواب صاحب۔

والا مرتبت سلمہ الواہب واوصلہ المطالب ۔ بعد از سلام مسنون الاسلام و تمنائے ملاقات ملتفت آیات مکشوف ضمیر عنایت تخمیر میگرداند۔ کہ یہاں حقیر اوقات اور ساعات میں لیل و نہار کے مشغول بدعا ازدیاد مراتب اور مناصب، بلکہ خواستگار رعالی درجات اور توفیق حسنات ہے ۔ اور اپنی جو درباب دریافت کرنے منشہ (منشار۔ ش ب) مراتب صلح کی۔ جناب والا قباب امیر صاحب سے فرمایا تھا۔ سو حسب فرمان جب بندہ نے دریافت کیا۔ جواب میں فرمایا۔ کہ یہ امر تفصیل طلب ہے ۔ اور مراتب اس کی بالمشافہ روبرو بیان ہوں گے ۔ سوا اس کے اگر قلم بند کیا جائے یا بالواسطہ بیان ہو، بخوبی ذہن نشین نہ ہوگا۔ اور حاجت استفسار کی باقی رہے گی۔ اس واسطے مناسب یہی ہے کہ ملاقات ہو کے ۔ بالتفصیل بیان ہو۔ مگر بتاکید اکید فرماتے ہیں کہ میثاق اور وعدہ نہایت مضبوط تحریر کردہ حکام انگریز بعد امتزاج ملکہ حاصل کرکے اس کام میں قدم ڈالیں۔ کیونکہ پہلے بہت سے لوگ اس کام کے لئے انگریزی حکومت اور امیر کے درمیان گفتگو کرتے رہے۔ مگر چونکہ کام بطور خام تھا۔ انجام نہیں پایا۔ انتہا کلام امیرنا المعظم اور جانب اس حقیر کے واضح اور روشن ہو کہ آپ بہت احتیاط کے ساتھ اس کام کو کریں۔ بدگمانی حکام وقت کی تو آپ کو بخوبی معلوم ہے .... مگر سوا اس کے ایک امر عظیم اور درپیش ہے ۔ وہ یہ ہے کہ فیصلہ کفر و اسلام کا آپ کے ہاتھوں سے کروایا جاتا ہے ۔ اس میں ہر وقت خوف رب طاری رہے ۔ اور خیال اس کا رکھیں۔ کہ بوجوہ من الوجوہ اہلِ اسلام کا ہتک اور ہلکاپن نہ ہو ورنہ بعینہٖ یہ فیصلہ بروزِ جزا پیشگاہ حضرتِ کبریا پیش ہوگا۔ جب خدائی تخت حکومت بچھ جائے گا۔ اور ایک آواز آئے گی۔ لمن الملک الیوم للّٰہ الواحد القہار ظہور فرمائیں گے۔ اور بڑے بڑے اولوالعزم اس روز کانپیں گے۔ اور نافرمانوں اور بدکاروں کو کون پوچھے۔ تفصیل اس کی تو بہت ہے مگر بطور نمونہ اس قدر تحریر کیا ہے زیادہ آفتاب درخشاں دو کوکب طالع تاباں باد۔

مہر

پروان محمد حسن است

سادات ستھانہ اور مجاہدین کے حالات ۔ سرکارِ انگریزی کے کاغذات خط و کتابت کی روشنی میں۔

ڈپٹی کمشنر پٹ ورسٹر ایچ ۔ بی بیکیٹ

بنام

کرنل جے ڈبلیو ۔ ایچ جانسٹن کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور مورخہ ۶ ر جولائی ۱۸۸۰ء

خاندانِ ستھانہ کے حالات یہ ہیں :۔

۱۔ ....

۲۔ ملکہ اور ستھانہ کے سید ایک ہی مورث کی اولاد ہیں ۔ خاندانِ ستھانہ کا سربراہ سید عمر تھا جو کہ ۱۸۵۶ء میں مارا گیا۔ اور اس کا بڑا لڑکا شاہ محمد پلوسی کے نزدیک ۱۸۷۰ء میں مارا گیا۔ اس کے بعد اس (سید عمر) کا دوسرا لڑکا شاہ حسین ان کا جانشین ہوا ۔ اور خاندان کا سرگروہ ہوا ۔

۳۔ مبارک شاہ ملکہ کے سیدوں کا سربراہ (جدّ) تھا۔ اس کے دو لڑکے ہیں فیروز شاہ اور بہادر شاہ جو دونوں زندہ ہیں مبارک شاہ خود اتفاقی گولی لگنے سے مر گیا تھا ۔

۴۔ شیر حسین اور مبارک شاہ کے لڑکوں کے درمیان سیری کی زمینوں کے بارے میں تنازعہ تھا ۔ اب ان کے درمیان خاندانی خونی بیر شروع ہوگیا ہے جس کا تصفیہ مشکل ہوگا۔ کیونکہ یہ سید پٹھان نہیں ہے ۔ جو خون بہا لے کر یہ تنازع ختم کردیں گے ۔ ۵۔ اس کے فوراً بعد فریقین نے امازیوں کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش شروع کردی ہے ۔ امازیوں کے تین خیل ہیں ۔ ۱۔ پناؤ (یعنی سورج کے سامنے مشرق) ۲۔ سورہ (سایہ کی طرف والے ۔ مغربی) اور ۳۔ مہار خیل لیکن یہ تینوں فی الحال آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ نواب امب دخل دے نہیں سکتا اور جدون یقینی طور پر ایک کے طرفدار ہو جائیں گے ۔ اور کھیل والے دوسری طرف ہو جائیں گے ۔

۶۔ ستھانہ اور ملکہ کے سیدوں نے باری باری مختلف اوقات میں مجاہدین یعنی ہندوستانیوں کو پناہ دی ہے ۔ جس کی وجہ سے دو جنگیں کرنی پڑیں۔ امبیلہ کی جنگ کے بعد ستھانہ کے سیدوں نے منڈی کے گاؤں کو جو ستھانہ کے نزدیک ہے پھر سے آباد کر لیا تھا ۔ اور یہ بات اس وقت ہی معلوم تھی ۔ لیکن اس کا نوٹس اس واسطے نہ لیا گیا کہ سید خاموش تھے اور انہوں نے کچھ تکلیف نہ دی۔

۷۔ مبارک شاہ کے بیٹوں اور منڈی والوں کے باہمی جھگڑا کا ہم سے کچھ سروکار نہیں۔ سوائے اس کے آخر میں ان میں سے ہر ایک مجاہدین کو بلا کر پھر سے ستھانہ یا ملکہ میں آباد کردیں گے ۔ اور یہ اس لئے بھی قابلِ یقین ہے کہ مجاہدین پلوسی کی رہائش سے تنگ ہیں۔ اور اس جگہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔

۹۔ میری رائے ہے کہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ منڈی والوں پر زور ڈالے کہ وہ مجاہدین کو اس جھگڑے میں نہ آنے دیں۔ اور میں مبارک شاہ کے لڑکوں کو بلا کر فہمائش کر دوں گا۔ کہ گورنمنٹ کبھی بھی ملکہ کو پھر آباد کرنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اور امازئی کے جرگہ کو بھی بلا کر تنبیہ کی جائے۔ کہ اگر ملکہ سیدوں نے ہمارا حکم نہ مانا تو امازیوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

اسسٹنٹ کمشنر یوسف زئی کا خط بنام ڈپٹی کمشنر پشاور مورخہ ۲۲ر جون ۱۸۶۰ء

۱۔ ....

۲۔ ستھانہ اور منڈی کی پانی سے سیراب ہونے والی زمینوں کی کاشت کے لیئے کاشتکاروں کے وہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن پلوسی کے ہندوستانیوں یا ملکہ کے سیدوں کا واپس آکر وہاں آباد ہونا قابلِ اعتراض ہے۔ ستھانہ، گدون اور اُتمان زئی قوم کھبل کے قبضہ و اختیار میں ہے لیکن منڈی جس پر جدونوں اور نواب امب کے درمیان ملکیت پر جھگڑا ہے۔ میرے خیال میں اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ ایک تناول، دفتر (ملکیت) ہے جس کے کچھ حصہ پر تناولی اور کچھ حصہ پر جدون قابض ہیں۔ اور ان سب سے نواب امب اجارہ کا دعوے دار ہے۔

۳۔ موجودہ نواب کے والد جہانداد خان کی کمزوری تھی جس نے پہلے پہل ہندوستانیوں کو منڈی میں آباد ہونے دیا اور اس آبادی کو ۱۸۵۸ء میں سر سڈنی کاٹن کو تباہ کرنا پڑا۔

۴۔ اگر منڈی بھی ستھانہ کی طرح ملکہ کے سیدوں کی سیری ہے تو نواب امب کے ذریعہ سے ایسا انتظام کیا جاسکتا ہے کہ ان کو مالکانہ کا حصہ دیا جاوے۔ لیکن گاؤں میں رہنے یا اس کے انتظام میں دخل دینے کی اجازت نہ دی جائے۔ میری رائے میں سیدوں کی سیری آمنی شمال کی طرف کہ منڈی تک ہو۔ نہیں ہے۔

ڈپٹی کمشنر پشاور سے کمشنر پشاور کو اسسٹنٹ کمشنر مردان کی رپورٹ مورخہ ۸ر اگست ۱۸۶۸ء کو بھیجی وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ ہندوستانی اب پلوسہ کو چھوڑ رہے ہیں۔ اور مداخیلوں نے ان کو نئی جگہ سمستے (دسمستہ گڑھی بموجب گزیٹر) میں جو ایک محفوظ اور مضبوط جگہ ہے۔ جو برندو نالہ کے شمالی کنارہ پر اور تقریباً ایک دو میل اس مقام سے نیچے ہے۔ جہاں چملہ کا نالہ برندو نالہ سے ملتا ہے اس مقام کے مغرب سے چغرزئی بنیر والوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے جنوب میں چملہ اور امازئی ہیں۔ ہندوستانی ڈنڈر کو جو نالہ برندو کے جنوبی کنارے پر ہے اور امازئی کے علاقہ میں ہے۔ حاصل کرنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سمستے کے نزدیک شاہراہ تجارت پر واقع ہے۔

۲۔ ہندوستانیوں نے سمستے والوں کو قیمت ادا کر دی ہے اور ان سے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے گھروں اور فصلوں کو اپنی حالت میں اسی طرح چھوڑ کر چلے جائیں۔ ہندوستانیوں کے ۱۲۰ آدمی اب سمستے میں ایک قلعہ بنا رہے ہیں۔ اور اپنے بال بچوں کی رہائش کے لئے مزید مکان بنا رہے ہیں ہندوستانیوں کی مرکزی جمعیت بمعہ اپنے بال بچوں اور مال متاع سمیت ابھی پلوسہ ہی میں ہے ان میں اس وقت ۴۵۰ کے قریب جنگ کے قابل سپاہی ہیں۔

۳۔ ہندوستانیوں کو پلوسہ اس واسطے چھوڑنا پڑا۔ کہ یہ جگہ حسن زیوں کی ہے اور وہ ہندوستانیوں سے اس بات پر ناراض ہیں کہ وہ ان کے ساتھ نواب امب کے علاقہ پر حملہ کرنے کے لئے شامل نہیں ہوئے۔ لیکن اب جب کہ ان کو یقین ہو گیا ہے کہ واقعی ہندوستانی پلوسہ سے جا رہے ہیں۔ تو اب ان کو یہیں رہ جانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ جنگ امبیلہ کے بعد اور ہندوستانیوں کے ملکہ سے نکالے جانے کے بعد مداخیلوں نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ پھر ہندوستانیوں کو اپنے علاقہ میں نہیں آنے دیں گے۔ میں ان کو یہ وعدہ یاد کرا رہا ہوں۔ اور امید کرتا کہ نواب امب کی امداد سے جن کا ان پر بہت اثر ہے۔ مداخیلوں کو ترغیب دوں گا کہ وہ ہندوستانیوں کو پھر پلوسہ کی طرف واپس ہونے پر مجبور کریں۔

۴۔ ہندوستانیوں کے پلوسہ چھوڑنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ مقام ایک گوشہ میں ہے اور اس مقام سے وہ اپنا مذہبی اثر و رسوخ حسب منشا استعمال نہیں کر سکتے۔ وہ مدت سے مہابن کو واپس آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن مداخیل اور سید اس وقت تک ان کو اس جگہ قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سمستہ (مداخیل کے علاقہ میں ہے) اُن کے لئے بہت مفید جگہ ہے۔ وہ یہاں پر بنیر سے جہاں پر اُن کے بہت سے معتقد ہیں بہت نزدیک ہو جائیں گے اور ساتھ ہی چملہ (جو کمزور سے گاؤں کا مجموعہ ہے جو آپس میں ہر وقت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں) کی شاہراہ ان کے لئے کھل جائے گی اور جب کبھی وہ چاہیں گے ہم کو شیر درّہ اور امبیلہ کے ذریعہ تنگ کر سکیں گے۔

سمستہ میں ایک دو سال رہنے کے بعد وہ اپنا اثر و رسوخ بنیر میں جو پہلے سے ہی بہت زیادہ ہے اور مضبوط کر لیں گے اور اس کے بعد وہ اوپر کسی اور مضبوط جگہ بنیر یا چملہ میں اقامت اختیار کر لیں گے

۵۔ ان نتائج کے پیش نظر جیسا آپ کو معلوم ہے۔ میں امازیوں اور مہابن کے سیدوں کو متنبہ کر رہا ہوں کہ ہم ہندوستانیوں کو برندو نالہ کے جنوب کی طرف آنے پر اور ان کے سمستہ میں آباد ہونے کی اجازت ہرگز نہ دیں گے۔ بنیر میں اس وقت حالات اس قدر خراب ہیں کہ میں اس وقت کوئی قدم اٹھانا

نہیں چاہتا۔ اور نہ ہی اس کی فی الحال ضرورت ہے۔

مندرجہ بالا خط پہ ڈپٹی کمشنر پشاور نے اپنی طرف سے یہ نوٹ ایزاد کر کے کمشنر پشاور کو بھیجا۔

۱۔ میں اپنے خط مورخہ ۹ جولائی ۱۸۸۰ء میں منڈی کا اور ستھانہ کے سیدوں اور مجاہدین کے متعلق رپورٹ کر چکا ہوں کہ مجاہدین پلوسہ میں تنگ ہیں اور سیدوں کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر اچھی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

۲۔ میں اسسٹنٹ کمشنر مردان کی رپورٹ بھیج رہا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ مجاہدین اب پلوسہ چھوڑ کر سمستہ جا رہے ہیں۔ کیونکہ حسن زیوں نے ان کو نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ اب تازہ اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن زئی اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ اور انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر مجاہدین نے پلوسہ چھوڑا تو ہم ان کا مال و متاع لوٹ لیں گے۔

۳۔ سمستہ وہی جگہ ہے جس کا ذکر (MCGREGOR) گزیٹیر کے صفحہ ۲۹۵ پر دُسمستہ گڑھی کے نام سے ذکر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں تیرہ خاندان آباد ہیں۔ یہ بہت مستحکم اور مضبوط جگہ ہے۔ اور اگر یہ مجاہدین وہاں آباد ہو گئے تو بہت تکلیف کا باعث ہوں گے۔ نواب امب اس کو روک سکتا ہے۔ اور میں تجویز کرتا ہوں کہ اس معاملہ پر نواب امب کو بذریعہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ خط لکھا جائے۔

اگر ایک دفعہ مجاہدین سمستہ میں آباد ہو گئے تو وہ بہت جلدی بُنیر اور چملہ میں اثر پیدا کر لیں گے۔ کیونکہ ان کو چملہ میں موجودہ ابتر حالات میں کافی مواقع ہیں۔ دراصل ان کے اس مقصد کے صریح علامات موجود ہیں۔ کیونکہ ناصر خان ساکن برکلی تپہ نوازئی نے امبیلہ کا گاؤں ان کی امداد کے صلہ میں دینے کے پیش کیا ہے۔

۵۔ حسن زیوں کے ساتھ جھگڑا کا جو بھی نتیجہ ہو۔ لیکن مجاہدین پلوسہ کو چھوڑنے کے لئے یقیناً انتہائی کوشش کریں گے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جگہ ایک کونے میں ہے۔ اور وہ اپنا مذہبی اثر کسی مفید نتیجے کے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ ابھی تک حسن زئی ان کے چلے جانے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اور ہم کوشش کریں گے کہ حسن زئی اسی اصرار پر ڈٹے رہیں۔ مسٹر راجنسن نے ان کا جرگہ طلب کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے کے بعد میں اطلاع دی جائے گی۔

۶۔ اخون صاحب سوات کی زندگی میں مجاہدین بہت خاموش رہے کیونکہ وہ ان کو وہابی ہونے پر ملامت کرتا تھا۔ اس لئے وہ بنیر، چملہ یا اُن جگہوں پر جہاں اخون صاحب کا اثر تھا جانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے اب جب کہ وہ فوت ہو چکا ہے اور یوسف زئی اس کا نام بھولتے جا رہے ہیں۔ مجاہدین کو موقع مل گیا ہے کہ وہ یہ انتظام کر رہے ہیں۔

اسسٹنٹ کمشنر مردان کا خط نواب امب کے نام

مورخہ ۸ اگست ۱۸۸۰ء

عالیجاہ۔ بعد سلام و شوق ملاقات واضح خاطر باد کہ باستماع درآمدہ کہ ہندوستانیاں از مقام پلوسہ برخاستہ بمقام سمستہ علاقہ مدا خیل تجویز اقامت نمودہ اند۔ مداخیل و امازئی سابق اقرار با سرکار دادہ کہ بملک خود بد اندیشاں سرکار نخواہم گذاشت۔ بنابرآں محمد اسرائیل بذریعہ مراسلہ شوق ہذا نزد آں مہربان فرستادہ شدہ دریں امر بہ شما شدہ کہ شما بہر صورت کہ میدانند مداخیل و امازئی را فہمانیدہ کہ بملک خود گذاشتن و پناہ دادن ہندوستانیاں خلاف اقرار مقرر شدہ است۔ بہتر ہمیں است کہ ہندوستانیاں را از مقام پلوسہ حرکت کردن و گذاشتن بموضع سمستہ وغیرہ ندہند۔ کہ ایں منشاء سرکار است و امید است کہ از ینبا خصوص حکم صاحب ضلع بہادر ہزارہ نزد آں مہربان نیز خواہد رسید۔ خلاصہ اینکہ بکمال تن دہی شما ہر دو تجویز ایں امر نمودہ کہ ہمیں منشاء سرکار است۔ فقط

مراسلہ شوق مسٹر راجنسن صاحب اسسٹنٹ کمشنر یوسف زئی۔

جواب نواب صاحب امب

خط از نواب امب بخدمت اسسٹنٹ کمشنر مردان۔

مہربان دوستان جناب والا مراتب گرامی مناصب جناب اسسٹنٹ کمشنر بہادر یوسف زئی۔

بعد سلام و اشتیاق حصول ملاقات، خلاصہ ملتمسات اینکہ مولوی محمد اسرائیل بذریعہ مراسلہ حضور رسیدہ مضامین کلیہ از و معلوم شدہ الّا در امورے چند تردّدی بخاطرے بود۔ لہذا گزارش مے شود۔ اول۔ اینکہ ریاست ہذا متعلق بعلاقہ ہزارہ ہست۔ بلا اطلاع و بلا مصلحت صاحب ضلع بہادر ہزارہ در ہمچنیں امورات عظیمہ کارروائی و دست اندازی مناسب بنظر نمی آید۔ دوئم۔ تجویزات سابقہ جناب کرنل واٹر فیلڈ صاحب بہادر بعہد ڈپٹی کمشنری ہزارہ بوساطت ایں جانب و نیز قاضی میر عالم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہزارہ ایں بود کہ مجاہدین ہندستانے از مقام پلوسہ بہر صورت برخاستہ بطرف دیگر کردہ شوند۔ چنانچہ چند مرتبہ بصرف خرچ و مبلغات سعی طلب آمد ...... جرگہ حسن زئی شدہ حالا باز سعی اقامت ایشاں بمقام پلوسہ تجویز نمودن نہایت مشکل و دشوار است۔ مگر چونکہ ضرر در صورت برخاستن ایشاں از پلوسہ و اقامت بموضع سمستہ توجہ بآں طرف احتمال بلکہ یقین فساد ہائے زیادہ دست اندازی بعلاقہ یوسف زئی خواہد بود۔ بانتظام دفعہ آں فساد ہا البتہ ماندن ایشاں در پلوسہ بہتر است اگر حالا صورت پذیر شود۔ سوئم درمراسلہ مرسلہ حضور تحریر بود کہ دریں خصوص حکم صاحب

ضلع بہادر ہزارہ نیز نزد ایں جانب نخواہد رسید۔ چونکہ تاحال ہیچ حکم اجمالی و تفصیلی از صاحب ضلع بہادر ہزارہ نرسیدہ لہذا بذریعہ مراسلہ ہذا التماس ست کہ حضور حسب صوابدید رائے عالیہ خود بخدمت جناب صاحب ضلع بہادر ہزارہ بذریعہ تحریر انگریزی مشورت فرمودہ تاکہ جلد تر فقط ہمیں قدر حکم از صاحب ضلع بہادر ہزارہ برسد بدیں خلاصہ کہ چونکہ جناب صاحب اسسٹنٹ کمشنر بہادر یوسف زئی بکار یکہ محمد اسرائیل فرستادہ تجویزاں باید کرد تاکہ بہ تسلی و اطمینان در امورات محکومہ حضور تجویز مجوز شدہ ومن بعد ختم آں یا متصل شروع جرگہ بہمراہ محمد اسرائیل بہیک صورت مناسب روانہ خدمت عالیہ شود۔ فقط

مراسلہ شوقی نواب محمد اکرم خان صاحب بہادر والی امب ۵ راگست ۱۸۸۰ء

مہر

محمد اکرم خان

خط مرسلہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام کمشنر پشاور

مورخہ ۲۶ راگست ۱۸۸۰ء

فی الحال حسن زیوں نے ہندوستانیوں کو پلوسہ نہ چھوڑنے پر رضامند کرلیا ہے۔

ڈپٹی کمشنر پشاور کا خط کمشنر پشاور کے نام — مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۸۸۰ء

۱۔ ....

۲۔ ....

۳۔ اسسٹنٹ کمشنر مردان کو امازیوں کے ساتھ گفت وشنید کی اجازت دی جائے۔ محمد اسماعیل جو اس معاملہ کے لئے وکیل چنا گیا ہے۔ ایک اچھا آدمی ہے وہ ملا صاحب کوٹھہ کا بیٹا اور نواب امب کا بہنوئی (یا سالہ) ہے اس کے پچھلے حالات سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس واسطے ان کو یہاں مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر مردان نے مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کیا ہے۔ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۸۰ء

۱۔ امازئی ملا صاحب کوٹھہ کے مرید ہیں۔ لہذا ملا صاحب کا بیٹا اسرائیل امازیوں کو راہ راست پر لانے کے لئے موزوں آدمی ہے۔ امازئی مداخیل کو اس بات پر آمادہ کرلیں گے کہ وہ ہندوستانیوں کو پھر یہاں میں آنے نہ دیں۔ اور ساتھ ہی امازیوں کو بھی یہ کہہ دے گا کہ وہ علاقہ چیلہ میں ڈنڈر کا گاؤں بھی ہندوستانیوں کو ان کے دوست سیدوں کے کہنے پر نہ دیں۔

۲۔ ہندوستانیوں کو پلوسہ سے سمستہ جانے کے لئے مداخیلوں کے علاقہ سے گزرنا پڑتا ہے اور اس قوم پر نواب امب کا بہت اثر ہے لہذا وہ نواب صاحب کے حکم پر ان کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہیں دیں گے۔

محمد اسرائیل ساکنہ کوٹھہ کے خط مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۸۸۰ء کے انگریزی ترجمہ سے اردو ترجمہ بنام ڈپٹی کمشنر پشاور

خط ۱۔ میں آپ کی اطلاع کے لئے رپورٹ کرتا ہوں۔ کہ حسن زئی اور اکازئی قبیلوں نے ہندوستانیوں کو پلوسہ چھوڑنے پر راضی کرلیا ہے۔ اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ۱۴۰/ روپیہ بابت کرایہ مکانات وغیرہ جن میں ہندوستانی بستے ہیں اور ۱/۲ روپیہ بابت کرایہ فی جندر جو ہندوستانی استعمال کرتے ہیں نہیں لیں گے۔ ہندوستانی پلوسہ میں رہنا چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ مداخیلوں سے ڈرتے ہیں اور وہاں رہنے پر پس وپیش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں۔ کہ ان کے پلوسہ میں رہنے سے مداخیل خفا ہو جائیں گے۔ کیونکہ انہوں نے سمستہ رہنے کے لئے دیا ہے اور وہ یہ بھی وعدہ کرتے ہیں۔ کہ وہ ان کو کسی دعوت کے لئے بھی مجبور نہیں کریں گے۔ جس طرح وہ حسن زیوں کو دیتے رہے ہیں۔ اس کے بعد جو حالات رونما ہوں گے۔ اطلاع کروں گا۔

میرے سامنے جو مشکل ہندوستانیوں کو سمستہ نہ جانے دینے میں ہے۔ وہ صرف امازئی جرگہ کے درمیان بے اتفاقی ہے۔ امازئی قوم کے سرکردہ افراد کبھی ایک جگہ ہر ایک وقت میں جمع نہیں ہوتے۔ جب تک کہ ان میں اتفاق نہ ہو جائے۔ اس کام کے لئے ان کا پشاور میں بلایا جانا ہی بہتر ہے۔

اب میں پہاڑی علاقہ سے امب میں آگیا ہوں۔

خط ۲۔ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۸۰ء بنام ڈپٹی کمشنر پشاور از جانب محمد اسرائیل ساکن کوٹھہ

آپ کے خط مورخہ ۱ ستمبر ۱۸۸۰ء جو مجھے یہاں ۱۲ ستمبر ۱۸۸۰ء کو ملا۔ جواب کی دیری کے بارے میں عرض ذیل ہے۔

۱۔ یہ دیر رمضان کے مہینہ کی وجہ سے ہوئی کیونکہ اس مہینہ میں کوئی شخص بھی اپنے گھر سے باہر نہیں جاتا۔ لیکن میں مداخیل اور آمازئی کے لوگوں کے پاس گیا۔

۲۔ امازیوں کے خاندانوں کے اختلاف نے مجھے بہت تکلیف دی۔ اسی اثناء میں آپ کا حکم در بارہ لانے جرگہ اقوام مداخیل و امازئی ملا۔ ان دونوں اقوام کے جرگہ کا یک جا آنا بوجہ امازیوں کے خانگی اختلافات کے مشکل ہے۔ لیکن ان کے جرگوں نے ۱۵ ماہ حال کو میرے پاس امب آنے کا وعدہ کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ میں غلام خان اور اس کے قبیلہ کو تمام جرگہ کے آپ کے پاس آنے سے پہلے پیش کروں۔ کیونکہ اس میں گورنمنٹ کا فائدہ ہے۔ اگر مداخیل ۱۵ کو آگئے تو میں ان کو اپنے ساتھ لاؤں گا۔ اگر وہ نہ آسکے

تو میں اکیلا ان کے انتظار کے بغیر آپ کے پاس آجاؤں گا اتنی دیر محض رمضان اور ان کے خانگی جھگڑے اور قتل مقاتلہ کی وجہ سے ہوئی۔ ان دنوں میں بھی ایک

حملہ کا خطرہ ہے۔ میں اس امر کی بہت کوشش کر رہا ہوں کہ میں ایک جرگہ ہی ساتھ لے اؤں۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو حملہ کا خطرہ میں امید کرتا ہوں رک جائے گا۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا خط بنام کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور ڈویژن مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۸۰ء

آخر کار نواب امب سے جواب لینے میں مَیں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور قاضی میر عالم کی رپورٹ بابت نقل و حرکت ہندوستانیاں پلوسہ بھیج رہا ہوں۔ نواب امب کا جواب قاضی میر عالم کی رپورٹ کی تائید کرتا ہے۔

۲۔ میں اس سے اس بات میں متفق ہوں کہ ہندوستانیوں کی قوت فساد انگیزی طاقت کا تناسب عین اس کے مطابق ہے۔ کہ جتنی اہمیت عام لوگوں کے خیال میں حکومت ان کو دیتی ہے۔ اب حکومت جتنی کوشش ہندوستانیوں کی نقل و حرکت کو روکنے کے لئے کرے گی۔ اتنی ہی ان کی ہر دلعزیزی اور اثر زیادہ ہو گا۔ اور اتنی ہی قبائل کو شرارت کرنے کا موقع ملے گا۔

قاضی میر عالم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی رپورٹ کے انگریزی ترجمہ سے اُردو کا ترجمہ یہ ہے یہ رپورٹ ہندوستانیوں کے پلوسہ کو چھوڑنے اور سمستہ میں آباد ہونے کے متعلق ہے۔

۱۔ سمستہ مداخیل کا گاؤں ہے۔ اور بُنیر کی سرحد پر ہے یہ یوسف زیوں کے ملک سے تقریباً دو دن کے فاصلے پر ہے۔

۲۔ ہندوستانیوں کی نقل مکانی کی وجہ یہ ہے کہ جب حسن زیوں نے ۱۸۵۸ء میں نواب امب کے علاقہ پر حملہ کیا تو انہوں نے ہندوستانیوں سے مدد مانگی۔ ہندوستانیوں نے مدد دینے سے انکار کیا۔ پھر جب فیروز خان نے احمد علی خان کو قتل کیا تو حسن زیوں نے ہندوستانیوں کو کہا کہ وہ فیروز خان کو اپنے قلعہ میں رکھیں اور مداخیلوں سے بچائیں تو اس پر بھی انہوں نے انکار کیا۔

۳۔ اب حسن زیوں کو یہ کہنا کہ وہ ہندوستانیوں کو پلوسہ ہی میں رکھیں یا مداخیلوں کو کہنا کہ وہ ان کو سمستہ میں رہنے نہ دیں۔ قرین صواب نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ دونوں فریق ایسے کسی حکم کو نہیں مانیں گے کیونکہ ہندوستانی ان کے ساتھ مدت سے رہتے ہیں۔ ایسے احکام اگر دئے گئے اور وہ نہ مانے گئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ حکومت کے احکام نہیں مانے گئے۔ اور اگر ان کو پرائیویٹ طور اس کام کے لئے کہا جائے تو یہ ان کو اپنی طاقت کے جو وہ حکومت کی امداد میں صرف کر سکتے ہیں گھمنڈ میں ڈال دے گا۔ اور ان کے لئے مزید انعامات مانگنے کا راستہ کھول دے گا۔ جو وہ ہر معمولی بات کے لئے مانگیں گے۔ اور پھر جب ایک دفعہ یہ عادت ان کو پڑ گئی تو ان کو واپس کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہندوستانیوں

کی اہمیت کی کمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی تک کسی قوم نے ان کو دوامی طور پہ جائے رہائش نہیں دی اگر اب وہ حسن زیوں کے ساتھ اتحاد و معاہدہ کی رو سے ایک دوامی جائے رہائش حاصل کر لیں تو وہ بہت طاقت ور ہو جائیں گے۔

۴۔ جب تک حکومت ہندوستانیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی۔ علاقہ غیر کے لوگ ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جب گورنمنٹ توجہ زیادہ کرتی ہے تو آزاد قبائل میں ان کا وقار بڑھ جاتا ہے کیونکہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ ہندوستانیوں سے ڈرتی ہے۔

۵۔ اس خیال کو کہ ہندوستانیوں کے سمستہ کو چلے جانے میں یوسف زئی اور بنیر کی سرحدوں پر نقصان کا احتمال ہے۔ دل میں نہ لانا چاہئے۔ کیونکہ ہندوستانی قتل و غارت کے عادی نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کا رویہ ہمارے خلاف ہے اور وہ لوگوں کو حکومت کے خلاف اُکساتے رہتے ہیں۔ تاہم یہ روشن ہے کہ ان کی ایسی کوششوں کا مقابلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

پلوسہ اگرور کے نزدیک ہے اور نواب کے علاقہ میں ہے۔ اور سمستہ یوسف زئی کے علاقہ سے دو دن کی مسافت پر ہے۔ اور اگرچہ ہندوستانی نجی گڑھ واقع بنیر میں ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۸ء تک رہے۔ لیکن بُنیر والوں کو اُن کے نکالنے پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔ لیکن جب وہ حسن زیوں کے پاس جا کر مقیم ہوئے تو ان کو وہاں سے مار کر نکال دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بنیر وال آسانی سے وہابیوں کے نکالنے پر آمادہ نہیں کئے جا سکتے۔

۶۔ حسن زئی نواب کی خواہش پر عمل نہیں کریں گے۔ مداخیل یقیناً اس کے قبضہ اختیار میں ہیں۔ لیکن میری (قاضی میر عالم کی) رائے میں نواب ہندوستانیوں کے اس علاقہ سے چلے جانے پر خوش ہو گا۔ کیونکہ ان کا پلوسہ میں رہنا اس کے لئے ہمیشہ سخت پریشانی کا باعث رہتا ہے۔

۷۔ آج کی زبانی رپورٹ از شاہ ولی حسن زئی سے معلوم ہوا کہ کچھ ہندوستانی سمستہ چلے گئے ہیں۔ اور اب اس جگہ پر تیس آدمی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ حسن زیوں نے ان کو یہاں ہی اپنی جگہ پر حسب سابق پلوسہ میں رہنے کی ہمت افزائی کی ہے۔ لیکن نعیم (یا نام) خان اکازئی کے پیغام کے بموجب کوئی یقینی اقدام ہندوستانیوں کی جائے رہائش کے متعلق ابھی تک نہیں کیا گیا۔

اسسٹنٹ کمشنر مردان کا خط بنام کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور ڈویژن مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۸۰ء

منگل تھانہ کے سید میری ملاقات کو آئے اُن سے اور دیگر ذرائع سے جو اطلاع مجھے منڈی، ستھانہ

اور کھبل کے سیاسی حالات کے متعلق معلوم ہوئی ہے آپ کی اطلاع اور دلچسپی کے لئے تحریر کرتا ہوں۔

سید مبارک شاہ ساکن ملکہ کی وفات پر اس کے تین بہت چھوٹے بیٹے رہ گئے اس کا ستھانہ اور منڈی کی سیری کی زمینوں کی پیداوار میں حصہ تھا۔ اور وہاں پر اس کا چچا زاد پسران سید عمر رہتے تھے۔ سید مبارک شاہ کی وفات پر سید عمر کے لڑکے اس بہانہ پر کہ وہاں کی جائداد کی حفاظت کریں ملکہ میں جاکر آباد ہو گئے۔ چھوٹے بچے ان سے تنگ ہو گئے۔ اور امازیوں سے درخواست کی کہ سید عمر کے لڑکوں کو ملکہ سے نکال دیں۔ اس پر سید عمر کے لڑکے واپس منڈی اور گو بٹی آ گئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے مبارک شاہ کے لڑکوں کو منڈی کی جائداد کا کچھ حصہ پیداوار نہ دیا۔ اس پر خاندانی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس موسم بہار میں فیروز شاہ نے سید عمر کے لڑکے شاہ حسین کو قتل کر دیا۔

اس قتل سے پہلے یا بعد یہ مجھے معلوم نہیں۔ ڈو السد (یا ڈولیا) غلام خیل ولد علی خان غلام خیل ساکن مورتی اور کھبل ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو سید مبارک شاہ کے لڑکوں کی امداد کی درخواست کی۔ کہ وہ منڈی والوں کو تنبیہ کرے کہ وہ فیروز شاہ کو سیری کی آمدنی کا حصہ دے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ درخواست نامنظور کر دی یا دلچسپی نہ لی۔ بہرحال ڈولیا یہ سمجھا کہ حکومت فیروز شاہ کے ارتکاب قتل پر کوئی اعتراض نہ کرے گی۔ ڈولیا نے ڈپٹی کمشنر کو اس بات سے بھی آگاہ کیا۔ کہ شیر حسین منڈی کی سیری میں ایک قلعہ بنا رہا ہے۔ ڈولیا نے فیروز شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ منڈی آکر اپنے تنازع کا خود فیصلہ کرے اور اس نے ایسا کیا۔ فیروز شاہ نے رات کے وقت منڈی پر حملہ کیا اور شیر حسین شاہ رسول اور آٹھ دس سیدوں اور دیگر افراد کو قتل کر دیا۔ اب سید عمر کی اولاد سے صرف دو آدمی رہتے ہیں یعنی شاہ رسول کا چھوٹا بھائی جو سید عمر کا پوتا ہے اور شیر حسین کا چھوٹا لڑکا۔ یہ دونوں چھوٹے بچے اور ایک یا دونوں ہی اپنی حفاظت کی خاطر دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر چلے گئے ہیں۔ ڈولیا کے اس معاملہ میں دخل دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا باپ علی خان ساکن مورتی فیروز شاہ کا ماموں ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز شاہ نے بھڑوں کا چھتہ اپنے کانوں کے پاس بنا لیا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے قلعہ واقع ملکہ کو ضرورت کے لئے مضبوط کر رہا ہے۔ سب امازئی اس سے خفا ہیں۔ گدون اور مقتول سیدوں کے رشتہ دار علاقہ میں پھر کر امازیوں اور گدونوں کو فیروز شاہ پر حملہ کرنے کے لئے اشتعال دے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ فیروز شاہ کا اثر و رسوخ اب ختم ہو چکا ہے۔ اس واسطے اس وقت ہمارا اس کو بلا کر اس سے استدعا کرنا کہ وہ اپنا اثر و رسوخ (جو اب صفر ہے) استعمال کر کے ہندوستانیوں کو پلوسہ سے جانے سے روک دے۔

غلط ہو گا۔ اگر بعد میں ہمیں اس کی ضرورت ہوئی تو اس کو عبید شاہ ساکن منگل تھانہ کے ذریعہ بلایا جا سکتا ہے۔ اس وقت فیروز شاہ پر کوئی مہربانی بھی مہاجرین کی اقوام کو ناراض اور مشتعل کر دے گی۔

ڈپٹی کمشنر پشاور کی رپورٹ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۸۱ء بنام کمشنر پشاور

بجواب آپ کے خط مورخہ ۹ اپریل ۱۸۸۱ء رپورٹ کرتا ہوں۔ کہ ستھانہ ایک غیر آباد خشک پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔ جس کو ہندوستانی اپنی مستقل رہائش کے لئے نہیں چاہتے وہ یہاں پر ایک دستہ فی الحال رکھنا چاہتے ہیں کہ ان کو اس وقت اور کوئی اچھی جگہ نہیں مل سکتی۔ ان کا مقصد حسن زیوں کو جان کو تنگ کر رہے ہیں یہ ہے کہ وہ ان کو دکھا سکیں۔ کہ وہ صرف پلوسہ ہی پر انحصار نہیں رکھتے۔ ستھانہ ایک مرکزی جگہ ہے۔ جہاں مولوی صاحبان اپنا اثر و رسوخ بنیر اور چھلہ کے علاقہ میں آہستہ آہستہ بڑھا سکتے ہیں۔ اور پھر تھوڑے عرصہ کے بعد اس جگہ سے ملکہ میں چلے جائیں یا چھلہ میں کسی اور جگہ پر چلے جائیں۔ مثلاً بٹ سیری یا امبیلہ۔ امازئی اور مداخیل مجھے یقین دلاتے ہیں۔ کہ وہ موقع ملتے ہی ہندوستانیوں کو ستھانہ سے نکال دیں گے۔ لیکن وہ یہ کام مشکل سے کر سکیں گے۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو ہر طرح سے مداخیلوں کو جتلا دینا چاہئے کہ ہم ہر قیمت پر بھی ہندوستانیوں کو ستھانہ سے نکال دیں گے۔ اور ان کو اس سرحد پر پلوسہ سے اس طرف نہیں چھوڑیں گے۔

پشاور سے ایک شخص نے اپنے خط مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۸۲ء میں سکرٹری گورنمنٹ پنجاب کو اطلاع دی ہے کہ بنگالی مجاہدین ساکن ملکہ، ستھانہ اور پلوسہ نے سوات اور بنیر میں خبر بھیجی ہے کہ وہ بندوق (توڑے دار) اور ان کی ٹوپیاں جس مقدار میں ضرورت ہو قیمتاً دے سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ خریدنے کے لئے ان کے پاس جاتے ہیں۔ مجاہدین بندوقیں اور ٹوپیاں خود بناتے ہیں۔

خان بہادر راجہ جہانداد خان اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہزارہ کی رپورٹ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۸۸۳ء جو اس نے مولوی فیض اللہ ساکن شکری کی معرفت سے حاصل کی۔ کا خلاصہ کرنل ہسٹینگز ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے مسٹر کارڈی کمشنر پشاور کو بھیجی۔

انگریزی رپورٹ کا ترجمہ حکومت پلوسہ کے ہندوستانیوں کے حالات سے پہلے ہی باخبر ہے۔ میں صرف چند کلمات ہی اس پر اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستانی دریائے سندھ کے کنارے پلوسہ کے مقام پر ایک کچے مٹی کے قلعے میں رہتے ہیں۔ اس قلعہ کے اندر خام جھونپڑیاں مثل زمینداران اس پہاڑ کے ہیں۔ قلعہ کا دروازہ لکڑی کا ہے جس پر ہر وقت پہرہ رہتا ہے۔

۲۔ پلوسہ دربند سے بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور اس کی سڑک دریائے سندھ کے کنارے پر سے

جاتی ہے۔ اگرچہ یہ سڑک پہاڑی ہے لیکن اس میں بہت نشیب وفراز نہیں ہیں۔ سامان سے لدی خچریں اس پر جاسکتی ہیں۔ دریا سے پار لوگ لٹھوں کے ذریعہ BY RAFT سے جاتے ہیں۔ یہاں کشتیاں نہیں ہیں۔ اور نہ استعمال ہی ہوسکتی ہیں۔

۳- ہندوستانی سرحدی قبائل کے درمیان رہتے ہیں۔ اور ان کے مراسم اکازئی۔ چغرزئی۔ مداخیل، حسن زئی سے اور باشندگان سوات اور بنیر سے بھی دوستانہ ہیں۔ پلوسہ حسن زئیوں کے علاقہ میں ہے۔

۴- ہندوستانیوں کا آج تک افغانوں پر اثر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کا امیر وہابی ہے۔ اور چونکہ اخون صاحب سوات کا افغانوں پر بہت اثر تھا اور وہ ان کا (ہندوستانیوں کا) سخت دشمن تھا۔ لہذا افغان ان سے متاثر نہ ہوئے۔ اب ہندوستانی وہابیوں کے ان طور طریقوں کو چھوڑ رہے ہیں۔ جن کو افغان قبول نہیں کرتے۔

۵- ان اقوام نے ہندوستانیوں کو کوئی امداد نہیں دی۔ سوا اس کے کہ ان کو قیمتاً غلہ خریدنے کی اجازت دی۔ یہ خرید و فروخت کنارکے ہندوؤں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

۶- پلوسہ میں ہندوستانیوں کی آبادی قریباً چھ سو مردوں پر مشتمل ہے۔ جن میں تقسیم کے لحاظ سے سات جمعیتیں یا کمپنیاں ہیں۔ ۵ جمعیتیں بنگالیوں کی ایک دہلی اور سرحدی صوبہ کی اور ایک پنجابیوں (جو پنجاب اور تناول کے لوگ ہیں) کی ہے۔

ہر ہندوستانی (بنگالی) جمعیت میں ۷۰ آدمی اور دوسری جمعیتوں میں سو سو آدمی ہوتے ہیں لیکن بعض ان جمعیتوں میں پوری تعداد سو کی بھی ہے۔ کل شادی شدہ خاندانوں کی تعداد چالیس ہے۔

۷- ان کو اپنے امیر سے کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ بلکہ ان کو ایک سیر آٹا روزانہ فی آدمی ملتا ہے اور ہفتہ کے لئے ایک دفعہ دال اور نمک ملتا ہے۔

۸- ان کے پاس چالیس خچر اور پچیس گھوڑے ہیں۔

۹- ہر ایک آدمی کے پاس ایک توڑے دار بندوق یا رائفل ایک تلوار اور بعضوں کے پاس ڈھال بھی ہے۔ رائفلیں عموماً انگریزی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے پاس تقریباً دو ہزار آدمیوں کے لئے مزید اسلحہ ہے ان کے پاس ایک (ONE PIECE OF ORDNANC) (توپخانہ) اور چھ لکڑی کی توپیں ہیں۔ جن پر چمڑا چڑھا ہوا ہے (چمڑا کا توپ)

۱۰- وہ اپنا بارود خود بناتے ہیں۔ دو ماہ ہوتے ہیں۔ کہ انہوں نے مبلغ اسی روپیہ کا بارود دربند سے خریدا۔

۱۱- وہ بندوق کی ٹوپیاں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔

کچھ عرصہ ہوا۔ انہوں نے ہندوستان سے ایک لوہے کی مشین منگوائی جو کہ ایک دفعہ دس ٹوپیاں بنا سکتی ہے لیکن وہ پھٹنے کا مرکب (DETONING COMPOSITION) بنانے میں ناکام ہے۔

۱۲- جو آدمی ہندوستانیوں کی بنی ہوئی بندوق کی ٹوپیوں کے لانے کے لئے بھیجا گیا وہ یہ نہ لا سکا۔

۱۳- ان کے پاس بندوق کی ٹوپیوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے ان میں سے بہت سی انہوں نے کابل کی جنگ کے دوران حاصل کیں۔ وہ اپنے کارتوس خود بناتے ہیں۔ اور ان کے پاس ان کا بڑا ذخیرہ ہے دو تین سال کے بعد وہ ان کو توڑ کر پھر نئے سرے سے بناتے ہیں۔

۱۴- وہ بندوقیں مرمت کر سکتے ہیں اور نئے (پرانے) پارٹ لگا سکتے ہیں۔ اور چمڑے سے ہر قسم کی چیز بنا سکتے ہیں۔ ان کے پاس BREACH LOADING نہیں ہیں۔ اور نہ ہی وہ اس وقت تک یہ بنا سکے ہیں۔ لیکن اس کی وہ کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے دو بنگالی لوہار ہیں جو بندوقیں بناتے ہیں ان میں سے ایک ابھی پھر ہندوستان مزید کام سیکھنے کے لئے گیا ہوا ہے۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام کمشنر پشاور مورخہ ۲۸ اپریل ۱۸۹۳ء

۱- مجاہدین پلوسہ کے متعلق رپورٹ جو خفیہ آدمیوں کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہیں ارسال ہے۔

۲- پلوسہ (پلوسی) حسن زیوں کا گاؤں ہے۔ جو کہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے کے موڑ پر واقع ہے۔ کرپلیاں کی پوسٹ سے بارہ تیرہ اور دربند سے دس میل پر ہے۔

۳- اس کی سڑک بڑی خراب ہے اور دربند سے دریا کے بائیں کنارے امب سے ہوتی ہوئی مریڑی گاؤں جو حسن زیوں کا ہے کے سامنے ختم ہوتی ہے۔ یہ راستہ ۵ میل لمبا ہے۔ مریڑی دریا کے دائیں کنارے پر ہے یہاں پر دریا کو ایک لکڑی کے ذریعہ پار کیا جاتا ہے۔ یہ جالا (لکڑی کا) دو درختوں کے تنوں سے جن کو ایک طرف سے کھوکھلا کیا ہوا ہوتا ہے، بنایا جاتا ہے۔ ان دونوں کو اکٹھا باندھ کر اُلٹا (یعنی کھدا ہوا جانب دریا میں) میں ڈالا جاتا ہے جس طرح کہ کشتی کو الٹا دریا میں ڈالا جائے ان دو کے اوپر ایک لکڑی کا تختہ جڑا ہوا - شل پلیٹ فارم ہوتا ہے گرمیوں میں ان کے ساتھ ہوا سے بھری ہوئی کھالیں (جن کو شناہ کہتے ہیں) بھی باندھی جاتی ہیں۔ یا ان کھالوں پر ہی دریا پار کرتے ہیں۔ مریڑی کے پاس سڑک دریا سے ہٹ جاتی ہے اور پھر ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے گزرتی ہے اس چوٹی سے آگے اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ ہندوستانیوں کی آبادی کو چلی جاتی ہے اور دوسری گڑھی میدان اور پلوسی کے گاؤں کو چلی جاتی ہے۔

۴- پہاڑ کی چوٹی جس پر سے مریڑی کی سڑک گزرتی ہے اور اس چوٹی سے جس پر گڑھی

میدان اور پلوسی کی سڑک جاتی ہے۔ ان سے نیچے اور زد پر ہندوستانیوں کا قلعہ ہے۔ قلعہ کا جنوب مشرقی کونہ دریا سے تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ہے۔

۵۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعہ ایک مربع کی شکل کا احاطہ ہے جس کے چاروں طرف چھ فٹ چوڑی اور پندرہ فٹ اونچی دیوار ہے۔ اور یہ پتھر اور چونے سے بنی ہوئی ہیں۔ اس مربع کی ہر طرف تقریباً سو گز ہے۔ قلعہ کے ہر کونے پر ایک گول بُرج ہے جو دیوار سے بھی پانچ فٹ بلند ہے برج اور دیواروں پر سنتریوں کے اندر کھڑا ہونے کے لئے منڈھیر کی دیوار ہے اور ان میں سوراخ ہیں۔ قلعہ کی دیواروں کے ساتھ اندرونی طرف سپاہیوں کی بارکیں اور افسروں کے لئے گھر ہیں۔

امیر اور مولویوں کے خاندانوں کو قلعہ کے اندر رہنے کی اجازت ہے۔ اور ان کے لئے خاص مکانات ہیں۔ شمالی اور جنوبی دیواروں میں دو لکڑی کے دروازے ہیں۔ جنوبی دروازہ دریا اور مریڑی کی سڑک کی طرف ہے۔ شمالی دروازہ پلوسی اور گرڈھی میدان کی طرف ہے۔

۶۔ قلعہ کے باہر مشرقی دیوار کے ساتھ گھوڑوں اور خچروں کے اصطبل ہیں۔ ان کی حفاظت کے لئے دو توپیں عین بائیں طرف اور شمال مشرقی برج کے باہر لگی ہوئی ہیں۔ ان توپوں کا رخ پلوسی کے گاؤں کی طرف ہے۔ جنوبی دروازہ اور دریا کے درمیان مشرقی جانب پر ورزش گاہ اور مغربی جانب پریڈ کا میدان ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک عارضی مسجد ہے۔ مسجد اور قلعہ کے درمیان ایک گھڑیال آویزاں ہے جس پر گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔ شمالی دروازہ اور موضع گرڈھی میدان کے درمیان شادی شدہ لوگوں کے مکانات ہیں۔ یہ بالکل غیر محفوظ ہیں۔

۷۔ ہندوستانیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنی بہت مشکل ہے۔ پیادہ فوج جن کے پاس (منہ کی طرف سے بھری جانے والی بندوق) ہیں ان کی تعداد اس وقت ۵۰۰ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ جو کمپنیوں یا جمیعتوں میں تقسیم ہیں۔ ان کے علاوہ ایک محکمہ رسل و رسائل (محکمہ نقل و حمل) ہے اور دو توپوں کا نصف توپ خانہ ہے۔ ان توپوں کے دہانہ کے ناپ معلوم نہ ہو سکا۔

۸۔ ہندوستانیوں کے پاس نہ کوئی زمین ہے اور نہ مویشی۔ اور نہ ہی کوئی صنعت و حرفت اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ آمدنی۔ ان کو روپیہ ہندوستان سے آتا ہے۔ اور اپنے لئے سامان ضرورت وہ ارد گرد کے علاقہ سے خریدتے ہیں۔ ان کے آدمیوں کے گروہ باقاعدہ روپیہ کے لئے ہندوستان بھیجے جاتے ہیں۔ اور ان کی امداد تمام راستہ پر برطانوی رعایا کرتی ہے۔ اس ضلع میں مجاہدین کا بارسوخ مختار مولوی حیات گل ساکن ہری پور ہے جو راجہ جہانداد خان اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہزارہ کا بہنوئی ہے

میں نے نہ کبھی سنا اور نہ ہی یقین کرتا ہوں۔ کہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر خود بھی اپنے بہنوئی کے غدارانہ رویہ میں شامل ہے۔ ایک اور طاقتور آدمی جس کے متعلق رپورٹ کی جاتی ہے کہ مجاہدین کا ایجنٹ ہے۔ وہ نواب[۱] علی خان ترین ساکن درویش ہے۔ ایک اور مولوی محمد شاہ ساکن ڈھینڈہ علاقہ ہری پور ہے۔ ان کے علاوہ اور لیکن کم معلوم آدمی میر زمان اور محب اللہ ساکن چندور علاقہ کرپلیاں میر جمال حجام میر عالم ساکن کچھی ہیں۔

مجاہدین کے لئے جو لوگ روپیہ لے جاتے ہیں ان میں ایک عورت بہت مشہور ہے جس کا نام ایمانؔ ہے۔ اس نے اب یہ راستہ (یعنی ضلع ہزارہ والا۔ ش ب) چھوڑ دیا ہے۔ پشاور کا راستہ اختیار کر لیا ہے کیونکہ یہاں ایک شخص مسمی ڈگو ساکن نواپاؤں (NAWA PAON) نے اس کا راز فاش کر دیا تھا۔ ایک اور شخص جو مولوی ہے اور کنہار (غالباً کنڑ) کا فقیر کے نام سے مشہور ہے یہ کام کرتا ہے۔

۹۔ فقیر کنہار کے خط کا جو فارسی میں ہے۔ انگریزی ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔ یہ خط اس نے اپنے دوستوں کو جو در بند میں تھے۔ جودھ پور سے لکھا تھا۔ جب کہ یہ فقیر اپنے سفر میں چندہ جمع کرتے ہوئے وہاں پہنچا۔ یہ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں اور مجاہدین کے درمیان خط و کتابت خفیہ تحریر سے ہوتی تھی (اس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔ ش ب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ جس کا شکر واجب اور اس کے نبی پر صلوۃ میرے دوستوں کو بعد از سلام دعا واضح ہو کہ میں حسب ذیل اطلاع دینی چاہتا ہوں۔ میر احمد اس مخلص کو جودھ پور لے گیا۔ وہ میرے ساتھ مہربانی و اخلاص سے پیش آتا ہے اور جانے نہیں دیتا۔ میں بمبئی پہنچتے ہی بخار اور کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔ اور ابھی تک یہ تکلیف ہے۔ یہاں پر ایک ڈاکٹر نے مجھے دوا دی جس سے مجھے کچھ فائدہ ہوا مجھے اور دوا کی ضرورت ہے۔ اور خدا کے فضل سے میں امید کرتا ہوں کہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔ خدا کو منظور رہو میں نے نکی کو بمبئی سے شریف اللہ اور عبد الغنی کے پیچھے بھیجا ہے۔ اور خط بھی لکھا ہے اکرم خان ادھر ہے اور میں نے اس کو بھی لکھا ہے کہ وہ ان کے پیچھے جاوے جو کچھ خدا کو منظور ہو گا وہ ہو جائے گا۔ اگر دوا اچھی ہوئی تو میں چند دن اور یہاں ٹھہروں گا۔ نہیں تو گھر آجاؤں گا مزید یہ کہ نہر کے نیچے کیلئے کاشت کریں جہاں تک کہ پانی بہتا ہے جس کو بادام کہتے ہیں اور باغ میں

---

[۱] نواب علی خان کا شجرہ نسب قوم ترین موضع درویش میں دیا گیا ہے۔

گنّا کاشت کریں۔ اور کیلے جو میں نے پچھلے سال توت کے درخت کے نیچے چھوٹے سے قطعہ زمین میں رکھے تھے اس جگہ سے کراں کو نہر کے نیچے لگا دیں۔ غنی کو اس کے ذلیل تین سو روپیہ دے دیں اور جھونپڑی کے متعلق، اگر وہ مجھے پیداوار کا تیسرا حصہ دے یا چالیس روپیہ تو یہ اس کو لینے دیں نہیں تو یہ جھونپڑی کسی اور کو دے دیں۔ فیروز خان اور غلام قادر پسران غلام خان کے ذمے جو روپے ہیں وہ ضرور وصول کر لیویں۔ میرے دوستوں اور میر احمد خان کو سلام و دعا قبول ہو۔ محمد سید بلند خدا تم کو لمبی زندگی اپنی خدمت کے لئے عطا کرے۔ اس سلام و دعا کے بعد واضح ہو کہ چھوٹے خرمانیوں کے درختوں کو جو کہ توت کے نیچے ہیں۔ ان کو اکھاڑ کر کسی اور جگہ پر لگانا ہے۔ اور توت کی شاخ تراشی کرنی ہے۔

۲۔ اس خط کے لفافہ پر تاریخ ۲۳ رجمادی الاول ۱۳۰۰ھ (۱۷ مارچ ۱۸۸۳ء) درج ہے جو ماہ اپریل کے قریب ہے۔ سال کے اس موسم اور وقت پر نہ ہی درختوں کی شاخ تراشی کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کو اکھاڑ کر دوسری جگہ پر لگایا جاتا ہے۔ دوا کا اشارہ بھی شک و شبہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس کا مطلب شاید روپیہ ہو۔ اسی طرح خط میں اور الفاظ بھی ایسے ہیں جن کے مخفی معنی معلوم ہوتے ہیں۔

ڈپٹی کمشنر پشاور بنام کمشنر سپرنٹنڈنٹ پشاور ڈویژن مورخہ ۹ راگست ۱۸۸۳ء

پولیس سرجنٹ فیض علی از صوابی کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص مسمی حاجی شیخ ساکن جالندھر چھاؤنی نے اپنے نوکر کریم کو براہ چکپل غیر علاقہ کو، ۸ بندوق کی ٹوپیاں برائے مولوی عبدالحق امیر مجاہدین پلوسہ دے کر روانہ کیا ہے اور مفتی غیّور جو پہلے پشاور سے مفرور ہوا تھا اور مولوی عبدالحق کا وزیر ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ وہ پشاور چھاؤنی جائے اور مسمی ہیرالال سے نوٹ حاصل کرے۔ خط میں مزید یہ لکھا ہوا ہے کہ ہندوستانی شمسہ تپہ امازئی اور پلوسہ میں رہتے ہیں۔ اور یہ افواہ ہے کہ جہانداد خان جو مقرب خان پنج تار والے کا رشتہ دار ہے۔ ان کو چملہ میں آباد کرنا چاہتا ہے لیکن مقرب خان اس بات کے مخالف ہے۔ کیونکہ اس سے اس کی حیثیت کم ہو جائے گی۔

آزاد خان ساکن طوطیالی کے بیان مورخہ یکم مارچ ۱۸۸۳ء سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ فیروز شاہ ساکن ملکہ کی امازئی کے لوگوں کے ساتھ بدلا ہے اس نے مولوی عبداللہ کو ملکہ لانے کے لئے امازیوں سے اجازت مانگی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس سے اس کا مطلب اپنی طاقت بڑھانا تھا۔ تاکہ وہ اپنے دشمنوں (یعنی امازیوں) کو تنگ کر سکے۔ امازیوں نے ملکہ کو جلانے کے لئے

حملہ کر دیا لیکن فیروز شاہ نے دو سو روپیہ دے کر ملکہ کو بچا لیا۔

اسسٹنٹ کمشنر مردان کے خط بنام ڈپٹی کمشنر پشاور مورخہ ۲۷ ردسمبر ۱۸۸۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے چملہ آنے کا مقصد وہاں پر رہنے کے لئے اجازت مانگنا تھا۔ لیکن نورزئی بنیر والوں نے اگرچہ ظاہراً انکار نہیں کیا۔ لیکن اجازت بھی نہیں دی۔ چملہ میں آنے پر ان کی خاص مدارات کی گئی۔ یہاں آنے سے پہلے ان کا نامہ و پیام بنیر کے ملکوں اور میاں گل صاحب ساکن سوات سے تھا۔

نواب امب کی رپورٹ مورخہ ۲۰ رجنوری ۱۸۸۴ء

کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور کے نام

ہندوستانی جہاد کا اعلان کرنے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن مولوی عبداللہ انکاری ہے وہ کہتا ہے کہ جب تک حسن زئی اور دوسرے قبائل آمادہ امداد نہ ہوں۔ جہاد کا اعلان نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی نے اپنا بھائی چملہ کے لوگوں کے پاس رہائش کی جگہ حاصل کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ بنیر کے لوگوں کی منظوری بھی حاصل کی جائے۔ مولوی نے اپنے بھائی کو واپس بلا لیا ہے۔ اور اب خود موسم بہار میں چملہ اس غرض کے لئے جائے گا۔ ہندوستانیوں کے درمیان کچھ نا چاقی ہو گئی ہے اور تقریباً ایک تہائی الگ ہو کر حسن زیوں کے گاؤں میں رہتے ہیں۔

نواب امب کی خواہش ہے کہ ہندوستانیوں کو پلوسہ سے ہٹایا جائے۔ لیکن کمشنر کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ پلوسہ ہی میں رہیں۔ مورخہ ۱۰ رجون ۱۸۸۴ء

کمشنر پشاور نے خادی خان مدا خیل کی سفارش پر مفتی محمد حسن ساکن پشاور کو غیر علاقہ سے واپس گھر آجانے کی اجازت دے دی ہے۔ مورخہ ۷ رنومبر ۱۸۸۴ء

مولوی عبداللہ صاحب کا خط محررہ پلوسی ۱۰ رشعبان ۱۳۰۰ھ (مطابق ۱۶ رجون ۱۸۸۳ء) کو بھیجا۔ اس کے انگریزی ترجمہ سے میں نے اردو میں ترجمہ کیا۔

نوٹ:- یہ مولوی عبداللہ امیر مجاہدین کے پاس رہا اور دو خطان کی جانب اس کے ہاتھ سے نواب امب کو لکھے گئے تھے۔

بعد سلام واضح ہو کہ ہم نے انگریزوں کی رعایا خواہ ہندو ہو یا مسلمان کے مال و نقدی کی کبھی بھی حرص نہیں کی۔ بہت سے لوگ یہ مال لائے لیکن ہم نے اس خیال سے کہ یہ غریبوں کا مال ہے۔ اور اس کو لینا کمینگی، انکار کر دیا۔ ہاں اگر ہمارا ہاتھ انگریزوں کے مال پر جائے تو ہم اس کو لے لیتے ہیں۔ کیونکہ انگریزوں نے ہمیں، ہماری زندگی، ہمارے حقوق، ہماری عزت ہمارے مال متاع کو بغیر کسی وجہ اور خلاف قانون اقوام عالم کے تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اگر اس امر کی تفتیش کی جائے تو ہم ثابت کر دیں گے کہ انگریزی رعایا نے ہمارا مال و متاع جبراً چھین لیا ہے۔ اور باوجود بہت دفعہ کے اصرار کے انہوں نے واپس نہیں کیا لہٰذا مجبور ہو کر اپنے آدمی کو بھیج کر انگریزی رعایا کا مال لے آنے کا فیصلہ اپنے غصب شدہ مال کے تاوان پورا کرنے کے لئے کیا۔ خواہ یہ مال ہندو کا ہے یا مسلمان کا۔

ہمارا سامان جو اس طرح لوگوں نے دبا لیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ لبشن داس ہندو ساکن ٹوپی کے ذمے بروئے حساب پانچ ہزار بقایا ہے۔

۲۔ بہادر خان ساکن جھنڈا بو کر نے شارع عام پر ہمارے آدمی سے تین ہزار روپے لوٹ لئے ہیں ہم نے بہت دفعہ خطوط لکھے اور پھر اپنے آدمی ان کی طرف بھیجے لیکن وہ روپے نہیں دیتے اور ہم اب مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ ہم اپنا تاوان بدلے کے طور پر انگریزی رعایا سے وصول کرنے کے لئے اس وقت تک حملے کریں جب تک یہ پورا نہ ہو جائے۔ اب ہم انگریز افسر کو لکھتے ہیں کہ اگر ان کو اپنی رعایا کا مال عزیز ہے تو وہ متذکرہ بالا اشخاص سے ہمارا وصول کر کے ہمیں بھیج دیں۔ اگر وہ اس سے انکار کریں تو ان کو نواب محمد اکرم خان والی امب کے پاس دربند بھیج دیں تاکہ وہ ہمارے سامنے اس معاملہ کا فیصلہ کریں۔ ان کو اپنی جان کے متعلق ہم سے کوئی خطرہ نہیں کرنا چاہئے۔ برخلاف اس کے ہم ان کی جان کے محافظ ہوں گے۔

اس خط کا جواب جلدی ہمیں نو دن کے اندر تھانہ دار کر پلیاں یا نواب صاحب امب کی معرفت دیا جائے۔ نہیں تو ہم آئندہ کے لئے بری الذمہ ہوں گے۔ پھر ہم پر کوئی الزام نہ لگایا جائے۔

اس معاملہ پر جو رپورٹ مورخہ ۵ر جون ۱۸۸۵ء مول چند تحصیل دار اتمان بلاک نے ڈپٹی کمشنر پشاور کو بھیجی اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

آپ کے حکم کے مطابق میں نے قادر خان ولد بہادر خان ساکن جھنڈا اور لبشن داس برہمن ساکن مینی کو بلایا اور ان کے بیانات لئے۔ ان بیانات سے مقدمہ کی نوعیت حسب ذیل ہے۔

۱۔ قادر خان ولد بہادر خان مرحوم ساکن جھنڈا نے بیان کیا کہ ۲۶، ۲۷ سال ہوتے ہیں (یعنی غدر

سے بعد) کہ جب ہندوستانی غیر علاقہ کی طرف بھاگے تو حکومت نے حکم دیا تھا کہ جو شخص بھی ان کی طرف روپے لے کر جاوے گا اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس پر بہادر خان مرحوم نے ایک ہندوستانی کو کنڈ کے نزدیک (جو اتمان تحصیل کا ایک گاؤں ہے) پکڑ لیا۔ جس کے پاس ۴۰۰- ۶۱۵ روپے تھے وہ مولوی عبداللہ کی طرف جا رہا تھا۔ قادر خان بیان کرتا ہے کہ یہ روپیہ اس کے والد کو بطور انعام دے دیا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک خوشنودی کا سرٹیفکیٹ اردو میں دیا گیا تھا جس کی نقل اس نے پیش کی ہے۔ اس کے سوائے کوئی اور تنازعہ اس کے والد اور مجاہدین میں نہ تھا۔ نہ ہی انہوں نے کبھی کوئی دعویٰ اس سے پہلے کیا تھا۔ قادر خان کو یہ معلوم ہے کہ مولوی اس کے خلاف ہیں۔

۲۔ لبشن داس برہمن ساکن ٹوپی مینی کا بیان ہے :۔ اس سے پہلے گندرت علاقہ غیر میں رہتا تھا۔ اور اس کا لین دین ہندوستانیوں سے تھا۔ تقریباً پندرہ سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ مجھے کرنل چیمبرلین نے بلا کر حکم دیا۔ کہ ان لوگوں کے نام جو ہمیشہ مجاہدین کو روپے بھیجتے رہتے ہیں بتلاؤں۔ انعام اور جاگیر اس صلہ میں دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے اس کا حکم مانا اپنے بیان پر بہت سے دکاندار جو پشاور اور دوسری جگہوں میں رہتے تھے اور مولوی سے حساب کتاب رکھتے تھے گرفتار کر لئے گئے اور ان کو کرنل چیمبرلین شملہ لے گئے۔ میں نے اپنی رہائش سرکار برطانیہ کے علاقہ میں آ کر کر لی۔ اور پھر کبھی بھی غیر علاقہ کو نہیں گیا وہ مولویوں کی کسی رقم کے بقایا سے انکار کرتا ہے۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ اس کے چھ ہزار (۶۰۰۰/-) ان کے ذمہ ہیں۔ ان کی دشمنی کی وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ اور جس کی وجہ سے وہ برباد ہو گئے اس کو کوئی انعام بھی نہ ملا کیونکہ کرنل چیمبرلین مر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر علاقہ کے لوگ اس کے دشمن ہو گئے ہیں۔ اور وہ اپنا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ اس کی خدمات کرنل چیمبرلین اور سردار نتھا سنگھ کو جو اس وقت صوبیدار میجر تھا اور اب وائسرائے کا ایڈی کمپ ہے اچھی طرح سے معلوم تھیں۔

ان امور کے متعلق سکرٹری گورنمنٹ پنجاب نے کمشنر کو ہدایت کی کہ مولوی عبداللہ کو کوئی رعایت نہ دی جائے۔

نواب امب کا خط مورخہ ۱۶ر مارچ ۱۸۸۶ء بنام ڈپٹی کمشنر ہزارہ

بخدمت فیضدرجت صاحب والاشان جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ضلع ہزارہ زاد عنا یتکم

بعد از سلام آنکہ اس وقت ایک کاغذ مولوی ہندوستانی باسم ایں جانب کے آیا ہے۔ مگر جواب اُس کا تا حال نہیں لکھا۔ لہٰذا بجنسہ کاغذ مولوی ہندوستانی واسطے ملاحظہ حضور کے بلفف ہذا ارسال

کرکے تحریر کیا جاتا ہے۔ کہ جس طور سے سرکار اس کے جواب میں فہمائش فرماویں بجا لایا جائے یعنی آیا جواب اس کا لکھا جاوے تو کس طرح جواب تحریر کیا جاوے یا سکوت کرکے جواب نہ لکھا جاوے

فقط تحریر ۱۶ر مارچ ۱۸۸۶ء

نواب محمد اکرم خان صاحب بہادر (مہر)

نقل خط مولوی عبداللہ (تاریخ ندارد)

از خادم المجاہدین بہ علو المراتب والامناقب رفیع المنزلت خان صاحب اکرم خان دام اقبالہٗ سلام میرا اوپر اس کے جو پیروی کرے صراط مستقیم کی اور شرع متین کی۔ بعد اس کے واضح ہو کہ ہم اور تم اہل اسلام سے ہیں اور کلمہ کے شریک۔ اس واسطے کتنی باتیں براہ خیر خواہی کے ہم تحریر کرتے ہیں خوب سوچو۔ اور غور سے ملاحظہ کرو۔

اول یہ کہ جس طرح بندہ نے برپا سداری دین قویم اور پیروی سید المرسلین کے اور مخالفت مخالفان متمردین، اللہ صاحب کے راہ میں ہجرت کی اور ترک اوطان اور اقران اختیار کیا اور کہ بر لذات پشت پا مارا۔ تم بھی جب کہ اپنی ذات کو زمرۂ مومنین کے شمار کرتے ہو۔ اور قرآن شریف پر ایمان لاتے ہو۔ اور خاتم النبیین رسول الثقلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر برحق جانتے ہو اور اس کی شفاعت کے امیدوار ہو۔ اگر یہ دعوے آپ کا سچا ہے تو ہجرت کرو۔ اور چھوڑ دو سب ریاست اور امارت کی زندگی۔ دنیا چند روز ہے۔ آخر سب چھوٹ جانے والا ہے۔ دیکھو آپ کے باپ دادا زیر زمین ہو گئے اور کچھ ساتھ نہ لیا۔ اور اپنے دل میں وساوس اور خیالات کو راہ مت دو کہ کس طرح زندگی بسر کریں گے اس واسطے کہ رزاق ہر جگہ موجود ہے جس کسی کا جس قدر مقسوم لکھ دیا ہے اس کو ہر حال میں پہنچا دے گا۔ بھروسہ اپنے خالق پر کرو اور فرمایا اس نے ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ

دوسری راہ یہ ہے کہ اپنے ملک میں آرام پذیر رہو۔ مگر جب ہم کسی مخالف پر دین کی خاطر سے چڑھائی کریں تو اس وقت ہمارا ساتھ دو۔

اور سوم صورت یہ ہے کہ جس وقت ارادہ ہو چڑھائی کا دشمنان دین محمدی پر اور گذریں آپ کے ملک سے تب نہ روکے جاویں لوگ ہمارے۔ اور جب مقابلہ ہو تو ہمارا ساتھ بھی نہ دو۔ اور نہ دشمنان دین اسلام کی طرفداری کرو۔ مناسب ہے کہ ان صورتوں سے جو کہ اوپر مذکور ہیں۔ جون سی صورت پسند آوے ہم کو مطلع کرو۔ ورنہ سن رکھو ایک بات اور وہ یہ ہے کہ بار بار سنا گیا ہے کہ ملازمان آپ کے

اگر کسی مسافر اجنبی کو بھی پاتے ہیں تو اس خیال سے کہ یہ زمرہ مجاہدین سے ہوگا اس کو بہت ستاتے ہیں اور حیران کرتے ہیں۔ ہم تو کسی کے لئے کچھ عرض نہیں کرتے مگر اس بات کو جان لیجئے کہ جو ایک شخص تمہارا آپ کے ملک میں سے کسی اجنبی وغیرہ سے مزاحمت کرے گا تو اس کے عوض میں ہم دس تمولی پکڑ لیں گے۔ کیونکہ لوگ تمہارے اس ملک میں آتے جاتے ہیں اور ملک تمہارا بھی ہمارے قبضہ سے باہر نہیں۔ اور یاد رکھئے کہ آپ کے ملک کے قرب وجوار میں سب یاغستان ہے خصوصاً چند تپہ تو سرحد پر ہیں۔ آپ کے ملک کے حسن زئی و اکازئی، مداخیل، امازئی، جدون اور وہ لوگ ذرہ ذرہ باتوں میں رنجیدہ ہو کے آپ کے ملک کے باندہ جات پر دست اندازی و دست درازی کیا کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ چاہتے ہیں کہ اس بندہ کو بھی اپنا شریک کریں۔ اور اس قسم کی باتیں آکے پیش کرتے ہیں مگر اب تک بندہ نے التفات نہیں کیا۔ مگر آپ چونکہ مدارج مذکور پر غافل نہ ہوں گے تو پھر بالضرور بندہ ان کا ساتھ دے گا۔ اور بندہ نے جب ان کا ساتھ دیا۔ تو آپ کے ملک پر کیسی خرابی اور بربادی آویں گے اور خوب جانو کہ ہمارا شیوہ یہ نہیں کہ مثل افاغنہ کے کسی پر خواہ مخواہ ظلم کریں البتہ ہاں جس وقت کوئی شخص درپے ایذا رسانی ہمارے کے پڑے تب اس کا سر و مال ہم پر حلال ہو جاتا ہے۔ اور جس قدر اس میں خون ریزی اور ضائع ہونا اموال کا اور بربادی ملک کی ہوتی ہے اس شخص کے اعمال نامہ میں لکھا جاتا ہے کہ جس نے اول شروع کیا کہ وہ ظالم ہے یہ قاعدہ اس کے اور سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ البادی اظلم والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور ڈویژن مورخہ ۱۲ر مئی ۱۸۸۶ء بنام ڈپٹی کمشنر ہزارہ

آزاد خان ساکن طوطالی نے فیروز شاہ ساکن ملکہ کی اطلاع پر خبر دی ہے کہ سات آدمی ہندوستان سے مجاہدین کے لئے سونے کی مہریں بانس کی لکڑیوں میں چھپا کر مجاہدین کے لئے لا رہے ہیں۔ پولیس اور پولیٹیکل افسران کو ہوشیار رہنا چاہئے۔ نیز فیروز شاہ نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اور آدمی بھی برہمنوں کے لباس میں اور ماتھے پر ٹیکے لگائے ہوئے لکھنؤ سے مولوی کے پاس آ رہے ہیں۔ ان کا منشاء مجاہدین کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کا ہے۔

ڈپٹی کمشنر پشاور کا خط کمشنر کے نام۔ مورخہ یکم ستمبر ۱۸۸۶ء

ٹبیر وال معہ ۲۰۰ ہندوستانیوں کے چیلہ میں جمع ہوئے۔ اور رستم (علاقہ سُدُم) کی بارڈر ملیشیا کی چوکی پر حملہ کیا ہے۔

اسسٹنٹ کمشنر مردان بنام ڈپٹی کمشنر پشاور مورخہ ۲۰ر ستمبر ۱۸۸۶ء

اطلاع دیتا ہوں کہ مولوی عبداللہ معہ دو سو ہندوستانیوں کے بموجب دعوت سرگروہاں تپہ دولت زئی

وزیرزئی بنیرواں کے چملہ میں جمع ہو گئے ہیں ان کو ڈنڈور۔ نزد سورہ بادنگی پانچ سو روپیہ سالانہ رہائش کے لئے دے دی گئی ہے۔ عمارت کی لکڑی ان کو چملہ والے لوگ مہیا کریں گے۔ ہندوستانیوں کی سب آبادی اس جگہ پر آکر آباد ہو جائے گی۔ کیونکہ حسن زیوں نے ان کو اب پلوسہ میں مزید رہنے کی اجازت نہیں دی۔

ریمارک ڈپٹی کمشنر بنام کمشنر ۱۵ راگست ۱۸۶۶ء مزید معلوم ہوا کہ حسن زیوں نے ان سے پانچ روپیہ بحساب فی کس ممبر جرگہ ان سے مطالعہ کیا۔ اس لئے ہندوستانی پلوسہ چھوڑ رہے ہیں۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا خط بنام ڈپٹی کمشنر پشاور مورخہ ۲۴ راگست ۱۸۶۶ء

۱۔ نواب امب اور خان اگرور کی رائے ہے کہ ہندوستانی مجاہدین فی الحال اپنی موجودہ جگہ سے نہیں جائیں گے۔

۲۔ وہ اس جگہ کا سالانہ کرایہ پانچ سو روپیہ حسن زیوں کو دیتے ہیں۔ اور ان کی موجودگی سے حسن زئیوں کے وزن اور اعتبار کو علاقہ غیر کے معاملات میں خاص اہمیت حاصل ہے اس واسطے یہ ناقابل یقین ہے۔ کہ حسن زئی ہندوستانیوں کو بہ جبر نکال دیں گے۔ میرے خیال میں حسن زئی اس چال سے ہندوستانیوں سے ایک سو روپیہ کے قریب اپنے سالانہ کرایہ میں زیادتی کروانا چاہتے ہیں۔

کمشنر کا خط

اشرف خان ولد محمد خان مرحوم ساکن بٹل اپنے خط مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۶ء میں لکھتا ہے کہ ہندوستانی مجاہدین نے کنہار سے کانگر کوٹ علاقہ بانسر (سوات) میں منتقل ہونے کے انتظامات کر لئے ہیں۔ اور ان کے تقریباً دو سو آدمی بمعہ مولوی (شاید مولوی عبداللہ) وہاں اپنی رہائش کے لئے مکانات بنانے کے انتظام کے لئے پہنچ گئے ہیں۔ جب مکانات تیار ہو جائیں گے تو بقیہ مجاہدین بمعہ بال بچوں کے وہاں چلے جائیں گے۔ ان کے اس جگہ کو چھوڑنے کی وجہ افغانوں سے ناراضی کے اسباب سے ہے۔

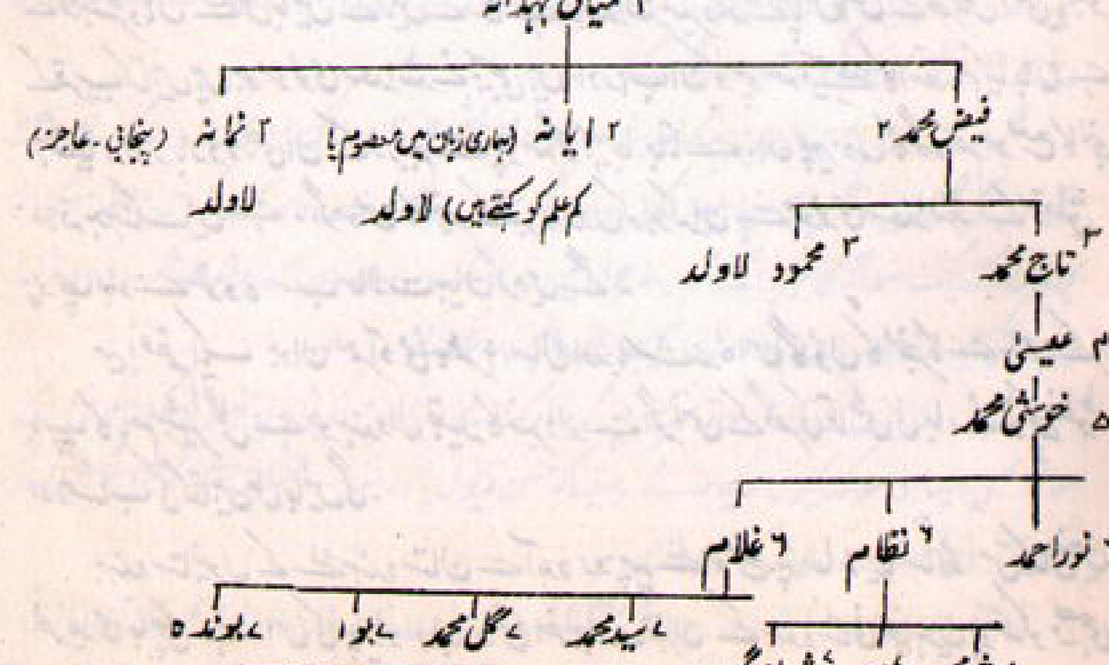
اشرف خان مزید لکھتا ہے۔ کہ ۱۰ ستمبر کو گلگت کی ایک راجہ (شاید گوہر مان جو مہتر چترال امان الملک کا رشتہ دار ہے اور اس سے باغی ہے) براستہ کوہستان والائی بمعہ ساٹھ ساتھیوں اور کچھ خیمہ جات کے آیا ہے۔ اور کنہار میں ہندوستانی مجاہدین سے مل گیا ہے۔ اس نے ایک رات ارسلا خان ساکن الائی کے ساتھ گزاری ہے۔ اور یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ظاہری طور پر یہ راجہ ہندوستانی مجاہدین کو اپنے ساتھ گلگت لے جانا چاہتا ہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

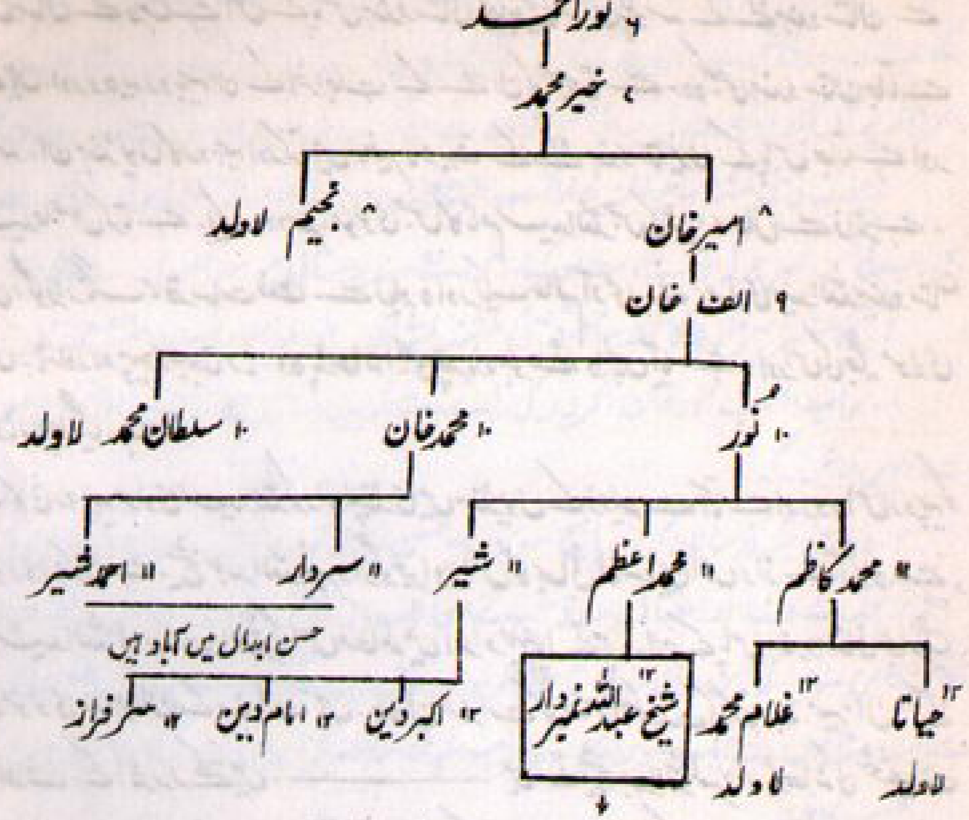
ایک گمنام عرضی بنام کمشنر و سپرنٹنڈنٹ پشاور ڈویژن جو ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو ملی۔ انگریزی ترجمہ (اس کا اردو ترجمہ میسر ہے۔ ش ب) ایک مولوی جس کا نام سعداللہ ہے وہ موضع پڈھانہ تحصیل ہری پور

میں عرصہ دس سال سے رہتا ہے اس کے پاس ہندوستانی مجاہدین ساکن پلوسہ کے لئے ہندوستان سے روپے آتے ہیں۔ اور وہ یہ روپیہ ان کے اخراجات کے لئے ان کو بھیجتا ہے۔ وہ کبھی ہندوستان جاتا ہے اور کبھی پلوسہ۔ ان ہنڈیوں کا روپیہ اور کتابیں وغیرہ دینے کے لئے ہندوستانیوں کے پاس جاتا ہے اور ان سے رسید حاصل کرتا ہے۔ ایک دوسرا مولوی جس کا نام سیداللہ جس کی عمر ۷۰ سال سے زائد ہے۔ سفید ڈاڑھی، گورا رنگ، قد سات فٹ سے زیادہ اور ایک عالم آدمی ہے۔ مولوی سیداللہ ہندوستان میں پانچ سال رہا۔ اور روپیہ بھیجتا رہا۔ وہ پڈھانہ ابھی چھ ماہ ہوئے واپس آیا ہے۔ اور اس کی جگہ مولوی سعداللہ وہاں چلا گیا ہے۔

بہت کافی روپیہ مولوی سیداللہ کو راولپنڈی میں ہنڈیوں کے ذریعہ سے آتا ہے اور وہ اس روپیہ کو آگے پلوسہ کو روانہ کرتا ہے۔ شیخ عبداللہ نمبردار گوجر اور اس کا بھائی امام دین اس راز سے آگاہ ہے۔ اور مولوی سیداللہ اور سعداللہ کو اس معاملہ میں امداد پہنچاتے ہیں۔ ان کے پاس ہندوستانی مجاہدین کے سرگروہ مولوی صاحبان کے سندات ہیں۔ وہ ان سندات کو دیسی حکمت کی کتاب "میزان" کے کپڑے کے غلاف کے اندر رکھتے ہیں۔ ——— میں نے شیخ عبداللہ نمبردار پڈھانہ کی شخصیت کی تحقیق کے لئے صورت دیہی پڈھانہ (یہ موضع ہری پور کے ساتھ ہے) دیکھی۔ اس سے شیخ عبداللہ کا شجرہ نسب نقل کر لیا۔

پڈھانہ قوم گوجر کی پرانی آبادی ہے۔ وجہ تسمیہ۔ گوجر پڈھانہ کی آبادی کی وجہ سے یہ نام ہوا۔





یہ ۱۸۸۶ء میں حسب خط ہذا موجود تھا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میاں بہڈانہ سولھویں صدی (۱۵۸۶ء) میں ہوا ہے۔ اگر شیخ عبداللہ نمبردار گوجر اور اس کے بھائی امام دین کے گھروں کی تلاشی لے جاوے۔ تو کچھ کاغذات اور حساب کتاب کے رجسٹر وہاں سے مل جائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ عبداللہ نمبردار کے پاس اس کے گھر میں اسّی یا سو کے قریب کتابیں ہیں جو مولوی سعد اللہ نے بھیجی ہیں۔ اور اب ان کو پلوسہ بھیجنے کا انتظام کیا جا رہا ہے ہتھیار اور بارود بھی ان کے ذریعہ سے پلوسہ کو بھیجا جاتا ہے۔ ان چیزوں کا گودام موضع کالنجر علاقہ بدہنک میں ہے۔ اگر موضع کالنجر کے نمبرداروں کو بلا کر ان سے مولوی سعد اللہ کے متعلق پوچھا جاوے تو وہ سب حالات بیان کر دیں گے۔

میر اعظم ایک جوان العمر آدمی بعمر ۱۹ سال اور باشندہ اس گاؤں کالنجر کا ہے۔ اس کے باپ کا نام شیر گل ہے جو ہندوال قبیلہ کا نمبردار ہے اگر اس کے گھر کی تلاشی لی جائے تو کچھ خطوط اور حساب کی کتابیں مل جائیں گی۔

ہندوستانیوں کے لئے ہندوستان سے آمدہ روپیہ سے موضع پڈھانہ میں ساٹھ اسّی کنال زمین خریدی جا چکی ہے۔ اس کی پیداوار بعد وضع اخراجات مخبران کے ہندوستانی مجاہدین پلوسہ کو بھیجی

جاتی ہے۔ مجاہدین کے پانچ نوکر اس زمین کی پیداوار کھاتے ہیں۔

ہندوستان سے روپیہ فضل دین وخدا بخش خوجہ، دکانداران صدر بازار راولپنڈی کے نام پر آتا ہے۔ وہ اس روپیہ کو سید اللہ، شیخ عبداللہ نمبردار اور اس کے بھائی امام دین کو بھیجتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی دو عرضیاں ۱۰ر جنوری ۱۸۸۶ء کو ڈپٹی کمشنر ہزارہ کو بھیجی ہیں۔ لیکن ان پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔ اب میں یہ عرضی آپ کے نام برائے اطلاع اور غور بھیجتا ہوں۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام کمشنر مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۸۶ء

۱۔ اطلاع دی جاتی ہے کہ ہاشم علی کو سیری میں امداد کے لئے ایک سو آدمی مجاہدین بھیجے گئے ہیں

۲۔ مزید مولوی عبداللہ بمعہ تین رفقا عنقریب راولپنڈی برائے وصول کرنے سالانہ چندہ آمدہ از ہندوستان جا رہا ہے۔

ڈپٹی کمشنر بنام کمشنر مورخہ ۱۹ رمئی ۱۸۸۶ء

۱۔......

۲۔ میں نے مہابن کے ایک سید سے سنا ہے کہ عنقریب تین آدمی مجاہدین سے راولپنڈی برائے وصول کرنے روپیہ اور سونا جا رہے ہیں۔ ایک تو عبدالجبار حسن زئی جو علی خان حسن زئی ملک کا بھتیجا ہے اور دو، بنگالی یا ہندوستانی مسلمان امام دین اور عبدالوہاب ہیں۔ وہ اپنا بھیس بدل کر سفر کرتے ہیں اور عبدالوہاب پیر کے بھیس میں سفر کرے گا۔ مولوی نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ قریب ۱۲ بیساکھ (۲۲ر اپریل) کو روانہ ہوں گے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ یہ رپورٹ دھوکہ دینے کے لئے ہے اور وہ اس تاریخ سے بعد کسی وقت جائیں گے۔

گذشتہ مارچ میں مجاہدین کے امیر نے دو سو آدمی ہاشم علی خان ساکن سیری کی امداد کے لئے بھیجے تھے جب کہ اگرور میں انگریزی سپاہیوں کو زیادہ کیا گیا تھا۔ اور اس سے وہ یہ سمجھا کہ اس پر حملہ ہوگا اور مجاہدین کے ایک سو آدمی سیری کے قرب وجوار میں دو ماہ تک رہے۔ اور اس وقت تک وہ وہاں رہے جب تک ہم نے جو سپاہی زیادہ وہاں بھیجے تھے واپس نہ بلا لئے۔

جو ہندوستانیوں کے آدمی علاقہ سرکار میں گرفتار کر لئے جائیں۔ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیوں نہ کیا جائے۔ جیسا کہ حسن زیوں یا دوسرے قبیلوں مثلاً گوجر و بنگش کیساتھ جو حسن زیوں میں بطور ہمسایہ کے رہتے ہیں۔

عرضی مورخہ ۲۳ ر ہاڑ (۵ رجولائی ۱۸۸۶ء) از طرف غلام خان ومولوی محمد جی قوم امازئی

جو ۱۹ جولائی کو کمشنر پشاور کو ملی۔

آج ۲۳ ہاڑ (۵ جولائی) کو ہندوستانی مجاہدین موضع بیاڑ سے موضع چرڑوڑی کو چلے گئے ہیں اور وہاں موضع شہباز گڑھ میں مقیم ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے اس جگہ کو اپنی رہائش کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ ہم آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ مختلف قبیلوں کے افراد ان کو حکومت کو نقصان دینے کے لئے جگہ دیتے تھے لیکن ہم نے ان کو رہائش کی جگہ حکومت کے دوست ہونے کی وجہ سے دی ہے تاکہ وہ حکومت کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اگر انہوں نے حکومت کے خلاف کوئی ناشائستہ حرکت کی تو ان کو فوراً نکال دیا جائے گا۔

یہ عرضی برائے اطلاع بھیجی جاتی ہے۔

اس عرضی کو ڈپٹی کمشنر ہزارہ بھیجتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ڈسٹرکٹ انسپکٹر پولیس اور نواب امب مطلع کرتے ہیں کہ موضع چرڑی، بھائی خان، پھاگن، ملکہ اور ڈھیری کے امازئی فیروزشاہ و سابق ساکن منڈی) کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ہندوستانیوں کو ایک ویران گاؤں ٹنڈارہ نزد شہباز گڑھ جو امازئی اور مداخیل کی درمیانی سرحد پر واقع ہے، دے دیا جائے۔ یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ مداخیل نے ان کو اپنے علاقہ میں آباد ہونے کی دعوت دی تھی (شہباز گڑھ ملکہ سے ۵ یا ۶ میل کے فاصلہ پر ہے یہاں پر وہ ہماری عین زد کے نیچے ہوں گے اور ان کو قابو میں رکھا جا سکے گا۔ ڈپٹی کمشنر پشاور)

اسسٹنٹ کمشنر مردان۔ ہندوستانی ٹنڈارہ میں عنقریب آباد ہو جائیں گے۔ یہ جگہ انہوں نے گوجر دولت زئی کی وساطت سے امازیوں سے ۸۰ روپیہ سالانہ کرایہ پر حاصل کی۔ ۳۱ جولائی ۱۸۸۹ء

ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام کمشنر پشاور ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۹ء

ہندوستانی اب بھی ٹنڈارہ میں رہائش کے لئے کوشاں ہیں۔ کیونکہ کابل گرام اور بہار آب و ہوا کے لحاظ سے خراب ہیں۔ لیکن مداخیل نے یہ تجویز رد کر دی۔ اس پر انہوں نے مولوی عبداللہ کو کہا کہ وہ اپنے قافلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دے۔ نصف امازئی کے علاقہ میں اور نصف مداخیل میں رہیں۔ لیکن مولوی نے یہ بات منظور نہیں کی۔ ٹنڈارہ دربند سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر ہے۔

مولوی عبداللہ صاحب مرحوم کا حلیہ اور ان کی آمد ایبٹ آباد

مولوی عبدالرحمٰن والد مولوی عبدالغفور مالک رؤف پٹرول پمپ نے مجھ سے بیان کیا کہ مولوی عبداللہ صاحب ۱۸۹۸ء۔۱۸۹۹ء میں ایک دفعہ ایبٹ آباد آئے اور جامع مسجد میں بہت پُر اثر وعظ کیا۔

جو انگریز حکومت کے خلاف تھا۔ وعظ کے معاً بعد خاموشی سے واپس چلے گئے۔ آپ درمیانہ قد اور مضبوط جسم کے آدمی تھے۔ اور داڑھی میں سفید بال بھی آچکے تھے۔ دو تین سال کے بعد پھر ایک رات آئے۔ اور حاجی عبداللہ گھڑی ساز کے ہاں ٹھہرے یہ شیخ عبدالحمید محکمہ خوراک کے سکرٹری کے دادا تھے۔ ان کی وساطت سے آدھ گھنٹہ میں ۳۰۰ روپیہ کے قریب چندہ کی فراہمی مولوی عبدالرحمٰن نے خود بمعہ حاجی عبداللہ۔ محمد رمضان (محمد یوسف مالک پٹرول پمپ کا دادا) مولوی سلطان میر والد میر ولی اللہ صاحب ایڈوکیٹ اور ماسٹر غلام حیدر والد بھائیا غلام حسین نے کی۔ اور ان کے عوض پونڈ تبدیل کر کے ان کو دئے۔ اور وہ اسی رات (چاندنی رات تھی) پیادہ پا سلہڈ سے براہ تناول واپس چلے گئے۔

مولوی عبداللہ صاحب کی وفات مطابق سرگزشت مجاہدین مصنفہ مولانا غلام رسول مہر ۲۷ شعبان ۱۳۲۰ھ (۲۹ نومبر ۱۹۰۲ء) میں ہوئی۔ عمر تقریباً ۷۴ سال تھی۔

خط مورخہ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ ۶ مئی ۱۸۹۵ء۔

مختصر ترجمہ۔ از مولوی عبداللہ بنام غلام خان اور مولوی محمد جی امازئی۔ امازئی میں رہائش کے لئے جگہ حاصل کرنے کے لئے انہوں نے لکھا کہ چونکہ ہم نے اپنے آپ کو صرف خدا کی عبادت کے لئے وقف کر دیا ہے اور سب دنیاوی علاقہ جات چھوڑ دئے ہیں۔ لہٰذا ہم کو رہنے کے لئے ایک جگہ دی جائے اور ساتھ ہی درخواست کی ہے کہ حکومت برطانیہ سے اجازت لی جائے کہ ہمیں تنگ نہ کرے اور ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ حکومت کے خلاف ہم کچھ نہیں کریں گے۔

جنرل افسر کمانڈنگ چترال نے ۱۸ جولائی ۱۸۹۵ء کو رپورٹ کی کہ ہندوستانیوں کے پاس ۲۸۰ آدمی ہندوستان سے پہنچ گئے ہیں۔

۱۸ اگست ۱۸۹۵ء نتھیا گلی از طرف کننگھم

نواب امب بیان کرتا ہے کہ جس وقت چترال کے لئے فوج جا رہی تھی ان دنوں میں ۱۲۰ آدمی اکثر ضلع ہزارہ، پشاور ملحقہ اضلاعات اور کچھ بنگال سے جہاد کے لئے مولوی کے ساتھ شامل ہوئے۔

چترال کی فتح اور جنگ کے بعد مقامی لوگ واپس اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بنگالیوں یا پوربیوں سے دو مر گئے چار واپس چلے گئے۔ اور چار مجاہدینوں کے پاس رہ گئے۔ اب مجاہدین کی آبادی ۳۰۰ ہے۔

نتھیا گلی ۴ ستمبر ۱۸۹۵ء از ینگ ہزبنڈ بنام کننگھم

اپریل اور جولائی ۱۸۹۵ء کے درمیان ۱۲۰ رنگروٹ ہندوستانیوں کے ساتھ شامل ہونے کے لئے

ان کی آبادی واقع تلوانی (ایک چھوٹی سی مضافات نگری علاقہ امازئی) میں آئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مولوی عبداللہ کا ارادہ جنگ کرنے کا، جب تک وہ ٹال سکے، نہیں ہے تو پنجاب کے اضلاع کے لوگ واپس چلے گئے۔ بعض ان میں سے ملّا ہڈہ کے پاس برائے مشورہ اور باقی اپنے گھروں کو چلے گئے۔ تلوائی میں ان کی آبادی تقریباً پانچ سو نفوس پر مشتمل ہے جس میں ۲۰۰ کے قریب جنگ آزما ہیں۔ ۲۲ سوار، ۱۴ توپچی۔ بیس گاڑی بان اور طالب علم، منشی مستورات اور بچے دو سو کے قریب ہیں۔ چار بنگالی جو مجاہدین پلوسہ کے آدمی تھے۔ ہری پور کی مسجد سے بتاریخ ۸ر نومبر ۱۸۷۹ء گرفتار ہوئے۔ بحکم کمشنر ۱۴ر دسمبر ۱۸۷۹ء کو ضلع بدر کئے گئے۔ کیونکہ ان کو گرفتار کر کے حکومت کے خرچ پر ہندوستان پہنچانے سے مجاہدین کی سرگرمیوں کی اشاعت ہوتی ہے۔

رپورٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ ۵ر مارچ ۱۸۸۰ء

اسسٹنٹ کمشنر مردان اپنے خط مورخہ ۱۱ر جون ۱۸۸۱ء بنام ڈپٹی کمشنر پشاور تحریر کرتا ہے۔ کہ ۵۰۰ اشرفی کی زکوٰۃ ہندوستانیوں کے لئے ماہ رجب ۱۹ر مئی سے ۲۹ر جون تک، ٹونک اور بریلی میں جمع کی گئی ہے۔ اور جمعدار متولی خان ہندوستانی اس کو لانے کے لئے جائے گا۔ اس کی تاریخ روانگی اور راستہ سے بعد میں اطلاع دی جائے گی۔

آخر میں مولانا عبیداللہ انور خلیفہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی تقریر کا وہ حصہ جس میں مجاہدین چمرقند کو ہندوستان سے امداد براہ ہزارہ دی جاتی رہی درج کرتا ہوں یہ روئداد "وفاق" جمعیت نمبر جولائی ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔

ہمارے جو بزرگ دور دراز سے تشریف لایا کرتے تھے تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ ان کی ہمت افزائی اور ان کے ساتھ ہمنوائی فرمایا کرتے تھے بلکہ اذیتیں اور تکلیفیں اٹھانے میں بھی کمی نہ کرتے تھے۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس کے راوی مبلغ اسلام حضرت مولانا لال حسین اختر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ دسمبر کی ایک نہایت سرد رات تھی مجھے ایک تقریر کے سلسلے میں راولپنڈی جانا تھا۔ چنانچہ میں فجر کی اذان سے کوئی ایک گھنٹہ قبل اٹھا اور اپنی رہائش گاہ واقع فیض باغ سے روانہ ہو کر لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ جب میں دو موریہ پل کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ حضرت ایک گٹھڑی اٹھائے ہوئے اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے سلام کیا اور پوچھا "حضرت! اس وقت آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

انہوں نے خندہ زیر لب کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے بتایا کہ میں ایک

تقریر کے سلسلے میں راولپنڈی جا رہا ہوں یہ سن کر حضرت نے فرمایا "خدا مسبب الاسباب ہے اچھا ہوا کہ آپ مل گئے"۔ تھوڑی دور جا کر جہاں آج کل ریوالی سینما ہے۔ آپ رک گئے اور فرمایا ایک اللہ کا بندہ میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے وہ آجائے تو ایک کام آپ کے سپرد کر دوں گا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شخص مذکور بھی آ ملا حضرت نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ مولانا لال حسین اختر اپنے آدمی ہیں۔ اب یہ آپ کے ہمراہ جائیں گے۔ میں نے بڑے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ داڑھی مونچھیں صاف اور انگریزی لباس میں مجھے وہ بڑا عجیب لگا۔ ابھی میں اس شخص کو دیکھ ہی رہا تھا کہ حضرت نے گٹھڑی میرے ہاتھ میں تھما دی اور فرمایا اس گٹھڑی میں دو شلواریں، دو قمیضیں، ایک نسخہ کلام پاک بہشتی زیور کی ایک جلد اور گتے کے ایک ڈبے میں بیس ہزار نقد موجود ہیں۔ آپ اس سامان کے ہمراہ اس شخص کو ٹیکسلا پہنچا کر پھر راولپنڈی جائیں اور اسے ہری پور ہزارہ کی گاڑی میں بٹھا کر گٹھڑی اس کے حوالہ کریں"۔ یہ کہہ کر حضرت نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور زاد راہ کے طور پر اس شخص کے حوالے کر دئے اس شخص کی درخواست بعد ازاں حضرت نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اور واپس شیرانوالہ دروازہ کی طرف پلٹ گئے۔ اسٹیشن پہنچ کر میں نے ٹیکسلا کا اور اس اجنبی نے حویلیاں کا ٹکٹ لیا۔ اور ہم دونوں گاڑی میں سوار ہو گئے۔ راستہ میں میں نے اس شخص سے پوچھا "آپ کون ہیں؟ یہ روپیہ کیسا؟ اور حضرت سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" اجنبی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "چونکہ حضرت نے آپ پر اعتماد کیا ہے اس لئے میں آپ کو یہ سب کچھ بتانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا۔ میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی جماعت چمرقند کا ایک رکن ہوں۔ حکومت انگریزی کو ختم کرنا ہمارا نصب العین ہے ہندوستان سے اکثر امداد ملتی رہتی ہے اور حضرت اس امداد کے مرکز ہیں۔ ہمارا کوئی معتمد حضرت کے پاس پہنچتا ہے اور امداد حاصل کرتا ہے ہم میں سے جو بھی آتا ہے وہ واپسی پر حویلیاں کا ٹکٹ لیتا ہے لیکن دو اسٹیشن پہلے (سرائے صالح) ہی اتر جاتا ہے۔ وہاں ہمارے آدمی موجود ہوتے ہیں۔ وہاں سے ہمارا قافلہ ایک غیر آباد جگہ سے دریا عبور کر کے اپنے ہیڈ کوارٹر چمرقند پہنچتا ہے میں نے جب اس کے داڑھی مونچھوں سے صاف چہرے اور لباس کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس نے بتایا کہ انگریزی حکومت کے جاسوس بری طرح ہمارا پیچھا کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر آدمی پکڑے گئے اور حکومت نے ان سے معلومات حاصل کرنے کے لئے ان پر بے پناہ تشدد کیا۔ اور ان میں سے اکثر جاں بحق ہو گئے۔ چنانچہ حکومت کے جاسوسوں سے

بچنے کے لئے ہمیں مجبوراً یہ بہروپ بھرنا پڑتا ہے تاکہ ہم پہچانے نہ جاسکیں۔ ہم میں سے جو بھی حضرت کے پاس امداد حاصل کرنے کے لئے پہنچتا ہے اس سے یہ حلف لیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنی آمد و رفت کے راز کو افشا نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہم لوگ کٹ مرتے ہیں مگر کسی کو بھی اپنے راز سے آگاہ نہیں کرتے۔

جاگیر دارانِ ہزارہ و کُرسی نشینان

جاگیر دارانِ ہزارہ ۔ ضلع ہزارہ میں جاگیرداروں (خواہ قلیل جاگیر ہی کیوں نہ ہوں) کی تعداد صوبہ سرحدی کے دوسرے اضلاع سے بہت زیادہ ہے۔ وجوہات

اسلامیوں کی قدیم سلطنتوں از محمود غزنوی تا احمد شاہ درّانی میں یہ ضلع افغانستان۔ پشاور۔ لاہور سے کشمیر کے لئے درمیانی شاہراہ تھا۔ یہ بہت دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے۔ اور امن بحال کرنے کے لئے اس ضلع کے خوانین کو جاگیریں دے کر رام کرنا فوج کشی کرنے سے آسان تر ہے اور حقیقتاً یہ ضلع جاگیروں کے دام ہی سے رام ہوسکا ہے۔ کبھی بھی فوجی مداخلت سے ختم نہیں کیا جاسکا۔

لہٰذا سلاطین نے اپنا راستہ پُرامن رکھنے کے لئے جاگیریں فراخدلی سے دیں۔ مغلیہ سلطنت سے تا بہ عہد درّانی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سکھوں نے بھی قدرے اس پر عمل کیا۔ لیکن انگریزوں نے پھر عہد ماضی سے سبق لے کر جاگیروں کو رواج دیا۔ میجر ایبٹ پہلے ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اس امر (بحالی امن) پر خاص زور دے کر جاگیرداروں کے منظوری حاصل کی۔ جیسا کہ اس کے خط مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۰ء سے جو اس نے سکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور کو لکھا تھا۔ ظاہر ہے لہٰذا عموماً جاگیردار خاندان سلاطین مغلیہ کے وقت سے وہی ہیں صرف ایک دو خاندانوں کو جن کو انگریزوں نے خاص خدمات کے صلہ میں جاگیرات عطا کیں۔

جاگیر دارانِ ہزارہ

یہ جاگیریں عطا کرتے ہوئے جو خط و کتابت ڈپٹی کمشنر ہزارہ میجر ایبٹ، چیف کمشنر کے سکرٹری اور

گورنمنٹ ہندوستان کے مابین ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔ اس سے ان جاگیروں کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا خط از طرف مسٹر پی۔ ملول (P. MELVIL) چیف کمشنر کے سکرٹری کا نمبر ۳۱۱ مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۵۳ء لاہور ہے جو اس نے مسٹر سی ایلن (C. ALLEN) سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم[1] کو لکھا۔ چیف کمشنر جاگیروں کے جلدی فیصلہ کی درخواست کرتا ہے .... ہزارہ پر قبضہ ہوئے بہت عرصہ ہوگیا ہے اور منظوری میں زیادہ دیر ہوجانے سے خطرہ ہے۔ کہ جو فائدہ ان جاگیروں کے عطا کرنے سے مدنظر تھا وہ ضائع نہ ہو جائے۔ وہ لوگ جنہوں نے گزشتہ جنگ میں وفاداری دکھلائی وہ اپنے حقوق کی منظوری میں اتنی دیر لگ جانے سے حیران ہوں گے۔

۲۔ چیف کمشنر ہزارہ کی گزشتہ تاریخ، اس کے پہاڑی اور جنگ جو ماحول، خوانین کی خصوصی خدمات اور ان کے رسوخ کا پس منظر ہزارہ میں جاگیریں دینے کی پالیسی کی تائید کرتا ہے۔ وہ خاص کر اس تجویز کی تائید کرتا ہے کہ ضروری نہیں کہ بڑا لڑکا ہی جاگیردار کا وارث ہو۔ اس شرط سے قبیلہ یا قوم کا بہترین اور قابل شخص ہی نمائندہ چنا جاسکے گا۔

۳۔ چیف کمشنر کی رائے میں جو شرائط تبادلہ ۱۸۴۷ء سابق سکھ دربار اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان ریزیڈنٹ کے ایما پر طے ہوئی تھیں۔ ان سے کوئی ضمانت برائے پابندی شرائط اخذ نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ایسی ضمانت بطور اصول مان لینے سے مشکلات پیدا ہوں گی۔ تبادلہ کی شرط ہزارہ کے دو روپیہ کے اصل مالیہ کے عوض ایک روپیہ مالیہ میدانی علاقہ نزد سرحد مہاراجہ کے قرار پایا تھا۔ اصل مالیہ سے مراد وہ مالیہ تھا۔ جو تمام جاگیروں کے منہا کر دینے کے بعد ہوتا تھا۔ لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ نے اس شرط کا یہ مطلب نہیں لیا تھا کہ وہ ان سب جاگیروں کو جو اس علاقہ میں تھیں جو جموں سے ملحق کیا گیا تھا۔ ضروری طور پر برقرار رکھے گا۔ اور نہ ہی اس نے ایسا عمل کیا کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ بھی ان کی بحالی ضروری سمجھتا تھا۔

۴۔ جہانداد خان کے متعلق خود مختار (INDEPENDENT) کے لفظ سے چیف کمشنر یہ مطلب

---

[1] انگریزی سلطنت ہند کا پہلا دار الخلافہ کلکتہ ہی تھا۔

سمجھتا ہے کہ وہ دریائے سندھ کے اس طرف کے آبائی علاقہ پر اختیار رکھے گا اور وہ علاقہ جو اس کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے بعوض ۵۵/۵ روپیہ جن کی تفصیل نقشہ نمبر۲ میں دکھائی گئی ہے اور جو سرن دریا کے کنارے ہماری سابقہ چھاؤنی بھارہ کوٹ کے نزدیک ہی ہے۔ بطور جاگیر محض ہے۔

۵۔ اس سوال کا جواب بھی درکار ہے کہ یہ نئی جاگیریں جن کی تفصیل نقشہ ۳ میں دکھائی گئی ہے خواہ زمین کی شکل میں یا نقدی میں ہوں گی۔ کس تاریخ سے شروع سمجھی جاویں۔ چیف کمشنر کی رائے ہے کہ جن لوگوں کو یہ جاگیریں عملاً دی جا چکی ہیں۔ وہ تاریخ عمل سے نافذ سمجھی جاویں۔ اور دوسری صورت جس میں ابھی حکم نہیں ہوا۔ اُن کو اس فصل سے دی جاویں اور نقد پنشن یکم جنوری ۱۸۵۳ء سے ہزارہ کے خزانہ سے ادا کی جائے۔

میجر ایبٹ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ ہزارہ کا خط بنام پی۔ ملول سکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور۔ مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۸۵۲ء

مجھے آپ کے خط بمعہ مسلکہ کاغذات کے ملا۔ میری ان سفارشات کے بارے میں ہے جو میں نے بعض ہزارہ کے (CHIFES) سرداروں اور ملکوں (MULLICKS) کی جاگیر کے متعلق کی تھیں۔ کہ وہ غداروں کی ضبط شدہ جائدادوں سے دی جائیں اور ساتھ ہی مجھے معلے القاب گورنر جنرل صاحب کی ناراضگی سے مطلع کیا گیا ہے۔ کہ میں نے ان غداروں کے نام، جو وقت کی ضرورت کی وجہ سے دشمنوں سے مل گئے تھے۔ بھجنے سے کیوں ہچکچاہٹ کی۔

۲۔ جواب میں عرض ہے کہ میری ہچکچاہٹ کے یہ وجوہات تھے :۔

اول: میں اپنی تفتیش کے نتیجہ سے خود ہی اتنا پر یقین نہ تھا کہ میں حتمی طور پر ان گروہوں کے نام لکھ سکتا جنہوں نے واقعی غداری کی تھی۔ دوم۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں کہیں ایسے لوگوں کا نام لکھ کر غلط اقدام نہ کر لوں اور ایسے اشخاص کی وفاداری پر شبہ کروں جن کا سخت قصور یہی تھا کہ انہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب مخالفت ناممکن تھی۔ ان امور کی وضاحت میرے پہلے خط سے ہوتی ہے میری زندگی اور آزادی کے محافظ یہی ہزارہ کے لوگ ہیں۔ اور مجھے ان کی غداری کی رپورٹ کرتے وقت دُکھ ہوا۔ میں نے اس خیال سے یہ رپورٹ کی کہ اس کی ضرورت اس واسطے تھی کہ میرے پہلے خطوط میں سے ایک میں میں نے غیر محتاط طور پر اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ حکومت کو لوگوں کی اصلی دماغی کیفیت کے متعلق مطلع کرنا۔ ایک

اعزاز اور استحقاق ہے جو کبھی بھی اظہار رنج کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

۳۔ میری ناچیز خدمات جو میں نے گزشتہ جنگ کے اختتام کے نزدیک انجام دیں۔ ان پر جس کمال شفقت و مہربانی کے ساتھ معلی القاب جناب گورنر جنرل نے اعتراف فرمایا ہے۔ وہ میرے لئے بہت ہی اعلیٰ اور مقدس انعام ہے۔ جس سے مجھے بہت سی امیدیں رکھنے کی ترغیب ہو گئی ہے کہ میری خدمات اور ہزارہ کے وفادار اور بہادر افراد کی قربانیاں آں عالی جناب کی نظر کے سامنے ہیں۔ اور قبولیت سے سرفراز ہوئی ہیں حالاں کہ میرے جیسے گمنام اور دور افتادہ نائب کی یہ خدمات اس عام ملکی ہنگامہ میں گم ہو جاتیں۔ اگر ان لوگوں کی جاں بازی و وفاداری حکومت کے ساتھ نہ ہوتی۔ یہ سب کارنامے اس واسطے ظہور پذیر ہوئے کہ حکومت نے مجھے حکومت کی ان جملہ عنایات کے لئے سربراہ بنایا جو کہ ان لوگوں سے ہوئیں۔

۴۔ گورنمنٹ کی ان بے مثال عنایات و قدر افزائی نے ان لوگوں کو دیدہ و دانستہ اپنے عزیز ترین واسطوں کو بھی قربان کرنے پر آمادہ کیا۔ اور ان کو اپنے محسنوں کے مستقبل سے ناامید ہونا ناممکن بنا دیا (یعنی انگریزوں کی فتح پر حتمی یقین رکھتے تھے۔ ش ب) حالانکہ جنگ کے میدان (محاذ ملتان) سے بہت ہی حوصلہ شکن خبریں آ رہی تھیں۔

۵۔ یہ فراخدلانہ جاگیریں جن کے مفصل وجوہات اوپر دئے گئے ہیں۔ میری ایماندارانہ رائے کے مطابق سرکاری آمدنی میں کمی کا باعث نہیں ہوں گی۔ آخر کار ان سے جو طمانیت اور قوت وفادار لوگوں کو حاصل ہو گی۔ اس سے پولیس اور فوج کی تعداد کم کرنے اور آمدنی میں زیادتی کا باعث ہو گی۔ گزشتہ ساڑھے تین سال میں ہزارہ کے اخراجات میرے آنے کے وقت سے ½ حصہ کم ہو گئے ہیں اور یہ جاگیروں کے ضبط کرنے سے نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے جو فراخدلی سب دعویداروں سے روا رکھی ہے اس کی وجہ سے جو اعتماد اور محبت کے جذبات ان لوگوں میں پیدا ہوئے وہی اس خرچ کی کمی کا باعث ہوں گے۔

۶۔ دوسرے اضلاع آمدنی کا باعث ہوں گے لیکن ضلع ہزارہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہمیشہ سے فوجی اخراجات کے کم کرنے کا رہا ہے۔ ان اخراجات کی کمی بتدریج اور مستقل طور پر جاری ہے کہ ہزارہ چند سالوں کے بعد اپنے سارے اخراجات کو برداشت کرے گا۔ [illegible] مستقل [illegible] کہ اب درخواست [illegible] کی گئی ہے

اور جو ۲۸ وفادار، بہادر اور بارسوخ افراد کو بطور انعام دی جائے گی۔ اس کے منظور ہو جانے کی صورت میں ایک سو ساٹھ پولیس کے سپاہی کم کر کے اس رقم کو پورا کیا جائے گا۔ ان افراد کی فہرست جن کے لئے جاگیروں کی سفارش کی گئی ہے حسب ہدایت درست کر کے بھیجی جا رہی ہے۔

میجر جے ایبٹ ڈپٹی کمشنر و سپرنٹنڈنٹ ہزارہ

بنام: پی۔ میلول سکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور

مورخہ ہزارہ یکم نومبر ۱۸۵ء

ملاحظات لارڈ کے ملاحظہ کے لئے پرانے جاگیرداروں کی فہرست پیش کرتے ہوئے ان حالات کا اعادہ کرتا ہوں۔ جن کے ماتحت یہ سب جاگیریں ۱۸۴۶ء میں ریذیڈنٹ لاہور کے حکم کے ماتحت مستقل کی گئی تھیں۔

۲۔ ہز ہائی نس مہاراجہ جموں ۱۸۴۶ء کے معاہدہ کے مطابق پنجاب کے پہاڑی علاقوں بمعہ ہزارہ کے مالک ہو گیا۔ لیکن جب یہ ظاہر ہو گیا کہ بغیر زیادہ خرچ اور سخت فوجی کارروائی کے ہزارہ کے لوگ مہاراجہ جموں کی اطاعت نہیں کریں گے۔ تو سکھ دربار اور جموں کی حکومت کے درمیان تبادلہ کی تجویز ہوئی۔ اور مجھے حکم ملا کہ اس تبادلہ سے پہلے میں ہزارہ کا بندوبست کروں اور ایک رپورٹ مرتب کروں۔

۳۔ ہزارہ کے لوگوں نے سکھ دربار کی اطاعت اس واسطے قبول کی کہ ان کو سرکار انگریزی کی حمایت کا یقین تھا دوسرے الفاظ میں ان کی اطاعت حکومت انگریزی کے اعتبار و عزت کی وجہ سے تھی۔ میرے آنے کے بعد انہوں نے حکومت کے ہر حکم کو انگریزی حکومت کا حکم سمجھا۔ ہمارا ان سے یہ کہنا کہ پنجاب میں ہماری موجودگی یا اثر عارضی ہے بے معنی تھا۔ ان کا جذبہ و شوق جو ہمارے متعلق تھا۔ وہ آئندہ واقعات کی صحیح پیشین گوئی تھی۔ ان کو یہ کہنا کہ حکومت و اختیار مہاراجہ دلیپ سنگھ کا ہے عبث تھا۔ ہماری موجودگی سے جو فوری فوائد اور آرام ان کو ملا۔ اس کی وجہ سے وہ اس بات کے باور کرنے پر تیار نہ تھے۔ کہ یہ اسی حکومت کی طرف سے ہے جس کے ہاتھ ان کی اجداد کے خون سے رنگین اور آلودہ ہیں۔ اور جو ہمیشہ اور لگاتار تمام مخلص معاہدے توڑتی رہی ہے۔ اس مخلصانہ اور پرجوش اعتماد کا اظہار بعد میں اس آٹھ ماہ کے ابتلاء و آزمائش میں ہوا جب کہ ایسی افواہیں ہزارہ میں پھیلائی گئیں جن سے تمام برطانوی طرفدار مایوس ہو جائیں اور جب کہ سکھوں اور درانیوں کی فوجیں نظر کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔

۴۔ مجھے اس تبادلہ مابین سکھ دربار لاہور اور جموں حکومت میں بطور ثالث ARBITER اختیار دیا گیا تھا

کہ میں پرانی جاگیروں اور انعام والی زمینوں کو بحال کر دوں۔ اور ایک معقول ذریعہ معاش ان سرداروں (CHIEFS) اور ان کے لڑکوں کے لئے تجویز کروں جن کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے محروم کر دیا تھا۔

۵۔ قریباً تیس سال ہوتے ہیں کہ ہزارہ میں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ شاہانِ دہلی یا کابل جب اپنی فوجوں کے ساتھ میدانِ ہزارہ سے گزر کر کشمیر کو جاتے تو راستہ پر واقع دیہات سے معمولی سا خراج وصول کر کے ان خانانِ ہزارہ کو دے دیتے جن کے علاقوں سے وہ گزرتے۔ یہ ایک قسم کی رشوت تھی جو وہ اپنی زرخیز جاگیر کشمیر کو جاتے ہوئے پرامن طور پر گزرنے کے لئے ادا کرتے تھے۔ لیکن پہاڑی علاقے آزاد تھے۔ ہر ایک چھوٹا سا خان (CHIEF) بھی اپنے علاقہ کا مختار کُل اور زندگی اور موت کا مالک تھا۔ اور جن علاقوں میں کوئی خان نہ تھا۔ وہاں پر قومی جرگہ کی حکومت تھی۔

۶۔ بہت سے علاقوں کے مالک پٹھان تھے۔ جن کی زمینوں کی کاشتکاری وہ خود نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اجارہ ½ حصہ پیداوار پر کاشت کراتے تھے۔ اور اب ان زمینوں پر سرکار نے قبضہ کر لیا ہے۔ ہزاروں ایسے اصل مالک اور قابض جنہوں نے یہ زمینیں بطور غلبہ یا خرید حاصل کیں موجود ہیں جن کو حکومت نے بے دخل کر دیا ہے۔ ان میں بعض بڑے جاگیردار تھے اور عموماً چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے جن کے پاس چند ایکڑ ہی آبائی زمین تھی۔

۷۔ اب مستقل حکومت کے انعقاد سے وہ سب لوگ جو طبقہ خوانین سے تعلق رکھتے تھے۔ مفلس اور گمنام ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے کئی سال تک حملہ آوروں کا مقابلہ مردانگی سے کیا۔ لیکن سکھوں نے چالاکی سے ان میں تفرقہ ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے ان میں اختلاف تھا۔ سکھ چند لوگوں کو جاگیریں دے کر قوم کے خلاف ان کو استعمال کرتے تھے۔ اس سے سکھوں نے اپنے قدم مضبوط کر لئے تو بہت سے لوگوں کو دی ہوئی جاگیریں ضبط کر لیں اور بہتوں کو لوٹ لیا اور بعضوں کو قتل کر دیا۔ اگر لوگوں میں بغاوت کے آثار شروع ہوتے تو سکھوں نے پھر پرانے طریقے استعمال کئے۔ اور پھر سے جاگیریں دیں لیکن ان کا منشا صرف موقع کی نزاکت کو ٹالنا ہی ہوتا تھا حالانکہ ان کی عطائیگی مضبوط عہد و پیمان کے ساتھ ہوتی تھی۔

۸۔ برطانیہ حکومت کا بندوبست اسی طرح کی ایک عام ملکی شورش کے وقت ہوا جب کہ جموں حکومت نے سابق پالیسی کے جاگیروں کا معاملہ فراخدلی تھی افسر بندوبست ان حالات سے جن کے ماتحت امن کو ان جاگیروں سے خریدا جا چکا تھا۔ باخبر تھا اور وہ ان کو حکومت کی تفصیلات کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔

لہذا اس نے اپنے حاصل شدہ اختیارات استعمال کئے اور ان کو مستقل کر دیا یہ جاگیریں چونکہ اس معاہدہ کا حصہ نہ تھیں۔ اور اس تبادلہ سے ہزارہ پہلے ہی مستقل کر دی گئی تھیں۔ اس واسطے لاہور حکومت پر اس سے کوئی بار نہ پڑا۔

۹۔ بہت سی ایسی جاگیریں ملک کے رؤسا کو خاص امداد کے طور پر ہیں۔ مثلاً جہانداد خان (نواب امب) کی جاگیر۔ اس جاگیر کی آمدنی ۸۰۷۵ روپیہ تھی اور سکھ حکومت کی فوج کا جو اس علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھی جاتی تھی۔ بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ تھا۔ اب اس جاگیر کی منظوری سے وہ سب خرچ غیر ضروری ہو گیا ہے۔ اب لوگ برطانوی حکومت کے زیر سایہ محفوظ ہیں۔ اور شمال کی جانب اس جاگیر کے بن جانے سے وہ نواب امب کی لوٹ مار سے بھی محفوظ ہو گئے ہیں۔

اسی طرح سادات کاغان کی اٹھارہ سو روپیہ کی جاگیر کی وصولی پر بھی اتنا ہی خرچ آتا تھا۔ اور اگر اس کی وصولی اسی طرح تھانہ کے ذمہ رہتی تو اس کے دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ فکر ہی لگا رہتا۔ یہی بات محمد امین خان گڑھی اور عطا محمد خان اگرور والے کی جاگیروں پر صادق آتی ہے۔ یہ جاگیریں خطرناک سرحدوں پر ہیں اور ان علاقوں کی حفاظت کے لئے بہت بڑے ذمہ دار جاگیرداروں کی ضرورت ہے جن کا اثر و رسوخ ان علاقوں میں ہو۔ یا تھانہ دار بمعہ بہت سے سپاہیوں کے جن پر کافی خرچ ہو رکھے جائیں۔ پہلی صورت بہت کم خرچ والی اور میری رائے میں امن کے لئے زیادہ پسندیدہ ہے۔

نمبر ۲۰۱ کیمپ نواں شہر مورخہ ۹ رمئی ۱۸۵۳ء

میجر ایچ۔ بی۔ ایڈورڈ۔ سی۔ بی۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ بنام پی میلول سکرٹری چیف کمشنر لاہور

میں آپ کے خط نمبر ۳۹۶ مورخہ ۹ راپریل ۱۸۵۳ء کی ہدایت کے مطابق نقشہ نمبر ۳ جس میں میجر ایبٹ نے ان بارسوخ لوگوں کی فہرست پیش کی تھی جو ۱۸۴۸-۴۹ء کی بغاوت میں بے دلی اور بے اختیارانہ شامل ہو گئے تھے۔ پھر سے تیار کر کے اور درست کر کے بھیج رہا ہوں۔

۲......۳......۴......۵......۶......۷......۸......۹......۱۰......

(یہ سب پیراگراف انعام اور پنجوترہ کے حساب کے متعلق ہیں۔ ش ب)

۱۱۔ ان واقعات کے پیش نظر جو میجر ایبٹ نے تحریر کئے اور ان سب لوگوں کی مکمل معذوری (سوائے دھنوڑیوں کے) اور کافی عرصہ اس واقعہ پر گزرنے کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر جو اس فہرست میں

درج ہیں، واقعاتی رُو سے بھی رحم ہی کی نظر کی جاوے۔ (فہرست میں عموماً تربیلہ کے لوگوں کے نام ہیں۔ ش ب)

اس خط کا مسودہ جو سابق بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس نظامت) کے صدر نے ۲۰ رجولائی ۱۸۵۲ء میں بنام سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم لکھا تھا حسب ذیل ہے۔

"جولائی ۱۸۵۲ء نے نقشہ جاگیرداران ہزارہ بورڈ کو واپس کرتے ہوئے لکھا تھا۔ کہ معلی القاب گورنر جنرل ان سفارشات کو منظور نہیں کرتے۔ ان سفارشات پر مزید روشنی چاہتے ہیں۔ یہ نقشہ جات حسب ہدایات پھر سے مزید غور اور نظر ثانی کر کے تیار کئے گئے ہیں لیکن پھر بھی کافی روشنی بعض امورات پر نہیں پڑ سکی۔ حالانکہ یہ نقشے کئی دفعہ میجر ایبٹ اور دوسرے متعلقہ حلقوں کو واپس کئے گئے لیکن وہ بھی اس پر خاطر خواہ روشنی نہ ڈال سکے۔ لہذا یہ پھر پیش کئے جاتے ہیں۔

۲۔ ہزارہ کے حالات مخصوص قسم کے ہیں۔ بلحاظ محل وقوع بھی اور بلحاظ ملکیت کے بھی۔ اس میں ہزاروں (جیسے کہ ضلع کے نام ہزارہ سے واضح ہے) رؤسا۔ و خوانین ہیں۔ ضلع کا رقبہ تین ہزار مربع میل ہے جس میں ۹/۱ حصہ پہاڑی ہے اور باقی تنگ وادیاں ہیں۔ جو خاص میدان ہزارہ سے چاروں طرف پہاڑوں کے اندر چلی گئی ہیں اور ہزارہ کا میدان بہ مشکل پچاس مربع میل ہو گا۔ پہاڑ سخت چٹانوں کے اور بہت خطرناک ہیں۔ جن میں تنگ اور بہت تھوڑے پیدل راستے ہیں۔ ان پہاڑوں میں جنگجو اور سخت طبع قبائل بستے ہیں یہ قبائل میدانی علاقوں کے لئے معمولی سپاہی ہیں۔ لیکن اپنے پہاڑی پناہ گاہوں میں زبردست مقابل ہیں۔

۳۔ یہ علاقہ کبھی بھی پورے طور سے فتح نہیں ہو سکا۔ یہاں تک کہ انہوں نے نہ کبھی شاہان دہلی یا کابل کو کوئی خراج دیا اور نہ ہی حاکمان پنجاب ان کو کسی طرح سے تنگ کر سکے۔ بلکہ ان لوگوں نے ہمیشہ اپنی ہی شرائط منوائیں اور شاہراہ عام از لاہور تا پشاور کے دونوں طرف آباد ہونے کی وجہ سے ہمیشہ مالیہ کی بجائے بطور رشوت ہی کچھ وصول کرتے رہے۔

۴۔ سکھ ان کو تنگ کرتے رہے لیکن مطیع نہ کر سکے۔ بہت دفعہ قابل سکھ سرداروں کے ماتحت فوجوں کو ان مسلح زمینداروں نے شکست دی۔ اگرچہ ظلم و جور اور فریب سے سکھ اپنا قدم یہاں جمانے میں کچھ عرصہ کے لئے کامیاب ہو گئے۔ اور اپنے چھوٹے بڑے قلعوں سے جو سو سے کم نہ تھے انہوں نے دریائے سندھ کے کناروں اور ہر پہاڑ کی چوٹی کو آماجگاہ بنا لیا۔ اور اس طرح گویہ ملک عارضی طور پر مطیع کر لیا گیا۔ لیکن اس فوجی خرچ نے سب آمدنی کو ہضم کر لیا۔ (اور یہی) ہزارہ کا ہر مسلمان باشندہ بغاوت

کے لئے ہر موقع کی تاک میں رہتا تھا اور یہ موقع ان کو ستلج کی جنگ نے مہیا کردیا۔ اور سب قلعے ان مسلح زمینداروں نے اپنے خوانین کے زیر علم سکھوں سے چھین لئے۔ اور یہاں تک کہ اس ضلع کے دار الخلافہ ہری پور کا قلعہ بھی انہوں نے مار لیا۔ اور مولراج حکومت سکھ کے گورنر کو ملک سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔

۵۔ میدانی اور پہاڑی علاقہ کی تقسیم بموجب معاہدہ قصور، ہزارہ کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ کو دیا گیا۔ لیکن یہ جلدی ہی معلوم ہوگیا کہ وہ اس پر قابض رہ کر امن قائم نہیں رکھ سکتا اور وہ سکھوں کے طرز پر فتح و شکست میں کبھی کسی قبیلہ یا اس کے لیڈر کو قتل کرے گا جس کے بدلے میں اس کی فوج قتل کی جائے گی اور اس طرح سے سب سرحد پر شورش پیدا ہو جائے گی۔ اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۴۶ء میں ریذیڈنٹ نے گورنمنٹ کی منظوری سے سکھ دربار اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے سامنے علاقہ تبدیل کرنے کی تجویز پیش کی۔ دونوں طرف کی بہت حیص بیص کے بعد یہ تجویز اس شرط پر منظور کرلی گئی کہ پہلے ہزارہ کا منصفانہ بندوبست کرلیا جائے۔ اور ہزارہ میں تمام جاگیریں اور انعام مہیا کرنے کے بعد جو آمدنی ہو اس کے نصف کے حساب سے مہاراجہ گلاب سنگھ کو دوسری طرف علاقہ دیا جائے۔

۶۔ یہ حالات تھے جن کی بنا پر انگریزی حکام نے جاگیرداروں کے حقوق کی ضمانت اس فیصلہ کے بنا پڑی تھی جو میجر ایبٹ نے مقرر کیا تھا۔ میجر ایبٹ کو اس وقت سرحد کی حد بندی کے بعد اس مشکل کام پر لگایا گیا تھا۔ تاکہ وہ ہزارہ کا بوجھ ہلکا کرے۔ اور ظلم اور لوٹ کی جگہ عدل و صلح سے امن قائم کرے۔

۷۔ یہ سکیم فوراً کامیاب ہوئی اور اس وقت سے آج تک کامیاب ہے۔ بہت سے سردار و خوانین نے جو اگرچہ چھوٹے درجہ کے ہیں لیکن مغرور ہیں۔ پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ ان کی اطاعت کے بعد لوٹ مار نہیں ہوئی اور میجر ایبٹ کے زیر سایہ ان کے حقوق اور جذبات محفوظ ہیں۔ اسی واسطے وہ متحدہ طور پر سکھ فوج کی بغاوت کے دوران میجر ایبٹ کے ساتھ رہے۔ اور نہ صرف اسی وقت جب کہ لاہور سے نامہ و پیام کٹ چکا تھا۔ بلکہ اس وقت بھی جب کہ دوست محمد خان بھی جنگ میں شامل ہوگیا تھا ان میں سے بہتوں نے میجر ایبٹ کا ساتھ صدقدلانہ طور پر دیا حالانکہ ان کی زمینوں پر دشمن نے قبضہ کرلیا تھا اور ان کی عزیز ترین متاع تک بھی خطرہ میں تھی۔

۸۔ اگر اس پر بھی بورڈ کی سفارشیں بہت فراخدلانہ معلوم ہوں تو ان کی درخواست ہے کہ معلی القاب جناب گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل ان پر یہ باور کرنے کی مہربانی کریں گے کہ یہ تمام سفارشات ملک کے حالات ماضی و حال پر مکمل غور کرنے کے بعد اور مکمل یقین کے ساتھ اس واسطے کی گئی ہیں۔ کہ یہ طریقہ نظم و نسق بہت ارزاں اور مفید ہے۔ گورنر جنرل کو معلوم ہے کہ بورڈ کی سفارشات کسی طرح بھی میجر ایبٹ کی سب سفارشات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے اغماض نہیں کرسکتے کہ ہزارہ جس کے اندر اور باہر اردگرد میں سامان بدامنی موجود ہیں۔ مدت سے امن سے محروم رہا ہے۔

۹۔ بورڈ نے نہ صرف سابق سکھ افسران اور سابق سکھ حاکمان ہزارہ مثلاً راجہ تیج سنگھ رائے مول سنگھ دیوان مولراج وغیرہ جنہوں نے ہزارہ میں حکومت کی۔ بلکہ مسٹر کارٹ لینڈ اور میجر چیمبرلین سے جو اس ملک سے خاص طور سے واقف ہیں۔ مشورہ کیا ہے۔ ان سب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ دس بارہ ہزار روپیہ سالانہ جاگیریں (جب پہلی جاگیریں خالی ہوتی جائیں) ان لوگوں کو دینا جو صاحب رسوخ ہوں، ملک کے امن کے لئے فوجوں کے رکھنے سے بہت بہتر ہیں۔ میجر ایبٹ نے لکھا ہے کہ وہ سب رقم جتنی کہ اس نے نئی جاگیروں کی ایزادی میں خوانین اور ان کے پیروؤں کو عطا کی ہیں جنہوں نے دوران جنگ میں کمال وفاداری سے اس کی خدمت کی ہے۔ صرف ۱۶۰ سپاہیوں کی تنخواہ کے برابر ہے۔ بورڈ کی رائے میں یہ سب رقم ایک پیدل فوج کی کمپنی کی تنخواہ ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ ایک شخص کی ناراضی یا بے اطمینانی خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے سے گاؤں کا نمبردار ہی کیوں نہ ہو بغاوت کی آگ کا ایک ایسا شعلہ بھڑکا سکتا ہے جس کو فرو کرنے کے لئے رجمنٹوں کی ضرورت ہوگی اور جو خرچ اس طرح سے ہوگا وہ کئی گنا اس تجویز شدہ خرچ سے زیادہ ہوگا۔

۱۰۔ جناب معلی القاب گورنر جنرل با جلاس کونسل شرائط طے شدہ کے ملاحظہ سے معلوم ہوجائے گا۔ کہ یہ دوامی جاگیریں خاص طور پر حکومت کی خدمت بوقت ضرورت کرنے کے لئے ہیں۔ اور نیز یہ کہ ہر جاگیردار کی وفات کے بعد حکومت کو اس کے جانشین کا اختیار رہوگا۔ اور اس طرح سے کوئی نااہل فاتر العقل یا ناپسندیدہ شخص جاگیردار نہیں بن سکے گا۔ اس طرح کی غیر یقینی مشرق کے رہنے والوں کے مزاج کے عموماً موافق ہے اس طرح کی شرط سے اُن کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ ان کے خاندان کا نام باقی رہے گا۔ اور اگر ان کی اولاد نے کوئی خاص نافرمانی نہ کی تو ان کے ذریعہ معاش ملتا رہے گا۔ اور اگر قابل انسان بھی خاندان میں ہوا تو اس کو یہ اعزاز ملتا رہے گا۔ بورڈ یہ سمجھتا ہے کہ اس شرط کی وجہ سے خاندان کے افراد کو خانی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانی کرنے کا موقع ملے گا۔ تاہم ان کی آپس میں ریشہ دوانی اس

سے بہتر ہے کہ وہ حکومت کے خلاف ریشہ دوانی کریں جیسا کہ حال میں ان کی سفارش برائے خانی علاقہ یوسف زئی میں واقعہ ہوا۔ بہر حال بورڈ بڑے لڑکے کے حقوق جانشینی ہی کی حمایت کرے گا بشرطیکہ وہ اور لحاظ سے اس کے قابل ہو گا۔ بورڈ اس جانشینی کے لئے خان کے لڑکوں یا بھتیجوں میں سے قابل ترین شخص کی تلاش نہیں کرے گا۔ بلکہ بڑے حقدار لڑکے کو وراثت سے صرف اس حال میں محروم کرے گا جب کہ وہ یقینی طور پر نااہل یا گورنمنٹ کا غدار ہو گا۔

۱۔ میجر ایبیٹ نے جہانداد خان (نواب امب) کی جدی جائداد کو آزاد علاقہ سمجھتے ہوئے شامل نہیں کیا بورڈ اس کی اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بورڈ جہانداد خان کے متعلق موجودہ طریقہ کو فوراً بدلنا چاہتا ہے۔ یا اس کو سکھوں کے وقت کے رتبہ اعزاز سے کم کرنا چاہتا ہے لیکن بورڈ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو کیوں خود مختار سمجھا جائے۔ اس واسطے بورڈ جہانداد خان کے علاقہ کے متعلق میجر ایبیٹ کی رپورٹ مورخہ ۱۵ر جون ۱۸۵۱ء کو ساتھ شامل کر کے بھیج رہا ہے اور اس رپورٹ سے اختلاف کرتا ہے۔ بورڈ کی رائے ہے کہ جہانداد خان کو یہ بات ذہن نشین کرا دی جائے کہ وہ اپنی اس جائداد کے عوض جو دریائے سندھ کے بائیں طرف ہے وہ سرکار انگریزی کا مکمل طور پر مطیع ہے اور سرکاری فوجی خدمت کے لئے پابند ہے۔

نوٹ۔ خدمت سے مطلب فوجی خدمت ہے جو جاگیردار اور اس کے لواحقین و پیروؤں کو بوقت ضرورت کرنی ہو گی۔

دوامی جاگیر مکمل طور پر جاگیردار کی اولاد میں سے کسی کو یا جو کوئی بھی اس قوم کا خان ہو گا اس کو ملے گی لیکن یہ صاف طور پر ذہن نشین کرایا جاوے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ خان کا وارث ضرور ہی اس کا لڑکا ہو گا۔ اگر اس کا بڑا لڑکا یا نزدیکی جانشین ناقابل اور نااہل بہ لحاظ اخلاق، رسوخ اور انتظامی قابلیت یا حکومت انگریزی کا جس کی طرف سے اس کو جاگیر عطا ہوئی ہے غدار ہو گا تو یہ صورت برقرار نہ رکھی جائے گی۔

جاگیریں۔ اضافہ ایزادی ۱۸۵۳ء

۱۔ امیر زمان خان چیف آف ناڑہ وکھلابٹ ولد سعد اللہ خان۔ پرانی جاگیر مانگرائے۔ نئی جاگیر کاگ اور بصیرو۔

موجودہ جاگیر بحساب روپیہ کمپنی ۔/۴۴۶ روپیہ

سفارش ایزادی از میجر ایبیٹ ۔/۱۵۵۶ روپیہ میزان کل ۔/۲۰۰۰ روپیہ

اولیں تاریخ عطائیگی ۱۸۲۵ء جب اس نے طویل اور باہمت مقابلہ کے بعد سکھوں کی اطاعت قبول کی۔ یہ جاگیر ۱۸۲۵ء میں سردار ہری سنگھ نے دی اور اس کی تجدید مہاراجہ گلاب سنگھ نے کی۔ خلاصہ سندات قدیم۔ پرانی سندات گزشتہ جنگ کے دوران میں دریائے سندھ میں ضائع ہو گئیں۔ یہ سندات بہت سے دیہات میں انعام کے متعلق تھیں اور یہ میں (میجر ایبیٹ) نے بہ حیثیت انگریزی ثالث کے یک جا بندوبست ہزارہ ۱۸۴۶ء میں جمع کی تھیں۔

یہ ایزادی جاگیر میر زمان خان کے کیریکٹر، مقامی رسوخ اور گزشتہ جنگ کی خدمات وغیرہ کے سلسلہ میں کی گئی۔

میر زمان خان ہزارہ کے رؤسا میں سے پہلا رئیس تھا جس نے سرکار انگریزی کی جنگ ستلج کی فتح کے بعد جب کہ ہزارہ نے سکھوں سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ سرکار انگریزی کی اطاعت قبول کی۔ اس وقت اس نے ناڑہ کے مقام پر سکھ فوجوں کو دو دفعہ شکست دی تھی۔ اس کی اطاعت نے ہزارہ کے بڑے قلعہ یعنی گندگر کی چابی انگریزی حکومت کے ہاتھ میں دے دی۔ جب چتر سنگھ کی بغاوت نے زور پکڑا تو ہزارہ میں موجود انگریز افسران نے ناڑہ کے مقام پر اپنا کیمپ بنایا۔ کیونکہ اس مقام پر ہی سکھوں کو بڑی شکست ہوئی تھی۔ اور دوسری زیادہ وجہ یہ تھی کہ میر زمان خان اور اس کے خاندان کی وفاداری اور شجاعت پر مکمل اعتماد تھا۔ مکمل سات ماہ تک جب کہ بہت مایوس کن اطلاعیں آ رہی تھیں۔ اس کی وفاداری و شجاعت کی آزمائش پوری طرح ہوئی جب کہ سکھوں اور درانیوں کی فوجیں نظر کے سامنے کیمپ لگائے پڑی تھیں۔ مزید یہ کہ چتر سنگھ اور دوست محمد خان کی طرف سے بہت فراخدلانہ انعام و جاگیر کی پیش کش دی جاتی رہی۔ بایں ہمہ میر زمان خان کی شجاعت و وفاداری اسی طرح اپنی جگہ پر قائم رہی اور جب اس کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ برہنہ شمشیر بدست کشن گڑھ کے قلعہ (ہری پور) پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک ہزار سکھ فوج کے سپاہیوں کو جو قلعہ سے باہر آ ہی گئی تھی بہت کشت و خون کے بعد پسپا کر دیا۔

ہزارہ میں اس کا مقام رہائش ہزارہ کے سب مقامات سے بہت اہم ہے جس سے سکھوں اور درانیوں کی فوجیں ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ گزشتہ جنگ کے تمام عرصہ میں انگریز افسر اس کے مہمان رہے۔

۲۔ قلندر خان و عبداللہ خان پسران سعداللہ خان برادران میر زمان خان، وفاداری اور شجاعت میں میر زمان خان کے ساتھ پیوستہ رہے اور بہترین خدمات ادا کیں۔ دونوں کو ۸۵/۱ روپیہ و ۱۰۰/۱ روپیہ ذاتی و دوامی طور جاگیر دی گئی۔

پرانے جاگیرداروں کی فہرست

۱۔ راجہ علی گوہر خان رئیس قوم گکھڑ ساکن خانپور، پسر شیر محمد خان عمر تقریباً ۵۶ سال، اولاد سلاطین گکھڑ علاقہ دوابہ (ضلع جہلم)

بارہ موضعات ان کی جاگیر ہیں۔ جو/ ۳۲۹۲ روپیہ گوہری دیہہ ۱/۸/۲۸۸۰ کمپنی روپیہ

کیفیت جاگیر :۔ ۱۔ تین گاؤں دیوان سنگھ اور مہاراجہ گلاب سنگھ نے دئیے۔

۲۔ تین گاؤں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے دئیے۔

۳۔ ایک گاؤں کنور پرتاپ سنگھ اور دیوان مولراج نے دیا۔ ۴۔ ایک گاؤں کنور پرتاپ سنگھ نے۔

۵۔ تین گاؤں دیوان مولراج۔ ۶۔ ایک گاؤں دیوان ہری چند نے۔

حالات ذاتی۔ راجہ علی گوہر خان، گکھڑ قوم کا سردار ہے۔ جس نے زمانہ سلف میں خان پور پر حکومت کی۔ شاہان دہلی کی طرف سے ان کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ اور بطور نذرانہ وہ شکاری کُتّے اور باز ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ راجہ علی گوہر خان اونچے درجہ کا رئیس ہے اور بہت معزز ہے۔ وہ جنگ سکھاں میں وفادار رہا۔

۲۔ جہانداد خان ولد پائندہ خان رئیس مغربی تناول عمر تقریباً ۳۲ سال

جاگیر میں ۲۸ دیہات۔ نقدی ۶۵۷۸ روپیہ = ۰-۱۲-۵۷۷۵ روپیہ کمپنی

کیفیت۔ صوابی میرا، سردار لہنا سنگھ نے دیا۔ اور باقی مہاراجہ گلاب سنگھ نے۔ جن کی تصدیق انگریزی ملازمت دمیجر ایبٹ نے کی۔ یہ جاگیر سرکار انگریزی کی خدمت کے صلہ میں مستقل کر دی گئی۔ یہ پابند شرائط ذیل سرکار انگریزی کو کسی وقت بھی قلعہ جات دربند۔ مانک گڑھ۔ رُت گڑھ اور ہلک پر قبضہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ اور دریائے سندھ کے تمام گذر دکشتیوں کے اڈے پر قبضہ کرنے کا حق ہوگا۔ جو اس وقت جہانداد خان کے قبضہ میں ہیں۔ اور اس جاگیر کے علاقہ سے مالیہ کی وصولی سرکاری کاروار اس شرح پر جو فوراً تشخیص کی جائے گی کر کے رئیس کو ادا کرے گا۔

حالات۔ یہ رئیس ہزارہ میں بہت بڑی طاقت کا مالک اور صاحب اثر ہے نرم طبیعت والا لیکن بہت وفادار ہے۔ گزشتہ جنگ کے زمانہ میں ہر وقت وہ ۲۰ سوار ۱۰۰ پیادہ سپاہیوں کے میرے ساتھ رہا۔ اس کی جاگیر ہماری سرحد اور شر پسند سرحدی لوگوں کے درمیان واقع ہے۔ جہانداد خان کو مضبوط بنانا بہتر پالیسی ہے۔ تاکہ وہ سرحدی شرارت پسند اقوام کا مقابلہ کر سکے اور ہم کو ان کے ساتھ ایک گراں خرچ جنگ سے بچائے رکھے۔

۳۔ راجہ نجف خان ولد مہند علی خان عمر تقریباً ۰ سال ~~۱۸۴۱ء~~۔ عطا کردہ دیوان جوالا سہائے جاگیر گوہر دیہہ روپیہ /۳۲۲۔ دکمپنی ۰/۱۲/۲۸۱ روپیہ

۴۔ راجہ قربان علی ولد مہند علی خان۔ عطا کردہ دیوان ہری چند ~~۱۸۴۱ء~~ جاگیر گوہر دیہہ روپیہ /۲۰۸ کمپنی /۱۸۲

۵۔ راجہ فیروز خان ولد راجہ علی گوہر خان (اس فہرست کا ۱) عمر تخمیناً ۲۲ سال۔ عطا کردہ مہاراجہ گلاب سنگھ سمت ~~۱۹۳۸~~ توثیق بندوبست دسمبر ~~۱۸۴۷ء~~ گوہر دیہہ روپیہ /۶۶۰ کمپنی روپیہ ۰/۸/۵۷۷

۶۔ راجہ غلام محمد خان ولد سید محمد خان عمر ۳۲ سال۔ عطا کردہ دیوان ہری چند ۱۲ پھاگن سمت ~~۱۹۰۴~~ ~~۱۸۴۳ء~~ رقم گوہر دیہہ روپیہ ۰/۲۲۵ = ۰/۱۴/۱۹۶ کمپنی دیہہ۔ یہ پرانی حکمران قوم گکھڑ کا فرد ہے جس کی خانپور پر ۴۰ سال پہلے تک حکومت رہی۔

۷۔ راجہ حیدر بخش خان ولد راجہ نجف خان (فہرست ہذا کا ۳) عمر ۴۵ سال۔ جاگیر گوہر دیہہ روپیہ /۱۲۰۰ کمپنی روپیہ /۱۰۵۰ عطا کردہ مہاراجہ گلاب سنگھ بذریعہ دیوان ہری چند ہاڑ سمت ~~۱۹۰۳~~ بکرمی ~~۱۸۴۲ء~~ یہ خان پور کے راجاؤں کی ایک شاخ کا سَرِ دار ہے۔ ان راجاؤں کے اس ضلع میں حکومت رہی ہے۔ اس نے سرکار انگریزی کی خدمت ملتان کے جنگ میں کی اور گزشتہ جنگ کے دوران بھی۔

۸۔ راجہ حسو خان ولد راجہ نجف خان عمر ۳۰ سال۔ راجہ نیاز علی خان ولد سید محمد خان۔ جاگیر گوہر دیہہ ۴۰۰ روپیہ = ۳۵۰ روپیہ کمپنی۔

۹۔ مولوی محمد علی ولد میر احمد خان ساکن اچھڑی پکھل عمر ۵۶ سال سابق آتالیق سر ڈبلیو میکناٹن۔ جاگیر پرگنہ گڑھیاں تناول۔ گیارہ موضعات گوہر دیہہ روپیہ ۱۰۵۶/ = ۹۲۴ روپیہ کمپنی۔ عطا کردہ مہاراجہ دلیپ سنگھ بعوض زرخیز جاگیر علاقہ کونش۔ یہ پکھلی ہزارہ کا رہنے والا ہے۔ جو کہ سر ڈبلیو میکناٹن کا اتالیق تھا۔ ہزارہ کی شمالی سرحد از اگرور تا کونش کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اور وہ اس علاقہ

کے دروں سے ترنی (مال مولیشی وغیرہ کی آمد و رفت پر محصول) لیا کرتا تھا۔ قوتِ فیصلہ و عظیم جرأت کا مالک تھا۔ اس نے درہ کونش کی آمدنی کو بہت جلدی تین گنا کر دیا۔ جس کی سالانہ مالیت ۳۵۰۰/- تھی۔ جب کہ محمد امین خان (ساکن گڑھی) نے دیوان مولراج کی طمع و لالچ کی عادت کی بنا پر اس کو بے دخل کرنے کا حکم دیوان مولراج سے لے لیا۔

گزشتہ جنگ میں یہ بہت وفادار سرگرم اور مفید ثابت ہوا۔

۱۰۔ محمد امین خان۔ رئیس پکھلی پسر حبیب اللہ خان ساکن گڑھی حبیب اللہ عمر ۴۰ سال۔ جاگیر ۱۹ دیہات واقع پکھلی، درۂ کنہار اور پرگنہ کونش۔ مالیت۔ گوہر دیہہ روپیہ ۵۰۰۰/- (پانچ ہزار) ابتدا میں یہ جاگیر سردار ہری سنگھ نے عطا کی تھی۔ اس کے بعد خدمات کے صلہ میں ۔ بہ سفارش لفٹیننٹ لمسڈن اور مسٹر وانز اگنیو، مہاراجہ گلاب سنگھ نے کنہار و کونش کے علاقہ ۵۰۰۰/- روپیہ جاگیر میں دے دئے اور اس کے گزشتہ قصور معاف کر دئے۔

ڈپٹی کمشنر کے ریمارک۔ اس کا پکھلی کا رسوخ حکومت کے کسی کام کا نہیں۔ بلکہ میری رائے میں مضر ہے۔ یہ پکھلی کا آبائی (دشتینی) رئیس ہے اس کا رسوخ اب کم ہو رہا ہے۔ خود تو بے ضرر سا انسان ہے لیکن اپنے سازش کنندہ کارداروں کے زیر اثر ہے۔ اور ان کا خیال ہے کہ اگر سرحد پر امن ہو گئی تو خان کی اہمیت نہ رہے گی ہزارہ کے پہلے بندوبست میں اس نے اچھی خدمت کی جس کے صلے میں اس کو جاگیر ملی۔

محمد امین خان کے آباء و اجداد علاقہ پکھلی جو مشکل سے مطیع رکھا جا سکتا تھا کے رئیس تھے۔

۱۱۔ سردار حسن علی خان رئیس کرڑال ولد مہند اخان عمر ۶۵ سال ناڑہ اور نیلاں کے پرگنوں میں دس گاؤں جاگیر میں ہیں۔ مالیت گوہری دیہہ روپیہ ۲۴۴۷/- اور کمپنی ۲۱۴۲/۲ روپے ہوتے ہیں۔

یہ جاگیر سب سے پہلے سردار ہری سنگھ نے دی اور پھر بہ سفارش سرکاری ثالث مہاراجہ گلاب سنگھ نے تجدید کی جو ۱۸۴۷ء سے اس کے قبضہ میں ہے۔

ذاتی حالات۔ اس رئیس کے اجداد کرڑال قوم کے پہاڑی علاقہ کے خود مختار رئیس تھے۔ سکھوں کے ساتھ بہت جنگ و جدال کے بعد جب کرڑال مطیع ہوئے تو سردار ہری سنگھ نے ان کو یہ جاگیر عطا کی۔ جو کہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ بعد میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے پھر دے دی۔

دریائے ستلج پر سکھوں کی شکست کے بعد یہ علاقہ آزاد ہو گیا اور پھر انگریزوں کو حکومت ہو جانے پر

مطیع ہو گیا۔

۱۲۔ عبداللہ خان ولد مہند اخان برادر سردار حسن علی خان کرڑال (نمبر ۱۱) عمر ۵۰ سال جاگیر کمپنی کا روپیہ ۱۷۵/- یہ جاگیر قلعہ ناڑہ کی خدمات کے صلہ میں دیوان مولراج و کنور پرتاپ سنگھ نے سمت ۱۸۹۸ بکرمی اور مہاراجہ گلاب سنگھ نے سنہ ۱۹۰۲ء میں عطا کی۔

۱۳۔ بہادر علی خان ولد احمد علی خان کرڑال قوم کی ایک شاخ کا رئیس عمر ۳۵ سال جاگیر کمپنی کا روپیہ ۹۸۰/- عطا کنندہ (۱) سردار ہری سنگھ و کنور پرتاپ سنگھ ۔ ۲۔ دیوان جوالا سہائے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ شرائط ۔ بد امنی اور جنگ کے زمانہ میں دو سو سپاہی پہاڑی علاقہ اور ایک سو سپاہی میدانی علاقہ میں رکھتا۔ ڈبران کی جاگیر احمد علی خان کو مالیتی ۲۰۰ روپیہ مندرجہ بالا شرائط پر دی گئی۔ نذرانہ ایک خچر اور ایک باز مقرر ہوا۔ جب سے ہزارہ مہاراجہ گلاب سنگھ سے تبدیل ہوا۔ نذرانہ موقوف کر دیا گیا۔

۱۴۔ میر غلام احمد ولد پیر شرف الدین عمر ۴۰ سال۔ جاگیر موضع پیر کوٹ مالیتی ۱۰۰/- روپیہ ۔ کمپنی ۸۷/۸ یہ جاگیر سردار ہری سنگھ و مہاراجہ شیر سنگھ اور دیوان مولراج نے سمت ۱۸۰۴ بکرمی سے عطا کی۔ یہ ایک پیر گھرانے کا فرد ہے۔

۱۵۔ غلام احمد و میر محمود پسران پیر شرف الدین ۱۹۵/- گوہری دیہہ = ۱۷۰/۱۰ کمپنی۔ عطا کردہ سرداران بالا (نمبر ۱۴) برعایت پیر گھرانہ۔

۱۶۔ عطائی خان ولد مشال خان عمر ۵۰ سال۔ جاگیر۔ پرگنہ ناڑہ نیلاں و بانڈہ عطائی خان پرگنہ میں مواضعات مجانکھ و بانڈہ عطائی خان مالیت گوہری دہ ۲۱۹/۰ روپیہ = ۱۹۱/۱۰ روپیہ کمپنی۔ عطا کردہ سردار تیجا سنگھ و سردار ہری سنگھ یہ جاگیردار قوم جدون میں صاحب رسوخ ہے اور گزشتہ جنگ میں مخالف نہیں ہوا۔

۱۷۔ نادر خان ولد مرید خان عمر ۵۰ سال موضع پھرہاڑی کا ملک۔ سردار ہری سنگھ گوہری دیہہ مبلغ سو روپیہ کی جاگیر دی جو کمپنی کے ۸۷-۸ روپیہ کے برابر ہے۔ یہ ملک وادی شنگرڑی میں صاحب اثر ہے اور حکومت کی ہر وقت اچھی خدمات کی ہیں۔

۱۸۔ پیر خان ولد قاسم خان عمر ۶۵ سال موضع جامہ کا ملک۔ اس کو سردار ہری سنگھ، پیارا سنگھ اور سردار تیجا سنگھ نے پچاس روپیہ (جو کمپنی کے ۱۲-۴۳ روپیہ کے برابر) کی جاگیروں تاریخ قبضہ ۲۲ بھادوں سمت ۱۸۹۷ ہے۔

پیر خان اور اس کا خاندان حکومت کے وفادار رہے۔ اس نے سردار ہری سنگھ کے خاندان کی اس وقت حفاظت کی جب لوگ اس کے خلاف بغاوت کر کے کھڑے ہو گئے تھے میں (ڈپٹی کمشنر کی رائے) اس جاگیر کو اور اس قسم کی دیگر جاگیرات کو ملک کے امن و امان کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

۱۹۔ حسن علی خان ولد کھیونا خان گوجر کوٹ نجیب اللہ۔ یہ جاگیر سردار چتر سنگھ ناظم ہزارہ نے ۱۸۴۶ء میں دی جس کی مالیت ۷۰ روپیہ (کمپنی کے ۴ - ۶۱ روپے کے برابر) ہے۔

اس نے گزشتہ جنگ سے پہلے قابلِ قدر خدمات کی تھیں۔ اور دورانِ جنگ و قبل اس کے وفادار رہا اس نے گندگر کے ڈاکوؤں کا مقابلہ کئی دفعہ دست بدست جنگ کے ذریعہ کیا۔ اس نے اور اس کی پارٹی نے بہت سے ڈاکوؤں کو قتل کر دیا۔

یہ جاگیر اس کی لڑکیوں کو دی جائے یہاں تک کہ وہ جوان اور شادی کے قابل ہو جائیں۔

۲۰۔ عبداللہ خان ولد جانو خان عمر ۵۰ سال ساکن بھاروکوٹ (نزد تھپلہ) مہاراجہ گلاب سنگھ کی طرف سے بوساطت بخشی ہری سنگھ ۱۹۰۳ء میں پچاس روپیہ = ۱۲/۳/۴۳ روپیہ کمپنی۔ یہ ایک بارسوخ اور سواروں کے دستے کا بہت اچھا لیڈر تھا۔

۲۱۔ آصف خان ولد میر سلطان خان عمر ۵۰ سال ترین ساکن کنڈی کابل۔ موضع توردی میں جاگیر ۱۵۰ روپیہ = ۴ - ۱۳۱ کمپنی پہلے پہل مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ۱۹۰۳ بکرمی دی۔ بعد میں دیوان جوالا سہائے نے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ۔

کیفیت۔ گزشتہ جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ صاحب اثر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

۲۲۔ حسین خان ولد نادر علی خان ساکن کنڈھی کابل جاگیر گوہری دیہہ ۵۰ روپیہ = ۱۲ - ۴۳ کمپنی کا روپیہ دیوان جوالا سہائے نے سمت ۱۹۰۳ میں از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ تصدیق کی۔ اول یہ جاگیر ۱۸۴۵ء سے ہے۔

۲۳۔ خدا بخش خان ولد کا منور خان عمر ۴۰ سال دلازاک ساکن سرائے صالح۔ موضع ایبان بانڈھی جاگیر از مہاراجہ گلاب سنگھ بذریعہ دیوان ہری چند سمت ۱۹۰۲ بکرمی مالیت ۸۰ روپیہ = ۷۰ روپیہ کمپنی۔ قوم دلازاک کے وفادار گروہ کا سردار ہے۔ باغی گروہ کی جاگیر ضبط کر لی گئی ہے اور خدا بخش خان کی جاگیر کی مستقلی کے لئے سفارش کی جاتی ہے۔

۲۴۔ بھائی دھیان داس ولد پریم داس عمر ۶۰ سال۔ سند سے ظاہر ہوتا ہے کہ سردار ہری سنگھ نے

دھیان داس کو ایک سو روپیہ کی جاگیر دی۔ جس کے عوض اب سرائے صالح میں اس کو ۶۰ روپیہ برابر ۸ - ۵۲ کمپنی کے دی گئی۔ یہ ایک مذہبی آدمی اور اس کی دعا برکت کے صلہ میں یہ جاگیر دی گئی۔ جو سمت ۱۸۹۶ سے ہے از طرف کنور پرتاپ سنگھ و سردار تیجا سنگھ۔

۲۵۔ اکبر علی خان ولد شیر خان عمر ۵۰ سال ساکن رجوعیہ۔ اس کی جاگیر ۱۰۰ روپیہ برابر ۸ - ۸۷ کمپنی کے سمت ۱۹۰۳ سے ہے۔ جس کی تجدید دیوان ہری چند نے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ کے کی۔

کیفیت۔ قوم جدون میں کافی اثر و رسوخ کا مالک ہے۔ اور ہمیشہ وفادار رہا۔ باقاعدہ حکومت ہو جانے سے اس کی بہت سی زرعی جائداد کا نقصان ہوا۔ گزشتہ جنگ میں وفادار رہا۔

۲۶۔ امیر شاہ ولد بھولا شاہ۔ عمر ۵۰ سال ساکن رجوعیہ۔ سردار ہری سنگھ نے ۵۰ روپیہ کی جاگیر جو کمپنی کے ۱۲ - ۴۳ روپیہ کے برابر ہے سمت ۱۸۹۰ میں دی۔ یہ ایک پیر گھرانہ کا فرد ہے اور قوم جدون میں صاحب اثر و رسوخ ہے۔

۲۷۔ پیر ریاض الدین ولد پیر نظر دین ساکن خان پور جاگیر ۶۰ روپیہ = ۸ - ۵۲ کمپنی دیوان ہری چند نے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ سمت ۱۹۰۲ میں دی۔ علاقہ کا پیر ہے کرڑالوں اور علاقہ خان پور کے لوگوں پر روحانی اثر رکھتا ہے۔

۲۸۔ مہتاب سنگھ ولد رام سنگھ عمر ۶۰ سال ساکن خان پور ۱۱۴ روپیہ کی جاگیر = ۱۲ - ۹۹ کمپنی روپیہ کے سمت ۱۹۰۲ میں دیوان ہری چند نے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ دی۔ یہ گزشتہ جنگ میں حاضر باش رہا۔ ہزارہ کے مالی معلومات کے متعلق کافی علم رکھتا ہے۔ نوٹ۔ گزشتہ نومبر (۱۸۵۲ء) میں مر گیا۔

۲۹۔ سردار بیگ ولد خوشحال خان بیگ عمر ۴۵ سال سمت ۱۹۰۲ سے ۸۰ روپیہ = ۷۰ کمپنی کے۔ خان پور کے علاقہ میں بطور مقدم خدمات کے صلہ میں۔

۳۰۔ شریف اور رشید شاہ عمر ۴۰، ۳۵ سال ساکن خان پور۔ اس علاقہ کی خود مختاری کے وقت سے ۱۴۰ روپیہ جاگیر = ۱۲ - ۱۱۳ روپیہ کمپنی پاتے رہے جس کی تصدیق سردار ہری سنگھ نے کی۔ پیارا سنگھ کاردار نے ضبط کر لی۔ حکومت کے ثالث (یعنی میجر ایبٹ) نے پھر جاری کر دی۔ سندات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس علاقہ کے پیر ہیں اور زمانہ قدیم سے یہ پنشن ان کو ملتی رہی ہے۔

۳۱۔ زرتان علی ولد احمد علی عمر ۴۰ سال ساکن سری کوٹ جاگیر ۱۰۰ روپیہ گوہری دیہہ = ۸ - ۸۷ کمپنی روپیہ۔

تجدید دیوان جوالا سہائے نے ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ کی ۔ یہ جاگیر سردار ہری سنگھ نے پہلے دی تھی اور سمت ۱۹۰۲ سے ان کو مل رہی ہے ۔ یہ شخص تکلیف دہ پہاڑی علاقہ سری کوٹ میں با اثر ہے ۔ بغاوت کے دوران وفادار رہا ۔ اور اچھی خدمات سرانجام دیں ۔

۳۲ ۔ نور جان نجیب، جمال، مغل خان، امیر محمد، ناصر، مشوانی ۔ ان سب کو ۳۰ روپیہ گوہری دیہہ اور ناصر کو ۴۵ روپیہ گوہری دیہہ انعام ۔ یہ صاحب اثر رسوخ ملک ہیں اور بہت تکلیف دہ پہاڑی علاقہ سری کوٹ میں رہتے ہیں ۔ یہ گزشتہ جنگ میں وفادار رہے ۔ یہ انعام سنہ ۱۸۸۱ بکرمی سے ہیں ۔ سردار ہری سنگھ اور پھر دیوان مولراج نے عطا کئے اور مہتمم بندوبست ہزارہ نے سنہ ۱۹۰۲ء میں توثیق کی ۔

۳۳ ۔ عطا محمد خان ولد غفور خان عمر ۳۲ سال سواتی ۔ رئیس اگرور ۔ جاگیر ۱۰۰۰ روپیہ گوہری دیہہ = ۸۷۵ کمپنی یہ جاگیر ۱۵ ارکا تک سمت ۱۸۹۰ بکرمی میں کنور پرتاپ سنگھ نے دی ۔ یہ اگرور کا آبائی خان اور رئیس ہے اس کا باپ خود مختار تھا ۔ یہ سرحد پر رہتا ہے ۔ اور حکومت کے لئے مفید ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہ الٹا ثابت ہوا اور غلط اطلاعیں بھیجتا ہے ۔

۳۴ ۔ فیروز خان ولد منصور علی خان عمر ۶۱ سال پٹھان ساکن تربیلہ ۔ میر امور تی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک ہزار روپیہ کی جاگیر سمت ۱۸۹۶ بکرمی میں دی ۔ جو کمپنی کے ۸۷۵ روپیہ کے برابر ہے ۔ یہ جاگیر اولاً منصور علی خان کو دی گئی تھی ۔ پھر اس کے لڑکے کے لئے حکومت کے ثالث نے ہزارہ کی مکمل اطاعت اور بندوبست کے بعد تجدید کر دی ۔ یہ سرحد پر ایک با اثر شخص ہے ۔

۳۵ ۔ ہاشم علی خان ولد رشید خان عمر ۴۵ سال ساکن شیروان ۔ جاگیر ۱۰۰ روپیہ برابر ۸۷ ۔ ۸ کمپنی روپیہ یہ جاگیر سردار ہری سنگھ نے اور پھر سردار تیجا سنگھ نے ۴۴ روپیہ سمت ۱۹۰۲ میں دی ۔ کچھ رسوخ والا انسان ہے ۔

۳۶ ۔ نصر خان ولد مقبول خان عمر ۴۵ سال ساکن شیروان ۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے سمت ۱۹۰۳ بکرمی میں ۵۰ روپیہ = ۱۲ ۔ ۳ ۔ ۴۳ کمپنی روپیہ کے دی ۔

۳۷ ۔ میر افضل ولد ناصر خان و یوسف ولد میر خان ساکن کچھی ۔ سردار ہری سنگھ نے مبلغ ۲۴۰ روپیہ جاگیر دی ۔ اس کے بعد دیوان ہری چند نے ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ تجدید کی ۔ تناول کے درہ میں یہ صاحب اثر ہیں ۔

۳۸ ۔ ہاشم علی ولد اخون زادہ و شیر شاہ ولد میراں شاہ ساکن کچھی ۔ ۸۰ روپیہ کی جاگیر سردار تیجا سنگھ

کنور پرتاپ سنگھ اور مہاراجہ گلاب سنگھ ۔ ۹ ماگھ سمت ۱۸۰۰ بکرمی سے ۔ یہ جاگیر اُن کو دس سپاہی رکھنے کے لئے دی گئی ۔ علاقہ میں ان کا قدرے اثر ہے ۔

۳۹ ۔ امان اللہ خان رئیس کھر کوٹ پسر کا موں خان تنولی عمر ۳۰ سال ۔ کُل جاگیر ۲۶۵ روپیہ = ۶ ۔ ۰ ۔ ۲۳۶ روپیہ کمپنی ۔ تاریخ عطائیگی سنہ ۱۸۸۰ بکرمی و سمت ۱۹۰۳ بکرمی ۔ دیوان ہری چند و سردار گلاب سنگھ نے سو روپیہ کی جاگیر موضع گنہاڑی میں دی ۔ دیوان ہری چند ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ نے مبلغ ۲۱۰ روپیہ کی موضع مُنگلی میں دی ۔ یہ تنولی کے خوانین میں سے ہے اور گزشتہ جنگ میں وفادار رہا ۔

۴۰ ۔ فیروز خان ولد عالم خان عمر ۳۷ سال ۔ تنولی ساکن کٹھیالہ ۔ سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۷ میں ۱۰۰ روپیہ کی جاگیر دی ۔ پھر دیوان مولراج نے سنہ ۱۹۰۲ء میں تجدید کی ۔ مہاں سنگھ نے جاگیر کے بدلہ کٹھیالہ دے دیا ۔ عالم خان کی خدمات اور حاضری کے صلہ میں کافی اثر و رسوخ کا مالک ہے ۔

۴۱ ۔ محمد خان ولد قمر علی خان عمر ۴۰ سال ۔ جاگیر موضع جلُّو (نزد کٹھیالہ) سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۷ میں ۵۰۰ روپیہ (۰ ۔ ۰ ۔ ۴۳۷ کمپنی) کی جاگیر دی سمت ۱۹۰۲ میں دیوان مولراج نے تجدید کی ۔ سوار اور پیدل پہلوئی سے سرحد پر امن رکھنے کی وجہ سے یہ جاگیر اس کو ملی ۔ یہ شخص اس سرحد پر بہت اثر و رسوخ کا مالک ہے اور اس سرحد پر جہاں ہمیشہ بدامنی رہتی تھی اس نے امن قائم کیا اور بہت اخلاص و کوشش سے بحال رکھا اس واسطے یہ جاگیر اس کو دی گئی ۔

۴۲ ۔ ولی اللہ خان ساکن نواں شہر ۔ سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۹۱ میں پچاس روپیہ جاگیر دی

۴۳ ۔ قم خان ۔ ساکن میرپور ۔ سردار ہری سنگھ نے ۶۰ روپیہ کی جاگیر سمت ۱۸۹۱ میں دی ۔ مندرجہ بالا ہر سہ اشخاص ملک کے ایک دشوار حصہ اور سرکش قوم کے درمیان صاحب اثر ہیں ۔

۴۴ ۔ زمان خان ولد رستم خان ۔ عمر ۳۵ سال ساکن مانسہرہ ۔ ۵ پھاگن سمت ۱۸۸۱ میں سردار ہری سنگھ نے ۶۰ روپیہ (۰ ۔ ۰ ۔ ۵۲ کمپنی) جاگیر دی اور سمت ۱۸۹۱ میں دیوان مولراج نے تجدید کی ۔ اس کا پکھلی میں کچھ اثر ہے ۔

۴۵ ۔ دفور خان ولد رستم عمر ۴۰ سال ۔ ساکن گڑھی پور پرگنہ بھیر کُنڈ ۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کی جانب سے دیوان کرم چند نے سمت ۱۹۰۳ ۱۹۰ روپیہ (کمپنی ۳ ۔ ۱۶۶ روپیہ) کی جاگیر دی ۔ بعوض حفاظت و امن درہ گیدڑپور از قزاق و ڈاکو ملے ۔ یہ شخص محمد امین خان گوجھی حبیب اللہ والا کا محض آلہ کار ہے اور سرکار کا مخلص خادم ۔

۴۶ ۔ لال خان ولد بہت خان عمر ۴۰ سال ساکن گلی باغ پرگنہ بھیر کُنڈ ۔ دیوان کرم چند نے ازجانب

مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۰۰۰ روپیہ (۸۷۵،۰ روپیہ کمپنی) جاگیر دی۔ یہ جاگیر اس کے پاس دیوان مولراج کے وقت میں بعوض خدمات ۲۵ سپاہیوں کے رہی جن سے درہ بٹڑ اسی کی حفاظت ہوتی تھی۔

۴۸۔ سید حسین ولد سید شاہ عمر ۵۰ سال ساکن خاص بھیڑ کنڈ جاگیر ۵۰ روپیہ گوہری دیہہ۔ یہ پرانی جاگیر ہے جس کی سمت ۱۸۹۳ میں دیوان مولراج نے خدمات کے صلہ میں تجدید کی۔ یہ شخص سرحدی گاؤں کا مالک ہے جہاں پر خطرہ کے وقت فوری طور پر مسلح لوگ سرحد کی حفاظت کے لئے جمع کئے جاتے ہیں۔

۴۹۔ گل خان ولد عبدالرحمٰن ملک ساکن خاکی۔ سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۳ میں ۶۰ روپیہ کی جاگیر دی۔

۵۰۔ مولوی محمد جان ولد سید احمد عمر ۵۰ سال ساکن ڈھوڈیال پرگنہ شنکیاری۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ نے سمت ۱۹۰۲ میں ۶۰۰ روپیہ کی جاگیر بجائے خدمات عطا کی۔ یہ اتنا قابل اثر شخص نہیں۔ بہرحال ایک مُلّا ہے اور ایسے شخص کا لڑکا ہے جس کا علاقہ میں عزت وقار ہے۔

۵۱۔ محبت خان ولد نجیب اللہ خان رئیس کل پکھل۔ صواتی، موضع جبوڑی پرگنہ بھیڑ کنڈ جاگیر ۱۰۰۰ روپیہ (۸۷۵،۰ کمپنی) سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۹۱ میں عطا کی۔ یہ پکھل کے سابق رئیس کا لڑکا اور بہت وفادار ہے۔

۵۲۔ کالا و ابراہیم خان پسران احمد علی خان عمر ۳۰ و ۳۵ صواتی موضع جبوڑی پرگنہ بھیڑ کنڈ۔ سردار ہری سنگھ نے ۱۰۰ روپیہ کی جاگیر سمت ۱۸۸۸ میں عطا کی جس کی تجدید دیوان کرم چند نے سمت ۱۸۹۰ میں کی صلہ خدمت وحاضر باشی۔ یہ ایک سرحدی جنگی گاؤں کا مالک ہے۔

۵۳۔ جھنڈو خان ولد سید شاہ خان صواتی عمر ۵۰ سال ساکن سچہ۔ پرگنہ بھیڑ کنڈ۔ سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۳ میں ۶۰ روپیہ کی جاگیر عطا کی۔ جس کی تجدید دیوان کرم چند نے کی۔ صلۂ خدمت وحاضر باشی۔

۵۴۔ سنگھر خان ولد عبداللہ خان صواتی ساکن بٹنگڑا۔ دیوان ہری چند نے ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ ۱۵ پوہ سمت ۱۹۰۳ میں ۵۰ روپیہ (۰-۱۲-۴۳ کمپنی) عطا کی۔ اس شخص کا اثر ورسوخ پکھل اور سرحد میں بہت سے رؤسا سے زیادہ ہے۔ صواتیوں کے گُشخالی قبیلہ کا سردار ہے۔

۵۵۔ لال خان ولد واصل خان عمر ۲۸ سال خاص بالاکوٹ۔ دیوان ابراہیم نے سمت ۱۸۸۹ میں ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ سمت ۱۸۹۰ میں تجدید کی۔ لال خان، کاغان، بالاکوٹ اور پکھل میں کافی اثر ورسوخ کا مالک ہے۔ اور سید ضامن شاہ آف کاغان سے رشتہ داری رکھتا ہے۔

۵۶۔ ہیبت خان ولد قمر علی خان صباتی عمر ۵۲ سال۔ ساکن بالاکوٹ خاص۔ دیوان ہری چند نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی جانب سے ایک سو روپیہ (برابر کمپنی ۸-۸۷ روپیہ) کے سمت ۱۹۰۴ میں جاگیر عطا کی۔ سرحد اور درہ کاغان کے سرے پر ایک بارسوخ ملک ہے۔

۵۷۔ ناصر علی خان ولد عبداللہ خان بالاکوٹ خاص۔ دیوان مولراج نے ۲۷۵ روپیہ (۰-۱۰-۲۴۰ کمپنی) کی جاگیر سمت ۱۹۰۲ میں دی۔ دیوان کرم چند نے ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ سمت ۱۹۰۴ میں تجدید کی۔ شرط ملازمت

۵۸۔ صفدر علی خان ولد اکبر خان عمر ۳۰ سال خاص بالاکوٹ۔ سردار ہری سنگھ نے سمت ۱۸۸۵ میں ۵۰ روپیہ جاگیر دی۔ دیوان ہری چند نے سمت ۱۹۰۳ ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ تجدید کی۔ ایک بارسوخ ملک ہے۔

۵۹۔ سید شاہ و شریف شاہ پسران عبداللہ شاہ عمر ۵۲، ۵۵ سال ساکن موضع مال مُولہ و بلاسی پرگنہ ڈومرہ۔ ڈھونڈ قوم کے روحانی پیشوا ہیں۔ اس قوم میں کوئی خان نہیں ہے۔ ان کا اثر اس پہاڑی علاقہ میں بہت زیادہ ہے۔ اور آج تک یہ وفادار رہے ہیں۔

۶۰۔ سید شاہ ولد عبداللہ شاہ عمر ۵۵ سال۔ پرگنہ ڈومرہ۔ موضع چوربٹ۔ نُورل۔ اطیمہ۔ جاگیر ۸۳ روپیہ (۰-۱۰-۲۷ کمپنی) یہ جاگیران کو ثالث میجر ایبٹ نے جو سکھ دربار اور جموں حکومت کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے آیا تھا دی۔ ان پیران کے پاس مقرر جاگیر کے لئے ایک پرانی سند ہے جو کہ ان کو ثالث نے عطا کی جب اس نے ان کی جاگیر کے مواضعات کا مالیہ کم کر دیا تھا تو یہ رقم اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے دی گئی۔ یہ مطابق احوال بالا اس علاقہ کے روحانی پیشوا ہیں۔

۶۱۔ محمد خان ولد مجا خان عمر ۳۰ سال۔ فقیر خان ولد بیج خان عمر ۵۰ سال موضع کھوٹہ۔ کاکرا۔ پرگنہ پوٹھا سردار ہری سنگھ نے ۱۲۲ روپیہ کی جاگیر عطا کی اور پھر انگریز ثالث نے تجدید کی۔ ڈھونڈ کے پہاڑی علاقہ کے بارسوخ ملک ہیں۔

۶۲۔ شاہ ولی خان ولد محمد سید خان موضع ہسر گُنتال پرگنہ پوٹھ۔ مہاراجہ گلاب سنگھ ۵۵ روپیہ کی جاگیر دی۔ ڈھونڈ کے پہاڑی علاقہ کا ایک ملک ہے جس کے لئے یہ امداد منصفانہ بھی ہے اور سیاسی طور پر جائز بھی۔

۶۳۔ عباس اخون زادہ ولد حبیب عمر ۴۳ سال ساکن بالاکوٹ۔ دیوان ہری چند ازجانب مہاراجہ گلاب سنگھ ۵۴ روپیہ جاگیر دی۔ اس شخص کا بالاکوٹ، پکھل اور کاغان میں بہت اثر ہے۔

۶۴ - سادات کاغان۔ ضامن شاہ ولد حسن علی شاہ عمر ۵۰ سال۔ فتح علی شاہ ولد فیض علی شاہ عمر ۵۰ سال
عمر شاہ و میر گل شاہ پسران فیض علی شاہ۔ ان کو کل جاگیر ۲۱۶۰ روپیہ (= کمپنی روپیہ ۱۸۹۰) دیہات سنگر،
ارگڑی۔ بٹکلا۔ گدعول۔ بائیلا۔ کوائی۔ کاغان خاص۔ منور۔ بھونجا میں عطا کی گئی تھی جس کی تصدیق
دیوان کرم چند نے از جانب مہاراجہ گلاب سنگھ دے کی۔ پھر انگریز ثالث (میجر ایبٹ) نے سادات کی ذاتی
حاضری پر مستقل کی۔

سندات - شیخ غلام محی الدین ناظم کشمیر نے سید ضامن شاہ اور سید فتح علی شاہ کی خدمات اور
حاضری کے صلہ میں ان کو وادی کاغان میں ۲۱۶۰ گوہری دیہہ روپیہ کی جاگیر مندرجہ ذیل شرائط پر دی۔

۱- ان ہر دو کے خاندان سے ایک ایک آدمی ہر وقت حاضر خدمت رہا کرے گا۔

۲- وہ کوئی ظلم و زیادتی اہلیان وادی کاغان پر نہیں کریں گے۔

یہ جاگیر وادی کاغان کے کل مالیہ کا نصف ہے۔ باقی نصف وہ سالانہ حکومت کو پیش کیا کریں گے۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کی سفارش کچھ عرصہ پہلے سید ضامن شاہ۔ فتح علی شاہ اور عمر شاہ حکومت سے
باغی تھے۔ اس لئے میں سفارش کرتا ہوں کہ ان کی ذاتی جاگیر بحق سرکار
ضبط کی جائے۔

سیرت و رسوخ دیوان ابراہیم جو مہاراجہ گلاب سنگھ کا کاردار تھا کے قتل کے بعد اور پھر ان کے
جاگیر دار بن جانے سے ان کا اثر و رسوخ انتہائی ہو گیا۔

۶۵ - حمید خان ولد منیم خان ساکن کیا۔ پار دریائے سندھ عمر ۵۴ سال۔ ۱۲۰ روپیہ کی جاگیر کنور پرتاپ سنگھ
نے سمت ۱۹۰۱ میں مواضعات تربیلہ و خان پور پرگنہ گندگر میں عطا کی۔

ڈپٹی کمشنر نے سفارش کی کہ یہ تھوڑی سی جاگیر بہت مفید ہے اس سے دریائے سندھ پار
یاغستان کے خود مختار لوگوں سے آئے دن کے جھگڑوں سے نجات ملتی ہے اور اس شخص کا وہاں بہت
رسوخ ہے۔ یہ بہت وفادار اور مفید آدمی ثابت ہوا ہے۔

۶۶ - ملک حسین ولد دارا شاہ ساکن سری کوٹ پرگنہ گندگر عمر ۵۰ سال۔ ۷۵ روپیہ (= ۶۶ کمپنی) کی جاگیر
ثالث حکومت نے ملک میں امن و امان ہو جانے پر ۱۲ ر جون ۱۸۴۵ء میں عطا کی تاکہ اس ملک کو بھی امداد
مل سکے جب کہ دوسروں کو جاگیریں مل چکی ہیں۔ سند میں مذکور ہے کہ جب اور جاگیر داروں کو جاگیریں دی

جا رہی تھیں تو یہ بیمار تھا اور حاضر نہ ہو سکا۔

سیرت و رسوخ یہ سری کوٹ ملکوں سے یہ ایک فسادی ملک ضلع بھر میں ہے اور اس کا علاقہ میں
کافی اثر ہے۔

۶۷ - قاضی محمد حسین ولد نسیم ساکن بھی کوٹ پرگنہ ناڑہ نکشی۔ دیوان مولراج حاکم ہزارہ نے ۲۸ ربیساکھ سمت ۱۹۰۲
میں تیس روپیہ کی جاگیر بطور امداد بہ حیثیت قاضی ہونے کے دی۔ قوم کرڑال میں قدرے رسوخ رکھتا ہے۔

۶۸ - اسمٰعیل، محمد طاہر پسران محمد صاحب خان ساکن اسمٰعیل پرگنہ دھمتوڑ۔ سردار ہری سنگھ نے ۲۶ ماگھ
۱۸۹۹ء میں ۱۹۰ روپیہ (کمپنی کے ۱۶۷ روپیہ) جاگیر موضع ٹنگی میں دی۔ یہ دونوں اشخاص ضلع ہزارہ میں
کافی اقتدار اور عزت کے مالک ہیں۔ اور گزشتہ بغاوت میں وفادار رہے۔ اور اپنے اثر و رسوخ سے حکومت
کی بہت خدمت کی۔

۶۹ - عمر خان ولد شیر محمد وکیل عطا محمد خان۔ خان اگرور۔ کنور پرتاپ سنگھ ۸ پھاگن سمت ۱۹۰۳ چالیس روپیہ
(= ۳۵ کمپنی) کے دی۔ چست اور قابل آدمی ہے۔ وادی اگرور میں اثر و رسوخ رکھتا ہے۔

۷۰ - منور شاہ ولد سید احمد شاہ، نوکوٹ پرگنہ پکھلی۔ دیوان کرم چند اور ناظر ممگوں نے ۳۰ ساون سمت ۱۹۰۱
میں ۳۲ روپیہ (= ۲۸ کمپنی) جاگیر دی۔ یہ گزشتہ جنگ میں بہت وفادار رہا۔ کاغان میں اثر رکھتا ہے۔

۷۱ - مظفر خان ولد ناصر خان رئیس غدم۔ خود مختار۔ سردار چتر سنگھ اور حکومت کے ثالث نے ۱۰ ر جولائی
۱۸۴۸ء بہ شرط ملازمت ۳۰۰ روپیہ (= ۲۶۲ کمپنی) کی جاگیر موضع پنجول۔ بھوگڑ منگ میں دی۔

سیرت و رسوخ میں اس جاگیر کو بہت ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ اس کی وجہ سے شمالی خود مختار قبائل
کے تصادم سے بچ جاتے ہیں۔

۷۲ - حضرت نور سید ولد سید حسین ساکن سوا کی (اغلباً صوابی۔ ش ب) پرگنہ بھاروکوٹ۔ راجہ تیجا سنگھ
نے ۷ ر ماگھ سمت ۱۸۹۶ میں مبلغ سو روپیہ (= ۸۷.۸ کمپنی) جاگیر موضع سوا کی میں دی۔ بدر تھو کے علاقہ میں کافی اثر
و رسوخ والا سید ہے۔

وہ جاگیریں جو ضلع راولپنڈی سے ضلع ہزارہ کو منتقل ہوئیں

(یہ سب قوم تارخیلی کی جاگیریں ہیں۔ ش ب)

۷۳ - ارسلہ ولد قوی داد خان عمر ۵۰ سال۔ موضع جموں پرگنہ کھڑی۔ نصف مبلغ ۲۵۰ روپیہ (۱۲۵ - ۲۱۸ کمپنی)

۷۴ - نور اللہ ولد ظفر خان عمر ۴۰ سال۔ جاگیر نصف موضع عیسیٰ اور نصف قاضی پور ۴۸۵ روپیہ (= ۴۲۴-۸-۰ کمپنی)

۷۵ - محمود ولد نواب خان۔ عمر ۳۸ سال جاگیر نصف غازی اور نصف ڈھیری ۷۵۰ روپیہ (= ۶۵۶-۴ کمپنی)

۷۶۔ زرداد ولد جنگ باز خان عمر ۴۰ سال جاگیر نصف موضع بھائی اور نصف کھوئی درہ ۲۸۰ روپیہ۔ (= ۱۰۴-۸-۳۳ کمپنی)

۷۷۔ حبیب ولد مبارز خان عمر ۶۰ سال۔ نصف کوٹ۔ جمال ولد سرفراز خان عمر ۴۰ سال موضع گھاڑھا موہانڑہ۔ بہادر ولد نصیر خان عمر ۴۰ سال۔ کل جاگیر ۲۷۵ روپیہ = ۶-۴-۲۳۴ کمپنی کا روپیہ۔

۷۸۔ محمود ولد نواب خان عمر ۳۶ سال، جاگیر موضع بھرواسہ ۶۰۰ روپیہ = ۵۲۵ روپیہ کمپنی۔

۷۹۔ سردار خان ولد آزاد خان عمر ۴۰ سال۔ محمود ولد سعادت خان عمر ۳۰ سال۔ کرم خان ولد عطا محمد خان عمر ۱۶ سال جاگیر موضع سلم کھنڈ، جھلیاری، ترموں ۱۰۰۰ روپیہ = ۸۷۶ کمپنی کا روپیہ

۸۰۔ محمود خان ولد نواب عمر ۳۰ سال۔ سردار خان ولد آزاد خان۔ جاگیر ¾ باندھی اور ¼ چمیاری ۸۰۰ روپیہ = ۷۰۰ روپیہ کمپنی

۸۱۔ حیات خان، رحمت اللہ، عباس خان پسران میر زمان خان۔ جاگیر بدھاروس ۱۰۰۰ روپیہ = ۸۷۵ کمپنی

۸۲۔ حبیب خان ولد وارث خان عمر ۶۰ سال۔ جاگیر نصف عام گاہ مبلغ ۴۰ روپیہ (برابر ۳۵ روپیہ کمپنی)

۸۳۔ سردار خان ولد آزاد خان عمر ۴۰ سال۔ محمد خان ولد سعادت خان عمر ۳۰ سال۔ کرم خان ولد عطا محمد خان عمر ۱۸ سال۔ کل جاگیر ۱۰۰ روپیہ (= ۸-۰-۸۷ روپیہ کمپنی) موضع کالا کٹھا میں۔

۸۴۔ ارسلا ولد قوی داد خان عمر ۵۰ سال۔ شریف ولد رحیم داد عمر ۵۰ سال۔ جاگیر ۳۹ روپیہ (= ۴-۰-۴۱ کمپنی) نصفا نصفی ½ حصہ موضع باغدرہ۔ ½ حصہ موضع دھرچھٹی

۸۵۔ زرداد ولد جنگ باز عمر ۴۰ سال۔ میرداد ولد شاہداد عمر ۴۰ سال موضع ڈھوک جاگیر ۶ روپیہ (= ۰-۸-۵)

۸۶۔ مہندو خان ولد امیر خان عمر ۴۰ سال۔ شیر خان ولد حسین خان عمر ۳۴ سال۔ خباٹہ اور پپلیالہ میں۔ جاگیر ۱۱۰۰ روپیہ (= ۸-۰-۹۶۲ روپیہ کمپنی)

یہ سب جاگیریں کئی پشتوں سے باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہیں۔ یہ سب سے پہلے سلطان احمد شاہ ابدالی نے عطا کیں۔ جب کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ان کی تجدید شاہان دہلی کی طرف سے بھی ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ سکھوں کی حکومت ہزارہ ہونے تک جاری رہا۔ سکھوں کے عہد میں ایک سکھ کاردار نے بغیر کسی وجہ سے ۴۰۰ روپیہ کی جاگیریں ضبط کرلیں۔ ہزارہ کے بندوبست کے مکمل ہونے پر میں نے یہ سب جاگیریں ۱۸۴۷ء میں باجازت سکھ دربار اور برٹش ریذیڈنٹ کے بحال کردیں۔ کیونکہ اس قوم کے خان خانی زمان خان نے اطاعت قبول کرلی تھی۔ جو سندات اس قوم کے پاس تھیں۔ وہ سب خانی زمان خان جب وہ پھر ۱۸۴۸ء میں باغی ہو کر سندھ پار چلا گیا تھا اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ وہاں ہی فوت ہوگیا۔ اور سندات کے انجام کا پتہ نہ چل سکا۔ اس

پروانہ کی نقل جو ان سے باجازت ریذیڈنٹ لاہور بر بحالی جاگیر مواضعات ۳ روپیہ بجائے مواضعات حسن ابدال وہرو تارخیلیوں کو دیا تھا۔ اور حسن کی اصل کاردار بھائی ماؤ سنگھ نے ان سے چھین لی تھی۔ یہاں میرے رجسٹر اندراج میں موجود ہے۔ اس پروانہ میں کاردار کھاٹڑ بھائی ماؤ سنگھ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ ان کے مواضعات کاہو۔ بھائی۔ ماؤ اور ریغا ہدجن کی آمدنی ۳۷۰۰ روپیہ ہے۔ قوم تارخیلی کے خوانین کو واگذار کردے۔ یہ رقم بعد از منہائی نذرانہ جو وہ زمانہ قدیم سے دیتے رہتے ہیں۔ ان کی جاگیر ہے آئندہ کے لئے ان سے کوئی نذرانہ نہ لیا جائے گا۔

ڈپٹی کمشنر کی رائے اور سفارش

درانی اور دہلی کے بادشاہوں کی یہ پالیسی بہت دانشمندانہ اور صحیح تھی۔ کہ جس علاقہ کو وہ فتح کرنے کے بعد قبضہ میں نہ رکھ سکتے تھے وہ جاگیریں دے دیا کرتے تھے۔ سکھوں نے بھی اسی پالیسی پر عمل کیا۔ اگرچہ سکھوں کے ایک کاردار نے بغیر اجازت میدان حسن ابدال کی جاگیر سے کچھ مواضعات واپس لے لئے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تارخیلیوں نے اس علاقہ کے لوگوں سے جبراً اپنا حصہ وصول کرنا شروع کردیا۔ اور لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہوگیا۔

سیرت و رسوخ

تارخیلی قوم زمانہ قدیم سے دوآبہ سندھ ساگر میں سوائے قوم گکھڑ کے، بہت زبردست قوم رہی ہے عرصہ سات سال کا ہوتا ہے (یعنی ۱۸۴۱ء ش ب) کہ وہ اٹک سے مارگلا تک کے سب میدانی علاقہ سے بہ جبر خراج لیتے رہے۔ جب ان کی پرانی جاگیر جو سکھ کاردار نے ضبط کرلی تھی۔ واپس کردی گئی اور ان کے چند سرغنہ آدمیوں کو مناسب سزا دی گئی۔ تو وہ اس کے بعد پُرامن اور وفادار رہے اور پھر کوئی زیادتی نہیں کی۔

گذشتہ جنگ میں ان کے بہت سے خوانین درانیوں سے مل گئے تھے۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ اور ان ہی میں ان کا رئیس خانی زمان خان تھا۔

روسا قوم تارخیلی جو اس علاقہ پر صاحب اختیار رہے۔

۱۔ تاج خان ۔ ۲۔ بُرشینڈ خان ۔ ۳۔ فتح خان ۔ ۴۔ ظفر خان ۔ ۵۔ شیر زمان خان ۔ ۶۔ خانی زمان خان

دستخط

میجر جیمز ایبٹ ۔ ڈپٹی کمشنر

نقل رپورٹ

جو میجر ایبٹ نے ۱۵ جون ۱۸۵۱ء میں جہانداد خان والی تناول کی جاگیر و جائداد کے متعلق حکومت کو ارسال کی۔

تناول ایک پہاڑی، سنگلاخ و دشوار گزار علاقہ ہے۔ اور اس میں سلطح اور جنگجو کاشتکار آباد ہیں۔ یہ دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے۔ اور ہزارہ خاص اس کے جنوب میں میدان رش اس کے مشرق میں، پکھلی اور خود مختار پٹھان علاقہ اس کے شمال میں ہے۔ دریائے سرن اس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ جن کو مشرقی اور مغربی تناول کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس علاقہ کی سیاسی تقسیم اس سے کچھ مختلف ہے۔ جس کی بنیاد قوم تناولی کی شاخوں کے قبضہ و وراثت پر ہے۔ یعنی ہندوال و پلال، خود مختار رئیس جہانداد خان قبیلہ ہندوال کا رئیس ہے۔ قبیلہ پلال کا سردار شیر محمد خان ولد احمد علی خان بمعہ اپنے سب قبیلہ کے برطانوی رعیت ہے۔

۲۔ جہانداد خان کا خود مختار علاقہ دوآبہ سندھ و سرن کا وہ حصہ ہے جس کا ایک بازو وہ ہے جو بھنگڑہ پہاڑ کے دامن میں ہے اور جو شمال میں اگرور تک اور خود مختار پٹھان قبائل کے علاقہ تک چلا گیا ہے اور مشرق میں پکھلی اور دریائے سرن تک اور جنوب میں کلیا کولنگا اور صوابی کے پہاڑوں تک اور مغرب میں دریائے سندھ تک چلا گیا ہے اس کا سطح رقبہ تقریباً ۲۴۰ مربع میل ہوگا۔ اور کل صحیح رقبہ ۲۰۰ مربع ہوگا۔

سابق زمانہ میں اس کی آمدنی کا اندازہ ۲۸۰۰۰ روپیہ کیا گیا۔ لیکن بدانتظامی اور ظلم کی وجہ سے یہ بہت گھٹ گئی ہے۔ جہانداد خان دریائے سندھ سے پار بھی امب کے محل اور عشرہ کے قلعہ کا مالک ہے۔

۳ جہانداد خان کا والد پائندہ خان قوی دل اور ہمت والا آدمی تھا۔ اور اس نے ......
سکھوں کے بہادر اور ہوشیار جرنیلوں سردار ہری سنگھ اور سردار گلاب سنگھ (سکھ کمانڈر علاقہ تناول) کو کئی سالوں تک اپنے علاقہ کے نزدیک پھٹکنے نہ دیا۔ لیکن جب ہندوستانی مجاہدین نے زیر سرکردگی سید احمد شہیدؒ اس کے سندھ پار کے علاقہ اور قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ تو وہ خود مختار پٹھانوں کے پاس امداد کے لئے چلا گیا اور اس کی چھوٹی سی ریاست (اس پار دریائے سندھ) پر سکھوں نے قبضہ کر کے اپنی فوج بٹھا دی۔

۴۔ پائندہ خان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا جہانداد خان جانشین ہوا۔ یہ اپنے باپ سے بہت ہی مختلف طبیعت کا آدمی ہے۔ اس میں باپ جیسی قوت و ہمت اور جرأت نہیں ہے۔ سبراؤں کی جنگ کے بعد ضلع ہزارہ کے لوگ سکھ فوجوں پر حملہ آور ہوئے اور ان کو قلعوں اور ملک سے نکال دیا۔ تو جہانداد خان نے کوشش کر کے اپنے علاقہ میں سکھوں کے قلعہ اور سکھ سپاہیوں کو اپنی حفاظت میں لے کر بچا دیا۔ اس حفاظت فوج و قلعہ اور امن و امان رکھنے کے صلہ میں سردار گلاب سنگھ نے جو ہزارہ میں سکھ فوج کا کمانڈر تھا جہانداد خان کو باقی علاقہ دوآبہ سندھ و سرن ۔ علاقہ بدہنک، کولائی۔ اور کانجر جس کی آمدنی ۲۰۰۰ روپیہ تھی جاگیر میں دے دیا۔

۵۔ پائندہ خان نے اپنے بیٹے سے حلف لیا تھا کہ وہ کبھی کسی شاہزادے یا حاکم کے دربار میں حاضری نہیں دے گا۔ جب میں نے ۱۸۴۷ء میں ہزارہ کا چارج لیا۔ تو میں نے صاف طور پر اس کے ذہن نشین کرا دیا تھا کہ اس کے بذات خود حاضر ہونے پر بھی اس کی جاگیر کا فیصلہ سرکار برطانیہ کی خوشی اور منظوری پر ہوگا۔ اس کا خود حاضر ہونا ضروری ہے۔ جب ہماری فوج نے سلم کنڈ پر حملہ کر کے لے لیا۔ تو اس کو یقین ہو گیا کہ ہماری فوج کو پہاڑ نہیں روک سکتے تو وہ بادل نخواستہ میرے پاس حاضر ہو گیا۔ میں نے اپنے اختیارات موجودہ کے مطابق اس کی جاگیر اس کو منتقل کر دی۔ وجوہات حسب ذیل تھے۔

چونکہ ہزارہ کا امن کچھ حد تک اس جاگیر سے خریدا جا چکا تھا لہذا مجھے اس کے بند کر دینے میں خلاف ورزی عہد نظر آئی۔ اس علاقہ کو جہانداد خان کے حملوں سے بچانے کے لئے اس علاقہ کی آمدنی سے بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اس علاقہ کے جنگجو اقوام کے مقاصد اور جہانداد خان کے مقاصد میں سخت اختلاف تھے۔ جو کبھی ایک نہ ہو سکتے تھے اس واسطے اگر جہانداد خان کبھی بھی بغاوت کرے تو اس کو بے دخل کرنا ہر وقت آسان ہے۔ بہر حال میں اس علاقہ کے لوگوں کے آرام و خوشحالی کو جاگیردار کی مرضی اور بدانتظام حکومت کے حوالہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس واسطے میں نے ہر ایک گاؤں کا مالیہ تشخیص کر کے ایک کاردار مقرر کر دیا کہ وہ یہ مالیہ خود جمع کرے۔ اور میں نے اس علاقہ کے سب عدالتی اختیارات سپرنٹنڈنٹ ہزارہ کے لئے مخصوص کر دئیے۔ اور جاگیردار کو ان لوگوں سے فوجی بیگار لینے سے بھی منع کر دیا۔

۶۔ گزشتہ جنگ میں اور سخت مشکل اور صبر آزما حالت میں جہانداد خان وفادار رہا۔ حالانکہ اس کا

دلی دوست غلام خان ترین بھی ہمیں چھوڑ کر درانیوں سے مل گیا تھا۔

۷۔ اس چھوٹی سی ریاست کی موجودگی مجھے کئی وجوہات سے مفید معلوم ہوتی ہے اور اس کا کوئی خرچ بھی حکومت کو برداشت نہیں کرنا پڑتا۔ اور اس کے رئیس کی وفاداری پر بہت مضبوط اثر ہے جہانداد خان کا علاقہ ہزارہ اور سرحد کے جنگ جو پٹھان اقوام جن سے اس کی پرانے جھگڑے ہیں کے درمیان واقع ہے۔ اور اس کا ان کے ساتھ اتحاد ناممکن ہے۔ اس کا علاقہ امب دربند، پار دریائے سندھ جو کبھی اقوام ہماین کی ملکیت تھا۔ اس کو ان کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رکھتا ہے اور اس کے علاوہ ستھانہ کا مجاہدین گروہ اس کے قلعہ جات امب دربند پر پھر قبضہ کرنے کے لئے آرزو کرتا رہتا ہے ان حالات نے اس کو مغربی علاقہ میں بالکل الگ تھلگ کر دیا ہے لہذا حکومت انگریزی کے مفاد سے وفادار رہنے ہی کی پالیسی میں اس کی اپنی سلامتی ہے۔

۸۔ اگر وہ اپنے دو حاشیہ برداروں شیر زمان خان اور بوستان خان (یہ دونوں عیاش اور مرفوع القلم ہیں) جنہوں نے اس کے سب اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں، کے اثر و رسوخ سے گلو خلاصی حاصل کرلے۔ تو پھر وہ اپنے ان تمام دشمنوں پر ہر وقت بھاری ہے۔ اور ان دو اشخاص کی وجہ ہی سے اس کی دلیر رعیت جنہوں نے اس کے باپ کے زیرِ عَلم بہادرانہ جنگیں کیں۔ جہانداد خان کو نفرت و حقارت سے دیکھتے ہیں یہ سب کاشتکار برطانوی قانون کی حفاظت کے نیچے آنے کی زبردست آرزو رکھتے ہیں۔ اور اگر کبھی بھی جہانداد خان نے ہم سے غداری کی۔ تو سب کے سب لوگ ہمارے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے۔

۹۔ میں اس حقیقت سے بھی باخبر ہوں کہ ہزارہ میں حالات کی ناسازگاری و اختلافات کے باوجود جو امن ہے وہ اس ضلع میں ایک نووارد فوجی کے لئے ان حالات کے مقابلہ کے لئے تسلی بخش معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ ایسے علاقوں سے آیا ہے جہاں حالات کا نظم و انتظام ایک مشینی پرزے کی طرح باقاعدہ چل رہا ہے۔ ایک مرکزی پرزہ کے اشارہ سے سب مشین کام کرتی ہے۔ اور جہاں پر مخالف قوتوں کے درمیان سازگار ہم آہنگی سے امن پیدا کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ اور ایک فوجی آدمی کے لئے یہ صورتِ حال خاص اثر کا احساس پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ فوجی گروہ کا نظام، تناسب، اتحاد اور طریقِ کار ان حالات سے بالکل متضاد ہے۔ جہاں پر ہزاروں پرشور، بے لگام مخالف عناصر موجود

ہوں اور پھر بھی وہ نظم و اتحاد پر مائل ہوں۔ لہذا یہ نظام سب کے لئے مفید ہے بنا بریں ایک ایسے نظام کو جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض محفوظ ہوں، برقرار رکھا جائے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن پر اس نظریہ کا اثر نہ ہو کیونکہ ان کے ہاتھ سے لوگوں پر ظلم کرنے کے اختیارات اس قانون سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن ایسے اشخاص سے کوئی بھی ہمدردی نہیں رکھتا۔ لہذا اگر ایسے لوگ کسی وقت بھی غداری کی طرف مائل ہوں تو فوری توجہ اور عمل سے ان کی سرکوبی کر کے موجودہ امن بحال کیا جا سکتا ہے۔

باغیوں کی نئی فہرست

یہ ان اشخاص کی فہرست ہے جنہوں نے گزشتہ بغاوت کے آخری مرحلہ پر خوف، ناواقفی یا ضرورت کی وجہ سے باغی فوجوں کی اطاعت کرلی تھی اور جن کے نام ان لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں جن کے لئے سزا تجویز کی گئی ہے۔ مورخہ ۲۱ر مئی ۱۸۵۳ء

۱۔ حافظ نواب ساکن جاگل۔ ایک ہل یا پندرہ روپیہ۔ ۱۹ر اسوج سمت ۱۸۹۷ از جواہر مستاجر

۲۔ ملک حسین شاہ ساکن سری کوٹ۔ ۴ر جون ۱۸۴۳ء از میجر ایبٹ ۷۵ روپیہ (= ۱۰-۶۵ کمپنی)

۳۔ خداداد خان ساکن لقمانیاں تربیلہ ولد شہباز خان جاگیر ۱۰۰ روپیہ (= ۸-۸۱ کمپنی) ڈب اور تندولہ میں از جانب راجہ تیج سنگھ ۲۳۔ ہاڑ سمت ۱۸۹۵

ایضاً۔ لقمانیاں میں دو ہل (۴۸ روپیہ = ۴۲ کمپنی) از جانب سردار مہان سنگھ ۱۰ر ساون سمت ۱۸۸۶

ایضاً۔ ایک جندر تربیلہ میں (۸-۷ روپیہ = ۹-۶ کمپنی) از جانب سردار مہان سنگھ ۱۲ ہاڑ سمت ۱۸۸۴

۴۔ سرفراز خان (ترین) ساکن تربیلہ ایک جندر گوجرہ میں (۸-۷ روپیہ = ۹-۶ کمپنی) از دیوان جوالہ سہائے ۱۷ر جیٹھ سمت ۱۹۰۳

اس کے بعد اس نے بارہ نئے جندر بنائے ہیں جن میں سے ایک معافی میں ہے بشرطیکہ وہ کل سولہ جندر چلا دے۔

۵۔ میر زمان خان ساکن تربیلہ۔ ایک ہل جٹو میں (۲۴ روپیہ = ۲۱ کمپنی) از جانب سردار تیج سنگھ ۱۰ر بیساکھ سمت ۱۸۹۵۔ میجر ایبٹ کے جاگیروں کی فہرست میں اس جاگیر کی مالیت صرف پندرہ روپیہ اس وقت کے حساب بندوبست سے ہے۔ اب دوسرے بندوبست کے بعد چونکہ تربیلہ

کی زمین بہت زرخیز ہے اس کی مالیت بڑھا کر ۴۲ روپیہ کر دی گئی ہے۔

عطا کردہ پیارا مل۔ کاردار سردار تیج سنگھ ۴ ہاڑ سمت ۱۸۹۹۔ ایک ہل جٹو میں بھی جاگیر کا ہے۔

۷۔ غزن خان۔ ساکن تربیلہ نقد از جٹو ۴۰ روپیہ = ۳۵ کمپنی روپیہ۔ از جانب میجر ایبٹ ۲۷ ستمبر ۱۸۴۷ء یہ لاہور دربار کا وفادار ملازم ہے۔

ایضاً۔ دو ہل، ایک جندر موضع جٹو۔ مالیت ۸-۵۵ روپیہ برابر ۹-۴۹ کمپنی۔ عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۲۹ بھادوں سمت ۱۹۰۴ جس کی تجدید میجر ایبٹ نے کی۔

۸۔ دستم۔ نمائندہ حیات خان تربیلہ۔ ایک ہل اور ایک جندر موضع جٹو۔ مالیت ۸-۳۱ روپیہ (= ۹-۲۷ کمپنی) عطا کردہ۔ سردار ہری سنگھ ۲ مگھر سمت ۱۸۸۱ شام داس کاردار سردار تیج سنگھ ۲۲ بیساکھ سمت ۱۸۹۷ یہ غزن خان کا چچا ہے۔

۹۔ سراج الدین تربیلہ۔ دو ہل موضع ٹاہلی۔ مالیت ۴۸ روپیہ = ۴۲ روپیہ کمپنی۔ عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۲ ہاڑ سمت ۱۸۸۰

۱۰۔ نادی خان تربیلہ۔ ایک ہل موضع ترکھی، مالیت ۲۴ روپیہ ۲۱ روپیہ کمپنی۔ عطا کردہ شام داس کاردار سردار تیج سنگھ ۲۰ پھاگن سمت ۱۸۹۶

۱۱۔ شاہباز خان تربیلہ۔ ایک ہل جٹو میں مالیت ۳۸ روپیہ۔

۱۲۔ منصور خان والد فیروز خان۔ ساکن تربیلہ۔ دو ہل اور ایک جندر لقمانیاں میں مالیت ۸-۵۵ روپیہ = ۹-۴۸ کمپنی۔ عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۳۰ بھادوں سمت ۱۸۸۹۔ منصور خان ستلج کے جنگ سے ایک سال پہلے فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا قابض رہا۔

۱۳۔ حسن علی خان۔ ساکن تربیلہ۔ ایک ہل اور ایک جندر لقمانیاں میں۔ مالیت ۸-۳۱ روپیہ = ۹-۲۷ کمپنی

۱۴۔ حاتم و چندن۔ ساکن تربیلہ۔ تین ہل اور تین جندر لقمانیاں میں مالیت ۸-۹۴ روپیہ = ۱۱-۸۲ کمپنی عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۱۶ ہاڑ سمت ۱۸۸۷ دیوان جولا سہائے ۲۶ چیت سمت ۱۹۰۴ میجر ایبٹ ۱۰ جون ۱۸۵۲ء

آج قائم خان ساکن پنیاں کی استدعا پر سردار ہری سنگھ کی ۱۶ ہاڑ سمت ۱۸۸۷ والی سند کا ملاحظہ کیا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاتم اور چندن کو دو ہل اور دو جندر زمانہ قدیم سے ملے ہوئے ہیں

---

۵۱ قائم خان کی رشتہ داری لقمانیاں تربیلہ میں تھی لہذا اس نے سفارش کی۔ ش ب

اس واسطے وہ اب بطور انعام ان کے پاس ہی رہنے دئے گئے ہیں۔

۱۵۔ رستم مشہور بہ راجہ رستم۔ ساکن تربیلہ۔ نقد بیس روپیہ (= ۸-۱۷ کمپنی) عطا کردہ راجہ تیج سنگھ ۹ اسوج سمت ۱۸۹۷

۱۶۔ گلو خان۔ ساکن تربیلہ۔ ایک ہل گوجرہ میں۔ مالیت ۳۶ روپیہ (= ۸-۳۱ روپیہ کمپنی) عطا کردہ شام داس کاردار از جانب راجہ تیج سنگھ ۲۲ بیساکھ سمت ۱۸۹۷

۱۷۔ غفار خان بہ نمائندہ رحمت خان تربیلہ۔ ایک ہل اور ایک جندر گوجرہ میں۔ مالیت ۸-۳۱ = ۹-۲۷ کمپنی۔ عطا کردہ سردار مہاں سنگھ ۱۳ ہاڑ سمت ۱۸۸۳ شام داس کاردار سردار تیج سنگھ ۱۴ ہاڑ سمت ۱۸۹۷۔ غفار خان ۱۸۵۱ء میں فوت ہوا۔

۱۸۔ رحمت خان ساکن تربیلہ - ۳ ہل آبی زمین۔ ایک جندر اور بیس کنال زمین موضع جھاڑ میں مالیت ۸-۹۹ = ۵-۸۰ کمپنی۔ عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۲۹ بھادوں سمت ۱۹۰۴ تجدید میجر ایبٹ ۱۹ تا ۲۷ ضلع راولپنڈی کو منتقل کر دی گئی ہیں۔

۲۸۔ محمد طاہر ساکن رش۔ جاگیر ۱۹۰ روپیہ = ۴-۱۶۶ کمپنی موضع نگلی میں عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۲۶ مگھر سمت ۱۸۷۹ یہ ملّا ہے اور اس کا والد بھی ملّا تھا۔ یہ جاگیر خیراتی ہے۔ اور اس کا کچھ تعلق وراثت سے نہیں ہے۔

۲۹۔ ستار خان ساکن رش (ایبٹ آباد) ایک ہل دھمتوڑ میں۔ مالیت ۱۴ روپیہ = ۴-۱۲ کمپنی عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۱۹ چیت سمت ۱۸۸۴

۳۰۔ رحیم خان ساکن رش (ایبٹ آباد) نقد جاگیر موضع دھمتوڑ پچاس روپیہ = ۱۲-۴۳ کمپنی دیوان ہری چند ۲ ہاڑ سمت ۱۹۰۳ میں اس کو بہ حیثیت سردار قبیلہ اُسمازئی عطا کی۔

۳۱۔ جلال خان ساکن رش۔ ایک ہل دھمتوڑ میں۔ مالیت ۲۰ روپیہ = ۸-۱۷ کمپنی۔ عطا کردہ سردار ہری سنگھ ۸ ہاڑ سمت ۱۸۸۱ اول یہ جاگیر جلال خان کے والد پیر خان حسن زئی کو دی گئی تھی۔

دستخط

ای۔ بی۔ ایڈورڈ۔ ڈپٹی کمشنر

کرسی نشیناں ضلع ہزارہ ۱۸۷۲ء

۱۔ نواب محمد اکرم خان تنولی۔ اے۔ ستارۂ ہند ۲۔ ہوتی شاہ سید۔ صوابی میرا

۳۔ راجہ جہانداد خان ۔ گکھڑ

۴۔ راجہ فیروز خان ؍؍

۵۔ راجہ محمد خان کلاں گکھڑ ۔ پنڈ گاکھڑہ جاگیردار

۶۔ راجہ عطا علی خان گکھڑ جاگیردار جب

۷۔ راجہ محمد خان خورد گکھڑ پنڈ کا کھڑہ جاگیردار

۸۔ خانی زمان خان سید خانی ۔ کھلابٹ

۹۔ عبداللہ خان سید خانی ؍؍ ؍؍

۱۰۔ علی اکبر خان ؍؍ ؍؍ ؍؍

۱۱۔ قاضی میر عالم اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہزارہ سکندر پور

۱۲۔ قاضی فیض عالم جاگیردار سکندر پور

۱۳۔ میر غزن خان پسر مفضل خان سری کوٹ ہری پور

۱۴۔ نادر خان ترین درویش

۱۵۔ حبیب خان پنشنر تلوکر

۱۶۔ قاضی نادر علی وکیل مہاراجہ جموں کشمیر تلوکر

۱۷۔ سیف اللہ خان سابق رسالدار ہری پور

۱۸۔ احمد خان پٹھان بنی جاگیردار پنیاں

۱۹۔ میر احمد گوجر پوتہ مقدم مشرف کوٹ نجیب اللہ

۲۰۔ عطا محمد گوجر دیدڑ

۲۱۔ الٰہی بخش خان دلازاک سرائے صالح

۲۲۔ نعمت خان جدون سیریاں بگڑاہ

۲۳۔ مدد خان جدون ؍؍

۲۴۔ کریم خان طاہر خیلی کوٹہرہ

۲۵۔ محمد شریف مشوانی پوتہ سید غلام سری کوٹ

۲۶۔ راجہ حیات خان ترک ۔ مانکرائے

۲۷۔ میر افضل خان پٹھان جاگیردار تربیلا خاص ۔ محمد خان پور

۲۸۔ سلطان برکات خان ببہ بوئی

۲۹۔ سردار آزاد خان کرڑال جاگیردار دیوال منال

۳۰۔ سید محمد خان ولد سردار علی بہادر خان ڈبران

۳۱۔ کرم خان کرڑال دیوال منال

۳۲۔ سلطان محمد خان ولد عطا محمد خان جاگیردار بیڑ

۳۳۔ دوست محمد خان پسر نواب خان تنولی ۔ شنگڑی

۳۴۔ عنایت اللہ خان جاگیردار چھچھ

۳۵۔ خداداد خان پسر میر خان جاگیردار بانڈہ پیر خان

۳۶۔ عطا محمد خان ڈھونڈ جاگیردار لورہ

۳۷۔ غلام شاہ جاگیردار پلاسی

۳۸۔ فضل شاہ ؍؍ ؍؍

۳۹۔ سید نادر شاہ ؍؍ ؍؍

۴۰۔ فیروز خان تنولی جاگیردار کوٹھیالہ

۴۱۔ امیر اللہ خان بانڈی عطائی خان

۴۲۔ سکندر خان ولد امین خان جاگیردار گڑھی حبیب اللہ

۴۳۔ علی گوہر خان ولد عطا محمد خان جاگیردار ۔ اگرور

۴۴۔ عبداللہ خان جاگیردار بھیلاڑہ

۴۵۔ حسین خان جاگیردار ۔ انسہرہ

۴۶۔ شیر زمان خان جاگیردار جلگو ۔ مانسہرہ

۴۷۔ نادر شاہ ۔ مہرجی ۔ دواتہ

۴۸۔ مولوی محمد ولی خان جاگیردار اوگرہ

۴۹۔ مظفر خان صواتی ۔ بھوگڑ منگ

۵۰۔ اکبر خان صواتی پسر عبدالغفار جمعدار گیدڑ پور

۵۱۔ مہدی علی شاہ سید کاغان

۵۲۔ فتح علی شاہ سید کاغان

۵۳۔ احمد علی شاہ سید ؍؍

۵۴۔ حیات شاہ سید کاغان

۵۵۔ غلام حیدر شاہ ولد ضامن شاہ سید ساکن بیلہ کوائی

ہزارہ کے علماءِ کرام و صوفیائے عظام

اس دنیا میں مادی قوانین کی طرح ایک سلسلہ روحانی قوانین کا بھی ہے اور مادی قوانین ان روحانی قوانین کے تابع ہیں۔ مادہ پر حکمرانی روحانی قوانین ہی کو حاصل ہے۔ جیسے جسم پر روح کو۔ جسم بغیر روح کے ایک لاش ہے اور دفن کرنے کے قابل۔ اور زندگی میں مادی جسم کا اگر روحانی تعلیم کے ذریعہ سے تزکیہ نہ ہوتا رہے تو اس دنیا کا نظام مادی بھی باطل بلکہ نابود ہو جائے۔

جسم و دل کی بیماریوں کی شفا کا نسخہ قرآن کریم ہے۔ جس کے رازدان اور شارح علماء دین و صوفیائے کرام ہیں۔ ذکر و استغفار کرنے والے یہی لوگ ہیں۔ اور ان ہی کے دم سے دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے اور عذاب خداوندی ٹل رہا ہے۔ قرآن کریم (سورہ انفال آیت ۳۳) فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ

ترجمہ :۔ اللہ ایسا نہیں ہے کہ تم ان لوگوں میں موجود رہو اور وہ ان کو عذاب دے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ لوگ معافی مانگتے رہیں اور وہ ان کو عذاب دے۔

آج اسلام کا نام اور رہا سہا اثر ان ہی کے دم سے ہے۔ یہ نبیوں کے وارث اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین و مامور ہیں۔ قرآن و حدیث کے امین ہیں۔ یہ پاک نفوس ہماری رہنمائی کے وسیلے ہیں۔ اور ان کی ہمدردی، تعظیم اور اطاعت ہماری فلاح دارین کی ضامن ہے۔ اللہ باقی مطلق ہے اور اللہ کی یاد سے کائنات کی بقا ہے اور اللہ کا ذکر رہے گا جب تک اللہ والے رہیں گے۔

میں نے ہزارہ کے علماء و مشائخ کے حالات معلوم کرنے میں بہت تلاش کی۔ لیکن افسوس ہے کہ سب کے نام و حالات طبع اول کے لئے میسر نہ ہو سکے۔ یہ نعمت کامل ہوتے ہوتے ہی ملے گی جن کے نام اور حالات معلوم کر سکا ہوں ان کو میں نے ابھی سے بطور تبرک اپنی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ اور فخر و انبساط کے حیات افروز جذبات کے ساتھ شامل کیا ہے۔ کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کو اپنا رب محبت سے یاد فرماتا ہے

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

توجمہ :- یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں یا بستر پر پڑے ہوں اللّٰہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور و فکر کرتے اور کہتے ہیں ، اے ہمارے رب آپ نے یہ سب کچھ رائیگاں نہیں بنایا ۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ ہر عیب سے پاک ہیں سو ہمیں نارِ جہنم سے بچا لیجئے ۔ سورۂ آل عمران آخری رکوع)

تفسیر بیضاوی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب بندہ جہنم کی آگ سے بچنے کی التماس ہنگامِ سحر و بہ حالت ذکر و فکر کرتا ہے تو اللہ کریم وعدہ فرماتے ہیں کہ جہنم کی آگ اس کے قریب نہ آئے گی ۔ علامہ بیضاوی فرماتے ہیں کہ قرآن و حدیث کے علم کے بغیر نجات و مغفرت کے حصول کی راہیں بندوں پر کیسے کشادہ ہو سکتی ہیں ۔ خالق کے ساتھ مراسم و روابط کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں ۔ ذکر و فکر کی ترغیب اور حرص کہاں سے آئے اور فرشتوں کی اسمبلیوں میں بندہ خاکی کی سربلندیوں کے چرچے کیسے ہوں ۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم

شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

چونکہ پیر بابا کا خاص اثر ہزارہ پر آج تک ہے اور اخوند صاحب کا بھی ۔ لہٰذا اس باب کے آغاز ان کے حالات سے شروع کیا گیا ۔

پیر بابا صاحب

اہل ہزارہ کو ان سے خاص عقیدت ہے ۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ موسم بہار میں ان کے مزار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اس لئے یہ باب ان کے ذکر سے شروع کیا جاتا ہے ۔[۵]

آپ کا نام پیر بابا سید علی غواص ترمذی ہے ۔ پیر بابا کی ولادت ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) میں قندز چاردرہ بہ مقام خواجہ غلطان جو موجودہ افغانستان کی سمت شمال کی ولایات مزار و میمنہ کے شمال مشرق میں واقع ہے ۔ یہ سارا علاقہ تاریخ کی پچھلی کتابوں میں ترمذ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جس کی نسبت

۵ اخذ و اقتباس از مضمون سیف الحنان پشاوری دارالرحیم اپریل ۱۹۶۹ء

سے موصوف ترمذی کہلاتے ہیں بموجب حضرت اخوند درویزہ کی کتاب "تذکرۃ الابرار والاشرار" آپ کا شجرہ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے آپ کے والد گرامی کا نام قنبر علی ہے ۔ جو شاہان وقت سے زیادہ تعلق رکھتے تھے ۔ درباری لوگوں میں امیر نظر بہادر کے نام سے مشہور تھے ۔ ان کے آباء و اجداد کا طریقہ صرف زُہد و ریاضت تھا ۔

اُن کے والد کو سلطان ہمایوں بطور تبرک ہندوستان لے گئے ۔ اور پیر بابا بھی ان کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے ۔

تاریخ سوات مؤلفہ محمد آصف خان کے مطابق آپ کے والد ہمایوں بادشاہ کی فوج میں ملازم تھے جب ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران کی طرف جا رہا تھا تو آپ کے والد اس کے ہم رکاب تھے ۔ پیر بابا کی طبیعت شروع سے تحصیل علم و ریاضت پر مائل تھی ۔ دنیادار لوگوں سے تعلق نہ رکھتے تھے ۔

پیر بابا ہند میں

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ہمایوں بادشاہ ان کے والد گرامی کو کب اور کس بار ہندوستان لے گئے لیکن تاریخ سوات کے مؤلف کے بیان کی روشنی میں وہ شروع سے ہی ہمایوں کے ساتھ تھے ۔ بہر حال پیر بابا فرماتے تھے ۔ کہ جب یہ قافلہ شاہی پانی پت پہنچا تو میں نے وہاں شیخ شرف الدین پانی پتی کے مزارِ اقدس پر حاضری دی ۔ اور میری طبیعت پر خاص اثر ہوا ۔ اور میں مزید تعلقات دنیوی سے متنفر ہوا ۔

والد ماجد سے علیحدگی

پانی پت کے مزار اقدس کی زیارت کے بعد آپ گجرات چلے گئے ۔ تاریخ سوات کے مؤلف کے مطابق جب ہمایوں بادشاہ شکست کھا کر ایران جا رہا تھا تو آپ گجرات ہی میں مقیم رہے ۔ آپ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پیروں فقیروں سے ملتے رہے اور زہد و عبادت میں اپنا وقت بسر کرتے رہے ۔ مالکپور میں مشہور عالم دین اور مشہور پیر طریقت "شیخ سیلونہ" کے درس میں شامل ہوئے ۔ کافیہ اور ہدایہ پڑھے ۔ جب شیخ نے حضرت بابا کی روحانی صلاحیت ، شغف اور تشنگی دیکھی تو انہوں نے اپنے پیر بھائی حضرت شیخ سالار رومیؒ کی خدمت میں اجمیر اپنے خط کے ساتھ جس میں پیر بابا کا حسب نسب و دیگر علمی و روحانی صلاحیتوں کا ذکر تھا ، رخصت کر دیا ۔ وہاں پر پیر بابا نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقۂ چشتیہ کی بیعت کی ۔ شیخ سالار اس طریقہ کے پیر طریقت تھے ۔ پیر بابا فرماتے ہیں کہ سلوک

کے راستے میں سب سے پہلا مانع یہ پیش آیا کہ حاجی سیف اللہ گگیانی و ملک گدائی خان گگیانی جیسے بڑے رئیس (جنہیں بادشاہ ہمایوں پشاور سے ہندوستان لے گئے تھے) اور دیگر عوام و خواص میرے مرید ہوئے اور لوگوں کی کثیر تعداد طریقت کی جستجو میں میرے گرد چکر لگانے لگے۔ لہذا میں نے مرشد سے اجازت لی کہ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کروں اور کسی پہاڑی علاقہ کی طرف چلا جاؤں۔"

پھر آپ مرشد کے حکم کے مطابق کشمیر روانہ ہوئے اور جب پنڈ داؤ المعروف بہ پنڈ دادن خان (جو دریائے جہلم سے مغرب کی طرف چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے) پہنچے تو وہاں کے لوگوں کے اصرار پر وہاں مقیم رہ کر وہاں کے باشندوں کو وعظ و نصیحت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے رہے

والد ماجد سے ملاقات

جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر (سنہ ۱۵۴۰ء) ایران جا رہا تھا تو پیر باباؒ کے والد قنبر علی صاحب لاہور کے قریب اپنے وطن جانے کے لئے ہمایوں بادشاہ سے علیحدہ ہو گئے۔ تو بہ اختلاف روایت ان کی ملاقات پیر باباؒ سے گجرات یا مضافات گجرات (پنڈ دادن خان) کے مقام پر ہوئی۔

ملاقات کے دوران ان کے والد صاحب نے ساتھ لے جانے پر بے حد اصرار کیا لیکن آپ نے معذرت کی۔ اُن کے والد ماجد نے ان کے سر آنکھوں پر بوسہ دیا۔ اور انتہائی مشفقانہ انداز میں فرمایا کہ "مجھ سے تو آباء و اجداد کے زہد و ریاضت کے طریقے چھوڑنے میں غلطی ہوئی۔ لیکن مجھے مسرت ہے کہ تم نے آباء و اجداد کا یہ نیک طریقہ اختیار کیا۔" انہوں نے اس راستہ میں آپ کی کامیابی پر خدا کا شکریہ ادا کیا۔

پیر بابا فرماتے ہیں۔ کہ "رخصت ہوتے وقت والد ماجد نے سونے اور چاندی سے بھری ہوئی دو تھیلیاں مجھے دیں۔ میں نے صرف ان کی دلداری کے لئے یہ ہدیہ قبول تو کیا۔ لیکن میری دلچسپی اس میں نہ تھی حتیٰ کہ یہ دونوں تھیلیاں شیر شاہ سوری کے سپاہیوں نے مجھ سے چھین لیں اور میں فارغ البال ہو گیا۔"

اجمیر کو واپسی اور خرقہ خلافت کا ملنا

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پیر باباؒ ۹۵۰ھ (۱۵۴۲-۱۵۴۳ء) میں شرف باریابی حاصل کرنے کی غرض سے اپنے مرشد شیخ سالار رومیؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے گجرات یا مضافات گجرات سے اجمیر تشریف لے گئے تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب میں سالار رومیؒ کے دولت خانے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ مرشدی شیخ سالار رومیؒ رحلت فرما چکے ہیں۔"

صاحب زادہ صاحب نے مجھے ایک خرقہ عنایت کیا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا اور یہ ان کے والد صاحب کی طرف سے بطورِ خلافت دیا گیا۔ چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد صاحب زادہ صاحب نے فرمایا کہ میرے والد بزرگوار نے وصیت فرمائی ہے کہ آپ کسی پہاڑی علاقے میں چلے جائیں یا اپنے وطن قندز چلے جائیں جب کہ اس کا تعلق بھی پہاڑی علاقہ سے ہے۔"

صاحب زادے کا یہ فرمان سن کر آپ سخت حیران ہوئے کہ خدایا میں تو مرشد سے یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ میرا بوجھ ہلکا کیا جائے۔ اس کی بجائے مزید بھاری ہو گیا۔

مرشد کی وصیت کے مطابق آپ اپنے وطن قندز جانے کے ارادہ سے پشاور آئے۔ پشاور شہر میں ان کے دو واقف حال، خاص رئیس عقیدت مندوں حاجی سیف اللہ گگیانی اور ملک گدائی خان گگیانی سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے آپ سے درخواست کی کہ ان کے علاقے میں چند دن قیام کریں تاکہ ان کی اولاد متعلقین اور دیگر عوام ان کی صحبت وعظ و نصیحت سے مستفیض ہوں۔ ان کی دعوت و معروضات پر آپ ان کے علاقہ دوآبہ نزد پشاور چلے گئے وہاں کے باشندوں نے کثیر تعداد میں ان سے بیعت کی۔

آپ فرماتے ہیں کہ "دوآبہ میں ایک سال گزارنے کے بعد قندز جانے کا ارادہ میں نے کیا۔ تو گگیانی قوم کے مخلصوں اور عقیدت مندوں نے مجھے ٹھہرانے کے لئے منصوبے بنانے شروع کئے۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ یہاں قریب یوسف زئی کے علاقہ میں دو ملحد اور زندیق ظاہر ہوئے ہیں۔ انہوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اور لوگوں کو غلط راستہ پر ڈال رہے ہیں۔ ایک کا نام پیر طیب ہے جو علزئی پٹھان ہے اور دوسرے کا نام پیر ولی جو بڑیچ قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ رقص و سرود اور گانا بجانا حلال سمجھتے ہیں۔ عورتوں، مردوں، چھوٹوں، بڑوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں اور ان کو واہی تباہی خلاف شرع باتیں سناتے ہیں یہاں تک کہ پیر ولی بڑیچ تو خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا ہے (العیاذ باللہ)

ہمارا خیال ہے کہ آپ اپنے وطن جانے کی بجائے یوسف زئی کے علاقے کی طرف توجہ فرمائیں۔ ان ملحدوں کی سرکوبی کریں اور لوگوں کو کفر گمراہی سے نجات دلائیں یہ باتیں سن کر اپنا فرض پورا کرنے کی خاطر میں علاقہ یوسف زئی کی طرف روانہ ہوا۔

آپ یوسف زئی کے علاقہ میں

حضرت پیر باباؒ فرماتے ہیں کہ جب میں یوسف زئی کے علاقے میں گیا تو میں نے وہاں کے باشندوں کی

---

۵ پیر روشن ہوگا جو افغانوں میں بہت با اثر رہا اور مغلیہ سلطنت کے لئے مدتوں درد سر بنا رہا۔

خصلتیں اور عادتیں دیکھ لیں ۔ وہ سادہ قسم کے لوگ ہیں ۔ مکر و فریب ، دھوکہ بازی اور ہیرا پھیری کو جانتے ہی نہیں ۔

۲۔ ان کے چھوٹے بڑوں سے دینداری اور دیانت داری میں زیادہ پکے ہیں ۔

۳۔ ان کی عورتیں ان کے مردوں سے دین اسلام کی زیادہ مضبوطی کے ساتھ پابند ہیں ۔

۴۔ ان کے بچے بچپن ہی میں دین اور اس کے سیکھنے کا شغف رکھتے ہیں ۔

۵۔ ان کے خادم ، نوکر ، غلام اور ماتحت لوگ اپنے آقاؤں اور مالکوں سے زیادہ دیندار ہیں ۔

لیکن اس کے باوجود گمراہی میں گھرے ہوئے ہیں کہ ان کے علاقہ میں مذہبی درسگاہیں نہیں اور تقویٰ دار اور خدا پرست علما ان کے درمیان نہیں ۔ پیر بابا مزید فرماتے ہیں کہ جب میں یوسف زئی کے علاقہ میں آیا تو سدوم کے علاقہ میں پہنچ گیا ۔ یہاں لوگ انبوہ در انبوہ میرے گرد جمع ہونے لگے ۔ چونکہ یہ لوگ طالب دین اور حق کے متلاشی تھے ۔ میری تقریروں نے ان کے دلوں پر اثر کیا اور وہ اہل ہوا و بدعت سے محترز و متنفر ہو گئے ۔

ازدواج

پیر بابا کے بیان کے مطابق یوسف زئی کے ملک دولت نے جو قبیلہ علی زئی کی بارک زئی شاخ سے تھا اپنی پاک دامن بہن سے نکاح کر دینے کی پیش کش کر دی ۔ آپ اگرچہ عیالداری کو ریاضت اور معرفت کے راستہ میں شادی کو ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے لیکن سنت کی تابعداری اور ملک صاحب کی ناراضی کے خیال سے راضی ہو گیا ۔ پھر یہاں شادی کر کے مقیم ہونا ایک پہاڑی مقام میں مقیم ہونا تھا ۔ اور آپ کو مرشد نے یہی وصیت کر دی ۔ لہٰذا شادی کر لی ۔

حضرت فرماتے ہیں کہ پٹھانوں کا عام دستور ہے کہ جب کوئی عالم نیک یا بزرگ آدمی جوان کی قوم اور اُن کے قبیلے سے نہ ہو اور ان میں آ جاتا ہے تو اس قبیلے یا قوم کا سردار اپنی بہن یا لڑکی کا مہر مقرر کئے بغیر اس کے سلک ازدواج میں دے دیتا ہے ۔ تاکہ اس طرح سے وہ ان کے شہر یا علاقہ میں رہ کر باشندے اس سے استفادہ کرتے رہیں ۔ پٹھانوں کے اس دستور کے مطابق میری شادی بھی کرائی گئی اور میری اولاد بھی وہاں پیدا ہوئی ۔

نوٹ ۔ پٹھان لڑکیوں کی شادی پر عام طور پر بہت روپیہ لیتے ہیں ۔

والدین کی خدمت میں حاضری

آپ کچھ عرصہ کے بعد والدین کی زیارت کرنے کے لئے قُندز پہنچے ۔ اُن کے والد صاحب رحلت فرما

چکے تھے ۔ اور والدہ بقید حیات تھیں ۔ ان کی خواہش پر اپنے گزشتہ تمام احوال بیان کئے اور شادی کا ذکر بھی کیا اور بچوں کی پیدائش کا بھی ۔ والدہ صاحبہ نے سنتے ہی ازراہ شفقت و محبت فرمایا کہ پھر آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ۔ زادِ راہ تیار کر کے رخصت کے وقت فرمایا کہ اگر ہو سکے تو بال بچوں کو بھی یہاں لے آنا ورنہ پھر وہیں سکونت رکھنا ۔ ایسا نہ ہو کہ ان کا حق میرے ذمے رہ جائے ۔ میں نے آپ کے لئے اپنا حق بخش دیا ہے ۔

اس کے بعد اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت کے مطابق مستقل طور پر آپ علاقہ یوسف زئی میں مقیم ہو گئے اور قبائل کو راہ حق و دین قیم پر مضبوط کرنے میں مشغول ہو گئے ۔ ان کی نصیحت اور تعلیم نے لوگوں پر اثر کیا ۔

پاچا کلی ۔ بنیر میں قیام

اس کے بعد آپ پاچا کلی ۔ بنیر ریاست سوات میں رہنے لگے ۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اکبر بادشاہ کی حکومت ہندوستان میں مضبوط ہو گئی تھی ۔ بنیر کو مستقل مرکز بنا کر آپ نے پیر روشن کے برخلاف مذہبی اصلاح کی تحریک شروع کی ۔ اس علاقہ کے مشہور عالم اخوند درویزہ نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کر کے انہیں اپنا مرشد تسلیم کیا ۔ یہ دونوں مرشد اور مرید مغلوں کے طرفدار تھے ۔ بنیر میں آپ کے عقیدت مندوں میں کافی اضافہ ہوا اور انہوں نے لنگر بھی جاری کیا ۔

وفات ۔ سنہ ۹۹۱ھ مطابق ۱۵۸۳ء آپ نے اسی جگہ وفات پائی ۔ وہاں ہی آپ کا مزار ہے اور مرجع خلائق خاص و عام ہے ۔ موسم بہار میں تو زائرین کے انبوہ اور جوش و خروش دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب دُور دراز خصوصاً علاقہ بنوں سے بسیں اور ٹرک کثیر تعداد میں لوگ آتے ہیں ۔ بہت سے جتھے سائیکلوں پر اور لاتعداد لوگ پیدل بھی زیارت کے لئے آتے ہیں ۔

یہ مزار مبارک درہ کڑاکڑ سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ایک ندی کے کنارے واقع ہے جو بنیر اور سوات میں حد فاصل کا کام دیتا ہے ۔ کوہ ایلم اس کے پشت پر ہے ۔

اولاد ۔ حضرت پیر بابا کے دو صاحبزادے سید حبیب اللہ ، سید مصطفےٰ اور تین صاحبزادیاں سیدہ رحیمہ ، سیدہ کریمہ اور سیدہ زینبہ بیان کی جاتی ہیں ۔

سید حبیب اللہ تو آپ کی زندگی میں وفات پا چکے تھے جن کا مزار حضرت کے مزار کے ساتھ متصل ہے سید مصطفےٰ نے افغانستان کے مشرقی علاقہ کونڑ میں رہائش اختیار کی اور وہیں وفات پائی ۔ ان کا مزار مرجع

دو نائی پشت علاقہ کونٹر میں ہے۔

سید مصطفےٰ کے تین صاحب زادے میاں عبدالوہابؒ المعروف بہ میاں عبدل کا مزار تختہ بند علاقہ بنیر میں ہے۔ میاں محمد قاسم جن کا روضہ موضع پیر کلی سوات میں ہے۔ میاں محمد حسنؒ کا روضہ سوات کے موضع کوکڑی میں ہے۔

پیر باباؒ کی اولاد کا سلسلہ ان تین پوتوں سے چلا ہے ان میں بڑے بڑے علماء صلحاء اور بزرگان دین گزرے ہیں۔ سید جمال الدین افغانیؒ بھی اسی خاندان کے نامور انسان تھے۔ سید مبارک شاہ اور سید اکبر شاہ ان کی اولاد سے تھے۔ سید اکبر شاہ ریاست سوات کا ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۷ء بادشاہ رہا۔ یہ دونوں اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے جاں نثار ساتھی تھے کنڑ (افغانستان) سے وادی کاغان تک زیادہ تر سادات آپ کے اخلاف سے ہیں (مولانا مہر)

خلفاء۔ حضرت پیر باباؒ کے چند مشہور خلفاء میں سے غیر معمولی شہرت کے مالک (۱) اخوند درویزہ بابا ہیں۔ جنہوں نے حضرت کے دوآبہ میں قیام کے دوران ان سے ۹۵۲ھ (۱۵۴۵ء) میں بیعت کی اور آخر تک مرشد کے ساتھ رہے۔ اخوند درویزہ نے پیر روشن سے مناظرے کئے اور اس کا نام پیر تاریک رکھا۔ پیر روشن ۹۸۵ھ میں علاقہ تیراہ میں فوت ہوگیا۔ یہ مغلوں کے مخالف اور سرحدی افغانوں کا رہنما اور امیر تھا۔ اخوند درویزہ کا نام عبدالرشید تھا اور علاقہ ننگرہار (افغانستان) کا رہنے والا تھا۔ عمر کا زیادہ حصہ پشاور، اطراف پشاور اور سوات بنیر میں گذارا۔ ان کا مزار کوہاٹی دروازہ پشاور سے باہر شہر سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر موسیٰ زئی۔ ہزار خانی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اور ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اخوند درویزہ نام کی وجہ یہ ہے کہ طالب علم عموماً مسجدوں میں اقامت گزیں ہوتے تھے اور صبح شام ٹوکری اور برتن لے کر گھر گھر سے گدا گر کے روٹیاں اور سالن جمع کر کے لاتے تھے اور سب طالب علم یک جا بیٹھ کر کھاتے تھے گدائی کا یہ عجیب وغریب طریقہ اخوند درویزہ کا ہی ایجاد کردہ ہے۔ پشتو زبان میں گدائی کو درویزہ (دریوزہ) بھی کہتے ہیں۔ غالباً اسی مناسبت سے اخوند عبدالرشید بھی اخوند درویزہ مشہور ہے۔

یہ طریقہ اب تک جاری ہے اور کہنا چاہئیے کہ اسلامی تعلیم کے زندہ رکھنے کا آسان طریقہ ہے اور مفید مطلب بھی۔

خاندان اخون درویزہ۔ آپ نسلاً تاجک ترک تھے۔ کافی عرصہ پٹھانوں میں رہنے کی وجہ سے پشاوری (پٹھان) کہلاتے ہیں۔ آپکے جد امجد پہلے لمغان میں رہتے تھے پھر وہ مہمند درہ (ننگرہار) میں منتقل ہوگئے۔ ۸۱۲ھ (۱۴۰۹ء) میں ان کے اجداد سعدی صاحب بھی یوسف زئیوں کے ہمراہ جب وہ سوات پر قبضہ کے لئے کابل سے براہ ننگرہار پشاور آرہے تھے۔ اُن کے ساتھ آگئے۔ جب مشہور پٹھان قانون دان شیخ ملیؒ نے سوات کی زمین کی تقسیم شروع کی تو شیخ سعدی کو قبیلہ مندے زئی کے ساتھ شامل کر کے زمین اسے بھی الاٹ کردی۔ یہ زمین دریائے خیالی اور سردریاب کے درمیان تحصیل چارسدہ ضلع پشاور میں پڑتی تھی۔ اور اس نسبت سے اب بھی مندے زئی گاؤں اس علاقہ میں مشہور ہے.........

جب مغلوں نے یوسف زئی علاقہ کے خلاف یورش کی تو ان کو بھی یوسف زئی قبیلہ کا فرد سمجھ کر شہید کردیا گیا شیخ سعدی کی شہادت اور ان کے والد اخوند گدائی جو مندے زئی ہی میں پیدا ہوئے تھے گرفتار کرلیا۔ بعد میں حاکم وقت کو صحیح حالات معلوم ہوئے تو شیخ سعدی کی شہادت کا افسوس کیا۔ اور اخوند گدائی کو رہا کردیا اس کے بعد وہ مندے زئی سے نکل کر چغرزئی (قبیلہ اسمٰعیل خیل) میں آگئے۔

اخوند درویزہ کی ولادت ۹۴۰ھ (۱۵۳۳ء) ہے۔ آپ شاید مندے زئی میں پیدا ہوئے اور بچپن یقیناً چغرزئی میں گزرا۔ **وفات۔** آخر عمر میں علاقہ یوسف زئی کو چھوڑ کر پشاور میں سکونت اختیار کرچکے تھے۔ وفات ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں ہوئی۔

۲۔ ملا صالح الکوزئی۔ جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم وفاضل تھے۔ قندھار میں قاضی تھے۔ ان کا مزار علاقہ بنیر میں ہے۔ دیوانہ بابا سے مشہور ہیں۔

۳۔ ملا یوسف بن الیاس گدائی زئی جن کا مزار مبارک وادی ملندری کے شاہراہ پر واقع ہے اور اخون یوسف سے مشہور ہے۔

۴۔ میاں عبدالکریم ولد اخوند درویزہ بابا المعروف بہ میاں کریم داد۔ بحر المعانی، محقق افغان اور میاں شہید ہیں۔ مزار مبارک موضع کانجو ریاست سوات میں ہے۔ شہید بابا سے مشہور ہیں۔

اخلاق وعادات۔ پیر بابا بے پایاں سخاوت کے مالک تھے۔ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے۔ مسافروں کو زادِ راہ اور سفر خرچ دیتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مالی امداد بھی فرماتے۔ ان کا لنگر ہر وقت جاری رہتا جہاں غرباء و مساکین کے لئے اذن عام ہوتا تھا ان میں کپڑے بھی تقسیم کئے جاتے۔ عوام کو بیعت شریعت اور خواص کو بیعت طریقت کرتے۔ آپ کشف وکرامات کے

پیر بابا کے حالات میں پیر روشن کا ذکر آیا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس تاریخی شخصیت کے حالات جو نایاب ہیں تحریر کئے جائیں۔

بایزید انصاری (پیر روشن یا پیر تاریک)

یہ اپنے حامیوں میں "پیر روشن" اور مخالفوں میں "پیر تاریک" کے ناموں سے مشہور ہیں۔ مسکین تخلص رکھتے تھے۔ آپ شیخ سراج الدین کی اولاد میں قاضی عبداللہ کے ہاں سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء) پنجاب کے مشہور شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ بایزید افغانوں کی قوم اُرمڑ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کا خاندان انصاری کہلاتا ہے۔

بایزید کی پیدائش کے بعد ان کے والدین کانڑی گرم (جنوبی وزیرستان) چلے آئے جہاں کے افغانوں نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی۔ چنانچہ وہ وہیں رہنے لگے۔ بایزید بچپن ہی سے روحانیت کی طرف مائل تھے۔ ایام جوانی میں قندھار، ہندوستان اور ترکستان سے سمرقند تک کئی سفر کئے اور ہمیشہ مرشد کامل کی ٹوہ میں لگے رہے۔ ایک بار وہ گھوڑوں کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں ہندوستان کے سفر پر تھے کہ شہر جالندھر میں ان کا نکاح شمسیہ نامی خاتون سے ہوگیا۔ جو لودھی خاندان سے تھی۔ بایزید کی اولاد اسی خاتون کے بطن سے ہوئی۔ ان سفروں میں بایزید ہمیشہ تزکیۂ نفس اور انفس و آفاق کے مشاہدے میں مشغول رہے اور لوگوں کو مرید بنا کر اپنے مسلک میں داخل کرتے رہے۔

بایزید ایک باثر اور محرک شخصیت کے مالک تھے۔ چنانچہ حضرت اخوند درویزہؒ "تذکرۃ الابرار" میں فرماتے ہیں: "والد نے بایزید کو تحصیل علم کی جانب متوجہ کیا جسے انہوں نے ایک حد تک حاصل بھی کیا۔ وہ طاعت و عبادت میں بڑی جد و جہد سے کام لیتے اور شریعت کے منہیات سے حتی الامکان بچے رہے۔

"دبستان مذاہب" کے مؤلف کا کہنا ہے کہ کابل میں بایزید شہزادہ محمد حکیم کے دربار میں حاضر کئے گئے اور علماء کے ساتھ مناظرہ کیا جس پر بہت سے علماء ان کے دلائل سے عاجز آ گئے اس پر شہزادے نے انہیں باعزت طور پر رہا کر دیا۔"

ایک دوسری جگہ حضرت اخوند درویزہ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

فرزان الاسلام

سے ماخذ صراط التوحید تصنیف بایزید انصاری۔ پیش کش محمد عبدالشکور ادارہ اشاعت سرحد۔ پشاور ۱۹۵۲ء

"بایزید بڑے عاقل، ہوشیار، زیرک اور دانا تھا اور حکمت میں بھی انہیں دسترس حاصل تھی۔"

مخالفین بایزید: اس زمانے میں جب بایزید پختونخواہ کے پہاڑوں میں اپنے مسلک کی نشر و اشاعت اور حکومت مغلیہ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ایک دوسرے بزرگ حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) نے جو امیر تیمور گورگان کے رشتہ داروں میں سے تھے (امیر تیمور کے خواہر زادہ تھے: تذکرۃ الابرار اور مخزن اسلام) مغلوں کی طرفداری میں بایزید کی مخالفت شروع کر دی۔ پیر بابا (سال وفات سنہ ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) کے مریدوں میں حضرت اخوند درویزہؒ خاص شہرت رکھتے تھے۔ جو بڑے عالم و فاضل اور پشتو و فارسی کے بلند پایہ مصنف تھے۔ پشاور کے علاقہ میں روحانی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ وہ بایزید انصاری کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے اپنے پیر کی تقلید میں اپنی کتب مخزن اور تذکرہ میں بایزید کو بے دین اور ملحد تک لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ انہوں نے مغلوں کی حمایت اور ایما ہی پر کیا ہو۔

دبستان مذاہب کے قول کے مطابق حضرت سیّد علی (پیر بابا) اور حضرت اخوند درویزہ کی مخالفت بایزید سے سنہ ۹۴۹ھ سنہ ۱۵۴۳ء میں شروع ہوتی ہے کیونکہ یہی وہ وقت تھا جب بایزید پختونخواہ کے پہاڑوں میں کامل طور پر اقتدار حاصل کر چکا تھا اور لوگوں کو اپنے مسلک میں لانے کے لئے علانیہ تبلیغ میں مصروف تھا۔ ان کے پیش نظر افغانوں کا اتحاد بھی تھا۔

حافظ محمد ادریس صاحب کتاب "صراط التوحید" (تصنیف بایزید انصاری) جو محمد عبدالشکور صاحب نے ایڈٹ کر کے سنہ ۱۹۵۲ء میں شائع کی کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

بایزید اپنے خیالات کے لحاظ سے بیحد انتہا پسند تھے۔ جن دنوں ریاضت میں منہمک تھے۔ بقول حضرت اخوند درویزہ راہ چلتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ کوئی چیونٹی ان کے پاؤں تلے دبنے نہ پائے۔" پھر جب اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے تو اسی انتہا پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے سب لوگوں کو مشرک کہنے لگے۔ اور علماء و مشائخ کے اقوال و اعمال پر تنقید کر کے ان کے دل دکھانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سارے لوگ ان کے مخالف ہوگئے۔ اور ان پر طرح طرح کے الزامات دھرنے لگے۔ جس کی وجہ سے بایزید اپنی زندگی ہی میں کافی بدنام ہوگئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ لوگوں کے غلط الزامات کی تردید کر کے اپنی پوزیشن صاف کرا لیتے مگر اس کے برعکس انہوں نے پشاور آ کر حضرت سید المشائخ پیر سید علی ترمذی عرف پیر بابا کے ساتھ مقابلہ کرنا شروع کر دیا جس سے ان کی قوت کو بہت نقصان پہنچا۔ ... سیاسی ... خادتوں کی وجہ سے مغلیہ حکومت

کی مادی طاقت اور اخوند درویزہؒ کی علمی قوت نے ان کی مذہبی اور سیاسی دونوں تحریکوں کو کچل کے رکھ دیا۔

سیاسی نظریہ وجدوجہد:۔ اپنے اصولوں کی دعوت دیتے ہوئے انہوں نے بہت سے مقتدر اشخاص کو اپنا طرفدار بنا لیا۔ اور چاہا کہ افغانوں کی ایک داخلی حکومت قائم کرلیں۔ کانیگرم (جنوبی وزیرستان) کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

ابتداءً وہ اپنے ایک شاگرد ملا دولت لہندزئی کے ہمراہ موضع کلہ ڈھیر گئے جو اشنغر میں واقع ہے اسی مقام پر یزیدے کے کچھ لوگ ان کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوگئے اور انہوں نے دہلی کی مغلیہ حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

جنگِ اشنغر:۔ کابل کے مغل صوبیدار محسن خان نے حضرت سید علی ترمذی (پیر بابا) اور حضرت اخوند درویزہ کی مدد سے ان پر لشکر کشی کی۔ سنہ ۹۷۰ھ ۱۵۶۲ء سے سنہ ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء تک تپہ اشنغر میں لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ آخری جنگ میں بایزید گرفتار ہوئے اور انہیں کابل کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

جنگِ تیراہ:۔ بایزید کو گرفتار ہوئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اپنے روحانی عقیدت مندوں کی مدد سے وہ وہاں سے رہائی پانے میں کامیاب ہوگئے اور ننگرہار اور تیراہ آچلے آئے یہاں پر اپنی حکومت اور طریقت کی بنیاد رکھی سنہ ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کے قریب تمام اورکزئی اور آفریدی قبائل میں ان کا سیاسی اور جنگی اقتدار قائم ہوگیا۔

مغلوں کے لشکر کابل اور پشاور سے چل کر موضع چوری (تیراہ) کے مقام پر ان کے سامنے صف آرا ہوئے مغلیہ فوج کو سخت شکست ہوئی بایزید نے تیراہ کی سرزمین کو تمام مخالفوں سے پاک کر دیا۔ اس کے بعد بایزید نے کافی لشکر منظم کرلیا۔ اور ننگرہار کی طرف سے کابل کے مغل حاکم محسن خان پر حملہ کر دیا۔ تورراغہ (علاقہ شنواری) کے مقام پر فریقین میں خونریز معرکہ ہوا اس جنگ میں بایزید مارے گئے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شکست کے بعد سخت گرمی کے موسم میں بایزید سفر میں پیاس و گرمی کی وجہ سے کالاپانی (تپہ اشنغر) میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد ان کی اولاد نے ان کے تابوت کو وہاں سے نکال کر وزیرستان پہنچا دیا اور دوبارہ وہاں دفن ہوئے۔

وفات سنہ ۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء میں عمر ۶۰ سال ہوئی۔

تصانیفِ بایزید

۱۔ رسم الخط پشتو۔ پشتو کے مخصوص رسم الخط کو رواج دینے کے لئے لکھی۔

۲۔ صراط التوحید۔ فارسی رسالہ جو حال و مقامات سلوک و نصائح کی تشریح پر مشتمل ہے۔

۳۔ حالنامہ۔ خود نوشت سوانح حیات۔

۴۔ مقصود المومنین۔ عربی کی ایک کتاب۔

۵۔ خیر البیان۔ پشتو زبان میں فقہ، احکام عبادات اور امر و نواہی شرعیہ اور تصوف و سلوک کے مسائل پر لکھی گئی۔ اس کے کچھ حصے عربی، فارسی اور ہندی زبانوں میں بھی ہیں۔

بایزید کے جانشین:۔ بایزید کی وفات پر ان کا بیٹا جلال الدین چودہ کی عمر میں باپ کی گدی پر بیٹھا اس نے بھی مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر سے کئی سخت لڑائیاں لڑیں۔

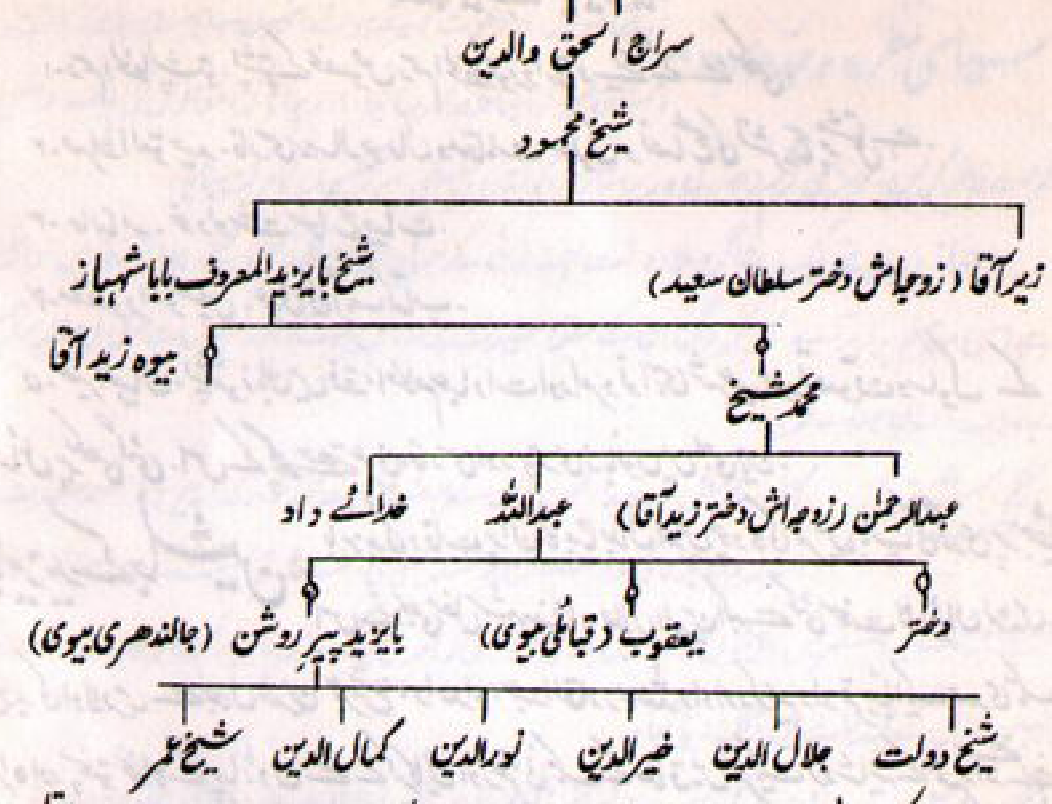
بایزید کی اولاد میں سے جلال الدین، عمر شیخ، واحداد، عبدالقادر، اللہ داد اور کریم داد قریباً ایک صدی تک تیراہ اور سپختو نخواہ کے پہاڑوں سے لے کر کابل اور غزنی تک کے علاقہ میں تحریک روشانیہ کے علمبردار رہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین کا ایک مضمون

پیر روشن بایزید انصاری پر پاکستان ٹائمز، جنوری ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا انہوں نے اس مضمون سے بایزید کی مغلوں سے چپقلش کا پس منظر اور ان کا شجرہ نسب مکمل دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ وہ ایوب انصاریؓ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد سے ہیں۔ شجرہ حسب ذیل ہے:۔

بایزید بن عبد اللہ بن شیخ محمد بن شیخ بایزید بن شیخ سراج الدین بن چاغ دین بن شیخ ابراہیم دانشمند بن شیخ زادہ حمزہ۔ بن خواجہ محمود بن شیخ داؤد بن شیخ شمس الدین بن شیخ خلیل بن شیخ نعمان بن شیخ نعمان بن شیخ خداداد بن شیخ منصور بن شیخ محمد بن خواجہ زید احمد انصاری۔ بن شیخ منصور محمد بن شیخ احمد بن شیخ زادہ بن خواجہ ایوب انصاریؓ (حالنامہ مصنفہ علی محمد بن ابوبکر قندھاری ماخوذ از سوانح عمری بیان کردہ بایزید انصاری۔

اورنٹل میگزین فروری ۱۹۵۵ء نے تذکرۃ الانصار کے حوالہ سے مندرجہ ذیل شجرہ نسب دیا ہے:۔



بایزید انصاری کی پیدائش جالندھر میں ۹۳۰ھ ۱۵۲۳ء میں ہوئی ۹۳۱ھ ۱۵۲۴ء میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا جس پر تمام افغان قبیلے وہاں سے منتشر ہو گئے اور بہار میں پناہ لی۔ جہاں افغان افواج ابھی تک قابض تھیں آخر کار اُن کو شکست ہوئی۔ اور جان بچانے کے لئے سب کو بھاگنا پڑا۔ عبداللہ کا بھائی خداداد بایزید اور اس کی والدہ کو ساتھ لے کر کانی گرم جنوبی وزیرستان میں آ گیا۔ جہاں عبداللہ والد بایزید پہلے سے موجود تھا اس واقعہ نے آخر کار بایزید کو مغل سلطنت کے خلاف صف آرا کیا۔

ہندوستان سے دو معروف ہستیاں ملا مودود اور ملا ارزانی (جو شاعر بھی تھے) نے بایزید کے پاس آ کر اس کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد بایزید نے باہر نکل کر اردگرد کے علاقوں سے تبلیغ شروع کر دی۔

اخوند صاحب سوات

آپ کا اثر و رسوخ علاقہ یوسف زئی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور وہاں سے تمام مالک ملحقہ پر بھی کافی موثر ہے اور ہزارہ پر اس کے اثرات رہے ہیں۔ اخوند صاحب کے حالات پر مسٹر ڈی۔ سی پلوڈن جو بہت عرصہ تک مردان میں اسسٹنٹ کمشنر رہا۔ ایک رپورٹ کمشنر پشاور کو مورخہ ۱۳ ار جون ۱۸۵۸ء کو پیش کی۔ اس میں اس نے اخوند صاحب کی پیدائش۔ عادات و رسوخ اور سوات کی

کی سیاسی پارٹیوں اور ان کے حالات پر تفصیل سے لکھا ہے اس رپورٹ کے ابتدائی حصہ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"موجودہ وقت میں علاقہ سوات میں بلا شبہ سب سے زیادہ مشہور اور با اثر شخصیت اخوند صاحب عبدالغفور خان کی ہے ان کا سیاسی اثر و رسوخ اور مذہبی قیادت کا غلبہ سرکار انگریزی اٹک سے پار اور ہزارہ میں اور یاغستان کے افغان علاقوں میں بہت زیادہ ہے۔

زائرین مسلمان اور اہل ہنود دُور دُور علاقوں سے مثلاً ہندوستان اور ڈاکٹر بیلیو کے بیان کے مطابق (اُس کے مرید ایک چھوٹے سے گاؤں بہ نام شہر آباد میں بھی جو بغداد سے ستر میل بہ طرف مشرق ہے آباد ہیں اور ایک ہزار نفوس کے قریب شہر موصل میں آباد ہیں۔) سے بھی ان کے مرید جو سالانہ بطور نذرانہ اس سابقہ پیر "بیکہ" (گاؤں برلب دریائے سندھ جہاں اخوند صاحب نے ابتدا میں چلہ کشی کی تھی) کی خدمت میں سوات بھیجتے ہیں۔

اخوند عبدالغفور صافی قوم کے فرزند ہیں۔ ان کی قوم کا ذریعہ معاش مواشی پالنا ہے جن کا اصلی وطن مہمند قوم کے آزاد علاقہ میں ہے لیکن اس قوم کے افراد یاغستان اور سرکار انگریزی کے علاقہ کے مختلف دیہات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش بلیو کے بیان کے مطابق ۱۷۹۴ء ہے لیکن حیات خان کے مطابق تاریخ پیدائش ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء ہے لیکن میری رائے میں پہلی تاریخ پیدائش ان کی زندگی کے واقعات سے مطابقت رکھتی ہے لہٰذا درست ہے۔ ان کی پیدائش موضع مجورا باشیرئی کے علاقہ میں تپہ جنگی خیل میں ہوئی۔ جہاں پر اب سے ۴۳ سال پہلے ان کے جد امجد آ کر اقامت گزیں ہوئے ان کے ایام طفولیت اسی گاؤں میں گزرے۔ بچپن میں وہ اپنے باپ کے مویشی چرایا کرتے تھے ان کی زندگی شروع ہی سے خاموش اور سنجیدہ تھی اور وہ مذہبی طرز کی علیحدگی پسند طبیعت رکھتے تھے۔ ان ایام کی ایک کہانی بیان کی جاتی ہے جب کہ دوسرے لڑکوں کی طرح انہوں نے کبھی سوائے اپنی گائے کے دوسری گایوں کا دودھ نہ پیا۔ اور اپنی گائے کے گلے میں رسی ڈال کر اور پکڑ کر چراگاہ میں لاتے تھے تاکہ راستہ میں کسی کا فصل نہ کھا سکے۔ تاکہ اس کا دودھ بھی حلال چارے سے پیدا ہو۔

اب بھی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی بکریوں کے ریوڑ کو جب چرانے کے لئے لے جاتے ہیں تو سب کے منہ باندھے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ راستہ میں وہ جلدی سے کسی کے فصل پر منہ نہ مار سکیں۔

اٹھارہ سال (۱۲۱۲ھ ۱۸۱۲ء) کی عمر میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بڑ نگولہ دریائے سوات سے پار (بالمقابل ڈھیری) چلا گیا [illegible]

جانب شمال بقدر ۳ میل فاصلہ) گئے اور وہاں پر عبدالحکیم اخونزادہ کی مسجد میں اس کے زیر تعلیم رہے۔ چند ماہ وہاں رہنے کے بعد وہ پشاور گئے۔ وہاں سے اٹھمڑہ اور رمبکی اور خٹک کے دیہات واقعہ دائیں کنارہ دریائے کابل گئے۔ اور اس اثنا میں شیخ رحمکار علیہ الرحمۃ کی زیارت کا کاخیل بھی گئے۔ ہر جگہ چند دن مساجد میں اقامت پذیر ہوتے رہے۔ آخر کار خیرآباد پہنچ گئے۔ خیرآباد میں ان کا واسطہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے سپاہیوں سے پڑا جنہوں نے بیگار میں پکڑ کر ان سے سامان اٹھوا کر نوشہرہ تک لے گئے۔ نوشہرہ میں وہ ان سے بھاگ کر پھر خیرآباد آگئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ ٹھہرنے کے بعد وہ دریائے کابل کو پار کر کے توڈھیر نزد لاہور (صوابی تحصیل) چلے گئے۔ وہاں پر وہ صاحبزادہ محمد شعیب کے مرید ہو گئے۔ صاحبزادہ محمد شعیب خود حافظ جی صاحب ساکن عمرزئی (ہشت نگر) کے مرید تھے۔ ان کے استاد (صاحبزادہ محمد شعیب) سلسلہ قادریہ کے خلیفہ تھے۔ اخون صاحب علم فقہ کے مطالعہ کے بعد قادریہ سلسلہ سے منسلک ہو گئے۔ اور مسجد سے اٹھ کر خانقاہ میں چلے گئے۔ ۱۸۱۶ء میں وہ توروڈھیر سے مشرق میں چار میل دور موضع بیکہ۔ لب دریا۔ ایک خود تعمیر کردہ جھونپڑے میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر معتکف ہو گئے اور بارہ سال تک چلہ کش رہے۔ اس عرصہ میں صرف سبزی اور دودھ پر بسر کرتے رہے ان کا ورد یہ تھا۔ انت الہادی، انت الحق۔ لیس الہادی الا ہو۔ یہاں اُن کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور لوگ ایران تک سے آکر مرید ہونے لگے اور وہ فقیر بیکہ کے نام سے پکارے جانے لگے۔ ان ہی کے صلاح اور مشورہ سے خادی خان خان ہند سید احمد شہید کے سامنے حاضر ہوا تھا۔ اور آخر کار قتل ہوا اور سید صاحب پنج تار چلے گئے۔ انہی ایام میں اخون صاحب بیکہ سے چلے گئے۔ اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے موضع نمل نیلاب سے نیچے علاقہ خٹک میں ایک غار میں معتکف ہو گئے۔ یہاں وہ ایک سال رہے۔ اس جگہ محمد غوث ترکھان نے ان کے غار کے لئے ایک دروازہ بنایا۔ جس پر گاؤں کا خان معین خان اس ترکھان پر ناراض ہوا اور اس ترکھان کو تنگ کرنے لگا۔ جس پر اخون صاحب وہاں سے نزدیک ایک دوسرے گاؤں آمر میں چلے گئے۔ موضع نمل میں وہ ایک ملا مسمی رسول ساکن ہرات سے تعلیم حاصل کرتے تھے ایک سال بعد وہ آمر سے بھی چلے گئے۔ اور گاؤں گاؤں پھرتے رہے اور آخر میں موضع غلا ال علاقہ یوسف زئی ضلع مردان میں آکر اقامت گزیں ہو گئے۔ یہاں ان کے تقدس اور بزرگی کی پھر شہرت ہو گئی۔ اس کے بعد موضع سلیم خان (علاقہ صوابی) کے لوگوں کی دعوت پر وہ وہاں چلے گئے۔ اور "اخون" کا لقب بوجہ مشہور ولی ہونے کے یہیں سے ان کے نام کے ساتھ شامل ہو کر مشہور ہو گیا اسی اثنا میں ان کی شہرت امیر دوست محمد خان کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے ان کو سکھوں کے خلاف جنگ کرنے

کے لئے ۱۸۳۵ء میں بلایا جب کہ وہ موضع شیخاں (نزد قلعہ بالاحصار) میں کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ اخوند صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی۔ اور اپنے مریدوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ اور دیگر نمازیوں اور امیر دوست محمد خان کی معیت میں سکھوں کے خلاف ایک دو معرکوں میں شریک ہوئے۔ لیکن جب مہاراجہ رنجیت سنگھ بذات خود بمعہ زیادہ فوج کے یہاں پر پہنچ گیا تو حالات بدل گئے۔ اور امیر دوست محمد خان نے دیکھا کہ وہ گھر گیا ہے تو وہ براہ خیبر واپس چلا گیا۔ اخوند صاحب بھی باجوڑ چلے گئے اور زال درہ علاقہ رانی زئی میں عبادت کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔ چند سال وہاں رہائش رکھنے کے بعد وہ موضع سیدو منز (درمیانہ گاؤں) علاقہ بابوزئی چلے گئے۔ اور آج تک کہ عرصہ تیس سال کا ہوتا ہے وہیں اقامت پذیر ہیں۔

موضع سیدو کے تین حصے ہیں۔ بالا۔ درمیانی اور پائیں۔ بالا اور پائیں میں افغان آباد ہیں۔ اور درمیانہ حصہ پاچینی میاں گانان موضع نجی گرام نزد مری کوٹ کے سپرد ہے یہ میاں گان ہندوستانی نسل سے ہیں۔ بابوزئی کا علاقہ اخوند صاحب کے وعظ کے زیر اثر پُرامن ہے۔ ان کے دو لڑکے ہیں بڑے میاں گل عبدالمنان صاحب اور چھوٹے میاں گل عبدالخالق ہیں۔ اخوند صاحب کے رہائش سوات کے بعد مشہور واقعہ ان کا ۱۸۵۰ء میں شاہ سوات کا تقرر ہے اور اس کے مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

۱۔ ضلع مردان کے الحاق (دسمبر ۱۸۴۹ء) کے تھوڑے عرصہ بعد خوانین۔ پلائی۔ زور مندی اور شیرخانہ علاقہ وادی باثیزئی کے خلاف ایک فوج زیر کمان کرنل بریڈ شاضروری بھیجنی پڑی۔ اس جنگ میں خوانین علاقہ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اور ان کے بہت سے آدمی قتل ہوئے ان کو مکمل طور پر زیر اطاعت کرنے کے بعد فوج پشاور واپس آگئی۔ اس واقعہ سے خوانین سوات خوفزدہ ہو گئے۔ کہ مبادا ان کا بھی یہی حشر ہو لہذا ان سب نے اتفاق کر کے ایک بادشاہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا جو سوات کا باشندہ نہ ہو انہوں نے اخوند صاحب کے آگے یہ درخواست پیش کی اور بادشاہ کو عشر دینا منظور کیا۔ اخوند صاحب نے سید اکبر شاہ ساکن ستھانہ کا نام تجویز کیا۔ جو ایک صاحب عزم ایک مخلص مسلمان تھا اور ایک عالی نسب سید بھی تھا۔ لوگوں نے منظور کر کے اس کو بلا کر اخوند صاحب کے زیر سرپرستی بادشاہ بنا لیا۔

سید اکبر شاہ، سید زمان شاہ ساکن تختہ بند تپہ دولت زئی (علاقہ گدون) کا پوتا تھا۔ سید زمان شاہ ہی نے سادات کی آبادی ستھانہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس جگہ (ستھانہ) پر تنولیوں اور اتمان زیوں کا ملکیت پر جھگڑا ہوتا تھا۔ آخر میں ان دونوں قبیلوں نے اس سے [illegible] یہ زمین سید زمان شاہ کو

بطور سیری دے دی۔ سید اکبر شاہ سید احمد شہیدؒ کا وزیر اعظم اور وزیر خزانہ تھا اور اس نے ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ کافی دوستی پیدا کر لی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں سید احمد صاحب علیہ الرحمۃ کی شہادت کے بعد سید اکبر شاہ نے ان مجاہدین کو ستھانہ میں پناہ دی۔ ۱۸۵۰ء میں جب سید اکبر شاہ سوات کا بادشاہ بن گیا۔ تو ان مجاہدین نے اس کے ساتھ وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو جب کہ غدر کی خبریں پشاور پہنچیں۔ سید اکبر شاہ کی وفات ہو گئی۔ اور اخوند صاحب نے سواتیوں کے کہنے پر اس کے لڑکے مبارک شاہ کو وہاں سے نکال دیا۔ اور سوات میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور سواتی ہماری مخالفت کر ہی نہ سکے۔

۲۔ اخوند صاحب کی زندگی کا ایک اور اہم واقعہ ان کا امبیلہ کی جنگ ۱۸۶۳ء میں حصہ لینے کا ہے قبائل کی درخواست پر وہ ۲۷ راکتوبر ۱۸۶۳ء میں تین چار ہزار سپاہیوں اور ۱۲۰ سواروں جو زیر کمان شیر دل خان، خان رانی زئی اور اس کے بھتیجے صحبت خان کے تھے۔ اور جن کے آگے ایک سو قبائلی علم تھے، شامل جنگ ہوئے۔ سواتیوں کے علاوہ بارسو افراد دیگر آزاد قبائل از کمک تا کابل بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چند متعصب اور شورش پسند افراد علاقہ مردان و پشاور ہماری رعیت سے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ ان کے ہمراہ مولوی عبداللہ کے تحت نو سو ہندوستانی مجاہدین بھی تھے۔ مولوی عبداللہ کے شامل ہو جانے پر سب لوگ زیر کمان مولوی عبداللہ کر دئے گئے۔ ۹ رنومبر کو اخوند صاحب کے اثر و رسوخ کی وجہ سے بہت سے باجوڑ کے لوگ زیر سرکردگی زمان خان ولد فیض طلب خان باجوڑ بھی ان کیساتھ شامل ہو گئے دسمبر کے شروع میں چھ ہزار آدمی زیر تحت غزن خان، خان دیر بھی پہنچ گئے۔ جب لالو اور امبیلہ فتح ہو گیا تو سب سے پہلے باجوڑ اور دیر کے لوگ فرار ہوئے۔ ان کے چلے جانے پر حسرت و افسوس اور کافروں کی فتح پر صدمہ کے احساس سے اخون صاحب اپنی خچر کی لگام موڑ کر واپس ہوئے۔
امیر کابل اور انگریزوں دونوں کی نظر سوات پر تھی اور اخوند صاحب ان ہر دو سے سوات کو بچانا چاہتے تھے اس واسطے انہوں نے سوات کا بادشاہ مقرر کیا اور جنگ امبیلہ میں بھی شامل ہوئے۔

۱۸۶۸ء میں جب انگریزی فوج حسن ابدال میں سالانہ فوجی مشق کر رہی تھی۔ تو اخوند صاحب نے اس خیال سے کہ شاید انگریز سوات پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں۔ سب دروں پر حفاظت کے لئے پہرہ دار بٹھائے جو رات دن وہاں متعین رہے اور ڈپٹی کمشنر پشاور کی یقین دہانی پر وہ ہٹائے گئے۔

اخوند صاحب کے روزانہ مشاغل حسب رپورٹ پادری ہیو جیچ مشن پشاور۔

اسلامی دنیا کے ہر کونہ سے ہزاروں عقیدت مند روزانہ ان کے پند و نصائح سننے اور دعا کرانے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ عرب، ترک، ایرانی، ہندوستانی۔ افغان اور بخارا کے لوگ۔ کبھی کبھی ان میں اکا دکا انگریز اور روسی بھی ہوتے ہیں جو ان کی مہمان نوازی سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور اکثر روزانہ تین سو سے زیادہ افراد حاضر ہوتے ہیں۔ یہ بزرگ انسان روزانہ اپنی مسجد کے ایک کونہ میں بیٹھ کر اپنے عقیدت مندوں کے لئے دعا کرتا ہے اور ان کو کفر و نفاق سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ مذہب کے متعلق لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتا ہے جس سے لوگ مطمئن ہو کر واپس جاتے ہیں۔ تمام دن میں صرف دوپہر کو وہ سوتے ہیں اور پانچ وقت کی نمازوں کے وقت یہ مجلس نہیں ہوتی۔

وہ اپنے احکام کی اشاعت اپنے خاص مریدوں سے جن کو شیخ کہتے ہیں کرواتے ہیں۔ یہ شیخ تمام آزاد علاقہ میں ان کے احکام پر عمل درآمد کرانے کے لئے دورہ کرتے ہیں۔ ان کے شیوخ کی تعداد دس ہے جن میں سے سات باہر کے علاقوں میں متعین ہیں۔ اور تین خاص سیدو میں رہتے ہیں۔ ان کے لنگر سے روزانہ پانچ سو کے قریب لوگ مفت روٹی کھاتے ہیں۔ جو نذر و نیاز اور سیری کی زمینوں کی آمدنی سے چلتا ہے۔ ان کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں ہیں جن کو ان کے مرید چراتے ہیں۔ لنگر اور دوسرے کام سب مرید مفت کرتے ہیں۔ اور اس بات کو عزت سمجھتے ہیں روٹی دن میں دو دفعہ کھلائی جاتی ہے۔ سردیوں میں مکی کا اوگرہ یا چاول گھی کے ساتھ۔ گرمیوں میں گندم یا جو کی روٹی دی جاتی ہے کوئی مرید تین دن سے زیادہ وہاں نہیں رہ سکتا۔ ان کی مُہر ان کے معتمد شیخ کے پاس رہتی ہے۔

چند سال ہوتے ہیں کہ بدچلنی کی روک تھام کے لئے اخوند صاحب نے حکم دیا۔ کہ سب نوجوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کی شادیاں فوراً کر دی جائیں۔ اخوند صاحب کی پاکیزہ زندگی اور قادریہ سلسلہ میں استقامت قابل تعریف ہے۔

مئی ۱۸۶۱ء میں انہوں نے سید مبارک شاہ ولد سید اکبر شاہ کو بادشاہ بنانے کی تجویز کی، لیکن لوگوں نے اس کو قبول نہ کیا۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء میں سید مبارک شاہ ایک شادی کے دوران میں موضع منگل تھانہ میں اپنے ہاتھ سے گولی لگ جانے کی فوت ہو گیا۔

جون ۱۸۶۵ء میں انہوں نے ایک سید مسمی احمد شاہ ساکن سرسنزی تپہ نیکپی خیل کو سوات کا بادشاہ بنایا لیکن ایک ماہ بعد اس کو اس بنا پر معزول کر دیا کہ وہ دیانت دار اور عادل نہیں تھا۔ اور کوئی عزم وہ بھی
ورعش نہیں ... بادشاہ کی عزت ... نہیں

سوات کے افغان فطرتاً کسی بادشاہ کی تابعداری نہیں کر سکتے اور وہ آزاد رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ سید اکبر شاہ کو انہوں نے ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کے حملے کے خوف سے بادشاہ مقرر کر دیا تھا لیکن جلد ہی اس سے تنگ آگئے تھے اور چند خوانین نے تو اس کی ظاہری مخالفت شروع کر دی تھی اور خوانین سوات و دیر نے درپردہ کئی خطوط کمشنر پشاور کو لکھے۔ کہ وہ ان کو سید اکبر شاہ کی حکومت سے آزاد کرائے۔ اور انگریزی فوج بھیجے۔ اس فوج کے سوات میں داخل ہوتے ہی وہ سب مل کر سید اکبر شاہ کو تخت حکومت سے اتار دیں گے۔

اخوند صاحب کا مذہبی اثر دُور دور تک ہے۔ سوات، کوہستانِ سوات، بُنیر، باجوڑ، دیر، کنڑ، کاشغار (چترال)، وادی دریائے کابل، افغانستان، یارقند، بدخشان، پنجاب اور ہندوستان میں خاص اثر ہے اور اس کے مرید ایران اور عرب ممالک میں بھی ہیں۔ اخوند صاحب کے مسلم ممالک میں اثر و رسوخ کی وجہ سے انگریزوں نے اس کو سوات کے پوپ کا خطاب دیا۔ اس کے مرید اس کو صاحب علیہ الرحمت کے نام سے پکارتے ہیں۔

اس کا اثر و رسوخ اضلاع پشاور، کوہاٹ اور بنوں میں بہت زیادہ ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ڈیرہ غازی خان میں بہت کم ہے کیونکہ وہاں پر (سنگھڑ۔ ڈیرہ غازی خان) ایک اور پیر خواجہ سلیمان تونسویؒ کا اثر زیادہ ہے وہ سلسلہ چشتیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان کے نزدیک سماع (راگ گانا) جائز ہے۔ خواجہ سلیمان کی وفات (۱۸۵۵ء) کے بعد اخوند صاحب کا اثر و رسوخ انگریزی حکومت کے علاقہ میں زیادہ ہوگیا ہے۔ آزاد علاقہ میں اخوند صاحب کا اثر و رسوخ خاص کر سوات اور بُنیر میں بہت زیادہ ہے اور دینی و دنیاوی معاملات میں مکمل صاحب اختیار ہے۔ اس علاقہ کی آزادی اور خاص کر ۱۸۶۳ء کی جنگ میں اس علاقہ کا مفتوح نہ ہونا اس کی بزرگی کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے۔ جب تک پیر سنگھڑ زندہ رہا وہ اخوند صاحب کا مدمقابل سمجھا جاتا رہا۔

اخوند صاحب کے زمانہ میں ان کے مدمقابل سید امیر موسوم بہ مُلا کوٹھہ اور محمد جی المعروف بابا جی ملا قصابہ (کو ضلع نزد منگر یار) دو اور مذہبی رہنما تھے۔ ان کے مریدوں کو اخوند صاحب وہابی کے نام سے پکارتے تھے۔

مُلّا قصابہ کے مختصر حالات

یہ اصلاً تاجک تھا اس کے والدین باڑیکاب ضلع پشاور کے رہنے والے تھے یہ خود موضع خویشگی (دریائے کابل کے بائیں کنارہ پر) میں پیدا ہوا۔ اور مفتی عبدالرزاق ساکن پشاور شہر سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ علاقہ شنواری میں چلا گیا۔ اور ایک ندی موسومی قصابہ کے کنارے قصابہ کا گاؤں آباد کر کے رہائش اختیار کر لی۔ اس کے مرید زیادہ تر ضلع کوہاٹ کے رہنے والے تھے اور وہ ہر سال ان کے پاس آیا کرتا تھا۔ لیکن جب سے اخوند صاحب نے اس کو وہابی قرار دیا۔ تب سے وہ وہاں نہیں آیا اور اس کے مرید بھی اس سے روگرداں ہو گئے۔ آخرکار دس سال ہوئے کہ وہ نماز میں سجدہ کی حالت میں قتل کر دیا گیا۔ عام مشہور یہ ہے کہ اخوند صاحب کے مریدوں نے قتل کیا۔

کوہاٹ میں اس کے آٹھ مشہور مریدوں میں سے ایک سید پھول شاہ بادشاہ ساکن جنگل خیل ہے۔

اب اخوند صاحب (۱۸۷۵ء میں) بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اور ان کو مسجد میں روزانہ چارپائی پر لایا جاتا ہے۔ ان کا قد درمیانہ لیکن عمر اور کمزوری نے ان کو اب جھکا دیا ہے۔ ان کا رنگ گندم گوں اور نہایت سفید داڑھی ہے۔ گزشتہ دو سال سے ان کی نظر بھی بہت کمزور ہو گئی ہے۔

۱۸۷۶ء میں امیر شیر علی خان جب انبالہ گیا۔ تو اخوند صاحب نے اس کو کافر قرار دیا۔ اور یارقندیو کو ۱۸۷۴ء میں سر ڈگلس کے مشن کو وہاں جانے دینے پر سخت ملامت کی۔

اخوند صاحب قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کے سخت خلاف تھے جب تک وہ زندہ رہے سوات اور بُنیر کی سرحد پر کوئی سخت واردات انگریزی علاقہ کے اندر نہ ہوئی اور ان کے اثر و رسوخ و دور اندیشی سے سوات و بُنیر انگریزی دست بُرد سے محفوظ رہے۔

اقتباس از تاریخ ریاست سوات

از محمد آصف

اخوند صاحب کا نام عبدالغفور ہے اور آپ کے والد کا نام عبدالواحد۔ آپ موضع جبڑی علاقہ شامیزئی سوات میں ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے قومیت کے لحاظ سے آپ صافی مہمند میں صافی کہلانی قبیلے کی ایک شاخ ہے جو کہ افغان قبائل میں ایک معزز قبیلہ ہے۔

آٹھ سال کی عمر میں بڑ ہنگولا کے ایک مولوی صاحب سے ابتدائی تعلیم اور لکھنا شروع کیا اس کے بعد آپ گوجر گڑھی ضلع مردان میں مولانا عبدالحکیم سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے جکنی، زیارت [illegible]

علوم باطنی کے شوق میں آپ حضرت جی پشاوری - سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ سے بیعت کی۔ وہاں پر ذکرِ جہر کرنے پر (اس سلسلہ میں ذکرِ جہر منع ہے) مرشد نے ان کو پشاور سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ تورڈھیر مولانا محمد شعیب المعروف شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے جو سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ تھے۔ اور ان سے بیعت کی۔ کافی عرصہ تک وہاں اُن کی خدمت میں رہے لیکن جب شیخ صاحب ۱۸۱۶ء میں فوت ہوئے تو آپ نے بھی تورڈھیری کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد آپ موضع بیکی۔ بکنارہ دریائے سندھ، بارہ سال تک چلہ کش رہے اور شوخا گھاس کی روٹی پر اوقات بسری کرتے رہے اس دوران میں بموجب ڈاکٹر بیلیو آپ کا وظیفہ "انت الہادی انت الحق لیس الہادی الا ھو" کا ورد کرتے تھے۔ ۱۸۲۳ء میں بعض نامساعد حالات کی بناء پر آپ نے بیکی کو چھوڑ دیا اور دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر آباد ایک گاؤں "نمل" میں مقیم ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پٹھان خوانین اور سید احمد صاحب بریلوی کے مابین اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ غالباً انہی اختلافات سے بچنے کی خاطر آپ نے بیکی کو بھی چھوڑ دیا۔ نمل میں ہرات کے ایک مشہور عالم دین مولانا رسول شاہ صاحب سے آپ نے مزید علمی استفادہ بھی کیا۔

نمل میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد باشندگان سلیم خان (صوابی) کے اصرار پر وہ یہاں چلے آئے یہاں ان کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ اور آپ کو یہاں اخوند کا اعزازی خطاب ملا۔ (سوات کے ماحول میں اخوند درویزہ کے بعد صاحبِ سوات ہی کو اخوند کا خطاب ملا) اس اثناء میں آپ کی شہرت افغانستان تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۸۳۵ء میں آپ نے امیر دوست محمد خان کی دعوت پر جہاد میں شمولیت کی۔ اور شیخان کے مقام پر سکھوں کے خلاف محاذ قائم کیا۔ دوست محمد خان کے بددل ہو کر واپس جانے پر آپ بھی براہ باجوڑ سوات میں اپنے وطن عزیز چوبیس سال بعد واپس آ گئے۔ سوات پہنچ کر آپ کچھ عرصہ طوچ کی ایک مسجد میں رہے پھر آپ رنگیلا چلے گئے کچھ عرصہ بعد ہوڈی گرام کے قریب دامنِ کوہ میں غازی بابا کی زیارت میں مقیم ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد مرغزار پہنچ گئے۔ وہاں سے سپل بانڈھی کے میاں گان کی دعوت پر سپل بانڈھی آ گئے۔ اور وہیں مقیم ہو گئے۔ وہاں ہی آپ نے شادی کر لی۔ آپ کے دو فرزند عبدالحنان اور عبدالخالق پیدا ہوئے۔ ۱۸۴۵ء میں اخوند صاحب سپل بانڈھی کو چھوڑ کر دائمی سکونت کے لئے سیدو چلے آئے اور یہاں اصلاح کے میدانِ عمل میں آنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہاں پر ایک رہائشی مکان بنوایا اور لنگر جاری کیا اور ایک مسجد بھی بنوائی۔ وفات ۱۲ رجنوری ۱۸۷۷ء بہ عمر ۸۴ سال۔

شبیہ مبارک۔ کھلا ہوا روشن چہرہ۔ سفید ڈاڑھی۔ رنگ بوجہ عبادت و دائمی ریاضت زرد۔ قد درمیانہ بارعب چہرہ۔ لباس۔ سادہ ملکی کھدر کا سفید کرتہ اور شلوار سفید عمامہ اور کوہاٹی چادر۔

علماء ہزارہ

مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہروی

آپ کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے خلافت اور ہجرت کی تحریک (۲۰-۱۹۱۹) میں تمام ضلع ہزارہ کو ہلا دیا۔ گفتگو، اثر و رسوخ سے لوگ جوق در جوق آپ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اور بہت سے لوگوں نے آپ کے ارشاد کے مطابق ہجرت کی۔ آپ حویلیاں نزد ایبٹ آباد کے رہنے والے تھے۔ اور مانسہرہ کی جامع مسجد میں خطیب رہے۔ خلافت کی تحریک میں آپ ۱۹ راگست ۱۹۲۰ء کو گرفتار ہو گئے۔ عرصہ تک مینی تال جیل میں رہے۔ جب رہائی ہوئی تو آپ کو انگریزی حکومت نے مانسہرہ جانے نہ دیا۔ بلکہ ضلع ہزارہ میں داخلہ پر پابندی عائد کر دی۔

ان کی وفات کے بعد ایک مفصل مضمون ان کی زندگی پر ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۸ رجنوری ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تحریر اشرف عطا صاحب کی ہے اور مکمل درج ذیل ہے:-

آپ نے راولپنڈی کو اپنی دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ محلہ امام باڑہ میں ایک شاندار مسجد بنوائی جس کا نام مسجد انگور رکھا خود ہی امامت و درس تدریس کی زندگی چالیس سال اسی مسجد انگور کے ایک حجرہ میں بسر کر دئے۔ اس عرصہ میں آپ مختلف تحریکات کے سلسلہ میں بارہا گرفتار ہو کر قید ہوئے اور رہائی کے بعد پھر اسی مسجد میں جاگزیں ہوئے۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۲ء تک مسلمانوں کی بے لوث خدمت کرنے کے بعد یہ مردِ مجاہد ۸ دسمبر ۱۹۶۲ء کو صبح چھ بجکر دس منٹ پر اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔ آپ کو اپنے آبائی گاؤں حویلیاں میں اپنے آبائی قبرستان میں آپ کے بڑے بھائی حکیم خلیل احمد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنی یادگار میں ۵۴۴ کتابیں ایک خوبصورت گھوڑی اور ایک ضعیف خادم جمعہ چھوڑا۔ گھوڑی جمعہ کے حوالہ کر دی گئی۔ اور کتابیں نئے امام اور خطیب کے حوالہ۔

آپ کا قد درمیانہ۔ وجیہہ پُر رعب شکل و صورت اور متین شخصیت کے حامل۔ بدن فربہ

مولانا غلام ربانی لودھی صاحب کی تحریر کے مطابق آپ کی جائے پیدائش حویلیاں ہے وہ گل اخوندزادہ مرحوم کے بڑے صاحبزادے تھے جو حویلیاں کے مقام میں زہد و عبادت کی عظیم طاقت تھے۔ صاحب لفظ تھے۔ ان کا تعویذ اور دم بیماری کو نیست و نابود کر دینے کے لئے تیغ دو دم تھا کسی وجہ سے مولوی محمد اسحاق صاحب مرحوم نے مانسہرہ کی اس مسجد میں ڈیرہ جما لیا۔ جو شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد ہے

عوام ان کے وعظ و بیان پر دیوانہ ہو جاتے تھے۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ نے برطانیہ کے خلاف جو شورش اٹھائی اس میں مولوی صاحب نے حصہ لیا اور ضلع ہزارہ یوں کھولنے لگا جیسے دیگدان میں چاول کھولتے ہیں آخر ڈپٹی کمشنر کرنل جیمز نے ان کے خلاف قدم اٹھایا۔ موضع سفیدہ (نزد مانسہرہ) کے مایۂ ناز رئیسول غلام رسول خان اور عبدالقیوم خان اور مولوی غلام ربانی دلازاک کے ہمراہ قید کر لئے گئے اور سابق انڈیا کے دور دور مقامات میں نظربند کردئے گئے۔ جب شورش فرد ہوئی تو مولوی صاحب موصوف نے محلہ امام باڑہ راولپنڈی کی ایک مسجد میں درس نظامی کا دارالعلوم بنالیا۔ اور تادم آخر ایک آزادی پسند اور محب اسلام لیڈر کی حیثیت سے آزادانہ زندگی بسر کی۔ ان کی آخری بیماری میں صدر ایوب خان نے بھی ان کے علاج کے لئے سہولتیں مہیا کیں۔ لیکن موت نے مہلت نہ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی محمد عرفان صاحب

نام ابو المعارف محمد عرفان۔ آپ ذات کے تنولی اور موضع بکھوال تحصیل مانسہرہ کے رہنے والے تھے۔ درس گاہ مینڈو سے فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ تحریک خلافت میں مولانا محمد اسحاق مانسہروی کے ساتھ شامل رہے۔ اور ان کے ساتھ ہی گرفتار ہوئے۔ رہائی کے بعد بمبئی چلے گئے اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے رفیق کار رہے اور آخر دم تک ساتھ دیا۔ کئی دفعہ جیل گئے بہت بڑے عالم اور فلسفی تھے اور بہترین معلم۔ تقریر دلپذیر ہوتی تھی بہت ہی مستقل مزاج مجاہد تھے۔

۲۶ ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو جو وفد سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی دعوت پر موتمر اسلامی کے انعقاد کے انتظام کے لئے) بھیجا گیا اس میں مولانا ظفر علی خان اور شعیب قریشی کی معیت میں آپ (مولانا محمد عرفان صاحب) کو مرکزی جماعت خلافت نے بھیجا جس سے آپ کا کل ہند پایہ کا لیڈر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۱۶ ر مارچ ۱۹۳۹ء صبح دس بجے کے قریب حرکت قلب بند ہو جانے سے موت واقع ہوئی ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولانا غلام ربانی لودھی نے ان کے حالات پر مندرجہ ذیل تحریر عنائت فرمائی۔

مولوی محمد عرفان بکھیل کے رہنے والے تھے۔ عمر بھر بمبئی، دہلی اور دیگر مرکزی شہروں میں علوم دین کی تحصیل اور اس کے بعد تدریس میں مشغول رہے۔ جب آزادی کی جنگ چھڑی تو مولوی محمد اسحاق مانسہروی مرحوم کے عوامی انداز وعظ کے پہلو بہ پہلو مولوی محمد عرفان کا اردو زبان میں فصیح و بلیغ اور لچھے دار خطبہ لوگوں کو اب تک یاد ہے۔ جب تک مولوی عبدالحنان مرحوم ساکن جرید (کاغان)

زندہ تھے۔ تو ان کی تقریروں سے مولوی محمد عرفان مرحوم کے وعظ کے فراق کی آگ قدرے بجھتی تھی۔ حال ہی میں مولوی عبدالحنان صاحب خطیب مسجد بھوسہ والی منڈی راولپنڈی زندگی کے آخری ایام بسر کرنے کے بعد خدا کو پیارے ہو گئے مولوی غلام غوث صاحب جو بفہ (بکھیل) کے باشندہ ہیں۔ ان کی جگہ خطیب مقرر ہوئے۔

حضرت پیر مہر علی شاہؒ۔ گولڑہ شریف

آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد سے تھے۔ آپ کا خاندان قادری سادات صدیوں سے گولڑہ شریف میں سکونت پذیر تھا۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام پیر نذر دین شاہ ہے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد آپ سیال شریف پہنچے۔ اور شمس العارفین خواجہ شمس الدین سیالویؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سلسلہ عالیہ قادریہ سے حضرت پیر فضل الدینؒ نے آپ کو خرقہ خلافت عطا کیا بعد ازاں قیام حجاز کے دوران حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے سلسلہ صابریہ کے خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مکہ معظمہ میں قیام فرمایا اور مدینہ منورہ میں بھی رہے۔ اس طویل سفر کے بعد گولڑہ شریف واپس آئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

آپ کی طبیعت میں فقر و استغنا بدرجہ اتم موجود تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ محمدی صحیح اور اصلی معنوں میں فقیر ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے مریدوں کو مرشد کی شان میں غلو کرنے سے ہمیشہ باز رکھا۔ آپ کے کلام میں پنجابی کلام کو خاص شہرت حاصل ہے۔ انہی کا یہ شعر ہے ؎

کتھے مہر علی، کتھے تیری ثناء　　گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

آپ کے فیض اور اثر سے ضلع راولپنڈی اور ہزارہ خاص طور پر فیض یاب ہوئے۔ نواب علی عرف مولوی نواب انیسویں صدی کے آخر میں کوٹ نجیب اللہ میں سکونت پذیر تھے اور حضرت پیر مہر علی شاہ کے خاص مرید تھے۔ انہوں نے اپنے حالات زندگی پر ایک یادداشت (قلمی) چھوڑی ہے اس میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ وہ حضرت پیر صاحب کے ہاتھ پر ۱۲ ر اگست ۱۸۸۰ء میں بیعت کی۔ اور یہ سلسلہ ان کی زندگی بھر قائم رہا۔ انہوں نے حضرت پیر صاحب کے ضلع ہزارہ کے مختلف اوقات میں دوروں کا حال مفصل لکھا اور مرزا غلام احمد بانی فرقہ احمدیہ کے ساتھ مناظرہ کے لئے حضرت کا لاہور جانے کا ذکر مفصل تحریر کیا اور وہ لکھتے ہیں کہ حضرت پیر صاحب ۲۴ ر اگست ۱۹۰۰ء کو لاہور پہنچے۔ ان کے ہمراہ تین سو کے قریب علماء از اضلاع پشاور، ہزارہ، راولپنڈی، جہلم، سیالکوٹ، ملتان، ڈیرہ جات، شاہ پور، گجرات

اورگوجرانوالہ وغیرہ مقامات سے لاہور پہنچ گئے یہ بھی اس قافلہ کے ساتھ تھے لاہور پہنچنے پر محمدن ہال موچی دروازہ میں مقیم ہوئے۔ حضرت ۱۴؍ سے ۲۰؍ اگست تک لاہور رہے مگر بانیٔ فرقہ احمدیہ مناظرہ کے لئے نہ آیا۔ حضرت پیر گولڑوی کی درس و تدریس اور وعظ و ارشاد سے فرقہ احمدیہ کو بہت زک پہنچی اور لوگ اس فرقہ سے بے زار ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت پیر صاحبؒ کے علم و فضل نے اس علاقہ کو کافی فیض یاب کیا۔

آپ کی پیدائش یکم رمضان ۱۲۷۵ھ ۴؍اپریل ۱۸۵۹ء اور وفات ۲۹؍صفر ۱۳۵۶ھ ۱۱؍مئی ۱۹۳۷ء ہے۔

مولانا غلام ربانی لودھی۔ ساکن سرائے صالح

مجھے ذاتی طور پر علماء ہزارہ سے بہت کم واقفیت رہی۔ زمانہ طالب علمی اور پھر ملازمت تقریباً چالیس پچاس سال باہر گزارنے پڑے۔ دو تین کے ناموں سے اور ان کے حالات سے قدرے واقفیت تھی لہذا بہت سوچ بچار کے بعد اپنے پرانے دوست مولانا غلام ربانی لودھی سے اس بات میں امداد کے لئے درخواست کی۔ وہ اور میں مڈل سکول میں ہم سبق تھے

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بصحرا رفت ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

آپ نے کمال مہربانی سے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ بہت سے علماء کے حالات اپنی قلم سے تحریر کر کے عنایت فرمائے اور مزید رہنمائی فرما کر دیگر علماء کے حالات معلوم کرنے کی امداد کا وعدہ بھی فرمایا۔ میں ان کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے ان پاک ہستیوں، مجاہدین ملت اور علماء دین اور اولیاء اللہ کے ذکر سے میری تالیف کو فخر بخشا۔ اور میرے لئے ثواب اور نجات کا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ سنی سنائی بات خواہ کتنی ہی مضبوط اور معتبر راویوں سے ملے وہ اس بات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جسے آنکھوں کی تصدیق حاصل ہو۔ مولانا غلام ربانی لودھی کو سب سے پہلے میں نے اینگلو ورنیکلر مڈل سکول ہری پور میں دیکھا اس وقت اس سکول کے ہیڈ ماسٹر محمد رمضان مرحوم تھے جنہیں اسلامیات سے بہت شغف تھا۔ اس سکول میں پہلی مرتبہ انہوں نے ہی اسلامیات کی تعلیم رائج کی۔ یہ ۱۹۱۰ء اور اس کے بعد کا زمانہ ہے مولانا غلام ربانی لودھی اور راقم الحروف کا ساتھ اس سکول کے طالب علم ہونے کی وجہ سے ہو گیا تھا۔

---

۵ تحقیق الاعوان۔ مصنف خواص خان اعوان۔ ساکن میرٹاں۔

ہیڈ ماسٹر محمد رمضان صاحب مرحوم نے اسلامیات کو ریشنلزم (عقلیات) کی روشنی میں رائج کر رکھا تھا مولانا غلام ربانی لودھی کی عمر قریباً بارہ سال تھی۔ لیکن قرآن شریف اپنے والدین سے ناظرہ پڑھ لینے کے بعد قاضی غلام حسن مرحوم سے باترجمہ بھی پڑھ لیا تھا۔ یہ قدیم سادہ عقائد کی تعلیم تھی جس کی ٹکر ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کی معقول پسندانہ اسلامیات سے ہوئی۔ غازی محمود، دھرم پال لدھیانہ کے ایک آریہ نو مسلم تھے جن کا رسالہ "المسلم" ریشنلزم کا پرچارک تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اسلام کی عقلیاتی تعبیر میں غلو کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور ان کا شاگرد مولانا غلام ربانی لودھی کم سنی کے باوجود استاد کے فلسفیانہ و منطقی استدلال کے مقابلہ پر چٹان کی طرح مضبوط رہا۔ یہی مضبوطی ان کی عمر کے ہر نشیب و فراز میں برابر قائم رہی۔ اس اختلاف اور بحث و جدل کے باوجود استاد و شاگرد میں کبھی اَن بَن نہ ہوئی۔ شاگرد اب عمر رسیدہ ہے اپنے مرحوم استاد محمد رمضان ہیڈ ماسٹر ہری پور سکول کے بارے میں اس کی یہ رائے ہے کہ جس طرح محمد رمضان نے اللہ والوں کی بات سمجھے بغیر نہیں مانی، اسی طرح انہوں نے اپنے سکول کا معیار نہایت اونچا رکھا۔ تحصیلدار سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک کوئی افسران سے اپنی بات منوا نہیں سکتا تھا مولانا غلام ربانی لودھی کی یہ رائے ہے کہ اسلامیات کی تحصیل کے لئے تواضع خوبی ہے۔ اور مغرور و متکبر لوگوں کے ساتھ چٹان ہی بن جانا خوبی ہے۔ لین دین اور عام برتاؤ میں ہیڈ ماسٹر محمد رمضان نے اپنے محبوب ترین دوستوں کی بھی ناجائز رعایت نہ کی۔ اور فرعونوں کو تو کبھی ماسٹر محمد رمضان سے ٹکر لینے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔ محمد رمضان مرحوم کی زندگی اس بہادری کی مثال ہے جو دیانتدار ہونے اور طمع کو چھوڑنے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

مولانا غلام ربانی لودھی نے میٹرکولیشن گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد سے پاس کیا اور سنہ ۱۹۱۷ء تا سنہ ۱۹۲۲ء اسلامیہ کالج پشاور میں قیام رہا۔ فارغ اوقات میں حدیث کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ مولانا قطب شاہ عباسی کالج کے ناظم اسلامیات تھے۔ بی اے کا نصاب یہاں مکمل کرنے کے بعد مولانا غلام ربانی لودھی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اولیں برادری کا ساتھ دیا۔ آپ کے اساتذہ مولانا محمد علی جوہر بانی اور پرنسپل (شیکسپیئر)، ۲۔ خواجہ عبدالحئی (تفسیر)، ۳۔ مولانا محمد بن یوسف السورتی (حدیث و ادب عربی) ۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریت (اقتصادیات) ۵۔ ڈاکٹر محمد عالم (قانون) تھے۔ اگرچہ جامعہ ملیہ میں سائنس اور علوم جدیدہ و قدیمہ کے بہت بڑے پایہ کے اساتذہ موجود تھے اور حصول علم کے لئے بہترین مواقع تھے۔ لیکن جب سیاسی اکابر کی کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ جامعہ کے طالب علم ملک میں پھیل جائیں اور ملک کی آزادی کی دعوت دیں۔ تو مولانا محمد علیؒ ناظم جامعہ نے اس فیصلے کے حق میں تقریر فرمائی۔

مولانا غلام ربانی لودھی کو بھی اس تبلیغی وفد کا ساتھ دینا پڑا۔ حضرت سورتی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا غلام ربانی لودھی کے جامعہ سے باہر جانے کی اس بناء پر مخالفت کی کہ اس طالب علم میں عربی ادب و اسلامیات کے لئے غیر معمولی استعداد ہے لیکن فضا میں غضب کا جوش تھا۔ مولانا سورتی کی بات نہ مانی گئی۔ آپ (مولانا غلام ربانی لودھی) اور ان کے رفقاء کو ایبٹ آباد پہنچتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اور ضلع سے جبراً نکال دئے گئے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور ضلع اٹک میں مجلس خلافت کے ماتحت تحریکِ آزادی کے کام میں مشغول ہو گئے۔ لاہور اور امرتسر کے قیام کے دوران آپ نے دینی تعلیم کے حلقوں میں رابطہ قائم کیا۔ اور مفتی محمد حسن مرحوم صدر مدرسہ نعمانیہ امرتسر اور ان کے منتہی تلامذہ سے فقہ و معانی کے اسباق شروع کئے۔ اور مدرسہ تعلیم الاسلام میں مولانا محمد داؤد غزنویؒ اور مولانا نیک محمد کی شاگردی کا موقع بھی ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب مولانا غلام ربانی لودھی پر تحریکِ خلافت ضلع امرتسر کی ذمہ داری اس وجہ سے عائد ہو گئی۔ کہ مولانا مظہر علی۔ شیخ حسام الدین۔ مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل حق وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے۔ مجلس خلافت نے باتفاق جمیع ارکان یہ اعلان کیا۔ کہ ضلع امرتسر کی مجلس خلافت کے جنرل سکرٹری آپ ہوں۔ روزنامہ "وکیل" امرتسر کی سب ایڈیٹری اور مدرسہ نعمانیہ کی شاگردی کی ذاتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ضلع امرتسر ایسے اہم علاقہ کے خلافت سکرٹری کا کام سنبھال لینا اور چلاتے رہنا، غیر معمولی قوت عمل کی علامت ہے۔ ان ایام میں آپ کے خاندان نے سخت مطالبہ کیا۔ کہ آپ شادی کے لئے تیار ہو جائیں۔ مزید انتظار دشوار ہے۔ ضلع سے جلاوطنی کے احکام بدستور موجود تھے۔ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کرنل جیمز۔ اس وعدہ پر جلاوطنی کے احکام کو منسوخ کرنے کے لئے تیار تھا کہ آپ یہ کہہ دیں کہ ضلع ہزارہ میں خلافت کا کام نہیں کریں گے۔ آپ نے یہ شرط نامنظور کی۔ قاضی عزیزالرحمٰن صاحب ان ایام میں علی برادران "بی اماں" رحمۃ اللہ علیہا کے سکرٹری تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا محمد علی مرحوم کو یہ ماجرا سنایا۔ تو انہوں نے اپنے اس حریت نواز شاگرد کو یہ شفقت نامہ لکھا:۔

"عزیزی غلام ربانی سلّمہ اللہ تعالیٰ۔ گھریلو حالات سے بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں لیکن ایسے حالات میں تمہاری ثابت قدمی دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔"

امرتسر اور لاہور میں جتنا عرصہ آپ کا قیام رہا۔ انہوں نے ترجمہ و تالیف اور صحافت سے خوب دل بہلایا۔ روزنامہ "وکیل" کے بعد "زمیندار" میں خدمت کی۔ راولپنڈی میں "شہاب" اور "ترجمان سرحد" کے سب ایڈیٹر رہے۔ ابن تیمیہؒ۔ امام غزالیؒ ایسے قدیم اہل علم و قلم کے علاوہ خالدہ ادیب خانم وزیر تعلیم

ترکی و دیگر مصری اہل تصنیف کے اُردو ترجمے چھپوائے۔ لیکن ان سب سے زیادہ مجھے اپنے محترم دوست مولانا غلام ربانی کی جو بات پسند آئی وہ یہ ہے کہ اپنے ضلع سے جلاوطنی کے دنوں میں آپ ایک مرتبہ پشاور جا پہنچے۔ تین چار دن تقریریں کیں۔ آخر پولیس نے پکڑ کر ڈپٹی کمشنر کے حضور پیش کیا۔ انگریز تھا کیونکہ ان دنوں دیسی ڈپٹی کمشنر ایسے نایاب تھے، جیسے آئرلینڈ میں سانپ!

ڈپٹی کمشنر: "تم کیوں بدمعاشی کے لئے یہاں آ گیا؟"

مولانا غلام ربانی لودھی۔ "میرا خیال تھا کہ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کے سامنے کھڑا ہوں جن کی شائستگی اور گالی کا اکٹھا ہونا مشکل ہے۔ اور لفظ بدمعاش گالی ہے۔ برطانیہ کے کنگ جان سے آپ کے باپ دادا جو آزادی کا پروانہ (میگنا کارٹا) حاصل کرنے کے لئے لڑے تھے۔ کیا آپ ان کے ایسے لڑنے کو بدمعاشی کہیں گے؟"

ڈپٹی کمشنر: "ویل۔ اگر آپ تین دن کے اندر اندر پشاور سے نکلے تو آپ گرفتار کر لئے جائیں گے۔"

مولانا غلام ربانی لودھی: "بہت اچھا"

خان بہادر سعدالدین خان مرحوم (جو بعد میں صوبہ سرحد کے جوڈیشل کمشنر ہوئے) اس سوال و جواب کے واحد تماشائی تھے جو کمرے سے باہر، دروازہ کے سامنے چپڑاسی کے بکس پر بیٹھے یہ ماجرا سن رہے تھے۔

۱۹۳۰ء میں آپ نے منٹگمری جیل میں بحالت اسیری قرآن حفظ کیا۔ اور اسی اسیری کی حالت میں اپنے محترم استاذ و قائد مولانا محمد علی کی وفات کی خبر داروغہ جیل خواجہ مہتاب دین کی زبانی سنی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ نے امرتسر اور لاہور کے بعض اسلامی کالجوں میں دس بارہ سال تک اور اس سے پہلے ایک سال نصرۃ الاسلام اورینٹل کالج میں عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کی تدریس بھی کی۔ جہادِ آزادی کے میدان میں کچھ مدت بسر کرنے کے بعد طبع کا میلان قومی صحافت ہی کی طرف ہو سکتا تھا۔ لیکن جہاد تقریر کا ہو یا تحریر کا۔ کانٹوں کی وادی ہے۔ جس سے برہنہ پاؤں سے گزرنا ہوتا ہے لیکن آپ گزرتے رہے۔

تقسیم برصغیر کے بعد صحافت کی تقدیر نے پلٹا کھایا۔ تنخواہیں تگنی چوگنی ہو گئیں۔ لیکن آپ نے اس سنہری روپہلی دَور سے فائدہ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ جس طرح دوزخ کا صدر دروازہ دلفریب اور حسین ہے اسی طرح بڑی تنخواہوں کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں میں گھری ہوئی اخبار نویسی ضمیر کا جہنم اور سرطانِ روح ہے۔ ان حالات میں اہل قلم کے تین طبقے ہو گئے۔ ایک وہ جن کے عقائد تبدیل ہوئے اور صحافت حاضرہ کے لئے ان کا ضمیر سازگار رہا۔ دوسرے وہ جن کے عقائد تو تبدیل

نہ ہوئے لیکن حالات نے جو چاہا اسی رنگ کی وردی پہن لی۔ اور سیم وزر بہ دامن صحافت کے مرغزاروں میں چرنے لگے تیسرا طبقہ صحافیوں کا وہ ہے جس نے اپنے ضمیر و عقائد کا احترام کیا اور مولائے علیؓ کے اس قول کو گاتا گنگناتا ہوا گوشہ نشین ہو گیا۔

رَضِیْنَا قِسْمَۃَ الْجَبَّارِ فِیْنَا لَنَا عِلْمٌ وَ لِلْجُہَّالِ مَالٗ"

ہمارے بارے میں ہمارے زبردست رب نے جو تقسیم فرما دی۔ اس پر ہم راضی ہیں ہمارے حصہ میں علم آیا اور جاہلوں کے حصے میں مال۔

اور یہ لوگ صاحب عزیمت ہیں اور ان کے سرخیل میرے محترم دوست مولانا غلام ربانی لودھی۔ آپ گوشہ نشین، کم خوراک اور کم آمیز ہیں۔ صحت خدا کے فضل سے بہت اچھی ہے۔ بدن دبلا لیکن روحانی عزم فولادی ہے اب بھی بیس تیس میل پیدل چل لیتے ہیں۔ رفتار میں بجلی کی سرعت۔ گفتار میں اولیاء اللہ کا اثر ہے۔ سادگی و قناعت سے ابوذر غفاریؓ کے گلستان کی شان ہے ع

اے گل بتو خرسندم کہ تو بوئے کسے داری

مندرجہ ذیل علماء ہزارہ کے حالات مولانا غلام ربانی صاحب لودھی نے اپنی قلم سے تحریر کر کے دئیے جو من و عن تحریر کئے جاتے ہیں۔

مولانا غلام رسول ساکن بفہ

کتاب و سنت کی اصطلاح میں علماء اور اولیاء کے مابین کوئی فرق قائم نہیں کیا جاسکتا۔ عالم ولی اور ولی عالم ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اللہ مومنوں کا ولی یعنی دوست ہے اور بطریق عکس یہ بات ثابت ہوئی کہ ہر مومن اللہ کا دوست ہے۔ اس لئے ولی ہے اگر عام مومن ولی ہے تو عالم بطریق اعلیٰ ولی ہے کیونکہ اللہ کا خوف جو کہ مومن کی بہترین و بزرگ ترین صفت ہے قرآن کریم میں علماء کی شان میں بہ طریق خاص مذکور ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ہیں)

آسمان پر جب کبھی ابر کا ٹکڑا دکھائی دیتا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ساختہ رونے لگتے تھے۔ کسی نے پوچھا حضور آپؐ کیوں زیادہ روتے ہیں۔ فرمایا میں تم سب سے زیادہ اس لئے روتا ہوں کہ میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں۔ یعنی حالات سے زیادہ واقف ہوں۔ بہر حال مومن، عالم اور ولی کوئی باہم جدا جدا حقائق نہیں ہیں۔ لیکن تاریخ کی کتاب لکھتے ہوئے قارئین کتاب کے ذہنوں میں عوامی

اصطلاح میں ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم مولانا غلام رسول صاحب بفہ رحمۃ اللہ علیہ کو صرف علماء کے عنوان کے تحت شمار کر رہے ہیں۔ مولانا محمود حسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بفہ کے مولانا غلام رسول کی وفات پر عربی زبان میں ایک منظوم مرثیہ لکھا تھا۔ جو اتنا قیمتی ہے کہ اگر دفتروں کے دفتر کسی کی مدح میں لکھ دئے جائیں تو وہ پلڑے میں اس مرثیہ کی برابری نہیں کر سکتے۔ شیخ الہند ایک عالمی حیثیت کے ولی اور بزرگ تھے۔ ان کے دل سے صادر ہونے والے اور قلم سے لکھے جانے والے جذبات ضلع ہزارہ کے ایک شہری کے حق میں ضلع ہزارہ کی عزت افزائی کی ایک زندہ جاوید سند ہیں۔ واضح رہے کہ مولانا غلام رسول مرحوم دارالعلوم کے اساتذہ کے اسٹاف کے ممبر تھے۔ الحمد للہ کہ وہ ہزارہ جسے دنیا والے پس ماندہ علاقوں میں شمار کرتے ہیں ایک ایسا انسان استاد بنا کر بھیجتا ہے جو ساری اسلامی دنیا کا استاذ الاساتذہ ثابت ہوتا ہے اور جس کے فراق میں شیخ الہند ایسا استاذ العلماء والاولیاء تڑپتا ہوا دیکھا جاتا ہے آپ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بھی استاد ہیں۔ آپ کا مزار مبارک دیوبند میں ہے۔

مولانا محمد رسول خان

عربی زبان و ادبیات کے فاضل موضع ٹکری (زند ھیاڑ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت علاقہ زندھیاڑ میں ہوئی۔ تحریک خلافت کے زمانے میں مولوی رسول خان دیوبند پہنچے۔ اور وہاں سے فراغ حاصل کیا اور وہیں مدرس ہو گئے۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۵ء کو ان کا تقرر اورنٹیل کالج لاہور میں بحیثیت ہیڈ مولوی عربی ہوا۔ بعد میں لیکچرار بنا دیا گیا۔ بیس سال بعد ستمبر ۱۹۵۵ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ آج کل جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ التفسیر ہیں۔ آپ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ کی استدعا و خواہش پر جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لائے۔

مفتی محمد حسن صاحبؒ

لاہور کے جامعہ اشرفیہ کے بانی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایسے واعظ شعلہ بیان کے استاذ اور خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے وہ خلیفہ ہیں۔ جو ہمیشہ حضرت سید اشرف علی تھانویؒ کی آنکھوں کا

ھ تاریخ یونیورسٹی۔ اورنٹیل کالج۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

تارا ہے۔ ان کا ابتدائی گاؤں مل پور ضلع کیمبل پور ہے۔ لیکن موضع موہن اور موضع چھوہر شریف تحصیل ہری پور اور دیگر دیہات کے خانوادوں کے ساتھ ان کے نسبی تعلقات نے ان کو اُن علماء اور اولیاء کی فہرست میں بھی درج کر دیا ہے۔ جو ہزاروی کہلائے جا سکتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ لیکن حافظ قاری مولوی عبید اللہ صاحب اور مولوی عبد الرحمٰن صاحب نے ان کے سجادۂ علم و تقویٰ کو شایانِ شان طریق سے سنبھال رکھا ہے۔ اور لاہور فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ کی شاہانہ کالونی نہ صرف بدھو اور پلپور بلکہ ہری پور کے لئے بھی باعثِ فخر ہے۔

مولوی عبد الرحمٰن صاحب چھوہر شریف (ہری پور)

آپ باجی صاحب چھوہردی کے نام سے مشہور ہیں۔ قریباً پچاس سال سے وہ دارِ فانی سے منہ موڑ چکے ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء چھوہر شریف میں ہوئی۔ قادری سلسلہ کے صاحب بیعت پیر تھے۔ انہوں نے درود شریف پر ایک کتاب لکھی تھی۔ دیوبند کے ایک بہت بڑے عالم کی رائے ہے کہ درود شریف کے موضوع پر یہ کتاب گہرے علم پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت باجی صاحب مرحوم نے کبھی عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ مطابق تذکرہ "علماء و مشائخ سرحد" از سید امیر شاہ صاحب قادری پشاور۔ آپ اُمی تھے۔ صرف قرآن مجید استاد سے پڑھا تھا لیکن آپ کو علم لدنی حاصل تھا۔ اور کوئی نام کا عالم سامنے آتا تو اس کے سامنے ہمہ تن ادب و تعظیم بن جاتے تھے اس انکسار کے مقابلے میں اس انقلابی تصنیف نے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ باجی صاحب کے بیٹوں، پوتوں اور دوہتوں کی صورت و سیرت سے تشرع نمایاں ہے۔ اور خصوصاً اولاد عزیز الرحمٰن کو اپنے خلیق و حلیم باپ کا نمونہ ہونے کے علاوہ درسِ نظامی میں خوب دسترس حاصل ہے۔ باجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جاری کیا ہوا مدرسہ عربیہ رحمانیہ اب تک چل رہا ہے۔ یہ مدرسہ ۱۳۲۱ھ ۱۹۰۳ء میں ہری پور میں جاری کیا گیا۔ طلباء کے لئے کھانا باجی صاحبؒ اپنے گھر چھوہر شریف سے بھیجا کرتے تھے۔ اس مدرسہ کی ۶۱ برسی پر ۲۷ رمضان ۱۳۸۲ھ ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بمعہ وزیر تعلیم پاکستان چودھری فضل القادر (مشرقی پاکستان) شامل ہوئے اور پچاس ہزار روپیہ بطور عطیہ مرکزی گورنمنٹ کی جانب سے دار العلوم کو مرحمت فرمایا۔

اسلامیہ کالج پشاور کی تعمیر کے وقت آپ نے ۱۹۱۳ء میں اس کی مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ آپ کی وفات بہ عمر اسّی سال بروز شنبہ بعد از نماز مغرب بتاریخ یکم ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ (۱۹۲۴ء) بمقام

چھوہر شریف ہوئی۔ آپ کے والد خواجہ خضری قدس اللہ سرّہٗ کا جب انتقال ہوا آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ اسی خورد سالی سے آپ نے چلہ کشی اور عبادت شروع کر دی۔ آپ کے تین صاحبزادے تھے چمن پیر صاحب مرحوم اور حاجی محمد فضل سبحان صاحب مرحوم اور موجودہ سجادہ نشین حاجی محمد محمود الرحمٰن صاحب۔

مولوی احمد سکندر پوری — دیوبند کے ابتدائی تلامیذ سے ہیں۔ کچھ عرصہ وہاں درس بھی دیا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دیوبند کے شاگرد تھے۔

سبحان اللہ وہ بھی کیا لیل و نہار تھے جب مولوی احمد اور ان کے والد مولوی عبد اللہ سکندر پور تحصیل ہری پور کی دو مختلف مسجدوں میں علوم دین پڑھایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ باپ سبق پڑھاتے پڑھاتے رک گئے۔ طالب کو کتاب دے کر فرمایا "جاؤ احمد سے اس مشکل کا حل معلوم کرو" جب طالب علم نے واپس آ کر بیٹے کی تقریر باپ کو سنائی تو مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور زبان سے الحمد للہ الحمد للہ پکارنے لگے۔ خال خال کوئی ایسا خوش نصیب باپ ہوتا ہے جسے احمد جیسا بیٹا ملے۔ پرانے ہندوستان کی علمی مجالس میں مولوی احمد فاضل سکندر پوری کے نام سے مشہور تھے ان کو فوت ہوئے کم و بیش پچاس سال ہوئے ہیں۔ انہی ایام میں قاضی میر عالم مرحوم علوم عربیہ میں ماہر ہونے کے علاوہ حکومت برطانیہ کے معتمد اور مجسٹریٹ بھی تھے۔

سید محمود شاہؒ۔ ڈھینڈہ

میں نے ان کے حالات علماء قوم سپنی کے ضمن میں تحریر کر دیئے ہیں۔ مندرجہ ذیل حالات مولانا غلام ربانی لودھی کے تحریر کردہ ہیں۔

"ہری پور ہزارہ سے جانب مغرب دو تین میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ڈھینڈہ نام ہے جسے واعظ بے بدل محمود شاہ کی مقبولیت نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ورنہ ڈھینڈہ بھی کوئی بتائے کہ ناموں میں سے کوئی نام ہے؟ غالباً لکھو کھہا واعظین پنجاب نے ایک واعظ سے وعظ کا ڈھنگ سیکھا اور اپنی خوش آوازی سے سابق صوبہ سرحد و پنجاب میں ساری مخلوقات کو فریفتہ اور دیوانہ بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کے استاذ فن وعظ کے علاوہ خوش آوازی میں بھی اپنے شاگرد سے افضل تھے۔

سرائے صالح میں حافظ میر عبد اللہ خان اپنے وقت میں خوش الحانی اور تجوید دانی میں علاقہ میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سید محمود شاہ نے اُن سے استدعا کی کہ آپ مجھے تجوید سکھائیں، میں آپ کو وعظ سکھاتا ہوں حضرت قاری صاحب مرحوم نے جو قاری عبد اللہ مکیؒ کے مقبول ترین شاگرد تھے۔ سید محمود شاہ ڈھینڈوی

کو جواب تک صرف واعظ تھے قاری بھی بنا دیا۔ قاری میر عبداللہ خان مرحوم کے پوتے حافظ محمد اشرف اور حافظ منظور الرحمٰن درس نظامی میں مولانا خلیل الرحمٰن صدر احمد المدارس سکندر پور کے فیض یافتہ ہیں اور خوب صالح نوجوان ہیں۔ مولانا غلام ربانی لودھی نے سید محمود شاہ کے وعظ کے اثر سے متعلق جو تحریر فرمایا ہے۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ میرے بچپنے کا زمانہ تھا۔ حضرت شاہ صاحب ایک بار پنیاں تشریف لائے بعد از نماز عشاء مسجد کی چھت پر سے وعظ فرمایا۔ جو صبح صادق تک جاری رہا مسجد کے ارد گرد کی چھتیں مردوں اور عورتوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اُن کے وعظ سے سب لوگ متاثر ہوئے۔

آپ دوران وعظ میں اکثر پنجابی شعر پڑھتے تھے جو عموماً ان کے اپنے شعر ہوتے تھے۔ کسی نے ان کا ایک شعر کسی مجلس میں سنایا تھا جو حافظ نے محفوظ کر لیا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

عاماں نامعقولاں اگے، گل خاصاں دی کرنی
مٹھی کھیر پکا محمودا، کتیاں اگے دھرنی

مولوی حمید الدینؒ مانسہرہ

مولوی حمید الدین صاحب مرحوم مانسہرہ کے جید عالم تھے۔ سرکاری سکول میں عمر بھر مدرس رہے اور فارغ وقت میں درس نظامی کی بڑی کتابوں کی تدریس بھی ہمیشہ جاری رکھی۔ آپ سنجیدہ۔ خاموش اور خوددار عالم تھے۔ ذاتی وجاہت اور خودداری کے بدرجہ اتم مظہر تھے۔ عقیدۃً انگریزی حکومت کے خلاف تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں جب کہ میں سول ہسپتال مانسہرہ میں اسسٹنٹ سرجن تھا۔ آپ سے میری بہت عقیدت تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ لطف و عنایت سے پیش آتے تھے۔ ان ایام میں عالمی جنگ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کی یادگار ہر سال ۱۱ر نومبر کو منائی جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں اس یادگار کو منانے کا انتظام کیا گیا۔ خان بہادر دلاور خان (ساکن جھنڈا بوقہ) اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ انہوں نے اس موقع پر تقریر کے لئے مولوی حمید الدین صاحب کو مقرر کیا۔ ان دنوں میں اس یادگار پر انگریزوں کی تعریف کی جاتی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ جرمن ظالم تھا اور انگریز مظلوم حق پر تھے اس واسطے خدا نے ان کو فتح دے کر ان کی امداد فرمائی مجھے فکر ہوئی کہ مولوی صاحب مرحوم اس نازک مقام سے کس طرح گزریں گے۔ جہاں سے گزرنے کے لئے انگریز کی تعریف ضروری ہے۔ اور آپ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے۔

وقت آیا۔ لوگ جمع ہوئے اور میں اپنے دل میں ایک جہانِ اضطراب لئے ہوئے پریشان بیٹھا تھا۔ کہ مولانا موصوف اٹھے خدا کی حمد و ثنا کے بعد تقریر شروع کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ جب کبھی موسم حد اعتدال

سے بڑھ جاتا ہے۔ اور گرد و غبار یا گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو اس وقت ایک طوفان اُٹھتا ہے اور بارش کا سماں بندھ جاتا ہے۔ زمین کی فضا مبدّل بہ اعتدال ہو جاتی ہے۔ گرمی کم ہو جاتی ہے گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے۔ اور موسم معتدل ہو کر باعث راحت خلق خدا ہو جاتا ہے۔ عین اسی طرح سیاسی دنیا میں جب موسم حد اعتدال سے گزرنے لگا تو قانونِ فطرت حرکت میں آیا۔ مخالفین میں تصادم ہوا سیاسی موسم حد اعتدال پر آگیا۔ اور مخلوقِ خدا نے آرام کا سانس لیا۔ اور ایسا ہونا عین حکمت خداوندی تھا۔

اس سب تقریر میں جس کا میں نے اپنے ناقص الفاظ میں خاکہ پیش کیا، نہ ظالم کا نام نہ مظلوم کا۔ تقریر ایسی سحر انگیز اور دلچسپ تھی کہ لوگوں نے گہری توجہ سے سنی۔

دیگر علماء ہزارہ

موضع شاہ محمد میں مولوی سکندر علیؒ اور ان کے بھائی مولوی محمد اسمٰعیل۔ مولوی عبداللہؒ گڑھی سیریاں میں مولوی عبدالکریمؒ، موضع کیگہ میں۔ مولوی محمد حسینؒ، موضع درویش میں مولوی فیروزدینؒ اور مولوی منیفؒ عالم، ہری پور میں۔ مولوی حیاتؒ گل (آپ مجاہدین کے ہری پور میں ملجا و ماویٰ تھے بخشی پب سرائے صالح میں الٰہی بخش خان مرحوم کے قاضی مولوی عبدالغفور (باڈھی علی خیلاں) اور خطیب مولوی عبدالرحیم اور مولوی ولی احمد ساکن رجوعیہ جن کی وفات مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ ضلع ہزارہ کے ان بے شمار علماء و اولیاء کی حالات سچے موتیوں میں مسوب ہیں۔ جن کی تدریس و تبلیغ کے صدقے میں آج تک تہذیب حجازی کی خوشبو اس ضلع میں پائی جاتی ہے۔

سکھ حکمرانوں کے فارسی آموز علماء

سکھ سرائے صالح میں ایک گھرانا ایسا ہے جن کے نام سکندر پور کے رئیسوں کی طرح قاضی کے لفظ سے شروع ہوتے ہیں۔ سکندر پور میں قاضی میر عالم آنریری مجسٹریٹ ہونے کے علاوہ علوم عربیہ کی نسبت سے کام کے قاضی بھی تھے۔ اسی طرح سرائے صالح میں قاضی غلام حسن مرحوم اور قاضی عبدالقادر مرحوم کا راسخ علماء میں شمار تھا۔ قاضی غلام حسن ہرچند کہ مولانا غلام ربانی لودھی کے ترجمہ قرآن میں استاد تھے۔ لیکن ان کا مسلک غیر مقلد اہل حدیث کا تھا۔ قاضی عبدالقادر راول الذکر کے قریبی رشتہ دار تھے۔ لیکن مسلک کے لحاظ سے بریلی مکتب کے پابند تھے۔ علمی مہارت نے ان میں وہ بلا کی خود اعتمادی پیدا کر رکھی تھی۔ کہ کسی مکتب کے عالم نے ان سے مناظرہ کی ٹکر لینے کی جرأت کبھی نہیں کی۔ سرائے صالح کے اس قاضی خاندان میں فارسی زبان کو خاص دخل تھا۔ قاضی محمد حسین بے تکان فارسی میں تقریر کیا کرتے تھے۔ اور اسی قاضی خاندان کے اکابر

[illegible]

میں ایک بہت بڑے عالم تھے۔ جن کے لئے ہری پور کے قلعہ ہری سنگھ سے روزانہ ہاتھی سرائے صالح بھیجا جایا کرتا تھا جس پر سوار ہو کر وہ عالم سکھ حکمرانوں کے شاہی خاندان کو فارسی سکھانے کے لئے قلعہ ہری سنگھ جایا کرتے تھے اور تدریس سے فارغ ہو جانے پر اسی ہاتھی پر ان کو بصد اعزاز و اکرام سوار کر کے واپس سرائے صالح پہنچایا جاتا تھا۔

قاری میر عبداللہ ساکن سرائے صالح

۱۹۱۵ء میں انقلاب پسند طلباء کی ایک جماعت آزاد قبائل کے علاقہ سے ہو کر کابل پہنچ گئی تھی۔ ان کے ساتھ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم بھی تھے۔ کابل میں انہوں نے پروونشل گورنمنٹ آف انڈیا (عارضی حکومت ہندوستان) بنائی۔ پشاور میں مولانا عبدالرحیم پوپلزئی مرحوم اس حکومت موقتۂ ہند کے افسر اعلیٰ تھے۔ ان کے ماتحت سرائے صالح میں قاری میر عبداللہ مرحوم کام کرتے تھے۔ مولوی فضل ربیؒ جو کہ کپھل کے مشہور انقلاب پسند عالم تھے اکثر قاری صاحب مرحوم کے پاس آتے جاتے تھے۔ قاری میر عبداللہ کا عہدہ حکومت موقتۂ ہند مقیم کابل کی طرف سے میر آلائی تھا جس کا مرادف لفظ انگریزی زبان میں کرنل ہے۔ کابل سے جو خطوط ہندوستان کے لیڈروں پر تقسیم کرنے کے لئے آتے تھے۔ وہ میر آلائی قاری میر عبداللہ ساکن سرائے صالح کے انتظام سے نشر ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جب مولانا غلام ربانی لودھی اسلامیہ کالج پشاور سے گرمی کی تعطیلات پر سرائے صالح آئے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے کابل سے آئی ہوئی ایک چٹھی کی ساتھ قلمی نقول تیار کیں جنہیں میر آلائی قاری میر عبداللہ صاحب نے سوگڑھی ضلع اٹک کے ایک حافظ صاحب کو دے کر اندرون ہند بھجوایا۔ ایک نقل قائداعظم محمد علی جناح کو بھی بھجوائی گئی تھی۔ ایک مرتبہ میر آلائی میر عبداللہ مرحوم نے فرمایا۔ کہ حکومت موقتۂ ہند مقیم کابل کا مسلک یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت خالص اسلامی حکومت ہوگی۔ مولانا غلام ربانی لودھی نے پوچھا۔ کہ جس ملک میں دو قومیں بڑی تعداد میں موجود ہوں وہاں خالص اسلامی یا خالص برہمن حکومت کا قیام خوش فہمی ہے۔ اس پر قاری میر عبداللہ جو مولانا غلام ربانی کے استاد تھے بہت ناراض ہوئے لیکن تقریباً ایک سال کے بعد حکومت موقتۂ ہند مقیم کابل کی تازہ ڈاک آئی تو حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ حکومت تمہاری رائے کے مطابق یعنی ملی جلی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کالج کے وہ مجاہد طلباء جو ۱۹۱۵ء میں روپوش ہوئے تھے ان میں مسلم بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ اور لیڈروں میں جہاں مولانا عبید اللہ اور برکت علی بھوپالی تھے وہاں مہندر اپرتاپ بھی تھے۔ اس لئے کسی فرقہ کی حکومت کا تصور بے جوڑ تھا۔ آج جس نقشے میں پاکستان اور بھارت مرقوم میں اس کے

پس منظر میں دوسرے نقوش کے علاوہ یہ کہانی بھی موجود ہے۔ جس میں ۱۹۱۵ء کے بھاگے ہوئے مجاہد طلباء سے لے کر میر الائی میر عبداللہ مرحوم اس ڈراما کے اداکار تھے۔

وہ رسوائے زمانہ رولٹ بل جس رپورٹ پر مبنی تھا اس میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم اور ان کی سرگرمیوں کی ساری داستان مرقوم ہے اور حکومت موقتۂ ہند مقیم کابل ہی کے شاخسانوں میں ان ریشمی خطوط کا بھی ذکر ہے جس سے رولٹ رپورٹ کے صفحات کی آرائش ہوئی۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی ایجاد کردہ ہے۔ یہ پیلے رنگ کے رومال ہوتے تھے جن پر ایسی روشنائی سے خط لکھا جاتا تھا جو نظر نہیں آتی تھی اس کے لکھنے اور پڑھنے کا طریقہ موجدین کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا۔ آخری خط گوٹھ پیر جھنڈا حافظ محمد صدیقؒ سے غالباً پکڑا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس وقت حرم میں معتکف تھے۔ ان کو ۱۹۱۵ء میں شریف مکہ کے ذریعہ سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں وہ رہا ہو کر دیوبند پہنچے۔ کچھ ماہ زندہ رہے دیوبند ہی میں انتقال فرمایا ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولوی محمد عثمان صاحب (حال گورنمنٹ کنٹریکٹر ساکن ہری پور) کے بیان کے مطابق حضرت مولانا احمد علیؒ لاہور ان کو ایک شخص (انگریزی سوٹ بوٹ میں ملبوس) کے ہمراہ سرائے صالح بھیجتے رہتے تھے) ریلوے اسٹیشن پر وہ شخص اکیلا اتر کر قاری میر عبداللہ سے ملا کرتا تھا۔ اور مولوی عثمان صاحب کو سٹیشن سے ہی واپس کر دیا کرتا۔ وہ لاہور سے مجاہدین کے لئے روپیہ اور نامہ و پیام لایا کرتا تھا۔ اس طرح سے لاکھوں روپیہ یہاں پہنچا۔ جو کمال امانت اور دیانت سے آگے پہنچتا رہا۔ سرائے صالح سے قاری میر عبداللہ بمعہ ایک نوجوان پٹواری گوہر سلطان مرحوم کو ساتھ لے کر براہ سرائے نعمت خان واوگی (کھلابٹ والا راستہ مخدوش ہو چکا تھا۔) چھر قند لے جایا کرتے تھے۔ روپیہ گوہر سلطان کے پاس ہوتا تھا جس کو برقعہ اوڑھا کر قاری صاحب ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ راستہ میں استفسار پر وہ کہہ دیتے کہ یہ برقعہ پوش ان کی بیوی ہے۔ ان کے ساتھ بقول مولانا غلام ربانی صاحب لودھی، محمد اکبر خان مرحوم عرف اکبڑا ساکن شاہ محمد بھی مجاہدین کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ان کا بیٹا دلاور خان آج کل کاروبار کرتا ہے۔

مولانا قمر علی صاحبؒ

آپ موضع گھنول علاقہ کاغان کے رہنے والے تھے۔ اعوان قوم کے سردار خاندان سے تھے۔ شجرہ

نسب مولانا قمر علی بن سردار مہدی خان بن سردار شاہ ولی خان ہے۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا۔ لاولد تھے۔ گھر پر ناظرہ قرآن پڑھنے کے بعد دینی علم کی تحصیل کے شوق میں گھر سے نکلے۔ اور دیوبند پہنچے۔ وہاں تعلیم حاصل کی، آپ عربی فارسی کے فاضل تھے۔ اور انگریزی میں درک رکھتے تھے آپ نے سیاسی زندگی کا آغاز علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی معیت میں شروع کیا۔ آپ گاندھی کے عدم تشدد کے قائل نہ تھے۔ انگریزوں کو تشدد سے نکالنے والوں کے حامی تھے۔

صوبہ سرحد کی کانگریس شاخ خدائی خدمت گار (سرخ پوش) کے پرجوش ممبر تھے۔ بفہ (ضلع ہزارہ) میں سرخ پوش تحریک کے مرکز کے ستون تھے۔ بفہ کے دفتر کانگرس میں قیام فرما رہے۔ مذہبی عالم اور تحریک آزادی کے مبلغ کی حیثیت سے تقریریں کرتے تھے۔ اور انگریز کے طرفدار علماء اور پیروں کے فتاوے اور مواعظ کا توڑ کرنے میں سرگرم رہے۔ انہوں نے تحریک آزادی کو جہاد قرار دیا۔ ہزارہ کے کوہ کوہ میں پھر کر تحریک کو کامیاب طریق پر چلایا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں آپ کو گرفتار کیا گیا۔ ایبٹ آباد جیل میں رکھے گئے اور تازیانہ کی سزا بھی ان کو دی گئی آپ کے اس زمانہ کے رفیق کار میاں عبدالقیوم بفہ بھی سرکار انگریزی کے تشدد کے نشانہ بنے۔ مولانا قمر علی صاحب فصیح اللسان مقرر تھے۔ زندگی بہت سادہ تھی۔ رہائی کے بعد آپ چند میاں عبدالقیوم کے ہاں رہے۔ پھر آپ اپنے گھر گھنول تشریف لے گئے۔ وہاں اصلاح معاشرہ کا کام شروع کیا۔ اپنی کل جائداد وارثوں کے نام منتقل کر کے پھر بفہ آ گئے۔ اور سرخ پوش و کانگرس تحریک میں کام جاری رکھا۔

ایبٹ آباد جیل کی سختی نے مولانا کو انگریز کا زیادہ مخالف کر دیا۔ آپ نے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ تقاریر میں جوش زیادہ ہو گیا۔ آخری تقریر انہوں نے خاکی علاقہ پکھلی میں کی۔ انگریزی حکومت نے وارنٹ گرفتاری جاری کیا۔ لیکن مولانا قمر علی صاحب انگریزی علاقہ سے نکل کر مجاہدین چمرقند کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ اور سنہ ۱۹۳۵ء میں جب مجاہدین چمرقند و حاجی صاحب ترنگ زئی نے آزاد قبائل کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کیا تو مولانا بھی ساتھ تھے اور سخت زخمی ہو گئے۔ مجاہدین آپ کو اٹھا کر جلال آباد (افغانستان) لے گئے۔ زخم شدید تھے جانبر نہ ہو سکے۔ انجام کار اپنی آرزو کے مطابق آزاد ملک میں شہید ہو کر دفن ہوئے۔

مولانا فضلِ ربّی

قوم صواتی سے تھے آباؤ اجداد بٹہ موڑی علاقہ تندھیاڑ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد

مولوی محمود صاحب بفہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے سنہ ۱۹۱۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے سنہ ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ میں علمائے ہند مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند و مولانا عبیداللہ سندھی کے مشن کے مطابق انگریزی حکومت کے جلسے اور تقریریں کرتے رہے جب ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو آپ مجاہدین چمرقند کے پاس چلے گئے۔ اور ان کے اور آزاد قبائل کے لشکروں میں شامل ہو کر انگریزی فوجوں پر یلغار کرتے رہے۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں شاہ امان اللہ خان کی جنگ آزادی میں حملہ ٹل کے وقت نادر خان کی فوج میں شامل تھے۔ امان اللہ خان کو افغانستان کا شاہ باقاعدہ طور پر تسلیم کئے جانے پر آپ وہاں مفتی مقرر ہوئے۔ مولانا فضلِ ربی کے مجاہدین چمرقند کے ساتھ شامل ہونے پر ان کے چھوٹے بھائی فضل الٰہی اور ان کے قریبی رشتہ دار مولانا گل حسن کو گرفتار کر لیا گیا آخر الذکر تو ایک سال بعد رہا ہو گئے لیکن فضل الٰہی صاحب کو کافی مدت جیل میں گزارنی پڑی۔ پاکستان بن جانے کے بعد اگرچہ مولانا فضلِ ربی کے داخلہ سرحد پر سے پابندی ہٹا لی گئی تھی لیکن وہ واپس نہ آئے چند سال بعد کابل ہی میں رحلت فرمائی۔ ان کی اولاد شاہ امان اللہ خان کی دی ہوئی جاگیر سے مستفید ہو رہی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی فضل الٰہی صاحب زندہ ہیں (۱۹۶۷ء)۔ اور اپنے گاؤں بٹہ موڑی تندھیاڑ میں ہیں۔

مولانا غلام نبی صاحب

آپ گیدڑپور، مانسہرہ کے مشہور عالم تھے۔ اور حضرت مولانا محمود حسنؒ صاحب کے خواص میں سے تھے۔ گلاوٹی (صوبجات متحدہ ہند) میں کافی مدت مدرس رہے۔

میاں عبدالقیوم بفہ

مولانا قمر علی صاحب کے رفیق کار اور تحریک آزادی کے سرگرم کارکن میاں عبدالقیوم بفہ کے حالات بھی یہاں تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ اخوند درویزہ بابا کی اولاد سے ہیں لہٰذا تاجک ہیں آپ سنہ ۱۹۲۰ء میں بفہ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری رہے۔ آزادی کی تحریکات۔ خلافت اور کانگرس (سرخ پوش) میں آپ کے دست راست حاجی خیر اخان ساکن ملک پور ہیں۔ تحریک آزادی کے نڈر اور بے باک سپاہی ہیں اور خاقی زمان خان سکنہ بفہ بھی ان کے ساتھی تھے۔ آخر الذکر نے سنہ ۱۹۲۰ء میں بہت بڑی جائیداد چھوڑ کر ہجرت کی۔ اور ہجرت کی ناکامی کے بعد واپس آ کر مذہبی امور و اصلاحِ معاشرہ میں کام کیا۔ میاں صاحب سنہ ۱۹۳۰ء

میں بمعہ حاجی فقیرا خان اور مولانا غلام غوث سرخ پوش (کانگرس جرگہ) میں شامل ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں تینوں ایک سال بنوں جیل میں قید رہے۔ جیل سے رہائی کے بعد حکام وقت نے میاں صاحب کو مختلف مقدمات میں الجھانے کی کوشش کی جس میں وقتاً فوقتاً اُن کو قید اور جرمانہ کی سزا دی جاتی رہی۔ مسجد شہید گنج لاہور کے سلسلہ میں ایک جعلی خط کی بناء پر ان کی تلاشی لی گئی۔ لیکن حکومت اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔

۱۹۴۲ء میں کانگرس سول نافرمانی کے سلسلہ میں اپنے رفیقوں داؤ خان و عمر فاروق خان و حاجی فقیرا خان کے ساتھ تین سال تک نظر بند رہے۔ رہائی کے بعد بھی کافی مدت تک پولیس ان کی کڑی نگرانی کرتی رہی۔ اب ۱۹۶۵ء ہے اور میاں عبدالقیوم صاحب بفہ کی محفل زندہ دلی کے بدستور صدر نشین ہیں۔ ذکر و فکر نبیؐ، شوکت ملی، اہل ایمان اور خدمت خلق کے اس طرح کے فریفتہ انسانوں کی بقاء مسلمانوں کی قوت دل اور ہمت و حوصلہ کی جیت ہے۔ ملت اسلامی کے اس طرح کے انتھک مجاہد کے طول حیات سے نئے جوانوں کو عمل کی امنگ حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا الحاج محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجویؒ

آپ کی ولادت تحصیل ہری پور کے ایک قریہ گنجہ نزد کوٹ نجیب اللہ میں ہوئی آپ کے والد کا نام مولانا ظہیر الدین تھا ان کا خاندان پشت در پشت علماء کا خاندان تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ اکبر بادشاہ کے زمانہ میں بخارا سے وارد ہندوستان ہوئے۔ اور جہلم تک کے علاقہ کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ غالباً آپ کے دادا صاحب ضلع ہزارہ میں آگئے۔ اور موضع گنجہ میں سکونت اختیار کی۔ اور وہیں دینی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آپ بچپن ہی میں حصول علم کے لئے ہندوستان گئے۔ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ آپ کے ابتدائی ہم عصروں میں سے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں حضرت مولانا گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن (مجذوب) مراد آبادی اور حضرت محمد علی کانپوریؒ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے موضع گنجہ میں درس و تدریس شروع کی۔ دُور دور سے طالب علم آپ کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اہالیان ایبٹ آباد اُن کو گنجہ سے لے آئے۔ اور جامع مسجد کا امام و خطیب مقرر کر دیا۔ (غالباً انیسویں صدی کے آخر میں) آپ بلند پایہ محدث، متقی

خوددار عالم تھے۔ لوگ آپ کی بے حد عزت و احترام کرتے تھے۔ آپ نے بتاریخ یکم ربیع الاوّل ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء بمقام گنجہ طویل علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے چند ممتاز تلامذہ یہ ہیں:۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کوکوی۔ مولوی سلطان میر صاحب۔ میر ولی اللہ صاحب۔ مولوی فیروز دین ساکن کنج ایبٹ آباد۔ مولوی محمد اکرم صاحب ساکن سلہڈ۔ مولوی عصمت اللہ صاحب نواں شہر۔ مولوی بدرالدین صاحب نواں شہر۔ مولانا حمید الدین صاحب مانسہروی۔ مولوی سکندر علی صاحب۔ ملک نادر شاہ سری کوٹی۔ بابو غلام حیدر سیالکوٹی (جو بعد میں مفسر قرآن ہوئے)۔ مولوی نواب صاحب کوٹ نجیب اللہ۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب عثمانی ساکن سلہڈ

میرے محترم جناب مولانا غلام ربانی لودھی نے حسب روایت مولانا محمد عرفان صاحب عرف میاں محمد جو معتدل مسلک کے اہل حدیث ساکن سرائے صالح ہیں۔ اور عمر اسّی نوّے سال ہے۔ اور اب بھی بچوں کو قرآن اور بڑوں کو حدیث و تفسیر پڑھا رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل علماء کے حالات تحریر فرماتے ہیں۔

مولوی محمد حسین مرحوم۔ ان کو قاضی میر عالم رئیس سکندر پور (نزد ہری پور) نے موضع کاگ بہی (جو اُن کی ملکیت تھی) میں امام مسجد کے طور پر مقرر کیا۔ مولانا محمد عرفان صاحب فرماتے ہیں کہ انہوں نے بخاری شریف اُن سے پڑھی۔ مولوی محمد حسین صاحب منہال نام کسی گاؤں کے رہنے والے تھے چونکہ قاضی میر عالم صاحب خود بھی عالم اور علم دوست تھے اس لئے انہوں نے کاگ بہی میں دانستہ طور پر ان کو علم آموزی کے لئے ٹھہرایا تھا۔ مولوی محمد حسین سے بقول قاضی زاہد الحسینی صاحب پروفیسر اسلامیات گورنمنٹ کالج کیمبل پور شارح "نخبۃ الفکر" کے تھے۔ کاگ بہی سرائے صالح کے نزدیک ہے۔

سرائے صالح کی اس مسجد میں جہاں غلام خان مرحوم اور عبداللہ خان مرحوم نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک بندۂ خدا خود بخود آکر مقیم ہو گئے۔ سیجی کوٹ علاقہ گلیات کے رہنے والے تھے۔ علاقہ غیر کے مجاہدین سے راہ و رسم تھی۔ اور گلیات کے علاقے میں اس طرح کے بہت لوگ تھے جن کا مجاہدین چمرقند سے تعلق رہا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ بالاکوٹ کے شہیدوں کا ان کے ارواح و قلوب پر قبضہ ہو چکا تھا۔ اور اب بھی یہ سب لوگ اہل حدیث ہیں۔ مولوی محمد جی ہی سے مولانا محمد عرفان عرف میاں محمد صاحب نے درس حدیث پڑھا۔

میاں محمد صاحب اپنے استاد محمد جی کی زبانی فرماتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے۔ کہ ابتداً میری کند ذہنی بہت تکلیف دہ تھی۔ ایک مرتبہ میں دہلی پہنچا تو ایک آدمی نے کہا کہ اگر تم کو علم کا شوق ہے تو دہلی مجذوب

کا وطن ہے۔ اگر تمہیں کہیں کوئی مجذوب مل گیا تو انشاءاللہ کامیاب ہو جاؤ گے " فرمایا " میں نے دلی کے ایک کوچے میں ایک سیاہ رنگ کا آدمی لیٹا ہوا دیکھا جس کا چہرہ اور سر گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دبانے لگا۔ آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ڈراؤنی آواز سے کہا " کیا ہے " میں نے کہا طالب علم ہوں۔ دعا کرانے آیا ہوں۔ مجذوب نے سر نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور کہا۔ میرے نزدیک آجاؤ اور منہ کھولو۔ میں نے منہ کھولا۔ تو مجذوب نے میرے منہ میں تھوک دیا۔ اور اس کے بعد علوم مجھ پر طلوع آفتاب کی طرح کھل گئے "

یہ مولوی محمد جی صاحب کچھ عرصہ یہاں رہے پھر سرائے صالح سے گڑھی حبیب اللہ چلے گئے۔ غلام خان مرحوم اور عبداللہ خان مرحوم پر غالباً دینداری کا رنگ اس مولوی محمد جی کی وجہ سے آیا۔ جو لطیفہ غیبی کی طرح سے آئے اور غیبی حالات ہی میں سرائے صالح کو چھوڑ کر گڑھی حبیب اللہ کو مسکن بنایا۔ اور وہیں وفات پائی۔

مولوی منہاج الدین صاحبؒ

ساکن کوٹ نجیب اللہ۔ ایک بڑے عالم اور حاذق طبیب تھے علوم عربیہ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور طریقت و تصوف میں گنگوہ شریف کے مرید بھی تھے۔ کافی عرصہ ملتان میں مدرس رہے۔ اپنے زمانہ میں ممتاز مناظر دین مانے جاتے تھے۔ کئی سال دربار گولڑہ شریف میں مفتی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے خلف الرشید حکیم فریدالدین صاحب اپنے فن میں کامل تھے۔ ان کے خلف الرشید حکیم فریدالدین صاحب اپنے فن میں کامل تھے۔ ان کے استاد مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم نے اپنے آخری وقت نبض دیکھنے کے لئے حکیم فریدالدین کو طلب فرمایا۔ آپ صرف طبیب ہی نہ تھے بلکہ علوم عربیہ کی مدریس بھی حضرت پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ اسے کامل و راسخ استاد کے شاگرد رہے۔ آپ کی وفات ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ آپ ہری پور مطب کرتے تھے۔

قصبہ مانگل (یا مانگلی) اور اس کے مجاہد علماء و مشائخ

مندرجہ ذیل حالات مولوی محمد عثمان صاحب ساکن علاقہ مانگل فاضل دیوبند حال گورنمنٹ کنٹریکٹر مقیم ہری پور کے مہیا کردہ ہیں۔ جو انہوں نے کمال مہربانی سے میری درخواست پر مہیا کئے۔

وجہ تسمیہ۔ مانگل سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی ہیں پُرفضا اور خوش منظر۔

(محل وقوع کے لحاظ سے موزوں نام) اور بقول مولوی حکیم محمد عالم صاحب مانسہروی مرحوم راجہ رسالو کے اس لڑکے کے نام (منگل) پر جو رانی کوکلاں کے بطن سے تھا موسوم تھا۔ تاریخی تحقیق کے لحاظ سے راجہ رسالو کا زمانہ دوسری صدی عیسوی کا ہے۔ لہٰذا یہ شہر دوسری صدی عیسوی کا آباد کردہ ہے۔ ہیون سانگ چینی سیاح جو ساتویں صدی میں ہندوستان آیا اس نے اس مقام کو بھی دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر اس علاقہ (ہزارہ و کشمیر) کا دارالخلافہ تھا۔ تو گویا اس شہر کو آباد ہوئے سولہ سترہ سو سال ہو گئے۔ اس نے بھی اور تاریخی شہروں کی طرح زمانہ کے نشیب و فراز دیکھے۔ افغانان جدون کے دور میں آخری سنبھالا لیا۔ سکھوں کے دور میں بھی یہ آبادی اُجڑی اور انگریزوں کے زمانہ میں بے نام و نشان ہو گئی۔ یہ فصیل بند شہر تھا اور اس کے سات دروازے تھے۔ طول چھ فرلانگ عرض تین فرلانگ تھا۔ دو ہزار گھر تھے اور کل آبادی دس ہزار نفوس کی تھی۔ تین نہایت مضبوط برج تھے۔ جو خطرے کے وقت مورچہ کا کام دیتے تھے۔ اس علاقہ میں یہ واحد شہر تھا جہاں ہر فن کے لوگ آباد تھے۔ لیکن علم و معرفت حق کے متلاشیوں کے لئے اس میں خاص کشش تھی یہ شہر علمائے حق اور صوفیائے بے ریا کا گہوارہ تھا۔ اس چھوٹے سے قصبہ نے عہد اسلام میں دو تین صدیوں تک اپنی علمی تقدیس اور روحانی عظمت کی انفرادیت کو قائم رکھا۔ سلاطین وقت کی پیشانیاں اس کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوتی رہیں۔ شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کا ہفتوں تک یہاں قیام پذیر ہونا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور سلطان محمود، سلطان حسین، شاہ رخ اور بہا جیسے ذی وجاہت اور بلند اقبال ترک امراء کا مسکن بھی یہی علاقہ تھا۔ مگر ان کو بھی کورنش اور قدم بوسی کے لئے اسی " مانگل " میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

اس شہر کی پرانی چوحدی مطابق نشانات موجودہ آبادی حسب ذیل تھی۔ جنوبی دیوار موجودہ بنگلہ خان ولی محمد خان جدون۔ خان باندہ پیر خان اور سری منارہ کے گاؤں سے شروع ہو کر کنٹھ مانگل کے ساتھ ساتھ بجانب غرب پرانے قبرستان مانگل (بطرف شمال) کے محاذ سے بہت نیچے تک جاتی تھی۔ شہر کی پرانی اور مرکزی آبادی اسی نچلے حصہ میں تھی۔ اس کے مرکز میں ملک شہاب اعوان سردار وقت کی حویلی بھی تھی۔ وہاں اب بھی پرانے محلوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آبادی کنٹھ مانگل (جنوب میں) اور گندی کستی (شمال میں) کے درمیان تھی۔ اس آبادی سے ملحق اور گندی کسی اور چھوٹی کسی کے درمیان بعض امراء کے مکان تھے۔

شہر مانگل کے مشرقی حصہ۔ مابین کنٹھ مانگل، سرے پر موسیٰ زئی اور ان کے نیچے جدون آباد تھے

ان کی مجذوبانہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

اخوند صاحب کے دو بیٹے تھے۔ محمد حنیف اور محمد عبید۔ محمد حنیف اپنے باپ کے مسلک پر ثابت قدم تھے۔ ترک و تجرید اور بانکے کارندا شتن میں اپنے والد کا پورا نمونہ تھے۔ لیکن محمد عبید ایک تیز طرار اور حوصلہ مند طبیعت کے مالک نکلے۔ جہاں ایک بھائی کتابوں کی ورق گردانی اور ذکر و اشغال میں منہمک رہتا۔ وہاں دوسرا فرصت کے اوقات فن سپہ گری، گھوڑے کی سواری اور تیراکی کی مشقوں میں گزارتا۔

جب اخوند صاحب کا انتقال ہو گیا تو ان کے اقارب ان کے کنبے کو واپس لے آئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (سنہ ۱۸۲۱ء ش ب) جب ہری سنگھ کی آمد آمد ہوئی تو محمد عبید نے سکھوں سے نبرد آزمائی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ان کے بھائی محمد حنیف نے مانگل کے اطراف کا دورہ کیا اور قاضی محمود کے والد سے جہاد کا فتویٰ لے کر چاروں طرف منادی کرادی۔ قاضی صاحب ان کے ماموں تھے۔ اور ابتداءً سکھوں سے مقابلہ کے حق میں تھے۔ لیکن جب محمد عبید نے کہا۔ کہ جہاد فرض ہے اور اگر ایک متنفس بھی میرا ساتھ نہ دے گا۔ تو بھی میں اکیلے ہی یہ فرض ضرور ادا کروں گا۔ اس پر قاضی صاحب بھی تیار ہو گئے۔ اور جہاد کی عام منادی کرادی۔ (اس جنگ کا حال میں اس کتاب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں ش ب) ان کا اپنا قبیلہ کثرت تعداد کے لحاظ سے اس علاقہ کے دوسرے قبیلوں سے زیادہ تھا۔ تاہم جدون اور تنولی سے بھی کافی زیادہ آدمی جہاد پر آمادہ ہو گئے۔ جرأت شوجھ بوجھ میں محمد عبید سب پر فائق تھے۔ لہٰذا ان کی زیر ہدایت سب نے مقابلہ کرنا منظور کر لیا۔

مانگل میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جسے سری منارہ کہتے ہیں۔ اس سری منارہ کے شمال میں شہر قانو یا مانگل کا شہر آباد تھا۔ اور اب جہاں پاٹا کی کوٹھی ہے۔ یہاں سے میاں صاحب کے مزار تک کا تمام علاقہ میدان کارزار تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لڑائی اس چھوٹے سے ٹکڑے میں ہی محدود نہ رہی۔ بلکہ گھاٹی سے اتر کر نیچے کشو مانگل میں پہنچ گئی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ شہر کی جنوبی دیوار پر جدونوں کا حفاظتی دستہ متعین تھا۔ اور یہی اہم دروازہ تھا۔ مغربی اور مشرقی دیواروں پر اعوانوں کے حفاظتی دستے متعین تھے۔ سکھوں کو جب ہزیمت کا خطرہ لاحق ہوا۔ تو شہر کی مشرقی دیوار سے، جہاں کہ اٹک کے محفوظ دستے نے جدونوں کے حفاظتی دستے پر حملہ کر دیا۔ لڑائی کا میدان شہر کے مغربی حصے میں تھا۔ مسلمانوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ سکھوں کی کوئی محفوظ نفری بھی ہے۔ جنوبی حصے پر حفاظتی دستہ متعین تھا۔ اس لئے اس طرف سے

ان کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن جس بات سے وہ بے خبر تھے وہی پیش آئی۔ جدونوں کے حفاظتی دستے کی تعداد بہت کم تھی۔ وہ مقابلہ نہ کر سکے اور پسپا ہو کر مغربی میدان کارزار کی طرف ہٹنے لگے۔ جب جنگ میں معروف جدونوں کو پتہ چلا کہ ان کے آدمی مارے جا رہے ہیں تو وہ ان چند آدمیوں کو بچانے کی فکر میں پڑ گئے۔ اور ان کی طرف امداد کے لئے دوڑ پڑے۔ اس طرح سے سکھوں کی مجموعی طاقت کا مقابلہ کرنے والی فوج کی تعداد کم ہو گئی۔ اس سے ایک قسم کی افراتفری پیدا ہو گئی۔ اور اسی افراتفری میں مسلمان پیچھے ہٹنے لگے۔ حالت یہ ہو گئی کہ سامنے کی طرف سے سکھوں نے اپنا دباؤ قائم رکھا۔ اور دوسری طرف جدونوں کو اپنے حفاظتی دستہ کی مدد سے الگ گھیرے میں لیا۔ جس طرف سکھوں نے دباؤ قائم رکھا اس طرف سے مسلح افواج ہٹتے ہٹتے نالہ مانگل میں اتر گئیں چنانچہ ہولناک جنگ اسی نالہ مانگل میں ہوئی۔ جہاں اب ایک حوض بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک بزرگ نے اپنا نیزہ گاڑ کر اس پر پگڑی رکھ دی تھی۔ جب سکھوں نے دیکھا تو کہا کہ جب تک یہ مسلمان (مسلمان) زندہ ہے لڑائی ختم نہیں ہو گی۔ چشم زدن میں ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ لڑائی ختم ہو گئی۔ یہ بزرگ محمد حنیف اور محمد عبید کے نانا تھے۔ اب یہ حوض ان کے نیزے والی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ یہ حوض ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ پانی زمین سے اُبلتا ہے۔

اس لڑائی میں محمد حنیف اور محمد عبید بچ گئے تھے۔ محمد حنیف تو بعض دیگر افراد کو ساتھ لے کر شمال مشرقی پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے گڑھی حبیب اللہ کے عقب میں پہاڑی علاقہ میں روپوش ہو گئے اور محمد عبید ان سے الگ ہو کر سلطان بوئی کے پاس چلے گئے۔ اس وقت کے سلطان سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ ان کے والد کے روحانی اثر کی وجہ سے ان کی خاطر داری بھی کرتے تھے جب سکھوں کو معلوم ہوا کہ ان کا اصل دشمن ابھی زندہ پھر رہا ہے تو انہوں نے سلطان بوئی پر دباؤ ڈالا۔ کہ محمد عبید کو ان کے حوالے کر دے۔ لیکن محمد عبید اس سے پیشتر ہی وہاں سے نکل کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ گئے۔ مگر وہاں بھی زیادہ دیر خاموشی سے نہ ٹھہر سکے۔ بھائی نے بہت روکا کہ مناسب وقت کا انتظار رکھئے بغیر آزادانہ آمد و رفت مناسب نہیں۔ اور اس طرح خود کو سکھوں کے ہاتھ میں پڑنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ لیکن وہ انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ بھائی کے پاس زیادہ عرصہ تک نہ ٹھہر سکے۔ آخری بار انہیں سید احمد شہیدؒ کے مجاہدین کے ساتھ دیکھا گیا تھا اس کے بعد ان کا کوئی پتہ نہ لگا۔ وہ مجرد تھے لہٰذا ان کی اولاد نہ رہی۔

محمد حنیف ایک عرصہ روپوش رہنے کے بعد اپنے والد کے مزار کے پاس فروکش ہوئے۔ ان

کا مزار بھی اپنے والد کے پاس ہے۔ اُن کی تاریخ وفات کہیں مرقوم نہیں۔ غالباً ۱۸۹۶ء کے قریب فوت ہوئے ہوں گے۔

میاں محمدؒ حنیف کی اولاد

آپ کی ایک صاحب زادی اور چار صاحبزادے طبعی عمر کو پہنچے ان میں حافظ محمد سعداللہ سب سے بڑے تھے۔ قرآن مجید کے حافظ تھے اور امور دین میں آگاہی تام رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے ماموں کے ہاں گڑھی افغاناں (پنج کٹھہ) چلے گئے تھے۔ علوم شریعت میں اپنے ماموں کے شاگرد اور طریقت میں خواجہ شمس الدین سیالوی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور حافظ محمد سعداللہ ایک ہی دن حضرت خواجہ کی خدمت میں اکٹھے حاضر ہوئے تھے۔ ایک ہی دن ان دونوں کو خلافت ملی۔ سفر حج بھی اکٹھے ہی طے کیا اور طریقہ نقشبندیہ میں حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکیؒ سے حجاز میں اجازت بھی ایک ساتھ ہی لی۔ ان کے دوسرے بھائی میاں محمد عباس نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی تکمیل علوم دہلی میں مفتی صدرالدین سے کی۔ اپنی آخری عمر میں وطن واپس آکر موضع سمو، علاقہ پنج کٹھہ میں اپنے بھائی کی خانقاہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ آخر کار اپنے بھائی کے انتقال سے دو سال بعد ۱۹۰۲ء میں راہیِ دارالبقا ہوئے۔ ان کا عظیم کتب خانہ تھا جو اب تلف ہو چکا ہے۔

اس خاندان کے یہی دو افراد علم و فضل اور عمل میں اپنے حلقہ میں نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ ان کے بعد کوئی قابل ذکر آدمی اس خاندان میں پیدا نہ ہوا۔ جہاں تک حافظ محمد سعداللہ کا تعلق ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی میں خانقاہی تصوف سے گریزاں رہے۔ اور اپنے مسلک کو ہمیشہ شریعت حقہ کے تابع رکھا۔ اُن کے ہم نشینوں میں حضرت فاضل صاحب جن کا مزار گڑھی افغاناں میں ہے۔ حضرت میاں بلو[1] صاحب مجذوب اور دیگر بہت سے بزرگوں کے علاوہ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب سے خاص اُنس تھا۔ حافظ صاحب کے خاندان سے اب بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔ مگر نہ اس حال اور نہ اس رنگ میں۔ علماء کی وہ محفلیں نہ رہیں اور نہ صوفیاء کا تصوف۔ سکھوں نے اس خاندان کی سیادت کو ختم کیا تھا۔ اور زمانہ نے حافظ صاحبؒ کے بعد ان کی جلائی ہوئی شمع علم و عرفان بھی گل

[1] ان کا مزار بھیر گنڈ میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

کردی۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔

پیر فاضل صاحب کا پورا نام فاضل خان ہے۔ میر پور (علاقہ رش۔ ایبٹ آباد) کے افغانوں سے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں قاضی محمود صاحب کے درس میں حاضر ہوئے۔ حافظ صاحب سے ہم درس ہوئی۔ دوران تعلیم میں حضرت خواجہ سلیمانؒ تونسوی کی مجلس میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ تو مرید ہو گئے۔ ایک عرصہ کے مجاہدہ و ریاضت کے بعد خرقۂ خلافت سے بہرہ ور ہوئے۔ حافظ صاحب سے انتہائی محبت ہوئی۔ ان کا انتقال بھی حافظ صاحب کے زانو پہ ہوا۔ دونوں کے مقبرے (پنج کٹھہ میں) آمنے سامنے ہیں۔ ہزارہ کے یہ دونوں بزرگ وادیٔ پنج کٹھہ میں روحانی قربت کی غیر مرئی شمع اب تک جلائے ہوئے ہیں۔ رحمہا اللہ تعالیٰ۔

میاں کنگال صاحب

میاں کنگال صاحب محمد عبیدؒ کے والد کے دوستوں میں سے تھے میاں صاحب رحمتہ اللہ علیہ خاندان مغلیہ کے امراء گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی زندگی امیرزادوں اور شاہزادوں کی طرح عیش و طرب میں گزاری۔ حضرت مظہر جان جاناں کے کوچے میں گزر ہوا تو ان کی صحبت اختیار کرلی۔ ان کی صحبت سے جذبۂ حق غالب آیا۔ امیری چھوڑ کر مجددی طریقہ میں فقیری اختیار کرلی۔ حضرت مجددؒ الف ثانیؒ کی اولاد سے کسی کے مرید ہیں۔ گھر بار چھوڑ کر سیاحت کے لئے نکل پڑے ابتداءً بانڈہ پیر خاں[1] میں پیش امامی میں اپنے آپ کو مستور رکھا۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ پہچان لئے گئے۔ لہٰذا "گمنامی" نے "فقیری" کا صحیح رنگ اختیار کر لیا۔ وہاں سے اٹھ کر مانگل کے قصبہ کے قریب ہی تکیہ گاہ قائم کرلی۔ اور یہ رنگ صوفیائے رشد و ہدایت اور تصوف و سلوک کے دریا بہانے لگے۔ مگر یہ رنگ بھی تا دیر قائم نہ رہ سکا۔ معاً جاذبۂ الٰہی غالب آیا۔ اور میاں صاحب مغلوب ہو کر مجذوب ہو گئے۔ کہتے ہیں صرف نماز کے وقت میاں صاحب ہوش میں آجاتے اور پھر دریائے حقیقت میں غوطہ زن ہو جاتے اور دوسری نماز کے وقت کوئی ہوش نہ رہتی۔ ایک دو خادم خورد و نوش کا انتظام کرتے۔

روایت ہے کہ کسی نے میاں صاحب سے بدسلوکی کی۔ وہ شخص مانگل کے سرکردہ لوگوں میں سے تھا۔ اُسے فقراء پر قطعی اعتقاد نہ تھا۔ اسی طرح میاں صاحب کی فقیری کا بھی انکار کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے جا کر گستاخانہ الفاظ استعمال کئے۔ اور ان لوگوں کو بھی جو میاں صاحب کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ برا بھلا کہا۔ میاں صاحب نہایت ملول ہوئے۔ اگر صوفیائے باہوش

[1] بعض [illegible] علاقہ ہیں

ہوتے تو شاید پی جاتے۔ مگر میاں صاحب مجذوب تھے۔ سر اٹھایا اور معاً زبان سے نکلا: "مانگل بے نشاں خواہد شد"۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ میاں صاحب کے ایک عرصہ بعد یعنی ۲۶ سال بعد ہری سنگھ کے حملہ ۱۸۳۱ء میں ہزارہ کی یہ عروس البلاد بے نام و نشان ہو گئی۔ ہری سنگھ نلوہ آندھی بن کر مانگل پر حملہ آور ہوا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ گستاخ زبانیں کاٹ دی گئیں۔ تکبر سے اونچے ہونے والے سر قلم کر دئے گئے۔ جس قبیلے کے شخص نے یہ بدزبانی کی تھی اس کے قبیلے کے سات سو افراد سے مانگل میں ایک کنواں اٹا پڑا ہے اور وہ کنواں سری منارہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد عبیدؒ کے نانا کا سر بھی اسی کنوئیں میں مدفون ہے۔

میاں کنگال صاحب کے مقبرہ پر ان کی تاریخ وفات ان الفاظ میں تحریر ہے۔ "حضرت میاں گل محمد کنگال وفات جمعہ ۲۴ محرم الحرام ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۹ دسمبر ۱۷۹۴ء۔"

مولوی محمد عثمان صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ کہ تفسیر بغوی کے پہلے سادہ صفحہ پر لکھا ہوا یہ فقرہ میاں کنگال صاحب کے متعلق ان کی نظر سے گزرا ہے۔ "حضرت ایشاں از اکابرین دہلی بودہ جاذبہ حق دامن گیر شدہ راہِ فقرا اختیار کردہ از ہمہ بیگانہ شدہ"

ایبٹسن نے اپنی تاریخ اقوام میں لکھا ہے کہ مانگل میں میاں کنگال صاحب کے مقبرہ سے جو زیارت مشہور ہے اس میں خواجہ گل محمد المعروف بہ میاں کنگال صاحب محو خواب ہیں۔ یہ شیخ عبدالصبور قادری کشمیر المعروف بہ ٹستال صاحب جن کا زمانہ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) ہے کے مرید تھے۔

حاجی عبداللہ صاحب

اخوند صاحب کے دوسرے بھائی کا نام حاجی عبداللہ تھا۔ ایک عرصہ تک یہ لوگ افراتفری کے بعد دوبارہ یہیں آکر باندھی ڈھونڈاں میں آباد ہو گئے جو پہلے معمولی "ڈھوک" تھی۔ سقوط مانگل کے بعد آہستہ آہستہ ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی۔ اس وقت آبادی زیادہ تر انہی (اولاد باشندگانِ مانگل) کی ہے۔

قاضی محمود

آپ کا خاندان کیلنگ تحصیل ہری پور سے آکر مانگل میں آباد ہوا تھا۔ ذات کے یہ بھی اعوان تھے ان کے اجداد ہمیشہ عہدہ قضا پر فائز رہے۔ مانگل کے قیام میں اخوند صاحب کے خاندان سے

قرابت داری کا رشتہ قائم ہو گیا۔ سقوط مانگل کے بعد ان کا بچا کھچا خاندان بھی منتشر ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا علمی خاندان تھا۔ جس میں بیک وقت تین تین، چار چار علما، درس و افتاء پیدا ہوئے اس دار و گیر میں قاضی محمود کے والد گڑھی افغاناں میں آکر آباد ہو گئے۔ قاضی محمودؒ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے استاد بھی ہیں۔ اس علاقہ کے سب سے بڑے قاضی اور سرآمد روزگار شخصیت تھے۔ اُن کی اولاد میں سے بہت سے لوگ مختلف مواضعات میں ہیں۔ لیکن انہیں اپنے اسلاف سے ادنیٰ سی نسبت بھی نہیں۔ اپنی آبائی سیری کی اراضیات یا مختلف پیشوں سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اصلاً یہ پورا خاندان ہزارہ سے تعلق رکھتا ہے۔ نواں شہر اور سلہڈ میں اب بھی ان کے افراد آباد ہیں۔

محمد گُل مرحوم

حافظ محمد سعد اللہ مجرد تھے۔ ان کے بھائی محمد گل کے بیٹے کا نام احمد دین تھا۔ حافظ احمد دین نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ قرآن مجید کے حافظ تھے۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں زیارت بیت اللہ کے لئے گئے۔ مدینہ منورہ میں چندے قیام کیا۔ وہاں کے اہلِ علم سے استفادہ کیا۔ واپس آنے کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے منسلک ہو گئے۔ ریشمی خطوط کی ترسیل اور اندرونِ ملک کی مراسلت ایک عرصہ تک ان سے متعلق رہی۔ اس تحریک کا راز افشاء ہو گیا تو روپوش ہو کر قبائلی علاقہ میں چندے قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد واپس آ گئے۔ اور تمام عمر گمنامی میں بسر کر کے ۱۹۵۵ء میں رحلت فرمائی۔ مولوی محمد عثمان سے فرماتے ہیں۔ کہ ان سے گفتگو کے درمیان انہوں نے ہر میت و مایوسی کا ایک ایسا تاثر محسوس کیا جس کا سوائے ان کے اور کسی سے اظہار نہیں ہوا۔ مزید لکھتے ہیں کہ ویسے بھی یہ تمام خاندان ایک عام قسم کی مایوسی کا شکار ہے۔ مانگل کے قصے کہانیاں باندھی ڈھونڈاں میں ان کی بڑی بوڑھیاں اب تک بیان کرتی رہتی ہیں۔

بابا احمد علی صاحبؒ

باندھی ڈھونڈاں میں ایک بابا احمد علی تھے۔ میاں محمد حنیف کے خاندان سے نسبی قرابت تھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں زندہ تھے۔ مانگل کی بربادی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ جب کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ مولوی محمد عثمان صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ کہ مانگل کی اس داستان کے

خدوخال انہوں نے زیادہ تر بابا احمد علی کی زبانی نوٹ کئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ایک آدھ میل چل سکتے تھے۔ صحت کافی اچھی تھی۔ اور ہری سنگھ کی یورش کا ایک ایک نقطہ اُن کو یاد تھا۔ یہ بھی جب حج کے لئے گئے تھے تو ایک عرصہ تک حجاز ہی میں مقیم رہے ان کے خاندان کے ایک بزرگ جب ۱۹۰۷ء میں حج کے لئے گئے تو ان کو ساتھ واپس لائے۔

مولوی عبدالکریمؒ

آپ کا خاندان چوہڑ سہامؒ سے مانگل میں منتقل ہوا تھا۔ یہ قریشی النسل تھے۔ ان کے آباؤ اجداد علم و عملِ حق کا ایک نشان تھے۔ محمد حنیف کے ساتھ ان (مولوی عبدالکریم) کے دادا صاحب کی ملاقات تھی۔ یہ ملاقات رشتہ داری میں تبدیل ہوگئی۔ ہری سنگھ نلوہ کی یورش کے وقت مولوی عبدالکریم کے دادا بھی اپنے بھائیوں اور مریدوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کا ایک بھائی اس لڑائی میں شہید ہوگیا تھا۔ جس کی بہادری اور دوسری خوبیوں کے حالات مولوی عبدالکریم صاحب نے اپنی بیاض میں قلم بند کر رکھے تھے۔ ان کی شہادت پر ایک فارسی مرثیہ بھی تھا۔ اور تمام حالات جنگ مانگل بہ قید سن و سال درج کر رکھے تھے۔ مولوی محمد عثمان صاحب تحریر کرتے ہیں کہ یہ بیاض انہوں نے ۱۹۳۵ء میں بچشم خود دیکھی لیکن افسوس اس کو نقل کرنے کا موقع ان کو نہ مل سکا۔ اور یہ بیاض مولوی عبدالکریم کی وفات فروری ۱۹۶۲ء کے بعد ضائع ہوگئی اور کافی تلاش سے بھی نہ مل سکی۔

مولوی محمد عثمان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ سید احمد شہیدؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ کے مزارات بالاکوٹ کی زیارت کے لئے جا رہے تھے جب مانگل پہنچے تو فرمایا کہ یہاں سے شہداء کے خون کی بو آرہی ہے۔ اس وقت مولانا عبدالحنان مرحوم، مولوی حکیم محمد عالم مانسہروی اور مولوی محمد ابراہیم ہم راہ تھے۔ بعد میں جب مولوی محمد ابراہیم نے مولوی محمد عثمان سے یہ واقعہ بیان کیا تو مولوی محمد عثمان صاحب نے حضرت مولانا لاہوریؒ کی خدمت میں مانگل کے واقعات سنائے۔ تو وہ بہت متاثر ہوئے اور شہداء کے لئے دعا فرمائی۔ میں (ڈاکٹر شیر بہادر خان) نے حضرت مولانا لاہوریؒ کی آمد بالاکوٹ کے سلسلہ میں یہ سنا کہ جب وہ سید احمد شہیدؒ کی قبر پر کھڑے ہوئے تو کشف سے فرمایا کہ اس میں حضرت شہید نہیں ہیں کوئی اور سید احمد ہوگا۔ (تاریخی لحاظ سے یہ قبر حضرت شہید کے لئے بنائی گئی تھی۔ اور ان کی نعش ایک رات اس میں رہی لیکن دوسرے دن سکھوں نے نعش نکال کر دریا برد کردی)

پائمال شریف

سابق ضلع ہزارہ کے شمال میں دریائے سندھ کے مشرق میں سینکڑوں میل کا علاقہ جو زیادہ تر پہاڑی ہے پہلے یاغستان کہلاتا تھا اور اب جدید پاکستان کہلاتا ہے۔ اور اس کا باقاعدہ الحاق تحصیل بٹگرام کے ذریعہ ہزارہ کے ساتھ ہوگیا ہے۔ بٹگرام سے چند میل کے فاصلہ پر پائمال شریف میں باباجی صاحب کا مزار ہے اُن کی جملہ اولاد اور عزیز آج تک جہاں بھی بستے ہوں صاحب زادے کہلاتے ہیں۔ حضرت باباجی چاروں طریقوں میں کامل تھے۔ اور مجددیہ سلسلہ میں حضرت مجدد صاحب الف ثانی کے پوتے کے خلیفہ تھے۔ اس خانقاہ سے آج تک سلسلہ رشد و ہدایت جاری ہے دور دراز مقامات پر بھی آباد ہیں۔ ان میں شینئ بالا تحصیل مانسہرہ کے صاحبزادہ خاندان بھی شامل ہے حضرت علامہ فیضیؒ حضرت صاحب کوٹھہ شریف (صوابی مردان) کے خلیفۂ اعظم تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صوفی ہوگزرے ہیں۔ خوانین دوتار سے رشتہ ہونے کی وجہ سے شیر پور میں انیسویں صدی کے آخر میں وفات پائی۔ مزار لب سڑک مرجع خاص و عام ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی حضرت بلال باجی صاحب بہت بڑے مفسر تھے اور درس بیضاوی کے لئے دور دراز مقامات سے اکثر منتہی طلباء ان کی خدمت میں آتے تھے۔ حضرت علامہ فیضی صاحب کے صاحبزادے حبیب اللہ صاحبؒ گولڑہ شریف اور چوہڑ شریف کے مشائخ عظام کے ہم عصر تھے۔ اُن کا فیض آج تک جاری ہے۔ ان کے صاحبزادے الحاج مولانا محمد اسحاق صاحب ایک مشہور عالم دین اور صوفی کامل ہیں۔ ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ کاشمیر اور سوات تک پھیلا ہوا ہے صاحب دیوان ہیں۔ اس خاندان کے افراد نے دنیوی تعلیم میں بھی بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب زادہ محمد الیاس ڈبل ایم اے سابق وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد یہاں پر مقیم ہیں۔ ان کے بڑے لڑکے صاحب زادہ محمد یونس پی۔ سی۔ ایس میں سینئر افسر ہیں۔ بھتیجے صاحب زادہ محمد عارف انکم ٹیکس افسر ہیں۔ دوسرے عزیز بھی اکثر گریجویٹ اور ایم اے ہیں اور مختلف عہدوں پر ملازم ہیں۔

سلہڈ (ایبٹ آباد) کے عثمانی خاندان کے علماء

اس خاندان کی مفصل تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالسلام اور مولوی محمد محمود صاحب دو بھائی اغلباً انیسویں صدی کے آخر میں اس ملک میں آئے۔ ان کا شجرۂ نسب جو مولوی عبدالعزیز عثمانی نے جو مولوی محمد محمود صاحب کے بھتیجے تھے۔ اپنی ایک کتاب میں مندرجہ ذیل واقعہ لکھا ہے:-

ابو محمد عبدالعزیز بن عبدالسلام بن الیاس بن شاہ عبداللطیف بن شاہ مقیم الدین بن شاہ عبداللطیف بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ فتح اللہ بن شاہ حبیب اللہ بن شاہ فتح اللہ ابن شاہ مہدی علی بن شاہ یوسف بن شاہ محمد مسعود خطائی "۔ آگے لکھتے ہیں:۔ یہ سلسلۂ نسب حضرت عثمانؓ خلیفۂ ثالث تک پہنچتا ہے۔

یہ اپنے چچا مولوی محمد محمود کے شاگرد تھے جو بہت بڑے عالم عربی اور فارسی زبان کے تھے۔ اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی ایک طبع شدہ منظوم کتاب، قواعد فارسی منظوم معروف بہ نیر لامع جو مطبع نول کشور لکھنؤ میں نومبر ۱۸۹۱ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۰۹ھ چھپی۔ خاندان عثمانی ایبٹ آباد کے پاس موجود ہے یہ طبع اول کا نسخہ ہے۔ مولوی محمد محمود کے ہاتھ سے تین حسب ذیل عربی کتب خوشخط نقل شدہ خاندان میں موجود ہیں۔

۱۔ سراجی۔ در علم میراث۔ جو ماہ ذوالحجہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) مسجد شریف موضع بھیڑی نزد سرائے صالح مکمل ہوئی۔ ۲۔ تعریف الاشیاء۔ در اصطلاحات علم منطق۔ بین السطور اور حاشیہ عربی تشریح۔ بروز پنجشنبہ بوقت چاشت۔ مسجد شریف موضع بھرجان ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۰ء اتمام کو پہنچی ۳۔ رشیدیہ۔ فی علم المناظرہ۔ جو بستم ماہ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) در مسجد بھیڑی وبہوج تمام ہوئی۔

تعریف الاشیاء کے پہلے صفحہ پر مولوی محمد محمود کی ایک اپنی غزل بڑی خوشخط تحریر کی ہوئی ہے جس سے ان کی طبع موزوں اور علم کا اندازہ ہو سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الا یا من رمیت سہم فی صدری مغاجاتا ۔۔۔ سناں حشت عشقت کرد فی قلبی جراحاتا

دلم از خنجر ہجراں درونِ سینہ مجروح است ۔۔۔ خدا را اے طبیب اینک رود انددست ہیہاتا

شہیدِ تشنہ لب ہستم، بہ دشتِ کربلا اندر ۔۔۔ ولا یبقی من الوصل یزید الہجر کاساتا

بدست مالکِ ہجرم درونِ دوزخ غمہا ۔۔۔ بس اے رضوان کہ ذا القدر یکفینی مکافاتا

بچاہِ غبغبِ جاناں، چوں ہاروت و ماروتم ۔۔۔ ایا ناہید من بنما زبرج وصل راحاتا

رُخِ آں دلفریب ہر دم کشد آئینۂ دل ۔۔۔ نعم جذب الحدید آمد زمقناطیس خاصاتا

ایا پیکِ صبا بخرام، سوئے آں شہِ خوباں ۔۔۔ کہ در خاطر نے گنجد دگر درد و شکایاتا

گزر کن بعد در سلطان، بزانوئے ادب بنشین ۔۔۔ پس از عجز و نیاز از من رساں آہ و نداماتا

بہر تار و زُلفش زبندہ بندگی برساں ۔۔۔ بیار از سُنبلِ شانش بمن بوئے ملاقاتا

بہارِ گلشن و گل را بچشمِ خود تماشا کن ۔۔۔ زگُل آور سوئے بلبل نسیم خوش بشاراتا

مثال اے بلبلِ بے دل کہ غنچہ بشگفد گاہے ۔۔۔ زلعلِ جاں فزا یابی کام دل ملاقاتا

بیا تا ایں ہمہ طامات بگذاریم اے محمود
کہ صدقِ عشق تو خواہد برآورد ایں ہمہ حاجاتا

مولوی عبدالعزیز نے تعلیم اپنے اسی عالم وفاضل چچا مولوی محمد محمودؒ سے پائی اور کمال حاصل کیا۔ ان کی تصانیف وغیرہ سے ایک کتاب کا متن علامہ ابن حجر متوفی ۲۸ ذوالحجہ ۸۵۲ھ ۱۴۴۹ء کی عربی کتاب " استجلاء البصر من شرح نخبۃ الفکر " کا ہے اور حاشیہ پر اس کا اردو ترجمہ ان کا اپنا اور اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے عربی اور اردو ہر دو بہترین اور خوبصورت قلم سے اور خوشخط ہیں اور بہت دلفریب ہیں۔ اسی کتاب پر مزید حاشیہ از قلم مولوی محمد حسین بن مولوی محمد محمود العثمانی ساکن سلہڈ ہے۔

مولوی عبدالعزیز ایک جہاں گرد عالم تھے۔ وفات ۲۶-۱۹۲۷ء میں بمقام سپاٹو نزد شملہ ہوئی ان کا ایک ہی بیٹا بنام عبدالحمید تھا جس کی وفات ۳۵-۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ مولوی عبدالعزیز کے والد مولوی عبدالسلام گڑھی حبیب اللہ میں رہے۔ مولوی عبدالسلام کے بھائی مولوی محمد محمود گاندھیاں میں اقامت پذیر رہے۔ موضع چیٹی گلی نزد گاندھیاں میں ان کی اراضیات تھیں۔ جو بعد بروئے انتقال ہو کر ۲۲ فروری ۱۸۸۹ء ان کے ورثاء کی طرف منتقل ہوئیں جو اب بھی عثمانی خاندان کے قبضہ میں ہیں۔

مولوی محمد داؤد کے چار بیٹے تھے۔ محمد داؤد۔ مولوی محمد حسین (وفات جنوری ۱۹۶۳ء) مولوی عبدالرحمٰن المعروف اجی جی (وفات ۳ ستمبر ۱۹۶۹ء)۔ عبدالرؤف وفات ۹ اپریل ۱۹۴۵ء مولوی عبدالرحمٰن صاحب اولاد اب بھی موجود ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب اور عبدالرؤف دونوں بھائیوں نے ۱۹۰۳ء میں ایبٹ آباد میں ورک شاپ کھولی۔ ۱۹۰۹ء میں مٹی کے تیل کا کاروبار شروع کیا۔ ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۹ء میں ایبٹ آباد اور ہری پور میں پٹرول پمپ لگائے۔ اور دیگر صیغۂ تجارت بھی شروع کئے۔ ۱۹۶۹ء میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب عمر کی پچانوے ۹۵ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ مگر صحت اب بھی اچھی، دماغ حاضر اور چاک وچوبند ہیں۔ مگر صدارت کاروبار کی کرسی مدت سے اپنے بڑے بیٹے مولوی عبدالغفور صاحب کے حوالہ کر دی ہے۔ لیکن عقابی نظر سے کاروبار کے ہر گوشہ پر اب بھی متوجہ رہتے ہیں۔ (اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ہی آپ نے ۳ ستمبر ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کے چار بیٹے ہیں۔ مولوی عبدالغفور صاحب۔ عبدالجلیل (ہری پور کے کاروبار کے انچارج) عبدالحنان۔ عبدالحفیظ (متوفی ۵ جون ۱۹۴۳ء) اور عبدالقیوم ہیں۔ ان کی فرم، عبدالرؤف اینڈ برادرز ایبٹ آباد کی مشہور قابل اعتبار

اور معززترین فرم ہے۔

ایبٹ آباد کا ایک عالم

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب ایبٹ آباد۔ آپ اصلاً "سوکال" ریاست دربند کے رہنے والے ہیں اور کافی عرصہ سے ایبٹ آباد میں مقیم ہیں۔ آپ مولانا عبدالحکیم صاحب مشہور عالم سوکال کے فرزند ہیں۔ ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۳ء میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے اور ایک سال رام پور منہاراں میں گزارا۔ پھر واپس دیوبند ہو کر وہاں مدرس ہوئے۔ بعد میں جامع مسجد میرٹھ، کوٹ عبدالخالق ہوشیار پور و چک اوکاڑہ اور مدرسہ میاں علم الدین رئیس لائل پور اور پشاور میں رہے۔ ایبٹ آباد کے ہائی سکولوں میں چندے اسلامی مضامین کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ آپ کے پاس عربی و فارسی کی قدیم قیمتی نوادر کی لائبریری ہے۔ زندگی عالمانہ اور درویشانہ گزار رہے ہیں۔

بفہ کے اہلِ علم خاندان

۱۔ موضع بفہ (ہزارہ) میں قوم سواتی سرخیلی آباد ہے۔ نہایت ذہین قوم ہے .... زمانہ قدیم میں تحصیل علم کے سلسلے لوگ دور دراز کا سفر اختیار کیا کرتے تھے اس لحاظ سے یہاں کے علمی حلقوں میں مولانا حاجی گل حسن صاحب مرحوم کا خاندان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حضرت مولانا مرحوم سکندر پور (نزد ہری پور) غور غشتی (علاقہ چھچھ) میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیوبند تشریف لے گئے۔ اور پانچ سال وہاں رہ کر دستار فضیلت حاصل کی۔ آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب کے شاگرد تھے مدتوں اپنے علاقہ میں تعلیم مذہبی کا روشن مینار رہے۔ بے ریائی اور جراٴت ایمانی میں یکتائے زمانہ تھے آپ کا تعلق سرخیلی قوم کی شاخ نعمانی سے ہے۔

شجرہ نسب

- محمد نصیر
  - محمد سلیمان
    - حاجی محمد نعمان
    - علی اصغر
    - محمد خان
    - حاجی گل حسن صاحب
      - ماسٹر محمد اسحاق صاحب
      - حاجی محمد یونس صاحب
      - محمد ابراہیم صاحب
  - محمود خان

ماسٹر محمد اسحاق صاحب۔ آپ آج کل ایبٹ آباد گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۲ میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔ آپ مشہور ماہر تعلیم اور مشہور ناظم ہیں۔

حاجی محمد یونس صاحب۔ محکمہ صحت سرحد میں ملازم رہے ہے۔ آج کل بفہ میں پرائیویٹ پریکٹس کر رہے ہیں۔

۲۔ ماسٹر غلام یحیٰی صاحب کا خاندان۔ آپ شاخ نعمانی قوم سرخیلی سواتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ محکمہ تعلیم کے مشہور استاد ہیں اپنے وقت کے فاضل و عالم معلم رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں مڈل سکول کی ہیڈ ماسٹری سے پنشن لی۔ آپ کے اجداد بالاکوٹ میں رہائش رکھتے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار ۱۸۹۵ء میں نقل مکانی کر کے بفہ میں مقیم ہوئے۔ آپ فن تحریر و بلاغت کے استاد اور معلومات دینی کے ماہر ہیں۔ آپ کا خط بہت خوبصورت اور نستعلیق ہے۔ تحریر پُر اثر، علمی اور تاریخی معلومات سے مزین ہوتی ہے اگرچہ شاعر نہیں لیکن جب کبھی کسی موضوع پر طبع آزمائی کرتے ہیں تو عربی، فارسی، اردو، اور بعض اوقات انگریزی الفاظ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ سلک مروارید رنگا رنگ کے موتیوں سے مزین ہو جاتی ہے۔ آپ کا شجرہ نسب

شجرہ نسب

- عزیز خان
  - رسول خان
    - غلام یحیٰی خان
      - عبدالحکیم خان
      - ڈاکٹر میر رمضان خان
      - حضرت سلطان خان۔ (انجینئر ہیں)
    - موسیٰ خان (یہ بالاکوٹ میں آباد ہیں)

عبدالحکیم خان مرکزی وزارت قانون میں جائنٹ سکرٹری ہیں

ڈاکٹر میر رمضان خان سول سرجن ہیں

ماسٹر غلام یحیٰی خان صاحب مولانا حاجی گل حسن صاحب مرحوم کے داماد ہیں۔

پیرانِ رجوعیہ تحصیل ایبٹ آباد

یہ پیری کی گدی شیخ طریقت حضرت خواجہ عنایت اللہ خان صاحب قوم جدون (افغان) سے شروع ہوئی۔ آپ قوم جدون کے قبیلہ حاجی خیل سے ہیں۔ جو پار دریائے سندھ علاقہ گدون میں رہتے ہیں وہاں آپ کے جد اعلیٰ خان بابا کے نام سے مشہور تھے۔ اور پیر بابا کے خلفاء میں سے تھے۔ آپ کا مزار بنیر میں ہی ہے۔ خان بابا کے صاحبزادے حاجی بابا (جن سے حاجی خیل قبیلہ کا نام پڑا) کا روضہ گدون

علاقہ گدون میں ہے۔

جب قوم جدون بار دریائے سندھ سے ہزارہ میں وارد ہوئی تو ان کے سخی شاہ زمان ؒ حضرت شاہ عنایت کے پردادا نے حویلیاں کی پہاڑیوں میں "لڑی سیّداں" کے نام سے ایک مختصر سی بستی کی بنیاد رکھی۔ یہاں سے ان کی اولاد بھیلی اور چینبہ، نوشہرہ، حویلیاں پنج گرائیاں اور رجوعیہ میں آباد ہو گئی۔ سکھوں کے عہد میں سخی شاہ زمان کی اولاد کی سرکردگی میں قوم جدون نے سکھوں سے جنگیں کیں اور ان کو شکست پر شکست دی۔ سکھوں نے ان کے بھائیوں محمد خان بابا اور عبداللہ بابا ساکن چینبہ کو گرفتار کر لیا۔ محمد خان کو توپ سے اڑا دیا۔ اور عبداللہ خان کو قلعہ ہری پور میں قید رکھا اور بارہ سال کے بعد انگریزی دور کی آمد پر رہا ہو کر چینبہ آ گئے۔

ان بھائیوں کے گرفتار ہونے کے بعد تا عہد انگریزی خواص خان (والد پیر عنایت اللہ خان) بمعہ اپنے والد جلال خان و عمو یان سید خان وغیرہ سکھوں سے نبرد آزما رہے۔ انگریزی حکومت کے پہلے ڈپٹی کمشنر ہزارہ میجر ایبٹ نے ان بھائیوں کو بلا کر مبارک باد دی۔ حضرت پیر صاحب کے والد خواص خان اپنے چچا محبت اللہ خان کے پاس ہی رہے۔ کیونکہ ان کی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اور رجوعیہ میں ان کی بڑی جائداد تھی۔ جو سب خواص خان کو دے دی اور خیر اللہ خان رئیس چینبہ کی لڑکی سے شادی کرا دی۔ اس بی بی سے ان کے تین فرزند پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عنایت اللہ ولی۔ حضرت شاہ ارسلا خان قلندر اور حضرت شاہ فتح خان صوفی۔

حضرت خواجہ عنایت اللہ ولی نے اپنے گاؤں کے ایک بزرگ کرم دین صاحب نقشبندی سے قرآن کریم پڑھا۔ بعد میں اپنے آبائی پیر حضرت شیخ کاکا صاحبؒ کے مزار نزد نوشہرہ پر چلہ کشی کی۔ اور چار سال وہاں رہے۔ اس کے بعد ایک بشارت کی بنا پر آزاد کشمیر۔ کیاں شریف میں شیخ نظام الدین نقشبندی مجددی سے بیعت کی۔ خرقہ خلافت عطا ہوا۔ اور حکم ہوا کہ اپنے گاؤں میں مسند ارشاد بچھائیں۔ یہاں آ کر آپ نے ایک لنگر جاری کیا۔ دور دور سے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے وعظ و ارشاد سے مستفید ہونے لگے۔ اور باقاعدہ درس بھی دیا جاتا تھا۔ آپ کی شادی حضرت خواجہ شاہ محمد گل ساکن حویلیاں کی صاحبزادی (حافظہ قرآن) سے ہوئی۔ خواجہ شاہ محمد گل ایک متقی عالم فاضل تھے اور طریقہ چشتیہ میں حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے مرید تھے۔ آپ احمد میروی اور بڑے بڑے صوفیوں کے استاد تھے اور مجاہد ملت حضرت محمد اسحاق مانسہروی کے والد ماجد تھے۔ حضرت خواجہ عنایت اللہ ولی کا مزار رجوعیہ میں ہے

اور مسجد کے متصل سادہ سی چار دیواری کے اندر ہے۔ عرس پر کوئی قوالی گانے اور باجے کے ساتھ نہیں ہوتی۔ آپ کی وفات ۳ ماہ صفر بروز اتوار ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو ہوئی۔ آپ اپنی اولاد، لواحقین، خدام اور مریدان کو نماز کی پابندی پر مؤثر طریق وعظ عمل کرواتے تھے۔ آپ کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

شجرہ نسب

- سخی شاہ زمان
  - جلال خان
    - خواص خان
      - پیر عنایت اللہ — وفات ۱۹۲۷ء بعمر سو سال
        - پیر ولایت محمد خان — موجودہ سجادہ نشین
        - پیر محمد کامران
        - پیر سلطان العارفین
        - چمن پیر
      - پیر ارسلا خان — وفات ۱۹۲۶ء
      - صوفی فتح خان — وفات ۱۹۵۱ء

پیر ارسلا خان کا سلسلہ پیری مریدی زیادہ تر میدان ہری پور میں رہا۔ خاص کر پنی قوم ان کی مرید رہی۔

مولانا محمد عبدالکریم قوم اعوان ساکن رجوعیہ تحصیل ایبٹ آباد

تاریخ پیدائش ۱۸۹۶ء۔ آپ نے ابتدائی تعلیم موضع سکندر پور (تحصیل ہری پور) کے علامہ عصر مولانا احمدؒ سے اور علمائے کیمبل پور سے پائی اور پچیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر اپنے گاؤں رجوعیہ میں تدریس شروع کی۔ جو تا وفات (۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء) جاری رکھی۔ آپ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اور مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

۱۔ محمد ادریس صاحب سابق مفتی آزاد کشمیر ۲۔ صاحبزادہ محمد اسحٰق صاحب سجادہ نشین شنمنی اور ان کے بھائی۔ ۳۔ سید شاہ محمود صاحب خطیب مسجد حاجی غائب۔ کھارڈی کراچی۔ آپ کے دو فرزند ہیں۔ جو صاحب علم ہیں۔ ۱۔ مفتی عبدالواحد خطیب گوجرانوالہ ان کی وفات ہو چکی ہے۔ ۲۔ مولوی محمد نور الحق خطیب جامع مسجد رجوعیہ۔

چند تاریخی خطوط

جو تاریخ ہزارہ پر روشنی ڈالتے ہیں

چند تاریخی خطوط اور حالات کے اقتباس جو ہزارہ کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔

پنجاب ریکارڈ آفس پبلی کیشن۔ مانوگراف ۱۷

رنجیت سنگھ کے دربار کے واقعات

۱۸۱۰ء تا ۱۸۱۷ء

یہ ریکارڈ ان فارسی خطوط کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جو باجی راؤ پیشوا کا ایک اہل کار فارسی زبان میں لاہور دربار رنجیت سنگھ سے پیشوا کی اطلاع کے لئے لکھتا رہا۔ یہ خطوط ۱۸۱۶ء پر ختم ہو جاتے ہیں کیونکہ اسی سال باجی راؤ نے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور پیشوا کا عہدہ ختم کر دیا گیا تھا۔

۱۔ ۱۸۱۰ء خط ۲۰ از ڈیوڑھی سردار رنجیت سنگھ بہادر بروز ہفتہ ۲۲ دسمبر ۱۸۱۰ء مطابق ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۲۵ھ۔ یہ اطلاع دی گئی ہے کہ مرزا محمود شاہ اور سردار فتح خان وزیر ابھی تک پشاور میں ہیں یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ عطا محمد خان صوبیدار کشمیر اور محمد عظیم خان کے ساتھ دونوں طرف کے نمائندگان کی معرفت صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اور محمد عظیم خان اور عطا محمد خان مالیہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں اور اس بات پر بھی رضامند ہو گئے ہیں۔ کہ صوبیدار کشمیر کے کچھ سوار اور پیادہ سپاہی مرزا محمود شاہ کی نوکری میں حاضر رہیں گے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حاکم سندھ کے کاردار نے اپنے حاکم کی جانب سے تیس ہزار روپیہ مرزا محمود شاہ اور سردار فتح خان وزیر کو مالیہ سے ادا کر دیا ہے۔ زمان شاہ ابھی راولپنڈی میں ہے اگرچہ اس کا عملہ وغیرہ اب پنڈ دادن خان کو منتقل ہو گیا ہے۔

۱۵ مارچ ۱۸۱۲ء۔ جالندھر کے مسلمانوں پر ایک گائے کے ذبح کرنے پر تین ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۱۷ ستمبر ۱۸۱۲ء قلعہ بھنگیاں۔ امرتسر۔ منشی دیوی داس نے ایک خط لاہور میں سردار رنجیت سنگھ کی خدمت میں، از جانب بیگم حضرت شجاع الملک پیش کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ میری مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے

اخراجات کی تنگی ہو رہی ہے۔ اور آپ کو خدا نے بڑا سردار بنایا ہے۔ لہٰذا میری امداد کریں۔ اعلیٰ سرکار نے اس پر غور کرنے کے بعد حکم سنگھ تھانہ دار لاہور کو حکم دیا کہ وہ ہر ماہ چار ہزار روپیہ بیگم موصوف کو خرچ کے لئے دیا کرے۔ (اگر بیگم شجاع الملک یہ خط نہ بھیجتیں اور قلیل پر قناعت کرتیں تو بہتر تھا اب تو اپنی آبرو بھی کم ہوئی اور شجاع الملک کی عظمت رفتہ کو بھی بٹہ لگا ؎

ناکم" افزود و آبرویم کاست　　　　بے نوائی بہ از مذلت خواست)

۴۔ مورخہ ۱۱ جنوری ۱۸۱۳ء از قلعہ بھنگیاں امرتسر۔ اس خط میں اطلاع دی گئی ہے کہ سردار فتح خان وزیر کشمیر کی سرحد پر پہنچ گیا ہے اور وہاں اپنا کیمپ لگا لیا ہے۔ عطا محمد خان دو تین دفعہ سردار فتح خان وزیر کو آ کر ملا لیکن بات چیت سے معاملہ طے نہ ہو سکا۔

۵۔ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۱۳ء۔ یہ افواہ مشہور ہے کہ سردار فتح خان وزیر اور عطا محمد خان غسل کرنے کے لئے حمام میں گئے۔ جب عطا محمد خان حمام میں داخل ہوا تو سردار فتح خان وزیر نے حمام کو بہت زیادہ گرم کروا دیا۔ اور عطا محمد خان سے زیر زمین میں دفن کئے ہوئے خزانہ کا حال پوچھا۔ اس دوران میں گالی گلوچ بھی بیان کی جاتی ہے۔ اور عطا محمد خان نے چالیس لاکھ روپیہ اور کچھ جواہرات جو زمین میں دبائے گئے تھے سردار فتح خان وزیر کو دے کر رہائی حاصل کی۔

۶۔ مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۱۳ء۔ شاہی قلعہ لاہور۔ قاصدوں کی ایک اور جوڑی آئی۔ (نوٹ ڈاک رسانی کے لئے دو آدمی۔ یعنی ایک جوڑی اس زمانے میں چلا کرتے تھے) اور وہ منشی دیوی داس مفرار مت سنگھ بھرانیہ اور حکیم عزیز الدین خان کے خطوط لائے۔ ان میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ وہ اٹک کی جانب روانہ ہو گئے ہیں۔ اور وہاں پہنچنے پر انہوں نے دریا کے کنارے اور قلعہ کے نیچے اپنا کیمپ لگایا ہے۔ عبدالرحیم خان نے جو نواب عطا محمد خان کی طرف سے اس قلعہ کا قلعہ دار تھا۔ قلعہ ہمارے حوالے کر دیا ہے اور ان کی فوج کے ساتھ شامل ہو کر ان کے کیمپ میں آ گیا ہے اور اس نے اعلیٰ سرکار کے قلعدار کو قلعہ پر پوری طرح قابض کرا دیا ہے۔

۷۔ مورخہ ۱۷ جون ۱۸۱۳ء ۱۸ جمادی الثانی ۱۲۲۸ھ کل اعلیٰ سرکار تمام دن کوہ نور ہیرا جو کمال مہربانی سے حضرت شجاع الملک نے ان کو دیا۔ جوہریوں کو دکھلاتے رہے اور ان سے اس کی قیمت لگوائی وزن میں یہ تین سو رتی سے زیادہ تھا۔ قیمت کے لحاظ سے اس کو بہت ہی بے بہا قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس کی مثل کوئی ہیرا کسی کے پاس نہیں۔

نوٹ۔ مندرجہ بالا ایک قیمتی عصری شہادت کہ کوہ نور ہیرا کو شجاع الملک سے رنجیت سنگھ کے

زبردستی لینے کی ہے اس بیان کی تصدیق اس عصر کی تاریخوں سے کی جاسکتی ہے۔

جب رنجیت سنگھ کی جام عمر لبریز ہونے لگا تو اس نے ظلم و زیادتی سے جمع کی ہوئی دولت سے بیالیس لاکھ روپیہ دان کیا۔ اور یہی کوہ نور ہیرا ایک مندر کو دے دیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار)

۸۔ لاہور۔ مورخہ ۹ رجون ۱۸۱۳ء۔ کنور کھڑک سنگھ بمعہ فوج حسن ابدال سرائے میں وزیر اعظم (سردار فتح خان وزیر) کی فوجوں سے جنگ کے لئے ٹھہرا ہوا ہے۔ وزیر اعظم کے دو ہزار درّانی سواروں نے کنور کھڑک سنگھ کو اٹک کے نزدیک شکست دی۔

۹۔ لاہور ۱۵ رجون ۱۸۱۳ء۔ فوج سے ایک قاصد آیا اور بیان کیا کہ اعلیٰ سرکار کی فوجیں سرائے کالا سے روانہ ہوگئی ہیں اور حسن ابدال کے نزدیک اور سردار فتح خان کی فوجوں سے ۵ یا ۶ کوس کے فاصلہ پر کیمپ لگایا ہے۔

۱۰۔ لاہور یکم جولائی ۱۸۱۳ء۔ ایک خط جو سکھ دیال ایجنٹ رامانند ساہوکار ساکن پنڈدادن خان نے لکھا ہے۔ بیان کرتا ہے۔ اس ماہ کی گیارھویں تاریخ کو صبح سویرے دیوان محکم چند اور دوسرے فوجی افسران اکٹھے اٹک کے قلعہ میں راشن پہنچانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ دوسری طرف سے دوست محمد خان برادر سردار فتح خان وزیر بمعہ اور سرداروں کے باولی سے تقریباً ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر موجود تھے۔ آمادہ جنگ ہوئے۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ درانیوں نے اچانک حملہ کر دیا اس طرف سے توپوں اور بندوقوں کے فائر کئے گئے۔ کافی جنگ اور کشت و خون کے بعد دشمنوں نے مقابلہ کی تاب نہ لاکر راہ فرار اختیار کی۔ اور دشمن کے بہت سے آدمی دریائے اٹک میں غرق ہو گئے۔ سردار فتح خان نے جو اپنے لشکر کے عقب میں چھپا بیٹھا تھا۔ دل ہار کر کشمیر کا راستہ لیا۔ اب خدا ہی جانتا ہے کہ اس کے بعد وہ کہاں بھاگ کر جائے گا۔ دیوان محکم چند، سردار دل سنگھ بھرانیہ بمعہ دوسرے سرداروں کے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔

نوٹ۔ اس کے بعد دوسرے خط محررہ ۸ رجولائی ۱۸۱۳ء میں معمولی معمولی جھڑپوں کا ذکر ہے اور جن کے نتیجہ میں آخری جنگ حضرو کے مقام پر ۱۳ رجولائی ۱۸۱۳ء میں لڑی گئی۔ ش ب)

۱۱۔ لاہور مورخہ ۹ رجولائی ۱۸۱۳ء۔ رام سنگھ مدار المہام نے اعلیٰ سرکار سے اظہار کیا کہ حضرت شجاع الملک سے کہا جائے کہ وہ عہدنامہ میں کشمیر، ملتان اور ڈیرہ غازی خان کو شامل کریں۔ اس پر اعلیٰ سرکار نے بھائی گوربخش سنگھ کو عہدنامہ کے کاغذات دے کر بھیجا۔ کہ وہ ان علاقوں کے نام اس میں درج کرا دے۔۔۔۔۔

(یہ دلچسپ واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۳ء ہی سے رنجیت سنگھ اور شجاع الملک

کے درمیان سیاسی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس بات کا تذکرہ سکھ تاریخ کے لکھنے والوں نے نہیں کیا)

۔۔۔۔۔۔ ایک قاصد آیا اور دیوان محکم چند کا ایک خط لایا۔ جس میں تحریر تھا کہ اس نے حرامیوں کے مواضعات کو جلا دیا۔ اور جو غلہ اور سامان ان گاؤں سے حاصل ہوا وہ قلعہ میں بھیج دیا ہے۔

۱۲۔ لاہور مورخہ ۲۱ رجولائی ۱۸۱۳ء مطابق ۲۲ ررجب ۱۲۲۸ھ۔ (سردار فتح خان وزیر ہر فتح کے بعد) سردار فتح خان وزیر جہانگیرہ نوشہرہ سے پشاور کی جانب روانہ ہوا وہ کابل جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔۔۔۔۔ قاصدوں نے آکر بیان کیا کہ دیوان محکم چند نے سابقہ فوجیوں کو قلعہ سے نکال نئے افسر اور فوج قلعہ میں مقرر کی۔ اور خود وہاں سے ضلع حسن ابدال کو روانہ ہو گیا اور وہاں کیمپ لگایا۔ وہاں پر اس نے اس علاقہ کے زمینداروں کو جو باغی ہو گئے تھے سرزادینی شروع کی۔ علاقہ کے سب لوگ اطاعت کے لئے حاضر ہوئے۔

۱۳۔ لاہور مورخہ ۲۴ رجولائی ۱۸۱۳ء۔ دل سنگھ بھرانیہ اپنے ساتھیوں اور قطب الدین خان (قصوری۔ ش ب) قلعہ میں داخل ہوا۔

۱۴۔ لاہور ۴ راگست ۱۸۱۳ء۔ ایک قاصد کشمیر سے آیا اور بیان کیا کہ محمد عظیم خان وہاں ہے اور اپنی بدقسمتی پر غمگین ہے اور کشمیر کے راجاؤں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ سردار فتح خان وزیر اٹک پر پھر یقیناً حملہ کرے گا اور اس کو فتح کرے گا اس واسطے اعلیٰ سرکار کی فوج کبھی بھی کشمیر نہیں پہنچ سکتی۔ سردار فتح خان کے متعلق اطلاع آئی ہے کہ وہ پشاور میں ہے اور لوگوں سے روپیہ جمع کر رہا ہے۔

۱۵۔ لاہور مورخہ ۱۲ راگست ۱۸۱۳ء۔ سردار فتح خان وزیر نے اعلیٰ سرکار کو لکھا کہ وہ اٹک کا قلعہ چھوڑ دے اور ہمارے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے نہیں تو وہ قلعہ پر حملہ کرے گا۔ اعلیٰ سرکار خط سن کر مسکرائے اور کہا کہ وہ (رنجیت سنگھ) اس ماہ اسوج میں وہیں ملے گا۔

۱۶۔ لاہور ۱۰ رستمبر ۱۸۱۳ء۔ ۴ ررمضان ۱۲۲۸ھ۔ اعلیٰ سرکار محل کے ایک کونہ میں چلے گئے اور نہال سنگھ سے تخلیہ میں کہا۔ کہ شجاع الملک کے پاس ایک گھوڑے کی زین ہے جو جواہرات سے مرصع قیمتی ۲۸ لاکھ روپیہ کی ہے۔ اور ایک بڑا فیروزہ کا پلنگ ہے اور اس کے چاروں پایوں پر ایک ایک بڑا ہیرا لگا ہوا ہے۔ اور وہ یہ اشیا اس سے اپنے لئے مانگنی چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اعلیٰ سرکار کو کلی اختیار ہے جو مناسب سمجھے کر سکتا ہے لیکن پہلے ہی اس سے کوہ نور ہیرا چھیننے پر کافی بدنامی ہو چکی ہے اور اب یہ دونوں چیزیں بغیر مزید سختی۔ بدمزگی اور بے عزتی کے حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ فی الحال اعلیٰ سرکار کو اس پر خاص توجہ عنایت، مہربانی اور حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔ اعلیٰ سرکار نے کہا

کہ اس کی بھی یہی رائے ہے۔ اعلیٰ سرکار نے سردار کھڑک سنگھ کے مدارالمہام کو بلایا اور شجاع الملک کو اپنی طرف سے پیغام پہنچایا کہ اعلیٰ سرکار عنقریب اس کو کافی فوج کے ساتھ پشاور بھجوا دے گا۔ ایک خط حکم سنگھ تھانہ دار لاہور کو لکھا گیا کہ وہ خاص طور پر بیگمات حضرت شجاع الملک کی خاطر مدارات کرے۔

(اطلاع ملی ہے کہ محمود شاہ کابل ہی میں ہے اور ایک ماہ کے اندر اس طرف روانہ ہوگا)

۱۷۔ لاہور ۲۲ر جنوری ۱۸۱۴ء۔ سردار فتح خان نے دو ترکی نسل کے گھوڑے اور پھل بطور تحفہ بھیجا۔ اور وعدہ کیا کہ حسب معاہدہ وہ ملتان کا قلعہ خالی کر دے گا۔ سردار فتح خان کے خط پر غور کرنے کے بعد اعلیٰ سرکار نے فرمایا۔ کہ اگر سردار فتح خان اپنی فوج کے ذریعے ملتان کا قلعہ خالی کرا دے اور کشمیر کا سالانہ خراج گیارہ ہزار روپیہ ادا کرے تو وہ اٹک کا قلعہ اس کے حوالہ کر دے گا۔ اس کے بعد اعلیٰ سرکار نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ درانیوں پر اعتبار نہیں کرتا۔

۱۸۔ جمعہ ۴ر مارچ ۱۸۱۴ء، ۱۱ ربیع الاول ..... رام سنگھ کاردار کنور کھڑک سنگھ (سب سے بڑا شاہزادہ) آیا اور کہا۔ کہ وہ حضرت شاہ شجاع الملک کے پاس گیا تھا۔ اور اس کو بموجب حکم اعلیٰ سرکار پیغام پہنچا دیا تھا۔ کہ وہ خود سب جواہرات ہیرے اور زمرد وغیرہ جو اس کی بیگمات کے پاس ہیں اعلیٰ سرکار کو دے دے نہیں تو دوسرے طریقہ سے لے لئے جائیں گے۔ جس پر شاہ نے کہا کہ فی الحال اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ پہلے سے ہی انہوں نے چھین لیا ہے۔ اب اس کی زندگی ہی باقی رہ گئی ہے اگر وہ چاہتے ہیں تو اس کو لے سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ آخر کار وہ کچھ نہ کر سکا اور واپس آ گیا ہے اور اعلیٰ سرکار کو خبر دے دی ہے۔

اعلیٰ سرکار نے یہ سنا اور کچھ اس کے کان میں کہا اور اس سے کہا کہ چند خدمت گار عورتیں بعد از دوپہر اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو اندر حرم میں بھیجے اور ان سے کہے کہ جو چیز از قسم جواہرات موتی اور جو بکس وہاں ملیں ان سب کو چھین کر لے آویں رام سنگھ نے سن کر حکم کی تعمیل کا اقرار کیا ..... رام سنگھ واپس آیا۔ اور کہا کہ وہ شجاع الملک کے ڈیرے پر گیا اور جو اہرات وغیرہ مانگے پھر پانچ خدمت گار عورتوں کے محل کے اندر بیگمات کے پاس بھیجا۔ اور جو کچھ ان کو محل کے اندر از قسم جواہرات، زمرد، موتی، چھوٹے بکس، قالین وغیرہ ملے وہ ساتھ لے آئیں۔ حضرت شاہ شجاع الملک یہ دیکھ کر رو دیا اور اونچی آواز سے فریاد کی کہ وہ خدا کی مرضی کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اور جو کچھ لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔ اعلیٰ سرکار نے اس کو کہا یہ سب اشیاء دوسرے دن اس کے ملاحظہ کے لئے پیش کرے۔

۱۹۔ مورخہ ۵ر مارچ ۱۸۱۴ء (ایام ہولی) یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت شاہ شجاع الملک نے جواہرات اور سامان چھن جانے کے غم سے دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔ اعلیٰ سرکار یہ سننے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ ہولی کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔

۲۰۔ لاہور۔ ۲۹، ۳۰ر جولائی ۱۸۱۴ء۔ عام افواہ ہے کہ اعلیٰ سرکار نے کشمیر فتح کر لیا ہے اور محمد عظیم خان ناظم کشمیر بھاگ گیا ہے۔

۲۱۔ مورخہ ۱۵ر دسمبر ۱۸۱۴ء۔ موضع نادین وال واقعہ تعلقہ قلعہ اٹک او قلعہ سے بجانب شمال۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اعلیٰ سرکار کے سپاہیوں نے اس سے اجازت لے کر گندگر میں ایک قلعہ بنا لیا ہے اور اس کے ہر برج پر قلعہ اٹک کے رُخ توپیں چڑھا دی ہیں۔ ..... یہ اطلاع ملی ہے کہ محمد عظیم خان کشمیر میں لوگوں کو تنگ کر رہا ہے۔ ...ایک جوڑی (قاصد) پشاور سے آئی۔ اور بیان کیا کہ شاہ محمود پشاور ہی میں مقیم ہے اور پشاور کے حاکم نے شہر کے بنیوں سے دو لاکھ روپیہ لے کر محمود شاہ کو دیا ہے۔"

۲۲۔ لاہور ۳ر مارچ ۱۸۱۵ء۔ حکیم عزیز الدین خان نے بیان کیا کہ حسب الحکم حضرت شاہ شجاع الملک کے پاس گیا اور اس کو بہت بڑی رقم والی ہُنڈی دینے کو کہا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ ہُنڈی اس کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ وہ حرم میں بیگمات کے پاس ہے اور اگر اعلیٰ سرکار اس کی جان لینا چاہتا ہے۔ تو وہ لے سکتی ہے لیکن اسے اب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کا سب مال متاع لے لے۔ اعلیٰ سرکار نے یہ جواب سنا اور خاموش رہا۔

۲۳۔ وزیر آباد۔ ۱۹ر جون ۱۸۱۵ء۔ نوشہرہ میں افواہ گرم ہے کہ سردار فتح خان وزیر پشاور ہی میں ہے۔ اور اس نے یوسف زیوں کے پچیس ہزار آدمی جمع کئے ہیں۔ اور قلعہ اٹک کی طرف ان کو روانہ کر دیا ہے اور اپنی کچھ فوج محمد عظیم خان ناظم کشمیر کی درخواست پر براہ تبت (چترال۔ ش ب) کشمیر کی روانہ کی ہے۔

۲۴۔ مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۸۱۵ء۔ ان دنوں میں ایک عجیب بیماری قلعہ اٹک میں شروع ہے بہت سے سپاہی اور سکھ مر گئے ہیں۔ افغان فوج دریا کے پار سے قلعہ اٹک پر گولے برسا رہی ہے اور ادھر سے گولیاں چلائی گئیں ...... تین سو مزدور، ترکھان اور راج قلعہ اٹک کے سامنے دریا کے پار برج نادر شاہ (خیر آباد۔ ش ب) کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اس برج سے گولہ قلعہ اٹک پر لگ سکتا ہے شاہزادہ کامران اور عثمان پسران زمان شاہ جواہرات چھوڑ کر حاجی فیروز الدین کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ وہاں سے حج کے بہانہ پر رخصت ہو کر ملتان پہنچ گئے ہیں۔ جہاں پر مقامی خوانین نے ان کا

بہت اچھی طرح استقبال کیا وہ وہاں شاہ شجاع الملک کے پاس جانے کے خواہاں ہیں۔

۲۵۔ لاہور ۲۷ جولائی ۱۸۱۵ء۔ اطلاع ملی ہے کہ شاہ شجاع الملک فرار ہو گیا ہے۔

۲۶۔ " ۴ ستمبر ۱۸۱۵ء۔ اطلاع ملی ہے کہ شاہ شجاع الملک پہاڑوں سے ہوتا ہوا امنی ماجرا چلا گیا ہے اور وہاں سے غالباً وہ لدھیانہ آج شام یا کل صبح پہنچ جائے گا۔

۲۷۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۱۵ء۔ خبر آئی ہے کہ شاہ شجاع الملک ابھی تک کشتواڑ (کشمیر) میں اقامت گزین ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک ہزار سوار اور پیادہ ملازم ہیں۔

نوٹ۔ ۱۔ سردار فتح خاں وزیر کو محمود شاہ کے حکم پر کامران نے ہرات میں ۱۸۱۸ء میں اندھا کر دیا۔ اس پر بارک زئی برادران نے قندھار اور کشمیر میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ محمود شاہ اور کامران نے غزنی میں مقابلہ کیا۔ فتح خان کو ساتھ لائے۔ اور وہاں زندہ کی کھال کھچوا دی۔ محمود شاہ اور کامران نے ہرات میں پناہ لی۔ اور سلطنت افغانستان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس طرح سدوزئی خاندان کی بادشاہی احمد شاہ ابدالی سے ۱۷۴۷ء میں شروع ہو کر ۱۸۱۸ء میں ختم ہو گئی۔

۲۔ ۱۸۱۸ء کے حالات۔ سدوزئی بادشاہی شمال میں بلخ سے جنوب۔ سندھ اور بلوچستان تک آزاد ہو گئی۔ مشرق میں پنجاب اور کشمیر پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا۔ اور پشاور پر بھی اپنا غلبہ کر لیا۔ اور وہاں کے حاکم سلطان محمد خان بارک زئی نے خراج دینا منظور کر لیا اور آخر کار پشاور کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ۱۸۱۹ء میں کشمیر پر سکھوں نے حملے شروع کر دئے۔ اور آخر کار فتح کر لیا۔ اور اسی سال ڈیرہ غازی خان اور ۱۸۲۱ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۲۳ء میں محمد عظیم خان پشاور پر حملہ کے لئے آیا لیکن سکھوں سے شکست کھائی ۱۸۳۶ء میں بہ مقام جمرود افغان فوجوں نے زیر کمان اکبر خان پسر دوست محمد خان سکھوں کو شکست دی اور ہری سنگھ مارا گیا۔

شجاع الملک اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کا معاہدہ

صلح نامہ مابین شاہ شجاع الملک، رنجیت سنگھ اور سلطنت انگلشیہ ۲۵ جون ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ اس معاہدہ کا آرٹیکل ۲ یہ تھا:۔

شاہ شجاع الملک نے اپنی اور اپنے ورثاء کی ملکیت مندرجہ ذیل علاقوں میں سکھوں کو منتقل کر دی ہے۔ کشمیر۔ اٹک۔ چھچھ۔ ہزارہ۔ کھبل۔ امب بمعہ ملحقات۔ پشاور بمعہ علاقہ یوسف زئی۔ خٹک۔ ہشت نگر۔ مچنی۔ کوہاٹ۔ ہنگو اور پشاور کے سب ماتحت علاقے تا خیبر۔ بنوں۔ وزیرستان۔ داوڑ۔ ٹانک

گومل۔ کالاباغ۔ خوشحال گڑھ۔ اور اس کے ماتحت اضلاع۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ ڈیرہ غازی خان۔ شمالی سندھ کے تین کچھ۔ اور صوبہ ملتان۔

نوٹ۔ رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں مر گیا۔

دسمبر ۱۸۴۸ء میں دوست محمد خان نے پشاور تا دریائے سندھ فتح کر لیا۔ اور اپنے پوتے (اکبر خان کے لڑکے) کو پشاور کا گورنر بنا دیا۔ یوسف زیوں سے کچھ تعرض نہ کیا۔ اور خود چتر سنگھ (جو سکھوں سے باغی تھا) سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ اور خیر آباد پر قبضہ کر لیا۔ سکھ اٹک کے اس طرف رہے۔ دوست محمد خان چتر سنگھ سے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا عہد و پیمان کرتا رہا۔

ایک خط اُس نے ایبٹ کو جو اس وقت مشوانیوں کے پاس گندگر میں تھا، لکھا۔ کہ وہ پشاور ڈیرہ جات اور ہزارہ کو لینے کے لئے آیا ہے اور جب وہ ان پر قبضہ کر لے گا تو وہ بڑی خوشی سے انگریزوں اور سکھوں میں صلح کرانے کی بات چیت کرے گا۔

ہزارہ میں نکلسن نانی (نکل سینی) گروہ۔ جان نکلسن کو اپنا گرو سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے اور اس کی موت کے بعد اس کا ماتم کیا کرتے تھے۔

جان نکلسن نے چتر سنگھ کا مقابلہ مارگلہ میں ۱۸۴۸ء میں کیا تھا۔ اس کی یادگار میں ۱۸۶۸ء میں اس مقام پر ایک مینار بنایا گیا۔ ۱۸۴۸ء میں ایبٹ نے سری کوٹ میں پناہ لی جب چتر سنگھ نے زیریں ہزارہ اور دوست محمد خان نے پشاور پر قبضہ کر لیا تھا۔

دوسری جنگ سکھاں کے عرصہ میں سری کوٹ سے ایبٹ نے نکلسن کی امداد کی۔ مارگلہ کی طرف سے یہ کوشش کی کہ پکھلی (مانسہرہ) کی سکھ فوجیں چتر سنگھ سے نہ مل سکیں۔ لیکن دھمتوڑ کے جدونوں کی بے وفائی اور میدان سے بھاگ جانے پر ایبٹ کو پھر سری کوٹ میں پناہ لینی پڑی اور وہاں دوستوں کی امداد پر مقیم رہا۔ یہاں تک کہ گجرات کی جنگ نے انگریزوں کو فتح دلائی۔ اور سکھوں کی بقایا فوج نے ۱۴ مارچ ۱۸۴۹ء میں راولپنڈی میں ہتھیار ڈال دئے۔ اس وقت ایبٹ مشوانی سپاہیوں کے ساتھ مارگلہ کے مورچہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اسی کی وجہ سے سکھوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ایبٹ میانہ قد کا مضبوط آدمی تھا۔ ۱۸۴۹ء کے بعد وہی ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا اور چار سال کے بعد اس کو ایشا پور نزد کلکتہ میگزین اور توپ کے کارخانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔

قاسم خان (جو پنی قوم میں قاسم بابا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے خاندان کی قرابت منیر خانی پنی خاندان سے تھی) ساکن کھبل ۱۹۳۶ء میں زندہ تھا۔ جب کہ وہ سو سال کی عمر کا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ

جب ایبٹ صاحب ۱۸۴۷ء میں ہزارہ آیا تو وہ (قاسم خان) ۲۴ سال کا نوجوان تھا۔ قاسم خان کا اپنا قد ۵ فٹ کے قریب تھا اور وہ کہتا تھا کہ ایبٹ صاحب کا قد اس کے برابر ہے۔ قاسم خان ۱۹۲۹ء میں فوت ہوا۔

۱۸۴۷ء میں جارج لارنس جو پہلی سکھ وار کے بعد پشاور آیا اس نے سلطان محمد کو اچھی طرح دیکھا۔

پہلی سکھ وار (اول جنگ سکھاں) کے بعد اگرچہ سکھوں کی حکومت تھی۔ لیکن عملاً وہ انگریزوں کے ماتحت تھے اور لاہور میں مہاراجہ کے ساتھ ایک انگریز ریذیڈنٹ بھی رہتا تھا۔ کشمیر گلاب سنگھ کو دیا گیا تھا اور سرحدی اضلاع جو پہلی جنگ کا باعث تھے لاہور کے انگریز ریذیڈنٹ کے ماتحت ان اضلاع میں انگریز اسسٹنٹ مقرر کئے گئے۔ تاکہ لوگ صلح اور امن سے آرام کریں۔ یہی وقت تھا جب جارج لارنس، ایبٹ، ایڈورڈ، نکلسن، اور دیگر انگریز پٹھانوں کے علاقے میں آئے۔ جارج لارنس کے کہنے پر سلطان محمد کو راجہ نے لاہور سے پشاور آنے دیا۔ وہ پشاور میں آکر وزیر باغ میں رہائش پذیر ہوا۔ جو اس کے بڑے بھائی فتح خان وزیر نے ۱۸۱۰ء سے پہلے بنایا تھا۔

جب دوسری جنگ سکھاں ۱۸۴۸ء ملتان میں اینڈرسن اور اگنیو کے قتل سے شروع ہوئی۔ اس وقت سلطان محمد خان ریذیڈنٹ کے پاس ملاقات کے لئے گیا اور لمبی ملاقات میں ہر قسم کی امداد کا وعدہ کیا۔ لیکن جنگ کے دوران میں سلطان محمد نے ریذیڈنٹ اور اس کی بیوی کو سکھوں کے حوالہ کر دیا۔ اور اس طرح سے ذاتی فائدہ کے لئے بے ایمانی اور بد عہدی کا مرتکب ہوا۔ اس پر ایبٹ نے اپنی ڈائری ۱۸۴۹ء ۱۸۴۶ء میں لکھا کہ پٹھانوں کے نزدیک دُرانی سکھوں سے بھی زیادہ قابلِ نفرت تھے۔ دوست محمد خان اگرچہ خود بھی دوسری جنگ سکھاں میں سکھوں کا معاون تھا۔ لیکن سلطان محمد نے اس کے کرتوت پر کہا۔ "کیا تم نے نہیں سنا کہ خوگیانی پٹھانوں نے ایک سُؤر کی حمایت میں جس نے کتوں سے بھاگ کر ان کے خیموں میں پناہ لی تھی احمد شاہ کے خلاف اپنی تلواریں نکال لی تھیں"

چند سندات جو متعلق قوم ترک وارثان منشی تور کی جو بندوبست ۱۸۷۲ء ۱۸۶۰ء میں پیش ہوئے۔

۱- ۹ پھاگن ۱۸۸۳ء۔ ۱۸۲۶ء بمہر گورمکھی ہری سنگھ فصل ربیع سمت ۱۸۸۳ سے موضع تیرونڈ توپہ و پھرڑی ٹکری و پنڈ بوجہ جاگیر راجہ ہاشم خان کو عطا کیا گیا۔

۲- ۴ ہاڑ سمت ۱۸۸۴ / ۱۸۲۷ء ہری سنگھ موضع دو بندی عوض ایک ہزار روپیہ کے فصل خریف سمت ۱۸۸۴ سے راجہ ہاشم خان کو جاگیر میں دیا گیا۔ بطور استمراری کے اور ماضی ۱۵ روپیہ اضافہ سالانہ تمام داخلہ سرکار کیا کرے اور بکری شادی و کار بیگار وغیرہ معاف ہوئے۔ سوائے گھکل اور مرمت قلعہ ہری کشن گڑھ کے کہ قدیم سے اس کے ذمہ ہے۔

۳- ۹ پھاگن سمت ۱۸۸۳ / ۱۸۲۶ء فصل ربیع ۱۸۹۲ سے مواضعات پنڈ، پھرالہ، نڑ، توپہ، پھرڑی ٹکری، راجہ ہاشم خان کو جاگیر عطا ہوئے مع ہشتاد سپاہیوں (اَسی سپاہیوں) کے خدمت سرکار میں حاضر رہے جب کہ ضرورت ہو۔ اور تنخواہ ان کی اپنے پاس سے دیوے اور کار بیگار قلعہ کی بھی کیا کرے۔

۴- ۱۸ ماگھ سمت ۱۹۰۱ مطابق ۱۸۴۴ء از دیوان مولراج۔ حیات خان مانگرائے والا کو حکم ہوا ہے جو معاملہ مقرر ہوا ہے بہرصورت وصول کر کے داخل توشہ خانہ سرکار کرو۔ اور لالہ آسانند و جمعدار لیکھراج کو لکھا گیا ہے۔ وہ تمہارے غور پرداخت میں فرق نہیں کریں گے۔

۵- ۱۹ پھاگن سمت ۱۹۰۱ ۱۸۴۴ء از دیوان مولراج۔ حیات خان کو لکھا گیا کہ ہم کو آبادی رعایا سب چیز سے مقدم ہے ہر کسی کو دلاسا دے کر رکھو اور بیباقی معاملہ کی پھر کرو۔ اور بابت مقدمہ کھتریوں کے لالہ آسانند کے پاس رجوع کرو۔ کہ وہ اپنے سامنے تصفیہ کرے گا۔

۶- ۲۲ اسوج سمت ۱۹۰۵۔ ۵ اکتوبر ۱۸۴۸ء از میجر ایبٹ صاحب۔ حیات خان مانگرائے والے کو حکم ہو کہ تم مانگرائے میں پہنچ کر اور معاملہ اپنے علاقہ اپنے کا تحصیل کر کے روانہ حضور کرو۔ اور جس گاؤں میں فصل سوختہ ہو کر خراب ہو گیا ہے۔ وہاں سوم حصہ تخفیف کرو۔

۷- ۳ ماگھ سمت ۱۹۰۵ ۱۴ جنوری ۱۸۴۹ء از سردار چتر سنگھ۔ لالہ کنہیا لال کے نام لکھا گیا ہے کہ جو نصف حصہ معاملہ خریف سمت ۱۹۰۵ حیات خان مذکور کا ہے۔ وہ حیات خان سے لے لو۔ اور بعد ادا کرنے معاملہ کے حیات خان مانگرائے میں سکونت رکھے۔ اور جو سکھاں نے چیدہ گاؤں سے لیا ہے وہ مجرا دیا گیا اور جو فتح خان کا نقصان ہوا ہے وہ تم مجرا دے دو۔

۸- ۵ اپو سمت ۱۸۹۵ / ۱۸۳۸ء سردار لہنا سنگھ۔ موازی اسّی کنال زمین اور ایک چندرہ موضع مانک رائے راجہ فتح خان کو دیا گیا۔ حاصل وہاں کا معاف کیا جائے۔ اور سرکار کے حق میں دعا کرے۔

۹- ۳۰ بیساکھ سمت ۱۹۰۳۔ ۱۸۴۶ء بخشی ہری سنگھ بوال بنام راجہ جنگ بہادر و سید حسین شاہ کے لکھا گیا کہ نصف حصہ مانک رائے خاص میں فتح خان ترک کو مقدم مقرر کیا گیا۔ تم کار سرکار اس سے لیتے رہو۔ اور نصف حصہ انعام مقدم کا اس کو دے کر مقدمان سے دلاتے رہو۔

نوٹ۔ پنڈ تور کی میں عملداری بادشاہی چغتائی سے پیمائش کا پیمانہ ایک رسّی تھا جس کے طول عرض سے بارہ کنال زمین ہوتی تھی۔ آدھ رسی چھ کنال اور پاؤ کے تین کنال سمجھے جاتے تھے۔

نقل فرمان احمد شاہ بادشاہ

مدظلہ امیر خان، ساکن بھیرہ بحوالہ تحقیقات کلیات ترین — مہر احمد شاہ دُرِ دوراں

آنکہ حکام و عمال حال و استقبال الملک بعنایت موفور شاہانہ سرفراز گشتہ بدانند کہ دریں وقت شیر شاہ نام کاکڑی ساکن ہزارہ قارلق بعرض اشرف رسانیدہ کہ مناصفہ قریہ ہا بہزارہ از محمد خان و نامدار خان وغیرہ ترکان بہ مبلغ چہار ہزار و ہفتصد روپیہ بموجب قبالہ کہ در دست مقر بود خریدہ بودہ است و وارثان بایقان مذبور عارض مذکور را بزور خود مقید نمودہ و قبالہ مزبور را از و گرفتہ و قبالہ دیگر درخصوص مناصفہ قریہ مذبور بقید مبلغ سہ ہزار و ہفتصد روپیہ نوشتہ باو دادہ اند و مبلغ یک ہزار روپیہ کہ حق حسابے او مے باشد بہ خانیدہ اند۔ باید کہ بحضور اطلاع بر مضمون رقم مطاع با آنکہ درباب یک ہزار روپیہ مذبور موافق حق و حساب وجہ را گرفتہ تسلیم عارض نمایند کہ بحق خود برسد۔ ہرگاہ مدعیان ہیچ حسابے داشتہ باشند۔ باعارض در حضور اہل شرع انور رجوع نمایند و از قرار حکم شرع حق عارض عاید او سازند و رسید و رضا نامہ بگیرد۔ و بخوبی نمایند کہ بحق خود رسیدہ دوبارہ تعرض نیابد۔

۱۰ ار شہر رجب ۱۱۷۶ھ (۲۴ ر جنوری ۱۷۶۳ء)

نقل صورتِ حال مدخلہ گوجراں بہ تحقیقات کلیات قوم ترین

دشوم طمع مومی الیہ ہیچ استطاعت و توانائی در رعایا بے چارہ ..... دریدہ ..... قلبہ نان برائے قوت ورخانہ کسے میسر نمے شود۔ چوں شیودت مذکور ہمراہ کل .... غلہ در ہر فصل در عمل او پیدا شدہ، تمام و کمال بتصرف خود آوردہ بلکہ سوائے ازاں مال مولیشی رعایائے غریب فروخت کنانیدہ متصرف گشتہ آنچہ کہ (دریدہ ہے) گل محمد مذکور از دست شیودت بوقوع آمدہ بر سر ہیچ آفریدہ خدا گاہی (دریدہ ہے) از روئے تمنا و حکمنامہ کاغذ مجمل بنام گل محمد باقی بر آوردہ و در استعمال (دریدہ ہے) نیز خراب و پریشان و ویران ساختہ آں قدر تاب و توانائی بر رعایائے طرف لائے مذکور نماندہ کہ از عہدہ ادائے مبلغ ماثور حسب سرکار تو انند بر آمد۔ و جمع موضع جدون کہ ہفتم حصہ از حصہ ترک دلاناک واقعہ است مبلغ دو ہزار و پانصد روپیہ ...... زیادہ بابت بالواجب موضع مذکور در ہر فصل سرکار عاید مشید۔ آں را تاخت نمودہ ویران ساختہ مال و متاع ..... از نقد چیز از قسم پشمینہ و زری و آلات مسینہ و براق و سلاح وغیرہ چیزہائے انواع اقسام و مواشے بسیار کہ در خانہ جدون موجود بود تمامی را تاخت کنانیدہ

در تحت تصرف خود در آوردہ و جزوی را از جملہ تاخت مولیشی۔ در حضور ارسال داشتہ و اکثرے را فروخت کنانیدہ چوں متصرف شدہ و آنچہ کہ جمع بر موضع جدون از قدیم مقرر بود بعد ویران شدن موضع مسطور بر تمام پرگنہ انداخت کردہ تحصیل نمودہ داخل سرکار گردہ موضع جدون ویران و خرابہ افتادہ ماندہ و آبادانی آنجا مطلق روا نداشتہ و نقصان جمع جدونان و سرکار آمدہ و اگر نقصان آنجا .... انداخت مے شود باعث ویرانی رعایائے غریب است و طرف گوجراں کہ چہارم حصہ از پرگنہ ہزارہ قارلق مقرر است و از سابق مرمت طلب بود شیودت مذکور و اعمال خود از راہ شوم طمعی اولاً تباہی را قرار دادہ بعد ازاں لنگوت بہر دستم کنانیدہ آنچہ کہ غلہ در ہر دو سہ پیدا شدہ تمام و کمال را خود متصرف گشتہ سوائے از زراعت ہر چہ کہ مال مواشی در خانہ رعایا غریب نے یافت ہمگی را در تحت و تصرف خود مے آورد۔ چنانچہ کہ تمام طرف گوجراں را تسلط و تعدی مومی الیہ از اوطان مالوفہ ویران شدہ بجائے و مکان دیگر رفتہ سکونت گرفتہ در رقبہ مواضعات طرف مذکور افتادہ ماند۔ چوں ہر چہار طرف پرگنہ مسطور خراب و سقیم احوال افتادہ اند و ہیچ طاقت در رعایائے ستم زدہ نماندہ از آنجا کہ صورت آبادانی پرگنہ و پرداخت رعایائے شکستہ احوال بتوجہات عنایات دکلائے حضور تعلق دارد امیدوار اند کہ غور و خصمانہ ستم رسیدہ ہائے از قرار واقعہ بر گردد۔ از آمدن سیادت و امانت پناہ حاجی محمد سلیم تمام رعایائے خوشوقت شدہ و رضامند بودہ امیدوار آبادانی در اوطان مالوفہ خود ہا شدند و بجہت آبادانی رعایائے ہر چہار طرف کہ فرار شدہ رفتہ بودند رجوع گرفتہ اند و شیودت مذکور اکثر کاغذہائے از قسم طومار و تذکرہ و صورتِ حال کہ زمطالب خود او را مطلوب بودند در ہر فصل پانزدہ پانزدہ و شانزدہ شانزدہ بلکہ زیادہ بر کاغذہائے سفید مہر ارباب شرع و تمامی اہالی موالی پرگنہ کنانیدہ مے گرفت و نزد خود نگاہ مے داشت۔ ہیچ کس را از مضمون کاغذ ہائے مطلوبہ مومی الیہ اطلاع و آگاہ نیست۔ از ملاحظہ و خوف مشار الیہ ہیچ کس را آں قدر قوت و قدرت نبود کہ دم تو انداز زد و اکثر اوقات مہر ہائے از دست گرفتہ مہر [illegible] کردہ کاغذ مطلوبہ را نزد خود نگاہ میداشت۔ صورتِ حال بریں منوال است۔

گواہ شد — دریدہ
گواہ شد — دریدہ
گواہ شد — مہر ملاں سید غفور
گواہ شد — مہر دلاور خان منصبدار
گواہ شد — مہر محمد شیر خان گکھڑ ۱۳۱ھ ۱۹۲۳ء

گواہ شد — شجاعت خان گکھڑ
گواہ شد — خوشحال بیگ گکھڑ
گواہ شد — مہر اصالت خان گکھڑ
فقیر محمد عارف

الله
الملک
ھو
الہی
علم شد از عنایات
شاہ تیمور شاہ

آنکہ عالیقدران کرم خان دلہ زاک و زمان خان ترک بالطاف روز افزوں شاہانہ سرافراز گشتہ بدانند عریضہ کہ دریں وقت درخصوص احوال خود و چند قریہ کہ بعالیجاہ فتح شیر خان دادہ شدہ در نزد او رجوع مے باشد و سوائے قریہ کہ بعالیجاہ فتح شیر خان دادہ شد..... از املاک و قراء رعایائے آں محال را نجیب اللہ و برادران او بزور متصرف شدہ اند و بسیار از املاک و قراء آنہا را ہم طائفہ ترین در ابتداء دولت خداداد بہ گروی از مردمال محدود ایں عرض مدت حاصل آں املاک کہ مساوی یک لک روپیہ میشود متصرف شدہ اند و بر...... چیزے ندادہ اند و رقم مالکا حاصل کردہ بودہ اند و استدعا نمودہ اند کہ رقم مالکا بعالیجاہان نیکو خان سردار و فیض طلب خان محمود زائی صادر شود کہ املاک ایشاں را گرفتہ بدہند. و حساب چندیں سالہ املاک گروی و حاصل آں را بکنند از جملہ حاصلات نسورہ گروی مساوی وجہ گروی باما بدہند و مابقی اگرچہ باشد نصف را برعایائے صاحب زمین بدہند و ما نصف را جہت سرکار ضبط نمایند و سواد دیگر التماس و حضور ساطع النور نمودہ بودند. رسید مضامین مندرجہ حال رای جہاں آرا شد. عالیجاہ فتح شیر خان ہم چگونگی مقدمہ مزبورہ را بالعرض اشرف رسانیدہ. حسب الاستدعا ایشاں رقم مبارک سرافرازی عالیجاہان نیکو خان و فیض طلب خان مشار الیہ صادر شدہ کہ املاکے کہ نجیب اللہ خان وغیرہ بزور از رعایا گرفتہ باشند بموجب ثبوت کردہ برعایا بدہند. و ہرچہ املاک گروی رعایا کہ نزد آنہا وغیرہ مردم ترین باشد حساب حاصل چندیں سالہ گروی را بکنند. ہرچہ مساوی وجہ گروی باشد بگر ویداران واگذارند و باقی ہرچہ از حاصل چندیں سالہ املاک گروی کہ بماند مناصفہ آں را برعایا...... بدہند و مناصفہ آں را جہت سرکار دیوان ضبط نمایند. بموجب فرمودہ بعمل خواہند آورد خاطر جمع بودہ املاک گروی وغیرہ خود را کہ آنہا متصرف شدہ بعالیجاہان مزبور ظاہر نمایند کہ آنہا بگیرند۔

۲۴ رجمادی الثانی ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء)

پشت پر چھ سات درباران سلطنت کی مواہیر ہیں۔

سند جو شاہجہاں بادشاہ نے مہتہ چھبیلداس کو عطا فرمائی تھی

طغرا نہ پڑھا جا سکا۔

اللہ اکبر — امیر الامرائے خدا یگان — چوں مہتہ چھبیلداس تا قانون قدیم از عمل او مرادان اضیہ لفاف۔

عمل حضرت نواب مستطاب قدس القاب خیر خواہ و دو لتخواہ شدہ آمد است چنانچہ تنخدایان و چودھریان و مقدمان و مزارعات پرگنہ ہزارہ قارلق و بر ہر کدامے مسلمانان و ہندوان برمہتہ مذکور رضا مند اند کہ از سلوک خود و رفاہیت سرکار و کفایت رعایا سعی میخائد. بنا بر آں میخواہند کہ در کار فرونی و معاملات مسلمانان و ہندوان پرگنہ ہزارہ قارلق و غیر سند مذکور در پرگنہ مذبور دخل نے شود محض دو لتخواہی و خیر خواہی سرکار رعایہ میخواہم کہ ہر کدامے سادات عظام و قضات اہل اسلام اہالی و عوام الناس از نہا برخود واقف شدہ ایں قرطاس ثبت..... بہ مہتہ مذکور را سند سرکار باشد موافق سند سرکار زیادہ بخوشی و خیر اندیشی کوشش کردہ سندے میخواہد کہ در معاملات پرگنہ مسلمانان و ہندواں تا دستخط مہتہ مذکور نشود منظور نباشد چوں سراسر دو لتخواہ سرکار است چند کلمہ ارقام نمودہ شد۔

(نوٹ) ۱۔ حاشیہ پر دس تحریریں ہیں جو ہندی یا ناگری میں ہیں جو نہ پڑھی جا سکیں۔ ۲۔ اغلباً مہتہ چھبیلداس ہری پور کے مہتہ خاندان کا مورث ہوگا۔ ۳۔ سند پر اغلباً تین مہریں دیوان و دفتر شاہی کی ہیں جو بعد تحریر سطور متن بیان واقعہ است، بطور تصدیق ثبت ہیں۔

پٹھانوں کا حسب و نسب

چونکہ ضلع ہزارہ میں بہت سی پٹھان قومیں آباد ہیں لہذا ان کے حسب و نسب کی تحقیق ضروری سمجھی گئی اس باب کے لئے میں نے بہت سے ماخذوں سے استفادہ کیا جن کا ذکر جا بجا دوران تحریر کیا گیا۔ لیکن خاص طور پر سر آلف کیرو سابق گورنر سرحد کی کتاب "پٹھان" (انگریزی) سے میں نے بہت زیادہ استفادہ کیا۔ یہ کتاب پٹھانوں کے حسب و نسب پر معلومات افزا اور بہترین کتاب ہے اور لائق مطالعہ ہے میں نے اس کتاب کے بہت سے حصے ترجمہ کرکے شامل کتاب کئے ہیں اور پٹھان کے علاوہ دیگر اقوام ہزارہ کے حسب و نسب کو بھی حتی المقدور تحقیق کی گئی اور ہر ایک قوم کے مشہور خاندانوں کے مکمل شجرہ نسب حاصل کرکے تحریر کئے ہیں ان کے حاصل کرنے اور نقل کرنے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی۔

آج کل عموماً لوگ شجرہ نسب کی اہمیت کے عملاً قائل نہیں رہے۔ حالانکہ زمانہ سلف میں شجرہ نسب کی بہت اہمیت سمجھی جاتی تھی۔ اور لوگ سینہ بسینہ اپنے شجرہ نسب یاد رکھتے تھے۔ بادشاہ ان کو یاد کرانے اور بر سر مجلس بیان کروانے کے لئے ماہر قصہ گو مقرر کیا کرتے تھے اور نسب کو شرف و عزت کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کا بیان کرنا فخر و مباہات کا سرمایہ تھا۔ اسلام نے جاہلیت کے اس بت کو توڑ دیا اور انسانی برتری کا معیار تقویٰ پر رکھا جو صحیح علم و عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس

حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخی واقعات کے نتائج وغیرہ کے لئے شجرۂ نسب کا مطالعہ ایک مفید چیز ہے ان شجروں سے اشخاص کی عظمت و اعمال انکے نتائج و آثار ان کی قوم اور اولاد میں دیکھے جاسکتے ہیں کسی عہد یا دور میں خاص ناموں کی اکثریت اس وقت کے نامور افراد، لوگوں کے میں رائج خیالات و عقائد کے اثر کا پتہ دیتی ہے۔ شجرۂ نسب کے نامی افراد، ان کی زندگی کے حالات اور کوائف سے تاریخ کے اس عہد کے واقعات کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

عموماً صاحب علم و اخلاق افراد اور صالح، عادل صاحب اقتدار کے نام لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور لوگ اپنے بچوں کے نام ان کے نام پر رکھتے ہیں۔ اور ان ناموں کو دوام حاصل ہو جاتا ہے نیک لوگوں کے شجروں سے نیکیوں کی شاخیں (اولاد) پھولتی اور پھلتی ہیں۔ دنیا میں نیک نام چھوڑ جاتی ہیں اور نیک اعمال کا ذخیرہ ساتھ لے جاتی ہیں اور بقائے انفع کا مشاہدہ کرا دیتی ہیں۔ بداعمال لوگ بدیوں کے شجرے ہوتے ہیں ان کی شاخیں (اولاد) مذموم افعال کی عامل ہوتی ہیں۔ ذات اور عوام کے لئے مضر ہوتی ہیں اس لئے بحکم خداوندی چھانٹ دی جاتی ہیں۔ تاریخ عالم کے صفحات سے ان کی اولاد کا نام مٹ جاتا ہے۔ نام چند الفاظ سے مرکب ہوتے ہیں۔ اور الفاظ (جیسا کہ علامہ غلام جیلانی صاحب برق نے اپنی کتاب "من کی دنیا" ص ۲۸ پر لکھا ہے) ایک یونٹ یا ایٹم ہوتا ہے جسے اندرونی جذبات کی بجلیاں برقاتی ہیں اور اس کے اثرات اس عالم فانی اور عالم لطیف، دونوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس کی ہلکی سی مثال گالی ہے۔ گالی کسی تلوار یا توپ کا نام نہیں۔ بلکہ یہ چند الفاظ کا مجموعہ ہے لیکن منہ سے نکلتے ہی مخاطب کے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے یہ آگ کہاں سے آئی۔ الفاظ کے اس مجموعہ سے۔ اس کی ایک اور مثال وہ چیخ ہے جو کسی دکھیا کے منہ سے نکل کر تمام ماحول کو بے چین کر دیتی ہے یا وہ تقریر جو کوئی آتش بیان جرنیل ہمت شکستہ فوج کے سامنے کرتا ہے۔ اور ہر سپاہی میں اس قدر آگ بھر دیتا ہے کہ وہ موت کے سیلاب اور طوفانوں سے بھی نہیں بجھ سکتی، گویا الفاظ کے مجموعوں میں ایک برقی قوت خیر یا شر کی طاقت ہوتی ہے۔ جس سے اقوال و افعال اور اسماء بنائے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی اپنی تاثیر دکھاتے ہیں۔ ان اشخاص کے ناموں کی تحقیق سے ان کے اثر و رسوخ (برائے خیر یا شر) کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ میرے اپنے تجربہ کی بات ہے کہ بعض نام خیر محض اور ان کے مسمیٰ خیر و نیکی کا مجسمہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ کسی ناروا بات یا عمل پر کہتے ہیں۔ کہ اپنے نام کی لاج تو رکھو۔ قومی سطح پر چند نام مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ محمد علی۔ اقبال۔ انور اور امان اللہ۔ ضلع ہزارہ کی تاریخ سے وابستہ چند نام بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ پائندہ خان، محمد خان، حبیب اللہ خان، بہادر خان، جعفر خان، خانی زمان خان، منیر خان

علماء و مشائخ میں سے سید احمد، اسماعیل، عبدالغفور، سید علی وغیرہ یہ نام ہر عہد میں مقبول ہے اور یہ اسماء کے اولین مسمیٰ میں خیر و برکت کے عنصر کا پتہ دیتے ہیں۔ پھر ایک یہ بات بھی عیاں ہے کہ امراء و حکامؒ کے ناموں کے ساتھ ساتھ علماء و مشائخ کے نام خیر و برکت کے طور پر ان کے معاون ہوتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں کسی قوم کو میسر آجائیں تو وہ عزت و شوکت کی مالک ہو جاتی ہے۔ سیاسی ادبار کے وقت ان نامور علماء و صلحاء کے ناموں سے قوم میں زندگی کی شعاع بجھ بجھ کر ابھرتی ہے۔ اور یوں زندگی کی چنگاری سلگتی رہتی ہے۔ کسی موزوں وقت میں کوئی عزم و شجاعت والا انسان پیدا ہو کر اس کو شعلہ میں بدل دیتا ہے اور عنان سرداری سنبھال کر قوم کو بام عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ محمدؐ اور احمدؐ نام کی ہمہ گیری اور برکت و توانائی نے تو ایک عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔ علماء ربانی، محدثین کرام و مشائخ عظام کی ہستیاں اسی نام کی برکت سے روشن ہیں۔ اور امت کے لئے چراغ راہ کا کام دے رہی ہیں۔ اور جن بادشاہوں اور حکام کے نام کا یہ جزو ہیں ان کو بھی خیر کثیر سے حصہ وافر ملا۔

الغرض انساب کی حفاظت اور ان سے دلچسپی افراد و اقوام کی ہمت و حیات کو ابھارنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ تلوار کی طرح نسب ناموں کی بقا بھی نہ خیر محض ہے اور نہ خالص برائی ہے۔ تلوار جب دشمن حق کے خلاف چلتی ہے تو وہ خیر ہے اور جب اہل حق و صلاح کے گلے کاٹتی ہے تو وہ بری ہو جاتی ہے لیکن محض اس وجہ سے کہ وہ نیک یا برے عمل کا وسیلہ بنتی ہے خیر یا شر سے منسوب ہو جاتی ہے۔ یہی حال شجرۂ نسب کی سرگرمیوں کا ہے اسلام نے نسب پر اترانے کی مذمت کی لیکن نسب ناموں کی حفاظت بھی کی۔ قرآن شریف میں آیا ہے: وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (اور ہم نے تمہیں اقوام و قبائل بنایا تاکہ تم ایک دوسرے سے الگ پہچانے جاسکو)

پٹھان اور ان کا حسب و نسب یہ ہے:

تاریخی تحقیق کے مطابق پٹھان اصلاً بنی اسرائیل میں جو اپنے پرانے وطن سے بوجوہ کوہ سلیمان کے گرد و نواح میں آباد ہو گئے۔ یہاں ان کا اختلاط یہاں کے باشندوں (اہل گندھارا) سے ہوا۔ اور اس قوم میں آریائی عنصر داخل ہو گیا۔ یہ اختلاط تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سی صاحب اقبال و سیادت اقوام میں ہوتا رہا ہے۔ اور پٹھانوں اور سادات میں، خاص کر اول الذکر میں۔ ان کے اوصاف بہادری اور مالک تخت و تاج کی وجہ سے اور سادات میں ان کے نسبی شرف و عزت کی وجہ سے۔

بقول ایک انگریز مورخ کے۔ پٹھان قوم کی تاریخ اور پاک و ہند کی تاریخ (ضلع ہزارہ کی تاریخ) اور افغانوں اور ان کے وطن کی تاریخ آپس میں اس طرح ملی ہوئی ہے کہ کسی ایک کی تاریخ، دوسرے کی تاریخ

کے صحیح علم کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ لہٰذا اس وجہ سے اور خود پٹھان ہونے کی وجہ سے بھی مجھے افغانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ اور مکمل جستجو کرنی پڑی۔ پٹھانوں کے جملہ قبائل کے آبائی وطن کے حالات و واقعات ان کی سلسلہ وار آمد بہ ہندوستان (ہزارہ) اور ان کے اس ضلع میں تاریخی حالات و کارہائے نمایاں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔

افغان

چند پرانی شہادتیں :- ۱۔ تاریخ فرشتہ (اردو ص ۱۹) پر تحریر ہے کہ :-

شاہ افراسیاب شاہ ایران کے زمانہ میں پنجاب کا حاکم کیدراج تھا اور اس وقت پنجاب میں کھوکھروں اور چوبے قوموں کی آبادی تھی۔ مردمان صحرانشین اور ان پہاڑیوں کے مابین کابل و قندھار کے رہنے والے لوگوں نے اکٹھے ہو کر کیدراج پر فوج کشی کی اس نے عاجز ہو کر ملک پنجاب انہیں کے قبضہ میں چھوڑ دیا۔ اور اس وقت سے یہ قوم اس ملک میں آباد ہو کر پھیل گئی۔ اور ہر ایک پہاڑ پر جو سردار تھا اس مقام پر وہی خود مختار و متصرف ہوا۔ ظاہراً یہ وہی قوم افغان ہے۔ جو اب بھی موجود ہے۔

کیدراج کے بعد جے چند مہاراجہ ہوا یہ ساٹھ سال حکمران رہا وہ بہمن اور داراب کا ہم عصر تھا اور ہر سال خراج و تحائف ارسال کرتا تھا۔ اس کے بعد دہلو نے ۴۰ سال حکومت کی اس کے بعد راجہ فور نے ۷۳ برس حکومت کی راجہ فور کے زمانہ میں سکندر رومی نے حملہ کیا۔ اس حساب سے یہ معلوم ہوا کہ سکندر اعظم کے حملہ سے جو ۳۲۷ قم میں ہوا تقریباً ۷۵ برس پہلے یعنی ۴۰۰ قم میں۔ افغان قوم کی موجودگی ان پہاڑوں پر پائی جاتی ہے (۲) ۳۱ھ (۶۵۱ء) میں عبداللہ بن عامر نے سیستان، کہستان اور نیشاپور فتح کر لیا۔ ۴۴ھ (۶۶۴ء) میں معاویہ بن ابوسفیان نے زیاد کو بصرہ، خراسان اور سیستان کا حاکم مقرر کیا۔ اور اسی سال عبدالرحمٰن بن شمر نے کابل فتح کیا۔ خالد بن عبداللہ جب کابل کی حکومت سے معزول ہوا تو عراق عرب جانے کی بجائے کوہ سلیمان کو چلا گیا۔ اور اپنی بیٹی ایک افغان کو جو مسلمان ہو گیا تھا نکاح میں دے دی۔ اس لڑکی سے بہت سے فرزند پیدا ہوئے ان میں سے دو شخص بہت مشہور ہوئے ایک لودی اور دوسرا شور۔ افغانان، لودی و شور اسی جماعت سے ہیں۔ مطلع الانوار (ص ۳۰) کے مطابق افغان قبطیہ فرعون ہیں۔ جو موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کی مغلوبیت کے بعد ایمان نہ لائے اور جلاوطن ہوئے اور یہاں آ کر کوہ سلیمان میں اقامت اختیار کی۔ ان کی جنگیں ہندو راجاؤں سے ہوتی رہیں۔ یہ کشمکش بہت مدت تک جاری رہی افغانوں کے شور و ہنگامہ پر ہندوؤں نے ان کا نام افغان اور ان کے ملک کا نام افغانستان رکھا۔ کیونکہ فغان فریاد کے معنی میں مستعمل ہے۔ جب لاہور کے راجہ کی کھوکھروں سے مخالفت ہوئی اور وہ بھی افغانوں

سے مل گئے۔ تو راجہ نے افغانوں سے صلح کر لی۔ افغان روہ و خیبر پر متصرف ہو گئے۔

الپتگین کا سپہ سالار سبکتگین تھا جو لمغان اور ملتان پر تاخت کرتا رہتا تھا۔ افغان اس سے تنگ آئے اور جے پال کو حملہ کے لئے بلایا۔ جے پال نے شیخ حمید افغان کو اپنی طرف سے ملتان اور لمغان کا حاکم مقرر کیا۔ اس تاریخ سے افغانوں نے صدر امارت پر قدم رکھا اور صاحب جاہ ہوئے۔

الپتگین کی وفات کے بعد شیخ حمید سبکتگین سے مل گیا اور جے پال کی شکست کے بعد ملتان کی جاگیر شیخ حمید کے نام مقرر کی۔ لیکن سلطان محمود نے اپنے عہد سلطنت میں اپنے باپ کے خلاف عمل کیا سرکش افغانوں کو قتل کیا اور فرماں برداروں کو ملازم رکھا اور خدمت لینے لگا۔ سبکتگین نے جے پال کو شکست دے کر لمغان۔ پشاور اور نیلاب دریائے سندھ اٹک کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ افغانان اور خلج کو کہ اس حدود میں صحرانشین تھے اپنے لشکر کے زمرہ میں جگہ دے کر غزنی کی طرف روانہ ہوا۔

سر اولف کیرو (جنہوں نے اپنی ملازمت کا تقریباً سارا حصہ صوبہ سرحد میں گزارا۔ اور آخر ۱۹۴۶ء کے قریب اس علاقہ کے گورنر ہوئے) نے ایک محققانہ کتاب "پٹھان" ۱۹۵۸ء میں لکھی ہے جو بصیرت افروز اور گہرے غور و فکر کی حامل ہے۔ انہوں نے اس قوم کی تاریخ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور میں نے اس سے بہت استفادہ کیا۔ اس سے موزوں حال اقتباسات جو طویل تو ہیں لیکن معلومات افزا ہیں درج کئے دیتا ہوں اور حاشیہ میں اس کا حوالہ "ک۔ پ" ہے۔ وہ تمہید میں لکھتا ہے۔ "سچ یہ ہے کہ پٹھانوں کی صحیح تاریخ آج تک نہیں لکھی گئی۔ اس تاریخ میں کچھ تو قومی روایات ہیں اور کچھ افسانے ہیں۔ اور کچھ کہانیاں ان میں بھی صرف ان کے سرداروں اور بادشاہوں کے حالات ہیں۔ جو اپنے ملک سے اور زیادہ تر تخت دہلی سے وابستہ تھے۔ یا ان کے درانی بادشاہوں کی سلطنت کے واقعات ہیں۔ پٹھان صدیوں سے خراسان اور ہندوستان کے درمیانی راستہ پر مقیم ہیں۔ جہاں بڑی بڑی تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ اور بڑے بڑے جنگ آزما لشکروں کے سیلاب بار بار ان کے علاقوں سے گزرتے رہے۔ فاتح ان کے ملک سے گزر کر بڑی بڑی سلطنتوں کی بادشاہی تک پہنچتے رہے۔ لیکن پٹھان قوم کو جو اس دروازہ کی نگہبان تھی اپنی تاریخ کے پس منظر سے صحیح طور پر آگاہ نہیں کیا گیا۔ اس وقت پٹھانوں کے اپنے علاقہ کی مرتب تاریخ نہ کسی پٹھان نے اور نہ کسی اور نے جو اس تاریخی مقام سے گزرتے رہے لکھی ہے۔

مثلاً اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ افغان اور پٹھان میں کیا فرق ہے۔ وہ کیا ہیں اور کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں ان کی معاشرتی و سیاسی تنظیم کیا تھی اور کیا وہ ایک ریاست قائم کرنے

میں کامیاب ہوئے ان کی زبان کیا ہے اور ان کا ادب کیا ہے۔ زمانہ گزشتہ میں مختلف اوقات میں انہوں نے ان بیشمار طاقتوں اور ریاستوں پر جنہوں نے ان پر دباؤ ڈالا، کیا اثر ڈالا۔ اور مستقبل میں ان سے کیا کارہائے نمایاں ہونے کی توقع ہے۔"

میں یہ چاہتا ہوں کہ پٹھان اور افغان دونوں کے متعلق کچھ تحریر کروں اگرچہ خود یہ قوم ان ہر دو الفاظ کو ہم معنی سمجھ کر عام طور پر استعمال کرتی ہے۔ وہ پٹھان قوم کو اصل کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا گروہ جو میدانی علاقہ اور سطح مرتفع پر بستے ہیں۔ ان کو وہ افغان کے نام سے موسوم کرتا ہے اور اس کو قوم کی سرداری کا شیخ کہتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو پہاڑی علاقوں میں رہتا ہے۔ ان افغان گروہ کو وہ پھر دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ۱۔ مغربی افغان۔ دُرّانی اور غلجی۔ ۲۔ مشرقی افغان۔ یوسف زئی اور ملحقہ افغان قبائل جو میدان پشاور اور اس کے شمالی دروں میں بستے ہیں۔ پھر وہ لکھتا ہے۔

"مغربی افغانوں پر ایران کا اثر غالب رہا یہاں تک کہ اُن دُرّانیوں کی زبان بھی اس سے متاثر ہوئی ان کا تعلق اور ترقی صفوی ایرانی شہنشاہیت سے تھا۔ اور ہرات و قندھار ان کے تہذیبی مراکز تھے۔ مشرقی افغان (یوسف زئی وغیرہ) پر بعض مورخین نے ان کو بُردُرّانی (بالا دُرّانی) کے نام سے یاد کیا ہے۔ ایرانی روایات کا اثر کم رہا ہے۔ کیونکہ ان کا تعلق سلطنت مغلیہ سے رہا ہے جو کہ کابل و پشاور کے مرکزوں سے حکومت کرتے تھے۔ بہرحال مغربی اور مشرقی دونوں شاخیں افغان ہیں۔ اور اس معنی میں موجودہ حکومت افغانستان کی حدود سے جو ۱۸۹۳ء میں قائم ہوئی وسیع تر علاقہ میں آباد ہیں۔" آگے چل کر اس نے دوسرے گروہ کے متعلق جو پہاڑوں میں آباد ہیں تحریر کیا ہے۔

"مشرقی اور مغربی افغانوں کے درمیان کے پہاڑوں میں اور ان دو شاخوں کو الگ الگ کرنے والے پہاڑی لوگ ہیں۔ جن میں بہت سے صوبہ سرحد کی مشہور قبائل ہیں۔ مثلاً آفریدی۔ خٹک اورکزئی بنگش۔ وزیر۔ محسود۔ توری۔ ان کی زبان تقریباً مشترک ہے اور ان سب کا شجرہ نسب کرلانڑی سے (جو کہ خالص افغان نہیں) ملتا ہے۔ یہ پشتون یا پختون ہیں۔ یہ اقوام کبھی بھی کسی بادشاہ کے مطیع نہیں رہے۔ یہ پہاڑی علاقہ کے پٹھان (پختنہ کا ہندوستانی مترادف) ہمیشہ سے مشرق کی طرف وادیٔ سندھ کے شہروں اور قصبوں سے آمد و رفت رکھتے رہے ہیں۔ بہ نسبت مغرب کی طرف کابل و قندھار سے۔ لہٰذا ان اقوام کا تعلق علاقہ پشاور کے افغانوں سے بہ نسبت مغربی افغانوں (دُرّانیوں سے جن کے ملک کو یہ خراسان کہتے ہیں) بہت گہرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی افغان (یوسف زئی) اپنے آپ کو ان پہاڑی قبائل سے نزدیک تر سمجھتے ہیں۔ یہ پہاڑی قبائل اور مشرقی افغان

مجموعی طور پر ڈیورنڈ لائن سے مشرق کی طرف حدود پاکستان میں رہتے ہیں انہی پٹھانوں کو شیر شاہ سُوری شاہ دہلی سولھویں صدی اور خوشحال خان خٹک نے سترھویں صدی میں باشندگان روہ کہا ہے۔

نوٹ:۔ "روہ ملتانی اور بلوچ زبانوں میں کوہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملتان اور ڈیرہ جات کے لوگ کوہ سلیمان کو اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو کہ پٹھانوں کا ملک ہے اس واسطے پٹھانوں کو روہیلہ کہتے ہیں۔" آگے چل کر سر آلف ان پہاڑی اور مشرقی افغانوں کی زبان و اطوار کے اختلاف پر لکھتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ پختو اور پشتو میں کیا فرق ہے۔

"پٹھانوں کی زبان میں چند اور باتوں کے علاوہ (جب کہ وہ فارسی نہ بولتے ہوں) ایک خاص فرق یہ ہے کہ شمال مشرقی پٹھان (یوسف زئی) پختو بولتے ہیں۔ اور جنوب مغربی (وزیر محسود) پشتو ان دو کے درمیان حد فاصل وہ لائن ہے جو مشرق سے مغرب جاتے ہوئے اٹک کے جنوب سے گزر کر کوہاٹ سے ہوتے ہوئے وادیٔ میران زئی (علاقہ ہنگو) سے ٹل تک اور پھر دریائے کُرم کے جنوب سے ہریوب اور شتر گردن درہ (ہر دو علاقہ افغانستان) سے گزرتی ہے۔ اس لائن کے شمال مشرق میں سکونت پذیر پٹھان قبائل علاقہ، پشاور، دیر، سوات، بُنیر، باجوڑ، آفریدی، اورکزئی، شنواری، بنگش، توری (کرم ایجنسی) صرف خ استعمال کرتے ہیں۔ اور اس لائن کے جنوب مغرب میں رہنے والے قبائل دُرّانی غلجی (سوا ان کے جو جلال آباد کے نزدیک رہتے ہیں) خوست، وزیرستان۔ بنوں اور ڈیرہ جات کے لوگ صرف ش بولتے ہیں۔ ژوب، و دیگر علاقہ بلوچستان و قندھار کے پٹھان بھی ش بولتے ہیں۔ صرف ایک قوم خٹک ہے جن میں دونوں تلفظ رائج ہیں صرف خ اس شاخ میں رائج ہے جو یوسف زئی کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ خوشحال خان خٹک پٹھان شاعر کے دیوان کی زبان بھی یوسف زئیوں کی زبان ہے۔"

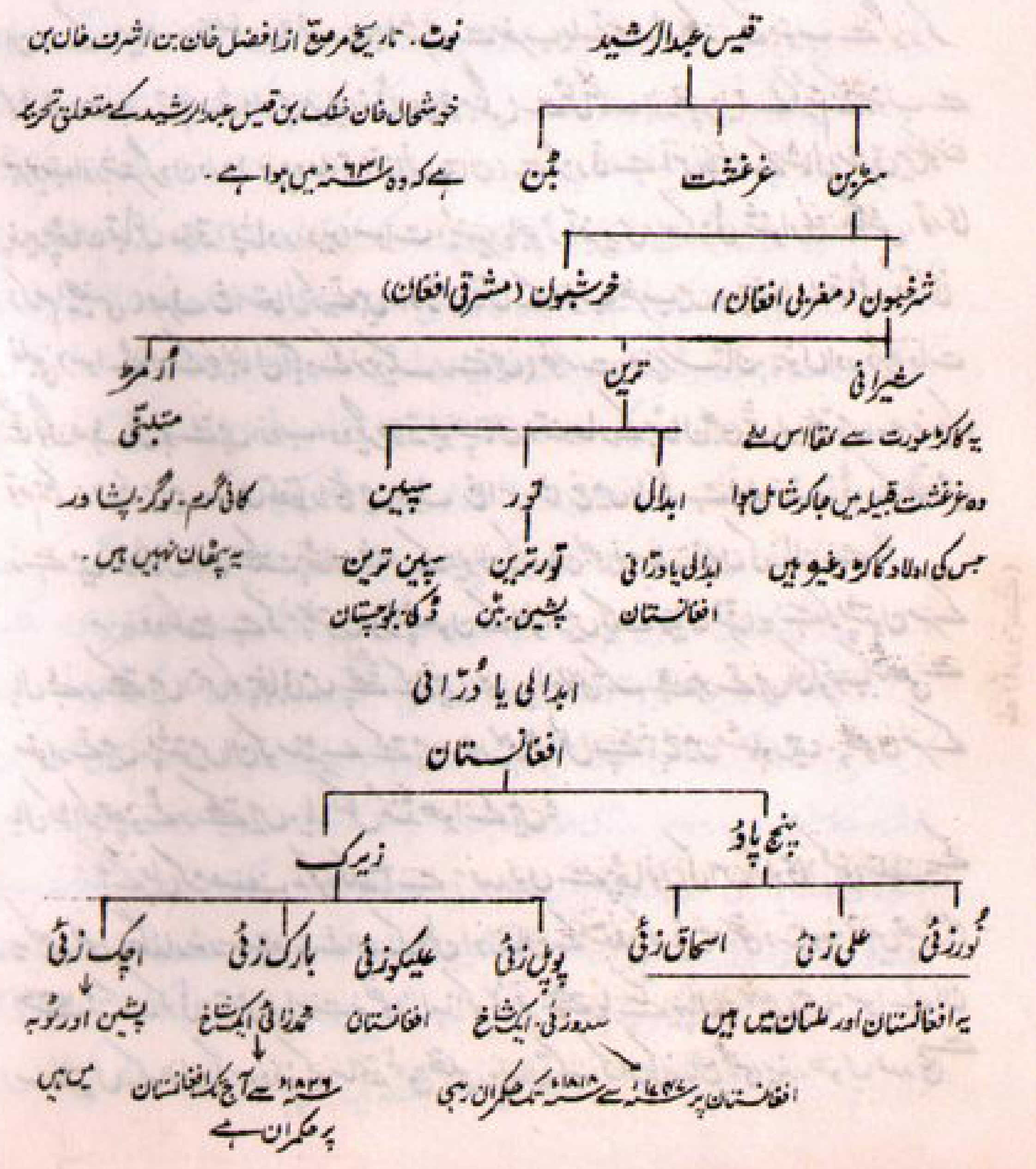
مزید وہ لکھتا ہے کہ "پختون اور پشتون کے اطوار میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ پشتون سر کے بال لمبے رکھتے ہیں (جس کو پنجابی میں پٹھے کہتے ہیں) اور یہ بال کان تک لمبے ہوتے ہیں ان کو خوب کنگھی سے سنوارتے ہیں۔ پشتو میں ان کو سنڑے کہتے ہیں۔ اور یہی قبائل اپنے ناچ میں مشہور ہیں۔ پختون سر کے بال کٹوا کر چھوٹے رکھتے ہیں۔ یا بالکل مُنڈھواتے ہیں۔"

آگے چل کر مصنف مذکور لکھتا ہے۔ "صدیوں سے پٹھانوں کی اس آزادی (کسی سلطنت کے یہ کبھی بھی باجگذار نہ رہے۔) نے ان کے وطن اور زبان کے متعلق کوئی تاریخی دستاویز نہیں چھوڑی ۱۸۴۷ء تک کوئی مقامی ریاست نہ تھی۔ لہٰذا کوئی نوشتے یا سکے یہاں پر نہیں ہیں۔ سوائے ان سلطنتوں کے جو ان کی حدود کے ساتھ ملحق تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی زبان بھی پندرھویں صدی سے

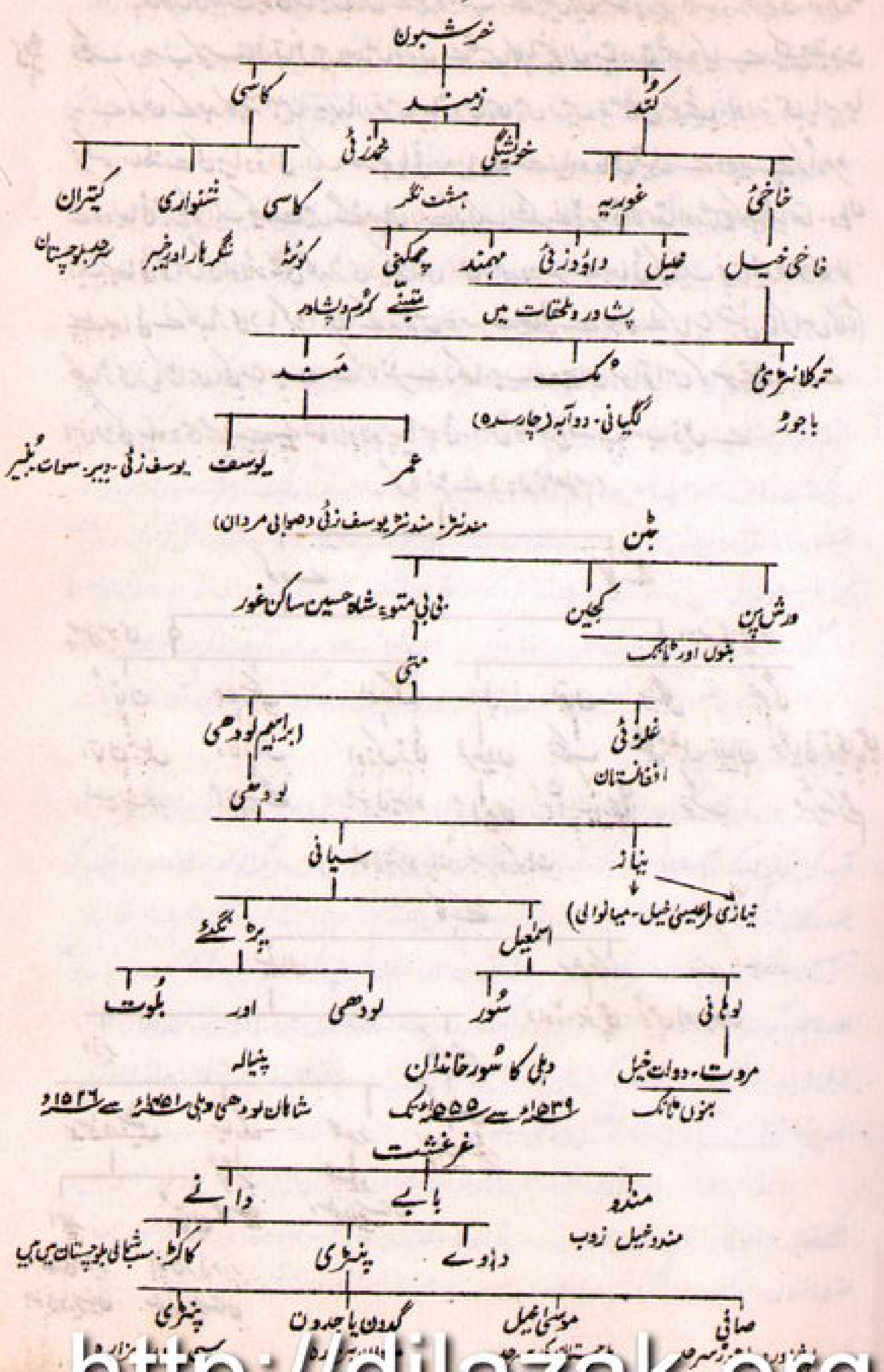
سے پہلے تحریر میں نہیں آئی تھی۔ اور کوئی خاص ادبی تحریر سترھویں صدی سے پہلے کی نہیں۔ لہذا ان کے متعلق کوئی پرانی یادداشت نہیں پٹھانوں نے اپنے ملک میں نہ ہی کوئی یادگار عمارتیں بنائیں اور نہ ہی کوئی کتبے لکھے۔ لہذا مورخ کو ان قوموں اور بادشاہوں کے جو ان کے ملک سے گزرتے رہے، تاریخی حالات، یادگار عمارتوں، کتبوں اور سکوں وغیرہ سے اور پٹھانوں میں رائج زبانی روائت اور قصوں سے مدد لے کر ان کی تاریخ کے دھندلے نقوش اجاگر کرنے پڑے ہیں۔"

اس کے بعد سر آلف کیرو نے پٹھانوں کا شجرہ نسب درج ذیل دے کر اس پر ایک دقیق بحث کی ہے۔

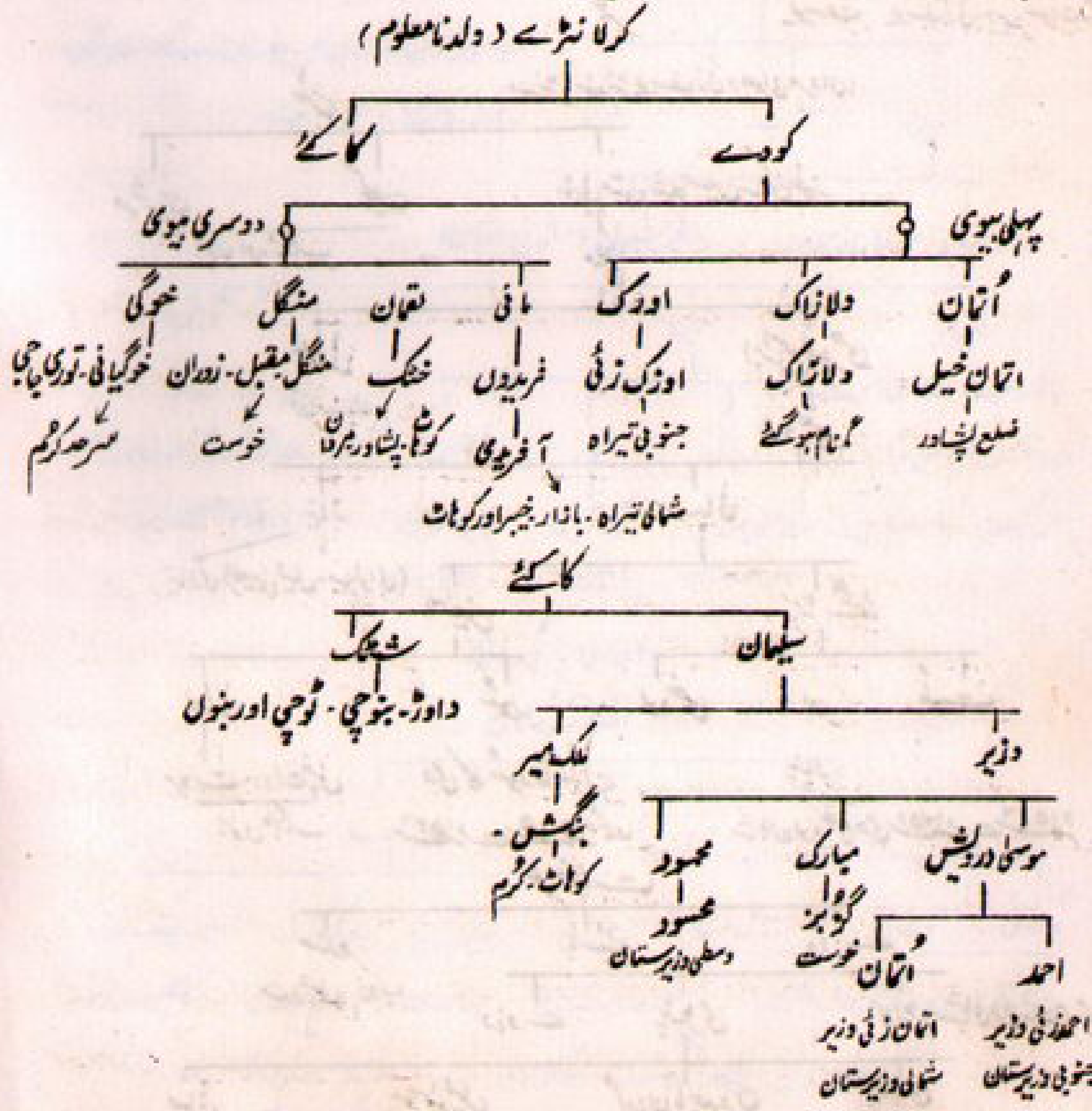
شجرہ نسب



مشرقی افغان



پٹھانوں کی بہت بڑی شاخیں قیس کے شجرہ نسب سے نہیں ہیں۔ مثلاً وزیر، محسود، آفریدی، اورک زئی خٹک۔ یہ سب کوہستانی قبائل ہیں بعد میں لوگوں نے قیس کا پانچواں بیٹا درج شجرہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے جد کا پتہ نہیں۔ یہ بہادر قومیں پہاڑوں ہی میں رہیں نہ مطیع ہوئیں۔ اور نہ ہی باہر جا کر کسی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ایک حصہ جو باقی روایات سے زیادہ قابلِ قبول ہے وہ یہ ہے کہ اُرمڑ کے دو بھائی صبح کو ایک کھیت میں گئے جہاں رات کو ایک لشکر نے ڈیرہ ڈالا تھا اور صبح کو چلا گیا تھا۔ وہاں ایک بھائی کو جس کی اولاد نہ تھی کلہاڑی (یا کڑاہی) ملی۔ اور دوسرے بھائی کو ایک نوزائیدہ لڑکا ملا پہلے بھائی نے کلہاڑی (یا کڑاہی) کے بدلے میں دوسرے بھائی سے لڑکا لے کر اپنا متبنیٰ بنا کر اس کا نام کلہاڑی (یا کڑاہی) کی مناسبت سے کرلانڑے رکھا۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کو سوتیلے باپ نے اپنی لڑکی بیاہ دی جس سے بے شمار اولاد پیدا ہوئی۔ اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔



گویا یہ سب کارلانڑے قبائل، اورمڑ قوم کے ایک فرد کے متبنیٰ کی اولاد ہیں۔ اور اُرمڑ اپنے آپ کو افغان نہیں کہتے۔ اس وقت اُرمڑ قوم تین جگہوں پر آباد ہے۔ ایک کانی گرم۔ وزیرستان کے پہاڑوں کے وسط میں۔ دوسرے لوگر کابل کے نزدیک اور تیسرے تین مواضعات اُرمڑ بالا، اُرمڑ میانہ اور اُرمڑ پایاں جو تقریباً پشاور سے دس میل جانب جنوب مشرق میں واقع ہیں۔

کانی گرم میں یہ لوگ محسود قبائل سے پشتو میں بات چیت کرتے ہیں لیکن آپس میں اُرمڑی زبان میں (جو ایک مشرقی ایرانی زبان ہے) لوگر اور پشاور کے علاقہ کے لوگ اپنی اُرمڑی زبان بھول چکے اور گرد و نواح کے قبائل سے گھل مل گئے ہیں۔ اور پختو بولتے ہیں۔

کانی گرم کی اُرمڑ قوم کا پشتو بولنے والے پٹھانوں کے درمیان رہ جانا ایک خاص تاریخی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس قوم کا کانی گرم۔ لوگر اور پشاور میں ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ یہ لوگ کسی زمانہ میں صاحبِ شہرت قوم رہ چکا ہے۔ شجرہ انساب کا یہ کہنا کہ ایک اُرمڑ نے کارلانڑی کو متبنیٰ بنایا تھا مزید دلچسپی کا باعث ہے اس سے یہ باور ہوتا ہے کہ کارلانڑے ایک ملکی قوم کی اولاد سے ہیں جو پشتو زبان نہیں بولتی تھی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ پشتو (پختو) بولنے والی اقوام سے خلط ملط ہو گئے۔ اور پٹھانوں کی زبان کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس لحاظ سے یہ بات تو کم از کم ظاہر ہوتی ہے کہ کارلانیڑے خالص پٹھان نہیں ہیں۔ اور فی الواقع یہ لوگ پٹھانوں کی اس علاقہ میں آمد سے بہت پہلے یہاں اقامت گزیں تھے۔

بہر حال آج کے کارلانڑی قبائل۔ وزیر، بنوچی۔ خٹک۔ بنگش اور کرزئی۔ آفریدی وغیرہ اپنے آپ کو پٹھان کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور پختون ولی (پٹھان ولی) ہیں دیگر اقوام سے اپنے آپ کو بلند سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یوسف زیوں کے برعکس پٹھان رسم و رواج کو افغان رسم و رواج پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بات اس کا ثبوت ہے کہ پٹھان اور افغان اگرچہ ایک ہی زبان کی مختلف بولیاں بولتے اور باہم دگر مخلوط رہتے ہیں لیکن اصل میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ افغان۔ قندھار۔ ہرات۔ کابل (بذریعہ فتح) اور پشاور کے زرخیز اور وسیع میدانوں میں رہتے ہیں۔ اور پٹھان پہاڑی علاقوں اور پہاڑوں پر۔ تیسری شاخ غلجی قبائل ہے۔

احمد حسن صاحب دانی پروفیسر علم الآثار قدیمہ پشاور یونیورسٹی اپنی کتاب "پشاور" صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں کہ افغان اور پٹھان میں امتیاز نہ پٹھانوں کے نزدیک صحیح ہے اور نہ ہی تاریخی طور پر۔ لفظ افغان۔ اوگان یا ابا گان تیسری صدی عیسوی (عہد ساسانی) اور چھٹی صدی میں ملتا ہے۔

ایرانیوں نے لفظ افغان استعمال کرنا شروع کیا۔ جو غزنوی عہد سے آج تک مروج ہے۔ ان کی رائے میں پٹھان قوم پر اسلام کا اثر عربوں کے وقت ساتویں آٹھویں صدی عیسوی میں پڑا اور غزنوی عہد میں یہ قبائل جوق در جوق حلقہ اسلام میں داخل ہوئیں۔ آگے چل کر وہ صفحہ ۶ پر لکھتے ہیں۔ تاریخی پس منظر اور جغرافیائی لحاظ سے ان میں دو بڑے طبقے ہیں۔ اول کارلانڑی۔ دوم بٹن۔ سربنڑی اور غورغشت۔ اول الذکر کا واسطہ عربوں سے پڑا اور دوم کا تیموریوں سے۔ پاک و ہند کے میدانوں میں بابر کی اولاد سے سوری اور لودھیوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ اور وہ شکست کھا گئے۔ پشاور کے علاقہ میں یوسف زئی مدت تک مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ آخر کار درانیوں نے مغلوں پر غلبہ پا کر افغان سلطنت کی بنیادیں استوار کیں۔

سرالف کیرو لکھتے ہیں :- " افغانوں کی روایات چھٹی صدی ق م میں بنی اسرائیل کی بابل کی تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ بر ۵۵۹ ق م میں کرسائیرس کی تخت نشینی کا سال ہے اس خاندان کی سلطنت کو ۳۳۱ ق م سکندر اعظم نے فتح کر لیا۔ ان دو صدیوں میں افغانستان، صوبہ سرحد اور کچھ حصے پنجاب کے ایران کی سلطنت کا حصہ تھے۔ اور ان اقوام پر ایرانی تاریخ و تہذیب کے اشاعت اسلام کے اثرات سے زیادہ پرانے اور گہرے ہیں۔ پرانے ایرانی کتبوں اور تواریخی اسناد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وادی پشاور ہی گندھارا تھا۔ اس علاقہ پر سائرس اور دارا کی حکومت رہی ہے۔

ہیروڈوٹس یونانی مورخ ان تاریخی واقعات کی تصدیق کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس اپنی تاریخ میں پکتوئی (پختون) کے علاقہ میں اور کاسپاپٹروس اور ہیکیٹیس ۵۰۰ قم (یعنی ہیروڈوٹس سے بھی پہلے) اس شہر کا نام کسپاپوروس علاقہ گندھارا میں لکھتا ہے۔ اور یہ دونوں پرانے نام پشاور کے ہیں۔ جس کو چینی سیاح ہیونگ سانگ نے پولوشاپولو لکھا ہے جو کہ پرشاپورہ کا سنسکرت زبان میں نام ہے اسی کو مسلمان مورخوں البیرونی وغیرہ نے پرشاپور یا پشاور لکھا ہے۔

مزید نقش رستم جو دارا اور اس کے خاندان کی قبروں پر تحریر ہے اس میں ۲۶۰ء کے واقعہ کا ذکر ہے جس سن میں ساسانی خاندان کے دوسرے بادشاہ جس نے روما کے بادشاہ کو اڈیسہ کے مقام پر شکست دی اور قید کر لیا۔ اس واقعہ کے ضمن میں ساسانی سلطنت کی مشرقی سرحد کے ایک شہر پشکبر جیکی جو لکھا ہے جو موجودہ پشاور ہے۔ سکندر اعظم کا صوبہ سرحد کو فتح کرنا اس بات کا مزید ثبوت ہے۔ کہ وہ ایرانی سلطنت کے آخری صوبہ کو فتح کر رہا تھا۔ ان تمام تاریخی واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ پکتوئی (پختون) قوم وادی کسپاپیٹروس (پشاور) و ملحقات میں آباد تھی۔ اور پھر سکندر کا جہلم تک جانا ایک اور ثبوت اس بات کا ہے کہ ایرانی سلطنت دریائے جہلم تک تھی۔

ہیروڈوٹس اور دیگر سب مورخین کے بیانات کے مطابق یہ سب پٹھان قومیں اپنے موجودہ علاقہ جات میں موجود تھیں۔ خاص کر آفریدی، خٹک اور وزیر اقوام کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ پرانی تاریخ میں خٹک کے ساتھ شٹک کا نام بھی ہے اور یہ اقوام داوڑ اور بنوچی ہیں۔"

بابر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ ۱۵۰۵ء میں بنوں کے گرد و نواح میں کارلانڑی قوم آباد تھی۔ اور ان کے ساتھ نیازی اور عیسیٰ خیل بھی آباد تھے۔ اس کارلانڑی قوم کے ذکر سے اس کا مطلب شٹک اور خٹک ہی ہوگا۔ کیونکہ دوسری کارلانڑی اقوام مثلاً وزیر اور بنگش جن سے بابر علاوہ ان کو اسی نام سے اپنی تحریر میں یاد کرتا ہے۔

ہیروڈوٹس کے بیان کے مطابق (زرکسیز) کی فوج کے خاص سوار دستوں کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ سگرتوئی قوم ہے جو لباس اور زبان میں ایرانی اور افغانی نصفا نصف ہیں۔ یہ تفصیل درانی (ابدالی) قوم ہی پر صادق آتی ہے جب کہ وہ کوچہ گمنامی سے شہرت کے دائرے میں (دو سو سال پہلے) (یعنی نادر شاہ کے وقت میں آئے۔ یہ افغانی قوم (درانی) سب سے پہلے شاہ عباس اعظم صفوی (۱۵۸۸ء سے ۱۶۲۹ء) کے عہد میں منظر عام پر آئے۔ اس وقت یہ مغرب میں ایران کے نزدیک آباد تھے۔ اور بعد میں نادر شاہ (۱۷۳۶ء سے ۱۷۴۷ء) کے زمانہ میں زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کے عادات و اطوار اور زبان پشتو سے زیادہ فارسی کی طرف مائل رہے ہیں۔ یہ ایرانی تہذیب کے بہت زیادہ زیر اثر ہیں۔ یہاں تک کہ غلجیوں سے بھی زیادہ جنہوں نے ایران پر پندرہ سال حکومت کی ہے۔

الفنسٹن (۱۸۰۹ء) نے بھی ابدالیوں کے متعلق ایسی ہی رائے دی ہے اور کہا ہے کہ ان کی زبان ایرانی ہے۔ ایسا ہی الیگزنڈر برن نے بیس سال کے بعد یہی لکھا ہے۔"

سکندر کے وقت سے پٹھانوں کے ملک کی سرحد مارگلہ ہے۔ سکندر نے باجوڑ سوات میں (گنگرا اور سوات کے درمیان) جن اقوام کو فتح کیا ان کے نام ایسف زئی۔ گرائی اور اساکینی ہیں۔ سکندر اعظم نے ۳۳۱ ق م میں ایران فتح کیا۔ جنگ اربیلا حال اربل میں دارا کی طرف سے فوج میں مشرقی ایران کے پٹھان اور پہاڑی اقوام موجود تھیں۔ اور یہ پہاڑی اقوام بموجب ہیروڈوٹس کے وہی لوگ ہیں۔ جن کا ذکر اس نے سنداروئی۔ پکتوئی اور اپریتوئی وغیرہ کے نام سے کیا ہے۔ سکندر کے بعد اس کے جانشین اگرچہ چند پشت تک ایران پر قابض رہے۔ لیکن گندھارا سے چند سالوں میں موریا حکمرانوں نے ان کو نکال دیا۔ اور سکندر کا اثر باقی نہ رہا۔ اگر رہا تو وہ قدیم ایرانی اثر ہی حکومت و ملک پر رہا۔ سکندر سے دو سو سال بعد پشکلاوتی (حال چارسدہ) گندھارا کا دار الخلافہ ہوا جب کہ سکندر کے وقت پشاور (یعنی PDAKA PUROS) تھا)

بیلیو کی رائے میں راجپوت اور پٹھان کی عادات و رسومات ایک سی ہیں اگرچہ اب ان ہر دو میں اسلام اور برہمن مذہب کی وجہ سے جدائی ہے۔ شجرہ نسب میں سڑبن (مشتق از سوریہ بنس) شرجیون اور شرجن اور کرشبون از کرشن اس لحاظ سے پٹھانوں کو راجپوتوں سے واصل قرار دیتا ہے۔ بقول بیلیو یہ اقوام سفید ہن کے باقیات ہیں۔ سفید ہن کے افغانوں میں اختلاط کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے یعنی شجرہ میں غلجی کو بٹن کی اولاد دکھایا گیا ہے۔ اور قیس کی لڑکی بی بی متو کی اولاد۔ اور یہ تحریر ہے کہ ایک غیر قوم کے شاہزادہ نے اس کو اغوا کرلیا تھا اور شاید یہ ترک شاہزادہ تھا۔ بہرحال افغان نہ تھا۔ اس کہانی سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ حملہ آور لوگ (سفید ہن) لوگوں کی لڑکیاں اٹھا لے جاتے تھے۔ اسی بنا پر غلجیوں میں ترکوں کا اختلاط زیر بحث رہا ہے۔ اور اب ثابت ہوچکا ہے کہ سفید ہن ہی غلجیوں کے اجداد ہیں۔ یہاں تک کہ ابدالی بھی سفید ہن کی نسل سے ہیں۔

۵۶۵ء میں ساسانیوں نے سفید ہن (HAYTOL EPHTHALITES) کو شکست دی اور گندھارا تا دریائے اٹک ایران کے ملحقات میں شامل کیا گیا۔ اور گیارہ صدیوں تک یعنی دارا کے وقت سے گندھارا ایران کا ایک بیرونی دروازہ بطرف ہندوستان رہا۔ اس عرصہ میں جو حملہ آور بھی آئے وہ ایرانی النسل ہی تھے۔ اور ان کا اقتدار عارضی ہی تھا۔

عربوں نے ایران کو مکمل طور پر ۶۴۲ء (۲۱ھ) میں نہاوند (ہمدان کے جنوب میں) کے میدان میں فتح کرلیا۔ سفید ہن کے خاتمہ اور محمود غزنوی تک کا زمانہ (چار سو سال) مشرقی سرحد تاریخی لحاظ سے گمنام و تاریک ہے۔ صرف چند سکوں کی بدولت کچھ حالات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عرب چار سو سال تک افغانستان و گندھارا کو فتح نہ کرسکے۔ جہاں پر ہندو حکمرانوں کی سلطنت تھی۔ گندھارا کے میدانوں پر محمود غزنوی کے حملوں تک (گیارھویں صدی عیسوی) ہندو شاہی خاندان کی حکومت رہی۔ محمود غزنوی کے وقت پٹھان مسلمان ہوئے تھے۔ ہندوؤں نے نہ کوئی تاریخ لکھی اور نہ ان کو تاریخی واقعات و سنین کا شوق تھا۔ عرب مکمل طور پر کابل و غزنی کو کبھی فتح نہ کرسکے اور کوہ سلیمان کے علاقہ کو تو بالکل ہی نہ پہنچ سکے۔

ابن سمورہ نے کابل کو ۶۶۳ء ۴۳ھ میں فتح کیا۔ لیکن اس سے تین سال بعد ابن زیاد جب زرنج پہنچا تو اس نے کابل شاہ اور رتبیل (یا زنبیل جو سیستان کے حکمران تھے اور جنوب میں بست تک قابض تھے) کو باغی پایا۔ جنگ ہوئی لیکن فتح و شکست کے بغیر صلح ہوگئی۔

۶۶۴ء ابن سمورہ کے ایک نائب نے (مطابق تاریخ کے) بنّہ (BANNAH) غالباً موجودہ بنوں

اور الاہور پر حملہ کیا۔ جو ملتان اور کابل کے درمیان ہے۔ یہاں (الاہور میں) اس پر اٹھارہ ترک سرداروں نے حملہ کیا۔ سر آلف کیرو کی رائے میں یہ لاہور تحصیل صوابی ہے اور غالباً یہی لاہور جے پال کا دارالسلطنت تھا جب محمود نے حملہ کیا۔ نہ کہ پنجاب والا لاہور۔ اور یہی لاہور کابل جنوں سے ملتان جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ یہ اٹھارہ سردار خانان ہنڈ و زیدہ کے اجداد ہوں گے۔ پرانا ہنڈ بھی اس لاہور ہی کے پاس ہوگا جہاں اب بھی پرانی ڈھیریاں موجود ہیں۔

۶۶۷ء (۴۷ھ) میں سیستان (سجستان) کے عرب گورنر عباد بن زیاد نے الہند کی سرحد پر حملہ کیا اور القندہار کے صحرا کو عبور کیا۔ یہ قندہار موجودہ قندھار نہیں۔ کیونکہ اس وقت اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ بلکہ یہ قندھار، گندھارا یعنی وادی پشاور ہے۔

اس بیان کی تصدیق البیرونی کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو گیارھویں صدی میں محمود غزنوی کے وقت تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ کابل و قندھار پر ہندوؤں کی حکومت تھی اور ان کا دارالخلافہ ویہند (ہنڈ) تھا۔ لیکن کیرو کے خیال کے مطابق لاہور (تحصیل صوابی) تھا۔ اسلام کی پہلی دو صدیوں میں عربوں کا اثر صرف سیستان پر رہا۔ وہ ہرات اور بست سے آگے مشرق کو نہیں بڑھے۔ زابلستان اور کابل پہ ہندو خاندان کی حکومت تھی۔ اس واسطے گندھارا اور اس کے ملحقہ پہاڑی آبادی مسلمان نہ تھی۔ عربوں کے حملے گندھارا کے علاقہ پر ہوتے رہے۔ لیکن انہوں نے قبضہ نہیں کیا۔

افغان۔ نام

سب سے پرانی شہادت ایک ساسانی کتبہ (INSCRIPTION) میں جو تیسری صدی عیسوی کی ہے۔ ابگان (افغان) کا لفظ ملتا ہے۔ ہندوستانی تحریروں میں چھٹی صدی عیسوی کی کتاب برہت سمہتیہ۔ جو ہندوستانی نجومی وراہا مہیرا نے لکھی ہے اس میں ان کے نام کے ہندوستان میں موجود ہونے کا ذکر ہے ہیون سانگ نے بھی ان کا نام کوہ سلیمان کے حصہ کے باشندوں میں لیا ہے اور اس نے ان کا نام A - PO-KIEN (جو افغان ہی ہو سکتے ہیں) لیا ہے وہ جنوبی ایشیا کے سفر میں ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک رہا۔ اور ۶۴۴ء میں گندھارا میں تھا۔ یعنی تقریباً عربوں کے پہلے حملہ الاہور سے بیس برس پہلے۔ اسلامی عہد میں افغانوں کا ذکر سب سے پہلے حدود العالم تصنیف ۹۸۲ء میں ملتا ہے۔ اس میں ایک گاؤں ساول نامی میں جو کہ گردیز کے نزدیک تھا۔ افغان آباد تھے اور ننہار (ننگرہار) موجودہ جلال آباد جس کا بادشاہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور تیس بیویاں رکھتا ہے جو مسلمان، افغان اور

اور وادیٔ کابل کے بالائی حصہ سے اس کو نکال دیا۔ بہت سا مالِ غنیمت اور دو سو کے قریب ہاتھی اس کو اس جنگ میں حاصل ہوئے۔ اس کے بیٹے محمود نے ہندوؤں کو گندھارا سے نکالنے ہی کا عہد نہیں کیا بلکہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا انتظام کرنے لگا۔ اس کے کارنامے نمایاں ہیں خاص کارنامہ ہندوؤں کو دریائے سندھ کے مغربی علاقہ سے نکالنے، افغانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے ان کو مسلمان بنانے اور ان کی طاقت کے بل پر ہندوستان پر حملے کرنے میں تھا۔ محمود ترک تھا۔ اور اس کی بہادری و شجاعت افغانوں میں ضرب المثل ہے اور وہ اس کو قومی لیڈر مانتے ہیں۔ اس نے افغانوں کے علاقہ کوہ سلیمان کی اقوام پر دخل حاصل کیا۔ اور اپنے بیٹے کو ان جنگجو قوموں کے زیر نظر رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد پٹھان محمد غوری کے ساتھ لیے اور سنہ ۱۱۹۱ء میں پرتھوی راج کی فوج نے محمد غوری کی فوج افغانوں اور خلجیوں کو شکست دی۔ مگر دوسرے سال محمد غوری نے پرتھوی راج کو افغانوں اور خلجیوں کی امداد سے شکست دی۔ بعد میں یہ دونوں اقوام شاہانِ دہلی کی فوجوں میں ہر جگہ موجود رہیں۔ سنہ ۱۲۹۰ء میں دہلی کی سلطنت پر خلجیوں نے قبضہ کر لیا۔ غوری ترک قوم تھی اور کلی طور پر ترکی غلاموں اور خلجی سپاہیوں پر حکومت اور فوج کے نظام کے لئے اعتماد کرتے تھے۔ گنگ ۔۔ گویا امورِ سلطنت ترکوں کے ہاتھ اور امورِ فوج خلجیوں اور افغانوں کے ہاتھ میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد غوری کے عہد سے خلجی ہندوستان کی تاریخ میں نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ مثلاً محمد غوری کے عہد میں محمد بختیار خلجی غزنی میں فوج کی بھرتی کے محکمہ کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ اس سے خلجیوں کا اثر اور پھر ان کا غزنی کے صدر مقام میں (جو اب تک خلجیوں کی قوم کی سکونت کا مرکز ہے) فوج کے بھرتی کا محکمہ کا حاکمِ اعلیٰ ہونے سے ان کے اثر و رسوخ کا پتہ چلتا ہے۔

بختیار خلجی اپنی ترقی کی خاطر دہلی چلا آیا۔ وہاں سے اس کو اودھ میں جاگیر مل گئی۔ اور وہ بہار کے ہندو راجہ سے مقابلہ کرنے کے لئے وہاں تعین کیا گیا۔ اس کی شہرت اور آوازہ سن کر خلجی قوم کے بہت سے لوگ اس کے پاس پہنچے اور وہ تمام بہار اور بنگال کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا وہ عملاً خود مختار حاکم ہو گیا۔ اور سب بڑے عہدوں پر خلجی قوم کے افراد کو مقرر کر دیا۔ اس نے تین سال سنہ ۱۲۰۲ء سے سنہ ۱۲۰۵ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد دو خلجی امیر ہوئے اور آخری کو سلطان التمش نے سنہ ۱۲۲۶ء میں ختم کر دیا۔ اس طرح پہلی نیم آزاد خلجی حکومت ۲۵ سال تک رہی۔ ان کی اس ریاست کی وجہ سے خلجی قوم کا زور وہاں رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں شیر شاہ نے بھی اس خطہ سے طاقت حاصل کر کے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغلوں کے زمانہ سے بہت پہلے خلجی اور افغانوں کا بہار اور روہیل کھنڈ میں ایک خاص تاریخی دور رہا ہے۔ ان کے علاوہ دو اور خلجی سلطنتیں ہندوستان میں تھیں۔ دہلی میں ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء اور مالوہ میں سنہ ۱۴۳۵ء سے سنہ ۱۵۱۰ء تک جس کا

ہندو ہیں۔ اس فقرے میں مسلمان اور افغان کی تفریق معنی خیز ہے۔

العتبی مورخ عہد غزنوی گیارھویں صدی کے شروع میں لکھتا ہے کہ افغان محمود کی فوج میں شامل تھے اور مسعود (پسر محمود) اپنے لڑکے کے ذریعہ غزنی کے نزدیک پہاڑوں میں رہنے والے افغانوں پر فتح پانے کے لئے فوج کشی کی۔ البیرونی اپنی تاریخ الہند (سنہ ۱۰۳۰ء) میں لکھتا ہے:۔ ہندوستان کے مغربی کوہستان میں افغانوں کی بہت سی قومیں مسکن پذیر ہیں اور وہ سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے اوراق میں وہ ان قبائل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ جنگجو وحشی قبائل ہندوستان کی سرحد سے لے کر کابل تک آباد ہیں۔ مزید وہ لکھتا ہے۔ "یہ قبائل ہندو ہیں" کابل کے حکمران اس وقت ہندو تھے ان کا دارالخلافہ "ہنڈ" تھا۔ بہت سی جگہ پر وہ گندھارا اور وادیٔ پشاور کا ذکر کرتا ہے جس کو وہ قندھار کہتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبائل ان علاقوں میں آباد تھے اور مسلمان نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی وہ کسی کے ماتحت تھے پختون یا پشتون نام اس وقت تک رائج نہ ہوا تھا۔

افغانوں کا عہدِ عروج

ترکی نسل کے محمود غزنوی کی حکومت سنہ ۹۶۲ء سے لودھی کی شکست اور بابر کے عہد ۱۵۲۶ء کے آغاز اور پھر شیر شاہ سوری سنہ ۱۵۳۹ء۔ ۱۵۵۵ء تک کا عرصہ افغانوں کے عروج، ملکی اثرات و غلبہ اور ان کے مسلمان ہونے اور پٹھانوں کے قیامِ سلطنتِ ہندوستان (نہ کہ آبائی وطن میں) کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ کی پہلی دو صدیوں میں مرکزِ حکومت غزنی رہا اور آخری تین صدیوں میں دہلی و ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں۔ ان دونوں زمانوں میں افغان مسلمانوں کے ہراول دستہ میں رہے۔ پہلے بطور تنخواہ دار ملازموں کے اور بعد میں خود صاحبِ حکومت ہونے کے۔ اس تمام عرصہ میں ان کے آبائی وطن پر نہ کسی نے باہر سے حملہ کیا اور نہ ہی خود انہوں نے منظم حکومت قائم کی۔ اور اس عرصہ میں ان کا آبائی وطن مختلف قبیلوں کی پرورش گاہ رہا۔ جہاں سے جنگ آزما سپاہی مہیا ہوتے رہے۔ البیرونی نے ان کا مسکن دسویں صدی کے آخر میں کابل اور دریائے سندھ کا علاقہ بیان کیا ہے اور اسی زمانہ میں وہ مسلمان ہوئے۔ اس تمام زمانہ میں صرف لودھی اور خلجی قوم کا نام تواریخ میں ملتا ہے۔ سبکتگین ہی نے پہلے پہل کابل اور گندھارا کے ہندو خاندان کو نکالنے کا بندوبست کیا۔ افغان اور خلجی بے شمار تعداد میں اپنی فوج میں بھرتی کئے افغان اور خلجیوں نے اس کی خدمت میں جسم و جان قربان کر دئے۔ ان اقوام کی فوجوں کے ساتھ اس نے جے پال دو دفعہ لغمان اور ننگرہار میں شکست دی۔

عظیم الشان دارالخلافہ مانڈو اب بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ وادی نربدا کے اوپر کھڑا ہے۔

خاندانِ غلاماں کے عہد میں بھی اصلی اختیار اور حکومت خلجی اور افغان فوجیوں کے ہاتھ میں تھی۔
سلطان کیقباد کی موت کے بعد ترکوں کا چراغ گل ہو گیا اور خلجی کا عروج شروع ہوا۔ جلال الدین خلجی فیروز شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ چھ سال تک حکمران رہا۔ اس کے بعد علاؤ الدین خلجی زبردست مطلق العنان بادشاہ ہوا ہے اور اس کے زیرِ نگین ہندوستان کا اتنا حصہ تھا کہ نہ اس سے پہلے اور نہ بعد مغلوں کے وقت میں ہوا۔ جہاں تک کہ انگریزوں کے وقت میں بھی اتنا ہی ملک یک جا ہوا۔ اس نے ایسے نظام ملکی و مالی کی بنیاد رکھی جس کو بعد میں شیر شاہ اور اکبر نے تکمیل تک پہنچایا۔

خلجی سلطنت کا خاتمہ ۱۳۲۱ء میں مبارک شاہ کے قتل سے جو اس کے اپنے منظورِ نظر نو مسلم خسرو خان کے ہاتھوں ہوا، ہو گیا۔ میری تحقیق کے مطابق خلجی اور موجودہ غلجی ایک قوم ہیں۔ خوشحال خان خٹک (۱۶۶۵ء) میں کہتا ہے۔ ؎

بیا سلطان جلال الدین پہ سر پر کبا ست　　　　چہ پہ اصل کنس غلجی دولایت ؤو

خوشحال خان ۱۶۶۵ء میں ہوا ہے اس کو یقین تھا کہ وہ خلجی اور موجودہ غلجی ایک ہی ہیں۔ لہٰذا خلج اور موجودہ غلجی ایک ہیں۔ اور ترکوں کی نسل خلج سے ہیں۔ یہ خلج سفید ہن کی ایک شاخ ہیں۔ جو افغانستان کے کوہستانوں میں پانچویں صدی عیسوی میں آگئے۔ صدیوں تک پختنہ (پشتونوں) کے نزدیک رہتے رہے۔ ان کے اطوار اور زبان کو اپنا لیا۔ اگرچہ کچھ اختلاف اب تک ان میں موجود ہے۔ چنگیز خان کے حملے ۱۲۲۰ء سے تیمور کے حملہ ۱۳۹۶ء تک اور اس کے بعد بھی پٹھانوں کے تاریخی کارنامے زیادہ تر ہندوستان ہی میں تھے بہ نسبت ان کے اپنے ملک کے۔

۱۳۳۳ء میں ابن بطوطہ جب کہ وہ غزنی سے کُرم ایجنسی کی طرف آ رہا تھا۔ بریوب کے علاقہ میں رہزنوں نے اس پر حملہ کیا۔ ان رہزنوں کو وہ افغان بتلاتا ہے۔ تیمور نے ۱۳۹۸ء میں کوہستان کے افغانوں پر حملہ کیا۔ اور ہندوستان کے حملہ میں لودھی اور شیرانی قبائل کو ساتھ لے کر دہلی فتح کی۔ لودھی غلجی ہیں۔ ان کی حکومت دہلی ۷۵ سال ۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء تک رہی۔ بہلول لودھی نے ایک فرمان افغانوں کو بھیجا جس میں لکھا کہ دہلی پر سلطنت وہی قوم کرے گی جس کے ساتھ سرحدی اقوام ہوں گی۔ اس واسطے ہر افغان کو اپنے لواحقین کے ساتھ جو اپنے وطن میں عُسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہندوستان آجانا چاہئے اور اپنی حالت کو بہتر بنا لینا چاہئے اور قومی حکومت کو دشمنوں کے مقابلہ میں مدد دینی چاہئے۔ اس پر بہت افغان قبیلے وارد ہند ہوئے۔ یہ فرمان شیر شاہ سوری کی تاریخ مولفہ عباس سروانی میں

درج ہے۔ جو قومیں اس فرمان پر ہند آئیں وہ سب غلجی قوم کے قبیلے تھے۔ لودھی، لوہانی، نیازی، مروت اور بیٹنی تھے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بہت سے سربنی اور کچھ کرلانٹری بھی تھے۔
بعد کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ سربنی، قبیلہ یوسف زئی، مندڑ، کرلانٹری بنگش اور اورک زئی تھے۔ انہی لوگوں میں ابراہیم سوری (لودھی قبیلہ کی شاخ) شیر شاہ کا دادا بھی تھا۔

پٹھان قوم کی سیرت

سور خاندان کی کہانی سے پٹھان قوم کے کریکٹر پر صحیح روشنی پڑتی ہے۔ ایک لیڈر اٹھتا ہے۔ جو اپنی عظمت اور بڑائی کی وجہ سے لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ اور ان کے قبائلی و ذاتی عناد و مخالفت کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے۔ اس یگانگت و اتحاد سے فتح کی خوشی کا اثر پیدا ہو جاتا ہے لیکن جونہی وہ لیڈر مر جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سب نظام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ قبائلی جھگڑے اور عداوتیں پھر سے شروع ہو جاتی ہیں اور حاصل شدہ عظمت پاش پاش ہو جاتی ہے۔
پٹھان قوم اپنی جبلت کے لحاظ سے سخت انفراد پسند، آزاد طبیعت اور خودسر واقع ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کبھی بھی طویل عرصہ کے لئے اتحاد پر قائم نہ رہے۔ یہاں تک کہ ان کی خالص آبادی کا بڑا شہر آج تک نمودار نہ ہوا۔ ان کے الگ الگ گاؤں (چند گھر) افراد کے نام پر بنتے رہے۔ یعنی فلاں کی کلی (شخصی)، ان کی عصبیت اول خاندانی اور قبیلہ وار ہے۔ قومی عصبیت گاہ گاہ ہی عارضی طور پر ظاہر ہوتی رہی۔ قدرت نے ان کو چند بہترین صلاحیتوں سے جو حکمرانی کے لئے ضروری ہیں نوازا ہے۔ لیکن ذاتی اور قومی کمزوریوں نے ہمیشہ ان کی ترقی کا راستہ روکے رکھا۔
الفنسٹن اپنی کتاب سلطنتِ کابل مطبوعہ لنڈن ۱۸۴۲ء پہلی جلد کے صفحہ ۲۳۱ پٹھانوں کی عادات و اطوار کے متعلق ایک عمر رسیدہ پٹھان کے قول کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔ "ہم نا اتفاقی پر مطمئن رہ سکتے ہیں ہم خطرے سے بے پرواہ رہ سکتے ہیں۔ ہم خون ریزی برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن کسی ایک شخص کی ماتحتی ہمیں کبھی بھی قبول نہیں ہو سکتی۔"
پھر ۲۶۱ پر لکھتا ہے۔ کہ "افغان بادشاہوں کا علم پرور ہونا قابلِ تعریف ہے۔ احمد شاہ ابدالی علم و ادب کا شائق تھا۔ رات کے وقت علماء کی مجلس منعقد کیا کرتا تھا۔ حقانیت، اسلام، توحید اور قانونِ اسلام پر ان مجلسوں میں مباحثے ہوتے۔ آخر میں شعر و شاعری اور دیگر فنون اور مسائل سائنس پر بحث ہوتی۔ یہ مناظرے بعض دفعہ صبح تک جاری رہتے۔

تیمور شاہ نے یہ طریقہ جاری رکھا اور اس کے بعد کے حکمرانوں نے بھی۔ تیمور شاہ ان مجلسوں میں اپنے اشعار بھی سنایا کرتا تھا۔ پھر صفحہ ۲۲۰ پر لکھتا ہے اور مختصراً پٹھانوں کے عادات، اُن کی برائیاں، انتقام، حسد، حرص، جبر ستانی اور ضد ہیں۔ ان کی خوبیاں، آزادی کا عشق۔ دوستوں سے وفاداری ماتحتوں پر مہربانی۔ مہمان نوازی۔ شجاعت۔ بلند ہمتی۔ فیاضی۔ محنت اور ہوشیاری ہیں۔ وہ اپنے قریب جوار کی اقوام کے مقابلہ میں جھوٹ۔ سازباز۔ اور فریب سے کم آشنا ہیں؛ یعنی ان کی خوبیوں کا پلّہ بھاری ہے۔

بابر نے ۱۵۰۵ء میں پشاور فتح کیا۔ واپس کوہاٹ۔ بنگش و بنوں براہ بر مل واپس آیا۔ ہنگو کے نزدیک رئیسان اور استرزئی کے درمیانی درہ میں بنگش پر حملہ کیا۔ وہاں وہ پٹھانوں کے اس رواج کا ذکر کرتا ہے کہ جب قبائل مفتوح ہو کر رحم کی درخواست کرنے کے لئے آتے ہیں تو دانتوں میں گھاس پکڑ کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں تمہارا بیل ہوں"۔

ہزارہ میں ایسے موقعوں کے لئے جو مثل مشہور ہے "منہ میں گھاس اور گلے میں رسی" تو اس کا ماخذ بھی یہی رسم معلوم ہوتی ہے۔ (ش ب)

بابر نے افغان قوم کے قبیلوں کا کم ہی ذکر کیا۔ وہ ان کو افغان ہی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ان گیارہ زبانوں کا جو کابل میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام وہ افغانی لیتا ہے۔ یہ اغلباً اس وجہ سے کہ وہ صرف یوسف زئی قوم سے ہی زیادہ واقف تھا۔ اور یہ قوم اپنے لئے ہمیشہ افغان نام ہی استعمال کرتی رہی۔ اور کبھی بھی اپنے آپ کو پٹھان نہیں کہا۔

بابر کی فوج میں یوسف زئی اور دیگر پٹھان اقوام شامل تھیں۔ قصوریہ پٹھان خویشگی پٹھان ہیں اور محمد زئی کی شاخ میں ان کی روایت کے مطابق وہ بابر کے ساتھ ہندوستان گئیں۔ اس نے ان کو وسطی پنجاب میں زمینیں بطور جاگیر دیں۔ جو ستلج کے دونوں کناروں پر ہیں۔

پٹھانوں کی حمایت بابر کو حاصل تھی۔ اس کا ثبوت خوشحال خٹک کا یہ شعر ہے۔

ترجمہ۔ دہلی کا بادشاہ بابر ہو گیا اور یہ کام پٹھانوں کی برکت سے ہوا۔

قندھار۔ وجہ تسمیہ

موجودہ قندھار پرانے گندھارا کے نام پر ہی آباد ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بیلیو کے خیال میں سفید ہن کے حملے سے گندھارا کے لوگ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں بھاگ کر اس مقام پر آباد ہو گئے اور اس کا نام قندھار رکھ دیا۔ یہ لوگ جاٹ اور گوجر اقوام کے جد تھے۔ وہاں پر یہ مسلمان ہو گئے اور پھر

بحیثیت یوسف زئی خیل اور مہمند واپس گندھارا آئے اور یہاں کی آبادی سے جو ایک رنگ میں اُن کے مورث ہی تھے جلد ہی گھُل مِل گئے۔ اس امر کی تصدیق چینی سیاح نے بھی جو سنہ ۵۲۰ء میں گندھارا آیا تھا۔ کی ہے۔ کہ سفید ہنوں نے پانچویں صدی عیسوی میں گندھارا فتح کر لیا تھا اور یہ ہجرت اسی سبب سے تھی۔ بُدھ کا کچکول جو بیلیو کے وقت تک سلطان ولیس کے مقبرہ میں قندھار سے باہر محفوظ تھا اغلباً بدھ پناہ گزین ساتھ لائے تھے۔ بیلیو نے یہ کچکول وہاں زیارت میں خود دیکھا تھا اب یہ کابل کے عجائب گھر میں ہے۔ گندھارا ہی بدھ مت کا مشہور مرکز تھا اور اس بدھ کے کچکول کا قندھار میں ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو وہاں لے جانے والے پشاور گندھارا کے لوگ تھے۔ اور اُن کا قندھار کے لوگوں کے ساتھ تعلق تھا۔

اقوام افغان کی اصلیّت

اللہ بخش یوسفی صاحب مرحوم اپنی کتاب "یوسف زئی" صفحہ ۸۹۶ پر تحریر فرماتے ہیں۔

عربستان کا علاقہ ابتدائی تہذیب انسانی کا گہوارہ تھا۔ ریگستانِ عرب سے ہجرت کی مختلف لہریں اٹھیں اور مختلف اطراف میں پھیل گئیں۔ یہ عرب سامی الاصل تھے۔

یہ قبائل کوئی تین ہزار سال قبل از مسیح سرحد ہند تک پہنچ چکے تھے جب کہ آرین کے متعلق اب قریب قریب تمام مورخ متفق ہو چکے ہیں۔ کہ ڈیڑھ ہزار ق م سے اس طرف آئے تھے۔ گویا اب مورخین میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں کہ آرین سے صدیوں قبل دوسرے غیر آرین قبائل سرزمین افغانستان و ہندوستان پر آباد دکھائی دے رہے تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنی کتاب تاریخ افاغنہ میں افغانوں کے متعلق وہ تمام احوال بیان کر دئے ہیں جو اس ملت کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی حمایت میں تھے۔ کوئی ایک دلیل بھی ان کے آرین ہونے کی ضبطِ تحریر میں نہیں لائے اور بالآخر اپنی رائے میں لکھا تو اسی قدر کہ یہ قوم اپنی نسل کے اعتبار سے ایرانی ہے۔

امیر عبدالرحمٰن خان کی سوانح زندگی (مطبوعہ لندن) کے مصنّف نے لکھا ہے۔ افغان مورخین کی رائے میں افغان بنی اسرائیل تھے"۔ دوست محمد خان کامل اپنی کتاب "خوشحال خان خٹک" کے صفحہ ۱۹۶ پر تحریر فرماتے ہیں۔ آغز خان حاکم جلال آباد نے ننگرہار میں قلعہ آغز آباد جون ۱۶۷۶ء کے قریب تعمیر کیا۔ اس پر تمام افغانوں نے حملہ کر دیا۔ خافی خان کے مندرجہ ذیل اشعار اس واقعہ کے متعلق قابلِ غور ہیں۔

حصارے دراں عرصہ بنیاد کرد ۔۔۔ باندک توجہ قلعہ آباد کرد

چوں آں قلعہ گردید آنجا تمام | شدش زاں سبب آغر آباد نام
افاغین ز ہر سو برانگیخت سر | ہمہ بستہ بر خونِ آغر کمر
ز حدِ اٹک تا حدِ قندھار | پدید آمدہ لشکرے بے شمار
ہمہ جمع گشتند بہرِ مصاف | تو لشکر مگو بلکہ یک کوہِ قاف
مسلح ہمہ گشتند بہرِ کیں | رسیدند بر حدِ لمغاں زمین

ترجمہ: آغر خان اس میدان میں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی جو تھوڑی توجہ سے آباد ہوگیا۔ جب وہ قلعہ مکمل ہوگیا تو اس کا نام آغر آباد رکھا گیا۔ اس پر ہر طرف سے افغانوں نے سر اٹھایا اور آغر کے قتل پر کمر ہمت باندھی۔ اٹک سے قندہار تک ایک بے شمار لشکر ظاہر ہوگیا۔ سب لوگ جنگ کے لئے جمع ہوگئے یہ ایک لشکر نہ تھا۔ بلکہ ایک کوہِ قاف تھا۔ دشمن کے لئے سب ہتھیار بند ہوگئے۔ اور لمغان کے علاقہ کی حد پر جمع ہو کر پہنچ گئے۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افغان اس وقت قندھار سے اٹک تک آباد تھے۔ ان کا قومی نام اس وقت بھی افغان تھا۔ جس میں سب باشندگان روہ (کوہستان) شامل تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰ پر "کابل میں سات سال" میں پشتون قوم کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔۔۔۔۔۔ "گو اس قوم میں مختلف عناصر مخلوط ہیں۔ جیسے ترک، ایرانی، یونانی، ارمنی ۔۔۔۔۔۔ یہودی، عرب وغیرہ اور ان سب قوموں کے آثار ان کے ہاں ملتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم تحقیق کرسکے اس قوم کو ہندی قدیم اقوام کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ اور پشتو کو سنسکرت کے فروع میں سے جانتے ہیں۔ تاریخی عینی اور کامل ابن الاثیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی قومیں اس وقت سلطان محمود کی فوج میں داخل ہوئیں جب کہ سلطان نے جے پال راجہ لاہور کو شکست دے کر لغمان کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ جہاں پر اس وقت تک ہندو بُت خانے موجود ہیں۔ انہوں نے شہاب الدین غوری کے زمانہ میں اسلام قبول کیا۔

پٹھانوں کے بعض قبائل ایسے ناموں سے مشہور ہیں۔ جن ناموں کی ہندو قومیں ہند میں بستی ہیں۔ جیسے بھڑایچ۔ لودھی۔ ایک ہی قبیلہ کاکڑ کے افراد جو قندھار میں بستے ہیں۔ مسلمان ہیں اور جو بلوچستان میں رہتے ہیں ہندو ہیں

پشتو زبان

ہیروڈوٹس جو غالباً پہلا یونانی مورخ ہے۔ جس نے ۴۵۰ق م میں پٹھان کے چار قبیلوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نے ان کی زبان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

فارسی زبان پہلوی زبان سے نکلی ہے۔ یہ پہلوی زبان دارا کے وقت میں بولی جاتی تھی اور اخمینی بادشاہوں کے وقت رائج رہی۔ زرتشت کی کتاب ژند اوستا اسی زبان میں تھی۔ اور اسی زبان سے پشتو زبان بھی نکلی ہے۔ پشتو ۵۵۰ سے ۳۳۰ ق م۔ زمانہ سلطنت اخمینی میں پروان چڑھی ہوگی۔ سولھویں صدی کے آخر میں پشتو تحریر کا پتہ چلتا ہے۔ خاص کر نظم کا۔ ۱۴۶۵ء (جب پٹھان قوم تاریخ میں نمودار ہوتی ہے) سے ۱۵۶۰ء تک پٹھانوں کی تحریر کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ سولھویں صدی کے نصف میں دو مذہبی رہنماؤں اخوند درویزہ اور پیر روشن کا نام تاریخ کے صفحات پر ملتا ہے جنہوں نے ایک دوسرے کا مقابلہ تلوار کی بجائے قلم سے کیا جس کی وجہ سے پشتو میں کافی تحریری مواد جمع ہوا۔ اخوند درویزہ کی تحریر مقفیٰ نثر میں ہے اور پیر روشن نے نظم میں بھی بہت کچھ لکھا۔ پیر روشن کا بھتیجا مرزا انصاری پہلا پشتو کا شاعر ہے جس نے نظم لکھی۔ اس کے بعد پیر محمد کاکڑ۔ خواجہ محمد بنگش۔ اور دوسرے شعراء پیدا ہوئے۔ سترھویں صدی کے شروع میں خوشحال خان خٹک۔ رحمان بابا۔ حمید علی خان۔ حفیظ اور دیگر مشہور شعراء پیدا ہوئے۔ انہوں نے پشتو زبان کی خوب خدمت کی اور اس کو سنوارا

پٹھانوں کی زبان

ساکا قوم بدویانہ عادات کے حملہ آور تھے جب وہ گندھارا میں آئے تو اس علاقہ پر ایرانی اثر صدیوں سے موجود تھا۔ پھر اس پر موریا (ہندوستانی) اثر ایک سو سال رہا۔ اور ایک سو سال یونانی اثر رہا۔ اس علاقہ پر صرف ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں ہی نے اثر نہیں کیا بلکہ ان کی فوجیں ایک دوسرے پر مخالف سمتوں سے چڑھائی کرتی رہیں۔ گندھارا۔ ایران اور ہندوستان کی سرحد پہ دونوں سے ملحق تھا۔ لہٰذا ہندوستانی اثر بھی اس کی زبان پر پڑا۔ مثلاً پشتو میں ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ ښ اور مذکر و مونث اور فعل ماضی کی ساخت ہندوستانی زبان کا اثر ہے۔ لہٰذا ان کی زبان پر بوجہ محل وقوع، ایرانی زبان اور ہندوستانی زبان کا اثر ہے لیکن اول الذکر کا اثر غالب ہے۔

لفظ خان کی ابتداء

سیفہن قوم جو منگولیا پر چوتھی صدی عیسوی میں حکمران تھی اس کے حاکم نے سب سے پہلے لقب خاگان یا خان اختیار کیا۔ ان کی یادگار لفظ خان پٹھان قوم میں باقی ہے۔ اللہ بخش یوسفی صاحب اپنی کتاب "یوسف زئی پٹھان" خان کے لقب کی وجہ حسب ذیل تحریر کرتے ہیں۔

"پٹھان سلطان محمود غزنوی کے وقت مسلمان ہوئے اور اس کے ہمرکاب رہے۔ سومنات پر پٹھانوں کے دلیرانہ حملے نے محمود سے یہ الفاظ کہلوائے کہ خان کہلانے کا مستحق صرف پٹھان ہے۔ اس دن سے پٹھان، خان کہلائے۔ اس سے پہلے یہ لقب صرف ترک یا تاتاری ہی استعمال کرتے تھے۔

بہت سے الفاظ ترک حملہ آور منگولیا سے اپنے ساتھ لائے جو پٹھانوں میں رائج ہوئے۔ مثلاً اُلوس (قوم)، بُرامتہ (اپنے نقصان کی تلافی کے لئے مخالف قوم کے آدمیوں یا ریوڑ کو پکڑ لینا) اور حشر (فصل کے کاٹنے یا کسی دوسرے کام کے لئے لوگوں کو اکٹھا کر کے کام کروانا) یہ الفاظ پشتو میں عام طور پر رائج ہیں لیکن ایرانی زبان میں نہیں۔

زمانہ قدیم کی زبان

کیرو، پٹھان

وادی ٹوچی میں مسلمانوں کے وقت کی سب سے پہلی تحریری تختی ملی۔ جو ایک مکان کی تھی اس پر سنہ ۲۴۳ھ (۸۵۷ء) کندہ ہے۔ اور اس پر سنسکرت زبان، ناگری اور کوفی عربی دونوں حروف میں تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ تک ٹوچی میں دونوں زبانیں رائج تھیں۔

پٹھانوں کی زبان۔ مزید تحقیق۔ مسٹر اے۔ این مچل ہوم سکرٹری صوبہ سرحد نے زبان پشتو اور اس کے مدارج ترقی پر ایک تقریر ریڈیو پشاور پر کی تھی۔ اور جو انگریزی اخبار خیبر میل میں ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء میں چھپی۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"یہ عام طور پر معلوم ہے کہ یورپ اور کافی حصہ ایشیا کی زبانیں آریائی زبان سے جس کے بولنے والے LAKEVAN کے جنوب میں رہتے تھے نکلی ہیں۔ جب ان لوگوں نے پہلے پہل نقل مکانی کی تو خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جیحوں اور سیحوں دریاؤں کے کناروں پر جا بسے۔ پھر ان دریاؤں کے منبعوں کی طرف چل پڑے۔ ان میں سے ایک گروہ جنوب کی طرف گیا اور کوہ ہندوکش کو عبور کر کے دریائے کابل کی وادی میں اور بعد میں ہندوستان جا پہنچا۔ جہاں پر وہ موجودہ ہندی آریائی زبانوں کے موجد بنے۔ دوسرا گروہ مشرق و مغرب دونوں طرف پھیل گیا۔ اس گروہ کو ایرانی گروہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ ایرانی بھی اصل میں آرین ہے۔ موجودہ ایرانی زبان کی شکل اتنی صاف نہیں اور اس سے مختلف آریائی زبانوں کے خاندان کی مشابہت ظاہر نہیں ہوتی۔

وہ آریائی گروہ جو مشرق کی طرف گئے اب تک پامیر کے علاقہ میں موجود ہیں۔ اور ان کی نقل و حرکت کے قافلے اور مشرق کی طرف بڑھے کیونکہ سر آرل سٹائن کی دریافت سے بہت پرانے کاغذات وسطی ایشیا میں ملے ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے جو گروہ مغرب کی طرف تقریباً سنہ ۱۵۰۰ ق م میں گئے وہ مشرقی

ایران میں بس گئے جہاں سے ان کی زبان تمام ایران میں اور موجودہ افغانستان اور بلوچستان میں پھیل گئی۔

ایرانی قوم بہت سے قبائل میں تقسیم تھی کتبہ دارا شاہ ایران سنہ ۵۲۲-۴۸۶ ق م میں کم از کم بارہ قبائل کا ذکر ہے۔ یہ سب مختلف زبانیں بولتے تھے لیکن کتبہ کی تحریر جو یقیناً سرکاری دفتری اور دارالخلافہ کی پرانی فارسی زبان میں ہے اوستا کی زبان سے بہت مختلف ہے۔ اوستا پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے۔ یہ مذہبی کتاب مشرقی ایرانی زبان (آرین) میں ہے جو باختر میں بولی جاتی تھی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھ لینی چاہئے کہ سرکاری ایرانی زبان کے علاوہ غیر ایرانی زبانیں بھی وہاں موجود تھیں۔ شروع شروع میں آریائی زبان کی ہندی آریائی شاخ اور ایرانی شاخ میں بہت مشابہت تھی۔ سر جارج گریرسن کے بیان کے مطابق چند اصول و تلفظی تغیرات کے ساتھ اوستا کی زبان کو ویدک سنسکرت میں ڈھالا جا سکتا ہے لیکن دونوں زبانیں آہستہ آہستہ اپنے بولنے والوں کی خصوصی عادات کے مطابق ایک دوسرے سے دور ہوتی گئیں۔ سنسکرت کا س (S) قدیم ایرانی میں ہ (H) ہے مثلاً سنسکرت کا سندھو اوستا کا ہندو ہے جو دریائے سندھ کا نام ہے۔ قدیم ایرانی زبان بتدریج پہلوی سے جو ساسانی عہد (تیسری سے ساتویں صدی عیسوی) کی زبان ہے۔ گزرتے ہوئے موجودہ ایرانی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ غیر آریائی قدیم زبان کو سہولت کی خاطر میدی زبان کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بولنے والے مید مشہور ہیں۔ حقیقت میں یہ مید صرف شمال مغربی ایران ہی میں جس کو میدیا کہا جاتا ہے موجود نہ تھے بلکہ سب ایران میں پھیلے ہوئے تھے۔

ایک دلچسپ تفصیل اس زبان کے متعلق ہیروڈوٹس (سنہ ۴۳۰ ق م) سے نقل کی گئی۔ اس کے وقت میں میدی زبان کتے کو ناکا (NAKA) کہتے تھے جو (ETYMOLOGICALLY) اُرمڑ زبان کے سپاک (SPAK) اور پشتو کے سپئے (SPAI) سے بہت ملتی ہے۔ میدی زبان کی اہمیت اس میں ہے کہ اس زبان میں اوستا لکھی گئی تھی۔ یہ زبان کئی صدیوں تک چھٹی صدی ق م سے جاری رہی۔ لیکن یہ بدقسمتی ہے کہ ایرانی زبان نے اس کو علمی درجہ سے نکال دیا۔ اور اب ہمارے لئے کوئی تحریری ثبوت جو اس پرانی میدی زبان کا تعلق اس سے نکلی ہوئی موجودہ زبانوں سے جوڑ سکے نہیں ملتا جس طرح کہ پہلوی زبان پرانی ایرانی اور موجودہ ایرانی زبان کے درمیانی زنجیر کے طور پر جوڑ رہی ہے۔

میدی زبانیں آہستہ آہستہ مختلف زبانوں میں بٹ گئی ہیں۔ جن میں سے موجودہ بلوچی اُرمڑی اور پشتو ہیں۔ اگرچہ میرے موضوع سے یہ بات باہر ہے تاہم یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ یہ تینوں زبانیں بہت سی موجودہ ایرانی زبانوں (بولیوں) جن میں بہت مشہور کردستان کی بولی ہے۔ کے ساتھ

افغان کی اصلیت - مزید تحقیق

اسلامک کلچر حیدرآباد دکن جلد ۲ ص ۱۴۳ از حسن امام الدین۔

افغان نام بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر تاریخ ابو الفدا (تصنیف ۲۵۵ھ تا ۲۶۹ھ) میں ملتا ہے۔ العتبی نے اپنی تاریخ یمینی میں لکھا ہے کہ سبکتگین نے افغان اور خلجی کو فوج میں بھرتی کیا اور سلطان محمود جب قنوج کو فتح کر کے واپس آیا تو اس نے شاہراہ عام کی ڈاکو قوم افغان پر حملہ کیا۔ اور بہت سے مردوں کو قتل کر کے غور کو واپس گیا۔

بیہقی (ساتویں صدی ہجری) اپنی تاریخ کے صفحہ ۳۱۶ میں افغان شال کا نام لیا ہے۔ روضۃ الصفا، کے مصنف (آٹھویں صدی ہجری کی تصنیف) نے لکھا ہے کہ سبکتگین نے افغانوں کا ملک فتح کیا۔

البیرونی نے افغانوں کا ذکر ایک دفعہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہندوستان کے مغربی سرحدی پہاڑوں میں افغانوں کی بہت سی قومیں بستی ہیں۔ اور ان کے حدود وادی سندھ تک چلے گئے ہیں۔

طبقات ناصری کا مصنف منہاج السراج بیان کرتا ہے کہ الغ خان نے میوات راجپوتانہ کی پہاڑی اقوام کو تین ہزار بہادر افغانوں کے ساتھ فتح کیا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ خاندان شنسبانی کے دور حکومت میں غور کے علاقہ میں ایک قوم جس کو بنی اسرائیل کہا جاتا تھا آباد تھی اور اس کے بہت سے لوگ ملحقہ ملکوں میں دور دور تک تجارت کے لئے جاتے تھے۔

ابن بطوطہ بھی اسی قوم کا ذکر کرتا ہے۔ ملفوظات تیموری۔ ظفر نامہ۔ اور مطلع السعدین میں بیان ہے کہ تیمور نے اوغان اقوام کے ملک کو جو کوہ سلیمان میں رہتی تھیں۔ تاخت و تاراج کیا۔ افغان فارسی لفظ ہے اور اوغان سے مشتق معلوم ہوتا ہے لیکن افغان اور اوغان خود کسی اور لفظ سے مشتق معلوم ہوتے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کا مصدر غالباً پہلوی لفظ اوگان ہے۔ سب سے پہلے ابو الفدا نے اپنی عربی تاریخ (۲۵۵ھ تا ۲۶۹ھ) میں لفظ افغان استعمال کیا ہے جو کہ اوگان (پہلوی) کا معرب معلوم ہوتا ہے۔ اس لفظ کو ترکی میں اوغان کہا گیا ہے۔

فریدوں کے زمانہ میں ایک مشہور اور نامور پہلوان بنام اوگان تھا۔ اور بہادر و دلیر لوگوں کو اس کے نام سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں مشہور بہادروں کو اوگان سے تشبیہ دی ہے

ے مطبوعہ نول کشور جلد ۴ ص ۳۲ ے سچاؤ۔ البیرونی کا ہندوستان جلد ا ص ۲۰۰ ے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ص ۱۵۱ ے بیلیو اقوام افغانستان باب ۳ ص ۵۱ ے گب ابن بطوطہ ص ۱۸۰ ے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول ص ۱۵۲۔

چونکہ یہ قوم بہت دلیر اور بہادر تھی اور اس قوم کے دو مشہور پہلوانوں برقیل اور برمیل کو فریدون کے مشہور پہلوان اوگان سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

افغانوں کی اصلیت کے متعلق بہت مختلف رائیں ہیں لیکن اکثر مورخ مشرقی و مغربی۔ ان کو بنی اسرائیل خیال کرتے ہیں۔ اپنی رائے کے اظہار سے پہلے عہد قدیم کے مسلمان مورخوں کی رایوں کا خلاصہ پیش کروں گا۔ جنہوں نے فارسی انگریزی اور پشتو میں تاریخیں لکھیں۔ تقریباً سب مشرقی مورخین افغانوں کو یہودی النسل بموجب ان کے اپنے بیان تسلیم کرتے ہیں اور اس کی تائید موجودہ مورخ کرتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کی تردید کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم تین مورخوں فرشتہ۔ نعمت اللہ اور اخون درویزہ کی رائے معلوم کرتے ہیں۔ جو ہم عصر تھے۔ نعمت اللہ اور اخون درویزہ ان کو بنی اسرائیل تسلیم کرتے ہیں۔ فرشتہ بموجب مطلع الانوار کے ان کو قبطی کہتا ہے۔ یعنی قوم فرعون کے وہ افراد جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے وہ ہندوستان کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور کوہ سلیمان میں آباد ہو گئے۔ یہاں ان کی آبادی بہت ہو گئی اور افغان کہلائے۔ لیکن اس کی تائید اس کے معاصرین نہیں کرتے۔

ملک احمد ملقب بہ خان جہاں لودھی نے اپنے معتمد عالم، افغانوں کے قدیم اور جدید وطن میں ان کے حالات کو جمع کرنے کے لئے بھیجے۔ اور یہ معلومات اس نے کتاب مراۃ الافغانی میں تحریر کئے۔ اس میں وہ ان کو بنی اسرائیل کہتا ہے۔ مطلع السعدین ان کو ترک یا مغل کہتا ہے لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے۔ کیونکہ اصلی افغان بموجب مشرقی مورخین کی رائے کے۔ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے اس واسطے یہ وہ افغان نہیں ہو سکتے۔ جن کا ذکر مطلع السعدین یا جامع التواریخ میں ہے۔ یورپین مورخین کے اس بارے میں دو گروہ ہیں۔ ایک ان کو بنی اسرائیل کہتا ہے تو دوسرا ان کو آرمینین یا آرین۔ ان کو آرمینین کہنے کے لئے تو قطعاً کوئی ثبوت نہیں۔ جو ان کو آرین کہتے ہیں ان کی رائے ہے کہ پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں ہندو سندھ کی وادی سے افغانستان ہلمند کی وادی کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور ان کے طور طریقے راجپوتوں سے ملتے ہیں۔ بیلیو کے خیال کے مطابق سربن سوریہ بنس کی ہی شکل ہے۔ اور اسی طرح اس کے لڑکوں کرشیون شرجیون اور اس کے پوتے شیورانی کے نام راجپوتوں اور برہمنوں کے عام نام، کرشن، شرجن اور شیو رام یا شیورانی کے تبدیل شدہ شکلیں ہیں۔

بیلیو کا خیال ہے کہ افغان یہودیوں سے، بہ نسبت راجپوتوں کے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں لیکن یہ لفظی قیاس ان کو راجپوت نسل کی اولاد ثابت نہیں کر سکتا۔

ے انگریزی راورٹی نوٹس آن افغانستان اور بلوچستان ص ۳۴۴ ے تاریخ افغان از ڈارن جلد ۲ ص ۶۸ ے ڈارن جلد ۲ ص ۶۸

کا ایک گروہ مشرق کی طرف آیا تو ہمارے پاس کوئی مضبوط دلیل اس دعوے کو رد کر دینے کے لئے نہیں رہتی
آخر میں وہ لکھتا ہے کہ وہ ماؤنٹسٹوارٹ الفنسٹن کی رائے سے جو اگرچہ معقول ہے اختلاف کرتا ہے۔
ڈاکٹر بیلیو بھی برن کی تائید کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ افغان جہاں گرد قافلوں میں یہود کی طرح یہ رواج ہے
کہ وہ شادی سے پہلے کچھ مقررہ مدت کے لئے اپنے خسر کی نوکری کرتے ہیں۔ مزید لکھتا ہے کہ یہ قوم بہت
سرکش اور گناہ کرنے پر بہت جری مثل پرانے یہودیوں کے ہے لہذا یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ
وہ یہود سے نفرت بھی کریں اور اپنے آپ کو بغیر کسی وجہ کے بنی اسرائیل کہیں۔ ڈاکٹر پینیل لکھتا
ہے کہ جو کوئی اس کے افغان بیماروں کو ہسپتال میں دیکھے گا وہ یقینی طور پر ان کو یہود سمجھے گا۔ اس
نے اور باتوں کے علاوہ مندرجہ ذیل دو رسموں سے جو افغانوں میں رائج ہیں۔ مگر اور مسلمانوں میں نہیں
ہیں۔ ان کے بنی اسرائیل ہونے پر استدلال کیا۔

PENNELL AMONG WILD TRIBES OF AFGHAN FRONTIER PP 30-32
BELLEW TRAVELLING MISSION OF HAKISTAN PP 27-146

ا۔ قحط پڑنے پر اس کے اثر سے بچنے کے لئے یہ ایک بکری یا بھیڑ ذبح کر کے اس کا خون اپنے
دروازوں پر اور صحن میں چھڑکتے ہیں (۲) اپنے گناہوں کے کفارہ کے لئے یہ لوگ ایک بچھڑے کو آزاد
پھرنے دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ رسم اب عام طور پر رائج نہیں۔ بموجب تورات سریانی بادشاہ بخت نصر نے
حملہ کر کے سیریا پر قبضہ کر لیا۔ بنی اسرائیل کو لے جا کر ہرات، ابہر کے علاقہ میں جو دریائے گوزان کے نزدیک
ہے۔ اور میڈیا یا مجوس کے شہروں میں آباد کر دیا۔ آصف اور افغان کے لڑکے سیریا (شام) میں رہتے تھے
لیکن وہ (عزیز اور دانیال) جو موسیٰؑ کے دین پر تھے۔ بخت نصر نے ان کو موجودہ علاقہ کو جہاں وہ اب
آباد ہیں کو بھگا دیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ افغانوں نے موجودہ غور کا نام شام کی ایک وادی کے نام پر رکھا۔
فارلانگ کہتا ہے کہ یہودی دعوے کرتے ہیں کہ وہ ۵۳۶ ق م میں باختر دسری رُود (ہرات) میں مسکن پذیر
ہوئے اور ان کے ڈھائی قبیلے ہرات میں بس گئے۔ طبقات ناصری میں لکھا ہے۔ شنسبانی خاندان کے دور
حکومت میں بنی اسرائیل قوم وہاں تھی جو کہ اردگرد کے ملکوں سے تجارت کرتی تھی۔ اور غور میں مسکن پذیر ہوئی۔
مسٹر بالیسن لکھتا ہے "عبد اللہ خان اور دوسرے افغان مصنفین کے مطابق فیر سیر افغان قوم کو
بنی اسرائیل کے دس گم شدہ قبیلوں سے متعلق سمجھتا ہے۔"

تاریخ افغانستان

سر ولیم جونز (SIR WILLIAN JONES) جو ایک بہت بڑا عالم ہے۔ اور جس نے ایشیائی
سائنسوں کی تحقیق میں بہت کام کیا ہے اس نے ان دس اسرائیلی قبائل کا جو تیرہ سو سال کے عرصہ سے لاپتہ
تھے۔ سُراغ افغانستان کے پہاڑوں تک پہنچایا ہے یہ سراغ اسرائیلیوں کے نشان راہ کا پتہ دیتے ہیں۔

لے اخبار الاولیا، رائل ایکڈیمی آف بنگال قلمی مسودہ نمبر ۳، ۲ صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۷

اُس کی رائے میں یہ قبائل اپنے مسکن یوروشلم اور ارزرات (ارض رات) سے نقل مکانی کر کے آئے ہیں۔
بیلیو کے الفاظ میں اس امر کی تائید ESDRAS اسدراس کے بیان سے ہوتی ہے کہ اسرائیل کے
دس قبیلے قیدی بنا لئے گئے تھے۔ آخر کار وہ بھاگ کر ارزرات کے ملک میں پناہ گزین ہو گئے۔ یہ
ملک آج کل کا ہزارہ جات ہے اور جس کا ایک حصہ غور ہے۔
سید جمال الدین افغانی کہتا ہے کہ جب سکندر اعظم ان کے ملک (ہزارہ جات) سے گزرا تو انہوں
نے اس کا مقابلہ کیا وہ اس جگہ پر شاہ گشتاسپ شاہ ایران کے عہد سے اس علاقہ میں آباد ہیں۔ اور وہ
اپنا خراج شاہنامہ والے رستم کو ادا کرتے تھے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ محمود غزنوی کے عہد سے
بہت پہلے یہ ہزارہ جات کے پہاڑی علاقہ میں اپنے قلعوں میں آباد تھے اور بغیر یہودی قوم کی ہجرت کے
اور کسی قوم کی ہجرت اتنی تعداد میں تاریخ سے ثابت نہیں ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی
ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔
افغانوں کی اصلی زبان عبرانی تھی لیکن آہستہ آہستہ ماحول اور زمانہ نے ان کی زبان کو تبدیل کر کے
پشتو بنا دیا۔ وہ بطور قیدی خراسان کو جلاوطن کئے گئے۔ اور آہستہ آہستہ تورات کا اثر ان پر سے جاتا
رہا۔ ان کا واسطہ وہاں ایرانیوں، عربوں اور تاتاریوں سے پڑا۔ پہلے پہل ان کی آبادی کے گرد ایرانی زبان
بولنے والے لوگ تھے یعنی ہروی، زابلی، دری، سکھزئی زبانیں جو کہ ایرانی زبان کی مختلف بولیاں
ہیں۔ جمال الدین افغانی کے قول کے مطابق پشتو پرانی ایرانی زبان سے ملتی ہے اور اسی بنا پر وہ ان کو
ایرانی النسل سمجھتا ہے لیکن اس کی دلیل کمزور ہے افغان نہ حکمران قوم تھے اور نہ ہی اچھے کاروباری
اس واسطے ان کی عبرانی زبان ترقی نہ کر سکی۔ برخلاف اس کے ان کی زبان پہاڑی آب و ہوا اور گرد و
نواح کی ان ہمسایہ اقوام کی زبان سے اثر پذیر ہوئی جن سے وقتاً فوقتاً ان کے تعلقات پیش آتے
رہے۔ ڈاکٹر ڈارن کا یہ کہنا صحیح ہے: "اس ملک خراسان میں صرف یہی لوگ آباد نہیں ہیں بلکہ اور بھی
مختلف اقوام اس میں آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان (جس کا بنیادی سرمایہ وہی عبرانی ہے) نے باہر
کی اقوام کے الفاظ اور شکلوں کو جذب کر لیا۔ اور خاص کر ایرانی الفاظ کو اپنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ وہ اپنی اصلی زبان آہستہ آہستہ بھول گئے اور اس کی جگہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے تلفظ اور
لب و لہجہ کے ساتھ استعمال کرنے لگے۔ اور اردو زبان کی طرح ایک نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اور یہ
نئی زبان پشتو زبان ہے۔ لیکن ان زبانوں کے الفاظ کا تلفظ ان کا اپنا ہے۔ پشتو اور سریانی زبانوں
کے درمیان کافی مشابہت ہے۔ پشتو زبان میں اب تک عبرانی الفاظ موجود ہیں۔ جو اس بات کی شہادت

دیتے ہیں۔ کہ یہ زبان عبرانی سے نکلی ہے۔ سر ولیم جونز کہتا ہے۔ "پشتو زبان کی جو لغت میں نے دیکھی ہے اس میں (چالڈی) CHALDAICK زبان سے بیّن طور پر مشابہت ہے۔ کچھ عبرانی الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔
قیس۔ شنسب۔ (بنجی، مخفف بنجمن) حرمیل۔ حرقبل۔ غور۔ خیبر۔ پختنہ یا پختون۔ روہ۔ کوہ سلیمان۔ غورے مرغ۔ پشت۔ پشت رود۔ بنیر۔ بودانی۔ سیبی۔ درہ مشکن۔ خاڑہ۔ شلیخ (بمعنی نان عید فسح) تورا۔

آخر میں تمام مورخین کے بیانوں کا نچوڑ یہ ہے کہ افغان بنی اسرائیل ہیں۔ ان کا شجرہ نسب۔ ان کی جلاوطنی اور غربت کی وجہ سے بہت مدت تک نامعلوم رہا۔ اگر ہم ان کو بنی اسرائیل نہ مانیں تو لازماً ہم کو یہ بتانا پڑے گا کہ بنی اسرائیل کے جلاوطن شدہ دس قبائل کی اولاد کہاں گئی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سوائے افغانوں کے اور کسی قوم نے ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ان کے دعویٰ کی تائید ان کا ادب اور ثقافت کرتی ہے۔ ان کی زبان فطرتی ضروریات کی وجہ سے تبدیل ہو گئی۔ لیکن بعض عبرانی الفاظ کی موجودگی پشتو زبان کی اصل بنیاد کا پتہ دیتی ہے۔ اسلام سے پہلے بھی عرب کے یہودیوں اور اس قوم میں آمد و رفت تھی۔ بہت سے یورپی مورخین جو پٹھانوں کو ہرگز بنی اسرائیل نہیں مانتے۔ وہ بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس قوم کی شکل و شباہت اور ناک نقشہ اسرائیلیوں سے ملتا ہے۔ یہ بھی بنی اسرائیلیوں کی طرح لمبے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس کی تصدیق تورات سے ہوتی ہے۔ وہ بہت سی رسومات یہودیوں کی طرح کرتے ہیں۔ وہ یہودیوں کی طرح عید فسح مناتے ہیں۔ جس میں وہ ایک خاص قسم کی روٹی شلیخ تیار کرتے ہیں۔ یہودیوں کی طرح یہ بھی اکثر خود غرض۔ سنگ دل۔ جاہل۔ بد دماغ۔ تُند خُو۔ اور سرکش ہیں۔ لیکن دلیر اور شجاع ہیں۔ ڈاکٹر ڈارن یہ بھی مانتا ہے کہ وہ سیرت اور شکل میں یہودیوں کی مانند ہیں۔ اور وہ کہتا ہے "ان لوگوں کے لئے جو ان کے بنی اسرائیل ہونے کے دعوے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس دعوے کی صداقت کے لئے واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کی سیرت و شکل بیّن طور پر یہودیوں سے ملتی ہے۔

افغان صرف یہی نہیں کہتے کہ وہ بنی اسرائیل ہیں۔ بلکہ اُن کے قبیلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے ناموں سے بھی یہ حقیقت ہوتی ہے جن کو انہوں نے اسرائیل کے بڑے آدمیوں کے نام پر موسوم کیا ہے، مثلاً تخت سلیمان۔ موسیٰ خیل۔ درہ خیبر۔ دواوزی۔ کوہ سلیمان۔ کوہ مری وغیرہ۔

افغانستان اور کشمیر میں بہت سے ایسے شہر ہیں کہ پرانے شام کے مواضعات کے نام پر ان کے نام رکھے گئے ہیں۔ امریکہ کی نئی آبادیوں کے شہروں کے ناموں کی مثال اس حقیقت کو واضح کرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں اور انگریزوں نے اس طرح سے اپنی حبّ الوطنی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ افغان ۲۰۰۰ سال ہوئے کہ افغانستان میں اقامت پذیر ہوئے لیکن جن مقامات کے نام انہوں نے اس وقت رکھے۔ اور جہاں سے ہندوستان پر حملہ آور قومیں وقتاً فوقتاً گزرتی رہیں۔ وہ آج تک اسی طرح قائم ہیں اور ان میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغان اپنے قومی طور و طریق پر متعصبانہ طور پر مستقل ہیں۔

افغان قوم مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کی جاتی ہے۔
۱۔ اسرائیلی۔ جو قوم کا اصلی نام ہے۔
۲۔ پشتون یا پختون۔ یہ نام انہوں نے اختیار کیا۔
۳۔ سلیمانی۔ عربوں کا دیا ہوا نام ہے۔
۴۔ پٹھان۔ ہندوستانیوں کا دیا ہوا نام۔
۵۔ افغان یا اوغان۔ یہ غیر ملکیوں کا دیا ہوا نام۔ خاص طور پر ایرانیوں اور تاتاریوں کا دیا ہوا ہے۔
(اسلامک کلچر)

ضلع ہزارہ کے مقبرے زیارتیں اور درگاہیں

یوں تو ہر گاؤں میں زیارت۔ مزار وغیرہ عام ہیں۔ لیکن چند مشہور اور تاریخی مزارات وغیرہ یہ ہیں۔

تحصیل ہری پور

۱۔ بوہرے والی زیارت۔ برلب نالہ جو بہی موضع موہڑی ملیا۔ یہ شاہ مقبول کی عبادت گاہ مشہور ہے جہاں پر انہوں نے ۱۲ سال عبادت کی۔ ان کا روضہ محلہ ڈبگری شہر پشاور میں ہے لوگوں کا عام عقیدہ ہے کہ اس زیارت پر جانے سے بہت سے امراض سے شفا ہو جاتی ہے۔ ان کی اولاد موضع بھیڈیاں اٹک اور موضع کوکلیہ ہزارہ میں آباد ہوئے۔

۲۔ زیارت شاہ مقصود۔ برلب دریائے دوڑ نزد موضع مقصود واقع ہے۔ یہاں پیر شاہ محمد غازی جو سکھر سے آئے تھے مدفون ہیں۔ زیارت کے ساتھ ایک شفاف پانی کا چشمہ ہے یہ زیارت مرجع خلائق ہے۔

۳۔ زیارت بی بی پرانی ولی (بی پرانی) یہ زیارت ایک کنواری فقیرنی کی موضع دیدڑ بر کنارہ سڑک جرنیلی (حسن ابدال تا ہری پور) پر واقع ہے اور زمانہ شاہان اسلام کے وقت کی ہے اس زیارت

پر ہر اتوار کو بیمار عورتیں (جو مرض پرچھاؤں، پچھاواں سایہ دیو بھوت سے آسیب زدہ ہوتی ہیں) جمع ہوتی ہیں۔ اور تالاب میں نہاتی ہیں۔ اس زیارت کے مجاور کے پاس لوگوں کی دی ہوئی آٹھ کنال زمین بطور سیری برائے خرچ زیارت ہے۔

۴۔ موضع داڑی کی زیارت۔ ہری پور سے ۹ میل نزد موضع کھلابٹ۔ شاہ شیر محمد غازی جو سید کسراں ضلع راولپنڈی سے آئے تھے یہاں مدفون ہیں۔ ہر جمعرات کو آنکھ کے مریض یہاں جاتے ہیں۔ اور زیارت کی پھلاہیوں کے پتوں کی رس آنکھ میں ڈالتے ہیں۔ ہر عید پر میلہ بھی لگتا ہے اور تیتی کھیلی جاتی ہے۔

۵۔ زیارت چھچکہ۔ موضع صوابی میرا کے پاس ہے اور درد قولنج کے مریض ہر جمعرات اس پر حاضری دیتے ہیں۔

۶۔ زیارت سخی حبیب۔ موضع مانک رائے میں ہے۔

۷۔ زیارت موضع جٹو پنڈ۔ ایک فقیر عہد اسلامی میں یہاں آکر اقامت پذیر ہوا۔ ہر جمعرات کو سر درد والے یہاں جمع ہوتے ہیں۔

۸۔ زیارت قاضیاں (نزد ہری پور) یہاں پر میاں عبدالوہاب غازی جو آوان کاری سے یہاں آئے تھے کا روضہ ہے۔ کھانسی کے مریض ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں ان کی اولاد قاضیاں۔ ملک یار اور پڑھانہ میں موجود ہے۔

۹۔ زیارت میاں مردان صاحب موضع درویش میں ہے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ اس زیارت کے تالاب میں نہانے سے خارش دور ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ حضرت حقانی صاحب کی زیارت موضع پہاڑو نزد موضع پنیاں۔ ان کا اصل گھر سید کسراں ضلع راولپنڈی میں تھا۔ یہاں پر معتقد ہر جمعرات کو اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔

۱۱۔ کھرکوٹ زیارت: یہاں پر بابا سجاول المعروف بہ سجالف قوم قطب شاہی آوان کا روضہ ہے۔ جو آوان کاری سے پہلے پکھلی گئے اور پھر یہاں آکر مقیم ہو گئے۔ اولاد نرینہ حاصل کرنے کے لئے ہر جمعرات کو یہاں میلا ہوتا ہے۔ تحقیق الاعوان (مولفہ خواص خان) کے مطابق بابا سجاول مزمل علی کلگاں پسر قطب شاہ کی اولاد سے ہیں۔ ہزارہ کی اعوان برادری زیادہ تر ان کی ہی اولاد ہے۔ مثلاً کھیال۔ شہزال وغیرہ

کھرکوٹ (پہلے بابا صاحب کی وجہ سے کھرے کوٹ ہوگا) در بند روڈ پر ہری پور سے ۱۵-۱۶ میل دور بر لب سڑک ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ بی بی چنن جان کی قبر جیندور تناول میں ہے۔ یہ موضع ان ہی کے نام پر مشہور ہوا۔ کھرکوٹ سے پہلے آپ تحصیل مانسہرہ میں موجودہ نوکوٹ سے متصل شاہ دا گنڈ یا شادو گنڈ

میں مقیم تھے۔ گلی باغ۔ نوکوٹ۔ بھیڑ گنڈ اور شکیاری شاہانِ مغلیہ سے لے کر ترک اور سکھوں کے عہد تک کافی اہمیت و شہرت کے مقام رہے ہیں۔ گلی باغ پکھلی کا صدر مقام رہا ہے۔ نوکوٹ اور بھیڑ گنڈ وغیرہ میں ان میں فوجی کیمپ رہا کرتے تھے۔ بابا سجاول اس مقام سے، چار سو سال ہوتے ہیں۔ اور سید جلال بابا کے پکھلی فتح کرنے سے پہلے کھرکوٹ چلے گئے تھے۔

نوٹ: (ش ب) آوان قوم میں بہت خدا رسیدہ لوگ اور اولیاء ہوئے ہیں۔ اس سے ان کے سادات ہونے کے دعوے کو قوت ملتی ہے۔

تحصیل مانسہرہ

۱۔ دیوان راجہ بابا کا مزار گلی باغ نزد لبغ ہے۔ عام روایت ہے کہ ترکوں کی جابر حکومت کا خاتمہ ان کی بد دعا سے ہوا۔ انہوں نے ترک راجہ کی اصلاح کے لئے نصیحت کی اور اس کے انکار پر انہوں نے بد دعا کی اور تھوڑے عرصہ بعد سواتیوں نے آکر اس کو شکست دے کر ملک سے بدر کر دیا۔ اس زیارت کے ساتھ ایک چشمہ ہے جس میں بیمار نہاتے ہیں۔

۲۔ میاں خاکی صاحب کا مزار اگرور کا نی مشہور ہے ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ بیدادی کے ترک بادشاہ نے ان کو ایک شال اور گھوڑا تحفہ میں بھیجا۔ آپ اس بادشاہ سے ناراض تھے۔ شال کو آگ میں ڈال دیا اور گھوڑے کو ذبح کر دیا۔ ایک ٹانگ بادشاہ کو بھیجی اور باقی پکا کر فقیروں کو بھنڈارے کے طور پر کھلا دی۔ بادشاہ اس حرکت پر ناراض ہوا تو اپنا گھوڑا اور شال واپس مانگا۔ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈال کر شال صحیح سلامت نکال کر اور گھوڑے کے پنجر کو اٹھا کر زندہ سلامت گھوڑا نکال کر واپس کر دیا۔

۳۔ زیارت سلطان مغل صاحب واقعہ موضع میاں خاکی دا باغ۔ علاقہ تناول ایک مشہور زیارت ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کو خرقہ حضرت میاں صاحب مانگل نے دیا تھا۔

۴۔ ایک زیارت موضع لیونگ میں ہے۔

۵۔ باقی زیارت گاہیں وادیٔ اگرور میں ہیں مثلاً پیاں شریف یا علاقہ مظفر آباد (علاقہ کشمیر) میں ہیں۔

۶۔ زیارت حیات المیر صاحب۔ بالاکوٹ برلب دریائے کنہار۔ ان کی حیات جاودانی کا عقیدہ لوگوں میں ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس جگہ وہ بیٹھتے تھے۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہاں بھائی بالا... (گرو نانک کا چیلا) کی بیٹھک ہے۔ اس زیارت کے ساتھ ایک چشمہ ہے جس کو لوگ شربت کہتے ہیں۔ اور ان کے عقیدہ کے مطابق اس پانی کے پینے سے کوڑھ کا مرض دور ہو جاتا ہے مدت سے یہاں کوڑھی رہتے تھے۔ اس بنا پر اب وہاں حکومت نے ایک بڑا ہسپتال اس مرض کے علاج کے لئے قائم کر دیا ہے۔

۷۔ زیارت ننکوٹ (پکھلی) یہاں پر سید علی ہمدان بابا کا روضہ ہے یہاں ہر اتوار خاص کر چاند کی

پہلی چودہ دونوں عورتیں یہاں جمع ہوتی ہیں اور اپنے پچھاواں (آسیب زدہ) والے بچوں کو برائے شفاء لاتی ہیں۔ اور بیماروں کو ایک خاص درخت کے نیچے سے گزارتی ہیں۔

۸۔ زیارت سید جلال بابا۔ موضع بھوگڑمنگ انہی کے زیر حکم سواتیوں نے ترکوں سے حکومت چھینی تھی۔

۹۔ ایک بہت پرانی زیارت۔ سفید اللہ بابا کی واقع خطائی علاقہ اگرور ہے یہ فقیر ننگا اور سید تھا۔

۱۰۔ زیارت دوگائی۔ (مقام اتصال نالہ سروری اور آنار) علاقہ اگرور۔ لوگ ہر جمعرات اور اتوار کو یہاں جمع ہوتے ہیں۔

۱۱۔ زیارت تکیہ نوالی۔ موضع طوراوارہ۔ علاقہ اگرور۔ یہاں پر اخوند سعدالدین کا روضہ ہے۔ اس نے صوبہ خان تناولی خان کی مدد سے اگرور فتح کیا تھا۔

۱۲۔ توتنی کی زیارت (غازی کوٹ کی زیارت) ایبٹ آباد کو جانے والی سڑک کے کنارے پر واقع ہے یہاں ہر جمعرات و جمعہ کو پیٹ کے درد والے مریض آتے ہیں۔

۱۳۔ زیارت شاہ شریف قلندر۔ واقع موضع سفیدہ۔ یہ سید تھے۔ زیارت کے ساتھ تالاب ہے جس کا پانی عقیدت مند اپنی بیماریوں کے دفع کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

۱۴۔ زیارت تکیہ مہانڈری۔ کاغان۔ یہاں پر پیر غازی شاہ کا مقبرہ ہے۔ اس کے ساتھ چشمہ ہے جو ان کی کرامت پتھر پر عصا مارنے سے پیدا ہوا تھا۔

۱۵۔ زیارت سیری پنجول والی۔ یہاں پر خطاب شاہ کا مزار ہے جو یاغستان سے یہاں آیا تھا دونوں عیدوں پر یہاں میلہ لگتا ہے۔

۱۶۔ زیارت باباجی والی نزد اچھڑیاں۔ دونوں عیدوں پر لوگ یہاں سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔

تحصیل ایبٹ آباد

۱۔ زیارت باواجی صاحب موضع مائی گوجری علاقہ تناول۔ باواجی موضع چنداور تحصیل ہری پور سے یہاں آ کر رہے۔ ان کی اولاد اب بھی چھتی موہری میں آباد ہے ہر مرض کے بیمار ان کی زیارت پر جاتے ہیں۔

۲۔ زیارت میاں سلطان غازی علاقہ تناول میں کمیاں ستھانہ میں ہے اور شیروان اور جوہری کو کے درمیان واقع ہے یہاں پر ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے اور بر سر راہ ہونے کے لحاظ سے مسافر یہاں پر آرام کرتے ہیں۔ بہت سی امراض کی شفا کے لئے یہ زیارت مشہور ہے۔

۳۔ چلہ شاہ بری لطیف۔ یہ بری شاہ لطیف کی عبادت گاہ ہے جن کا مزار نور پور شاہاں نزد راولپنڈی میں ہے۔ یہ علاقہ ناڑہ برلب ہرو ڈھونڈاں واقع ہے۔

۴۔ مزار کھنڈ والا پیر صاحب موضع سجکوٹ علاقہ ناڑہ۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات پر کھانڈ کی بارش ہوئی تھی۔ اسی واسطے ان کے مزار پر کھانڈ کی نیاز دی جاتی ہے ہر خواہش کے لئے لوگ وہاں حاضری دیتے ہیں۔

۵۔ زیارت نماناں (نمانڑا) شاہ ولی موضع چنالی نزد گڑھی ٹوٹیال۔ یہ ایک فقیر جو کشمیر سے آیا تھا اور یہاں رہا تھا کی قبر ہے۔ بخار کے مریض زیارت کے لئے آتے ہیں۔

۶۔ مانگل کی زیارت۔ میاں کنگال صاحب کا مقبرہ۔ یہ مقبرہ خواجہ گل محمد کا ہے اور یہ شیخ عبدالصبور قادری ساکن کشمیر المعروف بستال زمانہ ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء کا مرید تھا۔ ہر جمعرات کو مردوں اور عورتوں کا میلہ لگتا ہے۔

۷۔ تکیہ ترچھہ نزد موضع مجوہاں برلب دریائے جہلم۔ یہ بہت پرانا مزار ہے اس میں پیر ستار شاہ غازی مدفون ہے۔

دیگر زیارت گاہیں

۱۔ مزار جمال غازی دھمتوڑ۔ ۲۔ سائیں پلست تحصیل ایبٹ آباد۔ ۳۔ شیخ بالا اور مہر علی بابا۔ موضع بجنہ نزد شنکیاری۔ ۴۔ قلندر سید بالاکوٹ۔ ۵۔ نوبت شاہ سید لاچی منگ علاقہ کونش۔ ۶۔ تورتم بابا سید موضع شمدھڑہ علاقہ اگرور۔ ۷۔ حیدر بابا موضع گھانیاں۔ اگرور۔ میاں حیدر بابا سادات آتر کے جد ہیں۔

مزار حضرت سید احمد شہیدؒ آپ کا مزار بالاکوٹ برلب دریائے کنہار واقع ہے آپ سب سے پہلے جنگ آزادی کے شہید ہیں۔ اور ۱۸۳۱ء میں بمقام بالاکوٹ سکھوں کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے اگرچہ مزار آج تک شایان شان تعمیر نہیں ہوا لیکن آپ کا نام نامی روشن اور نمایاں ہے[1]

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حضرت شاہ اسمٰعیل کا مزار آپ کا مزار شہر بالاکوٹ سے ہٹ کر جنوب مغربی کونے میں ہے اس کے گرد چار دیواری بھی ہے اور بہتر حالت میں ہے۔ مرجع خلائق ہے اس میں ایک عالم باعمل محو خواب ہے یہ بھی اپنے قائد حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

---

[1] تاریخی شہادت کے لحاظ سے آپ کی نعش اس قبر سے نکال کر سکھوں نے دریا برد کر دی تھی لیکن پہلا مدفن یہی تھا۔

مقبرہ نورشاہ (غازی بابا) آپ کا مقبرہ بھوگرمنگ تحصیل مانسہرہ میں ہے اور غازی بابا کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ سید جلال بابا کے پوتے ہیں۔ ایک بہادر غازی اور سرگرم مبلغ تھا۔ کاغان سے کوہستانی علاقہ جہاں پر کافر لوگ آباد تھے انہی کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے صرف چترال کے قریب تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ جہاں کے لوگ اب بھی کافر ہیں۔ یہ علاقہ اب کافرستان کہلاتا ہے ان کے دادا سید جلال بابا بھی بھوگرمنگ میں مدفون ہیں۔ اور ان کی جائے رہائش (نزد مکانات خان خداداد خان سابق وزیر صحت) کے آثار آج تک موجود ہیں۔

زیارت شیخ بابا۔ میر علی بابا واقع بجنہ علاقہ شنکیاری ہر دو عید پہ فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔

اہل ہنود کی زیارت گاہیں

۱۔ ڈھیری بھائی کرپارام واقعہ کوٹ نجیب اللہ۔ ماہ ساون میں ہندو سلام کے واسطے حاضر ہوتے تھے
۲۔ شوالہ واقع چیٹی گٹی علاقہ شنکیاری یہ شومندر ہے۔ جس کے اندر سنگ مرمر کا ایک بہت بڑا شولنگ ہے۔ اہل ہنود اس کو اپنا عبادت خانہ جانتے ہیں چونکہ کوئی اور جگہ عبادت کی اس علاقہ میں نہیں ہے لہٰذا اس مندر کی تعظیم زیادہ کرتے تھے۔ اب غیر آباد ہے
۳۔ بربری ماتا۔ واقعہ مانسہرہ خاص۔ دیوی کا مندر ہے جنم اشٹمی کے تیوہار پر ہندو مرد و زن ہو کر شیرینی اور حلوہ چڑھاتے تھے۔

عہدِ ماضی کے سکے اور شاہان و خوانین کی مُہریں

یہ سکے اور ان کے دور کی اصلاحات اور تشریح سلیمان جوہر

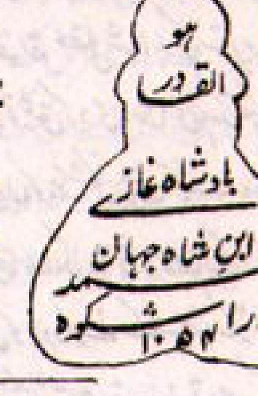
ان کا مطالعہ ایک دلاویز اور دلچسپ مضمون ہے اور جس خطے کے مطالعہ کا کسی کو شوق ہو۔ اس خطے کی پرانی دستاویزوں کی دستیابی اس شوق کو فریفتگی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ تاریخی تحقیقات کے سلسلے میں مُہروں کو دیکھنے سے مورخ کی نگاہ غائر میں وہاں کے باشندوں کی آئینی فراست، ملکی انتظام و معاشرت کے سلسلے میں ان کے اکابر و زعماء و علماء کے احساس ذمہ داری کا سراغ باقی ہے پھر یہی مواہیر اور سکوں میں رونما ہوتی ہیں۔ قوم کی مجموعی ذہانت اور فراست کی مشق و ورزش قوم کے رہبروں کی زندہ دلی اور منچلے پن کا اظہار ہیں۔ یہ منچلا پن اور زندہ دلی رہتی دنیا تک قوم کی روشن فکری کی یادگار ثابت ہوتی ہے۔ فرماں روا خواہ کتنا ہی جابر اور استبداد پسند ہو۔ اس کے سکۂ شاہی کی ڈیل ڈول، قوم کی مجموعی طرز، اس کے

مذہب اور اس کی ثقافت کے نشان سے خالی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ تاریخ عالم کے جو گوشے اور کرۂ ارض کے جن کناروں کے بارے میں تاریخی صحائف ذکر سے خالی ہیں۔ ان کے متعلق بھی عہد جدید میں علم تواریخ کے ضخیم دفاتر منصۂ شہود پر آ گئے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہوئی کہ کسی مقام سے ملکی سکہ برآمد ہوا اور اہل فراست نے اس سے ایک بڑے خطۂ زمین کے تاریخی حالات کا کھوج عقلی شواہد کی بنا پر لگا لیا۔ اور رفتہ رفتہ پرانی تاریخی کتابوں نے بھی اس انکشاف اور استدلال کی توثیق کر دی۔ شاہی سکہ حکمران کے اس احساس کی علامت ہے۔ کہ خرید و فروخت اشیائے ضرورت میں شہریوں کو جو مشکل پیش آتی ہے وہ سکہ شاہی کی مداخلت سے رفع ہو جاتی ہے۔ مثلاً جنس کی جنس کے عوض میں فروخت تجارت کی روانی و رفتار کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے حکمرانوں نے جہالت عہد قدیم کے باوجود رعایا کی اس مشکل کو دور کرنے کے لئے سکۂ شاہی ایجاد کیا۔ بعد میں جب معاشی مصلحتوں نے دھات کی بجائے کاغذ کے نوٹوں کو سکۂ شاہی قرار دیا۔ تو اس کے ضمن میں بھی ایک نفسیاتی مسئلہ سامنے آتا ہے جس کی تفصیل پولیٹیکل اکانومی کی سرحدوں تک جا پہنچتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب فطرتِ انسانی نے دھات کے سکوں کو بخل اور تنگ نظری کی وجہ سے دفنِ زمین کرنا شروع کر دیا۔ اور تجارت کی رفتار مدہم ہونے لگی۔ تو حکومتوں نے کاغذی کے نوٹ جاری کئے۔ جو محض معاشی پابندیوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور مدفون دولت کی شمر کا اثر قدرے کم ہو جاتا ہے۔ الغرض سکوں سے اور تاریخی دستاویزوں اور مہروں سے ملک کی سرحدات کا سراغ ملتا ہے۔ اور اہلِ ملک کی جہالت یا دانش، مذہب یا لامذہبی اور ثقافت کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً محمود غزنوی کا ایک سکہ لاہور میں مضروب ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں سے پہلے بھی اس شہر میں سکے ڈھالے جاتے تھے۔ اور یہ شہر محمود غزنوی کی سلطنت میں شامل تھا۔

محمد بن قاسم کا ایک سکہ مشرقی پاکستان میں پایا گیا۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ سوداگر لوگ سندھ سے مشرقی پاکستان تک کا لمبا سفر ان دنوں میں بھی کرتے تھے۔ اسی طرح مغربی پاکستان اور مشرق وسطیٰ میں تیسری چوتھی صدی کے یونانی سکے برآمد ہونے سے تجارتی آمد و رفت کا ان دور دراز مقامات تک پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی یونانی سلطنت کے اثر و رسوخ کا۔ ہزارہ میں جن شاہان و خوانین سلف کی دستاویزات و مواہیر مجھے معلوم ہو سکیں اُن کو ان صفحات میں درج کر دیا گیا ہے تاکہ ان کے مطالعہ سے ہزارہ کی تاریخ کے مختلف گوشے روشنی میں آ سکیں۔ اور ایک دو مشہور شخصیتوں کے دستخطوں کی نقل بھی شامل کی گئی ہے کیونکہ دستخط کا طرزِ املاء اور مواہیر کی ساخت، مالک کی عادات، اطوار اور مزاج کی مظہر ہوتی ہیں۔ اگر غور و تعمق سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو مالک کے انفرادی اور نفسیاتی عزائم کا

پر تو بھی ان سے ظاہر ہوتا ہے۔

شاہانِ سلف و خوانین کی مواہیر جو ضلع ہزارہ کے بندوبست ۱۸۷۲ء میں پیش کی گئیں

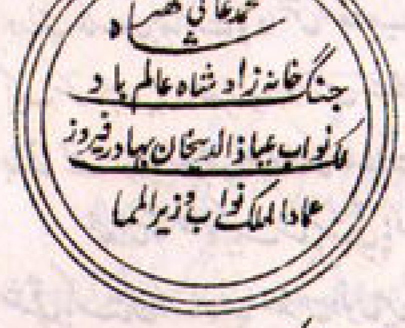


مُہر دارا شکوہ پسر کلاں شاہ جہان بادشاہ

یہ مُہر دارا شکوہ کی ہے اس کے فرمان صرف شاہ جہان بادشاہ کی زندگی میں ہنگام مقابلہ عالمگیر بحالت شاہزادگی جاری ہوئے۔

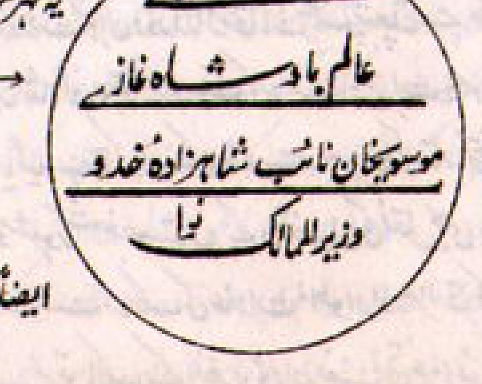


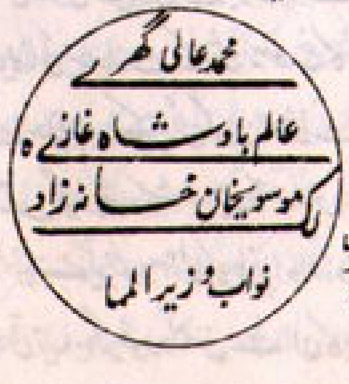
یہ مُہر دراصل فرخ سیر بادشاہ ابن معز الدین ابن شاہ عالم کی ہے۔



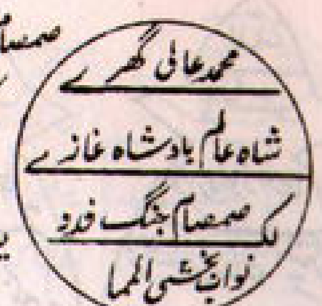
یہ مُہر شاہ عالم بادشاہ کے وزیر الممالک نواب غازی الدین خان کی ہے۔

یہ مُہر موسوی خان نائب وزیر کی ہے۔

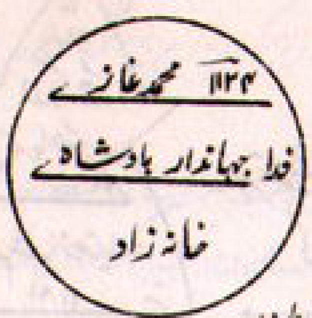




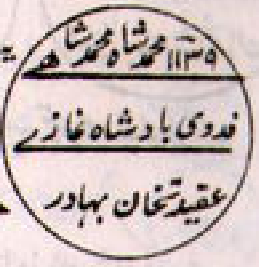
ایضاً بحالت وزارت



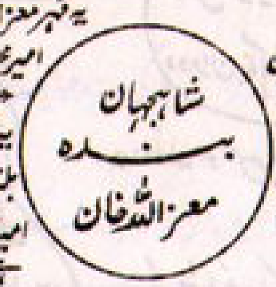
صمصام جنگ بخشی شاہ عالم بادشاہ کی مُہر ہے



یہ مُہر خدائی خان - امیر جہاندار خان یعنی معز الدین بادشاہ کی ہے

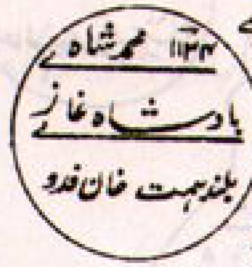


یہ مُہر عقیدت خان امیر محمد شاہ بادشاہ کی ہے

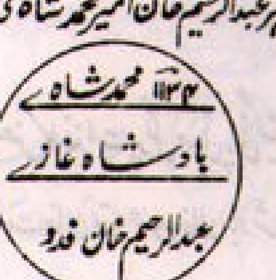


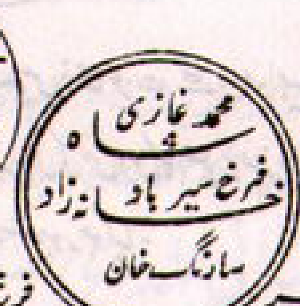
یہ مُہر معز اللہ خان امیر محمد شاہ کی ہے

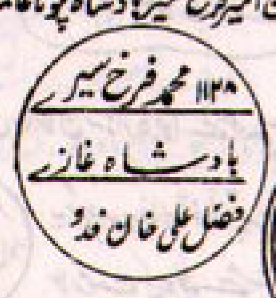
یہ مُہر بلند ہمت خان امیر محمد شاہ کی ہے



یہ مُہر عبد الرحیم خان امیر محمد شاہ کی ہے ۔ یہ مُہر فضل علی خان امیر فرخ سیر بادشاہ پوتا عالمگیر بادشاہ کی ہے



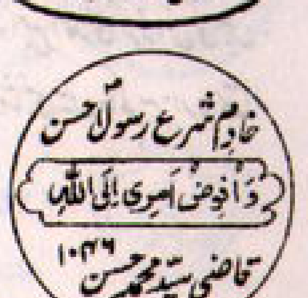




یہ مُہر سارنگ خان امیر فرخ سیر بادشاہ کی ہے۔

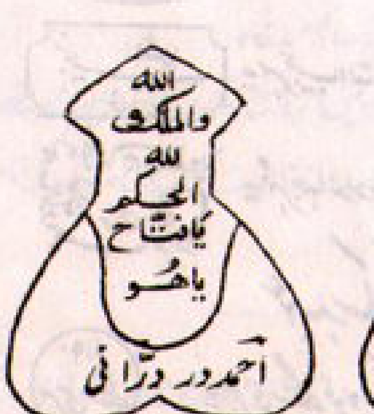


یہ مہر بہادر شاہ بادشاہ کے کسی عامل محمد علی کی ہے۔

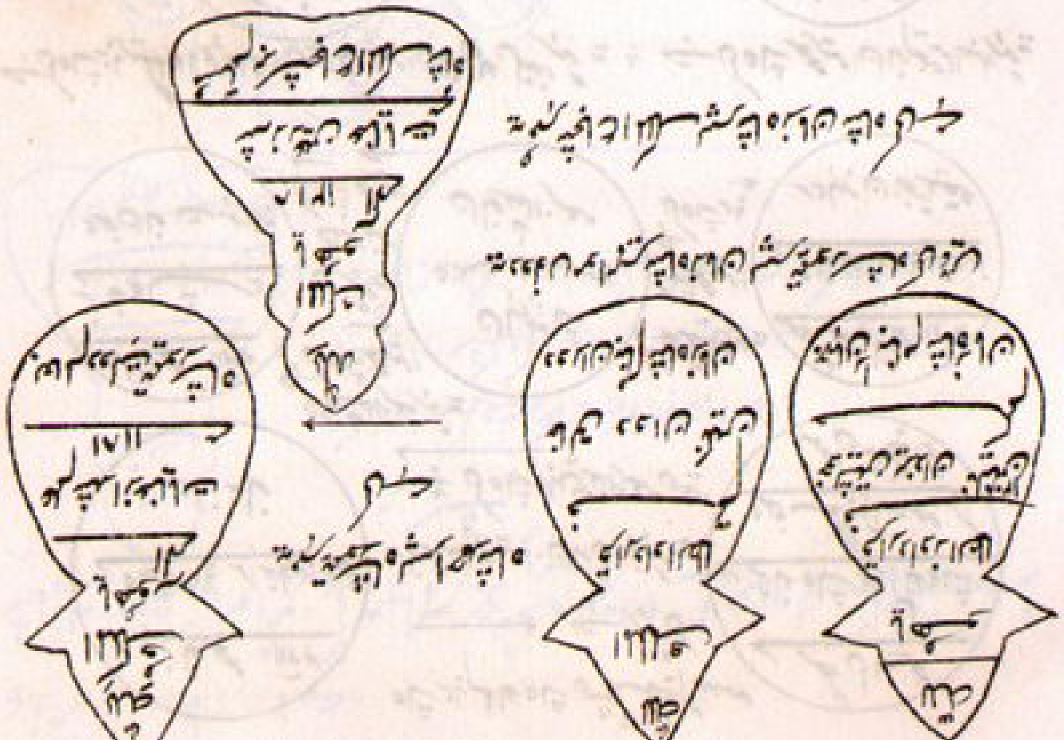


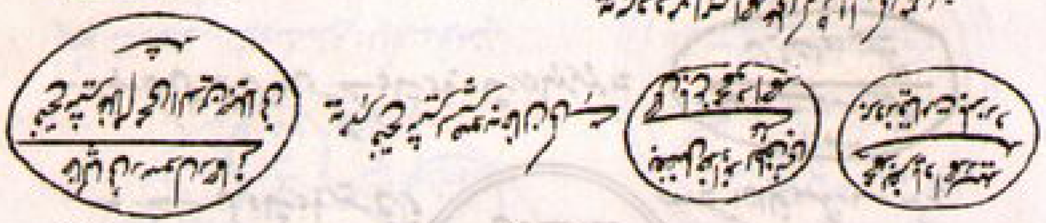
یہ مُہر قاضی سید محمد حسن عہد محمد شاہ بادشاہ کی ہے



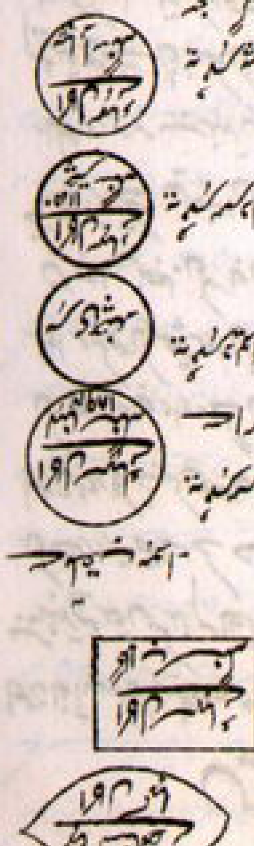


یہ ہر دو مہریں احمد شاہ بادشاہ درانی کی ہیں راجگان گکھڑ کی سندات سے یہ مواہیر لی گئیں









ہزارہ میں مروّج سکّے تاریخ کی روشنی میں

کائناتِ ارضی پر تہذیب و تمدن کی کرنیں کب پڑیں، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ کا کب آغاز ہوا ان سوالات کا جواب وثوق سے نہیں دیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس سوال کا کہ موجودہ نظامِ زر کس قدیم تہذیب کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہے بس اتنا کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں ابنائے آدم ایک دوسرے کے ساتھ ضرورت کی اشیاء کا تبادلہ کرتے ہوں گے۔ آہستہ آہستہ دھاتوں کے ٹکڑوں کے بدلے مختلف اشیاء حاصل کرنے کا رواج ہوا ہوگا۔ اور پھر دھات کے یہی ٹکڑے کرنسی یا سکّوں کی صورت اختیار کر گئے ہوں گے۔ وادیٔ سندھ کی پرانی تہذیب کے آثارِ قدیمہ (موہنجوڈارو اور ہڑپہ) سے برآمد ہونے والی بعض اشیاء مٹی اور پتھر کی چوکور اور مستطیل ٹکڑیاں ہیں جن پر عجیب و غریب عبارت کندہ ہے جو آج تک نہیں پڑھی جاسکی۔ بعض ماہرین انہیں "مُہریں" سمجھتے ہیں۔ بعض انہیں قدیم ابجد کے حروف گردانتے ہیں۔ اور بعض انہیں سکّے قرار دیتے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب پُرانی تہذیب ہے۔ اور بابل۔ نینوا۔ روم اور مصر کی تہذیب موجودہ علماء کی تفتیش کے مطابق سندھ تہذیب سے ہرگز قدیم نہیں۔ پاکستان میں آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے جو قدیم ترین سکّے ملے ہیں وہ دھات کے مربع اور بیضوی ٹکڑے ہیں۔ جو تانبے اور چاندی کی پتلی چادر کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان سکوں کے مطالعہ و تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سکّے ولادتِ مسیح سے پانچ سو سال پہلے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ اور دوسری عیسوی تک ٹیکسلا (ضلع ہزارہ میں) کے علاقہ میں رائج رہے۔ سکندرِ اعظم کے حملے سے مغرب پر قدیم پاکستان کے ساتھ تجارت کے دروازے کھُل گئے۔ پہلی اور دوسری صدی ق م کے قدیم سکّے یونانی انداز اور فنی حُسن سے غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی تک عظیم روم اور قدیم کشن تاجروں کے مابین گہرے روابط تھے چنانچہ اس زمانے کی معیاری طلائی کرنسی اس عہد میں شمال مغربی پاکستان کی معیشت اور ثقافت کے بارے میں گراں قدر معلومات مہیا کرتی ہے۔ کنشک اور اس کے جانشینوں کے عہد کے سکوں پر نہ صرف کُشنوں کے دیوتاؤں بلکہ ایران اور یونان کے دیوی دیوتاؤں کی تصاویر منقش ہیں۔ گپت خاندان کے عہد (چوتھی سے چھٹی عیسوی تک) کے طلائی سکّے وزن اور ساخت کے اعتبار سے کُشن عہد کے سکوں سے بہت ملتے ہیں لیکن ان کی ساخت بہتر ہے۔ اور ان پر زمانہ مابعد کے بعض دیوی دیوتاؤں کے نقش موجود ہیں۔

سنہ ۷۱۲ء میں عربوں کی آمد نے سندھ کو سماجی و معیشتی مساوات کے ایک انقلابی نظریہ سے ہمکنار کر دیا جس کا اظہار اس عہد کے طلائی و نقرئی سکوں سے ہوتا ہے ان سکوں پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے الفاظ

کندہ ہیں۔ ابتدائی دور کے سکّے ساسانی اور بازنطینی اثرات کے حامل نظر آتے ہیں۔ وسطی ایشیا کے ساتھ تجارت کے نئے دور کا آغاز سلطان محمد بن سام کے عہد (۱۱۹۳-۱۲۰۶) میں ہوا۔ روز افزوں تجارت معیاری طلائی کرنسی کی متقاضی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں "دھلی وال" سکہ کا رواج تھا۔ مسلمانوں نے "جیتل" اس زمانہ کا پیسہ رائج کیا۔ نقرئی بڑا سکّہ "ٹنکہ" یعنی روپیہ تھا۔ جو قریب ایک تولہ کا تھا۔ اس کے ۴۸ جیتل ہوتے تھے۔ یہ ٹنکہ سب سے پہلے سلطان التمش کے عہد (۱۲۱۰-۱۲۳۵) میں نقرئی ٹنکہ جاری ہوا۔ مغلوں کے زمانہ میں یہی ٹنکہ روپیہ ہوگیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانے میں نظامِ زر اور فروغ حاصل ہوا سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱) نے کرنسی کے ضمن میں کئی تجربات کئے۔ اس نے جیتل اور تانبے کے سکوں کی جگہ چاندی اور سونے کے سکّے جاری کئے۔

بابر (۱۵۲۵-۱۵۳۰) اور ہمایوں (۱۵۳۸-۱۵۵۵) کے سکّے زیادہ تر نقرئی درہم تک محدود رہے۔ جو مغربی ایشیا میں رائج تیموری سکّوں سے بہت مماثلت رکھتے تھے۔ شیر شاہ سوری (۱۵۳۸-۱۵۴۵) جس نے ہمایوں کی جلاوطنی کے زمانہ میں برصغیر میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ "روپے" کا موجد تھا۔ اکبرِ اعظم (۱۵۵۶-۱۶۰۵) اپنی سیاسی و فوجی کامرانیوں کی طرح نظامِ زر کی تاریخ میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ اس نے ایسے سکّے جاری کئے۔ جو تاریخ کے عظیم سکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں روپے کے چالیس دام تھے ہر دام کے ۲۵ حصے۔ ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے۔ (اکبر کے زمانہ میں من ۴۸ سیر کا تھا۔ اور شاہجہانی سیر ۵۰ روپیہ کا ہوتا تھا) جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷) کے عہد کے سکّے اپنی خوبصورتی اور حُسن کے اعتبار سے بڑے ممتاز ہیں۔ ان پر کندہ عبارت دلکشی اور حسن کی حامل ہے۔ جہانگیر نے اشرفیاں بھی ایجاد کیں دو اقسام کی اشرفیوں پر جہانگیر کی اپنی تصویر بھی ہے۔ یہ رواج اورنگ زیب تک رہا۔ فرخ سیئر (۱۷۱۳-۱۷۱۹) نے ٹکسال کا طریقہ جاری کیا اور اس طرح ٹھپے اور ڈھلائی کے مغل سکّے ختم ہو گئے۔

رنجیت سنگھ (۱۷۹۹-۱۸۳۹) کے عہد میں "ایرانی بیت نُما" سکّے جاری ہوئے۔ بعد میں ایسے سکّے بھی جاری ہوئے جن پر گورمکھی عبارت ہوتی تھی۔ لیکن یہ سکّے تانبے کے تھے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ء میں روپے تک کے تمام نئے سکّے جاری کئے۔ ان سکّوں پر شہنشاہ انگلستان یا ملکہ کی تصویر اور کمپنی کا نام درج ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگِ آزادی کے بعد کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ تو سکوں پر کمپنی کا نام بھی ختم ہوگیا۔ اکنی اور دونی کے نکل کے سکّے اس عہد میں جاری کئے گئے۔ (اٹھنی اور چونی چاندی کی تھی)۔

حصولِ آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد پاکستان اپنے نظریات کے مطابق سکے جاری کرنے میں آزاد تھا۔ تمام سکوں پر اردو۔ انگریزی میں حکومت پاکستان کے الفاظ لکھے گئے اور ہر سکے کی ایک جانب محبوب نشان چاند تارا ڈالا گیا۔ (یہ مضمون نوائے وقت ۸ مارچ ۱۹۶۴ء سے نقل کیا گیا)

یہ تمام سکے اس خطۂ ملک یعنی ہزارہ میں جاری رہے۔ سوائے عرب سکوں کے جن کا رواج سندھ ملتان تک ہی محدود رہا۔

زمانہ قریب یعنی کمپنی کے عہد حکومت میں کمپنی کے روپیہ اور گُنڈہ روپیہ کا عام رواج تھا۔ ان دونوں کی باہمی قیمتوں کا اندازہ ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک خط محررہ ۱۴ اپریل ۱۸۶۰ء سے ہوتا ہے جس میں اس نے جاگیروں کی مالیت کے ذکر میں ایک سو روپیہ گُنڈہ کو کمپنی کے ۹۷ روپیہ کے مساوی قرار دیا۔ یعنی کمپنی کا ایک روپیہ $\frac{1}{5}$ اگُنڈہ کے برابر تھا۔

میجر ایبٹ نے اپنی ڈائری مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۹ء میں تیس ہزار ہری سنگھی روپیہ کو کمپنی کے پندرہ ہزار روپیہ کے برابر لکھا ہے۔ میجر ایبٹ کے زمانہ کے تاریخی حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہزارہ کے بندوبست میں مالیہ کا تعین۔ سکہ گُنڈہ زمان شاہی روپیہ کی بنا پر ہوتی تھی۔ جو انگریزی روپیہ سے قیمت میں زیادہ تھا (حوالہ خط ڈپٹی کمشنر ہزارہ یکم مئی ۱۸۵۵ء) اس خط میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ نانک شاہی اور گُنڈہ روپیہ تجار و دیگر اشخاص سے حسب قیمت مقرر کردہ ۲۳ (دھات کے جانچ و پرکھ کا افسر) راولپنڈی خزانہ سے کمپنی کے روپیہ سے تبدیل کئے جائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے روپیہ کے ساتھ مئی ۱۸۵۵ء تک دوسرے سکے بھی رائج الوقت رہے۔

ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے ایک دوسرے خط جون ۱۸۴۹ء سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال (۱۸۴۹ء) میں گُنڈہ زمان شاہی ہری سنگھ کا روپیہ اور سری نگری روپیہ بھی چل رہے تھے۔

اس ضمن میں یہ امر بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ضلع ہزارہ میں عدالت میں ٹکٹ کا استعمال ۱۸۴۹ء (بموجب خط ۱۸ جولائی ۱۸۴۹ء) میں شروع کیا گیا۔ میجر ایبٹ نے اس امر کی مخالفت کی کہ ہزارہ کے لوگ غریب ہیں۔ اور یہ خرچ ان پر بوجھ ہوگا۔

ایک انگریزی دستاویز مورخہ ۱۲ جون ۱۸۵۰ء سے معلوم ہوا کہ اس وقت نمک کا بھاؤ تین روپے من تھا۔ لاہوری من ۴۰-۴ تولہ کا اور کالا نمک پر جو من استعمال ہوتا تھا وہ ۵۰-۱۶ تولہ کا تھا۔ شاہ جہانی سیر ۱۵ روپیہ کا ہوتا تھا۔ سکہ باٹے و اوزان مروجہ ہزارہ (۱۸۷۲ء تاریخ ہزارہ واٹسن) عہد ضلع ہزارہ میں عہدِ اسلام میں سکہ محمد شاہی اور گُنڈہ رائج تھے۔ عہدِ سکھاں میں گُنڈہ اور نانک شاہی

ASSAY MASTER ۲۳

عہدِ انگریزی میں ڈبل روپیہ (انگریزی)

اوزان۔ عہدِ اسلام میں: کہیں ۷۲ تولہ کا سیر (تارخیلی) کہیں ۸۴ تولہ کا سیر (اتمان زئی) ۷۷ تولہ کا سیر (ترک) قوم دلازاک میں ۸۴ تولہ کا سیر۔ قوم گوجر میں ۹۰ تولہ کا۔ قوم تنولی میں ۹۰ تولہ کا۔ قوم صواتی ۸۴ تولہ کا اور قوم جدون میں ۱۰۰ تولہ کا سیر رائج تھا۔ عہدِ سکھاں میں یہی اوزان سب اقوام میں جاری رہے عہدِ انگریزی میں قوم تنولی، دلازاک اور صواتی میں ۸۴ تولہ کا رہا اور باقی میں ۸۰ تولہ کا۔

ہزارہ میں نظامِ صحت

زمانہ قدیم یعنی مغلیہ، دُرانی اور سکھوں کے عہدِ حکمرانی میں صحت کے انتظام کے لئے کسی سرکاری ادارہ کے وجود کا علم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری طور پر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ لوگ انفرادی طور پر گاؤں یا شہر کے حکیم، طبیب یا کسی وید سے علاج معالجہ کراتے تھے۔ جو یونانی یا آیورویدک طریق سے جڑی بوٹیاں یا دھات کے کشتہ جات استعمال کرتے تھے۔ علماء، پیر اور ملا تعویذ، گنڈہ (دم شدہ دھاگہ گلے میں باندھنا) یا دَم (قرآن کی آیت پڑھ کر مریض پر پھونکنا) سے علاج کرتے تھے۔ بہت سے لوگ مشہور اولیا کی قبور پر جاتے۔ مٹی یا سنگریزہ قبر سے اٹھا کر جسم پر مل لیتے۔ جس کو لوگ امان کہتے تھے پیر دم شدہ تعویذ باندھنے کے لئے یا اس کی سیاہی کو پانی سے دھو کر پینے کے لئے دیتے۔ پکھیاں کے نزدیک موضع کوکلیہ کے سادات (جن کو پیر کہا جاتا ہے) پاگل کتے کے کاٹے کا علاج مٹی کے ایک ڈھیلے (جو وہاں سے اٹھا کر دیا جاتا ہے) سے کرتے تھے۔ اور اس کو تھوڑی تھوڑی مقدار میں کھانے کے لئے ہدایت کرتے۔ ان کا یہ علاج بہت مشہور اور مجرب یقین کیا جاتا ہے۔ دور دراز علاقوں سے لوگ ان کے پاس علاج کے لئے آتے ہیں۔ یہ طریق علاج۔ تعویذ گنڈہ۔ دم وغیرہ اب کم ہو رہا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ اشیاء و کلمات میں روحانی خاصیت اور تاثیر ہوتی ہے۔ جس سے روح و دل متاثر ہوتے ہیں اور جسمانی عوارض پر صحت مندانہ اثر ڈالتے ہیں۔ جسم کی صحت و توانائی روح و دل کی توانائی پر منحصر ہے ہی۔ لہٰذا ان کے اثر و بیان پر تاریخ بھی شاہد ہے۔ مختلف اقسام کے بیمار، اولیاء، صلحاء اور انبیاء کے ہاتھوں سے شفایاب ہوتے رہے ہیں مگر بنیادی شرط اس طریق علاج کے کارگر ہونے کی بیمار کے عقیدہ پر ہے۔ یعنی وہ عقیدت مندانہ ایسے صلحاء کے پاس جائے۔ اس قول کی تصدیق حضور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے ایک واقعہ سے ہوتی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بیان کیا۔ کہ

اس کے بھائی کے پیٹ میں درد ہے۔ آپ نے فرمایا "جاؤ اور اس کو شہد پلاؤ"۔ جب وہ شخص شہد لے کر اپنے بھائی کے پاس پہنچا تو اس کے بھائی نے پوچھا۔ "کیا لائے ہو؟" اس نے کہا۔ "حضورؐ نے فرمایا ہے کہ تمہارے درد کے لئے تم کو شہد پلاؤں۔ لہٰذا شہد لے آیا ہوں"۔ اس کے بھائی نے کہا۔ "کہ حضورؐ نے فرمایا ہے تو جلدی دو۔ کہ میں اس کو پی لوں"۔ اس نے شہد پیا تو اس کا درد جاتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد کسی اور شخص نے اسی طرح کے اپنے ایک بیمار کیلئے جس کے پیٹ میں درد تھا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا اس کو شہد پلاؤ۔" جب شہد اس کو پلانے لگے تو اس نے شور کیا کہ مجھے کیوں زہر پلا رہے ہو۔ مجھے کیوں مارتے ہو۔ بہرحال شہد اس کو پلایا گیا لیکن وہ مر گیا۔

یہ ماجرا یعنی دونوں شخصوں کا حضورؐ کی خدمت میں بیان کیا گیا کہ شہد سے ایک شخص اچھا ہوگیا اور دوسرے کی موت واقع ہوگئی۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا "پہلے کا پیٹ سچا تھا اس نے دوائی قبول کرلی اور اچھا ہوگیا۔ دوسرے کا پیٹ جھوٹا تھا اور دوائی قبول نہ کی اس لئے وہ مر گیا۔"

اب تو یورپ کے ڈاکٹر بھی تحلیل نفسی کی بنا پر اس طریق علاج کے قائل ہو رہے ہیں اور اب ان کا نظریہ یہ ہے کہ مریض کا علاج انسانی تحلیل نفسی کی بنا پر زیادہ موثر اور مفید ہے نہ کہ مرض کا۔ ان کی رائے ہیں نفس انسانی کی صحت پر جسم کی صحت کا دارو مدار ہے اس کے لئے بہت سے تجربات بھی انہوں نے کئے ہیں۔ کسی خاص مرض کے لئے مشہور دوا کا استعمال ایک گروہ پر کیا۔ اور اسی خاص مرض کے دوسرے گروہ پر مجرب دوا کے ہمرنگ اور مشابہ معمولی دوا سے کیا گیا۔ نتیجہ دونوں حالتوں میں تقریباً ایک رہا چونکہ ان دونوں گروہوں کا علاج ایک قابل اعتماد ڈاکٹر نے کیا۔ لہٰذا اس کے ہاتھ سے دونوں دوائیں کارگر ثابت ہوئیں۔ اس حقیقت کو شیخ سعدیؒ نے ایک دوسرے رنگ میں پیش کرکے اس نظریہ کی تائید مدتوں پہلے کردی ہے

اگر حنظل خوری از دست خوش خو ... بہ از شیرینی از دست ترش رُو

علم روحانی کے تصرفات ایک بدیہی بات ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (تدبر قرآن ص ۲۴۲) میں فرماتے ہیں۔ کہ اس علم کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے۔ تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انہوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا۔ بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انہوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی۔ لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم، علم سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دکانداری کا ایک

ذریعہ بن کے رہ گیا۔ اسی طرح ہمارے یہاں بھی صرف پیری و مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزاء شامل ہوگئے۔"

یہی حال بیماریوں کے تعویذوں وغیرہ کے معاملہ میں بھی پیش آیا۔ حکومت کی جانب سے نظام صحت کے بارے میں صحیح علم مجھے باوجود کوشش کے نہ ہوسکا۔ مسلمان حکومتوں نے تو ہر جگہ باقاعدہ شفاخانہ کھولے جہاں پر لوگوں کا باقاعدہ سرکاری خرچ پر علاج ہوتا تھا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے فیروز تغلق نے ایک بہت بڑا شفاخانہ قائم کیا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں صرف دہلی میں ستر شفاخانے تھے۔ جو اس زمانے میں مارستان یا بیمارستان کہلاتے تھے۔ بادشاہ کی ملازمت میں بارہ سو اطباء تھے۔ فیروز شاہ کو خود علم طب سے بڑا شغف تھا اور ایک رسالہ طب فیروز شاہی کے نام پر تالیف کیا۔ اس کے بعد علاؤ الدین احمد شاہ بہمنی نے ۸۵۶ھ مطابق ۱۴۵۲ء میں اپنے پایہ تخت بیدر (دکن) میں ایک عمدہ شفاخانہ کی بنیاد ڈالی۔

ضلع ہزارہ میں شفاخانہ جات

اس ضلع میں شفاخانہ کی ضرورت تعمیر اور باقاعدہ علاج کا انتظام اغلباً عہد انگریزی کے آغاز ہی میں ہوگیا۔ یورپین اقوام کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر مضبوطی سے پڑنے کے ذمہ دار یورپی ڈاکٹر ہی ہیں۔ اس ضلع میں سب سے پہلی ہسپتال ایبٹ آباد میں ۱۸۶۷ء میں اس جگہ قائم ہوئی جہاں اب میونسپل کمیٹی ایبٹ آباد کے دفاتر، چونگی اور موٹر بسوں کا اڈہ ہے۔ یہ مختصر سی عمارت ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف بیرونی (OUT DOOR) مریضوں کا علاج ہوتا تھا۔ اس کے بعد سنہ میں موجودہ زنانہ ہسپتال کی جگہ پر پہلے ہسپتال سے وسیع ہسپتال بنی۔ سخت مریض ہسپتال میں رکھے جاتے تھے۔ اس میں توسیع ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ زنانہ کمرہ زچہ خانہ اور ڈاکٹر کی رہائش بنا ۱۹۵۶ء میں زنانہ ہسپتال کیلئے مختص ہوگیا اور مردانہ ہسپتال کچہری کے متصل جانب غرب برلب سڑک لنک روڈ بنا۔ جس میں ایک سو بیماروں کے رکھنے کے لئے بستر ہیں۔ اس جگہ پر پہلے اڈیشنل پولیس کی بارکیں تھیں۔ یہ جگہ اس وقت کے وزیر اعلیٰ سابق صوبہ سرحد خان عبدالقیوم خان نے ہسپتال کے لئے منظور کی ۱۹۵۲-۵۳ء میں تعمیر شروع ہوئی اور ۱۹۵۴-۵۵ء میں مکمل ہوگئی۔

نئی تعمیر شدہ سول ہسپتال ایبٹ آباد کا افتتاح ۱۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء خان خداداد خان (بھوگڑ منگ) وزیر صحت مغربی پاکستان نے کیا۔

ہری پور میں پرانی ہسپتال کا سن آغاز ۱۸۶۳ء ہے۔ ۱۹۳۱ء میں جب میں اس ہسپتال کا انچارج تھا۔

تو اُس وقت اس ہسپتال کا بہت سا حصہ کچا تھا اور صرف آٹھ بستروں کا انتظام تھا۔ اس کا آؤٹ ڈور پختہ تھا۔ میں نے اپنے وقت میں اس سے ملحقہ میونسپل گارڈن کی زمین (جانب مغرب) سے نصف حصہ کمیٹی سے منظور کرا کر ہسپتال کے ساتھ ملحق کرا دیا تھا۔ تاکہ آئندہ توسیع میں اس طرف ہسپتال کے وارڈ وغیرہ بنائے جا سکیں۔ اغلباً ۱۹۶۰-۶۱ء میں جانب غرب بڑے بڑے وارڈ اور عملہ کے مکانات بنائے گئے ہیں ۱۹۶۷-۶۸ء میں اور بھی توسیع عمارت کی ہوگئی۔ اس کے شمالی کونہ میں ایک ٹی بی وارڈ میں جو خان صاحب عبد المجید خان مرحوم ترین رئیس ہری پور نے بنائی۔ مانسہرہ ہسپتال بھی پرانا مختصر اور تنگ جگہ میں ہے۔ توسیع کے لئے اس کے ساتھ کوئی جگہ نہیں۔ میں اس ہسپتال میں ۱۹۲۹ء میں چھ ماہ تک اسسٹنٹ سرجن رہا۔ پہلے یہ ہسپتال بہت مختصر تھا اب اس کے احاطہ میں نئے وارڈ بن گئے ہیں۔ زمانہ ماضی میں اس ہسپتال میں ایک بہت ہی نیک نفس، ہمدرد خلائق اور شریف النفس ڈاکٹر شیر باز خان مرحوم انچارج رہا۔ تمام تحصیل مانسہرہ کے لوگ اس کے گرویدہ تھے اور اس خوش اخلاق اور بے طمع ڈاکٹر سے فیض اٹھاتے تھے۔ وہ حکومت میں بھی قابل عزت تھے۔

ہزارہ ضلع کے دیگر ہسپتال

الف :- دیہاتی مراکز صحت (RURAL HEALTH CENTRES) ان میں چار مریضوں کے رکھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- لورا۔ اس کے ساتھ تین سنٹر ہیں۔ بھلا۔ جبڑی۔ سیر

۲- غازی۔ اس کے ساتھ سلم کھنڈ، جھامرا اور قاضی پور سب سنٹر ہیں۔

۳- خان پور۔ اس کے ساتھ بریلہ، جولیاں اور گر متھون سب سنٹر ہیں۔

ب :- وہ سول ہسپتال جن میں بیمار رکھنے کا انتظام ہے۔ دربند، ریحانہ، نتھیا گلی، خانس پور (ایوبیہ) شیروان، خیر گلی، بفہ، اوگی، پھولڑا، گڑھی حبیب اللہ، بالاکوٹ، کاغان، بٹ گرام، امب، اور نہ ہسپتال جذامیان۔

ج :- صرف آؤٹ ڈور دواخانے۔ جرید، عطر شیشہ، بٹل، شنکیاری، جبوڑی، منگلور، خاکی، بانی بالا، پڑسنہ (سردیوں کے چھ ماہ میں) لساں، شیر گڑھ، نکاپانی، گونہ، بانڈہ، باندھی گو، پھیٹی، گجبوڑی، تھاکوٹ، نیل شنگ، شملئی، طلوس، بیاری، ناڑاں، بوئی، حویلیاں، تاڑہ، ڈونگا گلی، چھانگلہ گلی، (یہ دونوں گرمیوں میں چھ ماہ کے لئے کھلتی ہیں) باگن (سردیوں کے چھ ماہ) گھوڑا ڈھاکا اور

نلاں (دونوں گرمیوں میں چھ ماہ کے لئے) بیرن گلی۔ سری کوٹ۔ کوٹ نجیب اللہ۔ ریالہ (سردیوں میں چھ ماہ) بکوٹ۔ تربیلہ۔ پنیاں۔ کیا۔ کالنجر۔ بھرڑے۔ کنڈر۔

د :- حرکت پذیر ہسپتالیں (بذریعہ موٹر) کاغان جیپ ڈسپنسری اور موبائیل میڈیکل کوچ۔

ہ :- زچہ و بچہ سنٹر۔ مانسہرہ۔ بفہ۔ حویلیاں۔ نواں شہر۔ ہری پور۔ تربیلہ۔ ایبٹ آباد

دماغی امراض کا ہسپتال۔ سابق وزیر صحت خداداد خان نے اپنے زمانہ وزارت میں ڈھوڈیال میں ایک دماغی ہسپتال منظور کیا۔ لاہور ہسپتال کے نمونہ پر بنا ہے۔

ڈاڈر ٹی۔ بی۔ سینیٹوریم

یہ ہسپتال ۱۹۳۱ء میں ڈاڈر کے مقام پر کھولا گیا۔ پرانے زمانہ میں ڈاکٹروں کے خیال میں چیڑھ کے جنگل کی ہوا تپ دق کے مریضوں کی صحت میں معاون سمجھی جاتی تھی لہذا ایسے ہسپتال عموماً پہاڑی مقاموں پر بنائے جاتے رہے۔ جہاں چیڑھ کے درخت ہوں۔ ڈاڈر کا انتخاب اسی وجہ سے ہوا۔ برلب دریائے سرن پُر فضا جگہ ہے۔

ہزارہ کے سند یافتہ ڈاکٹران (ایم بی ایس)

میں نے فہرست ڈاکٹران ہزارہ کے مکمل کرنے کے لئے بہت کوشش کی لیکن افسوس مکمل نہ کر سکا۔ اس ضلع میں سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں خان بہادر ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی سند لی۔ اور سابق صوبہ سرحد کے محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کی۔ ملازمت کا زیادہ حصہ چوبیس سال کے قریب ڈاڈر سینیٹوریم کے ناظم کی حیثیت سے گزارا۔ ۱۹۴۶-۴۷ء میں ریٹائر ہوئے اپنے مکان دار السعید لوئر ملک پورہ، ایبٹ آباد میں پریکٹس کرتے ہیں۔ ان کے بعد شیر بہادر خان بنی (مولف کتاب ہذا) نے ۱۹۲۵ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند لی۔ اور سابق صوبہ سرحد کے محکمہ صحت کی ملازمت میں منسلک ہوگیا۔ دوران ملازمت سابق صوبہ سرحد کے تمام اضلاع (سوائے ڈیرہ اسمٰعیل خان) کی ہسپتالوں میں مختلف حیثیت سے ہر شعبہ میں کام کیا۔ میرے علم میں اس کے بعد قریباً بیس سال تک ہزارہ سے کسی نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل نہ کی۔

قاضی عبد الخالق ساکن کنج ایبٹ آباد نے ۱۹۴۲ء میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ اغلباً ۱۹۵۲-۵۳ء میں سرجری کی اعلیٰ ڈگری (F.R.C.S) کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ کافی مدت وہاں رہے۔

سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء میں ڈگری لے کر واپس آئے کچھ عرصہ مشنری ہسپتال (HOLY FAMILY) راولپنڈی میں سرجن رہے لیکن سنہ ۱۹۶۷-۶۹ء میں پھر واپس انگلینڈ چلے گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر محمد اورنگ زیب خان مانکرائے تحصیل ہری پور ڈاکٹر بنے سنہ ۱۹۶۰ء سے مردان میں سول سرجن ہیں۔ ایک قابل ڈاکٹر اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ جراحی (SURGERY) سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں ڈاکٹر قاضی محب الرحمن ساکن بیدادی تحصیل مانسہرہ نے امتحان ڈاکٹری پاس کیا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں (D.P.H) پنجاب، سنہ ۱۹۵۹ء (T.D.D WALES) سنہ ۱۹۶۲ء میں (D.T.M & H) لورپول سے کیا۔ سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۶۱ء تک سابق صوبہ سرحد کے مختلف ہسپتالوں میں اسسٹنٹ سرجن رہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء سے سنہ ۱۹۶۷ء تک شمالی نائیجیریا (افریقہ) کی وزارت صحت کے مشیر رہے۔ ۴ر دسمبر ۱۹۶۷ء سے ڈاوڈر سینیٹوریم میں میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ خوش اخلاق، بیماروں کے ہمدرد اور ہزارہ کے قابل فخر ڈاکٹر ہیں۔ اس باب کی تکمیل میں انہوں نے میری امداد کی۔ اب وہ جنوری سنہ ۱۹۶۹ء سے پھر نائیجیریا چلے گئے ہیں۔

ڈاکٹر ناصر الدین اعظم خلف قاضی محمد اعظم صاحب رئیس نوثر ملک پورہ ایبٹ آباد نے سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹری کی سند لی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں M.R.C.P لندن اور F.R.C.P ایڈنبرا کی ڈگریاں امتیازی طور پر حاصل کیں۔ ہزارہ کے قابل فرزند اور ماہر فزیشن ہیں خیبر میڈیکل کالج (پشاور یونیورسٹی) میں علم طب (MEDICINE) کے پروفیسر ہیں۔

سنہ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر طارق محمود نے ڈاکٹری پاس کی (دونوں بھائی ہیں۔ شیخ عبدالحمید مرحوم سابق سکرٹری محکمہ تعلیم کے فرزند ہیں) ڈاکٹر طارق محمود نے سنہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں ناک۔ کان اور گلے EAR- (NOSE THROA) کا ڈپلومہ حاصل کیا۔

ڈاکٹر مسز ماجرہ جدون نے سنہ ۱۹۵۱ء میں ڈگری حاصل کی اور سابق صوبہ سرحد کے محکمہ سے منسلک ہو گئیں۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر رب نواز ساکن اوگی تحصیل مانسہرہ نے ڈاکٹری پاس کی اور محکمہ صحت سرحد میں ملازم ہو گئے۔ ڈاکٹر نیر رمضان خان ساکن بفہ نے سنہ ۱۹۵۵ء میں ایم بی بی ایس پاس کی اور صوبہ سرحد کی محکمہ صحت سے منسلک ہو گئے۔ شریف النفس، نیک طبیعت، قابل اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔ سرجری میں مہارت تام رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ناک، کان، گلے کی امراض کا ڈپلومہ (D.L.O) حاصل کیا۔

ڈاکٹر محمد یوسف ساکن بالاکوٹ نے سنہ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔

ڈاکٹر محمد بشیر خان خلف قاضی رحمت اللہ صاحب مرحوم ساکن ایبٹ آباد نے سنہ ۱۹۵۵ء میں امتحان ڈاکٹری پاس کیا۔ کچھ مدت محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کی۔ اب مانسہرہ میں پرائیویٹ پریکٹس کر رہے ہیں

اور بہت کامیاب ہیں۔

ڈاکٹر تاج محمد ساکن منگ (نزد کوٹ نجیب اللہ تحصیل ہری پور) نے سنہ ۱۹۵۶ء میں ڈاکٹری کی سند لی۔ تپ دق کا ڈپلومہ (T.D.D) حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں رزمک شمالی وزیرستان کے تپ دق کے ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ ڈاکٹر ملک محمود اختر خلف ملک عبدالرحمن صاحب ساکن ایبٹ آباد سنہ ۱۹۵۷ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ کچھ عرصہ محکمہ صحت سرحد سے منسلک رہے۔ آپ مریضوں کے ہمدرد، فرض منصبی کے پابند اور اپنے حلقہ میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ اب ملازمت چھوڑ کر اسلام آباد چلے گئے۔

ڈاکٹر مس نسیم ظفر بنت ظفر دین صاحب مرحوم دار الخیر ایبٹ آباد نے سنہ ۱۹۵۸ء میں سند ڈاکٹری حاصل کی۔ اور محکمہ صحت سرحد سے وابستہ ہیں۔ محمد عرفان ساکن پیر بانڈہ نزد لبفہ نے سنہ ۱۹۵۱ء میں سند ڈاکٹری حاصل کی۔ اب سنہ ۱۹۶۷-۶۹ء D.P.M کرنے کے لئے انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔

محمد مشتاق صاحب نے سنہ ۱۹۶۲ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔

رفیق الٰہی خلف بابو فضل الٰہی (الٰہی بلڈرز) ایبٹ آباد، سنہ ۱۹۶۱ء میں S.M.F. لیا کچھ عرصہ محکمہ صحت میں ملازمت کی پھر استعفیٰ دے کر حویلیاں میں پرائیویٹ پریکٹس شروع کی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے لئے (DOW MEDICAL COLLEGE) کراچی میں داخل ہوئے۔

ڈاکٹر رفعت سلطانہ قاضی بنت قاضی محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ ہری پور نے سنہ ۱۹۶۱ء میں خیبر میڈیکل کالج پشاور یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کیا۔ اور محکمہ صحت سے منسلک ہو کر چار پانچ سال لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں کام کیا۔ اس کے بعد وہ ایبٹ آباد سول ہسپتال میں آگئیں۔

مس سعیدہ حق ساکن ایبٹ آباد نے سنہ ۱۹۶۱ء میں ایم بی بی ایس کیا۔ سنہ ۱۹۶۲ء سے زنانہ ہسپتال ایبٹ آباد کی انچارج ہیں۔ ڈاکٹر داؤد الرحمن ساکن تو کر تحصیل ہری پور نے سنہ ۱۹۵۸-۵۹ء میں ڈاکٹری پاس کی سنہ ۱۹۶۰ء سے کراچی پوسٹ گریجوایٹ کالج سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر محمد اقبال خان پنی نے خیبر میڈیکل کالج پشاور سے سنہ ۱۹۶۴ء میں ڈگری حاصل کی۔ دو سال محکمہ صحت سرحد کے تحت پشاور لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں ملازمت کی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۶۶ء سے انگلینڈ میں ہیں۔ اور ایف آر سی ایس کرنے کا شوق ہے۔

حق نواز خان خلف نیاز علی خان طاہر خیلی نے سنہ ایم بی بی ایس کیا۔ کچھ مدت ہری پور میں پرائیویٹ پریکٹس کی پھر فوج میں چلے گئے۔ سنہ ۱۹۶۰ء سے کرنل ہیں اور راولپنڈی فوجی ہسپتال میں تعینات ہیں۔

علاؤ الدین خان خلف نصر اللہ خان طاہر خیلی نے سنہ ایم بی بی ایس کی۔ کچھ عرصہ ملازمت محکمہ سرحد میں کی پھر مزید ڈگری کے لئے انگلینڈ چلے گئے۔ کرنل عبدالعزیز ساکن ہری پور جنہوں نے شاید

۶۳-۱۹۶۲ء میں لاہور میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ بڑے ذہین خلیق اور علمی ذوق رکھتے تھے۔ فوج میں ملازم رہے ۱۹۶۹ء کے آخر میں عارضہ قلب سے وفات پائی۔ بہترین علمی کتابوں (فارسی عربی) کا ذخیرہ جمع کیا۔ جو ہر صنف علم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور بہت سی نایاب ہیں۔ ساری عمر کا سرمایہ انہوں نے ان کتابوں کی تلاش اور خریداری پر خرچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا ذاتی کتب خانہ اسی ہزار کتب پر مشتمل ہے جن میں کم از کم پانچ ہزار مسودات اور قلمی مخطوطے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ساکن ہری پور نے ۱۹۲۵ء میں ایل۔ ایس۔ ایم۔ ایف کا امتحان پاس کیا محکمہ صحت میں ملازمت پوری کرکے ریٹائر ہوئے کچھ عرصہ پشاور شہر میں پریکٹس کی۔ اور غالباً ۶۶-۱۹۶۵ء میں ہری پور آگئے اور وہاں اپنا کلینک کھولا۔ ڈاکٹر سعید احمد ساکن داتہ ۱۹۳۶ء میں امتحان پاس کیا۔ محکمہ صحت سرحد میں ملازم رہے۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں پولیس ہسپتال ایبٹ آباد سے ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر عبداللہ خان ساکن کوٹلی نے ۱۹۳۳ء میں ایل ایس ایم ایف کا امتحان پاس کیا۔

ہزارہ کے ایک ذہین اور شریف الطبع ڈاکٹری کے طالب علم کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ سید اسلم شاہ برادر پیر سرور شاہ صاحب ساکن صوابی میرا تھے۔ امتحان ڈاکٹری کے آخری سال تک پہنچ گئے۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ اور اس بہترین اخلاق سے مزین انسان نے تعلیم کے لب بام پہنچ کر ۱۹۴۰ء میں جان، جان آفرین کے سپرد کردی۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہ راجعون۔ ڈاکٹر ظہور الحق عثمانی خلف مولوی عبدالغفور صاحب آف رؤف براد رز ایبٹ آباد نے خیبر میڈیکل کالج پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء امتحان ایم بی بی ایس پاس کیا۔ اسی سال فوج میں ملازم ہو گئے ۱۹۶۹ء سے سرگودھا فوجی ہسپتال میں تعینات ہیں اور میجر ہیں۔ ڈاکٹر غلام ربانی لودھی مانسہرہ کے کہنہ مشق اور تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔ مدت سے اپنا پرائیویٹ کلنک کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ ڈاکٹر فتاح اللہ خان ایبٹ آباد کے مشہور پرائیویٹ پریکٹیشنر ہیں۔ آپ نے ایم بی بی ایس میڈیکل کالج بمبئی سے ۱۹۴۵ء میں پاس کی۔ آپ ضلع مردان کے رہنے والے ہیں۔ محکمہ صحت سرحد میں دو سال منسلک رہنے کے بعد ڈاڈر سینیٹوریم ہزارہ میں گذارے۔ پھر دو سال فوج میں ملازم رہے۔ اور ۱۹۵۰ء میں ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی اور یہاں ہی متوطن ہو گئے۔ آپ اصلاً موضع کھنڈہ تحصیل صوابی ضلع مردان کے رہنے والے ہیں۔

ڈاکٹر خورشید حسن برصغیر کی تقسیم کے بعد یہاں آئے آپ نے امرتسر میڈیکل کالج سے امتحان پاس کیا۔

ڈاکٹر محمد شریف مرحوم مہاجر ہری پور میں پریکٹس کرتے تھے۔ سیرت و صورت کا خوبصورت مرقع تھے۔ آپ ایل۔ ایس۔ ایم۔ ایف تھے ۶۷-۱۹۶۶ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہوئے۔ اللہ بخشے

اطوار شائستہ، گفتگو بے حد دلپذیر تھی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد خیبر میڈیکل کالج پشاور سے ضلع ہزارہ میں کافی تعداد میں ڈاکٹر کامیاب ہوئے۔

یہ فہرست مکمل نہیں۔ تاہم جتنا معلوم ہو سکا وہ بھی ڈاکٹر محب الرحمٰن صاحب قاضی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاڈر ہسپتال کا ہی مہیا کردہ مواد ہے۔ نام معہ سال کامیابی درج ذیل ہے۔

۱۔ ڈاکٹر محمد عرفان ساکن بانڈہ پیراں۔ نزد بفہ ۶۲-۱۹۶۱ء۔ ۲۔ ڈاکٹر اقبال لودھی مانسہرہ ۶۲-۱۹۶۱ء ۳۔ ڈاکٹر مسز نسرین ڈھوڈیال۔ ۴۔ ڈاکٹر ریاض جہانگیری مانسہرہ ۶۴-۱۹۶۳ء۔ ۵۔ ڈاکٹر مس مہرالنساء بالاکوٹ ۶۵-۱۹۶۴ء۔ ۶۔ ڈاکٹر فیروز بنگش بالاکوٹ ۶۲-۱۹۶۱ء۔ ۷۔ ڈاکٹر نذیر احمد دیگراں مانسہرہ ۶۶-۱۹۶۵ء۔ ۸۔ ڈاکٹر سلطان محمد کوٹمیاں بٹل ۶۶-۱۹۶۵ء۔ ۹۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل خاکی۔ ۱۰۔ ڈاکٹر محمد آصف گاندھیاں۔ ۱۱۔ ڈاکٹر منظور گردھی بالاکوٹ۔ ۱۲۔ ڈاکٹر اجمل ٹانڈہ مانسہرہ۔ ۱۳۔ ڈاکٹر کریم پاشا دیگراں ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۱۴۔ ڈاکٹر تاج ملک مانسہرہ ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۱۵۔ ڈاکٹر مس نسیم سحر بفہ ۶۸-۱۹۶۷ء ۱۶۔ ڈاکٹر ظہور ایبٹ آباد ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۱۷۔ ڈاکٹر سلطان نقوی ہری پور ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۱۸۔ ڈاکٹر مس شمع اشرف ایبٹ آباد ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۱۹۔ ڈاکٹر احمد خان مانسہرہ ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۲۰۔ ڈاکٹر نور وہاب شاہ بجنہ مانسہرہ ۶۸-۱۹۶۷ء۔ ۲۱۔ ڈاکٹر اسلم جہانگیری مانسہرہ ۶۴-۱۹۶۳ء

مندرجہ ذیل اسسٹنٹ میڈیکل افسران ۱۹۶۹ء سے ایم بی بی ایس کورس کے لئے زیر تعلیم ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر اسلم جہانگیری مانسہرہ۔ ۲۔ ڈاکٹر غلام سرور مانسہرہ۔ ۳۔ ڈاکٹر محمد رفیق ساکن سچہ مانسہرہ۔ ۴۔ ڈاکٹر جنید اختر لودھی ایبٹ آباد۔ ۵۔ ڈاکٹر محمد فیاض ایبٹ آباد۔

مزید ڈاکٹران ۱۔ ڈاکٹر محبوب الرحمٰن کپتان۔ برادر ڈاکٹر محب الرحمٰن قاضی ساکن بیدلوی ۱۹۶۲ء۔ ۲۔ ڈاکٹر عبداللہ جان لیٹر کوٹ۔ ۳۔ ڈاکٹر تاج محمد تنولی ساکن شیر گڑھ۔ ۴۔ ڈاکٹر محمد سلیم انجم ساکن داتہ۔ ۵۔ ڈاکٹر رب نواز ایم۔ ڈی ساکن ملوگا۔ (اُگی) میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سرگودھا۔ ۶۔ ڈاکٹر علی یحییٰ ایم آر سی پی ساکن شیخ آباد مانسہرہ۔ ۸۔ ڈاکٹر محمد ایوب ساکن عطر شیشہ۔ ۹۔ ڈاکٹر ظہیر ڈینٹل سرجن ساکن ایبٹ آباد ۱۰۔ ڈاکٹر نثار۔ ملک پورہ۔ ایبٹ آباد۔

نوٹ: خیبر میڈیکل کالج پشاور کا اجراء ۱۹۵۵ء میں ہوا۔ اس کے بعد سے ہزارہ کے بہت سے ڈاکٹر کامیاب ہوئے جن کی مکمل فہرست مہیا نہ ہو سکی۔

ہزارہ میں نظام تعلیم

علم اور اصحاب علم کی سرپرستی کی روایات اسلامی تہذیب کا ہمیشہ سے جزو رہی ہیں۔ یہ مسلمانوں کی خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے کبھی تعلیم کو بیچا اور نہ تصنیف کو۔ بلکہ اس کار خیر کو بلا مزد و تنخواہ اپنی زندگی کا مقصد اولیں سمجھا۔ کیونکہ ان کو یہ نکتہ خوب یاد تھا کہ انسان کو اس زمین کی خلافت علم ہی کی وجہ سے ملی تاریخ ہزارہ کی تدوین کے دوران یہ عقدہ بھی وا ہوا کہ کامیاب اور فلاح یاب افراد عموماً علماء و مدرسین کی اولاد سے ہوتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کے اجداد صاحب علم تھے۔ انہوں نے علم کی تبلیغ و توسیع میں عمریں بسر کر دیں۔ ان کی آمدنی بھی طیب اور شائبہ رشوت سے پاک تھی۔ خلفائے عباسیہ نے مشرق میں اور خلفائے بنو امیہ نے مغرب میں ان بیش قیمت یونانی علوم کو جو زوال کی حالت میں تھے۔ فنا ہونے سے بچایا۔ اور انہیں بنی نوع انسان کے واسطے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ خلافت عباسیہ کے زوال پر جو سلطنتیں بنیں انہوں نے ان روایات کو قائم رکھا۔ سلطان محمود غزنوی کا دربار اپنے عہد میں ایشیا کا سب سے مہذب اور متمدن دربار تھا۔ یہ شعراء و فضلاء عہد کا مرکز تھا۔

ہندوستان سلاطین دہلی (۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء) کے عہد میں علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ بلبن کے چالیس سالہ دور (۱۲۴۶-۱۲۸۶ء) میں علوم و فنون کو نمایاں ترقی ہوئی۔ تاتاری تاخت و تاراج کے بعد سے وسط ایشیا اور ایران کے بیشمار علماء و فضلاء پاک و ہند چلے آئے۔ علاؤالدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) اگرچہ خود اَن پڑھ تھا لیکن اس نے ملک میں وہ حالات پیدا کر دئے تھے جن میں عموماً علوم و فنون اور تمدنی ادارے پھلتے پھولتے ہیں۔ محمد بن تغلق سے بڑا عالم دہلی کے تخت پر شاید ہی کوئی بیٹھا ہو۔ اس کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ وہ اہل علم کی بے حد قدر کرتا تھا۔ اس کی قدر دانی کی خبر سن کر اسلامی ممالک کے بہت سے علماء اور فضلاء دہلی آ کر آباد ہو گئے۔ فیروز شاہ کو مذہبیات سے خاص شغف تھا۔ اس نے تیس بڑے مدرسے قائم کئے۔

عہد مغلیہ

علم کی سرپرستی کی روایات برابر قائم رہیں۔ اور بہتر ہوتی گئیں۔ ان کے امراء ان کے شہزادگان و وزراء کے دربار علم و فضل کا مرکز رہے۔ مغلیہ سلطنت جس طرح جہانبانی میں عروج پر تھی۔ اسی طرح علم و فضل بھی یہاں عروج پر رہے۔

عہد انگریزی میں پرانی بساط علم الٹ دی گئی۔ انہوں نے اپنی سلطنت کے لئے منشی و کلرک بنانے کے لئے علمی سطح کو پست تر کر دیا۔ انگریزی عملداری سے قبل اس علاقہ میں سرکاری مدارس نہ تھے۔ عہد مغلیہ کے آخری دور، درانیوں اور سکھوں کے عہد میں متفرق قصبوں میں مکتب جاری تھے۔ جن میں بچوں کو دینی تعلیم کے ساتھ نوشت و خواند کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ نوشت و خواند عموماً فارسی میں ہوتی تھی۔ اور ان تینوں حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی ہی تھی۔ اُردو کا رواج عام نہ تھا۔ شہری علاقوں میں کچھ لوگ اُردو میں نوشت و خواند کرتے تھے۔ جو اس وقت کی مروجہ اردو تھی۔ عام خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ خوانین و رؤساء کے بچے گھر پر ہی اپنے ہاں ملازم استادوں سے پڑھتے تھے۔ انگریزوں کی آمد پر جہاں جہاں نئے قصبات آباد ہوئے یا پہلے سے موجود تھے۔ وہاں سرکاری مدارس ابتدائی تعلیم کے لئے کھولے گئے۔ مگر دیہات میں وہی پرانا طریقہ بذریعہ مکتب جو مساجد میں ہوتے تھے جاری رہا۔ ائمہ مساجد ہی بچوں کو پڑھاتے تھے۔

انگریزی تعلیم کی بنیاد ہندوستان میں تعلیمی مقالہ میکالے جو ۱۸۳۵ء میں شائع ہوا کے بعد ہی پڑی اس تعلیم کی منشا اور روح کو سمجھنے کے لئے اسی میکالے کا قول تھا "ہم اس تعلیم سے ایک ایسی نسل تیار کریں جو بظاہر ہندو یا مسلمان ہو یعنی اس کی ظاہری قبا اپنے ہی مذہب کی ہو لیکن اندر خانے وہ یورپی فکر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ اس کے دل و دماغ اُن کے مذاہب کی روایتوں اور عصبیتوں سے یکسر مختلف ہوں۔ اور ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ "یہ صحیح ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو عیسائی نہیں بنا سکے لیکن ہم نے انہیں اپنے مذہب پر بھی رہنے نہ دیا۔ ہندو ہندو رہے نہ مسلمان مسلمان۔ وہ معاشرتی طور پر ہندو اور مسلمان ضرور ہیں لیکن مذہباً ہندو ہیں نہ مسلمان" انگریزوں کے اس مقصد کو علماء نے اپنی مومنانہ بصیرت سے دیکھ لیا تھا اس لئے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تھی۔ اسی مقالہ کی بناء پر ایبٹ آباد۔ ہری پور اور مانسہرہ میں مڈل سکول کھولے گئے۔ ایبٹ آباد میں انگریزی مڈل ۱۸۷۵ء میں۔ ہری پور میں انگریزی مڈل ۱۸۹۰ء میں کھولے گئے۔ ۱۸۹۰ء میں ہی بفہ اور کوٹ نجیب اللہ میں اردو مڈل کھولے گئے۔ ضلع کے ہر تھانہ میں ایک پرائمری سکول کھولا گیا جن کی تعداد ضلع میں پندرہ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مانسہرہ میں انگریزی مڈل سکول خان بہادر غلام ربانی خان ایڈووکیٹ کی مساعی سے ایک کچے مکان میں مانسہرہ کے شمال مشرقی کونہ میں کھولا گیا۔ خان بہادر صاحب خود ہیڈ ماسٹر بنے۔ اور باقی وکلاء مانسہرہ نے استادوں کے فرائض سنبھالے۔ جب چیف کمشنر سرحد سر مارمن بولٹن مانسہرہ کے دورہ پر آیا تو خان بہادر غلام ربانی خان اور ان کے رفقاء نے اس کا استقبال مانسہرہ شہر کے بھوت کنٹھہ کے پل پر کیا۔ پل سے سکول تک سڑک پر ریشمی کپڑا ڈال

کا فرش کر دیا گیا تھا۔ چیف کمشنر نے سکول کا معائنہ کیا۔ استقبال اور کارکردگی سکول سے خوش ہو کر اسی وقت حکم دے دیا کہ گورنمنٹ اس سکول کو اپنی تحویل میں لے لے۔ یہ سکول ۱۸۸۱ء میں ہائی ہو گیا۔

دیہات میں نظامِ تعلیم عموماً بذریعہ مکتب ہی رہا۔ یا چند پرائمری سرکاری سکول تھے۔ مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت کے پرائمری مدارس کے پاس شدہ طلبا آج کل کے میٹرک کے برابر قابلیت رکھتے تھے۔ وجہ زیادہ تر مادری زبان میں تعلیم اور پختہ عمر سے تعلیم کی ابتدا ہوتی تھی۔ اس وقت عموماً سات سال سے اوپر کے بچے پرائمری مدارس میں داخل ہوتے تھے۔ فی زمانہ چار پانچ سال کے بچہ کو داخل مدرسہ کیا جاتا ہے۔ انگریزی مدارس کے خلاف شروع شروع میں علمائے اسلام نے اعتراض کیا۔ علماء کا اعتراض اصولاً ٹھیک تھا۔ لیکن حالاتِ زمانہ بدل چکے تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریزی زبان کا سکّہ جاری تھا۔ اور اسی زبان میں قابلیت، معیارِ ترقی ٹھہری۔ غیر مسلم یعنی ہندوؤں اور سکھوں نے اس طریقِ تعلیم کو فوراً اختیار کر لیا۔ سرکاری ملازمتوں اور سرکاری کاروبار میں نوکریاں اور روزگار حاصل کرنے میں سبقت لے گئے۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں اور دیگر ذرائع روزگار سے محروم ہو رہے تھے اور سکھ، ہندو اقتصادی پہلو سے مسلمانوں پر غالب آ رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر سر سید احمد خان[1] مرحوم اور ان کے رفقائے کار نے علماء کے فتووں کی تردید کی اور آخر کار مسلمان بھی انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے۔ ضلع ہزارہ میں سب سے پہلے ایبٹ آباد ۱۸۶۲ء اور ہری پور اور مانسہرہ میں مڈل سکول کھولے گئے۔ یہ ڈسٹرکٹ بورڈ کی تحویل میں تھے۔ سب سے پہلے ایبٹ آباد کا مڈل سکول ۱۹۱۱-۱۲ء میں ہائی سکول بنا دیا گیا۔ اسی سکول سے سر فضل حسین جیسے نامور آدمی نے انٹرنس پاس کیا۔ جو صوبہ پنجاب کا وزیر اور بعد میں مرکزی حکومت کا وزیر ہوا۔ انہی ایام میں ایبٹ آباد کے ہندوؤں نے ایک ہائی سکول بنایا۔ ۱۹۵۰ء تک یہ میٹرک سکول پنجاب یونیورسٹی سے ملحق رہے۔ پہلے طلباء ہزارہ کو میٹرک کے امتحان کے لئے راولپنڈی جانا پڑتا تھا۔ بعد میں ان امتحانات کے سنٹر یہاں ہی بنائے گئے اس سے کئی سال بعد ہری پور اور مانسہرہ کے مڈل سکول بھی درجہ میٹرک تک بڑھا دئے گئے۔ اُدھر دیہات میں بھی چند پرائمری سکول درجہ لوئر مڈل تک بڑھا دئے گئے۔ بتدریج مدارس کے درجات اور تعداد دونوں بڑھنے لگے۔ سال ۱۹۱۳ء تک یہی رفتار قائم رہی۔ اسی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں ایبٹ آباد ہری پور اور مانسہرہ کے مدارس سرکاری تحویل میں آ گئے۔ اس سے پہلے ڈسٹرکٹ بورڈ کی تحویل میں رہے

---

[1] سر سید احمد خان ایک عالی دماغ، عالم فاضل، مدبر، سیاست دان، ایثار و محبت کا مجسمہ کچھ جیالا دہلی کی خاک سے اٹھا اور ہندوستان پر چھا گیا۔

غیر مسلم اقوام یعنی ہندوؤں۔ سکھوں اور عیسائیوں نے بھی اپنے اپنے الگ مدارس ضلع کے تینوں قصبوں میں کھول دئے۔ ایبٹ آباد میں پہلا غیر مسلم سکول البرٹ وکٹر اینگلو ورنیکلر ویدک مڈل سکول تھا۔ جو ۱۹۰۲ء سے پہلے کھولا گیا۔ اسی طرح ہری پور اور مانسہرہ میں بھی ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے اپنے ابتدائی مدارس الگ الگ جاری کئے۔ تعداد طلباء ابتداءً بہت تھوڑی ہوتی تھی یعنی پرائمری مدارس میں ۲۵، ۳۰ تک۔ مڈل سکول میں ۱۰۰-۵۰ تک اور ہائی میں ۱۵۰-۲۵۰ تک۔

تعلیم نسواں۔ اس ضلع میں حال ہی میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے لگی ہے۔ اس کا رواج ۱۹۴۰-۵ء سے ترقی پذیر ہوا ہے۔ اب تو ضلع بھر میں زنانہ مدارس، لڑکوں کے پرائمری مڈل اور سکولوں کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں یہاں تک کہ اب مردانہ کالجوں کے ساتھ زنانہ کالج بھی کھل چکے ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے پہلے اس ضلع کے باشندگان کی بی اے کی تعداد درجن سے بھی کم تھی۔ سب سے پہلے گریجوایٹ ملک شاہ سوار خان رئیس جاگل تحصیل ہری پور تھے۔ جو پہلے منصف اور بعد میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوئے ۱۹۲۳ء میں اس ضلع کے صرف دو ایم اے تھے جو محکمہ تعلیم میں بطور معلم ملازم تھے۔

دینی اسلامی تعلیم اس ضلع میں باقی اضلاع سرحد کے مقابلہ میں اچھی ہوتی رہی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں چند قدیم علماء خاندان لوگوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے اور پنجاب و سرحد کے دور افتادہ مقامات سے طلباء یہاں آ کر دینی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۳ء کے لگ بھگ دینی تعلیم کا مرکز ایبٹ آباد تھا۔ جہاں ایک بلند پایہ عالم و محدث جو درویش صفت انسان تھا مسجد صدر ایبٹ آباد میں قرآن و حدیث و دیگر علوم کا درس دیا کرتا تھا۔ آپ کا نام نامی الحاج محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجوی (موضع گنجہ نزد کوٹ نجیب اللہ تحصیل ہری پور) تھا ان سے پہلے سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ جو بعد میں دیوبند تشریف لے گئے امام مسجد و خطیب تھے۔ وہ بھی ایک مشہور عالم استاد حدیث بلکہ حافظ حدیث تھے۔ ان کے علاوہ سکندر پور اور درویش (ہر دو مواضعات تحصیل ہری پور) میں علماء دین کے خاندان تھے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

فنی تعلیم۔ ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم برصغیر سے پہلے اس ضلع میں فنی لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن اس دَور میں چند نامور اشخاص ضلع ہزارہ نے پیدا کئے جنہوں نے یہ تعلیم ضلع سے باہر حاصل کی۔ اور نام پیدا کیا۔ اب تو انشاءاللہ اس میدان میں ضلع ہزارہ کے فرزندان کسی سے پیچھے نہیں ۔

افسرانِ محکمہ تعلیم (ڈسٹرکٹ انسپکٹران)

اعلیٰ تعلیم۔ پاکستان بننے کے بعد اس ضلع میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے مردانہ اور زنانہ کالجوں کا افتتاح ہونے لگا۔ چنانچہ اس وقت تین مردانہ کالج (ایک ڈگری کالج ایبٹ آباد۔ ایک ڈگری کالج ہری پور ایک انٹرمیڈیٹ کالج مانسہرہ) اور ایک زنانہ ڈگری کالج ایبٹ آباد میں اور ایک زنانہ پائلٹ سکنڈری سکول ہری پور میں چل رہے ہیں۔

ہزارہ کے ممتاز حضرات یا انجمنیں جنہوں نے میدانِ تعلیم میں یا اشاعتِ تعلیم میں کوششیں کی تھیں بہت تھوڑے ہیں۔ مثلاً انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد۔ ۲۔ ہندو مہا سبھا ایبٹ آباد۔ ۳۔ سنگھ سبھا ایبٹ آباد و ہری پور۔

افراد: ۱۔ شیخ نور احمد صاحب مرحوم وکیل لاہوری۔ ۲۔ میر ولی اللہ صاحب مرحوم وکیل ایبٹ آبادی۔ ۳۔ سیٹھ موسیٰ جی مرحوم ایبٹ آبادی۔ ۴۔ رائے صاحب سیٹھ جواہر لال۔ ۵۔ رائے بہادر رو چارام۔ ۶۔ رائے بہادر ایشرداس۔ ۷۔ رائے بہادر دیوان چند او بھرائے۔ ۸۔ خان محمد عباس خان مرحوم ساکن مانسہرہ۔ ان کے علاوہ ضلع کے بعض رؤسا اور خوانین بھی تعلیم میں دلچسپی لیتے رہے۔

دینی مدارس: ماہنامہ "البلاغ" کراچی اپنے ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق مارچ ۱۹۶۹ء میں لکھتا ہے کہ ضلع ہزارہ میں مشہور مدارس عربیہ کی تعداد ۲۱ مئی ۱۹۵۵ء تک آٹھ تھی۔ یہ مدارس علمائے اسلام نے بے سروسامانی، گوناگوں مصائب اور ناموافق حالات میں بقائے اسلام کے لئے پاکستان کے دونوں حصوں میں دین کی مشعلیں روشن کرنے کے لئے بنائے۔ عربی درسگاہوں کے معاشرہ پر مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

۱۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی تہذیب میں مدغم ہونے سے بچائے رکھا اور ہندو تہذیب کو اسلامی تہذیب پر غالب نہ ہونے دیا۔ ۲۔ مغربی تہذیب سے مسلمانوں کی اکثریت کو محفوظ رکھا۔ ۳۔ مسلمانوں پر مسیحی تبلیغ کو جس کی پشت پر انگریزی حکومت تھی کے اثر و رسوخ کو اثر انداز نہ ہونے دیا۔ اور مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد سے محفوظ رکھا۔ ۴۔ آریہ سماج کی شدھی کی تحریک کے فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ ۵۔ انگریزوں نے اسلامی قوت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے جو فتنے بھی اٹھائے ان کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۶۔ یورپی مستشرقین کی تصنیفات کا منہ توڑ جواب دیا۔ ۷۔ اسلامی معاشرہ کا اخلاق اسلامی حیات آثار

نمایاں کئے۔ ۸۔ عالمِ اسلامی اخوت کے جذبہ کو بیدار رکھا اور مضبوط کیا۔ ۹۔ پاکستان کے لئے مسلم لیگ کی تحریک کو کامیاب نظریۂ اسلامی دیا۔ ۱۰۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں اور بھر خطۂ پاکستان میں اکثریت انہی کی تبلیغ کا نتیجہ تھی جس سے غیر مسلم اقوام حلقہ بگوش اسلام ہو کر مسلمانوں کی اکثریت کا باعث بنیں۔

ضلع ہزارہ میں ۱۹۶۵ء میں سکولوں کی تعداد حسب ذیل ہے:-

پرائمری سکول ۸۱۶۔ ان میں پرائمری سکول ایبٹ آباد ۱۸۶۷ء۔ ۲۔ بالاکوٹ ۱۸۶۹ء۔ ۳۔ غازی ۱۸۶۷ء ۴۔ گڑھی حبیب اللہ ۱۸۶۱ء۔ ۵۔ خان پور ۱۸۶۲ء۔ ۶۔ لنگڑیال ۱۸۶۷ء۔ ۷۔ شیروان ۱۸۹۲ء۔ ۸۔ ہری پور ۱۸۶۷ء۔ ۹۔ کوٹ نجیب اللہ ۱۸۶۷ء۔ ۱۰۔ امرائے صالح ۱۸۶۷ء میں کھولے گئے یہ کل دس سکول تھے۔

بیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں میں کل ۵۴ پرائمری سکول کھولے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ اربوڑہ ۱۹۲۰ء۔ ۲۔ بکوٹ ۱۹۱۳ء۔ ۳۔ بھگنوتر ۱۹۱۲ء۔ ۴۔ باندھی میرا ۱۹۲۰ء۔ ۵۔ بٹل ۱۹۰۱ء۔ ۶۔ بائی بالا ۱۹۲۳ء۔ ۷۔ چنجاہ ۱۹۲۶ء۔ ۸۔ دھرڑیال ۱۹۱۶ء۔ ۹۔ درگرہی ۱۹۱۱ء۔ ۱۰۔ ڈھیری نقارچیاں ۱۹۲۶ء۔ ۱۱۔ گڑھی پھوگڑاں ۱۹۱۹ء۔ ۱۲۔ گیدڑپور ۱۹۲۶ء۔ ۱۳۔ کھن کلاں ۱۹۲۳ء۔ ۱۴۔ کوائی ۱۹۱۲ء۔ ۱۵۔ خوشالہ ۱۹۱۴ء۔ ۱۶۔ لساں ۱۹۲۶ء۔ ۱۷۔ ماتڑائے ۱۹۱۶ء۔ ۱۸۔ منگ ۱۹۱۳ء۔ ۱۹۔ منگلور ۱۹۲۶ء۔ ۲۰۔ مرلفہ کلاں ۱۹۲۳ء۔ ۲۱۔ ملکاں ۱۹۲۳ء۔ ۲۲۔ نجف پور ۱۹۲۵ء۔ ۲۳۔ نمتال ۱۹۲۰ء۔ ۲۴۔ پھلکوٹ ۱۹۲۶ء۔ ۲۵۔ پھلاڑہ ۱۹۱۵ء۔ ۲۶۔ اسریاں ۱۹۲۶ء۔ ۲۷۔ سنگر ۱۹۲۳ء۔ ۲۸۔ سچہ کلاں ۱۹۱۹ء۔ ۲۹۔ سکدھر ۱۹۲۶ء۔ ۳۰۔ صابر شاہ ۱۹۱۳ء۔ ۳۱۔ شیخ البانڈی ۱۹۱۲ء۔ ۳۲۔ سلہڈ ۱۹۱۲ء۔ ۳۳۔ سرائے گدائی ۱۹۲۸ء۔ ۳۴۔ سری کوٹ ۱۹۱۱ء۔ ۳۵۔ ترنوائی ۱۹۱۶ء۔ ۳۶۔ تربیت ۱۹۲۳ء۔ ۳۷۔ مانسہرہ ۱۹۱۲ء۔ ۳۸۔ ترپایا ۱۹۲۱ء۔ ۳۹۔ ٹانڈہ ۱۹۱۲ء۔ ۴۰۔ اوگرہ ۱۹۱۳ء۔ ۴۱۔ اوگی ۱۹۰۱ء۔ ۴۲۔ بھوجا ۱۹۲۶ء۔ ۴۳۔ بیدادی ۱۹۳۰ء۔ ۴۴۔ باندہ گساج ۱۹۲۶ء۔ ۴۵۔ بھوگرمنگ ۱۹۲۶ء۔ ۴۶۔ باندہ پیراں ۱۹۱۲ء۔ ۴۷۔ باگڑیاں ۱۹۱۶ء۔ ۴۸۔ ویگراں ۱۹۳۰ء۔ ۴۹۔ حویلیاں سٹیشن ۱۹۱۳ء۔ ۵۰۔ جاگل ۵۱۔ جہانگیرہ (ایبٹ آباد تحصیل) ۱۹۱۲ء۔ ۵۲۔ شنگی (مانسہرہ) ۱۹۰۸ء۔ ۵۳۔ مقاکھی (مانسہرہ) ۱۹۱۳ء۔ ۵۴۔ پنیاں ۱۹۰۲ء۔

باقی سب سکول ۱۹۳۰ء سے بعد کے ہیں اور ان سکول میں نوے فیصدی کے قریب ۱۹۶۰-۶۵ء کے درمیان کھولے گئے۔ مڈل سکول۔ کل تعداد ۶۵ ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ ۱۔ بجالی مانسہرہ ۱۸۸۳ء۔ ۲۔ بریلہ (ہری پور) ۱۸۶۲ء۔ ۳۔ بھیرہ (علاقہ خان پور) ۱۸۹۶ء۔ ۴۔ رجوعیہ (ایبٹ آباد) ۱۸۸۳ء۔ ۵۔ ڈھوڈیال (مانسہرہ) ۱۸۸۵ء۔ ۶۔ شیرپور (مانسہرہ) ۱۸۸۳ء۔ ۷۔ دمتوڑ

(ایبٹ آباد) ۱۸۶۲ء ۸۔ شنکیاری ۱۸۹۵ء سے جاری ہیں۔ اکیس سکول ۱۹۴۳ء تک اور باقی ۳۶ سکول ۱۹۶۸ء تک کے عرصہ میں بنائے گئے۔ ہزارہ کے مڈل سکولوں کے امتحانات ۱۹۰۵ء تک راولپنڈی میں ہوتے رہے ۱۹۰۶ء میں نارمل سکول پشاور میں بن گیا۔ تو پھر یہ امتحانات یہاں ہی ہوتے رہے۔ انٹرنس کے امتحانات بھی راولپنڈی میں ہوتے رہے اغلباً ۱۹۲۰-۲۱ء تک بعد میں صوبہ سرحد کے مرکزی مقامات پر ہونے شروع ہو گئے۔

ہزارہ کے ہائی سکول

تحصیل ہری پور۔ ۱۔ ہری پور ۲۔ ہری پور ۳۔ سرائے صالح ۴۔ کوٹ نجیب اللہ ۵۔ پنیاں ۶۔ سری کوٹ ۷۔ دربند ۸۔ تربیلہ ۹۔ غازی ۱۰۔ خان پور ۱۱۔ ٹیلیفون فیکٹری ہری پور سرائے نعمت خان۔ (ہری پور میں ایک ٹریننگ سکول برائے جونیئر استاداں) تحصیل ایبٹ آباد۔ ۱۔ ایبٹ آباد ۲۔ ایبٹ آباد۔ ۳۔ نواں شہر ۴۔ خانس پور ۵۔ بھگنوتر ۶۔ جوبلیاں ۷۔ شیروان ۸۔ بورا ۹۔ بکوٹ

تحصیل مانسہرہ۔ ۱۔ مانسہرہ ۲۔ گڑھی حبیب اللہ ۳۔ بالاکوٹ ۴۔ کاغان ۵۔ بفہ ۶۔ بٹل ۷۔ اوگی ۸۔ بٹگرام ۹۔ کوزہ بانڈہ ۱۰۔ منگلور

ہزارہ کے کالج۔ ۱۔ ڈگری کالج ایبٹ آباد ۲۔ زنانہ ڈگری کالج ایبٹ آباد ۳۔ مردانہ انٹرمیڈیٹ کالج ہری پور ۴۔ مردانہ انٹرمیڈیٹ کالج مانسہرہ۔

ان سرکاری تعلیم گاہوں کے علاوہ مندرجہ ذیل سکول بھی ہیں۔

۱۔ ہری پور۔ اسلامیہ رحمانیہ سکول ۲۔ ماڈرن پبلک سکول زیر سرپرستی علامہ ابوالخیر صاحب ایبٹ آباد برن ہال مشنری سکول ۱۔ جونیئر اور سینیئر ۲۔ پبلک سکول نزد پیلس ہوٹل ۳۔ ماڈرن کنٹونمنٹ گرلز ہائی سکول ۴۔ ماڈرن پبلک ہائی سکول نزد بنگلہ خان سردار بہادر خان

مانسہرہ۔ پبلک سکول زیر سرپرستی غلام ربانی خان صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس ہزارہ۔

ایبٹ آباد میں ایک سرکاری تعلیمی ادارہ موسوم بہ ایجوکیشن ایکسٹینشن سنٹر (سکندر آباد) بھی کام کر رہا ہے۔

ہزارہ کی چند معروف علمی ہستیاں

تحصیل ہری پور۔ ۱۔ ملک غلام احمد صاحب ساکن تلوکر ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہزارہ ۲۔

نوٹ: ہری پور ایبٹ آباد اور مانسہرہ میں زنانہ ہائی سکول بھی ان کے علاوہ ہیں۔

پرنسپل ٹریننگ سکول ہری پور ۲۔ علامہ ابوالخیر صاحب سربدکوٹ نجیب اللہ ایم اے۔ ایم او ایل۔ ایس اے۔ وی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر حال پرنسپل ماڈرن پبلک سکول۔ ۳۔ قاضی محمد عبداللہ صاحب ایس۔ وی۔ ایچ پی ٹی اے وی ریٹائرڈ ایس وی ٹریننگ سکول ہری پور۔ ۴۔ راجہ خان بہادر خان ساکن مانکرائے بی ایس سی ریٹائرڈ، پرنسپل ٹریننگ سکول ہری پور۔ ۵۔ میاں افضل خان صاحب بی اے بی ٹی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر

تحصیل ایبٹ آباد۔ ۱۔ مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گنجوی ثم ایبٹ آبادی ۲۔ حافظ محمد شریف صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر نواں شہر ۳۔ عبداللہ جان خان ریٹائرڈ پرنسپل ٹریننگ سکول ۴۔ گوہر الرحمٰن عباسی صاحب ریٹائرڈ پرنسپل ٹریننگ سکول۔ ۵۔ عبدالمجید خان صاحب ساکن دارالخیر ناظم تعلیم حیدر آباد۔ (۱۹۶۸ء میں پنشن پر آ گئے)

تحصیل مانسہرہ ۱۔ غلام ربانی خان صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس

۲۔ عبدالرؤف خان صاحب ایم اے بی ٹی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بفہ ہائی سکول۔ ۳۔ عبدالمالک خان صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بفہ ہائی سکول۔ ۴۔ سردار بدر الاسلام ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کوہاٹ۔ ۵۔ سید نور احمد شاہ ساکن کاغان ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس ہزارہ۔ ۵۔ محمد فریدون خان صاحب بی اے بی ٹی پرنسپل

۶۔ لالہ عمر خان صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر بالاکوٹ۔ ۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شاہ صاحب ساکن منگلور ریٹائرڈ پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔ آپ علم و ادب کے مہتاب ہیں۔ اور پاکستان میں سرخیل مجلس علم و ادب ہیں۔

۸۔ مس برکت سلطانہ ڈپٹی انسپکٹرس پشاور۔ مس عطارد ہیڈ مسٹرس مانسہرہ گرلز ہائی سکول اور مسز سائرہ جدون ڈسٹرکٹ انسپکٹرس زنانہ مدارس ہزارہ۔ ۹۔ بیسویں صدی کے چند پرانے استاد۔ بخشی امیر چند کوٹ نجیب اللہ مولوی فیروز خان مرحوم ساکن بھیرہ۔ پیر رحمت شاہ لورہ۔ مولوی فضل احمد ساکن ترناوہ (خان پور) مولوی محمد یوسف صاحب ساکن تلوکر۔ قاضی عبدالخالق صاحب ساکن ہری پور۔ ماسٹر غلام یحییٰ صاحب ساکن بفہ۔ ماسٹر حسام الدین صاحب ساکن کیہال ایبٹ آباد۔ آپ علم ریاضی کے حافظ ہیں ۱۹۶۶ء سے کمزوری نظر کی وجہ سے خانہ نشین ہیں۔ حافظہ اسی طرح ہے۔ سید فدا حسین ساکن کوٹ نجیب اللہ ریٹائرڈ پروفیسر۔ قاضی محمد عبداللہ صاحب ساکن خانپور سابق ٹیچر حال وکیل مانسہرہ۔ خواجہ عبدالرشید بی اے۔ بی ٹی ساکن میاں ڈھیری۔ حال وکیل ایبٹ آباد۔

۱۰۔ پشاور یونیورسٹی۔ چودھری محمد علی صاحب ساکن ایبٹ آباد وائس چانسلر ۱۹۶۹ء میں ریٹائرڈ سید محمد شوکت صاحب ساکن خان پور کنٹرولر امتحانات پشاور یونیورسٹی

۱۱۔ چند اور نام۔ شیخ عبدالحمید مرحوم متوفی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء ساکن ہری پور سابق سکنڈری تعلیم سنٹر۔

کرنل میر حفیظ اللہ ایم اے بی ٹی خلف میر ولی اللہ صاحب مرحوم۔ پروفیسر محمد ظفر مرحوم برادر علامہ ابوالخیر ہری پور۔ کرنل احباب اللہ ایم اے بی ٹی مانسہرہ۔ کرنل شیخ حمید ابراہیم ایم اے پرنسپل لارنس کالج گھوڑا گلی۔

افسرانِ محکمہ تعلیم ضلع ہزارہ ڈسٹرکٹ انسپکٹران

حسب خواہش مکمل فہرست نہ مل سکی۔ چند افسران و ہیڈ ماسٹر صاحبان سے تبادلۂ خیالات سے جو فہرست بن سکی وہ درجِ ذیل ہے:۔

۱۔ عبد الغنی صاحب انبالوی زمانہ اغلباً ۱۸۹۷ء۔ ۲۔ خواجہ احمد حسن صاحب کانگڑوی۔ ۳۔ شیخ مفضل الٰہی صاحب ۱۹۰۰ء۔ ۴۔ مولوی احمد شفیع صاحب وزیر آبادی ۱۹۰۵ء۔ ۵۔ بابو محمد شفیع صاحب سیالکوٹی۔ آپ یہاں آنے سے پہلے دفتر ناظم تعلیم سرحد پشاور میں ہیڈ کلرک تھے۔ فرشتہ سیرت انسان تھے مرض نمونیہ سے فوت ہوا۔ زمانہ اغلباً ۱۹۱۱ء۔ ۵۔ قاضی عنایت اللہ سیالکوٹی ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۳ء۔ ۶۔ بابا محمد امین گجراتی ۱۹۱۳ء-۱۹۲۰ء حنائی سر اور داڑھی۔ گھوڑوں کے شوقین۔ ۷۔ مولوی غلام حسین وزیر آبادی ۸۔ خان صاحب شیخ اللہ دین ۱۹۲۳ء ۱۹۲۷ء۔ ۹۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب وزیر آبادی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء۔ آپ کے وقت سکولوں میں نماز با جماعت پابندی سے شروع ہو گئی۔ وہ نماز با جماعت پر زور دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ہندو استاد بھی لڑکوں کو نماز کی تاکید کرنے لگے۔ آپ کسی کی روٹی نہ کھاتے تھے ایک دفعہ بانڈھی ڈھونڈاں کے خوانین کی روٹی نہ کھائی تو انہوں نے بازار والوں کو بھی ان کو روٹی دینے سے منع کر دیا۔ قانون کے سخت پابند تھے۔ کاغذات دفتر بڑی تحقیق سے پڑھ کر دستخط کیا کرتے تھے ایک اسسٹنٹ نے جب کچھ کاغذات برائے دستخط پیش کئے تو کہنے لگے کہ مسلمانوں کی طرح دستخط کروں یا ہندوؤں کی طرح۔ اور کہا کہ مسلمان دستخط کرکے پھر کاغذ پڑھتا ہے ہندو پڑھتا پہلے ہے اور دستخط بعد میں کرتا ہے۔ ۱۰۔ مولوی محمد عالم ۱۹۳۲ء-۱۹۳۵ء۔ ۱۱۔ شیخ فصیح الدین ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء ۱۲۔ حافظ عبد الحمید لاہوری ۱۹۴۰ء-۱۹۴۳ء۔ ۱۳۔ بی سی رتڑا ہنوچی ۱۵ر اگست ۱۹۴۵ء تا ۷ر ستمبر ۱۹۴۷ء۔ ۱۴۔ سید نور احمد شاہ ہزارہ ۸ر ستمبر ۱۹۴۷ء تا ۲۲ر نومبر ۱۹۴۷ء۔ ۱۵۔ مولوی محمد مسعود الرحمٰن صاحب ایم اے ایس اے وی (ہزاروی) ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء تا ۱۲ر نومبر ۱۹۵۰ء ۱۶۔ ملک غلام احمد صاحب ہزاروی ایم اے۔ ڈی (انگلینڈ) ۱۳ر نومبر ۱۹۵۰ء تا ۸ر اپریل ۱۹۵۳ء ۱۷۔ چودھری خیر دین بی اے بی ٹی (پنجابی) ۸ر اپریل ۱۹۵۳ء تا ۱۵ر جولائی ۱۹۵۶ء۔ ۱۸۔ محمد یعقوب خان صاحب بی۔ ایس۔ سی بی ٹی ۱۶ر جولائی ۱۹۵۶ء تا ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۸ء۔ ۱۹۔ عبد الرشید خان صاحب

پنجابی بی اے۔ بی ٹی ۲ر فروری ۱۹۵۹ء تا ۱۴ر اپریل ۱۹۶۰ء۔ ۲۲۔ غلام حیدر خان بی اے بی ٹی ۱۴ر اپریل ۱۹۶۰ء تا ۲۴ر جون ۱۹۶۰ء۔ ۲۳۔ عبد الحمید قریشی بی اے۔ بی ٹی ہنگو کوہاٹ ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء تا ۱۳ر اپریل ۱۹۶۳ء۔ ۲۴۔ سید نور احمد شاہ بی اے بی ٹی ہزاروی ۱۶ر اپریل ۱۹۶۳ء تا ۳ر مارچ ۱۹۶۷ء ۲۵۔ محمد اسحاق صاحب ایم اے۔ ڈی ۴ر مارچ ۱۹۶۷ء تا ۳ر مئی ۱۹۶۷ء۔ ۲۶۔ سید نور احمد شاہ بی اے بی ٹی ۴ر مئی ۱۹۶۷ء تا حال۔ عبد القادر خان بی اے بی ٹی (ہنگو کوہاٹ) ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۱ء تا ۴ر اپریل ۱۹۶۳ء

ان میں بہت سے حضرات پہلے بطور ہیڈ ماسٹر صاحبان ہائی سکول خدمات سرانجام دیتے رہے اور بعد میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہوئے۔ ان میں ضلع ہزارہ کے باشندے صرف تین ہی ہیں۔ ۱۔ ملک غلام احمد صاحب (ٹکوکر) مولوی مسعود الرحمٰن صاحب گنجوی ثم ایبٹ آبادی اور سید نور احمد شاہ صاحب (کاغان) باقی سب حضرات پنجاب کے تھے۔

محکمہ تعلیم کے صوبائی اعلیٰ افسران میں سے مفصلہ ذیل اشخاص نے بحیثیت صوبائی انسپکٹر صاحبان اس ضلع کی تعلیمی (جو ضلع راولپنڈی کے انسپکٹر تھے۔) خدمات ۱۹۱۱ء تک سرانجام دیں۔ اس سے پہلے ہزارہ انسپکٹر حلقہ راولپنڈی کے ماتحت تھا۔

۱۔ نیاز علی خان۔ ۲۔ مولوی عمر دین صاحب مرحوم۔ ۳۔ خلیفہ عماد الدین صاحب لاہوری مرحوم۔ آپ بہت عرصہ تک انسپکٹر مدارس رہے۔ ۳۔ خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (خلف شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب حالی)۔ ۴۔ مولوی فیروز الدین صاحب مرحوم۔ ۵۔ خان صاحب مرزا علی محمد خان صاحب مرحوم۔ آپ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک انسپکٹر ورنیکلر صوبہ سرحد رہے۔ آپ کو ذاتی قابلیت و کارکردگی پر انڈین ایجوکیشنل سروس کا ممبر بنایا گیا۔ آپ کی وفات ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ ۶۔ خان صاحب حاجی کریم بخش صاحب مرحوم۔ ان حضرات میں کوئی بھی ضلع ہزارہ کا باشندہ نہ تھا۔

نوٹ۔ ۱۹۰۸ء محکمہ آثار قدیمہ کے سربراہ ڈاکٹر سر آرل سٹائن نے عارضی طور پر تمام سرحدی سکولوں کا معائنہ کیا۔ وہ مشرقی زبانوں کا عالم تھا۔ اس نے ایشیا کے اکثر ملکوں کی سیاحت کی تھی اس کی زندگی کا سرمایہ اس کی بیش بہا کتابوں کی لائبریری تھی۔ اس کے زمانہ میں تمام سکولوں کو احکام جاری کئے گئے کہ سال میں ایک دفعہ سب سکولوں کے بچے اردگرد کے مقامات کا سفر کیا کریں۔ اور ان مقامات کی کیفیت و تاریخی حالات تحریر کیا کریں۔ ان سب حالات کا خلاصہ سکول کا انچارج استاد ڈسٹرکٹ انسپکٹر کو بھیجا کرتا تھا۔ اور پھر سب ضلع کا خلاصہ ڈاکٹر ارل سٹائن کو بھیجا جاتا۔

۱۹۱۰ء میں صوبہ سرحد کے سررشتہ تعلیم کا ڈائرکٹر مسٹر جے۔ اے رچی (RICHEY)

مقرر ہوئے اور اس کے ساتھ مرزا علی محمد خان انباٹوی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں انگریزی شعبہ کے امتحانات کے لئے مسٹر گیچ (G.H. GEACH) مقرر ہوئے۔ وہ اساتذہ کے ٹریننگ سکول پشاور کے پرنسپل بھی تھے بہت ہی لائق۔ اس کے آنے سے مرزا علی محمد خان کو ورنیکلر مضامین کا انسپکٹر مقرر کیا گیا اور آپ کو (I.E.S) انڈین ایجوکیشنل سروس کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۲۵ء میں بعارضہ تپ دق انتقال کر گئے صوبہ سرحد تعلیمی شعبہ ان کا مرہون منت ہے۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔

اس باب کی تکمیل میں مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس (گنجوی ثم ایبٹ آبادی) علامہ ابوالخیر ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر و حال پرنسپل ماڈرن پبلک سکول ہری پور اور قاضی عبدالخالق صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر (آپ اپریل ۱۹۴۶ء میں ریٹائر ہوئے) ساکن ہری پور کا ممنون ہوں۔

ضلع ہزارہ نظامِ عدالت و وکلاء

سلطنت ہائے قدیم مثلاً مغلیہ و درانی کا صحیح حال تو میرے علم میں نہیں کہ ان کے عہد میں اس ضلع میں نظامِ عدالت کیسا رہا۔ آیا قاضی مقرر ہوتے رہے جیسے کہ شاہانِ اسلام میں دستور تھا یا حکام ضلع خود ہی مقدمات کے فیصلے کرتے رہے آخر الذکر طریقہ ہی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ ہزارہ کے چند مشہور واقعات اس نظام پر مندرجہ ذیل روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ جب چودھری عیسیٰ دوسی سربراہان قوم گوجر میدان ہزارہ، راجپورد پرانا مرکز قوم گوجر) نزد موضع کاہل (نزد کوٹ نجیب اللہ) قوم ترین کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ تو ان کے ورثاء انصاف حاصل کرنے کے لئے شہنشاہِ جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوئے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کوئی خاص نظامِ عدالت اس ضلع میں نہ تھا یا ممکن ہے کہ یہ تنازعہ چونکہ بین الاقوامی (مابین قوم گوجر و قوم ترین تھا) اور مقامی حاکم فیصلہ نہ کر پاتے ہوں۔ یا عدلِ جہانگیری کی شہرت پر ان کو بادشاہ کے دربار سے انصاف کرانے کی زیادہ امید ہو۔ بہر حال قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس وقت اس ضلع میں کوئی خاص مقررہ نظامِ عدالت نہ تھا۔ ہر قوم کا خان یا مقدم اپنے علاقہ کے مقدمات خود ہی فیصلہ کرتے رہے ہوں۔

۲۔ عہدِ درانی کا کوئی خاص تاریخی واقعہ میرے علم میں نہیں آیا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس

وقت کوئی نظامِ عدالت تھا یا نہ۔ اگر تھا تو کس قسم کا تھا۔

اس ضلع کی جغرافیائی حالت اور سیاسی ماحول ایسا تھا کہ یہ کبھی بھی پوری طرح کسی بادشاہی میں مطیع نہ ہو سکا اور نہ ہی یہ کوئی ایسا زرخیز قطعہ تھا جس سے کوئی آمدنی ہو سکے لہٰذا کسی حکومت کو اس کو باقاعدہ طور پر مطیع کرنے اور نظامِ حکومت و عدالت قائم کرنے کا خرچ برداشت کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ سب حکومتوں کی توجہ کشمیر کو جانے کے راستہ کو محفوظ رکھنے ہی پر رہی۔ لہٰذا اس سڑک کو پُرامن بنانے کے لئے مقامی خوانین کو جاگیریں عطا کر کے یہ مقصد حاصل کیا جاتا رہا۔

۳۔ سکھوں کا عہد تو بد نظمی کے لئے ضرب المثل ہے انصاف کی ضرورت ان کے ہاں کبھی سمجھی ہی نہ گئی۔ ان کے حکام یا سکھ افراد کی آمد کا آوازہ سنتے ہی لوگ اپنے گاؤں جو ان کے راستے پر واقع تھے خالی کر کے پہاڑوں میں چلے جاتے تھے۔ تو انصاف کے لئے ان کے ہاں حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کی سکھ شاہی انصاف کے متعلق موضع ڈھینڈہ تحصیل ہری پور کا ایک مقدمہ جو زبان زدِ عام ہے شاہد ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کسی نامی چور کو نمبردار موضع موسم خان نے سکھ حاکم کو رپورٹ کر کے پکڑوا دیا۔ سکھوں کے کارندوں نے چور کو گرفتار کر کے گاؤں میں پھانسی دینے کے لئے انتظام شروع کیا۔ یہ سزا برسرِ عام دی جاتی تھی۔ اور ڈھولکی بجا کر لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا جب ایک سکھ ڈھولکی بجا رہا تھا اور لوگ جمع ہو گئے تھے تو چور جو سکھوں کے انصاف کے کاروبار سے واقف تھا ان کے سامنے کسی پر الزام لگا دینا اس کو مجرم بنا دیتا ہے۔ شہادت و صفائی کا وہاں گزر نہ تھا لہٰذا اس نے موسم خان کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کے لئے اس پہ الزام لگا دیا اور کہا ؎

موت دی ڈھولکی نہ مار سکھا   میں اور موسم خان کدے وے یار سکھا

جب اس نے یہ کہا تو موسم خان نے اپنی جان بچانے کے لئے فی الفور کہا ؎

موت دی ڈھولکی ڈب ڈب کے مار سکھا   نہ چور نہ چوراں دے یار سکھا

یہ ضلع ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں کے تسلط میں آیا۔ تو امن و امان کا دور دورہ شروع ہوا تو اور محکموں کی طرح عدالت ہائے انصاف کے ادارے بھی قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ سکھوں کے وقت تو انتظام کی یہ حالت تھی کہ دارالسلطنت لاہور میں شاہی کاروبار بھی زبانی ہوتا تھا۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ مہاراجہ کی زبان سے جونکلا اس پر عمل درآمد کر دیا گیا۔ نہ شہادت نہ ریکارڈ نہ اپیل۔ لہٰذا انصاف معلوم۔ مختلف دفاتر حکومت بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے آخری دور میں قائم ہوئے۔

عہدِ انگریزی ۔ اہلِ ہزارہ سکھوں کے ظلم و تشدد سے اتنے بے زار تھے کہ ۱۸۴۷ء میں میجر ایبٹ

یکے از معماران سلطنت انگریزی ریذیڈنٹ لاہور کا نمائندہ اور ناظم ہزارہ (سکھ حاکم) کا مشیر ہو کر اس ضلع میں آیا۔ تو لوگوں نے فوراً ہی حق و انصاف کی طلب کے لئے، سکھ حاکم کے ہوتے ہوئے اس کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ حکومت سکھوں کی، حاکم سردار چتر سنگھ، فوج سکھوں کی، میجر ایبٹ کے اہل کار سکھ اور سکھ حکومت کے ملازم حتیٰ کہ میجر ایبٹ کا محافظ دستہ (PERSONAL BODYGUARD) بھی سکھ سپاہیوں کا تھا۔ مگر صورت حال یہ تھی کہ لوگ تمام ضلع ہزارہ اور چھچھ، گھیب، کھاتر اور پوٹھوار سے اپنی عرضیاں اور مقدمات میجر ایبٹ کے سامنے پیش کرتے تھے۔ وہ اپنی ڈائری۔ اپریل ۱۸۴۸ء تا جون ۱۸۴۹ء میں اپنے روزانہ معمول کے تحت لکھتا ہے کہ وہ گیارہ بجے دن سے تا غروب آفتاب لوگوں کی عرضیوں کے جواب دینے اور مقدمات کے فیصلہ کرنے میں صرف کرتا تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سکھوں کی حکومت اور اس کا رعب دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ اور معلوم ہے کہ جب حکومت کا رعب و وقار دلوں سے اٹھ جائے تو جسموں پر تھوڑی مدت ہی رہ سکتا ہے۔ سکھوں کے معاملہ میں تو یہ بہت ہی عارضی رہا اور مارچ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کی حکومت کا پختہ عمل درآمد شروع ہو گیا۔

اسی طرح جب تک انگریزی سلطنت کی عظمت و رعب کا اثر ہندوستانیوں کے دلوں پر رہا تو یہ سلطنت مستحکم رہی۔ جب اس حکومت کا اثر دلوں سے زائل ہوا تو سو سال کی حکومت کا قصر چند سال میں ہی زمین بوس ہو گیا۔

اس نکتہ کو گاندھی جی نے خوب سمجھا اور اس کے عمل آزادی ہند و پاکستان کا سورج طلوع ہوا۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ جب گاندھی جی نے آزادی کا علم بلند کیا تو اہل وطن سے اپیل کی کہ اگر اسے ایک لاکھ قومی رضا کار اور ایک کروڑ روپیہ جمع کر دیا جائے تو وہ انگریزوں کو ایک سال کے اندر ہندوستان سے نکال دے گا۔ اس کی اپیل پر ایک لاکھ رضا کار بھرتی ہو گئے۔ اور ایک کروڑ روپیہ بھی جمع ہو گیا۔ لیکن انگریز اس سال کے اندر ملک سے نہ گئے۔ اگرچہ اس نے ان رضا کاروں اور چندہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں آزادی کا بگل اس زور سے بجایا کہ انگریزوں کا تخت حکومت ہل گیا۔ تاہم باقی تھا مگر جان نکل چکی تھی۔

اس پر کسی نے گاندھی جی کو خط لکھا کہ ایک سال گزر گیا مطلوبہ روپیہ اور رضا کار بھی آپ کو مل گئے۔ لیکن انگریز کی حکومت ابھی باقی ہے۔

اس نے ہفتہ وار انگریزی اخبار ینگ انڈیا (نوجوان ہند) میں جواب دیا کہ "میں نے سفید چمڑی کا رعب ہندوستانیوں کے دلوں سے اٹھا دیا۔ اب جسموں پر یہ تھوڑا عرصہ ہی رہ سکے گا۔" جواب و تل

اور علمی تھا اور انجام کار صحیح بھی ثابت ہوا۔

یہ مضمون، نظام عدالت سے دور نکل گیا۔ میجر ایبٹ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک اس ضلع کا حاکم اور پہلا ڈپٹی کمشنر تھا اور انتظامی و عدالتی نظام کا وہی سربراہ تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ ہزارہ کے مختلف مقامات پر کیمپ لگاتا رہا۔ اور عدالت کرتا رہا۔

بعد میں نہ معلوم کب سے۔ اول اول اس ضلع میں ایک انگریز افسر بطور افسر خزانہ مقرر ہوا۔ جس کو چھوٹا صاحب (یعنی ڈپٹی کمشنر سے چھوٹا۔ اور موجودہ نام اسسٹنٹ کمشنر) کہا جاتا تھا۔ جو ضلع کے مالی معاملات کا سربراہ ہوتا تھا۔ اور فوجداری مقدمات کی عدالت بھی کرتا تھا۔ اور ضلع میں ایک افسر مال ہوتا تھا۔ بعد میں تاریخ معلوم نہیں۔ ایک ڈسٹرکٹ جج ایبٹ آباد میں مقیم تھا۔ جس کو آج کل سینیئر سب جج کہا جاتا ہے۔ ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے لئے ایک ہی منصف ہوتا تھا اور ہری پور کے لئے الگ۔ مانسہرہ میں ایک اسسٹنٹ کمشنر عرصہ قدیم سے رہا کرتا تھا۔ لیکن ہری پور میں ۱۹۳۶ء سے میں ایک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر (E.A.C.) ہوا کرتا تھا۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد (سے) ہری پور ایک سب ڈویژن بنا اور اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوا۔ اوگی میں ایک ای۔ اے۔ سی مستقل میں مقرر ہوا۔ اور اب ۱۹۶۸-۶۹ء میں بٹگرام میں ایک اسسٹنٹ کمشنر ضم شدہ علاقہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔

۱۹۱۸ء تک اس ضلع میں تین یا چار اعزازی مجسٹریٹ تھے خان بہادر محمد حسین خان مانسہرہ میں راجہ جہانداد خان آف خان پور جو کبھی خان پور اور کبھی ہری پور میں عدالت کرتے تھے۔ خان سلطان محمد خان آف بیٹر وہ ہری پور اور ایبٹ آباد میں عدالت کرتے تھے۔ ۱۹۱۸ء سے بعد مجسٹریٹ سرکاری و اعزازی میں کام کی زیادتی کی وجہ سے ایزادی کی گئی۔

وکلاء ہزارہ

عہد ماضی میں ہزارہ کے سب وکلاء ایبٹ آباد ہی میں رہتے تھے۔ ابتدائی وکلاء ہزارہ و ایبٹ آباد بار کلب کے حالات چوہدری محمد علی صاحب وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی نے حسب ذیل تحریر انہوں نے میری درخواست پر عنایت فرمائی۔ انیسویں صدی میں ضلع ہزارہ میں کوئی وکیل نہ تھا۔ ایک مسلمان مختار ہوا کرتا تھا۔ (جس کا نام ان کو یاد نہیں رہا)[1]

---

[1] مولوی عبدالرحمن صاحب المعروف اچھی جی مالک کمپنی عبدالرؤف اینڈ برادرز نے بتایا کہ ان کا نام مرزا علی محمد تھا۔ وہ پشاور کے رہنے والے تھے فارسی دان اور شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک رباعی بھی بتائی ... کہ سیم و زر نہ خوردہ ... مال و زر گہ چیستر نہ خوردہ۔ بعد مرگش ... کیڑا ... اگرچہ رباعی عریاں ہے لیکن ہے عبرت آمیز۔

جو عدالت ہائے ضلع میں متعلقہ پیش ہوتا تھا اس نے اردو میں قانون کا امتحان پاس کیا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں رائے بہادر روچا رام مقامی تاجر عمارتی لکڑی، کے دو بیٹے، پرمانند اور پربھو دیال۔ انگلینڈ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے اور ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی۔ بعد میں لالہ پربھو دیال سرکاری وکیل ہزارہ و پشاور کے لئے، بہ عدالت سشن جج پشاور مقرر ہو گئے۔ اس وقت ہزارہ اور پشاور کا ایک ہی سشن جج ہوتا تھا اس لئے وہ پشاور چلے گئے۔

انہی ایام میں دیوان چند اوبرائے، مصنف کتاب قانون پنجاب ہدایت نامہ (THE PUNJAB REFERENCES) چکوال سے آکر یہاں مقیم ہو گئے۔ بعد میں سرکاری وکیل مقرر ہو کر وہ بھی پشاور منتقل ہو گئے۔ رائے صاحب پرمانند ۱۹۴۷ء (تقسیم برصغیر پاک و ہند) تک ایبٹ آباد میں پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء کے درمیان شیخ نور احمد ایڈوکیٹ (والد شیخ محمد احمد مرحوم و پروفیسر عزیز احمد) امرتسر سے یہاں تشریف لائے۔ آپ کی وفات ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔

ان کے بعد رائے صاحب مہتہ منگل سین آئے اور ۱۹۰۹ء میں یہاں پریکٹس شروع کی۔ چودھری محمد علی صاحب نے جب ۱۹۲۱ء میں بی اے، ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تو کار آموزی کے لئے انہی کے شاگرد بنے۔ چھ ماہ بعد مہتہ منگل سین بھی سرکاری وکیل بن کر پشاور منتقل ہو گئے۔

یہ امر باعث فخر ہے کہ ایبٹ آباد کی جماعت وکلا ہی سے بہت سے افراد پشاور ڈویژن کے سرکاری وکیل منتخب ہوتے رہے

چودھری محمد علی صاحب نے جنوری ۱۹۲۲ء میں اپنی پریکٹس شروع کی۔ ۱۹۳۰ء میں پبلک پروسیکوٹر بنے۔ ۱۹۴۹ء میں ایڈوکیٹ جنرل ہو کر پشاور چلے گئے وہاں ان کے پاس قلمدان ایڈوکیٹ جنرل، سکرٹری قانون اور قانونی مشیر کا تھا۔ آپ ۱۹۶۳ء میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ اور ۱۹۶۹ء کے آخر میں ریٹائر ہوئے۔ ایبٹ آباد میں آپ کے والد بزرگوار چودھری علی بخش آئے وہ اینگلو ورنیکلر مڈل سکول ڈیرہ غازی خان میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں سے ان کی تبدیلی ضلع ہزارہ گزشتہ صدی کے اواخر میں ہو گئی۔ بعد میں وہ یہاں عدالت ڈسٹرکٹ جج کے ہیڈ کلرک ہو گئے۔ ان کے پانچ فرزند تھے اور آج صرف چودھری محمد علی ہی بقید حیات ہیں۔ چودھری محمد علی کے بڑے بھائی نے علی گڑھ کالج سے بی اے کیا اور وہ مولانا محمد علی جوہر کے ہم جماعت تھے انہوں نے ہیڈ ماسٹری سے پنشن لی۔ چودھری صاحب کے دو بھائی انجینیر تھے اور ایک بھائی جن کی وفات دسمبر ۱۹۶۰ء میں ہوئی انکم ٹیکس افسر تھے۔ ان کے ایک بھائی چودھری محمد رحیم (انجینیر) سے میرے دوستانہ مراسم رہے۔ خوش خلق اور دوست نواز انسان

تھے آخر عمر میں مرض گنٹھیا کا شکار ہوئے اور اسی سے جان ہار گئے۔ خدا بخشے خوب انسان تھے۔

میر ولی اللہ صاحب ۱۹۱۳ء میں زمرہ وکلا میں شامل ہوئے۔ وکلا ایبٹ آباد کی جماعت اس جلیل القدر شخص کی موجودگی سے مزید شہرت و عزت کی مالک ہوئی آپ ۱۹۲۲ء میں وکلا کی بزم کے صدر چنے گئے اور ۱۹۵۴ء تک (جب آپ لا کالج پشاور یونیورسٹی کے پرنسپل ہوئے) آپ ہی صدر رہے۔ آپ کی وفات دسمبر ۱۹۶۶ء میں ہوئی آپ کشمیری نژاد تھے آپ کے والد بزرگوار مولوی سلطان میر صاحب جو قانون سے ہی معاش حاصل کرتے تھے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ شعر و سخن میں خاصہ ملکہ تھا۔ یہ اُن ہی کی فیض صحبت کا اثر تھا کہ میر صاحب علم و ادب کے آسمان پر مہتاب بن کر چمکے۔ تاریخی مواد کے سلسلہ میں اپنے پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ "ایڈورڈ گزٹ" جو ایبٹ آباد سے زیر ادارت منشی قلندر خان تنولی شائع ہوتا تھا۔ میں مندرجہ ذیل نظم پر نظر پڑ گئی۔ تبرکاً درج ذیل ہے۔

بے ثباتی دُنیا

از مولوی محمد سلطان میر مختار سکرٹری انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد

آدمی اگر سوچتا آغاز اور انجام کو ۔۔۔ ڈھونڈتا پھرتا، کہیں پاتا نہ آرام کو

کیا تسلی ہے اُسے جو آج ہے اور کل نہیں ۔۔۔ صبح کی وہ کیا خوشی جب رنج پہنچا شام کو

زندگی چند روزہ اور ہوس اتنی طویل ۔۔۔ دوستو بس چھوڑ دو، ایسے خیال خام کو

فکر اور تدبیر سے کیا فائدہ، جب کوئی ۔۔۔ روک سکتا ہی نہیں ہے گردش ایام کو

ہوش کرنا بھولنا مت دیکھ کر باغ و بہار ۔۔۔ آنکھ ہے تو دیکھنا دانے کے نیچے دام کو

دیکھنا ہنسنا نہیں ہر گُل کِھلا ہے باغ میں ۔۔۔ روؤ گے آخر خزاں میں دلبر گلفام کو

اک جواں کو تخت پر بیٹھا ہوا دیکھا تو کیا ۔۔۔ قبر میں رکھا نہیں کیا رشک ماہ تمام کو

لازمی ہے جب سرور عیش کے پیچھے خمار ۔۔۔ شوق سے کیوں ڈھونڈتے ہو پھر صراحی جام کو

آخر جب ہے ٹھکانا تیرہ و تاریک تنگ
کس لئے پہنچا رہے ہو آسمان تک بام کو

میر صاحب حافظ و خیام کے شارح تھے۔ لسان الغیب۔ حافظ کے کلام کی شرح چار جلد میں تصنیف فرما کر ارباب ذوق سے خراج تحسین حاصل کیا خود بھی غزل گو شاعر تھے۔ اقبال کی شاعری کی طرح میر صاحب کی شاعری بھی ہمارے قلب و روح کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرتی ہے۔ رباعیات فارسی موسوم بہ "بادۂ ناب"

ہیں توحیدِ باری، فلسفۂ زندگی اور حالاتِ حاضرہ پر دل نشین پیرایہ میں اظہارِ خیالات کیا ہے۔
حکیم عمر خیام کی رباعیات کی شرح "کاس الکرام" نے تصوف اور فلسفہ کے اہم مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھا کر رکھ دیا ہے۔ ایک مجموعہ طنز آمیز مگر خوشگوار مضامین موسوم بہ "ماہ و پروین" شائع کیا

اُردو میں "گلپانگ" مختلف عنوانات پر قطعات اور بعض فرنگی شعراء کے منظوم ترجموں کے علاوہ بیشتر حصہ غزلوں کا ہے شائع کیا۔ اس میں بہت سی غزلیات بھی ہیں۔ میر صاحب کے پاس انگریزی کے علاوہ علوم شرقی کا بے بہا اور نہایت قیمتی کتب خانہ تھا جو اپنی موت سے پہلے ہی پشاور یونیورسٹی کو دے دیا تھا۔ بحکایت لذیذ ہے اور دراز ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن میر صاحب مرحوم کی ذات اس تذکرہ طویل کے لائق بھی ہے۔ میر ولی اللہ صاحب مرحوم کی پیدائش ۱۸۷۳ء اور وفات ۱۴ دسمبر ۱۹۶۶ء ہے۔ آپ کے والد صاحب مولوی سلطان میر صاحب کریالہ (چکوال) پنجاب سے یہاں آئے۔ اپیل نویسی۔ وثیقہ نویسی کا شغل اختیار کیا۔ اور اپنے فن میں قلّ و دلّ کے صحیح مصداق تھے۔ شاعر بھی تھے۔ اور روایت ہے کہ میر صاحب مرحوم کی دوسری شادی جو ۳۰ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ہوئی کا سہرہ بھی انہوں نے خود لکھا اور خود ہی پڑھا۔

میر صاحب کی ابتدائی تعلیم ایبٹ آباد میں ہوئی اس کے بعد اسلامیہ سکول میں ماسٹر ہو گئے۔ پھر گورنمنٹ سکول کے سیکنڈ ماسٹر بعد میں مشن کالج لاہور سے سندِ فضیلت حاصل کر کے وکالت کا جبّہ بھی اسی دار السلطنت سے زیبِ دستار کیا۔ زندگی کے آخری سالوں میں مجھے ان سے گاہے گاہے ملنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ وہ رؤف برادرز پمپ پر شام کے وقت تشریف لاتے اور میں بھی وہاں جایا کرتا۔ ان کی شعر و ادب کی نکتہ سنجی سے لطف اندوزی میسر ہوتی رہتی۔ آخری بیماری تک ان کا دماغ صحیح اور حافظہ کی گرفت ٹھیک تھی۔ ہزاروں اشعار یاد تھے اور سنا سکتے تھے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

یہاں پر میر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے درج کرتا ہوں۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب (المعروف اجی جی) مالک رؤف پمپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ اور میر صاحب مرحوم ہری پور جا رہے تھے۔ اور دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے کہ سرائے صالح کے نزدیک جب موٹر باغات کے درمیان سے گزری تو بادِ خزاں کے ایک جھونکے نے درختوں کے چند پژمردہ پتے موٹر کے اندر میر صاحب کی گود میں پھینک دیئے تو انہوں نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

برگ ایں ریزد، آں گل بیفشاند   ہم خزاں ہم بہار در گزر است

مسٹر جے دیوا۔ بار ایٹ لا، پسر سیٹھ جواہر لال (بانی آریہ سکول ایبٹ آباد) سنہ ۱۹۱۴ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان

سے ایبٹ آباد آیا اور پریکٹس شروع کی۔ وہ آخر کار اندھا ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۶-۱۹۱۵ء میں مسٹر رام پرکاش صوبجات متحدہ (یو۔ پی) ہندوستان سے آیا۔ وہ پاکستان بننے کے بعد چلا گیا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں خان بہادر غلام ربانی خان بی اے ایل ایل بی کر کے مانسہرہ میں کام شروع کیا۔ جہاں ایک اسسٹنٹ کمشنر کی عدالت تھی اور آنریری مجسٹریٹ خان بہادر محمد حسین خان مرحوم (خان محمد حنیف خان حال چیف پارلیمنٹری سکرٹری قومی اسمبلی کے جدّ بزرگوار تھے) ان ایام میں گورنمنٹ سرحد نے فیصلہ کیا کہ پشاور ڈویژن کا ایک سشن جج ہزارہ کے مقدمات ایبٹ آباد میں سنا کرے۔ ان ایام (سنہ ۱۹۰۱ء سے بعد) جب کہ یہ صوبہ ایک چیف کمشنر کے ماتحت تھا۔ ایک جوڈیشل کمشنر (بمنزلہ ہائیکورٹ) تھا۔ سنہ ۲۷-۱۹۲۶ء میں ایک اڈیشنل جوڈیشل کمشنر مقرر ہوا۔ اور اس منصب پر پہلے خان بہادر سعدالدین خان (ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خان ثم پشاوری) مقرر ہوا۔ مقدمات مال کی عدالت اپیل ریونیو کمشنر کی تھی۔ یہ سب افسران چیف کمشنر کے ساتھ گرمیوں میں چار ماہ کے لئے نتھیا گلی میں رہتے تھے جس سے اہلِ مقدمہ اور مالیانِ گلیات کو فائدہ پہنچتا تھا۔ بعد میں جوڈیشل کمشنر اپنی عدالت ایبٹ آباد میں تا قیامِ پاکستان کرتا تھا۔ لالہ رام لبھایا دیوان چند اوبرائے کے رشتہ دار نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہاں پریکٹس شروع کی۔ وہ آخر کار سرحد کا اڈیشنل جوڈیشل کمشنر بنا۔ اور پاکستان کے قیام پر ہندوستان چلا گیا۔ اور آسام ہائیکورٹ کا جج بنا دیا گیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں علی اصغر خان ساکن سفیدہ اور مولوی غلام غوث ہاشمی نے ایل ایل بی کی۔ علی اصغر خان نے مردان میں پریکٹس شروع کی اور آج تک (۱۹۶۸ء) وہاں ہی ہیں۔ ان ہی ایام میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے بھی ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور مولوی غلام غوث ہاشمی اور انہوں نے ہری پور میں پریکٹس شروع کی۔ ہری پور میں منصف کی عدالت کے علاوہ ایک جوڈیشل ای۔ اے۔ سی کی عدالت بھی ان ایام میں مقرر ہو چکی تھی۔

پیر زمان شاہ اور محمد نعمان خان طاہر خیلی نے سنہ ۱۹۲۳ء میں مانسہرہ میں پریکٹس شروع کی۔

۱۹۳۲ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کی عدالت مستقل طور پر ایبٹ آباد میں مقرر ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں لالہ گوبند سہائے اور لالہ لچھمن داس نے پریکٹس شروع کی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں مہتہ رام جی داس ساکن کوٹ نجیب اللہ قاضی رحمت اللہ مرحوم نے وکالت شروع کی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں وکلاء نے اپنا کلب بار کلب (اور ٹینس کلب) شروع کیا۔ انتخاب میں میر ولی اللہ صاحب صدر، لالہ رام پرکاش نائب صدر، لالہ رام لبھایا سکرٹری، چودھری محمد علی جائنٹ سکرٹری (اور کلب سکرٹری ٹینس) مقرر ہوئے۔ اس وقت کل گیارہ وکلاء تھے۔ غیر وکلاء کو بھی ممبر بنایا جاتا تھا۔ لیکن کلب کے انتظامی معاملات میں ان کو ووٹ دینے کا حق نہ تھا۔ یہی عہدہ دار تا قیامِ پاکستان رہے۔ صرف لالہ رام لبھایا کی جگہ جو جج ہو کر چلے گئے۔

قاضی رحمت اللہ کو سکرٹری بنا دیا گیا۔ اپنے وقت میں اس کلب نے بڑے نامور لوگ۔ قانون اور عدالت کے حلقوں کے لئے پیدا کئے۔ بار کلب کے ممبر عموماً سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ سیاسی گرمی (بقول چوہدری محمد علی صاحب) محمد سرور خان تاہرخیلی مرحوم کی آمد سے (سنہ ۱۹۳۰-۳۲ء) میں شروع ہوئی۔ محمد سرور خان طاہرخیلی ہزارہ کے ایک قابل فرزند تھے (شروع شروع میں ملازمت کی سنہ ۱۹۲۱ء میں ہری پور میں جوڈیشل ای۔ اے۔ سی تھے) انہی کی بدولت ہزارہ کو سیاسی اہمیت حاصل ہوئی اور پہلی بار ان کی مساعی ہی سے سرحد کی مجلس وزارت میں اہل ہزارہ کی جانب سے خان محمد عباس خان کو وزیر لیا گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں سجاد احمد جان صاحب نے ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی۔ کامیاب وکیل رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء تا سنہ ۱۹۴۶ء پبلک پراسیکیوٹر اور گورنمنٹ پلیڈر رہے۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ مارچ سنہ ۱۹۶۵ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج مقرر ہو گئے۔ سیاسی طور پر مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ ہزارہ کی ضلع مسلم لیگ کے بانی ممبروں میں سے تھے۔ کافی عرصہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر رہے۔ قائداعظم مرحوم نے ان کو صوبہ سرحد کے پارلیمنٹری بورڈ کا ممبر نامزد کیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء مسلم اکثریت کے صوبجاتی مشن۔ خیر خواہانہ مشن (GOOD WILL) کے ممبر کی حیثیت سے مسلم اقلیتی صوبوں کا دورہ کیا۔ بہت اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں۔ بزم علم و فن ایبٹ آباد کے بانی ممبروں سے ہیں۔ اسی بزم کے پلیٹ فارم سے جسٹس کیانی مرحوم نے اپنے مشہور "افکار پریشاں" لیکچر دئے تھے آپ سنہ ۱۹۶۰ء سے بہت سے قانونی اور علمی اداروں کے ممبر اور سرپرست ہیں۔

رائے بہادر دیوان چند اور سردار نیر وقم سنگھ بار ایٹ لا جو پبلک پروسیکیوٹر بھی تھے ایبٹ آباد کے مشہور وکلا میں سے تھے۔ قاضی اسدالحق (سنہ ۱۹۳۵ء) قاضی محمد صادق (سنہ ۱۹۳۳ء) نور الٰہی خان سنہ ۱۹۳۹ء خان سردار بہادر خان (سنہ ۱۹۳۶ء میں) ایبٹ آباد بار کے مشہور اور قابل ممبر ہوئے۔ قاضی اسدالحق صاحب سول لا میں منفرد ہیں۔ قاضی محمد صادق ذہین اور قابل وکیل ہیں۔ نکتہ رس دماغ پایا ہے۔ اور انتخابی قوانین کے ماہر ہیں۔ نور الٰہی خان مرحوم ایک قابل وکیل، دیانت دار افسر اور بہترین دوست تھے وہ سنہ ۱۹۴۷ء میں بہ حیثیت مجسٹریٹ سرکاری ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ اپنی قابلیت۔ محنت اور دیانت کے بل پر نام اور ترقی حاصل کی۔ صوبائی اور مرکزی وزارت قانون میں ڈپٹی سکرٹری رہے۔ بعد میں کل پاکستان انکم ٹیکس عدالت اپیل کے صدر رہے۔ اور کراچی میں قیام رکھتے تھے (۶ رجنوری سنہ ۱۹۶۹ء میں دفعتہً عارضہ دل سے کراچی میں وفات پائی خدا بخشے بہت خوبیوں کے مالک تھے)

خان سردار بہادر خان ایک مشہور و معروف سیاست دان ہیں مسلم لیگ میں بہت کام کیا۔ مرکزی حکومت پاکستان میں کافی عرصہ وزیر مواصلات رہے۔ اپنے عہد وزارت میں ہری پور ٹیلیفون فیکٹری پاکستان کی واحد فیکٹری قائم کی۔ بہترین پارلیمنٹیرین ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات اس کتاب میں دوسری جگہ تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ مولانا خلیل الرحمٰن المعروف خان مولوی صاحب ساکن بھیڑ کنڈ کے منجھلے فرزند ہیں۔ قریشی خاندان اور ہاشمی النسل ہیں۔ دوران تعلیم ہمیشہ اول آتے رہے۔ عربی۔ فارسی۔ اردو اور پشتو میں پنجاب یونیورسٹی سے آنرز (اعزازی ڈگریاں) حاصل کیں۔ ایم اے ایل ایل بی گولڈ میڈلسٹ علی گڑھ ہیں۔ مفتی محمد ادریس صاحب مانسہرہ کے نامور وکیل ہیں۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں ایڈووکیٹ ہوئے ابتداً مانسہرہ میں پریکٹس شروع کی۔ اور جلد ہی صف اول میں آ گئے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں تقریباً ۹ ماہ پبلک پراسیکیوٹر رہے۔ سنہ ۱۹۵۹ء سے ایبٹ آباد میں کام شروع کیا۔ یہاں بھی فوراً ہی اپنا بلند مقام حاصل کر لیا۔ قانون کی تینوں شاخوں فوجداری، مال اور دیوانی کے ماہر ہیں ان تھک کام کرنے والے ہیں۔ وکالت کے ساتھ ساتھ سیاست وطن میں بھی بھرپور حصہ لیتے ہیں اور اس میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے تحریک پاکستان سے وابستہ ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں جب لیاقت علی خان نے سرحد مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی مشتمل بر اکیس ممبران بنائی تو اس کے ایک رکن مقرر ہوئے سنہ ۱۹۵۱ء میں پاکستان نیشنل گارڈ میں فوجی تربیت حاصل کی۔ سیاسی جلسوں کے پُراثر خوش بیان مقرر اور نڈر بولنے والے ہیں۔ پاکستان کونسل مسلم لیگ کے جائنٹ سکرٹری ہیں۔ اور مسلم لیگ ہزارہ کے صدر رہے۔ عزم و ہمت سے اپنی کثیر المشاغل زندگی کو خوش اخلاقی اور کامیابی کے ساتھ نباہ رہے ہیں۔ اگرچہ ہزارہ کے قابل ترین فرزند ہیں لیکن بوجوہ اب تک اپنا اعلیٰ جوڈیشل مقام جس کے وہ ہر طرح سے حقدار ہیں کے لئے منتخب نہ کئے جا سکے ؎

مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی
وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی

شیخ محمد عبداللہ مرحوم آپ ہری پور کے پرانے وکیل، خاموش طبیعت اور خوش اخلاق انسان تھے۔ اپنے کام سے غرض رکھتے تھے اور بس۔ لالہ رام سرن و لالہ راجی داس یہ دونوں کوٹ نجیب اللہ کے رہنے والے تھے۔ لالہ رام سرن۔ دراز قد۔ خوش شکل اور سادہ مزاج وکیل تھے لوگ ان کی خوش اخلاقی کے گرویدہ تھے۔ خان بہادر محمد زمان خان ساکن کھلابٹ (تحصیل ہری پور) جو آنریری مجسٹریٹ درجہ اول تھے۔ یہ ان کے مشیر قانونی اور صلاح کار رہے۔ ان کی وکالت پاس کرنے کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن یہ یاد ہے کہ وہ سنہ ۱۹۱۳ء میں وکالت میں مشہور ہو چکے تھے۔ ہری پور میں پریکٹس کرتے تھے۔ لالہ راجی داس یہ ایبٹ آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ ان کے والد ماسٹر امیر چند صاحب پرانے ماہر تعلیم تھے۔ شاید انیسویں صدی کے آخری بیس سال میں کوٹ نجیب اللہ اردو مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے میرے والد مرحوم نے ان کی شاگردی

کی اور ۱۸۸۹ء میں پرائمری پاس کی اور ۱۹۲۳ء تک غالباً وہ ہیڈ ماسٹر رہے۔ میں نے ان کو ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔ اسّی نوے سال کی عمر کے معلوم ہوتے تھے۔ صحت بہت اچھی تھی اور مضبوط جسم رکھتے تھے قد سات فٹ سے کچھ ہی کم ہوگا۔ لالہ رامجی داس ان ہی قابل ماہر تعلیم کے بیٹے تھے۔ شرافت کے مجسمہ تھے ۱۹۲۲ء میں ایڈووکیٹ ہوئے اور ایبٹ آباد میں پریکٹس شروع کی۔ سول لاء میں صف اول کے وکیل تھے گفتگو بڑی میٹھی اور دھیمی ہوتی تھی۔ اپنی قانونی مصروفیتوں کے ساتھ ضلع ہزارہ کی ریڈ کراس کے آنریری سیکرٹری بھی رہے۔ بڑی قابلیت اور حسنِ انتظام سے اس ادارہ کو پروان چڑھایا۔ موجودہ ہیلتھ سنٹر ایبٹ آباد اُن کے زمانہ سکرٹری شپ کی یادگار ہے۔ شعر و شاعری کا چسکہ بھی رکھتے تھے ان کا ایک شعر نور الٰہی خان سنایا کرتے تھے جو انہوں نے ایبٹ آباد میں ایک پردہ شاپ کھولنے کے ضمن میں کہا تھا ؎

بے پردہ عورتوں نے کھولی ہے 'پردہ شاپ'　　پردے کے پیچھے ہوتا ہے' کیا کاروبار' دیکھ

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ترکِ وطن کر گئے۔ مولوی غلام غوث مرحوم ایڈووکیٹ ہری پور آپ ایک دینی خاندان محابیہ (نزد کھلابٹ) کے چشم و چراغ تھے۔ طبیعت نیک اور مذہبی پائی تھی۔ پیر اعوان شریف پنجاب کے مرید تھے۔ دوست و احباب کے قدردان تھے۔ میرے مہربان دوست اور مخلص رفیق تھے۔ قرآن و حدیث کے عالم اور متدیّن انسان تھے۔ چلم زیادہ پینے کی وجہ سے آخر عمر میں ضیق النفس میں مبتلا ہو گئے اور اسی مرض سے جان جاں آفرین کے حوالہ کر دی ۱۹۲۰-۲۱ء میں ایڈووکیٹ ہوئے ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔

ایبٹ آباد کے چند اور معروف وکلاء

صاحبزادہ محمد الیاس مرحوم ساکن کوٹھہ۔ آپ کوٹھہ (ٹوپی اتمان زئی) کے مشہور صاحبزادہ خاندان کے فرد تھے۔ بحیثیت پراسیکیوٹنگ انسپکٹر اس ضلع میں آئے پھر استعفیٰ دے کر یہاں ہی پریکٹس شروع کر دی۔ فوجداری مقدمات میں بہت شہرت تھی اور جرح کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے ۱۹۶۲ء میں فوت ہوئے۔ سردار بہادر خان آف تلوکر ہری پور۔ آپ ایک ماہر وکیل ہیں مال آپ کا خاص مضمون ہے۔ عالم باپ کے قابل فرزند ہیں۔ ان کے والد مرحوم مولوی محمد خان صاحب میرے استاد تھے تعلیم میں ماہر اور تنظیم سکول کے بہترین مدبر استاد تھے۔ سردار بہادر خان اُن کے سب سے چھوٹے فرزند ہیں قابلیت اور شرافت کے مجسمہ ہیں۔ سردار محمد صادق صاحب لورہ۔ ایک شریف النفس، ہنس مکھ اور سادہ طبیعت کے انسان ہیں تین چار سال سے (۱۹۶۴ء سے) کمزوری صحت کی بناء پر اپنے گھر تشریف لے گئے ہیں۔ لالہ رامچند اس کے بعد وہ ریڈ کراس کے آنریری سیکرٹری ہوئے۔ بڑی دیانت سے اپنا فرض پورا کیا۔ آخر

بیماری و کمزوری صحت پر مستعفی ہو گئے ایبٹ آباد میں ایک اور قابل اور کامیاب وکیل مسٹر فضل حسین ہیں۔ بہت مصروف اور اپنے فرض منصبی سے بڑی شغف رکھتے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں بی اے ایل ایل بی کیا تجربہ و قابلیت کے لحاظ سے صف اول کے وکیل ہیں۔ سید عبد السلام سرور بھی اونچے طبقہ کے ایڈووکیٹ اور مشہور وکیل ہیں۔ آپ منگلور تحصیل مانسہرہ کے مردم خیز علاقہ کے رہنے والے ہیں آپ کے بڑے بھائی سید عبد اللہ شاہ صاحب عالم و ادیب بے بدل ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں۔ شاید قاضی رحمت اللہ صاحب مرحوم کا ذکر ادھورا ہی رہ گیا۔ وہ ایک ذہین وکیل، مجلس آرا، دوست، اور بذلہ سنج انسان تھے۔ اونچے درجہ کے وکیل تھے۔ عدالتیں ان کی رائے کا بہت احترام کرتی تھیں۔ ان کے لطائف تو بے شمار سنے ہیں لیکن مندرجہ ذیل دو لطائف نور الٰہی جان کی زبانی حسب ذیل ہیں:۔

ایک دفعہ موسم سرما میں سردار محمد صادق وکیل آف لورا صبح سویرے بار روم میں آئے انہوں نے ایک کالی قراقلی ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر سے کان متعلق حصہ سے بال اڑے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب مرحوم کی رگِ ظرافت پھڑکی اور فوراً کہا کہ آج سردار صاحب داڑھی کی حجامت کے ساتھ ٹوپی کی بھی حجامت کرا آئے ہیں۔

دوسرا لطیفہ۔ ایک دن (۱۹۳۲-۳۳ء) میں مسٹر کرشن لال وکیل نے تمام وکلاء کو اپنے نئے تعمیر شدہ مکان کی رسم افتتاح کے لئے چائے پر مدعو کیا۔ کسی نے پوچھا کہ گھر کا نام کیا رکھا ہے۔ ایبٹ آباد میں مکان سامنے کے نظارہ پر عموماً موسوم کیا جاتا ہے مثلاً (PINE VIEW) (چیڑھ نظارہ) اس مکان کے سامنے سے شہر کا ایک بڑا گندہ نالہ گزرتا تھا قاضی صاحب نے فوراً کہا۔ (DRAIN - VIEW) (منظر نالۂ عفونت) آپ ۱۹۵۲ء میں فوت ہوئے۔ آپ کے فرزند قابل انسان ہیں بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد بشیر جان صاحب ہیں مانسہرہ میں بڑے اعلیٰ پیمانہ پر پریکٹس کر رہے ہیں۔ دوسرے بیٹے محمد جمیل صاحب گورنمنٹ لاء کالج لاہور میں پروفیسر ہیں۔ قاضی صاحب کے داماد ڈاکٹر فتاح اللہ خان ایبٹ آباد کے صف اول کے مشہور پرائیویٹ میڈیکل پریکٹیشنر ہیں۔ حافظ محمد داؤد صاحب مہاجر پرانے اور سلجھے ہوئے ایڈووکیٹ ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے یہاں مقیم ہیں۔ آپ حافظ قرآن ہیں۔ تجوید اور صحت کے ساتھ قرآن پڑھنا ان کا ہی حصہ ہے۔ ہر رمضان شریف میں بحصول ثواب مسجد شہزادہ بخار الولو ملک پورہ میں قرآن سناتے ہیں۔ فرشتہ صورت انسان ہیں دین و دنیا دونوں کو خوب نباہ رہے ہیں۔

ایبٹ آباد کے چند اور معروف اور تجربہ کار وکلاء یہ ہیں:۔

۱۔ بیرسٹر عبد الکریم فاروقی ایبٹ آباد۔ آپ انکم ٹیکس کے ماہر ہیں۔ ۲۔ محمد کمال خان جدون۔ نواں شہر کے رہنے

والے ہیں اور مشہور خاندان کے فرد ہیں۔ ۳۔ سردار غلام مصطفےٰ، آپ کڑرال ہیں اور علاقہ ناڑہ ستوڑا کے رہنے والے ہیں۔ ۴۔ ملک غلام مصطفےٰ آوان۔ آپ سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ ۵۔ سلطان خان جدون۔ سیاست ملکی میں خوب حصہ لیتے ہیں۔ ۶۔ سید داؤد شاہ ساکن داتہ آپ مشہور سیاسی کارکن ہیں۔ تحریک جمہوریت کے مشہور لیڈر ہیں۔ ۷۔ بیرسٹر جمعہ خان۔ آپ علاقہ بگل کے رہنے والے ہیں۔ سیاست میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ۸۔ محمد زمان خان پرانے وکیل ہیں۔ پیر پیائی ضلع پشاور کے رہنے والے ہیں۔ ۹۔ ملک سعید اختر۔ آپ موضع سریہ نزد کوٹ نجیب اللہ تحصیل ہری پور کے رہنے والے ہیں۔ ذہین انسان ہیں اور شاید شاعر بھی ہیں۔ ۱۰۔ سید شمس العرفا ساکن جھنگی ضلع ایبٹ آباد۔ ۱۱۔ محمد امان خان پنشنر ای۔ اے۔ سی ہیں۔ موضع پیر پیائی ضلع پشاور کے رہنے والے ہیں۔ فوجداری کے ماہر و تجربہ کار ہیں۔ آپ نے زمانۂ ملازمت بڑی عزت سے گزارا اور یہیں مقیم ہوگئے ہیں۔

مانسہرہ کے چند وکلاء

۱۹۳۰ء میں غلام ربانی خان ایڈووکیٹ کا ڈنکہ مانسہرہ میں بجتا تھا۔ آپ سیاست میں خوب حصہ لیتے تھے اپنے فن میں خوب ماہر تھے۔ مدت سے صحت کی کمزوری کی بنا پر خانہ نشین ہوگئے ہیں۔ مفتی محمد ادریس صاحب کا ذکر پہلے کرچکا ہوں۔ موجودہ وقت میں محمد اکبر خان صاحب مشہور وکیل ہے۔ کانونشن مسلم لیگ سے وابستہ ہیں۔ آج کل (۱۹۶۰ء) میں مانسہرہ ٹاؤن کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ خوش گفتار اور شریف انسان ہیں۔ مانسہرہ کے ایک پرانے وکیل قاضی محمد عبد اللہ صاحب ہیں۔ عالم فاضل انسان ہیں آپ اصلاً خان پور کے رہنے والے ہیں۔ چالیس سال سے مانسہرہ میں اقامت گزیں ہیں۔ محمد افضل خان صاحب ساکن سفیدہ۔ آپ سفیدہ کے معروف خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ مشہور اور تجربہ کار وکیل ہیں۔ شروع شروع میں مانسہرہ میں صرف ایک وکیل (مختار) تھے۔ جن کا اسم گرامی عبد اللہ شاہ تھا۔ آپ اس وقت کی زبان فارسی ہی میں قانون کے عالم تھے۔

ہری پور کے چند اور وکلاء

محمد جعفر خان طاہر خیلی پرانے وکیل ہیں۔ فوجداری میں صفِ اول کے وکیل ہیں۔ غازی کے رہنے والے ہیں۔ لالہ فضل الرحمٰن خان خاندان رسالداریان ہری پور کے ممتاز اصلح کل اور سنجیدہ ایڈووکیٹ ہیں۔ دیوانی کے ماہر ہیں۔ خدا محمد خان طاہر خیلی نوجوان وکیل ہیں۔ فوجداری و دیوانی دونوں میں خوب

دسترس رکھتے ہیں۔ قاضی محمد اکرم خان قاضیاں سکندر پور کے ممتاز فرد ہیں۔ اور قاضی محمد اسلم خان ایڈووکیٹ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ خاموش، سادہ طبیعت اور قومی رنگ کے آدمی ہیں۔ محمد اسلم خان ساکن کوٹ نجیب اللہ تجربہ کار وکیل ہیں۔ قومی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ ملک محمد بشیر صاحب ساکن تلوکر نوجوان وکیل ہیں۔ مشہور اہل علم ملک غلام احمد صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ مدارس کے فرزند ہیں۔

ضلع ہزارہ میں نظام پولیس

مفصل حالات دربارہ نظام پولیس ہزارہ کے دفتروں سے نہ مل سکے کیونکہ ان کا ریکارڈ تلف کیا جاچکا ہے۔ میجر ایبٹ نے ۱۸۴۸ء-۴۹ء میں چتر سنگھ کی بغاوت کے دوران لیوی (بے قاعدہ فوج) بھرتی کی۔ خیال ہوتا ہے کہ اسی کو ۱۸۵۲ء-۵۳ء میں پولیس کے نکمہ میں بدل دیا گیا۔ اس کی تائید ایک سرٹیفکیٹ مورخہ ۲۳ اپریل ۱۸۵۳ء سے ہوتی ہے جو میجر ایبٹ نے اس ضلع سے جاتے ہوئے قائم خان پنی کو دیا۴ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "قائم خان پنی نے اپنی خودداری، عزتِ نفس اور حیا سے اپنے لڑکوں کو پولیس میں ملازم کرانے کی خواہش ظاہر نہ کی حالانکہ اس کا حق فائق تھا مجھے اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہوا جب میں اس کا مداوا نہ کرسکتا تھا اس کی مخلصانہ خدمات کا صلہ نہ دے سکنے پر مجھے افسوس ہے۔ ۲۔ قلندر خان برادر میر زمان خان سید خانی ساکن کھلابٹ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۱ء تک پیادہ لیوی (بے قاعدہ فوج) میں اور اس کے بعد ۱۸۶۹ء تک پولیس میں خدمت انجام دیتا رہا۔ ۳۔ عبد اللہ خان برادر میر زمان خان ساکن کھلابٹ ان ایام میں ہری پور کا کوتوال تھا۔ تاریخ ہزارہ ولیس کے مطابق ۱۸۷۲ء میں مندرجہ ذیل تھانے تھے۔

۱۔ غازی۔ ۲۔ تربیلہ۔ ۳۔ کرپلیاں۔ ۴۔ ہری پور۔ ۵۔ خان پور۔ ۶۔ ایبٹ آباد۔ ۷۔ ناڑہ۔ ۸۔ بکوٹ ۹۔ شنکیاری۔ ۱۰۔ اوگی۔ اس وقت ان تھانوں میں انسپکٹر، ڈپٹی انسپکٹر، سارجنٹ، سوار اور سپاہی مقرر ہوتے تھے۔

افسوس ہے کہ مزید تفصیل معلوم نہ ہوسکنے کی وجہ سے یہ باب نامکمل رہا۔ اس وقت مندرجہ ذیل تھانے زائد ہیں۔ شیروان۔ کوٹ نجیب اللہ۔ اب ہر سب ڈویژن میں ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی ہوتا ہے اب سوار پولیس کی بجائے موٹروں پر نفری بوقت ضرورت ہر جگہ پہنچائی جاتی ہے۔

۴ اردو ترجمہ [illegible]

ہزارہ کے اخبارات اور صحافت

اہل ہزارہ ہمیشہ ہر میدان میں سوائے دولت آفرینی کے صف اول میں رہے ہیں۔ دولت آفرینی کے لئے قدرت نے ان کو وسائل ہی نہیں دئے اس واسطے اس میدان میں وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ بھی حکمت خداوندی کے تحت ہی ہو گا۔ مگر ان کو وطن ایسا دلفریب دیا جس کے نظارۂ حسن سے ایک دنیا محظوظ ہونے کے لئے کھینچی چلی آتی ہے۔ کشمیر خطۂ بے نظیر کا یہ ایک حصہ ہے اور جغرافیائی اور تاریخی طور پر پائیں کشمیر ہے۔ اہالیان وطن اس کو تخت ہزارہ سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا فرحت انگیز اور شب و روز راحت افزا ہیں۔ اس دولت پر ہم نازاں بھی ہیں۔ اس نے ہمارے قوائے ذہنی و جسمانی کو وہ جلا بخشی جس سے ہم ہر میدان کسب سعی میں گوئے سبقت لے جاتے ہیں۔ دنیاوی تعلیم کا میدان ہو یا مذہبی اور روحانی تعلیم کا۔ ہم ہر میدان میں ممتاز جگہ ہی پاتے ہیں۔ دنیوی لحاظ سے ہم نے بہترین افراد۔ علم و ہنر والے پیدا کئے جو معلوم دنیا کے کونے کونے میں پہنچے۔ اور اپنے زور بازو سے اپنا مقام پیدا کیا۔ دین کی دنیا میں ہزارہ کے علماء نے دیوبند کی عظیم الشان دینی درس گاہ کی مسند نشینی تک رسائی حاصل کی۔ حریت و آزادی کی شمع کو ایک عالم میں فروزاں کیا اور ہر باطل قوت سے ٹکرانے کے لئے علماء ہزارہ نے دست خود میں سیف و سناں سنبھالا۔ یہ مضمون بہت تفصیل کا طالب ہے لیکن میں اس سے قاصر ہوں ؎

زبان ز نطق فروماند و راز من باقی ست بسا بسا طِ سخن آخر شد سخن باقی ست

لہٰذا زیر تسوید باب کے متعلق ہی تحریر پر اکتفا کرتا ہوں۔ اخبار نویسی اور صحافت کے میدان میں سرحد دماور لئے سرحد کی ساری برادری میں اولیت اور شگفتگی کے لحاظ سے ضلع ہزارہ ہی کو امتیاز اور فضیلت حاصل ہے اس جیش کے اولیں کارکن شمع آزادی کے پروانے تھے۔ اور اسی جذبہ کے فروغ کے لئے وہ اس وادی میں آئے۔ ۱۹۱۱ء میں ایک اخبار "ایڈورڈ گزٹ" ایبٹ آباد سے شائع ہوا۔ شاید اس سے پہلے بھی کوئی اخبار شائع ہوا ہو۔ لیکن مجھے علم نہیں۔ صوبہ سرحد میں سب سے پہلے اس کے صدر مقام پشاور سے "افغان" نامی ایک اخبار شائع ہوا۔ ممکن ہے اس کا اجراء بھی کسی ہزارہ کے اہل علم کے ہاتھوں ہوا ہو۔ یا وہ شریک کار رہا ہو۔ ۲۳-۱۹۲۱ء اور اس کے بعد کا زمانہ کافی ہنگامہ خیز تھا۔ خلافت اور ہجرت کی تحریک زوروں پر تھی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس تحریک کے سالار اعظم تھے۔ کالجوں اور سکولوں کا بائیکاٹ ہوا۔ مختلف کالجوں کے طلبا، جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ چلے گئے۔ جہاں مولانا

محمد علی مرحوم کی مساعی سے ان کی سرکردگی میں علیحدہ یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اسلامیہ کالج پشاور میں تعلیم پانے والے ہزارہ کے چند نوجوان طلباء بھی علی گڑھ پہنچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر تبلیغی مشن پر ان کو اپنے صوبوں میں واپس بھیج دیا گیا۔ یہاں ان نوجوانوں کو واپس آکر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ ان میں مولانا غلام ربانی لودھی، ملک امیر عالم خان اعوان۔ ملک محمد عالم خان اعوان، مسٹر حاجی احمد مرحوم اور عبدالرشید خان طاہر خیلی مرحوم بھی شامل تھے۔ ان سب کو کچھ عرصہ ایبٹ آباد جیل میں پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بیڑیوں سے جکڑ رکھنے کے بعد اس وقت کے حاکم ضلع کرنل جیمز نے ضلع سے خارج کر دیا کچھ عرصہ خلافت کا کام کرنے کے بعد ملک امیر عالم خان نے راولپنڈی سے "ترجمان سرحد" کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکالا۔ اور اخبار "شہاب" بھی جاری ہوا۔ ان دونوں نے صوبہ اور ضلع کے نام کو کافی بلند کیا۔ صوبہ میں اصلاحات کی ترویج اور ضلع ہزارہ کی انتظامی خرابیوں کی نشاندہی کرنا۔ ان کا بنیادی مقصد تھا۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اخبارات اور ایڈیٹروں کے حالات تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ایڈورڈ گزٹ۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا جو ایبٹ آباد سے زیر ادارت منشی محمد قلندر خان صاحب تنولی ساکن پنڈ خان خیل ۲۰ مئی ۱۹۱۱ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ دس بارہ صفحات کا جلی قلم سے نستعلیق خط کا اخبار تھا۔ اس میں مقامی خبریں اور ضلع کے حالات پر تبصرے ہوتے تھے۔ پبلک کی تکالیف کا ترجمان تھا اور سرکاری ملازمین کے خلاف معمولی سی معمولی شکایت بھی لکھتا رہتا تھا۔ لہجہ ذرا تند و تیز تھا۔ تھوڑی مدت ہی چل سکا۔ تقریباً چھ ماہ جاری رہ کر جولائی ۱۹۱۱ء میں بند ہو گیا۔ محمد قلندر خان تنولی کی وفات ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ ۲۔ ترجمانِ سرحد ہفتہ وار مدیر ملک امیر عالم خان اعوان ساکن مانسہرہ۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں راولپنڈی سے شائع ہونا شروع ہوا ۱۹۳۲ء میں پشاور منتقل ہو گیا اور بحمداللہ آج تک جاری ہے۔ اس کے اداریے قابل قدر، سیاسی متانت آزادیٔ رائے اور قومی رنگ سے مزین ہوتے ہیں۔ اس کے خاص عنوان آئینۂ عالم، سرکاری گزٹ۔ صوبہ کی خبریں اور قابل قدر نوٹ ہوتے ہیں۔ ملک صاحب موصوف کے حالات زندگی اس کتاب میں دوسری جگہ پوری تفصیل سے لکھے جا چکے ہیں۔ اس ضمن میں یہ واقع بھی قابل ذکر ہے کہ برطانوی سامراج کے آخری ایام کا تشدد، آزادی پسند طبقے کے ساتھ کچھ دست بدست جنگ پر اتر آیا تھا ملک امیر عالم خان نے ترجمان سرحد جو کہ راولپنڈی میں تھا۔ ٹیکسلا سے "ترجمان" کا ڈیکلریشن بھی لے رکھا تھا تاکہ اگر ترجمانِ سرحد بیوروکریسی کے چنگل میں آجائے۔ تو کام رکنے نہ پائے۔ خریداروں کے نام "ترجمان" ٹیکسلا ہی پہنچتے رہے۔

۳۔ "شہاب" سہ روزہ ادارۂ تحریر مولانا غلام ربانی لودھی ساکن سرائے صالح، ملک محمد عالم خان

اعوان ساکن منگلور تحصیل مانسہرہ ۔ مولانا شہاب الدین جہلمی (ڈاکٹر فضل الرحمٰن سابق صدر اسلامی مشاورتی کونسل کے والد تھے) اور قاضی عزیز الرحمٰن ساکن سرائے صالح ۔ یہ اخبار راولپنڈی سے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا گیا صوبہ سرحد میں اصلاحات کی ترویج اور ضلع ہزارہ میں انتظامی خرابیوں کی طرف توجہ دلانا اس کا مقصد اعلیٰ تھا ۔ ساتھ ہی اس کی اٹھان محکمہ تعلیم کی رشوت ستانی اور ظالم افسروں کے خلاف کچھ ایسی بے جگری کی لڑائی تھی کہ مظلوم مدرس طبقہ کی جان میں جان آگئی ۔ یہ چاروں اصحاب علم وادب و صحافت کے آسمان کے تارے بلکہ مہتاب ہیں ۔ لہٰذا اس اخبار کا پایہ بہت بلند اور حکومت کی نظر میں قابل توجہ تھا ۔ آخر کار یہ اخبار کلی طور پر محمد عالم خان کے سپرد کر دیا گیا ۔ اس اخبار کی تحریک برائے ترویج اصلاحات سرحد جلد ہی کامیابی سے ہمکنار ہو گئی ۔ اور صوبہ سرحد کو ۱۹۳۲ء میں اصلاحات مل گئیں ۔ اور ملک محمد عالم خان اعوان محکمہ پبلسٹی سرحد میں جرنلسٹ کی اسامی سے منسلک ہو گئے ۔ اور ۱۹۶۰ء میں مغربی پاکستان کے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے از عہدہ سیکشن افسر پنشن پا آگئے ۔ اب ایبٹ آباد میں مقیم ہیں ۔ ملک محمد عالم خان کے بعد کچھ عرصہ تک مسٹر کالا خان ساکن باندھی ڈھونڈاں شہاب کو چلاتے رہے ۔ یہ ایک صاحب علم خاندان کے فرد تھے ۔ ان کے دو بھائی ماسٹر خیر اللہ اور ماسٹر امیر اللہ ٹیچر تھے ۔

۴ ۔ مظلوم ، ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ضرغام اللہ خان ساکن لا لوگلی نے جو ایک وقت میں نواب امب کے وزیر تھے اور ان کے زیر عتاب آکر راولپنڈی میں مقیم تھے یہ اخبار نکالا ۔ جس کا مقصد ریاست امب کے نظم ونسق پر جرح کرنا تھی ۔ شاید بعد میں نواب صاحب نے ان کو واپس بلا لیا اور یہ اخبار بند ہو گیا ۔

۵ ۔ نوجوان افغان ، ہفتہ وار ۱۹۳۲ء میں ہری پور سے شائع ہونا شروع ہوا ۔ ادارہ تحریر میں مجاہد وطن لالہ محمد اکبر خان قریشی (ہری پور) محمد سرور خان طاہر خیلی ماہر سیاست و غیرت ہزارہ اور تاج محمد خان مجسمہ جرات افغانی تھے ۔ یہ اخبار ۱۹۳۳ء تک جاری رہا ۔ جب کہ ڈاکٹر خان صاحب کی (کانگرس) حکومت نے اس کی ضمانت ضبط کر لی ۔ شاید ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ محمد سرور خان طاہر خیلی اور لالہ محمد اکبر خان قریشی نے زمام ادارت تاج محمد خان کے حوالہ کر دی ۔ ان کے جانے کے بعد ہی (اغلباً) غلام جان خان طاہر خیلی علاوہ ادارت میں شامل ہوئے ۔

۶ ۔ نوجوان سرحد ۱۹۳۵ء میں تاج محمد خان طاہر خیلی کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ۔ غلام جان خان بھی ادارہ تحریر میں شامل تھے ۔ نوجوان سرحد کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا ہے ؎

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ۔۔۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

اور یقیناً اس اخبار کا شہباز اوج آسمان پر اڑتا ہوا نشیب و فراز ارضی پہ عقابی نظر رکھتا ہے اس

کے بیباک اداریئے آزادی خیالات اور قومی مسائل کے حامل ہوتے ہیں اس میں وقتی اور وطنی مسائل پر مفید تبصرے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں ۔ گاہے گاہے ظرافت قلمی کی نوک ونشتر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھی اس کے صفحات پر بہار دکھاتے ہیں ۔ غلام جان خان طاہر خیلی ۱۹۴۰ء میں ان سے الگ ہو گئے اور اپنا اخبار جمہور نکالا ۔ چند سالوں سے " نوجوان سرحد " میں عالمانہ اداریئے اور مسائل دینی پر بصیرت افروز مقالے مولانا غلام ربانی صاحب لودھی کے قلم سے ہوتے ہیں جو اس کے ماتھے کا جھومر ہیں ۔

۷ ۔ " اسرار سرحد " فقیرا خان جدون نے ایبٹ آباد سے شائع کیا تھا ۔ سن اجرا معلوم نہ ہو سکا ۔ اغلباً ۱۹۳۶ء سے پہلے چند سال جاری رہا ۔ ۔ ۷ ۔ " انکشاف " یہ اخبار فقیرا خان جدون نے اسرار سرحد کے بعد ۱۹۳۶ء میں ایبٹ آباد سے نکالا ۔ اشاعت بے قاعدہ ہوتی تھی کئی کئی ماہ بعد جب کبھی مواد اکٹھا ہو جاتا تو شائع کر دیا جاتا تھا مضامین کسی خاص شخص کے خلاف یا حق میں ظرافت کی بھول بھلیاں کی طرز پر ہوتے تھے ۔ نشانہ پر خوب لگتے اور محفلوں کو کشت زار بناتے تھے ۔ اس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوا کرتا تھا ؎

نکالا ہے فقیرا خان نے اخبار ۔۔۔ کرے گا منکشف اسرار سرحد

فقیرا خان جدون مرحوم ہزارہ کی ایک دلچسپ اور ناقابل فراموش شخصیت تھے ۔ آپ کی تعلیم شاید مڈل تک یا کم تھی ۔ لیکن طرز گفتگو ، آداب مجلس اور طرز بود و ماند اعلیٰ طبقہ کی طرح تھی ۔ آپ بڑے ہی خراج تھے ۔ دماغ بڑا زرخیز پایا تھا ہر محفل میں سب پر چھا جاتے تھے ۔ دسترخوان ' افسران وقت ، وزیران حکومت اور اکابرین قوم کے کھلا رہتا تھا ۔ بہترین خانساماں رکھتے تھے ۔ دسترخوان پر بہترین الوان نعمت چنے جاتے تھے ۔ کھانے کے وقت کے سخت پابند تھے ۔ ٹھیک وقت پر کھانا میز پر چنا جاتا تھا ۔ خواہ کیسا ہی معتبر مہمان بھی اس وقت غیر حاضر ہو ۔ کھانا ختم ہونے اور گپ شپ کے بعد ٹھیک ۹ بجے رات (عموماً رات کا کھانا ہوتا تھا) آپ مودبانہ دست بستہ کھڑے ہو کر مہمانوں کو مخاطب کرتے ان کا شکریہ ادا کرتے اور کہتے کہ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں ۔ " اپنی ظرافت طبع و حاضر دماغی سے بڑے بڑے کام کئے ۔ لاکھوں کمائے اور خرچ کئے ۔ بڑے بڑے امرا اور نوابوں سے رابطہ رہا حتیٰ کہ نظام دکن سے بھی راہ و رسم رہی ۔ قائد اعظم کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن رہے ۔ ان کی بیٹھک میں اس زمانہ کی ایک تصویر آویزاں تھی ۔ جس میں وہ قائد اعظم کے ساتھ بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے ۔ قائد اعظم مرحوم کی وفات کے بعد ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح مرحومہ سے ان کی موٹر بطور یادگار حاصل کر لی ۔ آپ کی وفات جنوری ۱۹۶۰ء میں ہوئی ۔

۸ ۔ " شمشیر سرحد " ایبٹ آباد سے سردار کرپال سنگھ کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ۔ تاریخ

اشاعت معلوم نہ ہو سکی۔ ۹۔ "پیغام سرحد" ہفتہ وار ۱۹۳۱ء میں ہری پور سے زیر ادارت قاضی عزیز الرحمٰن صاحب ساکن سرائے صالح شائع ہونا شروع ہوا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس کی پیشانی کا شعر

الٰہی چار سو آفاق میں گونجے صدا اس کی — کہ مسلم کا حقیقی ترجماں "پیغام سرحد" ہے

اس کے اسلامی عزم و عمل کا اعلان ہے۔ اخبار کا مقصد اصلی اسلام ہی کی ترجمانی ہے۔ اس میں ضلع کے مفصل حالات اور خبریں بھی درج ہوتی ہیں۔ قاضی عزیز الرحمٰن صاحب کہنہ مشق اور عالم شخصیت ہیں۔ کافی عرصہ سے آپ خون کے دباؤ کے مریض اور صاحب فراش ہیں۔ خدا ان کو صحت کامل عطا فرمائے۔ آمین۔ ۹۔ "پاکستان" ہفتہ وار ایبٹ آباد سے ۱۹۳۵ء میں کاظمی صاحب (آزاد کشمیر) کے زیر اہتمام شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید غلام حسن کاظمی بڑے روشن فکر نوجوان تھے۔ آپ آغا لعل شاہ صاحب مرحوم سابق ایڈیٹر زمیندار لاہور کے داماد ہیں۔ مولانا غلام ربانی لودھی سے انہوں نے علامہ اقبال کی فارسی تصانیف کا درس لیا تھا جب کہ دونوں لاہور میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ کاظمی صاحب کے چچا اور خسر آغا لعل شاہ اور ان کے دوسرے بھائی گڑھی حبیب اللہ کے پاس بوئی میں موہڑہ شریف کے خلیفہ مجاز تھے۔

۱۱۔ "جمہور" ہفتہ وار ۱۹۴۶ء میں زیر ادارت غلام جان خان طاہر خیلی ہری پور سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کی طلوع بی اس کا باقاعدگی کے ساتھ اس وقت تک شائع ہوتا ہے۔ طباعت بہت صاف اور خوش خط ہوتی ہے۔ محکمہ جات سرکاری کی کارکردگی، مقامی خبریں اور مختلف مسائل پہ تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ سیاسی روش معتدل اور حکومت وقت کی سازگاری کی ہوتی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ایبٹ آباد سے شائع ہونا شروع ہوا۔ گاہے گاہے اس میں تاریخ ہزارہ پر مفید مضامین بھی شائع ہوتے ہیں جن سے میں نے اپنی کتاب "تاریخ ہزارہ" کے لئے استفادہ بھی کیا۔

۱۲۔ "مضراب" ہفتہ وار۔ زیر ادارت حکیم عبد العزیز صاحب چشتی ۱۹۵۰ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ سیاسی اور مقامی مضامین ہوتے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں مارشل لا کے ابتدائی سال میں بند کر دیا گیا۔ ۱۳۔ "نقیب" ہفتہ وار ایبٹ آباد سے اغلباً ۱۹۶۲-۶۳ء میں زیر ادارت ناشاد طاہر خیلی صاحب شائع ہونا شروع ہوا۔ تھوڑی مدت ہی جاری رہا۔

ہزارہ کے اخبارات و مدیران کرام کے تذکرے کا خاتمہ ایک علمی ماہنامہ مجلّہ کے ذکر سے کرتا ہوں۔

مجلّہ "ترجمان" ماہانہ سرائے صالح سے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ "زمیندار" لاہور کے آخری دور کے ایڈیٹر مولانا خدا بخش اظہر مرحوم اس مجلّہ کے اجرا کی تمام ذمہ داریوں کو نباہتے

رہے۔ اگرچہ مجلّہ پر حضرت مولانا غلام ربانی لودھی کا نام بطور ایڈیٹر درج ہوا کرتا تھا۔ یہ مجلّہ ادبی حیثیت سے سابق صوبہ سرحد کا غالباً واحد پرچہ تھا۔ یہ مجلّہ ماہانہ حیثیت سے ملک امیر عالم خان اعوان کی تجویز اور سرائے صالح (ہری پور) کے لودھی قبیلہ کے نوجوانوں ماسٹر خلیل الرحمٰن۔ مولوی منظور حسین لودھی اور غلام جیلانی لودھی کے اصرار پر جاری کیا گیا تھا۔ یہ علمی۔ ادبی۔ مذہبی اور تاریخی حقائق و معارف کا مبلغ تھا۔ اس کی یہ قابل قدر حیثیت حضرت مولانا غلام ربانی لودھی کی عالمانہ ہستی کی برکت و نگرانی کی وجہ سے تھی۔ اس مجلّہ کا ڈیکلریشن مولانا موصوف کو مسٹر ہاکپنس ڈپٹی کمشنر ہزارہ جو کھلی اور بے تکلف طبیعت کا انگریز تھا سے منظور کرانے میں دیر نہ لگی اور مولانا فرماتے ہیں کہ "مجھے ممنون کرتے ہوئے میں نے اس کی پیشانی پر مسرت اور بشاشت کو کھیلتے ہوئے پایا۔"

شہر ایبٹ آباد کے ادارے اور معروف ہستیاں۔

ایبٹ آباد شہر

میجر ایبٹ ۱۸۵۳ء میں یہاں سے تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے جانشین نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔ بنگلے اور عدالتیں تعمیر ہوئیں اور شہری آبادی کا آغاز ہوا۔ اس شہر کی آبادی میں جامع مسجد، اس کی دکانیں اور اسلامیہ سکول ابتدائی تعمیرات سے ہیں۔ اور انجمن اسلامیہ کی تعمیر کردہ ہیں۔ یہ قابل ذکر ادارہ تھا۔

"تاریخ انجمن اسلامیہ۔ اس کی تشکیل کا سال صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انجمن کا دفتر جو اسلامیہ سکول میں تھا دو دفعہ آگ لگنے سے (ایک دفعہ ۱۹۳۵ء کی آگ جس نے سارے شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ دوسری دفعہ صرف اسلامیہ سکول میں آگ لگنے سے) جل چکا ہے۔ انجمن کی قیمتی دستاویزات کتب خانہ (جس میں شاہزادہ بخارا کا کتب خانہ بھی شامل تھا) وغیرہ جل گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی کتابیں ایسی تھیں جو شاہزادہ بخارا مرحوم اپنے ہمراہ لائے تھے ان کتابوں کا ذخیرہ بہت وسیع تھا امیر تیمور سے لے کر بابر بادشاہ کے زمانہ تک کی کتابیں اس ذخیرہ میں موجود تھیں۔ جو سب کی سب قلمی تھیں۔ ان میں ایک کتاب ایسی تھی جس میں بابر بادشاہ مع خاندان محل میں یک جا بیٹھے دکھائے گئے تھے زبانی تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ انجمن ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی۔ اس کی تصدیق مسٹر جسٹس سجاد احمد جان صاحب (جو اس انجمن کے سیکرٹری ۱۹۵۲-۵۳ء رہے اور حکیم عبد العزیز صاحب چشتی نے (جو کافی مدت اس انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے) نے بھی کی۔

سیاسیات سے کچھ تعلق نہ تھا۔ ایبٹ آباد میں سیاسی جماعتوں
کے عہدیداروں کو حکام رسی کا موقع حاصل رہا۔ انجمن کی لائق
صاحب اثر اور باوقار لوگ اس انجمن کے ممبر بنتے رہے شہر
سے تھا۔ انجمن کی عہدہ داری قیادت کی سند بن گئی اور ضلع بھر
کی لیڈرشپ ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

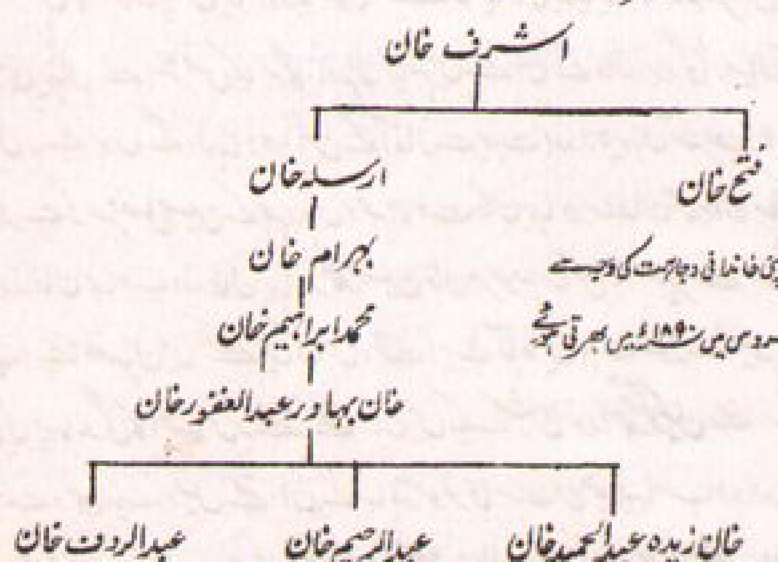
اسلامیہ کی کارکردگی

سے گورنمنٹ نے بہت سی نزول کی جائے سفید برائے نام
ایک چھوٹی سی مسجد اور مسجد سے متعلق دکانیں متفرق
کے تعمیر کا آغاز کیا ان تعمیرات کی نگرانی ٹھیکیدار اللہ بخش صاحب
ان بہادر جلال الدین (المعروف جلال بابا) بابو کرم الٰہی (والد
عبدالکریم خان صاحب مجسٹریٹ) اور ایک ہندوستانی

مسجد بنائی گئی اس کی تعمیر زیر اہتمام احمد میر صاحب ٹھیکیدار
صدی کے شروع میں اس انجمن نے ایک پرائمری سکول
حلوائی کی دکان میں آتشزدگی سے آناً فاناً آگ نے
آگ قابو سے باہر ہوگئی۔ یہ آگ تین شب و روز شعلہ
جامع مسجد۔ اسلامیہ سکول اور مسجد کی ملحقہ جائداد جل
سرکے کر ہمت باندھی اور قلیل مدت میں پہلے
مسجد کی جائداد بھی نئے سرے سے تعمیر ہوئی۔
خوبصورت پختہ دکانیں تعمیر ہوگئیں جو آمدنی میں خاصے
احمد خان صاحب سیکرٹری کی انتھک کوششوں
سکول بن گیا۔ جو اس وقت ایبٹ آباد میں تیسرا اور ضلع
سے ضلع بھر میں اول آ رہا ہے۔
جن کا علم ہوسکا وہ یہ تھے ۱۔ ڈاکٹر جہانگیر بخش صاحب

والد کریم بخش صاحب۔ ان کا صاحب زادہ میجر رحمت اللہ صاحب اب انگلینڈ میں مقیم ہیں اور گاہے
گاہے یہاں آتے ہیں۔ ۲۔ خان صاحب ڈاکٹر عبدالرحمٰن خان ملٹری ڈاکٹر۔ ۳۔ ڈاکٹر عبدالرزاق
خان صاحب۔ ۴۔ محمد امیر خان غوری۔ ۵۔ فتح بہادر صاحب ہندوستانی آپ فوجی کلرک تھے۔

انجمن کے ابتدائی صدر و سکرٹری صاحبان ۔ باوجود تلاش و جستجو کے صحیح طور پر یہ معلوم نہ
ہو سکا کہ ۱۸۹۲ء میں انجمن کے صدر اور سکرٹری کون صاحب تھے۔ مختلف واقف حال بزرگوں کی رائے
میں اختلاف ہے۔ ۱۸۹۴ء کے قریب خان بہادر عبدالغفور خان ساکن زیدہ کا صدر ہونا بیان ہوتا ہے
آپ ۱۸۹۶ء میں یہاں اسسٹنٹ کمشنر تھے لیکن یہ یقینی طور پہ مانا جاتا ہے کہ شاہزادہ بخارا اپنی وفات
۱۹۰۸ء تک اس انجمن کے صدر یا سرپرست رہے۔ آپ ۱۹۰۲ء میں ایبٹ آباد تشریف لائے۔
کچھ عرصہ کے لئے صاحب زادہ نور محمد صاحب مرحوم کا بھی صدر ہونا بیان ہوتا ہے لیکن سال کی تعین نہیں کیا۔
خان بہادر عبدالغفور خان سرحد کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ لہٰذا ان کے مختصر حالات زندگی
و شجرہ نسب تحریر کئے جاتے ہیں۔ خان بہادر عبدالغفور خان چیف آف زیدہ تھے۔ ان کے اجداد علاقہ
یوسف زئی مردان کے حکمران تھے۔ ان کے پردادا خان ارسلہ خان مشہور خان تھے جو انگریزوں سے مقابلہ
پر آخر دم تک ڈٹے رہے۔ ۱۸۴۹ء میں مزید تاب مقابلہ نہ پاکر سوات چلے گئے۔ وہاں فوت ہوئے اور
وہیں مدفون ہیں اس خاندان کا شجرہ حسب ذیل ہے۔



خان بہادر عبدالغفور خان اپنی خاندانی وجاہت کی وجہ سے
براہ راست انڈین سول سروس میں ۱۸۹۰ء میں بھرتی ہوئے

۱۸۹۴ء میں عبدالغفور خان ایبٹ آباد میں اسسٹنٹ کمشنر تھے ۱۹۲۳ء میں سیشن ججی سے پنشن
پر آئے پہلی سرحد اسمبلی (۱۹۳۲ء) کے سپیکر مقرر ہوئے۔ اور اسی عہدہ پر ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔ خوبصورت
شکل، گورا رنگ پُر وجاہت چہرہ اور بارعب شخصیت تھے۔ ان کے بڑے صاحب زادہ خان عبدالحمید خان

صاحب اب خان (دیدہ) میں جو کافی عرصہ آنریری مجسٹریٹ رہے ان کا بڑا صاحبزادہ خانزادہ عبدالسلام خان ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر از ۱۹ دسمبر ۱۹۶۶ء تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۹ء رہے۔

انجمن اسلامیہ کے بانی

اس باب میں بہت سی روایات ہیں۔ اہل ہزارہ میں سے قاضی میر عالم صاحب ساکن سکندرپور جو ۱۸۸۵ء میں ہزارہ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے اور راجہ جہانداد خان ساکن خان پور جو ۱۸۸۳ء میں ہزارہ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے کے نام لئے جاتے ہیں۔ دونوں بہت بڑے عالم فاضل انسان تھے گمان غالب ان دو میں سے راجہ جہانداد خان کے متعلق بانی ہونے کا ہوتا ہے لیکن حتمی شہادت میسر نہ آسکی۔ اگرچہ بہت سے راوی قاضی میر عالم صاحب سکندرپوری کو بانی بیان کرتے ہیں۔ چودھری محمد علی صاحب سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کے بیان کے مطابق اس انجمن کے بانی مبانی میاں حسین بخش (والد سر فضل حسین مرحوم وزیر صحت و تعلیم سابق صوبہ پنجاب و مرکزی وزیر ہندوستان اور میاں افضل حسین سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور) تھے۔ وہ ان دنوں میں یہاں افسر مال تھے۔ آپ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ہر وقت کوشاں رہے۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سر فضل حسین نے ایبٹ گورنمنٹ سکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور یہ سکول ۱۹۱۱ء میں ہائی بنایا گیا۔ لامحالہ سر فضل حسین نے ۱۹۱۱-۱۲ء کے بعد ہی یہاں سے انٹرنس کیا ہوگا۔ اور ان ایام میں سے ان کے والد بزرگوار میاں حسین بخش صاحب افسر مال رہے ہوں گے۔ لہٰذا وہ انجمن کے آغاز سے بہت بعد وہ یہاں تشریف لائے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سر فضل حسین کے ہم درس دہم جماعت خان بہادر سلطان محمد خان ساکن بیرٹ اور محمد فیروز خان صاحب ولد خان بہادر محمد حسین خان مرحوم ساکن مانسہرہ تھے۔ آگے چل کر چودھری صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ اس وقت ایبٹ آباد میں بہت تھوڑے تعلیم یافتہ مسلمان تھے جو ضلع کی پسماندگی کا احساس رکھتے تھے۔ ان میں ایک شیخ نور احمد صاحب وکیل تھے۔ سارے ضلع میں اس وقت وہی ایک وکیل تھے۔ ان کے ساتھ مولوی سلطان میر صاحب (والد میر ولی اللہ صاحب مرحوم ایڈووکیٹ) اور تیسرے چودھری اللہ بخش (والد چودھری محمد علی) تھے۔ ان چاروں نے انجمن اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ میاں حسین بخش صدر، شیخ نور احمد نائب صدر، مولوی سلطان میر صاحب سکرٹری اور چودھری اللہ بخش صاحب خزانچی بنے۔ میاں حسین بخش کے اثر رسوخ سے ایک بڑا قطعہ زمین گورنمنٹ سے برائے نام قیمت (رعایتی قیمت) پر حاصل کیا گیا۔ چندہ کے لئے اپیل کی گئی

بڑے بڑے زمینداروں و خوانین ہزارہ نے میاں حسین بخش صاحب کے اثر سے کافی رقوم پیش کیں۔ ان سے موجودہ جامع مسجد ایک پرائمری سکول اور مسجد کے ساتھ بہت سی دکانیں تعمیر کی گئیں۔ یہ سکول بعد میں مڈل بنا اور اب ہائی سکول ہے۔ دکانوں سے گراں قدر آمدنی ہے اور یہ سب میاں حسین بخش صاحب مرحوم کی کوششوں اور دُور بینی کا نتیجہ ہے۔

متذکرہ بالا اقتباس چودھری صاحب کے مضمون شائع شدہ پاکستان ٹائمز ۹ فروری ۱۹۶۹ء سے لیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ آپ کو انجمن کی ابتداء میں تسامح ہوا۔ ان کا بیان انجمن کی زندگی کے دوسرے یا تیسرے دور یعنی ۱۹۰۵ء سے مطابقت رکھتا ہے ان کی اپنی تحریر کے مطابق انجمن کی بنیاد انیسویں صدی کے آخر میں رکھی گئی۔ اور ایبٹ آباد کے وکلاء کے حالات میں جو خط چودھری صاحب نے مجھے لکھا اس میں شیخ نور احمد صاحب کی آمد ایبٹ آباد ۱۹۰۵ - ۱۹۰۷ء تحریر فرمائی لہٰذا وہ انجمن کے نہ ابتدائی ممبران سے اور نہ ہی پہلے صدر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا چودھری صاحب کا بیان تیسرے دور کا واقعہ ہو سکتا ہے۔ چوتھا دور میر ولی اللہ صاحب مرحوم ایڈووکیٹ کا تھا۔ جو ۱۹۳۵ء تک رہا۔ پانچواں دور ۱۹۳۵ء میں جلال بابا خان بہادر جلال الدین) کی صدارت کا تھا۔ وہ ۱۹۵۲ء تک صدر رہے۔ ان کے ساتھ جسٹس سجاد احمد خان صاحب سکرٹری رہے۔ جلال بابا کو سخت ترین مقابلہ کے بعد صدر چُنا گیا تھا۔ آپ کی مخالفت نوجوان پارٹی جس کے قائد مشہور اشتراکی کارکن محمد حسین عطا اور عبدالجلیل عثمانی تھے نے کی۔ خان فقیرا خان جدون کو نائب صدر شیخ سجاد احمد خان ایڈووکیٹ (جسٹس سجاد احمد خان حال ممبر سپریم کورٹ آف پاکستان) جنرل سکرٹری اور ایم غلام حسین المعروف بھاٹیا کو جائنٹ سکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ یکم جولائی کو ان اراکین نے انجمن کا چارج لیا۔ اور ٹھیک پانچویں دن تباہ کن آگ شہر میں لگ گئی۔

۱۹۵۲ء میں حکومت سرحد نے محکمہ اوقاف کی تشکیل کی اور صوبہ سرحد کی دیگر بڑی بڑی مساجد کے اوقاف کے ساتھ ایبٹ آباد کی جامع مسجد ملحقہ جائداد اور اسلامیہ ہائی سکول اس محکمہ کے حوالہ کر دی گئی۔ خان بہادر جلال الدین (جلال بابا) ایبٹ آباد کی مشہور شخصیت ہیں۔

...... آپ کی پیدائش مارچ ۱۹۰۳ء میں ہوئی۔ ہزارہ مسلم لیگ کے آغاز ہی سے (۱۹۳۶ء) پاکستان بننے تک صدر رہے۔ آپ کی تعلیم مڈل تک ہے لیکن ذاتی ہمت، سیاسی سوجھ بوجھ اور خرچ و محنت سے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ ۱۹۳۶ء میں سرحد اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۲ء وزیر رہے۔ بعد میں مرکز میں چلے گئے۔ اور جنوری ۱۹۵۵ء میں وزیر داخلہ مقرر ہوئے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگنے پر فارغ ہوئے۔ ۱۹۶۹ء کے آغاز سے بوجہ خرابی صحت خانہ نشین ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں یہ عہد سکندر مرزا ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد کی عید گاہ جلال بابا کی قیادت میں ہندوؤں کی مخالفت کے باوجود بنائی گئی۔

انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد کی جامع مسجد کے خطیب

۱۔ پہلے امام مسجد مولوی فقیر محمد پوٹھواری تھے جو بعد میں انجمن کے اسلامیہ سکول میں دینیات کے معلم مقرر ہوئے۔ ۲۔ ان کے بعد مولوی شریف اللہ امام مسجد ہوئے۔ ۳۔ ان کے بعد سید سرور شاہ ساکن داتہ امام مقرر ہوئے وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن احمدی ہونے کی وجہ سے ان کو معزول کر دیا گیا۔ ۴۔ حضرت سید انور شاہؒ کا قیام بھی بطور امام مذکور رہا۔ ۵۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۳ء تک حضرت مولانا محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجوئیؒ خطیب رہے۔ آپ بڑے عالم۔ فقیہہ۔ متدین اور صاحب اثر شخصیت تھے۔ اُن کے مفصل حالات باب علماء ہزارہ میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ۶۔ ۱۹۲۳ء سے تاحال مولانا محمد اسحاق صاحب خطیب ہیں آپ لنگر علاقہ تناول کے رہنے والے ہیں۔ فاضل دیوبند ہیں۔ فن خطابت، علم دینی و سیاسی ہر دو کے ماہر ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۹ء میں دیوبند سے تحصیل علم کی۔ دو تین سال بمبئی میں مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزند اکبر و مشہور مجاہد ملت مولوی محمد علی ایم اے کینٹب کے توسط سے بمبئی کے ایک دینی مدرسہ میں معلم تین سال کام کیا۔

یہاں انجمن اسلامیہ کے ایک ہیڈ ماسٹر کا ذکر غیر مناسب معلوم ہوتا ہے آپ کا نام آثار الحق تھا۔ آپ پوٹھواری تھے۔ نورانی چہرہ اور فرشتہ سیرت، ان کی ایک رباعی بطور تبرک درج ذیل ہے:۔

علم غیبی کس نمے داند بجز پروردگار | گر کسے گوید کہ من دانم، اور ا باور مکن
مصطفےٰ ہم نگفتہ تا نگفتہ جبرئیل | جبرئیل اش ہم نگفتے تا نگفتے کردگار

ایبٹ آباد کے ماضی قریب کے چند مشاہیر

۱۔ میر سید عبدالملک شہزادہ بخارا مرحوم۔ میں نے ان کے حالات مختلف ذرائع سے حاصل کئے سر فہرست مولوی مسعود الرحمٰن صاحب خلف الحاج محمد عبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ انہوں نے میری درخواست پر مفصل نوٹ لکھ کر عنایت کیا۔

اس ضمن میں چودھری محمد علی صاحب وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کے ایک مضمون شائع شدہ پاکستان ٹائمز (۱۵ ستمبر ۱۹۶۰ء) سے بھی استفادہ کیا گیا۔ ابتداء میں اسی مضمون سے مجھے شہزادہ بخارا کے حالات معلوم کرنے کی جستجو ہوئی۔ اس کے بعد مولوی فیض رسول صاحب امام مسجد شہزادہ بخارا

(وہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۶۰ء تک امام رہے) اور آخر کار مولوی عبدالرحمٰن صاحب مالک فرم عبدالرؤف اینڈ برادرس سے زبانی حالات معلوم کئے۔ شہزادہ مرحوم نے غالباً ۱۸۸۶ء میں بخارا سے ہجرت کی روس اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وسط ایشیا کی پرانی اسلامی سلطنت مملکت بخارا میں خانہ جنگی چھڑ گئی جو کئی سال تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخت و تاج کے ایک دعویدار میر سید عبدالملک نے اپنی نا دوم بخارا سے فرار ہو کر ایران و افغانستان کے راستے برطانوی ہند میں سیاسی پناہ لی۔ یہ زمانہ ملکہ وکٹوریہ برطانیہ اور امیر عبدالرحمٰن خان والئی افغانستان کا تھا۔

جس وقت آپ یہاں ایبٹ آباد میں غالباً ۹۳-۱۸۹۲ء میں تشریف لائے۔ تو آپ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ نہ صرف شہزادہ ہی تھے۔ بلکہ بلند پایہ ادیب، اہل قلم اور اہل سیف بھی تھے دینی علم میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ شکل صورت میں متشرع، از لبس خوبصورت اور وجیہہ اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ نہایت بارعب اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ اخلاق و عادات میں بدستور بادشاہ تھے۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اُن کے سلام کے لئے ان کی کوٹھی پہ جایا کرتا تھا۔ اور کئی دفعہ اس کو شہزادہ صاحب کے ہمرکاب گھوڑوں پر سوار شام کے وقت سیر کے لئے جانا بیان ہوتا ہے۔ یہ دونوں آپس میں فارسی میں گفتگو کرتے تھے۔ خوش کردار اور خوش گفتار بزرگ تھے۔ الغرض وسط ایشیا کی پرانی شاہی روایات ان میں پوری طرح موجود تھیں۔ چہرہ پر شاہی جلال اور ہیبت نمایاں تھی ہندوستان پہنچ کر ہندوستانی مسلمانوں کا لباس پہننے لگے تھے اور گاہے گاہے کوٹ پتلون اور سر پر شہدی لنگی ہوتی تھی۔ اکثر سیاہ رنگ کا لباس زیب تن ہوتا تھا۔ شہزادہ مرحوم کے ہمراہ ان کا بڑا بیٹا شہزادہ تیمور شاہ بھی بخارا سے آیا تھا جو اُن کی پہلی بخاری بیوی کے بطن سے تھا۔ شہزادہ تیمور شاہ نہایت خوبصورت اور دلکش جوان تھا۔ پولو شطرنج اور شعر و سخن میں کافی دلچسپی لیتا تھا۔ مگر افسوس کہ جلد ہی عالم شباب میں مختصر سی علالت کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور اسے اپنے والد کی بنائی ہوئی مسجد کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔

میر سید عبدالملک نے ایبٹ آباد میں تین چار شادیاں کیں لیکن ان سے اولاد نرینہ صرف ایک شہزادہ سکندر شاہ ہی پیدا ہوئے۔ اب عمر ۱۹۶۰ء تقریباً ساٹھ سال ہے۔ عارضہ قلب اور ضیق النفس میں مبتلا ہیں۔

شاہزادہ بخارا کا محل۔ شاہزادہ بخارا کو ایبٹ آباد کے قصبہ، علاقہ لوئر ملک[1] پورہ میں انہی کے انتخاب کے مطابق ایک وسیع اور پُر فضا رقبہ مقامی لوگوں سے خرید کر کے دلوایا گیا تھا۔ ایک حصہ

[1] ملک پورہ محلہ ایبٹ آباد کا نام بھی ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔

میں تو شاہزادہ مرحوم نے ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کرائی۔ (یہ کوٹھی اور باغ اب میاں مشرف شاہ کی ملکیت ہے۔) اور کوٹھی کے متصل ہی ایک مسجد بھی بنوائی۔ اس کی تاریخ بنا مطابق اس رباعی کے جو آپ کے مقبرہ پر کندہ ہے ۱۸۹۵ء ہے وہ رباعی یہ ہے:۔ ؎

چو شد تعمیر بہر دیندارے	کنم زرو ے بسر سجدہ گزارے
بہ ابجد گفت ہاتف سال ہجرت	زاد شد مسجد سید بخارے

۱۳۱۳ھ ۔ مطابق ۱۸۹۵ء

یہ مسجد آج تک موجود ہے اور مسجد شاہزادہ بخارا کے نام سے مشہور ہے اس مسجد کی ۱۹۷۶ء میں توسیع و ترمیم ہوئی ہے اور ایبٹ آباد کی بارونق مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد اغلباً حضرت مولانا الحاج محمد عبدالرحمٰن گنجوی ؒ نے جو اس وقت جامع مسجد ایبٹ آباد (بنا کردہ انجمن اسلامیہ) کے خطیب تھے۔ رکھا۔ آپ بلند پایہ عالمِ دین، مفسر اور محدث تھے۔ انہوں نے ہی پہلی نماز جمعہ کی شہزادہ مرحوم کی استدعا پر اقتداء فرمائی۔ اور بعد ازاں پہلی نماز عید کی اقتداء بھی کی اور اس مسجد میں جمعہ و عیدین کے اجراء کا فتویٰ بھی صادر فرمایا۔

دوسرے حصہ مسجد سے متصل میں حرم سرا بنائی گئی۔ اور کوٹھی اور حرم سرا کے آس پاس وسیع قطعات بالکل کھلے اور خالی چھوڑ دئے گئے اور حکومت کی طرف سے احکام نافذ ہو گئے۔ کہ شہزادہ صاحب کی کوٹھی اور حرم سرا (جس جگہ اب سعادت محل۔ مکانات نواب زادہ سعادت اللہ خان طورو اور ملک شاہ زمان خان کوٹھی ہیں) کے قرب و جوار میں کسی کو زمین خریدنے یا مکان بنانے کی اجازت نہ ہو گی۔ اس پابندی کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ صاحب کے موروثی امتیاز اور وقار میں کمی نہ آنے پائے۔ چنانچہ شہزادہ صاحب کے حینِ حیات میں یہ پابندی قائم رہی۔ کوٹھی کے متصل جو جائے سفید تھی وہاں شہزادہ صاحب نے ایک عالی شان باغ لگوایا جس میں ہر قسم کے پھل دار درخت لگائے گئے۔ یہ کوٹھی اور باغ اب یہ سب تعمیرات انقلابات زمانہ کی زد میں آ گئے ہیں۔ کوٹھی، حرم سرائے۔ باغات اور ملحقات سب بک چکے ہیں۔ موجودہ کوٹھی موسوم بہ شہزادہ بخارا، سکندر شاہ پسر ش کی بنائی ہوئی ہے۔ اور جسٹس سجاد احمد خان صاحب کی ملکیت ہے۔

شہزادہ بخارا مرحوم کو سلطنت انگریزی سے بارہ سو روپیہ اور امیر افغانستان سے ساڑھے سات سو روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ وہ بڑے آرام و عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہزادہ مرحوم کا شغل عموماً مطالعہ کتب، سیر و شکار اور گھوڑ سواری، اعلیٰ نسل کے گھوڑے ان کے اصطبلوں کی

زینت تھے اور گاہے گاہے فوجی افسران کے ہمراہ پولو بھی کھیلا کرتے تھے۔ پولو یا چوگان وسط ایشیا کے مسلمان سلاطین کی تفریح تھی۔ شاہزادہ صاحب مرحوم نے ایک کوٹھی بمقام ٹھنگلی بھی بنوائی تھی جہاں وہ موسم گرما میں رہائش رکھتے تھے۔ ٹھنگلی، ایبٹ آباد تھیا گلی روڈ پر۔ بجگوتر سے دو میل آگے ایک چھوٹا سا مقام ہے جو دو پہاڑیوں کے درمیان ایک تنگ وادی میں واقع ہے۔ شہزادہ صاحب مرحوم کو مطالعہ دین کا بے حد شوق تھا اور ان کے کتب خانہ میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں کئی سو کی تعداد میں موجود تھیں۔ تفسیر قرآن، حدیث۔ فقہ۔ فارسی۔ عربی۔ ترکی۔ علم و ادب۔ نثر و نظم کے بیش بہا نسخے ان کے کتب خانہ کو آراستہ کئے ہوئے تھے۔ چند کتابیں مصوری کی بھی تھیں۔ جن میں بخارا کے پرانے اور نئے شاہی خاندانوں کے بادشاہوں اور شاہی حرم کی بیگمات و خواتین کی تصاویر تھیں۔ جو بخارا کے ماہر مصورین اور نقاشوں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ تمام کتب خانہ شاہزادہ مرحوم کی وفات کے بعد انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد نے سنبھال لیا۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ بعد میں خورد برد ہو گیا چنانچہ آج اس کتب خانہ کی کوئی ایک کتاب بھی موجود نہیں۔

شاہزادہ سید عبدالملک کی وفات ۱۹۰۸ء میں بعمر ۷۵، ۸۰ سال ہوئی۔ (مولوی فیض رسول کے بیان کے مطابق ۱۹۰۹ء) کہا جاتا ہے کہ تدفین سے پہلے ان کی نعش کوٹھی کے صحن میں رکھی گئی اور دو دن تک ہزاروں لوگوں نے ان کا آخری دیدار کیا۔ انہیں اپنی مسجد کے احاطہ میں ان کی وصیت کے مطابق دفن کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ حضرت مولانا الحاج محمد عبدالرحمٰن صاحب نے پڑھائی۔ ایک بہت بڑے ہجوم نے جنازہ میں شمولیت کی۔ مسجد شاہزادہ مرحوم کے پہلو میں جو چھوٹا سا قبرستان ہجیرہ کے اندر واقع ہے اس میں شاہزادہ مرحوم خود ان کا بیٹا شاہزادہ تیمور شاہ اور دو بیویاں مدفون ہیں۔ ہر جمعرات کی شام کو معتقد لوگ وہاں چراغ جلا کر قبرستان کو روشن کرتے ہیں۔

ان کا ایک بیٹا ہزارہ کی بیوی کے بطن سے بنام سکندر شاہ ۳ رجون ۱۹۶۹ء کو فوت ہوا اور اسی احاطہ میں مدفون ہوا۔

امام مسجد شاہزادہ بخارا۔ مولوی فیض رسول صاحب اس مسجد کے امام از ۱۹۰۲ء تا ۱۹۶۸ء رہے۔ آخر میں ضعفِ نظر اور کمزوریٔ صحت کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے۔ مولوی صاحب صابر اور متقی شخص ہیں۔ دورانِ امامت نماز کے اوقات کی پوری پابندی کرتے تھے۔ خطبہ و تقریر مختصر اور جامع ہوا کرتی تھی۔ میرے سوال پر انہوں نے ضلع ایبٹ آباد کے علماء کے متعلق بیان کیا کہ دھمتوڑ کی مسجد کے امام قاضی عبدالرحمٰن صاحب تھے ان کے پاس دور دور سے طالب علم آیا کرتے تھے۔

کاکول میں دو مساجد ہیں۔ ایک کے امام مولوی قائم دین صاحب تھے۔ اور دوسری مسجد میں دو بھائی مولوی شرف دین اور فضل دین تھے ان ہر دو مساجد میں درس و تدریس بھی ہوتی تھی۔ مولوی فیض رسول صاحب خود ٹن علاقہ بوئی کے رہنے والے ہیں اسی علاقہ میں مختلف علماء سے درس لیتے رہے۔ اور ۱۹۰۳ء میں مسجد شاہزادہ بخارا کے امام مقرر ہوئے۔

۲۔ خاندان روچارام۔ اس خاندان کے عروج کا زمانہ ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ روچارام، ڈیرہ خالصہ نزد مانکیالہ ضلع راولپنڈی سے یہاں آیا۔ وہ کھیوڑہ کے کوئلے کا ریلوے ٹھیکیدار تھا اور ساتھ ہی گورنمنٹ کے دیگر کاموں کا بھی ٹھیکیدار تھا۔ روچارام کے دو لڑکے پرمانند اور پربھودیال برسر تھے۔ یہ خاندان بڑے شریف لوگوں پر مشتمل تھا جس نے علمی میدان میں خوب کام کئے۔ روچارام نے اپنے لڑکے لکھمی چند کی وفات پر لکھمی چند خالصہ ہائی سکول ہری پور ۱۹۱۵ء میں بنایا تحصیل ہری پور میں یہ پہلا ہائی سکول تھا۔ میں نے اس سکول سے میٹرک کا امتحان ۱۹۱۸ء میں پاس کیا۔ اس سکول کا سٹاف بہترین قابلیت کا تھا وہ اپنا فرض منصبی مشنریوں کی طرح صدق دل سے ادا کرتے تھے۔ تقریباً ہر استاد ایم اے تھا اور اپنے مضمون میں ماہر۔

یہ خاندان بعد میں لکڑی کے کاروبار میں بھی بہت مشہور رہا۔ ان کی رہائش موجودہ وڈلاک ہوٹل (جو اب ویران ہے) کے سب محلہ علاقہ میں تھی اسی کے ایک حصہ میں موجودہ گرل سکول ہے جو روچارام نے اپنے خرچ سے بنوایا۔ یہیں ان کی رہائش اور دفاتر تھے۔ وہ شراب اور افیم کے ٹھیکیدار بھی تھے۔ یہ خاندان بڑی جائداد کا مالک تھا۔ ایبٹ آباد اور نتھیا گلی میں کافی بنگلے اور کوٹھیاں تھیں۔ ڈونگا گلی میں موجود چوہدری ہوٹل ان ہی کا تھا موجودہ تاج محل سینما کے علاقہ میں روچارامیوں کی سرائے تھی۔ روچارام خود ان پڑھ ہندو تھا لیکن طور طریقہ تعلیم یافتہ اشخاص کے ساتھ تھا۔ مذہباً سکھ طور طریقہ رکھتا تھا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ لکھمی سنگھ۔ لکھمی چند۔ پرمانند اور پربھودیال اور چھپال سنگھ سب بال رکھتے تھے صرف چھپال سنگھ "مونا" تھا۔ شیخ محمد اقبال سردار لکھمی سنگھ کا بیٹا ہے۔ اور پاکستان بننے کے بعد اس خاندان سے یہی ایک فرد یہاں رہ گیا ہے۔

۳۔ سیٹھ چوہڑیال۔ یہ ایبٹ آباد کا پہلا بینکر تھا۔ موجودہ جونیر ہرن ہال کے سامنے اس کی رہائش تھی اور دفتر تھا۔ اس نے غالباً ۱۸۷۵ء-۷۶ء میں البرٹ وکٹر اینگلو سنسکرت سکول بنایا جہاں پاکستان بننے کے بعد چند سال تک گورنمنٹ کالج رہا نیا کالج بن جانے کے بعد اس کو مڈل سکول بنا دیا گیا۔ سیٹھ چوہڑ مال بڑا نیک نام انسان تھا اس کا بیٹا بے دیوا بیرسٹر تھا۔

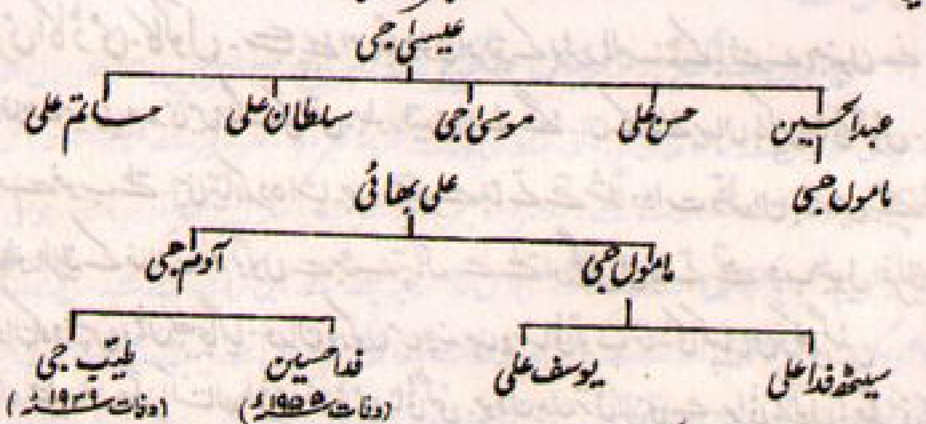
ایبٹ آباد کا بوہرہ سیٹھ خاندان

یہ دو خاندان ہیں اور یک جدی۔ یہ دونوں خاندان ایک ساتھ ریاست کچھ علاقہ کاٹھیاواڑ سے ۱۲۷۵ھ ۱۸۹۶ء

میں یہاں آئے۔ یہ خاموش طبیعت کے کاروباری افراد ہیں اور اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ ابتداً انجمن اسلامیہ میونسپل کمیٹی میں قابل قدر حصہ لیتے رہے۔ ایک خاندان کے اجداد میں سے ماموں جی علی بھائی انجمن اسلامیہ کے خزانچی ابتداء سے ۱۹۳۵ء تک رہے۔ اسی خاندان کے ایک ممبر آدم جی میونسپل کمیٹی کے ممبر اور نائب صدر رہے۔ دوسرے خاندان سے موسیٰ جی کمیٹی کے ممبر رہے۔ سیٹھ فدا علی مرحوم (متوفی ۵ جنوری ۱۹۶۹ء) بھی کمیٹی کے ممبر رہے۔ بہت اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک تھے۔ نیک کاموں میں ہر وقت امداد کے لئے تیار رہتے تھے

اس خاندان کے ابتدائی حالات۔ برماشیل کے ماہوار رسالہ میں تحریر ہے کہ سیٹھ علی بھائی ولد سیٹھ ماموں جی ۱۸۶۰ء میں ریاست کچھ سے لاہور آئے اور پھر راولپنڈی میں مقیم ہو گئے۔ اور کاروبار شروع کیا۔ ان کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ ان کے دو بیٹوں سیٹھ ماموں جی عمر ۱۶ سال اور سیٹھ آدم جی عمر ۱۰ سال نے کاروبار خانگی کو سنبھالا یہ دونوں راولپنڈی سے نقل مکانی کر کے ایبٹ آباد آ گئے۔ اور جنرل مرچنٹ کی دوکان بہ نام ماموں جی علی بھائی کھولی۔ ۱۹۲۰ء سے پٹرول کا کاروبار بھی ان کے حوالہ کر دیا گیا۔

شجرہ نسب



رائے بہادر الیشر داس۔ ساکن نواں شہر

یہ بیسویں صدی کے اول نصف میں ایبٹ آباد کی بہت مشہور شخصیت تھی اس میں تعصب نہ تھا۔ ہندو مسلمان ہم وطن کا ممد و معاون تھا پاکستان بن جانے کے بعد بھی اس نے اپنا تعلق پاکستان کے ساتھ جوڑے رکھا۔ اغلباً ۱۹۵۰ء میں پاکستان کی بہترین شوگر مل مردان میں بنائی جب تک زندہ رہا خود آتا رہا اور بڑے اخلاص سے اس کو چلاتا رہا۔ ان دنوں میں اگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا مسئلہ صلح صفائی سے حل ہو جاتا تو وہ پاکستان کا شہری بن جاتا۔ یہ تعمیری لکڑی کا بہت بڑا ٹھیکیدار اور آنریری مجسٹریٹ درجہ اول رہا۔ طور طریقہ شریفانہ اور امیرانہ تھے۔ موضع نواں شہر کے اندر اس کے وسیع مکانات تھے اور باہر ایک عظیم الشان بنگلہ وسیع احاطہ کے اندر تھا۔ یہ آج کل نواب زادگان ہوتی مردان کی ملکیت ہے اور انہوں نے

اس کو از سرِ نو تعمیر کیا ہے۔

مسلم لیگ اور ایبٹ آباد

صوبہ سرحد میں عوامی طور پر مسلم لیگ کی ابتدا (۱۹۳۷ء) کرنے کا شرف بھی اہالیان ایبٹ آباد کو حاصل ہے۔ اگرچہ چند افسران پشاور نے ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ بنائی مگر کاغذی۔ اس وقت ایبٹ آباد مسلم لیگ کے سرگرم کارکن میاں نورالدین صاحب مرحوم، قاضی اسد الحق ایڈووکیٹ، چشتی عبدالعزیز صاحب، مسٹر عبدالرشید کیانی، خان فتح محمد خان آف مروان، خان بہادر سعد اللہ خان مرحوم تھے۔ جسٹس سجاد احمد خان صاحب کو پہلا صدر چنا گیا تھا۔ ان حضرات کی کوشش اور اہتمام سے ۱۹۳۷ء میں ایبٹ آباد میں ایک شاندار مسلم لیگ کانفرنس ہوئی جس میں مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا عبدالحامد بدایونی، جمال میاں فرنگی محل والے اور چودھری خلیق الزمان نے شرکت کی تھی۔ اس کا ذکر چودھری خلیق الزمان نے اپنی کتاب "پاکستان کا راستہ" (PATHWAY TO PAKISTAN) میں کیا ہے۔

ایبٹ آباد کے چند ادارے

۱۔ **ملٹری اکاڈمی۔ کاکول۔** سب سے پہلے اس جگہ جنوبی افریقہ کے بوئر (ہالینڈ کے باشندے) جنہوں نے انگریزوں کے خلاف بیسویں صدی میں جنگ کی تھی۔ بطور قیدی لائے گئے۔ ان کے لئے یہاں بارکیں بنائی گئیں۔ یہ لوگ یہاں عوام سے خوب ملتے۔ اپنی تیار کردہ اشیا، جو وہ پتھر سے بناتے تھے مثلاً دوات و قلمدان بازار میں بیچتے تھے انگریزوں کے طور طریقہ کے خلاف عام لوگوں سے بڑے تپاک سے ملتے اور گھل مل جاتے تھے جب جنوبی افریقہ سے صلح ہوگئی تو ان کو واپس وہاں بھیج گیا۔ اور ان بارکوں میں چند ہندوستانی توپ خانہ کی کمپنیاں رکھی گئیں۔

پاکستان بننے پر اس جگہ پاکستان ملٹری اکاڈمی بنائی گئی۔ جو دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ پرانی بارکوں کی جگہ نئی پختہ دو تین چھت کی وسیع عمارتیں بن رہی ہیں۔ بوئر قیدیوں کی آمد پر جب پہلے پہل بارکیں بنائی گئیں تو شاید یہ نئی طرز تعمیر تھی کہ ہزارہ میں اس کے متعلق ایک عوامی گیت آج تک مجھے یاد ہے ؎

کاکولاں بنگلہ نیا پیا — چل ویکھن چلئے کیا جیہا

۲۔ **انجمن اسلامیہ ایبٹ آباد۔** اس کا مفصل ذکر گزشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔

۳۔ **زیارت پنج پیر۔** یہ زیارت پولیس لائن اور احاطہ عدالت ہائے کے درمیان ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہاں کون سے پانچ پیر مدفون ہیں۔ انیسویں صدی سے مشہور چلی آرہی ہے۔ لوگ محض قبر پرستی کی وجہ سے آتے جاتے۔ نزدیک یا دور سے ہی دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لیتے ہیں۔ مقدمات کے فریقین سب دعا کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ ہر جمعرات کو زیارت پر چراغاں ہوتا ہے۔ چند سال پہلے اس زیارت میں نشہ باز زیادہ جمع ہوتے تھے اور پولیس لائن افسر اس زیارت اور ان لوگوں پر نگاہ رکھتا تھا۔ اب ایک سائیں کے زیر اہتمام ہے۔

ہزارہ میں زمانہ قدیم میں ذرائع آمد و رفت

۱۸۹۱ء سے پہلے آمد و رفت حسن ابدال، ایبٹ آباد شاہراہ کے ذریعہ تھی۔ لوگ پیدل، گھوڑوں یا تانگے کے ذریعے سے راستہ طے کرتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں ٹیکسلا سے حویلیاں تک ریل بنی۔ اور ذرائع نقل و حرکت میں آسانی پیدا ہوگئی ابتدا زمانہ انگریزی سے حسن ابدال سے ایبٹ آباد تک ایک ڈاک تانگہ سروس تھی جس میں ڈاک بھیجی جاتی تھی۔ آغاز میں یہ ڈاک ایوب خان درانی کی اولاد کے پاس تھی جب وہ کابل سے بھاگ کر سلطنت انگریزی کی حدود میں آگئے تھے۔ ان کے بعد ایک پارسی کمپنی دھن جی بھائی۔ یہ تانگے چلایا کرتی تھی۔ اس میں زیادہ تر انگریز ہی سفر کیا کرتے تھے حسن ابدال سے ایبٹ آباد تک۔ اگر راستہ میں گھوڑے ٹھیک طور پر بدلے جاتے تو سولہ گھنٹے میں ایبٹ آباد پہنچ جاتے تھے۔ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ سب سے تیز ذریعہ سفر تھا۔ راستہ میں اس تانگہ سروس کے آٹھ دس میل پر سٹیشن ہوتے تھے جن پر تازہ دم گھوڑے تیار رکھے جاتے تھے۔ حسن ابدال سے تا بہ ایبٹ آباد حسب ذیل سٹیشن تھے۔

۱۔ حسن ابدال سے گھیرڑہ (نزد پنیاں) ۲۔ گھیرڑہ سے ہری پور ۳۔ ہری پور سے کھولیاں کلاں نواں۔ ۴۔ کھولیاں کلاں نواں سے سلطان پور۔ ۵۔ سلطان پور سے کھوتہ قبر ۶۔ کھوتہ قبر سے ایبٹ آباد۔ اس ڈاک کے تانگے کے آگے دو گھوڑے جُتے ہوتے تھے۔ دوسرا سائیس تانگہ کے پیچھے پائیدان پر کھڑا رہتا تھا۔ جو ان کو واپس اپنے اسٹیشن پر لے جایا کرتا تھا۔ دوسرے تانگے بھی اس راستہ پر چلتے تھے۔ جن کو یکے کہتے تھے۔ ان کے آگے ایک گھوڑا اور وہ بھی کمزور سا ہوتا تھا۔ اور آنے جانے میں بہت وقت لگتا تھا۔ حویلیاں سے ایبٹ آباد تک سخت چڑھائی ہے لہٰذا مرد سواریاں یکے سے اتر جاتی تھیں۔ اور باقی سفر وہ پیدل ہی پورا کرتے تھے۔ بارش کی وجہ سے اگر ہرو اور دوسرے نالے طغیانی پر ہوتے تو دو دن تک ایبٹ آباد پہنچنے میں لگ جاتے تھے۔ تجارت کا مال ان ایام میں بیل گاڑیوں کے ذریعہ بھیجا جاتا تھا۔ اور دس دس یا بیس بیس گاڑیاں یک جا چلتی تھیں۔ جو حسن ابدال سے کشمیر تک جایا کرتی تھیں۔ آنے جانے کا یہ سفر ڈیڑھ دو ماہ میں پورا ہوتا تھا۔

ہری پور شہر

اس کے ادارے اور مشہور اشخاص

سردار ہری سنگھ نے ۱۸۸۰ء بکرمی مطابق ۱۸۲۳ء میں یہ شہر قلعہ ہرکشن گڑھ کی فوج اور دیگر اہل کاران

حکومت کی سہولت اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے کے لئے بنایا۔ موجودہ زمانہ کی طرح یہ شہر بہترین نقشہ پر بنایا گیا۔ یہ شہر قلعہ بند تھا۔ غالباً اس کے چھ دروازے تھے۔ ان میں سے ایک شیرانوالہ دروازہ اب بھی ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ شمالاً جنوباً وسط میں چوڑی سڑک بنائی گئی۔ جو تقریباً تین فرلانگ لمبی ہے اور یہ ہی بڑے بازار کی سڑک ہے جس پر بڑے بڑے ساہوکاروں کے دفاتر اور کاروباری دکانیں تھیں دوسری سڑکیں شرقاً غرباً مساوی فاصلہ پر بنائی گئیں جو بڑی سڑک سے آرپار جاتی ہیں۔ ان کی لمبائی ایک ایک فرلانگ ہوگی۔ ان کے ہر دو جانب مختلف پیشہ وروں مثلاً لوہار، ترکھان، تیلی وغیرہ کی دکانیں تھیں مشرقی حصہ میں بر لب سڑک نزد شیرانوالہ دروازہ۔ بازار لوہاراں اور دوسری سڑک بطرف جامع مسجد موچی بازار کے نام سے مشہور تھا۔ ان سڑکوں کے درمیان مستطیل ٹکڑوں میں شہری آبادی تھی۔ شمال مشرقی کونہ میں ہندو آبادی اور باقی تین ٹکڑوں میں مسلمان آبادی تھی۔

ہری سنگھ کے عہد میں یہ شہر اپنے عروج کو پہنچا۔ اس کو پہلا حادثہ اس وقت پیش آیا۔ جب قلعہ و شہر کو ملکی لوگوں نے بہ عہد مولراج حاکم ہزارہ ۱۸۴۵ء میں جلا دیا۔ لیکن جلد ہی از سر نو آباد ہوگیا۔ ایک سو سال بعد ۱۹۴۷ء کی تقسیم برصغیر ہند و پاک کے ہنگامہ شورش و فساد کے دوران اس کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ پر رونق بازار جن میں عالی شان دکانیں اور چوبارے تھے جل کر زمین بوس ہو گئے۔ شہری آبادی کے خوب صورت مکانات اور حویلیاں خاکستر ہوگئیں۔ یہ برباد شدہ آبادی بیس سال تک اپنے حال تباہ پہ نوحہ کناں رہی۔ بازار میں تو چھپر و کھوکھے لگا کر معمولی کاروبار ہوتا رہا۔ لیکن سکنی آبادی کا علاقہ لوگوں کا بیت الخلاء بن گیا۔

تقریباً بیس سال تک یہ قدیم پر رونق شہر اپنی بربادی پر زبان حال سے نوحہ کناں رہا۔ آخر کار اس شہر کی تعمیر نو جناب امین خان (ریٹائرڈ) چیئرمین ٹاؤن کمیٹی ہری پور کے ہاتھوں ہوئی۔ ترہیب و ترغیب سے شہر کو پھر سے بارونق اور پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت بنا دیا گیا۔ اس کی وسعت بھی زیادہ ہوگئی خاص کر سبزی منڈی سے متصل خوبصورت عمارتیں اور دکانیں اور ترچیلہ اڈہ کی آبادی کے مکانات و ہوٹل بننے سے اس شہر کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

شہر ہری پور کے قابلِ ذکر ادارے، خاندان اور افراد

۱۔ انجمن اسلامیہ رحمانیہ ہری پور۔ اس کی بنیاد حضرت خواجہ عبدالرحمٰن صاحبؒ چھوہروی نے ۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء) میں اپنے بابرکت ہاتھوں سے رکھی۔ اس کے مصارف تعمیر و دیگر اخراجات ان کے مریدان بنگال و برما نے برداشت کئے۔ حضرت چھوہرویؒ اپنی زندگی میں طلباء کو کھانا اپنے گھر چھوہر شریف (ایک میل دور) سے بھجوایا کرتے تھے۔ اس دارالعلوم میں درس نظامی کا مکمل انتظام ہے۔ اور دورۂ حدیث بھی ہوتا ہے۔ مزید حالات حضرت چھوہروی کے حالات میں درج کئے جا چکے ہیں۔

انجمن اسلامیہ ہری پور۔ یہ انجمن چند مخلص و محب اسلام افراد کی کوشش سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی۔ اس کے قیام کا محرک ایک لاوارث لاش کی تدفین میں بے حرمتی کے واقعہ سے ہوا۔ جو میونسپل کمیٹی کے خاکروبوں نے شہر کے گندے نالے کے پانی سے نہلا کر کپڑوں میں لپیٹ کر ایک گڑھے میں دفن کر دی تھی۔

اغراض و مقاصد:۔ ۱۔ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، تعلیمی اور اقتصادی حالت کو درست کرنا۔ ۲۔ درس قرآن، حدیث و فقہ کا انتظام۔ ۳۔ پابندی شریعت کی ترغیب۔ ۴۔ مسلمانوں کو دعوت اتحاد و تنظیم۔ ۵۔ اوقاف اسلامیہ کی نگرانی۔ ۶۔ لاوارث مُردوں کی تجہیز و تکفین۔

بانی ممبران:۔ ۱۔ صدر بابو نبی بخش فرزند مولوی امام الدین صاحب پٹواری جو بابو احمد بخش صاحب مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ بابو نبی بخش ۱۹۴۲ء میں فوت ہوئے۔ یہ چار بھائی تھے۔ بابو احمد بخش ڈپٹی کمشنر کے ہیڈ کلرک (؟) تھے۔ بابو عزیز الرحمٰن تحصیلدار تھے۔ بڑے ہی قابل اور محکمہ مال کے بہترین دماغ تھے۔ فخر ہزارہ تھے اور اہل ہزارہ کی امداد فرض منصبی سمجھ کر کرتے تھے۔ چوتھے بھائی بابو عبدالرحمٰن ریٹائرڈ پٹواری تھے۔

بابو امام الدین پٹواری اور ان کے چچا حاجی پیر بخش صاحب قانون گو نے ۱۸۷۲ء کے بندوبست ہزارہ میں کام کیا تھا۔ وہ عرصہ تک لاہور رہے اور انجمن حمایت اسلام کے امور میں دلچسپی لیتے رہے ۱۹۲۹ء میں ہری پور آئے۔ اور جنرل مرچنٹ کی دکان کھولی۔ اپنے لاہور کے تجربہ کی بنیاد پر انجمن اسلامیہ ہری پور کی تشکیل کی۔ ۲۔ سکریٹری۔ ماسٹر مظفر الدین۔ آپ درزی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی اور اسلامی کاموں کے مخلص کارکن ہیں۔ ان کے والد مرحوم سائیں یاسین ایک فقیر منش آدمی تھے۔ آپ اگرچہ ان پڑھ ہیں۔ مگر حسن قابلیت کی بناء پر سکرٹری چنے جاتے رہے ہیں۔ ۳۔ لالہ محمد اکبر خان قریشی۔ خاندان رسالداریان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ مستقل ممبر ہیں اور تین بار انجمن کے صدر منتخب ہو چکے ہیں۔ ۴۔ بابو عبدالعزیز آپ ماسٹر مظفر الدین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انٹرنس پاس ہیں۔ قومی، ملی و مذہبی تنظیم و خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ملازم سرکاری (آپ محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر رہے ہیں) ہوتے ہوئے بھی قومی کاموں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ انجمن اسلامیہ کے مستعد کارکن ہیں۔ ملازمت سے بوجوہ مستعفی ہو کر قومی کاموں میں یکسوئی سے کام کرنے لگے ہیں۔ ہری پور روزن و تارپین فیکٹری میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۴ء تک بطور ہیڈ کلرک کام کیا۔ اور جانفشانی کے ساتھ اپنے فرض کو نبھایا۔ ۵۔ حاجی لعل دین صاحب خلف مستری فضل دین ٹھیکیدار ٹانگہ ہائے۔ انجمن کے سرگرم کارکن تھے۔ خاکسار تحریک سے گہری دلچسپی

لیتے رہے۔ بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ ۶۔ خٹک خاندان سے سیٹھ عبدالرحمن والد سیٹھ عبدالحمید اور ملک عبدالرحمن نے اور لوہاروں کے خاندان سے مستری فقیر محمد صاحب اور تیلی خاندان سے منشی بہادر خان اور میر نے اس انجمن کی بڑھ چڑھ کر خدمت کی۔ حاجی اللہ دتہ صاحب صراف نے بحیثیت خزانچی اور بعد میں کچھ عرصہ بطور صدر انجمن خدمت سرانجام دی۔

انجمن کے کارنامے۔ ۱۔ تعمیر جامع مسجد چوک بازار۔ اس جگہ ایک پرانی چھوٹی سی مسجد تھی اور ۱۹۱۳ء-۱۹۱۲ء میں اس مسجد کا مہتمم اور امام ایک معمر شاہ صاحب ہوتے تھے۔ نام ان کا یاد نہ رہا۔ گزر اوقات کے لئے مسجد کے سامنے ان کی قہوہ کی دکان تھی۔ آپ پشاور کے رہنے والے تھے۔ ان کی امامت کا زمانہ اور خطبہ جمعہ پڑھنا اب تک آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ ان کا معاون علی محمد ساکن درویش تھا۔ وہ سیخ کباب کی دکان کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کی اولاد ہری پور شہر میں موجود ہے۔ شاہ صاحب کے فرزند کا نام آغا میر بادشاہ بتلایا جاتا ہے اور علی محمد صاحب کے فرزند ٹاؤن کونسلر ہیں۔

اس مسجد کی توسیع اور تعمیر نو محمد فریدوں خان خاندان رسالداریاں کے مشہور رہبر نے غیر مسلموں کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے ذاتی مکان کے لئے جمع کردہ ملبہ و سامان تعمیر سے راتوں رات ۱۹۱۵ء میں مکمل کر دی۔ ۱۹۳۴ء-۱۹۳۳ء میں انجمن اسلامیہ نے اس کو دو منزلہ وسیع عمارت کی شکل میں تعمیر کر دیا۔ اس کے خود کفیل ہونے کے لئے چند دکانیں بھی تعمیر کر دیں۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں محکمہ اوقاف نے اس کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ انجمن نے درس و تدریس کے لئے ایک جید عالم قاضی محمد صدر الدین کی خدمات حاصل کیں۔ ۲۔ وسیع اور شاندار عیدگاہ نزد ریلوے سٹیشن ہری پور بھی اسی انجمن کا کارنامہ ہے اس کے لئے زمین غلام خان ترین رئیس پائنگ نے صفت دی تھی۔ سنگِ بنیاد نواب صاحب خانی زمان خان والی امب نے ۵ اردسمبر ۱۹۳۲ء کو رکھا۔ اور تین ہزار روپیہ عطیہ بھی دیا۔ ۳۔ یتیم خانہ ہری پور کا قیام بھی اسی انجمن کا مرہونِ منت ہے اس میں دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ دستکاری مثلاً درزی، بڑھئی کا کام، چمڑے کے بکس و سوٹ کیس کی ساخت کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد عالی جناب نواب محمد فرید خان والئی امب نے ۱۴ مئی ۱۹۴۴ء میں رکھا۔ اور تعمیر کے لئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ بھی دیا۔ ۴۔ آبادکاری مہاجرین میں بھی اس انجمن کی بھرپور شمولیت و امداد شامل رہی۔ ۵۔ تجارت و اقتصادیات کے ضمن میں مسلم تجارتی کمپنی لمیٹڈ ہری پور ۵ فروری ۱۹۳۵ء میں بنائی گئی۔ ۶۔ مسلم گرلز سکول کا اجرا انجمن کے ممبران کی متفقہ کوشش زیر سرکردگی صوفی عبدالعزیز (حال جائنٹ سکرٹری) ۱۹۳۵ء میں کیا گیا۔ ۷۔ انجمن کے ایک معزز رکن علامہ ابوالخیر صاحب ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر نے اپنی ذمہ داری پر یکم جولائی ۱۹۶۶ء میں "ماڈرن پبلک

سکول" کا اجرا اپنے خرچ سے کیا جو انگریزی سکولوں سے بہتر تعلیم کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ ۸۔ منڈی مال مویشی کا اجراء۔ لالہ محمد اکبر خان قریشی نے عوام کی سہولت اور فائدہ کے لئے اپنی زمین مفت دے کر منڈی کا اجرا کیا۔ یہ سکیم اتنی کامیاب ہوئی کہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہزارہ نے یہ منڈی اپنی زیر تحویل لے لی۔ اور اسی کے نمونہ پر خان پور، حویلیاں اور مانسہرہ میں ایسی منڈیاں شروع کرا دیں جن سے اب (۱۹۶۹ء) سالانہ ٹھیکہ کی آمدنی تقریباً ۵۰ ہزار روپیہ ہوتی ہے۔

ہری پور کے مشہور خاندان و اکابر۔ ۱۔ قریشی خاندان۔ یہ خاندان رسالداریان کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے اجداد بدخشاں سے ستھانہ آئے۔ اور پھر وہاں سے آ کر ہری پور میں سکونت اختیار کر لی۔ اس خاندان کے نامور اور مجاہد ممبر لالہ محمد اکبر خان قریشی ہیں۔ آپ اسلامیہ کالج پشاور کے بی اے ہیں۔ زندگی مجاہدانہ و سرفروشانہ گزاری۔ تحریک ہجرت میں آپ اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ یہ تحریک ترکوں کے ساتھ ظالمانہ صلح مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۲۰ء جس کے کرتا دھرتا مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان تھے کی رو سے ترکی کے حصے بخرے کرنے پر مسلمانانِ عالم کی برانگیختگی کا مظہر تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر لالہ محمد اکبر خان پانچ ہمراہیوں سمیت اسلامیہ کالج پشاور سے پیدل افغانستان روانہ ہوئے اور حاجی صاحب ترنگ زئی (مقیم علاقہ غیر، مہمند) کے ہاں پہنچے۔ حاجی صاحب ۱۹۱۶ء میں (دورانِ جنگ ۱۹۱۸ء-۱۹۱۴ء) اعلانِ جہاد کر کے ہجرت کر گئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات مجاہد سرحد قاضی عبدالولی صاحب ساکن پشاور سے ہوئی۔ جو ۱۹۱۹ء-۱۹۱۸ء کی سیاسی تحریک کے دوران گرفتاری سے بچ کر افغانستان چلے گئے تھے۔ قاضی صاحب موصوف حکومت افغانستان کی حکومت کی مجلس مشاورت کے رکن رہے۔ آپ انگریزی، فارسی، پشتو، اردو اور ترکی میں مادری زبان کی طرح گفتگو کر سکتے تھے۔ لالہ محمد اکبر خان یاغستان سے افغانستان اور پھر روس چلے گئے۔ کم و بیش دس سال وہاں گزارنے کے بعد جب واپس آئے تو حکومت انگریزی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ اور تقریباً آٹھ دس سال جیل میں گزارے۔ آج کل زمینداری خاص کر باغبانی کا شغل کرتے ہیں۔ ان کی نرسری موسومہ "ہزارہ نرسری" مغربی پاکستان بھر میں بڑی نرسری ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد اصغر خان صاحب پیکر حلم۔ دیانت۔ مسلم باعمل انسان ہیں سرکاری ملازمت محکمہ امداد باہمی میں بعہدہ اسسٹنٹ رجسٹراری سے پنشن لی۔ آج کل مردان میں مقیم ہیں۔

اس خاندان کا ایک خوبصورت۔ سرو قد۔ بلند و بالا اور خوش باش ممبر سرفراز خان مرحوم تھا۔ ۱۹۱۳ء-۱۹۱۲ء میں اس کی جوانی عروج پر تھی۔ فٹ بال کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کے کھیل کو شائقین فٹ بال خاص کر دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ اس کی ٹھوکر سے فٹ بال [illegible]

خوب انسان تھے۔ ملاد فضل الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ ہری پور بھی اسی خاندان کے تجربہ کار ایڈووکیٹ ہیں۔

ہندو اکابر۔ ہری پور میں ہندوؤں کے چار بڑے خاندان تھے۔ ۱۔ بھگت ۲۔ ساہنی ۳۔ گلہاٹی اور ۴۔ مہتہ خاندان ——— ۱۔ بھگت خاندان کوٹ نجیب اللہ سے ۱۹۶۰ء میں آیا۔ یہ چار بھائی تھے۔ امیر چند جیون داس، موہر چند اور روپ چند۔ انہوں نے عزت کے درجہ سے ترقی کی۔ اور نام پیدا کیا۔ پشاور اور کشمیر تک نقل و حمل کا کاروبار کرتے تھے آخر کار کوٹھی دار ہوئے ۱۹۴۰ء میں ہری پور سے کشمیر و ہندوستان تک کاروبار پران کا قبضہ تھا۔ ۲۔ ساہنی خاندان۔ اس خاندان کے اکابر اُتم چند۔ کرم چند۔ اور پرما نند تھے۔ یہ عام تجارت و ساہوکارہ خاص کر رنگ کا کام کرتے تھے۔ اتم چند نمک والا کافی عرصہ تک میونسپل کمیٹی کا ممبر رہا۔ دوسری جنگ عظیم (۱۹۴۵-۱۹۳۹ء) میں سستے داموں غلہ عوام میں تقسیم کیا۔ ۳۔ گلہاٹی۔ اس خاندان کا معتبر رکن پر بھدیال تھا۔ یہ زیادہ تر ساہوکارہ کا کام کرتا تھا ممبر کمیٹی بھی رہا۔ ۴۔ مہتہ خاندان کا سربراہ مہتہ ہمیراج تھا۔ تمام عمر کمیٹی کا ممبر رہا۔ جو ایک متعصب ہندو تھا۔ اس خاندان کے اکثر لوگ بڑے زمیندار تھے یا ملازمت پیشہ۔

نوٹ۔ اس باب کی تکمیل میں پوسٹ ماسٹر عبدالعزیز صاحب کی امداد کا ممنون ہوں۔

نوٹ۔ ہری پور کے اکابر میں مندرجہ ذیل اصحاب کا ذکر بھی ضروری ہے۔

حاجی عبدالرحمٰن صاحب۔ حاجی عبدالکریم صاحب و سیٹھ جمال دین صاحب ہر سہ اصحاب صاحبِ عزت و اثر تھے۔ حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے دو صاحبزادے عزیز الرحمٰن سپرنٹنڈنٹ محکمہ بجلی اور حبیب الرحمٰن ہیں۔

انجمن اسلامیہ تحصیل مانسہرہ

یہ انجمن خانان گیدڑ پور نے ۱۹۰۷ء میں بفہ میں بنائی۔ اس انجمن ہی نے اسلامیہ سکول بفہ ۱۹۰۸-۹ء میں بنایا۔ بچوں کو شوق و ترغیب دلانے کے لئے خان علی گوہر خان صاحب ساکن تانا ر امتحان کے بعد ان کو انعام و اکرام دیا کرتا تھا۔ افسوس کہ اس سے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مانسہرہ کے مشہور اشخاص کا ذکر ان کی قوم کے باب میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔

عمر نامۂ مؤلف

یعنی

آپ بیتی

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

محمد ہادی رحمۃ اللہ علیہ

اس باب میں میں نے اپنی زندگی کے حالات آغاز سے تا ایں دم تحریر کئے ہیں۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ مدنظر داستاں سرائی ہرگز نہیں اور نہ خود ستائی مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ عبرت اور بصیرت کا جو درس انسانوں کی مجموعی تاریخ سے ملتا ہے وہ چھوٹے پیمانے پر لیکن زیادہ واضح انداز میں فرد کی زندگی میں بھی موجود ہے۔ اپنے حالات آپ لکھنا بڑا مشکل اور نازک معاملہ ہے اگر انسان اپنی برائی کرے تو اپنا دل دُکھتا ہے اور تعریف کرے تو پڑھنے والوں کو برا لگتا ہے اس لئے میں نے یہ حالات کتاب کی تکمیل اور نظر ثانی کے بعد اور خوب سوچ بچار کے بعد لکھے ہیں۔ بارہا لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم اٹھا اٹھا کر رکھ دیا مبادا یہ محنت جو درحقیقت خدمت نوع کے ارادے سے ہوئی۔ خود نمائی اور خود ستائی پر محمول کی جائے کیونکہ شہرت طلبی انسان کی جبلی کمزوری ہے۔ ایک بہت بڑے انگریز شاعر نے کہا ہے کہ شہرت طلبی شریف دل سے بھی بڑی دیر کے بعد بلکہ تمام کمزوریوں کے نکل جانے کے بعد نکلتی ہے۔ تاہم لکھنے والوں نے اپنے اور دوسرے ابنائے نوع کے عمر نامے لکھے ہیں اور اہل الرائے کا اتفاق ہے کہ اس سے اجتماعی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر تاریخ ماضی نصیحت آموزی اور عبرت پذیری کا ایک مرقع بن سکتی ہے۔ تو بعتر تاریخ ہزاروں کی طرح یہ آپ بیتی بھی جو ہر چند کہ محدود زندگی کی تاریخ ہے موعظت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ پھر اس میں شنیدہ کے بجائے دیدہ کا عنصر بھی شامل ہے۔ جو واقعات اپنی زندگی میں پیش آئے وہ عین الیقین کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور قابلِ اعتبار ہیں۔

امید ہے قارئین کرام اگر میری آپ بیتی کو اس نظر سے مطالعہ فرمائیں گے تو یقیناً اسے مفید پائیں گے۔ ہر انسان اور اس کا ماحول دعوتِ عبرت ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے واقعات کو اپنے ماحول کے پس منظر کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

ڈاکٹر شیر بہادر خان خلف رسول خان

والد مرحوم رسول خان قوم ہنی کے خاندان منیر خانی کے فرد تھے۔ پنیاں میں سکونت رکھتے تھے قوم ہنی کی خانی منیر خانی خاندان میں تھی۔

والد مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات

آپ کے والد کا نام حسن علی خان پسر عیدو خان بن منیر خان تھا۔ قوم میں اپنے چچا مولوی کریم خان (جو پرانے زمانہ کے تعلیم یافتہ تھے اور طبابت کا پیشہ کرتے تھے) کے بعد یہ پہلے فرد تھے جنہوں نے عہد انگریزی کی مروجہ اردو تعلیم حاصل کی۔ آپ کی تاریخ پیدائش یکم نومبر ۱۸۶۹ء میں موضع پنیاں میں ہوئی۔ آپ درمیانہ قد اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ رنگ بہت سفید تھا بچپن میں چیچک کی وجہ سے چہرہ پر معمولی داغ بن گئے تھے۔ تعلیم۔ ورنیکلر مڈل سکول کا امتحان جنوری ۱۸۸۸ء (پنجاب یونیورسٹی) کوٹ نجیب اللہ کے سکول سے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ۱۵ مارچ ۱۸۸۸ء میں کوٹ نجیب اللہ سکول ہی میں سوم مدرس مقرر ہوئے ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء میں غازی سکول (علاقہ تارخیلی) برلب دریائے سندھ انچارج مدرس مقرر ہوئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۹ء کو راولپنڈی نارمل سکول برائے ٹریننگ داخل ہوئے اور ۳۱ جولائی ۱۹۱۰ء میں نارمل سکول کا امتحان پاس کیا۔ نارمل سکول کا ایک لطیفہ ان کی زبانی یاد ہے۔ فرماتے تھے کہ نارمل سکول میں کھانے میں صرف دال ہی ملا کرتی تھی۔ اور گوشت پکانا منع تھا۔ ہندو اساتذہ کی وجہ سے۔ انسپکٹر مدارس ایک دفعہ معائنہ پر آیا۔ طلبہ کا جلسہ ہوا مضامین وغیرہ پڑھے گئے۔ ایک لڑکے نے ایک نظم پڑھی جس کا ایک شعر تھا ؎

اے مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
نارمل کے قیدیوں کو گوشت کھانا منع ہے

چونکہ یہ شکایت کسی طریقہ سے گوش گزار انسپکٹر کرنی تھی لہذا یہ مصرعہ اس نظم میں رکھا گیا اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انسپکٹر نے گوشت پکانے کی اجازت دے دی۔

آپ نے دوبارہ ۱ اگست ۱۹۱۰ء پھر غازی سکول کا چارج لے لیا۔ اور تقریباً عمر کا بہترین حصہ اسی جگہ گزار دیا آخر ملازمت میں اپریل ۱۹۲۱ء میں ان کی تبدیلی کوٹ نجیب اللہ سکول کو ہو گئی۔ اور ۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء دنیا سے رحلت فرمائی۔ اور اپنے خالق کے جوار رحمت میں چلے گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

نارمل سکول کے شعر کا پس منظر یہ ہے کہ نارمل سکول کا ہیڈ ماسٹر ہندو۔ نام سورج نرائن مہر تھا۔ چونکہ تعلیم کے محکمہ میں ہندو پہلے داخل ہوئے اور قدرتی طور پر مدرسین کی تعداد ابتداء میں ہندوؤں ہی کی زیادہ ہو سکتی تھی جن کے ذوق کو گوشت سے نفرت تھی لیکن سوسائٹی نے گوشت کو غذا میں ہمیشہ شامل رکھا۔ کسی خاص مقام پر اگر اس پر پابندی لگا دی جائے تو اس کو رفع کرنے کے لئے محکوم طبقہ وہ رویہ اختیار کر سکتا ہے جو لطیفہ کا لطیفہ ہو اور مطالبہ کا مطالبہ۔ عمر ناموں میں زندگی کے لئے کام آنے والی باتیں اس طرح بھی منکشف ہو سکتی ہیں کہ بالاتر افسروں کو سکول کے طلبہ کی تکلیف اور مظلومی کا علم بھی ہو جائے۔ اور قریب تر افسروں یعنی استادوں کو یہ تبدیلی ناگوار بھی نہ ہو۔ اور نہ وہ اسے اپنے خلاف نقصان رساں شکایت خیال کرنے پائیں۔ چونکہ انسپکٹر ایک مسلمان افسر تھا لہذا یہ شعر اپنا کام کر گیا۔

والد مرحوم کی عادات و اطوار

آپ کی طبیعت بہت نفاست پسند تھی۔ لباس مہین کھدر (جس کو ہم اودھو تر کہتے ہیں) کا ہوتا تھا۔ سر پر پشاوری سفید لنگی کلاہ پر باندھتے تھے اور خاص اہتمام سے باندھتے تھے۔ شیشہ سامنے رکھ لیتے لنگی کا ایک سرا کسی کے ہاتھ میں پکڑا کر آہستہ آہستہ باندھتے جاتے۔ جب تک ان کی پسند پر ٹھیک نہ آتی کھولتے باندھتے رہتے۔ سُرمہ ہمیشہ لگاتے۔ دو جوڑے جوتی کے ہمیشہ ساتھ رکھتے۔ ایک نیا اور ایک پرانا۔ پرانا جوتا سفر کے لئے ہوتا تھا۔ تولیہ ہمیشہ زیر استعمال رہتا۔ کپڑے دھلانے کا خاص اہتمام کرتے۔ کپڑے اپنے سامنے دھلاتے۔ اس کے لئے صاف پانی کا انتظام کرتے۔ موسم گرما میں جب دریائے سندھ کا پانی گدلا ہو جاتا۔ تو پانی کے آٹھ دس گھڑے شام کو بھر کر رکھ لیتے۔ اور ہر گھڑے میں پھٹکڑی کی ایک پوٹلی لٹکا دیتے صبح تک پانی نتھر کر صاف ہو جاتا تو اس سے کپڑے دھلاتے۔ ماں باپ کے تابعدار اور حد درجہ خدمت گزار تھے۔ بھائیوں اور بہنوں کی محبت اور امداد کے جذبے سے سرشار تھے۔ دونوں بھائیوں سے بہت محبت تھی۔ پیار سے محمد جعفر خان کو جعفری خان اور شجاع الدولہ خان کو دولی خان کہا کرتے تھے۔ دونوں کو اپنے پاس غازی میں رکھ کر پرائمری (پانچویں جماعت) تک تعلیم دی۔ شجاع الدولہ خان نے پرائمری امتحان غازی سکول ۱۹۰۲ء میں پاس کیا۔ محمد جعفر خان کو تو مڈل سکول ہری پور میں داخل بھی کرایا۔ جہاں انہوں نے دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ بعد میں یہ دونوں یکے بعد دیگرے ملازمت کے لئے پہلے ملایا گئے بعد میں ۱۹۰۵ء میں شجاع الدولہ امریکہ چلا گیا۔ محمد جعفر خان بھی ۱۹۰۶ء میں وہاں ہی چلا گیا۔ والد مرحوم جب تک زندہ رہے ان سے باقاعدہ خط و کتابت کرتے رہے۔ اور وہ بھی جواب دیتے رہتے۔ دونوں بھائیوں کو والد مرحوم سے محبت تھی۔ اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ محمد جعفر خان نے

شادی نہ کی۔ شجاع الدولہ خانؒ نے وہاں ایک اٹالین لڑکی سے شادی کی۔ اس سے ان کا ایک لڑکا انور خان پیدا ہوا جو آج کل نیویارک میں بڑی کامیاب زندگی گزار رہا ہے امریکہ کی اول نمبر کی کمپنی کا مالک اور ڈائرکٹر ہے۔ والد مرحوم کی محبت کی چاشنی کا اثر تھا کہ میرے ان دونوں چچوں کی آپس میں بھی محبت رہی۔ انور خان اور میرے ساتھ بھی۔ محمد جعفر خان کو انور خان سے بے حد محبت تھی جعفر خان مرض دمہ کے مریض تھے۔ وقت نزع وطن کی محبت کے جذبہ کے تحت اپنے بھائی شجاع الدولہ سے کہا کہ "زندگی میں تم کو اکیلا چھوڑ نہ سکا اب تم خدا کے حوالے۔ میری لاش وطن ضرور پہنچا دینا۔" وفات کے بعد عموی شجاع الدولہ خان کا ٹیلیفون آیا کہ میت بھیجی جا رہی ہے۔ ہم سب میت کے لئے انتظار کرتے رہے۔ لیکن انور خان کی محبت نے اپنے مہرباں چچا کی لاش یہاں نہ بھیجنے دی۔ اور وہیں دفن کرا دیا۔ اور ان کی موت کے بعد اس نے اپنا نام بھی رابرٹ جعفری خان رکھ لیا۔ اور کمپنی کا نام بھی یہی رکھ دیا۔

میں جذبات محبت کی رو میں بہہ گیا — والد مرحوم نماز باجماعت کے پابند تھے۔ قرآن کی تفسیر کے مطالعہ کا خاص شغف تھا۔ اعلیٰ علمی مذاق رکھتے تھے۔ مشہور رسالے، اخبارات اور کتب منگاتے تھے اور مجھے مطالعہ کے لئے دیا کرتے تھے۔ الہلال کے شروع ہونے پر مجھے اس سے روشناس کرایا۔ میرا علمی ذوق انہی کی دین ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے دلدادہ تھے۔ انشا پردازی میں باکمال تھے میرے خطوط کی غلطیوں کی تصحیح کر کے خط واپس کرتے۔ مدرسین کے ہر اجتماع میں ان سے ہی تقریر کرائی جاتی تھی اور مقالہ بھی انہی سے پڑھایا جاتا تھا۔

والد مرحوم کی عادت تھی کہ ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو تحریر کرتے تھے۔ آمدنی اور خرچ کا حساب پائی پائی کا رکھتے تھے اور کفایت شعاری میں ضرب المثل تھے۔ ایک دفعہ بچپن میں میں ان کے پاس غازی گیا۔ کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق ان سے استفسار کیا۔ تو ان کا ایک شاگرد جو وہاں ہی ان دنوں سکول میں استاد تھا (نیاز علی خان طاہر خیلی) نے فوراً کہا کہ "شیر بہادر استاد (یعنی میرے والد) نے تو یہ حساب بھی لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے دریائے سندھ کا پانی اب تک کتنا پیا ہے۔"

والدہ مرحومہ

میری والدہ مرحومہ میر حسن خان ولد غزن خان منیر خانی کی بیٹی تھیں۔ آپ پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ پانچ حج کئے۔ بھائیوں، بہنوں، اُن کی اولاد اور دیگر اقرباء سے بہت محبت رکھتی تھیں۔ حسب استطاعت ان کی خدمت، تواضع اور امداد کرتی رہتی تھیں۔ نظم و پابندی اوقات ان کی عادت تھی۔ مجھے اور میری بہن کو سخت ضبط میں رکھا۔ قرآن خوانی اور نماز کا پابند بنایا۔ لاوارث یتیموں پر بہت مہرباں تھیں اور دس یتیموں کی پرورش کی تھی۔ آپ کی وفات سنہ ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔

میری پیدائش

میری پیدائش یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء بروز شنبہ صبح ۵ بجے ہے۔ اور میری بہن امیر خانم کی پیدائش ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء بروز یکشنبہ ۹ بجے رات ہوئی۔ ہم دو بھائی بہن ہی اپنے والدین کی اولاد تھے۔ بہن عین جوانی میں ۸ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء میں بعارضہ تپ محرقہ فوت ہوئی۔ میرے والد تمام عمر غازی (علاقہ طاہر خیلی برلب دریائے سندھ) مدرس رہے اور ہم دونوں بھائی بہن اپنی ماں کے آغوش محبت میں پلیاں ہی ہیں ان کی زیر تربیت اور ان کی عادات و خصلت سے ہی زیادہ متاثر ہوئے۔ میرے والد نے چونکہ عمر کا بہترین حصہ موضع غازی میں گزارا۔ اور طاہر خیلی قوم کی ذہانت اور نفاست نے ان کو گرویدہ کیا۔ لہذا میرا نام بھی اپنے ایک ذہین طالب علم شیر بہادر خان پسر محمد عمر خان صاحب طاہر خیلی جاگیردار غازی کے نام پر رکھا۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ شیر بہادر ان کا بہت ہی ذہین، بااخلاق اور تابعدار شاگرد تھا۔ محمد عمر خان صاحب خود صاحب علم و فراست انسان تھا۔ اور وسیع مطالعہ رکھتا تھا۔ ان کی تارخیلی بیوی سے دو فرزند شیر بہادر خان اور عبدالقادر خان تھے۔ اول الذکر جنوبی وزیرستان میں پولیٹیکل تحصیلدار تھے وہاں سے راستہ میں آتے ہوئے وزیریوں کے ہاتھ شاید سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء میں قتل ہوئے۔ عبدالقادر خان پولیس میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ میں نے شیر بہادر خان کو نہیں دیکھا عبدالقادر خان سے رسم و راہ رہی۔ بہت ہی شریف النفس انسان تھے اور پولیس کے محکمہ میں ایک فرشتہ تھے۔ اور پاک دامن ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے الہلال کے پرانے مجلدات جو شیر بہادر خان کی ملکیت تھے۔ میری درخواست پر مجھے عنایت کئے۔ اور آج تک یہ مجلدات میرے پاس ہیں۔ اور دونوں بھائیوں کی یاد کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔ باپ اور بیٹے علم و شرافت کے نمونے تھے خدا ان کو جنت الفردوس عنایت کرے

میری ابتدائی تعلیم

جب میری عمر ۶ سال کی ہوئی تو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل ہوا۔ جو ایک کچے کرایہ کے مکان سنہ ۱۹۰۲ء میں کھولا گیا تھا۔ یہ سکول ایک نیک بخت انسان کے گھر میں کھولا گیا تھا کیونکہ جتنے لڑکے بھی اس سکول میں زیر تعلیم رہے کم و بیش سب ہی نور تعلیم سے خوب آراستہ ہوئے۔ اور استاد بھی ہمیں نیک سیرت قابل اور محنتی ملے۔ جن کو فرض منصبی سے شغف اور شاگردوں سے محبت تھی۔ ایسے تو سب استاد ہی صفات بالا سے متصف تھے۔ لیکن ایک استاد کی یاد اور شفقت آج تک یاد ہے۔ ان کا نام مولوی حمید گل تھا جو موضع ٹھاپی۔ تربیلہ کے قوم اخون خیل سے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم تو واجبی تھی۔ شاید [illegible] تھے۔ لیکن بچوں کی تعلیم میں بہت

محنت کرتے تھے۔ صبح سویرے نماز فجر کے بعد گرد و نواح کے مواضعات کا روزانہ چکر لگاتے تھے اور شاگردوں کو جمع کر کے ساتھ لاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ لڑکے جو گھر کے اندر چھپے ہوتے تھے۔ ان کو بھی پکڑ کر لے آتے تھے۔ لڑکے ان کی آواز سن کر جمع ہو جاتے تھے۔ گرد و نواح دو تین میل دائرہ کے اندر دیہات ان کی صبح کی گردش کی زد میں ہوتے تھے۔ اور واپسی پر پنیاں کی گلیوں سے گزرتے اور لڑکوں کو آواز دیتے جاتے تھے۔ جب سکول پہنچتے تو سب لڑکے حاضر ہو چکے ہوتے تھے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں پرائمری امتحان پاس کیا۔ اور تحصیل میں مقابلہ کے امتحان میں اول آیا۔ اور انگریزی تعلیم کے لئے دو روپیہ ماہوار وظیفہ لیاقتی حاصل کیا۔ اس وقت چیدہ چیدہ لڑکوں کا امتحان مقابلہ برائے لیاقتی وظیفہ تحصیل وار انسپکٹر تعلیم صوبہ سرحد خود لیا کرتے تھے۔ جس سال میں نے امتحان دیا ان دنوں مرزا علی محمد خان صاحب مرحوم انسپکٹر تھے وہ ایک قابل اور ہمدرد انسان تھے۔ استادوں اور ان کی اولاد کی ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ ہمارا یہ امتحان جاگل کے سکول میں ہوا۔ ان دنوں وہاں ایک تجربہ کار اور سینئر استاد مولوی عبداللہ خان انچارج تھے۔ جن سکولوں کے لڑکے امتحان میں داخل ہوئے تھے ان سب کے استاد بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ میرے والد بھی غازی سے آئے۔ اگرچہ ان کے سکول کا کوئی طالب علم نہ تھا۔ مرزا صاحب مرحوم مجھے پہچانتے تھے۔ جب والد صاحب نے سلام کیا تو انہوں نے کہا "رسول خان تمہارے سکول کا کوئی لڑکا بھی آیا ہے؟" انہوں نے کہا۔ "نہیں جناب! میں صرف سلام کے لئے آیا ہوں۔" میری طرف مرزا صاحب مرحوم نے دیکھا اور مسکرائے تو فرمانے لگے: "ہاں اپنے پتر کے لئے آئے ہو۔" بس یہ فرمایا اور امتحان لینے میں مصروف ہو گئے۔ وہ سوال بولتے جاتے تھے اور لڑکے سلیٹوں اور تختیوں پر لکھ لیتے تھے۔ اور پھر اسی وقت جواب تحریر کر کے ان کو دکھاتے جاتے۔ ایک مضمون ختم ہوتا تو دوسرے مضمون کے سوالات لکھاتے۔ چھ سات مضامین تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے پاس نمبر نوٹ کرتے جاتے تھے۔ دو مضامین کے بعد انہوں نے دیکھا کہ کوٹ نجیب اللہ کا ایک لڑکا اور میں تقریباً برابر برابر جا رہے ہیں شاید وہ مجھ سے کچھ زیادہ نمبر لے رہے تھے۔ آپ نے کوٹ نجیب اللہ کے استاد کو الگ بلایا اور کہا کہ "کیا آپ کا یہ طالب علم انگریزی تعلیم کے لئے جائے گا؟ کیونکہ یہ وظیفہ انگریزی تعلیم کے لئے ہے۔ اگر وہ نہ جائے اور امتحان مقابلہ سے دست بردار ہو جائے تو ہم اس کو چار روپیہ خرچیہ ماہوار وظیفہ دیں گے اور اس کو سررشتہ تعلیم میں نوکری کے لئے امداد کریں گے۔" استاد نے خوشی سے منظور کیا وہ طالب علم امتحان مقابلہ سے اٹھ گئے۔ باقی مضامین میں میں سب امیدواروں سے اول آیا اور وظیفہ حاصل کیا۔

مرزا صاحب مرحوم کی دیانت اور استادوں کے لڑکوں کی امداد کے جذبہ کا اندازہ واقعہ بالا سے ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مجھے لازماً انگریزی مڈل سکول میں داخل ہونا تھا۔ اور یہ سکول ہری پور میں تھا۔ والدہ مصر تھیں۔

کہ کوٹ نجیب اللہ سکول میں جو نزدیک تھا اور روزانہ سکول سے گھر جا سکتا تھا داخل کیا جائے۔ والد مرحوم انگریزی تعلیم کے شائق تھے۔ لہٰذا مجھے ہری پور انگریزی مڈل سکول میں داخل کیا گیا جو اب گورنمنٹ ہائی سکول ہے۔ جب میں داخل ہو گیا۔ تو میری امداد کے لئے مرزا صاحب مرحوم نے حکم جاری کر دیا۔ کہ آئندہ کے لئے سب سب استادوں کے لڑکوں کی فیس مڈل سکولوں میں معاف ہو گی۔

میں جب لکھمی چند خالصہ ہائی سکول میں داخل ہوا تو استادوں کے لڑکوں کی فیس ہائی سکولوں میں بھی معاف کر دی گئی۔ اور غالباً آج تک یہی حال ہے۔ لکھمی چند خالصہ ہائی سکول لالہ روچی رام ساکن ایبٹ آباد نے اپنے بیٹے لکھمی چند کی وفات پر اس کے نام پر بنایا جس کا فیض آج تک جاری ہے۔ اب یہاں ٹریننگ سکول برائے جونیئر ورنیکلر و سینئر استاداں ہے (۲۷.۸.۷۰)

مرزا علی محمد خان صاحب کے اوصاف حمیدہ

مرزا صاحب مرحوم کی استادوں کے ساتھ شفقت کا ایک اور واقعہ تحریر کرتا ہوں۔ ضلع ہزارہ تحصیل ایبٹ آباد میں ایک سکول کا استاد نے اپنے گاؤں میں اپنا نیا اور پختہ مکان بنوایا۔ گاؤں کے نمبردار کو اس بات پر حسد ہوا اور ڈپٹی کمشنر کے پاس جھوٹی شکایت اس استاد کے خلاف کی۔ ڈپٹی کمشنر نے ڈسٹرکٹ انسپکٹر سے اس استاد کی تبدیلی دوسری جگہ کرا دی۔ مرزا صاحب کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو وہ پشاور سے خود یہاں آئے اور استاد کی واپسی کا اپنے گاؤں کے مدرسہ کے لئے فوری حکم جاری کیا۔ اور ڈپٹی کمشنر کو سب حالات بیان کئے۔ ڈپٹی کمشنر نے نمبردار کو بلا کر تنبیہ کی اور حکم دیا کہ جا کر ماسٹر مذکور سے معافی مانگے۔ اس کے بعد وہ استاد زندگی بھر اپنے گاؤں کے سکول ہی میں رہے۔

مرزا صاحب مرحوم ایک جفاکش تعلیمی افسر تھے۔ اور طوفانی دورہ گھوڑوں پر کیا کرتے تھے ان کے زمانہ میں معیار تعلیم بہت اونچا ہوا۔ استادوں کی عزت بہت بلند ہوئی۔ استادان سے مرعوب تھے اور اپنے کام میں سخت محنت کرتے تھے۔ لیکن اُن کا نام ادب اور عزت کے ساتھ لیتے تھے۔ مرزا صاحب مرحوم بہت خوبیوں کے مالک تھے اور اعلیٰ قسم کے بذلہ سنج و سخن نواز انسان تھے جن دنوں میں ایم بی مڈل سکول ہری پور میں زیر تعلیم تھا۔ آپ معائنہ کے لئے آئے۔ ہمارے فارسی کے استاد اپنے مضمون کے ماہر اور اعلیٰ قسم کے منتظم تھے اپنے گاؤں سے اعلیٰ قسم کے شہتوت کا تحفہ مرزا صاحب کے لئے لائے۔ مرزا صاحب نے شہتوت کے ایک دو دانے کھائے اور ان کی ڈنڈی دانتوں سے کاٹ کر پھینک دی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ "جناب اگر شہتوت کے ساتھ اس کی ڈنڈی بھی کھائی جائے تو ان کی تاثیر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔" مرزا صاحب نے فوراً کہا کہ مولوی صاحب اگر ان کے

پتنگ کٹائے جائیں تو پھر یہ برف ہی بن جائے

اخیر عمر میں مرزا صاحب مرحوم موذی مرض تپ دق میں مبتلا ہو کر ۱۹۲۵ء میں فوت ہوئے۔ خدا مغفرت کرے بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اور محکمہ تعلیم سرحد پر ان کے لاتعداد احسانات ہیں۔ میں پرائمری سکول ہی کا طالب علم تھا کہ والد صاحب مجھے مرزا صاحب کے سلام کے لئے ساتھ لے گئے۔ جب کہ وہ ہری پور سکول کے معائنہ کے لئے آئے تھے۔ بڑے پیار اور محبت سے مجھے پاس بلایا۔ نام پوچھا۔ پھر والد صاحب سے پوچھا کہ اور کوئی لڑکا بھی ہے۔ والد صاحب نے کہا کہ یہی ایک ہے۔ فرمایا مولوی صاحب شیر کا ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ اسی کو شیر بناؤ۔ ان کے اخلاص اور تاثیر زبان کا یہ معجزہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں خدا کے فضل اور ان کے کلمہ خیر کے باعث کامران ہی رہا۔ خدا ان کو جنت الفردوس نصیب کرے۔ آمین۔

مڈل سکول ہری پور کی طالب علمی کے زمانہ کے حالات

ہری پور ہمارے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے ہر روز سکول آنا جانا مشکل تھا اس وقت سائیکل کا رواج نہ تھا اگر تھا تو بہر حال ہمارے گاؤں میں نہ تھا۔ لہذا میں بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گیا۔ ہفتہ کی شام گھر آجایا کرتا تھا۔ اور اتوار گھر پر گزارتا تھا۔

مڈل سکول کے دو ہیڈ ماسٹر اور دو استاد قابلِ ذکر ہیں۔ میری تعلیم مڈل کے پہلے دو سالوں کے دوران محمد دین جان صاحب ہیڈ ماسٹر تھے۔ آپ بلند و بالا اور چھریرے بدن کے انسان تھے اور سخت منتظم تھے۔ طالب علم اور اُستاد دونوں اُن سے مرعوب تھے۔ مڈل سکول کے شمالی جانب برآمدہ ہے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کا دفتر مغربی کونہ پہ تھا اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے دفتر سے باہر نکل کر برآمدہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلا کرتے تھے۔ اس سے شاید ان کا مقصود استادوں کو فرض منصبی پر متوجہ کرنا ہوتا ہو برآمدہ میں پتھر (سلوں) کا فرش تھا ہیڈ ماسٹر صاحب مغربی لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ اور مضبوط ایڑی والے بوٹ پہنتے تھے۔

جب وہ اپنے دفتر سے باہر قدم رکھتے تو ان کے بوٹوں کی آواز سے طالب علم اور استاد سب چوکنے ہو جاتے۔ طالب علم گھبراہٹ اور بدحواسی کے عالم میں کتابوں کو اُلٹ پلٹ کرتے اور استاد بھی ذرا سنبھل کر بیٹھ جاتے۔ ان کے بعد دوسرے ہیڈ ماسٹر، ماسٹر محمد رمضان صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ آپ درمیانہ قد اور نحیف الجثہ تھے ان کی توجہ مذہبی تعلیم کی طرف زیادہ تھی۔ قرآن با ترجمہ کا مطالعہ انہوں نے سب سکول میں جاری کرا دیا تھا۔ اور اس میں تحریری اور زبانی امتحان بھی لیا کرتے تھے۔ اور اپنی گرہ سے کافی انعام بھی دیا کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے مذہب کی طرف خاص رُجحان ہوا۔ اور مذہبی کتب سے شغف پیدا ہوا۔ مڈل کا امتحان میں نے ۱۹۱۶ء میں

پاس کیا۔ اور وظیفہ حاصل کیا۔ انہی ایام میں لکھمی چند خالصہ ہائی سکول ہری پور تیار ہو چکا تھا۔ ہری پور تحصیل میں صرف یہی ایک ہائی سکول تھا لہذا سب لڑکے یہیں داخل ہوتے تھے تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا سب اُستاد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مشنری سپرٹ سے اپنا فرض منصبی ادا کرتے تھے۔ استادوں کا شاگردوں کے ساتھ بلا تفریق مذہب بہت اچھا سلوک تھا۔ ہم مسلمان لڑکے بھی ان کے دھارمک (مذہبی) جلسوں میں از خود شریک ہوتے تھے۔ بہت سے طالب علموں نے گورمکھی سیکھی اور میں نے بھی۔ ایک دفعہ بہت بڑا خالصہ دیوان سکول میں ہوا میں نے بھی ایک مضمون گرونانک صاحب کی زندگی پر پڑھا اور انعام حاصل کیا۔ ۱۹۱۹ء میں امتحان انٹرنس فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور کالج کے داخلہ کی فکر ہوئی۔ والد صاحب نے سر صاحب زادہ عبدالقیوم خان صاحب مرحوم کو درخواست بھیجی۔ انہوں نے یوں تحریر کیا کہ مجھے فوراً کالج بھیج دیا جائے۔ اور ساتھ ہی کالج کی جانب سے بیس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی عنائت کیا۔

میں ایف ایس سی میں داخل ہوا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ ڈاکٹری کا خیال ان کو ایک واقعہ سے ہوا۔ وہ بیمار ہوئے تو رخصت پر گھر آئے۔ اور ہری پور ہسپتال برائے علاج گئے۔ ان دنوں ڈاکٹر خالق داد خان اسسٹنٹ سرجن تھے آپ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے رہنے والے تھے اور بہت قابل ڈاکٹر تھے۔ بعد میں وہ پشاور ایجرٹن ہسپتال کے انچارج ہوئے اور بہت نام پایا۔

والد صاحب کے ساتھ بات چیت ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا تنخواہ ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہی تین سو روپیہ۔ اور مزید کہا کہ گورنمنٹ تنخواہ بہت کم دیتی ہے۔ حالانکہ اس وقت یہ تنخواہ بہت زیادہ خیال کی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کے نقطہ نظر سے یہ کم تھی۔ والد صاحب کو بھی خیال ہوا کہ وہ بھی مجھے ڈاکٹر بنائیں گے۔ ان کی یہ خواہش انجام کار پوری نہ ہوئی۔

اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان مرحوم کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ اور آپ اس کالج کی ترقی کے لئے بہت کوشش کرتے تھے۔ اور تمام صوبہ کے لڑکوں کو داخلہ کی ترغیب دیتے تھے۔ اور کافی وظائف لڑکوں کے لئے مقرر کئے ہوئے تھے۔ میں بھی اس کالج میں داخل ہو گیا۔ سر صاحب زادہ ان دنوں خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور کالج کے آنریری سکرٹری بھی۔ آپ تقریباً ہر شام کالج آتے ہر ایک سے ملتے ان کی توجہ اور کوشش نے کالج کو بہت جلدی اونچے معیار پر پہنچا دیا۔ اور سرحد میں اعلیٰ تعلیم کا معیار تیزی سے بلند ہونے لگا۔ یہاں پر سر نواب صاحب زادہ عبدالقیوم خان مرحوم کی سوانح عمری مختصر درج کرتا ہوں۔ جو مجلہ ترجمان سرحد پشاور سے ماخوذ ہے۔

نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان

آپ مُلّا صاحب کوٹھہ (نزد ٹوپی) سیّد امیر صاحبؒ کی اولاد سے ہیں۔ آپ ۱۸۶۴ء یا ۱۸۶۳ء میں موضع ٹوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام صاحبزادہ عبدالرؤف ہے جو ان کی صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کی تربیت ان کے جدّ امجد مُلّا صاحب کوٹھہ نے کی۔ آپ نے مشن ہائی سکول پشاور سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور خیبر رائفلز (KHYBER RIFLES) میں کلرک بھرتی ہوئے۔ جس کا دفتر کچی گڑھی (نزد جمرود تھا) وہیں جارج روس کیپل (GEORGE ROOS KEPPEL) لفٹیننٹ تھے۔ یہیں ان دو غیر معمولی قابلیت والے حضرات کا ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ آپ ترقی پاکر پولیٹیکل تحصیلدار اور پھر پولیٹیکل افسر بنے۔

پروفیسر دانی اپنی کتاب "پشاور" صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں...... کہ آپ بہ حیثیت منشی سرکاری ملازمت میں بھرتی ہوئے۔ اس کے بعد مترجم اور پھر ڈیورنڈ مشن کے ترجمان مقرر ہوئے۔ اور بعد میں پولیٹیکل افسر و پولیٹیکل ایجنٹ ہوئے۔ کُرم ایجنسی میں دونوں حضرات (جارج روس کیپل اور سر صاحبزادہ مرحوم) بہ حیثیت پولیٹیکل ایجنٹ اور اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر یک جا رہے۔ نواب سر صاحبزادہ مرحوم آخر کار خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ ہوئے۔ جب سر جارج کیپل سرحد کے چیف کمشنر اور منغل اعظم تھے۔

یہی وقت ہے جب نواب سر صاحبزادہ نے سر جارج روس کیپل کی سرگرم حمایت اور سرپرستی میں "دارالعلوم اسلامیہ سرحد" کی تحریک کی۔ اور ۱۲ مارچ ۱۹۱۲ء میں اس کا باقاعدہ سنگِ بنیاد مجاہد سرحد فضل واحد صاحب (حاجی صاحب ترنگ زئی) کے ہاتھوں رکھا گیا جو سب سے پہلے اسلامیہ کالجیٹ سکول کی شکل میں اور پھر اسلامیہ کالج کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور ۱۹۵۰ء میں یہاں ہی پشاور یونیورسٹی بنی۔ یہ آپ کے اخلاص کا فیض ہے کہ صوبہ سرحد تعلیم کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ نواب سر عبدالقیوم مرحوم ۱۹۱۹ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں مرکزی اسمبلی کے ممبر نامزد ہوئے۔ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ ۱۹۳۲ء میں نواب سر عبدالقیوم سرحد میں پہلے (واحد) وزیر محکمہ جات منتقلہ بنے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد آپ پہلے وزیر اعلیٰ بنے۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو اس اسمبلی کا اجلاس ایبٹ آباد میں ہوا۔ آپ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہوئی۔ اور آپ اپوزیشن کے لیڈر بن گئے۔ ۴ دسمبر ۱۹۳۷ء میں اپنے آبائی گاؤں ٹوپی میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ کا دسترخوان وسیع تھا۔ ان کے بنگلے پر ہر وقت ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا۔ صوبائی حالات پر گفتگو اور مباحثے ہوتے اور اسی سے آپ رائے عامہ کا اندازہ کرتے رہتے تھے۔ آپ ہر کہ و مہ کا استقبال اٹھ کر مصافحہ سے کرتے۔ چہرہ نہایت باوقار اور پرشکوہ۔ لباس پٹھانی۔ (پشاوری لنگی۔ سفید کرتہ۔ سفید پاجامہ اور سیاہ فراک کوٹ) ہمیشہ رکھتے بڑے جامہ زیب انسان تھے۔

کالج کے اساتذہ۔ سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے کالج کے لئے قابل ترین عالمی شہرت کے پروفیسر مقرر کئے۔ ان میں میرے سائنس کے استاد پروفیسر منہاج الدین (فزکس) پروفیسر کالیداس (زوآلوجی) اور پروفیسر ڈے (بنگالی) (کیمسٹری) اور خاص کر شیخ محمد تیمور صاحب (وائس پرنسپل) انگریزی کے تھے۔ میں نے اپنے استادوں کے فیض تعلیم اور ان کی توجہ و اخلاص سے منزلِ تعلیم کامیابی سے طے کی خاص کر شیخ محمد تیمورؒ جیسے محبِ وطن، شاگردوں کے مخلص رہنما اور خیرخواہ استاد کی معیت میری خوش نصیبی کا باعث تھی حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کی تعلیمی ترقی ایسے ہی قابلِ عزت استادوں کی مرہونِ منت ہے۔ ان محترم استادوں کی شخصیت کا اثر تھا کہ طالب علم ان کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے تھے۔ اور معلوم ہے کہ استاد کی عزت و تابعداری سرمایہ دین و دنیا ہے۔ اور یہ امر اس زمانہ میں خاص طور پر شاگردوں کے زیرِ نظر رہتا تھا۔

داخلہ میڈیکل کالج لاہور

اسلامیہ کالج سے ایف ایس سی پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج لاہور کا داخلہ ایک کٹھن کام تھا اولین عالمگیر جنگ ۱۹۱۸ء میں ختم ہو چکی تھی۔ لیکن دورانِ جنگ کی رعایات ابھی تک جاری تھیں۔ دورانِ جنگ میں فوجی افسران و افراد کے بچے ہی داخل کئے جاتے تھے۔ پانچ سال یہی عمل رہا۔ اس دوران میں چونکہ داخلہ قابلیت پر نہ تھا لہٰذا ڈاکٹری تعلیم کا معیار گر گیا۔ ان دنوں میں ایک مشہور قابل ترین اور منتظم قسم کا ایک جابر انگریز کرنل ڈبلیو۔ ڈی سدرلینڈ پرنسپل تھا اس میں انگریزی غرور و سرگرانی کے سوا باقی سب صفات اعلیٰ درجہ کی تھیں۔ وہ کالج کے انتظام میں کسی کی مداخلت گوارا نہ کر سکتا تھا۔ جنگ کے اختتام کے دو سال بعد اس نے داخلہ کے لئے قابلیت کو معیار بنایا۔ لیکن یہ راز پہلے اس نے ظاہر نہ کیا۔ لہٰذا داخلہ حاصل کرنے کے لئے سب فوجی افسران جنگی تمغہ جات چھاتیوں پر آویزاں کئے ہوئے مثل سابق سن ۱۹۲۰ء میں بھی جمع ہوئے میں نے بھی کوشش کی تھی۔ لیکن کسی فوجی رشتہ دار کی حمایت و سفارش حاصل نہ ہو سکی۔

یہ میری پریشانی کا دور تھا لیکن میں نے اور والد بزرگوار نے خدا پر بھروسہ کر کے داخلہ کے لئے قسمت آزمائی کی۔ چونکہ اسلامیہ کالج میں بی اے کے داخلہ کی تاریخ پہلے تھی اور میڈیکل کالج کی بعد میں لہٰذا میں نے حسب رائے والد صاحب بی اے کا داخلہ احتیاطاً پشاور میں لے لیا کہ لاہور کے داخلہ میں ناکام ہو کر پہنچ

لہ [illegible] ۱۹۶۹ء کو فوت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہاں تعلیم جاری رکھی جاسکے۔ داخلہ لاہور کی تاریخ جب قریب آئی تو میں نے وہاں سے والد صاحب کو لکھا کہ میں قسمت آزمائی کے لئے لاہور جا رہا ہوں۔ جس تاریخ کو میں یہ خط لکھ رہا تھا سروش غیبی والد مرحوم سے مجھے لکھوا رہا تھا۔ کہ میں قسمت آزمائی کے لئے ضرور لاہور جاؤں۔ دل را بہ دل رہیست اور پھر اس میں راز خداوندی۔ یہ دونوں خطوط محفوظ ہیں۔ اس پس منظر اور بیم و یاس کے ماحول میں اور صرف خدا کی امداد پر مکمل بھروسہ کی زادِ راہ لئے ہوئے لاہور پہنچا۔ اس توکل اور والد مرحوم کی دعائے نصرت سے میری خواہش کی کاربرآری کے لئے غیب سے انتظام ہوا۔ اور خوب ہوا۔ ہم نے اس کی امداد ہی پر تکیہ کیا اور اس نے بھی ہمیں مایوس نہ کیا۔ تاریخ مقررہ پر میڈیکل کالج حاضر ہوا۔ سکھ، ہندو اور مسلمان امیدوار کمروں میں بٹھائے گئے۔ ہندو الگ کمرے میں اور مسلمان اور سکھ یکجا ایک کمرہ میں۔ کالج کے برآمدے اور صحن امیدواروں کے فوجی رشتہ داروں سے جو فوجی لباس میں ملبوس اور فوجی خدمات کے تمغے سینوں پر آویزاں کئے ہوئے تھے بھرے تھے۔ عجب زرق برق کا سماں تھا اور سفارشیوں کا اژدحام تشویش و پریشانی ہر چہرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ خاص کر میرے جیسے امیدواروں کے جن کا کوئی فوجی مددگار نہ تھا۔ داخلہ کے لئے پچاس ہندو۔ پچیس مسلمان اور پچیس سکھ امیدواروں کی جگہ تھی۔

امیدواروں کو یونیورسٹی کے نتیجے ایف ایس سی کے حساب سے بٹھایا گیا تھا۔ سرحد و پنجاب کے مسلمانوں میں میں تیسرے نمبر پر بٹھایا گیا۔ پرنسپل کرنل سدرلینڈ ٹھیک دس بجے اندر آیا اور آتے ہی کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ ”حضرات! داخلہ اس سال محض قابلیت پر ہوگا“ یہ کہہ کر اس نے حکم دیا کہ نمبر کے لحاظ سے پہلے پچاس ہندو۔ پہلے پچیس مسلمان اور پہلے پچیس سکھ داخل کئے جائیں۔ رحمت پروردگار سے میں مسلمانوں میں تیسرے نمبر پر داخل کالج ہوا اور خدا کا شکر بجا لایا کہ اس نے مجھے اپنا ہی ممنون رکھا اور کسی انسان کے زیر احسان نہ کیا۔

داخلہ میڈیکل کالج کی نئی شرائط پر شور و ہنگامہ

اس یکایک تبدیلی شرائط داخلہ پر پنجاب کے فوجی حلقوں میں کہرام مچ گیا۔ فوجیوں نے اِدھر اُدھر سے بہت سفارشیں کرائیں کہ ان کے بچے داخل کئے جائیں۔ مگر پرنسپل مضبوط چٹان کی طرح تھے اپنے فیصلے پر مستحکم رہے۔ آخرکار دو تین افراد نے سر فضل حسین سے بھی جو ان دنوں وزیر صحت پنجاب تھے سفارش کرائی۔ انہوں نے کرنل سدرلینڈ کو ایک سفارشی خط لکھا کہ مہربانی کر کے ان دو تین لڑکوں کو داخل کر لیں۔ کرنل سدرلینڈ نے جواب دیا کہ افسوس ہے تمام نشستیں پُر ہو چکی ہیں۔ اور مزید داخلہ کی گنجائش نہیں۔ اس پر سر فضل حسین نے ان کو بطور وزیر صحت حکم بھیجا کہ ان کو داخل کیا جائے۔

کرنل سدرلینڈ نے جو ڈسپلن پر خود بھی سخت عامل تھا ان لڑکوں کو داخل کالج کر لیا۔ اور جواب میں لکھا کہ بموجب حکم ان لڑکوں کو داخل کالج کر لیا گیا ہے۔ لیکن میں اب پرنسپلی سے استعفیٰ دیتا ہوں اور باوجود ہزار کوشش کے انہوں نے اپنی استعفیٰ واپس نہ لیا۔ اور اس کے بعد بطور چند سال پروفیسر آف میڈیسن کالج میں رہے۔

کرنل سدرلینڈ کی چند خوبیاں برائے سبق آموزی بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

کرنل موصوف انگریزی عہد اقتدار کے شاہانہ کر و فر اور طبقہ امراء کا انسان تھا اور اپنے احساس برتری میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا۔ اس کی یہ طرز صرف ہندوستانیوں کے ساتھ نہ تھا۔ بلکہ انگریزوں کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ یہاں تک کہ انگریز افسروں اور گورنر تک کے گھر بطور ڈاکٹر علاج کے لئے نہ جاتا۔ ان کو بھی پہلے سے وقت مقرر کرانا پڑتا تھا۔ اور تاریخ اور وقت مقررہ پر اس کے بنگلے پر آنا پڑتا تھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے علم، تجربہ اور اپنے پیشہ کو معزز مقام دینے کی وجہ سے یہ کرتا تھا۔ لوگ دو دو ماہ تک اپنی تاریخ ملاحظہ کا انتظار کرتے تھے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ صرف ایک بیمار روزانہ دیکھتا تھا۔ اور بتیس روپیہ (اس زمانہ میں) فیس لیتا تھا۔ بیمار کا معائنہ بڑے غور سے کرتا تھا۔ اور کم از کم ایک گھنٹہ صرف کیا کرتا۔ پھر جب نسخہ لکھ کر دیتا تو اس کے ساتھ پرہیز، طریق استعمال و دیگر ہدایات مکمل طور پر لکھ کر دیا کرتا تھا۔ بیمار سے بڑی عزت اور شرافت کا برتاؤ کرتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو تین چار بیمار روزانہ دیکھ کر زیادہ روپیہ کما سکتا تھا لیکن وہ بہت سیر چشم انسان تھا۔ یہاں تک کہ طالب علموں کے رشتہ داروں اور ہم وطنوں کو ان کی درخواست پر مفت اور مکمل طور پر دیکھتا اور علاج تجویز کرتا تھا۔ وقت کا بہت پابند تھا۔ اور جتنی مدت وہ کالج میں رہا۔ اس کی پابندی میں کوئی فرق نہ آیا۔ صرف ایک دفعہ وہ پانچ منٹ دیر سے آیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی موٹر راستہ میں خراب ہو گئی۔ وہ موٹر کو اسی جگہ چھوڑ کر تانگہ میں بیٹھ کر کالج پہنچا۔ لیکچر میں پانچ منٹ دیر ہونے پر اپنے طالب علموں سے معافی مانگی۔ اس کے لیکچر کا ٹائم صبح ٹھیک ۸ بجے ہوا کرتا تھا۔ اور ہسپتال کے راؤنڈ کا گیارہ بجے۔ لوگ اس کی موٹر کی آمد کے ساتھ اپنی گھڑیاں درست کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ٹھیک آٹھ بجے اور ۱۱ بجے اس کا موٹر کالج کے پھاٹک کے اندر داخل ہو جایا کرتا تھا۔

لیکچر کے لئے وہ ٹھیک آٹھ بج کر پانچ منٹ پر لیکچر روم میں داخل ہو جاتا۔ یہ پانچ منٹ اپنے دفتر میں انتظار کرتا تاکہ تمام طالب علم اس وقفہ میں پہنچ جائیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہو جاتے تو پھر اپنے ہاتھ سے کمرے کے دروازہ کا کنڈا بند کر دیتے تھے۔ تاکہ اس کے بعد کوئی لڑکا اندر نہ آسکے۔

اس سے اس کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ لڑکوں کو عملاً پابندیٔ وقت کا سبق یاد رہے اور دوسرا یہ کہ لیکچر میں دخل اندازی نہ ہو۔ اس کا لیکچر علم کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہوتا تھا جس سے ساحل پر موتی جھڑا کرتے تھے۔ وہ لیکچر ہمیشہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر لایا کرتا تھا۔ اور ایسا جامع ہوتا تھا۔ کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا کرتا تھا۔ ایسا قابل انسان، ایسے موثر طرز پر زبانی۔ تحریری لیکچر دیتا اور ساتھ ہی تختہ سیاہ پر دستی شکلوں سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ کہ مضمون دماغ پر نقش ہو جاتا تھا۔ ہر مضمون کے شروع میں ایک مختصر سا فقرہ بیان کر دیتے تھے جو پُر حکمت اور تمام اطراف مضمون کا خلاصہ ہوتا تھا۔ مثلاً ہاضمہ کی بیماریوں پر لیکچر شروع کرنے سے پہلے یہ کہہ دیتے کہ حضرات نوٹ کرو اور موٹے قلم سے نوٹ کرو "معدہ میں دانت نہیں ہوتے،، مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہاضمہ کی بیماریوں کا عموماً سبب یہ ہوتا ہے کہ روٹی جلدی کھانے سے اور مکمل چبائے بغیر نگلنے سے معدہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس میں دانت نہیں ہوتے۔ کہ وہ منہ میں دانتوں سے کم چبائی ہوئی روٹی کو مزید چبا سکے۔ اور پھر یہ کہا کرتے تھے کہ خدا نے بتیس دانت انسان کو اس لئے دئے ہیں کہ ہر ایک دانت اپنا کام بہ حصہ رسدی کرے۔ یعنی ہر دانت ایک دفعہ چبائے۔ کل ۳۲ دانت ہیں لہذا ہر نوالہ ۳۲ دفعہ چبایا جائے دوران لیکچر اس کی نظر ہر طالب علم پر ہوتی تھی۔ اگر کوئی طالب علم غیر متوجہ بیٹھا ہوتا اور نوٹ نہ کر رہا ہوتا تو وہ اس کو باہر نکال دیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک گھنٹہ کا لیکچر اتنی خاموشی اور چُستی سے لڑکے نوٹ کیا کرتے تھے کہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک گھنٹہ کیسے ختم ہوا۔ لیکچر ختم ہونے پر جب علم کا دریا بہتے بہتے رک جاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دلنواز نغمہ بند ہو گیا ہے۔

کرنل موصوف اپنے علم اور پیشے کے اتنے عاشق تھے کہ وہ پروفیسری کو کسی حالت میں بھی چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے حالانکہ ان سے بہت سے جونیئر پروفیسر باری باری اعلیٰ انتظامی عہدوں پر چلے گئے۔ وہ اپنے طالب علموں کی علمی اور اخلاقی اقدار کے بھی زبردست نگہبان تھے۔ اور لباس کی پاکیزگی کے جس طرح خود عادی تھے اسی طرح پاکیزہ پوشی کی عادت کو اپنے شاگردوں میں بھی دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ وہ استاد بھی تھے اور صحیح مربی بھی۔

وارڈ میں بیماروں کا راؤنڈ وہ ۱۱ بجے سے ایک بجے دن تک کیا کرتے۔ اور ہر ایک بیمار کو دیکھتے اور خاص کر نئے بیمار پر وہ ہمیشہ ½ گھنٹہ صرف کرتے۔ خود معائنہ کرتے۔ شاگردوں کو عملی معائنہ کراتے اور پھر تشخیص اور علاج پر سیر حاصل تبصرہ کرتے۔ ان کا طرز معائنہ اتنا نازک اور اعلیٰ ہوتا کہ ہم دنگ رہ جاتے صرف ایک نظر سے یا اپنی انگلی کو جائے معائنہ پر رکھ کر اس آہستگی (PERCUSSION) سے ضرب

لگا کر عضو کے نقص کا پتہ لگا لیتے کہ اوروں کے لئے ممکن نہ ہو سکتا تھا اور ان کی یہ تشخیص بالکل صحیح ہوتی۔ عام ڈاکٹر ضربِ انگشت کی آواز سے عضو کا نقص معلوم کرتے ہیں وہ صرف حسِ انگشت سے اندازہ لگا لیتے تھے۔ بیمار کے معائنہ کے دوران بھی وہ طالب علموں کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے معائنہ کے دوران میں ان کی پشت پر کھڑا تھا کہ بارہ بج گئے اور میں نے اپنی جیبی گھڑی کو چابی دینی شروع کی۔ فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔ "کون گھڑی کو چابی دے رہا ہے" میں نے اقرار میں جواب دیا۔ کہنے لگے۔ کہ "یاد رکھو دانا لوگ رات کو سوتے وقت گھڑی کو چابی دیتے ہیں اور گھڑی کو تکیہ کے نیچے رکھتے ہیں۔ اس سے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ اس طرح سے چابی دینا نہیں بھول سکتے۔ دوسرے گھڑی گرمی اور سردی سے محفوظ رہتی ہے۔ اور کارکردگی میں صحیح رہتی ہے اور کافی مدت تک کام دیتی ہے"

کرنل سدرلینڈ کے عائلی اخلاق کی ایک جھلک

اس کی بیوی مہاراجہ دلیپ سنگھ کی بڑی لڑکی تھی۔ اس خوددار انگریز کا سر کسی کے آگے کبھی خم نہ ہوا اس نے اپنے کردار اور خودی کے زور سے گورنر، وزیر اور دیگر افسران کو اپنے سامنے مودب ہونے پر مجبور رکھا۔ ہم نے اس کو صرف اپنی بیوی کے آگے مودّب اور سر جھکا کر موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا۔ ہسپتال میں ایک دفعہ گفتگو کے دوران کسی نے اس کی بیوی کو مسز سدرلینڈ کے نام سے یاد کیا۔ اس پر وہ ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ اس کا اپنا منفرد لقب ہے اور وہ ہے پرنسس (شاہزادی) ایمبا دلیپا حالانکہ انگریز قوم میں بیٹی اور بیوی کی انفرادی حیثیت حاصل نہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ یا خاوند کے نام میں ہی مدغم رہتی ہے لیکن کرنل سدرلینڈ نے بیوی کی خاندانی وجاہت کو برقرار رکھا۔

زمانۂ طالب علمی میڈیکل کالج لاہور۔ کالج میں داخل ہونے کے تقریباً ایک سال بعد والد بزرگوار فوت ہو گئے۔ ان کو مجھ سے بے حد محبت تھی ایک تو میں ان کا اکلوتا بیٹا۔ ویسے بھی ان کی طبیعت میں محبت کا جز غالب تھا وہ اپنے ماں باپ کے تابعدار، بھائی بہنوں کے غمگسار اور ان کی اولاد سے بھی محبت رکھنے والے تھے۔ ان کی عمر کا بہترین حصہ غازی سکول کی مدرسی و رہائش میں گزرا۔ اور تعطیلات پر ہی گھر آتے اور وہ بھی چند روز۔ جب کبھی وہ پنیاں آتے تو ہم دونوں (باپ بیٹا) رفیقوں کی طرح ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے۔ گھر میں، مسجد میں، رشتہ داروں کے گھروں میں ملاقات کے دوران۔ لوگ یہ کہتے۔ کہ یہ باپ بیٹا نہیں بلکہ دو دوست ہیں۔ اور اس بات کو عجیب خیال کرتے۔ کیونکہ پٹھانوں میں اپنی اولاد سے محبت کا اظہار معیوب سمجھا جاتا ہے۔ شرم و حیا کا تقاضا یہ سمجھا جاتا ہے کہ باپ بیٹے سے محبت کا اظہار

نہ کرے اور نہ بیٹیا ہی باپ کے سامنے بیٹھے۔ والد مرحوم کے دل میں میری محبت تھی اور اس کا اظہار بھی تھا اس میں ان کو اتنا غلو تھا کہ ہر وقت میرا خیال ان کے دل میں رہتا تھا ایک دفعہ فرمایا۔ "جب میں بنیاں میں تم کو چھوڑ کر غازی کا راستہ لیتا ہوں (اس وقت غازی کا راستہ پیادہ براہ گرد والیاں، کالی گگی، سلم کھنڈا اور بھروا سہ تھا) تو شیطان میرے دل میں یہ وسوسہ ڈال دیتا ہے کہ تم اس بیٹے کو جوانی چڑھتا اور دنیا میں کامیاب ہوتا دیکھ بھی سکو گے یا نہ ؟ اس خیال (موہومہ جدائی) کے آتے ہی میری آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ اس سفر تنہائی میں تا غازی قائم رہتا ہے۔"

یہ کتنی تلخ یاد ہے کہ انہوں نے مجھے کامران نہ دیکھا۔ میرے داخلہ میڈیکل کالج کا ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ آپ سخت بیمار ہوئے میری تعلیم میں حرج کی وجہ سے مجھے مطلع نہ کیا جب آخری وقت آن پہنچا تو ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ "اگر تعلیم میں حرج نہ ہو تو دو تین دن کے لئے آجاؤ"۔ میں فوراً پہنچا۔ وہ بے دم تھے۔ اٹھنے کی ہمت نہ تھی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر چھاتی سے لپٹ جانے کا اشارہ کیا جب میں ان سے لپٹ گیا تو دونوں ہاتھوں سے مجھے دبا کر سینہ سے لگایا۔ اور یہ شعر پڑھا۔

به لبم رسیده جانم تو بیا که زنده مانم

مگر یہ ارمان زندہ رہنے کا پورا نہ ہو سکا۔ اور آپ نے دوسری رات بوقت عشاء داعی اجل کو لبیک کہا اگرچہ صدمہ جانگسل تھا مگر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے بعد میں فوراً اٹھا۔ ان کی چارپائی سے ایک جانب کھڑے ہو کر دو نفل پڑھے اگرچہ آنکھوں میں اندھیرا تھا لیکن دل کی طمانیت اپنے مولا کے فضل و کرم سے موجود تھی۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے کہ "اے میرے رب! میڈیکل کالج کے اخراجات اور ظاہری سہارا ختم ہو امیرے اس دُنیوی سہارے کا ذریعہ بھی آپ کی ذات تھی۔ اور اب بھی آپ ہی کی ذات ہے"

میری اس دعا کو رب نے قبولیت بخشی اور میری تعلیم کے اخراجات کا ایسا بندوبست فرمایا کہ کبھی تکلیف نہ ہوئی۔ والد مرحوم کی وفات ۱۹۲۱ء اور ہمشیرہ کی وفات ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ ان دونوں صدمات نے میری صحت کو بہت مضمحل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گو میں نے پانچ سال کی مقررہ مدت میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ لیکن اپنی گزشتہ۔ سکول و کالج۔ دور کی سطح پر قائم نہ رہ سکا۔ مزید وجہ یہ ہوئی کہ لاہور کے سیاسی ماحول اور دیگر علمی مشغولیتوں نے مجھے اپنی طرف راغب کر لیا۔ مذہبی رنگ تو بچپن سے مجھ پر غالب تھا اخبار بینی اور ان ایام کی سیاسی ہل چل نے سیاسی جلسوں، سیاسی لیڈروں کے محافل میں حاضر رہنے کا چسکہ پیدا کر دیا۔ ان دنوں لاہور میں ہندوستان کے چوٹی کے لیڈر ہندو اور مسلمان اکثر آتے تھے۔ ان کے جلسے ہوتے۔ تقریریں ہوتیں۔ جلوس نکلتے اور میں بھی اس ہنگامی رَو میں بہ گیا۔ اُس

وقت کا ایک دوست ڈاکٹر محمد شاہ خاص کر میرے ہمراہ رہتا تھا۔ یہ تحریکات آزادی کا زبردست دور تھا۔ چوٹی کے لیڈر لاہور آتے تھے میں اور ڈاکٹر احمد شاہ مرحوم ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ ہر ایک کے جلسے جلوس اور ملاقات میں شامل ہوتے تھے۔ اور خاص کر اہتمام یہ تھا کہ جب کبھی مولانا ابوالکلام آزادؒ تشریف لاتے تو ہم ان کے ساتھ جلسے۔ جلوسوں اور ملاقاتوں میں شامل رہا کرتے۔ اور ان سے بالمشافہ گفتگو کی سعادت بھی حاصل کرتے۔ وہ بڑی مہربانی اور شفقت سے ہمارے تمام سوالوں کا جواب دیتے۔

سفر مدراس۔ فروری ۱۹۲۵ء میں برائے عملی تعلیم بچہ وزچہ (MIDWIFERY) ہم پانچ طالب علموں کا گروپ مدراس میڈیکل کالج کیلئے روانہ ہوا۔ واپسی پر ہم کلکتہ کے راستے سے آئے۔ میرے ہم جماعتوں نے کلکتہ کے عجائبات کی سیر کی۔ اور میں نے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی زیارت کی۔ آپ اُس وقت ایک ایسے علاقہ میں رہتے تھے جہاں انگریز اور اینگلو انڈین کی آبادی تھی۔

مولانا محمد عبداللہ قصوری۔ دوران تعلیم مولانا محمد علی قصوری مرحوم (مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی) سے خاص طور پر میری ملاقات ہوتی تھی۔ انہوں نے دعوت تبلیغ کی ایک انجمن بنا رکھی تھی اس کے ممبر الاخوان کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ آپ نے ترک موالات کے زمانہ میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ ایک متوکل اور نیک انسان تھے شیرانوالہ دروازہ میں رہتے تھے۔ اور وہاں ساتھ ہی حضرت مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ کی قیام گاہ تھی۔ مولانا احمد علیؒ امیر انجمن خدام الدین مسجد شیرانوالہ میں درس قرآن دیتے تھے۔ اس میں کبھی کبھی شمولیت کی جاتی تھی مومنین سابقین کی نشانی تھے۔ اور قرآن وسنت کے متبع۔ اُن کی زندگی کا مقصد درس قرآن تھا۔ خدا ان کی قبر کو منور رکھے۔ انہوں نے چراغ ہدایت شیرانوالہ دروازہ میں نصف صدی کے قریب روشن رکھا۔ ان بزرگان دین کی وابستگی کی وجہ سے میڈیکل کالج میں میں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ ملازمت میں آجانے کے بعد آہستہ آہستہ داڑھی کم کرتے کرتے آخر صفا کر دی۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں اور محمد شاہ ہر سیاسی جلسے میں حاضر ہوتے اور ہر سیاسی لیڈر کی محفل میں پہنچتے۔ علی برادران۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور مولانا ظفر علی خان کے کسی جلسہ یا محفل سے ہم غیر حاضر نہ ہوتے تھے۔ انہی دنوں ایک دفعہ علامہ اقبالؒ کے مکان پر بھی گئے۔ شاید ۲۲-۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا کہ ہم نے مولوی محمد عبداللہ صاحب قصوری مرحوم سے درخواست کی کہ وہ علامہ اقبال مرحوم سے ہماری ملاقات کرائیں۔ وہ ایک دن ہمیں وہاں لے گئے علامہ اقبال تہمد باندھے آرام کرسی پر دراز تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ خاموش اور کسی گہری سوچ میں تھے۔ مولانا صاحب نے سلام کیا۔ وہ تپاک سے ملے ہم نے بھی سلام کیا۔ مولوی صاحب نے سوال کیا۔ کہ علامہ صاحب آپ کس سوچ میں مستغرق تھے۔ فرمانے لگے کہ "ایک انجمن بنانے کی فکر میں ہوں۔"

مولانا نے کہا تو پھر بسم اللہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ "مشکل یہ ہے کہ مدت سے اس پر غور کر رہا ہوں لیکن ایک ہی ممبر اب تک مل سکا اور دوسرے کی تلاش ہے" مولانا نے پوچھا۔ "جو ممبر مل گیا ہے وہ کون ہے؟" فرمانے لگے "جو مل گیا وہ تو میں خود ہی ہوں ع ورمیان انجمن تنہا ستم!

سندِ ڈاکٹری و آغازِ ملازمت

دورانِ تعلیم ڈاکٹری میں میں اور میرے رفقاء نے اسلامی طرزِ زندگی اور سادگی کو شعار بنایا۔ زمانہ کی ہوا بھی موافق تھی۔ کھدر پوشی بھی جاری رہی اور میرے چہرہ پر داڑھی بھی کافی بڑی دکھائی دیتی رہی۔

نومبر ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹری کی سند لی۔ اور گھر پہنچا۔ تحریکِ آزادی نے دماغ میں سرکاری نوکری سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ لہٰذا پرائیویٹ پریکٹس کرنے کا ارادہ ہوا۔ پشاور شہر میں محلہ ڈھکی نعل بندی میں ایک دکان لے کر کام شروع کیا۔ لیکن پرائیویٹ پریکٹس کے داؤ پیچ کے فن سے قطعاً ناآشنائی کی وجہ سے چار پانچ ماہ ہی میں دل اچاٹ ہو گیا۔ اور سرکاری نوکری ہی میں خیریت نظر آئی۔ ادھر ادھر کوشش کی گئی۔ آخر کار مئی ۱۹۲۶ء میں علی زئی کرم ایجنسی میں بطور سب اسسٹنٹ سرجن تعیناتی ہوئی۔ دو ماہ بعد سنٹرل جیل ہسپتال پشاور میں تبدیلی ہو گئی۔ ایک سال وہاں رہا۔ مئی ۱۹۲۸ء میں اسسٹنٹ سرجن بن کر جنرل ڈیوٹی پہ لیجر فرن ہسپتال پشاور آ گیا۔ ایک ماہ بعد سول ہسپتال ہنگو ضلع کوہاٹ کو تبدیل ہو گیا مئی ۱۹۲۹ء میں سول ہسپتال مانسہرہ ضلع ہزارہ کا چارج لیا۔ جنوری ۱۹۳۰ء میں پھر سول ہسپتال ہنگو کا چارج لے لیا۔ وہاں سے ۱۶ر مئی ۱۹۳۰ء کو بنوں تبدیل ہو کر پولیس ہسپتال کا چارج لیا۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو سول ہسپتال صوابی ضلع مردان تعیناتی ہو گئی۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کو سول ہسپتال ہری پور کا چارج لیا۔ نومبر ۱۹۳۲ء میں سول ہسپتال بنوں کا چارج لیا۔ اور ۱۳ر اپریل ۱۹۳۳ء کو اس کے ساتھ سول سرجنی کا بھی چارج لے لیا۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور کا رجسٹرار بنا۔ ۳۰ر مئی ۱۹۴۱ء کو مردان کا سول سرجن جہاں تقریباً چھ ماہ رہا۔ اور پھر واپس رجسٹرار لیڈی ریڈنگ ہسپتال ہوا۔ ۲۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو ایجنسی سرجن کرم، پارا چنار ہو کر وہاں چلا گیا۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۴۶ء ایجنسی سرجن لنڈی کوتل خیبر ایجنسی ہوا۔ یکم جولائی ۱۹۴۷ء میں سول سرجن مردان ہوا۔ اپریل ۱۹۵۲ء میں سول سرجن ہزارہ ہوا۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سرحد ہوا۔ مئی ۱۹۵۵ء ڈائرکٹر ہیلتھ سروسز (ناظم صحت) سرحد اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات ہوا۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں وحدت مغربی پاکستان (جب صوبہ جات مغربی پاکستان کو یکجا کر دیا گیا) کے بن جانے پر میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات شمالی حلقہ (جس میں سابق صوبہ سرحد کے علاوہ کیمبل پور۔ میانوالی۔ سرگودھا و گجرات اور جہلم

بھی شامل تھے) مقرر ہوا یکم نومبر ۱۹۵۶ء میں پنشن پر آیا۔ اور ایبٹ آباد اپنے مکان دار الشفاء میں مقیم ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۷ء میں وقت گزاری کے لئے گھر پر ہی شغل پریکٹس شروع کیا۔ مگر زیادہ وقت مطالعہ ہی جو میرا مرغوب مشغلہ ہے گزرنے لگا۔

رَو میں ہے رخشِ عمر، دیکھئے کہاں تھمے   نے ہاتھ باگ پہ ہے نہ پا ہے رکاب میں

زمانہ ملازمت کے تفریحی مشغلے

۱۔ مختلف ممالک کے اور پرانے تاریخی کھنڈروں سے برآمد شدہ سکوں کی تلاش کر کے جمع کرنا۔ اس طرح سے ایران۔ افغانستان ہند و پاکستان کے بہت سے سکے جمع ہو گئے۔ پرانے کھنڈرات مثلاً عکرہ (بنوں) سے کافی سکے ملے۔ ۲۔ جلد سازی، کتابوں کا شغل تو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کی جلد سازی خود کرنے کا بھی شوق رہا۔ والد مرحوم کے زمانہ سے گھر میں ایک شکنجہ تھا پہلے پہل اسی کو استعمال کرتا رہا۔ بنوں کی تعیناتی میں خاقمیر خان بنوچی کی شاگردی کی گئی۔ وہ بہترین جلد ساز تھے۔ انہوں نے مجھے باقاعدہ نوٹ لکھائے۔ اپنے سامنے کام کرایا۔ تین چار بڑے بڑے شکنجے اور ایک دو چھرے کتابوں کی صفائی کے لئے بنوا کر دئے۔ ۳۔ بہت مدت ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شغل بھی رہا۔ ۴۔ فوٹو گرافی میری تعیناتی جب ۱۹۲۶ء میں کرم ایجنسی میں ہوئی تو ڈاکٹر عطا محمد خان ساکن جالندھر نے اس طرف رغبت دلائی۔ اور ایک کیمرہ جو اس کے پاس زائد تھا۔ مجھے دیا۔ اچھا کیمرہ تھا۔ میں نے پچاس روپیہ میں اس سے خرید لیا۔

چند قابلِ ذکر افسران جن کیساتھ دورانِ ملازمت کام کرنے کا موقع ملا

۱۔ کپتان اے۔ ڈی۔ ہاروے۔ یہ ایک ہندوستانی عیسائی، سیاہ فام، پست قد فوجی ڈاکٹر (کپتان) تھا۔ بیس سال تک جزائر انڈمان (کالا پانی) میں قیدیوں کا سپرنٹنڈنٹ رہا۔ جب ۱۹۲۶ء میں میری تعیناتی سنٹرل جیل ہسپتال پشاور میں ہوئی تو وہ سپرنٹنڈنٹ جیل تھا۔ اس کے چارج لینے کا واقعہ قابلِ ذکر ہے وہ جب پہلے دن چارج لینے کے لئے دفتر میں آیا تو کرنل برائرلے (BRIERLEY) جو صوبہ سرحد کا چیف میڈیکل افسر و انسپکٹر جیل خانہ جات سرحد تھا۔ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان دنوں جیل کا چارج بھی اس نے اپنے پاس رکھا ہوا تھا جونہی ہاروے نے دفتر کے اندر قدم رکھا۔ اور گڈ مارننگ (سلام) کہا۔ تو کرنل برائرلے، جو خود مضبوط ڈیل ڈول، طویل قد کا آدمی تھا، نے اس پر نگاہ نفرت انگیز ڈالی۔ اور تکبرانہ انداز میں پوچھا "تم کون ہو؟"

ہاروے بڑا زیرک اور جہاندیدہ انسان تھا۔ تاڑ گیا کہ اس کے قد و قامت و رنگ کی وجہ سے یہ لہجہ استعمال ہوا ہے فوراً جواب [illegible]

حکومت ہند نے مجھے اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ بنا کر بھیجا ہے۔" جواب ترکی بہ ترکی اور تلخ تھا اور براٹرلے حکمران قوم کا متکبر فرد اپنے محکمہ کا افسر اعلیٰ۔ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ غصہ کی حالت میں اٹھا اور سیدھا چیف کمشنر سرحد کے پاس پہنچا۔ اور کہا۔ کہ "یہ پستہ قد، بدشکل، بے رعب آدمی سرحد کے اس بڑے جیل کا جس میں پٹھان قیدی ہوتے ہیں انتظام ہرگز نہیں چلا سکتا"

چیف کمشنر نے فوراً دہلی تار دے کر کسی اور کو بطور سپرنٹنڈنٹ جیل بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ حکومت ہند کی نظر میں اس کی انڈمان جیل کی کارکردگی تھی جہاں وہ بہت کامیاب رہا تھا۔ جواب آیا۔ "ہاروے کو تین ماہ کام کرنے کا موقعہ دیا جائے۔ اگر ناکام ہوا تو اس کو بدل دیا جائے گا۔" کرنل براٹرلے کو بادل نخواستہ چارج دینا پڑا۔ ہاروے نے چارج لینے کے بعد کرنل براٹرلے کے زمانہ کی بے ضابطگیوں پر گرفت کرنی شروع کر دی۔ آخر کرنل براٹرلے کو اپنے اس ماتحت کے آگے سر خم کرنے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی۔ اس طرح سے ہاروے تقریباً پندرہ سال اس جیل کا کامیاب سپرنٹنڈنٹ رہا۔ کپتان ہاروے انڈین میڈیکل ڈیپارٹمنٹ کا ممبر تھا۔ بے حد نیک اور بہترین تحریر کا مالک تھا۔ تھوڑے عرصہ میں جیل کا نظم و نسق اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا۔ قیدیوں اور افسران جیل کو اپنے آہنی پنجہ میں جکڑ کے رکھ دیا۔ ماتحتوں سے کام لینے میں سخت گیر اور ترش رو تھا۔ لیکن نقصان کسی کو بھی نہ پہنچایا۔

میں جب دو سال پورے کر کے تبدیل ہونے لگا تو مجھے کہنے لگا: "میں تمہارے کام سے بہت خوش تھا لیکن اس کا اظہار پہلے نہ کرنا چاہتا تھا کہ تم بے پرواہ نہ ہو جاؤ۔" مجھے بہت اچھی رپورٹ دی اور کہا "ماتحتوں کے ساتھ آزاد نہ ہونا۔ بلکہ ترش روئی سے کام لینا تاکہ وہ دلیر نہ ہو جائیں۔"

سنٹرل جیل پشاور کے دو رفیق ڈاکٹر۔ الف جی کنڈریک چند واسن ساکن میانوالی۔ خوش شکل اور بلند قامت انسان تھا۔ آخر میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال پشاور میں ایکس رے کا انچارج تھا۔ کہ ایک انتظامی معاملہ میں موقوف ہوا۔ ب۔ ڈاکٹر امام علی خان مرحوم۔ فرشتہ سیرت، پابند نماز، اور ہمدرد خلائق ڈاکٹر تھے غالباً سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ پنشن لے کر پشاور شہر میں پریکٹس شروع کی۔ وہیں فوت ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۳۔ کرنل سی۔ آئی۔ براٹرلے (C.I. BRIERLEY) صوبہ سرحد کے شفاخانہ جات کا افسر اعلیٰ اور جیل خانہ جات کا انسپکٹر جنرل تھا۔ وجیہہ اور بڑے قد و قامت کا آدمی تھا۔ لوگوں سے خوب میل ملاپ رکھتا تھا۔ ان کے سب کام۔ جائز و ناجائز کر دیا کرتا تھا۔ اور ان سے بھی خوب کام لیتا تھا اسی اثر و رسوخ کی بنا پر اس نے لاکھوں روپے لوگوں سے جمع کر کے اپنی ذاتی ہمت و کوشش سے لیڈی ریڈنگ جیسی عظیم الشان مرکزی ہسپتال پشاور میں بنائی۔ اس کی بنیادی کمزوری دولت کی حرص

تھی۔ مختلف ذرائع و حیل بے اندازہ دولت پیدا کی۔ اس کی دولت سے اس کے بھائی نے کینیا (افریقہ) میں بہت بڑی جائداد بنائی اور خود وہی دبا بیٹھا۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی اس کے سامنے مرگیا۔ انجام کار خود بھی حسرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔

۴۔ میجر رام موہن (مدراسی) یہ بنوں فوجی ہسپتال میں فزیشن اور درجہ کے لحاظ سے میجر تھا۔ اس کو ضلع بنوں کا سول سرجن بھی عارضی طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ بڑا وہمی۔ بدگن اور ناشائستہ چال چلن کا آدمی تھا یہ اپنے اسسٹنٹ سرجن، انچارج سول ہسپتال سے ہروقت بر سر پیکار رہتا تھا۔ مختلف اور ناجائز طریقوں سے اس کو تنگ کیا کرتا۔ میری تعیناتی ۱۹۳۲ء میں بنوں ہوئی۔ مجھ سے پہلے ایک قابل اور ہوشیار اسسٹنٹ سرجن سردار ی لال چوپڑا کو بدنام کر کے تبدیل کرا چکا تھا۔ میں فطرتاً محتاط اور تابعدار قسم کا آدمی ہوں۔ مگر اس کی بے جا دخل اندازیوں سے جلدی ہی عاجز آ گیا میں صبح سویرے ہسپتال میں کام پر لگ جاتا اور تمام کام ایک ڈیڑھ بجے عموماً ختم کر دیتا۔ مگر پھر بھی سول سرجن جو ہمیشہ بارہ ایک بجے آنے کا عادی تھا اس کے آنے کا انتظار کرتا۔ وہ بے کار گفتگو، بیماروں پر بے مقصد چکر میں وقت ضائع کر دیتا اسی طرح وہ شام یا رات کو بھی آجاتا اور مجھے گھر سے بلا لیتا۔ پانچ ماہ اسی طرح تلخی سے گزرے۔ بنوں میں کثرت کار بھی تھی۔ اور صرف ایک اور ڈاکٹر ہوتا تھا۔ سب ذمہ داری میرے سر پر تھی لہذا آرام کا وقت بہت کم ملتا۔ سول سرجن کے بے وقت آنے سے بے آرامی بڑھتی رہی۔ آخر کار میرا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہوگیا۔ ایک دن (یہ اس کی سول سرجنی کا آخری دن ثابت ہوا) صبح سویرے سے ڈیڑھ بجے بعد دوپہر کام کر کے تھکان سے مجبور ہو کر گھر آیا۔ کھانے کی رغبت بوجہ تھکان نہ ہوئی۔ چارپائی پر دراز ہوگیا۔ کہ ذرا سستا لوں۔ اتنے میں اردلی آ گیا کہ سول سرجن بلاتا ہے۔ میں نے کہا "میں ابھی ہسپتال سے تھک کر آیا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد آتا ہوں۔" اردلی پھر آیا کہ وہ جلدی بلاتا ہے: تنگ آمد بہ جنگ آمد میں نے اردلی کو غصہ سے کہا۔ "جاؤ۔ اس کو کہہ دو۔ میں نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔ آرام کر رہا ہوں۔ آرام کرنے کے بعد غسل کروں گا۔ نماز پڑھوں گا۔ کھانا کھاؤں گا۔ تب آؤں گا۔ میرا کم از کم ایک گھنٹہ اس میں لگ جائے گا۔"

میں ایک گھنٹہ کے بعد ہسپتال گیا اور اپنی نشست (برآمدہ آپریشن روم) جو سول سرجن کے دفتر کے عین سامنے تھی، بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع بھی اس کو نہ دی۔ وہ دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

اتنے میں تار والا آیا اور اندر جا کر اس کو تار دے دیا۔ جب وہ تار پڑھ چکا تو اپنے دفتر کے دروازہ سے مجھے اشارہ کر کے اندر بلایا۔ جب میں گیا تو تار مجھے دے دیا۔ تار [illegible] (ناظم) صاحب [illegible]

کی طرف سے آیا تھا اس میں لکھا تھا "چارج فوراً شیر بہادر کو دے کر اپنی ملٹری ڈیوٹی پر چلے جاؤ"۔ اس کا چہرہ متفکر اور رنگ فق تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں بڑی لجاجت سے کہا۔ کہ "اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو چارج کل لے لینا" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خدا نے میری مشکلات کو حل فرما دیا اور اس کے بعد مجھے پانچ سال تک خود مختارانہ طور پر کام کرنے کا موقع دے دیا۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

۵۔ کرنل ایل۔ کے۔ لیجر (K.L.LEDGER) یہ سول سرجن پشاور تھا۔ میں اس کے ماتحت لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں چار سال رجسٹرار رہا۔ یہ بڑا کارکن تھا۔ محنت اور شوق سے ڈاکٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ مسکراہٹ ہمیشہ اس کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی کام میں محنت، حوصلہ اور استقلال اس کا خاصہ تھا۔ ایک دفعہ گلہڑ کا (GOITRE) آپریشن کر رہا تھا اور میں اس کی مدد کر رہا تھا یہ آپریشن عموماً مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن یہ آپریشن کافی مشکل قسم کا تھا۔ گلہڑ بہت بڑا تھا۔ جب وقت زیادہ لگ گیا تو وہ میری تھکان اور بے صبری کو بھانپ گیا۔ اس پر اس نے گنگنانا شروع کیا۔ "صبر بڑی ہی نیکی ہے لیکن بہت کم لوگ اس سے بہرہ ور ہوتے ہیں" یہ گنگناتا جاتا تھا اور آپریشن کرتا جاتا تھا۔ آخرکار آپریشن کامیاب رہا۔ وقت زیادہ لگ گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ماتحتوں پر کامل اعتماد رکھتا تھا۔ دفتر کے کاغذات پر بغیر پڑھے دستخط کر دیتا تھا جس سے ماتحت کلرکان ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔

۶۔ کرنل منوّر خان آفریدی (مشہور بہ کرنل آفریدی) صوبہ سرحد میں محکمہ صحت کے نامور ڈائریکٹر تھے وسیع النظر (ہر میدان میں) خوش خلق اور قابل قدر صفات کے مالک تھے۔ مشہورِ عالم ملیریالوجسٹ (MALARIOLOGIST) یعنی ماہر ملیریا بخار تھے۔ آپ بیری باڑہ (کوہاٹ) کے معزز آفریدی خاندان کے فرد تھے۔ فوجی ملازمت کے دوران بطور ماہر ملیریا کام کیا۔ اور بہت نام پایا۔ پاکستان بننے کے بعد کچھ مدت کراچی میں رہے اور پاکستان کا پہلا میڈیکل ریسرچ لیبارٹریز کا قابلِ قدر ادارہ قائم کیا۔ کچھ مدت مشرقی پاکستان میں ناظم صحت رہے۔ ۱۹۵۲ء میں صوبہ سرحد کے ناظم صحت اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات مقرر ہوئے۔ صوبہ سرحد میں ملیریا کی بیماری کا قلع قمع ان کے وقت میں ہوا۔ اپنے عالمی اثر و رسوخ اور شہرت سے ملیریا کش دوائی (D.D.T) یورپ کے ممالک سے مفت حاصل کی اور سارے صوبے میں شہروں اور دیہاتوں میں اس کا چھڑکاؤ (SPRAY) کروایا۔ میں ان ایام میں ہزارہ کا سول سرجن تھا۔ وہ دورے پر آئے اور دور دراز مواضعات میں خود جا کر عمل چھڑکاؤ دیکھا اور

مناسب ہدایات بھی دیں۔ ضلع ہزارہ میں ملیریا کثرت سے اور وبائی قسم کا ہوتا تھا پہاڑی علاقوں میں خطرناک قسم۔ دماغی ملیریا (CEREBRALMALARIA) ہوتا تھا۔ اس موثر دوائی کے چھڑکاؤ سے ملیریا کا نام و نشان اس ضلع سے ختم ہو گیا۔ اب تیرہ چودہ سال بعد خال خال ہی اس بیماری کے مریض نظر آتے ہیں۔ بعد میں آپ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ یونیورسٹی میں اُن کی ایک مفید قوم یادگار خیبر میڈیکل کالج ہے۔ ان کی ہدایت اور رہنمائی میں اس کی تعمیر ہوئی۔ اور اس کا افتتاح گورنر جنرل غلام محمد سے کرایا۔ انتظامی معاملات میں ان کی رائے صائب اور فیصلے مدبرانہ ہوتے تھے۔ تحریر خوشخط، مختصر مگر جامع ہوتی تھی انگریزی زبان پر کامل عبور تھا۔ تحریر و تقریر دونوں لحاظ سے۔ وفات آغاز ۱۹۶۹ء میں بعارضہ قلب کراچی میں ہوئی۔ آبائی گاؤں میں مدفون ہوئے خدا بخشے۔

۷۔ خان بہادر محمد حسن خان صاحب مرحوم۔ معاونِ ذاتی۔ ناظم صحت و انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سرحد میں جب ۱۹۲۶ء میں محکمہ صحت سرحد میں ملازم ہوا تو آپ اس وقت ناظم صحت و انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سرحد کے معاونِ ذاتی کے طور پر کام کر رہے تھے۔ آپ نے سرود محکمہ جات کے انتظام کی باگ ڈور بڑی قابلیت فراست اور ہمت سے اپنی انجام ملازمت تک سنبھال رکھی۔ آپ وقت کے پابند اور کام بڑی عرق ریزی سے کرتے تھے۔ ان کا سلوک ہر ایک سے بزرگانہ، مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا وہ زمانہ ہندوؤں اور سکھوں سے مقابلہ کا تھا۔ مسلمان ان سے ہر میدان میں بہت پیچھے تھے اور ان کے حقوق کی پامالی کا خطرہ دائمی تھا۔ خان بہادر صاحب مرحوم نے مسلمانوں کے حقوق کی بڑی پامردی اور مضبوطی سے حفاظت کی۔ اور حتی المقدور ہر مسلمان کی مدد کی۔ آپ بڑے مہمان نواز تھے۔ ان کا گھر ڈاکٹروں اور اپنے رفیقوں کے لئے مہمان خانہ تھا۔ مختصراً آپ مسلمانوں کے محسن تھے۔ آپ سیاسی طور پر پختہ مسلم لیگی تھے۔ شروع تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جب قائد اعظم پشاور تشریف لائے تو آپ ہی کے بنگلہ پر قیام فرمایا۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۸۸۹ء، تاریخ پنشن اگست ۱۹۲۵ء اور وفات جولائی ۱۹۶۵ء ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ عنائت فرمائے۔

ایک رفیق۔ خان محمد مرحوم۔ اس شریف اور قابل قدر رفیق کار کا ذکر بھی ضروری ہے ہری پور شہر کے رہنے والے تھے اس خوش اخلاق انسان نے اپنی زندگی کا آغاز کمپونڈری سے کیا۔ لیکن محنت، حسن کارکردگی اور لیاقت سے خاص درجہ تک پہنچ گیا۔ کم و بیش بیس بائیس سال لیڈی ریڈنگ ہسپتال بہ حیثیت آپریشن تھیٹر اسسٹنٹ گذارے۔ اپنے کام میں مہارت، قابلیت اور محنت سے سب کو متاثر کیا۔ وہ اس ادارہ کا روح رواں تھا۔ سب ڈاکٹروں کا مخلص معاون اور ہمنا تھا سب اس کی عزت کرتے تھے کثرت کار اور محنت شاقہ سے

آخر کار عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ ان کا سال پنشن ۱۹۵۳ء تھا۔ آپ کا خلف الرشید ڈاکٹر نذیر الحق ۱۹۶۹ء میں پشاور میونسپلٹی کا ہیلتھ افسر ہے۔

میری شادیاں اور اولاد

میں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی ۱۹۲۶ء میں ہدایت اللہ خان پٹھان بنگزئی ساکن کوٹ حلیم خان قصور کی بڑی بیٹی سے ہوئی۔ یہ شادی مولانا محمد عبداللہ صاحب قصوری کے ایما پر ہوئی۔ میں ان کا عقیدت مند اور وہ خان صاحب ہدایت اللہ خان کے دوست اور ہم خیال تھے۔ میرے خسر سادہ طبیعت، کھدر پوش رسم و رواج کے سخت مخالف اور تحریک آزادی کے دلیر سپاہی تھے۔ قصور میں ہر تحریک آزادی کی جماعت کے صف اول میں رہا کرتے تھے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے معتمد ساتھی اور رفیق کار تھے۔ اور مولانا عبدالقادر مرحوم ایک مشہور وکیل، عالم متبحر اور آزادی کی تحریک کے صف اول کے سردار تھے۔ میری برات جو بہت مختصر تھی زیر سرکردگی مولانا عبدالقادر قصوری کوٹ حلیم خان جو شہر قصور سے ایک میل ہے گئی مولانا عبداللہ قصوری بھی ہمراہ تھے۔ رسم نکاح بڑی سادہ اور پُر وقار تھی۔ قصور کے ایک محترم بزرگ پٹھان حافظ دولت خان صاحب نے نکاح پڑھا۔

ہدایت اللہ خان کے دو بیٹے ہیں علی انور خان و علی اکبر خان اور وہ دونوں والد کی جائیداد اراضی واقع علی گڑھ تحصیل دیپالپور ضلع ساہیوال کی ترقی میں منہمک ہیں۔ اور دونوں نے آبائی جائے رہائش کوٹ حلیم خان، قصور ترک کر دی ہے۔ اور لاہور میں قیام پذیر ہیں۔

مولانا عبدالقادر قصوریؒ۔ ایک عالم باعمل، مجاہد حریت اور قابل عزت انسان تھے۔ مولانا عبدالقادر مرحوم کے پورے خاندان نے اسلام اور ملت کے لئے جس ایثار و جانبازی کے ساتھ کام کیا اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ آپ قصور میں وکالت کرتے تھے اور بہت کامیاب اور چوٹی کے وکیل تھے۔ ان کی کوٹھی تمام تحریکات دینی و وطنی کا مرکز تھی۔

مولانا غلام رسول صاحب مہر اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: "مولانا عبدالقادر مرحوم و مغفور تین بھائی تھے۔ ان میں بڑے مولانا عبدالقادر مرحوم تھے۔ منجھلے بھائی مولانا عبدالحق جو گوجرانوالہ میں وکیل تھے اور چھوٹے مولانا عبداللہ جو سکول ٹیچر رہے۔ پھر انہیں جمعیۃ دعوت و تبلیغ کا صدر بنا دیا گیا۔ مولانا عبداللہ عالم دین تھے اسی طرح مولانا عبدالقادر بھی۔ بڑے مولانا میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بے حد دور اندیش تھے اور ایسے قانون دان جو ایک ہی نظر میں باریکیوں تک پہنچ جاتے تھے۔ شاید آپ نے کبھی سنا ہو کہ مولانا کا وطن دلاور ضلع گوجرانوالہ یا ضلع سیالکوٹ تھا۔ وہ قصور میں اس لئے مقیم ہوئے کہ وکالت پاس کرتے ہی ایک موکل انہیں وکیل بنا کر تحصیلدار قصور کے پاس پیشی میں لے گیا۔ تحصیلدار نے مولانا کی تقریر سنی تو اس حد درجہ متاثر ہوا کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے بعد اصرار کیا کہ آپ قصور میں پریکٹس کریں خدا برکت دے گا۔ مولانا تیار ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شہرت دور دور پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ رہتے قصور میں تھے اور مقدمات کی پیروی کے لئے دوسرے شہروں میں جاتے تھے۔ قصور میں عالی شان اور وسیع حویلی بنائی جو آپ نے دیکھی ہوگی۔ (میں نے بہت دفعہ اس حویلی میں قیام کیا۔ ش ب) اور زمینیں بھی خریدی تھیں۔ پھر محمد علی مرحوم کو ولایت بھیجا۔ بھتیجے اور داماد جنید کو ولایت بھیجا۔ سب سے آخر میں عزیزی محمود علی قصوری کو ولایت بھیجا۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں کہ "مولانا کے والد ماجد کا ایک قصہ بڑا عجیب ہے۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالقادر مرحوم سے ملنے کے لئے قصور آئے صبح کو مولانا مقدمات کی تیاری کر رہے تھے۔ والد ماجد پاس ایک تخت پر بیٹھے قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ مولانا نے پنسل بنانے کے لئے چاقو اٹھایا۔ آپ نے شاید سنا یا دیکھا ہوگا کہ اس صدی کے اوائل میں جرمنی کا راجرس (RODGERS) چاقو بہت مشہور تھا۔ والد ماجد نے دیکھا تو سخت ناراض ہوئے فرمایا اگر تم جرمنی یا دوسرے بیرونی ممالک کی چیزیں خریدو گے تو ہمارے وہ لوہار کیا کریں گے جو چار پیسے میں چاقو بنا کر فروخت کرتے ہیں (راجرس چاقو کی قیمت اس وقت غالباً چھ آنہ تھی) چنانچہ مولانا نے پھر حتی الامکان کوئی ایسی بدلیشی چیز نہ خریدی جس کا بدل انہیں وطن میں مل سکتی تھی۔ دولت و ثروت میں اونچا درجہ حاصل کر لینے کے باوصف لباس، طریق، بود و ماند اور زندگی کی کسی چیز میں فرق نہ آیا۔ ان کا لباس و طرز زندگی واقعی صحابہ کرام کی زندگی کا عکس تھا۔"

پھر مولانا مہر تحریر فرماتے ہیں "میں نے انہیں پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۲۱ء میں بریڈ لا ہال لاہور کے اجلاس میں دیکھا تھا جس کی صدارت مولانا ابو الکلام آزادؒ نے فرمائی تھی (یہ اجلاس جمعیۃ العلماء ہند کا تھا۔ ش ب) دیر تک یہ احساس رہا کہ یہ کون شخص ہے جو عین مولانا کے پاس آ کر بیٹھ گیا ہے۔ بڑے بلند پایہ لوگ تھے اب ایسے خاندان کہاں ملتے ہیں۔"

میرے ایک خط جس میں میں نے مولانا مہر کی توجہ "تاریخ احرار" مصنفہ چودھری افضل حق مرحوم میں شائع شدہ رائے، دربارۂ مولانا عبدالقادر قصوریؒ کی طرف دلائی تو انہوں نے تحریر فرمایا۔

"چودھری افضل حق بڑے مخلص تھے لیکن مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کے پایہ کے افراد ہماری قومی تحریک میں بہت کم آئے۔ میں نے تحریک خلافت کے دور میں انہیں دیکھا ہے۔ وہ صدر مجلس خلافت

پنجاب تھے۔ مجلس کے دفتر میں ہر روز بیس تیس بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمانوں کے لئے باقاعدہ کھانا پکتا تھا مگر مولانا عبدالقادر مرحوم نے کبھی ایک نوالہ بھی اس کھانے میں سے نہ کھایا۔ جب دو چار روز کے بعد قصور سے آتے تو اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبداللہ کے ہاں ٹھہرتے۔ صبح ہی دفتر آجاتے اور کہتے کہ میں بیمار ہوں، پرہیزی ناشتہ کرتا ہوں۔ انگور یا موسم کا کوئی خوشگوار پھل منگا لیتے اور ایک پیالی دودھ کی پی لیتے۔ اس کے لئے اپنی جیب سے پیسے دیتے۔ خط لکھنا ہوتا تو کاغذ اور لفافہ اپنا استعمال کرتے جب تک ان کے پاس پیسے رہے دورے پر نکلتے تو نہ صرف اپنا بلکہ رفیقوں کا کرایہ بھی خود دیتے یعنی مصارف سفر ان کے صاحب زادے مولانا محمد علی مرحوم غیر معمولی قابلیت کے فرد تھے۔ مگر سرکاری ملازمت نہ کی۔ پہلے کابل میں رہے۔ پھر نکلے تو مجاہدین میں کام کیا (اور مجاہدین کے مشیر رہے (حکومت سرحد آپ کے نام اور کام سے ہمیشہ زدہ رہی۔ ش ب) واپس آئے تو سیٹھ مہر بخش مرحوم کے ساتھ کاروبار شروع کیا۔ داعلی پیمانہ پر چمڑے کی تجارت تھی۔ ش ب) سیٹھ صاحب بڑے پیسے سالانہ قومی اور دینی کاموں پر صرف کرتے تھے۔ میرے علم کی حد تک وہ روپیہ مولانا محمد علی کی رائے کے مطابق صرف ہوتا تھا۔ ہمارے مولاناؒ (مراد ہے مولانا ابوالکلام آزادؒ۔ ش ب) ۱۹۱۹ء میں نظربندی سے رہا ہوئے تھے۔ تو آپ کو یاد ہوگا کہ اسلامی تنظیم کی ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں مولاناؒ کو امام بنا کر کام کرنا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں ایک لاکھ روپے کی رقم مولانا محمد علی ہی نے فراہم کی تھی۔ لیکن ہمارے مولانا جلد دوبارہ گرفتار ہو گئے۔ اور وہ تحریک بھی رہ گئی۔ روپیہ بھی گیا۔ کچھ بھی نہ بنا۔ اس سے پیشتر ۱۹۱۴ء میں مولانا عبدالقادر مرحوم کے دوسرے صاحب زادے مولانا محی الدین احمد نے کلکتہ سے ہمارے مولاناؒ کے زیر نگرانی روزنامہ "اقدام" جاری کیا تھا اس پر بھی خاصا روپیہ مولانا قصوری کا خرچ ہوا۔ "اقدام" بہت جلد ہندوستان کا ممتاز اردو روزنامہ بن گیا۔ لیکن حکومت نے مختلف صوبوں میں اس کا داخلہ بند کر دیا خصوصاً پنجاب میں داخلہ بند ہونے کے باعث "اقدام" پر شدید ضرب لگی کیونکہ بیشتر خریدار یہیں کے تھے۔ بہر حال مولانا عبدالقادرؒ ایک نادر الوجود بزرگ تھے۔ قومی تحریکوں سے پیشتر بھی وہ سالہا سال تک "مجاہدین" کی تحریک سے وابستہ رہے۔ اور برابر روپے وہاں بھجواتے رہے۔"

مولانا مہر اپنے ایک خط میں مولانا عبداللہ قصوری کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"مولانا عبداللہ مرحوم کا مکان (اندرون شیرانوالہ دروازہ) مجھے خوب یاد ہے۔ بارہا وہاں گیا وہ بھی مولانا عبدالقادر مرحوم کی طرح بے حد مہربانی فرماتے تھے۔ تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے مولانا

محمد علی مرحوم قصوری نے کاروباری عروج کے دوران میں ایک رقم فراہم کی تھی اس انجمن کے صدر مولانا عبداللہؒ اور سکرٹری مولانا محی الدین احمد تھے۔ پہلے جنوبی ہند میں کام شروع کیا پھر ۱۹۲۱ء میں ملیبار کے ماپلوں کا مصیبت خیز معاملہ پیش آیا۔ تو مولانا محی الدین اور ان کے رفیقوں نے انتہائی تن دہی سے ان مصیبت زدہ بیکسوں کی گراں بہا امداد فرمائی۔ جب انجمن کے لئے مستقل مالی امدادی کی کوئی صورت نہ رہی تو اس کا نظام بھی معطل ہو گیا۔

مولانا عبدالقادر مرحوم کے پورے خاندان سے میرے تعلقات بہت ہی قریبی تھے۔ ان تمام افراد نے جس ایثار و جانبازی کے ساتھ اسلام اور ملت کے لئے کام کیا اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ پھر وہ عقیدہ کے پختہ اور مقاصد و عزائم کے پہاڑ تھے۔ آج ویسی شخصیتیں کہاں نظر آتی ہیں۔ جو کچھ کیا کمال بے نفسی اور بے غرضی سے کیا۔"

یتیم خانہ بنا کردہ جمعیت دعوت و تبلیغ زیر سر کردگی مولانا عبداللہؒ و مولانا محی الدین کالی کٹ۔ کیرالہ میں آج تک قائم ہے۔ نذیر احمد کاشمیری پر اس کے ملاحظہ سے جو تاثر ہوا اس کا ایک حصہ جس کا تعلق بانیان یتیم خانہ سے ہے۔ صدق جدید لکھنؤ مورخہ ۱۶ ر فروری ۱۹۶۲ء سے نقل کرتا ہوں۔

"...... یتیم خانے میں داخل ہونے کے بعد مجھے اس گھٹن کا کوئی بھی احساس نہ رہا جو یتیم خانے کے لفظ سے مجھ پر پہلے سے مستولی تھی۔ اس کے برخلاف ایک انشراح طبیعت میں پیدا ہو رہا تھا۔ لہٰذا دو گھنٹے کے قیام میں میں نے اس کے کونے کونے کو دیکھ ڈالا عجب نہیں کہ اس انشراح میں بانی یتیم خانہ مولوی عبدالقادر صاحب ایڈووکیٹ ساکن قصور مغربی پنجاب کے ان دو مبلغ صاحب زادوں مولوی محمد علی قصوری ایم اے کیمرج اور مولوی محی الدین بی اے آکسفورڈ کے حسن نیت کا اثر بھی کام کر رہا ہو"

مولانا عبدالقادر کی سیاسی بصیرت کا تجزیہ ڈاکٹر سید عبداللہ شاہ نے خوب کیا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ شاہ صاحب اپنے مضمون "کچھ یادیں اور کچھ باتیں" "نوائے وقت مورخہ ۱۰ ر مارچ ۱۹۶۹ء" میں مولانا عبدالقادر قصوری کے متعلق احرار تحریک کے ذکر کے تحت تحریر فرماتے ہیں:-

"...... مولانا عبدالقادر پنجاب کے ان بزرگوں میں تھے جن کی خاموش قیادت نے بیس پچیس برس تک برصغیر کی سیاست کو متاثر کیا۔ لیکن اہل پنجاب کی حاتمی بقول ے

عدیل ہمت عرفی است فطرت ساقی ۔۔۔ کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

کا یہ عالم ہے کہ وہ انہیں تو یاد رکھے ہوئے ہیں جو عبدالقادر کے فیض سے نامور ہوئے مگر خود عبدالقادر سے بے خبر ہیں ...... آگے چل کر لکھتے ہیں [illegible] ہمارے مخدوم اور بزرگ قصوری [illegible]

میں رہے انہوں نے مجلس خلافت پنجاب کو زندہ رکھا۔ اور اپنے تدبر سے اس ذہن کی تشفی کرتے رہے جو انگریز دشمنی پر قائم رہ کر کانگرس سے غیر مطمئن تو تھا اس سے الگ نہ ہو سکتا تھا۔ قصوری کی قابلیت اور خلوص کے زیر اثر پنجاب کی خلافت کمیٹی کانگرس سے منقطع نہ ہوئی۔ لیکن اس کمیٹی کے اکثر اراکین ملت اسلامیہ سے کٹ کر بالکل منقطع ہو کر کسی تحریک کو آگے چلانے کے حق میں نہ تھے۔ اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ کانگرس بہرحال ایک ہندو جماعت ہے اور مسلمانوں کا کوئی گروہ جب بھی کوئی سیاسی قدم اٹھائے گا ملت کے مفاد اور اسلام کے مفاد سے پیوستہ ہو کر ہی آگے بڑھ سکے گا؛

مولانا عبدالقادر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمود علی قصوری لاہور کے نامور بیرسٹر ہیں۔ ملک میں ان کے نام لیاقت قانونی اور سیاست کا ڈنکہ بج رہا ہے۔ میری پہلی شادی کے وقت ایک ہونہار بچہ تھے اور آثار سعادت ان کی پیشانی سے ہویدا تھے۔

میرا ارادہ تھا کہ اس خاندان کے حالات اور بھی تفصیل سے لکھوں۔ مگر افسوس میری معلومات کا سرمایہ ختم ہو گیا اور دیگر ذرائع سے ابھی تک کچھ زائد معلوم نہ ہو سکا ورنہ ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کے بمصداق جی بھر کر لکھتا

دوسری شادی

میری پہلی بیوی کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ لہٰذا میں نے دوسری شادی جنوری ۱۹۳۲ء میں احمد خان پنی (کمال خانی) کی دختر نیک اختر سے کی جو میرے ہم قوم اور میرے گاؤں کے معزز فرد تھے۔ میرے خسر عہد جوانی میں بڑے شہ زور پہلوان تھے۔ بہت تجربہ کار اور دانا انسان تھے۔ ان کی وفات ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ میری دوسری شادی سے خدا نے مجھے چھ بچے دئے تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب سے بڑا بیٹا محمد اقبال خان ہے اور محمد جمیل خان اس سے چھوٹا۔ محمد اقبال خان کو میں نے ڈاکٹری کی تعلیم دلوائی۔ اور وہ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے انگلینڈ میں ملازمت کر رہا ہے۔ میرے دوسرے بیٹے محمد جمیل خان نے سول انجنیری ۱۹۶۱ء میں پاس کی۔ اور آخری امتحان میں صوبہ بھر میں اول آیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اب وہ واپڈا میں ملازم ہے اور لاہور میں ایگزیکٹو انجنیر ہے۔

جمیل خان سے چھوٹی میری بیٹی سعیدہ بانو ہے جو بہت ذہین ہے اس نے بی ایس سی کا امتحان پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء اول درجہ میں پاس کیا۔ اس کی شادی اگست ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر نیئر رمضان خان پسر ماسٹر غلام یحییٰ صاحب ساکن بفہ سے کر دی گئی۔ اس کے دو بچے سلمہ یاسمین اور منیر خان ہیں دونوں بہت ہونہار ہیں۔ اور ہماری آنکھوں کے تارے ہیں۔ دوسری بیٹی نسیم بانو ہے۔ اس نے ایم ایس سی کا

کا امتحان فرسٹ کلاس پشاور یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں پاس کیا۔ اس کی شادی حضرت سلطان خان انجنیر خلف ماسٹر یحییٰ صاحب ساکن بفہ سے اگست ۱۹۶۷ء میں کر دی گئی۔ ان کو خدا نے ایک بیٹا دیا ہے نام کریم خان رکھا گیا ہونہار اور پیارا بیٹا ہے۔ دوسرا بیٹا رحیم خان ہے جو نومبر ۱۹۶۹ء میں پیدا ہوا تیسری بیٹی طاہرہ بانو خیبر میڈیکل کالج پشاور میں زیر تعلیم ہے اور ۱۹۶۹ء میں آخری سال میں ہے۔ خدا اس کو کامیاب کرے۔ سب سے چھوٹا محمد رشید ہے جو بی ایس سی میں زیر تعلیم ہے۔ خدا اس کو کامیاب کرے۔ بہت ذہین ہے۔

زمانہ طالب علمی کے احباب و رفقاء

میرے احباب و رفقاء کی فہرست بہت ہی مختصر بلکہ اقل قلیل ہے اس کا باعث بچپن میں والدہ صاحبہ مرحومہ کا سخت احتساب اور پابندی ہے۔ کھیل کود کے لئے لڑکوں کی صحبت سے الگ رکھا۔ مجھے کبھی بھی عام لڑکوں میں شامل نہ ہونے دیا۔ گھر کی چار دیواری ہی تک میری تگ و دو محدود تھی۔ ہمارا آبائی گھر موضع پنیاں میں برلب سڑک جرنیلی (شاہراہ عام از حسن ابدال تا ایبٹ آباد ہے) میری تنہائی کی اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے والدہ مرحومہ نے گھر کے اندر سڑک کی دیوار کے ساتھ مٹی کی سیڑھیاں بنا دی تھیں جن پر چڑھ کر دیوار کے اوپر سے سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت، تانگوں اور گاڑیوں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھ سکتا تھا۔ ایک دفعہ والد صاحب مرحوم غازی سے چند دن کی رخصت پر گھر آئے تو میں نے موقع کو غنیمت جان کر ان سے شام کے کھانے کے بعد ہم عمر لڑکوں کے ساتھ سڑک پر کھیلنے کی اجازت مانگی۔ والدہ نے فوراً درخواست مسترد کر دی۔ لیکن والد صاحب مرحوم نے اجازت دی اور کہا۔ کہ بہت جلدی واپس آجانا۔ اور والدہ سے کہا کہ اتنی سختی نہیں کرنی چاہئے۔ بچے کو تھوڑی سی آزادی اور کھیل کود کے لئے جانے کی اجازت ہونی چاہئے۔ تاکہ ورزش سے اس کی صحت بھی اچھی ہو (میں بچپن سے نحیف الجثہ سا تھا) اور دماغی تر و تازگی بھی کھیل کود سے حاصل کرے۔ بہرحال مجھے آزادی ملی تو میں گھر کے نزدیک ہی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوا۔ کھیل کود کے بعد ہم سب ایک مکان کے کونہ کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ اور آپس میں کہانیاں سنانا شروع کیں۔ وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ دیر ہو گئی۔ والدہ نے والد مرحوم سے کہا کہ جاؤ بچے کو تلاش کر کے واپس گھر لاؤ۔ اور ساتھ ہی کہا کہ بچے کھیلتے ہوئے گاؤں سے باہر دور تک چلے جاتے ہیں۔ شاید وہ باہر چلے گئے ہوں۔ کیونکہ بچوں کے کھیل کود کا شور سنائی نہیں دیتا۔ حالانکہ ہم گھر سے نزدیک ہی ایک مکان کے کونہ کے ساتھ دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کہانیاں ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ والد صاحب گھر سے باہر نکل کر گاؤں کے چاروں طرف گھوم کر واپس آ گئے۔ والدہ نے پھر

ان کو باہر بھیجا کہ جلدی بچے کو تلاش کر کے لاؤ۔ تم نے ہی اس کو اجازت دے کر آوارہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ خیر والد صاحب دو تین مرتبہ گاؤں کا چکر لگا کر مایوس واپس آ گئے والدہ بہت خفا ہو رہی تھی اور ان کو طعن و تشنیع کر رہی تھی۔ کہ آخر کار میں خود آ گیا۔ والد صاحب نے تو کچھ نہ کہا لیکن والدہ نے خوب سرزنش زبانی اور ہاتھوں سے کی۔ اور والد صاحب کو اپنی رائے اور عمل کی صحت پہ اتفاق کرا لیا۔ اس کے بعد تو پھر والد صاحب نے بھی کبھی والدہ کے اس کنٹرول اور جبر کے خلاف کچھ نہ کہا۔ بہرحال ان حالات نے خاص کر اور کچھ جبلی خصلت نے مجھے بچپن ہی سے کم آمیزی کی عادت ڈال دی اس واسطے میرے رفقاء و احباب کا حلقہ ہمیشہ ہی بہت محدود رہا۔ بچپن میں صرف دو ہی دوست تھے۔ ایک محمد سرور خان ولد دوست محمد خان مرحوم منیر خانی۔ چچا زاد بھائی اور دوسرا جمعہ خان ولد محمد خان۔ محمد سرور خان سے رفاقت آج تک قائم ہے۔ وہ ایک ہوشیار اور کارکن انسان ہیں۔ جمعہ خان نوکری کے لئے برما گیا۔ وہاں جوانی میں وفات پائی۔

مڈل اور ہائی سکول میں دوستی دو تین افراد تک ہی محدود رہی۔ ان میں ایک خورشید عالم تھا۔ اس کے والد ریلوے میں ڈاکٹر تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے بڑا محمد حسین اور چھوٹا خورشید عالم۔ خورشید عالم میرا ہم جماعت تھا۔ اور محمد حسین اگرچہ عمر میں بڑا تھا۔ لیکن کچھ غبی سا تھا۔ اس واسطے دو سال پیچھے تھا۔ ایک عبدالوحید ساکن ہری پور تھا۔ بہت خاموش مخلص اور سلجھے ہوئے اخلاق کا انسان تھا۔ خورشید عالم تو انٹرنس پاس کر کے انجینئرنگ کالج میں چلا گیا پھر ی۔ ء ۴۷ میں ملازمت کی اور اعلیٰ عہدہ پر پہنچا۔ کوئٹہ۔ لاہور اور راولپنڈی میں کوٹھیاں بنائیں۔ پھر تقریباً چالیس سال بعد ۱۹۶۰ء میں ملا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی موٹر کے حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔ خدا بخشے میرے گاؤں کے دو لڑکے روشن دین پسر میاں عبدالرحمن (نمبردار کمال پور) اور میرا چچا زاد بھائی خواجہ محمد خان پسر حبیب خان پنّی بھی میرے ہم جماعت رہے۔ روشن دین آٹھویں جماعت کے امتحان میں رہ گیا۔ میں۔ خورشید عالم۔ عبدالوحید اور خواجہ محمد خان خالصہ ہائی سکول ہری پور میں داخل ہوئے۔ روشن دین اور محمد حسین مڈل سکول میں رہ گئے۔ خواجہ محمد خان انٹرنس پاس کرنے کے بعد گرد آور قانون گو ہوا۔ پھر نائب تحصیلدار بانڈہ داؤد شاہ ہوا۔ وہاں بیمار ہو گیا۔ میں ان دنوں بنوں میں سول سرجن تھا۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ ایک ماہ کے قریب بیمار رہا۔ اور ۱۹۳۵ء میں بنوں ہی میں فوت ہوا۔ روشن دین انٹرنس پاس کرنے کے بعد پولیس میں بھرتی ہوا۔ اور ہیڈ کنسٹیبل ہو کر پنشن پر آیا۔ ۱۹۶۰ء میں تپ دق کا شکار ہو کر فوت ہوا۔ عبدالوحید انٹرنس کے بعد محکمہ صحت کے مرکزی دفتر پشاور میں کلرک بھرتی ہوا۔ خون کے بڑھے ہوئے دباؤ کے باعث فوت ہوا۔ ایک ڈوگرہ ہم جماعت ہائی سکول کا ذکر ضروری ہے۔ نام رنبیر سنگھ تھا۔ جموں کا رہنے والا تھا۔

وہ بہت ہی ہنس مکھ اور مجلس آرا انسان تھا۔ دو باتیں اب تک یاد ہیں۔ ۱۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مہاراجہ کشمیر پرتاپ سنگھ افیم بہت کھاتا تھا۔ اس واسطے اس کو سخت قبض رہتی تھی جب کبھی وہ پاخانہ جاتا۔ تو قبض کی وجہ سے اس کو وہاں بہت دیر لگ جاتی۔ اور افیم کے غلبہ سے وہیں سو جاتا۔ جب بہت دیر گزر جاتی تو ملازم ایک پیتل کا تھال لے کر پاخانہ کے دروازہ پر بجاتا تھا۔ اور ساتھ کہتا جاتا تھا۔" مہاراج ٹٹی آئے ہو۔ مہاراج ٹٹی آئے ہو" یعنی آپ سونے کے لئے نہیں بلکہ ٹٹی کے لئے یہاں آئے ہو۔ اس طرح اس کو بیدار رکھا جاتا تھا۔ تاکہ وہ ٹٹی سے فارغ ہو کر باہر آ جائے۔ ۲۔ اس وقت مہاراجہ کے چار وزیر تھے جن کے نام پنڈت بدری ناتھ۔ نریندر ناتھ اور رُو (ٹھیک نام یاد نہیں رہا) اور چوتھا خوشی محمد تھا۔ لوگوں نے ان کے خلاف ایک شعر بنا رکھا تھا جس کو وہ اپنی محفلوں میں سناتے تھے ؎

اد رُو، بد رُو، نیندرُو، چوتھا خوشیا جُٹ
چاروں پائے تخت دے، چاروں چُوڑ چپٹ

دو اور ساتھی اور دوست جو مڈل سے ہائی سکول تک ساتھ رہے، قابلِ ذکر ہیں۔ اول شیخ عبدالمجید ساکن شہر ہری پور تھے اچھی صحت اور قد و قامت کے آدمی تھے۔ اور ہنس مکھ اور خوش گو دوست تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد محکمہ مال میں بھرتی ہوئے بہت مدت گرد آور اور قانون گو رہے اور آخر میں تحصیلدار ہوئے۔ دوسرے دوست احمد سلطان خان پسر خان میر افضل خان ساکن درویش تھے۔ بہت ذہین، دوستوں کے شفیق اور نرم طبیعت کے انسان تھے میرے ساتھ دوستی بھی تھی۔ اور طالب علمانہ مسابقت کی چشمک بھی ہم دونوں میں رہتی تھی۔ امتحان میں کبھی وہ اول آتے اور کبھی میں۔ بے حد محنت کرتے تھے اور اول آنے کے لئے رات کو دیر تک پڑھتے تھے۔ میں سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتا تھا۔ اور وہ روزانہ گھر (موضع درویش) سے آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ جب امتحان میں میرے نمبر اُن سے کافی زیادہ آئے تو وہ غمزدہ سے ہو گئے۔ کلاس میں سب لوگ ان کی افتادِ طبیعت سے واقف تھے۔ خواجہ محمد خان پنّی (میرے عموی زادہ) نے کہا۔ کہ "احمد سلطان تم اس کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہو جو تو ساری رات پڑھتا رہتا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے رات بھر جاگنا شروع کر دیا۔ اس سے ان کی دماغی صحت پر بھی اثر پڑا۔ بہت مدت تک بیمار رہے۔ پھر افاقہ ہوا۔ تعلیم شروع کی۔ دسویں جماعت پاس کی۔ گرد آور محکمہ انہار پشاور رہے۔ ترقی کر کے۔ ای۔ اے۔ سی ہوئے۔ کم گو نہایت نیک نفس اور منکسر المزاج تھے اپنے رشتہ داروں اور ہم وطنوں کے صحیح خیر خواہ تھے۔ مرض معدہ کی مہلک بیماری میں وفات پائی خدا بخشے۔ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔

اسلامیہ کالج کے رفقاء

اسلامیہ کالج پشاور میں میرے رفیق سید عبدالمطلب اور نوازش علی تھے۔ مولوی عبدالقیوم ساکن تربار مانسہرہ مرحوم اور دوست تھے جو مجھ سے دو سال تعلیم میں آگے تھے۔ ہزارہ کے طلباء کے لیڈر اور ان کے مددگار تھے۔ خدا بخشے بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ بعد میں وکیل ہوئے۔ کچھ مدت مانسہرہ میں پریکٹس کی اور پھر اعصابی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ سید عبدالمطلب اور نوازش علی نے پشاور ہی سے ایم ایس سی کیا۔ بعد میں نوازش علی خان تو اور عبدالمطلب وہیں فزکس کے پروفیسر ہوئے۔ اور اسی عہدہ پر مدت ملازمت پوری کر کے پنشن حاصل کی۔ سید عبدالمطلب مضبوط صحت کے آدمی ہیں۔ اور اب بھی ویسے ہی مضبوط ہیں۔ میڈیکل کالج میں سرحد کے دو ہم جماعت مخلص دوست تھے۔ محمد شاہ ساکن ڈیرہ اسمٰعیل خان اور محمد کامل شاہ ساکن کوہاٹ دونوں ڈاکٹر ہوئے۔ محمد کامل شاہ کچھ مدت کے لئے سول سرجن بنے۔ لیکن نوکری چھوڑ دی اور مردان میں پریکٹس شروع کی۔ عارضہ دل کے مریض تھے۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ ڈاکٹر محمد شاہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر صحت ہوئے اور پنشن لی۔ آخری لیاقت آباد مل کے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ معرکہ کے آدمی تھے جسمانی اور دماغی توانائی کے مالک تھے۔ اور عمر کے آخری دور میں بھی وہی آن بان تھی۔ مجلس طراز اور ہر قسم کے مناظرہ کے لئے ہر دم جوان اور تازہ تھے۔ افسوس ہے سنا کہ وہ ابھی ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو فوت ہو گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

زمانۂ ملازمت کے احباب

میری کم آمیزی اور مصروفیت نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ کہ حلقۂ احباب زیادہ کر سکوں۔ ہر جگہ پر بہت محدود حلقہ احباب رہا۔ ویسے تو صاحب سلامت اور آمد و رفت کافی رہی۔ لیکن دائرہ احباب تنگ ہی رہا۔ ملازمت کا زیادہ حصہ کم و بیش سات سال بنوں میں گزارے اگرچہ حلقۂ احباب قابل وسیع رہا۔ ان میں صرف دو کا ذکر ہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

لیکن اس سے قبل بنوں کی مختصر سی تاریخ بیان کرتا ہوں۔ بنوں ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ جو ایک سو سال قبل مسیح سے لے کر مسلمان فاتح بادشاہوں کے عہد تک مشہور رہا۔ امپیریل گزٹ آف انڈیا کے مطابق اس علاقہ کا ایک قدیم شہر اکرۂ موجودہ بنوں شہر کے نزدیک ایک بلند ٹیلہ پر آباد تھا۔ اس کے کھنڈرات سے برآمد شدہ اشیاء کی مناسبت چینی ترکستان کے دارالخلافہ ختن کی اشیاء

سے ملتی ہیں۔ اغلباً یہ شہر زابلستان کا حصہ رہا ہے۔ دونوں مشہور چینی سیاح۔ فاہین ۴۰۲ء میں اور ہیون سانگ اس سے دو سو سال بعد۔ افغانستان سے پاک و ہند آنے کے لئے پرانے راستہ (درہ پیواڑ سرحد مابین افغانستان و وادی کرم) سے کرم ایجنسی میں داخل ہوئے۔ اور دریائے کرم کے کنارے چل کر علاقہ بنوں پہنچے۔ یہ ہمارا راستہ وسط ایشیا اور افغانستان کے دارالخلافہ غزنی سے ہو کر پاک و ہند آتا تھا۔ جب سے کابل دارالخلافہ ہو گیا تو عام آمد و رفت درہ خیبر سے ہونے لگی۔ اور بنوں شاہراہ عام سے ہٹ کر گمنامی میں چلا گیا۔ علاقہ بنوں بہت زرخیز علاقہ ہے اور اس کی زرخیزی اسی طرح دریائے کرم کا تحفہ ہے۔ جس طرح مصر کی زرخیزی تحفۂ نیل ہے۔

انگریزوں نے اپنے عہد میں بنوں کا موجودہ شہر قلعہ بند بنایا۔ ہر دروازہ پر مسلح پولیس رہتی تھی۔ پاکستان بننے سے دس سال پہلے پُرامن ماحول پیدا ہو جانے پر ان دروازوں سے پولیس ہٹا لی گئی تھی۔

احباب بنوں۔ ۱۔ عبداللہ جان خان ایڈووکیٹ۔ آپ بنوں کے بہت معزز اور شریف خاندان کے سربراہ ہیں آپ کے والد بزرگوار خان ظفر خان صاحب مدت تک ہزارہ کے سیشن جج رہے۔ بڑے ہی صاف گو، عادل اور دیانت دار افسر تھے۔ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے خان عبداللہ جان خان کے فرزند اکبر کرنل حمیدی خان پاکستان ہاکی ٹیم کے شہرہ آفاق کپتان رہے۔ ان کی سرکردگی ہی میں پاکستان ہاکی ٹیم نے عالمی مقابلہ میں اول مقام حاصل کیا۔ عبداللہ جان خان سے چھوٹے محمد اسلم خان ہیں۔ جو ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے اور اب پنشن پر ہیں۔ ان کے تیسرے نامور بھائی جنرل محمد اکرم خان ہیں۔ آپ نے انگلینڈ سے غالباً ۱۹۳۲-۳۳ء میں M.R.C.P اور D.T.M.&H ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ اپنے فن کے ماہر بڑے خوددار اور بہترین اخلاق و کردار کے مجسمہ ہیں ۱۹۶۳ء میں فوج سے ریٹائر ہو کر خیبر میڈیکل کالج پشاور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۶۹ء تک اسی عہدہ پر رہے۔ کالج کے نظم و نسق کو اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ اسلامی زندگی کا عملی نمونہ ہیں۔ سب سے چھوٹے محمد افضل خان ہیں بڑے بذلہ سنج اور محفل آرا ہیں۔ بنوں میں میرا طویل قیام ان بھائیوں کی معیت میں بہت خوش گوار گزرا۔ ۲۔ عالیجاہ کریم داد خان سدوزئی مرحوم۔ آپ انسپکٹر پولیس کے عہدہ سے اغلباً ۱۹۳۰-۳۱ء میں پنشن پر آئے۔ اور بنوں میں رہائش اختیار کر لی۔ مجلس آرا مخلص دوست تھے۔ اپنے دوستوں کے لئے چلتے پھرتے اشتہار تھے۔ ہر محفل میں دوستوں کا ذکر خیر کرتے۔ آپ کی عادت تھی کہ بعد نماز ظہر۔ گرمی ہو یا سردی گھر سے نکلتے۔ مقامی افسروں اور دوستوں کے گھر جاتے۔ تازہ خبریں سنا کر ان پر تبصرہ کرتے اور گپ شپ لڑا کر شام کے وقت گھر پہنچ جاتے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ کی اولاد صرف دو بیٹے ہیں۔ آپ کی وفات کو تقریباً ایک سال ہو گیا ہے [illegible]

میری امنگیں اور عزائم

آغاز جوانی سے میری خواہش رہی کہ خدمتِ خلق کے کام کرنے چاہئیں۔ یہ اثر مذہبی تعلیم کا تھا۔

۱۔ پہلا کام گاؤں میں اصلاح الرسوم سے شروع کیا گیا۔ لوگوں نے شروع میں کچھ دلچسپی لی۔ اور قدرے عمل بھی کیا۔ لیکن جلد ہی پرانی رسومات کے قیود میں جکڑے ہوئے اشخاص کی مخالفت سے یہ کوشش ناکام ہو گئی

۲۔ تحریک ہجرت میں کام کرنا۔ تحریک ہجرت کو مولانا محمد اسحاق مانسہروی کی قیادت میں اس ضلع میں کافی فروغ ہوا۔ انہوں نے سب ضلع کا دورہ کیا۔ ہمارے گاؤں میں ان کو دعوت دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر رسالدار گلاب خان مرحوم محلہ خندق والے تھے۔ مولانا محمد اسحاقؒ کو مدعو کیا گیا۔ جلسہ میں گرد و نواح کے مواضعات سے کافی تعداد میں لوگ جمع ہوئے۔ اور جلسہ خوب کامیاب رہا۔

۳۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء کا واقعہ ہے کہ ہم نے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مقدمات کے فیصلے کے لئے پنچ قوم کی ایک کمیٹی مشتمل بر فتح خان ولد عبداللہ خان، لالہ جی خواجہ محمد خان ولد محمد اکبر خان اور جمعدار محمد اسمٰعیل خان بنائی گئی۔ اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہری پور کو درخواست کی گئی کہ وہ چھوٹے چھوٹے مقدمات علاقہ جو راضی نامہ کے قابل ہوں اس کمیٹی کو برائے تصفیہ بھیجا کریں۔ کام بڑے جوش و خروش سے شروع ہوا۔ لیکن جلد ہی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ اور یہ کمیٹی توڑ دی گئی۔

۴۔ چوتھا دور قومی عصبیت کا آیا جب کہ اصلاحات کے زیر عمل انتخاب عمل میں آئے۔ ہر بار ایک قومی امیدوار کھڑا کرنے اور اس کو کامیاب کرانے کی سعی کی جاتی رہی۔ لیکن تعلیم و دولت کی کمی نفاق قومی اور جذبہ خلوص کی کمی نے ہر بار ناکام رکھا۔ پہلے دو الیکشنوں میں محمد اسلم خان مرحوم خلف حاجی بلند خان صاحب مرحوم ساکن کالو پنڈ کو کھڑا کیا گیا۔ قوم پنچی میں اخلاق، عادات اور تجربہ کے لحاظ سے یہ بہترین انتخاب تھا۔ تیسری بار حاجی محمد اشرف خان ولد جمعدار میر عالم خان مرحوم کو کھڑا کیا گیا۔ قوم نے اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کیا۔ لیکن آخر کار ناکامی ہی ہوئی۔

۵۔ قوم کی بہتری کے لئے ایک انجمن امداد باہمی بھی بنائی گئی۔ لیکن وہ بھی نہ چل سکی۔

۶۔ آخری کوشش ۱۹۴۲ء میں اشتمال اراضی کے لئے کی گئی اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

انجمن سازی کا شغل

مجھے زندگی کے ہر مرحلہ میں انجمن سازی کا شوق رہا۔ قدرت نے میرے خمیر میں تعمیری مجلسی زندگی کا تخم رکھا ہے تعلیمی زندگی سے جتنی فرصت مل سکی اس میں یہ شغل جاری رہا۔ اب ان کی تفصیل یاد نہیں۔ دورانِ ملازمت میں یہ شوق، کھیل کی تنظیم خاص کر ٹینس کلب کی شکل

میں ہر مقام پر جہاں تعیناتی ہوئی، ظاہر ہوتا رہا دو تین ممبر بھی اگر مل گئے تو اس کا انتظام کر دیا گیا۔ مثلاً پشاور مردان، پاراچنار میں تو درمیانہ قسم کے کلب بن گئے۔ اور شغل جاری رہا۔ لیکن بنوں کا ٹینس کلب سرکاری افسروں اور مقامی معززین کی شرکت سے خوب مشہور ہوا۔ میرے بعد بھی (میں ۱۹۳۴-۳۶ء تک وہاں رہا) کئی سال تک چلتا رہا۔ شرفاء کے مل بیٹھنے سے وقت بھی اچھا گزرتا رہا۔ اور تعمیری خدمت و باہمی واقفیت کے راستے بھی کھلتے رہے۔ مجھے اس قسم کی تنظیموں کا خیال انگریزوں کی کلب کی تنظیم سے پیدا ہوا۔ مجھے درجہ اول کے افسران میں ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کے کلب میں شامل ہونے سے نفرت رہی۔ اس کی وجہ ایک اپنا احساس خودی اور دوسرے ان کی فرعون سامانی اور شراب و کباب کی زندگی تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی ذاتی زندگی اور حکومت کی کامیابی کا راز ان کی کلب میں یک جائی تھی۔ ان کے کلبوں میں ہر سطح کے انگریز گورنر، جنرل، کمانڈنگ افسر، پروفیسر، کارخانوں کے کارکن جمع ہوتے۔ ایک دوسرے سے شناسائی رفاقت اور امور سلطنت پر تبادلہ خیال ہوتا۔ ہر افسر اپنے اپنے ماحول اور درجہ میں ایک متفقہ پالیسی پہ عمل پیرا رہتا۔ کلب میں افسر و ماتحت بڑی آزادی سے ایک دوسرے سے ملتے اور بات چیت کرتے

پشاور تبدیلی ہونے پر ایک چھوٹی سی ٹینس کلب لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں بھی بنائی گئی۔ لیکن ڈاکٹروں کو فارغ وقت کم ملتا ہے لہٰذا وہ اتنی کامیاب نہ رہی۔ پشاور میں ایک کامیاب "ہزارہ مجلس سرحد پشاور" کی بنیاد ۱۰ جنوری ۱۹۳۹ء کو رکھی جس کی ضرورت سب اہلیان ہزارہ مقیم پشاور نے محسوس کی تھی۔ مجلس بہت جلد کافی مشہور ہو گئی۔ اس کے اجلاس ہر تیسرے چوتھے مہینے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی ایک شاخ مانسہرہ اور ایک ایبٹ آباد میں بھی کھل گئی۔

بنیادی مقصد اہلِ ہزارہ کی امداد اور ان میں احساسِ خودی پیدا کرنا تھا۔ عوام اور خوانین کو صوبہ کے صدر مقام پشاور مختلف اغراض کے لئے جانا پڑتا تھا وہاں ان کو ہر آسائش پہنچانے کے لئے یہ اقدام ضروری سمجھا گیا۔

ہزارہ مجلس کے بانی ارکین

قاضی محمد اسلم صاحب ایڈووکیٹ۔ حاجی محمد اشرف خان پنی خان محمد عباس خان صاحب مانسہرہ نواب زادہ محمد اسلم خان۔ خان بہادر میاں عبدالرحمٰن ایبٹ آباد۔ سردار محمد سرفراز خان۔ تحصیل ایبٹ آباد شیخ رحیم بخش صاحب ایبٹ آباد۔ عبدالمجید خان تنولی۔ مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ایبٹ آباد۔ ملک محمد عالم خان مانسہرہ۔ اور ڈاکٹر شیر بہادر خان تھے۔

اس مجلس کے اپنے قواعد و ضوابط تھے جن کے تحت یہ مجلس کام کرتی تھی۔

ہزارہ مجلس کے اغراض و مقاصد

۱۔ باشندگان ہزارہ کے مابین اختلاط، اتفاق اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا۔

۲۔ باشندگان ہزارہ کا ایک دوسرے کو حسب ضرورت ہر جائز اور آئینی طریقہ سے ہر قسم کی امداد بہم پہنچانا۔

۳۔ باشندگان ہزارہ کی اخلاقی، مجلسی، ذہنی، اقتصادی، تعلیمی وغیرہ و دیگر ہر قسم کی بہبودی کے لئے مناسب تجاویز اور وسائل اختیار کرنا۔

ہزارہ مجلس کے زیر اہتمام ہزارہ ڈائرکٹری بھی شائع کی جاتی رہی جس میں ہزارہ کے ملازمین کی فہرستیں بمعہ سکونت وطنی اور موجودہ پتہ کی درج تھیں۔ اس میں ہر فن اور محکمہ کے اصحاب کے نام ہوتے تھے۔ پہلی دفعہ یہ ۱۹۴۰ء میں شائع کی گئی جس میں ۳۴۹ افراد کے نام و پتے درج تھے۔ دوسری دفعہ یہ ڈائرکٹری اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع کی گئی۔ دوسرے صفحہ پر عہدیداران، اراکین مجلس منتظمہ وغیرہ کی تصویر بھی دی گئی۔ اس میں کل ۴۸۴، ۱۳ اصحاب کے نام پیشہ اور پتے دئے گئے۔ ان سے ۵۷۵ اصحاب مجلس کے ممبر تھے۔ ان فہرستوں میں سب اہل ہزارہ مسلمان، ہندو اور سکھ شامل تھے۔ اس دوسری ڈائرکٹری کے آغاز میں یہ "عرض حال" تھی۔

"ہزارہ مجلس سرحد پشاور اپنی زندگی کے دو سال ختم کر چکی ہے اور تیسرا سال شروع ہو چکا ہے۔ گزشتہ سال مجلس نے ممبران اسمبلی۔ گورنمنٹ ملازمین (پراونشل کیڈر) اور وکلاء صاحبان کی ڈائرکٹری پیش کی تھی۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا۔ کہ ہمارے بھائی کہاں کہاں اور کس کس عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔ گویا مجلس نے ان اصحاب کا تمام اہل ہزارہ سے غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہماری وہ کوشش مقبول ہوئی۔ اور اسے بے حد پسند کیا گیا۔ آج ہم تیسرا سال شروع ہونے پر دوسری ڈائرکٹری پیش کر رہے ہیں۔ قوموں اور مجلسوں کی زندگی میں دو تین سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں۔ اس لئے اگر ہمارا دامن اہل ہزارہ کی گراں بہا خدمات سے خالی ہو تو اس پر تعجب کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ خدمات کا یہ دامن بالکل خالی بھی نہیں جس پر مجلس شرمندہ ہو۔ ہمارے جو بھائی مجلس کے کام میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو بھائی ابھی تک بعض وجوہ کی بنا پر اس طرف متوجہ نہیں ہوئے ان سے استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ دے کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں۔ قوموں اور ملکوں اور مجالس کی طاقت کا راز اسی میں مضمر ہے۔ کہ زیادہ سے زیادہ افراد مل کر اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر اٹھائیں۔ ہر شخص خواہ وہ کسی جگہ رہتا ہو اس کے حالات کیسے ہوں وہ محسوس کرے کہ وہ ایک قوم ایک ملک اور ایک مجلس کا ممبر ہے جس کی ترقی خود اس کی ترقی ہے خدا ہمارے حوصلوں کو بلند کرے۔ ہمیں خدمت

قوم و ملک کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

اجلاس

یہ مجلس ہر تیسرے چوتھے مہینے ایک جلسہ منعقد کرتی تھی۔ عموماً یہ اجلاس کسی باغ میں ہوتے تھے۔ مسائل جو زیر نظر رہتے تھے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ ہزارہ کی ترقی کے لئے ہر ممکن طور سے ہر محاذ پر کوشش کرنا خاص کر تعلیمی اقتصادی محاذ پر۔

۲۔ اہل ہزارہ کے لئے پشاور میں ایک "ہزارہ ہاؤس" تعمیر کرنا جس کے لئے کافی تگ و دو بھی کی گئی تاکہ اہل ہزارہ کے لئے یہ قیام و طعام کے طور پر استعمال ہو سکے۔ کافی چندہ بھی جمع کیا گیا لیکن افسوس ہے کہ حالات نے سازگاری نہ کی۔ اور یہ تجویز کاغذی ہو کر رہ گئی ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مجلس کے لائف ممبر

۱۔ خان محمد عباس خان صاحب ایم۔ ایل۔ اے سابق وزیر صوبہ سرحد مانسہرہ ۲۔ خان صاحب حاجی محمد اشرف خان پنی ۳۔ قاضی محمد اسلم خان صاحب بی اے۔ ایل ایل بی ایڈووکیٹ پشاور رئیس سکندر پور (ہری پور) ۴۔ نواب زادہ محمد اسلم خان بی اے (کنٹب) بار ایٹ لاء اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ نارتھ وزیرستان حبیب آف پڑھنہ۔ ۵۔ خان صاحب عبدالغفور خان بی اے سینئر سب جج ڈیرہ اسمٰعیل خان رئیس گیدڑ پور۔ ۶۔ خان بہادر میاں عبدالرحمٰن خان سپرنٹنڈنگ انجینئر شمالی سرکل ایبٹ آباد۔ ۷۔ سردار محمد سرفراز خان ساکن کاہو ڈپٹی کنٹرولر ۸۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنیؔ (مولف) ۹۔ ۹۔ سرور سلطان خان آف ایبٹ آباد۔ اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز پشاور۔ آپ خاموش اور سنجیدہ طبیعت کے انسان ہیں۔ پنشن آنے پر کیہال (ایبٹ آباد) میں مقیم ہیں۔ آپ خان صاحب قلندر خان ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کے بھتیجے ہیں۔ ۱۰۔ سوار بہادر خان ساکن ریحانہ سپیکر لیجسلیٹو اسمبلی صوبہ سرحد۔ ۱۱۔ لفٹیننٹ کرنل (حال فیلڈ مارشل صدر پاکستان) محمد ایوب خان ساکن ریحانہ۔ یہ دونوں بھائی قوم ترین کے چشم و چراغ ہیں۔ اور معلوم و مشہور ہستیاں ہیں۔ ان کے حالات اس کتاب میں دوسری جگہ مرقوم ہیں۔ ۱۲۔ خان صاحب راجہ عبدالرحمٰن خان ساکن نگری ٹوٹیال وزیر اطلاعات صوبہ سرحد۔

شاخیں

اس مجلس کی شاخیں مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں کھولی گئی تھیں۔

ہزارہ مجلس سرحد کے صدر قاضی محمد اسلم خان رہے اور جنرل سکریٹری سردار محمد سرفراز خان و دیگر افراد۔ مانسہرہ برانچ کے جنرل سکریٹری محمد عرفان صاحب اور ایبٹ آباد برانچ کے سید الطاف حسین شاہ۔

مجلس کے قابلِ ذکر اراکین

مجلس کے ایک رکن عبدالمجید خان تنولی کا ذکر خصوصاً ان کے جوشِ عمل، خوش اخلاقی اور شیریں زبانی کی وجہ سے کرنا ضروری ہے۔ وہ کنگوتری کے معزز تنولی خاندان کے فرد تھے۔ کمپٹرولر سرحد کے دفتر پشاور میں شاید اکونٹنٹ تھے ملک و قوم کے ہمدرد تھے۔ دوست نواز، خوش مذاق اور پسندیدہ طبع انسان تھے جس مجلس میں ہوتے اس پر چھا جاتے آخری دنوں میں دل کی بیماری نے ان پر حملہ کیا۔ دردِ دل رکھنے والا انسان آخر دل کے ہاتھوں ہی چل بسا۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

۲۔ محمد سرفراز خان علاقہ لورا کے رہنے والے ہیں۔ پشاور کمپٹرولر میں اکونٹنٹ افسر تھے۔ بعد میں پنجاب کے اکونٹنٹ جنرل کے دفتر میں آگئے۔ آغازِ جوانی میں انگریزی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ اخلاص و شرافت کے مجسمہ ہیں زندگی کے اس دور میں پیر صاحب گولڑہ شریف کے مرید ہو گئے ہیں۔ سرکاری فرائض سے جو وقت بچتا ہے رشد و ہدایت کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ دل میں یادِ خدا اور ہاتھ میں تسبیح رہتی ہے اور یہی انجام بخیر کے علامات ہیں۔ بے حد نیک سیرت انسان ہیں۔

۳۔ خان محمد عباس خان مرحوم مانسہرہ کے خان خیل تھے۔ سادہ مزاج، بے حد شریف اور خلیق انسان تھے۔ وہ اپنے وقت میں اتنے ہر دلعزیز تھے کہ ان کو وزیرِ اعلیٰ بنانے کے لئے سب ممبران اسمبلی ایک موقعہ پر تیار بھی ہو گئے۔ لیکن ایک سیاسی شعبدہ بازی سے ان کو اس میدان سے ہی ہمیشہ کے لئے نکال دیا گیا۔

۴۔ حاجی محمد اشرف خان بفّہ عنفوانِ شباب سے قومی جذبہ رکھنے والے ہیں۔ اور جذباتی اثر سے زود عمل بھی ہیں عمر کے آخری مرحلہ میں ہیں لیکن ویسے ہی مستقل طبیعت کے مالک ہیں۔

۵۔ قاضی محمد اسلم خان ایڈووکیٹ خاندان سکندر پور (ہری پور) کے نامور رکن۔ وکالت میں نمبر اول اور سیاست کے میدان میں بھی کافی مہارت رکھتے ہیں مستقل مسکن پشاور رہی ہے۔ قوم پرور انسان ہیں۔ عمر ۸۰، ۸۵ سال ہو گی۔

۶۔ نواب زادہ محمد اسلم خان (کنشب) ایک شریف خان زادہ تھے۔ قابلیت، شرافت اور زیرکی کے مجسمہ تھے آپ خاندان پڑھمہ کے چشم و چراغ تھے۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے افسوس کہ جوانی ہی میں دل کی بیماری سے فوت ہوئے۔

۷۔ خانصاحب عبدالغفور خان گیدڑپور تحصیل مانسہرہ کے معزز خاندان سے تھے۔ سیشن جج کے عہدہ تک پہنچے آخرکار مرکزی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوئے۔ بے حد دیانت دار، سخت غیور اور باعمل انسان تھے غیرتِ ہزارہ کی مجسم نشانی تھے ٹینس کے بیحد دلدادہ، اور بہت کھیلتے تھے۔ کھیل ہی میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ اور انہوں نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کے ایک بھتیجے خان محمد یعقوب خان

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں چیف انجینیئر ہیں۔ اور ان کا نقشِ ثانی حیا و شرافت کا مجسمہ۔

۷۔ خان بہادر میاں عبدالرحمٰن خان۔ آپ دارالخیر ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں۔ اپنے فن میں صفِ اول کے انسان ہیں چیف انجینیئر سے مدت ہوئی ریٹائر ہوئے لیکن آج تک اپنی قابلیت کے لحاظ سے گورنمنٹ محکمہ تعمیراتِ عامہ کے مشیر ہیں۔ آپ کا ایک بڑا صاحب زادہ محمد اسلم خان چیف انجینیئر محکمہ انہار رہے اور دو صاحب زادے سی۔ ایس۔ پی (C.S.P) ہو گئے۔ یہ دونوں امتحان مقابلہ میں بڑے اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوئے۔

۸۔ مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ساکن ایبٹ آباد، مجلس ہزارہ کے سرگرم رکن تھے۔ آپ ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں۔ اور حضرت مولانا الحاج محمد عبدالرحمٰن صاحب گنجوی خطیب جامع مسجد ایبٹ آباد کے بڑے صاحب زادہ ہیں۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس کے عہدے سے پنشن حاصل کی۔ بڑے صاحبِ علم اور فن تجوید کے ماہر ہیں صحت خوب ہے اور بڑھاپے کے آثار ابھی ظاہر نہیں ہوئے

۹۔ شیخ رحیم بخش۔ آپ ایبٹ آباد کے رہنے والے ہیں۔ تعمیراتِ عامہ کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹی تک پہنچ کر پنشن لی۔ فٹ بال اور ہاکی کے ماہر۔ جوانی میں شاید یہ کھیل کھیلتے بھی رہے ہوں۔ اب بھی ان کھیلوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اس بڑھاپے میں بھی ہر میچ دیکھنے کے لئے سردی ہو یا گرمی پہنچ جاتے ہیں کبھی ریفری (REFEREE) کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں ہزارہ مجلس کے سرگرم کارکن تھے خوب زندہ دل انسان ہیں اور اس شعر پر عامل ہے

زندگی زندہ دلی کا نام ہے	مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

۱۰۔ ہزارہ مجلس کے ایک اور مجلس سرگرم رکن خلیل الرحمٰن مانسہروی تھے۔ عقیدہ کے پختہ، اپنے کام کے ماہر۔ آپ دفتر ناظم صحت سرحد میں سپرنٹنڈنٹ رہے ۱۹۶۲ء سے ریٹائر ہو گئے ہیں۔ بڑے دیانت دار اور صاحب الرائے۔ اپنے فرضِ منصبی کے ساتھ ساتھ اہلِ ہزارہ کی امداد دامے، درمے، سخنے کرتے رہتے تھے آج کل تجارت میں مصروف ہیں متوکل انسان ہیں روزی اُسی رازقِ مطلق سے مانگتے ہیں جو سب کو پہنچاتا ہے

انجامِ مجلس

ہزارہ مجلس کا آخری فوٹو جو میرے پاس ہے وہ مارچ ۱۹۴۳ء کا ہے اور میری تبدیلی اگست ۱۹۴۳ء میں بعہدہ ایجنسی سرجن پاراچنار کرم ایجنسی ہو گئی۔

اس کے بعد مجلس کے حالات سے بیخبر ہو گیا۔ لیکن اتنا یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۴۵ء تک مجلس کی شمعِ زندگی جلتی رہی۔ نہ معلوم کب یہ گُل ہو گئی۔ اگر یہ مجلس جاری رہتی تو بہت مفید کام کرتی۔

بزمِ علم و فن ۔ ایبٹ آباد

یہ بزم ۱۹۵۲-۵۳ء میں محمد یوسف حیات خان سیشن جج ہزارہ کی تحریک پر عالمِ وجود میں آئی اس کے بانی ممبر یہ تھے ۔ ۱۔ ڈاکٹر مظہر علی خان، پروفیسر انگریزی کاکول اکیڈمی حال پشاور یونیورسٹی ۔ ۲۔ محمد یوسف حیات خان ساکن کوہاٹ ۔ ۳۔ مسٹر انور شبنم دل ساکن دل کا زرگو شنڈول ۔ ان کے والد دل محمد صاحب کے نام پر لوئر ملک پورہ ایبٹ آباد ۔ حال پروفیسر علم اللسانہ لاہور ۔ ۴۔ مسٹر شوکت واسطی صاحب حال پرنسپل گورنمنٹ کالج مردان ۔ ۵۔ سید واجد رضوی صاحب ایڈووکیٹ ایبٹ آباد ۔ ۶۔ مسٹر جسٹس سجاد احمد جان صاحب حال جج سپریم کورٹ پاکستان ۔ ۷۔ ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی ۔ دارالشفا ایبٹ آباد ۔ جسٹس سجاد احمد جان صاحب نے اس بزم کو ترقی دینے میں بہت موثر حصہ لیا ۔ بزم کے غرفہ نشین سے جسٹس کیانی مرحوم (چیف جسٹس مغربی پاکستان ہائیکورٹ) کے مشہور لیکچر "افکار پریشان" جسٹس سجاد احمد جان کی وساطت اور کوشش سے کرائے جاتے تھے ۔

ڈاکٹر مظہر علی خان ۔ یہ مہاجر صوبجات متحدہ ہندوستان سے ہیں ۔ انگریزی و اردو کے مانے ہوئے پروفیسر ہیں ان کے کمال زبان دانی و قابلیت کے لئے یہی بات بس کرتی ہے کہ آپ انگلینڈ میں انگریزی کے پروفیسر رہے آپ ایک جادو بیان مقرر ہیں ۔ تقریر ایسی دلپذیر ہوتی ہے کہ حاضرین کو مسحور کر دیتی ہے ۔ شوکت واسطی صاحب خوش نوا شاعر ہیں ۔ اور ادبی مجلسوں کی رونق اور اعلیٰ منتظم ہیں ۔ سید واجد رضوی صاحب مجاہد دکن سید قاسم رضوی کے بھتیجے ہیں ۔ شعلہ نوا خطیب ہیں ۔ ابوالکلامی رنگ رکھتے ہیں ۔ بلاغت ۔ فصاحت سے تشبیہات ۔ تمثیلات و استعارات سے اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر بدرجہ اولیٰ قادر ہیں ۔

محمد یوسف حیات خان اس وقت ہزارہ کے سیشن جج تھے ۔ علمی کاموں سے خاصا لگاؤ رکھتے ہیں ۔ محفل آرا دوست نواز اور خوش خلق انسان ہیں ۔ پنشن کے بعد آج کل پشاور میں ایڈووکیٹ ہیں ۔ مسٹر انور شبنم دل اس زمانہ میں کالج کے طالب علم تھے ادب و زبان سے بے حد شغف ہے ادبی اور علمی مجلسوں کے کرتا دھرتا رہے ہیں ۔ ایم اے کرنے کے بعد علم اللسانہ میں خصوصی تعلیم اور ڈگریاں امریکہ سے حاصل کیں ۔ علمی کانفرنسوں میں شمولیت کے سلسلہ میں پوری دنیا کی سیر کر چکے ہیں ۔ آج کل (دسمبر ۱۹۶۸ء) میں پنجاب یونیورسٹی میں ماہر لسانیات کام کر رہے ہیں ۔ جسٹس سجاد احمد خان ایبٹ آباد کے مشہور ایڈووکیٹ رہے ہیں ۔ علمی مذاق رکھتے ہیں ۔ اردو کے بہترین مقرر ہیں ۔ اور بزم کی مجلس کے مسند نشین ہیں ۔

میرے دل پسند مشغلے بچپن میں دیہاتی ماحول میں کوئی خاص شغل نہ رہا ۔ زیادہ تر سکول اور گھر کی چار دیواری ہی میں وقت گزرتا رہا ۔ اتنا یاد ہے کہ چند روز بٹیرے بھی رکھے ۔

اور کبھی دوڑ اور کشتی کا شوق بھی کیا لیکن یہ سب عارضی اور وقتی قصہ تھا ۔ کسی کھیل کی طرف فطرتاً رغبت ہی نہ تھی ۔ زیادہ رغبت مجھے کہانیوں قصوں اور قومی حکایتوں سے رہی ۔ والدہ مرحومہ دینی تعلیم، پیغمبرؐ کے قصے اور قومی حکایات، دونوں (بہن بھائی) کو سناتی رہتی تھیں ۔ میرے نانا مرحوم بہت زیادہ مذہبی زندگی پر عامل تھے اور والد مرحوم پکے نمازی تھے اور علی الصبح اٹھ کر مسجد چلے جاتے تھے ۔ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر زیر مطالعہ رکھتے تھے ۔ دن کے اوقات نماز میں مجھے بھی کبھی کبھی اپنے ساتھ مسجد لے جایا کرتے تھے اس لئے بچپن ہی سے مجھ پر خاصا مذہبی رنگ چڑھ گیا تھا ۔ ان ایام میں ہمارے علاقہ میں سید محمود شاہ صاحب ساکن ڈھینڈہ ایک پُر اثر واعظ تھے ۔ وہ جب کبھی ہمارے گاؤں میں آتے تو ان کا وعظ بھی خاص طور پر سننے کے لئے جایا کرتا تھا ۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد مجھے مذہبی اور تاریخی کتب کے مطالعہ کا شوق زیادہ ہوا ۔ مڈل سکول ہری پور کی تعلیم کے عرصہ مختصر مدت کے لئے شاعری سے بھی شغل کیا ۔ "عاکف" تخلص تھا ایک مُہر بھی بنوائی تھی ۔ ایک بیاض بھی مرتب کی تھی اب نہ بیاض ہے اور نہ ہی کوئی شعر یاد ہے ۔ مڈل سکول ہی میں ہیڈ ماسٹر محمد رمضان صاحب مرحوم کی وجہ سے قرآن اور اس کی تفسیر کا کافی شوق ہو چکا تھا ۔ مذہبی رسالوں اور اخبارات کے مطالعہ کی رغبت زیادہ ہوئی ۔ ان دنوں میں خواجہ حسن نظامی صاحب مرحوم کے اخبارات و مضامین کا چرچا تھا وہ مطالعہ کرنے شروع کئے ۔ پھر الہلال منظرِ عالم پر رونق افروز ہوا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی جادو بیانی اور سحر تحریر نے ایسا مسحور کیا کہ آج تک تبحر علم اور سحر بیانی سے مسحور ہوں ۔ اُن کی جملہ تصانیف بصورت الہلال ۔ البلاغ ۔ الجامعہ (عربی) وغیرہ سب محفوظ ہیں ۔ اور مشعلِ راہ ۔ جب کبھی طبیعت حالات زمانہ سے یا کسی اور وجہ سے مکدر ہوتی ہے تو پھر اس باغ سدا بہار کے ملاحظہ سے دل و دماغ کی ترو تازگی بحال کر لیتا ہوں ۔ زندگی میں شروع سے شغل مذہبی اور تاریخی کتب رسالہ جات و اخبارات کی خرید ہی رہا ۔ نہ سگریٹ نوشی اور نہ سینما بازی ۔ لاہور کے قیام طالب علمی میڈیکل کالج از ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۳ء شوق علمی کے پورا کرنے کے خوب مواقع ملے ۔ اور ان سے خوب استفادہ کیا ۔ اس حد تک کہ اپنی تعلیم ڈاکٹری کا شغل بھی ماند ہو گیا دوران ملازمت میں فرض منصبی سے اتنی مہلت نہ ملی کہ کسی ٹھوس کام کی طرف توجہ ہوتی ۔ پھر ڈاکٹری ایسا پیشہ ہے کہ انسان کو اپنے وقت پر کوئی اختیار نہیں ہوتا ۔ خدمتِ خلق اپنے علم و تجربہ ڈاکٹری کے مطابق اچھی ہی کی ۔ غرباء کی خدمت شوق و اخلاص سے کی اور امراء کی خدمت فرض منصبی سمجھ کر ۔ لیکن جو راحت غرباء کی خدمت سے روح و دل کو ہوئی اس کا اندازہ بتا نہیں سکتا ۔

دورانِ ملازمت میں خاص مشغلے پرانے ٹکٹ جمع کرنا ۔ پرانے سکے اور خطوط جمع کرنا ۔ پرانی اور نئی کتب خاص کر تاریخی و مذہبی کا اکٹھا کرنا اور آثار

قدیم کی چیزوں کو ڈھونڈتا رہا۔ میرے پاس آج تک اپنے والد مرحوم اور چچاؤں (جو ۱۹۰۵ء سے امریکہ چلے گئے تھے) کے سب خطوط محفوظ ہیں۔ خطوط کا سنبھال کر رکھنا میرے خاندان کی عادت ہے میرے حسب خطوط جو میں نے والد مرحوم کو لکھے یا اپنے چچاؤں کو لکھے انہوں نے محفوظ رکھے اور اب وہ سب خطوط میرے پاس ہیں جو ماضی کی خاندانی تاریخ اور زندگی کے نشیب و فراز کے حالات کے مظہر ہیں۔

پنشن کے بعد (۱ نومبر ۱۹۵۶ء) اپنے مکان دارالشفا ایبٹ آباد میں ذاتی کلینک (مطب) میں پریکٹس کر رہا ہوں۔ اور تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی ہے جو تیزی سے گزر رہی ہے ۔

رو میں ہے رخشِ عمر دیکھیے کہاں تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تبدیلیٔ سکونت۔ پنیاں سے ایبٹ آباد

تدبیرِ انسانی کی ناکامی بہ مقابلۂ تقدیر ربانی۔ کیونکہ اس دنیا میں تدبیر ہی کارفرما نہیں بلکہ اصل کارفرما تقدیر ہے قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (کہہ تحقیق اختیار سب اللہ ہی کا ہے)

جیسا کہ شروع میں تحریر کیا گیا میرا آبائی گھر موضع پنیاں۔ برلب سڑک جرنیلی از حسن ابدال تا ایبٹ آباد واقع ہے۔ میرے والد مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں اپنے گاؤں میں رواج کے مطابق اس وقت کا بہترین مکان بنایا اس کی مضبوطی اور خوبصورتی میں اپنے خیال کے مطابق کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مکان پرانی طرز کا۔ ایک طویل و عریض کمرہ جس کے درمیان ایک مضبوط ستون۔ چھت (تختے اور بتے) کڑیاں، سریاں اور ستون سب خالص دیار کی لکڑی کے اور بڑے موٹے لگائے گئے۔ یہ لکڑی گیلیاں تھیں جو دربند سے باہتمام خاص اور خان صاحب محمد عمر خان طاہر خیلی کی وساطت سے خریدی گئی تھیں۔ وہ میرے والد کے بہترین دوست تھے اور ان دنوں میں نواب صاحب امب کے وزیر تھے۔ دیار کی خوشبو اور خوبی آج بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی اور دیار (دیودار) کی خوشبو سے مکان اب بھی معطر رہتا ہے۔ ستون کی کرسی پوڑیہ یانہ سے ایک بڑے سبز رنگ کے پتھر سے تراش کر بنائی گئی ہے اور گل بوٹوں سے مزین ہے۔ اس کے نیچے فرش کو قدِ آدم گہرا کھود کر پتھر چونا سے بھرائی کر کے اس پر اس کو رکھا گیا ہے۔ یہ سب اہتمام والد مرحوم نے میری خاطر کیا۔ تاکہ میں (ان کا اکلوتا بیٹا) اس میں آرام و راحت کی زندگی بسر کر سکوں اسی ضمن میں انہوں نے اپنے بھائیوں سے جو امریکہ میں تھے یہ خواہش بھی کی تھی کہ اس مکان سے جو مشترکہ جدی جگہ پر بنایا گیا تھا کو تقسیم نہ کریں۔ بلکہ وہ دوسری ذاتی ملکیت کی زمین آبادی سے اپنا حصہ لے لیں۔ آہ! ماں باپ کس طرح اپنی اولاد کے آرام کے لئے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ خیر تذکرہ

یہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے والدین کی خواہش تھی کہ میں پنیاں ہی میں رہ کر اس مکان سے لطف اندوز رہوں لیکن قضا و قدر نے کچھ اور ہی فیصلہ کر رکھا تھا۔ یعنی نہ میں یہاں رہوں گا اور نہ میرے چچا ہی واپس آئیں گے دورانِ ملازمت میرا پکا ارادہ تھا کہ پنشن کے بعد جدی گاؤں پنیاں ہی میں سکونت رکھوں۔ اس کے لئے دماغ میں نقشہ بھی بنا رکھا تھا۔ اور ایک باغ بھی لگایا۔ اس کے ایک سرے پر اونچی جگہ ایک چھوٹا سا مکان بھی بنانے کا ارادہ کر رکھا تھا اس ارادہ کے پورا کرنے کے لئے عقلی دلائل بھی بہم پہنچا رہا۔ مثلاً مجھے اپنے علم تجربے اور وسائل سے اپنی قوم اور خاندان کو فیض پہنچانا چاہئے۔ اور ایسا ہی سب صاحب علم و تجربہ کے لوگوں کو اپنے دیہات ہی میں رہائش رکھنی چاہئے۔ تاکہ دیہات کا ماحول آہستہ آہستہ بدل جائے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ شہری زندگی کے ماحول میں عمر کا بہترین حصہ گزارنے کے بعد عمر کے آخری حصہ میں گاؤں کے ماحول میں رہائش رکھنا لوگوں کے ساتھ گھل مل کر زندگی گزارنا اور ان پر اثر ڈالنا ایک کٹھن کام ہے۔ جو عمر کی اس منزل میں نباہنا بہت مشکل ہے لہذا اس خیال کو ترک کرنا پڑا اور ایبٹ آباد میں ایک گوشہ پر سکون میں رہائش کا خیال ہوا۔ جو کہ آخر ملازمت میں ہوا۔ اور اس وقت ہوا جب یہاں بہترین ٹکڑے بک چکے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میری ملاقات نور الٰہی خان مرحوم ساکن ایبٹ آباد سے مردان میں ہوئی۔ میں وہاں سول سرجن تھا۔ اور وہ وہاں ای۔ اے۔ سی مقرر ہوئے۔ شاید سال ۱۹۴۵ء تھا۔ ان سے ہم وطنی اور ان کی خوش خلقی کی وجہ سے بہت جلد مخلصانہ دوستی ہو گئی۔ یہ ایک مخلص انسان اور قابل قدر دوست اور ایک اعلیٰ قسم کے دیانت دار افسر تھے۔ مردان میں تقرری کے دوران ان کو ہزاروں روپے کی رشوت بھی پیش کی گئی (اور یہ بات میرے علم میں ہے) لیکن انہوں نے اس کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ انصاف و عدالت کے معیار کو ہرگز نہ چھوڑا۔ آخر ملازمت میں پاکستان مرافعہ انکم ٹیکس عدالت کے صدر بنے۔ افسوس ۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو عارضہ دل سے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نور الٰہی خان سے ایبٹ آباد میں مکان بنانے کا ذکر کیا گیا اور ان سے درخواست کی کہ کوئی موزوں سی جگہ خرید کر دیں۔ انہوں نے اپنے بڑے بھائی فضل الٰہی خان کو لکھا۔ اور بعد میں زبانی بھی کہا۔ وہ اس وقت گورنمنٹ کالج میں ہیڈ کلرک تھے اور ۱۹۶۳ء سے پنشن پر آ گئے ہیں۔ انہوں نے تلاش شروع کر دی لیکن کوئی جگہ ان کو پسند نہ آئی۔ ۱۹۵۲ء میں میری تبدیلی ایبٹ آباد ہو گئی۔ ان کی معیت میں ایبٹ آباد کا کونہ کونہ دیکھا گیا۔ آخر کار موجودہ جگہ جو پولیس لائن کی مسجد کے عقب میں تھی۔ پسند آئی۔ کیونکہ یہ بھی کھلی اور پر فضا جگہ تھی شہر کے گنجان حصہ سے باہر بھی اور شہر کے نزدیک بھی اس پر مزید یہ کہ الٰہی برادران کی جائے رہائش سے متصل۔ چونکہ مجھے ان کی کشش یہاں لائی لہذا جگہ بھی ان کے نزدیک ہی مناسب تھی۔

اس جگہ کا سودا فضل الٰہی خان نے بڑی کاوش اور محنت سے کیا اور مجھے ارزاں قیمت پر دلائی۔ ۱۹۵۳ء میں زمین خرید لی گئی۔ اور خریدتے ہی مکان کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں تعمیر مکمل ہو گئی۔ اور معاً میری تبدیلی پشاور ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں جب پنشن پر آیا تو سیدھا ایبٹ آباد پہنچا اور اپنے مکان میں فروکش ہو گیا۔ اور الٰہی برادران خاص کر فضل الٰہی خان۔ نور الٰہی خان اور کرم الٰہی خان کی قربت باعثِ تسکینِ خاطر ہے۔ تھوڑا عرصہ ہی گزرنے پایا تھا کہ ایک خاندان عبد الرؤف اینڈ برادرز کے سربراہ الحاج مولوی عبد الرحمٰن صاحب عرف اجی جی مرحوم سے تعلق خاطر پیدا ہو گیا۔ جو دن بدن بڑھتا ہی رہا اجی جی کی صحبت نے میرے مذہبی جذبہ و طبیعت پر بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ اور آخر عمر میں مجھے اپنی زندگی کے صحیح مقصد پر لگا دیا۔ سحر خیزی اور نماز با جماعت کی عادت ڈال دی۔ اور حسنِ کردار کا سبق دیا۔ تقریباً ہر شام ان کی دکان پران کی معیت تا وفات میسر ہوتی رہی۔ صوفی شاعروں کے نکات معرفت خاص کر رومی و حافظ اور آیات قرآنی کا مذاکرہ ہوتا تھا۔ میری بہت سی قرآنی تلاوت کی غلطیوں کی تصحیح ہوئی جن کے لئے ان کا مشکور رہوں۔ اجی جی مرحوم نوے سال کی عمر میں بھی حافظہ جوانوں کا طبیعت سورماؤں کی اور عزم پٹھانوں کا رکھتے تھے۔ آپ ایک بڑے معزز کنبہ کے سربراہ تھے۔ ان کی نرینہ اولاد سے چار بیٹے بحمد للہ زندہ سلامت ہیں۔ سب سے بڑے مولوی عبد الغفور صاحب ہیں نیک سیرت مسلمان صورت، اور دین میں پختہ کار، کاروبار دنیا میں تجربہ کار اور صائب الرائے ہیں۔ وہ باپ پر فدا۔ اور باپ ان پر فدا۔ باپ سے ان کی محبت بہ حد عشق تھی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ کون عاشق اور کون معشوق تھا۔ والد کی طرح سحر خیز پابند نماز اور تہجد خواں ہیں۔ ان کے دوسرے بیٹے عبد الجلیل ہیں۔ وہ ہری پور میں رہتے ہیں وہاں اپنا مقام خود پیدا کر لیا ہے کاروبار میں پختہ اور کامیاب ہیں اور خاندانی عادات کے خلاف سیاست کے رسیا بھی ہیں ملکی سیاست سے باخبر اور ہری پور کی سیاست کے ماہر ہیں۔ دو بیٹے عبد الحنان اور عبد القیوم ایبٹ آباد میں بڑے بھائی کے ساتھ اپنے کثیر المقاصد کاروبار میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ شرافت اور اخلاق حسنہ سے مزین ہیں۔ عبد الحنان محکمہ مال میں مدت تک ملازمت کرنے کی وجہ سے قانونِ مال سے خوب واقف ہیں۔ عبد القیوم بے حد ذہین ہیں۔ کتابوں۔ رسالوں۔ اور اخباروں کا مطالعہ شوق سے کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ایک دفعہ جو واقعہ یا شعر ان کی نظر سے گزر جائے تو وہ دماغ میں نقش ہو جاتا ہے جب کبھی میرا اور اجی جی کا مباحثہ کسی شعر کی صحت پر ہو جاتا تھا تو فیصلہ وہی کرتے تھے۔ ایبٹ آباد کے چند رفیقوں کے حالات تحریر کرنے میں طوالت ہو گئی ہے۔ لیکن ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم (اجی جی ۳ ستمبر ۱۹۶۹ء کو بہت مختصر سی بیماری

کے بعد وفات پا گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے۔ آمین)

اب آخر میں ایک مہربان استاد پروفیسر منہاج الدین مرحوم اور ایک مہربان دوست شیخ محمد ابراہیم صاحب کا ذکر کرتا ہوں۔

پروفیسر منہاج الدین صاحب مرحوم

میں جب اسلامیہ کالج پشاور میں داخل ہوا تو پروفیسر صاحب چند عرصہ پہلے سے وہاں طبیعات (PHYSICS) کے پروفیسر تھے۔ ایف ایس سی کے سب استاد ہی وقت کے چیدہ لوگ تھے جن میں سے چند کا ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن پروفیسر منہاج الدین صاحب جیسا محنتی، پابند وقت اور مشفق استاد کم ہی ہوگا۔ آپ کا وقت زیادہ تر لیکچر روم اور عملی تجربہ گاہ میں گزرتا تھا۔ اپنے کام سے غرض رکھتے تھے۔ بہت سی کتابیں طبیعات پر تصنیف کیں جو اب تک کالجوں اور سکولوں میں بطور ٹیکسٹ بک پڑھائی جاتی ہیں۔ آپ ریٹائر ہونے کے بعد ایبٹ آباد محلہ کیہال میں مقیم رہے۔ پنشن اور فرصت کے دوران طبیعات پر ایک کتاب انگریزی۔ اردو لکھنی شروع کی۔ اور اس پر تا دم آخر کام کرتے رہے آپ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادوں نے اس کتاب کو شائع کرایا جو علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ آپ ۱۴ اپریل ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔ آپ کے پانچ صاحبزادے ہیں اور سب تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک لاہور کالج میں پروفیسر تھا۔ ان کے سب سے بڑے صاحب زادے پروفیسر ممتاز الدین تھے جو انجینئرنگ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ آپ کی وفات ۹ ستمبر ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ دوسرے صاحبزادے پروفیسر معز الدین ہیں۔ وہ پی ایچ۔ ڈی (ڈاکٹر علم نفسیات ہیں) تیسرے صاحبزادے منیر الدین ہیں۔ آپ ماہر ملٹری اکاونٹنٹ ہیں۔ چوتھے صاحبزادے ڈاکٹر منتظر الدین ہیں جو فوج کے محکمہ صحت میں کرنل ہیں۔ پانچویں صاحبزادے پروفیسر منظور الدین ہیں۔ اور اپنے نامور باپ کے مضمون فزکس کے پروفیسر ہیں۔ اور گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں تعینات ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم صاحب

آپ پروفیسر منہاج الدین کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اور کیہال میں ساتھ ہی ساتھ بنگلے بنائے اور رہائش رکھتے تھے۔

شیخ صاحب نے تمام عمر محکمہ تعلیم میں گزاری۔ ایک فرشتہ صفت انسان اور مخلص دوست ہیں عہدہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سے ریٹائر ہوئے۔ اب چند سالوں سے گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ عبادت ذکر و فکر میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے چار بیٹے ہیں چاروں ہی بڑے شریف قابل اور کامیاب ہیں سب سے بڑے کرنل عبد الحمید ہیں پہلے محکمہ تعلیم سول میں رہے پھر فوج میں چلے گئے۔ آج کل (۱۹۶۲ء) میں گھوڑا گلی کالج کے پرنسپل ہیں۔ ان سے چھوٹے مسٹر رشید ابراہیم ہیں بہت لائق انسان ہیں کالج میں اول آتے رہے۔

پھر محکمہ مالیات پاکستان کے سکرٹری رہے اور آج کل ۱۹۶۰ء میں مشیر مالیات فوج ہیں۔ ان سے چھوٹے سعید ابراہیم ہیں۔ وہ ریلوے میں ایگزیکٹو انجینئر تھے۔ اب کسی فرم میں کام کرتے ہیں۔ سب سے چھوٹے عبدالحفیظ ہیں۔ بجلی کے محکمہ کے ایگزیکٹو انجینئر ہیں اور آج کل منگلا ڈیم پر ہیں۔

بنیادی جمہوریت کی ممبری

صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریت کا قانون بنایا۔ چند ملحقہ دیہات کو ملا کر ایک یونین کونسل اور شہروں محلوں کی یونین کمیٹیاں بنا کر انتخاب کرائے تاکہ بنیادی سطح سے سیاسی شعور اور افراد میں کارکردگی کی استعداد پیدا ہو۔ دوسری بار بنیادی جمہوریتوں کا انتخاب نومبر ۱۹۶۴ء میں ہوا۔ میر خانی خاندان کی خواہش اور خاص کر برادران ولی محمد خان ولد پیر خان محمد سرور خان ولد دوست محمد خان۔ محمد سلیم خان ولد محمد افضل خان و شیر افضل خان ولد لالہ جی خواجہ محمد خان کے اصرار اور کچھ جذبۂ خدمت خلق کی بنا، پر میں بھی انتخاب میں کھڑا ہو گیا۔ ان نامبردہ اشخاص اور دیگر برادری کے ممبران اور دوستوں کی امداد سے میں نے انتخاب جیت لیا۔ اور یونین کونسل کے آٹھ ممبروں کا بلامقابلہ چیئرمین منتخب ہوا۔ اس سے پہلے کے چیئرمین کا انتخاب بڑے زور دار مقابلہ کے بعد ہوا تھا۔ اپنی بساط اور رجحانات کے مطابق اس شغل میں مصروف رہا۔ اور اب میعاد ختم ہے ۱۹۶۹ء کا اختتام ہے آئندہ کی خبر خدا جانے۔

میری زندگی کے حوادث و عوارض

یوں تو انسانی زندگی عوارض و حوادث کا ہی مجموعہ ہے تاہم چند اہم کا ذکر کرتا ہوں۔ شاید اب ایک ہی آخری حادثہ باقی ہے ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میری زندگی بڑی محتاط اور پرہیزانہ گزری۔ سخت بیماری کے حملے صرف دو ہی ہوئے۔ لیکن موٹر کے حادثے تین پیش آئے۔ تینوں سخت تھے۔ مگر زندگی باقی تھی۔ اور بفحوائے جسے رب رکھے اسے کون چکھے۔ بچتا ہی رہا۔ ہر حادثہ کے بعد اپنی زندگی رواں دواں رہی ان حوادث سے استقلال و صبر کا سبق ملتا رہا دعا ہمیشہ یہی رہی اور اب بھی ہے۔ کہ مزید ابتلاء سے محفوظ ہی رکھا جاؤں۔ خدا ہمیشہ اپنے فضل و کرم سے نوازتا رہا۔ پہلی بیماری لگاتار بخار میں چھ ماہ تک ۲۲-۱۹۲۱ء میں مبتلا ہوا۔ میڈیکل کالج کی جماعت اول کا طالب علم

تھا۔ مشہور ڈاکٹر کرنل سدرلینڈ کے زیر علاج رہا۔ انہوں نے B. COLI کا مرض تشخیص کیا۔ لیکن ان کے علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ رخصت پر گھر آیا بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے دیہاتی علاج۔ گھی شکر اور دودھ سے کیا۔ خدا نے کلی شفا دی۔ کالج واپس جانے پر دوست میری بحالی صحت و طریق علاج پر حیران رہ گئے۔ دوسری دفعہ ۱۹۵۵ء میں خونی پیچش، پیشاب کی بندش اور سر چکرانے کی تکلیف میں مبتلا ہوا۔ لیکن خدا کے فضل سے تین ماہ بعد صحت یاب ہو گیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

موٹر کار کے حادثے

۱۹۳۴ء میں گھر سے بنوں (جہاں میں بطور سول سرجن کا کام کر رہا تھا) کے لئے اپنی چھوٹی FIAT کار میں روانہ ہوا۔ وزیری ڈرائیور کار چلا رہا تھا جس ایدال سے گاڑی کا پٹرول بند ہونا شروع ہو گیا۔ ڈرائیور نے پٹرول دینے والے پیڈل پر زور دینا شروع کیا تو موضع بہادان کے نزدیک عین خطرناک موڑ کے آغاز پر زیرو یوے لائن پٹرول کھل گیا اور موٹر کی رفتار ساٹھ میل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں ڈرائیور نے زور سے بریک دبا دی۔ اور موٹر عین موڑ میں چھت کے بل الٹ گئی۔ اور ہم چاروں آدمی جو اس میں سوار تھے نیچے دب گئے۔ قدرت الٰہی سے اسی مقام پر ریل کی پٹڑی پر مزدور کام کر رہے تھے۔ وہ فوراً پہنچے موٹر کو سیدھا کر کے کھڑا کر دیا۔ اور ہم سب صحیح و سلامت بچ گئے۔ اسی موٹر میں ہم نے سفر جاری رکھا۔ رات بانڈہ داؤد شاہ۔ تحصیل ٹیری میں اپنے چچا زاد بھائی خواجہ محمد خان نائب تحصیلدار کے پاس گزار کر صبح بنوں پہنچ گئے۔

دوسرا حادثہ موٹر۔ ۱۹۵۵ء میں ایک ٹیکسی موٹر میں لوند خوڑ جا رہا تھا کہ تخت بھائی کارخانہ شکر سے ایک دو میل آگے ایک بیل گاڑی کو بچاتے ہوئے موٹر پھسل کر الٹ گئی اور میں بیہوش ہو گیا۔ اور تین پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

موٹر کا تیسرا حادثہ۔ اپریل ۱۹۶۶ء میں بالاحصیر جا رہا تھا اور میرا بیٹا محمد اقبال خان موٹر چلا رہا تھا۔ آرڈی ننس ڈپو کے نزدیک چند گائیں موٹر کے آگے آگئیں۔ اس دن معمولی سی بارش بھی ہو چکی تھی۔ ان گایوں کو بچانے کے لئے بریک لگانے پر پھسلاہٹ کی وجہ سے موٹر بائیں طرف گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اور ہم باپ بیٹا جو دونوں آگے پیچھے دائیں طرف بیٹھے تھے بال بال بچ گئے۔

اپنی یہ مختصر سی روئداد حوادث و عوارض لکھ کر شکر باری تعالیٰ ادا کرتا ہوں۔

سوشل ویلفیر کمیونٹی کونسل - ایبٹ آباد

چند دوستوں کے ایما پر جون ۱۹۶۹ء میں اس ادارہ کا ممبر بن گیا۔ یہ ادارہ حکومت کی جانب سے معاشرتی بہبود کے لئے آٹھ دس سال سے چل رہا ہے۔ اور مفید کام کر رہا ہے۔ اس کی سرپرستی میں فنی دستکاری کے دو نسوانی ادارے، اور آٹھ مکاتیب مختلف مساجد میں، آئمہ مساجد کی زیر قیادت چل رہے ہیں۔ ان مکاتیب میں خالص ابتدائی دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ سکول کے بچوں کے تفریحی مشاغل مثلاً کرکٹ، ہاکی وغیرہ کی سرپرستی کی جاتی ہے۔

کونسل کے دفتر میں ایک خاص کمرہ ان ڈور (IN-DOOR) کھیلوں مثلاً کیرم بورڈ وغیرہ کیلئے جہاں کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ایک لائبریری ہے جس میں چند کتب ہیں۔ اور سات آٹھ اخبار و رسالہ جات بھی آتے ہیں۔ شام کے وقت کافی لوگ ان کے مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔ یہ سب ادارے ممبران کونسل سے منتخب شدہ مجلس عاملہ کے زیر اہتمام چلتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء میں صدر کونسل سید واجد رضوی صاحب کے استعفےٰ پر نئے صدر کے انتخاب کے لئے ۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔ مولوی محمد مسعود الرحمٰن صاحب ڈاکٹر فتاح اللہ خان صاحب اور ہیڈ ماسٹر محمد اسحاق خان صاحب کے اصرار پر بادل نخواستہ میں نے صدارت کی امیدواری کے لئے کھڑا ہونا منظور کر لیا۔

کونسل کے اجلاس میں ملک فقیر علی صاحب سکرٹری مجلس عاملہ کی تحریک اور ڈاکٹر فتاح اللہ خان صاحب کی تائید پر مجھے بلا مقابلہ صدر منتخب کر لیا گیا۔ اپنی بساط کے مطابق اور اصحاب متذکرہ بالا و دیگر ممبران کے تعاون سے اس ادارے کی ترقی کے لئے کوشش شروع کر دی گئی ہے۔

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	
۳	۱۰	ترک کے بعد گکھڑ تھے
۴	۷	میں کی بجائے ہیں ہے۔
"	۱۸	خان شاد محمد خان پٹیل
"	۲۲	مرتبہ ولیس ہے (ولیسی غلط ہے)
۶	۵	سنگھاں و ڈرانیاں صحیح درانیاں ہے۔
"	۱۴	ش۔ ب (ب رہ گیا ہے)
۷	۱۱	مغربی پاکستان (ٹھیک نہیں چھپا)
"	۲۰	خوانین ہزارہ - پر۔
۱۲	۸	چوپانی صحیح ہے
۱۵	۲۰	اس "نے" سنہ ۲۷ھ
"	"	عبدالعزیز "کو"
۱۶	۵	سرما "از" گرما
۲۳	۱۹	صواتی صحیح ہے۔
"	۲۲	صوات "کے" ملک کے زائد ہے
۲۹	۱۲	یک جا کر۔ "یک جا ہو کر"
۳۱	۵	خیمہ و تنات
۳۷	۸	لارڈ ہارڈنگ
۴۱	۶	اجیت سنگھ "نے"
۴۲	۲۱	ذکر یوں کیا ہے
۴۲	۲۲	جنیوا
۷۴	۷	براہ غازی "کھڑی"
۹۳	۴	(ہرکشن گڑھ) "اس" کی شوکت
۹۹	۱۱	(سنہ ۱۸۴۲ء) "وصول" کیا
۱۰۴	۵	اور "مردوں" نے
۱۰۶	۸	میدان ہری پور کے سوا "یہ" زائد ہے۔
۱۲۳	۱۰	جزیرہ واٹ میں گزاری
۱۲۴	۱۳	مہاراجہ گلاب سنگھ "والی جموں کشمیر
۱۳۲	۲	تودہ "جلدی" سے
"	۹	"شیروان" کے قلعہ
۱۴۵	۱۵	غلام خان آدمی - دئے تھے
۱۴۶		ارسلہ خان - "خان زیدہ"
۱۵۰	۳	سنہ ۱۵ قدم سے سنہ قدم
۱۵۷	۱۱	سنہ "کر" پنجاب کا
۱۵۹	۱۰	پہلا باقاعدہ بندوبست
۱۶۱	۴	جگو۔ مرتبہ
۱۶۲		پہلے نمبر صوبہ کے اور دوسرے ضلع کی ترتیب کے ہیں۔

صفحہ	سطر	صحیح
۱۸۰	۷	سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۸۹۵ء
۱۸۵	۱۰	"اس کا آغاز" دو تین شہدا
۱۸۹	۲۳	"لکھ" بھیجا
۲۰۸		شجو صحیح علی خان | محمد ظریف خان

عبدو خان کی اولاد حسن علی خان ۔ اوپر سے نیچے ایک لمبی "لکیر" زائد ہے

صفحہ	سطر	صحیح
۲۱۲	۲۳	"تین" وہیں رہے ۔ میں زائد ہے
۲۵۰	۴	؟ راہی راجہ
۲۵۲	۱	بسبب مرنے "نجیب اللہ خان"
۲۵۳	۱۴	قبضہ بھی "وارثانہ"
۲۵۷	۱۲	"وکیل" کے نام سے
"	۱۵	"اس کے" فرزندان
۲۵۹	۱۰	بابت "مالکانہ"
"	۱۳	علاقہ ہزارہ "خارلق"
۲۶۱	۲	تین "حصوں"
"	۱۶	چنانچہ "اکمان زیوں" نے
۲۶۶	۱۰	صوبہ دار "کابل"
"	۱۹	موضع "کابل"
۲۶۸	۶	"ڈوئی"

نوٹ ۔ افسوس ہے کہ پوری کتاب کے اغلاط نامے کے لئے وقت میسر نہ آسکا ۔

(پاکستان ٹائمز پریس لاہور)